جنّت کے پتے
نمرہ احمد

باب 1

لیپ ٹاپ تکیے پہ رکھا تھا اور وہ اس کے سامنے کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی تھی۔ اسکرین کی روشنی اس کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ وہ ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھے دوسرے ہاتھ کی ایک اُنگلی لیپ ٹاپ کے ٹچ پیڈ پر پھیر رہی تھی۔

لمبے، سیدھے، سیاہ بال پیچھے کمر پہ پڑے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی ویسی ہی تھیں۔ سیاہ، بڑی بڑی مغلئی آنکھیں، جن میں چاندنی کی سی چمک تھی اور چہرہ تو ملائی کا بنا لگتا تھا۔ سفید، ملائم اور چمکدار۔

وہ اسی مگن انداز میں اسکرین پر نگاہیں مرکوز کیے، ٹچ پیڈ پہ اُنگلی پھیر رہی تھی۔ ایک کلک کے بعد اگلا صفحہ کھلا تو ایک دم اس کی متحرک اُنگلی ٹھہر گئی۔ اسکرین پہ جمی آنکھوں میں ذرا سا تفکر اُبھرا اور پھر بے چینی۔ اس نے جلدی جلدی دو، تین بٹن دبائے۔

لوڈنگ......

اگلے صفحے کے لوڈ ہونے کا انتظار کرتے ہوئے اسی مضطرب انداز میں اس نے اُنگلی سے چہرے کے دائیں طرف پھسلتی لٹیں پیچھے کیں۔

چند سیکنڈ بعد صفحہ لوڈ ہو گیا تھا۔ وہ بے چینی سے چہرہ اسکرین کے قریب لائی تو سلکی بالوں کی چند لٹیں پھر سے شانے پہ پھسل کر آگے کو گریں۔

جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی، اس کی سیاہ آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔ لب ذرا سے کھل گئے اور پورا وجود بے یقینی میں ڈوب گیا۔ ڈھیر سارے لمحے لگے تھے، اسے خود کو یقین دلانے میں کہ جو وہ پڑھ رہی ہے، بالکل سچ ہے اور جیسے ہی اس کے ذہن نے یقین کی دھرتی کو چھوا، وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔

اس کا سیل فون سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سیل اُٹھایا اور جلدی جلدی کوئی نمبر ملانے لگی۔ رات کی مقدس خاموشی میں بٹنوں کی آواز نے ذرا سا ارتعاش پیدا کیا تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی۔

''ہیلو زارا؟'' شاید رابطہ مل گیا تھا، تب ہی وہ دبے دبے جوش سے چہکی۔ ''کیسی ہو؟ سو تو نہیں گئی تھیں؟ حیا بول رہی ہوں''۔

دوسری طرف اس کی دوست کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ لمحے بھر کو سننے کے لیے رُکی، پھر دھیرے سے ہنس دی۔

''ساری باتیں چھوڑو زارا! میرے پاس جو بڑی خبر ہے، وہ سنو!'' اب وہ عادتاً سیاہ بالوں کی ایک موٹی لٹ اُنگلی پہ لپیٹتی کہہ رہی تھی۔ ''اور تم یقین نہیں کرو گی، میں جانتی ہوں''۔

''ارے نہیں، داور بھائی کی شادی کے متعلق نہیں ہے''۔ دوسری جانب زارا نے کچھ کہا تو اس نے فوراً تردید کی۔ ''بلکہ یوں کرو، تم گیس کرو کہ میں تمہیں کیا بتانے والی ہوں''۔

اس نے ایک ہاتھ سے لیپ ٹاپ پرے کیا اور تکیہ نکال کر بیڈ کراؤن کے ساتھ سیدھا لگایا، پھر اس سے ٹیک لگا کر پاؤں سیدھے کر لیے۔ ساتھ ساتھ وہ نفی میں سر ہلاتی زارا کے کچے اندازوں کی تردید بھی کرتی جا رہی تھی۔

''نہیں، بالکل نہیں''۔

''ایسا تو ہے ہی نہیں''۔

''ارے میری شادی وغیرہ نہیں ہو رہی''۔

''جی نہیں، ارم کی بھی نہیں ہو رہی''۔

''سیریسلی زارا! تمہاری سوچ بس یہیں تک ہے۔ اب کان کھول کر سنو! تمہیں وہ اریسمس منڈس ایکسچینج پروگرام (Erasmus Mundus Exchange Programme) یاد ہے، جس کے لیے ہم نے اپلائی کیا تھا؟ کین یو بلیواٹ زارا! کہ مجھے یورپی یونین نے اسکالرشپ کے لیے سلیکٹ کرلیا ہے؟''

دوسری جانب زارا اتنی زور سے چیخی کہ موبائل کا اسپیکر آف ہونے کے باوجود اس کی چیخ سارے کمرے میں سنائی دی۔

''بالکل سچ کہہ رہی ہوں زارا! ابھی پندرہ منٹ پہلے مجھے یونیورسٹی کی طرف سے میل ملی ہے''۔

اس نے ساتھ ہی ایک ہاتھ سے پرے پڑے لیپ ٹاپ کا رُخ اپنی جانب موڑا اور سر آگے کر کے غور سے دوبارہ دیکھا۔

''ہاں، پندرہ منٹ پہلے، ٹھیک ساڑھے نو بجے سلیکشن کی میل آئی ہے۔ تم بھی فوراً چیک کرو، تم نے بھی اپلائی کیا تھا، تمہیں بھی میل آئی ہوگی''۔

وہ فون ایک ہاتھ سے پکڑے دوسرے سے بٹن دبا کر لیپ ٹاپ آف کرنے لگی۔

''نہیں، اسپین کی Deusto نے نہیں بلکہ ترکی کی سبانجی یونیورسٹی نے ہمیں سلیکٹ کیا ہے اور اب ہم ایک سمسٹر پڑھنے پانچ ماہ کے لیے استنبول جا رہے ہیں''۔

لیپ ٹاپ کی اسکرین اندھیر ہوئی تو اس نے اسے ہاتھ سے دبا کر بند کیا، پھر تار نکال کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

''ہاں، میں نے سبانجی کو نیٹ پہ دیکھا ہے۔ بہت خوب صورت یونیورسٹی ہے، مگر......''

وہ لمحے بھر کو خاموش ہوگئی۔ دوسری جانب سے غالباً استفسار کیا گیا تو وہ گویا ہوئی۔

''بس، ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے لیکن ہم اس کے بارے میں اپنی فیملیز کو آگاہ نہیں کریں گے''۔

دھیمی آواز میں بولتے ہوئے، اس نے گردن موڑ کر بند دروازے کو دیکھا۔ ''دراصل سبانجی میں لڑکیوں کے ہیڈ اسکارف پر پابندی ہے۔ اُدھر سر ڈھکنا منع ہے۔ گھر والوں کو بتا کر ٹنشن کرنے کی بجائے اس بات کو گول کر جانا۔ ویسے بھی ہم دونوں میں سے کوئی اسکارف نہیں لیتا''۔

اسی پل کھڑکی کے اس پار کچھ کھڑکا تھا۔ وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ قد آدم کھڑکیوں کے آگے بھاری پردے گرے تھے، البتہ پیچھے جالیاں کھلی تھیں۔ شاید اس کا وہم تھا۔ وہ سر جھٹک کر فون کی جانب متوجہ ہوگئی۔

''ابا نے مجھے کبھی اسکارف لینے یا ڈھکنے پر مجبور نہیں کیا، تھینک گاڈ...... ہاں ارم گھر سے باہر اسکارف لیتی ہے، اس کے ابو، تایا فرقان، ذرا سخت ہیں نا''۔ وہ پھر سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے، نیم دراز مگن سی بتانے لگی۔

''پرمیشن تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ابا اسپین جانے کی اجازت نہ دیتے مگر ترکی میں سین پھوپھو رہتی ہیں نا، سو وہ مان گئے تھے۔ ویسے بھی انہیں اپنی بیٹی پہ پورا بھروسا ہے''۔

پھر وہ چند لمحے ایئر پیس سے اُبھرتی اپنی دوست کی بات سنتی رہی۔ زارا خاموش ہوئی تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کل نہیں، داور بھائی کی مہندی پرسوں ہے، تم آرہی ہو نا؟''

''اور ہاں، میں اور ارم لہنگا پہن رہے ہیں''۔

''سارے کزنز بہت ایکسائیٹڈ ہیں، خاندان کی پہلی شادی ہے نا''۔

''اوکے تم اب جا کر میل چیک کرو، میں بھی سوتی ہوں، رات بہت ہوگئی ہے''۔ الوداعی کلمات کہہ کر اس نے موبائل کان سے ہٹایا اور تکیے پہ اُچھال دیا۔ پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر لاؤنج خاموشی میں ڈوبا تھا۔ حیا نے آہستہ سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ننگے پاؤں چلتی لاؤنج سے کچن کی طرف آئی۔ سیاہ لمبی قمیص اور سیاہ کھلے ٹراؤزر میں اس کا قد مزید دراز لگ رہا تھا۔

کچن میں اندھیرا پھیلا تھا۔ وہ دروازے کے قریب رُکی اور ہاتھ سے دیوار پہ سوئچ بورڈ ٹٹولا۔ بٹن دبنے کی آواز آئی اور ساری

بتیاں جل اٹھیں۔

اس نے آگے بڑھ کر فریج کا دروازہ کھولا اور پانی کی بوتل نکالنے کو جھکی۔ جھکنے سے ریشمی بال کندھوں سے پھسل کر سامنے کو آگرے۔ حیا نے نزاکت سے انگلی سے ان کو پیچھے کیا اور بوتل نکال کر سیدھی ہوئی، پھر کاؤنٹر پہ رکھے ریک سے شیشے کا گلاس اٹھایا اور بوتل اس میں انڈیلی۔ پانی کی ندی سی گلاس میں گرنے لگی۔ تب ہی اس کی نگاہ کاؤنٹر پہ رکھی کسی سفید چیز پہ پڑی۔ وہ جیسے چونک اٹھی، بوتل وہیں سلیب پہ رکھ کر اس طرف آئی۔

وہ سفید اور گلابی گلابوں کا بکے تھا، جس میں کہیں کہیں سبز پتے جھلک رہے تھے۔ ساتھ ہی ایک بند سفید لفافہ رکھا تھا۔

حیا نے بکے دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور چہرے کے قریب لا کر آنکھیں موند کے سونگھا۔ دل فریب تازگی بھری مہک اس کے اندر تک اتر گئی۔

پھول بالکل تازہ تھے، جیسے ابھی ابھی توڑے گئے ہوں۔ جانے کون لایا تھا ادھر؟

اس نے لفافہ اٹھایا اور پلٹ کر دیکھا۔ اس پہ اوپر کے بیچ و بیچ نمایاں سا "حیا سلیمان" لکھا تھا۔ پیچھے بھیجنے والے کا پتہ نہ تھا، البتہ کوریئر سروس کی مہر اور اسٹیکر لگے تھے۔ مہر پہ ایک روز قبل کی تاریخ تھی۔

اس کو کبھی کسی نے یوں پھول نہیں بھیجے تھے۔ کیا معاملہ تھا یہ بھلا؟

الجھتے ہوئے حیا نے لفافہ چاک کیا۔ اندر ایک موٹا کاغذ تھا۔ اس نے دو انگلیاں لفافے میں ڈال کر کاغذ پکڑا اور باہر نکالا۔

سفید کاغذ بالکل صاف تھا۔ نہ لکیر، نہ کوئی ڈیزائن۔ بس اس کے وسط میں انگریزی میں تین لفظ لکھے تھے۔

"Welcome to Sabanci"

وہ سناٹے میں رہ گئی۔

یہ کیا مذاق تھا؟ بھلا خط بھیجنے والے کو کیسے پتا کہ وہ سبانجی جا رہی ہے؟ خط پہ تو ایک روز قبل کی تاریخ تھی، جبکہ قبولیت کی وہ ای میل اسے ابھی پندرہ منٹ پہلے موصول ہوئی تھی۔ جو بات اسے آفیشلی بتائی ہی پندرہ منٹ قبل گئی تھی، وہ اس شخص کو ایک روز پیشتر کیسے معلوم ہوئی؟

اگر زارا کو اس نے خود ابھی نہ بتایا ہوتا تو وہ سمجھتی کہ یہ اس کی حرکت ہے اور یہ خط سبانجی یونیورسٹی کی طرف سے بھی نہیں آ سکتا تھا کیونکہ اس پہ ایک قومی سطح کی کوریئر کمپنی کی مہر لگی تھی، پھر کس نے بھیجا ہے یہ؟

پانی سے بھرا گلاس وہیں سلیب پہ چھوڑ کر، بکے اور لفافہ اٹھائے وہ الجھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

سہ پہر کی ٹھنڈی سی چھاؤں ہر سو چھائی تھی۔ وہ پرس کندھے سے لٹکائے، باریک ہیل سے چلتی پورچ میں کھڑی اپنی کار کی طرف آئی، جو کبھی تو اس کے بھائی روحیل کی تھی، مگر اس کے پڑھائی کی غرض سے امریکہ چلے جانے کے بعد حیا کی ملکیت تھی۔

اس نے چابی لاک میں گھمائی ہی تھی کہ گیٹ کے اس پار سے زارا آتی دکھائی دی۔ وہ دروازہ کھول کر مسکراتی ہوئی سیدھی ہوئی۔

"حیا! مجھے تو کوئی میل نہیں آئی۔" زارا نے ادھ کھلے گیٹ کو دھکیل کر اندر قدم رکھا۔ اس کے چہرے پہ اداسی تھی۔ وہ درمیانی شکل و صورت کی اسٹائلش سی لڑکی اور حیا کی ہم عمر تھی۔

"کوئی بات نہیں، ایک دو دن میں آ جائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم نے ساتھ ہی اپلائی کیا تھا، میرا سلیکشن ہو گیا ہے تو تمہارا بھی ہو جائے گا۔" حیا ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ آدھا کھولے کھڑے بتانے لگی۔

"مگر اسکالرشپ پروگرام کوآرڈینیٹر کے آفس کے باہر آج جو لسٹ لگی ہے، اس میں بھی میرا نام نہیں ہے۔"

"اور میرا؟"

"صرف تمہارا ہے، ہمارے ڈیپارٹمنٹ سے اور انوائرمینٹل سائنسز کی ایک لڑکی خدیجہ رانا کا ہے۔ میرا خیال ہے میرا سلیکشن ہی نہیں ہوا۔"

''اوہ''۔ اسے واقعتاً افسوس ہوا۔ رات فون کال کے بعد اس کی زارا سے اب بات ہو رہی تھی۔

''خیر، تم کہیں جا رہی تھیں؟'' زارا چہرے پہ دوبارہ بشاشت لاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ہاں، مارکیٹ جا رہی تھی ارم کے ساتھ۔ داور بھائی کی مہندی کا فنکشن ہے اور میرے لہنگے کے ساتھ کی ہائی ہیلز گم ہو گئی ہے۔ شاید کام والی اُٹھا کر لے گئی ہے۔ اب نئے جوتے لینے پڑیں گے۔ تم چلو گی؟'' وہ گاڑی سے کہنی ٹکائے تفصیلاً بتانے لگی۔ اس وقت وہ ہلکی آسمانی لمبی قمیص اور ٹنگ چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھی۔ قمیص کا دامن ٹخنوں سے ذرا اوپر تک تھا۔ ہم رنگ دوپٹہ گردن کے گرد لپٹا تھا، بال کمر پہ گر رہے تھے اور عادتاً آنکھوں میں گہرا کاجل ڈالا تھا۔

''ہاں۔ چلو پھر جلدی نکلتے ہیں''۔ زارا فوراً تیار ہو گئی اور فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھی۔

''ارم کو بھی لینا ہے''۔ حیا نے اندر بیٹھ کر دروازہ بند کیا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔

''ویسے تمہارے سخت سے تایا ارم کو یوں تمہارے ساتھ شاپنگ پہ جانے کی اجازت دے دیتے ہیں؟''

ارم ان دونوں سے جونیئر تھی اور اس کا ڈیپارٹمنٹ بھی دوسرا تھا، سو زارا کی اس سے زیادہ ملاقات نہ تھی۔

''ان کی سختی صرف اسکارف تک ہے۔ ویسے بہت اچھے ہیں وہ''۔

وہ کار باہر گیٹ پہ لے آئی۔ ارم کا گھر حیا کے ہمسائے میں تھا۔ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار میں آنے جانے کا راستہ بھی موجود تھا لیکن اسے جب بھی ارم کو پک کرنا ہوتا وہ اس کے گیٹ پہ ہارن دیا کرتی تھی۔ اب بھی زور کا ہارن دیا تو چند ہی لمحے بعد ارم باہر نکل آئی۔

کاسنی لمبی قمیص اور ٹراؤزر میں ملبوس، ہم رنگ دوپٹہ پھیلا کر سامنے لیے، چہرے کے گرد میچنگ کاسنی اسکارف لپیٹے وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پچھلی سیٹ کے دروازے تک آئی تھی۔

''ہیلو حیا! ہیلو زارا!'' بے تکلفی سے چہکتے ہوئے اس نے اندر بیٹھ کر دروازہ بند کیا۔ حیا کے ساتھ آؤٹنگ کے پروگرام اسے یونہی خوش کیا کرتے تھے۔

''کیسی ہو ارم! تم سے تو ملاقات ہی نہیں ہو پاتی''۔ زارا نے ترچھی ہو کر رُخ پیچھے کو کیا۔

''آپ کا ڈیپارٹمنٹ دور پڑتا ہے نا، تب ہی، اور ہاں، حیا بتا رہی تھی آپ لوگوں کا ترکی کا سلیکشن آ گیا ہے؟''

''میں سلیکٹ نہیں ہوئی، حیا ہو گئی ہے۔ خیر، اس میں کوئی بہتری ہو گی۔ تم نے نہیں اپلائی کیا تھا؟''

''ابا اجازت دیتے تب نا!'' وہ اُداس ہو گئی۔

''ویسے پیرنٹس کو اتنا سخت نہیں ہونا چاہیے''۔ زارا نے کہا۔

حیا نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا کہ کہیں پہلے سے احساسِ کمتری میں مبتلا ارم مزید اُداس نہ ہو جائے مگر زارا گردن موڑے پیچھے دیکھ رہی تھی اور ارم...... ارم حسبِ توقع اُداس ہو گئی تھی۔

''ابا بھی پتا نہیں کس پہ چلے گئے۔ اتنی گرمی میں اسکارف لینا آسان ہوتا ہے کیا؟ اور پھر کل مہندی کے لہنگے کی بھی آدھی آستین نہیں بنانے دی مجھے۔ حیا کی بھی تو آدھی آستین ہیں۔ اتنی اچھی لگتی ہیں، مگر ابا ذرا بھی سلیمان چچا کی طرح نہیں ہیں''۔

''ارم! تمہیں آج کیا لینا ہے؟ میں نے تو جوتے لینے ہیں''۔ اس نے کوفت چھپاتے ہوئے بات کا رُخ بدلا۔ ارم کا ہر وقت کا شکایتی رویہ اسے بے حد برا لگتا تھا۔

''چوڑیاں لینی ہیں، مگر لہنگے کے بلاؤز کی فل سلیوز کے ساتھ چوڑیاں اچھی بھی نہیں لگیں گی''۔ وہ منہ بسورے پھر سے شروع ہو گئی تو حیا نے سر جھٹک کر سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔

عاطف اسلم کا گیت بلند آواز سے گونجنے لگا تو ارم کو خاموش ہونا پڑا۔

جناح سپر مارکیٹ پہنچ کر ارم تو چوڑیاں ڈھونڈنے نکل گئی، جبکہ وہ دونوں میٹرو شوز پہ آ گئیں۔

''یہ گولڈن والا جو تیسرے نمبر پہ رکھا ہے، یہ دکھائیں''۔ بہت دیر بعد ایک اونچی ہیل اس کی نظر میں جچی تھی۔

''یہ والا میم؟'' سیلز مین نے پورا جوڑا نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ وہ زمین پہ پنجوں کے بل بیٹھا تھا جبکہ حیا اور زارا سامنے کاؤچ پہ بیٹھی تھیں۔

''پہنا دوں میم؟'' بہت مؤدب اور شائستہ انداز میں پوچھتے ہوئے سیلز مین نے ہاتھوں میں پکڑا جوتا اس کے پاؤں کے قریب کیا، جو خوب صورت ہیلز میں مقید تھے۔

''میرے ہاتھ نہیں ٹوٹے ہوئے، میں خود پہن سکتی ہوں۔''

''جی شیور، یہ لیجئے'' سیلز مین نے مسکرا کر جوتا اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اسے یوں پکڑ رکھا تھا کہ اسے تھامتے ہوئے حیا کی انگلیاں لازماً اس کے ہاتھ سے مس ہوتیں۔

''سامنے رکھ دو، میں اُٹھا لوں گی''۔ اس کے روکھے لہجے پہ سیلز مین نے زیرِ لب کچھ گنگناتے ہوئے جوتا سامنے رکھ دیا۔

پھر بل کی ادائیگی کے بعد کاؤنٹر پہ کھڑے لڑکے نے بقیہ رقم اس کی طرف بڑھائی تو حیا نے دیکھا، چند نوٹوں کے اوپر پانچ کا سکہ رکھا تھا اور لڑکے نے سکے کو یوں پکڑ رکھا تھا جیسے سیلز مین نے جوتے کو..... تا کہ اسے تھامتے وقت لازماً اس کا ہاتھ ٹکرائے۔

''شکریہ''۔ حیا نے نوٹ کنارے سے پکڑ کر کھینچے، سکہ لڑکے کے ہاتھ میں رہ گیا۔

''میم! آپ کا سکہ!'' لڑکے نے فاتحانہ انداز میں سکہ اس کی جانب بڑھایا کہ اب تو لازمی پکڑے گی اور......

''یہ سامنے رکھے صدقے کے باکس میں ڈال دو''۔ وہ بے نیازی سے شاپر تھامے پلٹ گئی۔ زارا نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

''اس لڑکے کی شکل دیکھنے والی تھی حیا!''

''دل تو کر رہا تھا اس کی اسی شکل پہ شاپ کے سارے جوتے دے ماروں، معلوم نہیں ہمارے مردوں کی ذہنیت کب بدلے گی۔ یوں گھورتے ہیں جیسے کبھی لڑکی دیکھی نہ ہو''۔

وہ تنفر سے ناک سکوڑتی، غصے میں بولتی زارا کے ساتھ سیڑھیاں اُتر رہی تھی جب قریب سے آواز آئی۔

''تو اتنا بن سنور کر باہر نہ نکلا کرو بی بی!'' وہ چونک کر آخری سیڑھی پہ ٹھہر گئی۔ وہ ایک معمر خاتون تھیں، بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی، ناگواری بھری نگاہ اس پہ ڈال کر آہستہ آہستہ اوپر زینے چڑھ رہی تھیں۔

''ایک تو لوگوں کو راہ چلتے تبلیغ کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے''۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہتی مگر زارا اس کو کہنی سے تھامے وہاں سے لے آئی۔ تب ہی ارم سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس کا سینے پہ پھیلا دوپٹہ اب سمٹ کر گردن تک آ گیا تھا۔ اس نے کچھ خاص شاپنگ نہیں کی تھی۔ شاید وہ صرف ان کے ساتھ آؤٹنگ پہ آئی تھی۔

میٹرو سے وہ ''اسکوپ'' چلی آئیں کہ کچھ ہلکا پھلکا کھا لیں۔ رات کی دعوت تو تایا فرقان کی طرف تھی، جو وہ بیٹے کی شادی کے لیے جمع ہوئے خاندان والوں کے لیے دے رہے تھے۔

''میرے لیے پائن ایپل سلش slush منگوا لینا، میں ذرا بیکری سے کچھ لے لوں''۔ ارم جھٹ باہر کو لپکی۔ حیا نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنی جانب کا شیشہ نیچے کیا۔ سرد ہوا کا تھپیڑا تیزی سے اندر آیا تھا مگر اتنی سردی میں سلش پینے کا اپنا مزا تھا۔

وہ پارکنگ لاٹ میں موجود تھیں اور ٹھنڈی ہوا نے ساری جگہ کو گھیر رکھا تھا۔ مغرب گہری ہو چکی تھی اور ہر طرف اندھیرا سا تھا۔

''ارم خاصی کمپلیکسڈ لگتی ہے نہیں؟'' ارم دور ہو گئی تو زارا اس کی طرف گھومی۔

''اور تم اس کے انہی کمپلیکسز کو ہوا دے رہی تھیں''۔ وہ اُلٹا اسی پہ خفا ہوئی۔

''تایا فرقان صرف اسکارف کی سختی کرتے ہیں۔ وہ بس اسی بات پہ خود ترسی کا شکار ہے اور تم بھی اس کا ساتھ دے رہی تھیں''۔

''میں نے سوچا کہ بے چاری.....''

''نہیں ہے وہ بے چاری، اب اس کو بھی یہی سمجھانا کہ خواہ مخواہ کی خود ترسی سے نکل آئے''۔

ویٹر ہاتھ میں کارڈ پکڑے حیا کی طرف کھلے شیشے کے باہر آ چکا تھا۔

"تمہیں یاد ہے زارا! پچھلے سال جب یونیورسٹی والوں نے ہمیں ترکی کے ٹرپ کی آس دلائی تھی اور آخر میں پہنچ کر سارا پروگرام ہی کینسل کر دیا تھا"۔

آرڈر لکھوا کر وہ شیشہ اوپر چڑھاتے ہوئے یاد کر کے کہنے لگی۔

"میں تو اتنی مایوس ہوگئی تھی کہ سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی ترکی جا سکوں گی"۔ اس کی آواز میں آس جڑنے کی خوشی در آئی تھی۔

زارا اور وہ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ایل ایل بی آنرز (شریعہ اینڈ لاء) کے پانچویں سال میں تھیں۔ ان کا ساتواں سمسٹر درمیان میں تھا، جب یورپی یونین کی اسپانسرڈ اسکالرشپ کا اعلان ہوا۔ جس کے تحت یورپ اور ایشیاء کی یونیورسٹیز کے مابین طلباء کا تبادلہ ہونا تھا۔ یوں چند ماہ کے لیے یہاں سے کچھ طلباء یورپ کی یونیورسٹیز جائیں گے اور ایک سمسٹر پڑھ کر واپس آ جائیں گے۔ جب یورپین یونیورسٹیز میں درخواست دینے کی باری آئی تو اسے ترکی کی سبانجی یونیورسٹی کا فارم سب سے آسان لگا، مگر پھر ایک ہسپانوی یونیورسٹی میں بھی ساتھ ہی اپلائی کر دیا اور اب بالآخر سبانجی نے اسے منتخب کر لیا تھا۔

اِدھر ساتواں سمسٹر پورا کر کے اسے فروری میں پانچ ماہ کے لیے ترکی جانا تھا (ابھی دسمبر چل رہا تھا)، جہاں اس کے اپنے مضامین (شریعہ اینڈ لاء) تو نہ تھے کہ ترکی کا قانون پاکستان کے قانون سے مختلف تھا، سو پانچ ماہ کے لیے وہ اپنی مرضی سے کوئی بھی مضمون پڑھ سکتی تھی۔ پھر واپس پاکستان آ کر اسے ایل ایل بی کا آٹھواں سمسٹر شروع کرنا تھا۔

"کتنا مزا آئے حیا! اگر کوئی رومانٹک سا، ہینڈسم سا، ہم سفر تمہیں مل جائے تو تمہارا سفر کتنا خوب صورت ہو جائے گا"۔

"ہم سفر کوئی نہیں ملنے والا، کیونکہ پاکستان سے سبانجی صرف ہم دو لڑکیاں ہی جا رہی ہیں اور پھر ہم ٹھہرے آل ویمن یونیورسٹی میں پڑھنے والے"۔

"وہ خدیجہ رانا جو تمہارے ساتھ جا رہی ہے، اس سے کوئی بات ہوئی؟"

ویٹر نے شیشہ بجایا تو حیا چونکی، پھر شیشہ نیچے کرنے لگی۔

"نہیں۔ خدیجہ رانا کو تو میں جانتی بھی نہیں ہوں۔ معلوم نہیں کون ہے"۔ اس نے سلش کے گلاس پکڑے۔ زارا کا اسے تھمایا اور ارم کا ڈیش بورڈ پہ رکھا، پھر اپنا گلاس لبوں سے لگایا۔ ٹھنڈا سا سلش اندر تک اترتا گیا۔ بے دھیانی میں وہ شیشہ بند کرنا کب بھولی، اسے علم نہ ہو سکا۔

دفعتاً زارا کا موبائل بجا۔ زارا نے سپ لیتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو اماں! جی؟ کیا؟ آواز خراب ہے، ایک منٹ......" زارا کے فون پہ غالباً سگنل ٹھیک نہیں آ رہے تھے۔ وہ سلش کا گلاس ہاتھ میں پکڑے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

حیا اپنے گلاس سے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے زارا کو ونڈ اسکرین کے پار سے دیکھتی رہی۔ اب وہ دور ایک درخت کے ساتھ کھڑی فون پہ بات کر رہی تھی۔

"ہیلو مائی لیڈی"۔ کوئی ایک دم سے اس کے بہت قریب آ کر بولا۔ وہ ڈر کر اچھلی۔ ذرا سا جوس کپڑوں پہ چھلک گیا۔

کھلی کھڑکی پہ ایک عورت مسکراتے ہوئے جھکی ہوئی تھی۔ میک اپ سے اٹا چہرہ، چمکتا ہوا آئی شیڈو، بھڑکتی ہوئی سرخی، بالوں کا جوڑا، چھم چھم کرتے کپڑے...... وہ عورت نہیں تھی مگر وہ مرد بھی نہیں تھا۔

"کیسے ہو جی!" وہ اس کی کھڑکی پہ پورا جھکا کھڑا تھا۔ گلاس اس کے ہاتھ میں کانپا، بے اختیار اس نے شیشہ اوپر چڑھانا چاہا مگر اس کے ہاتھ درمیان میں تھے۔

"ڈرو نہیں باجی جی! میں آپ کی دوست ہوں، ڈولی کہتے ہیں مجھے"۔

"ہٹو، ہٹو، جاؤ" وہ گھبرا گئی۔ خواجہ سرا کے وجود سے سستے پرفیوم کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی، اسے کراہیت سی آئی۔

"ذرا بات تو سنو"۔ اس نے اپنا چہرہ مزید جھکایا اور اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا، حیا نے سلش کا بھرا ہوا گلاس اس کے منہ پہ

اُلٹ دیا۔ ٹھنڈی ٹھار برف چہرے پہ پڑی تو وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔ اس نے پھرتی سے شیشہ اوپر چڑھا لیا۔

"سنو جی....." وہ مسکرا کر چہرہ صاف کرتا، شیشہ بجانے لگا۔ بند شیشے کے باعث اس کی آواز ہلکی ہو گئی تھی اور اب وہ کوئی گیت گنگنانے لگا تھا۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور گاڑی وہاں سے نکال لائی۔ بیکری کے داخلی دروازے کے سامنے کار لا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

وہاں درختوں کے ساتھ وہ ڈولی نامی خواجہ سرا ابھی تک کھڑا تھا۔ وہ اس کے پیچھے نہیں آیا تھا اور اب گا بھی نہیں رہا تھا۔ بس خاموش، گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے بے اختیار جھرجھری سی آئی۔

"کہاں رہ گئیں یہ دونوں؟" اس نے جھنجھلا کر ہارن پہ ہاتھ رکھ دیا، پھر گردن موڑ کر دوبارہ دیکھا۔ وہ ابھی تک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ارم اور زارا کو ڈراپ کر کے وہ سیدھی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ ڈنر کا وقت ہونے والا تھا۔ اس نے یہ کپڑے ڈنر کی مناسبت سے ہی پہنے تھے، مگر جوس چھلکنے سے ذرا سا داغ پڑ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے دوپٹے کا وہ حصہ دھو کر اسے استری کیا۔ اسے رہ رہ کر وہ خواجہ سرا یاد آ رہا تھا۔

اس برادری کے لوگ اکثر آ کر پیسے مانگتے تھے مگر ایسی حرکت تو کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ اس خواجہ سرا کی عجیب نگاہیں اور انداز..... اسے پھر سے جھرجھری آئی۔

پھر جب اپنی تیاری سے مطمئن ہو کر وہ باہر آئی اور لابی کا دروازہ کھولا تو پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا، وہ چونک گئی۔

دروازے کے ساتھ فرش پہ سفید ادھ کھلے گلابوں کا بکے پڑا تھا۔ وہ جھکی اور بکے اُٹھایا۔ ساتھ میں ایک بند لفافہ بھی تھا۔ وہ دونوں چیزیں اُٹھا کر سیدھی ہوئی اور لفافہ کھولا، جس پہ "حیا سلیمان" لکھا تھا۔

اندر وہی سفید، بے سطر، چوکور کاغذ تھا۔ اس کے وسط میں اردو میں لکھا تھا۔

"اُمید کرتا ہوں کہ آپ کا آج کا ڈنر اچھا گزرے گا"۔

اس نے لفافہ پلٹ کر دیکھا۔ کہیں بھی کچھ اور نہیں لکھا تھا، بس لفافے پہ گزشتہ روز کی مہر لگی تھی۔ یہ کون تھا اور کیوں اسے پھول بھیج رہا تھا؟ وہ بکے اور خط کمرے میں رکھ کر سارے معاملے پہ اُلجھتی باہر آئی۔

تایا فرقان کے گھر خوب چہل پہل لگی تھی۔ لاؤنج میں سب کزنز بیٹھے تھے۔ ایک طرف خواتین کا گروہ خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ مرد حضرات یقیناً ڈرائنگ روم میں تھے۔ ان کے خاندان میں کزنز کی بے تکلفی کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

تایا فرقان چاروں بہن بھائیوں میں سب سے سخت تھے اور ان کی سختی ارم کے اسکارف لینے اور گھر سے باہر لڑکوں سے بات کرنے پہ تھی۔ ارم اور باقی کزنز بھی عموماً اپنے کزنز کے سوا باہر کے کسی لڑکے سے بات نہیں کرتی تھیں۔ حیا اور ارم تو پڑھتی بھی آل ویمن یونیورسٹی میں تھیں۔ ہاں دوسرے چچا اور خود سلیمان صاحب مستقبل میں اپنے بچوں کی شادیاں یقیناً مکسڈ گیدرنگ میں رکھیں گے، یہ سب کو معلوم تھا۔

ان کا خاندان زیادہ بڑا نہ تھا۔ وہ لوگ تین بھائی اور ایک بہن تھے۔ تایا فرقان سب سے بڑے تھے۔ داور، فرخ، اور ارم ان کے بچے تھے۔ فرخ میڈیکل کر چکا تھا اور آج کل پولی کلینک سے ہاؤس جاب کر رہا تھا، وہ حیا سے تین سال بڑا تھا۔ سبیح، فرخ سے سال بھر چھوٹا تھا اور ایم بی اے کے بعد جاب کر رہا تھا۔ ارم حیا سے سال بھر چھوٹی تھی۔ آج کل سب سے بڑے داور کی شادی تیار تھی۔

تایا فرقان کے بعد سلیمان صاحب تھے۔ حیا ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور روحیل اکلوتا بیٹا۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکہ میں ہوتا تھا۔ اب ان کے گھر میں سلیمان صاحب، فاطمہ بیگم اور حیا، بس یہی تینوں تھے۔

پھر زاہد چچا تھے۔ ان کی بڑی دو جڑواں بیٹیاں مہوش اور سحرش تھیں، پھر بیٹا رضا انجینئر تھا۔ سب سے چھوٹی بیٹی ثنا او لیول کر رہی تھی۔

اس وقت سوائے روحیل کے جو امریکہ میں تھا اور داور بھائی کے جو غالباً ڈرائنگ روم میں تھے، باقی تمام لڑکے لڑکیاں لاؤنج میں موجود تھے۔ لڑکیاں کارپٹ پہ دائرہ بنا کر بیٹھی تھیں۔ ارم کے ہاتھ میں ڈھولک تھی۔ اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر کندھے پہ آ گیا تھا۔ (اگر ابھی تایا فرقان آ جاتے تو وہ فوراً اس کو سر پہ لے لیتی) اور وہ مہوش، سحرش اور ثنا کے ہمراہ سُر ملا رہی تھی جبکہ رضا، فرخ اور سمیع اوپر کرسیوں پہ بیٹھے مذاقاً لڑکیوں کی طرف فقرے اُچھال کر رہے تھے۔

''ہیلو ایوری ون!''

وہ سینے پہ ہاتھ باندھے چلتی ہوئی ان کے قریب آ کر رُکی تو سب کی نگاہیں اس کی جانب اُٹھیں۔ سپید چہرے کے دونوں اطراف میں گرتے سیدھے سیاہ بادل اور بڑی بڑی کاجل سے لبریز آنکھیں...... وہ تھی ہی اتنی حسین کہ ہر اُٹھی نگاہ میں ستائش اُمڈ آئی۔

''حیا! کیسی ہو؟''

''آؤ چلو، ان لڑکوں کو ہراتے ہیں''۔

''آؤ بیٹھو نا!''

بہت سی آوازیں اس سے ٹکرائیں مگر اس نے بے نیازی بھری مسکراہٹ سے شانے اُچکائے۔

''پہلے میں صائمہ تائی کی کچن میں ہیلپ کروا دوں''۔ اس نے ارم کی امی کا نام لیا، جن کو اس نے آتے ہوئے اُٹھ کر کچن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ صائمہ تائی نے یقیناً اس کو آتے نہیں دیکھا تھا ورنہ اسے بلوا لیتیں۔ ارم سے زیادہ سمجھ دار تو بقول ان کے حیا تھی۔ صائمہ تائی کے پیچھے زاہد چچا کی بیگم عابدہ چچی بھی چلی گئی تھیں۔ اب صوفے پہ حیا کی امی فاطمہ بیگم تنہا بیٹھی تھیں۔

''اماں! میں ذرا صائمہ تائی کے ساتھ ہیلپ کروا دوں''۔ ان کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے اپنی بات دُہرائی تو انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔

وہ مطمئن سی آگے بڑھ گئی۔ راہداری پار کر کے کچن کے دروازے کی سمت بڑھی ہی تھی کہ صائمہ تائی کی تیز آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''جیسے میں جانتی ہی نہیں ہوں کہ یہ سارے رنگ ڈھنگ کس لیے ہوتے ہیں، ایک میرے ہی بیٹے ملے ہیں اس کو پاگل بنانے کے لیے''۔

وہ بے اختیار دو قدم پیچھے دیوار سے جا لگی۔ یہ صائمہ تائی کس کی بات کر رہی تھیں؟

''تبھی میں کہوں بھابھی! کہ رضا کیوں ہر وقت حیا، حیا کرتا ہے''۔ وہ عابدہ چچی تھیں۔ اپنے نام پہ وہ چونک سی گئی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''پچھلی دفعہ جب ہم سلیمان بھائی کے گھر کھانے پہ آئے تھے تو کیسے نک سک سے تیار پھر رہی تھی، تب سے رضا میرے پیچھے پڑا ہے کہ حیا کا رشتہ مانگیں''۔

''اس لڑکی کو لڑکوں کو متوجہ کرنے کا فن آتا ہے عابدہ! کتنی مشکل سے داور کے دل سے اس کا خیال نکالا تھا، میں نے اور فرقان نے۔ وہ تو اَڑ ہی گیا تھا کہ شادی کرے گا تو صرف حیا سے، مگر جب فرقان نے سختی کی کہ بھلا ایسی بے پردہ اور آزاد خیال لڑکی کو اپنی بہو بنا کر ہم نے اپنی آخرت بگاڑنی ہے کیا، تب کہیں جا کر وہ مانا، مگر اب فرخ...... کیا کروں اس لڑکے کا۔ یہ ابھی بھی اس طرح کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آ جائے گی اور فرخ پھر اس کے جانے کے بعد ضد پکڑ لے گا۔ اب میری ارم بھی تو ہے، مجال ہے کہ سر پہ دوپٹہ لیے بغیر گھر سے نکلے''۔

صائمہ تائی فخر سے کہہ رہی تھیں اور وہ دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بمشکل دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اسے لگا اگر اس نے مزید کچھ سنا تو اس کے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ بدقت اپنے وجود کو سنبھالتے وہ واپس پلٹ آئی۔

کسی بات پہ ہنستے ہوئے فرخ کی نگاہ اس پہ پڑی، جو راہداری سے چلی آ رہی تھی تو اس کی ہنسی تھم گئی، وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ قبول صورت سا فرخ جس کی رنگت مِڈ روٹین کے باعث مزید سنولا گئی تھی مگر مسئلہ اس کی واجبی شخصیت یا حیا کی بے پردگی کا نہ تھا، اصل بات تو وہ سب جانتے تھے۔ پھر بھلا اس کے بارے میں رضا یا فرخ نے سوچا بھی کیسے؟

وہ ایک سپاٹ نگاہ فرخ پہ ڈال کر چپ چاپ فاطمہ بیگم کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی۔

"تمہیں کیا ہوا؟" انہوں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں اماں!" وہ بدقت خود کو نارمل کر پائی۔ فاطمہ مطمئن ہو گئیں اور وہ صائمہ تائی کے بارے میں سوچنے لگی، جن کا "حیا میری جان" کہتے منہ نہ تھکتا تھا اور تایا فرقان کے لیے تو وہی بڑی بیٹی تھی، لیکن اندر سے ان لوگوں کے ایسے خیالات ہوں گے، وہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اور وہ پھول؟ وہ بھی رضا یا فرخ میں سے ہی کسی نے بھیجے ہوں گے، مگر کل رات جب پہلی دفعہ پھول آئے تھے، تب تو فرخ نائٹ ڈیوٹی پہ تھا اور رضا تھا تو اسلام آباد میں ہی، مگر ان دونوں میں سے کسی کو اس کے سبانجی کے سلیکشن کے بارے میں کیسے علم ہوا؟ شاید جب وہ زارا کو فون پہ بتا رہی تھی، تب کھڑکی کے باہر کچھ کھڑکا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، یقیناً اس نے کھڑکی کے باہر سے ساری بات سن لی ہو گی اور سن کر ہی وہ خط لکھ کر پھولوں کے ساتھ ادھر رکھا ہو گا، مگر...... اس پہ تو کوریئر کی ایک روز قبل کی مہر تھی۔ شاید اس نے کوئی جعلی مہر استعمال کی ہو، مگر اتنے جھمیلوں میں فرخ اور رضا جیسے جاب والے مصروف بندے کیوں پڑیں گے بھلا؟

اس کا دل کہتا تھا، یہ نہ فرخ ہے، نہ رضا بلکہ کوئی اور ہے۔ خیر، جہنم میں جائے وہ جو بھی ہے، ان دونوں کا دماغ تو ابھی ٹھیک کرتی ہوں۔ وہ تیزی سے اُٹھ کر لڑکے لڑکیوں کے گروپ کے پاس چلی آئی۔

"ارم!" سامنے کھڑے کھڑے اس نے مخصوص بے نیازی سے سینے پہ ہاتھ باندھے ارم کو پکارا تو سب رُک کر اسے دیکھنے لگے۔

"کیا؟"

"تم لوگوں نے سبین پھپھو کو شادی کا کارڈ بھیجا تھا ترکی؟" انکھیوں سے اس نے فرخ اور رضا کے چہروں کو دیکھا تھا۔ وہ دونوں چونکے تھے۔ اور دونوں کو ہی اس کی بات پسند نہیں آئی تھی جیسے۔

"پھپھو کا کارڈ سلیمان چچا کو دیا تھا، انہوں نے بھجوا دیا ہو گا اور ہاں، پھپھو کو ابا نے فون کر دیا تھا، کیا وہ آئیں گی؟"

"آنا تو چاہیے، آخر قریبی رشتہ ہے، تم سے نہ سہی، ہم سے تو ہے۔" اس نے قریبی رشتہ پہ زور دے کر ایک جتاتی نظر فرخ اور رضا پہ ڈالی۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

پھر کھانے کے وقت صائمہ تائی نے سب سے پہلے اسے بلایا۔

"حیا، میری جان! یہ ارم کسی کام کی نہیں ہے، تم سمجھ دار ہو، ٹیبل پہ تم نے خیال رکھنا ہے کہ جیسے کوئی ڈش آدھی ہو، فوراً ظفر (کک) کو اشارہ کرنا، ٹھیک؟"

"شیور تائی! میں خیال کروں گی"۔ وہ بدقت مسکراتی ہوئی سرو کرنے لگی۔

چند منٹ بعد سب ڈائننگ ہال میں کھڑے اپنی اپنی پلیٹوں میں کھانا نکال رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل کے اطراف سے کرسیاں ہٹا کر ایک دیوار کے ساتھ لگا دی گئی تھیں، تا کہ سب اپنی مرضی سے کھانا نکال کر ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے کھاتے رہیں۔

"تایا جان! آپ نے سلاد نہیں لیا"۔ وہ رشین سلاد سے بھرا شیشے کا بڑا پیالا اُٹھائے تایا فرقان اور سلیمان صاحب کے پاس آئی، جو اپنے دھیان میں محوِ گفتگو تھے، اس کے پکارے پر چونکے۔

"تھینک یو بیٹا!" تایا فرقان مسکرا کر چمچے سے سلاد اپنی پلیٹ میں نکالنے لگے۔ وہ شلوار کرتے میں ملبوس تھے۔ کندھوں پہ شال تھی اور بارُعب چہرے پہ مونچھیں۔

سلیمان صاحب ان کے برعکس کلین شیو، ڈنر سوٹ میں ملبوس، خاصے اسمارٹ اور ہینڈسم لگ رہے تھے۔ دونوں کی سوچ بھی اپنے حلیوں کی مانند تھی۔

"ابا! آپ بھی لیں نا"۔

"سلیمان! تم نے سبین کو کارڈ پوسٹ کر دیا تھا؟" تایا کو اچانک، شاید اس کی شکل دیکھ کر یاد آیا۔

سلیمان صاحب کا چمچے میں سلاد بھرتا ہاتھ ذرا سست ہوا اور چہرے پہ کڑواہٹ پھیل گئی۔ بہت آہستہ آہستہ سے انہوں نے سلاد

سے بھرا چمچہ اپنی پلیٹ میں پلٹا۔

"کر دیا تھا"۔ ان کے لہجے میں عجب کاٹ تھی جو حیا کے لیے نئی تھی۔

"ابا! سبین پھوپھو شادی پہ آئیں گی؟" وہ پوچھے بنا رہ نہ سکی۔

"کل مہندی ہے، آنا ہوتا تو اب تک آ گئی ہوتی۔ تیس سالوں میں جو عورت صرف چند دفعہ ملنے آئی ہو، وہ اب بھی نہ آئے تو بہتر ہے"۔

حیا تو کیا، فرقان تایا بھی دنگ رہ گئے۔

"سلیمان! کیا ہوا ہے؟"

"تھینک یو بیٹا!" جواب دینے کی بجائے سلیمان صاحب نے اسے مخاطب کیا تو وہ "اب تم جاؤ" کا اشارہ سمجھ کر سر جھکائے وہاں سے چلی آئی۔ بہت آہستہ سے سلاد کا پیالا میز پہ رکھا اور اپنی آدھی بھری پلیٹ اُٹھائی، مگر اب کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

یہ ابا کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ پھپھو کے بارے میں ایسے گفتگو کیوں کر رہے تھے؟ پھر وہ رہ نہیں سکی۔ اپنی پلیٹ لیے اس ستون کے پیچھے آ کھڑی ہوئی جس کی دوسری جانب تایا اور ابا کھڑے تھے۔ بظاہر اپنی پلیٹ پہ سر جھکائے، اس کے کان ان ہی کی طرف لگے تھے۔

"حیا کے لیے عمیر لغاری نے اپنے بیٹے کا پروپوزل دیا ہے"۔ سلیمان صاحب اپنے دوست اور اپنی کمپنی کے شیئر ہولڈر کا نام لے کر کہہ رہے تھے اور اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ لرز گئی، دل سہم اُٹھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" تایا فرقان ششدر رہ گئے تھے۔

"بھائی! اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ ولید اچھا لڑکا ہے، کل مہندی پہ آئے گا تو آپ کو ملواؤں گا۔ سوچ رہا ہوں، حیا سے پوچھ کر ہاں کر دوں"۔

"مگر...... مگر سلیمان! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا بھائی!"

"تم حیا کی شادی یوں کیسے کر سکتے ہو؟"

"باپ ہوں اس کا، کر سکتا ہوں، فاطمہ بھی راضی ہے اور مجھے یقین ہے کہ حیا کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا"

"اور جہان...... جہان کا کیا ہو گا؟"

"کون جہان؟" سلیمان صاحب یکسر انجان بن گئے۔

"تمہارا بھانجا، سبین کا بیٹا جہان، جس سے تم نے حیا کا نکاح کیا تھا، تم کیسے بھول سکتے ہو؟"

جواباً سلیمان صاحب نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"وہ اکیس سال پرانی بات ہے اور حیا اب بائیس سال کی ہو چکی ہے۔ بے وقوفی کی تھی میں نے کہ سبین پر اعتبار کر کے اپنی بچی کا نکاح اس کے بیٹے سے کر دیا تھا۔ کیا ان اکیس برسوں میں کبھی سبین نے مڑ کر پوچھا کہ اس نکاح کا کیا بنا؟ یا کیا بنے گا؟ زیادہ سے زیادہ وہ چھ ماہ میں ایک فون کر لیتی ہے اور تین منٹ بات کر کے رکھ دیتی ہے۔ آپ کو واقعی لگتا ہے کہ وہ لوگ اس رشتے کو قائم رکھنا چاہتے ہیں؟"

"مگر سبین تو سکندر کی وجہ سے، تم جانتے ہو وہ اُلٹے دماغ کا شخص......"

"میں کیسے مان لوں کہ صرف اپنے مغرور اور بد دماغ شوہر کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کا نکاح بھول سکتی ہے؟ اتنے برس بیت گئے، اس نے پھر کبھی رشتے یا شادی کی بات منہ سے نہیں نکالی۔ میں اس سے کیا اُمید رکھوں؟"

"مگر جہان تو اچھا لڑکا ہے، تم اس سے ملے تو تھے پچھلے سال جب تم استنبول گئے تھے"۔

"جی...... جہان سکندر...... اچھا لڑکا...... مائی فٹ!" انہوں نے تلخی سے سر جھٹکا۔

"اس کے تو مزاج ہی نہیں ملتے۔ وہ ترکی میں پیدا ہوا ہے، اس نے کبھی پاکستان کی شکل نہیں دیکھی۔ نہ اسے اُردو آتی ہے، نہ پنجابی۔ کبھی ان تمام برسوں میں اس نے اپنے کسی ماموں کا حال پوچھا؟ کبھی فون کیا؟ میں یہ سب بھول جاتا مگر جب میں پچھلے سال استنبول

گیا تو کیا آپ یقین کریں گے بھائی کہ میں اٹھارہ روز وہاں رہا۔ میں روز سبین کے گھر جاتا تھا، سکندر تو ملا ہی نہیں اور جہان...... جہان آخری روز مجھ سے ملا اور وہ بھی پندرہ منٹ کے لیے بس۔ وہ بھی جب اس کی ماں نے میرا نام بتایا تو کافی دیر بعد اسے یاد آیا کہ میں اس کا کوئی دور پار کا ماموں ہوتا ہوں۔ پھر جانتے ہیں وہ مجھ سے کیا پوچھنے لگا......؟ کیا پاکستان میں روز بم دھماکے ہوتے ہیں اور کیا وہاں انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے؟ پھر اس کا فون آیا اور وہ اُٹھ کر چلا گیا۔ میں کبھی حیا کے لیے کورٹ سے خلع لینے کے متعلق نہ سوچتا، اگر میں اس روز ایک ترک لڑکی کو جہان کو گھر ڈراپ کرتے نہ دیکھ لیتا، جب میں فلائٹ پکڑنے سے قبل سبین کو خدا حافظ کہنے گیا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ اس کی بے تکلفی...... الامان۔ وہ سکندر شاہ کا بیٹا ہے اور وہ اپنے باپ کا ہی پرتو ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر احمد شاہ جیسے عظیم انسان کا بیٹا ہو کر سکندر اس کے برعکس نکلا تو ویسے ہی جہان بھی اپنے باپ کے برعکس نکلے گا اور ایک اچھا انسان ہو گا مگر نہیں۔ وہ اسی مغرور آدمی کا مغرور بیٹا ہے۔ حیا کون ہے، اس کا ان سے کیا تعلق ہے، یہ بات نہ جہان کو یاد تھی، نہ سبین کو۔ سبین تو یہ ذکر ہی نہیں کرتی، اب میں اپنی بیٹی کو زبردستی ان کے گھر بھیج دوں کیا؟ خیر! کل ولید سے ملواؤں گا آپ کو، اب جو رشتہ بھی اچھا لگا، میں حیا کی ادھر شادی کر دوں گا اور ...."

اب اس میں مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔ وہ سفید چہرہ لیے بوجھل قدموں سے چلتی ان سے دور ہٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

جہان سکندر کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس بچپن سے اپنے اور اس کے رشتے کے متعلق سنا تھا۔ وہ سال بھر کی تھی، جب سبین پھپھو پاکستان آئیں اور فرط جذبات میں اپنے آٹھ سالہ بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ جذباتی سی کارروائی ہوئی اور دونوں بہن، بھائیوں نے بچوں کا نکاح کر دیا۔ تب آٹھ سالہ جہان ان کے ساتھ تھا۔ پھر وہ ترکی چلا گیا۔

اکیس سال گزر گئے، وہ ترکی میں ہی رہا، کبھی پاکستان نہیں آیا اور اس وزٹ کے بعد تو سبین پھپھو بھی نہیں آئیں۔ نہ کبھی انہوں نے کوئی تصویر بھیجی، نہ خط لکھا۔

اگر کبھی کوئی ترکی چلا جاتا تو ان سے مل آتا، ورنہ ان سے رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ انٹرنیٹ وہ استعمال نہیں کرتی تھیں۔ اگر جہان کرتا تھا تو بھی اس کا کوئی ای میل، فیس بک، ٹوئٹر، کسی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ارم وغیرہ اسے فیس بک پہ سرچ کر کر کے تھک گئے تھے مگر ترکی کا کوئی Jihan Sikander انہیں نہیں ملتا تھا۔

شروع کے چند برس پھپھو بہت فون کرتی تھیں، پھر آہستہ آہستہ یہ رابطے زندگی کی مصروفیات میں کھو گئے۔ تین ماہ میں ایک فون ان کا آ جاتا اور تین ماہ بعد ایک فون ادھر سے چلا جاتا۔ یوں چھ ماہ میں دو ہی دفعہ بات ہو پاتی۔ رسمی علیک سلیک، موسم کا حال، سیاست پہ تبادلہ خیال اور پھر اللہ حافظ۔

ان تمام باتوں کے باوجود وہ خود کو ذہنی اور جذباتی طور پر جہان سے وابستہ کر چکی تھی۔ نکاح کے وقت کی تصاویر آج بھی اس کے پاس محفوظ تھیں۔ آٹھ سالہ بھورے بالوں اور سنہری رنگت والا خوب صورت سا لڑکا، جس کو اس نے اپنے روبرو کبھی نہیں دیکھا تھا اور شاید ترکی جانے کی ساری خوشی کی وجہ بھی یہی تھی، جس پر ابا نے پانی پھیر دیا تھا۔ اس روز اسے رہ رہ کر پھپھو اور جہان پہ غصہ آ رہا تھا جن کی بے رُخی کے باعث اب یہ رشتہ ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔

مگر خیر، داور بھائی کی شادی ہو جائے، اور سمسٹر ختم ہو جائے، پھر وہ ترکی جائے گی اور ان لوگوں کو ضرور ڈھونڈے گی۔

☆ ☆ ☆

"حیا...... حیا! کدھر ہو؟"

وہ لابی میں آویزاں آئینے کے سامنے کھڑی ماتھے پہ ٹیکا درست کر رہی تھی، جب فاطمہ بیگم اسے پکارتی آئیں۔

ہر طرف گہما گہمی تھی۔ ایک ناقابل فہم شور سا مچا تھا۔ مہندی کا فنکشن باہر شروع ہو چکا تھا۔ سب باہر جانے کی جلدی مچائے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھیں۔

"کیا ہوا اماں؟" وہ ٹیکے کے ساتھ اُلجھی ہوئی تھی جو ماتھے پہ سیٹ ہو کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ سونے کا گول سکے کی شکل کا ٹیکا جس

کے نیچے ایک سرخ روبی لٹک رہا تھا۔ بار بار اِدھر اُدھر جھول جاتا، ٹیکے کو ٹھیک کرتے ہوئے مسلسل اس کی کلائیوں میں بھری چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔

''جلدی آؤ، تمہارے ابا بلا رہے ہیں، کسی سے ملوانا ہے تمہیں''۔ ان کی آواز میں خوشی کی رمق محسوس کر کے وہ چونک کر ان کو دیکھنے لگی۔ نفیس سی سلک کی ساڑھی اور ڈائمنڈز پہنے، وہ خاصی باوقار اور خوش لگ رہی تھیں۔ اس کی اُنگلیوں نے ٹیکا چھوڑ دیا۔ دل زور سے دھڑکا۔ کیا پھوپھو آگئیں تھیں اور ان کا مغرور بیٹا بھی۔۔۔؟

''کدھر ہیں ابا؟'' وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ان کے پیچھے باہر نکلی۔ گیٹ کے قریب سلیمان کھڑے دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے ساتھ ایک خوبرو سا لڑکا کھڑا تھا، جس کے شانے پہ ہاتھ رکھے وہ کچھ کہہ رہے تھے۔ سامنے خاصے باوقار سے سوٹ میں ملبوس ایک صاحب اور ایک ڈیسنٹ سی خاتون تھیں۔

وہ دونوں پہلوؤں سے لہنگا ذرا سا اُٹھائے ہوئے ان کے قریب آئی۔

''یہ حیا ہے...... میری بیٹی!'' سلیمان صاحب نے مسکرا کر اسے شانوں سے تھاما۔

''السلام علیکم''۔ اس نے سر کو جنبش دیتے ہوئے مدھم سا سلام کیا۔

''وعلیکم السلام بیٹا!'' وہ تینوں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔

اس نے ڈل گولڈن لہنگا اور کام دار بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کی آستین آدھی سے بھی چھوٹی تھیں اور ان سے نکلتے اس کے دودھیا بازو سنہرے موتیوں کی شعاؤں میں سنہرے دکھ رہے تھے۔ بھاری کام دار دوپٹہ اس نے گردن میں ڈال رکھا تھا۔ بال ہمیشہ کی طرح سیدھے کر کے کمر پہ گرا رکھے تھے۔ ٹیکے کے ساتھ کے سنہرے جھمکے کانوں سے لٹک رہے تھے اور ملائی سے بنا چہرہ ہلکے سے سنگھار سے مزید دل کش لگ رہا تھا۔ اس نے کاجل سے لبریز پلکیں اُٹھائیں۔ وہ تینوں ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''اور حیا! یہ میرے دوست ہیں عمیر لغاری۔ یہ مہناز بھابھی ہیں اور یہ ان کے صاحبزادے ہیں ولید''۔

اس کے دل پہ ایک بوجھ سا آگرا۔ آنکھوں میں بے اختیار نمکین پانی بھر آیا، جسے اس نے اندر اُتار لیا۔

''نائس ٹو میٹ یو، وہ...... وہ مہمان آنے لگے ہیں، میں پھول کی پتیاں اِدھر رکھ آئی تھی، سب مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے، تو میں......''

''ہاں، ہاں تم جاؤ، انجوائے کرو''۔ سلیمان صاحب نے آہستگی سے اس کے شانوں سے ہاتھ ہٹایا۔ وہ معذرت خواہانہ مسکراتی گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ باہر آ کر اس نے بے اختیار آنکھوں کے بھیگے گوشے صاف کیے اور ایک نظر پلٹ کر ان کو دیکھا، پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

ان کے گھر کے ساتھ خالی پلاٹ میں شامیانے لگا کر مہندی کا فنکشن ارینج کیا گیا تھا۔ مہندیاں دونوں گھرانوں کی الگ الگ تھیں۔

گیندے کے پھولوں اور موتیے کی لڑیوں سے ہر کونا سجا تھا۔ روشنیوں کی ایک بہار سی اُتری ہوئی تھی۔ تقریب سیگریگیٹڈ segregated تھی۔ مرد الگ، عورتیں الگ۔ ہاں عورتوں والی طرف خاندان کے مردوں کا آنا جانا لگا تھا۔ میوزک سسٹم کے ساتھ ڈی جے بیٹھا تھا اور مووی میکر کیمرا لیے پھر رہا تھا۔ ارم بھی سلور کام دار لہنگے میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ وہاں ڈی جے، مووی والے اور ریفریشمنٹ سرو کرتے ویٹرز، باہر کے مرد تھے مگر آج تو شادی کا ایک فنکشن تھا، پھر سر ڈھکنے کی پابندی کیسے ہوتی؟ شادیوں پہ تو خیر ہوتی ہے نا۔

''حیا! ڈانس شروع کریں؟'' ارم اپنا لہنگا سنبھالتی اس کے پاس آئی۔ داور بھائی پہ سارے ارمان نکال کر تمام رسمیں کر کے ان کو مردانے میں بھیج دیا گیا تھا۔

''ہاں! ٹھیک ہے، تم گانا لگواؤ اور...... یہ کون ہے؟'' وہ مصروف سے انداز میں ارم سے بولتی لحظہ بھر کو چونکی۔ سامنے والی کرسیوں کی قطار کے ساتھ ایک لڑکی کھڑی ایک کرسی پہ بیٹھی خاتون سے جھک کر مل رہی تھی۔ اس نے سیاہ عبایا اور اوپر اسنول لے رکھی تھی۔ وہ عورتیں کا فنکشن تھا، پھر بھی عجیب بات تھی کہ اس لڑکی نے اُنگلیوں سے نقاب تھام رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں اور ماتھے کا کچھ حصہ نقاب سے جھلک رہا تھا، اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ وہ جیسے مسکراتے ہوئے ان خاتون سے کچھ کہہ رہی تھی۔

''کون؟'' ارم نے پلٹ کر دیکھا، پھر گہری سانس لے کر واپس مڑی۔ ''یہ ایلین alien ہیں''۔

''کون؟'' حیا نے حیرت سے کہا۔
''ایلین، ارے بھائی شہلا بھابھی ہیں یہ۔ پوری دُنیا سے الگ ان کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہوتی ہے۔ بس توجہ کھینچنے کے لیے فنکشنز پر بھی عبایا، نقاب میں ملتی ہیں۔ اب پوچھو، بھلا عورتوں کے فنکشن میں کس سے پردہ کر رہی ہیں؟''
''ہاں، واقعی، عجیب ہیں یہ بھی!'' اس نے شانے اُچکائے۔ وہ ان کے ایک سیکنڈ کزن کی وائف تھیں اور سال بھر پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔
ڈی جے نے گانا سیٹ کر دیا تھا۔ خوب شور ہنگامہ شروع ہو گیا۔
انہوں نے مووی والے کو ڈانس کی مووی بنانے سے منع کر دیا اور پھر اپنا مہارت سے تیار کردہ رقص شروع کیا۔ ایک سنہری پری لگ رہی تھی تو دوسری چاندی کی۔ جب پاؤں دُکھ گئے اور خوب تالیاں بجیں تو وہ ہنستی ہوئی واپس کرسیوں کی طرف آئیں۔
''السلام علیکم شہلا بھابھی!'' وہ لڑکی بھی اسی میز پہ موجود تھی۔ مہوش، سحرش، اور ثناء بھی اپنی امی کے ساتھ وہیں تھیں۔ ارم نے فوراً سلام کیا، حیا نے بھی پیروی کی۔
''وعلیکم السلام، کیسی ہو تم دونوں؟'' وہ مسکرا کر خوش دلی سے ملی۔ ایک ہاتھ کی دو اُنگلیوں سے اس نے ابھی تک سیاہ نقاب تھام رکھا تھا۔
''بالکل ٹھیک، شہلا بھابھی! نقاب اُتار دیں، ادھر کون ہے؟''
شہلا نے جواباً مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا، مگر نقاب اسی طرح پکڑے رکھا۔
''ماشاء اللہ تم دونوں بہت پیاری لگ رہی ہو''۔
وہ بات کرتے کرتے ذرا سی ترچھی ہو گئی۔ حیا نے حیرت سے دیکھا۔ شاید اس طرف مووی والا فلم بنا رہا تھا، اسی لیے۔
''عجیب عورت ہے، اتنی بھی کیا بے اعتباری، ہماری فیملی مووی ہے، ہم کون سا باہر کسی کو دکھائیں گے''۔ حیا بڑبڑائی۔
پھر وہ جلد ہی معذرت کر کے وہاں سے چلی آئی۔ اس میز پہ عابدہ چچی بھی تو بیٹھی تھیں، اور کل ان کی باتیں سن لینے کے بعد اتنی منافقت اس میں نہیں تھی کہ وہ عابدہ چچی اور صائمہ تائی سے ہنس ہنس کر باتیں کر سکتی۔ اماں جانے کدھر تھیں۔ کس سے پوچھے کہ سبین پھوپھو آئی ہیں یا نہیں۔ اور آئیں گی یا نہیں۔ کافی دیر کشمکش میں مبتلا رہی، پھر گھر چلی آئی اور لاؤنج میں ٹیلی فون اسٹینڈ کے ساتھ رکھی ڈائری اُٹھائی۔ رقص کے باعث پاؤں درد کرنے لگے تھے۔ وہ صوفے پہ دھم سے گری، ایک ہاتھ سے گولڈن ہائی ہیلز کے اسٹریپس کھول کر انہیں اُتارا اور ننگے پاؤں ٹھنڈے ماربل کے فرش پہ رکھ دیے۔ ساتھ ہی وہ ڈائری کے صفحات پلٹتی سبین پھپھو کا نمبر تلاش کر رہی تھی۔ اس نے کبھی ان کو یوں فون نہیں کیا تھا، مگر آج وہ دل کے ہاتھوں ہار گئی تھی۔ ترکی کا وہ نمبر مل ہی گیا۔ اس نے ریسیور اُٹھایا اور نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی جانے لگی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ پانچویں گھنٹی پہ فون اُٹھا لیا گیا۔
''ہیلو''۔ بھاری مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
''السلام علیکم''۔ اس نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔
جواباً وہ کسی انجان زبان میں کچھ بولا۔
''میں پاکستان سے بات کر رہی ہوں''۔ وہ گڑبڑا کر انگریزی میں بتانے لگی۔
''پاکستان سے کون؟'' اب کے وہ انگریزی میں پوچھ رہا تھا۔
اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔
''میں سبین سکندر کی بھتیجی ہوں۔ پلیز ان کو فون دے دیں''۔
''وہ جواہر تک گئی ہیں، کوئی میسج ہے تو بتا دیں''۔ وہ مصروف سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اب یہ جواہر کیا تھا، اسے کچھ اندازہ نہ تھا۔
''وہ...... وہ سبین پھپھو نے پاکستان نہیں آنا کیا دادا اور بھائی کی شادی پر؟''
''نہیں، وہ بزی ہیں''۔ شاید وہ فون رکھنے ہی لگا تھا کہ وہ کہہ اُٹھی۔

''آپ..... آپ کون؟''
''ان کا بیٹا..... جہان!'' کھٹ سے فون رکھ دیا گیا۔
اس نے بھیگی آنکھوں سے ریسیور کو دیکھا اور پھر زور سے اسے کریڈل پہ پٹخا۔ بے اختیار اُمڈ آئے آنسو صاف کرتی وہ جھک کر سینڈل پہننے لگی۔ آنسوؤں نے آنکھوں کا میک اپ ذرا سا خراب کر دیا تھا۔ وہ اسے پھر سے ٹھیک کر کے کچھ دیر بعد باہر آئی تو گیٹ کی طرف سے ظفر چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سفید ادھ کھلے گلابوں کا بکے تھا۔
وہ بے اختیار ٹھٹک کر رُکی، پھر لہنگا سنبھالتی، برآمدے کے زینے میں اُتر آئی۔
''یہ کیا ہے ظفر؟''
''اوہ تسی اتھے ہو؟ یہ کوریئر والے نے دیا ہے تہاڈے لیے''۔ ظفر نے گلدستہ اور ایک بند لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ پچھلے سات سال سے تایا فرقان کا ملازم تھا۔ وہ گاؤں سے اسے لے کر آئے تھے، جب آیا تھا تو پنجابی بولتا تھا، پھر ان سات برسوں میں اُردو سیکھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اب وہ کوئی درمیانی زبان بولتا تھا۔
''ٹھیک ہے، تم جاؤ''۔ اس نے بوکے کو بازو اور سینے کے درمیان پکڑا اور دونوں ہاتھوں سے بند لفافہ کھولنے لگی۔
حسب معمول اس میں سفید سادہ کاغذ تھا، جس کے بالکل درمیان میں اردو میں ایک سطر لکھی تھی۔
''اس لڑکی کے نام..... جو کبھی کسی ان چاہے رشتے کے بننے کے خوف سے روتی ہے تو کبھی کسی بن چکے ان چاہے رشتے کے ٹوٹنے کے خوف سے''۔
وہ سُن رہ گئی پھر گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔
گیٹ کھلا تھا۔ مہندی والی جگہ سے روشنیاں اور موسیقی کا بے ہنگم شور یہاں تک آ رہا تھا۔ درمیان میں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ مہمان، نوکر چاکر وغیرہ۔ ایسے میں کیا کوئی اِدھر تھا، جو اس کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا؟
اس نے لفافے کو پلٹا۔ کوریئر کی مہر ایک روز قبل کی تھی۔
ابھی دس منٹ قبل وہ جہان کے ساتھ پہلی دفعہ بات کر کے روئی تھی۔
''بن چکا، اَن چاہا رشتہ''۔
اور گھنٹہ بھر پہلے ولید اور اس کے والدین سے ملی تھی۔
''اَن چاہے رشتے کے بننے کے خوف.....''
یہ کون تھا جو اتنا باخبر تھا؟ ایک دن قبل ہی اسے کیسے علم ہوا کہ وہ آج دو دفعہ روئے گی؟
وہ خوف زدہ سی کھڑی، بار بار وہ تحریر پڑھے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''ابا نکل تو نہیں گئے؟''
وہ پرفیوم کی بوتل بند کر کے سنگھار میز پہ رکھتی مخصوص ہارن اور گیٹ کھلنے کی آواز پہ موبائل اور پرس اُٹھا کر باہر کو بھاگی۔ کافی دیر سے وہ کمرا بند کر کے بارات میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ فاطمہ بیگم جلدی جلدی کا شور مچائے دس بار دروازہ بجا چکی تھیں۔ مقررہ وقت ہونے کو تھا، آج داور بھائی کی بارات تھی، سلیمان صاحب کو تو سب سے پہلے ہال پہنچنا تھا اور اس کی سست روتیاریوں سے بھی وہ واقف تھے۔
پورچ خالی تھا۔ تایا فرقان کے پورشن سے البتہ شور سنائی دے رہا تھا، غالباً وہاں پر ابھی سب نہیں نکلے تھے۔ اب کیا کرے؟ ابا کو فون کرے یا تایا فرقان کے گھر جا کر کسی سے لفٹ مانگے؟
وہ انہی سوچوں میں اُلجھتی اندر جانے کو پلٹی ہی تھی کہ کھلے گیٹ پہ ہارن ہوا۔ اس نے رُک کر دیکھا۔
سیاہ چمکتی اکارڈ باہر کھڑی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس خاصی تیز تھی۔ حیا کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے بے اختیار ماتھے پہ ہاتھ کا

سایہ بنا کر دیکھنا چاہا، تب ہی ہیڈ لائٹس دھیمی ہوئیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کا چہرہ واضح ہوا۔
وہ ولید لغاری تھا۔ ساتھ فرنٹ سیٹ پر اس کے والد تھے اور پیچھے والدہ۔
''السلام علیکم حیا!'' وہ دروازہ آدھا کھول کر باہر نکلا اور ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
وہ دھیمی ہوتی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔ گہرے سرخ کام دار بغیر آستینوں والا فراک جو پاؤں تک آتا تھا اور نیچے ہم رنگ تنگ پاجامہ۔ فراک بہت لمبا تھا، سو پاجامے کی چوڑیاں بمشکل بالشت بھر ہی دکھائی دیتی تھیں۔ گولڈن دوپٹہ گردن میں تھا اور کانوں سے لٹکتے لمبے لمبے آویزے کندھوں کو چھو رہے تھے۔ کاجل سے لبریز سیاہ آنکھیں اور کمر پہ گرتے سیدھے بال۔
''ہمیں میرج ہال کا علم نہیں ہے، انکل ہیں؟'' وہ نگاہوں میں اسے جذب کرتے پوچھ رہا تھا۔
وہ متذبذب سی آگے آئی، پھر اسے نظر انداز کیے، لغاری صاحب کے دروازے کے ساتھ رکی۔ ''انکل! پیراڈائز ہال جانا ہے اور ابا شاید نکل گئے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا''۔ وہ واقعتاً پریشان تھی۔
''اوہ..... تو آپ کے چچا وغیرہ؟''
''وہ تو ابا سے بھی پہلے چلے گئے تھے۔ ٹھہریں! ابا زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے، میں انہیں واپس......''
''ارے وہ کیوں واپس آئیں؟ ان کا جلدی پہنچنا ضروری ہے، آپ ہمارے ساتھ آجاؤ بیٹا! ہم نے بھی تو وہیں جانا ہے''۔
''ہاں بیٹا، آؤ!'' مسز مہناز لغاری نے فوراً اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور دوسری طرف ہو گئیں۔
وہ چند لمحے تذبذب میں کھڑی رہی۔
اب اگر ابا کا انتظار کرتی تو آدھا فنکشن نکل جاتا اور اگر ان کے ساتھ جاتی تو...... ابا برا نہیں مانیں گے۔ یہ تو اسے یقین تھا۔
''چلیں ٹھیک ہے''۔ وہ ہچکچاتے ہوئے پچھلی سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔
''تو ہماری بیٹی کیا کرتی ہیں؟'' راستے میں لغاری صاحب نے پوچھا تھا۔
(میں ان کی بیٹی کب سے ہو گئی؟)
''جی میں شریعہ اینڈ لاء میں ایل ایل بی آنرز کر رہی ہوں''۔
''یعنی کہ آپ اسلامی وکیل ہو؟''
''جی!'' وہ پھیکا سا مسکرائی۔ یہ لوگ اتنی اپنائیت کیوں دے رہے تھے اسے؟
''تو یہ شریعہ اینڈ لاء کیسا سبجیکٹ ہے؟'' عمیر لغاری نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ میں بنیادی طور پر ایک انجینئر ہوں اور انجینئرنگ شروع میں مجھے مشکل لگتی تھی، بعد میں آسان ہو گئی''۔
''مجھے شریعہ شروع میں مشکل لگتی تھی، بعد میں عادی ہو گئی''۔ وہ تینوں ہنس پڑے تو اسے احساس ہوا کہ اسے خوامخواہ ان کے ساتھ زیادہ بے تکلف نہیں ہونا چاہیے۔
''حیا بیٹا! آپ کا شادی کے بعد پریکٹس کا ارادہ ہے؟ کیونکہ میں اور آپ کے انکل تو کبھی اس معاملے میں زبردستی کے قائل نہیں رہے۔ ہم نے فیلڈ منتخب کرنے سے لے کر کیریئر بنانے تک، ہر چیز میں اپنے بچوں کی مرضی کو مقدم رکھا ہے۔ خود ولید کو بھی شادی کے بعد بیوی کے جاب کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے''۔
مہناز کہہ رہی تھیں اور وہ ہکا بکا ان کو دیکھ رہی تھی۔ کیا معاملات اتنے آگے بڑھ چکے تھے یا وہ اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ ابا ان کو کبھی انکار نہیں کریں گے؟
بمشکل ہوں ہاں میں ان کے سوالات کے جوابات دیتی، وہ اس وقت پُرسکون ہوئی جب میرج ہال کی بتیاں نظر آنے لگیں۔
''لفٹ کا شکریہ انکل''۔ وہ انکل اور آنٹی کے ساتھ ہی باہر نکلی تھی۔ اسی پل لغاری انکل کا موبائل بجا تو معذرت کر کے ایک طرف چلے گئے، مہناز بھی ان کے پیچھے گئیں۔

''حیا سنیے!'' وہ جانے ہی لگی تھی کہ ولید نے پکارا۔ وہ ابھی تک اندر اسٹیئرنگ وہیل تھامے بیٹھا تھا۔
''مجھے آپ سے بات کرنی ہے''۔ وہ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیے اس سے مخاطب تھا۔
''مگر یہ مناسب نہیں ہے''۔
''مگر مجھے اسی رشتے کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ اگر آپ دو منٹ اندر بیٹھ کر میری بات سن لیں تو''۔ ساتھ ہی اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔
روشنی کا ایک کوندا اس کے ذہن میں لپکا۔ موقع اچھا تھا۔ وہ اس کو اپنے نکاح کے بارے میں بتا کر سارا معاملہ یہیں دبا سکتی تھی۔ لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی اور یہ چھ فٹ کا سانپ بھی راستے سے ہٹ جائے گا۔
''ٹھیک ہے، لیکن یہاں ہمارے رشتے دار ہیں اگر.....''
''ڈونٹ وری، میں کار بیک سائیڈ پر لے جاؤں گا، آپ بیٹھیے''۔
وہ متذبذب سی اندر بیٹھ گئی۔
زندگی میں پہلی دفعہ وہ یوں کسی لڑکے کے ساتھ تنہا بات کرنے بیٹھی تھی۔ ابا کو پتا چلتا تو ان کی ساری وسیع النظری بھک سے اُڑ جاتی۔ اسے لباس پہننے کی آزادی تھی، سر ڈھکنے کی پابندی بھی نہ تھی، مگر لڑکوں سے بے تکلفی یا دوستی کی اجازت ابا نے کبھی نہیں دی تھی۔
وہ بیٹھی تو ولید زن سے گاڑی بھگا لے گیا۔
''آپ کو جو بھی کہنا ہے، جلدی کہیے، پھر مجھے بھی کچھ کہنا ہے''۔ وہ سر جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں کی اُنگلیاں مروڑ رہی تھی۔ عجیب مضطرب حالت ہو رہی تھی اس کی۔
''پہلے آپ کہیے''۔ ولید میرج ہال کی پچھلی طرف ایک نسبتاً سنسان گلی میں گاڑی لے آیا تھا۔
''او کے..... مجھے کچھ بتانا تھا''۔ وہ گردن جھکائے کہنے لگی۔ ''میرے ابا نے معلوم نہیں آپ کو بتایا ہے یا نہیں مگر میں بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔ میرا نکاح میری پھپھو کے بیٹے سے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ وہ لوگ ترکی میں ہوتے ہیں۔ کچھ خاندانی مسائل کے باعث میرے ابا ان سے ذرا بدظن ہیں اور اب مجھے ڈائیورس دلا کر میری شادی کہیں اور کرنا چاہتے ہیں مگر میں ایسا نہیں چاہتی''۔
اس نے سر نہیں اُٹھایا۔ ولید کی خاموشی سے اس نے یہی مراد لی کہ وہ سخت شاک کے عالم میں ہے۔
''میں اپنے شوہر کی وفادار ہوں، مسٹر ولید! میں نے اسی کے خواب دیکھے ہیں اور ذہنی طور پر خود کو اسی سے وابستہ پاتی ہوں۔ اب کسی اور سے شادی کرنے کے بارے میں مَیں سوچ بھی نہیں سکتی''۔
وہ اب بھی کچھ نہ بولا۔ حیا گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے بولتی جا رہی تھی۔
''پلیز آپ انکار کر دیں۔ میں کسی اور کی بیوی ہوں۔ نکاح پر نکاح نہیں ہو سکتا، پلیز! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں''۔
اس نے چہرہ اوپر اُٹھایا۔ وہ یک ٹک خاموش گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کا چہرہ تو نہ تھا، جو وہ سارا راستہ ڈرائیونگ کے دوران دیکھتی آئی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی شخص تھا۔
''پھر..... پھر آپ نے کیا سوچا؟'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ ولید کی آنکھوں میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ اسے لگا وہ ایک سنگین غلطی کر چکی ہے۔ خطرے کا الارم زور زور سے اس کے اندر بجنے لگا۔
''کس بارے میں؟'' وہ بوجھل آواز میں بولا تو وہ دروازے کی طرف سمٹی۔ نامحسوس انداز سے اس کا ہاتھ ہینڈل پر رینگ گیا۔
''آپ کے اس رشتے سے انکار کے بارے میں''۔
''ساری عمر پڑی ہے یہ باتیں کرنے کے لیے حیا! ابھی تو ان لمحوں سے فائدہ اُٹھاؤ جو میسر ہوں''۔ وہ ایک دم اس پر جھکا۔ حیا کے لبوں سے چیخ نکلی۔ ولید نے دونوں ہاتھ اس کی گردن پہ رکھنے چاہے، مگر اس نے زور سے ہینڈل کھینچ کر دروازہ دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے ولید کو دھکا دے کر باہر نکلی۔ اس کا دوپٹہ ولید کے ہاتھوں میں آ گیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر بھاگی تو ولید نے دوپٹہ کھینچا۔ دوپٹہ

اس کی گردن کے ساتھ رگڑتا ہوا پیچھے ولید کے ہاتھوں میں رہ گیا۔ وہ بنا پیچھے مڑ کے دیکھے، بھاگی جا رہی تھی۔

اسے ولید کے دروازہ کھول کر کوئی اونچی سی انگریزی گالی دینے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس کے بھاگتے قدموں میں تیزی آ گئی۔

گلیاں سنسان تھیں۔ جانے وہ کہاں لے آیا تھا۔ آج اتوار تھا اور دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر بدحواس سی دوڑتی ہوئی ایک گلی میں مڑ گئی۔

پیچھے کوئی دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی گلی کے دوسرے سرے تک پہنچی، مگر یہ کیا؟ گلی بند تھی۔ ڈیڈ اینڈ۔

وہ بے ساختہ پلٹی۔ بھاگتے قدموں کی آواز قریب آ رہی تھی۔

وہ دوڑ کر گلی کے بند سرے تک گئی اور دیوار کی اینٹوں کو چھو کر ٹٹولا۔ شاید اندر کوئی جادوئی دروازہ ہو۔ شاید ہیری پوٹر کی کہانیاں سچ ہوں مگر......

"کیوں بھاگتی ہو؟" مسرور سے انداز میں کسی نے پیچھے سے کہا تو وہ گھبرا کر پلٹی۔

ولید سامنے سے قدم قدم چلتا آ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ نڈھال سی دیوار سے لگ گئی۔ اس کا دوپٹہ تو وہیں رہ گیا تھا۔ اب بغیر آستینوں کے جھلکتے بازو اور گلے کا گہرا گھاٹ۔ اس نے بے اختیار سینے پہ بازو لپیٹے۔

"مجھے جانے دو!" اس کی آواز بھرا گئی۔ پہلی دفعہ یہ غلطی کی تھی اور پہلی ہی دفعہ اتنی بڑی سزا؟

"کیسے جانے دوں، پھر تم نے ہاتھ تھوڑا ہی آنا ہے؟" وہ چلتے چلتے اس سے چند قدم کے فاصلے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ دور لگے اسٹریٹ پول کا بلب اس کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

"پلیز، میں ایسی لڑکی نہیں ہوں"۔

"تو کیسی لڑکی ہو؟ مجھ سے لفٹ نے لی مگر شادی سے انکار ہے؟ تب ہی گاڑی میں اتنی بے رُخی دکھا رہی تھیں؟" وہ اس کے بالکل سامنے آ رکا۔

"پلیز......" وہ ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اب ولید کو دھکا دیتی۔

"ششش!" وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا۔ حیا نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔

تب ہی اس نے زور سے کسی ضرب لگنے کی آواز سنی اور پھر ولید کی کراہ۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

ولید چکرا کر نیچے گر رہا تھا اور اس کے پیچھے کوئی کھڑا نظر آ رہا تھا۔

شوخ نارنجی شلوار قمیص میں ملبوس، میک اَپ سے اٹا چہرہ لیے، وہی اس روز والا خواجہ سرا، ڈولی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فرائنگ پان تھا، جو اس نے شاید ولید کے سر پہ مارا تھا۔ وہ ساکت سی اس کو دیکھ رہی تھی۔

ڈولی نے پاؤں سے ایک ٹھوکر ولید کو ماری تو اس کا بے ہوش وجود ذرا پرے ہوا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور عین حیا کے سامنے رُکا۔ اس کی سلور چمکیلے آئی شیڈ والی آنکھوں میں ایسی کاٹ تھی کہ وہ سانس روکے اسے دیکھے گئی۔

تب ہی اس نے ہاتھ بڑھایا اور حیا کو گردن کے پیچھے دبوچا، یوں کہ گدی پہ گرے بال بھی اس کی گرفت میں آ گئے۔ ڈولی کے ہاتھ اور حیا کی گردن کے درمیان اس کے بال تھے، پھر بھی اس کے ہاتھ کا کھردرا پن وہ محسوس کر سکتی تھی، لیکن لبوں سے کراہ تک نہ نکلی۔

اس کی گردن کو یوں ہی پیچھے سے دبوچے، ڈولی نے ایک جھٹکے سے اسے آگے دھکیلا۔ وہ بے اختیار کھانسی مگر ڈولی کی بے رحم گرفت ڈھیلی نہ پڑی۔ وہ اسے اسی طرح پکڑے اپنے آگے آگے دھکیل کر چلا رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چل رہی تھی۔

گلی کے آغاز تک جہاں سے وہ آئی تھی، وہ اسے لے گیا، پھر مخالف سمت میں مڑ گیا۔ سامنے ہی میرج ہال کا پچھلا حصہ تھا۔ وہ اسے اپنے آگے دھکیلتا پچھلے گیٹ تک لے آیا اور ایک جھٹکے سے اسے چھوڑا۔ حیا کو لگا، اس کی گردن کے گرد سے ایک کھردرا طوق ہٹا ہے۔ اس نے پلٹ کر ڈبڈبائی آنکھوں سے ڈولی کو دیکھا۔

وہ ابھی تک لب بھینچے، تلخ کاٹ دار نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

حیا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اسے لگا، وہ اب کبھی بول نہیں پائے گی۔ دفعتاً ڈولی نے اپنی گردن سے لپٹا نارنجی دوپٹہ کھینچا اور اس پہ اُچھالا۔ دوپٹہ اس کے سر پہ آن ٹھہرا، پھر سلکی بالوں سے پھسلتا ہوا شانوں پہ ڈھلک گیا۔ ڈولی چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا، آہستہ سے بولا۔

''بے حیا!''

اس کے لہجے میں برچھی کی کاٹ تھی۔ پھر وہ پلٹ گیا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ نارنجی دوپٹہ اس کے کندھوں سے پھسل کر قدموں میں آگرا تو وہ چونکی، پھر جھک کر دوپٹہ اُٹھایا۔

ریشمی بھڑکیلا نارنجی دوپٹہ جس پر سستا سا گولڈن ستاروں کا کام تھا، وہ کبھی اپنی مائی کو بھی ایسا دوپٹہ نہ دیتی، مگر آج......

اس نے اچھے طریقے سے خود کو اس دوپٹے میں لپیٹا، تاکہ پہچانی نہ جائے اور پچھلے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

ہال میں جانے کی بجائے وہ باتھ رومز کی طرف آئی اور اپنا حلیہ درست کیا۔ رونے سے کاجل بہہ گیا تھا۔ بال بھی بکھرے تھے۔ موبائل اس چھوٹے سے کلچ میں تھا، جو اس نے اس سارے عرصے میں اپنے بائیں ہاتھ میں دبوچے رکھا تھا، شکر!

اندر فنکشن اپنے عروج پہ تھا۔

اسٹیج پہ دولہا، دُلہن، رشتے داروں، کزنز اور دوستوں کے جلو میں مسکرا رہے تھے۔ سونیا بھابھی بھی بہت اچھی لگ رہی تھیں اور داور بھائی بھی۔ ارم فیروزی فراک میں چہکتی ہوئی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ اصولاً اسے بھی وہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ ایسی ذہنی حالت میں نہ تھی کہ وہ دو قدم بھی چل پاتی، سو بے دم سی ایک آخری نشست پر گری ہوئی تھی۔

''بے حیا''۔

''بے حیا''۔

''بے حیا''۔

ڈولی کے الفاظ کی بازگشت ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پر برس رہی تھی۔ وہ بے حیا تو نہیں تھی۔ وہ تو کبھی کسی لڑکے کی گاڑی میں نہیں بیٹھی تھی۔ اس سے تو یہ غلطی پہلی دفعہ ہوئی تھی، پھر......؟ سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جاتا تھا۔

وہ آدھے فنکشن کے بعد ہی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے چلی آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ داور اور سونیا کی شادی کے چند روز بعد کا ذکر ہے۔

صبح سے سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ دسمبر ختم ہونے کو تھا اور ہوا ٹھٹھرا دینے والی بن چکی تھی۔ ایسے میں وہ کیمپس میں اسکالرشپ کوآرڈینیٹر کے آفس کے باہر دروازے پہ لگی لسٹ دیکھ رہی تھی۔ ''اراسمس منڈس ایکسچینج پروگرام'' کے تحت اسٹوڈنٹس میں سے صرف دو لڑکیاں سبانجی یونیورسٹی جارہی تھیں۔

حیا سلیمان اور خدیجہ رانا۔

''یہ خدیجہ رانا ہے کون بھلا؟'' وہ سوچتے ہوئے اپنے یخ ہوتے ہاتھ آپس میں رگڑ رہی تھی۔ سردی سے اس کی ناک سرخ پڑ رہی تھی۔ لانگ شرٹ اور ٹراؤزر پر اسٹائلش سالانگ سوئیٹر پہنے وہ دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ دفعتاً عقب سے کسی نے پکارا۔

''ایکسکیوزمی!''

وہ چونک کر پلٹی۔ پیچھے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ کندھے پہ بیگ، ہاتھ میں ڈائری اور پین اور آنکھوں پر بڑا سا چشمہ۔ وہ اس کو نام سے نہیں پہچانتی تھی مگر اس کو کئی دفعہ یونیورسٹی میں دیکھا ضرور تھا۔ وہ لڑکی اسے خوامخواہ ہی بہت بری لگی تھی۔

''یہ حیا سلیمان کون ہے بھلا؟'' وہ چشمے کے پیچھے سے آنکھیں سکیڑے سوچتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

حیا نے ایک طنزیہ نگاہ میں اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا، پھر ذرا روکھے انداز میں بولی۔ ''میں ہوں!''

''اوہ!'' اس نے جیسے بمشکل اپنی ناگواری چھپائی۔

''میں آپ کے ساتھ تیرہی جا رہی ہوں حیا! میں خدیجہ ہوں، میری فرینڈز مجھے ڈی جے کہتی ہیں، مگر آپ میری فرینڈ نہیں ہیں، سو خدیجہ ہی کہیے گا''۔

''مجھے بھی حیا صرف میرے فرینڈز کہتے ہیں۔ آپ مجھے مس سلیمان کہہ سکتی ہیں''۔ وہ کہہ کر پلٹ گئی۔

عجیب بددماغ لڑکی تھی وہ خدیجہ رانا۔ اسے پہلے بھی خواہ مخواہ ہی بہت بری لگتی تھی اور اب اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے بھی حیا کے بارے میں خیالات کچھ ایسے ہی تھے۔

وہ جیسے ہی گھر آئی، ظفر سامنے آ گیا۔ بھاگتا ہوا، ہانپتا ہوا۔

''حیا بی بی..... حیا بی بی!''

''بول بھی چکو اب!'' وہ گاڑی لاک کرتی کوفت زدہ ہوئی۔

''آپ کو ارم بی بی بلا رہی ہیں''۔

''خیریت؟''

''خیریت نہیں لگتی جی۔ وہ بہت رو رہی ہیں'' ظفر نے رازداری سے بتایا تو وہ چونکی۔

''اچھا..... میں آتی ہوں، تم یہ میرا بیگ اندر رکھ دو''۔ وہ سیدھا ارم کے گھر کھلنے والے درمیانی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

لاؤنج میں صائمہ تائی اور سونیا بیٹھی تھیں۔ سامنے کوئی کام دار دوپٹہ پھیلا رکھا تھا اور دونوں اس کے ساتھ اُلجھی تھیں۔ آہٹ پہ سر اُٹھایا۔ اسے دیکھ کر دونوں ہی مسکرا دیں۔

''حیا! کیسی ہو؟''

''بالکل ٹھیک، ارم کدھر ہے تائی اماں! مجھے بلا رہی تھی''۔

''اندر کمرے میں ہو گی''۔

''او کے، میں دیکھ لیتی ہوں''۔ وہ مسکرا کر راہداری کی سمت بڑھ گئی۔

ارم کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ڈور ناب گھما کر دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا، بیڈ پر ارم اکڑوں بیٹھی تھی۔ سامنے لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا، چمکتی اسکرین کی روشنی ارم کے چہرے کو چمکا رہی تھی، جس پہ آنسو لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے۔

''ارم! کیا ہوا؟'' وہ قدرے فکرمندی سے ارم کے سامنے آ بیٹھی۔

ارم نے سرخ متورم آنکھیں اُٹھا کر حیا کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا، جو اسے ٹھٹکا گیا۔

''حیا! ایک بات بتاؤ!'' اس کا رندھا ہوا لہجہ عجیب سا تھا۔

''بولو!''

''ہم شریف لڑکیاں ہیں کیا؟''

''اپنے بارے میں تو یقین ہے مگر تمہارا معاملہ ذرا مشکوک ہے''۔ اس نے ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کو کہا، مگر ارم مسکرائی تک نہیں۔

''نہیں حیا! ہم دونوں کا ایک ہی معاملہ ہے''۔

''کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟ ہوا کیا ہے؟''

''حیا مجھے بتاؤ، کیا ہم مجرا کرنے والیاں ہیں؟'' وہ ایک دم رونے لگی تھی۔

''ارم!'' وہ ششدر رہ گئی۔

''بتاؤ، کیا ہم طوائفیں ہیں؟'' وہ اور زور سے رونے لگی۔

''ارم! بات کیا ہوئی ہے؟''

''حیا! بولو، بتاؤ، ہم ایسی ہیں کیا؟''

''نہیں، بالکل نہیں!''

''پھر...... پھر یہ کیا ہے!'' ارم نے لیپ ٹاپ کی اسکرین کا رُخ اس کی طرف کیا۔

''کیا ہے یہ؟'' اس نے اُلجھن سے اسکرین کو دیکھا۔ ایک ویڈیو اَپ لوڈنگ ویب سائٹ کھلی ہوئی تھی اور اس پہ ایک ویڈیو چل رہی تھی۔ ویڈیو کا کیپشن اوپر رومن اُردو میں لکھا تھا۔

''شریفوں کا مجرا''۔

ویڈیو کسی شادی کے فنکشن کی تھی۔ ہر سو سجی سنوری خواتین اور درمیان میں ڈانس فلور پہ محو رقص دو لڑکیاں۔

ایک کا لہنگا گولڈن تھا اور دوسری کا سلور۔

پوری چھت جیسے اس کے سر پہ آن گری۔

''نہیں!'' وہ کرنٹ کھا کر اُٹھی۔ ''یہ کیا ہے؟''

''یہ شریفوں کا مجرا ہے حیا! اور یہ ہم نے کیا ہے، یہ داور بھائی کی مہندی کی ویڈیو ہے، جو کسی نے ادھر انٹرنیٹ پر ڈال دی ہے۔ یہ پڑھو، ویڈیو ڈالنے والے نے اپنا ای میل ایڈریس بھی دیا ہے، جس پہ میل کر کے پورے ڈانس کی ویڈیو حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ دیکھو...... اس ویڈیو کو تین دن سے اب تک سینکڑوں لوگ دیکھ چکے ہیں۔ حیا! ہم برباد ہو گئے ہیں، ہم کہیں کے نہیں رہے''۔

ارم پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور وہ ساکت سی اسکرین کو تکے جا رہی تھی۔ یہ کوئی بھیانک خواب تھا۔ ہاں، یہ خواب ہی تھا اور اب وہ جاگ جانا چاہتی تھی۔

اسکرین پہ رقصاں پریوں کے سراپے میں مختلف حصوں پہ کسی نے سرخ دائرے کھینچ رکھے تھے، جیسے ہی کوئی لڑکی کسی اسٹیپ پہ جھکتی، تو فوراً سرخ دائرہ اُبھرتا۔

اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔

''نہیں...... یہ میں نے نہیں کیا''۔ وہ ایک ایک قدم پیچھے ہو رہی تھی۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ ارم اسی طرح بلک رہی تھی۔

''میں...... میں مجرا کرنے والی نہیں ہوں، میں شریف لڑکی ہوں''۔ وہ قدم قدم پیچھے ہوتی دیوار سے جا لگی۔

''یہ ہم ہی ہیں حیا! ہم برباد ہو گئے ہیں''۔

اس کا سر چکرانے لگا۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا؟ ویڈیو کے سینکڑوں ویوز لکھے آ رہے تھے۔ کیا وہ پورے شہر میں پھیل گئی تھی؟ اور اگر اس کے خاندان والوں تک پہنچی تو......

''ابا تو مجھے گولی مار دیں گے ارم!''

''مجھے تو زندہ گاڑھ دیں گے''۔

''مگر یہ ویڈیو کس نے بنائی؟ ہم نے تو مووی والے کو بھی منع کر دیا تھا''۔

''کسی نے چھپ کر بنائی ہو گی۔ خاندان کی شادی پر بس، عورتوں میں ڈانس کی اجازت ابا لوگوں نے دی تھی، اگر انہیں پتا چلا کہ ہمارا یہ ڈانس پورے شہر کے لڑکے انجوائے کر رہے ہیں تو کیا ہو گا؟''

''کچھ کرو ارم!'' اس کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ تیزی سے ارم کے قریب آئی۔

''میں نے اس ویب سائٹ پر رپورٹ تو کی ہے لیکن ویب سائٹ نے ایکشن لے کر ویڈیو ہٹا دی تو بھی یہ سی ڈی پر تو ہر جگہ مل رہی ہے۔ ایسی چیزیں تو منٹوں میں پھیلتی ہیں۔ ہم کہاں کہاں سے اسے ہٹوائیں گے؟''

''خدایا...... یہ کیا ہو گیا ہے؟'' وہ بے دم سی زمین پہ بیٹھتی چلی گئی۔ ''اگر ابا یا کسی بھائی وغیرہ کو معلوم ہو گیا تو...... او خدایا۔ ہم کیا کریں؟''

ارم نے بھی خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور وہ بھی بس کمرے کی ہو کر رہ گئی۔ سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جاتا تھا مگر کوئی حل ذہن میں نہیں آتا تھا۔

شام میں فاطمہ بیگم نے اس کے کمرے میں جھانکا۔

''حیا! اُٹھو، کتنا سوؤ گی؟ روحیل کا فون ہے امریکہ سے''۔

وہ جو چہرے پہ بازو رکھے لیٹی تھی، کرنٹ کھا کر اُٹھی۔

''روحیل کا؟ کیوں؟ کیا کہہ رہا ہے؟'' اس کے ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔

''کہہ رہا ہے اسے تم سے بات کرنی ہے''۔ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں اور وہ شل سی بیٹھی رہ گئی۔ سکون کی ندی میں زور سے پتھر آ گرا تھا۔

روحیل امریکہ میں تھا اور وہاں پر تو لوگ عموماً سارا وقت ہی آن لائن رہتے تھے، پھر ایسے میں اس کی نگاہوں سے اس وڈیو کا گزر جانا عین ممکن تھا۔ خدایا، اب وہ کیا کرے؟

اس نے پیروں میں سلیپرز ڈالے اور مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی باہر لاؤنج میں آئی۔ کریڈل کے ساتھ اُلٹا ریسیور پڑا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا۔

''......ہیلو؟''

''ہیلو حیا؟ کیسی ہو؟'' روحیل کی آواز میں گرم جوشی تھی، وہ کچھ اندازہ نہیں کر پائی۔

''ٹھیک......تم......تم ٹھیک ہو؟''

''ایک دم فٹ۔ میں نے تمہیں مبارک باد دینی تھی''۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ کیا وہ طنز کر رہا تھا؟

''کک......کس بات کی؟''

''بھئی تم ایکسچینج پروگرام کے تحت ترکی جا رہی ہو اور کس بات کی بھلا!''

''اوہ اچھا''۔ اس کی اٹکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ نڈھال سی دھپ سے صوفے پہ گری۔

''ہاں جا رہی ہوں۔ تھینک یو سوچ''۔ ان گزرے تین دنوں میں وہ یہ بات بھلا چکی تھی۔

''کب تک جانا ہے؟'' وہ خوشی سے پوچھ رہا تھا۔

''جنوری کے اینڈ یا فروری کے شروع تک''۔

''تو کیا تم ادھر سبین پھپھو کی فیملی سے ملو گی؟''

''پتا نہیں، ابھی سوچا نہیں ہے''۔ اس کے پاس اس وقت سوچنے کے لیے زیادہ بڑے مسائل تھے۔

''کیا بات ہے، تم اپ سیٹ لگ رہی ہو؟'' وہ ذرا پریشان ہوا۔

''ارے نہیں......'' وہ فوراً سنبھلی اور پھر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے خود کو نارمل ظاہر کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

فون بند ہوا تو وہ ارم کی طرف چلی آئی۔ وہ تکیہ منہ پہ رکھے لیٹی تھی۔

''یوں سر منہ لپیٹ کر بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوگا''۔

''تو کیا کریں؟'' ارم نے تکیہ پھینکا اور اُٹھ بیٹھی۔

''سب سے پہلے تو دونوں گھروں کے تمام کمپیوٹرز پہ اس ویب سائٹ کو بلاک کرتے ہیں تاکہ کم از کم گھر والوں کو تو نہ پتا چلے، پھر اس کا کوئی مستقل حل سوچتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے، چلو!'' اُمید کا سرا دیکھ کر ارم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بنا کسی دقت کے جب وہ تمام کمپیوٹرز پہ اس ویب سائٹ کو بلاک کر چکیں تو صائمہ تائی نے آ کر بتایا کہ رات میں ارم کو دیکھنے تایا فرقان کے کوئی فیملی فرینڈ بمع خاندان آ رہے ہیں۔ رسمی کارروائی تھی، کیونکہ وہ رشتہ تو ڈھکے چھپے الفاظ میں مانگ ہی چکے تھے۔ حیا سب کچھ بھلا کر پُرجوش ہو گئی۔

"ہمارے دلہا بھائی بھی ساتھ ہی آئے ہیں"۔ حیا ڈرائنگ روم میں جھانک کر اندر کمرے میں آئی تو وہ منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔
"تم ایسے کیوں بیٹھی ہو؟"
ارم نے آہستہ سے سر اُٹھایا۔ سر پہ سلیقے سے دوپٹا جمائے وہ بر دکھوے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ ہاں! آنکھیں ذرا ویران سی تھیں۔
"وہ ویڈیو۔۔۔!"
"دفع کرواسے۔ آؤ سب بلا رہے ہیں۔ لڑکے کو اس کی والدہ ماجدہ نے اندر بلایا ہے، تمہیں دکھانے کے لیے۔ آؤ!" اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔
"اور ابا؟" ارم کی آنکھوں میں ذرا سی پریشانی اُتری۔
"ان سے اجازت لے لی ہے اور وہ باہر مردوں میں بیٹھے ہیں"۔ وہ ارم کو ہاتھ سے پکڑے ڈرائنگ روم کی طرف لے آئی۔ جالی دار پردے کے پیچھے وہ دونوں لمحے بھر کو رکی تھیں۔
اندر صوفوں پہ صائمہ تائی، فاطمہ بیگم اور سونیا بھابھی بیٹھی تھیں۔ سامنے والے دو سنگل صوفوں پہ ایک نفیس سی خاتون اور ایک خوبرو سانو جوان بیٹھا تھا۔ سامنے رکھی میز لوازمات سے سجی تھی اور سونیا بصد اصرار مہمانوں کو بہت کچھ پیش کر رہی تھی۔
"بس بھابھی! ہمیں تو اپنے جیسی ہی بچی چاہیے۔ باحیا، باپردہ، صوم صلوٰۃ کی پابند"۔ وہ خاتون مسکرا کر کہہ رہی تھیں۔
"ارے مسز کریم! ہماری ارم تو کبھی سر ڈھکے بغیر گیٹ سے باہر نہیں نکلی"۔
"السلام علیکم"۔ وہ ارم کو ساتھ لیے اندر داخل ہوئی۔ اس کے سلام پہ سب نے سر اُٹھا کر دیکھا۔
گلابی پوری آستینوں والی شلوار قمیص میں ہم رنگ دوپٹہ اچھی طرح پھیلا کر سر پہ لیے ارم جھکی جھکی نگاہوں سے سامنے ایک صوفے پہ آ بیٹھی۔
حیا بھی ساتھ ہی تھی۔ کمر پہ گرتے سلکی بال، گرے اے لائن شرٹ اور ٹراؤزر زیب تن کیے، دوپٹہ کندھے پہ ڈالے ارم کے ساتھ ہی ٹانگ پہ ٹانگ رکھے پُراعتماد طریقے سے بیٹھ گئی، یوں بیٹھنے سے ٹراؤزر کے پائنچے ذرا اوپر کو اٹھ گئے اور گرے قینچی چپلوں میں مقید سپید پاؤں ٹخنوں تک جھلکنے لگے۔
بیگم کریم کی مشفق سی آنکھوں میں ارم کو دیکھ کر پسندیدگی کی جھلک اُتری تھی۔ انہوں نے تائیدی انداز میں اپنے اسمارٹ سے بیٹے کو دیکھا، مگر وہ ارم کو نہیں، بلکہ بہت غور سے حیا کو دیکھ رہا تھا۔
"اور بیٹا! آپ کیا کرتی ہو؟" بیٹے کو متوجہ نہ پا کر وہ سنبھل کر ارم سے مخاطب ہوئیں۔
"جی ماسٹرز کر رہی ہوں انگلش لٹریچر میں"۔ ارم نے جھکی جھکی نگاہوں سے جواب دیا۔
تب ہی حیا کو محسوس ہوا، وہ لڑکا مسلسل اسے دیکھ رہا ہے۔ ستائش یا پسندیدگی سے نہیں، بلکہ غور سے، جانچتی پرکھتی نظروں سے۔
دفعتاً اس نے پاکٹ سے اپنا بلیک بیری موبائل نکالا اور خاموشی سے سر جھکائے بٹن پریس کرنے لگا۔
خواتین آپس میں گفتگو میں مصروف تھیں، مگر حیا کچھ عجیب سا محسوس کرتی کنکھیوں سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ جو اپنے فون پہ جھکا تھا۔ تب ہی ہولے سے اس کے موبائل سے "مائی نیم از شیلا" کی آواز گونجی جسے اس نے فوراً بند کر دیا، مگر وہ سن چکی تھی۔ شیلا کے ساتھ شادیوں کا مخصوص شور بھی سنائی دیا تھا اور ارم نے بھی شاید کچھ سنا تھا، تب ہی چونک کر گردن اُٹھائی اور پھر قدرے بے بسی سے واپس جھکا دی۔
حیا کو اپنی جان جسم سے نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ کیا دنیا اتنی چھوٹی تھی؟
وہ اب موبائل پہ کچھ دیکھ رہا تھا، کبھی اسکرین پہ دیکھتا اور کبھی حیا اور ارم کے چہروں پہ نگاہ ڈالتا۔ صاف ظاہر تھا، وہ کچھ ملانے کی سعی کر رہا تھا، یقین دہانی، تصدیق، ثبوت سب صاف ظاہر تھا۔
پھر ایک دم وہ اُٹھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ ایک شرمندہ سی خاموشی نے سارے ماحول کو گھیر لیا۔
حیا نے سر جھکا دیا، اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت بے چین سی بیٹھی تھی۔ پاؤں اوپر صوفے پہ سمیٹے، ہاتھ میں ریموٹ پکڑے، وہ جھلائی ہوئی سی چینل بدل رہی تھی۔ مضطرب، بے بس، پریشان۔

اسمارٹ ٹی وی کی اسکرین پہ پورے میوزک کے ساتھ اشتہار چل رہا تھا۔ وہ غائب دماغی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی، جہاں موبائل کمپنی کے لوگو کے ساتھ "غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً جرم ہے۔ پی ٹی اے" لکھا آرہا تھا۔ جانے کب Pause کا بٹن اس سے دبا اور اشتہار وہیں رُک گیا۔ وہ اتنی دور بھٹکی ہوئی تھی کہ پلے بھی نہ کر سکی۔

دفعتاً دروازے میں فاطمہ بیگم کی شکل دکھائی دی۔ وہ تھکی تھکی سی اندر داخل ہو رہی تھیں۔ حیا ریموٹ پھینک کر تیزی سے اُٹھی۔

"کیا بات تھی؟ صائمہ تائی نے کیوں بلوایا تھا؟" وہ بے چینی سے ان کے قریب آئی۔

"ارم کے رشتے کے لیے جو لوگ اس روز آئے تھے"۔ وہ نڈھال سی کہتی صوفے پہ بیٹھیں۔

"ہاں، کیا ہوا انہیں"۔ وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ان کے نزدیک بیٹھی۔

"انہوں نے انکار کر دیا ہے، حالانکہ رشتہ مانگ چکے تھے"۔

اور حیا کا دل بہت اندر تک ڈوب کر اُبھرا تھا۔

"کیوں؟، کیوں انکار کر دیا؟" اس کو اپنا سانس رُکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"کوئی وجہ نہیں بتاتے۔ بس ایک دم پیچھے ہٹ گئے ہیں، صائمہ بھابھی بہت اپ سیٹ تھیں"۔

"مگر کچھ تو کہا ہوگا!"

"بس یہی کہا ہے کہ ہم نے کسی آزاد خیال اور بے پردہ لڑکی کو بہو بنا کر اپنی عاقبت نہیں خراب کرنی"۔

وہ متحیر رہ گئی۔ چند روز قبل سنا تائی کا فقرہ سماعت میں گونجا تھا۔

"جب فرقان نے سختی کی کہ بھلا ایسی بے پردہ اور آزاد خیال لڑکی کو اپنی بہو بنا کر ہم نے اپنی آخرت بگاڑنی ہے کیا، تب کہیں جا کر وہ مانا"۔

کیا اس کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں؟ کیا دوسروں کی بیٹیوں پہ اُنگلیاں اُٹھانے والوں کے اپنے گھروں پہ وہی اُٹھی اُنگلیاں لوٹ کر آتی ہیں؟ اتنی جلدی بدلے ملنے لگتے ہیں؟ مگر وہ خوش نہیں ہو پائی۔ اگر بات کھل جاتی تو اصل بدنامی تو اسی کے حصے میں آتی۔ ارم کو تو شاید اس کی ماں "حیا نے اسے بگاڑا ہے" کہہ کر درمیان سے نکال لیتی اور بات تو اب بھی کھل سکتی تھی۔ وہ ویڈیو تو اب بھی انٹرنیٹ پہ موجود تھی۔

"خیر ارم کو کونسی کمی ہے رشتوں کی!" فاطمہ بیگم اُٹھ کر کچن کی جانب چلی گئی تھیں اور وہ صوفے پہ گر سی گئی۔ ٹی وی اسکرین پہ وہ اشتہار ابھی تک رُکا ہوا تھا۔ وہ بس خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔

"غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً جرم ہے۔ پی ٹی اے"

اب شاید ارم کے لیے کبھی کوئی رشتہ نہ آئے۔ آیا بھی تو یہی ہوگا، جو اس دفعہ ہوا تھا اور ہر کوئی ان کی طرح تو نہیں ہوگا کہ بات دبا جائے۔ کسی نے منہ پہ ساری بات کر دی تو...... خدایا! وہ کدھر جائیں گی؟

"غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً جرم ہے۔ پی ٹی اے"۔

وہ بے خیالی سے اسے تکتی، سوچوں کی اُلجھن سے نکل کر ایک دم چونکی۔

"غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً جرم ہے، پی ٹی اے"۔

بجلی کا ایک کوندا سا اس کے ذہن میں لپکا تھا۔ اوہ خدایا، یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھی اور باہر کو لپکی۔

"ارم...... ارم......" بہت جوش سے چلاتے ہوئے حیا نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔

ارم موبائل پکڑے بیڈ پہ بیٹھی تھی، دروازہ کھلنے پہ گڑبڑا کر موبائل سائیڈ پہ رکھا۔

''کیا ہوا؟'' ساتھ ہی ارم نے اپنا موبائل اُلٹا کر دیا تا کہ اسکرین چھپ جائے۔

''سنو وہ ....'' تب ہی رشتے والی بات یاد آئی۔ ''اوہ آئی ایم سوری، ان لوگوں نے رشتے سے انکار کر دیا''۔

''وہ تو ویڈیو دیکھ کر کرنا ہی تھا، خیر جانے دو، اچھا ہی ہوا''۔ وہ مطمئن تھی۔ حیا کو حیرت ہوئی مگر وہ وقت حیرت ظاہر کرنے کا نہیں تھا۔ وہ جلدی سے اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

''ارم! میری بات سنو، تم نے کبھی موبائل کنکشنز کے اشتہاروں میں وہ عبارت پڑھی ہے کہ غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال جرم ہے''۔

''ہاں تو؟''

''تو کیا تمہیں معلوم ہے سم رجسٹر کروانا کیوں ضروری ہوتا ہے؟''

''کیوں؟''

''تا کہ کوئی کسی سم کا غلط استعمال نہ کر سکے، چاہے وہ دہشت گردی کی واردات میں ہو یا کسی کو رانگ کالز کرنے میں، یہ سب سائبر کرائم کے تحت آتا ہے''۔

''سائبر کرائم؟'' ارم نے پلکیں جھپکائیں۔

''ہاں اور ہر سائبر کرائم پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کو رپورٹ کیا جا سکتا ہے''۔

''کیا کہہ رہی ہو حیا! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا''۔

''ارم...... ارم...... ہماری پرسنل ویڈیو انٹرنیٹ پہ ڈال دینا بھی تو ایک سنگین جرم ہے، سائبر کرائم۔ ہم اس کی رپورٹ کر سکتے ہیں''۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟'' وہ فوراً بدکی۔ ''اگر کسی کو پتا چل گیا تو؟''

''پتا تو تب چلے گا جب ہم اس ویڈیو کو وہیں رہنے دیں، چار دن سے میں سولی پہ لٹکی ہوں، اب اس مسئلے کو ختم ہو جانا چاہیے''۔

''مگر...... مگر ہم کس کو رپورٹ کریں گے؟'' وہ نیم رضا مند ہوئی تو حیا نے جھٹ اپنا موبائل نکالا۔

''پی ٹی اے کو، دروازہ بند کرو، میں اپنے کنکشن کی ہیلپ لائن سے پی ٹی اے کا نمبر لیتی ہوں''۔

ارم دوڑ کر دروازہ بند کر آئی اور حیا نمبر ملانے لگی۔

پی ٹی اے کی ہیلپ لائن کا نمبر آسانی سے مل گیا، مگر آپریٹر نے نہایت شائستگی سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ اس قسم کا سائبر کرائم کسی انٹیلی جنس ایجنسی کے سائبر کرائم سیل کو رپورٹ کرنا ہوگا۔ حیا نے ان سے ملک کی سب سے بڑی سرکاری، سویلین ایجنسی کے سائبر کرائم سیل کا ای میل ایڈریس لے تو لیا مگر اب وہ متذبذب بیٹھی تھی۔

''یہ انٹیلی جنس والے خطرناک لوگ ہوتے ہیں ارم!''

''مگر اب یہ کرنا تو ہے نا!''

اور واقعی کرنا تو تھا۔

ارم نے لیپ ٹاپ کھولا اور پھر بہت بحث و تمحیص کے بعد انہوں نے ایک کمپلینٹ لکھی اور اس پتے پہ بھیج دی جو پی ٹی اے سے ان کو ملا تھا۔

بمشکل دس منٹ ہی گزرے تھے کہ حیا کا موبائل بجا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ چمکتی اسکرین پہ انگریزی میں پرائیویٹ نمبر کالنگ Private number calling لکھا آ رہا تھا۔ ساتھ کوئی نمبر وغیرہ نہیں تھا۔ اس کے موبائل پہ نام اور نمبر دونوں آتے تھے اور اسے نہیں یاد تھا کہ کبھی کوئی نمبر اس نے پرائیویٹ نمبر کے نام سے محفوظ کیا ہو اور عجیب بات تو یہ تھی کہ نمبر تو سرے سے آ ہی نہیں رہا تھا۔

''یہ کون ہو سکتا ہے؟'' اس نے اچنبھے سے موبائل کان سے لگایا۔

''ہیلو''۔ دوسری جانب ذرا دیر خاموشی کے بعد ایک بھاری گمبھیر آواز سنائی دی۔

''السلام علیکم، مس حیا سلیمان؟''

"ج...جی..... آپ کون؟"

"میں میجر احمد بات کر رہا ہوں، سائبر کرائم سیل سے۔ آپ نے ہماری ایجنسی میں رپورٹ کی ہے، ہمیں ابھی آپ کی کمپلینٹ موصول ہوئی ہے"۔

وہ جو بھی تھا، بہت خوب صورت بولتا تھا۔ گہرا، گمبھیر، مگر نرم لہجہ جس میں ذرا سی چاشنی بھری تپش تھی۔ گرم اور سرد کا امتزاج۔

"مگر..... میجر احمد..... میں نے کمپلینٹ میں اپنا نمبر تو نہیں لکھا تھا"۔ وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ ارم بھی حیرت بھرے خوف سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ جواباً وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"نمبر تو بہت عام سی چیز ہے مس سلیمان! میں تو آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں"۔

"کیا؟"

"یہی کہ آپ سلیمان اصغر کی بیٹی ہیں۔ آپ کے والد کی ایک کنسٹرکشن کمپنی ہے۔ آپ کا بھائی روحیل جارج میسن یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ خود آپ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ایل ایل بی آنرز شریعہ اینڈ لاء کے پانچویں سال میں ہیں۔ فروری میں آپ ایکسچینج پروگرام کے تحت استنبول جا رہی ہیں، غالباً سبانجی یونیورسٹی میں اور پچھلے ہفتے اپنے کزن داور فرقان کی مہندی کے فنکشن پہ بننے والی ویڈیو کی انٹرنیٹ پہ اپ لوڈنگ کو آپ نے رپورٹ کیا ہے۔ از دیٹ رائٹ میم؟"

وہ جو دم بخود سی سنتی جا رہی تھی، بمشکل بول پائی۔

"جی..... جی، وہی ویڈیو"

"اب آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"یہی کہ آپ اسے اس ویب سائٹ سے ہٹا دیں"۔ اس کی آواز میں بہت مان، بہت منت بھر آئی تھی۔

"او کے اور کچھ؟"

"اور..... اور جن لوگوں کے پاس اس کی سی ڈی ہے وہ بھی....." آگے اس کا گلا رندھ گیا، احساس توہین سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

"میں شہر کے ایک ایک بندے سے وہ ویڈیو نکلوا لوں گا، آپ بے فکر رہیے"۔ اور اسے لگا منوں بوجھ اس کے اوپر سے اتر گیا ہو۔

"تھینک یو میجر احمد"۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ فون رکھنے ہی والی ہے کہ وہ کہہ اٹھا۔

"تھینک یو تو آپ تب کہیں جب میں یہ کام کر دوں اور اس کام کو محض شروع کرنے کے لیے بھی مجھے آپ کا تعاون چاہیے"۔

"کیسا تعاون؟"

"مادام! آپ کو ذرا سی تکلیف کرنی ہوگی، آپ کو اس ویڈیو کی باقاعدہ رپورٹ کرنے کے لیے میرے آفس آنا ہوگا"۔

"کیا؟ نہیں نہیں، میں نہیں آسکتی۔ وہ پریشانی سے ہکلا گئی۔ ارم بھی فکرمندی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

"پھر تو یہ کام نہیں ہو پائے گا۔ ایسے اسٹیپ فون پہ نہیں لیے جاتے"۔ اسے لگا، وہ محظوظ سا مسکرا رہا تھا۔

"مم..... مگر میں نہیں آسکتی"۔ اور وہ کیسے آسکتی تھی؟ کسی کو پتا چل جاتا تو کتنی بدنامی ہوتی۔

"آپ کو آنا پڑے گا، میں گاڑی بھیج دیتا ہوں"۔

"نہیں نہیں، اچھا خدا حافظ"۔ اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔

"بھاڑ میں گیا یہ اور اس کا سائبر کرائم سیل۔ اگر ابا یا تایا فرقان کو پتا لگ گیا کہ ہم ایک ایجنسی کے ہیڈ کوارٹرز گئے ہیں،..... تو ہماری ٹانگیں توڑ دیں گے وہ"۔

"میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ رپورٹ نہ کرو"۔

پرائیوٹ نمبر سے پھر کال آنے لگی تھی۔ اس نے جھنجھلا کر فون ہی آف کر دیا۔ اس ویڈیو سے زیادہ میجر احمد نے اسے بلیک میل کیا

ہے۔ یہ خیال پھر پورا دن اس کے ذہن میں گونجتا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت تھکی ہوئی پاسپورٹ آفس سے نکلی تھی۔ اسلام آباد سے پنڈی کا اتنا لمبا اور رش بھری سڑک پہ تھکا دینے والا سفر کر کے وہ آج پاسپورٹ آفس اپنا پاسپورٹ اُٹھانے آئی تھی، مگر یہاں علم ہوا کہ چودہ جنوری کو ہی پاسپورٹ مل پائے گا اور ابھی چودہ جنوری میں ہفتہ رہتا تھا۔ کوئی تکنیکی مسئلہ تھا، جس کے باعث اسلام آباد والے پاسپورٹ آفس میں پاسپورٹ کا کام رکا ہوا تھا۔ تبھی اسے پنڈی میں اپلائے کرنا پڑا تھا۔

واپسی پہ بھی اتنا ہی رش تھا۔ کچھ شاپنگ کے بعد جب وہ مری روڈ پہ آئی تو مغرب چھا رہی تھی۔ سڑک گاڑیوں سے بھری پڑی تھی اور گاڑیوں کا یہ سیلاب بہت سست روی سے بہہ رہا تھا۔ سگنل پہ اس نے گاڑی روکی اور شیشے کھول دیے۔ اس کا ذہن ابھی تک پاسپورٹ میں اُلجھا تھا۔

اگر چودہ جنوری کو پاسپورٹ ملے تو بھی ویزا لگتے لگتے بہت دیر ہو جائے گی۔ ابھی ٹکٹس نہیں آئے تھے مگر کچھ اندازہ تو تھا کہ فروری کے آغاز میں اسے ترکی جانا ہے، یعنی کم وبیش پندرہ دن اس کو ویزے کے لیے ملتے اور ترکی کا ویزا تو بھی پندرہ دن میں نہیں لگ پاتا، پھر؟

وہ انہی سوچوں میں اُلجھی تھی، یکا یک کوئی اس کی کھلی کھڑکی پہ جھکا۔

''سوہنیو ...... کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ بری طرح چونکی اور سر اُٹھا کر دیکھا۔

وہ وہی تھا، ڈولی چم چم کرتے ہرے لباس میں ملبوس وگ والے بالوں کا جوڑا اور شوخ میک اپ۔

ناگواری کی ایک لہر اس کے چہرے پہ سمٹ آئی۔ اسے بھول گیا کہ کبھی ڈولی نے اس پہ کوئی احسان کیا تھا۔

''ہٹو سامنے سے''۔ وہ جھڑک کر بولی تھی۔ وہ کھلی کھڑکی میں کچھ یوں ہاتھ رکھے کھڑا تھا کہ وہ شیشہ اونچا کر ہی نہیں سکتی تھی۔

''لو باجی! میں تو سلام دعا کرنے آئی تھی اور آپ تو غصہ ہو رہی ہو''۔ اس روز والے سخت تاثرات ڈولی کے چہرے پہ نہیں تھے بلکہ اس کے میک اپ سے اٹے چہرے پہ سادگی و معصومیت تھی۔ کراہیت بھری سادگی اور معصومیت!

''ہٹو سامنے سے، ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔'' اسے غصہ آنے لگا تھا اور بے بسی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت کر ڈالے۔

''ہائے باجی! ڈولی سے ایسے بات کرتی ہو؟ اور آپ کی تریفیں (تعریفیں) کر کر کے ڈولی نے میرا سر کھا لیا تھا''۔

اس نے آواز پہ گردن گھما کر دیکھا تو فرنٹ سیٹ کی کھلی کھڑکی پہ ایک اور خواجہ سرا ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ ڈولی کی سیاہ رنگت کی نسبت اس کا رنگ ذرا صاف تھا۔ چہرے پہ البتہ اس نے بھی سوکھے آٹے کی طرح فیس پاؤڈر تھوپ رکھا تھا، مگر شوخ سرخ رنگ کی قمیص کی آستینوں سے جھلکتے بازوؤں پہ شاید وہ کچھ لگانا بھول گیا تھا، وہ دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ میں دیے جھکا کھڑا تھا۔

''یہ...... کون ہو تم؟ ہٹو میری گاڑی سے''۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ وہ تنہا تھی اور ٹریفک بلاک، سامنے کوئی ٹریفک پولیس مین بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یہ جی میری بہن ہے پنکی۔ بڑا شوق تھا اسے آپ سے ملنے کا۔ ایک بڑی ضروری بات کرنی تھی جی ہمیں آپ سے''۔

''گیٹ لاسٹ''۔ اس نے بازو بڑھا کر فرنٹ ڈور کا شیشہ اونچا کرنا چاہا، مگر پنکی نے اپنا ہاتھ اندر کر دیا۔ ایک دم سے اس کی کلائی سامنے آئی تھی۔ حیا نے دیکھا، پنکی کی کلائی پہ ایک گلابی سرخ سا ایک انچ کا کاٹا بنا تھا، جیسے جلا ہو، یا شاید برتھ مارک تھا۔

''ہٹو...... آئی سے گیٹ لاسٹ''۔ وہ عالم طیش میں فرنٹ ڈور کا شیشہ اوپر کرنے لگی، مگر پنکی نے اس پہ ہاتھ رکھ دیے تھے۔ شیشہ اوپر نہیں ہو پا رہا تھا۔

''باجی! ایسے تو نہ کرو پنکی نال۔ اس کا ہاتھ زخمی ہو جائے گا جی''۔ ڈولی نے پیچھے سے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پہ رکھا تو وہ تیورا کر گھومی اور زور سے ڈولی کو دھکا دیا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھا، سولڑ کھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ اسے چند سیکنڈ لگ گئے اور اس

نے جلدی جلدی اپنی طرف کا شیشہ چڑھا دیا۔

"اب تم بھی ہٹو ادھر سے، ورنہ میں لوگوں کو اکٹھا کرلوں گی"۔ وہ بازو بڑھا کر پنکی کی طرف والا شیشہ بند کرنے لگی مگر وہ اڑ ہی گیا تھا۔

"باجی جی میں تو تہانوں ڈولی کے دل کی بات بتانے آئی تھی اور تساں اس طرح کر رہے ہو، یہ جو ڈولی ہے نا، یہ بڑا پسند کرتی ہے آپ کو مگر اقرار نہیں کرتی"۔ پنکی مصنوعی انداز میں بن بن کر بول رہا تھا۔

پیچھے ڈولی بند شیشہ بجانے لگا تھا۔

"شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ"۔ وہ پوری قوت سے شیشہ اوپر چڑھانے لگی۔ پنکی کی انگلیاں جو شیشے کے کنارے سے لگی تھیں، ساتھ ساتھ اوپر اٹھنے لگیں۔

"باجی جی..... گل تو سنو"۔ ڈولی گھوم کر پنکی کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔

اسی اثنا میں اشارہ کھل گیا۔ گاڑیاں آگے بڑھنے لگیں۔ حیا کی گاڑی رکی کھڑی تھی۔ عقب میں گاڑیوں کے ہارن بجنے لگے، مگر دور کھڑا پولیس مین خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا، مدد کے لیے آگے نہ بڑھا۔

ڈولی نے پنکی کے کندھے پہ ہاتھ مار کر چلنے کا اشارہ کیا۔ پنکی نے لمحے بھر کو گردن موڑ کر ڈولی کو دیکھا تو اس کی گرفت شیشے پہ ذرا ڈھیلی ہوئی۔ حیا نے عالم طیش میں فوراً شیشہ اوپر چڑھایا۔ پنکی نے چونک کر دیکھا، پھر انگلیاں کھینچنی چاہیں مگر وہ مستقل مزاجی سے شیشہ اوپر کس رہی تھی۔ پنکی کی انگلیاں پھنس کر رہ گئی تھیں۔

"اوہ چھوڑ دو باجی جی!" پنکی جھنجھلا کر ہاتھ کھینچ رہا تھا مگر انگلیاں نکل کر نہیں دے رہی تھیں۔

ڈولی نے غصے سے شیشہ بجایا مگر حیا تنفر سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بازو لمبا کیے شیشہ آخری حد تک لے گئی تھی۔ عقب میں گاڑیوں کی قطار ہارن پہ ہارن دے رہی تھی، کچھ گاڑیاں ساتھ سے نکلنے لگی تھی۔

دفعتاً پنکی کے دائیں ہاتھ کی انگلی سے خون کی بوند ٹپک کر شیشے پہ لڑھکی تو اسے جیسے ہوش آیا۔ ایک جھٹکے سے اس نے لیور نیچے کیا۔ شیشہ ایک انچ نیچے گرا۔ پنکی نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے ہاتھ باہر کھینچے۔ گاڑی آگے بھگانے سے قبل اس نے بہت غور سے پنکی کے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ دائیں ہاتھ، جس کی کلائی پر کانٹے کا جلا ہوا نشان تھا، کی شہادت کی انگلی سے خون نکلا تھا اور باقی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے اوپر پوروں کی قدرتی لکیر پہ موٹی سی بھوری لکیر بن گئی تھی۔ یقیناً اس کے ہاتھ زخمی ہوئے تھے مگر اسے پروا نہیں تھی۔

وہ زن سے گاڑی آگے لے گئی، پھر اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ وہ دونوں خواجہ سرا بار بار مڑ مڑ کر اسے غصے سے دیکھتے سڑک پار کر رہے تھے۔ ڈولی نے پنکی کا زخمی ہاتھ تھام رکھا تھا اور غصے سے پلٹ کر حیا کی دور جاتی گاڑی کو دیکھتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر ایکسیلیٹر پہ زور بڑھا دیا۔ کم از کم اتنی امید اسے ضرور تھی کہ اب وہ ڈولی اس کا پیچھا کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

بہت جلد وہ غلط ثابت ہونے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

"حیا..... حیا.....!" جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی، لاؤنج میں بیٹھے سلیمان صاحب تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ ان کے چہرے پہ غیظ و غضب چھایا تھا۔

وہ ڈر کر پیچھے ہٹی۔ تب ہی پیچھے کہیں فون کی گھنٹی بجی۔

"یہ ویڈیو تمہاری ہے؟ تم..... تم مجرے کرتی ہو!" روحیل جو صوفے پہ بیٹھا تھا، ایک دم اٹھا اور بہت سی سی ڈیز اس کی طرف اچھالیں۔ وہاں سب موجود تھے۔ تایا فرقان، داور بھائی، روحیل..... سب..... اور ایک طرف ارم زمین پہ بیٹھی رو رہی تھی۔ دور کہیں فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

"نہیں..... نہیں....." وہ سر ہلاتے ہوئے خوف سے ان کو کہنا چاہتی تھی۔ اس کا منہ تو ہلتا تھا لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ سب اس کا خون لینے پہ تلے تھے۔

دفعتاً سلیمان صاحب آگے بڑھے اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پہ دے مارا۔

"بے حیا..... بے حیا"۔ اسے تھپڑوں سے مارتے ہوئے سلیمان صاحب کہہ رہے تھے۔ ان کے لب ہل رہے تھے مگر ان سے آواز ڈولی کی نکل رہی تھی۔ وہ سلیمان صاحب نہیں، ڈولی بول رہی تھی..... ڈولی..... ڈولی..... پنکی..... بے حیا..... پنکی کی انگلیاں..... فون کی گھنٹی.....

وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کیا۔ زردی روشنی ہر سُو پھیل گئی۔

اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھوا۔ وہ ٹھیک تھی۔ سب ٹھیک تھا۔ کسی کو کچھ علم نہیں ہوا تھا۔ وہ سب ایک بھیانک خواب تھا۔

"اوہ خدایا"۔ وہ نڈھال سی بیڈ کراؤن کے ساتھ پیچھے جا لگی۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔ دل ویسے ہی دھڑک رہا تھا۔ پورا جسم پسینے میں بھیگا تھا۔

فون کی مخصوص ٹون اسی طرح بج رہی تھی۔ ہاں، بس وہ گھنٹی خواب نہیں تھی۔

اس نے سائیڈ ٹیبل سے موبائل اُٹھایا اور چمکتی اسکرین کو دیکھا۔

"پرائیوٹ نمبر کالنگ"۔

چند لمحے لگے تھے اسے ایک فیصلے پہ پہنچنے میں اور پھر اس نے فون کان سے لگا لیا۔

"میجر احمد! میں آپ کے آفس آ کر رپورٹ کروانے کے لیے تیار ہوں، کل صبح نو بجے میرے گھر کی بیک سائیڈ پہ موجود گراؤنڈ کے انٹرنس گیٹ پہ گاڑی بھیج دیں، نو بجے، شارپ"۔

"شیور!" اسے فاتحانہ لہجہ سنائی دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے فون بند کر دیا۔

کبھی بھی وہ کسی لڑکے سے یوں تنہا نہیں ملی تھی، مگر نہ ملنے کی صورت میں وہ ویڈیو کبھی نہ کبھی لیک ہو جاتی تو زیادہ برا ہوتا۔

اس نے بے اختیار جھرجھری لی۔ اس خوف ناک خواب نے اسے یہ سب کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اسے لگا، اب اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ رہا میجر احمد، تو اس سے وہ نپٹ لے گی۔

☆ ☆ ☆

پلے گراؤنڈ کے گیٹ کے ساتھ توت کا تناور درخت تھا۔ وہ اس سے ٹیک لگائے منتظر کھڑی تھی۔ سرخ لمبی اے لائن قمیص اور نیچے چوڑی دار پاجامہ۔ اوپر اسٹائلش سا سرخ سوئیٹر جس کی لمبی آستین ہتھیلیوں کو ڈھانپ کر انگلیوں تک آتی تھیں اور کندھوں پہ براؤن چھوٹی سی اسٹول نما شال۔ لمبے بال پیچھے کمر پہ گر رہے تھے، سردی اور دھند میں وہ مضطرب سی کھڑی، سرخ پڑتی ناک۔ لیے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑ رہی تھی۔

ارم یا زارا..... اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ یہ خطرہ اس کو اکیلے مول لینا تھا۔

دفعتاً اس نے بے چینی سے کلائی سے سوئیٹر کی آستین پیچھے ہٹائی اور گھڑی دیکھی۔ نو بجنے میں ایک منٹ تھا۔

اسی پل زن سے ایک کار اس کے سامنے رُکی۔ سیاہ پرانی مرسڈیز، اور کسی بت کی طرح سامنے سیدھ میں دیکھتا ڈرائیور۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے آگے بڑھی اور پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ اس کے دروازہ بند کرتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بھگا دی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ سیف ہاؤس پہنچی۔

سفید دیواروں والا خالی کمرا، درمیان میں لکڑی کی میز اور کرسی، جس پہ اسے بٹھایا گیا۔ میز پہ فقط ایک ٹیلی فون رکھا تھا۔ باقی پورا کمرا خالی تھا۔

وہ مضطرب سی گردن اِدھر اُدھر گھما کر دیکھنے لگی۔ تین طرف سفید دیواریں تھیں، ان میں سے ایک دیوار میں وہ دروازہ تھا، جہاں

سے وہ آئی تھی۔ البتہ چوتھی سمت اس کے بالمقابل دیوار شیشے کی بنی تھی۔ دراصل وہ شیشے کی اسکرین تھی، جو زمین سے لے کر چھت تک پھیلی تھی۔ شاید وہ چھوٹا خالی کمرا کسی بڑے کمرے کا حصہ تھا، جس میں شیشے کی اسکرین لگا کر پارٹیشن کر دیا گیا تھا۔

اس نے ذرا غور سے اسکرین کو دیکھا۔ اس کا شیشہ مکمل طور پر دھندلا کر دیا گیا تھا۔ جیسے مشین پھیر کر frosted کیا جاتا ہے۔ اس دھندلے شیشے کے اس پار ایک دھندلا سا منظر تھا۔ ہر شے اتنی مبہم اور دھندلی تھی کہ وہ بمشکل ایک خاکہ بنا پا رہی تھی۔ یقیناً وہ شیشہ ایک کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے درمیان میں لگایا گیا تھا اور اس کے پار کمرے کا باقی حصہ تھا۔

بس ایک دھندلا سا خاکہ سمجھ میں آتا تھا۔ شیشے کے اس پار کوئی بڑا، پرتعیش سا آفس تھا اور آفس ٹیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر پہ کوئی بیٹھا تھا۔ اس کا رُخ حیا کی جانب ہی تھا۔ اس کا چہرہ واضح نہ تھا، بس ایک دھندلی سی آؤٹ لائن ہی بنی تھی۔ خاکی یونیفارم، سر پہ کیپ، ٹیک لگا کر کرسی پہ بیٹھا، میز پہ رکھی کوئی چیز انگلیوں میں گھماتا، وہ کس طرف دیکھ رہا تھا، وہ فیصلہ نہ کر پائی۔ اس کا رُخ تو سامنے حیا کی جانب ہی تھا، شاید دیکھ بھی اسی کو رہا تھا مگر اس کی آنکھیں واضح نہ تھیں، واضح تھی تو بس ایک چیز، اس آفیسر کے گندمی چہرے کے دائیں طرف والے آدھے حصے پہ ایک بدنما سی کالک، جیسے آدھا چہرہ جھلس گیا ہو۔

دفعتاً وہ شخص آگے کو جھکا اور میز سے کچھ اٹھا کر کان سے لگایا۔ غالباً فون کا ریسیور۔

"ٹرن.....ٹرن"۔

یک دم حیا کے سامنے میز پہ رکھا فون بجنے لگا۔ وہ چونکی۔ فون مسلسل بج رہا تھا، کیا وہ شخص اسے کال کر رہا تھا؟ اس نے دھڑکتے دل سے ریسیور اٹھایا اور کان سے لگایا۔

"ہیلو!"

"السلام علیکم مس حیا سلیمان! دس از میجر احمد"۔ وہی بھاری، نرم گرم سا خوب صورت لہجہ۔

"وعلیکم السلام!" وہ فون ہاتھ میں پکڑ کر کان پہ رکھے، یک ٹک سامنے اسکرین کو دیکھ رہی تھی، جس کے پار آدھے جھلسے چہرے والا آفیسر فون تھامے بیٹھا تھا۔ کیا وہی میجر احمد تھا؟

"میں امید کرتا ہوں کہ ہم نے آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دی"۔

"جی"۔ اسے گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔

"میرے سامنے لیپ ٹاپ پہ تمام سسٹم کھلا ہوا ہے۔ مجھے ایک کلک کرنا ہے اور آپ کی ویڈیو صفحۂ ہستی سے یوں مٹ جائے گی، جیسے کبھی بنائی ہی نہیں گئی تھی"۔

دیوار کے پار اس دھندلے منظر میں بیٹھے اس آفیسر کے سامنے بھی ایک لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا تو وہ میجر احمد تھا؟ مگر سامنے کیوں نہیں آتا تھا؟

"اور شہر کے ایک ایک بندے سے میں یہ ویڈیو نکلوا چکا ہوں۔ بولیے حیا! میں کلک کر دوں؟"

"اور.....وہ رپورٹ؟"

"سمجھیں، وہ درج ہو گئی"۔ اسے لگا، وہ مسکرایا تھا۔

"مگر..... آپ نے کہا تھا کہ مجھے رپورٹ کے لیے....."

"غلط کہا تھا، ایکسکیوز بنایا تھا۔ بعض اوقات بہانے بنانے پڑتے ہیں، تب جب مزید صبر نہیں ہوتا، سمجھیں؟"

فون کو جکڑا، اس کا ہاتھ پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ یہ شخص اتنی عجیب باتیں کیوں کر رہا تھا؟

"آپ..... کلک کر دیں"۔ بمشکل وہ کہہ پائی۔ وہ شخص جھکا، شاید بٹن دبائے اور پھر واپس پیچھے ہو کر بیٹھا۔

"کر دیا!"

"اوہ تھینک یو میجر احمد!" اس کا گلا رندھنے لگا تھا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''جی؟''

''کیا یہ ویڈیو جعلی تھی؟''

''نہیں، تھی تو اصلی''۔

''تو آپ اتنی ڈر کیوں رہی تھیں؟''

''ظاہر ہے یہ ہماری فیملی ویڈیو تھی اور شادیوں پہ ڈانسز کی ویڈیو ہم نہیں بنواتے''۔

''کیوں؟'' وہ پے در پے سوالات کر رہا تھا۔

''کیا مطلب کیوں؟ شادیوں کی ویڈیو سرکولیٹ ہوتی ہیں، ہر جگہ، کیا اچھا لگتا ہے ہماری ڈانس کی ویڈیو پرائے لوگ دیکھیں؟''

''مگر پرائے لوگ لائیو تو دیکھ سکتے ہیں، غالباً اس ویڈیو میں مجھے ویٹرز، موی میکر اور ڈی جے نظر آ رہے تھے، وہ بھی تو پرائے مرد ہیں نا؟ میں سمجھ نہیں پایا کہ اگر آپ اس طرح رقص کرنے کو صحیح سمجھتی ہیں تو ویڈیو کے باہر نکلنے پہ پریشان کیوں تھیں؟ چاہے موی میکر، ویٹر، ڈی جے دیکھیں یا انٹرنیٹ پہ موجود مرد، بات تو ایک ہی ہے اور اگر آپ اس کو غلط سمجھتی ہیں تو آپ نے یہ کیا ہی کیوں؟''

''میں آپ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں''۔ وہ درشتی سے بولی تو چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

''ٹھیک کہا آپ نے، خیر!'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھیے!'' اب کے اس کی آواز میں اجنبیت در آئی تھی۔

''کبھی کوئی آپ کے لیے جنت کے پتے توڑ کر لایا ہے؟''

''ہم دنیا والوں نے جنتیں کہاں دیکھی ہیں میجر احمد!'' اس کے چہرے پہ تلخی رقم تھی۔

''تب ہی تو ہم دنیا والے جانتے ہی نہیں کہ جنت کے پتے کیسے دکھتے ہیں۔ کبھی کوئی آپ کو لا دے تو انہیں تھام لیجئے گا۔ وہ آپ کو رسوا نہیں ہونے دیں گے''۔

اس کے چہرے کی تلخی سکوت میں ڈھلتی گئی۔ وہ ٹھہر سی گئی، دھندلی دیوار ابھی تک اس کے سامنے تھی۔ کون تھا اس پار؟

''آپ سن رہی ہیں؟''

''ہوں...... جی...... جی''۔ وہ چونک کر سنبھلی۔ ''میں چلتی ہوں''۔ وہ ریسیور کان سے ہٹانے ہی لگی تھی کہ وہ کہہ اُٹھا۔

''ایک منٹ، ایک آخری سوال کرنا ہے مجھے''۔

وہ اُٹھتے اُٹھتے واپس بیٹھ گئی۔ ''جی پوچھئے!''

''آپ مجھ سے شادی کریں گی؟''

اسے زور کا دھچکا لگا تھا۔ وہ گنگ سی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دھندلی دیوار کو دیکھے گئی۔

''بتائیے مس حیا!''

اس کے لب بھینچ گئے۔ حیرت اور شاک پہ غصہ غالب آ گیا۔

''مس حیا نہیں، مسز حیا!'' چبا چبا کر ایک ایک لفظ بولتی، وہ پرس تھام کر اُٹھی۔ فون کا ریسیور ابھی تک پکڑ رکھا تھا۔

''کیا مطلب؟'' وہ واضح چونکا تھا۔

''افسوس کہ میرے بارے میں اتنی معلومات رکھنے کے باوجود آپ میرے بچپن کے نکاح کے بارے میں لاعلم ہیں۔ وہ نکاح جو میرے کزن جہان سکندر سے میرا بچپن میں ہی پڑھا دیا گیا تھا۔ میں شادی شدہ ہوں اور میرا شوہر ترکی میں رہتا ہے''۔

''اوہ آپ کی وہ رشتہ دار فیملی جو کبھی پاکستان نہیں آئی؟ جانتا ہوں، آپ کی پھپھو کا خاندان جو ذلت اور شرمندگی کے مارے اب شاید کبھی ادھر کا رُخ نہیں کرے گا، آخر کارنامہ بھی تو بہت شرمناک انجام دیا تھا نا۔ ان کا انتظار کر رہی ہیں آپ؟ ارے بچپن کا نکاح تو کورٹ

کی ایک ہی پیشی میں ختم ہو جاتا ہے"۔

"شٹ اَپ، جسٹ شٹ اَپ میجر احمد!" وہ چلائی تھی۔ "آپ کی ہمت بھی کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی؟ ارے بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کی وہ ویڈیو، آپ بھلے اسے ٹی وی پہ چلوا دیں، مجھے پروا نہیں۔ میرا ایک کام کرنے کی اتنی بڑی قیمت وصولنا چاہتے ہیں آپ؟ رہا جہان سکندر، تو وہ میرا شوہر ہے اور مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ اس کے علاوہ میری زندگی میں کوئی نہیں آ سکتا، سمجھے آپ"۔

ریسیور واپس پٹخنے سے قبل اس نے دوسری جانب سے اس کا سوگواریت بھرا قہقہہ سنا تھا۔ پیر پٹخ کر وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ اسی پل دروازہ کھول کر ایک سپاہی اندر داخل ہوا، جو اسے اندر بٹھا کر گیا تھا، گویا اسے فوراً اشارہ کر دیا گیا تھا۔ ملاقات ختم ہو چکی تھی اور حیا کے لیے وہ بے حد تلخ ثابت ہوئی تھی۔

"گاڑی آپ کا انتظار کر رہی ہے میم! آیئے"۔ وہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ حیا نے گردن موڑ کر دیکھا۔

دھند کے اس پار وہ آدھے سیاہ چہرے والا شخص میز پہ جھکا کچھ کر رہا تھا۔ شاید کچھ لکھ رہا تھا۔ اسے لگا اس نے اس کی میز پہ کسی سرخ شے کی جھلک دیکھی ہے۔ شاید سرخ گلابوں کے گلدستے کی یا شاید یہ اس کا وہم تھا۔

جس لمحے وہ اس پرانی مرسڈیز کی پچھلی نشست پہ بیٹھی تو کھلے دروازے سے اسی سپاہی نے جھک کر ایک سرخ گلابوں کا بوکے اسے تھمایا۔ گو کہ اس کے ساتھ کوئی خط نہ تھا اور وہ پھول ان سفید گلابوں سے قطعاً مختلف تھے، پھر بھی اسے یقین ہو گیا کہ وہ گمنام خطوط بھیجنے والا میجر احمد ہی تھا اور وہ اسے بہت پہلے سے جانتا تھا۔

"یہ جا کر اپنے میجر احمد کے منہ پہ دے مارو"۔ اس نے بوکے واپس سپاہی کے بازوؤں میں پھینکا اور دروازہ کھٹاک سے بند کیا۔ مرسڈیز زن سے آگے بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"حیا..... حیا"۔

شام میں ارم بھاگتی ہوئی آئی۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

"وہ ویڈیو اس ویب سائٹ سے ریموو ہو گئی ہے"۔ اس نے فرطِ جذبات سے تقریباً ہیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی حیا کو جھنجھوڑ ہی دیا تھا۔

"مگر کیسے ہوا یہ سب؟"

"اس ویب سائٹ والے کو خوفِ خدا آ گیا ہو گا، مجھے کیا پتا"۔ وہ لاپروائی سے انجان بن گئی۔

"ہوں شاید، مگر اچھا ہی ہوا، اوہ ہاں! تمہاری ترکی کی کب فلائٹ ہے؟"

"پتا نہیں، پہلے پاسپورٹ تو ملے، پھر ہی ویزا ملے گا"۔ اس کو ارم کی موجودگی سے کوفت ہونے لگی تھی۔ کچھ اس کے تاثرات سے ہی ظاہر تھا، ارم جلد ہی اٹھ کر چلی گئی۔ وہ پھر سے اپنی سوچوں میں اُلجھ گئی۔

میجر احمد..... اس کا آدھا جھلسا چہرہ..... سامنے نہ آنا..... پردے کے پیچھے سے بات کرنا..... اور وہ اس کی عجیب فلسفیانہ باتیں..... جنت وغیرہ کا تذکرہ..... باز پرس کرنا..... اور پھر شادی کا سوال، اوہ خدایا..... کیسا عجیب آدمی تھا وہ..... اور..... اور اس کی ایک بات جس کے بارے میں وہ اس وقت شدید عالمِ طیش میں ہونے کے باعث سوال نہیں کر سکی تھی۔

"آپ کی پھپھو کا خاندان جو ذلت اور شرمندگی کے مارے اب شاید کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ آخر کارنامہ بھی تو بہت شرمناک سرانجام دیا تھا نا"۔

کیوں کہی تھی اس نے یہ بات؟ کیسی ذلت و شرمندگی؟ کیسا شرمناک کارنامہ؟

پھپھو کا خاندان واقعتاً پلٹ کر نہیں آیا تھا، تو کیا اس کی وجہ ان کی اپنے ملک اور خاندان سے بیزاری نہیں تھی، جیسا کہ وہ قیاس کرتی تھی، بلکہ کوئی اور تھی؟ کوئی ذلت آمیز کام جو انہوں نے سرانجام دیا تھا؟ اور انہوں نے کس نے؟ پھپھو؟ ان کے شوہر؟ یا جہان سکندر

نے؟ کیا تھی بھلا؟ مگر میجر احمد سے وہ استفسار کر نہیں سکتی تھی، نہ ہی اس کا دوبارہ کوئی فون آیا تھا۔۔۔۔۔ پھر؟
اور وہ خطوط۔۔۔۔۔ وہ گلدستے۔۔۔۔۔ وہ بھی اسی نے بھیجے تھے۔ اسے اس کی سبانجی جانے کا کیسے علم ہوا؟ یقیناً وہ اس کی کال ٹیپ کر رہا تھا جب ڑارا کو اس نے بتایا تھا اور وہ اس وقت یقیناً اس کے گھر کے باہر ہی ہوگا، مگر وہ گلدستہ تو کچن کی ٹیبل پہ رکھا تھا۔ تو کیا وہ ان کے گھر بھی داخل ہو سکتا تھا؟ اور اس کے کمرے میں بھی؟

خوف کی ایک لہر نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ اُٹھ کر کمرے کا دروازہ لاک کرنے ہی لگی تھی کہ فاطمہ بیگم دروازہ کھول کر اندر آئیں۔

''حیا۔۔۔۔۔ تمہارے ابا تمہیں بلا رہے ہیں''۔

''او کے، آ رہی ہوں''۔ اس نے تکیے پہ رکھا دوپٹہ اُٹھا کر گلے میں ڈالا، سلیپرز پہنے اور باہر آئی۔

''ابا؟'' اس نے اُنگلی کی پشت سے ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''آ جاؤ حیا''۔

اس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے بیڈ پہ سلیمان صاحب بیٹھے تھے۔ سوچ میں ڈوبے، متفکر، اس کے منتظر۔۔۔ ساتھ ایک طرف صوفے پہ فاطمہ بیگم موجود تھیں۔ ان کی خوب صورت آنکھیں سوگوار تھیں اور باوقار سراپے پہ افسردگی چھائی تھی۔

''آپ نے بلایا تھا ابا؟''

''ہاں، آؤ بیٹھو''۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے چلتی ہوئی آئی اور بیڈ کی پائنتی پہ ٹک گئی۔ سلیمان صاحب چند لمحے خاموش رہے، شاید وہ کوئی تمہید سوچ رہے تھے مگر حیا کو اُمید تھی کہ وہ بنا تمہید کے ہی سیدھی بات کر ڈالیں گے۔

''میں نے ایک فیصلہ کیا ہے''۔

اس نے گردن اُٹھائی۔ وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

''اب تمہیں کورٹ کے ذریعے سبین کے بیٹے سے خلع لے لینی چاہیے''۔

کوئی اس کے منہ پہ چابک دے مارتا، تب بھی شاید اسے اتنا درد نہ ہوتا، جتنا اب ہوا تھا۔

''میں نے وکیل سے بات کر لی ہے۔ عدالت کی ایک پیشی میں علیحدگی ہو جائے گی اور جتنے بے زار وہ لوگ ہم سے ہیں، یقیناً انہیں اس بات سے بہت خوشی ہوگی''۔

اس نے شاکی نگاہوں سے ماں کو دیکھا تو انہوں نے بے بسی سے شانے اُچکا دیے۔

''تمہارے ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں''۔

''اور اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ ان کے رویے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس رشتے کو رکھنا ہی نہیں چاہتے''۔

''ابا! کیا یہ واحد حل ہے؟'' بہت دیر بعد وہ بولی تو اس کی آواز میں ٹوٹے خوابوں کا دُکھ تھا۔

''کیا اس کے علاوہ بھی کوئی حل ہے؟ حیا! دنیا کا کوئی باپ اپنی بیٹی کا گھر نہیں توڑنا چاہتا اور میں کبھی تمہیں یہ نہ کہتا، لیکن کس قیمت پر؟ کس قیمت پر ہم یہ رشتہ نبھانے کی کوشش کریں، جب وہ کوئی اُمید ہی نہیں دلاتے؟''

''اگر آپ کو واقعی لگتا ہے کہ آپ میرا گھر بسا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تو مجھے ترکی جانے دیں، وہاں میں اس کو ضرور ڈھونڈوں گی اور پوچھوں گی کہ اگر وہ گھر بنانا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ مجھے طلاق دے دے۔ اگر نہیں دیتا تو وہیں کورٹ چلی جاؤں گی مگر مجھے ایک آخری کوشش کر لینے دیں، پلیز!''

وہ خاموش ہو گئے، شاید قائل ہو گئے تھے۔

''ابا آپ مجھے پانچ ماہ کا وقت دیں۔ اگر اس کے آخر میں بھی آپ کو لگے کہ مجھے خلع لے لینی چاہیے، تو میں آپ کے فیصلے میں

آپ کے ساتھ ہوں گی!" وہ اُٹھی اور پھر بنا کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ خبطی لڑکی اسے کلاس کے باہر ہی مل گئی تھی۔ وہ فائلیں سنبھالتی باہر جا رہی تھی، جب اس نے حیا کو روک لیا۔

"سنیں مس سلیمان!" وہ جیسے مجبوراً اسے مخاطب کر رہی تھی۔ حیا نے کوفت سے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں خدیجہ رانا کھڑی تھی۔ آنکھوں پہ بڑا سا چشمہ لگائے، بالوں کی اونچی پونی باندھے، سینے سے فائل لگائے۔ ڈی جے..... جسے ڈی جے صرف اس کے فرینڈز کہا کرتے تھے، اور وہ اس کی فرینڈ نہ تھی، نہ بننا چاہتی تھی۔

"جی خدیجہ؟" بادل نخواستہ اس نے ذرا مروت سے جواب دیا۔

"آپ نے ویزا کے لیے اپلائی کر دیا؟ دراصل میم فرخندہ نے کہا ہے کہ ہم دونوں کو جلد از جلد ویزا کے لیے اپلائی کرنا چاہیے کیونکہ فروری کے پہلے ہفتے میں ہم نے سبانجی کو جوائن کرنا ہے اور آج تیرہ تاریخ ہے۔ ہمارے پاس بس پندرہ دن ہیں اور ترکی کا ویزا پندرہ دن میں کبھی نہیں لگا کرتا"۔

وہ پریشانی سے تیز تیز بولے جا رہی تھی۔ اس کی بات کچھ ایسی تھی کہ حیا کو سنجیدہ ہونا پڑا، ورنہ ابھی تک وہ ابا کی کہی گئی باتیں سوچ رہی تھی۔

"اوہ..... تو تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"کل لازماً ٹرکش ایمبیسی جا کر ویزے کے لیے اپلائی کرنا ہے۔ آپ کو پتا ہے ٹرکش ایمبیسی کا عجیب سا رول ہے کہ ہر روز سب سے پہلے آنے والے پندرہ امیدواروں کا ہی انٹرویو ہوتا ہے۔ ایمبیسی صبح سات بجے ہی کھل جاتی ہے اور وہاں لوگوں کی لائن لگی ہوتی ہے۔ اگر ہم ایک منٹ بھی لیٹ ہوئے تو وہ ہمیں اگلے دن پہ ڈال دیں گے۔ آپ سن رہی ہیں نا؟"

"ہوں..... جی"۔ اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔ پتا نہیں وہ کیا بولے جا رہی تھی۔

"آپ مجھے اپنا نمبر لکھوا دیں، تاکہ ہم کوآرڈی نیٹ کر سکیں"۔

اس نے بے دلی سے اپنا نمبر لکھوا دیا۔ خدیجہ اسے اپنے فون پہ نوٹ کرتی گئی۔

"ٹھیک ہے، کل صبح ساڑھے چھ تک آپ ڈپلومیٹک انکلیو تک پہنچ جایئے گا، میں وہیں ہوں گی"۔

اس نے اچھا کہہ کر جان چھڑانے والے انداز میں سر ہلایا۔

"اور پلیز درست کیجئے گا۔ یہ نہ ہو کہ آپ کی وجہ سے میرا بھی ویزا رہ جائے مس سلیمان!" وہ ناک چڑھا کر یہ جتا گئی کہ آخر وہ بھی خدیجہ رانا ہے۔

"کیا کمپنی ملی ہے مجھے، اُف!" وہ پیر پٹخ کر آگے بڑھ گئی۔ ابا کی باتوں نے اسے اتنا ڈسٹرب کیا تھا کہ اس وقت ویزا وہ آخری چیز تھا، جس کے بارے میں وہ سوچ سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کی تاریکی کو دُکانوں کی شیشے کی دیواروں سے جھلکتی روشنیاں روشن کیے ہوئے تھیں۔ زرد روشنیوں کا عکس سامنے لمبی سیدھی سڑک پہ بھی پڑا تھا، جس کے ایک طرف پارکنگ کی گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا تھا۔ چبوترے پہ دن میں بک فیئر کے اسٹال لگا کرتے تھے، آج کل وہ بند تھے۔ یہ جناح سپر تھا اور وہ اس وقت زرد روشنیوں کے عکس سے چمکتی سڑک پہ چل رہی تھی۔

سیاہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، شانوں پہ پھسلتے لمبے بال لیے، وہ سر جھکائے خود فراموشی کے عالم میں قدم اُٹھا رہی تھی۔ ابا اور اماں کی کہی گئی باتیں دل و دماغ میں گونج رہی تھیں۔

جہان سکندر کون تھا؟ اس کا منکوحہ، کزن، شوہر..... وہ شخص جس کے خواب اس نے ساری عمر دیکھے تھے، اتنی آسانی سے وہ کیسے اس سے دست بردار ہو جائے؟ کیا ابا، اماں نہیں جانتے تھے کہ خواب اگر اپنے ہاتھوں سے توڑے جائیں تو اُنگلیاں بھی زخمی ہو جاتی ہیں پھر

کیسے وہ خود کو زخم دے؟ اگر وہ جہان یا سبین پھپھو کے لیے کوئی ان چاہا رشتہ تھی تو بھی ان کو صفائی کا ایک موقع دیئے بغیر ہی کیسے خود کو ان سے الگ کر لے؟ یہ مکھن نہیں تھا جس سے بال نکالنا تھا۔ یہ تو کانٹوں سے اُلجھا دامن تھا۔ اگر کھینچ کر الگ کیا تو دامن پھٹ جائے گا اور اگر کانٹے نکالنے کی کوشش کی تو اُنگلیاں زخمی ہو جائیں گی۔ مگر کیا پتا اس کانٹوں کے پودے پہ گلاب بھی کھلتے ہوں۔ ...سرخ گلاب...... سبز پتے...... رنگوں، خوشبوؤں اور خوابوں کے۔

وہ سیٹی کی تیز آواز تھی، جس نے اسے خیالوں کے ہجوم سے نکالا۔ اس نے چونک کر سر اُٹھایا۔

وہ تین لڑکے تھے۔ جینز اور جیکٹس میں ملبوس، وہ مختلف سمتوں سے اس کی طرف آ رہے تھے، یوں کہ ہر طرف وہی تھے، گھیرا...... نرغہ...... تنگ دائرہ۔

جگہ قدرے سنسان تھی۔ خالی چبوترا تاریکی میں ڈوبا تھا۔ جگمگاتی روشن دُکانیں ذرا دور تھیں، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

وہ تیزی سے پلٹی مگر ادھر سے بھی ان کا ہی کوئی چوتھا آ رہا تھا۔

وہ مبہم آوازیں نکالتے، معنی خیز اشارے کرتے اس کے اردگرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ دبی آوازوں کا شور اس کو گھیرنے لگا تھا۔

وہ قریب آتے دو لڑکوں کے درمیان سے تیزی سے سر جھکائے گزرنے لگی مگر دائیں والے لڑکے نے سبک رفتاری سے اس کی کلائی کو تھام کر اپنی جانب کھینچا، ابھی اس کے لبوں سے چیخ بھی نہیں نکلی تھی کہ آگے بڑھنے والا خود بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ ٹن کی زوردار آواز کے ساتھ کسی نے اس لڑکے کے سر کے پچھلے حصے پہ کچھ مارا تھا۔

''مرن جوگے...... باجی کو تنگ کرتے ہو، چھوڑوں گی نہیں میں تمہیں''۔ وہ اونچی لمبی، ہٹی کٹی سی ڈولی ہاتھ میں پکڑا فرائنگ پان گھما گھما کر ان کو مار رہی تھی۔

حیا ہکا بکا سی دو قدم پیچھے ہوئی۔

جس کو لگا تھا وہ سر پکڑے بلبلاتا ہوا پیچھے بھاگا۔ باقی دو بھی ساتھ ہی دوڑے۔ ایک نے ذرا پھرتی دکھا کر ڈولی کو لات مارنی چاہی، ڈولی نے اسی فرائنگ پان کو گھما کر ایسی ضرب دی کہ اس لڑکے کا گھٹنا چیخ اُٹھا۔ شاید ٹوٹ گیا تھا، کم از کم اس کی چیخ سے تو حیا کو یہی لگا تھا اور وہ لنگڑاتا ہوا بھاگ اُٹھا۔

''آئے بڑے سالے، ڈولی سے پنگا لیتے ہیں''۔ وہ فاتحانہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اب حیا کی طرف مڑا۔

سفید آٹے سے گویا اٹا ہوا چہرہ، آنکھوں کے گرد لمبی کالی لکیریں کھینچ کر لائنر لگایا ہوا اور آنکھوں میں نیلے سبز سے لینز، گالوں پہ سرخ پاؤڈر، بھڑکیلا آئی شیڈ اور سرخ چونچ کی طرح کی لپ اسٹک، بھورے گولڈن بالوں کی لٹیں، سر پہ لیے دوپٹے سے نکل رہی تھیں۔ یقیناً وگ تھی جیسے کہ عموماً ہوتی ہے۔

پہلی دفعہ جب اس نے ڈولی کو دیکھا تھا، اسے کراہیت آئی تھی۔ دوسری دفعہ خوف اور اس روز ٹریفک جام پہ اسے دیکھ کر غصہ آیا تھا اور آج...... آج کچھ بھی نہیں، وہ خاموشی سے تیز تیز سانس لیتی اس کو دیکھ رہی تھی۔

''چھوڑو جی ان حرام خوروں کو باجی! ان کا تو کام ہی یہی ہے، میں بھی بڑی دیر سے تاڑ رہی تھی ان کو، پر مجھے کیا پتا تھا کہ اپنی باجی جی کو تنگ کر رہے ہیں، آئے بڑے''۔

وہ پوری بات سنے بغیر ہی پلٹ گئی۔ سینے پہ بازو لپیٹے، سر جھکائے، تیز تیز قدموں سے چبوترے کی جانب بڑھنے لگی۔ ایک خواجہ سرا کے ساتھ رات کے اس پہر سڑک پہ کھڑے ہونا قطعاً درست نہ تھا۔

''ارے باجی جی...... گل تو سنو''۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔ حیا چلتے چلتے رُکی اور پلٹ کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''کیا ہے؟'' اس کا مومی چہرہ دکانوں کی زرد روشنیوں میں دمک رہا تھا۔

''ہائے ربا! باجی جی تسی کتنے سوہنے ہو جی''۔ وہ دونوں ہاتھ رخساروں پہ رکھے خوشی سے چہکا۔

اسے کراہیت آئی، نہ خوف، بس چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

''شکریہ ہی کہہ دو جی''۔
''شکریہ..... اور کچھ؟'' اس کا انداز سپاٹ تھا۔
''تسی تے ناراض لگدے ہو جی''۔
''ڈولی! تم کیوں ہر جگہ میرے پیچھے آتے ہو؟''
''ہاں تو ٹینشن تے نہیں دی تہانوں، ہمیشہ مدد ای کیتی اے''۔
''تمہیں کس نے کہا ہے میری مدد کو؟ کس نے تمہیں میرے پیچھے لگایا ہے؟ بولو، جواب دو''۔
ڈولی کا منہ آدھا کھل گیا۔ لینز لگی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر آنسو تیرنے لگے۔
''کسی نے نہیں جی''۔ بڑی دیر بعد وہ دُکھ سے بولا۔ ''مجھے آپ اچھی لگتی ہو، اس لیے آپ کا خیال رکھتی ہوں، آپ کو برا لگتا ہے تو نہیں آؤں گی''۔

دفعتاً حیا کا فون بجا۔ اس نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھا۔ اس پہ پرائیویٹ نمبر کالنگ لکھا آ رہا تھا۔ وہ پیر پٹخ کر چبوترے کی طرف آئی اور پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ فون ابھی تک بج رہا تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا اور ڈولی کو دیکھا، جو چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا، سسکتا ہوا اس تک آ رہا تھا۔

''ہیلو؟''
''ہیلو مس حیا..... کیسی ہیں آپ؟'' وہ میجر احمد تھا۔ اس کی آواز کے پیچھے بہت شور تھا۔
ڈولی آہستہ سے اس سے ذرا فاصلے پہ چبوترے پہ بیٹھ گیا۔ سر جھکائے وہ ہتھیلی سے آنسو پونچھ رہا تھا۔
''خدا کے لیے مجھے فون مت کیا کریں اور یہ جو بندے آپ نے میرے پیچھے لگائے ہیں نا، میں ان میں سے ایک ایک کا خون کر دوں گی اور اس سب کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ میں شادی شدہ ہوں اور جلد ہی اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤں گی، میرا پیچھا چھوڑ دیں، سمجھے آپ؟''

مزید کچھ سنے بغیر اس نے فون رکھ دیا۔
''تسی گھر بار والے ہو جی؟'' ڈولی نے چہرہ اس کی طرف اُٹھایا۔
''ہاں، تمہارے اس میجر نے تمہیں بتایا نہیں کیا؟ اسی نے میرے پیچھے لگایا ہے نا تمہیں؟''
''اللہ پاک کی قسم لے لو جی، مجھے کسی میجر ویجر نے نہیں بھیجا، میں خود آتا ہوں۔ اللہ کی قسم جی''۔ وہ روتے روتے کہہ رہا تھا۔ حیا کے دل کو کچھ ہوا، اسے لگا وہ سچ بول رہا ہے۔
''میں کسی کو جا کر آپ کی باتیں نہیں بتایا۔ مجھے بڑا پیار ہے جی آپ سے، قسم سے''۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھے گئی۔ کچھ تھا اس میں، پُراسرار، خوف زدہ کرتا، مگر ترس و ترحم آمیز۔
''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مت روؤ''۔
''میں جی بڑا پیار کرتی ہوں آپ سے..... اسی لیے آتی ہوں، پر تسی تے الزام لا رہے ہو''۔ وہ اب سسکتے ہوئے اپنا سر پیٹنے لگا تھا۔
''اچھا..... اچھا..... ناؤ اسٹاپ اٹ!'' وہ چپ چاپ بیٹھا اسے تکتا رہا، جبکہ وہ سامنے خلاؤں میں گھورتی رہی۔
''تسی جا رہے ہو کہیں؟''
حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔
''تسی فون میں کہیا نا''۔ اس نے وضاحت کی۔
''ہاں، میں یورپ جا رہی ہوں''۔
''وہ جہاں امریکہ ہے؟ وہ انگریزی فلموں والا؟'' وہ رونا بھول کر خوشی سے چہکا۔ شاید وہ واقعی ایک عام خواجہ سرا تھا یا پھر کوئی بہت

مکار، اداکار۔

"ہاں وہی"۔ اس نے تردید نہیں کی۔

"ادھر کون ہے جی؟"

"میرا شوہر رہتا ہے وہاں"۔ وہ اب سامنے روشن دکانوں کی قطار کو دیکھ رہی تھی۔

"کیسا ہے جی تہاڈا شوہر؟"

"میں نہیں جانتی ڈولی..... اگر میں جانتی ہوتی تو آج ادھر نہ بیٹھی ہوتی"۔

اس کی لانبی پلکیں ذرا سی بھیگیں، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پانی تیرنے لگا تھا۔

"پر جی....."

"تم دعا کرو ڈولی! وہ مجھے مل جائے"۔ وہ آنکھوں کی نمی چھپاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈولی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ صاف کرتی سڑک کی طرف جا رہی تھی۔

ڈولی کی آنکھوں میں بے پناہ اداسی اتر آئی۔

"خدا کرے وہ تمہیں کبھی نہ ملے حیا سلیمان..... خدا کرے تم اس سے مایوس ہو کر جلد ہی واپس آ جاؤ۔ اور خدا کرے تم ادھر جا ہی نہ سکو"۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی، جب اس نے ڈولی کو کہتے سنا، مگر نہیں، وہ ڈولی کی آواز نہیں تھی، وہ کسی مرد کی آواز تھی۔ بھرپور، خوب صورت اور اداس، ایسی آواز جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ میجر احمد کی آواز سے زیادہ خوب صورت تھی اور اس میں جہان سکندر کی اجنبی آواز جیسی بے رخی بھی نہ تھی۔

اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔ تیزی سے اس نے گردن موڑی۔

دور اندھیرے میں ڈوبا چبوترہ خالی تھا۔ وہاں دور، دور تک کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔

زندگی میں پہلی بار اس کے اندر ڈولی سے دوبارہ ملنے کی خواہش نے جنم لیا تھا۔ اسے جاننا تھا کہ ڈولی کون ہے، کیا ہے، کیوں ہے۔

☆ ☆ ☆

اس رات وہ بمشکل دو، تین گھنٹے تک سو سکی تھی۔ پھر فجر کی اذان سے بھی پہلے تیار ہو کر وہ ڈپلومیٹک انکلیو پہنچ گئی کہ خدیجہ کی بار بار کال آ رہی تھی۔

"شکر ہے آپ آ گئیں"۔ خدیجہ اسے باہر ہی مل گئی۔ اس کی عینک کے پیچھے چھپی آنکھیں فکرمند لگ رہی تھیں۔

حیا سادہ شلوار قمیص اور سیاہ جیکٹ میں ملبوس تھی۔ لمبے کھلے بال کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے وہ خدیجہ تک آئی۔

"اب کدھر جانا ہے؟"

"اندر..... یہ شٹل لے لیتے ہیں۔ یہ ٹرکش ایمبیسی تک پہنچا دے گی"۔

تب ہی ایک عمر رسیدہ صاحب اور خاتون تیزی سے شٹل کی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔

"میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ یہ انکل آنٹی بھی ٹرکش ایمبیسی جا رہے ہیں۔ حیا! جلدی کریں، ہمیں پہلے پندرہ میں سے ہونا ہے"۔

وہ حیا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھی، پھر خیال آنے پہ پوچھ لیا۔ "اندر آئی ڈی کارڈ سے انٹری ہو گی، آپ آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ لائی ہیں نا؟"

اور حیا کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ رات اتنی ڈسٹرب رہی کہ بھول ہی گیا کہ.....

"پاسپورٹ..... پاسپورٹ تو مجھے آج ملنا تھا۔ وہ تو ابھی بنا ہی نہیں ہے"۔

"حیا!" خدیجہ منہ کھولے ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں..... آئی ایم سوری..... میں..... اور خدیجہ..... آئی ایم رئیلی سوری، میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہے"۔ اس کا سر گھومنے

لگا تھا۔ وہ اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتی تھی؟

"آپ..... آپ کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے تو آپ خود کیوں آئی ہیں، ہاں؟ آپ کی وجہ سے میرا اسکالرشپ بھی رہ جائے گا، اتنا احساس ہے آپ کو؟"

وہ پھٹ پڑی تھی اور حیا، جو اتنی مغرور اور خود پسند تھی، جس کی شخصیت سے لباس تک ہر شے پرفیکٹ ہوتی تھی اور جس کی مثالیں اس کی کلاس فیلو دیا کرتی تھیں، وہ ایک دم رو پڑی۔

"آئی ایم سوری خدیجہ..... میرے کچھ پرابلمز تھے، میری لائف..... میری لائف بہت ڈسٹرب ہو گئی ہے، میں....." وہ جلدی جلدی بے اختیار اُمڈ آنے والے آنسو صاف کرنے لگی۔

"اٹس او کے خدیجہ! آئی ایم سوری، مگر آپ جائیں، میں کل ٹرائی کرلوں گی"۔

خدیجہ چند لمحے خاموش رہی، پھر آہستہ سے بولی۔

"اپنا آئی ڈی کارڈ مجھے دیں"۔

"جی؟"

"اپنا آئی ڈی کارڈ مجھے دیں اور واپس جا کر پاسپورٹ آفس سے اپنا پاسپورٹ اُٹھا کر لائیں۔ اُمید ہے آئی ڈی کارڈ سے آپ کی انٹری ہو جائے گی اور ہماری باری آنے تک آپ واپس پہنچ جائیں گی"۔

"مگر..... مگر پاسپورٹ آفس تو پنڈی میں ہے اور مجھے تو جاتے ہوئے بھی ایک گھنٹہ لگ جائے گا اور پاسپورٹ آفس تو کھلے گا ہی نو بجے، جبکہ ایمبیسی سات بجے کھل جائے گی"۔ اس نے فکرمندی سے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

"یہ ناممکن ہے۔ میں کبھی بھی اتنی جلدی واپس نہیں پہنچ پاؤں گی کہ پہلے پندرہ میں سے ہو سکوں"۔

"حیا! میں نے زندگی میں ایک ہی بات سیکھی ہے کہ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی، جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔ آپ ابھی سے ہار مان لینا چاہتی ہیں؟ لائیں، آئی ڈی کارڈ دیں، مجھے ان انکل آنٹی سے پہلے پہنچنا ہے"۔ وہ اس کے ہاتھ میں پکڑا آئی ڈی کارڈ جھپٹ کر شٹل کی طرف دوڑتی ہوئی چلی گئی۔

اس نے آنکھوں کے کنارے پونچھے اور پھر کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھا۔ کیا اس کا ویزا لگ جائے گا؟ یا ڈولی کی بددعا پوری ہو جائے گی اور وہ کبھی ترکی نہیں جا سکے گی؟ اسے کبھی جہان سکندر نہیں مل سکے گا؟

مگر خدیجہ نے کہا تھا، انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ خود ہار نہ مان لے اور اس نے سوچا، وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گی۔

بے دردی سے آنکھیں رگڑ کر وہ گاڑی کی طرف لپکی تھی۔

بہت ریش ڈرائیو کر کے وہ پنڈی آئی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ اسے بند پاسپورٹ آفس کے باہر بیٹھنا پڑا، خدا خدا کر کے نو بجے آفس کھلا تو وہ اندر بھاگی۔ شاید اس کی ہمت دکھانے کا صلہ تھا۔ دس منٹ بعد وہ اپنا پاسپورٹ لیے آفس کی بیرونی سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ تب ہی کسی غیر شناسا نمبر سے کال آئی۔ اس نے کسی خیال کے تحت فون اٹھا لیا۔

"ہیلو؟"

"ہیلو حیا؟ میں خدیجہ بول رہی ہوں۔ میرا فون تو باہر بھائی کے پاس ہے، کیونکہ اندر سیل فون کی پرمیشن نہیں ہے، ابھی ایمبیسی کے گارڈ سے فون لے کر سو منتیں کر کے کال کر رہی ہوں"۔ وہ ایک ہی سانس میں تیز تیز بولے گئی۔ "آپ کدھر ہیں؟"

"بس مجھے پاسپورٹ مل گیا ہے، میں آ رہی ہوں۔ میری انٹری ہوئی؟" اس نے گاڑی میں بیٹھ کر چابی اگنیشن میں گھمائی۔

"شکر ہے میں نے تیز بھاگ کر ان انکل آنٹی کو بائی پاس کر لیا۔ میں چودہ نمبر پہ تھی اور آپ کی بھی انٹری کرا دی ہے، آپ کا پندرھواں نمبر ہے"۔

''اوہ شکر!''

''لیکن انہوں نے ان انکل آنٹی کو روک رکھا ہے کہ اگر آپ نہ آئیں تو ان کا انٹرویو ہو جائے گا اور وہ آنٹی مسلسل تسبیح پڑھ رہی ہیں، حیا! آپ جلدی سے آجائیں''۔

''میں آرہی ہوں، بس ابھی آفس ٹائم ہے نا تو ٹریفک بہت ہیوی ہے''۔

''بس جلدی سے آجائیں، یہ بار بار پوچھ رہے ہیں کہ میری دوسری ساتھی کدھر ہیں''۔

''بس تھوڑی دیر اور!'' اس نے ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھا دیا۔

ٹریفک حسب معمول بہت پھنسا ہوا تھا۔ بے پناہ رش، ہارن کا شور، بند سگنل، پھنسی ہوئی گاڑیاں۔ وہ بار بار فکری مندی سے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی اور پھر سست روی سے چلتے ٹریفک کو، بمشکل مری روڈ سے نکل پائی تو سکون کا سانس لیا۔

معمول کی چیکنگ کے بعد وہ گیارہ بجے تک اس اوپن ایرلاؤنج میں پہنچ پائی جہاں خدیجہ تھی۔ ترک رگز، مخصوص ترک بلیو آئی (evil eye) اور ترکی کے نقشوں سے وہ لاؤنج سجایا گیا تھا۔

خدیجہ ایک صوفے پر منتظر، پریشان سی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''شکر ہے آپ آگئیں حیا! انہوں نے سب کے انٹرویو روک رکھے ہیں۔ پہلے ہمارا ہوگا''۔

''اچھا.....مگر کیوں؟''

لیکن کیوں کا جواب سننے کا وقت نہیں تھا اور پھر ان کو انٹرویو کے لیے کال کر لیا گیا تھا۔

وہ خوش شکل سا ترک ڈپلومیٹ ان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ وہ خدیجہ کے آگے چلتی ہوئی سامنے ہوئی اور اپنی فائل شیشے کی کھڑکی کے سوراخ سے اندر دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر اس کا ویزا مسترد ہو گیا تو......؟

اس آفیسر نے ان کی فائلیں اُٹھائیں، ان سے فارم نکالے اور فائلیں واپس بند کر کے رکھ دیں۔ اگر اس نے ویزا دینا ہوتا تو ان کا انٹرویو کرتا، کچھ تو پڑھتا، کوئی سوال تو پوچھا مگر وہ بس سرسری سا فارم کو دیکھ رہا تھا، تو کیا وہ واقعی اس کا ویزا مسترد کرنے لگا تھا۔

فارم پہ ایک نگاہ دوڑا کر اس نے سر اُٹھایا اور سنجیدگی سے ان دونوں کو دیکھا، جو بنا پلک جھپکے، سانس روکے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

''آپ کدھر تھیں؟ میں اتنے دنوں سے آپ کا ویٹ کر رہا تھا''۔ اس نے ساتھ ہی میز پہ رکھا ایک کاغذ اُٹھایا۔ ''مجھے سبانجی یونیورسٹی نے یہ لسٹ بھجوائی تھی، اس میں آپ کے نام ہیں تا کہ میں آپ کا ویزا لگا دوں۔ خیر، ویزا کل تک اسٹیمپ ہو جائے گا، آپ میں سے کوئی ایک کل آ کر دونوں پاسپورٹ پک کر لے۔ شام چار بجے تک، رائٹ؟''

''رائٹ!'' فرط جذبات سے ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ دل یوں دھڑک رہا تھا گویا ابھی سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔ وہ جیسے ہی اس کے آفس سے نکلیں، ایک ساتھ رُک گئیں اور ایک دوسرے کو دیکھا۔

''آئی ایم سوری حیا!''

''آئی ایم سوری خدیجہ!''

بیک وقت دونوں کے لبوں سے نکلا تھا اور پھر وہ دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

بالآخر اسے یقین آگیا تھا کہ ہاں، وہ واقعی ترکی جا رہی ہے۔ وہ بھی پورے پانچ ماہ کے لیے۔ وہ ترکی جہاں وہ رہتا ہے۔ وہ جو ہمیشہ سے اس کے دل کے ساتھ رہا تھا۔

Welcome me O Sabanci !

''ویلکم می او سبانجی!'' (مجھے خوش آمدید کہو، اے سبانجی!)

☆ ☆ ☆

''بھائی تو چلے گئے تھے مجھے ڈراپ کر کے، میں آپ کے سیل سے ان کو کال کر لوں کہ وہ مجھے پک کر لیں؟'' ڈپلومیٹک انکلیو سے

نکلتے ہوئے خدیجہ نے پریشانی ظاہر کی تو اس نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔

''نو پرابلم، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی خدیجہ!''

''آپ مجھے ڈی جے اور تم کہہ سکتی ہیں''۔

''شیور''۔ اس نے پارکنگ میں کھڑی کار کا لاک کھولا ''مجھے جناح سپر جانا تھا۔ یوں نہ کریں کہ کچھ شاپنگ کر لیں؟ آپ نے کچھ تو لینا ہوگا خدیجہ؟'' اس کی تاکید کے باوجود وہ تکلف ختم نہ کر سکی۔

''سوئیٹرز لینے ہیں، وہاں بہت سردی ہوگی''۔

''پھر وہیں چلتے ہیں''۔

''سائینو شور کے بالمقابل چبوترہ خالی تھا مگر دن کے وقت وہ اتنا ویران نہیں لگ رہا تھا، جتنا پچھلی رات لگا تھا اور وہ آواز...... وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

''اوہ نیڈل امپریشنز پہ سیل لگی ہے۔ آئیں، کچھ دیکھ لیتے ہیں''۔ وہ کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ یہاں سے کوئی اچھا شرٹ پیس لے آئے اور آج تو سیل بھی لگی تھی۔ وہ اور خدیجہ آگے پیچھے شیشے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئیں۔

شاپ کے اندر وہی مخصوص ماحول تھا۔ ہیٹر کی گرمی اور باہر کی خنکی کا ملا جلا تاثر۔ زرد سپاٹ لائٹس سے چمکتی چھت اور ہر طرف شو کیسز پہ پھیلے کڑھائی والے کپڑے......

وہ مخروطی اسٹینڈ پہ لگے نمونے دیکھتی آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی تھی۔ سامنے ورک ٹیبل تھی جس کے پیچھے کھڑا مستعد سیلز مین اسے دیکھ کر فوراً متوجہ ہوا تھا۔

''جی میم؟''

''یہ پنک والا دکھائیں، جس پہ وائٹ ایمبرائڈری ہے''۔ اس نے انگلی سے پیچھے رول کیے ہوئے تھان کی طرف اشارہ کیا۔ سیلز مین نے گردن پھیر کر دیکھا۔

''میم! یہ میں نے سامنے رکھا ہے، یہ سامنے ہی پڑا ہے''۔ وہ اس سے چند فٹ بائیں جانب اشارہ کر رہا تھا جہاں ایک فیملی کھڑی اسی کپڑے کا معائنہ کر رہی تھی۔

''اوہ تھینکس''۔ وہ چند قدم چل کر بائیں جانب آئی، جہاں میز پہ وہ خوب صورت کڑھائی والا شرٹ کا فرنٹ پیس پھیلا ہوا تھا۔ حیا کے بالکل بائیں طرف کھڑا ایک نوجوان سر جھکائے ہاتھ میں کپڑے کو مسل کر چیک کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نفیس، معمری خاتون اور ایک کم عمر اونچی پونی ٹیل والی لڑکی کھڑی تھی۔

''ممی! یہ پنک والا لے لیتے ہیں، ثانیہ بھابھی کا کمپلیکشن فیئر ہے، ان پہ سوٹ کرے گا، کیوں بھائی؟'' وہ اب نوجوان سے رائے مانگ رہی تھی۔ حیا نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اسے بس یہی جلدی تھی کہ کب وہ شخص اس کپڑے کو چھوڑے اور وہ اسے دیکھ پائے۔ اس وقت بھی گلابی شرٹ کا کپڑا اس شخص کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اسے ہاتھ میں یوں پکڑ رکھا تھا کہ اس کی ہتھیلی والی طرف اوپر تھی۔ حیا اس کے ہاتھ میں پکڑے کپڑے کو دیکھ رہی تھی، جب دفعتاً اس کی نگاہیں کپڑے سے اس شخص کی کلائی پہ پھسلتی گئیں۔ وہ بری طرح چونکی۔

اس کی کلائی پہ کانٹے کا سرخ گلابی سا نشان تھا۔ جیسے جلا ہو...... یا...... کوئی برتھ مارک......
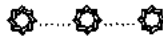
باب 2

وہ اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ گلابی کپڑے کو ہاتھ میں مسل کر چیک کرتا ہوا وہ مکمل طور پر یہ اپنی فیملی کی طرف متوجہ تھا۔ وہ یہاں سے اس کا نیم رخ ہی دیکھ سکتی تھی۔

وہ دراز قد تھا۔ رنگ صاف اور آنکھوں پر فریم لیس گلاسز تھے۔ چہرے پہ متانت اور سنجیدگی تھی۔ جینز اور جیکٹ میں ملبوس وہ اچھا خاصا اسمارٹ نوجوان تھا۔

حیا نے دوبارہ اس کے ہاتھ کو دیکھا جس میں اس نے کپڑا ابھی پکڑ رکھا تھا۔ اسی پل اس کی بہن نے وہ کپڑا نرمی سے اپنی جانب کھینچا۔ گلابی ریشم اس کی ہتھیلی سے پھسل گیا۔ اب اس کی انگلیاں سامنے تھیں جن کے اوپری پوروں کی قدرتی لکیر پہ بھوری سی لکیر پڑی تھی۔

اسے بے اختیار شیشے میں آئی وہ انگلیاں یاد آئیں۔

بہت احتیاط سے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ خدیجہ قدرے فاصلے پہ کھڑی ڈمی کا لباس دیکھ رہی تھی۔ آس پاس کوئی اس کا جاننے والا نہیں تھا۔ یقیناً وہ یہاں تماشا کر سکتی تھی۔

"پنکی!"

اس نے دانستہ قریب کھڑے نوجوان کی طرف چہرہ کر کے با آواز بلند پکارا۔ وہ اپنی بہن کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اس نے شاید سنا ہی نہیں۔ البتہ اس کی بہن حیا کو اپنی جانب دیکھتا پا کر کچھ بولتے بولتے رکی تھی۔

"پنکی!" اس نے ذرا زور سے پکارا۔

کم عمر لڑکی نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔ اس کی والدہ بھی بیٹی کی نگاہ کے تعاقب میں اس طرف دیکھنے لگی تھیں۔ ان دونوں کے یوں رک کر حیا کو دیکھنے کے باعث اس نوجوان نے گردن موڑی۔ حیا نے دیکھا، اس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ جھلسنے کا نشان بہت گہرا نہ تھا، بس اتنا کہ آدھا چہرہ صاف گندمی رنگ کا لگتا تو دوسرا حصہ گہرا سانولا۔

"پنکی! ڈولی کہاں ہے؟" وہ سینے پہ بازو لپیٹے بڑے تیکھے انداز میں بولی اور چونکہ وہ اس نوجوان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی تو وہ ذرا الجھ سا گیا۔

"سوری؟"

"میں نے پوچھا ہے، ڈولی کہاں ہے؟"

"کون؟ میں سمجھا نہیں!" وہ دھیمے مگر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اگر آپ کے دماغ پہ چوٹ آنے کی وجہ سے آپ کی یادداشت کھو گئی ہے تو بے فکر رہیے، میں آپ کو یاد کرائے دیتی ہوں۔ ڈولی آپ کا وہ خواجہ سرا دوست ہے جس کے ساتھ مل کر آپ روز خواجہ سرا بنے سڑک پر بھیک مانگ رہے تھے۔ پنکی نام بتایا تھا آپ نے اپنا، نہیں؟"

اس کی پیشانی شکن آلودہ ہو گئی۔ آنکھوں میں غصہ در آیا، تاہم وہ ذرا برداشت کر کے بولا۔

"میڈم! آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میں آپ کو جانتا تک نہیں ہوں۔"

"مگر میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ آپ کی انگلیوں پہ نشان میری گاڑی کی کھڑکی کے شیشے میں پھنسنے کا باعث ہی آئے تھے۔ مجھے یاد ہے مسٹر!"

"آپ کون ہیں اور پرابلم کیا ہے آپ کو؟" وہ لڑکی مزید برداشت نہیں کر سکی تھی۔

"میں وہ ہوں جس نے آپ کے ان بھائی صاحب کو خواجہ سرا بنے دیکھا تھا۔"

''اُنس انف!'' اس نوجوان نے غصے سے کھڑکا۔ ''میں شرافت سے آپ کی بکواس سن رہا ہوں اور آپ بے لگام ہوتی جا رہی ہیں۔ اس سے آگے اگر پھر کوئی فضول گوئی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''اتنی ہی شرافت ہے آپ میں تو خواجہ سرا کیوں بنے ہوئے تھے؟'' کسی نے اس کے عقب میں کہا تو وہ چونکی۔ خدیجہ بہت اعتماد سے کہتی اس کے برابر آن کھڑی ہوئی تھی۔ حیا کو ایک دم ہی جیسے ڈھارس سی ملی۔

''آپ کا دماغ خراب ہے! اپنی بہن کو سمجھائیں! میرے بھائی سے تعارف کا اچھا بہانہ ڈھونڈا ہے انہوں نے۔'' لڑکی بھڑک کر بولی۔

شاپ میں بہت سے لوگ سب کچھ چھوڑ کر ان کو دیکھ رہے تھے۔

''تعارف، مائی فٹ!'' جواباً خدیجہ بھی اونچی آواز میں بولی۔ ''آپ کے بھائی کو میں نے بھی خواجہ سرا بنا دیکھا تھا۔ میں ابھی دس اور لوگ لا سکتی ہوں جو اس بات کی گواہی دیں گے۔''

''عجیب خاتون ہیں آپ، خوامخواہ تنگ کیے جا رہی ہیں۔ یہ تعارف کے بہانے کسی اور کے سامنے جا کر بتائیے۔''

''سر، میڈیم!'' شاپ کا منیجر تیزی سے ان کی طرف آیا تھا۔ ''پلیز آپ ادھر تماشا نہ کریں۔ دوسرے کسٹمرز ڈسٹرب...... اوہ میجر صاحب۔'' اب اس نے اس نوجوان کا چہرہ دیکھا تو شناسائی بھری حیرت سے بولا! ''بہت معذرت سر! آپ محترمہ۔'' وہ حیا کی طرف مڑا۔ ''آپ پلیز شور نہ کریں۔ اگر آپ نے خریداری نہیں کرنی تو آپ جا سکتی ہیں۔''

حیا کے تو تلووں پہ لگی، سر پہ بجھی۔

''آپ ہوتے کون ہیں مجھے شاپ سے نکالنے والے؟''

''احمد بھائی! چلیں ہم ہی چلتے ہیں۔ ان کا تو دماغ خراب ہے۔'' لڑکی نے خفگی سے اسے دیکھتے ہوئے کپڑا پھینکا اور پلٹی۔ وہ نوجوان ایک تنفر بھری نگاہ اس پہ ڈال کر، اپنی ماں کا شانہ تھامے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''احمد بھائی...... میجر صاحب...... تو کیا وہ......''

''توبہ ہے، ان آج کل کی لڑکیوں کی۔'' والدہ صاحبہ مسلسل ناپسندیدگی سے بڑبڑاتی نکل گئیں۔

وہ لب بھینچے کھڑی انہیں جاتے دیکھے گئی۔ اسے اس شخص کے میجر احمد ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔

''حیا! اس سے پہلے کہ یہ منیجر ہمیں دھکے دے کر نکالے، ہم بھی کھسک جائیں۔'' ڈی جے نے اس کے قریب سرگوشی کی تو وہ چونکی، پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

باہر کھلی فضا میں آ کر اس نے بے اختیار کہا تھا۔

''تھینک یو ڈی جے!'' اور یہ وہ پہلی دفعہ تھا جب اس نے خدیجہ کو اس کے معروف نام سے پکارا تھا۔

ڈی جے بے ساختہ ہنس دی۔

''مجھے پتا تھا آپ جھوٹ نہیں بولتیں۔ آپ نے واقعی وہی دیکھا ہوگا جو کہہ رہی تھیں۔''

''مگر ڈی جے! میں نے واقعی اسے خواجہ سرا بنے دیکھا تھا۔''

''حیا! آپ نے اسے بس خواجہ سرا بنے دیکھا تھا نا؟ تو ہو سکتا ہے وہ صرف ایڈونچر کے لیے ایسا بنا ہو۔''

''پتا نہیں!'' اس نے بے زاری سے شانے اچکائے۔

''چلو چلتے ہیں۔'' وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اٹھائیس جنوری کو اسے اتحاد ایئر لائنز کا ٹکٹ ای میل کر دیا گیا جس کا اس کو پرنٹ آؤٹ نکلوانا تھا، پھر اسی ٹکٹ پر اسے پانچ فروری کی صبح استنبول کے لیے روانہ ہونا تھا۔

شام میں وہ ارم سے اس کا evo مانگنے تایا فرقان کے گھر آئی تھی۔ اس کا نیٹ کام نہیں کر رہا تھا، اور ابا ابھی آفس سے نہیں آئے

تھے ورنہ ان کا استعمال کر لیتی۔ خدیجہ کا پیغام آیا تھا کہ سبانجی یونیورسٹی نے ہاسٹل کا الیکٹرک فارم پر کرنے کے لیے بھیجا ہے، سو وہ میل چیک کرلے۔

تایا فرقان لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر مسکرائے۔

''آ گئی تایا کی یاد؟'' انھوں نے صفحہ پلٹتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''جی!'' وہ بظاہر مسکراتے ہوئے ان کے پاس چلی آئی۔ ورنہ اس روز کی صائمہ تائی کی باتیں ابھی تک نشتر کی طرح چبھتی تھیں۔

''فلائٹ کب ہے؟'' وہ اخبار پہ نگاہیں مرکوز کیے پوچھ رہے تھے۔

''پانچ فروری کو۔''

''ہوں، اپنا خیال رکھنا۔ ویسے بیٹیوں کو تنہا اتنا دور بھیجنا نہیں چاہیے۔ سلیمان کا حوصلہ ہے بھئی! خیر تم ترکی میں اپنے لباس اور اقدار کا خیال رکھنا، سر سے دوپٹا نہ اتارنا، جیسے ارم نہیں اتارتی۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے ان کے لہجے میں فخر در آیا تھا۔ حیا کے حلق تک کڑواہٹ گھل گئی۔

''جی بہتر! میں ذرا ارم سے مل لوں۔'' وہ جان چھڑا کر اندر آ گئی۔

کاش کہ وہ تایا فرقان کو بتا سکتی کہ مغربی لباس جو وہ یہاں ان کی وجہ سے نہیں پہنتی، وہاں ضرور پہنے گی۔ اس نے بہت سے ٹاپس اور جینز خرید کر اپنے سامان میں رکھ لیے تھے، اور رہی سر ڈھکنے کی بات تو وہ خیر سے سبانجی میں سختی سے ''حرام'' تھا..... شکر!

ارم کمرے میں نہیں تھی۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا اور اندر سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ بے دلی سے اس کے بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ ارم شاور لینے میں بہت دیر لگاتی تھی۔ سو مجبوراً اسے انتظار کرنا تھا۔

دفعتاً سیل فون کی گھنٹی بجی۔ حیا چونکی۔

ارم کا سیل فون اس کے ساتھ ہی تکیے پر رکھا تھا۔ اس نے گردن جھکا کر دیکھا۔ سیل فون کی روشن اسکرین پر ''ایک نیا پیغام'' جگمگا رہا تھا۔ ساتھ ہی بھیجنے والے کا نام لکھا آ رہا تھا۔ ''حیا سلیمان''

وہ بے یقینی سے فون کی اسکرین کو دیکھے گئی۔

کیا کسی نے ارم کو اس کے نمبر سے پیغام بھیجا تھا یا ارم نے کسی کا نمبر اس کے نام کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا؟

حیا نے محتاط نگاہوں سے باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھا، اور فون پہ ایک دو بٹن دبائے۔ پیغام لمحے بھر بعد کھل گیا۔

''میں کال کر لوں؟ صبح سے بات نہیں ہوئی، اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ یہ دل اتنا مضبوط نہیں ہے جان! ریپلائی!''

اس نے جلدی سے پیغام مٹایا اور سیل فون واپس تکیے پر الٹا کر کے رکھ دیا۔ ایک لمحے میں اسے سب سمجھ میں آ گیا تھا۔

ارم..... تایا فرقان کی اسکارف والی، سر ڈھکنے والی بیٹی۔ ایک عدد بوائے فرینڈ کی مالک تھی جسے لوگوں سے چھپانے کے لیے اس نے ''حیا سلیمان'' کا نام دے رکھا تھا۔ تب ہی وہ اس رشتے پہ خوش نہیں تھی، حیا کو یاد آیا۔

وہ مزید بیٹھے بنا وہاں سے نکل آئی۔ evo اس نے تایا فرقان سے مانگ لیا، مگر جاتے جاتے ایک طنز و استہزاء بھری مسکراہٹ کے ساتھ ان کو ضرور دیکھا تھا۔ کاش! وہ ارم کے حجاب کا پول کھول سکتی تو تایا کی شکل دیکھنے والی ہوتی۔ حجاب اوڑھنا یا نقاب کرنا کردار کی پختگی کی علامت نہیں ہوتی، اس نے بے اختیار سوچا تھا اور تب وہ ایسا ہی سوچتی تھی۔

سبانجی یونیورسٹی نے اسے اس کے ہاسٹل کے متعلق ترجیحات جاننے کے لیے ایک سوال نامہ بھیجا تھا۔ لیپ ٹاپ گود میں رکھے، وہ بیڈ پہ نیم دراز دلچسپی سے سوالات پڑھتی، صرف اپنا موڈ بہتر کرنے کے لیے مضحکہ خیز جواب بھیجنے لگی۔

''کیا آپ اپنی کسی ہم وطن ایکسچینج اسٹوڈنٹ کے ساتھ کمرا شیئر کرنا چاہیں گی؟''

''بالکل بھی نہیں!'' اس کی انگلیاں تیزی سے لیپ ٹاپ کی کنجیوں پہ حرکت کر رہی تھیں۔

''کیا آپ اسموکنگ کرتی ہیں؟''

''بالکل کرتی ہوں۔''

"ڈرنک کرتی ہیں؟"

"وہ بھی کرتی ہوں"

"آپ کس قسم کی طبیعت کی مالک ہیں؟"

"سخت جھگڑالو اور خونخوار"

وہ مسکراہٹ دبائے جواب لکھ رہی تھی۔ جب صفحہ ختم ہوا تو اس نے "نیکسٹ" کو دبایا۔ سوچ رہی تھی کہ اگلے صفحے کے جوابات پُر کر کے اس فارم کو منسوخ کر دیگی۔ اس فارم کو جمع کرانے کا اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا، مگر جب نیکسٹ دبانے پہ اگلے صفحے کے بجائے،

"فارم فل کرنے کا شکریہ..... ہم آپ کا ڈورم الاٹ کرتے وقت آپ کی دی گئی ترجیحات کا خیال رکھیں گے۔"

لکھا آیا تو اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"لعنت ہو تم سب پر!" وہ جھنجلا کر اٹھی اور لیپ ٹاپ ایک طرف رکھا، فارم سبانجی کو جا چکا تھا اور اسکا پہلا ہی تاثر کتنا برا پڑا ہوگا، وہ جانتی تھی۔

اس کی پیکنگ ابھی نامکمل تھی۔ اس نے ایک نگاہ کھلے سوٹ کیسز اور بکھری اشیا پہ ڈالی، پھر کچھ سوچ کر باہر آئی۔

لاؤنج خالی تھا۔ حیا نے ٹیلی فون اسٹینڈ پہ رکھی ڈائری اٹھائی اور صفحے پلٹنے لگی۔ "ایس" کے صفحے پہ چار سطور میں سبین پھپھو کے گھر کا پتا اور ایک فون نمبر لکھا تھا۔ اس نے وہ صفحہ پھاڑا اور تہہ کر کے مٹھی میں دبا لیا۔

ایک دفعہ جہان سکندر اسے مل جائے، پھر وہ ان بیتے ماہ و سال کا حساب ضرور لے گی۔ وہ واپس بیڈ پہ آ کر بیٹھی اور سامنے لیپ ٹاپ پہ کھلے پڑے میل باکس کو دیکھا۔ وہاں اب ایک نئی ای میل کا نشان جگمگا رہا تھا۔

"نیشنل رسپانس سینٹر فار سائبر کرائم۔"

اس نے قدرے الجھ کر اس میل کو دیکھا اور کھولا۔ بھلا اب سائبر کرائم سیل والے اس سے کیوں رابطہ کر رہے تھے؟

صفحہ کھل گیا اور وہ جیسے جیسے پڑھتی گئی، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی گئیں۔

یہ ای میل سائبر کرائم سیل سے حیا کی اُس میل کے جواب میں آئی تھی جو چند روز قبل اس نے بطور شکایت بھیجی تھی اور جس میں اس نے ویڈیو کا ذکر کیا تھا۔ اب اس کے جواب میں، ہیلپ ڈیسک آفیسر نے اس کو ایک باقاعدہ کمپلینٹ فارم بھیجا، جس کو بھرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنا فون نمبر، گھر کا پتا، شناختی کارڈ نمبر وغیرہ لکھ کر بھیجنے تھے۔ یہ فارم ایف آئی آر کے مترادف تھا، سو تمام تفصیلات ضروری تھیں۔

وہ یک ٹک اس فارم کو دیکھے گئی۔ اگر سائبر کرائم سیل نے اُسے جواب اب دیا تھا تو وہ پرائیویٹ نمبر سے آنے والی کال، وہ میجر احمد کا آفس، وہ سب کیا تھا؟ کیا اسے بے وقوف بنایا گیا تھا؟ کیا واقعی وہ اصلی میجر تھا یا.....؟ مگر پھر اس کے پاس اس وڈیو کو مکمل طور پر انٹرنیٹ سے ہٹوانے کی طاقت اور اثر و رسوخ کیسے آیا؟

وہ الجھتے ذہن کے ساتھ جلدی جلدی جواب ٹائپ کرنے لگی۔ اسے سائبر کرائم سیل کو مختصر الفاظ میں یہ یقین دہانی کروانی تھی کہ وہ وڈیو اب ہٹ چکی ہے، اور وہ اپنی شکایت واپس لے رہی ہے۔ اسے اب فوری طور پر ان خفیہ والوں سے پیچھا چھڑانا تھا۔

میل لکھ کر اس نے "سینڈ" کو دبایا، اور پُرسوچ نگاہوں سے اسکرین دیکھے گئی۔

میجر احمد کا تعلق سائبر کرائم سیل سے نہیں تھا، اس بات کا اس کو یقین ہو چلا تھا۔

☆ ☆ ☆

ائرپورٹ پہ ڈی جے بری طرح رو رہی تھی اس کے والدین اس کے ساتھ کھڑے اسے تسلی دے رہے تھے۔ حیا کچھ دیر تو اسے چپ کروانے کی کوشش کرتی رہی، پھر عاجز سی ہو کر قدرے فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی اور جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑے سکون سے ڈی جے کو روتے دیکھتی رہی۔

آج اُس نے شلوار قمیص پہ سیاہ جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اور دوپٹہ مفلر کی طرح گردن سے لپٹا تھا بس آج آخری روز تھا۔ پھر ترکی

میں وہ اپنی مرضی کا لباس پہنے گی اور اپنی مرضی سے اکیلی ہر جگہ گھومے گی، بنا روک ٹوک، بنا تایا فرقان یا ابا کی ڈانٹ کے خوف کے۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور ان کی فلائٹ اگلی صبح (پانچ فروری کی صبح) چار بجے کی تھی۔

"کتنا روتی ہے یہ، تم خیال رکھنا اس کا!"

سلیمان صاحب کو ڈی جے کے مسلسل رونے پہ کوفت ہونے لگی تھی۔ جب تک وہ واپس ہوئے، ڈی جے روئے جا رہی تھی۔ اس کے آنسو تب جا کر تھمے جب اتحاد ایئر لائنز کی وہ پاکستانی نژاد آفیسر ان کے پاس آئی اور بہت شائستگی سے ان کو مخاطب کیا۔

"میڈم! آپ لوگ پلیز اپنے ڈاکومنٹس اور لیپ ٹاپس سوٹ کیس سے نکال کر ہینڈ کیری میں رکھ لیں، تاکہ اگر آپ کا سامان گم بھی ہو جائے تو کم از کم ڈاکومنٹس محفوظ رہیں۔"

"ایویں ہی سامان گم ہو جائے؟" ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کر کے ڈی جے نے غصے سے کہا۔ وہ سارا رونا بھول گئی تھی۔ "ہم نے ہینڈ کیری میں اتنا بوجھ نہیں اٹھانا۔"

"میم! یہی بہتر ہے، کیونکہ بعض اوقات سامان گم بھی ہو جایا کرتے ہیں، کہیں یہ نہ ہو کہ بعد ازاں آپ کسی مسئلے سے دوچار ہوں۔"

وہ اس ترک ایئر لائن میں کام کرنے والی ایک پاکستانی لڑکی تھی اور ان کے پہلی دفعہ بین الاقوامی فلائٹ لینے کے پیش نظر کہہ رہی تھی۔ اور حیا مان بھی جاتی، مگر ڈی جے اڑ گئی۔

"ہرگز نہیں، ہم نے اتنا بھاری ہینڈ کیری نہیں اٹھانا۔"

"پلین میں آپ کو نہیں اٹھانا پڑے گا۔" آفیسر کی شائستگی برہمی میں بدلنے لگی۔

"پلین میں جانے تک تو اٹھانا ہی پڑے گا۔"

"پھر تو ترکی میں آپ پر اللہ ہی رحم کرے!" وہ پیر پٹختی چلی گئی تو ڈی جے نے اپنی متورم آنکھوں اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ حیا کو دیکھا اور انگلی سے عینک پیچھے کی۔

"انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی، جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے!"

حیا بے اختیار ہنس دی۔ اسے ڈی جے اچھی لگی تھی۔

فلائٹ میں ان دونوں کو نشستیں ایک ہی قطار میں ملیں۔ درمیانی راستے کے دائیں طرف جڑی تین نشستوں میں سے کھڑکی کے ساتھ والی حیا کو ملی اور راستے والی نشست ڈی جے کو، درمیانی نشست خالی تھی۔

"کیا ہی مزا آ جائے حیا! اگر اس سیٹ پہ کوئی ہینڈسم اور چارمنگ سا لڑکا آ کر......" ڈی جے کے الفاظ ادھورے ہی رہ گئے۔ ایک بھاری بھرکم سے پاکستانی صاحب جو اپنے ٹوپیس میں بے حد پھنسے پھنسے سے لگ رہے تھے، اطمینان سے چلتے ہوئے آئے اور دھپ سے ان دونوں کے درمیان بیٹھ گئے۔

حیا ذرا غیر آرام دہ محسوس کر کے مزید کھڑکی کی طرف کھسک گئی اور خدیجہ مخالف سمت۔

"مجھے عثمان شبیر کہتے ہیں، شیخ عثمان شبیر۔" اپنی بھاری آواز میں وہ خوش دلی سے گویا ہوئے۔

"نائس!" حیا بظاہر اپنے چھوٹے سے گولڈن کلچ کو کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ یہ وہی کلچ تھا جو داور بھائی کی مہندی پہ اس نے گولڈن لہنگے کے ساتھ لیا تھا۔

"گڈ!" ڈی جے نے میگزین اٹھا کر چہرے کے سامنے پھیلا لیا۔

"میں ترکی سے آیا ہوں، دراصل وہیں رہائش پذیر ہوں، میری بیوی اور بیٹا بھی وہیں رہتے ہیں۔"

حیا مزید اپنے پرس پہ جھک گئی اور ڈی جے نے میگزین چہرے کے اتنا قریب کر لیا کہ اس کی ناک صفحات کو چھونے لگی۔

"مگر وہ میرا بیٹا نہیں ہے، جانتی ہو وہ کس کا بیٹا ہے؟"

مزید نظر انداز کرنا بے کار تھا۔ حیا نے رخ عثمان شبیر کی جانب موڑا اور ڈی جے نے بیزاری سے میگزین نیچے کر لیا۔

''آپ بتائیں، کس کا بیٹا ہے وہ؟''

عثمان شبیر کو شاید صدیوں سے کسی سامع کی تلاش تھی۔ وہ اپنی داستان حیات فوراً ہی شروع کر بیٹھے۔ ڈی جے مسلسل جمائیاں روک رہی تھی اور حیا شدید تھکی محسوس کر رہی تھی۔ وہ کل صبح کی جاگی ہوئی تھی اور اب اس صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اوپر سے جہاز کا سفر! اس نے ڈی جے کے سامنے ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ پہلی بار جہاز میں بیٹھ رہی ہے، آخر ڈی جے کیا سوچتی کہ کیسی لڑکی ہے، کبھی ہوائی سفر ہی نہیں کیا۔ اب کیا بتاتی کہ کبھی کوئی ایسی صورت ہی نہیں بن سکی۔

اس سب پہ مستزاد ان صاحب کی الم ناک داستان، جو مختصراً کچھ ایسے تھی کہ وہ اور ان کی بیگم عرصہ تیس سال سے ترکی میں رہائش پذیر تھے۔ چونکہ اولاد نہیں تھی، اس لیے انہوں نے عثمان صاحب کے ایک کزن کا بیٹا گود لیا تھا۔ وہ بیٹا بے جا لاڈ پیار سے خاصا بگڑ چکا تھا، سو اس صورتحال کو سنوارنے کے لیے انھوں نے کھوہ میں رہائش پذیر اپنی بھانجی سے اس کا رشتہ طے کر دیا تھا، جس پہ آٹھویں فیل بھانجی صاحبہ بہت خوش اور بیٹا بہت ناراض تھا اور اس کے پیشتر کہ وہ اپنی پاکستان آمد کی وجہ بیان کرتے، مینیو کارڈز آ گئے۔

وہ دونوں پھر سے تازہ دم ہو گئیں۔ مینیو پہ کچھ نام جانے پہچانے اور کچھ اردو سے ملتے جلتے تھے۔

''جیرہ آلو دو سبز کٹلٹس، پنیر جلفریزی، سادہ پراٹھا، تیکھی بریانی، Sayadiat samak وغیرہ۔''

حیا نے ڈی جے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ درمیان میں موجود بھاری بھرکم دیوار کے باعث وہ آگے ہو کر بیٹھی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا منگوائیں۔

''ٹرکش فوڈ بہت زبردست ہوتا ہے اور ترک لوگ کھانے کے بہت شوقین ہوتے ہیں، میں بتاتا ہوں کہ کیا منگواؤ۔''

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر متذبذب سی حیا نے ہتھیار ڈال دیے۔

''بہت بہتر، بتایئے۔'' وہ گہری سانس لے کر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

''پہلے تو Sayadiat samak منگواتے ہیں۔ یہ روایتی ترک چاول ہیں، سفید مچھلی، فرائیڈ پیاز اور کاجو کے ساتھ۔''

''مشروم اینڈ چیز آملیٹ، جیرہ آلو.....'' وہ بہت اعتماد سے آرڈر لکھواتے گئے۔ مگر جب کھانا آیا تو حیا کا دل خراب ہونے لگا۔ کھانے کی خوشبو سونگھ کر ہی اس کا جی متلانے لگا تھا۔ عثمان شبیر بڑے بڑے لقمے لیتے مزے سے کھا رہے تھے۔ ڈی جے بمشکل ایک چمچہ لیکر ہی دوہری ہوئی۔ حیا بھی بدمزہ ہو گئی تھی۔ اتنا پھیکا کھانا اس نے آج تک نہیں کھایا تھا۔

بمشکل چکھ کر انھوں نے برتن پرے کر دیے۔ عثمان شبیر ابھی تک پوری دلجمعی سے کھا رہے تھے۔ عجیب سی خوشبوئیں اس کے نتھنوں میں گھس رہی تھیں۔ اگر یہی ترک فوڈ تھا تو اسے لگا، ترکی میں پانچ ماہ وہ بھوکی رہے گی۔ ایسا جی تو اس کا ڈائیوو بس میں بھی نہیں متلاتا تھا، جیسے ادھر ہو رہا تھا۔ وہ چہرے پہ دوپٹا رکھ کر سو گئی۔

☆ ☆ ☆

اسلام آباد سے پورے ڈھائی گھنٹے بعد انہیں ابوظہبی ائرپورٹ پہ اترنا تھا۔ وہاں کچھ دیر کا قیام تھا اور پھر.....استنبول!

ابوظہبی اترنے سے قبل کھڑکی کے پار زمین کا گولائی میں کٹاؤ دکھائی دینے لگا تھا۔ زمین کا وہ کٹاؤ اتنا حسین تھا کہ اس کی ساری بیزاری اور نیند بھاگ گئی۔ وہ محو سی یک ٹک وہ منظر دیکھے گئی۔

ابوظہبی ایئرپورٹ پر انھوں نے ٹرمنل تھری پہ لینڈ کیا تھا۔ استنبول کی فلائٹ انھوں نے ٹرمنل ون سے پکڑنی تھی، مگر پہلے...... گھر فون کرنا تھا!

وہ دونوں آگے پیچھے تیز تیز چلتی، کالنگ کارڈ خریدنے گئیں۔ پانچ یوروز کا اتصلات کا کارڈ خریدا اور فون بوتھ کی طرف بھاگیں۔ قطار میں فون بوتھ لگے تھے۔ حیا نے ایک ایک کر کے پہلے تینوں پہ کارڈ لگانے کی کوشش کی، مگر کارڈ تھا کہ ڈلنے کا نام ہی نہ لے۔ اسے ائرپورٹ پہ فون بوتھ استعمال کرنے کا پہلا تجربہ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

''حیا اس بندے کو دیکھو جیسے یہ کارڈ ڈال رہا ہے، ویسے ہی ڈالو'' ڈی جے نے اسے کہنی ماری تو حیا نے پلٹ کر دیکھا۔ چوتھے

بوتھ پہ ایک شخص ان کی طرف پشت کیے، اپنا کارڈ ڈال رہا تھا۔ حیا کو دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کون سا طریقہ استعمال کر رہا ہے۔ سو وہ ڈی جے کا ہاتھ تھامے اس کے سر پہ جا پہنچی۔

وہ ریسیور کان سے لگائے نمبر ملا رہا تھا۔

"پلیز ہمیں یہ کارڈ ڈال دیں۔ میں اسے ڈال نہیں پا رہی۔" حیا نے کارڈ اس کی طرف بڑھایا، وہ چونک کر پلٹا۔

وہ سیاہ رنگت، گھنگریالے بالوں اور اونچے قد کا نسلاً حبشی تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کارڈ لیتے ہوئے ان دونوں لڑکیوں پہ نگاہ ڈالی۔ ایک سیاہ لمبے بالوں اور بڑی آنکھوں والی خوبصورت سی لڑکی جو جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔ دوسری بڑے چشمے اور ڈھیلی پونی والی لڑکی جس نے سوئیٹر تہ کر کے بازو پہ ڈال رکھا تھا۔ دونوں منتظر سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اچھا میں ذرا بات کرلوں، پھر......!" اسے شاید کان سے لگے ریسیور میں کوئی آواز سنائی دی تھی، تب ہی رخ موڑ گیا۔

وہ دونوں اسی طرح کھڑی اسے دیکھتی رہیں۔ ان سے وہ انگریزی میں مخاطب ہوا تھا، مگر اب فون پہ عربی میں بات کر رہا تھا۔ ڈی جے تو بور ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، مگر شریعہ اینڈ لاء کے پانچ برسوں نے حیا کو عربی اچھی طرح سے سکھا دی تھی۔ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں اپنے ایل ایل بی کے پہلے برس ان کو عربی ہی سکھائی جاتی تھی، اور انکی کلاسز میں الجیرین اور مصری اساتذہ انہیں عربی میں ہی لیکچرز دیا کرتے تھے۔

"میں استنبول آ رہا ہوں۔" وہ اب رخ پھیرے قدرے پریشانی سے کہہ رہا تھا۔ "ہاں شام تک گھر پہنچ جاؤں گا۔ تم نے حارث کو ڈاکٹر کو دکھایا؟ اچھا؟ کیا کہتا ہے ڈاکٹر؟...کر دوں گا پیسوں کا انتظام، کہا جو ہے، بار بار ایک ہی بات مت دہرایا کرو، جاہل عورت!" طیش سے اس کی دبی دبی سی آواز بلند ہوئی۔ "ہاں! میری عبدالرحمان سے بات ہوگئی تھی، اسی کے کام کے لیے خوار ہو رہا ہوں، مگر وہ زیادہ رقم نہیں دے گا۔ ایک جگہ اور بھی بات کی ہے۔"

اس نے رک کر کچھ سنا اور پھر مزید جھنجھلاہٹ سے بولا۔ "اچھا فون رکھ رہا ہوں، مرحبا!" اس نے کھٹاک سے فون رکھا اور انکی طرف پلٹا۔ "سوری گرلز!" بمشکل چہرے پر بشاشت لاتے ہوئے وہ اب انکا کارڈ لگانے لگا۔ پہلی ہی کوشش کامیاب ہوگئی۔ وہ شاید کارڈ کو الٹا پکڑ رہی تھی۔

"لیجئے!" سیاہ فام نے ریسیور اس کی طرف بڑھایا۔ پھر ان سے ہٹ کر دور چلا گیا۔

"بس ایک ایک منٹ کی کال کریں گے۔" حیا نے نمبر ملاتے ہوئے ڈی جے کو تنبیہ کی۔ سلیمان صاحب نے پہلی ہی گھنٹی پہ فون اٹھالیا۔

"وہ چپ ہوئی کہ نہیں؟ تو یہ کتنا روتی ہے۔"

"جی جی ابا جی! وہ چپ ہوگئی ہے" اور پھر جلدی جلدی اپنی خیریت بتا کر فون بند کر دیا۔ ڈی جے نے بھی بمشکل ایک ہی منٹ گھر بات کی۔ بعد میں بقیہ رقم دیکھی تو بمشکل ایک یورو استعمال ہوا۔ باقی چار یورو کا بیلنس ابھی موجود تھا۔ دونوں اپنی عجلت و کنجوسی پہ خوب پچھتائیں کہ اب ابوظہبی سے نکل کر تو یہ کارڈ کسی کام کا نہیں تھا۔ حیا نے اسے اپنے گولڈن پاؤچ میں ڈال لیا۔

اب انہیں اپنا سامان لینا تھا۔ وہاں بہت سے ٹائرز چل رہے تھے۔ ہر ٹائر پر بیگز اور سوٹ کیس قطار میں رکھے چلے آرہے تھے۔ انہیں قطعاً علم نہیں تھا کہ اپنے بیگز کو کہاں تلاشیں؟

وہ دونوں بدحواس سی ایک ٹائر سے دوسرے کی طرف بھاگنے لگیں۔ ڈی جے کا تھوڑی دیر میں ہی سانس پھول گیا۔ کبھی حیا کو ایک جگہ اپنے سیاہ سوٹ کیس کا گمان گزرتا تو وہ ڈی جے کا ہاتھ کھینچ کر ادھر بھاگتی، مگر قریب سے دیکھنے پہ وہ کسی اور کا بیگ نکلتا، تو کبھی ڈی جے اپنے بھورے تھیلے کو پہچان کر چلاتے ہوئے ایک طرف دوڑتی، مگر اس پہ کسی اور کا نام درج ہوتا۔

"حیا بتاؤ! اب بیگز کہاں سے ڈھونڈیں؟" ڈی جے نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ حیا نے بمشکل تھوک نگلی اور چہرے پہ آتے بال کانوں کے پیچھے اڑسے۔ اب سچ بولنے کا وقت تھا۔

"ڈی جے! مجھے سچ میں نہیں سمجھ آ رہی، میں آج زندگی میں پہلی دفعہ جہاز میں بیٹھ رہی ہوں۔"

ڈی جے نے چند لمحے اس کا چہرہ دیکھا، پھر اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی۔

"ہاتھ مارو! میں بھی آج پہلی دفعہ جہاز میں بیٹھی ہوں۔"

حیا نے زور سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا اور دونوں ہنس پڑیں۔

کافی دیر بعد ان کو ٹائرز کی لسٹ نظر آئی، جس پہ ہر فلائٹ کے مخصوص ٹائر کا نمبر درج تھا۔ فہرست دیکھ کر دو منٹ میں ہی اپنا مطلوبہ ٹائرمل گیا۔ سامان لیکر حیا اتنی تھک چکی تھی کہ جب ڈی جے نے وہیں ایک جگہ چمکتے فرش پہ بیٹھنے کو کہا تو وہ اپنا سارا نخرہ اور غرور بالائے طاق رکھ کر ادھر زمین پہ بیٹھ گئی۔ اپنے بیگز کے ساتھ وہ دونوں اب مزے سے فرش پہ بیٹھیں ہر آتے جاتے کو دیکھ رہی تھیں اور اردگرد مہذب، نفیس لوگ حیرت سے ان کو دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆
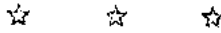
ٹرمنل ون سے جو پرواز ان کو ملی، اس میں بھی عثمان شبیر ساتھ ہی تھے۔ اپنی داستان حیات فراموش کر کے وہ اب ان کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا انٹرویو کرنے لگے۔

"کون ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ کیوں آئی ہو؟ ترکی میں کدھر جانا ہے؟ کیوں جانا ہے؟"

"سبانجی؟ سبانجی یونیورسٹی؟" انھوں نے اتنی بلند آواز میں دہرایا کہ اگلی نشست پہ بیٹھی ترک خاتون نے گردن موڑ کر قدرے اونچے ہو کر ان کو دیکھا۔

"سبانجی!" اس سے آگے خاتون نے قدرے ستائش سے چند الفاظ ترک میں کہے، جو حیا کو سمجھ نہ آئے، جواباً عثمان شبیر نے اپنی بھاری بھرکم آواز میں کچھ کہا تو وہ خاتون قدرے گڑبڑا کر واپس رخ پھیر گئیں۔

"آپ نے ان کو کیا کہا؟" حیا نے کڑی نگاہوں سے انہیں گھورا۔

"کچھ نہیں، تم بتاؤ، یہ پاکستان میں والدین اتنے آزاد خیال کب سے ہو گئے کہ جوان بچیوں کو اکیلے ترکی بھیج دیں؟"

"اکیلے نہیں ہیں ہم، پورا گروپ ہے، ہم دو اسٹوڈنٹس ہیں اور باقی فیکلٹی ممبران ہیں، جو دو روز قبل روانہ ہو چکے ہیں۔" مگر انہوں نے تو جیسے سنا ہی نہیں...

"خیر اب اکیلی جا رہی ہو تو خیال رکھنا کہ....." اور پھر ان کا وعظ شروع ہو گیا۔ نماز پڑھا کرو، قرآن پڑھا کرو، پردہ کیا کرو، سچ بولا کرو، اللہ سے ڈرو، غرض ہر وہ بات جو اپنے بیٹے کی تربیت کے وقت انہیں بھول گئی تھی، اب اچانک یاد آ گئی۔ حیا نے قدرے جھنجھلا کر رخ پھیر لیا۔

دوپہر دو بجے کھڑکی کے اس پار...... نیچے...... بہت نیچے......وہ پرفسوں منظر پھیلنے لگا۔

مرمرا کا سمندر، اوپر بادل اور برف...... یوں جیسے نیلی چادر پہ سفید روئی کے گالے تیر رہے ہوں، وہ اس منظر کے سحر میں کھوتی چلی گئی۔

جہان سکندر کا ترکی اس کے قدموں تلے تھا۔

"یہ رکھ لو" پرواز اترنے کا اعلان ہونے لگا تو نہایت زبردستی عثمان شبیر نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے تھمایا۔ "اس پہ میرے گھر، سیل اور آفس کے نمبرز لکھے ہیں۔ کبھی کبھار میں گھر پہ نہیں ہوتا اور کبھی کبھار میرا سیل بھی آف ہوتا ہے، مگر آفس کے نمبر پہ میں ہمیشہ ملتا ہوں۔ میری سیکرٹری کی فضولیات سے بچنے کے لیے ڈائریکٹ میری پرائیویٹ ایکسٹینشن ڈائل کرنا۔ وہ ہے 14 یعنی چودہ، کیونکہ میری اور پاکستان کی تاریخ پیدائش چودہ اگست ہے۔ رکھ لو، ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

عثمان شبیر سے بمشکل جان چھوٹ رہی تھی۔ انکو کبھی کال کرنا یا دوبارہ ملاقات کا تصور ہی حیا کے لیے سوہان روح تھا، پھر بھی ان کے اصرار پہ اس نے اپنے سنہری پاؤچ میں وہ کارڈ بغیر دیکھے رکھ لیا۔

اتاترک انٹرنیشنل ائرپورٹ استنبول کی یورپی طرف واقع تھا۔ یہ اسے بعد میں علم ہوا تھا، البتہ جو بات ہمیشہ سے معلوم تھی، وہ یہ تھی کہ استنبول دنیا کا وہ واحد شہر تھا، جو دو خطوں کو باہم ملاتا ہے... یورپ اور ایشیا۔

استنبول کے دو حصے تھے۔ ایک یورپی طرف کہلاتا تھا اور دوسرا ایشیائی طرف یا اناطولین طرف (اناطولین طرف کو عرف عام میں 'پرانا شہر' بھی کہا جاتا تھا)۔

وہ دونوں جب اپنے سامان کی ٹرالیاں دھکیلتے آگے آئیں تو رومی فورم کے ارکان اُن کو مل گئے، جو انہیں لینے آئے ہوئے تھے۔ رومی فورم ایک ترک این جی او تھی جو بالخصوص ایکسچینج اسٹوڈنٹس کا بہت خیال رکھتی تھی۔

وہ دو لڑکے تھے، احمت اور چغتائی۔

''چغتائی نام تو ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے، جیسے مصور عبدالرحمٰن چغتائی، ہے نا حیا۔'' ڈی جے نے سرگوشی کی تھی۔

''اسلام علیکم!'' وہ بہت گرمجوشی اور احترام سے ملے۔ چغتائی نے ان سے بیگز لے لیے۔ ''آیئے، باہر گاڑی انتظار کر رہی ہے۔''

''چغتائی برادرز! پلیز پانی پلا دیں۔ بہت پیاس لگی ہے۔'' حیا کی طرح ڈی جے بھی پیاس سے بے حال تھی۔ چغتائی نے سر اثبات میں ہلایا اور احمت کے ساتھ سامان اٹھانے لگا۔ پھر وہ دونوں ان کے آگے چلتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گئے۔

بے حد مہمان نواز قوم کے اس سپوت نے ان کو پانی کیوں نہیں پلوایا، یہ معمہ وہ ساری زندگی حل نہیں کر سکی۔ قوی امکان یہ تھا کہ چغتائی کی انگریزی کمزور تھی، جس کے باعث وہ انکا مدعا سمجھ نہیں پایا تھا۔

باہر نکلنے سے قبل انھوں نے اپنی رقم ترک لیرا اور یوروز میں تبدیل کروالی تھی۔ ایک لیرا پاکستانی پچپن روپے کا تھا اور ایک یورو ایک سو پچیس روپے کا......

''ففٹی فائیو......ون ٹوئنٹی فائیو......ففٹی فائیو......ون ٹوئنٹی فائیو......'' ڈی جے زیر لب کرنسی کی مالیت کا حساب لگاتی اور انکی قیمت یاد کرتی باہر آئی تھی۔

ائرپورٹ کا دروازہ کھلتے ہی سردی کی ایسی یخ بستہ، ہڈیوں میں گھستی، خون منجمد کرتی لہر نے انکا استقبال کیا کہ چند لمحوں میں حیا کے ہونٹ نیلے پڑنے لگے۔ یہاں مری اور ایوبیہ کی سرد ترین ہوا سے بھی کئی گنا سرد ہوا چل رہی تھی۔ حیا نے بے اختیار بازو سینے پہ لپیٹ لیے۔ وہ ٹھٹھرنے لگی تھی۔

انکا سامان خاص وزنی اور بے تحاشا تھا۔ دونوں لڑکے سرمئی رنگ کی ہائی ایس میں بیگز رکھتے رکھتے ہانپ گئے تھے۔

''آپ واقعی صرف پانچ ماہ کے لیے آئی ہیں؟'' چغتائی نے سادگی سے پوچھا، تو احمت نے اسے گھور کر موضوع بدل دیا۔

''ہماری روایت ہے کہ جو بھی اتاترک ائرپورٹ سے استنبول آتا ہے، ہم اسے سب سے پہلے سلطان ابو ایوب انصاریؓ کے مزار پہ لیکر جاتے ہیں۔ اس سے اس کا ترکی میں قیام اچھا گزرتا ہے۔'' احمت کہہ کر بیگ گاڑی میں رکھنے لگا تو ڈی جے نے سرگوشی کی۔

''مگر حیا! یہ تو تو ہم پرستی اور شرک......''

اس نے زور سے کہنی مار کر ڈی جے کو خاموش کرایا، پھر اندر بیٹھتے ہوئے دبی آواز میں گھرکا۔

''میزبانوں سے اس سردی میں بحث کی تو وہ تمہیں یہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے پاگل! صبح تک منجمد ہو کر پڑی ہو گی اور آئندہ ترکی آنے والے سب سے پہلے تمہارے منجمد مجسمے کی زیارت کیا کریں گے۔''

احمت کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی آتی تھی، سو وہ سارا راستہ گرد و پیش کے متعلق بتاتا رہا۔ حیا کو اس سفرنامے سے دلچسپی نہ تھی سو رخ پھیرے کھڑکی کے باہر دیکھے گئی۔

وہ جو امریکی فلموں والی بلند و بالا عمارتوں کی آس لگائے بیٹھی تھی، قدرے مایوس ہوئی، کیونکہ استنبول شروع میں تو یوں لگا جیسے اسلام آباد ہو مگر آہستہ آہستہ غور کرنے پہ محسوس ہوا کہ نہیں...... وہ واقعی یورپ تھا۔ دکانوں کے چمکتے شیشے، صاف سڑکیں، مغربی لباس میں پھرتے لوگ، دکانوں کی چھتوں اور درختوں کے اوپر پڑی برف اور سڑک کنارے بچھی برف کی تہیں، گویا سفید گھاس ہو۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس کہر اور سردی میں بھی ترک لڑکیاں بڑے مزے سے منی اسکرٹس میں ملبوس ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔

"خدا کرے، آج رات برف نہ پڑے۔" چغتائی نے موڑ کاٹتے ہوئے ایک پُرتشویش نگاہ باہر پھیلے برف زار پہ ڈالی۔

"ہاں! خدا کرے رات واقعی برف نہ پڑے۔"

احمت نے تائید کی۔

حیا اور ڈی جے نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ڈی جے آہستہ سے اردو میں بڑبڑائی۔

"ایویں نہ پڑے... خود تو برف باری دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہیں، ہمیں تو دیکھنے دیں۔ اللہ کرے، رات برف ضرور پڑے آمین، ثم آمین۔" اور حیا نے دل میں اس کی تائید کی۔

ونڈ سکرین کے اس پار یورپین شہر کا اختتام دکھائی دے رہا تھا۔ آگے نیلا سمندر بہہ رہا تھا اور اسکے دوسری طرف استنبول کا ایشیائی حصہ آباد تھا۔ دونوں حصوں کو ایک عظیم الشان پل نے جوڑ رکھا تھا۔ دو خطوں کا ملاپ، دو تہذیبوں کا سنگم...

"مرمرا کے سمندر کا جو حصہ استنبول کے درمیان سے گزرتا ہے، اسے بوسفورس کا سمندر کہا جاتا ہے۔ اس پل کا نام بھی باسفورس برج Bosphorus Bridge ہے۔" احمت بتانے لگا۔

"مگر ہم تو مزار پہ جا رہے تھے جو کہ یورپین حصے ہی میں ہے، پھر پل عبور کرنے کا مقصد؟" قریب آتے پل کو دیکھ کر حیا نے حیرت سے پوچھا، کیونکہ پل کے اس طرف اناطولین شہر تھا۔

"ہم نے پل عبور نہیں کرنا، اس کے قریب سے کسی کو اٹھانا ہے، ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے، آگے مزار تک آپ کو اسی نے لے کر جانا ہے۔"

چغتائی نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ احمت اب لاک کھول کر باہر نکل رہا تھا۔

حیا نے اس خوبصورت، اونچے پل کو دیکھا اور سوچا کہ کتنے برس وہ اسی پل پر سے گزرا ہوگا۔ کتنی ہی دفعہ اس نے بوسفورس کے نیلے پانیوں پہ چاندنی پریوں کا رقص دیکھا ہوگا۔ جب وہ اس سے ملے گی تو کیا اس کی آنکھوں میں استنبول کی سفید گھاس سی برف جمی ہوگی یا مرمرا کے پانیوں کا جوش ہوگا؟ اور کیا وہ کبھی اس سے مل پائے گی؟ اس خیال پہ اس کا دل جیسے مرمرا کے سمندر میں ڈوب کر کسی لٹی پٹی کشتی کی طرح ہولے سے ابھرا تھا۔

کھڑکی کے اس پار سے ایک دراز قد لڑکی کار کی طرف چلی آ رہی تھی۔ چہرے کے گرد اسکارف لپیٹے، بلیو جینز کے اوپر گھٹنوں تک آتا سفید کوٹ پہنے، وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے چلتی آ رہی تھی۔ اس کی رنگت استنبول کے سورج کی طرح سنہری اور آنکھیں بوجھل بادلوں کی مانند سرمئی تھیں۔

وہ لڑکی ان دونوں ترک لڑکوں کے پاس پہنچی اور مسکراتے ہوئے چغتائی کے ہاتھ سے چابی لی۔ رحمت پیچھے کھڑی ہائی ایس کی جانب اشارہ کر کے کچھ کہنے لگا۔ وہ لڑکی اپنی نرم مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلاتی سنتی گئی۔ پھر وہ دونوں چلے گئے اور وہ لڑکی کار کی طرف آئی۔ دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ کر گردن پیچھے گھمائی۔

"سلام علیکم..... اور ترکی میں خوش آمدید.....!" اس کی انگریزی شستہ اور انداز بے حد نرم تھا۔ حیا نے محسوس کیا کہ ترک السلام علیکم کے بجائے سلام علیکم Salamun Alaikum کہتے تھے۔

"وعلیکم السلام۔" حیا نے اس کا بڑھا ہاتھ تھاما تو اسے لگا، اس نے اتنا نرم ہاتھ کبھی نہیں چھوا۔ وہ ہاتھ نہیں گویا مکھن کا ٹکڑا تھا۔

"میرا نام ہالے نور ہے، میرا تعلق زودی فورم سے ہے۔ میں سانجی سے میٹریل سائنس اینڈ انجینئرنگ میں ایم ایس کر رہی ہوں۔ ائرپورٹ پر آپ کو لینے کے لیے بھی مجھے ہی آنا تھا، مگر میں کہیں پھنس گئی تھی، اس لیے نہیں آسکی، بہت معذرت" اس نے کار واپس موڑ دی تھی۔

"حیا سلیمان..."

"خدیجہ رانا..."

ان کے تعارف کو ہالے نور نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ سنا اور سر اثبات میں ہلایا۔ وہ واقعی نور کا ہالہ تھی۔ دھلی ہوئی چاندنی۔

"اب ہم انصاری محلہ جا رہے ہیں" وہ اسٹیرنگ وہیل گھماتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"محلہ؟ اردو والا محلہ، حیا!" ڈی جے نے دھیرے سے سرگوشی کی۔

"شاید..... تب ہی تو کہتے ہیں کہ اردو ترک سے نکلی ہے، تم نے میٹرک میں اردو زبان کے مضمون میں اس فقرے کا رٹا نہیں لگایا تھا کہ لفظ اردو ترک زبان سے نکلا ہے، جس کے معنی....."

"لشکر کے ہیں!" ڈی جے نے چہک کر فقرہ مکمل کیا۔

"ایوب سلطان جامعہ" کے بیرونی بازار کا نام ہے انصاری محلہ تھا۔ بے حد رش، بہت سے لوگ اور ہر سو اڑتے، چگتے کبوتر، وہ تینوں لوگوں کے درمیان بمشکل راستہ بناتیں، مسجد کے احاطے تک پہنچی تھیں۔

نماز سے فارغ ہو کر حیا نے دیکھا، وہاں جامعہ کا نام Eyup Sultan Camii لکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ جامعہ میں j کی جگہ C لکھا ہے، جو کہ غلط لگ رہا تھا۔

"ہماری زبان میں c کو عربی کے جیم کی آواز سے پڑھا جاتا ہے۔" انصاری محلے کے رش سے گزرتے ہوئے اس کی حیرت پہ ہالے نے بتایا۔ وہ مسکراتی ہوئی بڑے اعتماد سے اپنے سفید کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چل رہی تھی۔ اس کی بات پہ حیا بے اختیار چونکی۔

"حیران کیوں ہو؟" ہالے نے رک کر شاپر سے اپنے جوتے نکالتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہاں مسجد میں داخلے کے وقت جوتے باہر رکھنے کے بجائے شاپر میں رکھنے اور ساتھ شاپر ہمہ وقت اٹھائے رکھنے کا رواج تھا۔

"یعنی اگر کسی کا نام جہان ہو تو وہ ترک ہجوں میں اسے کیسے لکھے گا؟" بلا ارادہ اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر فوراً گڑبڑا کر ڈی جے کو دیکھا۔ وہ ذرا فاصلے پر کبوتروں کی تصاویر کھینچ رہی تھی۔ اس نے نہیں سنا تھا۔

ہالے شاپر ڈسٹ بن میں پھینک کر سیدھی ہوئی اور مسکرا کر ہجے کر کے بتایا۔ (Cihan)

"اوہ!" اس نے خفیف سا سر جھٹکا۔ تب ہی وہ اسے فیس بک پہ نہیں ملا تھا۔ وہ اس کو jihan لکھ کر ڈھونڈتی رہی، مگر وہ تو اپنے نام کو Chian لکھتا ہوگا۔

گلی صاف ستھری اور کشادہ تھی۔ دونوں اطراف میں دکانوں کے دروازے کھلے تھے۔ آگے کرسیاں میزیں بچھی تھیں اور گرد بہت سے اسٹال لگے تھے۔ سڑک کے کناروں پہ کھلے عام کتے ٹہل رہے تھے۔ مگر وہ بھونکتے نہیں تھے۔

حیا کو بھوک لگ رہی تھی اور وہ اب اس سفرنامے سے بور ہونے لگی تھی۔ بمشکل وہ تینوں اس رش بھرے محلے سے نکلیں۔

"ایکسچینج اسٹوڈنٹس کو ان کا پہلا کھانا ایک ترک میزبان خاندان دیا کرتا ہے اور ابھی ہم اسی میزبان خاندان کے گھر جا رہے ہیں۔"

جب وہ کار میں باسفورس کے پل پر سے گزر رہی تھیں تو ہالے نے بتایا۔ کھانے کا سن کر اس پہ چھائی بیزاریت ذرا کم ہوئی۔

میزبان خاندان کا گھر استنبول کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ کشادہ سڑک، خوب صورت بنگلوں کی قطار، اور بنگلوں کے سامنے سبزے پہ جمی برف۔

ان کے اسکالر شپ کوآرڈی نیٹر نے چند باتیں انہیں ذہن نشین کروا دی تھیں کہ:۔

ترکی میں جوتے گھر سے باہر اتارتے ہیں...

گھاس پہ نہیں چلنا...

اور ملاقات کے وقت ترک خاندان کے بڑے کا ہاتھ چومنا ہے۔

"اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس تکلف کو رہنے دو۔" ان دونوں نے گھر کے داخلی دروازے کے باہر بچھے میٹ پہ جوتے اتارے تو اندر سے آتی وہ مشفق اور محبت بھری خاتون پیار بھری خفگی سے بولی تھیں۔ "پہلے دن کوئی اصول نہیں ہوتے، سلام علیکم اور ترکی میں خوش آمدید۔"

"آپ کے اصولوں کی پاسداری ہمارے لیے فخر ہے۔" حیا نے مسکراتے ہوئے ان کا ہاتھ تھاما اور سر جھکا کر انکے ہاتھ کی

پشت کو لبوں سے لگایا۔

معمر خاتون، مسز عبداللہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا "اندر آ جاؤ" وہ راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹیں۔ ان کی سرخ بالوں والی بیٹی آگے بڑھی اور کارپٹ شوز حیا اور ڈی جے کے قدموں میں رکھے۔ وہ ریشمی کپڑے سے بنے کوٹ شوز کی شکل کے جوتے تھے۔ دونوں نے جھک کر وہ جوتے پہنے اور اندر داخل ہوئیں۔

اس ترک گھر کا فرش لکڑی کا بنا تھا۔ لونگ روم کے فرش پہ بہت خوب صورت قالین بچھے تھے۔ وہ باتھ روم ہاتھ دھونے آئی تو دیکھا، وہاں الگ سے ٹونٹی وغیرہ نہیں تھی۔ بلکہ ایک طرف قطار میں نل لگے تھے، البتہ باتھ روم کے فرش پر بھی رگز (پائیدان) اور کاؤچ بچھے تھے، حیرت انگیز!

وہ واپس آئی تو ڈائننگ ہال میں کھانا لگایا جا رہا تھا۔ ڈی جے جھک کر پیار سے مسز عبداللہ کی چھ سالہ نواسی عروہ سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ تین خواتین پر مشتمل چھوٹا سا کنبہ تھا اور چونکہ وہ دونوں لڑکیاں تھیں، سو ہالے نے ایسے ترک خاندان کا چناؤ کیا تھا، جس میں کوئی مرد نہ ہو۔ اسی پل مسز عبداللہ سوپ کا بڑا سا پیالہ اٹھائے آئیں۔ ہالے ان کی مستعدی سے مدد کروا رہی تھی۔

"تم کیا کہہ رہی تھیں، تمہارا یہاں کوئی رشتہ دار بھی ہے؟" انہوں نے سوپ کا ڈونگا میز پہ رکھا۔ حیا نے ایک نظر اس ملغوبے کو دیکھا۔

"جی..... میری پھپھو ہیں ادھر۔" وہ سوپ کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کدھر رہتی ہیں؟"

"ادھر!" اس نے پرس سے وہ مڑا تڑا کاغذ نکال کر ہالے کو تھمایا۔ ہالے نے ایک نظر اس کاغذ کو دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کل میں ملوا دوں گی تمہیں ان سے، کھانا شروع کرو۔" اس نے کاغذ واپس حیا کی جانب بڑھا دیا۔

"ڈی جے! ہم واقعی ترکی میں بھوکوں مریں گے۔ اس ملغوبے کی شکل تو دیکھو، مجھے تو پھر سے متلی ہو رہی ہے۔" حیا جبراً مسکراتے ہوئے ہولے سے اردو میں بولی۔ مسز عبداللہ نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"یہ کہہ رہی ہے کہ ان خواتین کا خلوص اسے شرمندہ کر رہا ہے۔" ڈی جے نے جلدی سے ترجمانی کرتے ہوئے میز کے نیچے سے اس کا پیر زور سے کچلا۔

"اوہ شکریہ۔" مسز عبداللہ مسکرا کر کھانا پیش کرنے لگیں۔

سوپ دراصل سرخ مسور کی دال کا شوربہ تھا اور اردو جیسی ترک میں اسے چوربہ کہتے تھے۔ وہ ذائقے میں شکل سے بڑھ کر بدمزا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی دونوں پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی برداشت جواب دینے لگی۔

"حیا! مجھے الٹی آنے والی ہے"

"اور میں مرنے کے قریب ہوں۔"

وہ بدقت مسکراہٹ چہروں پہ سجائے چمچہ بھر رہی تھیں۔ ترک خواتین بہت مرغوبیت سے سوپ پی رہی تھیں۔

چوربہ ختم ہوا تو کھانا آ گیا۔ وہ اس سے بھی بڑھ کر بدمزا۔ ایک چاولوں کا پلاؤ تھا۔ پاکستان میں پلاؤ کو "پ" کے اوپر پیش کے ساتھ بولا جاتا ہے، مگر یہاں اسے "پ" کے نیچے زیر کے ساتھ بولا جاتا تھا۔ پلاؤ شکل میں ابلے چاولوں سے مختلف نہ تھا۔ ساتھ چنے کا سالن اور مرغی کی گریوی تھی جو کہ منچورین کی طرح دکھتی تھی۔

وہ ڈیڑھ دن کی بھوکی تھیں اور اوپر سے یہ بدمزا کھانے مزید حالت خراب کر رہے تھے۔ وہی ترک خواتین ہی کھا رہی تھیں۔ پلاؤ کا پیالہ بھی ختم ہو چکا تھا، اور ہم پاکستانی میزبانوں کے برعکس وہ اسے دوبارہ بھرنے کے لیے دوڑی نہیں تھیں۔ وجہ ان کی خلوص کی کمی نہ تھی، بلکہ شاید یہی ان کا طریقہ تھا کہ پیالہ ایک ہی دفعہ بھر کر رکھا جاتا تھا۔

"خدیجہ! تمہاری دوست مجھے کچھ پریشان سی لگ رہی ہے، خیریت؟" مسز عبداللہ نے پوچھ ہی لیا۔

ڈی جے نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔ سب کھانے سے ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔
حیا نے میز تلے آہستہ سے اپنا پاؤں ڈی جے کے پاؤں پہ رکھا۔
''فیملی فرنٹ کی ہما، کوئی معقول وجہ بتاؤ ان کو۔''
''نہیں......وہ......دراصل......حیا......حیا بہت ڈرپورک ہے۔ اسے اسٹریٹ کرائم سے بہت ڈر لگتا ہے اور یہ پہلی دفعہ اکیلی یورپ آئی ہے، تو یہ پوچھ رہی ہے کہ کہیں استنبول میں ہمارا آرگنائزڈ کرمنلز سے تو واسطہ نہیں پڑے گا؟''
حیا خفت سے سر جھکائے لب کاٹتی رہی۔ وہ خالی ہاتھ ان کے گھر آئی تھیں اور انھوں نے میز بھر دی تھی، پھر بھی اس کے نخرے ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ اُسے بے حد پچھتاوا ہوا۔ وہ بات سنبھالنے پہ ڈی جے کی بے حد ممنون تھی۔
''قطعاً نہیں، استنبول بہت محفوظ شہر ہے۔''
سرخ بالوں والی لڑکی رسان سے بولی۔ ''یہاں کی پولیس ایسے لوگوں کو کھلے عام نہیں پھرنے دیتی۔''
''بالکل......استنبول میں قانون کی بہت پاسداری کی جاتی ہے۔'' ہالے نے تائید کی۔ مسز عبداللہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ ان کے چہرے پہ کچھ ایسا تھا کہ حیا انہیں دیکھے گئی۔
جب ہالے نور استنبول کی شان میں ایک لمبا سا قصیدہ پڑھ کر فارغ ہوئی تو مسز عبداللہ نے گہری سانس لی۔
''خدا کرے، تمہارا واسطہ کبھی عبدالرحمان پاشا سے نہ پڑے۔''
حیا نے دھیرے سے کانٹا واپس پلیٹ میں رکھا۔ ایک دم پورے ہال میں اتنا سناٹا چھا گیا تھا کہ کانٹے کی کانچ سے ٹکرانے کی آواز سب نے سنی۔
''کون پاشا؟'' ڈی جے نے الجھ کر مسز عبداللہ کو دیکھا۔
''وہ ممبئی کا ایک اسمگلر ہے، یورپ سے ایشیا اسلحہ اسمگل کرتا ہے۔ استنبول میں اگر چڑیا کا بچہ بھی لاپتہ ہو جائے تو اس میں پاشا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بوسفورس کے سمندر میں ایک جزیرہ ہے، بیوک ادا۔ اس جزیرے پہ اس مافیا کا راج ہے۔''
''اور میری ماں کو خواب بہت آتے ہیں۔'' ان کی بیٹی نے خفگی سے ان کو دیکھا۔
''یہ لڑکیاں سمجھتی ہیں، میری عقل میرا ساتھ چھوڑنے لگی ہے۔''
''بالکل ٹھیک سمجھتی ہیں اور ایکسچینج اسٹوڈنٹس! کان کھول کر سن لو۔'' ہالے نے قدرے تلملا کر مداخلت کی۔ ''استنبول میں ایسا کوئی کرائم سین نہیں ہے، یہ سب گھریلو عورتوں کے افسانے ہیں۔ یہاں کوئی بھارتی اسمگلر نہیں ہے۔''
دونوں ترک لڑکیاں اپنے تئیں بات ختم کر کے اب سوئٹ ڈش کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ خدیجہ بھی ان کی باتوں پہ مطمئن ہو کر شکر پارے کھانے لگی تھی، مگر حیا کے حلق میں وہ بہت میٹھے سے شکر پارے کہیں اٹک سے گئے تھے۔
ابوظہبی انٹرنیشنل ائرپورٹ پہ اس نے اس حبشی کے منہ سے پاشا کا نام سنا تھا۔ وہ نہایت مضمحل سا اپنی بیوی سے عربی میں بات کر رہا تھا۔ اپنے بیٹے کے علاج کا ذکر۔ مگر ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور پاشا کے کام کا ذکر کر رہا ہو اور واقعی ترک گھریلو عورتوں کے افسانوں کے مرکز 'پاشا' کا کوئی وجود نہ ہو۔
الوداعی لحات میں جب باقی سب آگے نکل چکے تو مسز عبداللہ نے دھیرے سے حیا کے قریب سرگوشی کی۔
''یہ لڑکیاں استنبول کی برائی نہیں سن سکتیں۔ تمہیں اس لیے بتایا کہ تم کرائم سے ڈرتی ہو اور خوب صورت بھی ہو، خوبصورت لڑکیوں پہ عموماً ایسے لوگ نظر رکھتے ہیں۔''
حیا نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ان کے جھریوں زدہ چہرے پہ سچائی بکھری تھی۔
''وہ واقعی اپنا وجود رکھتا ہے۔'' وہ بالکل سن سی ہو کر انہیں دیکھے گئی۔ کیا افواہوں کا خوف مجسم صورت میں ان کے سامنے آ گیا تھا،

یا ان کی عقل واقعی ان کا ساتھ چھوڑ رہی تھی؟

☆ ☆ ☆

شام کے سائے گہرے پڑ رہے تھے، جب وہ سبانجی یونیورسٹی پہنچیں۔ سبانجی امراء کی جامعہ تھی۔ وہاں چار ماہ کے ایک سمسٹر کی فیس بھی دس ہزار ڈالرز سے کم نہ تھی۔ شہر سے دور، مضافات میں واقع وہ قدرے گولائی میں تعمیر کردہ عمارت بہت پر سکون دکھتی تھی۔ چونکہ وہ جگہ استنبول شہر سے قریباً پینتالیس منٹ کے فاصلے پہ تھی، اس لیے سبانجی میں ڈے اسکالرز نہیں ہوتے تھے۔ اس کے تمام طلبہ و طالبات بشمول ہالے نور جیسے لوگوں کے، جن کے گھر استنبول میں ہی تھے، ہاسٹل میں رہائش پذیر تھے۔

یونیورسٹی کی عمارت سے دور برف سے ڈھکے میدانوں میں ایک جگہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پہ اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ وہ ان کے رہائشی ڈورم بلاکس تھے۔ انگریزی حرف ایل کی صورت کھڑی تین تین منزلہ عمارتیں، جن کے کمروں کے آگے بالکونیاں بنی تھیں۔ چھ کمرے ایل کی ایک لکیر پہ تھے اور چھ دوسری لکیر پر تھے۔

''تمہارا کمرہ دوسری منزل پہ ہے۔'' ہالے نے اس کا سامان گاڑی سے نکالتے ہوئے بتایا۔ حیا اور ڈی جے دوسرا بیگ گھسیٹ کر لا رہی تھیں۔

ایل کی شکل کا ڈورم بلاک جس کو ہالے بی ون کہہ رہی تھی، کے باہر گولائی میں چکر کھاتی سیڑھیاں کھلے آسمان تلے بنی تھیں، جو اوپر تک لے جاتی تھیں۔ لوہے کی ان سیڑھیوں کے ہر دو زینوں کے درمیان خلا تھا اور زینوں پہ برف کی موٹی تہ تھی۔ ذرا سا پاؤں پھسلے اور آپ کی ٹانگ اس گیپ میں سے نیچے پھسل جائے۔ وہ تینوں گرتی پڑتی بمشکل حیا کا سامان اوپر لائیں۔

''کمرا تو اچھا ہے، ہم یہاں رہیں گے؟'' حیا نے ہالے کی تھمائی چابی سے اپنی dormitory کا دروازہ دھکیلا تو بے اختیار لبوں سے نکلا۔

''ہم نہیں، صرف تم، کیونکہ خدیجہ کا بلاک بی ٹو ہے۔ وہ جو سامنے ہے۔'' اس نے انگلی سے دور برفیلے میدان میں بنی عمارت کی جانب اشارہ کیا۔

''کیا مطلب، میں ادھر اکیلی؟'' وہ دنگ رہ گئی۔

''بعد میں تم بدلوا سکتی ہو ڈورم آفیسر سے کہہ کر۔ ابھی تم آرام کرو، ہر کمرے میں چار اسٹوڈنٹس ہوتے ہیں۔ ہر اسٹوڈنٹ کی ٹیلی فون ایکسٹینشن اس کی میز پہ ہوتی ہے۔ آج کل چھٹیاں ہیں، اکثر طالبعلم اپنے گھر گئے ہوئے ہیں۔ تمہارا کمرا خالی ہے، مگر تم جا کر اپنے بیڈ پر ہی سونا، ترک لڑکیوں کے بستر پہ کوئی سو جائے تو وہ بہت برا مانتی ہیں۔ کوئی مسئلہ ہو تو میرا ڈورم بلاک بی فور میں ہے، اوکے؟'' مسکرا کر وہ بولی تو حیا نے سر ہلا دیا۔

ڈی جے نے بے چارگی سے اسے دیکھا اور ہالے کے ہمراہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

''ہالے! سنو، اس عمارت کے پیچھے کیا ہے؟'' کسی خیال کے تحت اس نے پکارا۔ ہالے مسکرا کر پلٹی اور بولی ''جنگل!'' پھر وہ دونوں زینے اتر گئیں۔

حیا ایک جھرجھری لے کر پلٹی اور اندر کمرے میں قدم رکھا۔

کمرا خوبصورتی سے آراستہ تھا۔ ہر دیوار کے ساتھ ایک ایک ڈبل سٹوری بنک bunk رکھا تھا۔ عموماً ایسے بنکس میں نیچے ایک بیڈ اور اوپر بھی ایک بیڈ ہوتا ہے، مگر اس میں نیچے بڑی سی رائٹنگ ٹیبل بنی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لکڑی کی سیڑھی اوپر جاتی، جہاں ایک آرام دہ بیڈ تھا۔ میز پہ ایک ٹیلیفون رکھا تھا۔ وہ چاروں بنکس کو دیکھتی اپنے نام کی میز کی کرسی کھینچ کر نڈھال سی بیٹھ گئی۔

وہ ایک تھکا دینے والا دن ثابت ہوا تھا، مگر ابھی وہ تھکن کے بجائے عجیب سی اداسی میں گھری تھی۔

غیر ملک، غیر خطہ، غیر جگہ اور تنہا کمرا۔ جس کے پیچھے جنگل تھا۔ اسے جانے کیوں بے چینی ہونے لگی۔ وہ فریش ہونے کے لیے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی، تاکہ باہر کہیں باتھ روم ڈھونڈے، ابھی اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ دو کمرے چھوڑ کر ایک کمرے کا دروازہ

کھلا اور اس میں سے ایک لڑکا بیگ اٹھائے نکلا۔

اس نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور پھر مقفل کر دیا۔

گرلز ہاسٹل میں لڑکا؟ اگر پاکستان میں ہوتی تو یقیناً یہی سوچتی، مگر یہ بات تو سبانجی کے پراسپکٹس میں پڑھ چکی تھی کہ وہ مخلوط ہاسٹل تھا۔ البتہ ایک کمرے کے اندر صرف ایک صنف والے افراد ہی رہ سکتے تھے۔

وہ بددل سی ہو کر واپس کرسی پہ آ بیٹھی۔

سامنے والی دیوار پہ ایک سفید اور سیاہ تصویر آویزاں تھی، پنسل سے بنایا گیا وہ خاکہ ایک کلہاڑے کا تھا، جس کے پھل سے خون کی بوندیں گر رہی تھیں۔

خاکہ بے رنگ تھا، مگر خون کے قطروں کو بے حد شوخ سرخ رنگ سے بنایا گیا تھا۔

اس نے جھرجھری لے کر دوسری دیوار کو دیکھا۔

وہاں ایک لڑکی کے چہرے کا بے رنگ پنسل سے بنا خاکہ ٹنگا ہوا تھا۔ وہ تکلیف کی شدت سے آنکھیں بھینچے ہوئے تھی، اس کی گردن پہ چھری چل رہی تھی۔ اور اس سے بھڑکیلے سرخ خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

وہ مضطرب سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ان تصاویر والی دیوار کے ساتھ لگے بینک کی میز پہ بہت سے چاقو اور چھریاں قطار میں رکھے تھے۔ ہر سائز، ہر قسم اور ہر دھار کا چاقو، جن کے لوہے کے پھل مدھم روشنی میں بھی چمک رہے تھے۔

وہ ایکدم بہت خوفزدہ ہو کر باہر لپکی۔

کوریڈور میں بہت اندھیرا تھا۔ دور نیچے برف سے ڈھکے میدان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی، جیسے ہی اس نے پہلے زینے پہ قدم رکھا، اوپر چھت پہ لگا بلب ایک دم جل اٹھا۔

وہ ٹھٹک کر رکی اور گردن گھمائی۔ کوریڈور خالی تھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر بلب کس نے جلایا؟

اس کی گردن کی پشت کے بال کھڑے ہونے لگے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ پلٹی اور زینے اترنے لگی۔ تب ہی ایک دم ٹھاہ کی آواز کے ساتھ اوپر کوئی دروازہ بند ہوا۔ اس نے پتھر بن جانے کے خوف سے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی چلی گئی۔

آخری زینے سے اتر کر اس نے جیسے ہی برف زار پہ قدم رکھا، اوپر بالکونی میں جلتا بلب بجھ گیا۔

باہر زور و شور سے برف گر رہی تھی۔ تازہ پڑی برف سے اس کے قدم پھسلنے لگے تھے۔ سفید سفید گالے اس کے بالوں اور جیکٹ پہ آ ٹھہرے تھے۔ وہ گرتے پڑتے ڈی جے کے بلاک بی ٹو کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے پہلی دفعہ اپنی مانگی گئی کسی دعا پہ پچھتاوا ہوا تھا "کاش! آج یہ برف نہ پڑتی۔"

بی ٹو کی دوسری منزل کی بالکونی میں وہ دم لینے کو رکی۔ اسے منزل یاد تھی، مگر کمرے کا نمبر بھول چکا تھا۔ اس نے ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کا پیالا بنا کر زور سے آواز دی۔

"ڈی جے...... تم کہاں ہو؟"

"ڈی جے......"

"ڈی جے......"

ایک دروازہ جھٹ سے کھلا اور کسی نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اندر کھینچا۔

"اگر تم دو منٹ مزید تاخیر کرتیں تو میں مر چکی ہوتی حیا!" ڈی جے بھی اس کی طرح تنہا اور خوف زدہ لگ رہی تھی۔ مگر اس کمرے میں آ کر حیا کا سارا خوف اڑن چھو ہو چکا تھا۔

"ڈر ومت، تمہارے لیے ہی تو آئی ہوں۔ مجھے پتا تھا، تم اکیلی ڈر رہی ہو گی، ورنہ میرا کیا ہے، میں تو کہیں بھی رہ لیتی ہوں۔" وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر بولی، پھر بے اختیار جمائی روکی۔ خوف ختم ہوا تو نیند طاری ہونے لگی۔

''مگر ڈی جے! میں سوؤں گی کدھر؟''

''ان تین خالی بیڈز پہ کانٹے بچھے ہوئے ہیں کیا؟''

''مگر ہالے نے کہا تھا کہ ترک لڑکیاں......''

''فی الحال یہاں نہ ہالے ہے، نہ ہی ترک لڑکیاں......''

''مگر اللہ تو دیکھ رہا ہے!'' غیر ملک میں اس کا سویا ہوا خوف خدا جاگ اٹھا تھا۔

''اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہالے کو پتا نہیں لگنے دے گا۔ اب بستر میں گھسو اور سو جاؤ۔ خدا جانے مجھے کس پاگل کتے نے کاٹا تھا، جو ترکی آ گئی۔ آگے جھیل، پیچھے جنگل، اتنی وحشت......''

ڈی جے کمبل میں لپٹے بڑبڑائے جا رہی تھی۔ نیند سے تو وہ بھی بے حال ہونے لگی تھی، سو ڈی جے کے قریبی بینک کی سیڑھیاں پھلانگ کر اوپر کمبل میں لیٹ گئی۔

''حیا......'' وہ کچی نیند میں تھی، جب ڈی جے نے اسے پکارا۔

''ہوں؟'' اس کی پلکیں اتنی بوجھل تھیں کہ انہیں کھول نہیں پا رہی تھی۔

''سامنے والے کمرے میں بڑے ہینڈسم لڑکے رہتے ہیں، میں نے انہیں کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔''

''اچھا......'' اس کا ذہن غنودگی میں ڈوب رہا تھا۔

''اور سنو، وہ پلاؤ اتنا برا بھی نہیں تھا، ہمیں صرف سفر کی تھکاوٹ کے باعث برا لگا، اور سنو......''

مگر ڈی جے کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ سو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

دروازے پہ مدھم سی دستک ہوئی تو وہ سرعت سے کرسی سے اٹھی۔ ایک نظر سوتی ڈی جے پہ ڈالی، دوسری اپنے زیر استعمال بینک پہ جو دوبارہ سے بنا سلوٹ اور شکن کے بنایا جا چکا تھا اور جس پہ ترک لڑکیوں کے اعتماد کے خون کیے جانے کی کوئی نشانی باقی نہ تھی......اور دروازہ کھول دیا۔

''سلام علیکم ایکسچینج اسٹوڈنٹس!'' ہالے نور ہشاش بشاش سی مسکراتی کھڑی تھی۔ وہ یوں تھی گویا دھلی ہوئی چاندنی۔ سیاہ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹے، ہلکی سبز لمبی جیکٹ تلے سفید جینز پہنے، شانے پہ بیگ اور ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑے وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔

''وعلیکم السلام، آؤ ہالے!''

''میں تمہارے ڈورم میں گئی تھی مگر تم ادھر نہیں تھیں۔ میں نے اندازہ کیا کہ تم یہیں ہو گی۔'' ہالے نے اپنا بیگ میز پہ رکھا اور کرسی کھینچ کر نفاست سے بیٹھی۔

''ہاں میں علی الصبح ہی ادھر آ گئی تھی۔ ڈی جے کی یاد آ رہی تھی۔''

''خدیجہ سو رہی ہے؟'' ہالے نے گردن اونچی کر کے اوپر دیکھا، جہاں ڈی جے دو موٹے کمبل گھٹڑی کی صورت خود پہ ڈالے سو رہی تھی۔

''ہاں اور شاید دیر تک سوتی رہے۔''

''اوہ......میں نے سوچا تھا کہ تمہارے فون رجسٹرڈ کروانے چلیں آج۔ ترکی میں غیر ملکی فون پہ ترک سم کارڈ ایک ہفتے کے بعد بلاک ہو جاتا ہے۔''

''ہاں بالکل، تم لوگ جاؤ اور میرا فون بھی لے جاؤ، میں ابھی دو گھنٹے مزید سوؤں گی۔''

کمبلوں کے اندر سے آواز آئی تو ہالے مسکرا دی، مسکراتے ہوئے اس کی چمکتی سرمئی آنکھیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔

''چلو حیا! ہم دونوں چلتے ہیں۔''

وہ دونوں ساتھ ساتھ کھڑی ہو گئی تھیں۔ حیا صبح اپنے کمرے میں جا کر فریش ہو آئی تھی۔ ابھی وہ سیاہ چوڑی دار پاجامے اور ٹخنوں تک آتی سیاہ لمبی قمیص میں ملبوس تھی۔ شیفون کا دوپٹہ گردن کے گرد مفلر کی طرح لپیٹے، اور اوپر لمبا سیاہ سویٹر پہنے ہوئے تھی جس کے بٹن سامنے سے کھلے تھے۔

''کچھ دن میرے خوش قسمت دن ہوتے ہیں، جب میرے پاس کار ہوتی ہے اور کچھ دن بدقسمت دن جب میرے پاس کار نہیں ہوتی۔ اور آج میرا خوش قسمت دن ہے۔'' ہالے نے اٹھتے ہوئے بتایا۔

''ابھی ہم قریبی دو دکانوں میں جائیں گے، اگر وہاں سے فون رجسٹرڈ نہ ہوئے تو جواہر چلیں گے، اس کے بعد وہاں سے جہانگیر۔''

''جواہر؟'' حیا نے ابرو اٹھائی، جہانگیر کو اس نے کسی ترک کا نام سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

''جواہر شاپنگ مال ہے۔ یورپ کا سب سے بڑا اور دنیا کا چھٹا بڑا شاپنگ مال!''

''اوہ اچھا جیسے پاک ٹاورز......'' اوپر کمبلوں سے آواز آئی۔

''پاک ٹاور؟'' ہالے نے گردن اٹھا کر خدیجہ کے کمبلوں کو دیکھا۔

''ہمارا پاک ٹاورز، ایشیا کے سب سے بڑا شاپنگ مال شمار ہوتا ہے۔'' وہ غنودہ آواز میں بولی۔

''نائس!'' ہالے ستائش سے مسکرا کر باہر نکل گئی۔

حیا نے اس کے جانے کی تسلی کر لی، پھر لپک کر پیچھے آئی اور سیڑھی پہ چڑھ کر ڈی جے کا کمبل کھینچا۔

''یہ پاک ٹاورز ایشیا کا سب سے بڑا مال کب سے ہو گیا؟''

''اس نے کون سا جا کر چیک کر لینا ہے۔ تھوڑا شو مارنے میں کیا حرج ہے؟''

ڈی جے غڑاپ سے پھر کمبل میں گھس گئی۔

☆ ☆ ☆

ہالے ڈرائیو کرتے ہوئے متاسف سی بار بار معذرت کر رہی تھی۔ فون رجسٹر نہیں ہو سکتے تھے۔ Avea کی دوکان پہلے تو ملی نہیں، دوسری موبائل کمپنیوں کی دوکانیں ہی ہر جگہ تھیں۔ یوں جیسے آپ کو زونگ کی دوکان کی تلاش ہو اور ہر طرف یوفون کی دوکانیں ہوں۔ بمشکل ایک دوکان ملی تو اس کا مینیجر شاپ بند کر کے جا رہا تھا۔ لاکھ منتوں پر بھی اس نے دوکان نہیں کھولی اور چلا گیا۔ اب ہالے مسلسل شرمندگی کا اظہار کر رہی تھی۔

''بس کرو ہالے! بعد میں ہو جائے گا یہ کام، اب مجھے شرمندہ مت کرو۔''

''خیر، تمہارا دوسرا کام تو کر دوں، جہانگیر چلتے ہیں۔''

ہالے نے گہری سانس اندر کھینچی۔ گاڑی سڑک پہ رواں دواں تھی اور کھڑکی کے باہر ہر سو برف دکھائی دے رہی تھی۔

''تم ایڈریس دکھاؤ، ہم پہنچنے والے ہیں۔''

''کدھر؟'' حیا نے نا سمجھی سے ڈرائیو کرتی ہالے کو دیکھا۔

''جہانگیر اور کدھر؟''

''وہاں کیا ہے؟''

''تمہاری آنٹی کا گھر، کل کہا جو تھا کہ تمہیں لے جاؤں گی، صبح بتایا بھی تھا، بھول گئیں؟''

''تم...... مجھے ادھر لے کر جا رہی ہو؟'' وہ ہکا بکا رہ گئی۔

''ہاں نا...... اب ایڈریس بتاؤ، اسٹریٹ نمبر تو مجھے یاد رہ گیا تھا، آگے بتاؤ۔''

''اوہ ہالے!'' اس نے ہڑبڑا کر پرس سے وہ مڑا تڑا سا کاغذ نکالا...... اس نے کاغذ پہ دیکھا، اس علاقے کا نام Cihangir

لکھا تھا، وہ اسے سہانگیر پڑھتی رہی تھی، اب اسے یاد آیا کہ ترکوں کا سی، جیم کی آواز سے پڑھا جاتا تھا۔ اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ ادھر جانا ہے تو وہ تحائف ہی اٹھا لیتی جو اماں نے بھیجے تھے۔ ذرا اچھے کپڑے ہی پہن لیتی تھوڑا سا میک اپ ہی کر لیتی۔

"لو، یہ تو سامنے ہی تھا۔ اب تم جاؤ، مجھے ادھر تھوڑا کام ہے، میرا نمبر تم نے فون میں فیڈ کر لیا ہے نا؟ جب فارغ ہونا تو مجھے کال کر لینا۔ میں آجاؤں گی، گھنٹہ تو مجھے لگ ہی جائے گا، پھر کھانا ساتھ کھائیں گے۔"

گاڑی رک چکی تھی۔ حیا نے بے توجہی سے اس کی ہدایات سنیں اور دروازہ کھول کر نیچے اتری۔

اس کے دروازہ بند کرتے ہی ہالے گاڑی زن سے بھگا کر لے گئی۔

وہ ایک خوبصورت چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ بیرونی چار دیواری کی جگہ سفید رنگ کی لکڑی کی باڑ لگی تھی۔ گیٹ بھی لکڑی کی باڑ کا بنا تھا۔ گیٹ کے پیچھے چھوٹا سا باغیچہ تھا اور اس کے آگے وہ بنگلہ۔

بنگلے کی گلابی چھت مخروطی تھی۔ داخلی سفید دروازہ ذرا اونچا تھا۔ اس تک چڑھنے کے لیے دو اسٹیپس بنے تھے۔ اسٹیپس کے دونوں اطراف خوش رنگ پھولوں والے گملے رکھے تھے۔ تو یہ تھی وہ چھوٹی سی جنت، جس میں وہ رہتا تھا، اور جس سے باہر نکلنے کا اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

وہ گیٹ کو دھکیل کر، پتھروں کی روش پہ چلتی ان اسٹیپس تک آئی، اونچے سفید دروازے پہ سنہری رنگ کی تختی لگی تھی۔

"سکندر شاہ....."

وہ ترک ہجوں میں لکھا نام اس کے پھوپھا کا ہی تھا۔ گھنٹی کی تلاش میں اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اس گھر میں بہت سی لکڑی کی کھڑکیاں بنی تھیں اور شاید کوئی کھڑکی کھلی تھی، جس سے مسلسل ایک ٹھک ٹھک کی آواز آرہی تھی۔ جیسے کوئی ہتھوڑے یا کلہاڑے کو لکڑی پہ زور سے مار رہا ہو۔

اس نے کپکپاتی انگلی گھنٹی پہ رکھی اور سنہری ڈور ناب کے چمکتے دھات میں اپنا عکس دیکھا۔

کاجل سے لبریز بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، دونوں شانوں پر پھسل کر نیچے گرتے لمبے بال اور سردی سے سرخ پڑتی ناک۔ وہ سیاہ لباس میں چینی کی مورت لگ رہی تھی، گھبرائی ہوئی پریشان سی مورت۔

اس نے گھنٹی سے انگلی ہٹائی تو ٹھک ٹھک کی آواز بند ہوگئی۔ چند لمحے بعد لکڑی کے فرش پہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی انجانی زبان میں بڑبڑاتا دروازہ کھولنے آرہا تھا۔

وہ لب کاٹتے ہوئے کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی، جب دروازہ کھلا۔ چوکھٹ پہ بچھے ڈور میٹ پہ اسے دروازہ کھولنے والے کے ننگے پاؤں دکھائی دیے۔ اس کی نگاہیں دھیرے سے اوپر اٹھتی گئیں۔

بلیو جینز اور اوپر گرے سویٹر میں ملبوس، وہ ایک ہاتھ میں ہتھوڑی پکڑے کھڑا تھا۔ سویٹر کی آستینیں اس نے کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں اور اس کے کسرتی بازو جھلک رہے تھے۔

حیا نے دھیرے سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا سانس لمحے بھر کو ساکت ہوا تھا۔ وہ ویسا ہی تھا جیسے اپنے بچپن کی تصاویر میں لگا کرتا تھا۔ وہی بھورے مائل بال جو بہت اسٹائلش انداز میں ماتھے پہ گرتے تھے۔ پرکشش آنکھیں، اٹھی ہوئی مغرور ناک، سنہری رنگت کے تیکھے نقوش، وہ ماتھے پہ تیوری لیے آنکھیں سکیڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

بلاشبہ، وہ بہت ہینڈسم تھا۔

"سن کمسن؟" اس نے ترک میں کچھ پوچھا تو وہ چونکی۔

"سس..... سبین سکندر..... سبین سکندر کا گھر یہی ہے؟"

"جی یہی ہے۔" وہ انگریزی میں بتا کر سوالیہ جانچتی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

اسے لگا وہ بوسفورس کے پل پہ ہتھیلیاں پھیلائے کھڑی ہے، اور نیلے پانیوں کو چھو کر آتی ہوا اس کے بال پیچھے کو اڑا رہی ہے۔ وہ

کسی گہرے خواب کے زیر اثر تھی۔ حسین خواب کے......

"میں ان کی مہمان ہوں۔ پاکستان سے آئی ہوں۔" وہ اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ اس کے سامنے اس کی ساری خوداعتمادی ہوا ہوگئی تھی۔ ایک دم وہ خود کو بہت کمزور محسوس کرنے لگی تھی۔

"کیسی مہمان؟" اس کا انداز اکھڑا اکھڑا سا تھا، جیسے وہ کسی ضروری کام میں مصروف تھا جس میں حیا مخل ہوئی تھی۔

"میں حیا ہوں...... حیا سلیمان۔" اس نے پرامید نگاہوں سے جہان سکندر کا چہرہ دیکھا کہ ابھی اس کا نام سن کر اس کی پرکشش آنکھوں میں شناسائی کی کوئی رمق......

"کون حیا سلیمان؟"

اس کے قدموں تلے باسفورس کا پل شق ہوا تھا وہ بے دم سی نیچے گہرے نیلے پانیوں میں جا گری تھی۔

"کون حیا سلیمان؟" یہ آواز دہراتے ہوئے وہ سن سی ہوتی، اسے تک رہی تھی۔ اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ اس شخص کے چہرے پہ زمانوں کی اجنبیت اور بیزاری تھی، پہچاننے یا نہ پہچاننے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ جہان سکندر تو اس سے واقف ہی نہ تھا۔

"کون، مادام؟" اس نے قدرے اکتا کر دہرایا۔

حیا نے خفیف سا سر جھٹکا، پھر لب بھینچ لیے

"میں سبین پھوپھو سے ملنے آئی ہوں۔ ان کے بھائی سلیمان کی بیٹی ہوں۔ وہ جانتی ہیں مجھے۔"

"اوکے، اندر آجاؤ۔" وہ شانے اچکا کر واپس پلٹ گیا۔

وہ جھجک کر اوپر زینے پہ چڑھی پائیدان کو دیکھ کر کچھ یاد آیا تو فوراً پیر جوتوں سے نکالے اور لکڑی کے فرش پہ قدم رکھا۔

فرش بے حد سرد تھا۔ دور راہداری کے اس پار جہاں اس نے جہان کو جاتے دیکھا تھا۔ وہاں سے ہتھوڑی کی ٹھک ٹھک پھر سے شروع ہو چکی تھی۔

وہ راہداری عبور کر کے کچن کے کھلے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

امریکی طرز کا کچن نفاست سے آراستہ تھا۔ عین وسط میں گول میز کے گرد چار کرسیوں کا پھول بنا تھا۔ ایک جانب کاؤنٹر کے ساتھ وہ حیا کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہتھوڑی تھی، جس سے وہ اوپر کیبنٹ کے کھلے دروازے کے جوڑ پہ زور زور سے ضربیں لگا رہا تھا۔

وہ چند لمحے کے شش و پنج کے بعد ڈھیٹ بن کر آگے آئی اور قدرے آواز کے ساتھ کرسی کھینچی۔ وہ بے اختیار چونک کر پلٹا۔

"ڈرائنگ روم میں...... خیر!" وہ ناگواری سے لب بھینچ کر واپس کیبنٹ کی طرف مڑ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کیبنٹ کے دروازے کے جوڑ پہ کسی شے کو پکڑ رکھا تھا اور دوسرے سے ہتھوڑی مار رہا تھا۔

حیا سلیمان نے زندگی میں کبھی اتنی تذلیل محسوس نہیں کی تھی۔

"مام...... مام......" چند لمحے گزرے تو وہ، اسی طرح کام کی طرف متوجہ، چہرے پہ ڈھیروں سنجیدگی لیے پکارنے لگا۔

وہ انگلیاں مروڑتی، ٹانگ پہ ٹانگ رکھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دفعتاً چوکھٹ پہ آہٹ، ہوئی تو سر اٹھایا۔

راہداری سے برتن ہاتھ میں لیے سبین پھپھو اسی پل کچن میں داخل ہوئی تھیں۔ کندھوں تک آتے باب کٹ بال اور کھلے لمبے اسکرٹ کے اوپر سرمئی سویٹر پہنے، وہ کچھ بولتی آرہی تھیں۔ اسے بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک کر رکیں۔

"حیا...... میرا بچہ...... تم کب آئیں؟" برتن کاؤنٹر پہ تقریباً گرا کر وہ والہانہ انداز میں اس کی طرف لپکیں۔ وہ جو جہان کے سرد مہر رویے پہ بددل سی بیٹھی تھی، گڑبڑا کر اٹھی بہت گرم جوشی سے اسے گلے لگا کر انھوں نے اس کی پیشانی چومی، پھر بے حد محبت و اپنائیت بھری نم آنکھوں سے مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"فاطمہ نے بتایا تھا کہ تم کچھ روز تک آؤ گی ملنے۔ میں سوچ رہی تھی کہ تم تھکن اتار لو تو میں خود ہی تم سے ملنے آؤں گی۔ کیسی ہو تم؟

کتنی پیاری ہوگئی ہو۔"

وہ اب اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی محبت سے اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں پھپھو! آپ کیسی ہیں؟" وہ بدقت مسکراتی انہی کی طرح انگریزی میں گفتگو کر رہی تھی۔

"تم کتنی بڑی ہوگئی ہو۔ آنکھیں تو بالکل سلیمان بھائی جیسی ہیں۔"

"لوگ کہتے ہیں، میری آنکھیں میری اماں سے ملتی ہیں پھپھو!" وہ ہلکا سا جتا گئی۔

"مجھے تو تم میرے بھائی کا ہی عکس لگتی ہو۔ اور سب کیسے ہیں؟" وہ ایک ایک کا حال پوچھنے لگیں۔ وہ سب کی خیریت بتا کر کہنے لگی۔

"آپ داور بھائی کی شادی میں نہیں آئیں۔"

"داور بھی کتنا بڑا ہوگیا ہے ماشاءاللہ شادی بھی ہوگئی۔ کیسی رہی شادی؟ میں نے ویڈیو دیکھی تھی تمہاری۔"

اس نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"کون سی ویڈیو؟" اس کا سانس رکنے لگا۔ ایک دم ہی کمرے میں بہت گھٹن ہوگئی تھی۔

"وہ جو داور کے ولیمہ پہ اسٹیج پہ بنائی گئی تھی۔ تم نے ریڈ فراک پہن رکھی تھی۔ میں نے روحیل کے فیس بک پہ دیکھی تھی۔"

"روحیل سے کانٹیکٹ ہے آپ کا؟" اس کی رکی سانس ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ بحال ہوئی۔ "اور آپ فیس بک یوز کرتی ہیں؟"

وہ ان دونوں کی جانب پشت کیے کیبنٹ کے دروازے پہ اسی طرح ضربیں لگا رہا تھا۔

"ہاں، بس روحیل کی البمز دیکھنے کے لیے کرتی ہوں۔ تم استعمال کرتی ہو فیس بک؟"

"نہیں، پہلے کرتی تھی، پھر چھوڑ دیا۔ مجھے یہ سوشل نیٹ ورکس پسند نہیں ہیں، ہر شخص آپ کی زندگی میں جھانک رہا ہوتا ہے، انسان کی کوئی پرائیویسی ہی نہیں رہتی۔"

"اوہ حیا! تم جہان سے ملیں؟" ایک دم خیال آنے پہ انھوں نے گردن پھیر کر اپنے بیٹے کو دیکھا، جو چہرے پہ ڈھیروں سختی لیے اپنے کام کی جانب متوجہ تھا۔

"جہان! تم حیا سے ملے ہو؟ یہ سلیمان بھائی کی بیٹی اور روحیل کی بہن ہے۔ تمہاری فرسٹ کزن۔"

"ہوں۔ مل چکا ہوں۔" وہ اب جھک کر دراز سے کیل نکال رہا تھا۔

"یہ رشتہ داریاں یاد رکھنے کے معاملے میں بہت پور ہے۔ ویسے کوشش تو کرتا ہے اور اسے رشتے یاد بھی رہتے ہیں۔"

"دراصل پھپھو! انسان کو رشتے تب یاد رہتے ہیں جب اس کے ماں باپ اسے رشتے یاد دلائیں۔ بچوں کا کیا قصور؟ سارا قصور تو والدین کا ہوتا ہے۔ اگر والدین ہی اولاد کو کبھی رشتہ داروں سے نہ ملوائیں تو الزام کس کے سر پہ رکھا جائے؟"

سبین پھپھو کا جوش و خروش سے دمکتا چہرہ پھیکا پڑ گیا مگر وہ اسی طرح تلخی سے کہتی جا رہی تھی۔ جہان اب بھی کام میں مصروف تھا۔ "مثلاً اب آپ لوگ ہیں۔ آپ کئی دہائیوں سے ادھر مقیم ہیں اور شاید آپ کا واپس آنے اور اپنے خونی رشتوں سے ملنے کا دل ہی نہیں چاہتا تو ہے ناں یہ ان فیئر...... نہیں؟"

پھپھو کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ لٹھے کی مانند سفید اور پھیکا۔ پھر وہ بدقت ذرا سا مسکرائیں اور ہولے سے سر جھٹکا۔

"ٹھیک...... ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بس کبھی آ ہی نہ سکے۔"

وہ اب مطمئن تھی۔ اپنے لہجے پہ اسے قطعی افسوس نہیں ہوا تھا۔ یہ ان لوگوں کی بے رخی تھی جس کے باعث اس کا ان سے تعلق ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔ وہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق تھی۔ کسی کی منکوحہ ہو کر بھی خاندان کے لڑکے اس سے امید لگانے لگے تھے۔ اس کڑوی دوائی کا ذرا سا ذائقہ یہ ذمہ داران بھی تو چکھیں، جنہیں اپنے بیٹے کو یہ بتانا یاد رہا تھا کہ وہ اس کی کزن ہے اور بس۔

دفعتاً اس کی نگاہ فریج کے اوپر رکھے فوٹو فریم پہ پڑی۔ اس میں ایک خوش شکل، درمیانی عمر کے صاحب مسکرا رہے تھے۔ سر پہ

آرمی کیپ اور خاکی وردی کے کندھوں پہ سجے تمغے و پھول ستارے۔

"یہ پھوپھا ہیں؟" وہ گردن اٹھا کر حیرت سے تصویر دیکھنے لگی۔ سبین پھپھو نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور دھیرے سے سر ہلا دیا۔

"انسان کو رشتے تب یاد رہتے ہیں، جب اس کے ماں باپ اس کو رشتے یاد دلائیں۔" وہ پلٹے بنا خاصا جتا کر بولا تو حیا چونکی۔

وہ تو اسے اتنا لاتعلق سمجھ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا، جہان نے اس کی تلخ باتوں پہ دھیان نہیں دیا، مگر نہیں، وہ بظاہر نظر انداز کیے سب سن رہا تھا۔ وہ ذرا محتاط سی ہو کر سیدھی ہوئی۔

"میرا مطلب ہے، پھوپھا آرمی میں تھے؟ پاکستان آرمی میں؟"

"نہیں!" جہان، تھوڑی سلیب پہ رکھ کر آگے بڑھا اور فریج پہ رکھا فریم ہاتھ سے گرا دیا، تصویر والی طرف فریج کی چھت پہ سجدہ ریز ہو گئی۔

"حیا! تم نے کھانا تو نہیں کھایا نا؟ میں بس لگا رہی ہوں۔" پھپھو اب سنبھل کر دوبارہ سے ہشاش بشاش سی ہو گئی تھیں۔

حیا جواب دیے بنا تحیر سے فریج کے اوپر اوندھے منہ گرے فریم کو دیکھے گئی۔ اس کے ایک سوال کے جواب میں جس بدمزاجی سے جہان نے فریم گرایا تھا، وہ ابھی تک اس پہ گنگ تھی۔

"ممی آپ کا کیبنٹ تیار ہے۔" وہ اب کیبنٹ کا دروازہ کھول بند کر کے چیک کر رہا تھا۔

"تھینک یو جہان، اور باتھ روم کا نل بھی!" پھپھو نے گول میز پہ پلاؤ کا بڑا سا پیالا رکھتے ہوئے یاد دلایا۔

"اے ہئے... پھر وہی بدمزا پلاؤ؟" وہ خفیف سا سر جھٹک کر رہ گئی۔

"رہنے دیں پھپھو! میں..."

"کوئی اگر مگر نہیں۔ میں تمہارے لیے کچھ خاص نہیں بنا سکی اس لیے اب انکار کر کے مجھے شرمندہ مت کرنا۔"

جہان اب دراز سے ایک ڈبہ نکال کر اندر رکھی چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ دفعتاً ڈور بیل بجی۔ جہان نے رک کر راہداری کی سمت دیکھا، پھر ڈبہ وہیں چھوڑا اور باہر نکل گیا۔

"شروع کرو حیا۔" پھپھو نے مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پلیٹ اسے تھمائی۔ اس نے شکریہ کہہ کر چاول اور تھوڑا سا لوبیہ کا مسالا پلیٹ میں نکالا۔

راہداری کے اس پار جہان کسی مرد کے ساتھ ترک میں کچھ بول رہا تھا۔ دونوں کی مدھم سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

دوسرے ہی چمچ میں وہ پلاؤ اسے مزیدار لگنے لگا تھا۔ ڈی جے ٹھیک کہہ رہی تھی، ان کو کھانا صرف سفر کی متلی کے باعث برا لگ رہا تھا۔

"پھپھو آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ..."

"حیا...!"

اس کا چمچہ پکڑے منہ تک جاتا ہاتھ اور بات دونوں رک گئے۔ بے حد بے یقینی سے اس نے گردن موڑی۔ جہان راہداری سے اسے پکارتا چلا آ رہا تھا۔ کیا اس مغرور اور بد دماغ آدمی کو اس کا نام یاد رہ گیا تھا؟

"جی؟" وہ بمشکل بول پائی۔

وہ کچن کے کھلے دروازے سے اندر آیا تو حیا نے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں ایک ادھ کھلے گلابوں کا بوکے اور ایک سفید کارڈ تھا۔

"کیا تم یہاں رہنے آئی ہو؟" وہ اس کے سامنے کھڑا سختی سے پوچھنے لگا۔

"نن..... نہیں۔" وہ سانس روکے ان سفید گلاب کے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ اس کے لیے نہیں ہو سکتے تھے... نہیں... ہرگز نہیں...

"تو پھر اپنے ویلنٹائن کو میرے گھر کا پتہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

اس نے زیر لب ترک میں کسی غیر مہذب لفظ سے اس نامعلوم شخص کو نوازا اور گلدستہ و کارڈ اسکے سامنے میز پر تقریباً پھینکنے کے انداز میں رکھا۔

''نہیں...... میں نے نہیں!'' وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے پھولوں کے اوپر گرے سفید کارڈ کو دیکھے گئی، جس پہ لکھے حروف نمایاں تھے۔

''فار مائی لو......حیا سلیمان، فرام یور ویلنٹائن۔''

اور ویلنٹائن ڈے میں ہفتہ دس دن باقی تھے۔ اسے یاد تھا۔

''یہ یہاں بھی پہنچ گیا؟'' وہ ابھی تک بے یقین تھی۔

جہان اپنا ٹول بکس کھولے کھڑا چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ کچن میں ایک شرمندہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دفعتاً میز پہ رکھا حیا کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ گھر سے کال آرہی تھی اس نے کال کاٹی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''حیا...... بیٹھو بچے......'' پھپھو نے اسے روکنا چاہا۔

''میری...... میری فرینڈ کال کر رہی ہے۔ وہ باہر آگئی ہے شاید، چلتی ہوں۔ اللہ حافظ۔''

حالانکہ پھپھو کی شکل سے ظاہر تھا کہ وہ جانتی ہیں کہ فون اس کی دوست کا نہیں تھا، مگر انھوں نے سر ہلا دیا۔ کہنے کو جیسے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ کرسی دھکیل کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

میز پہ سفید گلاب پڑے رہ گئے۔ ڈور میٹ پہ اس کے جوتے یونہی پڑے تھے۔ اس نے ان میں پاؤں ڈالے تو دیکھا، ایک کاغذ ان پر گرا ہوا تھا۔ حیا جھکی اور وہ کاغذ اٹھایا۔ وہ کسی کوریئر کمپنی کی رسید تھی غالباً جو شاید جہان نے دستخط کر کے وہیں پھینک دی تھی۔

وہ رسید الٹ پلٹ کر دیکھتی تیز قدموں سے گیٹ عبور کر گئی۔

وہ پھول آج ہی کی تاریخ میں کسی ''اے آر'' نے بک کروائے تھے۔ اے سے احمد اور آر سے......؟ وہ دھیرے دھیرے سڑک کنارے چلنے لگی۔ رسید ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

وہ گھنٹہ بھر پہلے تک خود اس بات سے ناواقف تھی کہ وہ جہانگیر سے آرہی ہے، پھر اس ''اے آر'' کو کیسے علم ہوا؟ کیا وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا؟ کیا اس کا تعاقب کیا جا رہا تھا؟ لیکن ایک پاکستانی آفیسر کے ایک غیر ملک میں اتنے ذرائع کیسے ہو سکتے تھے؟ صرف اسے تنگ کرنے کے لیے اتنی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کون کرے گا؟

وہ کالونی کے سرے پہ نصب بینچ پہ بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں برف سے ڈھکی گھاس پہ جمی تھیں۔ اسے ہالے کے آنے تک یہیں بیٹھنا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے اگلے روز ہی ڈورم آفیسر حقان سے بات کر کے اپنا کمرہ بدلوا لیا تھا۔ اب وہ ڈی جے کے کمرے میں منتقل ہو چکی تھی۔ کمرے میں تیسری لڑکی ایک چینی نژاد ''لنگ لنگ'' تھی۔ اس کا پورا نام اتنا لمبا اور پیچیدہ تھا کہ اس نے یورپ کے لیے اپنا نام ''چیری'' رکھ لیا تھا۔ وہ ایکسچینج اسٹوڈنٹ تھی اور پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔

چوتھی لڑکی ایک اسرائیلی یہودی ''ٹالی'' تھی۔ واقعتاً تاڑ کے درخت کی طرح لمبی چوڑی اور گھنگھریالے بالوں والی۔ وہ بھی ایکسچینج اسٹوڈنٹ تھی۔ اور اس کی ساتھ والے کمرے کے فلسطینی ایکسچینج اسٹوڈنٹس (وہ ہینڈسم لڑکے کا ذکر ڈی جے نے پہلے روز کیا تھا) سے گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ فلسطینی لڑکے اور وہ اسرائیلی لڑکی ہر جگہ ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔ کیمپس کی سیڑھیاں ہوں یا ہاسٹل کا کامن روم۔ وہ چاروں ساتھ ہی ہوتے۔

''ان کے پاسپورٹ چیک کرواؤ، یا تو یہ اسرائیلی نہیں ہے، یا وہ فلسطینی نہیں ہیں۔ اتنا اتحاد اور دوستی؟ توبہ ہے بھئی!'' ڈی جے جب بھی ان کو ساتھ دیکھ کر آتی، یونہی کڑھتی رہتی۔ حیا نے ابھی ان لڑکوں کو نہیں دیکھا تھا، نہ ہی اسے شوق تھا۔

تمام ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس پیر تک پہنچ گئے تھے۔ وہاں کسی کو کسی ایکسچینج اسٹوڈنٹ کا نام معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بس یہ فلسطینی ہیں، یا چائنیز ہے، یہ نارویجن ہے، یہ ڈچ ہے اور یہ دونوں پاکستانی ہیں۔

ان کو ایک سے چار مضامین لینے کا اختیار تھا۔ ڈی جے نے دو لیے جبکہ حیا نے چار لیے۔ چوتھے ماہ کے اختتام پہ امتحان دینے کی پابندی تھی، اور یہ پانچ ماہ لازماً ترکی میں گزارنے کی پابندی تھی، باقی چاہے ہاسٹل میں رہو، چاہے نہ رہو، چاہے ساری رات باہر گزارو، کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ خوب مزے تھے۔

سبانجی میں کلاس کے اندر لڑکیوں کے سکارف پہ پابندی تھی۔

''تو یہ ہالے نور کیا کرتی ہوگی؟ حیا نے ڈی جے سے تب پوچھا، جب وہ دونوں نماز کے بہانے کلاس میں دکھائی جانے والی ترکی کی تعارفی پریزنٹیشن سے کھسک کر آ گئی تھیں اور اب پریئر ہال میں بیٹھی چپس کھا رہی تھیں۔

''وہ کلاس میں اسکارف اتار کر ہی جاتی ہے۔'' ڈی جے چپس کترتے ہوئے بتا رہی تھی۔ وہ دونوں چوکڑی مار کر کارپٹ پہ بیٹھی تھیں۔ ایک طرف الماری میں قرآن و اسلامی کتب کے نسخے سجے تھے۔ دوسری طرف بہت سے اسکارف اور اسکرٹس ٹنگے ہوئے تھے۔ جینز والی ترک لڑکیاں اسکرٹ پہن کر نماز پڑھ لیتیں اور پھر بعد میں وہ اسکرٹ وہاں لٹکا کر چلی جاتیں۔ استنبول کے ہر زنانہ پریئر ہال میں ایسے اسکارف اور اسکرٹس لٹکے ہوتے تھے۔

''مزے کی ہے یہ ہالے نور بھی۔'' وہ انگلی سے بال پیچھے کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس نے بھی بلیو جینز کے اوپر گلابی سویٹر پہن رکھا تھا۔ پاکستان میں تایا فرقان کی ڈانٹ کے ڈر سے وہ جینز نہیں پہن سکتی تھی، لیکن شکر کہ یہاں وہ لوگ نہیں تھے اور وہ زندگی کو اپنی مرضی سے لطف اندوز ہو کر گزار رہی تھی۔

''پرسوں تم اپنی پھپھو کے گھر گئی تھیں۔ کیسا ٹرپ رہا؟''

''اچھا رہا، پھپھو نے پلاؤ بنایا تھا، وہ واقعی اتنا بدمزا پکوان نہیں ہے، جتنا ہم سمجھے تھے۔''

''میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی۔''

جب پریئر ہال میں بھی خوب بور ہو گئیں تو باہر نکل آئیں۔

سرد نم ہوا دھیمی لے میں بہہ رہی تھی۔ ہری گھاس پہ سبانجی کی گول سی عمارت پورے وقار کے ساتھ کھڑی تھی، جیسے ایک گولائی کی شکل میں بنے گھر کو ہیٹ پہنا دی جائے۔ شیشے کے اونچے داخلی دروازوں کے سامنے سیڑھیاں بنی تھیں۔ سیڑھیوں کے دونوں اطراف سبزہ پھیلا تھا۔ وہ دونوں فائلیں تھامے زینے اتر رہی تھیں، جب ڈی جے نے اس کا شانہ ہلایا۔

''یہ جو آخری زینے پہ تین لڑکے کھڑے ہیں، یہ وہی فلسطینی لڑکے ہیں۔ دیکھو! ٹالی بھی ان کے ساتھ ہے۔''

اس نے ہوا سے چہرے پہ آتے بال پیچھے ہٹائے اور دیکھا۔ وہ ہینڈسم اور خوش شکل سے لڑکے سیڑھیوں کے کنارے کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔

''آؤ ان سے ملتے ہیں۔''

''مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ تم جاؤ، مجھے ذرا کام ہے۔''

وہ کھٹ کھٹ زینہ اترتی آگے بڑھ گئی۔ ڈی جے نے اسے نہیں پکارا، وہ ان فلسطینیوں کی جانب چلی گئی تھی۔ اور وہ یہی چاہتی تھی، ڈی جے سے دوستی اپنی جگہ، مگر فی الحال وہ خوب آزادی سے استنبول کو کھوجنا چاہتی تھی۔ اکیلی اور تنہا......

قریباً گھنٹے بھر بعد وہ اپنے کمرے سے خوب تیار ہو کر نکلی اور پتھریلی سڑک پہ چلنے لگی۔

اس نے بلیو جینز کے اوپر ایک تنگ، اسٹائلش سا گھٹنوں تک آتا سرخ کوٹ پہن رکھا تھا۔ شدید سردی کے باوجود ننگے پاؤں میں پانچ انچ اونچی سرخ پنسل ہیل پہنی تھی۔ ریشمی بال ہوا سے شانوں پہ اڑ رہے تھے اور گہرے کاجل کے ساتھ رس بھری کی طرح سرخ لپ اسٹک۔ اسے سرخ لپ اسٹک ہمیشہ سے پرکشش لگتی تھی اور آج اسے معلوم تھا کہ وہ بہت حسین لگ رہی ہے۔

بس اسٹاپ آ چکا تھا، جب بادل زور سے گرجے۔ یہ بس اسٹاپ یونیورسٹی کے اندر ہی تھا۔ سبانجی کی ہیروئن ''گورسل'' تھی۔ گورسل بس سروس۔ وہ سبانجی کے طلبا کے لیے ہی چلتی تھی اور انہیں استنبول شہر تک لے جاتی تھی۔ ہالے نے اسے گورسل کا شیڈول رٹوا دیا تھا۔

"جس دن تمہاری گورسل چھوٹی، تمہیں ہالے نور بہت یاد آئے گی۔" اس نے سختی سے تاکید کرتے ہوئے کہا تھا۔ گورسل اپنے مقررہ وقت سے ایک لمحہ تاخیر نہیں کرتی تھی، اور اگر آپ چند سیکنڈ بھی دیر سے آئے تو گورسل گئی۔ اب دو گھنٹے بیٹھ کر اگلی گورسل کا انتظار کریں۔

جب وہ گورسل میں بیٹھی تو آسمان پہ سیاہ بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ جب گورسل نے باسفورس کا عظیم الشان پل پار کیا تو موٹی موٹی بوندیں پانی میں گر رہی تھیں اور جب وہ تاقسم اسکوائر پہ اتری تو استنبول بھیگ رہا تھا۔

تاقسم اسکوائر استنبول کا ایک مرکزی چوک تھا۔ وہاں عین وسط میں اتاترک سمیت تاریخی شخصیات کے مجسمے نصب تھے۔ "مجسمہ آزادی" ایک طرف ہرا بھرا سا پارک تھا، اور دوسری طرف میٹرو ٹرین کا زیر زمین اسٹیشن۔

وہ بس سے اتری تو بارش تڑاتڑ برس رہی تھی۔ موٹے موٹے قطرے اس پہ گر رہے تھے۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے تیز تیز سڑک پار کرنے لگی۔ گیلی سڑک پہ اونچی ہیل سے چلنا دشوار ہو گیا تھا۔ چند ہی لمحوں میں وہ پوری طرح بھیگ چکی تھی۔

زیر زمین میٹرو اسٹیشن تک جاتی وہ چوڑی سیڑھیاں سامنے ہی تھیں۔ وہ تقریباً دوڑ کر سیڑھیوں کے دہانے تک پہنچی ہی تھی کہ چٹخ کی آواز آئی۔ وہ لڑکھڑائی اور گرتے گرتے بچی۔ اس کی دائیں سینڈل کی ہیل درمیان سے ٹوٹ گئی تھی۔ ٹوٹا ہوا دو انچ کا ٹکڑا بس اٹکا ہوا ساتھ لٹک رہا تھا۔

اس نے خفت سے ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ مصروف انداز میں چھتریاں تانے گزر رہے تھے۔ شکر کہ کسی نے دیکھا نہیں تھا۔

بارش اسی طرح برس رہی تھی۔ اس کے بال موٹی گیلی لٹوں کی صورت چہرے کے اطراف میں چپک گئے تھے۔ اس نے کوفت سے ٹوٹے جوتے کے ساتھ زینہ اترنا چاہا، مگر یہ ناممکن تھا۔ جھنجلا کر وہ جھکی، دونوں جوتوں کے اسٹریپس کھولے، پاؤں ان میں سے نکالے اور جوتے اسٹریپس سے پکڑ کر سیدھی ہوئی۔

نیچے ٹرین کے پہنچنے کا شور مچ گیا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے ننگے پاؤں زینہ اترنے لگی۔ اس کے پہلو میں گرے ہاتھ سے لٹکے دونوں جوتے ادھر ادھر جھول رہے تھے۔

میٹرو کا ٹکٹ ڈیڑھ لیرا کا تھا، چاہے جس اسٹیشن پر بھی اترو۔ وہ ٹکٹ لے کر جلدی سے ٹرین میں داخل ہوئی تاکہ کسی کے محسوس کرنے سے قبل ہی معتبر بن کر جوتے پہن کر بیٹھ جائے۔

میٹرو میں نشستیں دونوں دیواروں کے ساتھ سیدھی قطار میں تھیں۔ کھڑے ہونے والوں کے لیے اوپر راڈ سے ہینڈل لٹک رہے تھے۔ وہ ایک ہینڈل کو پکڑے بھیڑ میں سے راستہ بنانے لگی۔ اس کی نظر کونے کی ایک خالی نشست پہ تھی مگر آگے چلتے شخص نے گویا راستہ روک رکھا تھا۔ جب تک وہ کونے والی نشست پہ بیٹھا نہیں، وہ آگے نہیں بڑھ سکی، پھر اس کے بیٹھتے ہی دھم سے اس کے برابر کی جگہ پہ آ بیٹھی۔ وہ سیاہ سوٹ میں ملبوس شخص شناسا سا لگا۔ لمحے بھر کو اس کا سانس رک سا گیا۔

وہ جہان سکندر تھا۔

بہت قیمتی اور نفیس سیاہ سوٹ میں ملبوس، جیل سے بال پیچھے کیے وہ چہرے پہ ڈھیروں سنجیدگی لیے اخبار کھول رہا تھا۔ بریف کیس اس نے قدموں میں رکھ دیا تھا۔ وہ متحیر سی بیٹھی، سامنے دیکھے گئی۔ کن انکھیوں سے اسے وہ چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے نظر آ رہا تھا۔ سامنے والی قطار اور ان کی قطار کے درمیان جگہ اوپر لگے ہینڈل پکڑ کر کھڑے لوگوں سے بھرنے لگی تھی۔

وہ اس عجیب اتفاق پہ اتنی ششدر بیٹھی تھی کہ ہاتھ سے لٹکتے جوتے بھول ہی گئے۔ یاد رہا تو بس یہی کہ وہ کتنا قریب...... مگر کتنا دور تھا۔ وہ اسے کیسے مخاطب کرے؟ اور اگر وہ اسے دیکھے بنا ٹرین سے اتر گیا تو......؟ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

مگر وہ تو شاید اسے پہچانے بھی نہ۔ اس سرد مہر، کم گو شخص سے اسے یہی توقع تھی۔

چند پل سرکے تھے کہ جہان نے صفحہ پلٹنے کی غرض سے اخبار پیچھے کیا اور انگوٹھے سے اگلے صفحے کا کنارہ موڑتے ہوئے ایک سرسری نگاہ پہلو میں بیٹھی لڑکی پہ ڈالی، پھر صفحہ پلٹ کر اخبار کی جانب متوجہ ہو گیا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ جیسے رکا اور گردن موڑ کر دوبارہ اسے دیکھا۔ اس کی بھیگی موٹی لٹیں رخساروں سے چپک گئی تھیں۔ پانی کے قطرے ٹھوڑی سے نیچے گردن پہ گر رہے تھے۔ وہ اسکے متوجہ ہونے پہ بھی

سانس روکے سامنے دیکھے گئی۔

"اوہ حیا.....!" وہ حیرت بھری آواز جیسے کہیں دور سے آئی تھی۔ حیا نے دھیرے سے پلکیں اس کی جانب اٹھائیں۔ کاجل کی لکیر مٹ کر نیچے بہہ گئی تھی، تب بھی ان اداس آنکھوں میں عجب سحر دکھتا تھا۔

"جہان سکندر!" وہ بدقت رسماً مسکرائی۔

"حیا! کیسی ہو؟ اکیلی ہو؟" کہنے کے ساتھ جہان نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ وہاں کوئی مسافر حیا کا ہم سفر نہیں لگ رہا تھا۔

"جی اکیلی ہوں۔"

"میں نے یہ بھی پوچھا ہے کہ کیسی ہو؟" مسکراتے ہوئے اپنائیت سے کہتے ہوئے وہ اخبار تہہ کرنے لگا۔ وہ جو اس کے لیے ہتھوڑی اور میخیں نہیں رکھ سکتا تھا، اب اخبار رکھ رہا تھا؟ یا خدا! یہ وہی جہان سکندر تھا؟

"ممی تمہیں یاد کر رہی تھیں۔ تم پھر کب آؤ گی گھر؟" اخبار ایک طرف رکھ کر اب وہ پوری طرح حیا کی جانب متوجہ تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

"بس.....شاید کچھ دن....." کچھ کہنے کی سعی میں اسے محسوس ہوا، جہان کی نگاہیں اس کے ہاتھ پہ پھسلی تھیں، اور پیشتر اس کے کہ وہ چھپا پاتی، وہ دیکھ چکا تھا۔

"جوتے کو کیا ہوا ہے؟ اتنی سردی میں ننگے پاؤں بیٹھی ہو۔ لاؤ دکھاؤ جوتا۔" وہ خفا ہوا تھا یا فکرمند، اسے سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ جہان جوتا لینے کے لیے جھکا تو اس نے بے بسی سے ٹوٹی ہیل والی سینڈل سامنے کی۔

"یہ تو الگ ہونے والا ہے۔" اس کے ہاتھ سے جوتا لیکر اب وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ حیا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"جہان! رہنے دو۔"

"ٹھہرو، شاید یہ جڑ جائے....." وہ جھک کر دوسرے ہاتھ سے بریف کیس میں سے کچھ نکالنے لگا۔

"جہان، لوگ دیکھ رہے ہیں!"

"یہ پکڑو ذرا۔" وہ سیدھا ہوا اور جوتا حیا کو تھمایا، پھر ہاتھ میں پکڑا ٹیپ کھولا۔ کافی لمبا سا اسٹریپ کھول کر دانت سے کاٹا۔ حیا نے جوتا سامنے کیا۔ اس نے احتیاط سے ہیل کے نچلے لٹکتے حصے کو اوپر کے ساتھ جوڑا اور اس کے گرد چکروں میں ٹیپ لگاتا گیا۔

"اب پہنو۔" مرہم شدہ سینڈل کو اس نے جھک کر حیا کے قدموں میں رکھا۔ حیا نے اس میں پاؤں ڈالا اور اسٹریپ بند کرنے جھکی ہی تھی کہ زور پڑنے سے دوبارہ چیخ ہوا اور ہیل کا ٹوٹا حصہ سرے سے ہی الگ ہو گیا۔

"اوہ!" وہ متاسف ہوا۔

"کوئی بات نہیں۔" حیا کو شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔ یہ وہ سرد مہر اور تلخ جہان نہیں، بلکہ کوئی اپنا اپنا سا شخص تھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے جھک گیا تھا۔ حیا نے گردن ترچھی کر کے دیکھا۔ وہ اپنے بوٹ کا تسمہ کھول رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے روک پاتی، جہان اپنے بوٹ اتار چکا تھا۔

"پہن لو۔ باہر ٹھنڈ ہے، سردی لگ جائیگی۔" اب وہ جرابیں اتار کر اپنے بریف کیس میں رکھ رہا تھا۔ اس کا انداز عام سا تھا، جیسے وہ روز ہی میٹرو میں کسی نہ کسی کو اپنے جوتے دے دیتا ہو۔

"نہیں، رہنے دو۔ میں ابھی مارکیٹ سے نیا لے لوں گی۔"

"مگر تم کیا کرو گے؟ تم تو آفس جا رہے ہونا؟"

جہان نے ذرا سا مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ "آفس کے کام سے سسلی جا رہا ہوں۔"

"پھر میں تمہیں جوتے واپس کیسے کروں گی؟ پتا نہیں کب تمہارے گھر آؤں اور....."

"تم ابھی اکیلی کہیں نہیں جا رہیں۔ اگلا اسٹیشن سسلی ہے۔ ادھر ہم ساتھ مال سے جوتا خریدیں گے، پھر میں اپنا بوٹ واپس لے لوں گا۔"

''مگر تمہارے آفس کا کام.....''

''میں ننگے پاؤں کام پہ جا کر کیا کروں گا؟'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔ وہ پہلی بار حیا کے لیے مسکرایا تھا۔ وہ یک ٹک کاجل کی فتی سیاہی والی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ اس کے چہرے سے چپکی موٹی گیلی لٹیں اب سوکھنے لگی تھیں اور ٹھوڑی سے گرتے پانی کے قطرے خشک ہو چکے تھے۔

''جوتے پہن لو۔ لوگ اب بھی دیکھ رہے ہیں۔''

وہ چونکی پھر خفیف سا سر جھٹکا اور دوہری ہو کر بوٹ پہننے لگی۔ وہ جب بھی سمجھتی کہ جہان لاتعلقی سے بیٹھا، اس کی بات نہیں سن رہا، وہ اس کو وہی فقرہ لوٹا دیا کرتا تھا۔ وہ سیدھی ہوئی تو جہان اخبار کھول چکا تھا۔ عجیب دھوپ چھاؤں جیسا شخص تھا۔

سسلی کے اسٹاپ پہ میٹرو سے اترتے وقت حیا نے دیکھا، جہان بہت آرام سے اس کے آگے ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی خفت، کوئی جھجک نہ تھی۔

وہ دونوں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ چند زینے بعد ہی اوپر سیڑھیوں کے اختتام پہ سڑک اور کھلا آسمان دکھائی دینے لگا۔ وہ جہان کے دائیں طرف تھی۔ آخری سیڑھی چڑھتے ہوئے اس نے دیکھا زمین پہ ایک کیل نکلی پڑی تھی۔ اس سے پیشتر کہ وہ مطلع کر پاتی، جہان کا پاؤں اس کیل کے نوکدار حصے پہ آیا۔ جب اس نے دوبارہ پاؤں اٹھایا تو اس کی ایڑھی سے خون کی ننھی سی بوند نکل گئی تھی۔ اس نے بے اختیار جہان کے چہرے کو دیکھا۔ وہ سکون سے سیدھ میں دیکھتا تیز تیز چل رہا تھا۔

''جہان..... تمہارا پاؤں..... تمہیں زخم آیا ہے۔'' وہ اس کے ساتھ چلنے کی کوشش میں تیزی سے چلنے لگی تھی۔

''خیر ہے۔'' وہ رکا نہیں۔

''مگر تمہارا خون نکلا ہے۔'' وہ واقعتاً پریشان تھی۔

''بچوں والی بات کرتی ہو تم بھی۔ اتنے ذرا سے خون سے میں زخمی تو نہیں ہو گیا۔ بہت سخت زندگی گزاری ہے میں نے..... وہ دیکھو، جواہر مال۔''

اس سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہ چپ ہو کر اس کے ساتھ مال کے قریب آرکی۔

وہ ایک بلند و بالا خوبصورت، نیلے سرمئی شیشوں سے ڈھکی عمارت تھی۔ اس کے اوپر بڑا سا ستارہ اور اطراف میں چھوٹے ستارے بنے تھے۔ بڑے ستارے کے اوپر ''Cevahir Mall'' لکھا تھا، اور جہان ترکوں کی طرح ''سی'' کو ''جے'' پڑھ رہا تھا۔

''یہ جواہر مال ہے۔ یورپ کا سب سے بڑا اور دنیا کا چھٹا بڑا شاپنگ مال۔'' وہ فخر سے بولا تھا۔

جواہر اندر سے بھی اتنا ہی عالیشان تھا۔ سفید ٹائلوں سے چمکتے فرش، اوپر تک نظر آتی پانچوں منزلوں کے برآمدے، اور ہر مال کی طرح وہ درمیان سے کھوکھلا تھا۔ عین وسط میں ایک اونچے کھجور کے درخت ٹاورز کی طرح لگے تھے، اور یہ روشنیوں و قمقموں سے مزین ٹاورز پانچویں منزل کی چھت تک جاتے تھے۔

وہ مسحور سی گردن اٹھائے اوپر پانچوں منزلوں کی بالکونیاں دیکھ رہی تھی، جہاں انسانوں کا ایک بے فکر، ہنستا مسکراتا ہجوم ہر سو بکھرا تھا۔ رنگ، خوشبو، امارت، چمک..... آہ..... وہ یورپ تھا۔

جوتے خرید کر وہ دونوں اوپر چلے آئے۔ حیا نے جوتوں کا بل بنواتے ہی جلدی سے ادائیگی کر دی تھی تاکہ جہان کو موقع ہی نہ مل سکے۔ وہ اس پہ خاصا خفا ہوا، مگر حیا پُرسکون تھی۔ ہالے نور سمیت وہ کسی بھی ترک سے کچھ بھی لینے میں عار نہیں سمجھتی تھی مگر جہان سکندر کا احسان ..... کبھی نہیں!

چوتھی منزل کی دکانوں کے آگے بنی چمکتی بالکونی میں وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ لوگوں کے رش میں رستہ بناتی حیا کو جہان کی رفتار سے ملنے کے لیے تقریباً بھاگنا پڑ رہا تھا، پھر بھی وہ پیچھے رہ جاتی، اور وہ آگے نکل جاتا۔ وہ اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں اب تھکنے لگی تھی۔

شاید یہی ان کی زندگی کی کہانی تھی۔

جہان نے ایک شیشے کا دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کر راستہ دیا۔

"تھینک یو" وہ سرخ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی، وہ اس کے پیچھے آیا۔

وہ ریسٹورنٹ تھا۔ نرم گرم ماحول، ہیٹر اور باہر کے سرما کی ملی جلی خنکی، مدھم روشنیاں، پیچھے بجتا دھیما میوزک۔

"آرڈر کرو۔" وہ ایک کونے والی میز کے گرد آمنے سامنے بیٹھ گئے تو جہان نے کہا۔ اپنا کوٹ اتار کر اس نے کرسی کی پشت پہ رکھ دیا تھا اور اب وہ کف کھول کر آستین موڑ رہا تھا۔

"مگر یہ دعوت کس خوشی میں ہے؟" حیا دونوں کہنیاں میز پہ ٹکائے دائیں ہتھیلی ٹھوڑی تلے ٹکائے دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ چہرے کے دونوں اطراف میں گرتے بال اب خاصے سوکھ گئے تھے۔

"تمہارے اس خوبصورت کوٹ کی خوشی میں اور یہ دعوت میری طرف سے ہے، اب آرڈر کرو۔"

حیا نے گردن جھکا کر ایک سرسری نگاہ اپنے کوٹ پہ ڈالی۔ "مگر دعوت تمہاری طرف سے ہے تو آرڈر تمہیں ہی کرنا چاہیے۔" اس نے جہان کی بات نظر انداز کر دی کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہے۔

"ٹھیک ہے۔" جہان نے مینیو کارڈ اٹھایا اور صفحے پلٹنے لگا۔ وہ محویت سے اس کے وجیہہ چہرے کو دیکھے گئی۔ کیا وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی بیوی ہے؟ اتنی بڑی بات وہ نہ جانتا ہو، کیا یہ ممکن تھا؟

"اس روز تم نے بہت غلط بات کی تھی جہان! مجھے تم پہ بہت غصہ آیا تھا۔" جب وہ آرڈر کر چکا تھا وہ یونہی بند مٹھی ٹھوڑی تلے ٹکائے اسے تکتے ہوئے بولی۔

"میں نے کیا کیا تھا؟" وہ حیران ہوا۔

"پتا نہیں کس نے میرے نام وہ پھول بھیجے اور تم نے کہا کہ میرا ویلنٹائن...... میں ایسی لڑکی نہیں ہوں جہان! نہ ہی میں جانتی ہوں کہ وہ پھول کس نے بھیجے تھے۔"

"اوکے!" جہان نے سمجھنے والے انداز میں اثبات میں سر کو جنبش دی، مگر وہ جانتی تھی، اسے یقین نہیں آیا۔

ریسٹورنٹ میں گہما گہمی تھی۔ ارد گرد ویٹرز میزوں کے درمیان راستہ بناتے، ٹرے اٹھائے تیزی سے پھر رہے تھے۔ پس منظر میں بجتی موسیقی کے سُر بدل گئے تھے۔ اب ایک ترک گلوکار دھیمی لے والا گیت گنگنا رہا تھا۔

"ویسے تم صبح صبح کہاں جا رہی تھیں؟"

"میں یہیں سسلی ہی آ رہی تھی، شاپنگ وغیرہ کرنے۔" ویٹر کافی لے آیا تھا اور اب ان دونوں کے درمیان جھکا ٹرے سے دوسرا کپ اٹھا کر میز پہ رکھ رہا تھا۔

"بہادر لڑکی ہو، اکیلی گھوم پھر لیتی ہو۔" جہان نے مسکرا کر کہتے ہوئے اپنی کافی میں شکر ڈالی۔

"استنبول میں یہ بہادری مہنگی تو نہیں پڑے گی؟"

"مطلب؟" کافی کا بھاپ اڑاتا ہوا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے جہان کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔ اس نے ایک گھونٹ بھر کر کپ نیچے رکھا۔

"مطلب ڈرگ مافیا، آرگنائزڈ کرائم اور اسٹیٹ سیکرٹ آرگنائزیشن جیسی ترکیبات سے واسطہ تو نہیں پڑے گا؟" وہ کہنیاں میز پہ رکھے آگے ہوئی اور چہرے پہ سادگی سجائے آہستہ سے بولی۔ "کیونکہ سنا ہے یہاں ان سب سے پالا پڑ سکتا ہے۔"

"کس سے سن لیں تم نے ایسی خوفناک باتیں؟" جہان نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

"تم بتاؤ، یہ پاشا کون ہے؟"

"پاشا کو نہیں جانتیں تو ترکی کیوں آئی ہو؟ مصطفیٰ کمال پاشا...... یا کمال اتاترک...وہ ترکوں کا باپ تھا۔"

"وہ نہیں، میں استنبول کے پاشا کی بات کر رہی ہوں، عبدالرحمان پاشا کی۔"
کافی کا کپ لبوں تک لے جاتے ہوئے جہان نے رک کر اسے دیکھا۔
"کون؟" کافی سے اڑتی بھاپ لمحے بھر کے لیے اس کے چہرے کو ڈھانپ گئی۔
"ایک بھارتی اسمگلر جو یورپ سے ایشیا اسلحہ سمگل کرتا ہے۔"
"کم آن!" اس نے کپ رکھ کر سنجیدگی سے حیا کو دیکھا" استنبول میں ایسا کوئی مافیا راج نہیں ہے یہ کس نے تمہیں کہانیاں سنا دی ہیں؟ یوں ہی مشہور ہونے کے لیے کسی نے اپنے بارے میں کوئی افواہ اڑائی ہوگی۔ تم استنبول کو کیا سمجھ رہی ہو؟"
ہالے کی طرح وہ ایک خالص ترک تھا۔ اپنے استنبول کے دفاع کے لیے جی جان سے تیار۔
ویٹر جہان کے اشارے پہ بل لے آیا تھا اور جہان اپنے بٹوے سے کارڈ نکال کر اس کی فائل میں رکھ رہا تھا۔
"رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے نا۔"
"حیا! یہ پاکستان نہیں ہے۔" جہان نے ذرا تفاخر سے جتا کر کہا تو اس کے لب بھنچ گئے۔ کارڈ رکھ کر جہان نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھی۔
"پاکستان میں بھی یہ سب نہیں ہوتا اور بل میں دوں گی۔" حیا نے تیزی سے فائل اٹھائی اور کھولی۔
"جیسے میں جانتا ہی نہیں۔" جہان کی اگلی بات لبوں میں رہ گئی۔
ان کے دائیں طرف سے ایک ویٹر ٹرے اٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اچانک ایک دوسرا ویٹر تیزی سے اس کے پیچھے سے آیا اور پہلے ویٹر سے آگے نکلنے کی کوشش کی۔ پہلے ویٹر کو ٹھوکر لگی، وہ توازن برقرار نہ رکھ پایا اور نتیجتاً اس کی دائیں ہتھیلی پہ سیدھی، رکھی لکڑی کا شڑ شڑ کرتا بھاپ اڑاتا sizzler platter بیف اسٹیکس سمیت الٹ گیا۔ میز پر رکھے حیا کے ہاتھ پہ ٹرے اور گرم بیف اکٹھے آ گرے۔ وہ بلبلا کر کھڑی ہوئی۔ فائل اور بل نیچے جا گرے۔
"آئی ایم سوری...... آئی ایم سوری" دونوں ویٹر بیک وقت چیزیں ٹھیک کرنے لگے۔ ٹرے سے کافی کا کپ بھی الٹ گیا تھا اور ساری کافی اب فرش پہ گری پڑی تھی۔
جہان ناگواری سے ترک میں انہیں ڈانٹنے لگا۔ چند منٹ معذرتوں اور میز صاف کرنے میں لگ گئے۔ وہ واپس بیٹھا تو حیا اپنی کلائی سہلا رہی تھی۔
"تمہیں چوٹ آئی ہے۔ دکھاؤ، زیادہ جل تو نہیں گیا۔" اس نے ہاتھ بڑھایا مگر حیا نے کلائی پیچھے کر لی۔
"ذرا سی چوٹ سے میں زخمی تو نہیں ہو گئی۔ بہت لمف زندگی گزاری ہے میں نے۔" بظاہر مسکرا کر وہ درد کو دبا گئی۔ ہتھیلی سرخ پڑ چکی تھی اور شدید جل رہی تھی۔
"میری بات اور ہے، ہاتھ دکھاؤ!"
مگر اس نے ہاتھ گود میں رکھ لیا۔
ٹھیک ہے، اٹس او کے، کافی کا شکریہ، اب ہمیں چلنا چاہیے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بل والی بات اسے بھول گئی تھی۔
"مگر کافی تو ختم کر لو۔" وہ قدرے پریشانی سے کھڑا ہوا۔
"رہنے دو، انتہائی بدتہذیب ویٹرز ہیں یہاں کے، چلو۔" واپسی پہ وہ اسے میٹرو اسٹیشن تک چھوڑنے آیا تھا۔ زیر زمین جاتی سیڑھیوں کے دہانے پہ وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔
"تم واپس تاقسم نہیں آؤ گے؟"
"نہیں، وہ دفتر یہاں سے قریب ہی ہے، جس سے کام کے سلسلے میں ملنے آیا تھا، اس طرف۔"
جہان نے بازو اٹھا کر دور ایک طرف اشارہ کیا۔ اس نے سفید شرٹ کی آستین یوں ہی کہنیوں تک موڑ رکھی تھی اور کوٹ بازو پہ

ڈال رکھا تھا۔ ٹائی کی ناٹ اب تک ڈھیلی ہو چکی تھی۔ وہ یقیناً اس کا ایک ورکنگ ڈے خراب کر چکی تھی۔

''ویسے تم کیا کرتے ہو؟'' وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی، گردن اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں ایک غریب سا ریسٹورنٹ اونر ہوں، استقلال اسٹریٹ پہ جو پہلا برگر کنگ ہے، وہ میرا ہے۔ استقلال اسٹریٹ تاقسم اسکوائر کے بالکل ساتھ ہے۔ دیکھی ہے نا تم نے؟''

''اوں ہوں۔'' اس نے گردن دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلائی۔

''تم اس ویک اینڈ پہ گھر کیوں نہیں آجاتیں؟ ممی خوش ہوں گی۔''

''اور تم؟'' بے ساختہ لبوں سے پھسلا۔

''میں تو ویک اینڈ پر بھی ریسٹورنٹ میں ہوتا ہوں۔''

''پھر فائدہ؟'' اس نے سوچا۔

''کوشش کروں گی۔'' وہ مسکرا دی، پھر دایاں ہاتھ جیب سے نکال کر بال پیچھے ہٹائے۔

''تمہارا ہاتھ ابھی تک سرخ ہے، اگر کسی دوست نے پوچھ لیا تو کیا کہو گی؟''

''کہہ دوں گی کہ گدلی برف کے ساتھ کیچڑ تھی گھاس پہ، وہیں پھسل گئی۔'' اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔ (اب کزن کے ساتھ کافی پینے کا قصہ سنانے سے تو رہی۔)

''پھسل گئی تو ہتھیلی رگڑی گئی؟''

''ہاں!''

''اور گھٹنے؟'' جہان نے مسکرا کر اس کی جینز کی طرف دیکھا۔

''مطلب؟'' حیا نے ابرو اٹھائے۔

''لڑکی! کوراسٹور پوری بنایا کرو۔ اگر تم ہتھیلیوں کے بل کیچڑ میں گرو تو اصولاً تمہارے گھٹنوں پر بھی رگڑ آنی چاہیے۔'' پھر وہ چند قدم چل کر گھاس کے قطعے کی طرف گیا، جھک کر تین انگلیوں سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور واپس آ کر اس کے سامنے کی۔

''اسے اپنی جینز پہ لگا دو، ورنہ تمہاری فرینڈز یقین نہیں کریں گی۔''

''اتنا بھی کوئی شکی مزاج نہیں ہوتا جہان سکندر!'' اس نے ہنس کر اپنے پوروں پہ ذرا سی گیلی مٹی لی اور جھک کر گھٹنوں کے اوپر جینز پہ مل دی، پھر ہاتھ جھاڑتے ہوتے سیدھی ہوئی۔

''میں کوشش کروں گا کہ ہفتے کی صبح سارا کام ختم کر کے گھر آجاؤں، تم ہفتے کی شام میں ضرور آنا۔''

پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کم گو، سنجیدہ طبیعت کا، لیے دیے رہنے والا شخص ضرور ہے، مغرور بھی ہے اور جلدی گھلتا ملتا بھی نہیں، مگر اندر سے وہ بہت خیال رکھنے والا بھی ہے اور باریک بین بھی۔ جو معمولی باتیں وہ نظر انداز کر دیتی تھی، وہ جہان کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہیں رہتی تھیں۔

وہ جب ہاسٹل میں واپس آئی تو ڈی جے اور ہالے ایک رسالہ کھولے کسی طویل بحث میں مگن تھیں۔ ڈی جے کی نگاہ سب سے پہلے اس کے سرخ ہاتھ پہ پڑی۔

''تمہیں کیا ہوا ہے؟''

''ایک جگہ گدلی برف کیساتھ کیچڑ تھی، وہیں پھسل گئی۔''

ڈی جے نے بے اختیار اس کے گھٹنوں پہ لگے کیچڑ کو دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں لگ رہا ہے!''

حیا بات بدلنے کی غرض سے بولی۔ ''ہالے! یہ بالکونی بتی کون جلاتا ہے؟ جیسے ہی اس کے نیچے جاؤ تو وہ جل اٹھتی ہے۔''

ہالے جو غور سے اس کے کوٹ کو دیکھ رہی تھی، اس کے سوال پہ نگاہیں اٹھا کر اس کو دیکھا۔

"ان میں آٹو میٹک سینسرز لگے ہیں، وہ اپنی رو میں کسی انسان کی موجودگی پر یا پھر تیز ہوا، آندھی وغیرہ میں خود بخود جل اٹھتی ہیں۔"
"اور دروازہ، بہت دیر سے بند ہوا، خود بخود۔"
"ان دروازوں کے کچھ زسلو ہیں۔ یہ چوکھٹ پہ دیر سے آ کر لگتے ہیں تا کہ ہر وقت کی ٹھاہ ٹھاہ سے طلبا کی پڑھائی ڈسٹرب نہ ہو۔"
"آہاں..." ڈی جے نے سمجھ کر سر ہلایا۔ "ہمارے ہاں بھی ہاسٹلز میں ایسی لائٹس اور دروازے......"
"نہیں ہوتے۔" حیا نے ڈی جے کی بات تیزی سے کاٹی۔ "اور پاکستان اور ایشیا کا دوسرا بڑا امال نہیں ہے۔ ہمیں غلط فہمی ہوئی تھی۔"
وہ جواہر دیکھ آئی تھی اور اسے اس بڑھک پہ خفت ہوئی تھی۔
"حیا!" ڈی جے نے احتجاجاً گھورا۔ ہالے ابھی تک حیا کا کوٹ دیکھ رہی تھی۔ حیا الماری کی طرف چلی گئی تو ہالے گہری سانس لے کر بولی۔
"پھر حیا! تمہیں کسی ہینڈسم لڑکے نے کافی پلائی؟" وہ جو ٹوٹی جوتی والا شاپر الماری میں رکھ رہی تھی، بری طرح چونک کر پلٹی۔
"نہیں...... کیوں؟" وہ تیزی سے بولی۔
"کافی، چائے، لنچ...... کچھ بھی نہیں؟"
"نہیں، مگر کیوں؟"
"تم عقل مند، جو سرخ کوٹ پہن کر گئی تھیں، شہر کی سیر پہ استنبول میں، اگر اتنا زیادہ سرخ رنگ پہن کر اور ہیوی میک اپ کر کے باہر نکلا جائے تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ......" ہالے نے مسکراہٹ دبائی "کہ یو آر لکنگ فار اے ڈیٹ، یا پھر ون نائٹ اسٹینڈ! یہاں تو لوگ ویلنٹائن ڈے پر بھی اتنا سرخ پہن کر نہیں نکلتے۔"
"اچھا؟ پتا نہیں۔" وہ دانستہ ان کی طرف سے رخ موڑ کر الماری میں چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگی۔
"یہ دعوت کس خوشی میں ہے؟"
"تمہارے اس خوبصورت کوٹ کی خوشی میں۔"
مارے تضحیک کے اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ وہ جہان کی مسکراہٹیں، وہ شائستگی، وہ ریسٹورنٹ لے جانا، وہ سب کسی اپنائیت کے جذبے کے تحت نہیں تھا، بلکہ...... بلکہ وہ اسے کوئی بکاؤ مال کی طرح سمجھ رہا تھا؟ خود کو پلیٹ میں رکھ کر پیش کرنے والی لڑکی؟ کوئی پیشہ ور......؟

اس کے دل پہ بہت سے آنسو گر رہے تھے۔ جہان سکندر ہمیشہ اسی طرح اسے بے عزت کر دیا کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

آہستہ آہستہ وہ جہان سکندر کے استنبول میں ایڈجسٹ ہوتی جا رہی تھی۔
ڈی جے کی نیند اور نسیان البتہ اسے عاجز کر دیتے تھے۔ ڈی جے کو ذرا کہیں ٹیک مل جاتی، وہ آنکھیں بند کر کے سونے کے لیے تیار ہو جاتی اور پھر اس کا بھلکڑ پن...... حیا جب بھی کچھ فوٹو کاپی کروانے جاتی، اسے وہاں لاوارث پڑے کسی رجسٹر، کسی نوٹس کے جھتے، کسی کتاب پہ ہمیشہ شناسائی کا گمان گزرتا۔ وہ اسے اٹھا کر دیکھتی تو بڑا بڑا "ڈی جے" لکھا ہوتا تھا۔ وہ ہر چیز واپس لا کر ڈی جے کے سر پہ مارا کرتی تھی۔ اور ڈی جے "یہ ادھر کیسے پہنچ گیا؟" کہہ کر ہنسنے لگ جاتی۔
سبانجی میں ان کا ایک مخصوص آئی ڈی کارڈ بنا تھا۔ اس پہ تصویر کھنچوانے کی شرط سر اور گردن کھلی رکھنا تھی۔ وہ موبائل کے پری پیڈ کارڈ کی طرح تھا۔ گورسل کا ٹکٹ، فوٹو کاپیز کی رقم اور دوپہر کے کھانے کا بل اسی کارڈ پہ ادا ہوتا تھا۔ اس میں موبائل کے ایزی لوڈ کی طرح بیلنس ڈلوایا جاتا تھا۔ انہیں ان پانچ ماہ میں ہر مہینے ایک ہزار یوروز کا اسکالرشپ ملنا تھا، مگر چند تکنیکی مسائل کے باعث کسی بھی اسکالرشپ ایکسچینج اسٹوڈنٹ کے فروری کے ایک ہزار یوروز نہیں آئے تھے۔ امید تھی کہ مارچ میں اکٹھے دو ہزار مل جائیں گے اور پھر آگے ہر مہینے باقاعدگی سے ملا کریں گے۔ تب تک پاکستان سے آئی رقم سے گزارا کرنا تھا۔ سو آج کل سب ایکسچینج اسٹوڈنٹس کا ہاتھ تنگ تھا۔

دوپہر کا کھانا وہ سبانجی کے ڈائننگ ہال میں کھاتی تھیں۔ رات کا کھانا اپنے کمرے میں خود بنانا ہوتا۔ ہر بلاک میں ایک کچن تھا، جہاں پر ہر اسٹوڈنٹ اپنا ناشتا اور رات کا کھانا تیار کرتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہاں پر طلبا کے لیے خصوصی ڈیزائن کردہ چولہے تھے، اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں کوئی پڑھائی میں مگن چولہے پہ کچھ رکھ کر بھول جائے یا گیس کھلی چھوڑ دے اور نقصان ہو، وہ چولہے آٹومیٹک تھے۔ ہر پندرہ منٹ بعد جب چولہا خوب گرم ہوجاتا تو خود بخود بند ہوجاتا۔ پھر پانچ منٹ بعد دوبارہ جل اٹھتا۔ ان کو بند ہونے سے روکنے کا کوئی طریقہ نہ تھا اور ایسے بے کار چولہوں پہ دیسی کھانے پکانا ناممکن تھا۔

ہاسٹل کے بلاکس کے قریب ہی ایک بہت بڑا الگزری پراسٹور "دیاسا" Dia Sa تھا۔ "دیا" اس کا نام تھا اور "سا" ترک میں اسٹور کو کہتے تھے۔ وہ دونوں دیا اسٹور سے راشن لاتیں اور بل آدھا آدھا تقسیم کرلیتیں۔ ایک رات حیا کھانا بناتی اور وہ بہت اچھا سا دیسی کھانا ہوتا۔ دوسری رات ڈی جے کی باری ہوتی اور جو وہ بناتی وہ کچھ بھی ہوتا، مگر کھانا نہ ہوتا۔

"ڈی جے! میں یہ تمہارے سر پہ الٹ دوں گی۔" وہ جب بغیر بھنی ابلی ہوئی سبزی کا سالن دیکھتی یا پھر ابلے چاولوں پہ آملیٹ کے ٹکڑے تو ڈی جے پہ خوب چلایا کرتی تھی۔

اور پھر ترکی کے مسالے...... وہ اتنے پھیکے ہوتے کہ حیا چار، چار چمچے بھر کے سرخ مرچ ڈالتی تو بمشکل ذرا سا ذائقہ آتا۔ کھانے اس کے بھی پھیکے ہوتے، مگر ڈی جے سے بہتر تھے۔ البتہ اپنے کمرے میں روز جب صبح ہوتی تو ڈی جے بینک کی سیڑھیاں پھلانگ کر اترتی اور اسی طرح نہار منہ کھڑکی میں کھڑی ہوجاتی، پھر پٹ کھول کر باہر چہرہ نکال کر زور سے آواز لگاتی۔

"گڈ ما آ آ رننگ ڈی جے۔"

اور جواب میں دور کسی بلاک سے ایک لڑکا زور سے پکارتا۔

"ٹی ی ی بے......"

غالباً وہ ڈی جے کے الفاظ ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا تھا۔ ڈی جے روز صبح صبح یہی عمل دہراتی۔ اس کے ٹی بے کہنے کے بعد وہ پکارتی "ذا...... لیل......" اور وہ لڑکا جواباً چلاتا۔

"دا...... دی......" اس کے بعد حیا کمبل سے منہ نکال کر کشن اٹھاتی اور ڈی جے کو زور سے دے مارتی۔ یوں اس کی اور اس ان دیکھے لڑکے کی گفتگو اختتام پذیر ہوتی۔

گھر روز ہی بات ہوجاتی تھی۔ البتہ موبائل کی رجسٹریشن میں مسئلہ ہوا تھا۔ ڈی جے کا تو رجسٹر ہوگیا، مگر حیا کے ساتھ ہوا یوں کہ اس کے پاسپورٹ پہ جہاں انٹری کی تاریخ پانچ فروری لکھی تھی، وہاں اوپر آفیسر کے دستخط کے باعث پانچ کا ہندسہ بظاہر چھ لگ رہا تھا۔ تاریخ کا ذرا سا فرق مشکل پیدا کرنے لگا اور اس کا فون رجسٹر نہ ہوسکا۔ وہ ترک سم اس پہ استعمال نہیں کرسکتی تھی، کیونکہ ہفتے کے بعد غیر رجسٹرڈ فون پہ ترک سم بلاک ہوجاتی تو ہالے نے اسے اپنا ایک پرانا موبائل سیٹ لادیا، اور وہ اس بدصورت، موٹے، بھدے فون کو برداشت کرنے پہ مجبور ہوگئی۔ اپنے موبائل پہ اس نے پاکستانی سم لگادی تھی اور وہ رومنگ پہ ٹھیک چل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہارا کہاں کا پلان ہے؟" حیا نے چاولوں کی پلیٹ میں سے چمچہ بھرتے ڈی جے سے پوچھا۔ یہ پلاؤ اس کا اور ڈی جے کا مرغوب ترین کھانا بن چکا تھا۔ اور ساتھ ترک کوفتے اور پھلوں کا سلاد۔ وہ دونوں آمنے سامنے ڈائننگ ہال میں بیٹھی جلدی جلدی کھانا کھا رہی تھی۔

"میں سسلی جانا چاہتی ہوں، شاپنگ وغیرہ کے لیے اور تم تو اپنی پھپھو کے گھر جاؤ گی نا؟" ڈی جے کوفتے کے سالن میں سے تیل نکال کر دوسرے پیالے میں ڈال رہی تھی۔ وہ یوں ہی ہر سالن میں سے تیل نکالا کرتی تھی۔ تلی ہوئی چیزوں کو اخبار میں لپیٹ کر دباتی اور پھر کھاتی۔

"ہاں اور تم ہڈیوں کا ڈھانچہ اسی لیے ہو۔" حیا نے رک کر ناگواری سے اس کے عمل کو دیکھا۔ وہ بنا اثر لیے اوپر آیا تیل دوسرے پیالے میں انڈیلتی رہی۔

ڈائننگ ہال بے حد وسیع و عریض تھا۔ ہر سو زرد روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہاں دو لمبی سی قطاروں میں مستطیل میزیں لگی تھیں اور دونوں قطاروں کے چاروں طرف کرسیوں کی سرحد بنی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی، رش اور شور سا تھا۔

دفعتاً پلیٹ کے ساتھ رکھا حیا کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے چمچہ پلیٹ میں رکھا اور نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے چمکتی اسکرین کو دیکھا۔ تایا فرقان ہوم کالنگ۔۔۔

''حیا! ارم بول رہی ہوں۔''

''ہوں..... کیسی ہو ارم؟'' نوالہ منہ میں تھا، اس لیے اس کی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

''ٹھیک..... تم سناؤ۔'' ارم کی آواز میں ذرا بے چینی تھی۔

''سب خیریت ہے، تم بتاؤ، کوئی بات ہوئی ہے کیا؟''

''نہیں..... ہاں..... سنو، ایک بات تھی۔'' ارم کی آواز دھیمی سرگوشی میں بدل گئی۔

''کہو، میں سن رہی ہوں۔'' حیا نے آہستہ سے چمچہ رکھا اور نیپکن سے لبوں کو دبایا۔ اس کے ذہن کے پردے پہ وہ ویڈیو ابھری تھی۔

''وہ..... یار عجیب سی بات ہے، مگر تم ابا وغیرہ کو نہ بتانا۔ اصل میں کل شام جب میں یونیورسٹی سے واپس آئی تو گیٹ کے قریب ایک..... خواجہ سرا تھا..... اس نے مجھے روکا۔''

حیا بالکل دم سادھے سنے گئی۔ پل بھر کو اسے ڈائننگ ہال کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ اس کی سماعت میں صرف ارم کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''پہلے تو میں ڈر گئی، مگر اس نے کوئی غلط حرکت نہیں کی تو مجھے تسلی ہوئی۔ وہ مجھ سے تمہارا پوچھ رہا تھا کہ حیا باجی کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟ امریکہ پہنچ گئیں، خیریت سے؟ میں نے بتایا کہ وہ امریکہ نہیں، ترکی گئی ہے۔ پھر وہ کہنے لگا کہ میں تمہیں اس کا سلام اور.....'' وہ جھجکی۔

''اور دعا دے دوں۔''

''اور کچھ؟''

''نہیں، مگر تم ابا وغیرہ کو مت بتانا کہ میں نے ایک خواجہ سرا سے بات کی ہے۔''

''یہ بات تمہیں اس سے مخاطب ہونے سے قبل سوچنی چاہیے تھی۔ بہرحال میں نہیں جانتی، وہ کون ہے، کیا نام بتایا اس نے اپنا؟''

''ڈولی۔''

''پتا نہیں کون ہے۔ آئندہ ملے تو بات نہ کرنا، بلکہ نظر انداز کر کے گزر جانا۔'' مزید چند باتیں کر کے اس نے فون رکھ دیا اور دوبارہ پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''ویسے تمہاری پھپھو کا کوئی ہینڈسم بیٹا وٹا ہے؟'' ڈی جے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے مگن سے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ''کیوں؟''

''تمہاری چمک دمک دیکھ کر یہ خیال آیا۔'' ڈی جے نے مسکراہٹ دباتے، اپنی عینک انگلی سے پیچھے کی۔

حیا نے یوں ہی چمچہ پکڑے گردن جھکا کر خود کو دیکھا۔ پاؤں کو چھوتے زرد فراک اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھی۔ فراک کی زرد شیفون کی تنگ چوڑی دار آستینیں کلائی تک آتی تھیں۔ شیفون کا دوپٹا اس نے گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ بال حسب عادت سمیٹ کر دائیں کندھے پہ آگے کو ڈال رکھے تھے۔

''ہاں، ہے ایک بیٹا، مگر شادی شدہ ہے۔'' وہ لاپروائی سے شانے اچکا کر پلیٹ میں پڑا کوفتہ کانٹے سے توڑنے لگی۔

''اونہوں..... سارا مزا ہی کرکرا کر دیا۔''

''او ڈی جے! یہ کیا؟'' وہ ڈی جے کے پیچھے کچھ دیکھ کر رکی تھی۔

''کوفتہ ہے اور کیا۔'' ڈی جے نے کانٹے میں پھنسے کوفتے کو دیکھ کر کہا۔

"افوہ! اپنے پیچھے دیکھو۔" اس نے جھنجھلا کر کہا تو ڈی جے نے گردن موڑی۔ وہاں ایک قدرے فربہی مائل لڑکی چلی آ رہی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس تھی۔

"سبانجی میں ہم وطن؟" ڈی جے نے بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ اگلے ہی پل وہ دونوں اپنے اپنے کوٹ اٹھا کر کھانا چھوڑ کر اس کی طرف لپکیں تھیں۔

وہ لڑکی اپنی کتابیں سنبھالتی چلی آ رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر ٹھٹکی۔ وہ ڈی جے کی شلوار قمیص اور حیا کا فراک پاجامہ بے یقینی سے دیکھ رہی تھی اور وہ دونوں اس کی شلوار قمیص۔

"آپ پاکستانی ہیں؟" حیا پرجوش سی اس کے پاس گئی۔ ڈی جے ذرا اس سے ذرا پیچھے تھی۔

"نہیں، میں انڈین ہوں۔"

ڈی جے ڈھیلی پڑ گئی۔ "رہنے دو حیا! مجھے ابھی ورلڈ کپ کا غم نہیں بھولا۔"

اس نے سرگوشی کی۔ تین سال پہلے مصباح الحق کا آخری بال پہ آؤٹ ہونا ڈی جے کو کبھی نہیں بھولتا تھا۔

حیا نے زور سے اپنا پاؤں ڈی جے کے جوتے پہ رکھ کر دبایا۔

"ہم پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس ہیں۔ حیا سلیمان اور یہ خدیجہ رانا۔ آپ؟"

"میں انجم ہوں۔ میں اور میرے ہزبینڈ پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اور ہم دونوں یہاں پڑھاتے بھی ہیں۔ ادھر فیکلٹی میں ہمارا اپارٹمنٹ ہے، وہیں رہتے ہیں ہم، کبھی آؤ نا ادھر۔" انجم ان دونوں سے زیادہ پرجوش ہو گئی تھیں۔

"شیور..... انجم باجی۔" ڈی جے ان کا مسلمان ہونا سن کر پھر سے خوش ہو گئی تھی۔ وہ تینوں کافی دیر وہاں کھڑی باتیں کرتی رہیں اور جب ڈی جے کو یاد آیا کہ گورسل نکلنے میں پانچ منٹ ہیں تو انجم باجی کو جلدی سے خدا حافظ بول کر وہ اپنا کوٹ ہاتھوں میں پکڑے باہر بھاگیں۔

☆ ☆ ☆

وہ ٹاقسم کے پارک میں سنگی بینچ پہ بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا لمبا سفید اونی کوٹ اب زرد فراک پہ پہن لیا تھا اور سر جھکائے ہاتھ میں پکڑی شکن زدہ چٹ پہ سے سبین پھپھو کا نمبر موبائل پہ ملا رہی تھی۔ ابھی تک اس نے اس نمبر کو موبائل میں محفوظ نہیں کیا تھا۔

کال کا بٹن دبا کر اس نے وہ بھدا ترک فون کان سے لگایا۔

وہاں دور تک سبزہ پھیلا تھا۔ خوش نما پھول اور رنگوں، تتلیوں کی بہتات، ہوا اس کے لمبے بال اڑا رہی تھی۔ وہ موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے فون پہ جاتی گھنٹی سننے لگی۔

"ہیلو۔" بہت دیر بعد جہان نے فون اٹھایا۔

"جہان..... میں حیا....." اس کے انداز میں خفت در آئی۔ اس سے کہہ رکھا تھا اسی لیے آج جا رہی تھی، ورنہ اس سرخ کوٹ نے تو اسے خوب بے وقعت کیا تھا۔

"ہاں حیا بولو؟" وہ مصروف سا لگ رہا تھا۔

"وہ میں ٹاقسم پہ ہوں، تم مجھے یہاں سے پک کر کے گھر لے جا سکتے ہو؟ آج ویک اینڈ تھا تو....."

"سوری حیا! میں شہر سے باہر ہوں، تم گھر ممی کو فون کر لو نا۔"

"یہ تمہارے گھر کا نمبر نہیں ہے؟" اس نے حیرت سے چٹ کو دیکھا۔

"نہیں، یہ تو میرا موبائل نمبر ہے۔"

تو کیا اس نے داور بھائی کی مہندی والے روز جہان کے موبائل پہ فون ملا دیا تھا؟

"اوہ..... مجھے پھپھو کا نمبر لکھوا دو۔" جہان نے فوراً نمبر لکھوا دیا۔

"اچھا میں ڈرائیو کر رہا ہوں، پھر بات ہوتی ہے۔" مزید کچھ سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔

وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ عجیب اجنبی سا اپنا تھا۔

پھپھو اسے کیب پہ لینے آئی تھیں۔ وہ جو چند لیرا کی بچت کے چکر میں کیب کر کے نہیں گئی تھی، خوب شرمندہ ہوئی۔

''گاڑی نہیں تھی تو بتاتیں، میں تو ایسے ہی.....''

''کوئی بات نہیں، گاڑی تو جہان کے پاس ہی ہوتی ہے۔'' اور وہ مزید شرمندہ ہوئی۔ پھر گردن موڑ کر کھڑکی کے باہر دوڑتے درخت دیکھنے لگی۔

اسے پھپھو کچن میں ہی لے آئیں۔ حسب عادت وہ کام میں مصروف ہو گئیں۔

''یہ میرے لیے اتنا بکھیڑا پالنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ اردگرد پھیلی اشیاء دیکھ کر خفا ہوئی۔

''کوئی بات نہیں، تم میری بیٹی ہو، میرا ہاتھ بٹادوگی، اسی لیے میں نے یہ سب شروع کر لیا۔'' دونوں کے درمیان پچھلی ملاقات کے ناخوشگوار اختتام کا کوئی تذکرہ نہ ہوا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''چلیں! پھر آج پلاؤ تو میں ہی بناتی ہوں، مجھے ریسیپی سمجھاتی جائیں، ویسے بھی ترکوں کی میز اس پلاؤ کے بغیر ادھوری لگتی ہے۔'' وہ کورٹ اسٹینڈ پہ لٹکا کر آستین کلائی سے ذرا پیچھے کرتی واپس آئی۔ دوپٹا اس نے اتار کر کرسی پہ رکھ دیا تھا۔

''پہلے تو تم چکن کی بوٹیاں کاٹ دو۔'' انھوں نے ٹوکری میں رکھے مسلم مرغ کی طرف اشارہ کیا اور خود چولہے پہ چڑھی دیگچی میں چمچہ ہلانے لگیں۔

''چھری تو یہ پڑی ہے، کٹنگ بورڈ کدھر ہے؟'' وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

''کٹنگ بورڈ.....اوہو.....وہ تو صبح سے نہیں مل رہا۔ جہان بھی پتا نہیں چیزیں اٹھا کر کدھر رکھ دیتا ہے۔ ٹھہرو! میں ایک پرانا بورڈ لے آؤں اوپر اٹیک attic سے۔''

''آپ رہنے دیں، میں لے آتی ہوں، اٹیک اوپر کس طرف ہے؟''

''سیڑھیوں سے اوپر راہداری کے آخری سرے پہ، مگر تمہیں تکلیف ہوگی، میں خود.....''

''آپ گوشت بھونیں، جل نہ جائے، میں بس ابھی آئی۔'' وہ ننگے پاؤں چلتی باہر لونگ روم میں آئی۔

سیڑھیوں کیساتھ لگے قد آور آئینے میں اسے اپنا عکس دکھائی دیا تو ذرا سی مسکرا دی۔ فرش کو چھوتے زرد فراک میں وہ کھلتے پھول کی طرح لگ رہی تھی۔ گلے کا گھاٹ کھلا تھا اور اسکے دہانے پہ چھوٹے چھوٹے سورج مکھی کے پھولوں کی لیس نیم دائرے میں لگی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کی خوبصورت لمبی گردن میں سورج مکھی کے پھولوں کا ڈھیلا سا ہار لٹک رہا ہو۔ اس نے انگلیوں سے فراک پہلوؤں سے ذرا اٹھایا اور ننگے پاؤں لکڑی کے زینوں پہ چڑھنے لگی۔

اور راہداری کے آغاز میں ایک کمرے کا دروازہ بند تھا، شاید وہ جہان کا ایک کمرا تھا۔ ابھی گھر میں داخل ہوتے ہوئے پھپھو نے کچھ ایسا بتایا تھا۔

وہ ایک نظر بند دروازے پہ ڈال کر آگے بڑھ گئی۔ فراک اب اس نے پہلوؤں سے چھوڑ دیا تھا۔

اٹیک میں آگے پیچھے بہت سے صندوق اور دوسرا کاٹھ کباڑ رکھا تھا۔ وہ متذبذب سی اندر آئی۔ بتی نہ جانے کدھر تھی۔ اس نے دروازہ کھلا رہنے دیا، باہر سے آتی روشنی کافی تھی۔

وہاں ہر سو سامان رکھا تھا، کٹنگ بورڈ نہ جانے کدھر تھا۔ وہ اندازاً آگے بڑھی اور ایک کونے والے صندوق کا کنڈا کھول کر ڈھکن اوپر اٹھایا۔

نیچے لونگ روم سے بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ ساتھ میں جہان اور پھپھو کی ملی جلی آوازیں۔ یقیناً وہ آ گیا تھا۔ وہ مسکرا کر صندوق پہ جھکی۔

اس میں الیکٹرک کا کوئی ٹوٹا پھوٹا سامان رکھا تھا۔ کٹنگ بورڈ کہیں نہ تھا۔ حیا نے ڈھکن بند کیا اور نسبتاً زیادہ کونے میں رکھے صندوق کی طرف آئی۔

اپنے عقب میں اسے راہداری سے کسی دروازے کے ہولے سے کھلنے کی چرچراہٹ سنائی دی تھی۔ جہان اتنی جلدی اوپر پہنچ گیا؟ مگر وہ پلٹی نہیں اور صندوق کو کھولنے لگی، جس کے ڈھکن کے اوپر گرد اور مکڑی کے جالوں کی تہہ تھی۔
اس نے چند چیزیں الٹ پلٹ کیں تو بے اختیار گرد نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اسے ذرا سی کھانسی آئی۔ پورا اٹیک بے حد صاف تھا۔ ماسوائے ان کونے میں رکھے دو تین صندوقوں کے جیسے انہیں زمانوں سے نہ کھولا گیا ہو۔
اس کی پشت پہ اٹیک کا ادھ کھلا دروازہ ہولے سے کھلا۔ کوئی چوکھٹ میں آن کھڑا ہوا تھا، یوں کہ راہداری کی آتی روشنی کا راستہ رک گیا۔ پل بھر میں اٹیک ......نیم تاریک ہو گیا۔
وہ پلٹنے ہی لگی تھی کہ صندوق میں کسی خاکی شے کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اسے اوپر نکالا۔ وہ لکڑی کا تختہ نہیں تھا، بلکہ ایک اکڑا ہوا کپڑا تھا۔
حیا نے کپڑا کھول کر سیدھا کیا۔ ایک پرانی گرد آلود خاکی شرٹ......اوپر سجے ستارے، تمغے اور ایک نام کی تختی۔
چوکھٹ میں کھڑا شخص چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا، اس کی طرف بڑھنے لگا۔
حیا نے نیم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ تختی پڑھی۔
''سکندر شاہ!'' اس نے بے اختیار رینک دیکھا۔ وہ کرنل کی نشاندہی کر رہا تھا۔
وہ شرٹ ہاتھ میں پکڑے کسی الجھن میں گرفتار پلٹی اور ایک دم جھٹکے سے پیچھے ہٹی۔
اس کے عقب میں جہان نہیں تھا۔ وہ کوئی اور تھا۔
دراز قد، کنپٹیوں اور پیشانی سے جھلکتے سفید بال، سخت نقوش، نائٹ گاؤن میں ملبوس، وہ کڑی نگاہوں سے اسے دیکھتے قریب آ رہے تھے۔

وہ سانس روکے انہیں دیکھے گئی۔
وہ عین اس کے سر پہ آئے، اور ایک جھٹکے سے اس کی گردن دبوچی۔
''میری جاسوسی کرنے آئی ہو؟''
اس کے گلے کو دبوچتے وہ غرائے تھے۔
بے اختیار اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔ شرٹ اس کے ہاتھ سے پھسل گئی۔ اس نے اپنی انگلیوں سے گردن کے گرد جکڑے ان کے ہاتھ کو پکڑ کر ہٹانے کی کوشش کی، مگر بے سود۔
''پاکستانیوں نے بھیجا ہے تمہیں؟ اپنے مالکوں سے بولو، انہیں بلیو پرنٹس کبھی نہیں ملیں گے۔''
''چھوڑیں مجھے۔'' وہ زور سے کھانسی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ اس کا گلا دبا رہے تھے۔
''کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا، کبھی نہیں، ہر چیز آگے دے دی گئی ہے، ہر چیز۔'' انھوں نے اسے گردن سے دبوچے اس کا سر کھلے صندق پہ جھکایا۔ وہ تڑپنے، چلانے لگی۔
''چھوڑیں مجھے۔'' وہ اپنے ناخن ان کے ہاتھ میں چبھا کر ان کو ہٹانے کی ناکام سعی کر رہی تھی۔
''تمہیں واپس نہیں جانے دوں گا۔ وہ بلیو پرنٹس تمہیں کبھی نہیں ملیں گے۔''
حیا کا سانس رکنے لگا۔ وہ اس کا سر صندق میں دے کر اوپر سے ڈھکنا بند کر رہے تھے، اسے لگا وہ مرنے والی ہے۔
''امی......امی......'' وہ دہشت سے چلانے لگی۔ وہ اس کو گردن سے دبوچے، اس کا سر منہ کے بل اندر دے رہے تھے۔ گرد سے اٹے صندوق میں اس کا سانس اکھڑنے لگا۔

✿......✿......✿

باب 3

''چھوڑیں۔'' دھاڑ سے دروازہ کھلا اور کوئی غصے سے چلاتا اندر آیا۔ اس کی گردن کے گرد جکڑے ہاتھ کو کھینچ کر الگ کیا اور ادھ کھلا ڈھکن پورا کھول کر دوہری ہو کر اوندھی جھکی حیا کو بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔

''کیا کر رہے تھے آپ؟ وہ آپ کی بیٹی کی طرح ہے، ایک بات میری دھیان سے سنیں۔ آئندہ اگر آپ نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

انگشت اٹھا کر سختی سے وہ انہیں تنبیہہ کر رہا تھا۔ جہان کو دیکھ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر خاموشی سے اسے سنتے گئے۔

''اور تم!'' وہ حیا کی طرف پلٹا۔ ایک غصیلی نگاہ اس پہ ڈالی، اور کہنی سے پکڑ کر کھینچتا باہر لایا۔ ''اوپر کیوں آئی تھیں؟ کس نے کہا تھا ادھر آؤ؟''

سیڑھیوں کے دہانے پہ لا کر اس نے حیا کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دہشت سے چہرے کا رنگ لباس کی مانند زرد پڑ چکا تھا۔ گردن پہ انگلیوں کے سرخ نشان پڑے تھے۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

''وہ پھپھو نے......''

''پھپھو کا بیٹا مر گیا تھا جو انہوں نے تمہیں بھیجا؟ منع بھی کیا تھا، مگر یہاں کوئی سنے تو۔'' وہ غصے میں بولتا، اسے کہنی سے پکڑے نیچے سیڑھیاں تیزی سے اترنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ کھنچی چلی آرہی تھی۔ پھپھو پریشان سی آخری سیڑھی کے پاس کھڑی تھیں۔

''میں بکواس کر کے گیا تھا نا، مگر میری سنتا کون ہے اس گھر میں؟ دو دن کے لیے نہ ہوں تو سارا انتظام الٹ جاتا ہے۔ پورے گھر کو پاگل کر دیا ہے انھوں نے۔''

وہ آگے بڑھا اور سینٹر ٹیبل پہ رکھی میز سے پانی کی بوتل اٹھا کر لبوں سے لگائی۔

وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ جہان کو اتنے شدید غصے میں اس نے پہلی دفعہ دیکھا اور اتنی شستہ اردو بولتے ہوئے بھی۔

''میں...... میں انہیں دیکھتی ہوں۔'' پھپھو پریشانی سے کہتے ہوئے اوپر سیڑھیاں چڑھ گئیں۔

وہ گھونٹ پہ گھونٹ چڑھاتا گیا۔ بوتل خالی کر کے میز پہ رکھی اور اسکی طرف دیکھا۔

''باہر آؤ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' وہ کہہ کر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ ڈری، سہمی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے آئی۔

وہ بیرونی دروازے کے آگے بنے اسٹیپس پہ بیٹھا تھا۔ حیا نے دروازہ بند کیا اور اسکے ساتھ آ بیٹھی۔ زرد فراک پھسل کر اس کے ننگے پاؤں کو ڈھانپ گیا۔ باہر سردی تھی، مگر اسے نہیں لگ رہی تھی۔

''جو بھی ہوا، میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

نیلی جینز کے اوپر پہنے بھورے سوئیٹر کو عادتاً کہنیوں سے ذرا آگے تک موڑے، وہ ہمیشہ کی طرح وجیہہ اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ غصہ اب کہیں نہیں تھا۔ وہ پہلے والا دھیما اور سنجیدہ جہان بن گیا تھا۔

''ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتے۔ کئی دفعہ انہوں نے ممی کو بھی مارنے کی کوشش کی ہے، مگر مجھے کچھ نہیں کہتے۔ ڈرتے نہیں ہیں، شاید نفرت کرتے ہیں۔''

سامنے سبزہ تھا۔ اس سے آگے سفید لکڑی کی باڑ اور باڑ سے ہی بنا گیٹ، باڑ کے تختوں کی درزوں سے باہر گیلی سڑک دکھائی دیتی

تھی۔ نم ہوا گھاس پر سے سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے چہرہ جہان کی جانب موڑے بیٹھی تھی۔ فراک کا فرش کو چھوتا دامن ہوا کی لہروں سے پھڑ پھڑاتا ہوا اوپر اٹھ جاتا تو پاجامے کی تنگ چوڑیوں میں مقید ٹخنے اور پاؤں جھلکتے۔

''میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں پاکستان جاؤں۔ اپنے رشتہ داروں کے درمیان رہوں، اپنا آبائی گھر دیکھوں، مگر ہم پاکستان نہیں جاتے اور تم اس روز ممی کو طعنہ دے رہی تھیں کہ ہم پاکستان نہیں آتے۔''

''نن..... نہیں.....'' وہ گڑبڑا گئی، مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

''حیا! ہم کبھی پاکستان واپس نہیں جا سکتے۔''

''مگر کیوں؟'' وہ سناٹے میں رہ گئی۔ وہ چند لمحے چپ رہا، پھر آہستہ سے کہنے لگا۔

''میرے دادا، اپنے کاروبار کے سلسلے میں استنبول آیا کرتے تھے۔ اس گھر کی زمین انہوں نے ہی خریدی تھی بعد میں ابا نے ادھر گھر بنوایا۔ تب وہ پاکستان آرمی کی طرف سے یہاں پوسٹڈ تھے۔ میں استنبول میں ہی پیدا ہوا تھا اور ابا کی دوبارہ اسلام آباد پوسٹنگ ہونے کے بعد بھی میں اور ممی اِدھر دادا کے ساتھ رہتے تھے۔ میرے دادا، بہت اچھے، بہت عظیم انسان تھے۔ انھوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا۔ دین، دنیا، عزت، بہادری اور وقار سے جینے اور شان سے مرنے کا سبق انھوں نے ہی مجھے دیا تھا۔ میں آٹھ سال کا تھا، جب دادا فوت ہوئے تو میں اور ممی کچھ عرصہ کے لیے پاکستان آ گئے۔ اور تب ہی وہ واقعہ ہوا، جس نے ہماری زندگی بدل دی۔''

حیا کا سانس رک گیا۔ تب ہی تو ان کا نکاح ہوا تھا، تو کیا وہ باخبر تھا.....؟

''جن دنوں میں اور ممی پاکستان میں تھے، بلکہ تمہارے گھر میں تھے، ابا آناً فاناً ترکی فرار ہو گئے۔ فرار اس لیے کہ انھوں نے ایک حساس مقام کے بلیو پرنٹس ان کو بیچ دیے تھے جو ہمیشہ خریدنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ثبوت انھوں نے نہیں کوئی چھوڑا، مگر تفتیش شروع ہوئی تو بہت کچھ کھلنے لگا۔ ابا نے ترکی سے ہی اپنا استعفیٰ بھجوا دیا۔ پیچھے عدالت میں مقدمہ چلا اور وہ غدار ٹھہرائے گئے۔ ان کے جرائم کی فہرست خاصی طویل تھی۔ ان کو سزائے موت سنا دی گئی اور انھوں نے ترکی میں سیاسی پناہ حاصل کر لی۔ کچھ تعلقات کام آئے اور کچھ رشوتیں، ابا کو ترک حکومت کبھی ڈی پورٹ نہ کر سکی، نہ ہی انٹرپول نے کوئی قدم اٹھایا۔ قصہ مختصر، ابا جس دن پاکستان کی سرزمین پہ قدم رکھیں گے، وہ گرفتار ہو جائیں گے اور ان کو پھانسی دے دی جائے گی۔ یہ بات تمہارے والدین کو پتا ہے، مگر بدنامی کے ڈر سے کسی کو بتائی نہیں جاتی۔''

وہ کسی بھی جذبے سے عاری نگاہوں سے سامنے باڑ کو دیکھ رہا تھا۔ حیا یک ٹک اسے دیکھے گئی۔ اس کے گھر میں پھپھو کے شوہر کا ذکر کوئی نہیں کرتا تھا۔ شاید دانستہ طور پہ ایسا کیا جاتا تھا۔

''میں ایک غدار کا بیٹا ہوں۔ میرا باپ ایک ملک دشمن ہے۔ اس ذلت کے باوجود ہم ابا کے ساتھ رہنے پہ مجبور ہیں۔ احساس جرم ہے یا قدرت کی سزا، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ذہن کھوتے جا رہے ہیں۔ سزائے موت کا خوف ان کے لیے ناسور بنتا جا رہا ہے۔ جو انھوں نے تمہارے ساتھ کیا، اس پہ ان کو معاف کر دینا۔ وہ میرے باپ ہیں اور باوجود اس کے کہ یہ حقیقت بہت جگہ پہ میرا سر جھکا دیتی ہے میں ان سے محبت کرنے پہ مجبور ہوں۔''

حیا نے گہری سانس لی۔ اس کے کسی قصے میں اس کا قصہ نہیں تھا، کسی داستان میں اس کی داستان نہ تھی۔

''میں کام سے باہر جا رہا ہوں، آج کھانا کھا کر جانا۔'' وہ اٹھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ شاید وہ صرف ابھی تنہائی چاہتا تھا۔

حیا گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ وہ ننگے پاؤں لکڑی کے فرش پہ چلتا سیڑھیوں کی بڑھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

''حیا..... خدیجہ!''

ٹالی نے انہیں اس وقت پکارا، جب وہ دونوں ڈی جے کے بینک پہ بیٹھی، ڈی جے کی شاپنگ پہ تبصرہ کر رہی تھیں۔ وہ تیرہ فروری کی دوپہر تھی۔ انہیں ترکی آئے آٹھواں روز تھا اور ڈی جے جو ویلنٹائن ڈے کی رونق دیکھنے آج تاقسم گئی تھی مایوس سی واپس آئی تھی۔ پاکستان کے برعکس ترک ہر کام چھوڑ کر سرخ رنگ میں نہا نہیں جاتے تھے، بلکہ سوائے سرخ پھولوں کی فروخت کے استنبول میں ویلنٹائن ڈے کے کوئی

آثار نہ تھے۔ جب ڈی جے خوب مایوس ہو چکی تو اس نے یہ کہہ کر اپنے خیالات میں ترمیم کرلی کہ "بھاڑ میں گیا سینٹ ویلنٹائن، ہمیں اس تہوار سے کیا لینا دینا۔"

ان کی اس گفتگو میں مخل ہونے والی اسرائیلی ایکسچینج اسٹوڈنٹ تھی۔

"ہاں؟" وہ دونوں رک کر نیچے دیکھنے لگیں، جہاں ٹالی ان کے بینک سے نیچے لٹکتی سیڑھی کے ساتھ کھڑی تھی۔

"وہ لڑکے تمہارا پوچھ رہے تھے۔"

حیا اور ڈی جے نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ٹالی کو۔

"کون سے لڑکے؟"

"وہ فلسطینی ایکسچینج اسٹوڈنٹس جو ساتھ والے ڈورم میں رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ وہ پاکستانی لڑکیاں کیسی ہیں اور یہ کہ ان کو کوئی مسئلہ وغیرہ تو نہیں ہے، اور یہ بھی کہ تم دونوں آج شام کی چائے کامن روم میں ان کے ساتھ پیو۔ وہ تمہارا انتظار کریں گے، اوکے بائے۔" ایک اسرائیلی مسکراہٹ ان کی طرف اچھالتی، ہاتھ ہلا کر وہ باہر نکل گئی۔

"یہ فلسطینیوں کو ہمارا خیال کیسے آ گیا؟"

"اس ٹالی کے درخت سے دل بھر گیا ہوگا شاید۔" ڈی جے نے قیاس آرائی کی۔

"یکومت! وہ ہمیں صرف اپنی مسلمان بہنیں سمجھ کر بلا رہے ہوں گے۔"

"اتنے ہینڈسم لڑکوں کی بہن بننے پہ کم از کم میں تیار نہیں ہوں۔ یہ بھائی چارہ تمہیں ہی مبارک ہو۔" ڈی جے بدک اٹھی تھی۔

"چلو پھر تیار ہو جائیں تاکہ وقت پہ پہنچ سکیں۔"

حیا لکڑی کی سیڑھی سے نیچے اترنے لگی۔

"صرف ہمیں ہی بلایا ہے یا یہ عرب اسرائیل دوستی کی زندہ مثال بھی موجود ہوگی؟" ڈی جے کا اشارہ ٹالی کی طرف تھا۔

"پتا نہیں۔" حیا نے شانے اچکا دیے۔ وہ الماری سے کپڑے نکالنے لگی۔ ہر موقع کی مناسبت سے مکمل ڈریسنگ کرنا اس کا جنون تھا۔ کپڑوں پہ ایک سلوٹ تک نہ ہو اور میک اپ کی ایک لکیر بھی اوپر نیچے نہ ہو، وہ ہر بات کا خیال رکھتی تھی۔ البتہ لڑکوں کی دعوت پہ جانے کی اجازت پاکستان میں ابا یا تایا فرقان کبھی نہ دیتے، مگر وہ ادھر کون سا دیکھ رہے تھے۔ یہ ترکی تھا اور یہاں سب چلتا تھا۔

وہ تین لڑکے تھے معتصم المرتضیٰ، حسین اور مومن۔ ان کے دو فلسطینی دوست محمد قادر اور نجیب اللہ جاتی دعوت کے شروع میں موجود رہے، پھر اٹھ کر چلے گئے، مگر ان تینوں میزبانوں نے احسن طریقے سے میزبانی نبھائی۔

وہ تینوں اسمارٹ اور گڈ لکنگ سے لڑکے ایک جیسے لگتے تھے۔ معتصم ان میں ذرا لمبا تھا۔ (اس کا نام معتصم المرتضیٰ تھا، مگر یہ ڈی جے نے بعد میں نوٹ کیا کہ وہ فیس بک پہ اپنا نام معتصم اینڈ مرتضیٰ لکھتا تھا۔ وجہ انہیں کبھی سمجھ نہ آئی۔) حسین اور معتصم ان دونوں کو بالکل اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح ٹریٹ کر رہے تھے۔ البتہ اس بھائی چارے سے مومن متفق نہ تھا۔ وہ فلرٹی، نظر باز سا لڑکا کچھ بھی تھا، مگر مومن نہ تھا۔ البتہ وہ دونوں اس کو اپنی موجودگی میں سیدھا کیے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اتنے ملنسار اور مہذب لڑکے تھے کہ حیا کو اپنے سارے کزنز ان کے سامنے بے کار لگے۔ البتہ جہان کی بات اور تھی۔ اس نے فوراً اپنی رائے میں ترمیم کی۔

"اگلے ہفتے حسین کا برتھ ڈے ہے۔" حسین موبائل پہ فون سننے باہر گیا تو مومن نے بتایا۔

"پھر تو ہمیں اسے ٹریٹ دینی چاہیے۔" ڈی جے سوچ کر بولی۔

"اور گفٹ بھی۔" حیا کو خیال آیا۔

"ہم دونوں اس کے لیے ایک گھڑی خریدنے کا سوچ رہے ہیں اور جو ہم نے جواہر میں دیکھی ہے۔ 130 لیراز کی ہے۔" معتصم نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر کپ میز پہ رکھا۔

"یعنی کہ پاکستانی روپوں میں......" حیا نے سوچتے ہوئے پرس میں ہاتھ ڈالا تاکہ موبائل کے کیلکولیٹر سے حساب کر سکے۔

''سات ہزار ایک سو پچاس پاکستانی روپے۔'' معتصم جھک کر پیسٹریز کی پلیٹ سے ایک ٹکڑا اٹھاتے ہوئے بولا۔ حیا کا پرس کو کھنگالتا ہاتھ رک گیا۔ اس نے حیرت و بے یقینی سے معتصم کو دیکھا۔

''تم نے اتنی جلدی حساب کیسے کیا؟''

''میں میتھس کا اسٹوڈنٹ ہوں۔'' وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔

''اور معتصم کا ایک ہی خواب ہے کہ وہ میتھس میں نوبل پرائز لے۔'' مومن، حیا کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد معتصم سے آنکھ بچا کر حیا کے سراپے کا جائزہ لے لیتا تھا۔ حیا قدرے رخ موڑ کر معتصم کی طرف متوجہ ہوئی۔

''تو میتھس کے اسٹوڈنٹ! جلدی سے بتاؤ کہ اس مہنگی گھڑی کو خریدنے کے لیے اگر ہم چاروں پیسے تقسیم کریں تو ہر ایک کے حصے میں کتنے .....''

''32 لیرا اور پچاس کُرش۔''

''اوکے!'' حیا نے گہری سانس لی اور پرس کھولا۔ ان کو پیسے انھوں نے زبردستی تھمائے۔ مومن کو تو کوئی اعتراض نہ تھا، مگر معتصم ان سے رقم لینے پہ متذبذب تھا، مگر یہ ایک ان کہی بات تھی کہ بغیر اسکالرشپ کے استنبول جیسے مہنگے شہر میں وہ سب اتنا ہی افورڈ کر سکتے تھے۔

وہ تینوں جواہر کے لیے نکل رہے تھے۔ معتصم نے بتایا کہ وہ ابھی حسین سے نظر بچا کر گھڑی خرید لائیں گے۔ ان کو بھی ساتھ چلنے کی پیش کش کی اور ڈی جے ہاں کرنے ہی والی تھی کہ حیا نے اس کا پاؤں اپنے جوتے سے زور سے کچلتے بظاہر مسکراتے ہوئے انکار کر دیا۔

''نہیں! آپ لوگ جائیں، ہم آج ہی ہو کر آئے ہیں۔''

وہ تینوں چلے گئے تو ڈی جے نے برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا۔ ''تم نے انکار کیوں کیا؟''

''پاگل عورت! تم پاکستان سے آئی ہو یا نیویارک سے؟ ان کی دعوت قبول کر لی، یہ ہی بہت ہے۔ اب ہم ان کے ساتھ سیر سپاٹوں پہ بھی نکل جائیں، دماغ ٹھیک ہے؟''

''مگر وہ تو ہمارے بھائیوں کی طرح ہیں۔''

''پیچھے ہمارے اصلی والے بھائیوں کو پتا چلا تو کل ہی پاکستان واپس بلوا لیں گے۔ اس لیے اپنی اوقات میں واپس آؤ اور رات کے کھانے کی تیاری کرو۔'' وہ موبائل کے ساتھ ننھی ہینڈز فری کانوں میں لگاتے ہوئے بولی۔

''زہر ملا کر دوں گی تمہیں۔'' ڈی جے بھناتی ہوئی پیر پٹخ کر اٹھی۔

''اور اگر تم چاولوں پہ آملیٹ ڈال کر لائیں تو میں ساری ڈش تمہارے اوپر الٹ دوں گی۔''

وہ وہیں صوفے پہ لمبی بیٹھی، اب موبائل کے بٹن دبا رہی تھی۔ دھیما میوزک اس کے کانوں میں بجنے لگا۔ ڈی جے غصے میں بہت کچھ کہتی گئی، مگر اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آنکھیں موندے ہولے ہولے پاؤں جھلانے لگی۔

ڈی جے پیر پٹخ کر باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ رات ویلنٹائن کی رات تھی۔ ڈی جے کامن روم میں منعقدہ اس آل گرلز پارٹی میں جا چکی تھی، جو لڑکیوں نے مل کر دی تھی، جبکہ حیا آئینے کے سامنے کھڑی اپنا کاجل درست کر رہی تھی۔ اس کی تیاری مکمل تھی، لیکن جب تک وہ اپنی آنکھوں کے کٹورے کاجل سے بھر نہ لیتی، اسے تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ابھی وہ کاجل کی سلائی کی نوک آنکھ کے کنارے سے رگڑ ہی رہی تھی کہ دروازہ بجا۔

دھیمی سی دستک اور پھر خاموشی۔

اس نے کاجل کی سلائی نیچے کی اور پلٹ کر دیکھا۔

یہ انداز ڈی جے کا تو نہیں تھا۔ وہ یوں ہی کاجل پکڑے آگے بڑھی اور ناب گھما کر دروازہ کھولا۔

باہر بالکونی میں روشنی تھی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، بالکونی تاریک ہو گئی۔ غالباً سیڑھیوں کے اوپر لگا بلب بجھ گیا تھا۔ کیا

کوئی آکر واپس پلٹ گیا تھا؟

''کون؟'' اس نے گردن آگے کر کے راہداری میں دونوں سمت دیکھا۔ ہر سو خاموشی تھی۔ بالکونی ویران تھی۔ وہاں سردی تھی اور اندر کمرا گرم تھا۔

وہ چند ثانیے کھڑی رہی، پھر دھیرے سے شانے اچکا کر پلٹنے ہی لگی تھی کہ.....

''اوہ نہیں!'' اس کے لبوں سے ایک اکتائی ہوئی کراہ نکلی۔

چوکھٹ پہ اس کے قدموں کے ساتھ سفید گلابوں کا بکے اور ایک بند لفافہ رکھا تھا۔ وہ جھکی، دونوں چیزیں اٹھائیں اور جارحانہ انداز میں لفافے کا منہ پھاڑا۔ اندر رکھا چوکور سفید کاغذ نکالا اور چہرے کے سامنے کیا۔

''ہیپی ویلنٹائن ڈے.....فرام یور ویلنٹائن۔''

اس نے لب بھینچ کر تنفر سے وہ تحریر پڑھی اور پھر بے حد غصے سے کاغذ مروڑ کر گلدستے سمیت پوری قوت سے راہداری میں دے مارا۔

''آؤچ!'' وہ واپس مڑنے ہی لگی تھی، جب کسی کی بوکھلائی ہوئی آواز سنی۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

گلدستہ اور کاغذ سیدھے ہاتھ والے کمرے سے نکلتے معتصم کو جا لگے تھے اور اس سے ٹکرا کر اب اس کے قدموں میں پڑے تھے۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ ہکا بکا کھڑا تھا۔

''آئی ایم سوری معتصم!'' وہ شدید بےزاری سے بمشکل ضبط کر کے بولی۔ معتصم کو وضاحت دینے کا سوچ کر ہی اسے کوفت ہونے لگی تھی۔

''یہ میں نے تمہیں نہیں دیے بلکہ کسی فضول انسان نے مجھے بھیجے ہیں۔ تم برا مت ماننا اور ان کو ڈسٹ بن میں ڈال دینا۔'' وہ ایک ہاتھ دروازے پر رکھے، دوسرے میں کاجل پکڑے ذرا رکھائی سے بولی۔

معتصم نے جھک کر وہ کاغذ اٹھایا اور سیدھے ہوتے ہوئے اس کی شکنیں درست کر کے چہرے کے سامنے کیا۔ حیا کو کوفت ہونے لگی۔

''میں کہہ رہی ہوں نا، سوری۔'' وہ جو قدرے بھنویں سکیڑے کاغذ کو دیکھ رہا تھا، چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

''نہیں، اٹس او کے۔ مگر یہ..... تمہیں کوئی سائیکی میں تنگ کر رہا ہے؟'' وہ تحریر پہ نگاہیں دوڑاتے تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

''یہ بات نہیں ہے۔ یہ بہت پہلے سے میرے پیچھے پڑا ہے۔ لمبی کہانی ہے، جانے دو۔ اس کو کوڑے میں پھینک دینا۔ گڈ نائٹ۔''

وہ مزید مروت کا مظاہرہ کیے بغیر دروازے کا کواڑ بند کرنے ہی لگی تھی جب وہ ہولے سے بولا۔

''یہ گیلا کیوں ہے؟ تم روئی ہو؟''

کچھ تھا اس کی آواز میں کہ دروازہ بند کرتی حیا ٹھٹک کر رکی، پھر پٹ نیم وا کیا اور باہر بالکونی میں قدم رکھا۔

''میں کیوں روؤں گی؟'' وہ کاغذ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

معتصم کاغذ کے نچلے دائیں طرف کے کنارے پر انگلی پھیر رہا تھا۔

''پھر یہ گیلا کیوں ہے؟ شاید پھولوں پہ پانی تھا؟''

حیا نے میکانکی انداز میں نفی میں گردن ہلائی۔

''نہیں، یہ تو موٹے لفافے میں مہر بند تھا۔''

معتصم نے وہ نم حصہ ناک کے قریب لے جا کر آنکھیں موندے سانس اندر کو کھینچی۔

''سٹرس؟ لیموں؟ لائم؟'' وہ متذبذب سا حیا کو دیکھنے لگا۔

''کیا کہہ رہے ہو، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''کسی نے اس کے نچلے کنارے پہ لیموں کا رس لگایا ہے۔'' پھر اس نے ذرا چونک کر حیا کو دیکھا۔

''تمہارے پاس ماچس ہے؟''

وہ جواب دیے بنا الٹے قدموں پیچھے آئی اور دروازہ پورا کھول کر ایک طرف ہو گئی۔ معتصم قدرے جھجکا، پھر کاغذ پکڑے اندر داخل ہوا۔

حیانے اپنی اور ڈی جے کی میز کی کرسیاں کھینچ کر آمنے سامنے رکھیں اور پھر ٹالی کی میز پر چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگیں۔

''کیا تم بھی بچپن میں لیموں کے رس اور آگ والا کھیل کھیلتے تھے؟'' وہ اب میز کی دراز کھول کر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

معتصم دھیرے سے ہنسا۔

''بہت کھیل کھیلے ہیں اور ان میں سے اکثر آگ والے ہوتے تھے۔ فلسطین میں بہت آگ ہے، شاید تم نہ سمجھ سکو۔''

''چلو، آج ان ترکوں کے کھیل اسرائیلی آگ سے کھیلتے ہیں۔'' وہ دراز سے ایک سگریٹ لائٹر نکال کر اس کے سامنے کرسی پر آ بیٹھی اور لائٹر اس کی طرف بڑھایا۔

معتصم نے لائٹر کا پہیہ انگوٹھے سے دبا کر گھمایا تو آگ کا نیلا زرد سا شعلہ جل اٹھا۔

''احتیاط سے۔'' وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

معتصم نے جواب نہیں دیا۔ وہ خط کے نم حصے کو، جو ابھی تک نہیں سوکھا تھا، شعلے کے قریب لایا۔ ذرا سی تپش ملی اور الفاظ ابھرنے لگے۔ بڑے بڑے کر کے لکھے انگریزی کے تین حروف۔ ''اے آر پی''

وہ حروف عین ''فرام یور ویلنٹائن'' کے نیچے لکھے تھے۔

وہ دونوں چند لمحے کاغذ کے ٹکڑے پہ ابھرے بھورے حروف کو تکتے رہے، پھر ایک ساتھ گردن اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''آرپ...... ایرپ؟ کیسا لفظ ہے یہ؟'' حیانے ممکنہ ادائیگی کے دونوں طریقوں سے حروف کو ملا کر پڑھا۔

''شاید کوئی نام!''

''کیا آرپ کوئی ترک نام ہے؟''

''معلوم نہیں۔''، معتصم نے شانے اچکا دیے۔

حیا سوچتی نگاہوں سے کاغذ کو تکتی رہی۔

''کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں؟''

اس نے ایک نظر معتصم کو دیکھا، پھر نرم سا مسکرائی۔

''تم کر چکے ہو۔''

وہ ہولے سے مسکرا کر کھڑا ہوا اور کاغذ میز پر رکھا۔

وہ جو بھی ہے، شاید تمہیں اپنا نام بتانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ کون ہو سکتا ہے، یہ تم بہتر سمجھ سکتی ہو گی۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔''

''ہوں۔ تھینک یو معتصم!''

معتصم نے ذرا سی سر کو جنبش دی اور باہر نکل گیا۔

دروازے کا کچھ سست روی سے واپس چوکھٹ تک جانے لگا۔

حیا چند لمحے میز پہ رکھے کنارے سے بھورے ہوئے کاغذ کو دیکھے گئی، پھر بے اختیار کسی میکانکی عمل کے تحت اس نے ہاتھ میں پکڑی کاجل کی سلائی کو سیدھا کیا اور بائیں ہتھیلی کی پشت پہ وہ تین حروف اتارے۔

''اے آر پی''

دروازہ چوکھٹ کے ساتھ لگنے ہی والا تھا۔ ذرا سی درز سے باہر راہداری میں گرا گلدستہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک دو پل مزید گزرے اور زوردار ''ٹھاہ'' کی آواز کے ساتھ دروازہ بند ہو گیا۔

وہ اپنی ہتھیلی کی پشت پہ سیاہ رنگ میں لکھے وہ تین الفاظ دیکھ رہی تھی۔

"اے آر پی....."

☆ ☆ ☆

اس نے اوپر بنے کیبنٹ کا دروازہ کھولا۔ چند ڈبے الٹ پلٹ کیے۔ نچلے خانے میں سرخ مرچوں کا ڈبا نہیں تھا۔ وہ ایڑیاں اٹھا کر ذرا سی اونچی ہوئی اور اوپر والے خانے میں جھانکا۔ وہاں سامنے ایک پلاسٹک کے بے رنگ ڈبے میں سرخ پاؤڈر رکھا نظر آ رہا تھا۔

اس نے ڈبا نکالا اور کاؤنٹر کی طرف آئی۔ وہاں ڈی جے کھڑی، سلیب پہ کٹنگ بورڈ کے اوپر پیاز رکھے کھٹا کھٹ کاٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

"بریانی کی مقدار زیادہ ہے، چار چمچ سرخ مرچ کے ڈال دیتی ہوں، شاید ذرا سا ذائقہ آ جائے۔ ٹھیک؟" وہ خود کلامی کے انداز میں کہتی ٹوکری سے چھوٹا چمچ ڈھونڈنے لگی۔

"ہاں ٹھیک!" ڈی جے نے بھیگی آنکھیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے رندھی آواز میں کہا اور آستین سے آنکھیں رگڑیں۔

حیا اب ڈبے سے چمچ بھر بھر کر دھوئیں اڑاتے پتیلے میں ڈال رہی تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا اس کے پیچھے گردن پہ جھول رہا تھا۔ سادہ شلوار قمیص پہ وہ ڈھیلا ڈھالا سا سبز سوئٹر پہنے ہوئے تھی، جس کی آستینیں اس نے کہنیوں تک موڑ رکھی تھیں۔ دوپٹا ایک طرف دروازے پہ لٹکا تھا اور چند لٹیں جوڑے سے نکل کر چہرے کے اطراف میں لٹک رہی تھیں۔ گوشت میں چمچہ ہلاتی وہ بہت مصروف لگ رہی تھی۔

وہ دونوں اس وقت انجم باجی کے کچن میں موجود تھیں۔ صبح انجم باجی ڈی جے کو ڈائننگ ہال میں ملیں تو شام اپنے گھر کھانے کی دعوت دے ڈالی، جو کہ ڈی جے نے یہ کہہ کر قبول کر لی کہ وہ اور حیا مل کر بریانی بنائیں گی۔ اب سرِ شام ہی وہ دونوں ہالے کو لیے انجم باجی کے اپارٹمنٹ آ گئی تھیں۔

ایک بیڈ روم، لاؤنج اور کچن پہ مشتمل وہ چھوٹا مگر بے حد نفیس اور سلیقے سے سجا اپارٹمنٹ تھا۔ ہالے کو انہوں نے لاؤنج میں انجم باجی کے ساتھ بیٹھا رہنے دیا اور خود کچن میں آ کر کام میں مصروف ہو گئیں۔

"یہ پینٹنگ جوید جی لائے تھے انڈیا سے۔" اندر لاؤنج میں انجم باجی کی ہالے کو مطلع کرتی آواز آ رہی تھی۔

"ڈی جے! یہ جوید جی کیا ہے؟" اس نے قدرے الجھ کر پوچھا۔

"ان کا مطلب ہے، جاوید جی۔ ان کے ہزبینڈ!" ڈی جے نے سرگوشی کی تو وہ 'اوہ' کہہ کر مسکراہٹ دباتی پلٹ کر ابلتے چاولوں کو دیکھنے لگی۔

جس وقت انجم باجی اور ہالے کچن میں داخل ہوئیں، حیا پتیلے کا ڈھکن احتیاط سے بند کر رہی تھی۔ آہٹ پہ پلٹی اور مسکرائی۔

"بس دم دے رہی ہوں۔"

"بہت خراب ہو تم دونوں، مجھے اٹھنے ہی نہیں دیا۔"

"بس اب آپ کو کھانے کے وقت ہی اٹھانا تھا۔ وہ جوید..... جاوید بھائی آ گئے؟" وہ ہاتھ دھو کر تولیے سے صاف کرتی ڈی جے کے پاس آئی۔

ڈی جے کا سلاد ابھی تک مکمل نہیں ہوا تھا۔ اب کہیں جا کر وہ ٹماٹروں پہ پہنچی تھی۔

"بس آنے والے ہیں۔ لاؤ! یہ سلاد تو مجھے بنانے دو۔"

"نہیں! میں کر لوں گی۔ تھوڑا سا رہ گیا ہے۔" ڈی جے نے بڑی بے فکری سے کہا تو اس نے اسے جتاتی نظروں سے گھورا۔

"آپ نے اس تھوڑے میں بھی صبح کر دینی ہے، لاؤ مجھے دو، اور پلیٹیں لگاؤ۔" اس نے ٹماٹر اور چھری ڈی جے کے ہاتھ سے لے لی۔

ہالے از خود نہایت پھرتی سے سارا پھیلاوا سمیٹنے میں لگی تھی۔ وہ میلے برتن اب سنک میں جمع کر رہی تھی۔ وہ ان کبھی کبھی کام کرنے والی دونوں پاکستانی لڑکیوں کی نسبت بہت تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔

ڈی جے کیبنٹ سے پلیٹیں نکالنے لگی اور انجم باجی رائتہ بنانے لگیں۔

حیا نے ٹماٹر کو کٹنگ بورڈ پہ بائیں ہاتھ سے پکڑ کر رکھا اور چھری رکھ کر دبائی۔ دو سرخ ٹکڑے الگ ہو گئے اور ذرا سا سرخ رس اس کی بائیں ہتھیلی کی پشت پہ بہہ گیا، جہاں کاجل سے لکھے تین مٹے مٹے سے حروف تھے۔

اے.....آر.....پی

وہ دو تین روز سے اسی "اے آر پی" کے متعلق سوچے جا رہی تھی، اب بھی کچھ سوچ کر اس نے گردن اٹھائی۔

"انجم باجی!"

ڈش کو کانٹے سے پھینٹتیں انجم باجی نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

"آپ نے کسی "ارپ" کے متعلق سنا ہے؟"

"ارپ؟" انجم باجی نے حیرت بھری الجھن سے دوہرایا۔

"جی، ارپ۔ اے آر پی۔" اس نے وضاحت کے لیے ہجے کر کے بتایا۔

"اوہ ناٹ اگین حیا!" ہالے جو سنک کے آگے کھڑی تھی، قدرے اکتا کر پلٹی۔ اس کے ہاتھ میں جھاگ بھرا اسفنج تھا جسے وہ پلیٹ پہ مل رہی تھی۔

"تم پھر وہی موضوع لے کر بیٹھ گئی ہو؟" اس کے انداز میں خفگی بھرا احتجاج تھا۔

"مگر ہالے....." اب کے وہ الجھی تھی۔ یہ موضوع تو اس نے ابھی تک ہالے کے ساتھ ڈسکس نہیں کیا تھا، پھر.....؟

"میں نے کہا تھا نا، یہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔"

"مگر میں نے پوچھا ہی کیا ہے؟"

"اے آر پی۔ عبدالرحمان پاشا اور کون؟ میں نے بتایا تھا کہ یہ گھریلو عورتوں کے افسانے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ یہ استنبول ہے، یہاں قانون کا راج ہے، مافیا کا نہیں۔ اب اس کے بعد میں اس موضوع پہ کچھ نہیں سنوں گی۔"

ہالے اب پلٹ کر جھاگ سے بھری پلیٹ کو پانی سے کھنگال رہی تھی اور وہ..... وہ حیرتوں کے سمندر میں گھری کھڑی تھی۔

اے آر پی..... عبدالرحمان پاشا..... اوہ..... یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟

"او کے او کے!" وہ بظاہر سر جھکائے ٹماٹر کاٹنے لگی مگر اس کے ذہن میں بہت سے خیال گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ہالے اور جہان دونوں ایک جیسے تھے اور اپنے استنبول کے دفاع کے علاوہ بھی کچھ نہیں کہیں گے، اسے یقین تھا، مگر کسی کے پاس تو کچھ کہنے کے لیے ہوگا اور اسے اس "کسی" کو ڈھونڈنا تھا۔

وہ میز لگا رہی تھی جب جاوید بھائی آ گئے۔

وہ بھی پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور سبانجی میں پڑھاتے بھی تھے۔ بے حد ملنسار، سادہ اور خوش اخلاق سے دیسی مرد تھے۔ پرانے پاکستانی ڈراموں کے شوقین اور پرستار۔ ٹی وی کے ساتھ ریک میں ان کہی، تنہائیاں، دھوپ کنارے، آنگن ٹیڑھا، الف نون سمیت بہت سے کلاسک ڈراموں کی ڈی وی ڈیز قطار میں سجی تھیں۔ ان دونوں میاں بیوی کا ایک دوسرے کے لیے طرزِ تخاطب بہت دلچسپ تھا۔ "جوید جی" اور "انجو جی"۔ اسے بہت ہنسی آئی۔ باقی تینوں کچن میں تھیں، جب حیا پانی رکھنے میز پہ آئی تو جاوید بھائی کو تنہا بیٹھے پایا۔ وہ کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہے تھے۔

"جوید..... جاوید بھائی!" وہ گڑبڑا کر تصحیح کرتی ان کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھی اور محتاط نگاہوں سے کچن کے دروازے کو دیکھا۔

"ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔"

"جی جی۔ پوچھیے۔" وہ فوراً کتاب رکھ کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"استنبول میں ایک انڈین مسلم رہتا ہے عبدالرحمان پاشا نام کا۔ آپ اسے جانتے ہیں؟" وہ محتاط سی کرسی کے کنارے ٹکی بولتے

ہوئے بار بار کچن کے دروازے کو بھی دیکھ لیتی۔

کون پاشا؟ وہ بیوک ادا والا؟''

اور حیا کو لگا، اسے اس کے جواب ملنے والے ہیں۔

''جی جی وہی۔ وہ خاصا مشہور ہے۔''

''ہاں سنا تو میں نے بھی ہے۔ بیوک ادا میں اس کا کافی ہولڈ ہے۔ وہ مال امپورٹ ایکسپورٹ کرتا ہے۔''

''کیا وہ مافیا کا بندہ ہے؟ اسلحہ اسمگل کرتا ہے۔؟''

''ایک پروفیسر کو مافیا کے بارے میں کیا معلوم ہوگا حیا جی؟'' وہ کھسیاہٹ سے مسکرائے۔

''یعنی کہ وہ واقعی مافیا کا بندہ ہے اور آپ کو معلوم بھی ہے، مگر آپ اعتراف نہیں کرنا چاہ رہے۔'' اس نے اندھیرے میں تیر چلانا چاہا۔

''میں ٹھیک سے کچھ نہیں جانتا۔'' انہوں نے سادگی سے ہتھیار ڈال دیے۔

دفعتاً کچن سے انجم باجی کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ جو کرسی کے کنارے پہ ٹکی تھی، گھبرا اٹھی اور کچن کی طرف لپکی۔

''کیا ہوا؟''

انجم باجی سرخ بھبھوکا چہرہ اور آنکھوں میں پانی لیے کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں خالی چمچہ تھا۔

''مرچیں...... اتنی مرچیں حیا!''

''نن نہیں۔ یہ ترکی کی مرچیں پھیکی ہوتی ہیں تو میں نے صرف چار چمچے......''

''چار چمچے؟'' ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''یہ ترکی کی نہیں، خالص ممبئی کی مرچیں ہیں، میں سارے مسالے وہیں سے لاتی ہوں۔''

''اوہ نہیں!'' اس نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا، جبکہ ڈی جے ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

سردی کا زور پہلے سے ذرا ٹوٹا تھا۔ اس صبح بھی سنہری سی دھوپ تاقسم اسکوائر پہ بکھری تھی۔ مجسمہ آزادی کے گرد ہر سو سونے کے ذرات چمک رہے تھے۔ وہ دونوں سست رروی سے سڑک کے کنارے چل رہی تھیں جب ڈی جے نے پوچھا۔

''حیا...... یہ تاقسم، نام کتنے مزے کا ہے اس کا مطلب کیا ہوا بھلا؟''

''میں شہری کی میئر ہوں، جو مجھے پتا ہوگا؟''

''نہیں، وہ میری گائیڈ بک میں لکھا تھا کہ تاقسم عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی شاید بانٹنے کے ہیں، کیونکہ یہاں سے نہریں نکل کے سارے شہر میں بٹ جاتی تھیں۔ تمہیں عربی آتی ہے۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔''

''عربی میں تو تاقسم نام کا کوئی لفظ نہیں ہے، اور عربی میں بانٹنے کو تقسیم کہتے ہیں۔'' وہ ایک دم رکی اور بے اختیار سر پہ ہاتھ مارا۔

''اوہ تاقسم یعنی تقسیم۔ اگر گوروں کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے پڑھو تو تقسیم، تاقسیم یا تاقسم بن جاتا ہے۔''

''تاقسم...... اواؤ'' وہ دونوں اس بات پہ خوب ہنستی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ وہ شاپنگ کے ارادے سے آج استقلال اسٹریٹ کی طرف آئی تھیں۔

استقلال جدیسی Istiklal Caddesi (اسٹریٹ) تاقسم کے قریب سے نکلنے والی ایک لمبی سی گلی تھی۔ وہ گلی دونوں اطراف سے قدیم آرکیٹیکچر والی اونچی عمارتوں سے گھری تھی۔ گلی بے حد لمبی تھی، وہاں انسانوں کا ایک رش ہمیشہ چلتا دکھائی دے رہا ہوتا۔ بہت سے سامنے جا رہے ہوتے اور بہت سے آپ کی طرف آ رہے ہوتے۔ ہر شخص اپنی دھن میں تیز تیز قدم اٹھا رہا ہوتا۔

گلی کے درمیان ایک پٹری بنی تھی، جس پہ ایک تاریخی سرخ رنگ کا چھوٹا سا ٹرام چلتا تھا۔ وہ پیدل انسان کی رفتار سے دگنی رفتار سے چلتا اور گلی کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچا دیتا۔ اس گلی کو ختم کرنے کے لیے بھی گھنٹہ تو چاہیے تھا۔

وہاں دونوں اطراف میں دکانوں کے چمکتے شیشے اور اوپر قمقمے لگے تھے۔ بازار، نائٹ کلبز، ریسٹورنٹس، کافی شاپس، ڈیزائنر ویئر،

غرض ہر برانڈ کی دکانیں وہاں موجود تھیں۔ چند روز پہلے وہ ادھر آئیں تو صرف ونڈو شاپنگ میں ہی ڈھائی گھنٹے گزر گئے، اور تب بھی وہ استقلال جدیسی کے درمیان پہنچی تھیں، سو تھک کر واپس ہو لیں۔

"حیا! تم نے دیکھا، استقلال اسٹریٹ جیسے ماڈرن علاقے میں بھی ہر تھوڑی دور بعد پر بیر ہال ضرور ہے۔"

"بڑے نیک ہیں بھئی ترک!" وہ قدرے طنزیہ ہنسی اور پھر متلاشی نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ استقلال اسٹریٹ آنے کا اصل مقصد جہان سے ملنا تھا، اور وہ صرف اس لیے یہاں آئی تھی کہ برگر کنگ جائے اور "میں یہاں سے گزر رہی تھی تو سوچا" کہہ کر اس سے ملاقات کا بہانہ ڈھونڈ لے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے چل رہی تھیں۔ وہاں ہوا تیز تھی اور حیا کے کھلے بال اڑ اڑ کر اس کے چہرے پہ آ رہے تھے۔ وہ بار بار کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکالتی اور انہیں کانوں کے پیچھے اڑستی۔ تب ہی اس نے برگر کنگ کا بورڈ دیکھا تو ڈی جے کو بتائے بنا ریسٹورنٹ کے دروازے تک آئی اور اس سے پہلے کہ وہ دروازے پہ ہاتھ رکھتی، دروازہ اندر سے کھلا اور کوئی باہر نکلا۔ وہ بے اختیار ایک طرف ہوئی۔ وہ جہان تھا، وہ اسے پہچان گئی تھی مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔

وہ اس کے سامنے سے آتا ساتھ سے نکل کر گزر گیا تو وہ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ ڈی جے نے اسے رکتے نہیں دیکھا تھا، وہ اپنی دھن میں دکانوں کو دیکھتی چلتی گئی اور لوگوں کے ریلے میں آگے بہہ گئی۔

حیا یونہی اپنے گھٹنوں تک آتے سیاہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ ہوا کے رخ پہ کھڑی تھی، تو اس کے بال پیچھے کی طرف اڑنے لگے تھے۔

جہان اس سے دور جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دراز قد لڑکی بھی تھی۔ کوٹ اسکرٹ میں ملبوس اپنے سرخ بالوں کو اونچے جوڑے میں باندھے، وہ لڑکی ناگواری سے ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہی تھی۔

جہان نے اسے نہیں دیکھا، اسے یقین تھا۔ وہ دوڑ کر ان کے پیچھے گئی۔ وہ دونوں بہت تیز چل رہے تھے۔ ان کی رفتار سے ملنے کی سعی میں وہ ایشیائی لڑکی ہانپنے لگی تھی، بمشکل وہ ان کے عین عقب میں پہنچ پائی۔

لڑکی بلند آواز میں نفی میں سر ہلاتی کچھ کہہ رہی تھی۔ جہان بھی خاصا جھنجلایا ہوا جواباً بحث کر رہا تھا۔ وہ ترک بول رہے تھے، یا کوئی دوسری زبان، وہ فیصلہ نہ کر پائی۔ شاید ترک نہیں تھی۔ وہ بہت لمبے لمبے فقرے بول رہے تھے اور جتنی ترک حیا نے اب تک سنی تھی، وہ ایسی نہیں تھی۔ ترک میں فقرے چھوٹے ہوتے تھے۔ بس فعل استعمال کیا اور اس کے آگے پیچھے سابقے لاحقے لگا لگا کر ایک بڑا لفظ بول دیا جو معنی میں کئی فقروں کے برابر ہوتا تھا۔

"جہان...... جہان......" وہ شور اور رش میں بمشکل اتنی آواز سے اسے پکار پائی کہ وہ سن سکے۔ اس کی تیسری پکار پہ وہ رکا۔ لڑکی بھی ساتھ ہی رکی۔ وہ دونوں ایک ساتھ پلٹے۔

"جہان......" اس کے ہونٹ جہان کو دیکھ کر ایک معصوم مسکراہٹ میں ڈھلنے لگے تھے۔

"کیا مسئلہ ہے؟" اس نے سنجیدہ، اکھڑے اکھڑے انداز میں ابرو اٹھائے۔ اس کے چہرے پر اتنی سختی اور ناگواری تھی کہ حیا کے مسکراہٹ میں کھلتے لب بند ہو گئے۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"میں......حیا......" وہ بے یقینی سے بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے شک گزرا کہ جہان نے اسے نہیں پہچانا۔

"ہاں تو پھر؟" وہ بھنویں سکیڑ کے بولا۔

وہ لڑکی کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی ناپسندیدگی سے حیا کو دیکھ رہی تھی۔

"پھر؟" حیا نے بے یقینی سے زیر لب دہرایا۔ وہ ششدر سی جہان کو دیکھ رہی تھی۔

"کوئی کام ہے؟" وہ بمشکل ضبط کر کے بولا۔

حیا نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس میں بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

''تو میری شکل کیا دیکھ رہی ہو؟ جاؤ!'' وہ شانے جھٹک کر پلٹا۔لڑکی بھی ایک اچٹتی نگاہ اس پہ ڈال کر مڑ گئی۔
استقلال اسٹریٹ پہ لوگوں کا ریلا آگے بڑھتا گیا۔ جہان سکندر اور اس لڑکی کے پیچھے بہت سے لوگ اس سمت جا رہے تھے۔ کتنی ہی دیر وہ ساکت کھڑی بہت سے سروں کی پشت کے درمیان اور ان دونوں کو دور جاتے دیکھتی رہی۔ اس کی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔
ان دونوں کے سراپے ہجوم میں گم ہو رہے تھے۔ وہ دو نقطے بنتے جا رہے تھے۔ مدھم...... دور...... بہت دور......
''حیا...... حیا......'' ڈی جے کہیں دور اتھل پتھل سی سانسوں کے درمیان چلا رہی تھی، مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ اسی طرح بھیڑ کے درمیان پتھر ہوئی کھڑی اسی سمت دیکھ رہی تھی۔ وہ بہت دور جا چکے تھے۔ ساکت پتلیوں میں اب درد ہونے لگا تھا۔ بالآخر بوجھ سے اس کی پلکیں گریں اور جھک کر اٹھیں تو منظر بھیگ چکا تھا۔ اس نے پھر سے پلکیں جھپکائیں تو بھیگی آنکھوں سے قطرے رخساروں پہ گرنے لگے۔ سامنے کا منظر قدرے واضح ہوا مگر......
لمحے بھر کی تاخیر سے اس کا تعاقب ہار گیا تھا۔ وہ دونوں بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ وہ اپنا منظر کھو چکی تھی۔
آنسو ٹپ ٹپ اس کی ٹھوڑی سے نیچے گردن پہ لڑھکتے گئے۔
''حیا...... کدھر رہ گئیں تھیں تم؟'' ڈی جے نے نڈھال سی آ کر اس کا شانہ جھنجھوڑا۔ اس کا سانس پھول چکا تھا اور وہ ہانپ رہی تھی۔
''میں کہیں بہت پیچھے رہ گئی ہوں ڈی جے!'' وہ اسی سمت دیکھتے ہوئے بڑبڑائی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے ایک ہاتھ سے اوون کا ڈھکن کھولا دوسرے ہاتھ سے گرم ٹرے باہر نکالی۔
ٹرے پہ بھوری، خستہ گرما گرم جنجر بریڈ تیار پڑی تھی۔ ادرک کی ہلکی سی خوشبو سارے کچن میں پھیلی تھی۔
وہ دوسرے ہاتھ سے جنجر بریڈ کو چیک کرتی سیدھی ہوئی اور ٹرے لا کر کاؤنٹر پہ رکھی۔ وہ سفید ڈھیلی سی آدھے بازوؤں والی ٹی شرٹ اور کھلے سیاہ ٹراؤزر میں ملبوس تھی۔ بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا گردن پہ پڑا تھا اور ادھر ہی لٹیں گالوں کو چھو رہی تھیں۔ ٹی شرٹ کے اوپر پہنے ایپرن پہ جگہ جگہ چاکلیٹ اور کریم کے دھبے لگے تھے۔
معتصم کاؤنٹر کے ایک طرف کھڑا پیالے میں انڈے کی سفیدی پھینٹ رہا تھا۔ ڈی جے دوسری طرف کھڑی سجاوٹ کے لیے لی گئیں بنٹی bunties، جیلی اور رنگ برنگے بینز beans کے پیکٹ کھول کھول کر پلیٹ میں انڈیل رہی تھی۔ ہر رنگ کے بینز، کینڈیز اور سرخ جیلی بینز کا ڈھیر لگ چکا تھا۔
آج حسین کی سالگرہ تھی۔ روایتی طریقے سے کیک بنانے کی بجائے حیا اس کے لیے جنجر بریڈ ہاؤس تیار کر رہی تھی۔ ایک فٹ اونچا جنجر بریڈ سے بنا گھر جو چاکلیٹ، کریم اور رنگ برنگی جیلیز سے سجانا تھا۔ وہ پچھلے چار گھنٹے سے لگی ہوئی تھی، اور اب بالآخر اس کی جنجر بریڈ کے چھ کے چھ ٹکڑے بیک ہو چکے تھے۔ چار دیواروں کے لیے اور دو مخروطی چھت کے لیے۔
''آؤ! اب اس کو جوڑتے ہیں۔'' اس نے کہا تو معتصم جو آئسنگ بنا چکا تھا، پیالہ رکھ کر اس کی طرف آیا۔ ڈی جے اب ایک دیوار اٹھا کر اس میں سے مستطیل دروازہ کاٹ رہی تھی۔
حیا اور معتصم نے احتیاط سے دو دیواریں متصل کھڑی کیں اور ان کے جوائنٹ پہ، بطور گم، مخصوص سیرپ لیپ دیا۔ پھر بہت آہستہ سے دونوں نے اپنے ہاتھ ہٹائے۔
دیواریں سیدھی کھڑی رہیں۔ سیرپ نے ان کو چپکا دیا تھا۔
''زبردست!'' وہ پرجوش سی ہو گئی۔ اس کا گھر بن رہا تھا، یہ خیال ہی اس کی ساری تھکاوٹ بھگا کر لے گیا۔
وہ دونوں اب اگلی دیوار جوڑنے لگے۔ حیا کے ماتھے سے جھولتی لٹ بار بار آنکھوں کے سامنے آتی، وہ بار بار ہاتھ سے اسے پیچھے ہٹاتی۔ پوروں پہ لگے چاکلیٹ سیرپ کے دھبے اس کے رخسار پہ لگ گئے مگر پروا کسے تھی۔
چار دیواری بن گئی تھی۔ اب انہوں نے دو مستطیل ٹکڑوں کو اوپر الٹے ''وی'' کی طرح رکھا اور جوڑ پر سیرپ لگایا۔ کافی دیر بعد

انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھائے۔

چھت برقرار رہی۔ سیرپ سوکھنے لگا تھا۔ چھت مزید مضبوط ہوتی گئی۔

"حیا! تم گریٹ ہو۔" وہ بھورا سا گھر بنا رنگ یا آرائش کے بھی اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ معتصم بے اختیار ستائش سے بولا۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

وہ تینوں اب الابلا کینڈیز، بٹنیز، اور جیلیز سے دیواروں کی سجاوٹ کرنے لگے۔ وہ ہر ڈیکوریشن کے ٹکڑے کے پیچھے ذرا سا سیرپ لگا کر اسے دیوار سے چپکا دیتے۔ بھورے گھر پہ جگہ جگہ سرخ سبز اور نیلے بٹن کی مانند آنکھیں ابھرنے لگی تھیں۔ ذرا سی دیر میں گھر سج گیا تھا۔ ڈی جے نے سفید کریم سے کھڑکیوں کی چوکور چوکھٹیں بنائیں اور اندر نیلی کریم کا رنگ بھر دیا۔

"اب استنبول کی برف باری کا مزا اپنے گھر کو بھی چکھائیں۔"

حیا آئسنگ شوگر اور چھلنی لے آئی۔ اس نے سفید سوکھے آٹے کی شکل کی آئسنگ شوگر چھلنی میں ڈالی اور گھر کے اوپر کر کے چھلنی آہستہ آہستہ ہلانے لگی۔ چھلنی کے سوراخوں سے سفید ذرے نیچے گرنے لگے۔ بھورے گھر پہ برف باری ہونے لگی اور ایک ہلکی سی سفید تہہ چاکلیٹ سے ڈھکے گھر پہ بیٹھنے لگی۔

حیا کا "جنجر بریڈ ہاؤس" GingerBread House تیار تھا۔

اس نے احتیاط سے ٹرے اٹھائی۔ گھر برقرار رہا۔ وہ اس کی ساڑھے چار گھنٹوں کی محنت کا ثمر تھا۔ کسی سالگرہ کی تقریب سے پہلے حیا سلیمان تک سک سے تیار نہ ہو، حیرت انگیز بات تھی، مگر آج اس کی تیاری وہ گھر ہی تھا۔ اسے اپنے رف حلیے ایپرن اور چہرے پہ لگے دھبوں کی پروا نہیں تھی۔ اس کی ساری توجہ ٹرے میں رکھے جنجر بریڈ ہاؤس پہ تھی۔

وہ ڈی جے اور معتصم کے پیچھے چلتی کامن روم میں داخل ہوئی۔

وہاں فاصلے فاصلے پہ گول میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ درمیانی میز پہ گفٹس اور حسین کا لایا ہوا کیک رکھا تھا۔ بارہ ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس آ چکے تھے۔ وہ کوئی سرپرائز پارٹی نہ تھی۔ سو حسین بڑی میز کے پیچھے کھڑا ہنستا ہوا تالی کا گفٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا، جسے تالی بار بار پیچھے کر رہی تھی۔

"سرپرائز!" حیا نے پکارا تو سب نے ادھر دیکھا۔

معتصم اور ڈی جے کے پیچھے وہ چوکھٹ پہ کھڑی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں اٹھائی ٹرے میں وہ فیری ٹیل ہاؤس رکھا تھا، اور حیا کو پتا تھا، وہ ہنسل اور گریٹل کے جنجر بریڈ ہاؤس سے زیادہ خوب صورت تھا۔

"واؤ!" بے اختیار بہت سے لبوں سے ستائش نکلی۔

"حیا..... تم نے میرے لیے اتنا کیا؟" حسین بے حد متاثر ہوا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے شانے اچکائے۔

وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ دروازہ آدھا کھلا تھا اور سردی اندر آ رہی تھی۔

"آؤ حیا! اسے میز پہ لے آؤ۔" معتصم بڑی میز پہ گفٹس، کیک اور دوسری ڈشز کے درمیان چیزیں ہٹا کر جگہ بنانے لگا۔

سردی کی لہر دروازے سے اندر گھس رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ٹرے پکڑے، دایاں ہاتھ بڑھا کر دروازہ دھکیلنا چاہا۔ وہ بدقسمتی کا لمحہ تھا۔

دروازے کے ناب کو اس نے چھوا ہی تھا کہ دروازہ زور سے پورا کھلا اور کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ کھلتے دروازے نے اس کا بڑھا ہاتھ پیچھے دھکیلا اور وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹی اور تب ہی اس کے بائیں ہاتھ میں پکڑی ٹرے ٹیڑھی ہوئی۔

"اوہ..... نو!" بہت سی دلدوز چیخیں بلند ہوئیں اور ان میں سب سے دل خراش اس کی اپنی چیخ تھی۔

الٹی ہوئی ٹرے اس کے ہاتھ میں رہ گئی۔ ہلکی سی ٹھک کی آواز کے ساتھ جنجر بریڈ ہاؤس زمین پہ جا گرا۔ ہر دیوار ٹکڑوں میں بٹ

گئی۔ بٹیز اور جیلز اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔

فرش پہ بریڈ، چاکلیٹ، کریم اور رنگ برنگی ہنٹیوں کا ایک ملبہ پڑا تھا اور وہ سب سناٹے کے عالم میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھے۔

کتنے ہی پل وہ شاک کے عالم میں اس ملبے کو دیکھے گئی، پھر اس کے پار نظر آتے جوگرز کو دیکھا اور اپنی ششدر نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

وہ جہان سکندر تھا، اور اتنی ہی بے یقینی و شاک سے اس ملبے کو دیکھ رہا تھا۔ حیا کے دیکھنے پہ بے اختیار اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''حیا..... آئی ایم سوری۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم سامنے..... اوہ گاڈ.....'' تاسف، ملال کے مارے وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

وہ جو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی، ایک دم لب بھینچ گئی۔ اس کی آنکھوں میں تحیر کی جگہ غصے نے لے لی۔ خون کی سرخ لکیریں اس کی آنکھوں میں اترنے لگیں۔ وہ ایک دم جھکی، بریڈ کا ٹوٹا، کریم میں لتھڑا ٹکڑا اٹھایا اور سیدھے ہوتے ہوئے پوری قوت سے جہان کے منہ پہ دے مارا۔

وہ اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کریم میں لتھڑا ٹکڑا اس کی گردن پہ لگا تو وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹا۔ ٹکڑا اس کی شرٹ پر سے پھسلتا نیچے قدموں میں جا گرا۔

اس نے گردن پہ لگی کریم کو ہاتھ سے چھوا اور پھر انگلیوں کے پوروں کو بے یقینی سے دیکھا۔

''حیا! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔''

وہ سرخ آنکھوں سے لب بھینچے جہان کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے لب اتنی سختی سے بھینچ رکھے تھے کہ گردن کی رگیں ابھرنے لگی تھیں اور کنپٹی پہ نیلی لکیر نظر آ رہی تھی۔ وہ بالکل چپ کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

''حیا..... اٹس او کے.....'' حسین پریشانی سے آگے بڑھا۔ ڈی جے اور معتصم اس کے ساتھ تھے۔

''حیا! میں نے واقعی نہیں دیکھا تھا کہ تم.....''

''شٹ اپ۔ جسٹ شٹ اپ!'' وہ اتنی زور سے چلائی کہ آگے بڑھتا حسین وہیں رک گیا۔

''چلے جاؤ تم یہاں سے۔ کہیں بھی چلے جاؤ مگر میری زندگی سے نکل جاؤ۔ تم میرے لیے عذاب اور دکھ کے علاوہ کبھی کچھ نہیں لائے۔ نکل جاؤ اس کمرے سے۔'' اس نے اردو میں چلا کر کہا تھا۔ بارہ ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس میں سے اردو کوئی نہیں سمجھتا تھا سوائے ڈی جے کے، مگر وہ تمام متاسف کھڑے طلبا سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''حیا.....!'' جہان کی آنکھوں میں دکھ ابھرا۔

''میرا نام بھی مت لو۔'' اس نے گردن کے گرد بندھے ایپرن کی ڈوری ہاتھ سے نوچی، ایپرن ایک طرف اتار پھینکا اور بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

سیڑھیوں کے اوپر لگا بلب اس کے آتے ہی جل اٹھا تھا۔ وہ تیزی سے چکردار سیڑھیاں اترنے لگی۔ آنسو اس کے چہرے پہ بہہ رہے تھے۔ آخری سیڑھی پھلانگ کر وہ اتری اور برف سے ڈھکی گھاس پہ تیز تیز چلنے لگی۔

باہر تیز سرد ہوا تھی۔ ہلکا ہلکا سا کہر ہر سو چھایا تھا۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے، سر جھکائے روتی ہوئی چلتی جا رہی تھی اور اسے پتا تھا کہ وہ ایک جنجر بریڈ ہاؤس کے لیے نہیں رو رہی۔

پہاڑی کی ڈھلان اتر کر سامنے سبانجی کی مصنوعی جھیل تھی۔ جھیل اب خاصی پگھل چکی تھی، پھر بھی فاصلے فاصلے پہ بڑے بڑے برف کے ٹکڑے تیرتے نظر آ رہے تھے۔

وہ جھیل کے کنارے رک گئی۔ تیز دوڑنے سے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ پتلی ٹی شرٹ میں سردی لگنے لگی تھی۔ ڈھیلا جوڑا آدھا کھل کر کمر پہ گر گیا تھا۔

وہ تھکی ماندی سی گھاس پہ بیٹھ گئی اور سلیپرز سے پاؤں نکال کر ٹھنڈے پانی میں ڈال دیے۔ وہ خود اذیتی کی انتہا تھی۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر سر نیچے جھکا کر وہ ایک دم سے بہت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مصنوعی جھیل کا پانی رات کے اندھیرے میں چاند کی روشنی سے چمک رہا تھا، گویا چاندی کا ایک بڑا سا ورق سیاہ پانی پہ تیر رہا ہو۔ دور جنگل سے پرندوں کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دیتی تھی۔ کئی لمحے ریت کی طرح پھسل کر جھیل کی چاندی میں گم ہو گئے تو اس نے قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی اس کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔

اس نے بھیگا چہرہ اٹھا کر دیکھا۔

وہ جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لب کاٹتا سنجیدہ سا اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

"سوری حیا! میں تو معذرت کرنے آیا تھا کہ اس روز کام کی پریشانی میں تم سے مس بی ہیو کر گیا مگر......" وہ چپ چاپ بے آواز روتی اسے دیکھے گئی۔

"آئی ایم رئیلی سوری...... میں نے تمہارا اتنا نقصان کر دیا۔ میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم دروازے کے پار کھڑی ہو۔ میں نے تمہارا بڑھا ہوا ہاتھ نہیں دیکھا تھا۔ اپنی دانست میں میں بہت تیز چل رہا تھا اور انجانے میں تمہارا ہاتھ دھکیل دیا۔ تمہاری ساری ریاضت ضائع کر دی۔"

شاید وہ صرف جنجر بریڈ ہاؤس کی بات کر رہا تھا، یا شاید ان کے تعلق کی۔ وہ ابھی کچھ بھی صحیح یا غلط سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔

"مگر میں مداوا کر دوں گا۔"

"مداوا؟" اس کے بہتے آنسو پل بھر کو تھمے۔

"ہاں! میں تمہیں بالکل ایسا جنجر بریڈ ہاؤس بنا کر لا دوں گا۔"

اور اس کا دل چاہا، وہ پھوٹ پھوٹ کر پھر سے رو دے۔

"مائی فٹ جہان سکندر!" وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور گیلے پیر پانی سے نکال کر سلیپرز میں ڈالے۔ "میری زندگی میں جنجر بریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل ہیں۔"

وہ تیزی سے پلٹی تو ڈھیلے جوڑے کا آخری بل بھی کھل گیا اور سارے بل آبشار کی طرح کمر پہ سیدھے گرتے گئے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اوپر ڈھلان پہ چڑھنے لگی۔

جہان لب کاٹتا اسے دور جاتے دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

وہ تکیے سے ٹیک لگائے، پاؤں لمبے کیے، کمبل میں لپٹی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے موبائل تھامے وہ گیم کھیل رہی تھی۔

ساتھ والے بینک پہ ٹالی منہ پہ تکیہ رکھے سو رہی تھی۔ چیری اسٹڈی روم میں تھی۔ خدیجہ نیچے اپنے بینک کی کرسی پر بیٹھے میز پہ رکھے لیپ ٹاپ کی کنجیوں پہ انگلیاں چلا رہی تھی۔

"حسین کا برتھ ڈے جنجر بریڈ ہاؤس ٹوٹنے سے خراب نہیں ہوا، اس کا برتھ ڈے تمہارے اوور ری ایکشن سے خراب ہوا ہے۔ تم نے اپنے کزن کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس کا قصور نہیں تھا۔ اس نے تمہیں واقعی نہیں دیکھا تھا۔ اگر تم تھوڑا سا ضبط کر لیتیں اور کھلے دل سے اپنے کزن کو ویلکم کرتیں تو ہم اسی ٹوٹے جنجر بریڈ ہاؤس کو یادگار بنا لیتے۔ اسے ایک دوسرے کے چہروں پہ ملتے، اس کے ساتھ تصویریں کھنچواتے اور کیا کچھ نہ کرتے۔ چیزیں وقتی ہوتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں۔ رویے دائمی ہوتے ہیں۔ صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور تم نے آج ایک ٹوٹے ہوئے جنجر بریڈ ہاؤس سے ہار مان لی۔"

لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ نگاہیں جمائے ڈی جے تیزی سے کچھ ٹائپ کرتی کہہ رہی تھی۔

حیا اسی طرح ببل چباتی موبائل کے بٹن دباتی رہی۔

"تمہارے جانے کے بعد سب اتنے شرمندہ تھے کہ مت پوچھو کس طرح میں نے بمشکل سب کو منا کر حسین سے کیک کٹوایا۔"
دفعتاً حیا کا موبائل بجا تو ڈی جے خاموش ہو گئی۔
حیا نے لب بھینچے اسکرین کو دیکھا۔ وہاں جہان کا موبائل نمبر لکھا آ رہا تھا۔ چاہنے کے باوجود بھی وہ کال مسترد نہ کر سکی۔
"کیا ہے؟" اس نے فون کان سے لگا کر بہت آہستہ سے کہا۔
"ابھی تک خفا ہو؟" وہ ایک دم اتنی اپنائیت سے پوچھنے لگا کہ وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹکنے لگا۔
"خفا ہونے کا اختیار اپنوں کو ہوتا ہے، مجھے یہ اختیار کبھی کسی نے دیا ہی نہیں۔"
"اتنے لمبے مکالمے مت بولو۔ مجھ سے اب سردی میں نہیں کھڑا ہوا جا رہا۔ فوراً باہر آؤ۔"
وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔
"تم کہاں ہو؟" آنسو غائب ہو گئے۔
"تمہارے ڈورم کے باہر بالکونی میں کھڑا ہوں۔"
"میرے اللہ! تم اب تک یہیں ہو۔" وہ فون پھینک کر اٹھی، تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتری اور دوڑ کر دروازہ کھولا۔
وہ بالکونی کی ریلنگ سے ٹیک لگائے، سینے پہ بازو لپیٹے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔
"اُف جہان!" حیا دروازہ بند کر کے اس تک آئی۔ اس نے ٹی شرٹ کے اوپر ایک کھلا سا سیاہ سوئیٹر پہن لیا تھا اور بالوں کا پھر سے ڈھیلا جوڑا باندھ لیا تھا۔ آنکھیں ہنوز متورم تھیں۔
"کب سے کھڑے ہو ادھر؟" وہ خفگی سے کہتی اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔
"جب سے تم نے بتایا تھا کہ تمہاری زندگی میں جنجر بریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل ہیں۔ میں نے سوچا ان کو حل کیے بغیر نہ جاؤں۔ چائے تو نہیں پلاؤ گی؟"
وہ کچھ ایسے ڈرتے ڈرتے بولا کہ وہ ساری تلخی بھلا کر ہنس دی۔
"آؤ! تمہیں ایپل ٹی پلاتی ہوں۔ تمہارے ترکی کی سوغات ہے ورنہ پاکستان میں تو ہم نے کبھی سیب والی چائے نہیں پی تھی۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ اندرونی سیڑھیاں اترنے لگے۔
"اور ہم یہی پی کر بڑے ہوئے ہیں۔ کتنا فرق ہے نا ہم میں۔" وہ شاید یونہی بولا تھا۔ مگر کچن کا دروازہ کھولتی حیا نے مڑ کر اسے دیکھا ضرور تھا۔
"ہاں! بہت فرق ہے ہم میں۔" اس نے تسلیم کر لیا تھا۔ اس نے ہار مان لی تھی، اور انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود...... اف یہ ڈی جے کے سنہری اقوال بھی نا......!
وہ سر جھٹک کر کچن میں داخل ہوئی۔
"ایپل ٹی تو ختم ہے، اب سادہ چائے پیو۔" اس نے کیبنٹ کھول کر چند ڈبے آگے پیچھے کیے اور پھر مایوسی سے بتایا۔
"دودھ نکالو، میں چائے کا پانی چڑھاتا ہوں۔" وہ آگے بڑھا، دیگچی ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالی، اس میں پانی اور پتی ڈال کر چولہے پہ چڑھائی اور چولہا جلا دیا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ فوراً سے کام کر دینے والا۔ اس کے ہاتھ بہت سخت اور مضبوط سے لگتے تھے۔ کام کے، محنت اور مشقت کے عادی۔ وہ استنبول کی ورکنگ کلاس کا نمائندہ تھا۔
اب وہ سلیب پہ رکھے برتن جمع کر کے سنک میں ڈال رہا تھا۔
"رہنے دو جہان! میں کر لوں گی۔"
"تم نے کرنے ہوتے تو اب تک کر چکی ہوتیں۔ اب اس سے پہلے کہ پانی سوکھ جائے، دودھ ڈال دو، بلکہ مجھے دو۔" اس نے پلیٹ دھوتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے دودھ کا ڈبا اٹھایا اور خود ہی دیگچی میں انڈیل دیا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

وہ کھلے نل تلے پلیٹ کھنگال رہا تھا۔ جینز اور جوگرز پہنے، سویٹر کی آستینیں کہنیوں تک موڑے، وہ تاقسم اسکوائر کی میٹرو میں موجود اس انگیز یکٹو سے قطعاً مختلف لگ رہا تھا، جس سے چند ہفتے قبل حیا ملی تھی۔

''حیا.....حیا.....'' ڈی جے حواس باختہ سی چلاتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی۔

''تمہارا فون مر جائے گا بج بج کر۔ اوہ، السلام علیکم۔'' جہان کو دیکھ کر وہ گڑبڑا گئی۔

''وعلیکم السلام!'' جہان نے پلٹ کر اسے جواب دیا۔

''تمہارا فون!'' وہ حیا کو موبائل تھما کر واپس مڑ گئی۔

حیا نے موبائل پہ دیکھا۔ پانچ مسڈ کالز۔ ترکی کا کوئی غیر شناسا نمبر۔

اسی وقت اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے اسکرین کو دیکھا۔ وہی ترکی کا نمبر۔ اس نے کال وصول کر لی۔

''ہیلو؟'' جب وہ بولی تو اس کی آواز میں تذبذب تھا۔

''حیا سلیمان؟ بندے کو عبدالرحمان پاشا کہتے ہیں۔ اب تک تو آپ مجھے جان گئی ہوں گی۔'' وہ شستہ اردو میں کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز میں ممبئی کے باسیوں کا تیکھا پن تھا اور لہجہ بہت ٹھنڈا۔

حیا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے پلکیں اٹھا کر جہان کو دیکھا۔ وہ بہت غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔

''رانگ نمبر!'' اس نے کہہ کر فون رکھنا چاہا مگر وہ آگے بڑھا اور موبائل اس کے ہاتھ میں لے لیا۔

''کون؟'' وہ فون کان سے لگا کر بولا تو اس کے چہرے پہ بے پناہ سختی تھی۔

''کون؟'' اس نے دہرایا۔ شاید دوسری جانب سے کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔ جہان لب بھینچے چند لمحے انتظار کرتا رہا، پھر اس نے فون کان سے ہٹایا۔

''بند کر دیا ہے۔'' اس نے موبائل حیا کی طرف بڑھاتے ہوئے جانچتی، مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''کون تھا؟''

''تمہیں نہیں بتایا تو مجھے کیوں بتاتا۔ شاید رانگ نمبر تھا۔'' وہ اب سنبھل چکی تھی۔

''ہوں! تمہیں کوئی تنگ تو نہیں کر رہا؟'' پھر جیسے وہ چونکا۔ ''وہ پھول.....''

''پتا نہیں کون ہے۔'' اس نے شانے اچکا دیے۔ ''جانے دو۔''

''ہراس منٹ ایک جرم ہے، ہم اس کے لیے پولیس کے پاس جا سکتے ہیں۔'' وہ کچھ سوچ کر بولا۔

کسی مسئلے کا حل جہان سکندر کے پاس نہ ہو، یہ ممکن تھا بھلا؟

''جانے دو۔ میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ خود ہی تھک کر رک جائے گا۔'' گو کہ وہ مطمئن نہیں ہوا تھا، مگر سر ہلا کر پلٹ گیا اور نل پھر سے کھول دیا۔

حیا نے موبائل کو سائلنٹ پہ لگا کر جیب میں ڈال دیا۔ وہ اس نازک رشتے میں مزید بدگمانی کی متحمل نہ تھی۔

''چولہا کیوں بند کر دیا؟ ابھی پکنے دیتیں، میں زیادہ کڑھی ہوئی چائے پینے کا عادی ہوں۔'' اسی پل چولہا بند ہوا تو وہ چونکا۔

''میں نے نہیں بند کیا، یہ آٹومیٹک ہیں، ہر پندرہ منٹ بعد دس منٹ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ سو دس منٹ بعد خود ہی جل اٹھے گا۔''

''یہ اچھا کام ہے!'' اسے جیسے کوفت ہوئی، پھر آخری برتن کھنگالتے ہوئے وہ بار بار چولہے کو سوچتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ جب برتن ختم ہو گئے تو ہاتھ دھو کر چولہے کی طرف آیا۔

''برتن دھل گئے ہمارے، اب تمہاری زندگی کے اگلے مسئلے کو حل کرتے ہیں۔ اس کے بعد کون سا مسئلہ ہے، وہ بھی بتاؤ۔'' وہ چولہے کو پھر سے جلانے کی کوشش کرنے لگا۔

''میری زندگی کے مسئلے ٹوٹے کیبنٹ یا ٹھنڈے چولہے کی طرح نہیں ہیں، جو تم حل کر لو۔''

''اچھی بھلی زندگی ہے تمہاری، کیا مسئلہ ہے تمہیں، سوائے اس بے کار چولہے کے، کوئی تو حل ہوگا اس کا بھی۔'' وہ نچلا لب دبائے

جھک کر سوئچ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔

"اس کا کوئی حل نہیں ہے۔"

"یہ ناممکن ہے کہ کسی مسئلے کا کوئی حل نہ ہو۔ ٹھہرو! میں کچھ کرتا ہوں۔" وہ پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھا اور جھک کر نیچے سے چولہے کا جائزہ لینے لگا۔

"جہان! رہنے دو!"

"میری کار سے میرا ٹول بکس لے آؤ۔ ڈیش بورڈ میں پڑا ہوگا۔ تب تک میں اسے دیکھتا ہوں۔" وہ جینز کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر اس کی طرف بڑھائے، گردن نیچے جھکائے چولہے کے اردگرد جیسے کچھ تلاش کر رہا تھا۔

وہ جہان ہی کیا، جو کچھ کرنے کی ٹھان لے تو پھر کسی کی سنے۔ اسے میٹرو میں اپنے جوتے کے تسمے کھولتا جہان یاد آیا تھا۔ اس نے مسکراہٹ دبا کر ہاتھ بڑھا کر چابی پکڑی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

جہان کی چھوٹی سفید سی کار ہاسٹل کی سیڑھیوں کے آخری زینے کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ اس میں سے ٹول بکس نکالتے ہوئے حیا نے بے اختیار سوچا تھا کہ وہ اتنا امیر نہیں ہے جتنا وہ سمجھتی تھی، یا پھر شاید یورپ میں رہنے والے رشتہ داروں کے بارے میں عمومی تصور یہی ہوتا ہے کہ وہ خاصے دولت مند ہوں گے، جبکہ جہان اور سبین پھپھو اس کے برعکس محنت کش، ورکنگ کلاس کے افراد تھے۔

وہ واپس آئی تو وہ چھری سے ہی شروع ہو چکا تھا اور پائپ، ساکٹ اور پتا نہیں کیا کیا کھولے بیٹھا تھا۔

چند منٹ وہ خاموشی سے سلیب کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی اسے کام کرتے دیکھتی رہی۔ وہ دائیں گھٹنے اور بائیں پنجے کے بل زمین پر بیٹھا پائپ کے دہانے پہ پیچ کس سے کچھ کھول رہا تھا۔ ٹول بکس اس کے پاؤں کے ساتھ فرش پہ کھلا پڑا تھا۔

چند صبر آزما پل بیتے اور پھر وہ فاتحانہ انداز میں ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھا۔

"یہ چوتھا چولہا جو کونے میں ہے، یہ فکس کر دیا ہے، اب یہ خود سے نہیں بجھے گا۔" اس نے کہنے کے ساتھ ہی عملی مظاہرے کے طور پہ چوتھے چولہے کو جلا دیا اور پھر چائے کی کیتلی اسی پہ رکھ دی۔

"یہ جو تم نے حرکت کی ہے نا جہان سکندر! یہ غیر قانونی ہے۔ اگر کسی کو پتا چل گیا تو......؟"

"سبانجی میں اسموکنگ بھی غیر قانونی ہے، مگر اسٹوڈنٹس کرتے ہیں نا؟ ڈرنکنگ بھی غیر قانونی ہے، اسٹوڈنٹس وہ بھی کرتے ہیں اور کمروں میں چھوٹے چولہے اور مائیکرو ویو رکھنا بھی غیر قانونی ہے، وہ بھی رکھتے ہیں نا؟ سو تم بھی اپنی مرضی کرو!" وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگائے کھڑا بڑی لاپروائی سے بولا تو وہ ہنس دی۔ اسے اپنا سروے فارم یاد آ گیا تھا۔

"تم سبانجی سے پڑھے ہو جو اتنی معلومات ہیں؟"

"سبانجی سے پڑھا ہوتا تو ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ نہ چلا رہا ہوتا۔ ہم تو عام سی سرکاری یونیورسٹیز میں پڑھنے والے مڈل کلاس لوگ ہیں مادام!" وہ جب بھی اپنی کم آمدن یا کام کا ذکر کرتا، اس کے بظاہر مسکراتے لہجے کے پیچھے ایک تلخ اداسی سی ہوتی۔ ایک احساس کمتری، یا پھر شاید یہ اس کا وہم تھا۔

"خیر!" حیا گہری سانس لے کر چولہے کی طرف آئی اور چائے کی کیتلی اٹھالی۔ ٹرے میں پیالیاں اس نے پہلے سیٹ کر رکھی تھیں، اب وہ چھلنی رکھ کر چائے انڈیلنے لگی۔

"اس ویک اینڈ پہ ڈنر کریں ساتھ؟"

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا، ذرا سی چائے چھلنی کے دہانے سے پھسل کر پیالی پکڑے اس کے ہاتھ پہ گری، مگر وہ بے حد حیرت و بے یقینی سے جہان کو دیکھے گئی۔

"اچھا...... اچھا...... نہیں کرتے۔ غلطی سے کہہ دیا۔" وہ جیسے شرمندہ ہو گیا۔

"نہیں! نہیں، میرا مطلب ہے، ٹھیک ہے شیور، مگر کہاں؟" وہ جلدی سے بولی مبادا وہ کچھ غلط نہ سمجھ لے، پھر اپنی جلد بازی پہ بھی

خفت ہوئی۔

"استقلال جدیسی میں کہیں بھی۔ تمہیں بس ٹاقسم پہ اتارنی ہے نا؟" حیا نے اس کی پیالی اٹھا کر اسے دی تو اس نے سر کے ذرا سے اثبات کے ساتھ تھام لی۔

"ہاں۔" وہ اپنی پیالی لے کر اس کے بالمقابل سلیب سے ٹیک لگائے کھڑی ہوگئی اور چائے میں چمچ ہلانے لگی۔

"پھر میں تمہیں ٹاقسم سے پک کرلوں گا۔ ہفتے کی رات، آٹھ بجے ٹھیک؟"

"ٹھیک۔" وہ گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرادی۔

جب وہ اسے واپس باہر تک چھوڑنے آئی تو دونوں کو اپنے پیچھے پا کر بالکونی کی بتی خود سے جل اٹھی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ وہ ہولے سے کہہ اٹھی۔

"آئی ایم سوری، میں آج اوور ری ایکٹ کرگئی تھی۔"

جہان نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"کچن کے سارے برتن دھلوا کر، چولہا ٹھیک کروا کر اور چائے کے دو کپ بنوا کر تم نے بالآخر مان ہی لیا۔ بہت شکریہ۔ اب میں سکون سے سوسکوں گا۔" وہ گویا بہت تشکر اور احسان مندی سے بولا تھا۔

وہ خفت سے ہنس دی۔ "کہا نا سوری۔"

"سوری مجھے بھی کرنی چاہیے، مگر وہ میں ڈنر پہ کردوں گا، ادھار رہا۔ ہفتے کی شام آٹھ بجے، شارپ!"

"مجھے یاد رہے گا۔" وہ سیڑھیاں اترنے لگا اور حیا سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی۔ جب اس کی کار نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو وہ کمرے کی طرف مڑ گئی۔ بالکونی کی بتی بجھ گئی۔ سارے میں تاریکی چھاگئی۔ ڈی جے وہیں کرسی پہ بیٹھی لیپ ٹاپ پہ کچھ ٹائپ کررہی تھی۔

وہ زیر لب کوئی دھن گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے بینک کے زینے چڑھنے لگی۔

"تمہارا کزن بڑا ہینڈسم ہے۔" ڈی جے نے مصروف انداز میں تبصرہ کیا۔

"سو تو ہے۔" اس نے بستر میں لیٹ کر ڈی جے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ وہی پھپھو کا بیٹا ہے نا؟" ڈی جے اسکرین کو دیکھتی لیپ ٹیپ کی کنجیوں پہ انگلیوں چلا رہی تھی۔

"ہوں!"

"وہی شادی شدہ؟"

"ہاں۔" اس کے لبوں پہ ایک دبی دبی مسکراہٹ در آئی۔

"اچھا!" ڈی جے مایوسی سے خاموش ہوگئی۔

حیا زیر لب وہی دھن گنگنانے لگی۔

"بکومت۔ مجھے اسائنمنٹ بنانے دو۔" کچھ دیر بعد ڈی جے جھنجلا کر بولی مگر وہ مسکراتے ہوئے گنگنائے جارہی تھی۔ وہ خوش تھی، بہت خوش۔

☆ ☆ ☆

دروازہ کھلا تھا۔ اس نے دھکیلا تو وہ ایک ناگوار مگر آہستہ آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔

سامنے لاؤنج میں ابتری پھیلی تھی۔ چھوٹا سا کچن بھی ساتھ ہی تھا جس میں اس کی بیوی کام کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

ہاشم قدم قدم چلتا کچن کے دروازے پہ آ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی اس کی جانب پشت کیے چولہا جلا رہی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح تھی۔ دراز قد، گھنگھریالے سیاہ بال اور اہل حبشہ کی سی مخصوص موٹی سیاہ آنکھیں۔

"ڈاکٹر کیا کہتا تھا؟"

وہ چونک کر پلٹی۔ پھر اسے دیکھ کر گہری سانس لی اور واپس چولہے کی طرف مڑ گئی۔

"سرجری ہوگی، اور اس کے لیے بہت سے پیسے چاہئیں۔"

وہ خاموشی سے کھڑا سنتا رہا۔

"پیسوں کا انتظام ہوا؟" وہ کپڑے سے ہاتھ پونچھتی ہاشم تک آئی اور پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں۔" ہاشم نے گردن دائیں سے بائیں ہلائی۔

"تو اب کیا ہوگا؟ ہمیں ابھی چند ہفتوں میں ہزاروں لیراز جمع کرنے ہیں۔ تم نے پاشا سے بات کی؟"

"کی تھی۔"

"تو کیا کہتا ہے وہ؟" وہ بے قرار ہوئی۔

"نہیں دے گا۔ جو کام میں کر رہا ہوں، بس اس کی قیمت دے گا۔ اوپر ایک کرش kurush بھی نہیں۔"

"کیوں؟ اتنا تو پیسہ ہے اس کے پاس۔ پورا محل تو کھڑا کر رکھا ہے بیوک ادا میں، پھر ہمیں کیوں نہیں دے گا؟"

"وہ کہتا ہے اس نے کوئی خیراتی ادارہ نہیں کھول رکھا اور پھر مزید کس کھاتے میں دے؟ میں نے ابھی تک اس کی پچھلی رقم نہیں لوٹائی۔"

"ہاں تو وہ حارث کے علاج پہ لگ گئے تھے، کوئی جوا تو نہیں کھیلتے ہم۔" اس نے غصے سے ہاتھ میں پکڑا کپڑا میز پہ دے مارا۔

"وہ نہیں دے گا، میں کیا کروں؟" وہ بے حد مایوس تھا۔

"مجھے نہیں پتا ہاشم! کہیں سے بھی ہو، تم پیسوں کا بندوبست کرو، ورنہ حارث مر جائے گا۔"

ہاشم نے بے چارگی اور کرب سے سر جھٹکا۔

"ہاشم! کچھ کرو۔ ہمارے پاس دن بہت کم ہیں۔ ہمیں پیسے چاہئیں ہر حال میں۔"

"کرتا ہوں کچھ۔" وہ جس شکستگی کے عالم میں آیا تھا، اسی طرح واپس پلٹ گیا۔ اس کی سیاہ پیشانی پہ تفکر کی لکیروں کا جال بچھا تھا اور چال میں واضح مایوسی تھی۔

وہ مضطرب سی انگلیاں مروڑتی کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی، پھر ایک نظر کمرے کے بند دروازے پہ ڈالی جہاں ان کا بیٹا سو رہا تھا اور سر جھٹک کر واپس سنک کی طرف پلٹ گئی، جہاں بہت سے کام اس کے منتظر تھے۔

☆ ☆ ☆

ڈی جے نے دروازہ کھولا تو وہ اسے آئینے کے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ وہ دروازہ بند کر کے آگے آئی اور حیا کے سامنے کھڑے ہو کر پوری فرصت سے اور بہت مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس کے ہاتھ میں مسکارا برش تھا اور وہ آئینے میں دیکھتی، آنکھیں کھولے احتیاط سے پلکوں سے برش مس کر رہی تھی۔ گہرا کاجل، سیاہ سنہری سا آئی شیڈ اور لبوں پہ چمکتی گلابی لپ اسٹک وہ بہت محنت سے تیار ہو رہی تھی۔ بال یوں سیٹ کر رکھے تھے کہ اوپر سے سیدھے آتے بال کانوں کے نیچے سے مڑ کر گھنگریالے ہو جاتے تھے۔ بالوں پہ اس نے کچھ لگا رکھا تھا کہ وہ گیلے گیلے سے لگتے تھے اور جو فراک اس نے پہن رکھا تھا، اس کی اوپری پٹی قدیم طرز کے سنہری سکوں سے بھری تھی۔ آستین بہت چھوٹی تھیں اور ان پہ بھی سنہری سکے لٹک رہے تھے۔ نیچے لمبے فراک کی کلیاں سیاہ تھیں۔ ٹخنوں سے ذرا سا جھلکتا پاجامہ بھی سیاہ تھا۔

"کدھر کی تیاریاں ہیں؟" ڈی جے نے سر سے پیر تک اسے دیکھا۔

"ڈنر کی!" اس نے لپ گلوس کے چند قطرے لبوں پہ لگائے اور آئینے میں دیکھتے ہوئے ہونٹ آپس میں مس کر کے کھولے۔

"کس کے ساتھ؟"

"جہان کے ساتھ!" بے ساختہ لبوں سے پھسلا، لمحے بھر کو وہ چپ ہو گئی، پھر لاپروائی سے شانے اچکائے۔ "ویسے وہ شادی شدہ ہے۔"

”اچھا! وہ دو گھنٹے سردی میں بالکونی میں کھڑا رہتا ہے، چولہے کے تاروں میں ہاتھ ڈال کر اسے ٹھیک کر دیتا ہے، سارا کچن صاف کر کے جاتا ہے، پھر تمہیں ڈنر پہ بلاتا ہے اور تم اس ساری تیاری کے ساتھ جا رہی ہو۔ پھر سوچ لو، وہ اب بھی شادی شدہ ہے؟“

”بکومت!“ وہ ہنستے ہوئے کرسی پہ بیٹھی اور جھک کر اپنی سیاہ ہائی ہیلز پہننے لگی۔

”نہ بتاؤ، میں بھی پتا لگا کر رہوں گی۔“ ڈی جے منہ پہ ہاتھ پھیرتی اپنی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

حیا نے گنگناتے ہوئے میز پہ رکھا اپنا چھوٹا سنہری کلچ اٹھایا۔ وہی دادر بھائی کی مہندی والا کلچ جو اس نے جہاز میں بھی ساتھ اٹھا رکھا تھا۔ اسے وہ زیادہ استعمال نہیں کرتی تھی، اب بھی کھولا تو اندر ایک تہہ کیا ہوا وزیٹنگ کارڈ اور اتصلات کا کالنگ کارڈ بھی رکھا تھا جو انہوں نے ابوظہبی میں خریدا تھا۔ اس نے موبائل، پیسے اور سبانجی کا آئی ڈی کارڈ اندر رکھا۔ کلچ چھوٹا تھا، ہالے کا دیا گیا موٹا بھدا موبائل اس میں پورا نہیں آ رہا تھا، تو اس نے موبائل ہاتھ میں پکڑ لیا اور ”اچھا میں چلی“ کہہ کر ہینگر پہ لٹکا اپنا سفید ٹرم بٹ ایک ہاتھ سے کھینچ کر اتارا اور باہر لپکی۔

باریک لمبی ہیل سے پتھریلی سڑک پر چلتے ہوئے اس نے کوٹ سیدھا کیا اور پہنا، پھر چلتے چلتے سامنے سے بٹن بند کیے۔ گورسل کا اسٹاپ ذرا دور تھا۔ اسے وہاں تک پیدل جانا تھا۔ وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے تیز تیز سڑک پر چلتی جا رہی تھی۔ شام کی ٹھنڈی ہوا سے اس کے تیلے گھنگھریالے بال کمر پہ اڑ رہے تھے۔

جس لمحے وہ گورسل اسٹاپ کے قریب پہنچی، اسے گورسل دور سبانجی کے گیٹ سے باہر نکلتی دکھائی دی۔

ہالے نے کہا تھا، جس دن تمہاری گورسل چھوٹے گی اس دن تمہیں ہالے نور بہت یاد آئے گی۔ اور اس پل بے بسی و دکھ سے اس دور جاتی گورسل کو دیکھ کر اسے واقعی ہالے نور بہت یاد آئی تھی۔

اس نے جیب سے موبائل نکالا اور جہان کو پیغام لکھا۔

”میری گورسل چھوٹ گئی ہے مجھے پک کر لو، میں اسٹاپ پہ کھڑی ہوں۔“

وہ کتنی ہی دیر وہاں سڑک پہ ٹہلتی رہی، مگر کوئی جواب نہیں آیا، شاید اس غریب کے پاس جواب دینے کا بھی کریڈٹ نہیں تھا۔ ہارن کی آواز پر وہ اپنے حال میں لوٹ آئی جہاں ایک سیاہ چمکتی ہوئی کار اس کے عین سامنے رکی تھی۔

ڈرائیور نے بٹن دبا کر اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا اور چہرہ ذرا سا موڑ کر اسے مخاطب کیا۔

”مادام سلیمان؟ تاقسم اسکوائر، جہان سکندر۔“ ترک لب و لہجے میں ڈرائیور نے چند الفاظ ادا کیے تو اس نے سر ہلا دیا اور دروازہ کھول کر پچھلی نشست پہ بیٹھ گئی۔ وہ یقیناً جہان کا ڈرائیور تھا، گو کہ اس نے مفلر چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور سر پہ ٹوپی بھی لے رکھی تھی۔ حیا بس اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائی تھی، پھر بھی اسے گمان گزرا کہ اس نے اس سیاہ فام حبشی کو کہیں دیکھ رکھا ہے۔ کہاں، یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے جہان کو ”بہت شکریہ۔ میں پہنچ رہی ہوں۔“ لکھنے لگی۔

ذرا کی ذرا اس نے نگاہ اٹھا کر بیک ویو مرر میں ایک دو بار دیکھا بھی، مگر ڈرائیور نے اسے کچھ یوں سیٹ کر رکھا تھا کہ وہ صرف اپنا چہرہ ہی دیکھ سکتی تھی۔

تاقسم اسکوائر پہ تاریکی کے پنچھی نے اپنے پر پھیلا رکھے تھے اور اسی مناسبت سے ہر سو بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ پورا اسکوائر ان مصنوعی روشنیوں سے چمک رہا تھا۔ مجسمہ آزادی کے اطراف سے مخالف سمتوں میں سڑکیں نکل رہی تھیں، وہاں ہر سو ٹریفک کا رش تھا۔

مجسمہ آزادی کو چاروں اطراف سے گھاس کے ایک گول قطعہ اراضی نے گھیر رکھا تھا، جیسے کسی پھول کی چار پتیاں ہوں اور ہر پتی کے کناروں کی لکیر پہ پتھریلی روش بنی تھی۔ وہاں لوگوں کی خوب چہل پہل تھی۔

ڈرائیور نے اسکوائر کے مقابل ایک عمارت کی بیرونی دیوار کے ساتھ گاڑی کھڑی کر دی۔

”جہان سکندر!“ اس نے انگلی سے اسی دیوار کے ساتھ ساتھ دور اشارہ کیا، جہاں جہان کی سفید کار کھڑی تھی یوں کہ وہ دیوار کے اس کنارے پہ تھی تو یہ سیاہ کار اس کنارے۔

اس نے دروازہ کھولا اور باریک ہیل احتیاط سے باہر سڑک پہ رکھی۔ تاقسم اسکوائر کو اس کی ہیلز پسند نہیں تھیں، اسے اندازہ تھا۔

وہ اپنی گاڑی کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ بونٹ کھول کر وہ جھکے ہوئے، کچھ تاریں جوڑ رہا تھا۔ سیاہ جیکٹ اور جینز میں ملبوس، ہمیشہ کی طرح عام سے حلیے میں۔

وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سبک سبک چلتی اس تک آئی۔ وہ کچھ گنگناتے ہوئے ایک تار کو دوسری کے ساتھ جوڑ رہا تھا۔ (بل کی ٹک ٹک پہ رکا اور گردن گھما کر دیکھا۔

''سلام علیکم!'' اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے سیدھا ہوا۔

''وعلیکم السلام! اس تاریک کونے میں کیا کر رہے ہو؟''

''میری کار ہر خاص موقع پہ دغا دے جاتی ہے، اب بھی مسئلہ کر رہی ہے، خیر میں فکس کر لوں گا'' وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے لاپروائی سے بولا۔

''وہ تو تم کر لو گے، مجھے پتا ہے۔ جہان سکندر کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔'' وہ دھیرے سے ہنسی۔

''تم بتاؤ، پورے اسکوائر پہ مجھے تلاشتے تمہیں کتنی دیر لگی؟ اور بس پہ آئی ہو؟''

''نہیں، تمہاری بھیجی گئی شوفر ڈریون کار میں آئی ہوں۔''

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''یہ طنز کرنا کہاں سے سیکھ لیے ہیں تم نے؟ میں اتنا غریب بھی نہیں ہوں کہ تم یوں مذاق اڑاؤ'' وہ ہنس کر سر جھٹکتا اب بونٹ بند کر رہا تھا۔

حیا نے گردن پھیر کر پیچھے دیکھا۔ طویل دیوار کے اس سرے پہ وہ سیاہ کار اسی طرح کھڑی تھی۔

''تمہیں میرا میسج نہیں ملا تھا؟'' وہ قدرے بے چینی سے بولی۔

''میسج؟'' جہان نے جب تھپتھپائی۔ ''میرا موبائل کہاں گیا؟'' اس نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا اسمارٹ فون نکالا، پھر اس کی اسکرین کو انگلی سے چھوا۔

''نہیں!'' اس نے اسکرین حیا کے چہرے کے سامنے کی۔ وہاں ان باکس کھلا تھا اور حیا کا کوئی پیغام نہ تھا۔ حیا نے بے اختیار اپنے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا۔ اس پہ پیغام رکنے کا نشان نظر آرہا تھا، اس نے جلدی سے بٹن دباتے ہوئے آؤٹ باکس کھولا۔ اس کے دونوں پیغام وہیں پھنسے ہوئے تھے۔ اوہ! بیلنس بالکل ختم تھا، ظاہر ہے پھر میسج کیسے جاتا؟

''کوئی خاص بات تھی کیا؟'' وہ کار کو لاک کر رہا تھا۔

''تم نے مجھے اس پارکنگ ایریا میں ڈنر کرانا ہے یا کسی مہذب جگہ پہ؟'' وہ بات بدل گئی۔ کنکھیوں سے اس نے اس لش پش چمکتی سیاہ کار کو دیکھا، جو دور کھڑی تھی۔ اسے کس نے بھیجا، وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

''اگر یہ کار میرا اتنا وقت ضائع نہ کراتی تو میں اب تک کسی ریسٹورنٹ میں جگہ ڈھونڈ بھی چکا ہوتا۔ لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی۔'' دونوں ساتھ ساتھ سڑک کے کنارے چلنے لگے۔

استقلال اسٹریٹ نامی وہ طویل گلی تاقسم اسکوائر کے ساتھ سے ہی نکلتی تھی۔ وہ ہفتے کی رات تھی، سو استقلال اسٹریٹ روشنیوں میں نہائی، رنگوں اور قہقہوں سے بجی، رونق کے عروج پہ تھی۔ وہاں لوگ ہمیشہ کی طرح دونوں اطراف میں تیز تیز چلتے جا رہے تھے۔ گلی کی دونوں جانب چمکتے شیشوں والی شاپس اور ریسٹورنٹس میں خاصا رش تھا۔

وہ آغاز میں ہی دائیں ہاتھ کی قطار میں بنے ایک ریسٹورنٹ میں چلے آئے۔

زرد روشنیوں سے مزین چھت اور جگمگاتے فانوس نے ریسٹورنٹ کے ماحول کو ایک خواب ناک سا تاثر دے رکھا تھا۔ اس کونے والی خالی میز کے ساتھ رکھے اسٹینڈ پہ حیا نے کوٹ اتار کر لٹکایا اور جہان کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ زرد روشنیوں میں اس کے فراک کے سنہری سکے چمکنے لگے تھے۔ اس نے دائیں بازو میں ایک سنہری کڑا پہن رکھا تھا اور اب وہ کہنی میز پہ رکھ کر بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے کڑے کو

گھمارہی تھی۔ سنہری کلچ اور موبائل اس نے میز پہ ہی رکھ دیا تھا۔
''آرڈر میں کروں یا تم؟''
''دعوت تمہاری طرف سے ہے، سو تم کرو۔'' اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔ جہان نے مسکرا کر سر کو خم دیا اور مینیو کارڈ کھول کر انہماک سے پڑھنے لگا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ پڑھتے ہوئے نچلے لب کو دانت سے دبائے ہوئے تھا۔
حیا نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔ استقلال جدیسی میں کتنے ہی لوگوں نے مڑ مڑ کر اس قدیم یونانی دیویوں کے سے سنگھار والی لڑکی کو ستائش سے دیکھا تھا، مگر یہ عجیب شخص تھا۔ کوئی تعریف نہیں، کوئی اظہار نہیں، اتنی لاتعلقی و بے خبری، وہ بھی اس شخص کی جو ایک نظر میں سارے منظر کا باریک بینی سے جائزہ لے لیا کرتا تھا؟
اسے اپنی ساری تیاری رائیگاں جاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔
آرڈر کر چکنے کے بعد وہ میز پہ کہنیاں رکھے، دونوں ہاتھ آپس میں پھنسائے حیا کی طرف متوجہ ہوا اور ذرا سا مسکرایا۔
''تم نے مجھ سے اس روز پوچھا ہی نہیں کہ میں تمہارے ڈورم بلاک کیوں آیا تھا؟''
وہ مسکراتے ہوئے کتنا اچھا لگتا تھا۔ اس کے ہلکے سے بھورے شیڈ لیے سیاہ بال نوعمر لڑکوں کی طرح ماتھے پہ سیدھے کٹے ہوئے تھے اور عموماً وہ ہلکے ہلکے گیلے ہوتے تھے۔ پرکشش آنکھوں میں ایک نرم، دھیما سا تاثر لیے، وہ اب اتنا کم گو اور محتاط نہیں لگتا تھا جتنا پہلے دن لگا تھا۔
''ظاہر ہے، کسی کام سے ہی آئے ہوگے۔ مجھ سے ملنے بالخصوص آؤ، یہ تو ذرا مشکل ہی ہے۔''
''تم سے ملنے بالخصوص ہی آیا تھا اور اس کے لیے ممی کو پاکستان فاطمہ آنٹی کو فون کر کے تمہارے ڈورم کا نمبر پوچھنا پڑا تھا، ورنہ تم نے تو ہمیں ایڈریس تک نہیں دے رکھا۔''
اور یہ بات تو اماں نے اسے کل ہی فون پہ بتا دی تھی مگر لمحے بھر کو اس نے سوچا تھا کہ ڈھونڈنے والے تو بنا پتے کے بھی ڈھونڈ لیتے ہیں، جیسے وہ سفید گلاب اسے ہر جگہ تلاش کر لیتے تھے۔

''تو پھر آپ کیوں آئے تھے مجھ سے ملنے؟''
''بس یونہی۔ مجھے لگا تھا کہ تم اس روز استقلال اسٹریٹ میں مجھ سے خفا ہو گئی تھیں۔''
''اچھا تو آپ نے مجھے اس دن پہچان لیا تھا، ہو سکتا ہے وہ میری شکل کی کوئی لڑکی ہو؟'' وہ بہت جلدی بھلا دینے والوں میں سے نہیں تھی، سو بڑی حیرت سے کڑے کو انگلیوں میں گھماتے بولی تھی۔
''ایک بات ابھی کلیئر کر لیتے ہیں حیا!'' وہ قدرے آگے کو ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولا ''میں بہت ایکسپریسو نہیں ہوں، میں لمبی لمبی باتیں نہیں کر سکتا۔ میں پریکٹیکل سا آدمی ہوں، ایسا آدمی جس کو فکر معاش ہمیشہ گھیرے رکھتی ہے۔ میرے پاس بڑی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ہے، میں ایک ریسٹورانٹ چلاتا ہوں، جس کی ملکیت میری اپنی نہیں ہے، میں کئی سالوں سے اس ریسٹورنٹ کی قسطیں ادا کر رہا ہوں جو کہ پوری ہی نہیں ہو رہیں۔ یہ چیز مجھے بہت پریشان رکھتی ہے۔ وہ کرد لڑکی جو اس دن میرے ساتھ تھی، وہ میرے ریسٹورنٹ کی عمارت کی اونر ہے اور ہمارے درمیان اس وقت یہی مسئلہ زیر بحث تھا، جب تم وہاں آئیں۔ حیا! میں اس دن اتنا پریشان تھا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ وہ میری پراپرٹی ضبط کرنے کی بات کر رہی تھی اور اگر میں اس کی رقم ادا نہ کر پایا تو وہ ایسا کر بھی گزرے گی۔ اسی پریشانی میں مَیں تمہارے ساتھ بھی مس بی ہیو کر گیا۔ آئی ایم سوری فار دیٹ۔ مگر اپنی تمام پریشانیوں میں بھی مجھے اپنے سے جڑے رشتوں کا احساس ہے، اور میں ان کی پروا کرتا ہوں۔''
حیا نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔
''اب بھی خفا ہو اسی بات پہ؟'' وہ قدرے توقف سے بولا۔
''نہیں، میں نے تمہیں تب ہی معاف کر دیا تھا جب تم نے کچن کے سارے برتن دھوئے تھے اور چولہا فکس کر کے دیا تھا۔''
وہ بے اختیار ہنس پڑا۔
''مگر وہ جنجر بریڈ ہاؤس مجھ پہ ادھار ہے۔''

اس سے قبل کہ وہ جواباً کچھ کہتی، ایک ویٹر اس کی طرف آیا تھا۔

''میڈم سلیمان؟''

حیا نے چہرہ اٹھا کر دیکھا اور لمحے بھر کو پتھر کی ہو گئی۔

ویٹر ایک سفید گلابوں کا بوکے میز پہ رکھ رہا تھا۔

''یہ آپ کے لیے۔'' ساتھ ہی اس نے ایک دوہرا تہہ کیا ہوا کاغذ حیا کی طرف بڑھایا۔

''لیجیے مادام!'' وہ جو ساکت نگاہوں سے گلدستے کو دیکھ رہی تھی، چونکی اور مضطرب سے انداز میں وہ کاغذ تھاما۔ اس کے قدموں سے جان نکل چکی تھی۔ مؤدب سا ویٹر واپس پلٹ گیا۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے کاغذ کی تہیں کھولیں۔

بے سطر کاغذ کے عین وسط میں انگریزی میں تین سطور لکھی تھیں۔

''میری کار میں سفر کر کے یہاں آنے کا شکریہ، لیکن اصولاً مجھ سے لفٹ لینے کے بعد آپ کو ڈنر میرے ساتھ کرنا چاہیے تھا، نا کہ اپنے کزن کے ساتھ۔

''فرام یور ویلفائن!''

جہان گلاس لبوں سے لگائے گھونٹ گھونٹ پانی پیتا پلکیں سکیڑے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔

''کون بھیجتا ہے تمہیں یہ سفید پھول؟'' وہ خاصے سرد لہجے میں بولا تو حیا نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔ چند لمحے پیشتر کی گرم جوشی جہان کی آنکھوں میں مفقود تھی۔ اس کے چہرے پہ زمانوں کی اجنبیت اور رکھائی چھائی تھی۔

''پپ...... پتا نہیں۔''

''اور اسے کیسے علم ہوا کہ ہم ریسٹورنٹ میں ہیں؟''

اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

وہ خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ کوئی جواب بن ہی نہیں پڑ رہا تھا۔

''دکھاؤ!'' اس نے ہاتھ بڑھایا اور اب حیا کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے کمزور ہاتھوں سے وہ کاغذ جہان کے ہاتھ پہ رکھا۔

جیسے جیسے وہ تحریر پڑھتا گیا، اس کی پیشانی پہ شکنیں ابھرتی گئیں۔ رگیں تن گئیں اور لب بھینچ گئے۔

''تم کس کی گاڑی میں تاقسم آئی ہو؟'' اس نے نگاہ اٹھا کر حیا کو دیکھا اور وہ ایک نگاہ اسے سمجھا گئی تھی کہ وہ ایک مشرقی مرد تھا۔ تایا فرقان، ابا اور روحیل کی طرح کا مشرقی مرد۔

''وہ...... میں سمجھی وہ تمہاری کار اور ڈرائیور ہے۔ میں سمجھی تم نے ڈرائیور بھیجا ہے۔''

''میرا ڈرائیور؟ کب دیکھا تم نے میرے پاس ڈرائیور؟'' اس نے تنفر سے کاغذ کو مٹھی میں مروڑ دیا۔

''میں سمجھی، اور اس نے کہا، تمہارا نام لیا تو......''

''اس نے یہ کہا کہ اس کو میں نے بھیجا ہے؟'' اس نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔

''ہاں...... نہیں ہے۔''

''یعنی کہ نہیں۔ اس نے نہیں بتایا کہ اسے کس نے بھیجا ہے اور تم اس کے ساتھ بیٹھ گئیں؟ حیا! تم یوں کسی کی گاڑی میں بھی بیٹھ سکتی ہو؟''

''میں نے کہا نا، میں سمجھی وہ تمہاری کار ہے۔'' بے بسی کے مارے اب اسے غصہ آنے لگا تھا۔ بے قصور ہوتے ہوئے بھی اسے اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔

''میرے پاس تم نے دوسری کار کب دیکھی؟ تم......''

''اگر تمہیں مجھ پہ اتنی بے اعتباری ہے تو میں لعنت بھیجتی ہوں تم پہ۔'' اس نے نیپکن نوچ پھینکا اور کرسی دھکیل کر اٹھی۔ ''جو شخص یہ

حرکت کرتا ہے، وہ مجھ سے پوچھ کر نہیں کرتا، نہ اس میں میرا کوئی قصور ہے۔ اگر تم مجھے اتنا ہی برا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے، یہاں اکیلے بیٹھو، اکیلے کھاؤ اور اکیلے رہو۔"

اس نے کلچ یوں ہاتھ مار کر اٹھایا کہ کرسٹل کا گلدان میز سے لڑھک کے نیچے جا گرا۔ چھناکے کی آواز آئی اور وہ کرچیوں میں بٹ گیا۔

جہان شاید اس کے لیے تیار نہیں تھا، مگر وہ اس کے تاثرات دیکھنے کے لیے نہیں رکی۔ وہ تیزی سے میز کے ایک طرف سے نکلی، اسٹینڈ پہ لٹکا کوٹ کالر سے پکڑ کر کھینچا اور تیز تیز چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اگر وہ اس کے پیچھے آنا بھی چاہتا، تو ابھی جو نقصان وہ کر کے گئی تھی، اسے پورا کر کے ہی آتا اور اس کارروائی میں اسے جتنے منٹ لگتے، اتنی دیر میں وہ دور جا چکی ہوتی۔

استقلال اسٹریٹ میں لوگ اسی طرح چل رہے تھے۔ وہ اس رش کے درمیان میں ہی کہیں تھی۔ اس نے کوٹ پہنا نہیں، بازو پہ ڈال دیا اور دونوں بازو سینے پہ لپیٹے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی چلتی جا رہی تھی۔ آنسو متواتر اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

وہ اس کے پیچھے نہیں آیا، اور اگر آیا بھی تو وہ اس شور اور رش میں نہ اسے دیکھ پائی، نہ ہی اس کی آواز سن پائی۔ بس اسی طرح چلتی رہی۔ استقلال اسٹریٹ کا آخری کنارا مڑ کر وہ ٹاقسم اسکوائر میں داخل ہوئی اور بالکل سیدھ میں چلتی ہوئی ٹاقسم پارک کی طرف بڑھ گئی۔

تاریک پارک کے ایک گوشے میں وہ سنگی بنچ ویران پڑا تھا۔ وہ گرنے کے سے انداز میں اس پہ بیٹھی اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

انا، خودداری، عزتِ نفس، اور اپنی ذات کے وقار کے وہ سارے اسباق جو وہ ہمیشہ خود کو پڑھاتی اور یاد دلاتی رہی تھی، آج بہت ذلت کے ساتھ چکنا چور ہوئے تھے۔ وہ شخص کب اس کو یوں ذلیل نہیں کرتا تھا، یوں بے مول، بے وقعت نہیں کرتا تھا، اسے ایک موقع بھی یاد نہ آیا۔ ہمیشہ، ہر دفعہ وہ یہی کرتا تھا، یا پھر ایسا ہو جاتا تھا۔ آخر کب تک یوں چلے گا؟ بہت گرا لیا اس نے خود کو، بہت جھکا لیا، بہت بے مول کر لیا، اب وہ مزید نہیں جھکے گی۔ اب اسے جھکنا پڑے گا، بس آج یہ طے ہو گیا۔

اس نے بے دردی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوچا، پھر ارد گرد پھیلی رات کو دیکھا تو واپسی کا خیال آیا اس نے گود میں رکھا سنہری کلچ کھولا تاکہ موبائل نکال سکے، مگر...... اوہ، موبائل تو اس میں پورا ہی نہیں آتا تھا، وہ تو اس نے میز پہ رکھا تھا اور......

وہ کوٹ اٹھائے باہر بھاگ گئی۔ اپنا ترکی والا بھدا موبائل وہ اس ریسٹورنٹ میں چھوڑ آئی تھی۔ اسے ہر حالت میں موبائل واپس اٹھانا تھا، چاہے جہان سے سامنا ہو یا نہ ہو۔ چند منٹ بعد جب وہ ہانپتی ہوئی واپس استقلال اسٹریٹ میں اس ریسٹورنٹ کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو کونے والی میز خالی تھی۔ وہ دوڑ کر اس میز تک گئی اور اِدھر اُدھر چیزیں اٹھا اٹھا کر اپنا موبائل تلاشا، مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ کرسٹل کے ٹوٹے گلدان کی کرچیاں بھی اب فرش سے اٹھائی گئی تھیں۔

"پرابلم، میڈم؟"

وہ آواز پہ پلٹی تو وہی باوردی ویٹر جس کی ناک پہ موٹا سا تل تھا، متفکر سا کھڑا تھا۔ وہ بوکے اسی نے اسے لا کر دیا تھا۔

"میرا موبائل تھا اس میز پہ۔" وہ پریشانی سے گھنگھریالی لٹیں کانوں کے پیچھے اڑستی ہوئی میز پہ چیزیں پھر سے اِدھر اُدھر کرنے لگی۔

"جی ہاں پڑا تھا مگر جب آپ گلدان گرا کر گئیں تو آپ کے ساتھ جو صاحب تھے، انہوں نے وہ موبائل رکھ لیا اور مجھے کہا تھا کہ اگر آپ آئیں تو میں بتا دوں کہ وہ فون انہی کے پاس ہے۔" ویٹر نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا۔

"اوہ اچھا۔" اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ملنے کا ایک اور بہانہ۔ "وہ چلا گیا؟"

"جی! وہ بل پے کر کے فوراً آپ کے پیچھے باہر دوڑے تھے۔ آپ کو نہیں ملے؟"

"نہیں۔ شکریہ!" وہ پھولوں کے متعلق کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے باہر نکل آئی۔ استقلال اسٹریٹ پہ قدم رکھتے ہوئے اس نے کوٹ پہن لیا۔ اب اسے کافی دیر تک ٹاقسم اسکوائر پہ گورسل کے انتظار میں بیٹھنا تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈی جے خاموشی سے موبائل کے بٹن دباتی نمبر ملا رہی تھی۔ بٹنوں کی ٹوں ٹوں نے ڈورم کی خاموشی میں ذرا سا ارتعاش پیدا کیا تھا۔ کال کا سبز بٹن دبانے سے پہلے اس نے نظر اٹھا کر اپنے مقابل کرسی پہ بیٹھی حیا کو دیکھا جو پوری سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ تھی۔

"مگر حیا! میں اسے کہوں گی کیا؟"

"یہی کہ حیا کو اپنا موبائل چاہیے اور وہ اسے واپس کرے۔"

"مگر وہ واپس کیسے کرے گا؟"

"یہ اس کا مسئلہ ہے، تم کال ملاؤ۔" وہ جھنجھلا کر بولی۔

ڈی جے نے سر ہلا کر سبز بٹن دبایا، اسپیکر آن کر دیا اور فون اپنے لبوں کے قریب لے آئی۔

دوسری جانب طویل گھنٹیاں جا رہی تھیں۔ وہ دونوں دم سادھے گھنٹیاں سنتی گئیں۔

"پتا نہیں، تمہارا موبائل کدھر پڑا ہو، اسی کے نمبر پہ کر لیتے ہیں، شاید اس پہ وہ اٹھائے ہی....." تب ہی کال اٹھا لی گئی۔

"ہیلو؟" وہ جہان ہی تھا۔ ازلی مصروف انداز۔

"السلام علیکم! میں ڈی..... خدیجہ بول رہی ہوں۔"

"دس از جہان۔ خدیجہ! ایسا ہے کہ یہ فون میرے پاس ہے، حیا ریسٹورنٹ میں بھول گئی تھی۔" وہ مصروف سا لگ رہا تھا۔ پیچھے بہت سے لوگوں کی بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ ریسٹورنٹ میں تھا۔

"مجھے پتا ہے، اسی لیے تو کال کی ہے۔"

"اوکے!" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "حیا کدھر ہے؟"

"وہ..... وہ ذرا مصروف تھی تو میں نے سوچا، میں آپ سے بات کر لوں۔" بات کرتے ہوئے ڈی جے نے ایک نظر حیا پہ ڈالی جو دم سادھے، کرسی کے کنارے پہ آگے ہو کر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔

"جی..... کہیے۔"

"بات یہ تھی کہ میں اور حیا کل پرنسز آئی لینڈز (شہزادوں کے جزیروں) پہ جانے کا سوچ رہے تھے، ان فیکٹ ہم پرنسز آئی لینڈز کے سب سے بڑے جزیرے بیوک ادا Buyuk Ada جائیں گے۔"

حیا نے ناسمجھی سے الجھ کر اسے دیکھا، پھر نفی میں سر ہلا کر روکا، مگر وہ مزے سے کہے جا رہی تھی۔

"اوکے تو آپ کو فون چاہیے؟"

"نہیں! فون آپ اپنے پاس رکھیں، عیش کریں، ہمیں بس کمپنی چاہیے۔"

"ڈی جے، ذلیل!" وہ بنا آواز کے لب ہلا کر چلائی اور ڈی جے کی کہنی مروڑی، مگر ڈی جے ہاتھ چھڑا کر اٹھی اور دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

"کل؟ کل تو میں ذرا مصروف ہوں۔ آپ کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔"

"تو پرسوں صبح چلتے ہیں۔"

"شش..... نہیں۔" وہ ہاتھ سے اشارے کرتی اسے باز رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"پرسوں تو مجھے شہر سے باہر جانا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"پھر جمعے کو؟"

"جمعے کو میری ایک اہم میٹنگ ہے اور بیوک ادا میں تو پورا دن لگ جاتا ہے۔"

"پھر تو آپ ہفتے کو بھی مصروف ہوں گے؟" ڈی جے نے مایوسی سے کہا تو دوسری جانب چند لمحے کی خاموشی چھا گئی۔

"ان فیکٹ ہفتے کو میں واقعی فارغ ہوں۔ ٹھیک ہے، ہفتے کو میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔" وہ جیسے بہت با دل نخواستہ تیار ہوا تھا۔

''بس پھر ٹھیک ہے، ہم صبح والی گورسل سے کدی کوئے کی بندرگاہ پہ پہنچ جائیں گے۔ آپ بھی سات بجے سے پہلے پہلے ادھر ہمارا انتظار کیجیے گا۔ وہاں سے ہم پھر اکٹھے فیری میں سوار ہوں گے، ٹھیک؟''

''ٹھیک میڈم!''

''اور ہاں، تب تک آپ ہمارا فون استعمال کر سکتے ہیں۔''

''میں آپ کا احسان تاعمر یاد رکھوں گا۔'' وہ ذرا سا ہنس کر بولا۔

وہ فون بند کر کے واپس آئی تو حیا خاموشی سے اسے گھور رہی تھی۔ ڈی جے واپس کرسی پہ بیٹھی اور بڑے لاپروا انداز میں میز سے میگزین اٹھا کر صفحے پلٹنے لگی۔

''کیا ضرورت تھی اسے ساتھ چلنے کا کہنے کی؟ ہم اکیلے بھی تو جا سکتے تھے۔''

''کیونکہ مجھے اس کے شادی شدہ ہونے میں بھی ابھی تک شک ہے۔'' وہ اب ایک صفحے پہ رک کر بغور کوئی تصویر دیکھ رہی تھی۔ ''ویسے اس کی بیوی کہاں ہوتی ہے؟''

''یہیں، استنبول میں۔'' وہ بددلی سے پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

''اس کی کیا اپنی بیوی سے کوئی لڑائی ہے؟ کبھی ذکر نہیں کرتا اس کا۔''

''شاید...... میں نے اس موضوع پہ کبھی بات نہیں کی۔ ویسے بھی جہان کا نکاح بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ اب پتا نہیں اس کو خود اپنے نکاح کا علم ہے بھی یا نہیں کیونکہ وہ کبھی ذکر نہیں کرتا، شاید پھپھو نے اس سے چھپا رکھا ہو۔''

''بچوں والی باتیں کرتی ہو تم بھی۔'' ڈی جے چہرہ اٹھا کر خفگی سے اسے دیکھا۔ ''آج کے دور میں ایسا کہاں ممکن ہے کہ کسی کا نکاح ہوا ہو اور اسے علم بھی نہ ہو۔ یقیناً اسے پتا ہوگا۔ مگر یہاں سوال یہ ہے کہ نکاح اس کا جس سے بھی ہو، تم اس کی اتنی کیئر کیوں کرتی ہو؟''

ڈی جے پھر مسکراہٹ دبائے رسالے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''کیونکہ اس کا نکاح مجھ سے ہوا تھا۔'' وہ آہستہ سے بولی تو ڈی جے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔

''یعنی، یعنی اوہ گاڈ...... تمہارا اس سے نکاح ہوا تھا تو...... تو وہ تمہارا کیا لگا؟''

''سوتیلا ماموں لگا۔'' وہ بگڑ کر بولی اور اپنے بینک کی طرف بڑھ گئی۔

''اوہ مائی گاڈ...... تم نے مجھے اتنی بڑی بات نہیں بتائی!'' ڈی جے ابھی تک بے یقین تھی۔

''اب بتا تو دی ہے نا۔ اب جاؤ کلاس کا ٹائم ہونے والا ہے اور میں آج کیمپس نہیں جاؤں گی۔'' وہ اوپر اپنے بستر میں پھر سے لیٹ گئی اور کمبل منہ پہ ڈال لیا۔

''بہت ذلیل ہو تم حیا! اوہ گاڈ، وہ تمہارا ہزبینڈ ہے...'' ڈی جے ابھی ٹھیک سے حیران ہی نہیں ہو پائی تھی کہ گھڑی پہ نگاہ پڑی۔

ارے آٹھ بج گئے۔'' وہ میگزین پھینک کر اٹھی اور کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی، پھر سلائیڈ کھول کر، چہرہ باہر نکالے لبوں کے گرد دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنائے با آواز بلند چلائی۔

''گڈ ما آ آ آ آرننگ...... ڈی جے۔''

''ٹی ی ی ی ی...... نے ے ے......'' دور نیچے سے کسی لڑکے نے جوابی ہانک لگائی تھی۔

''ذ ا...... لیل۔'' وہ جل کر اور زور سے چلائی۔

''چپ کرو، مجھے سونے دو۔'' حیا نے تکیہ کھینچ کر اسے دے مارا، مگر وہ اسی کھڑکی کے پاس کھڑی صدائیں لگاتی رہی۔

☆ ☆ ☆

وہ یونیورسٹی کی عمارت کی بیرونی سیڑھیاں اتر رہی تھی، جب اس کا موبائل بجا۔ وہ وہیں تیسری سیڑھی پہ رکی، فائل اور کتابیں دوسرے ہاتھ میں منتقل کیں اور باری باری کوٹ کی دونوں جیبیں کھنگالیں، پھر اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چنگھاڑتا ہوا موبائل باہر نکالا۔

یہ اس کا پاکستانی سم والا فون تھا۔ دوسرا موبائل جہان کے پاس ہونے کے باعث وہ آج کل اسے ہی استعمال کر رہی تھی۔
چمکتی اسکرین پہ ترکی کا کوئی غیر شناسا سا نمبر لکھا آ رہا تھا۔ نمبر کس کا تھا، اسے قطعاً یاد نہ آیا۔ نمبر یاد رکھنے کے معاملے وہ بہت چور تھی۔ اسے اپنے پاکستانی موبائل نمبر تک کے آخری دو ہندسے بھولتے تھے اور ترکی والا تو خیر سرے سے یاد نہ تھا۔
''ہیلو؟'' وہ فون کان سے لگائے ہوئے وہیں سیڑھی پہ بیٹھ گئی۔ کندھے سے بیگ اتار کر ایک طرف رکھا اور فائلیں گود میں۔

''جہاں تیرا نقش قدم رکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں''

آواز اجنبی تھی بھی اور نہیں بھی، مگر اس کا لوچ، اتار چڑھاؤ اور انداز...... سب شناسا سا تھا۔ وہ لب بھینچ گئی۔
''عبدالرحمٰن بات کر رہا ہوں اور بات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔'' گو کہ وہ پڑھا لکھا لگتا تھا مگر انداز سے کہیں نہ کہیں ممبئی کے کسی نچلے طبقے کے شہری کی جھلک آتی تھی۔
''کیا بات کرنی ہے آپ کو؟ آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟''
''ملنا چاہتا ہوں۔ بتائیے کیا یہ ممکن ہے؟''
اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ ہتھیلیاں بے اختیار پسینے میں بھیگ گئیں۔
''میں نہیں مل سکتی۔''
''کیوں؟ جس فون کال میں آپ کی دوست نے آپ کے کزن کو اپنے ساتھ چلنے کی آفر کی تھی، اس میں غالباً انہوں نے بیوک ادا کا ذکر کیا تھا۔ پرنسز آئی لینڈز...... شہزادوں کے جزیرے...... کیا آپ ادھر نہیں آ رہیں؟''
تو وہ اس کی کالز ٹیپ کر رہا تھا اور تب ہی اس نے پاکستان والے موبائل پہ کال کی تھی کیونکہ وہ ترکی والے فون کے جہان کی تحویل میں ہونے کے بارے میں جانتا تھا۔
''میں بیوک ادا نہیں جا رہی۔ آئندہ آپ نہ تو میرا پیچھا کریں گے، نہ ہی میری کالز ٹیپ کریں گے۔ ورنہ میں آپ کی جان لے لوں گی سمجھے!'' اس نے جھلا کر فون کان سے ہٹایا اور سرخ بٹن زور سے دبایا۔ موبائل آف ہو گیا۔
وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانے کب یہ شخص اس کا پیچھا چھوڑے گا۔

☆ ☆ ☆

سمندر کی جھاگ بھری نیلی لہروں پر سے ہوا سرسراتے ہوئے گزر رہی تھی۔ وہ دونوں فیری کی بالکونی میں کھڑے سامنے سمندر کو دیکھ رہے تھے۔ جہان قدرے جھک کر ریلنگ پکڑے کھڑا تھا اور حیا گردن سیدھی اٹھائے لب بھینچے سامنے افق پہ دیکھ رہی تھی۔
ڈی جے ابھی ابھی کیمرا لیے بالکونی کے دوسرے سرے تک گئی تھی، سو ان دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔
وہ جب سے کدی کوئے کی بندرگاہ پہ فیری میں سوار ہوئے تھے، تب سے آپس میں بات نہیں کر رہے تھے۔ فیری ویسے بھی کھچا کھچ بھرا تھا۔ جگہ ڈھونڈنے میں ہی اتنا وقت صرف ہو گیا۔ فیری کی نچلی منزل جو چاروں طرف سے شیشوں سے بند تھی، پر جڑے تمام صوفے اور کرسیاں بھرے تھے، سو وہ بالائی منزل پہ آ گئے جو اوپن ائیر تھی۔ کھلا سا وسیع احاطہ جہاں ہر طرف صوفے اور کرسیاں تھیں، مگر ایک نشست بھی خالی نہ تھی۔ ان کو بالآخر فیری کے کنارے پہ بنی تنگ سی بالکونی میں کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ وہ اتنی تنگ تھی کہ سمندر کی جانب رخ کر کے ایک وقت میں ایک بندہ ہی ریلنگ کے ساتھ کھڑا ہو سکتا تھا۔ بالکونی کی گیلری لمبی تھی اور لوگوں کی ایک طویل قطار وہاں کھڑی تھی۔
وہ دونوں بالکل دائیں طرف کے کونے میں تھے۔ ہوا بے حد سرد تھی، پھر بھی جہان سیاہ سوئیٹر کی آستین کہنیوں تک موڑے ہوئے تھا۔ مگر اسے بے حد سردی لگ رہی تھی کہ اس نے سیاہ لمبے اسکرٹ کے اوپر صرف سرمئی سوئیٹر ہی پہن رکھا تھا، سو اب سیاہ اسٹول کو سختی سے کندھوں کے گرد لپیٹ کر بازو سینے پہ باندھ رکھے تھے۔
''گیوی سم سن شائن...... گیوی سم رین......''

حیا کے بائیں جانب ریلنگ پکڑے انڈین لڑکیوں کا ایک گروپ کھڑا تھا۔ وہ لڑکیاں بہت سی تھیں وہ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی تھیں، اور ان کی قطار بالکونی کے دوسرے سرے تک جاتی تھی۔ وہ کسی اسٹڈی ٹور پہ استنبول آئی ہوئی تھیں اور اب چہرے کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بنائے باآواز بلند لہک لہک کر گیت گا رہی تھی۔

"تم اس روز بغیر بتائے اٹھ کر چلی گئیں۔ تمہیں پتا ہے میں کتنی دیر استقلال اسٹریٹ میں تمہیں ڈھونڈتا رہا؟" وہ ریلنگ پہ جھکا سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تو نہ ڈھونڈتے۔" حیا نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ ہوا سے اس کے بال اڑ اڑ کر جہان کے کندھے کو چھو رہے تھے مگر وہ انہیں سمیٹنے کا تکلف بھی نہیں کر رہی تھی۔

"اتنا غصہ؟" جہان نے گردن موڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ تنے ہوئے نقوش کے ساتھ سامنے دیکھتی رہی۔

"ایسا بھی کچھ نہیں کہا تھا میں نے۔"

"اگر تمہیں خود شرمندگی نہیں ہے تو میں کیوں دلاؤں؟"

"میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی پوچھتا۔"

"مجھے کسی اور سے کوئی سروکار نہیں ہے۔"

Sea gulls کا ایک غول پر پھڑپھڑاتا ان کے سامنے سے گزرا تھا۔ جہان سیدھا ہوا اور ہاتھ میں پکڑی روٹی کا ٹکڑا توڑ کر فضا میں اچھالا۔ ایک بڑے سے sea gull (سمندری بگلے) نے فضا میں ہی غوطہ لگا کر اسے اپنی چونچ میں دبا لیا۔

وہ خاموشی سے پانی کی نیلی سطح کو دیکھتی رہی جہاں گلابی جیلی فش تیر رہی تھی، ان کے سر پانی کے اندر ہی تھے مگر وہ اتنا شفاف تھا کہ وہ واضح دکھائی دیتی تھیں۔

"کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے حیا! کہ میں پوچھ سکوں کہ وہ شخص کیوں تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے؟"

"پوچھو، ضرور پوچھو، مگر اسی سے جا کر پوچھو۔"

"مگر میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے؟"

"میں بھی نہیں جانتی کہ وہ کون ہے۔"

آج وہ جہان کے لیے وہی حیا سلیمان بن گئی تھی، جو وہ ہر ایک کے لیے تھی۔ خود کو جس شخص کے سامنے جھکا لیا تھا، اب اسی کے سامنے اٹھانا بھی تھا۔

"جینے دو...... کچھ پل تو...... جینے دو۔"

وہ لڑکیاں ابھی تک لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ ڈی جے بھی کہیں ان کے ساتھ تھی۔

"اچھا آئی ایم سوری۔" وہ رخ موڑ کر اس کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا اور روٹی کا بچا ہوا ٹکڑا اس کی طرف بڑھایا۔

حیا نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ ذرا سا مسکرایا۔ ایک لمحہ لگا تھا اسے پگھلنے میں اور وہ پگھلی ہوئی موم کا ڈھیر بن گئی۔ بہت دھیرے سے وہ مسکرا دی۔ خود سے کیے سارے وعدے بھول گئے۔

"اوکے!" اس نے روٹی کا ٹکڑا کھینچ کر توڑا اور اڑتے ہوئے بگلے کی سمت پھینکا۔ اس نے اسے فضا میں ہی پکڑ لیا۔

"تمہارا ترکی بہت خوب صورت ہے جہان! مگر یہاں کے لوگ اچھے نہیں ہیں۔" اب وہ روٹی کے ٹکڑے کر کے فضا میں اچھال رہی تھی۔

"اچھا...... کیسے ہیں وہ؟"

"اکھڑ، بدلحاظ، مغرور، بدتمیز، بدتہذیب، بے مروت، الٹے دماغ کے لوگ ہیں یہاں کے۔"

وہ کہتی گئی اور وہ بے اختیار ہنستا چلا گیا۔

''اور پاکستان کے لوگ کیسے ہوتے ہیں حیا سلیمان؟'' خوب ہنس کر وہ بولا تھا۔

''کم از کم ترکوں سے تو بہتر ہوتے ہیں۔'' اس نے روٹی کا آخری ٹکڑا بھی دور اچھال دیا۔

جہان ابھی تک ہنس رہا تھا۔

Give me some sunshine

Give me some rain.....

Give me another chance

To grow up again......

لڑکیاں اسی طرح مگن سی گا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ تینوں ساتھ ساتھ بیوک ادا کی اس بل کھاتی سڑک پر نیچے اتر رہے تھے۔ حیا ایک ہاتھ سے اسٹول اور دوسرے سے اڑتے بالوں کو سمیٹ کر پکڑے ہوئے چل رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ پرانے زمانوں میں واپس چلی گئی ہے۔ ایک قدیم جزیرے پہ جو ساری دنیا سے الگ تھلگ سمندر کے درمیان واقع تھا۔ وہ صدیوں پرانے شہزادوں کے جزیرے تھے اور وہ خود کوئی امر ہوئی شہزادی تھی۔

''شہزادوں کے جزیرے یا پرنسز آئی لینڈز' Princes' Islands (ترک میں 'ادالار' ادا یعنی جزیرے، اور لار یعنی شہزادوں کے) مرمرا کے سمندر میں قریب قریب واقع نو جزیروں کے گروہ کو کہا جاتا تھا۔ گئے وقتوں میں سلاطین اپنے تخت و تاج کے لیے خطرناک لگتے شہزادوں کو جلاوطن کر کے ان نو جزیروں پہ بھیجا کرتے تھے، جس سے اس کا نام پرنسز آئی لینڈز پڑ گیا تھا۔ ''بیوک ادا'' ان میں سب سے بڑا جزیرہ تھا۔ بیوک یعنی بڑا، ''ادا'' یعنی جزیرہ۔ بیوک ادا دنیا کے ٹریفک، رش اور ہنگامے سے دور ایک پرسکون چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ وہاں گاڑیں، بسیں اور دوسری آٹو گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں۔ سفر کرنے کے لیے قدیم وقتوں کی طرح گھوڑا گاڑیاں رکھی گئی تھیں یا پھر بائی سائیکل۔

ڈی جے اور جہان اس سے چند قدم آگے نکل گئے تھے اور وہ قدیم زمانوں کے رومانس میں کھوئی ذرا پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ دونوں باتیں بھی کر رہے تھے، ان میں اب تک خاصی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ جہان اسے ریسٹورنٹس کے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔

''یہاں بہت زیادہ اقسام کے کباب ملتے ہیں، غالباً ڈیڑھ سو اقسام کے، اور ہر ریستوران یا تو سوپ فری دیتا ہے، یا ایپل ٹی۔''

وہ بے توجہی سے ان کی باتیں سنتی قدم اٹھا رہی تھی۔

اس جگہ سڑک دونوں اطراف سے ریسٹورنٹس میں گھری تھی۔ ان کے دروازے کھلے تھے اور سامنے برآمدوں میں شیڈ تلے کرسیاں میزیں بچھی تھیں۔ سیاحوں کا ایک ہجوم ہر سو پھیلا تھا۔

سڑک کے وسط میں ایک جگہ مجمع سا لگا تھا۔ وہ تینوں بھی بے اختیار دیکھنے کے لیے رک گئے۔

سیاحوں کے ہجوم کے درمیان کھڑی وہ ایک خوب صورت سی ترک بچی تھی۔ وہ گہرے جامنی بغیر آستین فراک میں ملبوس تھی، اور گھنگھریالے بال کندھے پہ آگے کو ڈالے ہوئے تھے۔ وہ ریڈ کارپٹ پہ کھڑی کسی اداکارہ کی طرح کمر پہ ہاتھ رکھے ایک معصوم سا پوز بنائے کھڑی تھی اور اردگرد دائرے میں کھڑے سیاح کھٹا کھٹ اپنے کیمروں میں اس کی تصویریں مقید کر رہے تھے۔

وہ ہر تصویر کے بعد ذرا مختلف انداز سے کھڑی ہو جاتی اور چہرے پہ معصومیت طاری کیے کبھی آنکھیں پٹپٹاتی، کبھی تھوڑی تلے ہاتھ رکھتی، کبھی مسکراتی، کبھی ناک سکوڑتی، شاید ایک دو سیاح اس کی تصویر بنانے رکے ہوں گے تو دیکھا دیکھی...... مجمع لگ گیا ہوگا۔

وہ اور ڈی جے بھی فوراً اپنے کیمرے نکال کر تصویریں بنانے کھڑی ہو گئیں۔ اس بچی کے پوز اتنے پیارے تھے کہ تصویر بنا بنا کر بھی ان کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حیا نے لمحے بھر کا توقف کرتے ہوئے چہرہ اٹھایا تو دیکھا، جہان ساتھ ہی کھڑا لب بھینچے قدرے ناگواری سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

وہ شانے اچکائے پھر سے سیاحوں کے جگمگھٹے میں گھری بچی کی طرف متوجہ ہو گئی۔
''یار! عمر دیکھو اس کی، اور ایکشن کیسے مار رہی ہے۔'' ڈی جے ہنستے ہوئے تصویریں کھینچ رہی تھی۔
دفعتاً مجمع کو چیر کر ایک لڑکی تیزی سے آگے بڑھتی دکھائی دی۔ اس نے لمبے اسکرٹ اور کھلے سے سوئیٹر کے اوپر بھورا سادہ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی رنگت سنہری تھی اور آنکھیں بھوری سبز۔ وہ سولہ سترہ برس کی لگتی تھی۔ بائیں کہنی پہ اس نے ٹوکری ڈال رکھی تھی، جس میں جنگلی پھول تھے۔
وہ ماتھے پہ تیوریاں لیے آگے بڑھی اور سختی سے اس بچی کا بازو پکڑا۔ بچی گھبرا کر پلٹی اور جیسے ہی اس لڑکی کو دیکھا، اس کے لبوں سے ہولے سے نکلا ''عائشے گل!''
''جواباً وہ بھوری سبز آنکھوں والی لڑکی ترک میں غصے سے کچھ کہتی ہوئی اس کا بازو پکڑ کر مجمع میں سے راستہ بنا کر اسے لے جانے لگی۔ وہ ترک میں جو کہہ رہی تھی، وہ ایسا تھا کہ سیاح فوراً پیچھے ہٹنے لگے۔ ریڈ کارپٹ شو ختم ہو گیا تھا۔
بچی اب مزاحمت کرتی، چڑچڑے پن سے کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ لڑکی، جس کا نام شاید عائشے گل تھا، مسلسل بولتی ہوئی اسے لے کر جا رہی تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں غصہ بھی تھا اور دکھ بھی اور شاید نمی بھی۔
حیا گردن موڑ کر ان کو جاتے دیکھتی رہی۔
''آؤ! تمہیں اپنا بیوک ادا دکھاتا ہوں۔'' جہان کی آواز پہ وہ چونکی، پھر خفیف سا سر جھٹک کر اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔
جہان نے ایک بگھی روک دی تھی۔ ڈی جے نے البتہ چار لیرا فی گھنٹہ کے حساب سے سائیکل کرائے پر لے لی تھی اور اب وہ اسی پہ سوار ہو رہی تھی۔ حیا بگھی کے قریب آئی تو جہان نے ایک طرف ہو کر راستہ دیا۔
وہ شاہانہ سی بگھی اوپر سے کھلی تھی۔ آگے ایک گھوڑا جتا تھا، اس کے ساتھ بگھی بان لگام تھامے بیٹھا تھا۔ پیچھے ایک خوبصورت سی دو افراد کے بیٹھنے کے لیے نشست بنی تھی، جس پہ سنہری نقش و نگار بنے تھے۔
وہ احتیاط سے اوپر چڑھی۔ مخملیں، شاہی نشست نہایت گداز تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی اس پہ بیٹھے۔
بگھی بان نے گھوڑے کو ذرا سی چابک لگائی تو وہ چل دیا۔ پتھریلی سڑک پر اس کے ٹاپوں کی آواز گونجنے لگی۔
''تو پھر پاکستان کے اچھے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟''
حیا نے گردن اس کی طرف پھیری۔ وہ ہاتھ میں پکڑے اسمارٹ فون پر نگاہیں جمائے پوچھ رہا تھا۔ وہ اسے کبھی بھی مکمل توجہ نہیں دے گا، یہ تو طے تھا۔
''پاکستان اور پاکستان کے اچھے لوگ!'' حیا گہری سانس لے کر سامنے کو دیکھنے لگی۔
سڑک دو رویہ سبز درختوں کی قطار سے گھری تھی۔ چند پیلے زرد پتے سڑک کے کناروں پہ بکھرے پڑے تھے۔ درختوں کی دونوں قطاروں کے درمیان بگھی سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔
''ہم بہت ترقی یافتہ نہیں ہیں، بہت پڑھے لکھے بھی نہیں ہیں۔ دھوکہ دہی، رشوت زنی، قتل و غارت اور بہت سی برائیوں میں بھی ملوث ہیں۔ ہمارے ہاں ظلم کھلے عام کیا جاتا ہے اور مظلوم بھی ہم ہی ہوتے ہیں۔ ہم پسماندہ بھی ہیں اور پست ذہن کے بھی، مگر اس سب کے باوجود جہان سکندر! ہم دل کے برے نہیں ہیں۔ ہمارے دل بہت سادہ، بہت معصوم، بہت پیارے ہوتے ہیں۔''
پھر وہ قدرے توقف سے بولی۔
''کیا تم نے واقعی ابا سے پوچھا تھا کہ پاکستان میں ہر روز بم بلاسٹ ہوتے ہیں؟''
''میں نے؟'' موبائل کی اسکرین کو انگلیوں میں پکڑے وہ ذرا سا چونکا، پھر زیر لب مسکرا دیا۔ ''شاید..... کیا نہیں ہوتے؟''
''ہوتے تو ہیں۔ ہماری انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی کے کیفے میں بھی بلاسٹ ہوا تھا۔ اس دن ہماری ایک فیئر ویل پارٹی تھی اور ہم فرینڈز بلاسٹ سے دس منٹ پہلے کیفے سے نکلی تھیں۔ جب دوبارہ آئے تو بہت برا منظر تھا وہ... خون، ٹوٹا کانچ، جلی ہوئی دیواریں.....''

اس نے یاد کر کے جیسے جھر جھری لی۔

"تو سکیورٹی ادارے کیا کرتے ہیں؟"

"لگتا تو نہیں کہ کچھ کرتے ہیں۔ خیر! ترکی کے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟"

"میں تو ایک غریب سا ریسٹورنٹ اونر ہوں۔ ورکنگ کلاس کا ایک مزدور صفت شخص، جس کو مصروفیت کے باعث گھومنے پھرنے کا وقت بھی نہیں ملتا اور باوجود اس کے کہ میرے گھر سے بیوک ادا قریباً دو گھنٹے کی مسافت پہ ہوگا، میں تین سال بعد ادھر آ رہا ہوں۔"

"واقعی؟" اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ جہان نے شانے اچکا دیئے۔

"وقت ہی نہیں ملتا۔ میں نے بچت کے لیے ریسٹورنٹ میں ورکرز کم سے کم رکھے ہوئے ہیں، سو کام کا بوجھ بہت بڑھ جاتا ہے۔" وہ اسی طرح اسکرین کو دباتا مسلسل کام کر رہا تھا۔

بگھی سڑک کی ڈھلان سے نیچے اتر رہی تھی۔ بل کھاتی سڑک کے دونوں اطراف میں خوب صورت بنگلوں کی قطاریں تھیں۔ سڑک کے کنارے کتے ٹہلتے پھر رہے تھے۔

"یہ تختہ کمزور ہے۔" دفعتاً جہان نے اپنے جوگر سے نیچے موجود تختہ تھپتھپایا اور پھر جھکا۔

"پلیز جہان! ساری دنیا کی ٹوٹی چیزیں تمہارا ہیڈک نہیں ہیں۔"

"اچھا!" وہ جو جھک رہا تھا، قدرے خفگی سے سیدھا ہوا۔ وہ پھر سے موبائل پہ کچھ لکھنے لگا۔

"فون رکھ بھی دو۔"

"مادام! آپ یہ مت بھولا کریں کہ آپ ایک غریب ورکر کے ساتھ ہیں جو اگر ایک دن کا آف لے گا تو سارے آرڈرز میں ہیر پھیر ہو جائے گی، سو اس بے چارے کو بہت سے کام یونہی آن دی موو بھگتانے پڑتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان تمام محنتوں کے باوجود وہ اگلے دس سال تک بھی بیوک ادا کے ان بنگلوں جیسا آدھا بنگلہ بھی نہیں بنا سکتا۔"

اس کے کہنے پہ حیا نے لاشعوری طور پر سڑک کے دونوں اطراف بنے بنگلوں پہ نگاہ دوڑائی اور ایک لمحے کو ٹھٹک کر رہ گئی۔

دائیں طرف جہان کے اس جانب جس بنگلے کے سامنے سے بگھی گزر رہی تھی، وہ اتنا عالیشان اور خوب صورت تھا کہ نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔ چار منزلہ، سفید اونچے ستونوں پہ وہ محل یوں شاہانہ انداز میں کھڑا تھا جیسے کوئی ببر شیر اپنے پنجوں پہ بیٹھا ہوتا ہے۔ اس کے چھوٹے سے باغیچے کے آگے ایک لکڑی کا سفید گیٹ تھا۔

بگھی آگے بڑھ گئی تو وہ گردن موڑ کر دیکھنے لگی۔

سفید محل کے لکڑی کے گیٹ پہ نام کی ایک تختی لگی تھی جس پہ قدیم لاطینی ہجوں کے انداز میں ترچھا کر کے انگریزی میں لکھا تھا۔

"اے آر پاشا"

اس کے دل کی دھڑکن لمحے بھر کو رکی تھی۔ اس کے انداز پہ جہان نے پلٹ کر اس گھر کو دیکھا تھا۔

"اب کیا تم ابھی سے میری جیب کا مقابلہ ان بنگلوں کے ساتھ کرنے لگی ہو؟"

وہ چونکی، پھر دوبارہ اس گیٹ کو دیکھا جو اب دور ہوتا جا رہا تھا۔

"نہیں تو۔" وہ سر جھٹک کر آگے دیکھنے لگی۔

پھر کتنی ہی گلیوں سے وہ خاموشی سے گزرے، یہاں تک کہ ایک جگہ جہان نے ترک میں کچھ کہہ کر کوچوان سے بگھی رکوا دی۔

"ہم نے پورے جزیرے کا چکر لگانا تھا، پھر ابھی سے کیوں رک گئے؟" وہ اترنے لگا تو حیا بول اٹھی۔

"نماز!" جہان نے سامنے مسجد کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

"اچھا!" وہ سر ہلا کر اٹھی، ایک ہاتھ راڈ پہ رکھا اور احتیاط سے پاؤں نیچے پیڈل پہ رکھ کر اتری۔ جہان پہلے ہی اتر کر مسجد کے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

مسجد چھوٹی مگر صاف ستھری سی تھی۔ جہان مردوں والے حصے میں چلا گیا تو وہ وضو کر کے عورتوں کے پریئر ہال میں آ گئی۔ وہ ظہر کا وقت تھا، مگر سورج بہت ٹھنڈا لگ رہا تھا۔

ہال کے ایک کونے میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے ایک بچی اسی کے انداز میں بیٹھی دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔

حیا گیلے بازوؤں کی آستین نیچے کرتے ہوئے بغور ان دونوں کو دیکھتی رہی۔ یہ وہی دونوں لڑکیاں تھیں جو ابھی دو گلیاں چھوڑ کر سڑک پہ اسے نظر آئی تھیں۔ جامنی فراک والی چھوٹی بچی اور دوسری بھورے اسکارف والی سنجیدہ سی لڑکی۔

بچی منت بھرے شکایتی انداز میں اس لڑکی کے گھٹنے کو جھنجھوڑتی کچھ کہے جا رہی تھی، مگر وہ لڑکی جس کا نام شاید عائشے گل تھا، نفی میں سر ہلاتی گویا مسلسل اس کی تردید کیے جا رہی تھی۔ وہ دونوں بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھیں، حیا اسٹول کو چہرے کے گرد لپیٹے ہوئے ان دونوں کو دیکھے گئی۔ انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا شاید، وہ آپس میں مشغول تھیں۔

وہ جب نماز پڑھ کر اٹھی تو دیکھا، وہ بچی ابھی تک اس لڑکی کو منا رہی تھی اور شاید اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی آواز دھیمی اور زبان انجان تھی، مگر کبھی کبھی وہ بے بسی بھرے انداز میں چیخ کر ذرا زور سے "عائشے گل...... پلیز!" کہہ اٹھتی تو حیا کو سنائی دے دیتا۔

ایک آخری نگاہ ان دونوں پہ ڈال کر وہ باہر آ گئی۔

مسجد کے برآمدے میں وہ تنہا نماز پڑھ رہا تھا۔ حیا ننگے پاؤں چلتی ہوئی برآمدے تک آئی اور ایک ستون سے ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئی۔ ہوا سے اس کا سر پہ لیا اسٹول سر کی پشت تک پھسل گیا تھا۔

سامنے چند قدم کے فاصلے پر وہ سجدے میں جھکا تھا۔ نیلی جینز اور اوپر سیاہ سوئیٹر جہان سکندر کا مخصوص لاپرواہ سا حلیہ۔ وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ سر ستون سے ٹکائے اسے دیکھے گئی۔

وہ اب سجدے سے اٹھ کر تشہد میں بیٹھ رہا تھا۔ ہر کام بہت پھرتی سے کرنے والا جہان سکندر کی نماز بہت ٹھہری ہوئی اور پرسکون تھی۔ وہ چونکہ اس سے ذرا پیچھے کھڑی تھی۔ تو یہاں سے اس کا صرف ہلکا رخ ہی نظر آتا تھا۔ گردن کی پشت اور چہرے کا ذرا سا دایاں حصہ۔ وہ گردن جھکائے پڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے دائیں رخ سلام کے لیے گردن موڑی تو حیا کو بالآخر اس کا چہرہ نظر آیا۔ وہ زیر لب مسکراتے اسے دیکھے گئی۔

دوسری جانب سلام پھیر کر اس نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے۔ چند لمحے وہ یونہی بیٹھا دعا مانگتا رہا، پھر ایک گہری سانس لے کر ہاتھ چہرے پر پھیرتا وہ کھڑا ہوا اور واپس مڑا تو اسے ستون کے ساتھ کھڑے دیکھ کر مسکرایا۔

"تم انتظار کر رہی تھیں؟" وہ ذرا مسکرا کر کہتا ہوا اس کی طرف آیا تو حیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں ساتھ ہی باہر آئے تھے۔

"جہان!" چوکھٹ پر جب وہ جھک کر کھڑا جوگر پہن رہا تھا تو حیا نے اسے پکارا۔

"ہوں؟"

"تم مذہبی ہو؟"

"تھوڑا بہت۔" وہ تسمہ باندھ رہا تھا۔

"لگتے نہیں ہو۔"

تسمے کی گرہ لگاتی اس کی انگلیاں تھمیں، اس نے سر اٹھا کر قدرے ناسمجھی سے حیا کو دیکھا۔

"میں کیا کرتا تو مذہبی لگتا؟"

"یہ تو مجھے نہیں پتا۔ ویسے تم نے دعا میں کیا مانگا؟"

"میں نے زندگی مانگی!" وہ تسمہ بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"زندگی؟" حیا نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے دہرایا۔ وہ اب عادتاً سوئیٹر کی آستینیں موڑ رہا تھا۔

"انسان وہی چیز مانگتا ہے، جس کی اسے کمی لگتی ہے، سو میں ہمیشہ زندگی مانگتا ہوں۔ اگر زندگی ہے تو سب خوب صورت ہے، نہیں

ہے تو سب اندھیر ہے۔" وہ دونوں سڑک کے کنارے ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

"خوب صورتی کیا ہوتی ہے جہان؟"

بیوک ادا کی سرد ہوا اس کے بال پھر سے اڑانے لگی تھی۔ شال سر سے پھسل کر اب گردن کے پیچھے اٹک گئی تھی اور جب اپنے بکھرتے بال دونوں ہاتھوں میں سمیٹتے ہوئے اس نے یہ سوال پوچھا تھا تو شدید خواہش کے باوجود وہ جانتی تھی کہ "وہ خوب صورتی حیا سلیمان کی آنکھیں ہیں" جیسی کوئی بات نہیں کہے گا، مگر جو اس نے کہا، وہ حیا سلیمان کے لیے قطعاً غیر متوقع تھا۔

"علی کرامت کی ماں!"

"کیا؟" اس نے نا سمجھی سے جہان کو دیکھا۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا۔

"میرے لیے خوب صورتی علی کرامت کی ماں پہ ختم ہو جاتی ہے۔ علی کرامت میرا ایک اسکول فیلو تھا۔ ایک دفعہ میں اس کے گھر گیا تھا، تب میں نے اس کی ماں کو دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت خاتون تھیں۔ وہ ڈاکٹر تھیں اور اس وقت ہسپتال سے آئی تھیں۔ وہ تھکی ہوئی تھیں اور تب کچن میں کھڑی ٹشو سے اپنا چہرہ تھپتھپا رہی تھیں۔ حیا! وہ چہرہ اتنا مقدس، اتنا خوب صورت تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔" اس کی بات پہ وہ چند لمحے کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

"وہ..... ترک تھیں یا پاکستانی؟" بہت دیر بعد بولی۔

"وہ سیاہ فام تھیں۔ خالص سیاہ فام۔"

اور حیا کے حلق تک میں کڑواہٹ گھل گئی، تاہم وہ لب بھینچے خاموشی سے اس کے ساتھ قدم اٹھاتی رہی۔

یہ وہ واحد شخص تھا جس کے سامنے وہ جھک جاتی تھی، خاموش ہو جاتی تھی، کڑوے گھونٹ پی لیتی تھی اور پھر بھی موم بن جاتی تھی۔ اگر یہی بات کسی اور نے کہی ہوتی تو وہ اپنے ازلی طنطنے سے اس کو اتنی سناتی کہ ایسی بات کرنے کی وہ شخص دوبارہ کبھی ہمت نہ کرتا۔ حد ہو گئی، بھلا سیاہ فام کہاں اتنے حسین ہو سکتے ہیں۔ یا پھر شاید جہان کا مطلب یہ تھا کہ اسے حیا سلیمان کے مقابلے میں ایک بدصورت ترین سیاہ فام عورت بھی خوب صورت لگتی ہے۔

وہ زندگی میں پہلی دفعہ کسی بدصورت عورت کو سوچ کر حسد کا شکار ہوئی تھی مگر چپ رہی۔

سہ پہر ڈھلنے لگی تو وہ واپسی کی تیاری کرنے لگے۔ بیوک ادا جزیرے کی گلیوں میں چل چل کر اب اس کے پاؤں دکھنے لگے تھے۔ ڈی جے واپسی پہ پھر سے بالکونی میں کھڑے ہونے کے لیے قطعی راضی نہ تھی اور اس کا پورا ارادہ فیری میں گھس کر چاہے پیار سے، چاہے لڑ جھگڑ کر، مگر بیٹھنے کے لیے نشست ڈھونڈنے کا تھا۔ جہان کو ٹکٹ لینے میں خاصی دیر لگ گئی۔ پانچ بجے والی فیری شام کی آخری فیری تھی، سو سیاحوں کا سارا ہجوم ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے آگے موجود تھا۔ اب اس کے بعد اگلا جہاز رات آٹھ بجے چلنا تھا اور پھر اگلی صبح تک کوئی جہاز نہیں آتا تھا۔ جو رہ گیا، وہ جزیرے پر رات بسر کرے یا تیر کر واپس جائے۔

"اگر تم دونوں اسی رفتار سے چلتی رہیں تو فیری نکل جائے گی اور تمہیں واقعی تیر کر واپس جانا پڑے گا۔" وہ ان دونوں کی سست روی پہ خاصا جھنجھلا کر بولا تھا۔ جواباً وہ قدرے خفت سے ذرا تیز چلنے لگیں۔

بندرگاہ کھچا کھچ سیاحوں سے بھری تھی۔ وہ تینوں اس رش میں سے بمشکل راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔ جہان آگے تھا اور وہ دونوں پیچھے۔ اسے اب اپنے ریسٹورنٹ کی فکر ہونے لگی تھیں۔ پراپرٹی کی مالکہ نے آ کر پھر سے کوئی ہنگامہ کیا تھا۔ جہان اسے اس سارے معاملے پہ قدرے پریشان و متاسف لگا تھا، گو کہ وہ اپنے تاثرات چھپانے کی مکمل کوشش کر رہا تھا، مگر وہ اس کا ہر رنگ اب پہچاننے لگی تھی۔

وہ تینوں فیری کی طرف جاتے بورڈ کی جانب بڑھ رہے تھے جب کسی نے حیا کی کہنی کو ذرا سا چھوا۔

"ماڈم..... ماڈم!"

وہ ٹھٹک کر رکی اور گردن موڑی۔

اس کے عقب میں ایک بارہ تیرہ برس کا ایک ترک لڑکا کھڑا تھا۔ وہ کوئی ٹھیلے والا تھا، اس نے گردن کے گرد اور دونوں ہاتھوں میں،

بہت سے ہار اور موتیوں کی لڑیاں ڈوریوں میں باندھ کر اٹھائی ہوئی تھیں اور اب وہ لڑیوں کا ایک گچھا حیا کے چہرے کے سامنے کر کے دکھاتا، ترغیب دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ کبھی نہ رکتی مگر وہ موتی اور ان کی چمک اتنی خوبصورت تھی کہ اسے ٹھہرنا ہی پڑا۔ وہ بے اختیار وہ لڑیاں انگلیوں میں اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ بالوں میں پرونے والی لڑیاں تھیں اور اتنی حسین تھیں کہ چند لمحے کے لیے وہ لمبے بالوں کی دیوانی لڑکی ارد گرد کو فراموش کر بیٹھی۔

''حیا.....حیا!''

جہان دور سے اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہان اور ڈی جے فیری کے تختے پہ چڑھ چکے تھے اور اب جھنجھلاہٹ بھری کوفت سے اسے بلا رہے تھے۔

''ایک منٹ!'' وہ انگشت شہادت اٹھا کر ان کو رکنے کا اشارہ کرتی پلٹ کر جلدی جلدی لڑیاں دیکھنے لگی۔

''ہاؤ مچ؟'' اس نے دو لڑیاں الگ کر کے پوچھا۔

''ٹین لیرا.....ٹین لیرا۔''

''یہ تو بہت زیادہ ہیں۔'' اس نے خفگی سے بچے کو دیکھا۔ پیچھے جہان اسے ناگواری بھرے انداز میں پھر سے آواز دے رہا تھا۔

''تم جاؤ جگہ تلاش کرو میں دو منٹ میں آ رہی ہوں!'' اس نے ان کو مطمئن کرنے کے لیے جانے کا اشارہ کیا۔ ان تک ان کی آواز شاید پہنچ گئی تھی، تب ہی وہ دونوں سر ہلا کر مڑے اور فیری کے اندرونی راستے کی جانب بڑھ گئے۔

فیری نکلنے میں ابھی تین منٹ تھے اور وہ ان تین منٹوں کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''سیون لیرا۔'' اس نے حتمی انداز میں لڑکے کو کہا اور پیسے نکالنے کے لیے سنہری کلچ کھولا، اس سے قبل کہ وہ نوٹ نکالتی، لڑکے نے ایک دم پرس جھپٹا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

لمحے بھر کو اسے سمجھ نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے اور جب سمجھ آیا تو وہ۔

''رکو.....رکو.....میرا پرس!'' وہ چلاتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی۔ جہان، ڈی جے، فیری اس افتاد میں اسے سب بھول گیا۔

لڑکا پھرتی سے بھاگتا جا رہا تھا۔ سیاح افراتفری میں فیری کی طرف بڑھ رہے تھے، کسی کے پاس توجہ کرنے کو وقت نہ تھا۔ وہ تیز قدموں سے دوڑتی اس لڑکے کے پیچھے آئی۔ وہ بازار کی طرف مڑ گیا تھا اور اب ایک گلی کے عین وسط میں کھڑا تھا، حیا جیسے ہی بھاگتی ہوئی اس گلی میں داخل ہوئی، لڑکے نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر بھاگ کھڑا ہوا۔

''رکو.....رکو!'' وہ غصے سے چلاتی اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ لڑکا خاصا پھرتیلا لگ رہا تھا، مگر وہ اتنا تیز نہیں بھاگتا تھا۔ تین گلیاں عبور کر کے وہ اس رہائشی علاقے میں داخل ہوا اور سرپٹ دوڑتا ہوا دائیں طرف کی قطار کے بنگلوں میں سے ایک کا گیٹ عبور کر گیا۔ وہ ہانپتی ہوئی اس گیٹ تک آئی۔ گیٹ نیم وا تھا۔ لڑکا اندر ہی کہیں گیا تھا۔

دور کہیں فیری نکل چکی ہے۔ ڈی جے اور جہان جزیرے سے چلے گئے تھے اور وہ ادھر تنہا رہ گئی تھی۔ لیکن یہ وقت وہ سب سوچنے کا نہیں تھا۔ اسے اپنا پرس اور پاسپورٹ واپس لینا تھا۔ ہر صورت۔

اس نے ایک لمحے کو اس نیم وا گیٹ کو دیکھا اور پھر اس کے پیچھے کھڑے اس عالیشان سفید محل کو اور پھر تیزی سے اندر آ گئی۔ یہ وہی سفید محل تھا جو اس نے دوپہر میں دیکھا تھا۔

چھوٹے سے باغیچے میں خاموشی چھائی تھی۔ شام کے پردے اب نیلے پڑ رہے تھے۔ وہ پھولتے سانس کو ہموار کرتی متذبذب سی چلتی بنگلے کے داخلی دروازے تک آئی اور بیل کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔

لکڑی کا اونچا منقش دروازہ قدیم طرز کا بنا تھا۔ اس کے آس پاس بیل نامی کوئی شے نہ تھی۔ وہ کیا کرے؟ یوں منہ اٹھا کر کسی کے گھر میں کیسے گھس جائے؟ مگر وہ بھی تو اسی گھر میں چھپنے کی نیت سے داخل ہوا تھا، اسے بہر حال اندر جانا تھا۔

ایک مصمم ارادہ کر کے اس نے کندھے پہ پھسلتی شال درست کی اور دروازے کا سنہری ناب گھمایا۔ وہ قدیم وقتوں کی کوئی امر ہوئی

شہزادی تھی جو راستہ بھٹک کر اس جزیرے پہ آنکلی تھی اور اب سلطان کے محل کے سامنے کھڑی تھی۔

دروازہ چرر کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ اندر ہر سو اندھیرا تھا۔ اس نے چوکھٹ پہ قدم دھرا۔

''ہیلو؟'' وہ دو قدم مزید آگے آئی اور پکارا اس کی آواز کی گونج در و دیوار سے ٹکرا کر پلٹ آئی۔

وہ کسی لابی میں کھڑی تھی۔ وہاں نیم تاریکی سی چھائی تھی۔ صرف کھلے دروازے سے آتی شام کی نیلگوں روشنی میں آگے جاتی راہداری سی نظر آ رہی تھی۔ اس کا دل عجیب سی بے چینی و خوف میں گھرنے لگا۔

''کوئی ہے؟'' اب کے اس نے پکارا تو آواز میں ذرا ارتعاش تھا۔ ایک دم اس کے عقب میں ٹھاہ کے ساتھ دروازہ بند ہوا اور کلک کے ساتھ لاک لگنے کی آواز آئی۔

وہ گھبرا کر پلٹی اور دروازے کی طرف لپکی۔ ڈور ناب تاریکی میں بمشکل اس کے ہاتھ لگا۔ اس نے زور سے ناب کھینچا، پھر گھمایا، مگر بے سود۔ دروازہ باہر سے بند کیا جا چکا تھا۔

''اوپن! اوپن دی ڈور!'' وہ دونوں ہتھیلیوں سے لکڑی کا دروازہ پیٹنے لگی۔ ساتھ ہی وہ خوفزدہ سی دبی دبی آواز میں چلا بھی رہی تھی۔

''شہزادوں کے جزیروں پہ خوش آمدید!''

کسی نے بہت دھیرے سے اس کے عقب میں کہا تھا۔

✡ ✡ ✡
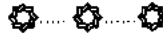
باب 4

''شہزادوں کے جزیرے پہ خوش آمدید۔''
کسی نے بہت آہستہ سے اس کے عقب میں کہا تھا۔ وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔
لابی تاریک تھی۔ البتہ اندر کی سمت مڑتی راہداری کے آخری سرے پہ کوئی ٹمٹماتی سی زرد روشنی دکھائی دے تھی۔ وہ آواز بھی وہیں سے آئی تھی۔
اس نے پلٹ کر آخری بار دروازے کی ناب کو گھمایا۔ وہ جام رہا۔ اب اسے اس محل سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنا تھا۔ جو بے وقوفی وہ کر چکی تھی، اسے انجام تک پہنچانا ہی تھا۔
وہ آنکھیں سکیڑ کر اندھیرے میں دیکھتی آگے بڑھی۔ تاریک راہداری کے اس پار کوئی بڑا سا کمرا تھا۔ شاید لونگ روم۔ گھپ اندھیرے میں وہ زرد سی موم بتیوں کی روشنیاں وہیں سے آ رہی تھیں۔
''کون؟'' اس نے چونکنے انداز میں پکارا۔
وہ لونگ روم کی چوکھٹ پہ آن کھڑی ہوئی تھی اور اس کو خوش آمدید کہنے والی عورت وہیں سامنے ہی تھی۔ لمبے اسکرٹ اور سویٹر میں ملبوس، اسکارف چہرے کے گرد لپیٹے، وہ جھریوں زدہ چہرے والی ایک معمر خاتون تھیں۔ وہ لونگ روم کے دوسرے سرے پہ کھڑی، ہاتھ میں پکڑی موم بتی سے اسٹینڈ پہ رکھی موم بتیوں کو جلا رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے سرد پڑی موم بتیاں جلنے لگی تھیں۔
آ جاؤ...... اندر آ جاؤ......'' لمبی موم بتی سے اوپر نیچے اگلی موم بتیاں جلاتے ہوئے انہوں نے اسی نرمی سے کہا تھا۔
وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی، بس بنا پلک جھپکے اس پرتعیش لونگ روم کے وسط میں رکھی میز کو دیکھے گئی، جس پہ رکھا سنہری ستاروں والا کلچ موم بتیوں کی ہلکی زرد روشنی میں چمک رہا تھا۔
''یہ تمہارا پرس ہے، تم اسے لے سکتی ہو۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم میرے پاس صرف میرے بلاوے پہ آ جاؤ گی، تو میں اس بچے کو نہ بھیجتی۔ اسے معاف کر دینا، اس کی مجبوری تھی۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ کھڑی کیوں ہو؟''
وہ ہاتھ میں پکڑی موم بتی لیے اب سامنے رکھی ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئیں۔ وہاں بھی ایک بڑا سا کینڈل اسٹینڈ رکھا نظر آ رہا تھا، جس کے اوپر جگہ جگہ موم بتیاں سیدھی کھڑی تھی۔ وہ ایک ایک کر کے ان موم بتیوں کو بھی روشن کرنے لگیں۔
حیا کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی آگے بڑھی اور بڑے صوفے کے کنارے کی نشست پہ جا ٹکی۔ اس کی نگاہیں ابھی تک قریب رکھی میز پہ دھرے اپنے سنہری کلچ پہ تھیں۔
''کچھ کھاؤ گی؟''
''اس نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔ بہت ساری ہمت مجتمع کر کے وہ بمشکل کہہ پائی۔
''آپ نے مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟''
''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے اور پھر تمہیں کچھ بتانا ہے۔ عبدالرحمٰن آج صبح کی فلائٹ سے انڈیا چلا گیا ہے مگر جاتے جاتے اس نے یہ کام میرے ذمے لگایا تھا'' وہ اب اس کی جانب پشت کیے آخری موم بتی جلا رہی تھیں۔
وہ عبدالرحمٰن کے نام پہ حیران نہیں ہوئی۔ اس نے دوپہر میں ہی اس گھر کے باہر گیٹ پہ لگی تختی دیکھ لی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ بچہ اس گھر میں داخل ہوا تو وہ بھی پیچھے چلی گئی۔ وہ صرف اپنے پرس کے لیے آئی تھی یا کسی معمے کے حل کے لیے وہ کسی نتیجے پہ پہنچنے سے قاصر تھی۔

''آپ کا عبدالرحمٰن پاشا سے کیا رشتہ ہے؟'' وہ بولی تو اس کی آواز زرد روشنی کی مانند مدھم تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا خوف زائل ہو رہا تھا۔

''میں عبدالرحمٰن کی ماں ہوں۔'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی موم بتی میز پر رکھی اور انگلی کی پوروں پہ لگی موم کھرچی، پھر پلٹ کر اس کی طرف آئیں۔

''عبدالرحمٰن نے تمہیں ملنے کا کہا تھا، لیکن جب تم نے انکار کیا تو بھلے وہ ہاتھوں اور دامن کا صاف نہ ہو، دل کا اتنا صاف ہے کہ وہ رکا نہیں۔ البتہ جاتے جاتے اس نے میرے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ میں تم سے مل لوں اور تمہیں ان سوالوں کے جواب دے دوں جو تمہارے ذہن میں کلبلاتے رہتے ہیں۔''

وہ دم سادھے خاموشی سے اس معمر عورت کو دیکھے گئی، جو ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان رکھی کارنر ٹیبل پہ ایک فوٹو فریم رکھا تھا، جس میں دو چہرے مسکرا رہے تھے۔ ایک وہی معمر خاتون اور دوسرا ان کے ساتھ ایک پینتیس، چھتیس برس کا مرد، جس کے بال گھنگھریالے اور لمبے تھے۔ آنکھوں پہ فریم لیس چشمہ تھا۔ چہرے پہ چھوٹی سی داڑھی جس میں جگہ جگہ سفید بال جھلکتے تھے۔ نہایت گہری سانولی رنگت کا وہ شخص بہت ہی عام سا، قبول صورت مرد تھا۔

''اس سے پہلے کہ میں کچھ بتاؤں، تم اگر کچھ پوچھنا چاہتی ہو تو پوچھ لو۔'' حیا نے فوٹو فریم سے نگاہ ہٹا کر ان کو دیکھا، جو مسکراتی پر شفقت نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ دروازہ بند ہو جانے پہ ڈر گئی تھی مگر اب اس ڈر کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''عبدالرحمٰن پاشا مجھے پھول کیوں بھیجتا ہے؟ سفید پھول، جو شاید دشمنی کی علامت ہوتے ہیں۔'' اس کے سوال پہ وہ ہولے سے مسکرائیں۔

''ہر شخص کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے، شاید وہ اس طرح پھول اس لیے بھیجتا ہے تاکہ تمہیں چونکائے، تمہاری توجہ حاصل کرے۔''

''مگر وہ مجھے کیسے جانتا ہے؟'' اس نے وہ الجھن سامنے رکھی، جو اس کو مسلسل پریشان کیے ہوئے تھی۔

''میں تمہیں یہی بتانا چاہتی تھی۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''دسمبر میں تم نے کسی چیریٹی ایونٹ میں شرکت کی تھی۔ وہ اسلام آباد میں اس وقت اسی ہوٹل میں تھا۔ وہاں اس نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا اور اسی رات پہلی دفعہ پھول بھیجے تھے۔''

ایک دم سے اس کی اس دو ڈھائی ماہ کی بے چینی کا اختتام ہو گیا۔ اسے فوراً سے یاد آ گیا۔ جس رات اسے سبانجی کی طرف سے سلیکشن کی میل آئی تھی، اسی دوپہر اس نے وہ چیریٹی لنچ اٹینڈ کیا تھا، جو زارا کی کزن کی کسی اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے تعاون سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس میں شہر کے کئی بزنس مین اور دیگر بااثر شخصیات نے شرکت کی تھی۔ وہ اور زارا بھی یونہی چلی گئی تھیں، یقیناً اسے عبدالرحمٰن پاشا نے وہیں دیکھا تھا۔ یہ ممکن تھا۔

''تمہیں وہ ڈولی نامی خواجہ سرا تو یاد ہوگا۔ اسے عبدالرحمٰن نے ہی تمہارے تعاقب پہ لگایا تھا۔ ڈولی اس کے آبائی گھر کا پرانا خادم ہے۔ برسوں سے ہمارے ساتھ ہے اور وہ صرف تمہاری مدد کے لیے تمہارے پیچھے آتا تھا۔ جہاں تک تعلق ہے اس میجر کا، جس کو تم نے اس کی ماں اور بہن کے سامنے بے عزت کیا تھا، اس کی مدد بھی عبدالرحمٰن نے تمہاری ویڈیو ہٹوانے کے لیے ہی لی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ میجر کرنل گیلانی کا بیٹا ہے۔ کرنل گیلانی جانتی ہو، کون ہیں؟''

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

''کرنل گیلانی وہ تھے جن کو تمہارے پھوپھا نے ملک چھوڑتے ہوئے اپنے کیس میں پھنسا دیا تھا۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کرنل گیلانی نے کئی سال سزا کاٹی اور گو کہ وہ بعد میں رہا ہو گئے تھے۔ انہوں نے قید کی صعوبتوں میں لگنے والی بیماریوں کے ہاتھوں زندگی ہار دی۔ اس میجر کی شادی ہونے والی ہے۔ اس نے تمہیں صرف اپنے کسی ذاتی منصوبے کے لیے پھنسانا چاہا تھا مگر تم بے فکر رہو، وہ اب تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔''

تو یہ تھا سارا کھیل۔ ایک بااثر شخص کے اپنی محبت کو پا لینے کے لیے استعمال کردہ کچھ مہروں کی کہانی۔ ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔

"اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟" وہ ذرا سرد لہجے میں بولی۔

"تم یہ گھر دیکھ رہی ہو؟ بیوک ادا میں اس وقت بجلی کا کوئی پول مرمت کے باعث کام نہیں کر رہا، سو اس علاقے میں بجلی بند ہے، ورنہ تم دیکھتیں کہ جس گھر میں تم بیٹھی ہو، وہ بیوک ادا کا سب سے خوبصورت، سب سے عالیشان محل ہے۔ یہ دولت، یہ شان و شوکت، یہ طاقت، یہ سب کچھ اور ایک ایسا شخص جو تم سے واقعتاً محبت کرتا ہے، یہ سب تمہارا ہو سکتا ہے اگر تم اسے قبول کر لو۔ اگر تم عبدالرحمٰن سے شادی کر لو۔ میں نے یہی کہنے کے لیے تمہیں ادھر بلایا ہے۔"

حیا نے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔

"آپ کو پتا ہے جب کوئی شخص کسی عورت کو اذیت دیتا ہے اور اس کی بے عزتی کا باعث بنتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟ وہ عورت اس شخص کی عزت کرنا چھوڑ دیتی ہے۔ میں نے بھی عبدالرحمٰن پاشا کی عزت کرنا چھوڑ دی ہے۔ میں شادی شدہ ہوں، اس لیے میرا جواب صاف انکار ہے۔"

"کیا ہے، اس ایک معمولی سے ریسٹورنٹ اونر کے پاس جو عبدالرحمٰن کے پاس نہیں ہے؟" وہ ذرا حیران ہوئی تھیں۔

"اس کے پاس حیا سلیمان ہے اور عبدالرحمٰن پاشا کے پاس حیا سلیمان نہیں ہے۔" وہ بہت استہزاء سے چبا چبا کر بولی تھی۔

وہ خاتون لاجواب سی خاموش ہو گئیں۔

"اور اگر وہ نہ رہے، تب بھی تمہارا جواب انکار ہو گا؟" وہ ایک دم اندر تک کانپ گئی۔

"یہ دھمکی ہے؟"

"نہیں، محض ایک سوال ہے۔"

"میرا جواب پھر بھی انکار ہو گا۔"

"ٹھیک ہے، پھر تم بے فکر ہو جاؤ۔ عبدالرحمٰن زبردستی کا قائل نہیں ہے۔ نہ وہ عشق میں جوگ لینے والا شخص ہے۔ وہ آج کے بعد نہ تمہیں فون کرے گا، نہ تمہارا پیچھا کروائے گا، نہ ہی تمہارے راستے میں آئے گا۔ ویسے بھی وہ دو ڈھائی ماہ سے قبل انڈیا سے واپس نہیں آ پائے گا اور اس کے آنے تک تم جا چکی ہو گی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تمہارا جواب انکار ہو میں تو میں تمہیں اس چیز کی گارنٹی دے دوں کہ وہ تمہیں اب کبھی پریشان نہیں کرے گا۔ تم جا سکتی ہو۔ آخری فیری آٹھ بجے نکلے گی، اگر تم چاہو تو ٹکٹ کے پیسے......"

"بہت شکریہ۔ میرے پاس پیسے ہیں۔" اس نے اپنا کلچ اٹھایا اور تیزی سے اٹھی۔

"سنو! تم اچھی لڑکی ہو۔ کبھی دوبارہ بیوک ادا آنا ہو تو ادھر ضرور آنا، مجھے تم سے مل کر خوشی ہو گی۔"

"مگر مجھے نہیں ہو گی۔" وہ واپس پلٹ گئی۔

نیم تاریک راہداری کے دوسرے سرے پہ بنے دروازے کا ناب اس نے گھمایا تو وہ کھل گیا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ پتھر بن جانے کے خوف سے اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

باہر شام کی نیلگوں روشنی ڈوب رہی تھی۔ ہر سو اندھیرے اچھانے لگا تھا۔ وہ دروازہ بند کر کے آگے روش پہ آئی۔ اسی پل باہر سے کسی نے سفید گیٹ کھولا۔ نیم اندھیرے میں بھی اسے وہ دونوں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ ترک میں باتیں کرتیں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلی آ رہی تھیں۔ وہی گہرے جامنی فراک والی بچی اور بھورے اسکارف والی بڑی لڑکی جس کے بازو میں جنگلی پھولوں سے بھری ٹوکری تھی۔

وہ مگن سی بچی کا ہاتھ تھامے چلی آ رہی تھی۔ اسے سامنے سے آتا دیکھ کر ٹھٹک کر رکی۔ حیا تیز قدموں سے چلتی آگے بڑھ گئی۔ بھورے اسکارف والی لڑکی رک کر گردن موڑے اسے جاتے دیکھے گئی۔

بچی نے اسے جھنجھوڑا، تو وہ چونکی، پھر سر جھٹک کر اندر کی طرف جاتے آبنوسی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

حیا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ سمندر کی طرف سے آتی ہوا مزید سرد ہو چلی تھی۔ نیلگوں سیاہ پڑتی شام دم توڑ رہی تھی۔ جب تک وہ واپس بندرگاہ پہ پہنچی، شام اندھیرے میں بدل چکی تھی۔

تاریک رات، ویران سمندر، پراسرار جزیرہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی محفوظ جگہ ملے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ ابھی تو وہ رونے کی ہمت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

"رات کو فیری کتنے بجے آئے گی؟" اس نے ٹکٹ کی کھڑکی سے جھانکتے آفیسر سے پوچھا۔ اس کا موبائل جہان ساتھ لایا تھا، مگر وہ واپس نہیں لے سکی تھی اور جہان اور ڈی جے کے موبائل نمبرز اسے زبانی یاد نہیں تھے۔ ورنہ کہیں سے کال کر لیتی۔ وہ چلے گئے ہوں گے اور کتنے پریشان ہوں گے۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی۔

"آٹھ بجے۔" ٹکٹ چیکر نے جواب دیتے ہوئے بغور اسے دیکھا، پھر ساتھ رکھا کاغذ اٹھا کر دیکھا۔

"آر یو حیا سلیمان؟ پاکستانی تورست؟ (ٹورسٹ؟)" اس نے کہنے کے ساتھ وہ پرنٹ آؤٹ اس کے سامنے کیا، جس میں اس کی اور ڈی جے کی آج دوپہر کی کھینچی تصویر پرنٹ کی گئی۔

"یس..... آئی ایم..... میری فیری نکل گئی تھی، کیا میرے فرینڈز ادھر ہی ہیں؟" فرط جذبات سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ اس نے سوچ بھی کیسے لیا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے؟

"پولیس اسٹیشن..... کم ٹو پولیس اسٹیشن۔"

اور جب وہ پولیس آفیسرز کے ہمراہ پولیس اسٹیشن پہنچی تو اندرونی کمرے میں اسے وہ دونوں نظر آ گئے۔

ڈی جے کرسی پہ سر دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھی تھی جبکہ جہان انگلی اٹھائے درشتی سے سامنے بیٹھے آفیسر سے کچھ کہہ رہا تھا۔ آفیسر جواباً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہنے کی سعی کر رہا تھا مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

چوکھٹ پہ آہٹ ہوئی تو وہ بولتے بولتے رکا اور گردن موڑی۔ وہ بھیگی آنکھوں سے دروازے میں کھڑی تھی۔

اس کی اٹھی انگلی نیچے گر گئی، لب بھینچ گئے۔ ایک دم ہی وہ کرسی کے پیچھے سے نکل کر اس کی جانب آیا۔

"کدھر تھیں تم؟"

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "میں کھو گئی تھی۔ وہ بچہ میرا پرس لے کر بھاگا تو....."

"تو آدھے بیوک ادا نے تمہیں اس کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ عقل نام کی چیز ہے بھی تم میں یا نہیں؟ ایک پرس کے لیے تم اس کے پیچھے بھاگیں؟ فیری چھوٹ جائے گی یا وہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے، تمہیں اس بات کا کوئی خیال تھا؟" وہ غصے سے چلایا۔

"کیوں نہ بھاگتی میں اس کے پیچھے؟ پرس میں میرا پاسپورٹ تھا، سبانجی کا آئی ڈی کارڈ تھا، پھر بعد میں پریشانی ہوتی کہ....."

"اور جو پریشانی ہمیں ہوئی وہ..... ہم اس ڈیڑھ گھنٹے میں پاگلوں کی طرح تمہیں پورے جزیرے پہ ڈھونڈ رہے تھے۔ جانتی ہو ہماری کیا حالت تھی؟"

ڈی جے جو اس کے چلانے کے باعث رک گئی تھیں۔ اب آگے بڑھی اور اس کے گلے لگ گئی۔

"حیا! تم بالکل پاگل ہو۔" اس کی آنکھیں رونے سے متورم تھیں وہ دونوں پھر رونے لگی تھیں۔

"حد ہوتی ہے غیر ذمہ داری کی۔ آئندہ میں تم دونوں کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا۔" وہ بھنا کر کہتا واپس پولیس آفیسر کی جانب پلٹ گیا۔ وہ ابھی تک روئے جا رہی تھی۔ اسے پتا تھا اسے واپسی پہ جہان کی بہت سی باتیں سننی پڑیں گی۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں لکڑی کا دروازہ دھکیل کر اندر آئیں تو ہر سو اندھیرا چھایا تھا۔ لونگ روم سے ٹمٹماتی زرد روشنی جھانک رہی تھی۔

"آنے!" اس نے جنگلی پھولوں کی ٹوکری لابی میں رکھے اسٹینڈ پہ دھری اور بچی کا ہاتھ تھامے لونگ روم کی طرف آئی۔

صوفے پہ وہ معمر خاتون اسی طرح بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں چند نوٹ تھے۔ جو وہ گن کر علیحدہ کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی وہ لڑکا کھڑا ان نوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

"سلام علیکم آنے! کیسے ہو عبداللہ؟" اس نے بچی کی انگلی چھوڑ دی اور کندھے سے پرس کی اسٹریپ اتارتے ہوئے بڑی میز کی

طرف آئی۔

"میں ٹھیک ہوں عائشے!" لڑکے نے معمر خاتون کے بڑھائے گئے نوٹ پکڑے، گنے اور باہر بھاگ گیا۔ وہ بقیہ نوٹ واپس بٹوے میں رکھنے لگیں۔

"بجلی والا پول ٹھیک ہوا؟" بٹوہ بند کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"وہاں بندے کام کر تو رہے ہیں۔ ابھی گلی میں داخل ہوتے ہوئے ہم نے دیکھا تھا۔ عبداللہ کیوں آیا تھا؟" وہ میز کے ساتھ کھڑی اپنا پرس کھولتی کہہ رہی تھی۔

"میرا کام تھا۔" انہوں نے بچی کا ہاتھ تھامتے ہوئے سرسری سا جواب دیا۔ جواب ان کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی تھی۔

"کام بھی تھا اور آنے نے اسے پیسے بھی دیے عائشے گل! تم نے دیکھا، وہ صبح قرآن پڑھنے کب سے نہیں آیا، روز بہانے بنا دیتا ہے۔" بچی ناک سکوڑتی کہہ رہی تھی۔

اپنے پرس کو کھنگالتی عائشے نے پلٹ کر خفگی سے اسے دیکھا۔

"بری بات ہے بہارے! کسی کے پیچھے اس کا یوں ذکر نہیں کرتے۔" وہ ایک نظر اس پہ ڈال کر واپس اپنے پرس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی تھی۔

"اور یہ وہی لڑکی تھی نا؟" چند لمحے موم کی طرح پگھل کر گر گئے تو اس نے پرس کی چیزیں ہاتھ سے الٹ پلٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ "ادھر کیوں آئی تھی؟"

"یہ عبدالرحمٰن کے مسئلے ہیں، وہ خود ہی نپٹا لے گا۔" انہوں نے ٹالنا چاہا۔

"اچھا۔" وہ اداسی سے ہنسی۔ "یعنی مسئلہ ابھی تک نپٹا نہیں ہے، کیا کہہ رہی تھی؟"

"صاف انکار۔" انہوں نے گہری سانس لی۔

"عبدالرحمٰن چلا گیا؟" اس نے بات پلٹ دی۔

"ہاں، آج صبح کی فلائٹ تھی نا۔"

"واپسی کا نہیں بتایا؟"

"کہہ رہا تھا، دو سے تین ماہ لگ جائیں گے اور شاید اس دفعہ وہ واپس نہ آئے۔"

"جانے دو آنے! وہ ہر دفعہ یہی کہتا ہے۔" وہ اداسی سے مسکرا کر بولی۔ ایک ہاتھ سے ابھی تک وہ پرس کے اندر کچھ تلاش کر رہی تھی۔

"آنے! تمہیں پتا ہے، عائشے گل مجھ سے ناراض ہے۔" بہارے اپنے ننھے ننھے سے جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے بتانے لگی۔

آنے نے حیرت سے میز کے سامنے کھڑی عائشے کو دیکھا، جس کی ان کی طرف پشت تھی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ سات دن کی تربیت کے بعد آپ کی چہیتی پہ یہ اثر ہوا ہے کہ آج یہ بازار میں عین سڑک کے وسط میں کھڑی اپنا پونچو کہیں گرا کر، سیاحوں کے کیمروں میں تصویریں بنوا رہی تھی۔"

"ارے! تو تم اسے سمجھا دو نا، یوں ناراض تو نہ ہو۔"

"کس کس کو سمجھاؤں؟ سفیر کہتا ہے اس کے ماں، باپ کو سمجھاؤں۔ اس کے ماں باپ کہتے ہیں سفیر کو سمجھاؤں۔ آپ کہتی ہیں بہارے کو سمجھاؤں، بہارے کہتی ہے میں خود کو سمجھاؤں اور عبدالرحمٰن کہتا ہے......" وہ لمحے بھر کو رکی، پھر سر جھٹک کر پرس کی چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنے لگی۔

"عبدالرحمٰن کیا کہتا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر ذرا سی گردن موڑ کر بہارے کو دیکھا، جو چہرہ ہتھیلیوں پہ گرائے آنے کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"آج تم نے مجھے بہت خفا کیا ہے بہارے! میں نے کہا تھا نا کہ اچھی لڑکیاں ایسے نہیں کرتیں۔"

"تو اچھی لڑکیاں کیسے کرتی ہیں عائشے گل؟" بہارے نے منہ بگاڑ کر اس کی نقل اتاری۔

"اچھی لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی بات مانتی ہیں۔ وہ ہر جگہ نہیں چلی جاتیں، وہ ہر کسی سے نہیں مل لیتیں، وہ ہر بات نہیں کر لیتیں۔"

اس نے پرس میز پہ الٹ کر جھاڑا۔

"تو پھر میں بری لڑکی ہوں؟" بہارے پل بھر میں روٹھی ہوگئی۔

"نہیں..... کوئی لڑکی بری نہیں ہوتی۔ بس اس سے کبھی کبھی کچھ ایسا ہو جاتا ہے، جو برا ہوتا ہے، جس پہ اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ اور جانتی ہو جب اللہ ناراض ہوتا ہے تو وہ کیا کرتا ہے؟"

"کیا؟"

"جب وہ ناراض ہوتا ہے تو انسان کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے اور جانتی ہو کہ اکیلا چھوڑنا کیا ہوتا ہے؟ جب بندہ دعا مانگتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتی۔ وہ مدد مانگتا ہے تو مدد نہیں آتی۔ وہ راستہ تلاشتا ہے تو راستہ نہیں ملتا۔" وہ اب میز پہ نکلی اشیا الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ خالی پرس ساتھ ہی اوندھا رکھا تھا۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟"

"سفیر نے اپنی ممی کو چابیاں دینے کے لیے کہا تھا۔ یہیں پرس میں رکھی تھیں۔ پتا نہیں کہاں چلی گئیں۔ عبدالرحمٰن ٹھیک کہتا ہے، عائشے گل کبھی کچھ نہیں کر سکتی۔"

"وہ یہ اس لیے کہتا ہے تا کہ عائشے گل سب ہی کچھ کرنا سیکھ جائے۔"

ان کی بات پہ اس نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا اور چیزیں واپس پرس میں ڈالنے لگی۔ وہ چابی یقیناً کہیں اور رکھ کر بھول گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آنے والے چند دنوں میں پڑھائی کا بوجھ ذرا بڑھ گیا اور کلاسز کا شیڈول پہلے سے سخت ہو گیا تو وہ دونوں ٹیسٹ تیار کرنے اور دینے میں ایسی مصروف ہوئی کہ کہیں آ، جا نہیں سکیں۔

وہ وسط مارچ کے دن تھے۔ استنبول پہ چھایا کہر ٹوٹ رہا تھا اور بہار کی رسیلی ہوا ہر سو گلاب اور ٹیولپس کھلا رہی تھی۔ اب صبح سویرے گھاس پہ برف کی جمی سفید تہہ نہیں نظر آتی تھی اور سبانجی کا سبزہ اپنے اصل رنگ میں لوٹ رہا تھا۔ ایسے ہی ایک دن ان دونوں نے ٹاپ قپی پیلس (میوزیم) جانے کا پروگرام بنایا، مگر اسی وقت ہالے آگئی۔ اس کے پاس کوئی دوسرا پروگرام تھا۔

"میلو کینٹ میں میلاد ہو رہا ہے، چلو گی؟"

"کیوں نہیں، اس بہانے تھوڑا سا ثواب ہی کما لیں گے، ورنہ میں نے اور حیا نے ایسے تو کوئی نیکی کرنی نہیں ہے۔" ڈی جے اپنا بیگ بند کرتے ہوئے بولی۔

"ویسے ربیع الاول ختم ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے؟"

"ہو چکا ہے، مگر یہ اسٹوڈنٹس کا میلاد ہے اور پڑھائی کے باعث ملتوی ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے اتنا لیٹ کیا ہے، اب چلو۔"

میلاد میں درس دینے والی لڑکی اونچی چوکی پہ بیٹھی تھی۔ سامنے رکھی چھوٹی میز پر کھلی کتاب سے پڑھ کر وہ ترک میں درس دے رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ ایک شرمندہ نگاہ سامنے دیگر لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی حیا اور خدیجہ پہ بھی ڈال لیتی جو سروں پہ دوپٹے لپیٹے بہت توجہ سے درس سن رہی تھی۔ مدرس لڑکی سخت شرمندہ تھی۔ حاضرین کی انگریزی اچھی نہیں تھی۔ اس لیے اس کی مجبوری تھی کہ اسے ترک میں درس دینا پڑ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ بظاہر بہت توجہ اور غور سے سنتی پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کو سمجھ کچھ نہیں آ رہا۔

درس ختم ہوا تو وہ لڑکی ان کی طرف آئی اور بہت معذرت خواہانہ انداز میں ان کو دیکھا۔

"آپ کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا ہوگا؟"

"لیں! سمجھ کیوں نہیں آیا۔" ڈی جے نے ناک سے مکھی اڑائی۔ "پہلے آپ نے حجر اسود کو چادر پہ رکھنے والا واقعہ بتایا، پھر غار حرا، وحی، مسلمانوں کی ابتدائی تکالیف، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی قربانیاں، ابوجہل بن ہشام کی گستاخیاں، حضرت عمرؓ کا قبول اسلام، ہجرت مدینہ، پھر غزوہ بدر......"

لڑکی نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔

"آپ کو ترک آتی ہے؟"

"ترک نہیں آتی، مگر اپنی ہسٹری ساری سمجھ آتی ہے۔" وہ جواباً ہنس کر بولی۔ ترک، اردو جیسی ہی لگتی تھی اور واقعتاً وہ صحابہ کرامؓ کے اسماء کے باعث سب سمجھ پا رہی تھیں۔

"شکریہ...... شکریہ!" وہ اتنی خوش ہوئی کہ اس کا چہرہ گلابی پڑ گیا۔

میلاد ختم ہوا تو ہالے کی امی کا فون آ گیا۔ انہیں کوئی ضروری کام تھا۔ سوہالے نے ان کے ساتھ آگے جانے سے معذرت کر لی۔ اب انہیں ٹاپ قپی پیلس اکیلے جانا تھا۔

"دو لوگ اکیلے تو نہیں ہوتے۔" وہ ٹاقسم اسکوائر پہ بس سے اتریں تو حیا نے اسے تسلی دی۔ ڈی جے ہنس دی۔

"پھر بھی تیسرے کو ساتھ لینے میں کیا حرج ہے؟"

وہ استقلال سٹریٹ کی جانب مڑیں تو قدم خود بخود برگر کنگ کی جانب اٹھنے لگے۔

"وہ چلے گا ہمارے ساتھ؟ اس روز کتنا غصہ کیا تھا اس نے، یاد ہے؟"

"وہ اس لیے کہ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے وہ بہت فکر مند اور پریشان ہو گیا تھا مگر اب تھوڑا سا اصرار کریں گے تو ضرور چلے گا۔"

استقلال سٹریٹ ویسے ہی رش سے بھری تھی۔ وہ دونوں بازو میں بازو ڈالے تیز تیز چل رہی تھیں۔ یہ ان کی دوستی کی علامت ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ اسٹریٹ کے جیب کتروں سے بچاؤ کے لیے وہ اپنے ملے ہوئے کندھوں سے پرس لٹکاتی تھیں تاکہ چھینے نہ جا سکیں۔ حیا تو اس واقعے کے بعد بہت محتاط ہو گئی تھی۔ اب بھی اس نے اپنے سفید کوٹ کے اوپر پرس یوں ڈال رکھا تھا کہ بائیں کندھے سے اسٹریپ گزار کر دائیں پہلو سے پرس لٹک رہا تھا۔ بال کھلے تھے اور دوپٹا گردن کے گرد لپٹا تھا۔ ڈی جے نے بھی اسی کی طرح شلوار قمیص پہ سیاہ لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔

برگر کنگ میں خوب گہما گہمی تھی۔ اشتہا انگیز سی مہک سارے ماحول میں پھیلی تھی۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کچن کی طرف کھلتے دروازے کی طرف آئیں۔ سامنے طویل سا کچن تھا۔ اِدھر اُدھر ایپرن اور ٹوپیاں پہنے دو، چار افراد آ، جا رہے تھے۔ ایک سلیب کے ساتھ وہ بھی کھڑا تھا۔ جینز اور شرٹ پہ سفید ایپرن پہنے، ہاتھ میں بڑا ٹوکا لیے وہ کٹنگ بورڈ پہ رکھے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو کھٹا کھٹ کاٹ رہا تھا۔

"گڈ ما آ آ رننگ منیجر!"

دونوں نے چوکھٹ میں کھڑے ہو کر با آواز بلند پکارا تو اس کا تیزی سے چلتا ہاتھ رکا۔ اس نے گردن اٹھا کر انہیں دیکھا، پھر سر سے پاؤں تک ان کا جائزہ لیا۔ دونوں جوگرز پہنے پھولے ہوئے ہینڈ بیگز اٹھائے ہوئے تھیں۔ حیا کے ہاتھ میں رول کیا ہوا استنبول کا نقشہ تھا اور ڈی جے کے ہاتھ میں ایک گائیڈ بک۔ گویا وہ پوری پوری تیاری سے آئی تھیں۔

"گڈ مارننگ!" وہ واپس گوشت کی طرف متوجہ ہوا اور دوسرے ہاتھ سے ایک چھوٹی سی اسٹینڈ پہ لگی تختی اٹھا کر سامنے کاؤنٹر پر پٹخ کر رکھی۔ اس پہ لکھا تھا۔ "آئی ایم بزی، ڈونٹ ڈسٹرب۔"

حیا اور خدیجہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر حیا وہیں چوکھٹ کے ساتھ ٹیک لگائے بازو سینے پہ لپیٹ زیر لب مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگی، جبکہ ڈی جے مسکراہٹ دبائے آگے بڑھی۔

''ہم ٹاپ قپی پیلس جارہے ہیں!'' خدیجہ نے کاؤنٹر کے سامنے آ کر اطلاع دی۔

''استقلال اسٹریٹ سے باہر نکلو، تاقسم سے میونسپلٹی بس پکڑو، وہ پہنچادے گی۔'' وہ سر جھکائے ایک ہاتھ سے گوشت کا ٹکڑا پکڑے، دوسرے سے کھٹ کھٹ چھرا چلا رہا تھا۔

''مگر ہمیں ایک ہینڈسم گائیڈ بھی چاہیے۔''

''ہینڈسم گائیڈ ابھی مصروف ہے۔کسی غیر ہینڈسم گائیڈ سے رابطہ کرو۔''

ڈی جے نے پلٹ کر حیا کو دیکھا۔اس نے مسکراتے ہوئے شانے اچکا دیے۔وہ واپس جہان کی طرف گھومی۔

''تو آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے؟''

''بالکل بھی نہیں۔تم میں سے کوئی پھر ٹاپ قپی کے قلعے میں گم ہو جائے گی اور میرا پورا دن برباد ہوگا۔''

''ایک دفعہ پھر سوچ لیں۔''

''لکھ کر دے دوں؟'' وہ کہتے ہوئے ٹکڑوں کو ایک طرف ٹوکری میں رکھنے لگا۔اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

''اچھا..... ایک بات بتائیں، استقلال اسٹریٹ میں جیب کترے ہوتے ہیں نا؟'' ڈی جی نے اس کے سلور اسمارٹ فون کو دیکھتے ہوئے کہا جو قریب ہی چارجنگ پہ لگا تھا۔

''ہاں!''

''تو سمجھیں آپ کی جیب کٹ گئی۔'' ڈی جے نے ہاتھ بڑھا کر فون اچکا، تار نکالی اور حیا کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔فون والا ہاتھ اس نے کمر کے پیچھے کر لیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' اسے شدید قسم کا جھٹکا لگا تھا۔وہ ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگا۔

''مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ہمارے ساتھ ٹاپ قپی پیلس نہیں چلیں گے تو ہم اس موبائل کو بیچ کر آدھا جواہر تو خرید ہی لیں گے۔ ویسے فون اچھا رکھا ہوا ہے آپ نے۔'' وہ الٹ پلٹ کر کے موبائل دیکھنے لگی۔''پاکستانی روپوں میں دو، ڈھائی لاکھ سے کم کا تو نہیں ہوگا۔''

''وہ چھرا رکھ کر ان کے سر پہ آ پہنچا۔

''میرا فون واپس کرو۔'' کڑی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھایا۔

''ٹاپ قپی سے واپسی پہ دے دوں گی۔وعدہ!''

''مطلب تم لوگ مجھے یرغمال بنا کر لے جاؤ گی؟''

''کوئی شک!'' وہ پہلی دفعہ بولی۔

''ٹھیک ہے، مگر یہ آخری بار ہے، پھر میں کبھی تم دونوں نکمی لڑکیوں کے ساتھ اپنا دن برباد نہیں کروں گا۔'' وہ ایپرن گردن سے اتارتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔''اور اگر آج تم دونوں میں سے کوئی کھوئی تو میں بہت برا پیش آؤں گا۔'' ہاتھ دھو کر جیکٹ پہنتا وہ ان کے ساتھ باہر نکلا۔

ٹاپ قپی سرائے کے سامنے وہ سبزہ زار پہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔حیا درمیان میں تھی اور وہ دونوں اس کے اطراف میں۔

''جہان! یہ ٹاپ قپی سرائے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟''

''میں ایک یرغمال شدہ گائیڈ ہوں اور یرغمالی عموماً خاموش رہتے ہیں۔'' وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چیونگم چباتا شانے اچکا کر بولا۔

''میں بتاتی ہوں، ٹاپ قپی کا توپ دراصل اردو والا توپ ہی ہے، جیسے تقسیم تاقسم بنا، ویسے ہی توپ ٹاپ بن گیا۔قپی کہتے ہیں گیٹ کو اور سرائے ہو گیا محل، سو توپ قپی سرائے بنا ''Canon Gate Palace'' آہا، ایم اے جینیئس۔ ہے نا جہان؟''

''میں نہیں بول رہا۔'' وہ سخت خفا تھا۔

ٹاپ قپی پیلس چار سو سال تک سلاطین کا محل رہا تھا۔ سرمئی عظیم الشان قلعہ نما محل جہاں خاص کمروں کے پہرے دار گونگے، بہرے ہوا کرتے تھے، تاکہ راز دیواروں کے باہر نہ نکلیں۔ اور جس کے کون نما مینار شاہانہ انداز میں اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ سلطان کا عظیم ورثہ اور اثاثے۔ چینی پورسلین کے نیلے اور سفید رنگ کے ایسے برتن جن میں اگر زہر ملا کھانا ڈالا جاتا تو برتن کا رنگ بدل جاتا۔ چھیاسی قیراط کے جواہرات سے مزین سلطان کے شاہی لباس نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے۔

''یہ منحوس گارڈ ہمارے سر پہ نہ کھڑا ہوتا تو میں کسی طرح دو، چار ہیرے تو توڑ ہی لیتی۔'' ڈی جے ان آنکھیں چندھیا دینے والے قیمتی پتھروں کو دیکھ کر سخت ملال میں گھر چکی تھی۔

پویلین آف ہولی مینٹل کے حصے میں دینی متبرکات تھے۔

وہ ایک اونچا ہال تھا۔ منقش در و دیوار، رنگ برنگی ٹائلز سے سجے چمکتے فرش، بلند و بالا ستون۔ حیا اردگرد نگاہیں دوڑاتی شیشے کی دیواروں میں مقید تاریخی اشیاء کو دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً ایک جگہ رکی اور شوکیس میں سجے ایک تبرک کو دیکھا۔ وہ ایک ٹیڑھی رکھی ہوئی چھڑی تھی۔ بھوری سی چھڑی جو شیشے میں مقید تھی۔ وہ گردن ترچھی کر کے اس کو دیکھنے لگی، پھر ادھر ادھر نگاہیں دوڑائی۔ کیپشن سامنے ہی لگا تھا۔

''اسٹاف آف موسیٰ۔''

(حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا۔)

اس کی سیکنڈ کر پڑھتی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ لب بھی نیم وا ہو گئے۔ لمحے بھر بعد وہ دور کھڑی ڈی جے کا بازو قریباً دبوچ کر اسے ادھر لائی۔

''ڈی جے...... یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہے۔''

''ریئلی؟'' اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ ''مگر یہ ان کے پاس کیسے پہنچا؟''

وہ دونوں گھوم پھر کر ہر زاویے سے اس کو دیکھنے لگیں۔ جہان بھی جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے چلتا ان کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے لیے تو سب پرانا تھا، مگر وہ دونوں تو سارے جوش کے راہداری میں آگے پیچھے ایک ایک تبرک کی طرف لپک رہی تھیں۔ ان کے دوپٹے سروں پہ آ گئے تھے۔

کعبہ کا تالا، حضرت داؤد علیہ السلام کی تلوار، حضرت یوسف علیہ السلام کا صافہ، ابراہیم علیہ السلام کا برتن، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کے نشان، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس، دانت مبارک، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار اور بہت سے صحابہؓ کی تلوار۔

''ڈی جے! کیا یہ شیشے کی دیوار غائب نہیں ہو سکتی؟ اور ہم اس تلوار کو چھو نہیں سکتے؟'' وہ دونوں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کے سامنے کھڑی تھیں۔ کوئی ایسا مقناطیسی اثر تھا اس تلوار میں کہ مقابل کو باندھ دیتا تھا۔

''مگر ہم اس قابل کہاں ہیں حیا؟'' خدیجہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

وہ ابھی تک یوں ہی اس تلوار کو دیکھ رہی تھیں۔

''اگر ہم اس کو چھو سکتے تو جانتی ہو کیا ہوتا؟ چودہ صدیوں کا فاصلہ ایک لمس میں طے ہو جاتا مگر ہمارے ایسے نصیب کہاں؟''

''جہان! یہ سب تبرکات اصلی ہیں نا؟''

جہان نے دھیرے سے شانے اچکائے۔

''میں نے کبھی نہ ان پہ ریسرچ کی، نہ کوئی ریسرچ پڑھا۔ قوی امکان ہے کہ یہ سب اصلی ہیں۔ کہنے والے کہتے تو ہیں کہ مسلمانوں کے ریلکس (تبرکات) بھی اتنے ہی نقلی ہیں جتنے عیسائیوں کے، مگر اللہ بہتر جانتا ہے۔''

''یہ اصلی ہیں، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ سب ہمارے انبیاء سے وابستہ رہنے والی اشیا ہیں۔ تحریک خلافت انہی متبرکات اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کے لیے ہی تو چلائی گئی تھی۔'' ڈی جے کو معاشرتی علوم کا بھولا بسرا سبق یاد آ گیا۔

ٹاپ قپی پیلس میں خوب گھوم پھر کر جب وہ باہر نکلے تو جہان نے اپنا موبائل واپس مانگا۔

''یہ لیں! کیا یاد کریں گے اور فکر نہ کریں، ہم نے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی۔ سکیورٹی لاک کوئی پاس ورڈ ہوتا تو میں کھولنے کی ضرور کوشش کرتی مگر آپ نے تو فنگر پرنٹ انٹری لگا رکھی ہے۔'' ڈی جے کے ہاتھ سے فون لیتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

ٹاپ قپی کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ سے جہان نے ان کو بہت اچھا سا کھانا کھلایا۔ ترکی کا اب تک کا بہترین کھانا اور کھانے کے دوران ہی خدیجہ سر درد کی شکایت کرنے لگی۔ جب تک کھانا ختم ہوا، وہ بہت پژمردہ سی لگنے لگی تھی۔ اس کا سر ایک دم ہی درد سے پھٹنے لگا تھا۔

''میرا خیال ہے، میں واپس ڈورم میں جا کر ریسٹ کروں، تم لوگ اکیلے گھومو پھرو۔'' اس کی طبیعت واقعی خراب لگ رہی تھی۔ سو انہوں نے اسے جانے دیا۔ وہ چلی گئی تو وہ دونوں ٹاپ قپی کی پچھلی طرف آ گئے۔

وہاں ایک وسیع و عریض سفید سنگ مرمر کے چمکتے فرش والا برآمدہ تھا، جسے سفید ستونوں نے تھام رکھا تھا۔ برآمدے کے آگے فاصلے فاصلے پر چوکور چبوترے سے بنے تھے جن کے سامنے ٹیرس کی طرح چند گز چوڑا کھلا احاطہ تھا۔ اس کے آگے اونچی سفید منڈیر بنی تھی۔ وہاں کھڑے ہو کر منڈیر پہ کہنیاں رکھ کر دیکھو تو نیچے بہتا مرمر کا جھاگ اڑاتا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ وہ جگہ اتنی خوب صورت تھی کہ دل چاہتا انسان صدیوں وہاں بیٹھا سمندر دیکھتا رہے۔

''تھک گئے ہو؟'' وہ دونوں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے چبوترے کے کنارے پہ بیٹھے تھے۔ جب حیا نے پوچھا۔ اسے جہان ذرا تھکا تھکا لگا تھا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ ذرا سا بخار ہے شاید۔'' اس نے خود ہی اپنا ماتھا چھوا، پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جیکٹ کی جیب سے گولیوں کی ڈبی نکالی۔ ڈھکن کھول کر ڈبی ہتھیلی پہ الٹی، دو گولیاں علیحدہ کیں اور ڈبی بند کرتے ہوئے دونوں گولیاں منہ میں ڈالی، پھر نگل گیا۔

''میرے پاس پانی تھا۔'' وہ اپنا پرس کھنگالنے لگی، لیکن تب تک وہ نگل چکا تھا۔

''تم ٹھیک ہو؟'' وہ تشویش سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ صبح ریسٹورنٹ سے نکلتے ہوئے اسے یوں ہی جہان کی آواز ذرا دھیمی لگی تھی مگر اس نے پوچھا نہیں۔ اب شاید اس کا بخار شدید ہو گیا تھا۔ کیونکہ چہرے پہ اثرات آنے لگے تھے۔ سرخ پڑتی آنکھیں اور نڈھال سا چہرہ۔

''بس میں نے دیکھ لیا سمندر، اب واپس چلتے ہیں، تمہیں گھر جا کر ریسٹ کرنا چاہیے۔''

''گھر جاتے جاتے گھنٹہ لگ جائے گا۔ میں نے ابھی دوائی لی ہے، اس کا اثر ہونے میں ذرا وقت لگے گا۔ ابھی یہیں بیٹھتے ہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے تکان سے کہہ رہا تھا۔

چند لمحے خاموشی سے بیت گئے۔ ان چبوتروں پہ دور، دور تک ٹولیوں کی صورت میں سیاح بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ بہت سے لوگ آگے منڈیر کے ساتھ کھڑے ہوئے سمندر کو دیکھ رہے تھے۔

''میں تھوڑی دیر یہاں لیٹ جاؤں، تم اکیلی بور تو نہیں ہو گی؟ ابھی میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ میری لینڈ لیڈی شاید آج آئے جھگڑا کرنے میں فی الحال اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔''

''نہیں نہیں، تم لیٹ جاؤ۔ یہ شال لے لو۔'' اس نے بیگ سے شال نکال کر اسے تھمائی۔ وہاں ٹھنڈی ہوا بہت تیز تھی۔ یہ شال وہ اور ڈی جے بطور پکنک میٹ کے استعمال کرتی تھیں۔

''تھینکس!'' وہ ستون کے ساتھ فرش پہ لیٹ گیا۔ آنکھوں پہ بازو رکھے، وہ گردن تک شال کمبل کی طرح ڈالے، کب سو گیا اسے پتا نہیں چلا۔ اسے یقیناً بہت سردی لگ رہی تھی۔

وہ اس سے ایک زینہ نیچے آ بیٹھی تھی۔ ہر چند لمحے بعد وہ گردن موڑ کر اوپر لیٹے جہان کو دیکھ لیتی تھی۔ وہ سو چکا تھا۔

سمندر کی لہروں کا شور وہاں تک سنائی دے رہا تھا۔ وہ اپنا ترکی والا موبائل نکال کر یوں ہی ان باکس نیچے کرنے لگی۔ وہاں چند دن پہلے کا ایک ایس ایم ایس ابھی تک پڑا تھا۔ اس نے اس کا جواب نہیں دیا تھا اور کئی دفعہ پڑھ لینے کے باوجود مٹایا نہیں تھا۔ وہ بیوک ادا سے واپسی کے اگلے روز انڈیا کے ایک غیر شناسا موبائل نمبر سے آیا تھا۔

''مجھے آپ کے جواب سے خوشی نہیں ہوئی، مگر میں آپ کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔ آج کے بعد آپ سے کبھی رابطہ نہیں کروں

گا۔ جو تکلیف میں نے آپ کو پہنچائی، اس کے بدلے میں اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو یہ آپ کی بڑائی ہوگی اور اگر کبھی آپ کو استنبول میں کوئی مسئلہ ہو، سرکاری کام ہو یا غیر سرکاری، قانونی یا غیر قانونی، مجھے صرف ایک ایس ایم ایس کر دیجیے گا، آپ کا کام ہو جائے گا، اے آر پی۔''

اس پیغام کے بعد اس شخص نے واقعتاً کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ اب استنبول میں بہت آزادی سے، بہت مطمئن دل و دماغ کے ساتھ گھومتی تھی۔ اسے پہلے کی نسبت اب اے آر پی سے ڈر نہیں لگتا تھا مگر اس وقت وہ پیغام دوبارہ پڑھتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا تھا۔

اس نے پلٹ کر احتیاط سے جہان کو دیکھا۔ وہ آنکھوں پہ بازو رکھے سو رہا تھا۔ وہ واپس سیدھی ہوئی اور ریپلائی کا بٹن دبایا۔ اس پیغام کا جواب اسے کبھی نہ کبھی تو دینا ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ خوب غور و فکر کر کے کچھ ایسا لکھ کر بھیجے گی کہ وہ بھڑ کے بھی نہیں اور دوبارہ اس کا پیچھا بھی نہ کرے، سو اچانک اسے ایک عجیب سا خیال آیا تھا۔

جہان کو صرف بخار نہیں تھا۔ وہ پریشان بھی تھا۔ اسے وہ بیوک ادا والے ٹرپ کے مقابلے میں ذرا کمزور لگا تھا۔ گردش معاش کے جھمیلوں میں پھنسے اس انسان کی اگر وہ ایک مدد کر سکتی تھی تو اس میں آخر حرج ہی کیا تھا۔

وہ کافی دیر سوچتی رہی، پھر اس نے جواب ٹائپ کرنا شروع کیا۔

''آپ کی وسیع النظری کا شکریہ۔ مجھے واقعتاً استنبول میں ایک کام درپیش ہے۔ اگر آپ میری مدد کریں تو میں اسے آپ کی طرف سے پہنچائی جانے والی اذیت کا مداوا سمجھوں گی۔''

اس نے پیغام بھیج دیا۔ اب وہ خاموشی سے بیٹھی سمندر کی لہریں دیکھنے لگی۔ وہ بیوک ادا اس کے گھر بھی تو چلی گئی تھی اور جب دروازہ بند ہوا تھا تو اسے لگا تھا وہ ایک سنگین غلطی کر چکی ہے۔ مگر اس غلطی کا نتیجہ بہت اچھا اور اطمینان بخش نکلا تھا۔ اسے احساس تھا کہ اب بھی اس نے غلطی کی ہے اور اس کا نتیجہ......؟

ایک دم فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ چونکی اور موبائل سامنے کیا۔ وہی انڈیا کا غیر شناسا نمبر تھا، وہ تو سمجھی تھی کہ ٹیکسٹ پہ بات ہو جائے، بہت ہے مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ فون کر لے گا۔

وہ موبائل سنبھالتی اٹھ کر سامنے منڈیر کے پاس چلی آئی۔ اگر وہ یہاں کھڑے ہو کر بات کرے گی تو جہان تک آواز نہیں پہنچے گی۔

''ہیلو؟'' اس نے فون اٹھالیا۔

''زہے نصیب...... زہے نصیب...... آج آپ نے ہمیں کیسے یاد کر لیا؟'' وہی عامیانہ سا، مسکراتا لب و لہجہ۔ اسے اپنی حرکت پہ شدید پشیمانی ہوئی تھی۔

''مجھے ایک کام تھا۔'' وہ احتیاط سے نپے تلے لہجے میں کہنے لگی۔ ''اور بہتر ہوگا کہ ہم کوئی بے کار کی بات کرنے کی بجائے کام کی بات کریں۔''

''آپ کی مرضی ہے حیا جی! رابطہ بھی تو آپ نے ہی کیا ہے، ورنہ عبدالرحمٰن پاشا اپنے قول کا بہت پکا ہے۔'' شاید وہ طنز کر گیا تھا، مگر وہ پی گئی۔

''میرے کزن کا ریسٹورنٹ ہے استقلال اسٹریٹ پر، برگر کنگ، اس کی شاپ کی قسطیں ادا نہیں ہوئیں۔ ریسٹورنٹ کی مالکہ آج کل میرے کزن کو تنگ کر رہی ہے۔ کیا وہ اسے سال، دو سال کی مہلت نہیں دے سکتی؟''

''کون سا کزن؟'' وہ جیسے چونکا تھا۔

''جج...... جہان سکندر۔'' وہ ہکلائی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ ٹھیک کر رہی ہے یا غلط، مگر وہ یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھی اسے اس پریشانی سے تھکتے بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''اچھا...... تو آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے کزن کا یہ مسئلہ حل کر دوں اور یہ کہ اس کی مالکہ پھر اسے تنگ نہ کرے؟''

''جی!''

وہ ہولے سے ہنس دیا۔

"میں کچھ کرتا ہوں، آپ فکر نہ کریں۔"

اس نے فون رکھ دیا اور سوچنے لگی کہ وہ ہنسا کیوں تھا؟

وہ واپس آ کر جہان کے ساتھ بیٹھ گئی۔ چند لمحے لگے تھے اسے نارمل ہونے میں۔ اس نے وہی کیا، جو اسے ٹھیک لگا تھا اور اب وہ ذرا مطمئن تھی۔

کافی دیر وہ وہیں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ اس کے عقب میں ٹاپ قپی کا عظیم محل تھا اور سامنے مرمرا کا سمندر۔ سمندر کے اس پار ایشیائی استنبول (پرانا شہر) تھا۔ بہت سے لمحے محل کی دیواروں سے رینگتے مرمرا کے پانیوں میں تحلیل گئے تو ایک دم جہان کا موبائل بجا۔

وہ جیسے ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ شال ہٹائی اور جیب سے موبائل نکالا۔ تب تک کال کرنے والا شاید کال کاٹ چکا تھا۔

"ریسٹورنٹ سے آ رہی تھی کال، میرا خیال ہے واپس چلتے ہیں، وہ چالاک لومڑی نہ آئی ہو کہیں۔" وہ پریشانی سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا تم کیوں فکر کرتے ہو؟" وہ بڑے اطمینان سے کہتے ہوئے اس کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ جہان نے اس کی بات پہ تھکے تھکے سے انداز میں نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ کافی دیر بعد جب وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے استقلال اسٹریٹ میں داخل ہوئے تو حیا نے کہا۔

"آج میں تمہارا برگر کھا کر جاؤں گی، کیونکہ ڈی جے اور تم نے اپنی اپنی بیماری میں مجھے بالکل اگنور کر دیا ہے۔"

"کھا لینا۔" وہ دھیرے سے مسکرایا مگر اگلے ہی پل ٹھٹھک کر رکا۔ مسکراہٹ چہرے سے غائب ہو گئی۔ حیا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

سامنے برگر کنگ تھا۔ اس کی شیشے کی دیوار میں بڑا سا سوراخ تھا اور سوراخ کے گرد مکڑی کے جالے کی مانند دراڑیں پڑی تھیں۔

وہ ایک دم تیزی سے دوڑتا ریسٹورنٹ کی طرف لپکا، جبکہ وہ وہیں ششدر سی کھڑی رہ گئی۔ اس کی سماعتوں میں ایک قہقہہ گونجا تھا۔

دوسرے ہی پل وہ بھاگ کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔

کھڑکیوں کے ٹوٹے شیشے، الٹا، بکھرا ٹوٹا فرنیچر، اوندھی میزیں، ٹکڑے ٹکڑے ہوئے برتن، ہر جگہ توڑ پھوڑ کے آثار تھے۔ عملے کے ایک شخص کے ساتھ دو پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک آفیسر ہاتھ میں پکڑے کلپ بورڈ پہ لگے کاغذ پہ کچھ لکھ رہا تھا۔

جہان تحیر سے وہ سب کچھ دیکھتا ان پولیس آفیسرز کی طرف آیا۔ وہ اس سے کچھ پوچھ رہے تھے اور وہ صدمے اور شاک سے گنگ نفی میں سر ہلاتا کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" اس نے قریب سے گزرتے شیف کو روک کر پوچھا۔ جواباً اس نے تاسف سے سر ہلایا۔

"وہ گینگسٹرز تھے، ان کے پاس اسلحہ تھا۔ وہ اندر آئے اور پورا ریسٹورنٹ الٹ دیا۔ عملے کو زدوکوب بھی کیا۔ پولیس بھی بہت دیر سے پہنچی۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور اس کا دل چاہ رہا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ یہ اس نے کیا کر دیا؟ کس شخص پہ بھروسا کر لیا؟ اوہ خدایا......

پولیس آفیسر کی کسی بات کے جواب میں کچھ کہتے جہان کی نگاہ اس پہ پڑی۔ جو بمشکل آنسو روکے کھڑی تھی۔ اس نے اسے ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی۔ وہ اس کی طرف آیا۔

"تم جاؤ، ٹاقسم سے بس پکڑ لینا، ابھی جاؤ، میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔" وہ تھکا تھکا سا کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پژمردہ اور تھکن زدہ لگ رہا تھا۔ وہ سر ہلا کر، آنسو پیتی پلٹ گئی۔

"یہ تم نے کیا کر دیا حیا! جو اس کے پاس تھا، اسے بھی ضائع کرا دیا؟ آئی ہیٹ یو حیا...... آئی ہیٹ یو......"

خود کو ملامت کرتی، وہ خاموش آنسوؤں سے روتی واپس ٹاقسم جا رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا تھا کہ وہ فون کر کے اس شخص

کو بے نقط سنائے، مگر شاید وہ یہی چاہتا تھا۔ رابطہ رکھنے کا کوئی بہانہ۔ اس نے آنسو رگڑتے ہوئے سر جھٹکا۔

''نہیں۔ اب وہ اسے کبھی فون نہیں کرے گی۔''

☆ ☆ ☆

وہ گہری نیند میں تھی۔ سیاہ گھپ اندھیرے میں جب دور ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز نے سماعت کو چیرا۔ اندھیرے میں دراڑ پڑی۔ دور سے آتی آواز قریب ہوتی گئی۔ اس نے پلکیں جدا کرنی چاہیں تو جیسے ان پہ بہت بوجھ تھا۔

بمشکل آنکھیں کھلیں تو چند لمحے اسے حواس بحال کرنے میں لگے۔ اس نے اردگرد دیکھا۔

ڈورم میں پرسکون سی نیم تاریکی چھائی تھی، کونے میں مدھم سا نائٹ بلب جل رہا تھا۔ ڈی جے، ٹالی اور چیری اپنے اپنے بستروں میں کمبل ڈالے سو رہی تھیں۔ دیوار پہ آویزاں بڑے کلاک کی چمکتی سوئیاں رات کے ایک بجنے کا پتا دے رہی تھیں۔

وہ چنگھاڑتی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔ اس نے نیند سے بوجھل ہوتا سر دائیں جانب گھمایا، کہنی کے بل ذرا اوپر ہوئی اور تکیے تلے ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا۔ اس کا ترکی والا موبائل بج بج کر اسی پل خاموش ہوا تھا۔ دو مسڈ کالز، اس نے تفصیل کھولی تو چمکتی اسکرین سے آنکھیں پل بھر کو چندھیا ئیں۔ حیا نے پلکیں سکیڑے ہاتھ سے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے اسکرین کو دیکھا۔ ''تایا فرقان موبائل'' ساتھ بریکٹ میں دو کا ہندسہ تھا۔ حیا نے اسکرین کے کونے پہ لکھے ٹائم کو دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ یہاں ایک بجا تھا تو پاکستان میں تین بجے ہوں گے۔

آدھی رات کو آنے والا فون اور مہمان کبھی اچھی خبر نہیں لاتے، اور نہ ریسیو کر سکنے والی کال اس برچھی کی مانند ہوتی ہے جو کوئی گھونپ کر نکالنا بھول گیا ہو۔

اس کی ساری نیند اور سستی پل بھر میں بھاگ گئی۔ تایا اس وقت کیوں کال کر رہے تھے؟ وہ ٹھیک تو تھے؟ اماں، ابا، روحیل، سب ٹھیک تو تھے؟ پتا نہیں کیا مسئلہ تھا۔ وہ تڑپ کر واپس کال ملانے لگی، پھر یاد آیا کہ اس میں بیلنس نہیں تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے پاکستانی موبائل کو دیکھا جو تکیے کے اس طرف رکھا تھا۔ اس میں بھی بیلنس ختم تھا بلکہ اس فون میں تو ترکی آنے کے بعد بیلنس ہی نہیں ڈلوایا تھا۔

اس نے کمبل پھینکا اور سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے اتری۔ وہ اپنے نائٹ سوٹ میں ملبوس تھی۔ گلابی چیک والا ٹراؤزر اور کھلا لمبا کرتا۔

''ڈی جے..... ڈی جے..... موبائل دو اپنا۔'' اس نے ڈی جے کے بینک پہ چڑھ کر اس کو جھنجھوڑا۔ وہ بمشکل ہلی۔

''نیند مت خراب کرو میری۔ سیدھی جہنم میں جاؤ گی تم۔'' بند آنکھوں سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے کروٹ بدل لی۔ اس کا موبائل وہیں تکیے کے ساتھ رکھا تھا۔ حیا نے موبائل جھپٹا اور نیچے اتری۔ ٹالی کے بینک کی کرسی کھینچ کر بیٹھی اور اپنے موبائل سے تایا کا نمبر دیکھ کر ڈی جے کے فون پہ ملانے لگی۔ فون نمبرز حیا سلیمان کو کبھی زبانی یاد نہیں رہے تھے۔

نمبر ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ لمحے بھر کی خاموشی کے بعد وہ مشینی نسوانی آواز ترک میں کچھ بکنے لگی جس کا مطلب یہ تھا کہ ڈی جے ذلیل کا بیلنس بھی ختم تھا۔ اس نے جھنجھلا کر فون کان سے ہٹایا۔ یورپی یونین کا سارا اسکالرشپ استقلال اسٹریٹ اور جواہر میں شاپنگ پہ اڑا دینے والیوں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔

اسی پل فون پھر سے بجا۔ تایا فرقان کالنگ۔ اس نے جھٹ سے کال اٹھائی۔

''ہیلو.....؟''

''حیا..... تمہارے پاس اس نمبر کے علاوہ کون سا دوسرا نمبر ہے؟'' وہ تایا فرقان ہی تھے اور اتنے غصے سے بولے تھے کہ وہ کانپ گئی۔

''جی..... کیا؟''

''حیا! میرے ساتھ بکواس مت کرو، مجھے بتاؤ تمہارے پاس دوسرا کوئی نمبر ہے؟'' وہ نیند سے جاگی تھی اور کبھی بھی اتنی حاضر دماغ نہیں رہی تھی۔ مگر ساری بات سمجھنے میں اسے لمحہ لگا تھا۔

ارم پکڑی گئی تھی۔ ارم آدھی رات کو کسی سے فون پہ بات کرتی پکڑی گئی تھی۔

"نہیں تایا ابا! میرے پاس یہی ایک نمبر ہے اور دوسرا یوفون کا جو آپ کے پاس آل ریڈی ہے۔"
"تمہارے پاس موبی لنک کا کوئی نمبر نہیں ہے؟"
"نہیں تایا ابا! آپ بے شک ابا سے پوچھ لیں۔ یہ نمبر ان کے نام ہے اور میں نے دوسرا نمبر رکھ کر کیا کرنا ہے؟"
"اچھا..... ٹھیک ہے۔" انہوں نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔
اس نے گہری سانس لے کر موبائل کان سے ہٹایا اور دوسرے ہاتھ سے چہرے پہ آئے بال سمیٹ کر پیچھے کیے۔
تو ارم فرقان اصغر پکڑی گئی تھی۔
"میری ارم بھی تو ہے، مجال ہے جو بنا سر ڈھکے کبھی گھر سے نکلی ہو۔"
وہ ارم کے لیے متاسف بھی تھی اور فکر مند بھی، مگر دور اندر دل کے اس پوشیدہ خانے میں جو کوئی شخص دنیا کو نہیں دکھاتا، اسے تھوڑی سی کمینی سی خوشی بھی ہوئی تھی۔
"بہت اچھا ہوا تایا ابا!" اس دور کے خانے میں کسی نے کہا تھا۔ "اب تو آپ کو بھی معلوم ہو گیا کہ دوسروں کی بیٹیوں پہ انگلیاں اٹھانے والے لوگوں کے اپنے گھروں پہ وہ انگلیاں لوٹ کر آتی ہیں۔ بہت اچھا ہوا تایا ابا!"
صبح سویرے اٹھتے ہی وہ اسی کرتے، ٹراؤزر پہ ایک ڈھیلا ڈھالا سا سوئیٹر اور شال لپیٹ کر 'دیا' اسٹور آ گئی۔ بال اس نے اب کیچر میں باندھ لیے تھے اور اپنے گلابی قینچی چپل پہن لیے تھے۔
اسٹور سے اس نے کارڈ خریدا، ری چارج کیا اور موبائل پہ اماں کا نمبر ملاتی باہر کیفے کے برآمدے میں بچھی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔ دہاں فاصلے فاصلے پہ گول میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ اسٹوڈنٹس صبح صبح ادھر ناشتا کرنے آتے تھے۔ سامنے سبانچی کا خوب صورت فوارہ نصب تھا۔ گول چکر میں مقید فوارہ جس کی پانی کی دھار بہت اوپر جا کر نیچے گرتی تھی۔
"اتنی صبح صبح فون کیسے کیا، خیریت؟" فاطمہ ذرا فکر مند ہو گئیں۔
"تو کیا میں آپ کو ایسے یاد نہیں کر سکتی؟" وہ آرام دہ انداز میں ٹیک لگا کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھتی ذرا خفگی سے بولی۔
"ہماری پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ ہمیں عموماً مسڈ بیل دیا کرتی ہیں یا پھر کسی ایس ایم ایس ویب سائٹ سے مفت کا ایس ایم ایس کر کے کال کرنے کا کہتی ہیں تو ہم کال بیک کرتے ہیں۔ اس لیے اگر وہ علی الصبح خود فون کریں گی تو حیرت تو ہو گی نا!"
"بس اماں! غربت ہی اتنی ہے، کیا کریں۔" وہ قینچی چپلوں میں مقید پیر جھلاتے ہنس کر بولی۔
"ہاں یورپی یونین نے وہ ہزاروں یوروز کا اسکالرشپ تو کسی اور کو دیا تھا نا۔" فاطمہ کی تشویش ختم ہو چکی تھی اور وہ اسی کے انداز میں بات کر رہی تھیں۔
وہ تو رینی ڈیز کے لیے سنبھال کر رکھا ہے۔"
"کون سے رینی ڈیز؟"
"اسپرنگ بریک اماں، اور یہاں اسپرنگ بریک کے دنوں میں خوب بارش ہوتی ہے۔ اس لیے میں اور ڈی جے اسپرنگ بریک میں پورا ترکی گھومنے کا سوچ رہے ہیں اور لگتا ہے آج کل آپ صائمہ تائی کی کمپنی میں رہ رہی ہیں، صبح ہی صبح طنز کیے جا رہی ہیں..... اچھا سب کچھ چھوڑیں، یہ بتائیں گھر میں سب خیریت ہے؟"
"ہاں سب ٹھیک ہے۔"
"تایا فرقان کی طرف بھی؟" اس نے ہاتھ سے ویٹر کو اشارہ کیا۔ وہ قریب آیا تو اس نے مینیو کارڈ پہ بنے ڈونٹ پہ انگلی رکھی، پھر انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا تو وہ سمجھ کر واپس مڑ گیا۔
"ہاں کیوں؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟"
"نہیں، مگر رات تایا کا فون آیا تھا۔ اچھا آپ جا کر ان کو کہہ مت آیئے گا۔"

''لو، میں کیوں کہوں گی؟'' فاطمہ الٹا خفا ہوئیں، مگر وہ جانتی تھی کہ ماؤں کا بھروسا نہیں ہوتا۔ لاکھ کہو کہ نہ بتایئے گا پھر بھی اپنے اگلے پچھلے حساب چکاتے وقت کسی نہ کسی موقع پہ اس بات کو استعمال کر ہی لیتی تھیں، مگر ایک اچھی بیٹی کی طرح سے پوری بات ماں کے گوش گزار کیے بغیر ڈونٹس کہاں ہضم ہونے تھے۔ سو ساری بات دہرا دی، بس ارم کا میسج پڑھنے والا قصہ گول کر گئی۔

''اچھا، پتا نہیں، ہمیں تو کچھ نہیں پتا چلا۔'' وہ کچھ دیر اسی بات پہ تبصرہ کرتی رہیں، پھر ایک دم یاد آنے پہ بولیں۔ ''لو، میں بتانا ہی بھول گئی، مہوش کی شادی طے ہو گئی ہے۔'' انہوں نے نئے زاہد چچا کی بیٹی کا نام لیا، جس کی نسبت کافی عرصے سے اپنے ماموں زاد سے طے تھی۔

''اچھا، کب؟'' اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔ ترکی آتے وقت سنا تو تھا کہ اپریل کی کوئی تاریخ رکھیں گے، مگر اسے بھول گیا تھا۔

''ہفتہ ہو گیا ہے رکھے ہوئے، جب بھی بات ہوتی ہے، بتانا بھول جاتی ہوں۔'' پھر انہوں نے جو تاریخ بتائی وہ اپریل میں ان کے اسپرنگ بریک کے درمیان آتی تھی۔

''تب تو ڈی جے اور میں عظیم سلطنتِ ترکیہ کی سیر کر رہے ہوں گے۔''

''سبین کو بلایا تو ہے، مگر کہہ رہی تھی کہ سکندر بھائی کی طبیعت آج کل خراب رہتی ہے، وہ نہیں آ سکے گی، میں نے کہا جہان کو بھیج دو، اچھا ہے ساتھ حیا بھی آ جائے گی، دونوں شادی اٹینڈ کر لیں گے، مگر وہ کہہ رہی تھی کہ مشکل ہے۔''

اس نے فون کو کان سے ہٹا کر گھورا، اور پھر ہنس دی۔ اماں بھی کبھی کبھی لطیفے سناتی تھیں۔ وہ انتہائی غیر رومانٹک سے ماں، بیٹا کہاں ماننے ایسے رومانٹک ٹرپ کے لیے؟

اس نے سر جھٹک کر موبائل کان سے لگایا۔ فاطمہ کہہ رہی تھیں۔ ''ایک تو تمہاری پھپھو بھی کوئی بات غیر مبہم نہیں کرتیں۔''

''بالکل!'' اس نے تائید کی۔

ویٹر نے چاکلیٹ اور رنگ برنگے دانوں سے سجے دو ڈونٹس پلیٹ میں میز پہ رکھے تو وہ الوداعی کلمات کہنے لگی۔ ارم کے متعلق مزید جاننے کی فی الحال اسے طلب نہیں رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''بیوک ادا؟ پھر بیوک ادا؟''

اس روز وہ شام میں جلدی سو گئی تھی، سو عشاء کے بعد آنکھ کھلی۔ کچھ دیر پڑھتی رہی، پھر روحیل سے اسکائپ پہ گھنٹہ بھر باتیں کیں اور اسے ترکی کا سفرنامہ سنا کر خوب بور کیا اور اب بھوک لگی تو کچن میں آئی تھی۔ ڈی جے نے آلو، مٹر بنایا تھا جو سالن کم اور کوئی گدلا پانی زیادہ لگ رہا تھا، جس میں مٹر، آلو اور پیاز تیر رہے تھے۔ وہ ناک چڑھاتے ہوئے اس ملغوبے کو گرم کرنے کے لیے پلیٹ میں ڈال ہی رہی تھی کہ ڈی جے نے پیچھے سے آ کر بتایا کہ اس نے، ہالے اور انجم باجی کے ساتھ بیوک ادا جانے کا پروگرام بنا لیا اور کل صبح چھ بجے کی گورسل شٹل پکڑنی ہے۔

''بیوک ادا؟ پھر بیوک ادا؟'' وہ اوون کا دروازہ بند کرتی چونک کر پلٹی۔ پل بھر میں اس کی آنکھوں میں ناگواری سمٹ آئی تھی۔

''ہالے اور انجم باجی نے پروگرام بنا کر مجھ سے پوچھا تو میں نے ہامی بھر لی۔'' پانی کی بوتل کو کھڑے کھڑے منہ سے لگاتے ہوئے ڈی جے نے شانے اچکائے۔

''اور یقیناً میری طرف سے بھی بھر لی ہو گی۔''

''بالکل!''

''میں کوئی نہیں جا رہی بیوک ادا، میری طرف سے انجم باجی کو انکار کر دو۔'' وہ پلٹ کر چیزیں اٹھا پٹخ کرنے لگی۔ انداز میں واضح جھنجھلاہٹ تھی۔

''کیوں؟ اتنا تو خوب صورت جزیرہ ہے۔''

''مجھے نہیں جانا ادھر، بس کہہ دیا نا۔'' وہ ریفریجریٹر کا اوپر والا فریزر کھولے چند پیکٹ ادھر ادھر کرنے لگی۔ بالوں کا ڈھیلا جوڑا اس کی گردن کی پشت پہ جھول رہا تھا۔

"مگر کیوں؟"

"وہ عبدالرحمٰن پاشا کا جزیرہ ہے اور میں اس آدمی کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" اس نے روٹیوں کا پیکٹ نکال کر فریزر کا دروازہ زور سے بند کیا۔ پیکٹ میز پہ رکھا۔ جمی ہوئی دو روٹیاں نکالیں، اور پلیٹ میں رکھیں۔ ان میدے کی بنی ترک روٹیوں کا نام انہیں معلوم نہیں تھا۔ بس "دیا" اسٹور پہ وہ فریزر میں نظر آئی تھیں اور اتنی سمجھ تو انہیں تھی کہ انہیں مائیکرو ویو میں گرم کر کے کھاتے ہیں۔ تب سے وہ یہی روٹیاں کھا رہی تھیں۔

ڈی جے اس کے روٹی اوون میں رکھنے تک سکتے سے باہر آ چکی تھی۔

"عبدالرحمٰن پاشا؟ وہ جس کا ذکر ہماری ہوسٹ آنٹی نے کیا تھا؟"

"ہاں وہی، کرمنل، اسمگلر!"

"مگر اس کا کیا ذکر؟ ہالے نے کہا تھا کہ..."

"ہالے کو چھوڑو، میں سب بتاتی ہوں، پہلے کیچپ لاؤ، پھر انجم باجی کو کال کر کے پروگرام کینسل کرو۔"

کھانا کھا کر وہ دونوں باہر آ گئیں۔ رات گہری ہو چکی تھی۔ دونوں نے اونی سوئیٹر پہن رکھے تھے۔ وہ ڈورم سے بلاک سے نکل کر باتیں کرتے سبزہ زار پہ چلتی گئیں۔ پہلے ڈی جے نے انجم باجی کو فون کر کے معذرت کی اور جب اسے لگا کہ وہ ذرا ناراض ہو گئی ہیں، کیونکہ ان دونوں نے خاصی پاکستانی حرکت کی تھی اور ترکی میں کمٹمنٹ توڑنا بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ سو اس پاکستانی حرکت کو سنبھالنے کے لیے حیا نے فون لے لیا اور انہیں بتایا کہ اس کی پھپھو نے کل اسے اور اس کی فرینڈز کو اپنے گھر انوائٹ کیا ہے۔ سو انجم باجی اس کی دعوت قبول کر کے ان کے ساتھ چلیں، بیوک ادا پھر کسی روز چلے جائیں گے۔ یوں انجم باجی مان گئیں اور اب وہ دونوں چلتے چلتے "دیا" اسٹور کے سامنے والے فوارے کی منڈیر پہ آ بیٹھیں۔ فوارے کا پانی چھینٹے اڑاتا ہوا نیچے گر رہا تھا اور اس پانی میں بنتے مٹتے بلبلوں کو دیکھتے ہوئے حیا نے ساری کہانی الف تا یے اس کو سنا ڈالی۔

ڈی جے کتنی دیر تو چپ بیٹھی رہی، پھر آہستہ آہستہ سوچ کر کہنے لگی۔

"تو وہ چیکی میجر احمد تھا، جو ہمیں مارکیٹ میں ملا تھا؟"

"بالکل!"

"اور ڈولی اصلی خواجہ سرا تھا؟"

"شاید، وہ ان کا پرانا ملازم ہے۔"

"اور تم منہ اٹھا کر اس کے گھر میں چلی گئیں؟"

"منہ اٹھا کر کیا! میرا پاسپورٹ تھا اس پرس میں اور اچھا ہی ہوا، ساری بات تو کلیئر ہو گئی۔" وہ اپنی غلطی مانتی، یہ ناممکن تھا۔

"مگر تم نے اسے فون کر کے بہت غلطی کی۔"

"تو بھگت رہی ہوں نا وہ غلطی۔ اس ظالم شخص نے یہ نہیں سوچا کہ جہان کے پاس اس ریسٹورنٹ کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس نے اسی کو ایسے تباہ برباد کر دیا۔ اب یقیناً وہ اس کی لینڈ لیڈی کو شہہ دے گا کہ وہ ریسٹورنٹ واپس حاصل کر لے۔" وہ سخت نادم تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، وہ تم سے واقعی محبت کرتا ہے؟"

"کسی کو اذیت پہنچانا محبت نہیں ہوتی۔"

کچھ دیر وہ یوں ہی اسی بات کو ہر پہلو سے ڈسکس کرتی رہیں، پھر ڈی جے نے ہاتھ اٹھا کر حتمی انداز میں کہا۔

"ایک بات تو طے ہے، اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ تمہارے پیچھے نہیں آئے گا۔"

"ہوں!" وہ سر ہلا کر اٹھ گئی۔ رات بہت بیت چکی تھی، اب ان کو واپس جانا تھا۔

سبزہ زار پہ چلتے ڈورم بلاک کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ اپنے مسئلے کسی کو بتانے سے وہ حل نہیں ہوتے۔ دل کا بوجھ کسی کے سامنے ہلکا کرتے کرتے بعض دفعہ ہم اپنی ذات کو ہی دوسرے کے سامنے ہلکا کر دیتے ہیں۔ پریشانیاں بتانے سے کم ہو سکتی ہیں،

ختم نہیں، جیسے اس کی پریشانی ابھی تک اس کے ساتھ تھی۔

☆ ☆ ☆

کلاس روم کی کھڑکیوں سے سورج کی روشنی چھن کر اندر آ رہی تھی۔ صبح کی نم ہوا بار بار شیشوں سے ٹکرا کر پلٹ جاتی، جیو انفارمیشن سسٹم کے پروفیسر اپنے مخصوص انداز میں لیکچر لے رہے تھے۔ اس کے ساتھ بیٹھی ڈی جے بظاہر بہت توجہ سے لیکچر سنتی رجسٹر پہ لکھ رہی تھی۔ وہ ہر چند لفظ لکھ کر سر اٹھا کر پروفیسر کو دیکھتی، ذرا غور سے ان کے اگلے الفاظ سنتی اور پھر سمجھ کر سر ہلاتی دوبارہ لکھنے لگ جاتی۔

حیا نے ایک نگاہ اس کے رجسٹر پہ ڈالی۔ وہاں اس کا چلتا قلم لکھ رہا تھا۔

''تم لوگوں کا اسپرنگ بریک کا کیا پروگرام ہے؟ کدھر جاؤ گے اور کون کون تمہارے ساتھ جا رہا ہے؟'' آخری لفظ لکھ کر اس نے گردن سیدھی کر کے پورے اعتماد سے پروفیسر کو دیکھتے ہوئے رجسٹر دائیں جانب بیٹھے معتصم کو پاس کر دیا۔ یہ ان کی اور فلسطینیوں کی واحد مشترکہ کلاس تھی۔

معتصم نے ایک نگاہ کھلے رجسٹر پہ ڈالی، اور پھر سر جھکا کر کچھ لکھنے لگا۔ جب رجسٹر واپس ملا تو اس پہ انگریزی میں لکھا تھا۔

''ہم ٹرکی کے ٹور پہ جا رہے ہیں۔ سات دن میں سات شہر۔ ہم پانچوں اور ٹالی۔ اور تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟''

''اف پھر یہ ٹالی!'' ڈی جے کوفت سے جواب لکھنے لگی۔

''ہم بھی سات دنوں میں سات شہر گھومنے کا سوچ رہے ہیں۔''

اس نے رجسٹر آگے پاس کر دیا اور پھر ذرا ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

معتصم اب صفحے پہ چند الفاظ گھسیٹ رہا تھا۔

''تو ہمارے ساتھ چلو نا۔''

''تم لوگوں کو کب نکلنا ہے؟''

''پہلی چھٹی والے دن۔'' معتصم نے اپنا پروگرام بتایا۔

''ہم نے دوسری چھٹی پہ نکلنا ہے، سو تمہارے ساتھ مشکل ہوگا۔ چلو پھر چھٹیوں کے بعد ملیں گے۔''

''نو پرابلم!'' ساتھ میں معتصم نے ایک مسکراتا ہوا چہرہ بنایا۔

حیا دانت پہ دانت جمائے بمشکل جمائیاں روکنے کی سعی کر رہی تھی۔ اسے اس کلاس سے زیادہ بورنگ کوئی کلاس نہیں لگتی تھی۔

دفعتاً معتصم نے رجسٹر ڈی جے کی جانب بڑھایا تو اس پہ لکھے الفاظ کو پڑھ کر ڈی جے نے رجسٹر حیا کے سامنے رکھ دیا۔ حیا نے ذرا سی گردن جھکا کر دیکھا۔ اوپر اس نے انگریزی میں لکھا تھا۔ ''ٹرانسلیٹ اِن اردو پلیز۔'' اس کے نیچے عربی عبارت لکھی تھی۔ ''کیف حالک؟''

حیا نے قلم انگلیوں کے درمیان پکڑا اور اردو ہجوں میں لکھا۔

''آپ کا کیا حال ہے؟'' اور رجسٹر واپس کر دیا۔ معتصم اور حسین کو آج کل ڈی جے سے اردو الفاظ سیکھنے کا شوق چڑھا ہوا تھا۔ اس کلاس میں وہ یوں سارا وقت عربی الفاظ لکھ لکھ کر ان کو دیتے تھے۔

چند لمحوں بعد اس نے پھر صفحہ حیا کے سامنے کیا۔ اب کے اس پہ لکھا تھا ''حالی بخیر''

حیا نے جیسے چڑ کر نیچے لکھا۔

''میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ کی خیریت ٹھیک چاہتی ہوں۔''

''اتنا لمبا کیوں لکھا؟'' ڈی جے نے حیرت سے سرگوشی کی۔

''اگر چھوٹا لکھتی تو یہ فوراً ہی اسے سیکھ کر مجھ سے آج ہی کی تاریخ میں پوری فیروز اللغات لکھواتا۔ اب اچھا ہے نا، پورا دن ''ٹھیک'' پڑھنے میں گزار دے گا۔''

اور معتصم سے کلاس کے اختتام تک ''ٹھیک'' ٹھیک سے نہیں پڑھا گیا۔

کلاس ختم ہوئی تو وہ واپس ڈورم میں آئیں۔ منہ ہاتھ دھو کر تیار ہونے میں بھی کافی وقت لگ گیا۔ اس نے ایک مور پنکھ کے سبز رنگ کا پاؤں کو چھوتا فراک پہنا۔ فراک کی آستین تنگ چوڑی دار تھی اور نیچے پاجامہ تھا۔ پورا لباس بالکل سادہ تھا۔ بال اس نے کھلے چھوڑ دیے اور کاجل اور نیچرل پنک لپ اسٹک لگا کر ڈی جے کی طرف پلٹی۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟''

ڈی جے، جو بالوں میں برش کر رہی تھی، رک کر اسے دیکھنے لگی۔

''بالکل پاکستان کا جھنڈا لگ رہی ہو۔''

''دفع ہو جاؤ۔''

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ دونوں انجم باجی اور ہالے کے ساتھ جہانگیر میں واقع پھپھو کے گھر کے سامنے کھڑی تھیں۔

''پھپھو کو بتا تو دیا تھا نا؟ یہ نہ ہو کہ وہ کہیں، میں نے تو انوائٹ ہی نہیں کیا تھا۔'' ڈی جے نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں ہاں، بتا دیا تھا۔'' اس نے سرگوشی میں ڈی جے کو جواب دیتے ہوئے ڈور بیل بجائی۔

پھپھو ان سے بہت تپاک سے ملیں۔ لونگ روم میں بیٹھنے تک ہی تعارف کا مرحلہ تمام ہو گیا۔

''حیا! آج تو تم نے گھر میں رونق کر دی ہے۔'' وہ واقعتاً بہت خوش تھیں۔ حیا ان کے گھر کو اپنا سمجھ کر دوستوں کو ساتھ لائی ہے، یہ خیال ہی ان کو بے حد مسرت بخش رہا تھا۔

وہ ان دو ماہ میں چند ایک بار ہی پھپھو کے گھر آئی تھی اور پہلی دو دفعہ کے بعد جہان کبھی گھر نہیں ملا تھا، نہ ہی وہ اسے بتا کر آتی تھی۔ اس دفعہ تو اس نے بالکل بھی نہیں بتایا۔ وہ اندر ہی اندر خود کو اس کا مجرم سمجھ رہی تھی۔ اس کے ٹوٹے بکھرے ریسٹورنٹ کو یاد کر کے وہ اکثر خود کو ملامت کرتی تھی۔

''آپ کا گھر بہت پیارا ہے آنٹی!'' انجم باجی نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے ستائشی انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اور یہ رگز تو بہت ہی پیارے ہیں۔'' ہالے نے فرش پہ بچھے رگز کی جانب اشارہ کیا۔

''اور میری پھپھو بھی بہت پیاری ہیں۔'' وہ پھپھو کے شانوں کے گرد بازو حمائل کیے مزے سے بولی تو پھپھو ہنس دیں۔ ڈی جے نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ ''اور پھپھو کا بیٹا بھی بہت پیارا ہے۔''

حیا نے زور سے اس کا پاؤں دبایا۔ وہ بس ''سی'' کر کے رہ گئی۔

''چلو تم لوگ ادھر بیٹھو، میں بس ابھی آئی۔'' اچھے میزبانوں کی طرح پھپھو مسکرا کر کہتے ہوئے راہداری کی طرف مڑ گئیں جس کے دوسرے سرے پہ کچن تھا۔ کچن کا دروازہ کھلا تھا سو صوفوں پہ بیٹھے ہوئے انہیں کچن کا آدھا حصہ نظر آتا تھا۔

''پھپھو!'' وہ ان کے پیچھے ہی چلی آئی۔

''ارے! تم کیوں آ گئیں؟ ان کو کمپنی دو نا۔'' وہ فریزر سے کچھ جمے ہوئے پیکٹ نکال رہی تھیں۔

''وہ ایک دوسرے کو کافی ہیں۔ آپ سنائیں! انکل اوپر ہیں؟ میں نے سوچا ان سے مل لوں۔ جب بھی آتی ہوں، عموماً ان کے سونے کا وقت ہوتا ہے۔ ملاقات ہی نہیں ہو پاتی۔'' وہ یہ تو نہیں کہہ پائی کہ جب بھی وہ آتی تھی، پھپھو ان کو دوا دے کر سلا دیتی تھیں تاکہ کوئی بدمزگی نہ ہو۔

''ہاں! شاید جاگے ہوئے ہوں۔ تم اوپر دیکھ لو۔''

''اچھا۔ اور...... جہان کے ریسٹورنٹ کا کیا بنا؟ کچھ لوگوں نے نقصان کر دیا تھا شاید۔'' ذرا سرسری انداز میں پوچھا۔

''ہاں! اچھا خاصا نقصان ہو گیا ہے اس کا۔ کافی چڑچڑا رہنے لگا ہے اس دن سے...... بس دعا کرنا۔'' وہ پُرملال لہجے میں کہتے ہوئے کیبنٹ سے کچھ نکال رہی تھیں۔

وہ واپس آئی تو ڈی جے اور ہالے پھپھو کے گھر کی آرائش پہ تبصرہ کر رہی تھیں، جبکہ انجم باجی بہت غور سے ٹی وی پہ کارٹون نیٹ ورک دیکھ رہی تھیں۔ جس کے کارٹون ترک میں ڈب کیے گئے تھے۔ سبانجی میں جو واحد شے دیکھنے کا موقع نہیں ملتا تھا، وہ ٹی وی تھا۔

ان کو مصروف پا کر وہ زینہ چڑھنے لگی۔ کندھے سے لٹکتے شلوار کے سبز دوپٹے کا کنارہ زینوں پہ پھسلتا اس کے پیچھے اوپر آ رہا تھا۔

سکندر انکل کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ہولے سے انگلی کی پشت سے دستک دی، پھر ڈور ناب گھما کر دروازہ دھکیلا۔

کمرے میں نیم تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ باہر دھوپ تھی، مگر بھاری پردوں نے اس کا راستہ روک رکھا تھا۔ سکندر انکل بستر پہ لیٹے تھے، گردن تک کمبل ڈالا تھا، اور آنکھیں بند تھیں۔

''انکل؟'' اس نے ہولے سے پکارا۔ وہ ہنوز بے حس و حرکت پڑے رہے۔ وہ چند لمحے تاسف سے ان کا پژمردہ، بیمار وجود دیکھتی رہی، پھر ہولے سے دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔

وہ سیڑھیوں کے وسط میں تھی، جب بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ وہیں ریلنگ پہ ہاتھ رکھے، رک کر دیکھنے لگی۔ صوفوں پہ آرام سے بیٹھی لڑکیاں بھی تیر کی طرح سیدھی ہوئی تھیں۔

دروازہ کھول کر جہان اندر داخل ہو رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں بریف کیس، دوسرے بازو پہ کوٹ ڈالے، ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے، ہلکی گرے شرٹ کی آستین کہنیوں تک موڑے وہ بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ پہلے سے کمزور، اور مرجھائی ہوئی رنگت۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹا تو ایک دم ٹھٹک کر رکا۔

''السلام علیکم'' وہ جو سیڑھیوں کے وسط میں کھڑی تھی، سلام کر کے زینے اترنے لگی۔ جہان نے چونک کر سر اٹھایا، پھر اسے دیکھ کر سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔

''پھپھو سے ملوانا تھا اپنی فرینڈز کو۔''

''نائس ٹو میٹ یو۔'' بغیر کسی مسکراہٹ کے اس نے کھڑے کھڑے مروتاً کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر ان ہی سنجیدہ تاثرات کے ساتھ کچن کی طرف بڑھ گیا۔

''یہ؟'' انجم باجی نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''پھپھو کا بیٹا جہان۔'' وہ قدرے خفت سے تعارف کرواتے ہوئے آخری زینہ اتر کر صوفے پہ آ بیٹھی۔

وہاں سے کچن کا آدھا منظر دکھائی دیتا تھا۔ جہان کا کوٹ راہداری میں لگے اسٹینڈ پہ ٹنگا تھا، اور بریف کیس کاؤنٹر پہ۔ وہ خود بھی کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑا پانی کی بوتل منہ سے لگائے گھونٹ بھر رہا تھا۔ ساتھ ہی پھپھو کیبنٹ سے کچھ نکالتی دکھائی دے رہی تھیں۔ گھر چھوٹا تھا اور راہداری مختصر، سو کچن میں گفتگو کرتے افراد کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔

''نے ضمن جلدی؟'' وہ بوتل رکھ کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

''حمن سمدی۔''

جواباً وہ ذرا اکھڑے انداز میں درشتی سے ترک میں کچھ بولا تو ڈی جے سے کچھ کہتی ہالے نے چونک کر کچن کی طرف دیکھا۔

''جہان!'' پھپھو نے تنبیہی نگاہوں سے اسے گھورا۔ اس نے جواب میں خاصی تلخی سے کچھ کہتے ہوئے بوتل میز پہ رکھی۔

ہالے نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔ حیا اس کے چہرے کے الجھے تاثرات بغور دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہالے ذرا سوچ کر بولی۔

''حیا! استقلال اسٹریٹ میں آج Levi's پہ سیل لگی ہے، وہ چیک نہ کر لیں؟''

اٹھنے کا ایک بہانہ۔ حیا گہری سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔ ڈی جے اور انجم باجی بھی کچھ کچھ سمجھ پا رہی تھیں۔

''ہاں! چلو میں ذرا پھپھو کو بتا دوں۔'' وہ کچن کی طرف آ گئی۔ باقی لڑکیاں صوفوں سے اپنے اپنے بیگ اٹھانے لگیں۔

''اچھا پھپھو! ہم لوگ چلتے ہیں۔ ہمیں آگے شاپنگ پہ جانا ہے۔'' کچن کی چوکھٹ میں کھڑے ہو کر اس نے جہان سکندر کو قطعاً

نظر انداز کرتے ہوئے بتایا۔ وہ فریج کا دروازہ کھولے کھڑا کچھ نکال رہا تھا۔

"ارے! ابھی تو آئی تھیں۔ ابھی سے جا رہی ہو؟" پھپھو ایک ملامت زدہ نگاہ جہان پہ ڈال کر تیزی سے اس کی طرف آئیں۔ وہ بے نیازی سے کھڑا پانی پیتا رہا۔ پھر وہ اصرار کرتی رہیں، مگر وہ نہیں رکی۔ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہ بظاہر بہت خوش دلی سے ان کو خدا حافظ کر کے باہر نکلی۔

ڈور میٹ پہ رکھے اپنے جوتوں میں پاؤں ڈالنے تک اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ سپاٹ سی سختی لے لی تھی۔ وہ ان چاروں کے آگے خاموشی سے سڑک کے کنارے چلنے لگی۔ جب وہ کالونی کا موڑ مڑ کر دوسری گلی میں داخل ہوئیں تو وہ تیزی سے ہالے کی جانب گھومی۔

"ہالے.....! جہان نے پھپھو سے کیا کہا تھا؟"

"جانے دو حیا!" ہالے نے نگاہیں چرائیں۔ اسکارف میں لپٹا اس کا چہرہ قدرے پھیکا سا تھا۔

"ہالے! مجھے بتاؤ، اس نے کیا کہا تھا۔"

"حیا! وہ کسی اور بات پہ اپ سیٹ ہو گا۔ تم چھوڑ دو اس قصے کو۔"

"ہالے نور چولغ لو! میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" اس نے کندھوں سے پکڑ کر ہالے کو جھنجھوڑتے ہوئے اس کا پورا نام لیا۔ (چولغ لو یعنی کہ اس گاؤں کی ہالے نور)

"اچھا! ٹھیک ہے پھر سنو۔ اس نے پہلے پوچھا کہ یہ کب آئی ہیں، پھر کہا کہ ان کے لیے اتنا پھیلاؤ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر اس نے کہا کہ میں سارا دن کتوں کی طرح اس لیے نہیں کماتا کہ آپ یوں ضائع کر دیں۔"

اس کے کندھوں پہ رکھے حیا کے ہاتھ نیچے جا گرے۔ بہت آہستہ سے وہ پلٹ گئی۔

"حیا..... چھوڑ دو!" انجم باجی نے پیچھے سے کندھا تھپتھپا کر اسے تسلی دی۔

"چھوڑ ہی تو دیا ہے۔ آج کے بعد میں کبھی پھپھو کے گھر قدم نہیں رکھوں گی۔ میں اتنی ارزاں تو نہیں ہوں کہ میرے مغرور رشتہ دار میری یوں توہین کریں۔"

وہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سیدھ میں دیکھتے ہوئے ان کے آگے چلتی جا رہی تھی۔ آج اس کا دل بہت بری طرح دکھا تھا۔ اس نے واقعی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ دوبارہ پھپھو کے گھر نہیں جائے گی۔

☆ ☆ ☆

رات سبانجی کے گرد و نواح پہ اپنے پر پھیلائے ہوئے تھی۔ سبزہ زاروں پر جمی برف اب پانی بن کر جھیل میں بہتی تھی۔ بہار کی تازہ ہوا ہر سو پھول کھلا رہی تھی۔ ڈورم بلاکس کی چوکور کھڑکیاں باہر سے روشن دکھائی دیتی تھیں۔ رات بیت چکی تھی، مگر ہاسٹل جاگ رہا تھا۔ اسپرنگ بریک شروع ہونے میں چند دن ہی تھے، اور چھٹیوں سے پہلے یہ ان کی ڈورم میں آخری راتیں تھیں۔ پھر باری باری سب کو اپنے اپنے ٹور پہ نکل جانا تھا۔

خدیجہ، حیا، ٹالی اور چیری کے ڈورم میں رونق اپنے عروج پہ تھی۔ حیا کی کرسی پہ سوئٹزرلینڈز کی سارہ ایکسٹینشن کا ریسور کان سے لگائے بیٹھی تھی۔ مسکراہٹ دبائے، انگلی پہ سنہری بالوں کی لٹ لپیٹتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔

"میرا فیورٹ کلر تو بلیو ہے۔ اوہ! تمہارا بھی یہی ہے مومن؟" وہ کہنے کے ساتھ بمشکل ہنسی روکے ہوئے تھی۔ مومن کافی دنوں سے اس کی توجہ لینے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ اس کو دکھانے کے لیے ہالینڈ کے لطیف کے ساتھ نظر آتی تھی۔ لطیف خالص ڈچ اور کیتھولک تھا، مگر افغانستان میں پیدا ہونے کے سبب اس کے ماں باپ نے اس کا نام اپنے کسی افغان دوست لطیف کے نام پہ رکھا تھا۔ یوں وہ تمام فلسطینیوں کا بہت اچھا دوست بن چکا تھا، سوائے مومن کے۔

سامنے ڈی جے کی کرسی پہ ہالے بیٹھی تھی اور اس کے مقابل کاؤچ پہ اسپین کی سینڈرا تھی۔ وہ دونوں اپنے درمیان ایک میگزین

کھولے تبصرہ کر رہی تھیں۔

"اس تھیم کے ساتھ یہ کنٹراسٹ کچھ اوور لگے گا..... نہیں؟" ہالے متذبذب سی سینڈرا سے پوچھ رہی تھی۔

چیری اپنے بینک کی سیڑھی کے ساتھ کھڑی اپنے Kipoa آئل کی آدھی شیشی ان کو دکھاتے ہوئے بار بار نفی میں سر ہلاتے ہوئے "آئی ڈونٹ بلیو دس!" کہے جا رہی تھی۔ کسی لڑکی نے کچن میں رکھا اس کا تیل استعمال کر کے اوپر چٹ لگا کر معذرت کر لی تھی کہ "چونکہ میں جلدی میں ہوں، سو پوچھ نہیں سکی۔" اور چیری کو جب سے ان چند بوندوں کا غم کھائے جا رہا تھا۔

"ان چینیوں کے دل بھی اپنے قد کی طرح ہوتے ہیں۔ چھوٹے اور پست۔"

ٹالی جو اوپر اپنے بینک پہ بیٹھی حیا کو اسرائیلی نامہ سنا رہی تھی، لمحہ بھر کو بات روک کر چیری کو دیکھتے ہوئے بولی۔ پھر سر جھٹک کر بات کا وہیں سے آغاز کیا جہاں چھوڑی تھی۔

"You know, in Israel, we have such citrus that...

ٹالی کے نزدیک دنیا کا سب سے رسیلا پھل اسرائیل کا تھا، سب سے میٹھا پانی، سب سے خالص شہد، سب سے خوشبودار پھل، اور سب سے سہانا موسم اسرائیل کا تھا۔ وہ کہتی تھی "اسرائیل جنت ہے، مقدس اور بابرکت سرزمین ہے۔" اور اس کے جاتے ہی حیا اور ڈی جے اس کے فقرے میں یوں ترمیم کر لیتیں کہ "فلسطین جنت ہے۔ مقدس اور بابرکت سرزمین ہے۔"

اب بھی حیا بہت انہماک سے دونوں ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے اس کی باتیں سن رہی تھیں۔ جو بھی تھا اسرائیل نامہ سننے میں مزا بہت آتا تھا۔

دھیمی آواز میں بات کرنے کے باوجود ان سب کی آوازوں نے مل کر شور کر رکھا تھا اور اس سارے شور میں ڈی جے اپنے بینک کے اوپر بستر میں لیٹی تکیہ منہ پہ رکھے ہوئے تھی۔

ان کی آوازیں بلند ہوتی گئیں تو اس نے منہ سے تکیہ ہٹایا اور چہرہ اوپر کر کے بے زاری سے ان کو مخاطب کیا۔

"پلیز! شور مت کرو۔ میرے سر میں درد ہے۔ مجھے سونے دو۔"

"اوکے اوکے۔" ہالے نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ سب نے "شش شش" کر کے ایک دوسرے کو چپ کروایا اور دھیمی دھیمی بڑبڑاہٹوں میں بولنے لگیں۔

ڈی جے واپس لیٹ گئی اور تکیہ منہ پہ رکھ لیا۔

"ہاں چاند..... میں چاند کو ہی دیکھ رہی تھی۔" سارہ جو اپنی لٹ کو انگلی پہ مروڑتے، مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی، دوسری طرف کچھ سن کر ذرا گڑبڑائی۔ "اچھا! آج چاند نہیں نکلا؟ اوہ..... میں نے شاید پھر اپنے تصور میں دیکھا تھا۔"

"مجھے یہی کلر اسکیم چاہیے اور اگر اس کے ساتھ ہم یہ پھول کر لیں تو وہ میچ کر جائیں گے، پھر یہ رنگ۔"

سینڈرا میگزین کے صفحے کو پلٹ کر پیچھے سے کوئی دوسرا صفحہ نکال کر ہالے کو دکھانے لگی۔ آہستہ آہستہ ان کی آوازیں پھر سے بلند ہونے لگیں۔

چند ثانیے بعد ڈورم میں پھر سے شور مچا تھا۔

"کین سم ون پلیز شٹ اپ؟" ڈی جے ضبط کھو کر اٹھی اور زور سے چلائی۔ وہ پچھلے دو گھنٹوں میں کئی دفعہ ان کو خاموش ہونے کو کہہ چکی تھی، مگر بار بار لڑکیوں کی آوازیں بلند ہو جاتی تھیں۔ لیکن اس کے یوں چلانے پر ایک دم سے ڈورم میں آوازیں فوراً بند ہو گئیں۔

"بس! تم آرام کرو۔ ہم چپ ہیں۔ اب سب آہستہ بولو، اچھا!" حیا نے جلدی سے مسکرا کر اسے تسلی دی۔ وہ کچھ بڑبڑاتے ہوئے واپس لیٹ گئی اور کمرے میں سب مدھم سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔

چند پل مزید سرکے، پھر.....

"اسرائیل میں ہمارا مقدس درخت....." سب سے پہلے ٹالی کی آواز بلند ہوئی تھی، پھر سارہ، پھر ہالے اور پھر چیری جو ابھی تک

سب کو متوجہ کرنے کی سعی کرتے ہوئے انہیں بوتل دکھا رہی تھی۔

''مطلب، یہ کہاں کی اخلاقیات ہیں کہ کسی کا تیل اس سے پوچھے بغیر استعمال کر لیا جائے۔'' شور واپس لوٹ رہا تھا۔

ڈی جے ایک دم اٹھی، کمبل اتار کر پھینکا، بینک کی سیڑھیاں پھلانگ کر اتری۔ اپنی میز پہ رکھا سوئیٹر گردن میں ڈالا، ساتھ رکھی تین کتابیں اٹھائیں، تہہ کردہ عینک کھول کر آنکھوں پہ لگائی اور خاموشی سے کسی کی طرف بھی دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔

اس نے اپنے پیچھے دھڑام سے دروازہ بند کیا تھا۔

ڈورم میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

سارہ نے بنا کچھ کہے ریسور کریڈل پہ رکھ دیا۔ چیری نے خفت سے اپنی بوتل واپس بیگ میں رکھی۔ ہالے اور سینڈرا نے میگزین بند کر دیا۔ بہت سی نادم نگاہوں کے تبادلے ہوئے۔

''وہ ناراض ہو گئی ہے، اب کیا کریں؟'' ہالے بہت آہستہ سے بولی۔

''ٹھہرو! میں اسے مناتی ہوں۔'' حیا نے کمبل پرے ہٹایا اور بینک کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی۔ میز پہ رکھا اپنا دوپٹا اٹھایا اور چپل پہنتے ہوئے باہر نکل گئی۔ پیچھے کمرے میں ابھی تک سناٹا چھایا تھا۔

اسٹڈی ساتھ ہی تھی۔ اسے پتا تھا، ڈی جے وہیں ہو گی۔ اس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ سامنے رائٹنگ ٹیبل پہ کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ چوکھٹ سے اس کا نیم رخ ہی نظر آتا تھا، پھر بھی وہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ رو رہی ہے۔

اس کا دل ایک دم بہت زیادہ دکھا۔ وہ دبے قدموں چلتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

''ڈی جے!''

خدیجہ بائیں کنپٹی کو انگلی سے مسلتے، چہرہ کتاب پہ جھکائے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ڈی جی! وی آر رئیلی سوری۔'' وہ کرسی کھینچ کر اس کے ساتھ بیٹھی اور اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ ڈی جے نے سختی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اسے بے حد ملال ہوا۔

''سوری یار! ہم نے تمہارا خیال نہیں کیا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

وہ جواب دیے بنا یونہی کنپٹی کو انگلی سے مسلتی کتاب پہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''سر میں درد ہے؟'' اس نے ہولے سے پوچھا۔ ڈی جے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹیبلٹ لی ہے کوئی؟''

''ہاں!'' وہ ہتھیلی کی پشت سے گیلے رخسار رگڑتے ہوئے بولی تو آواز بھاری تھی۔

''صرف یہ ہی بات ہے؟ اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''مجھے گھر یاد آ رہا ہے۔''

''تو روکیوں رہی ہو؟ سمسٹر ختم ہونے کے بعد ہم نے گھر تو چلے جانا ہے نا۔''

''سمسٹر ختم ہونے میں بہت دیر ہے۔'' اس نے چہرہ اٹھا کر بے چارگی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

''دیر کہاں؟ فروری میں ہم ادھر آئے تھے، مارچ گزر گیا، اپریل گزر رہا ہے، مئی آنے والا ہے، جون میں ایگزامز ہوں گے اور جولائی میں ہم پاکستان ہوں گے۔ پانچ ماہ تو ختم بھی ہو گئے۔'' ڈی جے بھیگی آنکھوں سے مسکرا دی۔

''کیا زندگی اتنی جلدی گزر جاتی ہے؟''

''اس سے بھی جلدی گزر جاتی ہے۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور ہمارا وقت ختم ہو جاتا ہے..... اختتام..... دی اینڈ..... خلاص!'' اس نے ہاتھ جھاڑ کر جیسے بات ختم کی۔

ڈی جے چند لمحے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”حیا! میں نے کل اپنی امی کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ بہت بری طرح رو رہی تھیں۔ اتنی بری طرح کہ میرا دل ڈر رہا ہے۔ پتا نہیں، گھر میں سب ٹھیک بھی ہیں یا نہیں۔ میں گھر کا آخری بچہ ہوں اور آخری بچوں کے حصے میں ہمیشہ بوڑھے ماں باپ آتے ہیں۔ میرا دل ان کے لیے دکھتا ہے حیا!“

”میں سمجھ سکتی ہوں، مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تین ماہ تو ہم نے یہاں گزارنے ہیں نا۔“

”ہم پاکستان چلے جائیں؟“

”تم جانتی ہو یہ ناممکن ہے۔ ہم نے کانٹریکٹ سائن کیا ہے۔ ہم پانچ ماہ ختم ہونے تک ترکی نہیں چھوڑ سکتے۔“

”میں مستقل جانے کی بات نہیں کر رہی۔ بس چند دن کے لیے۔ اسپرنگ بریک میں ہم اسلام آباد چلے جائیں۔“

حیا نے گہری سانس لی۔

”میری بھی کزن کی شادی ہے، مگر میں اسے قربان کر رہی ہوں۔ صرف اس لیے کہ اگر ہم ابھی پاکستان گئے تو واپس آتے ہوئے ہمارا دل خراب ہوگا اور پھر یوں ترکی میں اکیلے گھومنے پھرنے کا موقع ہمیں کبھی نہیں ملے گا۔“

”اکیلے!“ ڈی جے نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ ”تمہیں پتا ہے، ہم دونوں نے یہ اسکالرشپ پروگرام کیوں اپلائی کیا تھا؟ کیونکہ ہم دونوں کو اکیلے آزادی سے وقت گزارنے کا شوق تھا۔ ایسی آزادی جس میں ابو اور بھائیوں کی روک ٹوک نہ ہو۔ مگر انسان آزاد تب ہی ہوتا ہے جب وہ تنہا ہوتا ہے اور یہ وہی تنہائی قید کر لیتی ہے۔ ہر آزادی میں قید چھپی ہوتی ہے، جیسے اب ہم ترکی میں قید ہیں اور مجھے لگتا ہے ہم کبھی پاکستان واپس نہیں جاسکیں گے۔“

حیا نے جیسے تاسف سے نفی میں گردن ہلائی، پھر نگاہ میز پہ رکھی ڈی جے کی موٹی سی فلسفے کی کتاب پہ پڑی جس کے سرورق پہ سقراط کی تصویر بنی تھی۔ اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

”پرے ہٹاؤ ان بوڑھے انکل کو۔ انہی کو پڑھ پڑھ کر تمہارا دماغ خراب ہوا ہے۔“

”سقراط کو کچھ مت کہو۔“ ڈی جے نے تڑپ کر کتاب پیچھے کی۔ ”افلاطون گواہ ہے کہ سقراط نے کس عظمت و بہادری سے زہر کا پیالا پیا تھا۔“

”میری تو سات نسلوں پہ احسان کیا تھا۔“ وہ تنک کر کہتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ ”اور ہم کوئی پاکستان نہیں جا رہے۔ سات دن اور ترکی کے سات شہر۔ یہ پروگرام ہے ہمارا، ڈن؟“

”ڈن!“ ڈی جے مسکرا دی۔

”اور سنو! آج ٹائم چینج ہو گیا ہے۔ گھڑی ایک گھنٹہ آگے کر لو۔“

وہ ڈی جے کو نارمل ہوتا دیکھ کر ٹالی کا اسرائیل نامہ سننے واپس چلی گئی۔

”اوہ! نہیں، یہاں بھی وہی مشرف والا نیا ٹائم، پرانا ٹائم!“ ڈی جے نے جھنجھلاتے ہوئے کتاب کھول لی۔ اسے نئے ٹائم، پرانے ٹائم سے زیادہ کوفت کسی شے سے نہیں ہوتی تھی۔

☆ ☆ ☆

تاقسیم اسکوائر کا مجسمہ آزادی بہار کے پھولوں کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا اور مجسمے کے گرد دائرے میں اگی گھاس پہ سرخ، زرد اور سفید ٹیولپس کھلے تھے۔ فضا میں تازہ کیے پھلوں کی رسیلی مہک تھی۔

وہ دونوں اس ٹھنڈی، میٹھی ہوا میں ساتھ ساتھ چلتی، استقلال اسٹریٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ دونوں نے سیاہ کوٹ پہن رکھے تھے اور بازو میں بازو ڈال رکھا تھا۔ وہ اتنی دفعہ استقلال اسٹریٹ آچکی تھیں کہ بہت سی دکانیں تو انہیں حفظ ہو چکی تھیں۔ اس کے باوجود وہ آج تک اس طویل ترین گلی کے اختتام تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔

ان کے تمام دوست اور ڈورم فیلوز کل ہی اپنے ٹورز پہ نکل چکے تھے۔ انہوں نے آج سارا دن استقلال اسٹریٹ میں شاپنگ کر کے کل صبح بس سے Cappadocia جانا تھا۔ آج وہ خوب بھاؤ تاؤ کر کے شاپنگ کرنے کا پروگرام بنا کر آئی تھیں، کیونکہ ویسے بھی پاکستانی سیاحوں کے لیے ترک فوراً نرخ کم کر دیتے تھے۔

''سات دن...... سات شہر! کتنا مزا آئے گا نا!'' ڈی جے نے چشم تصور سے خوب صورت ترکی کو دیکھتے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

''مزا تو چھوٹا لفظ ہے ڈی جے! مجھے تو خود پہ رشک آنے لگا ہے۔ کیا زندگی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔؟''

وہ دونوں استقلال اسٹریٹ میں داخل ہو گئی تھیں۔ وہاں ہمیشہ کی طرح رش تھا۔ دونوں اطراف میں بنے ریسٹورنٹس اور دکانوں کی رونق عروج پہ تھی۔

''ترکی کا نقشہ ہمارے پاس ہے۔ ہم روز ایک شہر جائیں گے۔ ایک رات ادھر قیام کریں گے اور پھر وہاں سے قریبی شہر کی بس پکڑ کر آگے چلے جائیں گے۔ یوں سات دنوں میں ہمارے سات شہر ہو جائیں گے۔''

''اور کپادوکیہ میں ہاٹ ایر بیلون کی فلائٹ بھی لیں گے۔ کتنا مزا آئے گا حیا! جب ہم بیلون کی ٹوکری میں بیٹھے اوپر فضا میں تیر رہے ہوں گے اور پورا ترکی ہمارے قدموں تلے ہوگا۔''

وہ دونوں بہت جوش و جذبے سے منصوبے بناتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک طرف برگر کنگ کا بورڈ جگمگا رہا تھا۔ ڈی جے نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

''سنو حیا...... جہان کو بھی ساتھ چلنے کو کہیں؟''

''اس کا تو نام بھی مت لو۔'' وہ سیدھ میں دیکھتے ہوئے آگے چلتی گئی۔ ابھی وہ اس کے ریسٹورنٹ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

''یار...... معاف کر دو نا، وہ کسی اور بات پہ اپ سیٹ ہوگا۔''

''مگر میں اسی بات پہ اپ سیٹ ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے ملنے کی۔'' وہ اسے بازو سے ذرا کھینچ کر آگے لے گئی۔

''میرا میگرین سارا ٹرپ خراب کرائے گا۔ ٹیبلٹ لی تھی، مگر کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔'' ڈی جے کو پھر سے سر میں درد ہونے لگا۔

''اور میرا ٹرپ میرا غیر رجسٹرڈ فون خراب کرائے گا۔'' اس نے کوٹ کی جیب سے ہالے کا بھدا ترک فون نکال کر مایوسی سے اسے دیکھا۔ ''اس کی بیٹری جلد ختم ہو جاتی ہے، وہاں دوسرے شہروں میں پتا نہیں کیا حالات ہوں۔ میں اپنے پاکستانی فون کو رجسٹر کروا ہی لیتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے! مگر پہلے جوتے دیکھ لیں۔'' وہ دونوں ایک شو اسٹور کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ دروازہ ذرا بھاری تھا، مشکل سے کھلا۔ حیا اچنبھے سے دروازے کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ عجیب بات تھی کہ جس اگلی دکان پہ وہ گئیں اس کا دروازہ بھی زور لگا کر دھکیلنے پہ پیچھے ہوا۔

آج استقلال جدیسی کے دروازوں کو کیا ہوا ہے؟ ڈی جے بھی محسوس کر کے ذرا حیرت سے بولی۔

Avea کی دکان استقلال اسٹریٹ میں ذرا آگے جا کر تھی۔ وہ دونوں اکٹھی چوکھٹ تک آئیں اور لاشعوری طور پر ایک دم بہت زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ وہ گلاس ڈور بے حد باریک اور نازک شیشے کا بنا تھا۔ وہ گویا اڑتا ہوا جا کر مخالف سمت میں کھڑے اسٹینڈ سے ٹکرایا اور زوردار چھناکے کی آواز آئی۔ لوہے کے اسٹینڈ کا کوئی ہک نکلا ہوا تھا، اس کی ضرب زور سے لگی اور دروازے کے اوپری حصے سے شیشے کے ٹکڑے چھن چھن کرتے فرش پہ آ گرے۔

وہ دونوں ایک دم ساکت سی، آدھے ٹوٹے دروازے کو دیکھ رہی تھیں۔

کاؤنٹر کے نچلے دراز سے کچھ نکالتے سیلز مین نے چونک کر سر اونچا کیا۔ ٹوٹے دروازے کو دیکھ کر اس کا منہ پورا کھل گیا۔ وہ ہکا بکا سا اٹھ کھڑا ہوا۔

''کا پٹے کر دی؟'' اس نے انگلی سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

ڈی جے کا سکتہ پہلے ٹوٹا۔ وہ حیا کے قریب کھسکی اور ہولے سے سرگوشی کی۔

''حیا! اس نے ہمیں دروازہ توڑتے نہیں دیکھا۔''

''بس! ٹھیک ہے، ہم مکر جاتے ہیں۔''

وہ گلا کھنکھارتے، خود کو نارمل کرتے ہوئے آگے بڑھی اور اپنا پاکستانی فون اس کی طرف بڑھایا۔ ''فون رجسٹر کروانا ہے۔''

''کاپے کردی مادم؟'' وہ فون کو دیکھے بنا ابھی تک دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

''مجھے فون رجسٹر کروانا ہے۔''

''کاپے کردی؟''

''ڈی جے! یہ کیا بک رہا ہے؟'' وہ کوفت سے ڈی جے کی طرف پلٹی۔

''اسے غالباً انگلش نہیں آتی اور یہ دروازے کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔''

''دیکھو بھائی!'' وہ آگے آئی اور کاؤنٹر پہ کہنی رکھے بڑے اعتماد سے بولی۔ ''ہم نے کوئی دروازہ نہیں توڑا اور ہم نے تو تمہارا دروازہ دیکھا ہی نہیں تھا۔''

''بالکل! ہم نے تو کبھی زندگی میں دروازے نہیں دیکھے۔ ہمارے ہاں گھروں میں دروازے ہوتے ہی نہیں ہیں۔ لوگ کھڑکیوں سے اندر پھلانگتے ہیں۔''

مگر ان کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ اب صدمے اور دکھ سے سینے پہ ہاتھ مارتے، دروازے کو دیکھتے ہوئے ''اللہ اللہ'' کہنے لگا۔ ترک شدید غم میں یہی کرتے تھے۔

''اچھا! میرا فون رجسٹر کردو۔''

لڑکا چند لمحے غمگین و کینہ پرور نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا، پھر ہاتھ آگے بڑھایا۔

''پسپورت؟'' (پاسپورٹ؟)

ان دونوں نے ایک دوسرے کو ذرا تشویش سے دیکھا۔

''یہ پاسپورٹ صرف فون کے لیے مانگ رہا ہے؟''

''نہیں! یہ ہمیں اندر کروائے گا۔ ڈی جے! اسے پاسپورٹ نہیں دینا ورنہ اس نے اتنا لمبا جرمانہ کروانا ہے کہ ہمارا ٹرپ کینسل ہو جائے گا۔''

''پاسپورٹ نہیں ہے ہمارے پاس!'' ڈی جے نے ہاتھ ہلا کر زور سے کہا۔ وہ حیا سے چند قدم پیچھے تھی۔

''پسپورت؟'' اس نے بازو بڑھائے پھر سے پاسپورٹ مانگا۔

''کہا نا، نہیں ہے ہمارے پاس پاسپورٹ!'' حیا جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔ ''پاسپورٹ کے بغیر رجسٹر نہیں کرسکتے؟ دیکھو! ہم تمہیں کچھ پیسے اوپر دے دیں گے۔''

''ایمبولنس..... ایمبولنس۔'' وہ اپنی دھن میں کہے جارہی تھی جب لڑکا ایک دم گھبرا کر چلا اٹھا۔ اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا، پھر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گردن موڑی۔

''حیا..... حیا!'' پیچھے کھڑی خدیجہ سر دونوں ہاتھوں میں تھامے اوندھی گرتی جارہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور وہ تکلیف کی شدت سے دبے دبے انداز میں چلا رہی تھی۔

لڑکا بھاگ کر کاؤنٹر کے پیچھے سے نکلا۔

''ڈی جے..... ڈی جے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے اس کی طرف لپکی۔

اس کی عینک پھسل کر فرش پہ جاگری۔ تیزی سے اس کی طرف بڑھتے لڑکے کا جوگر اس پہ آیا۔ کڑچ کی آواز آئی اور ایک شیشہ دو

حصوں میں بٹ گیا۔

''ڈی جے......ڈی جے......!'' وہ اس پہ جھکی دیوانہ وار اسے پکار رہی تھی۔ ڈی جے کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ ساری دنیا اندھیرے میں ڈوب رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہسپتال کا وہ کاریڈور سرد اور ویران تھا۔ سنگ مرمر کا فرش کسی مردے کی طرح تھا۔ سفید، بے جان، ٹھنڈا۔ وہ بنچ پہ بالکل سیدھی بیٹھی تھی۔ ساکت، جامد، سیدھ میں کسی غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں مرکوز کیے اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ جب سے ڈی جے آپریشن تھیٹر میں تھی، وہ یوں ہی ادھر بیٹھی تھی۔ آن ڈیوٹی ڈاکٹر نے کچھ بتایا تھا کہ خدیجہ کے برین میں Berry annueurysm تھی۔ ایک پھولی ہوئی اینورزم جو پھٹ گئی تھی۔ سب ارکنائڈ ہیمرج۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ بیری اینورزم پھٹنے والے مریضوں میں سے اسی سے نوے فیصد کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کم سے کم بھی دس فیصد کی امید تھی اور وہ اسی دس فیصد امید کو تھامے وہاں بنچ پہ بیٹھی تھی۔

اس کا ذہن بالکل مفلوج ہو چکا تھا، جیسے بھاری سل سے سر کو کچل دیا گیا ہو۔ پھر بھی اس نے کہیں سے ہمت مجتمع کر کے ڈی جے کے گھر والوں کو پاکستان فون کر دیا تھا۔ اس کے باپ بھائیوں کی پریشانی، ماں کے آنسو، وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ اس کے ابو ترکی آنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کا بھائی جو فرانس میں مقیم تھا، وہ بھی رات تک پہنچ جائے گا۔ بس اس کی سمجھ میں یہ ہی بات آئی تھی۔ بار بار کوئی نہ کوئی اسے فون کرتا اور وہ ہر بات کے جواب میں بھیگی آواز سے اتنا ہی کہہ پاتی۔

''مجھے نہیں پتا۔ ڈاکٹر باہر نہیں آئے۔''

اب وہ یوں ہی نڈھال سی بنچ پہ بیٹھی تھی۔ آنسو لڑیوں کی صورت اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

دس فیصد کی امید......

اس نے گود میں رکھے موبائل کو دیکھا، پھر اٹھا کر کپکپاتے ہاتھوں سے پیغام لکھنے لگی۔

''میں تاقسم فرسٹ ایڈ ہاسپٹل میں ہوں۔ ڈی جے کو برین ہیمرج ہوا ہے، تم فوراً آجاؤ۔'' اور جہان کو بھیج دیا۔

ان کے درمیان اگر کوئی تلخی تھی بھی تو اسے یاد نہیں تھی۔ اگر یاد تھی تو صرف اور صرف خدیجہ۔

اذان کا وقت ہوا تو وہ اٹھی اور وضو کر کے واپس ادھر آئی۔ کوٹ اس نے وہیں بینچ پہ چھوڑ دیا تھا اور اب نیلی قمیص کی آستینیں گیلے بازوؤں پہ نیچے کر رہی تھی۔ چہرہ، ہاتھ اور ماتھے سے بال بھی ویسے ہی گیلے تھے۔

''کیا زندگی اتنی جلدی گزر جاتی ہے؟''

''اس سے بھی جلدی گزر جاتی ہے......'' چند روز قبل کی دو لڑکیوں کی گفتگو اسے یاد آئی تھی۔

وہ سلام پھیر کر تشہد کی حالت میں بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ مکمل طور پہ بھیگا ہوا تھا اور یہ وضو کا پانی نہیں تھا۔ وہ دونوں ہتھیلیاں ملائے انہیں ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

''میرے اللہ......'' وہ بے آواز رو رہی تھی۔ ''آپ کو پتا ہے، ڈی جے میری بیسٹ فرینڈ ہے۔ میری سب سے اچھی دوست۔ ارم، زارا، ان سب سے اچھی دوست۔ آپ اسے ہم سے مت چھینیں۔ اس کے ماں باپ......وہ بوڑھے ہیں، وہ مر جائیں گے۔ آپ ہمیں ایسے مت آزمائیں۔ آپ ہمیں ڈی جے واپس کر دیں۔ میری دس فیصد کی امید کو ہارنے مت دیں۔'' وہ ہتھیلیوں پہ چہرہ جھکائے ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ شیفون کا نیلا دوپٹا سر سے پھسل کر گردن کی پشت تک جا گرا تھا۔

''میں بہت اکیلی ہوں۔ میرے پاس ابھی کوئی نہیں ہے سوائے آپ کے۔ میرے پاس بجانے کے لیے کوئی گھنٹی نہیں ہے، کھٹکھٹانے کے لیے کوئی دروازہ نہیں ہے، ہلانے کے لیے کوئی زنجیر نہیں ہے۔ میری پہلی امید بھی آپ ہیں، آخری بھی آپ ہیں۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو کوئی میری مدد نہیں کر سکے گا۔ اگر آپ نے چھین لیا تو کوئی دے نہیں سکے گا اور اگر آپ دے دیں تو کوئی روک نہیں سکے گا۔ آپ ہمیں ڈی جے کی زندگی واپس لوٹا دیں۔ آپ ڈی جے کو ٹھیک کر دیں۔''

اس کے دل پہ گرتا ہر آنسو اندر ہی اندر داغ لگا رہا تھا۔ جلتا، سلگتا ہوا داغ۔ اس کا دل ہر پل زخمی ہوتا جا رہا تھا۔

"اللہ تعالیٰ! میرے پاس کوئی نہیں ہے جس سے میں مانگ سکوں اور آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو مجھے کچھ دے سکے۔ میری ایک دعا مان لیں، میں زندگی بھر کچھ نہیں مانگوں گی۔ کبھی کوئی خواہش نہیں کروں گی۔ آپ ہمیں ڈی جے کی زندگی واپس لوٹا دیں۔ میں ہر وہ کام کروں گی جو آپ کو راضی کرے اور راضی رکھے۔ میں آپ کو کبھی ناراض نہیں کروں گی۔ آپ ڈی جے کو ٹھیک کر دیں پلیز۔"

وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ وہ زندگی میں کبھی اتنی اکیلی نہیں ہوئی تھی، جتنی آج تھی۔ وہ کبھی اتنی بے بس، اتنی لاچار بھی نہیں رہی تھی، جتنی اس وقت تھی۔

کتنے گھنٹے گزرے، کتنی گھڑیاں بیتیں، اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ بس اندھیرا چھا رہا تھا، جب اس نے جہان کو تیز تیز قدموں سے چلتے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ کھڑی بھی نہیں ہوئی، بس بینچ پہ بیٹھی گردن اٹھائے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اب کیسی ہے وہ؟ ہوا کیا تھا؟" وہ پھولی سانسوں کے درمیان کہتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھا۔ وہ انتہائی پریشان تھا، جتنی وہ۔

"بیری اینورزم پھٹ گیا تھا، جس کے نتیجے میں سب ارکنائڈ ہیمرج......" اسے خود جو سمجھ میں آیا تھا، وہ بتانے لگی۔ بتا کر وہ پھر سے دونوں ہاتھوں سے سر دیے رونے لگی۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گی، تم ایسے مت روؤ۔ تم نے کچھ کھایا ہے؟ تم مجھے ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ میں کچھ لاتا ہوں۔" پھر وہ رکا نہیں۔ تیزی سے اٹھ کر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو ہاتھ میں سینڈوچز کا پیکٹ اور جوس کی بوتل تھی۔

"کچھ کھا لو۔" اس نے سینڈوچ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔

"مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ اسی پل آپریشن تھیٹر کے دروازے کھلے۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" اسے وہیں رکنے کا کہہ کر وہ آگے گیا اور باہر آنے والے سرجن سے ترک میں بات کرنے لگا۔ وہ بے قراری سے کھڑی ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھے گئی۔

"اوکے اوکے!" سر ہلا کر بات ختم کر کے وہ واپس اس کی طرف آیا۔

"کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر؟ کیسی ہے ڈی جے؟"

"وہ آرام سے ہے۔ ابھی اسے شفٹ کر دیں گے مگر تم ٹھیک نہیں ہو، ادھر بیٹھو۔" اسے واپس بینچ پہ بٹھا کر اس نے سینڈوچ اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ کھاؤ۔"

"اوہ جہان! وہ ٹھیک ہے۔ میری دعا قبول ہو گئی۔" اس نے نڈھال سے انداز میں سر دیوار سے ٹکا دیا۔

"کچھ کھا لو حیا......!" اس کے اصرار پہ اس نے بمشکل آدھا سینڈوچ کھایا اور تھوڑا سا جوس پیا، پھر بوتل پرے ہٹا دی۔

"جہان! میری دعا رد نہیں ہوئی...... میں نے اتنی دعا کی تھی...... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اتنی دعا کرے اور وہ پوری نہ ہو؟" وہ کھوئے کھوئے انداز میں دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"حیا! تھوڑا سا اور کھا لو، ورنہ تمہاری طبیعت بگڑ جائے گی۔"

"نہیں...... تمہیں پتا ہے، میں نے کبھی اتنے دل سے دعا نہیں مانگی جتنی آج مانگی تھی، پھر یہ کیسے ہوتا کہ وہ پوری نہ ہوتی؟" اس کی آنکھوں سے پھر سے آنسو بہنے لگے۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ اب وہ مزید کچھ نہیں کھائے گی، اسے اندازہ ہو چکا تھا۔

وہ اب سامنے دیوار کو دیکھتے ہوئے بہتے آنسوؤں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے، انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور میں نے آج امید نہیں ہاری تھی جہان۔"

"مگر بعض دفعہ قسمت ہرا دیا کرتی ہے۔"

وہ بہت دھیرے سے بولا تو وہ چونکی۔ جہان اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک دم اس کا دل ڈوب کر ابھرا۔

''جہان؟''

''حیا...... ڈی جے کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔'' کاریڈور کا سناٹا یکدم سے ٹوٹا۔ پیچھے کہیں کسی اسٹریچر کے پہیوں کے چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔

وہ بنا پلک جھپکے جہان کو دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی ٹوٹی عینک پہ اس کی گرفت سخت ہوگئی تھی۔ پسینے میں بھیگی ہتھیلی سے عینک کے شیشے پہ دھند چھاتی جا رہی تھی۔

ٹھنڈی، گیلی دھند۔

☆ ☆ ☆

''میری فرینڈز مجھے ڈی جے کہتی ہیں، لیکن چونکہ آپ میری فرینڈ نہیں ہیں، اس لیے مجھے خدیجہ ہی کہیں۔''

شام کی دھندلی سی چادر نے پورے استنبول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ دوپہر میں خوب بارش ہوئی تھی اور آسمان اتنا کھل کر برسا تھا کہ لگتا تھا ساری دنیا بہہ جائے گی، سب ڈوب جائے گا۔ وہ تب سے اسی طرح پھپھو کے لاؤنج کے صوفے پہ پاؤں اوپر کرکے بیٹھی، گھٹنوں پہ سر رکھے روئے جا رہی تھی۔

''ایویں ہی سامان گم ہو جائے؟ ہم نے ہینڈ کیری میں اتنا بوجھ نہیں اٹھانا۔''

اس کی آنکھوں کے سامنے ڈی جے کا آخری چہرہ جیسے ثبت ہو گیا تھا۔ وہ منظر یوں ہر جگہ چھایا تھا کہ اور کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ بے جان چہرہ جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو، بند آنکھیں، اسٹریچر پہ ڈالا بے حس و حرکت وجود...... وہ اس منظر میں مقید ہوگئی تھی۔

''ایویں برف نہ پڑے، خود تو برف باری دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہیں، ہمیں تو دیکھنے دیں۔''

اسی رات ڈی جے کا بھائی پہنچ گیا تھا اور دو دن تک کلیئرنس مل گئی تھی۔ آج دوپہر وہ اس کی میت لے کر پاکستان روانہ ہوگئے تھے۔ تب اسے جہان اور پھپھو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ وہ اس وقت سے یوں ہی بیٹھی تھی۔ نہ کھاتی تھی، نہ کوئی بات کرتی تھی، بس روئے چلی جا رہی تھی۔ اس کا غم بہت بڑا تھا۔

''سامنے والے کمرے میں بڑے ہینڈسم سے لڑکے رہتے ہیں۔ میں نے انہیں کمرے میں جاتے دیکھا ہے۔''

سارے دن میں اگر اس نے کوئی بات کی بھی تو یہی تھی کہ مجھے پاکستان جانا ہے۔ میری سیٹ بک کروا دیں۔ میں نے ادھر نہیں رہنا۔''

کچن میں جہان اور پھپھو کھڑے یہ ہی بات کر رہے تھے۔ ان کی دبی دبی آوازیں اس تک پہنچ رہی تھیں، مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ اس کی دلچسپی ہر شے سے ختم ہوگئی تھی۔

''مگر میں کیسے جا سکتا ہوں اس کے ساتھ؟''

''اور وہ اکیلی کیسے جا سکتی ہے؟ اسے کل سے بخار ہے۔ حالت دیکھی ہے تم نے اس کی؟ میں اسے اکیلا بھیجوں تو اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گی؟''

''مگر ممی! آپ کو ابا کا پتا ہے نا؟ انہیں علم ہوا تو؟''

''انہیں یہ بتائیں گے کہ تم انقرہ تک گئے ہو۔''

''مگر ممی! میرا جانا ضروری تو......''

''جہان سکندر! جو میں نے کہا وہ تم نے سن لیا؟ تم کل صبح کی فلائیٹ سے حیا کے ساتھ جا رہے ہو۔''

وہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی۔ ارد گرد کیا ہو رہا ہے، اسے نہیں پتا تھا۔ اس کا دل ایسے بری طرح ٹوٹا تھا کہ ہر شے سے دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔

''پاک ٹاورز، ایشیا کا سب سے بڑا شاپنگ مال...... اس نے کون سا جا کر چیک کر لینا ہے، تھوڑا سا شو مارنے میں حرج ہی کیا ہے؟''

جب پھپھو نے آ کر یہ بتایا کہ جہان اس کے ساتھ جائے گا، چاہے جتنے دن بھی لگیں، تو بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسے فی الحال جہان سکندر سے کوئی سروکار نہ تھا۔

''ویسے تمہاری پھپھو کا کوئی ہینڈسم بیٹا ویٹا ہے؟ تمہاری چمک دمک دیکھ کر یہ خیال آیا۔''

ہر چیز جیسے سلوموشن میں ہو رہی تھی۔ آوازیں بند ہو گئی تھیں۔ صرف حرکات دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اتاترک ایرپورٹ پہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چل رہی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی چل رہا تھا مگر وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔

''رہنے دو حیا! مجھے ابھی ورلڈ کپ کا غم نہیں بھولا۔''

جہاز دھیرے دھیرے محو پرواز تھا۔ کھڑکی کے پار مرمرا کے سمندر پہ بادل تیرتے دکھائی دے رہے تھے۔ نرم روئی کے گالوں کی طرح سرمئی بادل۔ ان میں اتنا پانی لدا تھا جتنا اس کی آنکھوں میں تھا، یا شاید اس کے آنسو زیادہ تھے۔

''اتنے ہینڈسم لڑکوں کی بہن بننے پہ کم از کم میں تیار نہیں ہوں، یہ بھائی چارہ تمہیں ہی مبارک ہو۔''

اس نے خود کو ایئرپورٹ پہ ابا کے سینے سے لگتے، بے تحاشا روتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ اس کا سر تھپکتے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے۔ کچھ ایسا کہ بس اب وہ ان کے پاس رہے گی، اب وہ اس کو واپس نہیں بھیجیں گے۔

''چیزیں وقتی ہوتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں، رویے دائمی ہوتے ہیں، صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور تم نے آج ایک ٹوٹے ہوئے جنجر بریڈ ہاؤس سے ہار مان لی؟''

وہ اماں کے ساتھ ڈی جے کے گھر میں تھی۔ وہاں ہر طرف کہرام مچا تھا۔ اس کی امی اور بہنوں کا بلک بلک کر رونا، ماتم، بین، سسکیوں کی آوازیں چیخیں...... جوان موت تھی اور گویا پوری دنیا ادھر اکٹھی ہو گئی تھی، وہ کسی کو دلاسا نہ دے سکی، بس ایک کونے میں بیٹھی بے آواز روتی گئی۔

''اچھا پھر سوچ لو...... وہ اب بھی شادی شدہ ہے؟''

نماز جنازہ پچھلے روز ہی ادا کی جا چکی تھی مگر غم ابھی پرانا نہیں ہوا تھا۔ خدیجہ کی بہنیں اس سے اس کے بارے میں پوچھتی تھیں، مگر وہ کسی کو کچھ بتا نہیں پا رہی تھی۔ ساری باتیں ختم ہو گئی تھیں۔ دنیا برف کا ڈھیر بن گئی تھی۔ مرمرا کے سمندر پہ تیرتی برف کا ڈھیر۔

''کیا زندگی اتنی جلدی گزر جاتی ہے؟''

''اس سے بھی جلدی گزر جاتی ہے۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلتا اور ہمارا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اختتام...... دی اینڈ......!''

✿......✿......✿

باب 5

سرخ صنوبر کے اونچے درختوں کے درمیان ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ وہاں ہر سو گھنا جنگل تھا۔ اونچے درختوں کے پتے سنہری دھوپ کو مٹی تک پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ دوپہر کے وقت بھی ادھر ٹھنڈی، میٹھی سی چھایا تھی۔

بہارے اسی چھایا میں ادھر ادھر بھاگتی ببول کے سفید پھول توڑ توڑ کر ٹوکری میں بھر رہی تھی۔ عائشے گل ایک درخت تلے زمین پہ بیٹھی سامنے پھیلے کپڑے پہ رکھے بہت سے سرخ جنگلی پھولوں کو دھاگے میں پرو رہی تھی۔ قریب ہی ایک کٹا ہوا تنا گرا پڑا تھا۔

جب بہت سے پھول جمع ہو گئے تو وہ عائشے کے پاس آئی۔

''عائشے......'' سفید پھولوں سے بھری ٹوکری اس کپڑے پہ ایک طرف انڈیلتے ہوئے اس نے پکارا۔

''ہوں'' اس نے جواباً کہتے ہوئے ہاتھ سے سفید پھولوں کا ڈھیر نئے پھولوں سے ایک طرف سمیٹ دیا۔

''سفیر تم سے لڑ کیوں رہا تھا؟'' وہ خالی ٹوکری رکھ کر اس کے سامنے آلتی پالتی مار کے یوں بیٹھ گئی کہ اب دونوں کے درمیان پھولوں والا کپڑا بچھا تھا۔

''لڑ نہیں رہا تھا، اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''مگر وہ اونچا اونچا کیوں بول رہا تھا؟'' بہارے دونوں ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے الجھی الجھی سی پوچھ رہی تھی۔ گردن جھکا کر سوئی پھول میں ڈالتی عائشے نے مسکرا کر سر جھٹکا۔

''جب انسان دوسرے کی بات نہیں سمجھنا چاہتا تو وہ یونہی اونچا اونچا بولتا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا، اس کے پیرنٹس نے اس کی شادی اس کی پاکستانی کزن سے طے کر دی ہے اور وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''کیوں نہیں کرنا چاہتا؟''

''اس کی مرضی نہیں ہو گی!'' اس نے سوئی کو پھول کی دوسری طرف سے نکال کر کھینچا۔ دھاگا کھنچتا چلا آیا۔ پھولوں کی لڑی لمبی ہوتی جا رہی تھی۔

''شادی مرضی سے ہوتی ہے نا؟''

''ہاں!'' وہ اب بہارے کے سفید پھولوں کے ہاتھ سے ادھر ادھر ٹٹول رہی تھی۔

''پھر جب میں بڑی ہوں گی تو میں عبدالرحمٰن سے شادی کروں گی۔''

پھولوں کو سمیٹتا اس کا ہاتھ رکا۔ اس نے ایک خفا سی نگاہ بہارے پہ ڈالی۔

''بری بات بہارے گل! اچھی لڑکیاں یوں ہر بات نہیں کر لیتیں۔''

''مگر میں نے عبدالرحمٰن کو کہہ دیا تھا۔''

وہ ایک دم ٹھٹک کر رک گئی اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''کیا کہا تم نے اسے؟''

''یہی کہ جب میں بڑی ہوں گی تو کیا وہ مجھ سے شادی کرے گا؟''

''تو اس نے کیا کہا؟''

''اس نے کہا، تمہیں ایسی باتیں کس نے سکھائی؟''

"پھر؟" وہ سانس روکے سن رہی تھی۔
"میں نے کہا.....عا.....عائشے گل نے!" روانی سے بولتی بہارے یک لخت اٹکی۔
"کیا؟" وہ ششدر رہ گئی۔ "تم نے اس سے جھوٹ بولا؟ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اب تم جھوٹ نہیں بولو گی۔ خدایا! وہ کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں۔" اس نے تاسف سے ماتھے کو چھوا۔ بہارے نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔
"مگر اسے پتا چل گیا تھا۔ اس نے کہا، عائشے گل اچھی لڑکی ہے اور مجھے پتا ہے، اس نے ایسا کچھ نہیں کہا ہوگا۔"
اس کی بات پہ عائشے کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ایک بے اختیار سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ بکھر گئی۔ وہ ہولے سے سر جھٹک کر پھول اٹھانے لگی۔
"مگر تم نے جھوٹ نہیں چھوڑا ناں۔"
"وعدہ، اب نہیں بولوں گی۔"
"ہر دفعہ اللہ سے وعدہ کرتی ہو۔ وہ ہر دفعہ تمہیں ایک اور موقع دے دیتا ہے، مگر تم پھر وعدہ توڑ دیتی ہو۔ اتنی دفعہ وعدہ توڑو گی تو وہ تمہارے وعدوں کا اعتبار کرنا چھوڑ دے گا۔"
"آئندہ میں سچ بولوں گی، اب کی بار مضبوط والا وعدہ۔"
"چلو ٹھیک ہے۔" وہ مسکرادی۔ "اب تم نے ہمیشہ سچ بولنا ہے، کیونکہ جب انسان بہت زیادہ جھوٹ بولتا ہے تو ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسے خود اپنے سچ کا بھی اعتبار نہیں رہتا۔"
Seagulls کا غول پھڑ پھڑاتا ہوا ان کے اوپر سے گزرا۔ عائشے نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ پرندے یقیناً پورے بیوک ادا کا چکر کاٹ کر اب سمندر کی طرف محو پرواز تھے۔
"عائشے گل!" چند لمحے ان پرندوں کے پنکھ کی مانند اڑ کر بادلوں میں گم ہوگئے تو بہارے نے پکارا۔
"بولو۔" وہ گردن جھکائے اپنی لڑی میں اب سرخ پھولوں کے آگے سفید پھول پرو رہی تھی۔
"تم تو ہمیشہ سچ بولتی ہو نا۔ ایک بات بتاؤ گی۔" بہارے ذرا ڈرتے ڈرتے کہہ رہی تھی۔
"پوچھو۔"
"عبداللہ کی بہن کسی کو کہہ رہی تھی کہ بیوک ادا کی پولیس بہت بری ہے۔ وہ عبدالرحمٰن پاشا کو کچھ نہیں کہتی اور یہ کہ وہ جزیرے کا سب سے برا آدمی ہے۔ عائشے! کیا عبدالرحمٰن واقعی برا آدمی ہے؟" وہ رک رک کر تذبذب سے پوچھ رہی تھی۔
عائشے سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔ بہارے خاموش ہوئی تو اس نے ذرا خفگی سے سر جھٹکا۔
"نہیں، وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ عبداللہ کی بہن کو کیا پتا؟ اور تم نے کسی سے جا کر عبدالرحمٰن کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟" بہارے نے گردن اثبات میں ہلا دی۔
"مجھے یاد ہے۔"
عائشے دھاگا دانت سے توڑ کر لڑی کے دونوں سروں کی آپس میں گرہ لگانے لگی۔ اس کے چہرے پہ واضح اداسی بکھری تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ سہ پہر میں خدیجہ کے گھر سے واپس آئی تھی۔ کچھ دیر کمرے میں لیٹی رہی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا، بخار بھی ہو رہا تھا اور نیند تھی کہ آ ہی نہیں رہی تھی۔ بند کمرے میں گھٹن ہونے لگی تو وہ گھبرا کر اٹھی اور کھڑکیوں کے پردے دونوں ہاتھوں سے ہٹائے۔
سامنے لان میں کرسیوں پر ابا اور اماں کے ساتھ تایا فرقان اور صائمہ تائی چائے پیتے نظر آرہے تھے۔ میز پہ اسنیکس اور دیگر لوازمات رکھے تھے اور وہ لوگ باتوں میں مگن تھے۔ صائمہ تائی بہت سلیقے سے سر پہ دوپٹا جمائے فاطمہ کی طرف چہرہ کیے کچھ کہہ رہی تھیں۔ فاطمہ، تایا فرقان کے سامنے سر پہ دوپٹا لے لیتی تھیں جو پیچھے کمر تک ڈھلک جاتا تھا۔ ان کی آنکھیں حیا جیسی تھیں اور لوگ کہتے تھے کہ بیں

سال بعد حیا ایسی ہی ہوگی اور اب وہ سوچتی تھی کہ پتا نہیں بیس سال بعد وہ ہوگی بھی یا نہیں۔

وہ شاور لے کر، سادہ سفید ٹراؤزر پہ ٹخنوں کو چھوتی سفید لمبی قمیص پہنے، ہم رنگ دوپٹہ سر پہ لپیٹے باہر آئی۔ پہلے عصر کی نماز پڑھی کہ نمازیں ان تین دنوں میں وہ قریباً ساری پڑھ رہی تھی۔ خدیجہ کے لیے بہت ڈھیر ساری دعائیں کر کے وہ اٹھی اور پھر دوپٹا شانوں پہ پھیلائے، بالوں کو کھلا چھوڑے کچن کی طرف آ گئی۔

فاطمہ فریج سے کچھ نکال رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھا تو فریج کا دروازہ بند کر کے مسکراتی ہوئی اس کی طرف آئیں۔ شانوں تک آتے بالوں کو کیچر میں باندھے، وہ عام حلیے میں بھی بہت جاذب نظر لگتی تھیں۔

''میرا بیٹا اٹھ گیا؟'' انہوں نے اسے گلے لگایا، پھر ماتھا چوما۔

''جی!'' وہ مسکرانا چاہتی تھی مگر آنکھیں بھیگ گئیں۔

''بس صبر کرو۔ اللہ کی چیز تھی، اللہ نے لے لی۔''

''صبر اتنا آسان ہوتا تو کوئی دوسرے کو کرنے کو نہ کہتا اماں! ہر شخص خود ہی کر لیتا۔ مگر میں کوشش کروں گی۔''

''گڈ! اچھا باہر آ جاؤ، تایا تائی ملنے آئے ہیں۔''

''مجھ سے؟''

''ہاں اور جہان سے بھی۔''

''اوہ ہاں، کدھر ہے وہ؟'' اسے یاد آیا کہ وہ بھی ساتھ آیا تھا۔

''بس کھانا کھا کر سو گیا تھا، ظاہر ہے تھکا ہوا تھا، ابھی میں نے دیکھا تو اٹھ چکا تھا، کہہ رہا تھا بس آ رہا ہوں۔ ویسے سبین کا بیٹا ذرا.....'' وہ کہتے ہوئے جھجکیں۔ ''ذرا پراؤڈ سا ہے، نہیں؟''

''نہیں، وہ شروع میں یونہی ریزرو سا رہتا ہے۔''

''اور بعد میں؟''

حیا نے گہری سانس لی۔

''بعد میں بھی ایسا رہتا ہے۔ اس شروع اور بعد کے درمیان کبھی کبھی نارمل ہو جاتا ہے۔''

وہ باہر آئی تو اسے دیکھ کر تایا فرقان مسکرائے۔ وہ جھک کر ان دونوں سے ملی۔

''اتنے عرصے بعد ملا ہوں اپنی بیٹی سے اور وہ بھی ایسے موقع پر۔ تمہاری دوست کا سن کر بہت افسوس ہوا، اللہ اس کی مغفرت کرے۔''

''آمین!'' وہ سر کے اثبات کے ساتھ تعزیت وصول کرتی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔

''ہوا کیا تھا اسے؟'' صائمہ تائی نے از راہِ ہمدردی پوچھا۔

''برین ہیمبرج۔''

چند لمحے کے لیے ملال زدہ خاموشی چھا گئی، جسے برآمدے کا دروازہ کھلنے کی آواز نے چیرا۔ وہاں سے فاطمہ باہر آئی تھیں اور ان کے عقب میں جہان بھی تھا۔

اس نے سیاہ ٹراؤزر جس کے دونوں پہلوؤں پہ لمبی سفید دھاری تھی، کے اوپر آدھے بازوؤں والی سرمئی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھیں خمار آلود تھیں، جیسے ابھی سو کر اٹھا ہو۔ چہرہ اور سامنے کے بال گیلے تھے وہ شاید پانی کے چھینٹے مار کر تولیے سے خشک کیے بغیر ہی باہر آ گیا تھا۔

اسے آتے دیکھ کر سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ لان کے دہانے پہ پہنچا تو لمحے بھر کے لیے ذرا تذبذب سے گھاس کو دیکھا، پھر ایک نگاہ سامنے بیٹھے افراد کے قدموں پر ڈالی جو جوتوں میں مقید تھے، پھر ذرا جھجک کر گھاس پہ چلتا ہوا ان تک آیا۔

حیا جانتی تھی کہ وہ کیوں جھجکا ہے۔ ترکی میں گھاس پہ جوتوں سے چلنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا اور موقع ملنے پہ وہ اور ڈی جے اپنی دلی تسکین کے لیے گھاس پہ ضرور جوتوں سے چل کر دیکھتی تھیں۔

"شکر ہے تمہاری شکل تو دیکھی ہم نے۔" اس سے مل کر، رسمی انداز میں سب کا حال احوال پوچھ کر تایا فرقان نے گھنی مونچھوں تلے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"تھینکس!" وہ رسماً بھی نہیں مسکرایا اور اسی سرد انداز میں کہتا حیا کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ وہ یہاں آنے پہ قطعاً راضی نہ تھا، وہ جانتی تھی۔

"سبین نے تو گویا قسم کھا رکھی کہ ہمیں اپنے بیٹے کی شکل نہیں دیکھنے دے گی۔ اسے کیسے خیال آیا تمہیں بھیجنے کا؟" اس کے لیے دیے سے انداز کا اثر تھا کہ تایا فرقان کے مسکراتے لہجے کے پیچھے ذرا سی چبھن در آئی۔

"ممی کو اپنی بھتیجی کو اکیلے بھیجنا آکورڈ لگ رہا تھا، سو مجھے آنا پڑا۔" بغیر کسی لگی لپٹی کے اس نے کہہ ڈالا۔ منگیتر، منکوحہ کے الفاظ تو دور کی بات، اس نے تو میری کزن تک نہیں کہا تھا، گویا رشتوں کی حدود واضح کیں۔

سلیمان صاحب کے ماتھے پہ ذرا سی شکن ابھر آئی، اور صائمہ تائی کے لبوں کو ایک معنی خیز مسکراہٹ نے چھو لیا۔ حیا بالکل لاتعلق سی لان کی کیاریوں میں اگے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ وہ اور ڈی جے ہمیشہ ٹاقسم پارک سے پھول چرانے کی کوشش کرتے تھے مگر پارک کا کیئر ٹیکر ان پہ بڑی سخت نگاہ رکھتا تھا۔

"اور تمہاری ممی کب آئیں گی؟" سلیمان صاحب نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

"ممی کی بھتیجی" اور "تمہاری ممی" اس کے گھر کے مرد آج بہت تول تول کر الفاظ ادا کر رہے تھے۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" اس نے شانے اچکا دیے۔

"جہان! جوس لو گے یا چائے، یا پھر کافی؟" فاطمہ نے چائے کے خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے اس کو مخاطب کیا۔ وہ مردوں کی بہ نسبت اس کو داماد والا پروٹوکول دے رہی تھیں۔

"بس ایپل ٹی بہت ہے۔" اس نے روانی میں کہہ دیا، مگر فاطمہ کی آنکھوں میں ابھرتی ناسمجھی دیکھ کر لمحے بھر کو متذبذب ہوا، پھر فوراً تصحیح کی۔

"بس چائے!"

فاطمہ نے مسکرا کر سر ہلایا اور ٹرے اٹھائے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

"تو بیٹا! آپ کی اسٹڈیز کمپلیٹ ہو گئیں؟" صائمہ تائی اب بہت میٹھے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔ وہ ہر کسی کے لیے اتنی میٹھی نہیں ہوتی تھیں، کچھ تھا جو اسے چونکا گیا۔

"جی، اب تو کافی عرصہ ہو گیا۔"

"پھر کیا کر رہے ہو آپ؟"

"میرا استقلال اسٹریٹ پہ ایک ریسٹورنٹ ہے وہی دیکھتا ہوں۔"

جواباً صائمہ تائی ذرا حیران ہوئیں، البتہ تایا فرقان نے متانت سے سر ہلاتے اپنے تاثرات چھپا لیے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ لوگ استقلال اسٹریٹ کی قیمتی زمین کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، اس لیے متاثر نہیں ہوئے اور گو کہ وہ اپنی لاتعلقی توڑنا نہیں چاہتی تھی، پھر بھی دھیرے سے بولی تھی۔

"استقلال اسٹریٹ پہ ایک ریسٹورنٹ کا مطلب ہے، لاہور کی ایم ایم عالم روڈ پہ دو ریسٹورنٹس۔" وہ کہہ کر کیاریوں کو دیکھنے لگی۔

"اوہ اچھا..... گڈ!" ان کے تاثرات فوراً ہی بدلے تھے۔

"والد صاحب کی طبیعت کیسی ہے اب؟"

"جی ٹھیک ہیں۔" وہ مختصر جواب دے رہا تھا۔ تب ہی فاطمہ اس کی چائے کا مگ ٹرے میں لیے چلی آئیں۔
"کچھ لو نا بیٹا! تم نے کچھ نہیں لیا۔"
"جی، میں لیتا ہوں۔" اس نے مگ اٹھا لیا مگر دوسری کسی شے کو چھوا تک نہیں۔
تایا فرقان اور صائمہ تائی ادھر ادھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے جلد ہی اٹھ کر چلے گئے۔ البتہ جاتے وقت وہ جہان کے لیے دیے جانے والے آج رات کے ڈنر پہ سب کو مدعو کر کے گئے تھے۔
"تمہاری چھٹی کب تک ہے پھر؟" ان کے جانے کے بعد سلیمان صاحب جہان سے پوچھنے لگے۔
"بس یہی چار دن۔"
پھر تم اپنی فلائٹ بک کروانا تو حیا کی مت کروانا۔ وہ واپس نہیں جائے گی۔"
حیا نے چونک کر ابا کو دیکھا۔
"اوکے!" جہان نے ایک سرسری نظر اس پہ ڈالتے ہوئے شانے اچکا دیے۔
"مگر ابا...... ہمارا کانٹریکٹ۔" وہ ایک دم بہت پریشان ہو گئی تھی۔
"میں تمہارا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوا دوں گا۔ کانٹریکٹ کی فکر چھوڑ دو۔ اب میرا مزید حوصلہ نہیں ہے تمہیں باہر بھیجنے کا۔ اس بچی کا جنازہ بھگتایا ہے میں نے۔ اتنی دور اکیلی بچیاں بھیجنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ کل کو کچھ ہوا تو۔"
"مگر ابا! اس کے برین میں اندر بہت پہلے سے......"
"حیا! جو میں نے کہا، وہ تم نے سن لیا؟" ان کا انداز واشگاف دوٹوک اور سخت تھا کہ اس نے سر جھکا دیا۔
"جی ابا!"
جہان لاتعلق سا بیٹھا چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ ان دونوں نے ایک دفعہ بھی نگاہیں نہیں ملائی تھیں۔ پتا نہیں کیوں!

☆ ☆ ☆

تایا فرقان کے پورچ کی بتیاں رات کی تاریکی میں جگمگا رہی تھیں۔ وہ اور جہان، فاطمہ کے ہمراہ چلتے ہوئے برآمدے کے دروازے تک آئے تھے۔ سلیمان صاحب کا کوئی آفیشل ڈنر تھا، سو انہوں نے معذرت کر لی تھی۔
دروازے کے قریب جہان رکا اور جھک کر بوٹ کا تسمہ کھولنے لگا۔ فاطمہ نے رک کر اچنبھے سے اسے دیکھا۔
"پاکستان میں جوتے پہن کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔" وہ اتنی کبیدہ خاطر اور بے زار تھی کہ جہان سے مخاطب ہونے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، پھر بھی کہہ اٹھی۔
"اوہ سوری!" وہ ذرا چونکا، پھر جلدی سے تسمے کی گرہ لگا کر سیدھا ہوا۔ یہ وہ پہلی باضابطہ گفتگو تھی، جو پاکستان آ کر ان دونوں کے درمیان ہوئی تھی۔
"ترکی میں جوتے گھر کے باہر اتارتے ہیں، اس لیے وہ رکا تھا۔" اس نے ابھی ہی کھڑی فاطمہ کے قریب سرگوشی کر کے وجہ بتائی۔ فاطمہ نے سمجھ کر "اوہ!" کہا اور آگے بڑھ گئیں۔
ڈائننگ ہال میں بہت پرتکلف سا کھانا سجا تھا۔ صائمہ تائی نے خوب اہتمام کر رکھا تھا۔ جہان بہت مختصر گفتگو کر رہا تھا۔ کوئی کچھ پوچھتا تو جواب دیتا اور پھر خاموشی سے کھانے لگ جاتا۔
ارم، سونیا بھابھی اور داور بھائی کے اس طرف بیٹھی تھی۔ فرخ کی کال تھی سو وہ ہسپتال میں تھا۔ ارم حیا سے ذرا رکھائی سے ملی تھی۔ اس کا کھچا کھچا اور خاموش سا انداز حیا کو ساری وجہ سمجھا گیا۔ اس رات وہ یقیناً پکڑی گئی تھی، مگر حیا نے اسے نہیں بچایا تھا سو تایا کے سامنے اس کا پول کھل گیا ہوگا، اسی لیے وہ حیا کو اس سب کا ذمہ دار سمجھتی تھی، مگر اس نے اثر نہیں لیا۔ وہ ڈی جے کا صدمہ اتنا گہرا لیے ہوئی تھی کہ اسے اب ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا۔

داور بھائی اور تایا فرقان، جہان سے ترکی کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں یونہی برسبیل تذکرہ پوچھ رہے تھے اور وہ پے تلے جواب دے رہا تھا۔

"کبھی ترکی آئے تو تمہاری طرف ضرور آئیں گے!" داور بھائی نے سونیا کی طرف ابرو سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سونیا مسکرائی۔ تائی نے فوراً داور بھائی کو دیکھا۔

"میرا مطلب ہے، ہم سب!" داور بھائی نے جلدی سے تصحیح کی۔ سونیا نے سر جھکا دیا۔

"شیور!" جہان نے شانے اچکا دیے، جیسے آپ آئیں یا نہیں، مجھے فرق نہیں پڑتا۔

"آگے کا کیا ارادہ ہے تمہارا؟" کھانا درمیان میں تھا، جب تایا فرقان نے بہت سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے گویا پہلا پتا پھینکا۔

حیا نے ذرا چونک کر انہیں دیکھا اور پھر فاطمہ کو، جو حیا کی طرح ہی چونکی تھیں۔ جو بات ان دو ماہ میں وہ خود، اور اتنے عرصے سے اس کے ماں باپ، سبین پھپھو یا جہان سے نہیں پوچھ سکے تھے، وہ تایا فرقان نے بڑے آرام سے پوچھ لی تھی۔

"کچھ سرمایہ جمع ہوا تو جواہر مال میں ایک ریسٹورنٹ کھول لوں گا۔" چمچے اور کانٹے سے چاول پلیٹ سے اٹھاتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

"تم داور سے سال بھر ہی چھوٹے ہو نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بھئی داور میاں تو اب مزید اسٹیبلش ہونے کے حق میں بالکل نہیں تھے اور صاحبزادے کا خیال یہ تھا کہ اس عمر میں فیملی شروع کر دینی چاہیے، سو ہم نے ان کی شادی کر دی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

تایا فرقان چاولوں کی پلیٹ میں رائتہ ڈالتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ حیا کے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا، اس نے جھکا سر مزید جھکا دیا۔ جہان نے ذرا سے کندھے اچکائے۔

"داور کے پاس اس کے والد کا اسٹیبلشڈ بزنس تھا، سو وہ اس پوائنٹ پہ شادی افورڈ کر سکتا تھا۔" اس نے سلاد کی پلیٹ سے کھیرے کا ایک ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔

"کام تو خیر تمہارا بھی اسٹیبلشڈ ہو گیا ہے۔"

"میرے اوپر ابھی کافی قرض ہے، وہ ذرا ہلکا ہو جائے تو ہی کچھ سوچوں گا۔"

حیا نے گردن مزید جھکا لی۔ کیا تھا اگر وہ اپنی لینڈ لیڈی کے قرضے کا ذکر نہ کرتا، کچھ بھرم تو رہنے دیتا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے، انسان اس وقت ہی شادی کرے، جب وہ اس ذمہ داری کو نبھا سکے۔ ذمہ داری نبھانا بھی مشکل کام ہوتا ہے۔ ہاں اگر والدین ساتھ دیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے، مگر یہاں پاکستان میں تو اب اکثر شادیوں پہ والدین ناخوش ہوتے ہیں، کیونکہ آج کل کے بچے ان کی پسند کی اہمیت نہیں دیتے اور اپنی مرضی کرتے ہوئے ان کے طے کردہ رشتوں کو ریجیکٹ کر دیتے ہیں۔ یہ تو میرے بچے ہیں کہ جو ماں باپ نے کہا، اس پہ راضی ہو گئے، ورنہ تو......" انہوں نے معاشرے پہ ایک تبصرہ کرتے ہوئے تاسف سے سر جھٹکا۔

سونیا بھابھی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ فاطمہ کی پیشانی پہ ناگواری شکنیں ابھر آئی تھیں، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔ تایا بڑے تھے۔ ان کے سامنے کوئی نہیں بول سکتا تھا۔

"ویل...... یہ ڈیپنڈ کرتا ہے۔" جہان نے کولڈ ڈرنک کے گلاس سے چھوٹا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے، ماں باپ اگر اپنی مرضی مسلط نہ کریں تو چیزیں ٹھیک رہتی ہیں۔"

صائمہ تائی کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ فاطمہ کے چہرے پہ ایک تاریک سایہ لہرایا اور حیا کی گردن مزید جھک گئی۔ بھرے پنڈال میں گویا اس کی بے عزتی کر دی گئی تھی۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" تایا فرقان نے سر ہلا کر تائید کی۔ "تمہاری واپسی کب ہے؟" جواب مل گیا تھا، سو بات بدل دی۔

"سوموار کی صبح کی فلائٹ ہے۔"

"حیا تو نہیں جا رہی نا۔ ویسے میرا بھائی میری طرح بزدل نہیں ہے بلکہ کافی بہادر ہے۔ میری بیٹی نے بھی آ کر اسی اسکالرشپ کا کہا تھا، مگر میں نے اس کی ماں سے کہا کہ اسے سمجھاؤ اکیلی لڑکی جب دوسرے ملک یوں تن تنہا جاتی ہے تو پورا خاندان انگلیاں اٹھاتا ہے۔ بھئی بچی جتنی احتیاط کرے، لوگ تو باتیں بناتے ہیں کہ کو ایجوکیشن میں پتا نہیں کیسے رہتی ہے، وہاں اکیلے باہر آنا جانا ہوگا، کس سے ملتی ہے، کس سے نہیں، پھر کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو ماں باپ تو ہو گئے بدنام۔ خیر! ویسے ترکی تو اچھا مسلمان ملک ہے اور تمہاری فیملی ساتھ تھی تو ہمیں اپنی بیٹی کی طرف سے بے فکری رہتی تھی۔"

انہوں نے کہتے ہوئے مسکرا کر حیا کو دیکھا جو خاموشی سے پلیٹ میں دھرے چاول کانٹے سے ادھر ادھر کر رہی تھی۔ وہ کھا نہیں رہی، کسی نے محسوس نہیں کیا۔

"حیا! تم نے شادی کے کپڑے بنوا لیے؟" صائمہ تائی نے گفتگو کا رخ اس کی طرف موڑا۔ اس نے ذرا سی نفی میں گردن ہلائی۔

"ابھی دیکھوں گی۔" اسے علم نہیں تھا کہ اماں نے کپڑے بنوائے یا نہیں۔

"چلو تم تو ریڈی میڈ بھی لے سکتی ہو، آسانی ہو جائے گی۔ سارا مسئلہ میری ارم کا ہوتا ہے۔ دوپٹا شیفون کا نہ ہو، پتلا دوپٹا سر پہ ہی نہیں ٹکتا، آستین باریک نہ ہو اور پھر جو اچھا جوڑا لگتا ہے اس کی آستینیں ہی غائب ہوتی ہیں۔ تمہاری تو خیر ہے، تم سب ہی کچھ پہن لیتی ہو، ساری مصیبت تو میری آئی رہتی ہے۔ بار بار درزی کے چکر لگاتے پڑتے ہیں۔" بات ختم کر کے انہوں نے ایک نظر جہان پر ڈالی۔ وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

"بس کیوں کر دی بیٹا؟ اور لو نا، کھانا ٹھیک لگا تمہیں؟"

"جی! امی! کھانا تو بہت اچھا تھا، بس ذرا مرچ زیادہ تھی۔" وہ پہلی دفعہ قدرے مسکرا کر بولا۔

جہاں تائی کی مسکان پھیکی ہوئی، وہاں سونیا بھابھی نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے چہرہ جھکا دیا۔

☆ ☆ ☆

رات دیر تک جاگنے کے باعث وہ صبح دن چڑھے تک سوتی رہی اور آنکھ کھلی بھی تو موبائل کی آواز سے۔

اس نے مندی مندی سی آنکھیں کھولیں اور سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اپنا پاکستان موبائل اٹھا کر دیکھا۔ وہاں "پرائیوٹ نمبر کالنگ" جلتا بجھتا دکھائی دے رہا تھا۔

"اُف...... یہ پھر پیچھے پڑ گیا۔" اور اسے پتا تھا کہ جب تک اٹھائے گی نہیں وہ کال کرتا رہے گا۔

"ہیلو؟" اس نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

"ویلکم بیک۔ کیسی ہیں آپ؟" وہی دھیما، خوب صورت، گمبھیر لہجہ۔ اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔

"کیوں فون کیا ہے آپ نے؟"

"آپ کی دوست کا سنا تھا، بہت افسوس ہوا۔"

"آئندہ آپ کو بھی افسوس ہو یا خوشی ہو، مجھے فون مت کیجیے گا۔"

"آپ اتنی بدگمان کیوں رہتی ہیں؟ آپ اگلے بندے کی پوری بات کیوں نہیں سنتیں؟ مجھے کہنے تو دیں جو مجھے کہنا ہے!" اسے جیسے غصہ آیا تھا۔

"دیکھیں! میں جانتی ہوں کہ آپ کون ہیں، میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کس کے بیٹے ہیں اور یہ بھی کہ آپ کا میرے خاندان سے کیا ایشو ہے، مگر بات جو بھی ہے، اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ آپ آئندہ فون کریں گے بھی تو میں نہیں اٹھاؤں گی۔ خدا حافظ۔"

اس نے زور سے بٹن دبا کر فون بند کیا اور تکیے پہ اچھال دیا۔ پتا نہیں کون سا گناہ تھا اس کا، جو وہ شخص اس کے پیچھے پڑ گیا اور اپنے ساتھ بہت سے مسئلے اس کے پیچھے لگا دیے۔

شام میں فاطمہ کے بے حد اصرار اور پھر ناراض ہونے کی دھمکی کے بعد حیا وہ کامدار انارکلی فراک پہننے پہ راضی ہوئی جو رنگ کے فرق کے ساتھ تمام لڑکیوں نے مہندی کے لیے بنوائے تھے۔ اس کا قطعاً تیار ہونے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، مگر فاطمہ نے اس کی ایک نہیں سنی۔

"جو ہو چکا ہے، ہم اسے بدل تو نہیں سکتے۔ پھر لوگوں کو خود پہ تمسخر کرنے کا موقع کیوں دیں؟ فریش ہو کر جاؤ ورنہ تمہاری تائی کوئی نہ کوئی قصہ بنا دیں گی۔"

لمبا انارکلی فراک گہرے سبز رنگ کا تھا اور اس پہ دبکے کا سلور کام تھا۔ ساتھ میں سونیا بھابھی نے اس کو اپنا سبز اور سلور پراندہ باندھ دیا کہ سب لڑکیاں پراندے پہن رہی تھیں۔ سلور ٹیکا بھی سونیا نے ہی اس کی پیشانی پہ سجایا، مگر کسی بھی قسم کے سنگھار کے لیے وہ قطعاً راضی نہ تھی۔

"اچھا کاجل تو ڈال لو۔" سونیا اس کے ساتھ سیڑھیوں کے اوپر کھڑی، اسے کاجل تھمانا چاہ رہی تھی مگر اس نے چہرہ پیچھے کر لیا۔ وہ اس وقت تایا فرقان کے گھر میں تھیں۔ سیڑھیوں سے نیچے لاؤنج میں ہر طرف رشتہ داروں کی چہل پہل تھی۔ مہوش اور سحرش کی چھوٹی بہن ثنا کیمرا لیے ادھر ادھر بھاگ رہی تھی۔ اس کا فراک سرخ کلر کا تھا۔ سونیا کا اپنی بری کا تھا، ہلکا گلابی۔

"نہیں رہنے دیں بھابھی!" اس نے بددلی سے چہرہ پیچھے ہٹایا۔ چاندی کے گول ٹیکے نے دھلے دھلائے چہرے کو سجا دیا تھا۔

سونیا تاسف سے سر جھٹک کر گویا اس پہ ماتم کرتی، سیڑھیاں اتر گئی۔ اس نے ایک آخری نگاہ دیوار پہ آویزاں آئینے پہ ڈالی، کامدار سبز دوپٹا کندھے پہ ڈالا۔ اور دوسرا پلو بائیں بازو سے آگے کو نکال لیا اور پلٹ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ تب ہی اس نے جہان کو دیکھا۔ وہ سب سے لاتعلق سا اپنے موبائل پہ کچھ پڑھتا سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ فاطمہ اس کے لیے دو تین کرتے لے آئی تھیں اور اس وقت اس نے ان میں سے ایک سیاہ والا کرتا زیب تن کر رکھا تھا، جس کے گلے پہ سنہرے دھاگے کا کام تھا۔ آستین کہنیوں تک موڑے وہ شاید کوئی میسج لکھ رہا تھا۔

وہ سج سج کر باریک ہیل سے زینے اترنے لگی۔ ٹاقسم والا واقعہ اسے نہیں بھولتا تھا۔ وہ آخری سیڑھی پہ تھی، جب جہان نے سر اٹھایا، ایک لمحے کے لیے رک کر اسے دیکھا، پھر اس کی طرف آیا۔

"حیا......!" وہ آخری زینے پہ ایک ہاتھ ریلنگ پہ رکھے ٹھہر گئی۔

"میں نے سوموار کی فلائٹ بک کروائی ہے۔ تمہاری بک تو نہیں کروائی نا؟ تم واپس نہیں جا رہیں رائٹ!" لاتعلق سے انداز میں وہ محض کام کی بات پوچھ رہا تھا۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹکنے لگا۔

"نہیں، میں واپس نہیں جا رہی۔ ابا ایک دفعہ فیصلہ کر لیں تو پھر وہ اسے نہیں بدلتے۔" وہ آخری زینہ اتر کر اس سے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی ہوئی۔

"اوکے!" وہ شانے اچکاتے ہوئے پلٹنے ہی لگا تھا کہ ثنا اسی پل کیمرا لیے ان کے سامنے آئی۔

"ایک منٹ جہان بھائی! یہیں کھڑے رہیں، میں آپ دونوں کی پکچر لے لوں۔" خوش دلی سے کہتے ہوئے اس نے کیمرا اپنے چہرے کے سامنے کیا۔

جہان نے ذرا چونک کر ساتھ کھڑی حیا کو دیکھا اور پھر قدرے ناگواری سے وہ چند قدم آگے کو آیا۔ ثنا جو فوکس کر رہی تھی، نے ذرا حیران ہو کر کیمرا چہرے پہ سے نیچے کیا۔

"کسی کی پکچر بنانے سے پہلے اس سے پوچھ لینا چاہیے۔" لب بھینچے، ذرا درشتی سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

ثنا کا رنگ ماند پڑ گیا۔ اس کا کیمرے والا ہاتھ ڈھیلا ہو کر پہلو میں آ گرا۔ اس نے پلٹ کر راہداری کی سمت دیکھا، جہاں وہ جاتا دکھائی دے رہا تھا، پھر دبے دبے غصے سے سر جھٹکا۔

"میری توبہ جو کبھی ان کی تصویر بناؤں یا ان سے بات بھی کروں۔" وہ خفگی سے بڑبڑاتے ہوئے آگے چلی گئی۔

حیا نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا بھیگا گوشہ صاف کیا اور سر کو خفیف سی جنبش دے کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے پاس رونے کے لیے بہت سے غم تھے۔

مہندی کا فنکشن زاہد چچا کے لان میں ہی منعقد کیا گیا تھا۔ لان کافی کھلا اور وسیع تھا، سو قناتوں سے صرف اوپر کی چھت بنائی

گئی، باقی اطراف کھلی رکھی گئیں۔ جہاں ہر سو دیواروں پر لڑیوں کی صورت بتیاں جگمگا رہی تھیں۔

اسٹیج پر رکھے لکڑی کے جھولے کو گیندے کے پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا اور مہوش اس پہ کسی ملکہ کی شان سے بیٹھی تھی۔ اس کا انارکلی فراک باقی لڑکیوں کے برعکس دو رنگا تھا۔ سرخ اور زرد۔ ان ہی دو رنگوں کا پراندہ آگے کندھے پر ڈالے دوپٹا سر پر ٹکائے وہ مسکرا کر بہت اعتماد طریقے سے سب سے باتیں کر رہی تھی۔ اس اعتماد میں غرور کی جھلک بھی تھی۔ وہ خوب صورت نہیں تھی، مگر خوب سارا پیسہ اپنی تراش خراش پر لٹانے کے بعد اب بے حد پرکشش لگ رہی تھی۔

پہلو میں بیٹھا اس کا ماموں زاد عفان عام سی شکل کا کینیڈین نیشنل تھا مگر سننے میں آیا تھا کہ تازہ تازہ بے حد امیر ہوا تھا۔ ابھی یہ کہانی حیا نے پوری سنی نہیں تھی۔

وہ بالکل کونے میں رکھی ایک میز کے گرد کرسی پہ بیٹھی تھی۔ وہاں جگہ جگہ ایسے ہی میزوں کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ بھی اپنے سبز فراک میں ادھر ادھر خوش باش پھیر رہی ہوتی مگر آج وہ اندر سے اتنی بے زار اور اداس تھی کہ وہیں بیٹھی سب کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھے گئی۔

ہر طرف لڑکیاں، لڑکے آ جا رہے تھے۔ ثنا اپنا کیمرا اٹھائے، ماتھے پہ جھولتا ٹیکا سنبھالتی، ادھر ادھر اٹھلاتی تصویریں کھینچتی پھر رہی تھی۔ اسٹیج پہ صائمہ تائی مہوش کو مہندی لگانے کے بعد اب مٹھائی کھلا رہی تھیں۔ ارم بھی وہیں تھی۔ اس کا انارکلی فراک ہلکا فیروزی تھا اور کبھی وہ دوپٹا گردن میں ڈال لیتی، تو کبھی سر پہ کر لیتی کہ خواتین اور مردوں کا ایک ہی جگہ انتظام تھا اور تایا فرقان بھی آس پاس ہی تھے۔

زاہد چچا روشن خیال تھے تو مہوش کے ماموں کا خاندان بھی آزاد خیال تھا، سو مہندی کا فنکشن مشترکہ رکھا گیا تھا۔ البتہ ان کے خاندان کے لڑکے اور مرد ذرا الگ تھلگ چند میزوں پر براجمان تھے تاکہ برائے نام ہی سہی، مگر پارٹیشن ہو جائے۔ تایا فرقان اور سلیمان صاحب، سب وہیں ہی تھے۔

وہ اسی طرح بیٹھی، پراندہ آگے کو ڈالے، غیر دلچسپی سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ میں گرد و پیش کا جائزہ لے کر جہان کو ڈھونڈنا چاہا تھا اور وہ اسے نظر آ بھی گیا تھا۔ دور، مردوں کی طرف، تایا فرقان اور سلیمان صاحب کے ساتھ کرسی پہ بیٹھا آستین عادتاً کہنیوں تک موڑے وہ خاصا لاتعلق سا بیٹھا تھا۔ یقیناً وہ جی بھر کر بور ہو رہا تھا۔

وہ تلخی سے سر جھٹک کر واپس اسٹیج کو دیکھنے لگی، جہاں اب فاطمہ، مہوش کو مٹھائی کھلا رہی تھیں۔ ساتھ ہی اس کی جڑواں بہن سحرش بیٹھی مسکرا کر کیمرے کو دیکھتی تصویر بنوا رہی تھی۔ اس کا انارکلی فراک پستئی رنگ کا تھا۔ دونوں بہنوں کی شکل و صورت سمیت سب مختلف تھا۔ مگر بدلے بدلے یہ مغرورانہ انداز یکساں تھے۔ ثنا چونکہ چھوٹی تھی یا فطرتاً مختلف تھی، سو اس نے یہ اثر قبول نہیں کیا تھا۔ اب ایسا بھی کیا ہوا تھا کہ وہ دونوں اتنی اکڑی پھر رہی تھیں۔ کس سے پوچھے! اس کے اندر فطری تجسس جنم لینے لگا تھا۔

"حیا...... ادھر بیٹھی ہو؟" ارم اپنا فیروزی کامدار دوپٹا سر پہ ٹھیک سے جماتے ہوئے اس کے ساتھ کرسی پہ آ بیٹھی۔ کل کی نسبت اس کا رویہ قدرے دوستانہ تھا۔

"ہاں، تم سناؤ! تھک گئی ہو؟" وہ بھی جواباً نرمی سے بولی۔

"ہاں بس، تھوڑی بہت۔ اچھا وہ......" لہجہ ذرا سرسری بنا کر وہ بولی "فون فارغ ہو گا تمہارا؟" مجھے ذرا فضہ کو کال کرنی تھی، کچھ نوٹس کا کہنا تھا۔ میرا فون خراب ہے آج کل۔"

حیا نے گہری سانس اندر کو کھینچ کر خارج کی۔ (تو ارم سے اس کا فون بھی لے لیا گیا تھا۔)

"ہاں! فون فارغ ہے، جب چاہے لے لو، مگر کریڈٹ ختم ہے، جب سے آئی ہوں، ڈلوایا ہی نہیں ہے۔ دوپہر سے ظفر کو ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ ملے تو اس کو بھیج کر کارڈ منگواؤں۔"

اس نے تایا فرقان کے کل وقتی سنک کا نام لیا۔ گو کہ یہ سچ نہیں تھا اور کریڈٹ اس نے صبح ہی ڈلوا لیا تھا مگر وہ ارم کو فون نہیں دینا چاہتی تھی۔

''اچھا.....'' ارم کے چہرے پہ واضح مایوسی پھیلی تھی۔

''اماں کا فون فارغ ہوگا، لے آؤں؟'' وہ اٹھنے لگی تو اس کی توقع کے عین مطابق ارم نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا۔

''رہنے دو، میں بعد میں ابا سے لے لوں گی۔ میرا فون ریچارجنگ کے لیے نہ گیا ہوتا تو۔ خیر تم سناؤ ترکی میں سب ٹھیک تھا؟'' وہ بات کا رخ پلٹ گئی۔

''بس.....وہاں کی تو اب دنیا ہی بدل گئی ہے، مگر اسے چھوڑو، یہ بتاؤ، مہوش، سحرش کے انداز اتنے بدلے بدلے کیوں لگ رہے ہیں؟'' اس نے پراندے کو ہاتھ سے پیچھے کمر پہ ڈالتے ہوئے حیرت کا اظہار کر ہی دیا۔ آخر دونوں کزنز تھیں اور کبھی بہت اچھی دوستیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے ان دونوں کا۔'' ارم سرگوشی میں کہتے ہوئے ذرا قریب کھسک آئی۔ ''یہ جو عفان صاحب ہیں نا، جن کو میں اپنا ڈرائیور بھی نہ رکھوں۔ انہوں نے کینیڈا میں کسی ریلیٹی ٹی وی شو میں حصہ لے کر ڈیڑھ ملین ڈالرز جیتے ہیں اور ان سب کی جون ہی بدل گئی ہے۔ سنا ہے دونوں ہنی مون پہ یورپ کے ٹور پہ جا رہے ہیں۔'' ارم کے لہجے میں نہ حسد تھا، نہ رشک۔ بس وہ اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔

''تب ہی میں کہوں!'' اس نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ ارم کچھ دیر مزید بیٹھی، پھر اٹھ کر چلی گئی۔ حیا کو اگر کسی نے اسٹیج کی طرف بلایا تو بھی وہ نہیں گئی اور اصرار بھی کسی نے نہیں کیا۔ اس کے صدمے سے سب واقف تھے، مگر اس کی دوست کے غم میں کسی نے اپنا کام نہیں چھوڑا تھا اور وہ کسی سے ایسی توقع کر بھی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی دل پہ ایک بوجھ سا تھا۔ کتنی بے حس تھی یہ دنیا۔ کیسے لمحوں میں لوگ ختم ہو جاتے ہیں اور یہاں کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ سب کام جاری و ساری تھے اور.....

ایک دم سے بجلی غائب ہوگئی۔

ساری بتیاں گل ہوگئیں۔

ہر طرف اندھیرا اور سناٹا چھا گیا۔

صرف کیمرامین کے کیمروں کی فلیش لائٹس کی روشنی رہ گئی۔

پھر مایوسی، غصہ بھری مضمحل سی آوازیں بلند ہوئیں۔ موبائل کی ٹارچز آن ہوئی، کسی نے بھاگ کر برآمدے کی یو پی ایس کی ٹیوب لائٹ جلائی تو مدھم سفید روشنی برآمدے میں پھیل گئی۔

رضا، فرخ، داور وغیرہ کو ان کی ماؤں نے آوازیں دیں۔ جنریٹر آٹومیٹک تھا، پھر کیوں نہیں چلا؟

''کوئی تو جنریٹر چلائے۔'' ہر طرف اکتاہٹ بھری آوازیں سنائی دینے لگیں۔

لڑکے بھاگ کر برآمدے میں آئے اور فرخ نے جلدی سے آگے بڑھ کر جنریٹر چلانے کی کوشش کی مگر اس کا انجن مردہ پڑا رہا۔

اچھے بھلے فنکشن میں بدمزگی سی ہوگئی۔ ہر طرف بے چینی اور اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر میز پہ ایک ٹمٹماتی موبائل کی ٹارچ جگمگا رہی تھی۔

''پتا نہیں ابا! نہیں چل رہا۔'' داور بھائی نے بھی دو چار دفعہ کوشش کی، مگر بے سود۔ وہ ہاتھ جوڑ کر مایوسی سے کہتے ہوئے کھڑے ہوئے۔

ابا اور تایا فرقان بھی برآمدے کے ستونوں کے پاس آن کھڑے ہوئے تھے۔ حیا کی میز چونکہ برآمدے سے بہت قریب تھی، سو وہ گردن موڑ کر بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

''جاؤ، مکینک کو بلا کر لاؤ یا دوسرے جنریٹر کا بندوبست کرو۔ جلدی۔'' تایا فرقان برہمی سے ڈانٹتے اپنے بیٹوں کو دوڑا رہے تھے۔ کوئی ادھر بھاگا، تو کوئی ادھر۔ ہر طرف ایک شرمندگی اور بے زاری پھیل گئی تھی۔

وہ ایک کہنی میز پر ٹکائے، ٹھوڑی ہتھیلی پہ رکھے گردن ترچھی کر کے برآمدے کو دیکھنے گئی، جہاں مدھم سی روشنی میں رکھا جنریٹر دکھائی دے رہا تھا۔ قریب ہی تایا فرقان اور سلیمان صاحب کھڑے قدرے متاسف سے آپس میں کچھ کہہ رہے تھے۔

دفعتاً وہ ذرا چونکی۔ اس نے جہان کو برآمدے کے زینے چڑھتے ہوئے دیکھا۔ تایا فرقان اور ابا نے اسے نہیں دیکھا تھا، وہ آپس

میں مصروف تھے۔

وہ خاموشی سے آستینیں مزید پیچھے موڑتے ہوئے آگے بڑھا اور جنریٹر کے سامنے ایک پنجے اور ایک گھٹنے کے بل بیٹھا۔ نچلا لب دانتوں سے دبائے، وہ اب گردن جھکائے جائزہ لینے لگا تھا۔

پھر سر اٹھایا اور متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ قریب سے افراتفری کے عالم میں ثنا اندر جاتی دکھائی دی۔ اس نے ثناء کو آواز دی۔ وہ ٹھٹھک کر رکی۔ اس نے کچھ کہا تو ثناء نے ذرا جھجھکے سے اثبات میں سر ہلایا اور اندر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی تو چھری، پیچ کس اور ایسی چند چیزیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ جہان کے ساتھ وہ سب رکھ کر وہ خود بھی وہیں کھڑی ہوگئی۔

وہ جنریٹر کا کور اتار رہا تھا۔ تب ہی تایا فرقان کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ چونکے۔ وہ بغیر اپنے کرتے کی پروا کیے، زمین پہ بیٹھا جنریٹر میں ہاتھ ڈال کر کچھ دیکھ رہا تھا۔ تایا فرقان کی نگاہوں کے تعاقب میں سلیمان صاحب نے بھی اس طرف دیکھا۔

''فیول والو میں کچھ پھنس گیا ہے، ابھی صاف ہو جائے گا۔'' اس کی آواز مدھم مدھم سی حیا تک پہنچی تھی۔ ثنا بہت حیرت، بہت متاثر سی اس کے ساتھ کھڑی اس کو کام کرتے دیکھ رہی تھی، جو بالکل کسی ماہر مکینک کے انداز میں بہت مہارت سے تاریں ادھر ادھر کر رہا تھا۔

چونکہ ہر سو اندھیرا تھا اور روشنی صرف برآمدے میں تھی، سو برآمدے کا منظر سارے منظر پہ چھانے لگا۔ لڑکیاں اور رشتہ دار خواتین مڑ مڑ کر اسی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ماحول پہ چھائی بے چینی ذرا کم ہوئی۔

اس نے کور واپس ڈالا۔ اس کے ہاتھوں پہ کالک لگ گئی تھی۔ پھر اس نے جنریٹر کا لیور کھینچا اور پیچھے کو ہٹا تو ساتھ ہی ایک جھماکے سے ساری بتیاں روشن ہوگئیں۔ اتنی تیز روشنی سے حیا کی آنکھیں لمحے بھر کو چندھیا ئیں اس نے بے اختیار انہیں میچ کر دھیرے دھیرے کھولا۔

ثنا خوشی اور تشکر سے کچھ کہتے ہوئے چیزیں اٹھا رہی تھی۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ رہا تھا۔ ثنا نے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا تو وہ اسی سنجیدگی سے سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ ثنا بھاگ کر اس کے پیچھے گئی۔

سلیمان صاحب جو قدرے دم بخود سے دیکھ رہے تھے، ذرا سنبھل کر واپس مڑ گئے۔ وہ متاثر ہوئے تھے اور وہ اس تاثر کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ حیا مسکراہٹ دبائے واپس سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

جس شخص نے اندھیروں میں روشنیاں بکھیری تھیں، اس سے سب ہی متاثر تھے۔ البتہ وہ جانتی تھی کہ ابا نے کبھی یہ توقع نہیں کی ہوگی کہ جہان یوں زمین پہ بیٹھ کر جنریٹر کھولنے لگ جائے گا۔ اس کے دل میں ایک بے پایاں سا فخر جاگا۔ اس کی اور یقیناً ثنا کی بھی خود ساختہ سی خفگی اب کہیں نہیں تھی۔

مہمانوں کے لیے ریفریشمنٹ تھی اور ان کے جانے کے بعد گھر والوں کے لیے کھانے کا انتظام تھا۔ جب مہمان چلے گئے اور صرف وہی اپنے لوگ رہ گئے تو لان میں خواتین کا کھانا لگا دیا گیا جبکہ مردوں کا انتظام اندر تھا۔ مرد حضرات اور لڑکے وغیرہ اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ لان اب خالی خالی سا ہو گیا تھا۔

وہ پانچوں کزنز اس وقت اسٹیج پہ جھولے اور ساتھ رکھی کرسیوں پہ آ بیٹھی تھیں۔ مہوش تھوڑی دیر بیٹھی، پھر ''میں اب آرام کروں گی'' کہہ کر نزاکت سے اپنا فراک سنبھالے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''جہان بھائی تو بڑے کمال کے ہیں۔'' ثنا اپنی ہیلز اتار کر دکھتے پیروں کو ہاتھ سے سہلا رہی تھی۔ ''میں نے تو ان سے کہہ بھی دیا کہ جہان بھائی! میں نے آپ کو پاس کر دیا'' ۔ پہلے تو حیران ہوئے، پھر ہنس پڑے۔ سچ حیا آپی، آپ کے فیانسی ہیں بڑے اسمارٹ۔''

''اچھا۔'' وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

''ان فیانسی صاحب کو تو شاید خود بھی اپنی منگنی کا علم نہیں ہے۔ سلوک دیکھا ہے ان کا حیا کے ساتھ؟''

ارم جو قدرے بے زار سی بیٹھی تھیں، ہنک کر بولی ''اور جب فرخ بھائی مکینک کو لا ہی رہے تھے تو کیا ضرورت تھی بھرے مجمع میں الیکٹریشن بننے کی؟ لوگ بھی کیا سوچتے ہوں گے، ترکی سے یہی سیکھ کر آئے ہیں۔''

ثنا کے تو تلووں پہ لگی، سر پہ بجھی۔

"ارم آپی! بات سنیں، مسیح بھائی کو الیکٹریشن لانے میں پون گھنٹہ تو لگ ہی جانا تھا، جبکہ جہان بھائی نے چھ، سات منٹ میں سارا مسئلہ حل کر دیا اور امیج کی کیا بات ہے، لوگ تو امپریس ہی ہوئے ہوں گے۔"

"ہاں، بہت امپریس ہوئے ہوں گے کہ ہمارا ٹرکش کزن باورچی ہونے کے ساتھ ساتھ مکینک بھی ہے۔"

ارم بڑے تمسخر سے ہنس کر اٹھ گئی۔ ثنا نے غصے بھری نگاہوں سے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا۔

"ارم آپی بھی نا، ہر وقت مرچیں ہی چباتی رہتی ہیں۔"

"اچھا جانے دو۔ اس کی تو عادت ہے۔ تم مجھے آنٹی کی پکچرز دکھاؤ، اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔" اس نے کہا تو ثنا سر ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی اندر آئی تھیں۔

لاؤنج میں سارے مرد حضرات بیٹھے تھے۔ جہان بھی ادھر ہی تھا۔ ایک سنگل صوفے پہ بیٹھا وہ غور سے داور بھائی کی باتیں سن رہا تھا جو وہ اپنے مخصوص انداز میں با آواز بلند کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ دونوں تیز تیز چلتی لاؤنج کے سرے پہ بنے دروازے تک آئیں۔ وہ باہر کھڑی رہ گئی جبکہ ثنا نے دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ مہوش کا کمرا تھا، جس کے اندر ثنا کا کیمرا رکھا تھا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں بیڈ پہ لیٹی، آنکھوں پہ بازو رکھے مہوش نظر آ رہی تھی۔ ثنا دبے قدموں اندر گئی اور ڈریسنگ ٹیبل سے کیمرا اٹھایا۔ آہٹ پہ مہوش نے بازو ہٹایا۔

"کیا ہے ثنا! سونے دو نا مجھے۔" وہ تنگ کر بولی۔

"سوری آپی! بس جا رہی ہوں۔" ثنا کیمرا اٹھا کر جلدی سے باہر آئی اور دروازہ بند کیا۔

"ایک تو مہوش آپی بھی نا۔" وہ ذرا خفگی سے کہتی اس کے ساتھ کچن کی جانب بڑھ گئی۔ ایک دفعہ پھر لاؤنج سے گزر کر وہ دونوں کچن میں آئی تھیں اور حیا جانتی تھی کہ وہ بنا میک اپ کے بھی اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ اس کے بہت سے کزنز نے نگاہوں کا زاویہ موڑ کر اسے دیکھا ضرور تھا، البتہ وہ جس کے دیکھنے سے فرق پڑتا تھا، ویسے ہی داور بھائی کی جانب متوجہ تھا۔

وہ دونوں اب کچن میں کاؤنٹر کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی، ثنا کے ہاتھ میں پکڑے کیمرے کی چمکتی اسکرین پہ گزرتی تصاویر دیکھ رہی تھیں۔ جنہیں ثنا انگوٹھے سے بٹن دباتی آگے کرتی جا رہی تھی۔ تب ہی دھاڑ سے دروازہ کھل کر بند ہونے کی آواز آئی۔ ان دونوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

"داور بھائی! یہ کیا تماشا ہے؟" وہ ضبط کھو کر چلانے والی مہوش تھی۔

لمحے بھر کو تو وہ دونوں ساکت رہ گئیں، پھر ایک دم سے دوڑ کر چوکھٹ تک آئیں۔

لاؤنج میں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب ششدر سے مہوش کو دیکھ رہے تھے جو اپنے کمرے کے دروازے کے آگے کھڑی کمر پہ ہاتھ رکھے، چلا رہی تھی۔

"یہ کون سی جگہ ہے تقریریں کرنے کی؟ کسی کو میرا احساس ہی نہیں ہے کہ میں نے آرام بھی کرنا ہے، کل سارا دن میرا پارلر میں گزرے گا، مگر آپ تو میرے سر پہ چیخ رہے ہیں۔ آپ کو آہستہ بولنا نہیں آتا؟ حد ہو گئی۔" وہ پیر پٹخ کر واپس مڑی اور اپنے پیچھے اسی دھاڑ سے دروازہ بند کیا۔

لاؤنج میں یک دم موت کا سناٹا چھایا تھا۔ سب کو ایسا جھٹکا لگا تھا کہ بیان سے باہر تھا۔ پھر ایک دم سے جہان اٹھا۔

"داور! فرخ! مجھے گھر ڈراپ کر دو گے یا میں تم میں سے کسی کی کار لے جاؤں؟"

وہ تنے ہوئے نقوش کے ساتھ بہت قطعیت سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے سوال پہ سلیمان صاحب، تایا فرقان اور ان کے تینوں بیٹے ایک جھٹکے سے اٹھے۔ وہ جواب سننے کے لیے نہیں رکا۔ تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ وہ سب اس کی معیت میں باہر نکل گئے۔ ذرا پریشان سے زاہد چچا اور رضا بھی ان کے پیچھے لپکے۔

"مہوش آپی..... آئی کانٹ بلیو دس!" ثنا نے بے حد تحیر سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ حیا نے افسوس سے اسے دیکھا اور پھر خالی پڑے لاؤنج کو۔

"ابا لوگ بہت غصے میں گئے ہیں، مجھے لگتا ہے وہ ابھی ہمیں چلنے کا کہیں گے۔" اسی پل اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے موبائل سامنے کیا۔ "ابا کالنگ" باہر پہنچنے کا بلاوا آ گیا تھا۔

"سوری ثنا!" اس نے بے بسی سے شانے اچکائے، پھر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"کل شادی کے فنکشن تک سب کا غصہ اتر چکا ہوگا۔ فکر نہ کرنا، اچھا!" کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکلی۔

☆ ☆ ☆

سب سونے جا چکے تھے اور وہ اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے کھڑی پراندے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ سونیا نے کافی سخت باندھا تھا، گرہ کھل کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ بالآخر پراندہ چھوڑ کر اس نے پیشانی پہ جھولتے ٹیکے کو کھینچنے کے لیے چھوا ہی تھا کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

اس نے ٹیکا چھوڑا اور پھر حیرت سے دروازے کو دیکھتی اس تک آئی۔ اماں، ابا تو سونے چلے گئے تھے پھر......

اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے جہان کھڑا تھا۔

"سوری! تم سو تو نہیں گئی تھیں؟" وہ قدرے جھجک کر بولا۔ سیاہ ٹراؤزر کے اوپر آدھی آستین والی سفید ٹی شرٹ پہنے وہ وہی ترکی والا جہان لگ رہا تھا۔

"نہیں، تم بتاؤ خیریت؟"

"ہاں، ابھی میں لاؤنج میں بیٹھا تھا تو وہ فرقان ماموں کی بیٹی آئی تھی۔"

"ارم؟" اس نے ذرا حیرت سے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

"ہاں وہی۔ تمہارا فون اور پرس میز پہ رکھا تھا، اس نے فون اٹھا کر مجھ سے کہا کہ اسے ایک کال کرنی ہے، ابھی پانچ منٹ میں فون لا دے گی، مگر اب......" اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ "اب بیس منٹ ہونے کو آئے ہیں مگر وہ واپس نہیں آئی۔ میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔"

"اُف! تم نے اسے میرا فون کیوں لے جانے دیا؟"

جواباً جہان نے بے چارگی سے شانے اچکائے۔

"اس نے مجھ سے اجازت نہیں مانگی تھی اور میں اسے کیسے روک سکتا تھا؟ مجھے تو فرقان ماموں کی فیملی سے ویسے ہی بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں؟" وہ چونکی۔

"کیونکہ وہ سرخ مرچ کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولا تو وہ بے اختیار ہنس دی اور یہ ترکی سے آنے کے بعد پہلی دفعہ تھا، جب وہ یوں پورے دل سے ہنسی تھی۔

"سرخ مرچ کا استعمال ہمیں بھی آتا ہے۔ تم ادھر ہی ٹھہرو، میں ذرا ارم سے فون لے آؤں۔" اور آج تو ویسے ہی ارم کی طرف سے اس کے بہت سے حساب اکٹھے ہو گئے تھے۔

"اچھا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ مسکرا کر کہتا صوفے پہ بیٹھ گیا اور وہ باہر چلی آئی۔

تایا فرقان کے لاؤنج میں سب ہی موجود تھے سوائے ارم اور سونیا کے۔ تایا ابا بہت پر ملال انداز سے نفی میں سر ہلاتے کچھ کہہ رہے تھے، شاید آج والے واقعے کا تذکرہ، جب حیا کو آتے دیکھا۔

"آؤ آؤ بیٹا۔" انہوں نے مسکرا کر اپنے ساتھ صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر سونیا کو آواز دی۔

"سونیا! حیا کی چائے بھی لے آنا۔"

"جی! اچھا ابا!" سونیا نے جواباً کچن سے آواز لگائی۔

"نہیں تایا ابا! میں چائے نہیں پیوں گی، بس اب سونے ہی جا رہی تھی۔" وہ بے تکلفی سے کہتی تایا ابا کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی۔

ان کی گھریلو سیاستیں اور وقتی تند و تیکھی باتیں ایک طرف، تایا فرقان اس سے پیار بھی بہت کرتے تھے اور آج مہوش کی بدتمیزی پہ جہاں وہ دکھی تھے، وہاں انہیں حیا کی قدر بھی آئی تھی۔

''ابا سو گئے تمہارے؟''

''جی، کب کے۔ میں بس ذرا ارم سے فون لینے آئی تھی۔''

''فون، کیوں؟'' تایا ابا بری طرح چونکے۔ صائمہ تائی بھی ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگیں۔

''ارم کو کوئی کال کرنی تھی تو وہ میرا فون لے کر گئی تھی، مگر ابھی مجھے اپنی فرینڈ کو میسج کرنا ہے، سو سوچا فون لے لوں۔'' وہ بہت سادگی سے کہہ رہی تھی۔

تایا کے چہرے کا رنگ فوراً ہی بدل گیا تھا۔ نرمی کی جگہ سختی نے لے لی۔

''ارم...... ارم۔'' انہوں نے بلند آواز میں پکارا۔

''جی ابا!'' وہ دوپٹا سنبھالتی، بھاگتی ہوئی آئی، مگر حیا کو بیٹھے دیکھ کر اس کا رنگ ایک دم سے فق ہوا۔

''حیا کا فون اسے واپس دو۔'' تایا نے اسے کڑی نگاہوں سے گھورتے ہوئے، بڑے ضبط سے کہا۔

''ج...... جی وہ نفضہ کو میسج کرنا تھا تو......'' وہ ہکلا گئی۔ تایا اتنی شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے کہ وہ رکی نہیں۔ الٹے قدموں واپس مڑی، اور چند ہی لمحوں بعد فون لا کر حیا کو تھمایا اور ساتھ ہی ایک کینہ توز نگاہ اس پہ ڈالی تھی، گویا کچا چبا جانا چاہتی ہو۔ وہ جواباً سادگی سے مسکرا دی۔

''تھینک یو، میں چلتی ہوں، آپ لوگ چائے انجوائے کریں۔'' وہ فون لے کر وہاں سے اٹھ آئی اور وہ جانتی تھی کہ اب چائے انہوں نے خاک انجوائے کرنی تھی۔

واپس لاؤنج میں آتے ہوئے اس نے موبائل کا Log چیک کیا۔ میسج اور کال لاگ بالکل کلیئر تھا۔ سارا کال ریکارڈ غائب۔

''ارم کی بچی!'' اسے ارم پہ بے طرح سے غصہ آیا۔ کال ریکارڈز میں موجود تمام نمبرز اس کے پاس محفوظ ہی تھے، البتہ جب وہ ترک فون ریسٹورنٹ میں چھوڑ آئی تھی، بیوک ادا جانے سے قبل، تو اس کے اسی پاکستانی موبائل پہ عبدالرحمٰن پاشا کا فون آیا تھا۔ اس کا نمبر اس نے محفوظ نہیں کیا۔ وہ بس کال لاگ میں پڑا رہ گیا تھا۔ اب وہ مٹ گیا تھا۔ چلو خیر، اس نے کون سا بھی اے آر پی کو کال کرنی تھی۔

جہان صوفے پہ اسی طرح بیٹھا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیسے ملا؟ مرچوں کے استعمال سے؟'' اس کی نگاہیں حیا کے ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ تھیں۔

''نہیں، جہاں شکر کے استعمال سے بات بن جائے ہم وہاں مرچیں ضائع نہیں کرتے۔''

''ویسے پاکستان کے لوگ دل کے بہت ہی اچھے ہیں۔ ایک کزن بغیر پوچھے فون اٹھا لیتی ہے، ایک بہت عزت سے بغیر کھانا کھلائے گھر سے نکالتی ہے اور ایک کھانا بھی نہیں پوچھتی۔''

''او خدایا!'' اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ ''تم نے کھانا نہیں کھایا۔''

''کہاں کھاتا، وہاں تو ابھی لگا ہی نہیں تھا اور یہاں گھر کی دونوں خواتین نے پوچھا ہی نہیں۔'' وہ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی بھاگ کر جلدی سے کچن کی طرف آئی اور فریج کھولا۔

''آج وہاں کھانا تھا تو کچھ بنایا ہی نہیں۔ ہمارے ہاں رات کا سالن اگلے دن کوئی نہیں کھاتا۔ ٹھہرو! میں انڈے بنا لیتی ہوں۔'' سے یاد آیا۔ کھانا تو اس نے بھی نہیں کھایا تھا مگر اسے اتنی بھوک نہیں تھی۔ انڈوں کا خانہ کھولا تو اندر دو ہی انڈے رکھے تھے۔ اسے بے پناہ شرمندگی ہوئی۔

''ان دو انڈوں سے تو کچھ نہیں بنے گا۔'' اس نے خفت سے کہتے ہوئے فریج کا دروازہ بند کیا۔

جہان نے جیسے اس پر افسوس کرتے ہوئے سر نفی میں ہلایا۔

''تمہیں شاید بھول گیا ہے کہ تم استنبول کے بہترین شیفس میں سے ایک سے بات کر رہی ہو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ ادھر کرسی پہ......میں خود بنا لوں گا سب کچھ۔''

اس نے اپنا سلور اسمارٹ فون میز پہ رکھا اور پھر آگے بڑھ کر فریج، فریزر، کیبنٹس، ہر چیز کھول کھول کر الا بلا باہر نکالنے لگا۔ فروزن قیمہ، پاستا کا پیکٹ، جمے مٹروں کا لفافہ، ساسز، سبزیوں کے خانے سے چند سبزیاں چن لیں۔ وہ تمام چیزیں کاؤنٹر پہ جمع کرتا جا رہا تھا۔

''تم اس وقت پاستا بناؤ گے؟'' وہ متعجب سی کرسی پہ بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی تک اپنے سبز فراک پرانڈے اور ٹیکے سمیت بیٹھی تھی اور اسے کپڑے تبدیل کرنا بالکل بھول گیا تھا۔

''ہاں اور مجھے کوکنگ کے درمیان ٹوکنا مت۔ میں بہت برا مانتا ہوں۔'' مسکراتے ہوئے وہ سبزیاں دھو رہا تھا۔ ''اور تمہارا بخار کیسا ہے؟''

''اب ٹھیک ہے۔'' اس نے خود ہی اپنا ماتھا چھوا۔ وہ کل کی نسبت قدرے ٹھنڈا تھا۔

''ویسے مجھے حیرت زاہد ماموں اور ان کے بیٹے پہ ہے۔ اس لڑکی نے اتنی بدتمیزی کی اور انہوں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔'' وہ واقعتاً حیرت سے کہتا سبزیاں کٹنگ بورڈ پہ رکھ کر کھٹا کھٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے۔

''اس کی ایک دن کے بعد رخصتی ہے۔ شاید وہ اس کا دل برا نہیں کرنا چاہتے ہوں گے۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''مگر اس نے بہت مس بی ہیو کیا۔'' وہ افسوس سے کہتا پانی ابلنے کے لیے رکھ رہا تھا۔ دوسری جانب اس نے فرائنگ پین میں ذرا سا تیل گرم ہونے رکھ دیا تھا۔

''اصل میں اس کے فیانسی نے کسی کینیڈین ریلیٹی شو میں ایک ڈیڑھ ملین ڈالر جیتے ہیں، اسی پہ اس کا دماغ ساتویں آسمان پہ ہے اور وہ زمین پہ بغیر دماغ کے گھوم رہی ہے۔'' وہ ٹیک لگائے ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی بتا رہی تھی۔

''کینیڈین شو میں ڈیڑھ ملین ڈالر؟ بہت اچھی کور اسٹوری ہے۔'' اس نے ذرا سا ہنس کر سر جھٹکا۔ ساتھ ہی وہ فرائنگ پین میں فرائی ہوتی سبزیوں کو بجائے کفگیر سے ہلانے کے، فرائنگ پین کا ہینڈل پکڑے دائیں بائیں تو کبھی اوپر نیچے ہلا رہا تھا۔ سبزیاں چند انچ اوپر کو اڑتیں اور پھر واپس پین میں آ گرتیں۔

''کیا مطلب؟'' اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''اگر کسی پاکستانی نے کینیڈین شو میں اتنی خطیر رقم جیتی ہوتی تو میڈیا پہ ہر جگہ آ چکا ہوتا۔ مجھے تو وہ لڑکا شکل سے ہی کریمنل لگ رہا تھا۔ تازہ تازہ آئی بلیک منی کو وائٹ کرنے کے لیے کور بنایا ہے، اور کیا۔''

''اچھا!'' اسے تعجب ہوا۔ اس نہج پہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا، البتہ کریمنل سے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

''جہان! تمہارے ریسٹورنٹ پہ جو حملہ ہوا تھا، اس کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔'' وہ گردن ترچھی کیے، ساس کی بوتل پین میں انڈیل رہا تھا۔ ''حالانکہ میری استنبول میں کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ قوی امکان ہے کہ کسی اور کے دھوکے میں ان لوگوں نے میرا ریسٹورنٹ الٹ دیا۔''

ایک دشمنی تو خیر اب اس کی بن چکی تھی، مگر وہ تو خود بھی اس سے واقف نہیں تھا۔

''تم تو کہتے تھے کہ استنبول میں ایسا کوئی کرائم سین نہیں ہے۔''

''خیر، اب اتنے بھی برے حالات نہیں ہیں اور ڈارک سائیڈ تو ہر بڑے شہر کی ہوتی ہے۔''

وہ چولہے کے سامنے کھڑا، اس کی طرف پشت کیے، پین میں قیمہ بھون رہا تھا۔ قیمے اور شملہ مرچ کی بھینی بھینی، اشتہا انگیز سی مہک سارے کچن میں پھیلنے لگی تھی۔ اس کی گم گشتہ بھوک ایک دم سے جاگ اٹھی۔

''تمہیں پاکستان آ کر کیسا لگا جہان!'' وہ ٹھوڑی تلے مٹھی رکھے اسے دیکھتی سادگی سے پوچھنے لگی۔ یہ یہاں آنے کے بعد ان کی پہلی باقاعدہ گفتگو تھی۔

"اچھا لگا بلکہ بہت اچھا لگا، مگر فرقان ماموں کی باتیں..... میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرے رشتے دار اتنی تیکھی باتیں بھی کر لیتے ہوں گے۔" اس نے جیسے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔ آج وہ سارا دن تایا فرقان کی کمپنی میں رہا تھا تو یہ ردعمل فطری تھا۔

"وہ اتنے تیکھے نہیں ہیں، اور بہت پیار کرتے ہیں ہم لوگوں سے۔ بس ان کے اپنے نظریات ہیں جو اتنے سخت ہیں کہ اگر کوئی ان پر پورا نہ اترے تو وہ اس کی گریڈنگ بہت نیچے کر دیتے ہیں۔"

"واٹ ایور!" وہ اب ابلے پاستا کو پتیلے میں قیمہ اور ساس انڈیل رہا تھا۔ پھر ان کو اچھی طرح مکس کر کے اس نے اسے دم پہ رکھ دیا اور سنک کی ٹونٹی کھول کر ہاتھ دھونے لگا۔ وہ بھی اب وہ اس کے پاس آ کر بیٹھے گا، مگر وہ ہاتھ دھو کر اب سارا پھیلاوا سمیٹنے لگا تھا۔ جھوٹے برتن، سبزیوں کے چھلکے، خالی شاپر۔ وہ جلدی سے اٹھی۔

"میں کر دیتی ہوں۔"

"پلیز تم بیٹھی رہو، جتنی پھوہڑ تم ہو، میں جانتا ہوں۔ اگر تم نے میری مدد کروائی تو دو گھنٹے لگ جائیں گے، جبکہ میں اکیلا کروں تو دو منٹ میں ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، خود ہی کرو۔" وہ قدرے خفگی سے کہتی دوبارہ بیٹھ گئی۔

اور واقعی، اس نے دو، تین منٹ میں ہر چیز اپنی جگہ پہ رکھ دی۔ چند ایک برتن جو پکانے کے دوران میلے ہوئے تھے، وہ دھل کر اسٹینڈ میں لگ گئے اور سلیب چمکا دیے گئے۔ وہ بندہ کمال کا تھا۔

"تم کب سے ریسٹورنٹ چلا رہے ہو؟"

"اب تو بہت عرصہ ہو گیا۔ اچھا۔ میں برتن لگاتا ہوں، تم سلیمان ماموں کو بلا لاؤ، انہوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔"

"ارے ہاں!" وہ ماتھے پہ ہاتھ مارتی اٹھی، پھر نگاہ اس کے سلور اسمارٹ فون پہ پڑی جو میز پہ رکھا تھا۔

"تمہیں پتا ہے۔ ڈی جے کو تمہارا فون بہت پسند تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھی کہ جہان سے کہنا، جب اپنا یہ ایک دو لاکھ کا فون پھینکنا ہو تو سبانجی کے باہر ہی پھینکے۔" وہ اداسی سے مسکرا کر بولی تو وہ ہنس دیا۔

"ویسے یہ اس کے لگائے گئے تخمینے سے کہیں زیادہ مہنگا ہے۔"

"اچھا۔" اسے ذرا حیرت ہوئی۔ "اتنا قیمتی فون کیوں خریدا تم نے؟"

"خریدا نہیں تھا، گفٹ ملا تھا۔ اسپیشل گفٹ" وہ مسکرا کر جیسے کچھ یاد کر کے بولا۔

"کس نے دیا تھا؟"

"سم ون اسپیشل! اچھا جاؤ۔ ابھی ماموں کو بلا لاؤ!" وہ ٹال گیا تو وہ شانے اچکاتی وہاں سے چلی آئی۔ ابا کا دروازہ بجا کر، وہیں سے بلا کر وہ واپس لاؤنج میں آئی تو وہ وہاں میز پہ پلیٹیں اور گلاس رکھ رہا تھا۔ وہ بڑے صوفے پہ بیٹھی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی چلا دیا۔

جس وقت ابا ذرا حیران سے باہر آئے، جہان پاستا کی ڈش اٹھائے کچن سے نکل رہا تھا اور وہ مزے سے اپنے کامدار جوڑے میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی چینل بدل رہی تھی۔

"ابا!" ان کو دیکھ کر جلدی سے اٹھی اور جہان کے ہاتھ سے ٹرے لی۔

"سوری ماموں! ہم نے آپ کو اٹھا دیا۔ آپ نے کھانا نہیں کھایا تھا سو......" ادھورا چھوڑ کر اس نے ان کی طرف پلیٹ بڑھائی۔

"تھینک یو۔" ابا نے قدرے ناسمجھی سے کھانے کو دیکھا اور پھر حیا کو "یہ تم نے بنایا ہے؟"

"نہیں، جہان نے!" وہ مسکراہٹ دبا گئی۔

"ویسے ماموں! یہ اٹالین ریسپی نہیں ہے۔ ذرا دیسی اسٹائل میں بنایا ہے جیسے ممی بناتی ہیں، آپ کو پاستا میں قیمہ پسند ہے نا، ممی نے بتایا تھا مجھے۔"

سلیمان صاحب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اس کو دل توڑنے کا فن آتا تھا تو ٹوٹے ہوئے دلوں کو دوبارہ جوڑ کر انہیں جیتنے کا فن

بھی آتا تھا۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ اسے اب احساس ہوا تھا کہ وہ رف اور مفت سا بندہ تو بھوکا بھی سوجاتا مگر رات کے ایک بجے اگر اس نے اتنا اہتمام کیا تھا تو صرف اور صرف ابا کے لیے، کیونکہ اسے یاد تھا کہ ابا نے کھانا نہیں کھایا اور اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس سے ذرا کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ اور حیا کو خود اب یاد آیا تھا کہ قیمہ والا پاستا ابا کا پسندیدہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس عمل سے جہان نے اپنے اور ابا کے درمیان حائل برف کو پگھلانے کی کوشش کی تھی۔

پاستا بہت مزے کا تھا۔ منہ میں جاتے ہی گھل جانے والا۔ سلیمان صاحب نے تعریف نہیں کی، مگر ان کے چہرے سے ظاہر تھا کہ انہیں اپنا یوں خیال کیا جانا اچھا لگا تھا۔ وہ خود بھی بہت شوق سے کھا رہی تھی۔ ڈی جے کے بعد یہ پہلا کھانا تھا، جو اس نے دل سے کھایا تھا۔

''قونیا میں دو لڑکیوں کا اغوا۔''

ٹی وی اسکرین پہ بی بی سی چل رہا تھا، اور جو خبر نیوز کاسٹر نے پڑھی، اس پہ ان تینوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ کونیا ترکی کا شہر تھا۔ جلال الدین رومی کا شہر۔

جہان نے بجلی کی تیزی سے ریموٹ اٹھایا اور چینل بدل دیا۔

''کیا کہا اس نے..... کونیا؟'' ابا جو ہاتھ روک کر اسکرین کو دیکھنے لگے تھے، چینل تبدیل ہونے پہ الجھ کر جہان کو دیکھا۔ وہ سادگی سے مسکرا دیا۔

''نہیں، کونیا نہیں، اس نے کہا تھا کینیا..... اور لیں نا!''

وہ ریموٹ ایک طرف رکھ کر انہیں پھر سے سرو کرنے لگا۔ ابا نے ذرا تذبذب سے سر ہلایا، گویا وہ اپنی سماعت کے دھوکا دینے پہ الجھے ہوئے تھے۔ حیا نے جہان کو دیکھا اور جہان نے اسے، پھر دونوں زیر لب مسکرا دیے۔

ابھی وہ ابا کے سامنے ترکی کا امیج سبوتاژ ہوتا دیکھنے کے متحمل نہیں تھے۔

☆ ☆ ☆

بارات کے لیے وہ میرج ہال کے جانب رواں دواں تھے۔ ابا ڈرائیو کر رہے تھے اور آج وہ خاموش نہیں تھے بلکہ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھے جہان کو سڑک کے اطراف میں گزرتی جگہوں کے بارے میں مختصر فقروں میں آگاہی دے رہے تھے۔ وہ بھی جواباً کوئی مختصر سا جواب دے دیتا تھا۔ وہ آج بھی اتنا ہی کم گو تھا، جتنا دو روز قبل، مگر وہ برف کی دیوار پگھل گئی تھی۔

وہ پچھلی نشست پہ بیٹھی لاتعلق سی باہر دیکھ رہی تھی۔ اسے ڈی جے کے بغیر یوں ان خوشی کی تقاریب میں شرکت کرنا سخت برا لگ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر احساس جرم کا شکار تھی۔ ابھی اسے بچھڑے دن ہی کتنے ہوئے تھے، مگر مجبوری تھی۔ جانا تو تھا۔ وہ آج بھی خاص تیار نہیں ہوئی تھی۔

کاجل اور نیچرل لپ اسٹک کے علاوہ کوئی میک اپ نہیں کیا، بال یونہی کھلے چھوڑ دیے۔ جیولری بھی نہیں پہنی۔ ضرورت بھی نہیں تھی کہ اس کی لمبی، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی قمیص کے گلے پہ کافی کام تھا۔ وہ شیفون کی قمیص تھی، اور اس کا رنگ آلو بخارے کے چھلکے کا سا تھا۔ قمیص کا گلا گردن تک بند تھا اور گردن سے لے کر دو بالشت نیچے تک سیاہ اور آلو بخارے کے رنگ کے چھوٹے بڑے ہر سائز کے Diamonties (نگ) لگے تھے۔ ان کی جھلملاہٹ بہت خوب صورت تھی۔ نیچے ہم رنگ سلک کا پاجامہ تھا اور آستینیں کلائیوں تک آتی چوڑی دار تھیں۔ لیکن آج بھی اسے کل کی طرح اپنے لباس کی خوب صورتی سے قطعاً دلچسپی نہ تھی۔

میرج ہال کے باہر بارات ابھی ابھی اتری تھی۔ داخلی دروازے پہ خاصا رش تھا۔ سجی سنوری، زیورات، قیمتی ملبوسات اور خوشبوؤں میں رچی بسی لڑکیاں اور خواتین گاڑیوں سے نکل کر، اپنے بال اور میک اپ ٹھیک کرتی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ رضا اور زاہد چچا وہاں کھڑے خوش اخلاقی سے مسکراتے مہمانوں کو ویلکم کر رہے تھے۔ اسے پتا تھا کہ مہوش کی کل والی بات کو آج بھلا کر سب شادی میں شرکت کریں گے اور واقعی یہ ہو رہا تھا۔

کار رکنے پر اس نے دروازہ کھولا اور باریک ہیل باہر پتھریلی زمین پہ رکھی۔ بے اختیار اسے اپنی ٹوٹی ہوئی سرخ ہیل یاد آئی۔ سر

جھٹک کر وہ باہر نکلی اور پرس سنبھالتے ہوئے دروازہ بند کیا۔ ابا، جہان اور اماں ایک ساتھ میرج ہال کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے اور وہ بھی وہیں چلی جاتی اگر جو اس کے پاؤں پہ وہ پتھر آ کر نہ لگتا۔

''آؤچ!'' اس نے کراہ کر پیر ہٹایا۔ وہ بجری کا چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ مخالف سمت سے آیا تھا، جہاں پارکنگ میں گاڑیاں کھڑی تھیں اور کسی نے بہت تاک کر اسے مارا تھا۔ ان گزرے تین چار ماہ میں اسے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ اتفاقات نہیں ہوتے تھے۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے اس سمت دیکھا اور پھر ٹھہر سی گئی۔ پارکنگ کے پیچھے سے ایک ہیولا سا نکلا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔ چند لمحے تو وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی۔

رات کی تاریکی میں پارکنگ ایریا کو اونچے پولز کی زرد بتیوں نے مدھم سی روشنی بخش رکھی تھی۔ اس روشنی میں وہ صاف دکھائی دے رہا تھا یا دے رہی تھی۔

بھڑکتا ہوا نیلا زرتار دوپٹہ ہم رنگ جوڑے کے اوپر پہنے، وہ دوپٹے کا پلو چہرے پہ ذرا سا ڈالے، اسے دانتوں سے یوں پکڑے ہوئے تھا کہ دور سے اس پہ کسی عورت کا گمان ہوتا تھا۔ چہرے کو سفید پینٹ کیے، گہرے آئی میک اپ، سرخ چونچ سی لپ اسٹک اور سنہرے بالوں کی وگ لگائے، وہ اس کی طرف چلتا آ رہا تھا۔ وہ اسے ایک نظر میں ہی پہچان گئی تھی۔

''پنکی!''

اس نے ہراساں نگاہوں سے گردن موڑ کر دور ہال کی طرف کو دیکھا۔ ابا کی اس کی جانب پشت تھی۔ وہ واپس مڑی، تب تک وہ قریب آ چکا تھا۔

''کیسی ہو باجی جی؟'' وہ مسکرایا تھا۔

''تم...... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے سراسیمگی سے اسے دیکھتے اپنے پرس پہ گرفت مضبوط کر لی، گویا ذرا بھی وہ آگے بڑھا تو وہ بھاگ اٹھے گی۔

''آپ سے ملنے آئی تھی جی! پنکی کہتے ہیں مجھے۔ یاد ہے جی؟'' وہ مسکرا کر بولا۔

''اچھی طرح یاد ہے اور بھولی تو تمہاری ماں اور بہن بھی نہیں ہوں گی! اب ہٹو میرے راستے سے۔''

''غصہ کیوں کر رہی ہو جی! میں تو آپ کو کچھ بتانے آئی تھی۔''

''مائی فٹ! مسئلہ کیا ہے آپ کو میجر احمد؟'' وہ پیر پٹخ کر بولی۔ ''اتنے باوقار عہدے پہ فائز ہو کر کیسی حرکتیں کر رہے ہیں آپ؟''

''لو جی...... میں تو ڈولی کا پیغام دینے آئی تھی مگر......''

''کیسا پیغام؟'' وہ اسی رکھائی سے بولی۔

''ڈولی کی حالت امید بخش نہیں ہے، پتا نہیں کتنے دن جی پائے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' وہ ذرا چونکی۔

''خود چل کر دیکھ لیجیے۔ آئیے! میں آپ کو لے جاتی ہوں۔''

''نہیں نہیں، مجھے کہیں نہیں جانا۔'' وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

''ایک دفعہ تو اس سے مل لیں، اس نے کچھ بتانا ہے آپ کو۔''

''مجھے کچھ نہیں جاننا۔ تم لوگوں کی ساری معلومات مجھے اے آر پی کی ماں سے مل گئی تھیں۔'' تلخی سے کہتے ہوئے اس نے پھر سے پلٹ کر دیکھا۔ بارات کے مہمان اندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

''ہو سکتا ہے کچھ ایسا ہو، جو اس کی ماں کو بھی نہ پتا ہو۔''

''کیا؟'' وہ چونکی، پھر بغور پنکی کو دیکھا۔ اس کے اونچے قد کے سوا کوئی چیز اس روز جناح سپر کی شاپ میں ملنے والے اس اسمارٹ، گلاسز والے نوجوان کا پتا نہیں دیتی تھی۔ پنکی کا تو چہرہ بھی جلا ہوا نہیں لگتا تھا مگر نہیں...... اس کا چہرہ تو سلیٹ کی طرح چپٹا تھا۔ ایسی

جعلی جس نے سب نقش چھپا دیے ہوں۔ خدایا! کیسے یہ لوگ اپنے چہرے بدل لیتے تھے۔ مگر آنکھیں...... وہ چونکی یہ آنکھیں وہی تھیں۔ وہی گلاسز کے پیچھے سے جھلکتی آنکھیں۔ اب آئی شیڈو کی چمکیلی تہہ کے باوجود انہیں پہچان گئی تھی۔

''اس بات کا جواب تو بس ڈولی کے پاس ہے جی اور اس نے مجھے یہی آپ کو بتانے کا کہا تھا۔ سہیلی کی دوستی نبھا رہی ہوں میں تو جی اور نہ میری جوتی کو بھی شوق نہیں ہے۔ آپ جیسی بدزبان خاتون کے منہ لگنے کا۔''

چڑ کر کہتے ہوئے اس نے دوپٹے کے اندر چھپے ہاتھ باہر نکالے۔ اس میں ایک چھوٹا سا لکڑی کا ڈبا تھا۔

''یہ ڈولی نے بھیجا ہے۔ اسے اسی طریقے سے کھولیے گا جو اس پہ لکھا ہے، مگر جب تک آپ اسے کھول پائیں گی، وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔''

حیا نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں پکڑے اس ڈبے کو دیکھا۔ اس کی کلائی پہ وہی کانٹے کا سرخ بھورا سا نشان تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے اچنبھے سے سر اٹھا کر پنکی کو دیکھا۔ وہ کہاں کھڑی ہے، اسے لمحے بھر کو بالکل بھول گیا تھا۔

''یہ ایک پہیلی سے کھلے گا، مگر یہ پہیلی صرف آپ ہی بوجھ سکتی ہیں اور آپ بوجھ ہی لیں گی۔ یہ بہت آسان ہے، لیکن اس کے اندر موجود چیز نکالنے کے لیے اسے توڑنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ اسے توڑ دیا تو وہ چیز آپ کے کام کی نہیں رہے گی۔'' پنکی نے مسکرا کر کہتے ہوئے ڈبا اس کے مزید سامنے کیا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تھام لیا۔

''اچھا باجی جی! رب راکھا۔'' وہ وہی خواجہ سراؤں والا لہجہ بنا کر بولتا، سلام جھاڑ کر دوپٹہ منہ پہ ڈالے پلٹ گیا۔

اس نے جلدی سے ڈبا پرس میں رکھا اور پیشانی پہ نمودار ہوئے پسینے کے قطرے ٹشو سے تھپتھپائی، خود کو کمپوز کرتی ہال کی جانب بڑھ گئی۔

بارات کا فنکشن ویسا ہی تھا، جیسا کسی بھی شاندار شادی کا ہونا چاہیے۔ بقعہ نور بنا ہال، بہترین سجاوٹ، دلہن کا قیمتی ڈیزائنر سوٹ اور جیولری، مہوش کی ننھیالی کزنز کے گروپ ڈانسز، اور پر تکلف طعام کی اشتہا انگیز خوشبو جو ابھی کھلا نہیں تھا۔ آج بھی مرد و خواتین اکٹھے تھے مگر یوں کہ آدھے ہال میں مرد اور باقی آدھے کی میزوں پہ خواتین براجمان تھیں تا کہ ایک حد تک علیحدگی رہے۔ ان کی فیملی کی کسی بھی لڑکی نے رقص میں حصہ نہیں لیا مگر مہوش کی کزنز ہر طرف چھائی رہیں۔

وہ آج بھی ایک الگ تھلگ کونے والی میز پہ بیٹھی رہی۔ اس کا دل اسٹیج پہ جا کر موودی بنوانے کو قطعاً نہیں چاہ رہا تھا۔ اس شریفوں کے مجرے نے اُسے ایسا احساس عدم تحفظ بخشا تھا کہ وہ کسی بھی دوسرے کے کیمرے یا موبائل میں تصویر کھنچوانے سے احتیاط برت رہی تھی۔ یہ مووویز اور تصاویر کہاں کہاں نہیں گھومتی ہوں گی۔ اس نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔

اتنے بڑے ہال میں کوئی بھی اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ وہ ویسے بھی اس میز پہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے چند لمحے کے لیے سوچا، پھر میز پہ رکھے پرس سے وہ ڈبا نکالا اور فانوس کی چکا چوند روشنی میں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

وہ ایک ہاتھ جتنا لمبا اور پانچ انچ موٹا مستطیل ڈبا تھا۔ ڈبہ نہ بہت بھاری تھا، نہ بہت ہلکا۔ وہ گہری بھوری لکڑی کا بنا تھا اور اس کے ڈھکن کے علیحدہ ہونے کی جگہ پر چھ خانے بنے تھے۔ جس کے اندر A لکھا نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک A پہ انگلی رکھ کر نیچے کو رگڑا تو A نیچے چلا گیا اور B سامنے آ گیا۔ وہ اسے نیچے کرتی گئی۔ ان چھ خانوں میں پوری انگریزی کے حروف تہجی لکھے تھے۔ جیسے عموماً بریف کیسز پہ ایسی اسٹرپس لگی ہوتی ہیں جو تین زیرو پہ کھل جاتی ہیں، ویسے ہی اس باکس کو کھولنے کے لیے کوئی چھ حرفی لفظ سامنے لانا تھا۔

پنکی نے کہا تھا کہ اسے کھولنے کا طریقہ اس ڈبے پہ لکھا ہوا ہے۔ اس نے ڈبے کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور لحظہ بھر کو ٹھٹھکی۔ اسے ڈھکن کی اوپری سطح پر کچھ کھدا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ چہرہ ڈبے پہ جھکائے آنکھیں سکیڑ کر پڑھنے لگی۔ وہ بہت باریک انگریزی میں لکھا ایک فقرہ تھا۔

"Into the same river, no man can enter twice! "

(ایک ہی دریا میں کوئی شخص دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔)

"Into the same river, no man can enter twice!" اس نے الجھن بھرے انداز میں وہ فقرہ دہرایا۔ کیا یہی وہ پہیلی تھی، جس کا ذکر پنکی نے کیا تھا؟ مگر یہ پہیلی تو نہیں لگتی تھی۔ اس میں تو کوئی سوال نہ تھا۔ بس ایک سادہ سا فقرہ تھا۔

''السلام علیکم حیا!''

آواز پہ اس نے کرنٹ کھا کر گردن اٹھائی اور ساتھ ہی گود میں رکھے ڈبے پہ دوپٹا ڈالا۔

سامنے شہلا کھڑی تھی۔ سیاہ عبایا کے اوپر سبز اسکارف کا نقاب انگلیوں سے تھامے، اپنے ازلی نرم انداز میں مسکراتے ہوئے۔

''وعلیکم السلام شہلا بھابھی! کیسی ہیں آپ؟ آئیں بیٹھیں۔'' وہ ذرا سنبھل کر اٹھی اور جلدی سے ڈبا پرس میں ڈال کر ان سے گلے ملی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، مجھے علم نہیں تھا کہ تم آئی ہوئی ہو۔'' وہ رسان سے کہتی ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی۔ ''پھر ابھی فاطمہ پھپھو نے تمہاری فرینڈ کا بتایا..... رئیلی سوری فار ہر۔''

ڈی جے کے ذکر پہ اس کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ پھر سے افسردہ ہو گئی۔

''پتا نہیں شہلا بھابھی! اللہ تعالیٰ کی کیا مرضی تھی۔ میری ایک ہی دوست تھی ترکی میں اور وہ میری تمام دوستوں سے بڑھ کر ہو گئی تھی۔ بہت دعا کی میں نے اس کے لیے، مگر کوئی دعا قبول نہیں ہوئی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ لبوں پہ آ گیا۔

''اللہ تمہیں صبر دے گا۔ ہم سب ہیں نا تمہارے ساتھ۔'' شہلا نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔ ''سبین آنٹی کا بیٹا بھی آیا ہے؟''

''جی، وہ ادھر ہے'' اس نے نگاہوں کا زاویہ موڑا تو شہلا نے تعاقب میں دیکھا۔

اسٹیج کے قریب وہ سلیمان صاحب کے ساتھ کھڑا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس اس کی مقناطیسی شخصیت بہت شاندار لگ رہی تھی۔ سلیمان صاحب اس کے شانے پہ ہاتھ رکھے کسی سے اس کا تعارف کروا رہے تھے اور وہ دھیمے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ آج وہ اس کے ساتھ اتنے مطمئن اور مسرور لگ رہے تھے گویا روحیل واپس آ گیا ہو۔

''بہت اچھا ہے ماشاء اللہ۔''

''تھینکس۔'' وہ لمحے بھر کو جھجکی۔ ''شہلا بھابھی! ایک بات کہوں۔ آپ کی ساس نے آپ کی اتنی خوبصورت بری بنائی تھی اور آج بھی آپ نے ان ہی میں سے کوئی سوٹ پہنا ہوگا، اس طرف تو عورتیں ہی ہیں۔ آپ کا عبایا..... میرا مطلب ہے، آپ کے کپڑے تو نظر ہی نہیں آ رہے۔'' وہ رک رک کر ہچکچاتے ہوئے بولی تھی۔ داور بھائی کی مہندی پہ اس نے بہت کھنک دار لہجے میں شہلا کو نقاب اتارنے کے لیے کہا تھا مگر آج اس کی آواز سے وہ کھنک مفقود تھی۔

جواباً شہلا بہت تھکن سے مسکرائی تھی۔

''کیا فرق پڑتا ہے حیا! اتنے مردوں کو اپنے کپڑے دکھا کر مجھے کیا مل جائے گا؟''

''تو نقاب ہی اتار دیں۔'' اس کا لہجہ بہت کمزور تھا۔ اس نے نقاب ڈھیلا بھی نہیں کیا۔ حیا نے پھر نہیں کہا۔ اس سے کہا ہی نہیں گیا۔

وہ تو خود دل سے نہیں چاہتی تھی کہ شہلا نقاب اتار دے۔ وہ تو بس اس کا جواب سننا چاہ رہی تھی۔ اسے شریفوں کے مجرے کا وہ منظر اچھی طرح سے یاد تھا، جب سنہری اور چاندی کی محو رقص پریوں کے پیچھے کرسی پہ ترچھی ہو کر بیٹھی کسی آنٹی سے بات کرتی شہلا نظر آ رہی تھی، مگر نقاب میں ہونے کے باعث اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ سو اس کے حصے میں وہ بدنامی نہیں آئی، جو ان دونوں کے نصیب میں آئی تھی مگر آج وہ اتنی پژمردگی اور تھکان سے کیوں مسکرائی تھی..... یوں جیسے اس کا دل اندر تک زخمی ہو۔ وہ دکھ، وہ تھکن، وہ زخمی نگاہیں۔ اسے کسی نے پکار لیا اور وہ اٹھ کر چلی گئی مگر حیا کی نگاہیں کافی دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

پچھلی دفعہ اسے شہلا کو عبایا میں دیکھ کر عجیب کوفت بھرا احساس ہوا تھا مگر آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی ان دکھ بھری آنکھوں میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ شہلا کو کیا غم تھا۔ اتنی اچھی فیملی میں شادی ہوئی۔ اتنا ہینڈسم شوہر، امیر کبیر، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا پھر..... پھر اسے کیا دکھ تھا؟ وہ پھر سارا فنکشن یہی سوچے گئی۔

☆ ☆ ☆

آدھی رات گئے اپنے کمرے میں بیٹھے وہ پھر سے اس ڈبے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جہان، ڈولی، پنکی، احمد، پاشا مگر انگریزی میں یہ سارے نام پانچ حرفی تھے۔ چھٹا حرف نہیں ملتا تھا۔ وہ بار بار اس سطر کو پڑھے گئی مگر کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ مگر وہ کون سا شخص تھا، جس

کے پاس ایسے ہر محنت طلب مسئلے کا حل ہوتا تھا؟

وہ ڈبا لیے بھاگ کر باہر آئی۔ جہان کچن میں کھڑا کاؤنٹر پہ گلاس رکھے پانی کی بوتل اس میں انڈیل رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے آئی اور باکس اس کے ساتھ رکھا۔

''یہ مجھے کسی نے دیا ہے اور مجھے اس کا پاس ورڈ نہیں معلوم اسے کھول دو۔''

وہ آواز پہ چونکا، پھر بوتل رکھ کر ڈبا اٹھایا۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ ذرا اچھنبے سے اسے پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''جو بھی ہے، تم اسے کسی طرح کھول دو۔''

''ہوں! کھل جائے گا نو پرابلم۔'' وہ ڈھکن اور ڈبے کی بند دراز پہ انگلی پھیر کر کچھ محسوس کر رہا تھا۔ ''تم مجھے ایک بڑا چھرا اور ایک ہتھوڑا لا دو۔''

''افوہ! توڑنا نہیں ہے اسے بلکہ تم تو رہنے ہی دو۔'' اس نے خفگی سے ڈبا اس کے ہاتھ سے واپس لے لیا۔

''کیا ہوا؟ میں کھول تو رہا تھا، ایک منٹ مجھے دیکھنے تو دو۔''

''میں خود کرلوں گی، تم رہنے دو۔ تم میرے لیے کچھ نہیں کرتے۔'' پتا نہیں وہ کس بات پہ اس سے خفا تھی جو جھنجھلا کر بولی۔

''پھر سوچ لو۔ میں تو ابھی ماموں کے پاس جا رہا تھا انہیں تمہیں دوبارہ استنبول بھیجنے کے لیے راضی کرنے مگر ٹھیک ہے، میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرتا۔'' وہ شانے اچکا کر پانی پینے لگا۔

''سچ؟'' اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکائیں۔ ''تم انہیں منا سکتے ہو؟''

''میں ایک اچھا شیف اور اچھا مکینک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا وکیل بھی ہوں۔ ٹرائی می!'' وہ گلاس رکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

''ابا ایک دفعہ اڑ جائیں تو کبھی فیصلہ نہیں بدلتے۔ تم انہیں کیسے مناؤ گے؟''

''ویسے تو تمہارا دوبارہ استنبول جانا میرے مفاد میں قطعاً نہیں ہے کیونکہ اب تم ہر ٹورسٹ اٹریکشن دیکھنے جانے کے لیے مجھے ہی خوار کرواؤ گی، مگر مجھے لگا تم جانا چاہتی ہو۔ سو میں ماموں سے بات کرنے ہی جا رہا تھا اور وہ مان جائیں گے۔ بروقت کونیا کو کینیا نہ بناتا تو شاید وہ کبھی نہ مانتے۔''

''ہاں استنبول تو بہت محفوظ شہر ہے اور پاکستان میں تو روز بم دھماکے ہوتے ہیں اور پاکستان میں تو پتا نہیں لوگوں کے پاس انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے بھی یا نہیں!'' وہ ذرا جل کر بولی۔ وہ بنا کچھ کہے مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اگلا ایک گھنٹہ وہ کچن میں کرسی پہ بیٹھی جہان کا انتظار کرتی رہی۔ بالآخر جب وہ ابا کے کمرے سے نکلا تو وہ تیزی سے اٹھی۔

''کیا ہوا؟''

''پیکنگ کر لو۔ ہم کل صبح کی فلائٹ سے واپس جا رہے ہیں۔'' وہ دھیما مسکرا کر بولا۔ ''مگر اس شرط پہ کہ فی الحال تو تم ہمارے ساتھ رہو گی، بعد میں جب تمہاری اسپرنگ بریک ختم ہو جائے تو بے شک چلی جانا۔''

''سچ!'' وہ بے یقینی و خوشگوار حیرت میں گھری اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک طمانیت بھرا احساس اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا۔

البتہ ایک بات وہ جانتی تھی۔ استنبول ڈی جے کے بغیر کبھی بھی ویسا نہیں ہوگا جیسا پہلے تھا۔

☆ ☆ ☆

''تمہارا دماغ درست ہے؟''

ہاشم نے بے یقینی سے اپنی بیوی کو دیکھا، جو بستر کے دوسرے کنارے پہ بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں کے درمیان حارث آنکھیں موندے سو رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ہاشم کے ہاتھ میں تھا۔

''ایسا کیا غلط کہہ دیا ہے میں نے؟'' وہ جی بھر کر کوفت کا شکار ہوئی۔

''تم پاگل ہوگئی ہو، تمہارے حواس جواب دے گئے ہیں۔'' حیرت کی جگہ اب جھنجھلاہٹ نے لے لی تھی۔

''حواس تو تمہارے جواب دے گئے ہیں۔ میں تمہیں ایک سیدھا سادا ساحل بتا رہی ہوں اس سارے مسئلے کا۔ تم روز کے چوبیس گھنٹے بھی کام کرو تو اس رقم کے آدھے لیراز بھی اکٹھے نہیں ہوں گے، جو ہمیں حارث کی سرجری کے لیے چاہئیں۔ اور ایسے مت دیکھو مجھے۔'' آخر میں وہ خفا ہو کر بولی۔

''عبدالرحمٰن مجھے جان سے مار دے گا۔ وہ اس کی لڑکی ہے۔''

''اور عبدالرحمٰن کو بتائے گا کون؟ وہ تو مہینہ بھر پہلے ہی انڈیا چلا گیا تھا۔ تم نے خود ہی مجھے بتایا تھا۔'' وہ چمک کر بولی۔ نیم روشن کمرے میں سبز بلب کی مدھم روشنی اس کے چہرے کو عجیب سا تاثر دے رہی تھی۔

''وہ انڈیا گیا ہے، مر نہیں گیا، جو اسے کبھی پتا نہیں چلے گا۔ وہ مجھے جان سے مار دے گا سلمیٰ۔''

''تو پھر تم اپنی جان سنبھال کر بیٹھے رہو اور حارث کو مرنے کے لیے چھوڑ دو۔'' غصے سے کہتی اٹھ کر چادریں تہہ کرنے لگی۔

''سلمیٰ...... میں ایسا نہیں کر سکتا۔'' اب کے وہ قدرے تذبذب سے بولا تھا۔

''تو تم کر کیا سکتے ہو؟ اور کیا کیا ہے تم نے حارث کے لیے؟''

''میرا بیٹا مجھے بہت پیارا ہے۔'' اس نے سوتے ہوئے حارث پہ ایک نظر ڈالی۔ ''مگر وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے۔''

''میں بھی تو کسی کی بیٹی تھی، مجھے اس ڈربے میں لا کر پل پل مارنے سے پہلے تم نے سوچا؟'' وہ چادر کا گولا بنا کر ایک طرف پھینکتی جارحانہ انداز میں اس کی طرف آئی۔ ''تم مرد ہو کر ڈرتے کیوں ہو؟''

''تم عبدالرحمٰن کو نہیں جانتیں۔''

''میں بس اتنا جانتی ہوں کہ اگر میرا بیٹا مر رہا ہے تو اس کا ذمہ دار عبدالرحمٰن پاشا ہے۔ اگر وہ تمہیں تمہاری مطلوبہ رقم دے دیتا تو ہم کبھی یہ کرنے کا نہ سوچتے۔ کوئی کمی تو نہیں ہے اس کو پیسے کی، پھر بھی اس نے ہاتھ روک کر رکھا ہوا ہے۔ اب یا تو تم اس کا خیال کر لو، یا اپنے بیٹے کا۔ فیصلہ تمہارا ہے۔'' سلمیٰ کے نقوش مدھم روشنی میں بگڑے بگڑے دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت یوں تیز تیز بولتی وہ سیک بتھ کی چوتھی جادوگرنی لگ رہی تھی۔

ہاشم متذبذب سا اسے دیکھے گیا۔ وہ جو کہہ رہی تھی وہ اتنا مشکل تو نہ تھا مگر......

☆ ☆ ☆

وہ جہان کے ساتھ سیدھی اس کے گھر آئی تھی، پھر کھانا کھا کر اس نے اجازت چاہی۔ اس کا سارا سامان سبانجی کے ڈورم میں رکھا تھا اور جس افراتفری میں وہ گئی تھی، سوائے چند چیزوں کے کچھ بھی انہیں اٹھایا تھا۔ پھپھو نے اصرار کیا کہ وہ چھٹیاں ختم ہونے تک ان کے پاس رک جائے مگر وہ کل آنے کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں تو پھر کہوں گی کہ رک جاؤ۔'' پھپھو ذرا خفا تھیں۔

''پھپھو! میں کل آؤں گی ناں پرامس۔ اب چلتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے مگر کل ضرور آنا۔'' جہان ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں اور ناک گلابی پڑ چکے تھے۔ سرد و گرم علاقوں کے مابین سفر کا موسمی اثر تھا کہ استنبول پہنچتے پہنچتے اس کا فلو بخار میں بدل گیا تھا۔

''آؤ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔''

''صرف تاقسم تک چھوڑنا۔ آگے میں گورسل پکڑ لوں گی۔''

''میں سبانجی تک چھوڑ دوں گا، نو پرابلم۔'' وہ چابی پکڑے، جیکٹ پہنتے ہوئے بولا۔

''نہیں اس بخار میں تم سے پینتالیس منٹ کی ڈرائیونگ کروائی تو پینتالیس دن تک تم جتاتے رہو گے۔ ویسے بھی مجھ پہ تمہارے

احسان بہت جمع ہو گئے ہیں، اتنے سارے، کیسے اتاروں گی؟'' وہ اس کے سامنے سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''اتارنے کے لیے کس نے کہا ہے۔''

وہ ذرا سا مسکرا کر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اس کی پشت کو دیکھے گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہان کا رویہ اس کے ساتھ نرم پڑتا جا رہا تھا۔ پاکستان میں پہلے دو دن تو وہ لاتعلق رہا، شاید اس لیے کہ دونوں کو ٹھیک سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا مگر پھر اس نے خود ہی کچھ محسوس کیا تھا، تب ہی وہ خود آگے بڑھا اور ان کے درمیان کھڑی سرد دیوار ڈھا دی لیکن کیا وہ اس کے لیے وہ محسوس کرتا تھا، جو وہ اس کے لیے کرتی تھی؟ کیا اسے ان کا وہ بھولا بسرا رشتہ یاد تھا جس کے متعلق اس گھر میں کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ ابھی کچھ دن وہ اس کے گھر رہے گی تو ان سارے سوالوں کے جواب جاننے کی کوشش ضرور کرے گی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

تاقسم اسکوائر کا مجسمہ آزادی اسی طرح تھا، جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ مجسمے کے گرد گول چکر میں اگی گھاس پہ سرخ سفید اور زرد ٹیولپس کھلے تھے۔ ہر جگہ سالانہ ٹیولپ فیسٹول کے پوسٹرز بھی لگے تھے، جو ہر سال کی طرح اس موسم بہار میں بھی استنبول میں منعقد ہونا تھا۔ ٹیولپ کا پھول استنبول کا ''سمبل'' تھا، مگر ان کی دلفریب مہک میں ڈوبا تاقسم اسکوائر حیا کو خزاں آلود لگا تھا۔ وہ بہار اب وہاں نہیں تھی، جیسے ڈی جے نہیں تھی۔

''تم جا رہی ہو، حالانکہ میں چاہتا تھا کہ تم کچھ دن ہمارے گھر رہو۔'' گاڑی روکتے ہوئے جہان نے چہرہ اس کی طرف موڑے سنجیدگی سے کہا تھا۔

''میں کل آ جاؤں گی مگر کل تک میں سبانجی، اپنا ڈورم بلاک، جھیل اور ہر جگہ جہاں میں اور ڈی جے اکٹھے گئے تھے، ایک دفعہ پھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اکیلے، بالکل اکیلے..... میں ان بیتے لمحوں میں پھر سے جینا چاہتی ہوں۔''

''مت کرو۔ تمہیں تکلیف ہو گی۔''

''بہت تکلیف سہہ لی، اب اس سے زیادہ تکلف مجھے نہیں مل سکتی۔'' اس نے بھیگی آنکھ کا کونا انگلی کی نوک سے صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اوکے!'' اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پہ ابھی تک نقاہت تھی۔ وہ واقعی بیمار لگ رہا تھا۔

جہان چلا گیا اور وہ مجسمہ آزادی کے گرد اگی گھاس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ گھاس کا گول قطعہ اراضی دراصل یوں تھا، جیسے کوئی چپٹا رکھا گول سا سبز پھول ہو، جس کی سبز پتیاں بنی ہوں، اور ہر دو پتیوں کے درمیان ایک سیدھی روش تھی جو مجسمے تک لے جاتی تھی۔ یوں چار گزرگاہیں مجسمے تک لے کر جاتی تھیں!

تاقسم کے ہر پھول، ہر پتھر اور ہر بادل پہ جیسے یادیں رقم تھیں۔ وہ اس کا اور ڈی جے کا زیرو پوائنٹ تھا۔ مین اسٹاپ۔ تقریباً ہر دوسرے روز وہ ادھر آتی تھیں۔ گورسل انہیں یہیں جو اتارا کرتی تھی۔ یہاں سے آگے وہ عموماً میٹرو ٹرین پکڑ لیا کرتی تھیں۔ اس اسکوائر کا چپہ چپہ انہیں یاد تھا اور ڈی جے کے بغیر سب کچھ ادھورا تھا۔

اور اس طرف استقلال اسٹریٹ تھی۔ وہاں سے کی گئی ان کی ڈھیروں شاپنگ جو رائیگاں چلی گئی۔ استقلال اسٹریٹ آج بھی وہی تھی، بہت طویل، نہ ختم ہونے والی..... مگر زندگی ختم ہو گئی تھی۔

گورسل کی کھڑکی کے شیشے کے پار وہ باسفورس کا عظیم الشان سمندر دیکھ رہی تھی۔ وہاں سے ایک فیری گزر رہا تھا۔ اسے یاد تھا جب پہلی دفعہ ان دونوں نے اسی جگہ پل پار کرتے ہوئے نیچے فیری تیرتا دیکھا تھا تو وہ تو خوشی اور جوش سے پاگل ہی ہو گئی تھیں۔ وہ کبھی بحری جہاز میں نہیں بیٹھی تھیں اور صرف اسے دیکھ کر ہی وہ پرجوش ہو گئی تھیں، پھر فیری وہیں رہ گیا اور زندگی ختم ہو گئی۔

دوپہر کی ٹھنڈی ٹھنڈی دھوپ سبانجی کے در و دیوار پہ پھیلی تھی۔ ڈورم بلاکس تقریباً ویران پڑے تھے۔ اسپرنگ بریک ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں اور اسٹوڈنٹس اپنے اپنے ٹورز پہ تھے۔ اسے کسی کو اطلاع دینے کا ہوش ہی نہیں تھا، مگر پاکستان روانگی والے دن جانے والے کو کسی نے بتایا اور پھر سب کے فون آنے لگے تھے۔ معتصم، حسین، ٹالی، سارہ، لطیف، انجم باجی سب اسے برابر فون کرتے رہے تھے، مگر وہ

سب یقیناً ابھی واپس نہیں آئے تھے۔

وہ اپنے ڈورم بلاک کا گول چکر کھاتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جب وہ سبانجی آئی تھیں تو ان زینوں پہ برف جمی ہوتی تھی۔ اب وہ برف بہار لے گئی تھی۔ اس نے گردن اوپر اٹھا کر بالکونی کے بلب کو دیکھا اور پھر ادا سی سے مسکرا دی۔ کتنا ڈر گئے تھے وہ اپنے پہلے دن جب یہ بلب خود بخود جل اٹھا تھا کہ پتا نہیں یہاں کون سے جن بھوت ہیں۔

"نکلے ہم وہی، پاکستان کے پینڈو۔" ہالے کے یہ بتانے پر کہ یہ ٹیکنالوجی کا کرشمہ، ڈی جے اس کے جانے کے بعد کتنی دیر افسوس کرتی رہی تھی۔

اس نے ڈورم کا لاک کھولا۔

کمرا سنسان پڑا تھا۔ صاف ستھرا بنے ہوئے بستر، میز پہ ترتیب سے رکھی چیزیں، ڈی جے کے بینک کی میز البتہ خالی تھی۔ اس کی ساری چیزیں حیا نے اس کے بھائی کو پیک کر کے دے دی تھیں۔

وہ کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اور سلائیڈ کھولی۔

"گڈ.....گڈما.....!" اس نے کہنا چاہا مگر آواز گلے میں اٹک گئی۔ آنسوؤں نے اس کا گلا بند کر دیا تھا۔ دور کہیں کسی بلاک سے ڈی جے کو جواب دینے والے لڑکے نے اتنے دن کی غیر حاضری پہ کچھ تو سوچا ہوگا، مگر شاید وہ خود بھی اسپرنگ بریک پہ ہو۔ اب وہ آئے گا تو اسے کوئی آواز نہیں آئے گی۔ اسے کیا معلوم کہ اب ساری آوازیں ختم ہو گئیں۔

"گڈ مارننگ ڈی جے!" اس نے کھڑکی میں کھڑے بھیگی، بے حد مدھم آواز سے ڈی جے کو پکارا۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر چہرے پہ لڑھک رہے تھے۔

جواب نہیں آیا۔ اب جواب کبھی نہیں آنا تھا۔

وہ پلٹ کر اپنے بینک کی طرف آئی اور شانے سے پرس اتار کر اپنی میز پر رکھا، پھر زپ کھول کر اندر سے لکڑی کا وہ چھوٹا سا ڈبا نکالا۔ اس کا جواب بھی اسے ڈھونڈنا تھا۔

"اوہ حیا.....تم کب آئیں؟" آواز پہ وہ چونک کر پلٹی۔ کھلے دروازے میں معتصم کھڑا تھا وہ راہداری سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ کر حیرت سے رکا تھا۔

"آج ہی آئی ہوں۔ تم سب واپس آگئے؟" اسے یک گونا گو طمانیت کا احساس ہوا۔ وہ ڈبا ہاتھ میں لیے اس کی طرف آگئی۔

"نہیں، وہ سب تو ابھی کونیا میں ہیں۔ مجھے ذرا کام تھا، اس کے لیے آیا تھا" وہ دانستہ لمحہ بھر کو رکا۔ "مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ خدیجہ.....اتنا اچانک کیسے ہوا؟"

"اللہ کی مرضی تھی معتصم! ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ بیری اینورزم پھٹے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اچانک سے انسان کولیپس کرتا ہے اور اچانک مر جاتا ہے۔ بہت کم لوگوں کو چند روز قبل سر درد شروع ہوتا ہے، ڈی جے کو بھی ہوا تھا مگر اس نے میگرین سمجھ کر نظر انداز کیے رکھا اور پھر..... پھر سب ختم ہو گیا۔"

"دوستوں کو کھونا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔" وہ دونوں اسی طرح چوکھٹ پہ کھڑے تھے۔

"میں تو تب سے یہی سوچ رہی ہوں معتصم! کہ کیا زندگی اتنی غیر یقینی چیز ہے؟ ایک لمحے پہلے وہ میرے ساتھ تھی اور اگلے لمحے وہ نہیں تھی۔ موم بتی کے شعلے کی طرح بے ثبات زندگی جو ذرا سی پھونک سے بجھ جائے..... لمحے بھر کا کھیل؟"

"یہی اللہ تعالیٰ کا ڈیزائن ہے حیا اور ہمیں اسے قبول کرنا پڑے گا۔ یہ کیا کوئی پزل باکس ہے؟" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑے ڈبے کو دیکھ کر ذرا سا چونکا۔

اس نے ناسمجھی سے ڈبا اس کی طرف بڑھایا۔

"چائنیز پزل باکس؟ تم نے یہ کہاں سے لیا؟" وہ ڈبا الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''کسی نے دیا ہے مگر میں اسے کھول نہیں پا رہی۔ کیا تم اسے کھول سکتے ہو؟'' اس نے پُرامید نگاہوں سے معتصم کو دیکھا۔

''میں دیکھتا ہوں، ٹھہرو۔'' وہ اس کا اوپر نیچے سے جائزہ لیے رہا تھا ''یہ قدیم چائنیز باکس کی طرز پہ بنایا گیا ہے۔ اس کے اوپر عموماً کوئی پزل بنا ہوتا ہے جس کو سالو کرنے سے یہ کھلتا ہے یا پھر کوئی پانچ حرفی الفاظ لگانے سے۔ ایک منٹ......'' اسے جیسے اچنبھا ہوا...... ''پانچ نہیں، اس پہ تو چھ حروف ہیں۔ اس طرح کی چیزوں پہ ہمیشہ پانچ حروف ہوتے ہیں، مگر شاید اس کا جواب کوئی خاص لفظ ہو جس پہ چھ حروف ہی پورے آتے ہوں۔''

''مگر اب یہ کھلے گا کیسے؟'' وہ بے چینی سے بولی۔

''یہ تو جس نے دیا ہے، اس کو ہی......'' وہ رکا اور اوپر لکھی سطر پڑھنے لگا۔

''ایک ہی دریا میں کوئی شخص دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔ ہوں...... حیا! تمہارا واسطہ کسی سائیکو سے پڑ گیا ہے۔ یہ ایک پہیلی ہے اور اسے حل کرنا ہے۔''

''اور اس نے کہا تھا کہ اسے صرف میں ہی حل کر سکتی ہوں اور اگر اسے توڑا تو یہ میرے کسی کام کا نہیں رہے گا۔''

''یعنی وہ چاہتا ہے کہ تم دماغ استعمال کرو۔ ویسے یہ فقرہ......'' وہ اس سطر پہ انگلی پھیرتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ ''یہ فقرہ مجھے کچھ سنا سنا لگ رہا ہے۔ شاید...... شاید......'' وہ جیسے یاد کرنے لگا۔ ''اس دن، جب ہم جیو انفارمیشن کی کلاس میں لکھ لکھ کر باتیں کر رہے تھے، تب شاید پروفیسر نے یہ بولا تھا۔''

''نہیں، مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں۔''

''پتا نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''انسان کی یادداشت چیزوں کو بہت ریلیٹ کرتی ہے۔ ہمیں ایک چیز کو دیکھ کر اس سے متعلقہ چیز یاد آ جاتی ہے۔ مجھے بھی اس کو دیکھ کر وہی کلاس یاد آئی۔ خیر! جو بھی ہے تم فکر نہ کرو، ہم اس کا کوئی حل نکال ہی لیں گے۔ ابھی تو میں کام سے جا رہا ہوں، دیر سے آؤں گا۔ تم دروازہ اچھی طرح لاک کر دینا، آج کل ڈورم بلاک تقریباً خالی ہے۔ ٹھیک ہے؟''

اس کے یوں خیال کرنے پہ وہ زیرِ لب مسکرا دی۔

وہ چلا گیا تو اس نے واقعی کمرا اچھی طرح لاک کر لیا۔ سبانجی اتنی ویران تھی کہ اسے انجانا سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ٹاقسم سے یہاں آنے تک اسے مسلسل محسوس ہوتا رہا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ کوئی اس کے پیچھے ہے۔ حالانکہ پیچھے مڑ کر دیکھنے پہ اسے سب کچھ معمول کے مطابق ہی نظر آتا تھا، مگر کچھ تھا جو اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔

رات بہت دیر تک لیٹے لیٹے وہ پزل باکس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے، انگوٹھے سے حروفِ تہجی کی سلائیڈ اوپر نیچے کرتی رہی۔ اس نے حروف کے کئی جوڑ بنائے مگر وہ مقفل رہا۔ اسے نیند نے کب گھیرا، اسے علم بھی نہیں ہوا۔ پزل باکس اس کے گرد...... ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ سرد، جامد اور مقفل۔

☆ ☆ ☆

صبح وہ دیر سے اٹھی۔ ناشتا کر کے رات والے شکن آلود لباس پہ ڈھیلا سا سوئیٹر پہنے، بالوں کو جوڑے میں باندھتی وہ نیچے آ گئی۔ اس کا رخ یونیورسٹی میں فوٹو کاپیئر کی طرف تھا۔ وہاں سے اس نے کچھ نوٹس کئی روز پہلے فوٹو اسٹیٹ کروائے تھے اور انہیں اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

صبح کی چمکیلی مگر ٹھنڈی ہوا سبانجی کے سبزہ زار پہ بہہ رہی تھی۔ وہ فوٹو کاپیئر کے پاس آئی، اپنے نوٹس اٹھائے، سبانجی کے کارڈ سے ادائیگی کی اور پھر واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اسے ایک میز پہ رکھا لاوارث سا رجسٹر نظر آیا۔ رجسٹر جانا پہچانا تھا۔ اس نے پہلا صفحہ پلٹا اور اس پہ بڑا بڑا DJ لکھا تھا۔

''اوہ ڈی جے......'' ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ ڈی جے کا نسیان۔ وہ ہمیشہ اپنا رجسٹر فوٹو کاپیئر پہ چھوڑ جایا کرتی تھی۔ اس نے رجسٹر اٹھا لیا۔ وہ اب اس کا تھا۔ باقی چیزیں تو وہ ڈی جے کی فیملی کو دے چکی تھی، مگر اس کی ایک یادگار سنبھالنے کا حق تو

اسے بھی تھا۔

وہ باہر آ گئی اور گھاس پہ بیٹھ کر ڈی جے کے رجسٹر کے صفحے پلٹنے لگی۔ وہ اس کا رف رجسٹر تھا، جسے وہ زیادہ تر لکھ لکھ کے باتیں کرنے کے لیے استعمال کرتی تھی اور ایسی باتیں عموماً وہ آخری صفحے پہ ہی کیا کرتی تھیں۔ اس نے آخری صفحہ پلٹا تو دھیرے سے مسکرا دی۔

اس روز جیو انفارمیشن سسٹم کی کلاس میں ان کی اور فلسطینیوں کی اسپرنگ بریک کی پلاننگ اس پہ لکھی تھی۔ وہ بہت محبت سے ڈی جے کے لکھے الفاظ پہ انگلی پھیرتی انہیں پڑھ رہی تھی، جب ایک دم وہ رک گئی۔

رجسٹر کے اس آخری صفحے کے اوپر بڑا بڑا کر کے ڈی جے کی لکھائی میں لکھا تھا۔

"into the same river,

no man can enter twice."

- Heraclitus (535-475 BC)

(ایک ہی دریا میں کوئی شخص دو بار نہیں اتر سکتا) (ہراقلیطس ۵۳۵-۴۷۵ قبل از مسیح)

وہ بالکل شل سی، سانس روکے، تحیر سے اس سطر کو دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ پزل باکس اسے ڈی جے نے بھیجا تھا؟

''جب تک آپ اسے کھول پائیں گی، وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔''

وہ رجسٹر لیے ایک دم سے اٹھ کر ڈورم کی طرف بھاگی۔ اسے معتصم کو ڈھونڈنا تھا۔

☆ ☆ ☆

''ہراقلیطس...... یونانی فلسفی...... یاد آ گیا۔'' معتصم نے وہ سطر پڑھتے ہوئے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ ''یہ ہراقلیطس کا ایک قول ہے، جیسے تم اس کے دوسرے اقوال سنے ہوں گے، مثلاً......'' وہ یاد کر کے بتانے لگا۔ ''کتے اسی پہ بھونکتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے ہوئے یا انسان کا کردار اس کی تقدیر ہوتا ہے۔'' وہ انگریزی کے چند مشہور اقوال بتا رہا تھا۔

''ہاں، بالکل۔'' حیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اس میں سے کوئی بھی قول نہیں سن رکھا تھا۔

''تو ثابت ہوا کہ ہم اس پزل کے ٹھیک راستے پہ چل نکلے ہیں۔ اور اس راستے پہ اس شخص نے یقیناً ریڈ کرمز گرائے ہوں گے۔ اب ہمیں ایک ایک کر کے ہنسل اور گریٹل کے ان بریڈ کرمز کو چننا ہے۔''

''شش!'' دور بیٹھی لائبریرین نے کتاب سے سر اٹھا کر عینک کے پیچھے سے ان کو ناگواری سے ٹوکا، وہ دونوں اس وقت لائبریری میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''سوری میم!'' حیا نے گردن موڑ کر ایک معذرت خواہانہ مسکراہٹ ان کی طرف اچھالی اور واپس پلٹی۔

''اچھا اب کیا کرنا ہے؟'' وہ دھیمی سرگوشی میں پوچھ رہی تھی۔ ''اگر اس نے ہراقلیطس کا ایک قول ڈبے کے اوپر لکھا ہے تو یقیناً اس کے کوڈ ورڈ کا تعلق اسی قول سے ہوگا۔''

''یا پھر شاید ہراقلیطس کی ذات سے۔ ٹھہرو! میں ایک منٹ آیا۔'' وہ اٹھا اور چند لمحے بعد جب وہ واپس آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں میں موٹی موٹی چند کتابیں اوپر نیچے پکڑ رکھی تھیں۔

''یہ رہا ہراقلیطس کا اعمال نامہ۔'' اس نے دھپ کی آواز کے ساتھ کتابیں میز پہ رکھیں۔

لائبریرین نے چہرہ اٹھا کر اسے تلملا کر دیکھا۔

''سو...... ری!'' وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر کہتا واپس کرسی پہ بیٹھا۔

''میں لاء کی اسٹوڈنٹ ہو کر فلاسفی کی یہ اتنی وزنی کتابیں پڑھوں؟ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں ہراقلیطس کو google کر لیتی ہوں۔ لیپ ٹاپ ادھر دکھاؤ۔'' اس نے ساتھ رکھے معتصم کے لیپ ٹاپ کا رخ اپنی طرف گھمایا اور کی پیڈ پہ انگلیاں رکھیں۔

''اف!'' جب اتنے ڈھیر سارے نتیجے کھلے تو وہ بے زار سی ہو گئی۔ اسے جلدی سے کوئی جواب چاہیے تھا اور بس جلدی سے وہ

باکس کھولنا تھا۔ اتنے لمبے لمبے ڈاکومنٹس پڑھنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

"ادھر لاؤ، میں پڑھ کر تمہیں مین پوائنٹس بتاتا ہوں۔" اس کی کوفت دیکھ کر معتصم نے لیپ ٹاپ اپنی طرف گھمایا اور پھر اسکرین پہ نگاہیں دوڑاتے ہوئے پڑھنے لگا۔

"ہوں......اچھا...... ہراقلیطس کا تعلق Asia Minor سے تھا۔ خاصا بدمزاج فلاسفر تھا۔ اپنے علاقے میں چیف پریسٹ بھی رہا ہے اور بہت خاندانی بھی تھا۔ بڑے بڑے فلسفیوں کو خاصی حقارت سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں ہومر کو بھرے چوک میں لے جا کر درے مارنے چاہئیں اور Hesoid اتنا جاہل ہے کہ اسے دن اور رات کا فرق نہیں پتا۔ ہراقلیطس کے مشہور اقوال یہ ہیں......

گدھے سونے پہ گھاس کو ترجیح دیتے ہیں، کتے ہر اس شخص پہ بھونکتے ہیں جسے وہ نہیں جانتے، اور......"

"بس کرو معتصم! ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی!" اس نے جھنجھلا کر لیپ ٹاپ کی اسکرین ہاتھ سے دبا کر فولڈ کر دی۔ معتصم ہنس دیا پھر اپنا موبائل نکالا۔

"لطیف رات کو آ گیا تھا۔ اس کا ایک سائیڈ کورس فلاسفی ہے، اس کو بلاتا ہوں۔"

لطیف کو ادھر آنے اور اس کو ساری بات سمجھنے میں پندرہ منٹ لگے گئے اب وہ معتصم کے ساتھ والی نشست پہ بیٹھا سوچتے ہوئے اس پزل باکس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کیتھولک اور خالصتاً ڈچ تھا مگر افغانستان میں پیدائش کے وقت لطیف کے نام پہ اس کا نام رکھا تھا اور چونکہ اس کو پہلی خوراک ایک مسلمان نرس نے دی تھی سو لطیف ذہنی اور اخلاقی طور پہ ان فلسطینی لڑکوں جیسا ہی لگتا تھا۔

"میں تو ہراقلیطس نامہ سن کر تنگ آ گئی ہوں، اور اس کے یہ کتوں، گدھوں اور ......" حیا نے باکس کی طرف اشارہ کیا۔ "دریاؤں والے اقوال میری سمجھ سے تو باہر ہیں۔"

"ایک منٹ!" لطیف ذرا چونکا "وہ کتوں اور گدھوں والے اس کے اقوال ہوں گے مگر یہ دریا والا صرف اس کا قول نہیں بلکہ اس کی مشہور زمانہ فلاسفی ہے۔ Flux فلاسفی۔ تم نے سن تو رکھی ہو گی؟"

"میں ہراقلیطس کا نام آج پہلی دفعہ سن رہی ہوں، کجا کہ اس کی فلاسفی۔"

"اونہہ۔ تم نے، بلکہ ہر کسی نے یہ فلاسفی سن رکھی ہے۔ یہ محاورہ تو تم جانتی ہو نا کہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے؟"

"ہاں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ لطیف آگے ہو کر بتانے لگا۔

"یہ محاورہ دراصل ہراقلیطس کی اسی فلاسفی کا نچوڑ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی شخص ایک ہی دریا میں دو دفعہ نہیں اتر سکتا۔ یعنی کہ جب انسان ایک دفعہ پانی میں قدم رکھ کر نکالتا ہے، تو وہ پانی آگے بہہ جاتا ہے، پانی اور انسان دونوں ہر لمحہ تبدیل ہوتے ہیں، وہ دوبارہ جغرافیائی لحاظ سے تو اسی دریا میں قدم رکھتا ہے مگر نہ وہ خود وہی پہلے والا انسان ہوتا ہے اور نہ وہ دریا پہلے والا ہوتا ہے۔ سمجھ آئی؟"

"ہاں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے قطعاً سمجھ نہیں آئی۔

"نہیں، تمہیں سمجھ نہیں آئی۔ دیکھو، جب استنبول میں پہلے دن تم نے باسفورس کا سمندر دیکھا تھا، تب وہ، وہ سمندر نہیں تھا، جو تم نے کل دیکھا۔ اب نہ تم وہ ہو، اور نہ سمندر وہی ہے۔ ہر چیز لمحہ بہ لمحہ بدل جاتی ہے۔ یہ ہے ہراقلیطس کی فلاسفی آف چینج!"

"فلاسفی آف چینج!" حیا نے اثبات میں سر ہلاتے باکس اٹھایا۔ "اور تمہیں پتا ہے، چینج میں پورے چھ حروف ہوتے ہیں۔"

"اوہ ہاں!" معتصم نے ذرا جوش سے ڈیسک پہ ہاتھ مارا۔

ادھر ادھر ٹیبلز پہ پڑھتے چند طلبا نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"لاسٹ ٹائم، ایکسچینج اسٹوڈنٹس!" لائبریرین نے کڑی نگاہوں سے اسے دیکھتے انگلی اٹھا کر وارننگ کی۔ معتصم نے فوراً سر جھکا دیا۔

وہ دبے دبے جوش سے حروف کی سائیڈز اوپر نیچے کر رہی تھی، یہاں تک کہ اس نے پورا لفظ چینج لکھ لیا۔

"اب یہ کھل جائے گا۔"

مگر پزل باکس جامد رہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کوڈ کچھ اور ہے۔ اور وہ کچھ ایسا ہے جسے صرف تم کھول سکتی ہو۔ کچھ ایسا جو صرف تمہیں ہی معلوم ہو گا۔"

"حیا! تم ہر اقلیطس کی میٹافزکس میں تو انٹرسٹڈ نہیں ہو؟" لطیف کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

"فی الحال تو میں صرف تاقسم جانے میں انٹرسٹڈ ہوں۔ میرا خیال ہے میں تیار ہو جاؤں۔" وہ ہار مانتے ہوئے باکس لیے اٹھ گئی۔

"ہم نے بھی تاقسم جانا ہے اور ابھی گورسل نکلنے میں ڈیڑھ گھنٹہ تو ہے۔ تم تیار ہو جاؤ تو اکٹھے چلتے ہیں۔"

لکڑی کا وہ پزل باکس اس نے اپنے ڈورم کے لاکر میں رکھا، پھر اپنے کپڑے کھنگالنے لگی۔ جس افراتفری میں گئی تھی، یہ یاد کہاں تھا کہ لانڈری کو کپڑے نہیں دیے۔ اس وقت جو ایک واحد استری شدہ جوڑا ہینگر پہ لٹکا تھا وہ اس کا سیاہ فراک تھا جس کی اوپری پٹی سنہری سکوں سے بھری تھی۔ وہی جو وہ جہان کے استقلال اسٹریٹ میں دیے جانے والے ڈنر پہ پہن کر گئی تھی۔ فی الحال وہ پھپھو سے پہلے اپنی ان میزبان آنٹی کے گھر جا رہی تھی جنہوں نے پہلے روز ان کا کھانا کیا تھا۔ چونکہ وہ ایک طرح سے ڈی جے کے لیے ہی جا رہی تھی، سو یہ کام والا فراک مناسب نہ تھا، لیکن وہ اوپر سیاہ کوٹ پہن لے گئی تو کام چھپ جائے گا، اور نیچے سے تو فراک سادہ ہی تھا۔ اس نے لباس بدل کر بال کیچر میں باندھے، پھر اپنے سنہری کلچ میں پاکستانی سلم سا میں موبائل ڈالا۔ کلچ چھوٹا سا تھا، اس میں ترک بھدا فون پورا نہیں آتا تھا، سو اس نے ترک فون کوٹ کی جیب میں رکھ دیا اور کلچ کی زنجیر کو ایک کندھے سے گزار کر دوسرے پہلو میں ڈال کر بڑی پن کے ساتھ فراک کی بیلٹ سے نتھی کر دیا۔ سنہری سکوں کے کام میں سنہری ستاروں والا پرس بالکل چھپ سا گیا تھا۔ کم از کم اب کوئی اس کا پرس چھین تو نہیں سکتا تھا نا۔

مسز عبداللہ کا پتا اس کے پاس تھا۔ ہالے سے ان کا نمبر لے کر ان کو فون بھی کر دیا تھا۔ جب سے وہ ترکی آئی تھی، ان کے گھر پلٹ کر نہیں گئی۔ اب اسے لازمی جانا چاہیے تھا۔

گورسل میں وہ درمیانی راستے والی نشست پہ بیٹھی تھی۔ راستے کے اس طرف معتصم اور اس کے ساتھ لطیف بیٹھا تھا۔ حیا کے بائیں طرف کھڑکی کے ساتھ والی نشست پہ ایک ترک لڑکی موجود تھی۔

"تمہارا فلوٹیلا فلسطین کب پہنچے گا معتصم!" وہ سیاہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھی گردن موڑ کر اس سے مخاطب تھی۔

"جون میں پہنچ جائے گا۔"

"اسرائیلی اسے داخل تو ہونے دیں گے نا؟"

"امید تو ہے کیونکہ یہ فلوٹیلا ترکی کا ہے، اور اس میں بہت سے ممالک کے وفد ہیں۔" جواب لطیف نے دیا تھا۔

"اور اگر اسرائیلیوں نے ایسا نہ ہونے دیا تو؟ آخر بنی اسرائیل سے کسی بھی چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

"تو پھر یہ یاد رکھنا کہ جتنے بنی اسرائیل وہ ہیں، اتنے ہم بھی ہیں۔ وہ سامنے دیکھو! وہ اسرائیلی ایمبیسی ہے!" معتصم کے اشارے پہ ان دونوں نے گردن اونچی کر کے ونڈ اسکرین کے پار دیکھا، جہاں ایک جھنڈے والی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔

"اگر فلوٹیلا غزہ نہ پہنچا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ ایمبیسی استنبول میں دوبارہ نظر نہیں آئے گی۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔" لطیف نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

"می ٹو!" حیا نے فوراً کہا۔

"می تھری!" ساتھ ترک لڑکی نے فوراً انگلی اوپر کی۔ وہ بے اختیار ہنس دی۔

"ویسے معتصم! ثالی کو اغوا کرنا زیادہ مناسب رہے گا نہیں؟" لطیف کی بات پر سب ہنس پڑے تھے۔ اسے یاد تھا، ڈی جے کو ان کی ثالی سے دوستی کتنی بری لگتی تھی۔

تاقسم اسکوائر پہ مغرب اتر رہی تھی اور ہر طرف اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اسکوائر کی بتیاں ایک ایک کر کے جلنے لگی تھیں۔

"تم نے جدھر جانا ہے، ہم تمہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اکیلی مت جاؤ۔" وہ دونوں بس سے اتر کر اس کے لیے رکے کھڑے تھے۔

"ترکوں کے ساتھ رہ کر تم بھی ترک بن گئے ہو۔ ان پرخلوص ترکوں سے راستہ پوچھو تو منزل تک پہنچا کر آتے ہیں۔"

"مادام! آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ ان پرخلوص ترکوں کے اس ملک میں ہر سال تقریباً پانچ سو لڑکیاں اغوا کر کے آگے بیچ دی جاتی ہیں اور یہ ترکی کا سب سے منافع بخش کاروبار ہے۔"

"اچھا اب ڈراؤ تو مت۔ مجھے تھوڑی دور ہی جانا ہے۔" وہ تینوں سڑک کے کنارے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگے تھے۔

"تم اپنی آنٹی کے گھر جا رہی ہو؟"

"ہاں مگر مجھے ابھی اپنی ہوسٹ آنٹی کے گھر بھی جانا ہے۔ کچھ دن بعد جب میں واپس آؤں گی تو اس پزل باکس کا حل ڈھونڈیں گے۔"

وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے ٹھنڈی ہوا میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ مجسمہ آزادی ان کے پیچھے رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

لاؤنج میں سوگواریت سی چھائی تھی۔ مسز عبداللہ اور ان کی سرخ بالوں والی بیٹی مہر مغموم سی سامنے صوفوں پہ بیٹھی تھیں۔ حیا کے صوفے سے ذرا دور کارپٹ پہ مہر کی بیٹی عروہ کشن کا سہارا لیے نیم دراز ریموٹ پکڑے ٹی وی پہ کارٹون دیکھ رہی تھی۔

"آپ کو پتا ہے، ہم دونوں ہر ہفتے آپ کی طرف چکر لگانے کا پلان بناتے تھے مگر ہر دفعہ کچھ نہ کچھ روک لیتا، اور اب....." اس نے تاسف سے سر جھٹکا۔

"تم مجھے اسی روز بتا دیتیں تو..... کم از کم میں اسے دیکھ ہی لیتی، پھر کلیئرنس میں تمہاری مدد کروا دیتی۔ تم کتنی پریشان رہی ہو گی!"

"مجھے تو اپنی آنٹی کو بتانے کا بھی ہوش نہیں تھا، ایسا اچانک دھچکا لگا تھا کہ....." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑا اور سر جھکا کر انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارا پونچھا۔ مہر نے بہت فکرمندی سے اسے دیکھا۔

"تم بہت کمزور ہو گئی ہو پہلے سے حیا! اور تمہاری رنگت بھی کملا گئی ہے۔"

"بس..... بخار ہو گیا تھا اور پھر سفر کی تکان!" وہ اداسی سے مسکرائی۔ وہ واقعی بہت پژمردہ اور تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

"میں ذرا کھانے کا کچھ کر لوں۔" مسز عبداللہ اٹھیں تو وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

"کھانا پھپھو کی طرف ہے۔ میں بس چائے پیوں گی۔"

"پھر مجھے صرف دس منٹ دو۔" وہ عجلت سے کہتی کچن کی جانب بڑھ گئیں۔ مہر بھی اس کے پیچھے جانے کے لیے اٹھی، پھر عروہ کو دیکھا۔

"عروہ! تم حیا کو کمپنی دو اور فار گاڈ سیک عروہ! جب کوئی مہمان آتا ہے تو ٹی وی نہیں دیکھتے۔" اس نے جاتے جاتے خفگی سے بچی کو گھورا۔ عروہ گڑبڑا کر سیدھی ہوئی اور مڑ کر حیا کو دیکھا، پھر سادگی سے مسکرائی۔

"سوری!"

"کوئی بات نہیں۔ تم بے شک کارٹون دیکھ لو۔ میں بور نہیں ہوں گی۔ ویسے کون سا کارٹون ہے یہ؟" اسے کارٹون ذرا شناسا سا لگے تو آنکھیں سکیڑ کر اسکرین کو دیکھنے لگی۔

"کیپٹن پلینٹ۔ Captain Planet آپ نے دیکھے ہیں کبھی؟" عروہ دبے دبے جوش سے بتاتی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"ارے! یہ کیپٹن پلینٹ ہیں؟ میرے فیورٹ" وہ ایک دم خوشی سے کہتی صوفے کی نشست پہ آگے کو ہوئی۔

"مجھے یہ بہت پسند ہیں، اور لنڈا تو بہت ہی زیادہ..... عروہ! میری تو جان تھی کیپٹن پلینٹ میں۔ میں بچپن سے ہی ان کی بہت جنونی فین رہی ہوں۔ جب یہ سارے پلینیٹرز اپنی اپنی انگوٹھیاں فضا میں بلند کر کے فائر، ارتھ، ونڈ، واٹر چلاتے تھے تو میرے اندر واقعی انرجی بھر جاتی کہ مجھے لگتا میں ابھی اڑنے لگوں گی۔"

وہ چھوٹے بچوں سے کبھی بھی اتنی بے تکلف نہیں ہو پاتی تھی، مگر یہاں معاملہ کیپٹن پلینٹ کا تھا۔

"پھر میرے ابا نے مجھے سمجھایا کہ آگ، مٹی، ہوا اور پانی ہمارے اس سیارے کو بنانے والے چار ایلیمنٹس ہیں۔ تب پہلی دفعہ مجھے ان چار یونانی عناصر کا پتا چلا تھا۔"

"ہاں مجھے پتا ہے۔ ماما نے مجھے بتایا تھا کہ یہ یونانی عناصر ہیں۔"

''مجھے بھی تب ہی ابا نے بتایا تھا کہ کس طرح یونانی فلسفیوں نے یہ چار عناصر باری باری پیش.....'' وہ کہتے کہتے ایک دم رکی۔
لمحے بھر کو اس کے اندر باہر بالکل سناٹا چھا گیا۔

''یونانی عناصر!'' اس نے بے یقینی سے زیر لب دہرایا۔ اسے یاد تھا، یہ عناصر یونانی فلسفیوں نے پیش کیے تھے۔ کسی نے کہا دنیا پانی سے بنی ہے، کسی نے کہا ہوا سے.....اور وہ عنصر اس فلسفی کی پہچان بن گیا۔

''ہراقلیطس کا عنصر کون سا تھا؟'' وہ خود سے پوچھتی جیسے چونک اٹھی۔ عروہ منتظر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''عروہ! مجھے نیٹ چاہیے۔ ابھی، اسی وقت'' وہ بے چینی سے بولی تو عروہ سر ہلا کر اٹھی اور صوفے پر سے ایک آئی پوڈ اٹھا کر اسے دیا۔

''یہ ممی کا آئی پوڈ لے لیں۔''

''تھینکس!'' اس نے آئی پوڈ پکڑ کر اس کا گال تھپتھپایا اور جلدی جلدی گوگل کھولنے لگی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد جب وہ ان کو خدا حافظ کر کے باہر آئی تو سڑک کے کنارے چلتے ہوئے اس نے کوٹ کی جیب سے اپنا ترک فون نکالا اور تیزی سے معتصم کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''حیا! خیریت؟'' وہ فون اٹھاتے ہی ذرا فکرمندی سے بولا تھا۔

''معتصم! تمہیں پتا ہے یونانی فلسفیوں نے زمین کی تخلیق کی وضاحت کرنے کے لیے کچھ عناصر پیش کیے تھے کہ زمین ان سے مل کر بنی ہے؟'' چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ آہستہ سے بولا۔

''حیا! میرے خیال سے تم ذرا تھک گئی ہو، تھوڑا سا ریسٹ کر لو، اس کے بعد تم نارمل ہو جاؤ گی۔''

''معتصم!'' اس نے جھنجھلا کر زور سے کہا۔ ''میں سنجیدہ ہوں۔ میری بات سنو! ہم خوامخواہ اس نیم پاگل آدمی کی سوانح عمری پڑھ رہے تھے۔ ہمیں اس کی فلاسفی چاہیے تھی۔ اس دور کے ہر فلسفی نے اپنا ایک عنصر پیش کیا تھا اور اس کے خیال میں زمین کی ہر چیز اس عنصر سے بنی تھی۔ کسی نے کہا وہ پانی ہے، کسی نے کہا ہوا اور یوں ان چاروں، بلکہ پانچوں عناصر کی فہرست مرتب ہوئی تھی۔ ہراقلیطس کا عنصر ''آگ'' تھا اور یہی اس کی پہچان تھا۔''

''فائر؟''

''ہاں، فائر ہراقلیطس کی دائمی آگ۔ اس نے آگ کی بنیاد پہ اپنی فلاسفی آف چینج پیش کی تھی۔ معتصم..... انسان ایک دریا میں دو دفعہ کیوں نہیں اتر سکتا؟ کیونکہ انسان اور دریا، دونوں ہراقلیطس کے خیال میں آگ سے بنے تھے اور دنیا میں سب سے زیادہ تبدیل ہونے والی چیز آگ ہے جو ہر لحہ بدلتی ہے.....اور جو ہر ہر چیز کو بدل دیتی ہے۔ اس پزل باکس پہ لکھی بات ایک ہی لفظ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو ہے ''فائر''۔'' وہ کالونی کے سرے پہ کھڑے ہو کر فون پہ کہہ رہی تھی۔ رات گہری ہو رہی تھی اور اسٹریٹ پولز جل اٹھے تھے۔

''مگر حیا! فائر میں تو چار حروف ہوتے ہیں۔ یہ کوڈ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''یہ کوڈ ہے بھی نہیں۔ اس کا مطلب ہے آگ، اصلی والی آگ، نالی کا لائٹر، اسرائیلی آگ، یاد ہے تمہیں؟''

''اوہ مائی!'' اسے ایک لحہ لگا تھا سمجھنے میں۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ اس نے آگ کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ..... کیونکہ اس خط کی طرح اس باکس پر بھی کچھ لکھا ہو گا جو.....''

''جو صرف آنچ دکھانے سے ظاہر ہو گا۔'' اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے اس کی بات مکمل کی۔

''حیرت ہے، یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا؟''

''کیونکہ تم کافی تھک گئے ہو، ذرا آرام کر لو، پھر تم نارمل ہو جاؤ گے۔''

وہ جواباً ہنس دیا تھا۔

''چلو پھر تم رات کو واپس آئی تو اس باکس کو کھولیں گے۔''

''نہیں، میں آج رات واپس نہیں آؤں گی۔ میں آنٹی کی طرف رکوں گی۔''

''تمہاری اپنی آنٹی یا پھر وہ ہوسٹ آنٹی؟''

''میں......'' فقرہ اس کے لبوں میں رہ گیا۔ کسی نے اس کے کان پہ لگا فون زور سے کھینچا تھا۔ اسے مڑنے یا چیخنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔

کسی نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا اور کوئی سوئی کی نوک تھی جو اس کی گردن کے آس پاس کہیں کھبی تھی۔ لمحے بھر کا عمل تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے بادل چھانے لگے۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ دل و دماغ کے سن ہونے سے قبل جو آخری بات اس نے سوچی تھی، وہ یہ تھی کہ کوئی اسے پیچھے کی طرف گھسیٹ رہا تھا...... اور پھر...... ہر طرف اندھیرا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ بدقت پلکیں اوپر کو اٹھی تھیں، ان پہ جیسے بہت بوجھ سا تھا۔

ہر سو اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا۔ وہ ایسے پڑی تھی کہ کمر دیوار سے لگی تھی اور گھٹنے سینے سے۔ وہ جیسے ایک بہت تنگ و تاریک جگہ پر بہت سے سامان کے اندر کہیں پھنسی بیٹھی تھی۔

اس نے آنکھیں چند ایک بار جھپکائیں۔ منظر ویسا ہی رہا۔ اندھیرا، تاریکی، بس اتنا احساس ہوا کہ وہ کسی تنگ سے کمرے میں ہے، جہاں اس کے دونوں اطراف وزنی چیزیں رکھی ہیں۔

اس نے کہنیوں کے بل ذرا سا اٹھنا چاہا تو دائیں ہاتھ میں کھنچاؤ تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچا۔ ذرا سا لوہا کھنکا۔ اس کی دائیں کلائی میں ہتھکڑی ڈلی تھی اور وہ دیوار سے بندھی تھی۔ اس نے زور سے کلائی کو جھٹکا مگر بے سود۔

اس کے سر اور کمر میں بے تحاشا درد ہو رہا تھا، جیسے کوئی چوٹ لگی ہو۔ بمشکل وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے، دوسرے ہاتھ کے سہارے ذرا سی سیدھی ہو کر بیٹھی۔ بائیں جانب کوئی بوجھ سا اس کے اوپر گرنے لگا۔ اس نے آزاد ہاتھ سے اسے پرے دھکیلا تو وہ نرم سا بوجھ دوسری جانب ذرا سا لڑھک گیا۔

حیا نے گردن موڑی۔ درد کی ایک ٹیس بے اختیار اٹھی۔ اس کے لبوں سے کراہ نکلی۔ پیچھے دیوار لکڑی کے پھٹوں سے بنی تھی اور پھٹوں میں باریک سی درازیں تھیں۔ اب ذرا آنکھیں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو اسے نظر آیا۔ ان درزوں سے رات کی تاریکی میں زرد سی روشنی جھانک رہی تھی۔ وہ بدقت چہرہ اس درز کے قریب لائی اور آنکھیں سکیڑ کر جھانکا۔

باہر ہر سو سمندر تھا۔ سیاہ پانی جو رات کے اس پہر زرد روشنیوں میں چمک رہا تھا۔ پل کی روشنیاں۔ ہاں، وہ پل ہی تھا۔ وہ باسفورس کے سمندر پہ بنے اس پل کے آس پاس ہی کہیں تھی۔ مگر وہ باسفورس برج نہیں تھا، وہ ذرا مختلف لگ رہا تھا، یا شاید وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں پا رہی تھی۔

بائیں طرف موجود بوجھ پھر سے اس پہ لڑھکنے لگا۔ اس نے کوفت سے اسے پرے دھکیلا تو اس کا ہاتھ نم ہو گیا۔ وہ نم ہاتھ چہرے کے قریب لائی اور دور سے آتی روشنی میں دیکھنا چاہا۔ اسے نمی کا رنگ تو نظر نہیں آیا مگر...... وہ خون تھا۔

وہ متوحش سی ہو کر ہاتھ اپنے کپڑوں سے رگڑنے لگی۔ اس کا کوٹ اس کے جسم پہ نہیں تھا۔ جو واحد خیال اسے اس وقت آیا تھا۔ وہ بہت تکلیف دہ تھا۔

عبدالرحمان پاشا نے اغوا کروا لیا تھا۔

زور زور سے وہ اپنا ہاتھ سنہری سکوں سے رگڑ رہی تھی، جب اس کی انگلیاں ذرا بھاری سی چیز سے ٹکرائیں۔ وہ ٹھہر گئی اور اسے ٹٹولا۔

اس کا چھوٹا سنہری کلچ جو فراک کی بیلٹ کے ساتھ منسلک تھا۔ اس کے سر میں درد سے ٹیس اٹھ رہی تھیں۔ ذہن میں اپنی پھپھو کی آخری گفتگو گونج رہی تھی۔ اس نے شام میں انہیں یقین دلایا تھا کہ رات کھانے پر وہ ان کے ساتھ ہو گی۔ اب جانے کون سا وقت تھا، پھپھو نے اس کا انتظار کیا ہو گا اور اسے نہ پا کر...... کیا ان کے ذہن میں آیا ہو گا کہ وہ اغوا ہو گئی ہے؟

اس نے اپنے آزاد ہاتھ میں کلچ کھولا۔ اندر اس کا پتلا سا پاکستانی موبائل رکھا تھا۔ انہوں نے اس کا فون کیوں نہیں لیا، وہ سمجھ گئی

تھی۔ اس کا ترک فون کھینچ کر انہوں نے سمجھا ہوگا کہ وہ اسے رابطے کے ہر ذریعے سے محروم کر چکے ہیں اور فراک کے ساتھ ننھی کلچ پہ ہم رنگ ہونے کے باعث کسی نے غور نہیں کیا ہوگا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاس دو فون تھے۔ مگر عبدالرحمن پاشا کو تو معلوم تھا لیکن......

اس نے اسکرین کو چھوا تو وہ روشن ہو گئی۔ بند کمرے میں مدھم سی سفید روشنی جل اٹھی۔ اس موبائل میں مہوش کی مہندی کے روز ہی اس نے بیلنس ڈلوایا تھا اور یہ پاکستانی نمبر تھا۔ جس کی رومنگ آن تھی۔ معلوم نہیں کتنے پیسے بچے تھے، ایک کال کے تو ہوں گے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ بیلنس چیک کیا۔ اس میں اتنے ہی روپے تھے کہ وہ ترکی کے کسی نمبر پہ تیس سیکنڈ کی کال کر سکتی بس۔ اتنی سی دیر میں بھی وہ جہان کو اپنی صورتحال سمجھا سکتی تھی۔

وہ جلدی جلدی فون بک نیچے کرنے لگی۔ "ج" میں جہان کا نمبر نہیں تھا اس نے "سی" میں دیکھا۔ وہاں بھی نہیں تھا۔ وہ ذرا حیرت سے سبین پھپھو کا نام تلاشنے لی۔ ان کا نمبر بھی غائب۔ بس پاکستانی نمبر تھے۔

"کیوں؟" اس نے دکھتے سر کے ساتھ سوچنا چاہا اور تب ایک جھماکے سے اسے یاد آ گیا۔ یہ پاکستانی موبائل تھا اور ترکی کے سارے نمبرز اس نے اپنے ترک فون میں محفوظ کر رکھتے تھے۔ اب وہ گھر فون کر کے اپنے اغوا کا نہیں بتا سکتی تھی اور نہ اتنا بیلنس تھا کہ وہ انہیں فون کر کے جہان کا نمبر لیتی۔ تیس سیکنڈ کی کال اسے ضائع نہیں کرنی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سر دیوار سے لگا دیا۔ وہ سوچنا چاہتی تھی، فرار کا کوئی راستہ، مدد کی کوئی صورت، اور تب ہی اس نے لکڑی کی اس دیوار کے پار وہ آوازیں سنیں۔ عربی میں تیز تیز بولتا ایک آدمی جیسے دور سے چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔

"پاشا تمہیں جان سے مار دے گا اگر اسے علم ہوا کہ تم اس کی لڑکی اٹھا لائے ہو۔"

"یہ بحری جہاز روانہ ہو جائے، پھر میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا جہاں پاشا کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔" دوسری آواز ذرا جھنجلائی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اسی دیوار کے پیچھے باتیں کر رہے تھے۔

"تم امید کرو، اور تم اچھی امید کرو، کیونکہ اگر پاشا کو......" آوازیں دور جا رہی تھیں۔ اب وہ مبہم ہو گئی تھیں۔

اس نے ان کی باتوں پہ غور کرنا چاہا۔ وہ پاشا کا ذکر کر رہے تھے کچھ ایسا جو اس کے علم میں نہیں تھا۔ بحری جہاز کی روانگی اور پاشا کی لاعلمی...... تو کیا پاشا کے کہنے پہ اغوا نہیں کی گئی تھی؟

وہ کتنی ہی دیر اپنے درد کرتے سر کے ساتھ سوچنے کی کوشش کرتی رہی مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا۔ اس فون میں ترکی کا ایک ہی نمبر تھا۔ جب وہ ریسٹورنٹ میں اپنا ترک موبائل چھوڑ کر گئی تھی، تو اسے اسی پاکستانی فون پہ پاشا نے کال کیا تھا۔ اس نے وہ نمبر محفوظ نہیں کیا تھا مگر وہ کال لاگ میں پڑا تھا۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے لاگ کھولا۔ وہ خالی تھا۔ صرف ایک کال تھی، جو ترکی آتے ہی ابا نے اس نمبر پہ کی تھی۔ باقی لاگ ارم نے مٹا دیا تھا۔

اس کا سر گھومنے لگا۔ ہر طرف اندھیرا تھا، ہر راستہ مسدود، ہر دروازہ بند، وہ تیس سیکنڈ کی کال کس کو کرے؟ سارے ایمرجنسی نمبرز ترک فون میں تھے اور ترکی کے دوسرے نمبر اسے زبانی یاد نہیں تھے۔ فون نمبر حیا سلیمان کو کبھی زبانی یاد نہیں رہتے تھے۔

بوجھ پھر سے اس پہ لڑھکنے لگا۔ اس نے موبائل کی روشنی اس پہ ڈالی اور ایک دم بالکل شل رہ گئی۔ وہ لمبے سنہری بالوں والی ایک لڑکی تھی۔ جو اس پر گری تھی۔ اس کے منہ اور کندھے سے خون نکل رہا تھا۔ بغیر آستین کی قمیص سے جھلکتے اس کے سنہری بازو پہ کچھ لکھا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بازو پہ موبائل کی روشنی کی۔ وہاں سیاہ رنگ سے انگریزی میں لکھا تھا۔ "Natasha" "نتاشا......" شاید اس کا نام تھا، اور وہ اس کے نام کا ایک بدصورت ساٹیٹو تھا۔ یا جلا ہوا کوئی داغ۔

اس نے موبائل کی روشنی ادھر ادھر دوڑائی۔ اس چھوٹے سے ڈربے میں ہر طرف لڑکیاں تھیں۔ ایک دوسرے کے اوپر گری ہوئی۔ بے ہوش، بے سدھ پڑی کسی کے چہرے پہ نیل تھے، تو کسی کے بازوؤں پہ خراشیں یا جما ہوا خون تھا۔

خون کی بو اور سر میں اٹھتا شدید درد۔ اس کا جی ایک دم سے متلانے لگا تھا۔ اسے محسوس ہوا، وہ پھر سے ہوش کھو دے گی۔ اپنے ناکارہ فون کو کھلے کلچ میں ڈالتے ہوئے اس کی نگاہ اندر پڑے کارڈ پہ پڑی اس نے جلدی سے وہ کارڈ نکالا۔ اتصلات کا کالنگ کارڈ جو انہوں

نے ابوظہبی میں خریدا تھا، مگر اب وہ بے کار تھا۔ اس نے اندر انگلیاں ڈال کر ٹٹولا اور پھر یہ تہہ شدہ کارڈ نکالا۔
کارڈ کو سیدھا کر کے اس نے گھٹنے پہ رکھا اور موبائل کی روشنی اس پہ ڈالی۔ آف وائٹ کارڈ پہ لکھے سیاہ الفاظ روشن ہوئے۔
''شیخ عثمان شبیر۔''
نیچے ترکی کے تین نمبرز لکھے تھے۔ آفس، گھر اور موبائل کا۔ اس کا دل نئی امید سے دھڑکنے لگا۔
اسے ایکسٹینشن یاد نہیں آ رہی تھی۔ کوئی تاریخ تھی۔ کوئی نشان، کوئی مشہور واقعہ۔ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہ تیس سیکنڈ کی کال ضائع نہیں کرنی تھی۔ مگر اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ سر میں اٹھتا درد اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔
اس نے آنکھیں کھول کر دوبارہ کارڈ کو دیکھا اور کچھ سوچ کر موبائل نمبر ملایا اور فون کان سے لگایا۔ ترک میں ریکارڈنگ چلنے لگی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ فون بند ہے۔ اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ گھر کا نمبر ملایا۔
گھنٹی جا رہی تھی۔ وہ بے چینی سے لب کاٹتی سنے گئی۔ اس کی امید کا دیا بار بار جلتا بجھتا جا رہا تھا۔
بند کمرے میں خون کی عجیب سی بو پھیلی تھی۔ اس سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ دوسری جانب گھنٹی ابھی تک جا رہی تھی۔
''پلیز اللہ تعالیٰ، پلیز......اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔
''السلام علیکم۔!'' اسی لمحے فون اٹھا لیا گیا۔
''کون، عثمان انکل؟'' وہ تیزی سے بولی۔
''آ......نہیں، میں ان کا بیٹا، سفیر!'' وہ جو بھی تھا۔ ذرا چونکا۔
''میں حیا بول رہی ہوں۔ حیا سلیمان۔ میں عثمان انکل کے ساتھ آئی تھی۔ اتحاد ائیر لائنز۔ سبانجی یونیورسٹی۔ ایکسچینج اسٹوڈنٹ۔'' وقت کم تھا اور وہ اسے تعارف میں ضائع نہیں کر سکتی تھی۔

''کیا ہوا؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟''
''نہیں، مجھے ان لوگوں نے اغوا کر لیا ہے، یہاں پر کوئی کمرا ہے میں اس میں بند ہوں یہاں چھ، سات اور لڑکیاں بھی ہیں۔ پلیز کسی سے کہیں میری مدد کرے۔'' وہ تیز تیز بولتی گئی۔
''ایک منٹ۔ مجھے بتائیں آپ کس جگہ پر ہیں۔ کوئی آئیڈیا ہے آپ کو؟ کسی کھڑکی وغیرہ سے باہر دیکھ سکتی ہیں؟''
''ہاں، یہاں باہر سمندر ہے، مجھے ایک فیری نظر آ رہا ہے اور ادھر پل ہے۔ باسفورس برج......نہیں، یہ......'' رابطہ کٹ گیا۔
اس نے بوکھلا کر اسکرین کو دیکھا اور پھر اس باریک درز سے جھلکتے منظر کو۔ اس نے باسفورس برج کہہ دیا تھا جبکہ وہ باسفورس برج نہیں تھا۔ وہ اب پہچانی تھی۔ یہ سلطان احمت برج تھا۔ شہر کے دونوں حصوں کو ملانے والا دوسرا پل۔ اس نے اپنی لوکیشن ہی غلط بتائی تھی۔ اب؟
وہ بے بسی سے موبائل کو دیکھے گئی۔ بیلنس ختم ہو گیا تھا اور اب وہ کال ریسیو کرنے سے بھی قاصر تھی۔
دروازے پہ آہٹ ہوئی۔ تالا کھلنے کی آواز۔ اس نے جلدی سے فون کلچ میں ڈال کر اسے بند کیا اور گردن ایک طرف ڈھلکا کر آنکھیں موند لیں۔
دروازہ بھاری چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ کوئی اندر آیا، اس پہ جھک کر اس کی ہتھکڑی چابی سے کھولی اور پھر اسے بازو سے کسی جانور کی طرح گھسیٹتے باہر لے جانے لگا۔
اس کے لبوں سے بے اختیار کراہ نکلی۔
وہ آدمی اسے بڑے کمرے میں لایا اور اب کرسی پہ بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں کرسی سے باندھ رہا تھا۔
''مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو۔'' وہ منمنائی تھی۔ اس نے جواباً ٹیپ کا ایک ٹکڑا دانت سے کاٹ کر اس کے لبوں سے کس کر چپکا دیا۔
''اُم......'' وہ گردن دائیں سے بائیں مارنے لگی۔ ٹیپ سے اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ توجہ دیے بنا لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا۔

اس نے نگاہیں پورے کمرے پہ دوڑائیں۔ وہ بڑا سا کمرا تھا۔ ایک طرف بڑا صوفہ رکھا تھا اور دوسری طرف آتش دان، جس کے پاس وہ کرسی سے جکڑی بیٹھی۔ آتش دان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ ہرا قلیطس کی دائمی آگ۔ ساتھ ہی لوہے کی چند سلاخیں پڑی الاؤ میں دہک رہی تھیں۔ ان کے سرے پہ انگریزی کے مختلف حروف لکھے تھے اور وہ حروف دہک دہک کر سرخ انگارے بن چکے تھے۔

آتش دان کے ایک طرف ایک چھوٹی انگیٹھی رکھی تھی۔ اس میں جلتے انگاروں پہ ایک برتن میں شہد کی طرح کا گاڑھا سا مائع ابل رہا تھا۔ اس کی بو سارے کمرے میں پھیلی تھی۔ شہد سے زیادہ بھورا مائع۔ وہ شاید ویکس تھی۔

اس نے گردن گرادی۔ اس کی ہمت ختم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب بہت دیر سے اس کمرے میں تنہا پڑی تھی اور یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس نے وہ کال ضائع کر دی۔ پتا نہیں وہ کون تھا اور اسے اس کی بات سمجھ میں آئی بھی تھی یا نہیں اور وہ کچھ کرے گا بھی یا نہیں۔ اگر وہ گھر فون کر لیتی تو شاید..... مگر نہیں، گھر فون کرنے کی صورت میں بات پھیل جاتی اور اس سے تو بہتر تھا کہ وہ یہیں پڑی رہتی۔ لیکن بات تو اب بھی پھیل جائے گی اور جو ذلت، جو بدنامی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ بھولی بسری سی ویڈیو آ گئی۔

شریفوں کا مجرا۔

''نہیں، پلیز اللہ تعالیٰ، پلیز میری مدد کریں۔'' وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ دعا مانگنے گئی۔ اس کی دعا پہلے قبول نہیں ہوئی تھی، شاید اب ہو جائے۔ شاید اب اس کی مدد کر دی جائے۔

آتش دان کے قریب ہونے کے باعث تپش اس تک پہنچ رہی تھی اور اس مسلسل حدت سے اس کے پاؤں دہکنے لگے تھے۔ وہ زرد الاؤ کو دیکھ رہی تھی جس کی سرخ لپٹیں اٹھ اٹھ کر ہوا میں گم ہو رہی تھیں۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی اس کا سارا وجود گویا آگ میں دہک رہا تھا۔ لمبے بال کمر اور کندھوں پہ بکھرے تھے، وہ ان کو سمیٹنے پہ بھی قادر نہیں تھی۔ اس نے پورا زور لگا کر کرسی کو پیچھے دھکیلنا چاہا، مگر وہ نہیں ہلی۔ پسینے کی چند بوندیں اس کی گردن اور پیشانی پہ چمک رہی تھیں۔

دفعتاً دروازہ کھلا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ایک پستہ قد، چینی نقوش کا حامل شخص تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا بیگ تھا۔ جسے اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی میز پہ رکھا پھر اس کی طرف آیا اور ایک ہاتھ سے کرسی کا رخ اپنی جانب موڑا اور ہاتھ سے ڈکٹ ٹیپ کا کنارا پکڑ کر کھینچ کر اتارا۔

''آہا..... نتاشا!'' وہ قریب سے دیکھنے پہ کوئی روسی لگتا تھا۔

''میں نتاشا نہیں ہوں، پلیز مجھے جانے دو۔'' ایک امید سی بندھی کہ وہ اسے کسی اور کے دھوکے میں پکڑ لائے تھے۔

''ناؤ یو آر نتاشا..... انگلش، انگلش؟ آل رائٹ، آل رائٹ!'' وہ اثبات میں سر ہلا کر مسکراتا ہوا انگیٹھی کی طرف بڑھ گیا۔

''پلیز مجھے جانے دو۔'' وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی۔ وہ آگ کے ساتھ کھڑا تھا۔ تپش کا رستہ رک گیا۔ ذرا سا سکون ملا۔

''پور کنٹری، تورسٹ گرل، پور پیپل!'' وہ نفی میں سر ہلا کر ایک سلاخ اٹھائے اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔

''میرا باپ امیر آدمی ہے، وہ تمہیں تاوان کی رقم دے دے گا۔''

''سو نتاشا، یو وانٹ انگلش نیم؟'' وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہتا اس کی طرف پلٹا۔ وہ جواب دیے بنا یک ٹک اس سلاخ کو دیکھے گئی جس پہ لکھا ''ایم'' دہک رہا تھا۔ یا شاید وہ ''ڈبلیو'' تھا۔

وہ سلاخ کیوں دہکا رہا تھا؟ کس لیے؟''

''ایک خوف سا اس کے اندر سر اٹھانے لگا۔ اسے بے اختیار اس کمرے میں بے سدھ پڑی لڑکی کا بازو یاد آیا۔ وہ ٹیٹو نہیں تھا۔ وہ لمحے بھر میں جان گئی تھی۔

''یو وانٹ انگلش نیم؟'' وہ اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''نو..... نو.....'' وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلاتی بڑبڑائی۔

''ناؤدس از یورنیم!'' وہ سلاخ کا دہکتا لوہا اس کے قریب لایا۔

''نہیں.....نہیں.....'' وہ گردن دائیں بائیں ہلاتی زور سے چلانے لگی۔ وہ اسے اس گرم لوہے سے داغنے لگا تھا۔ اس کا چہرے خوف و دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔

''یورنیم!'' اس نے جتا کر کہتے سلاخ حیا کے بازو کے قریب کی جہاں فراک کی چھوٹی آستین ختم ہوتی تھی۔ کندھے سے ذرا نیچے وہاں وہ سلاخ قریب لے گیا۔ اسے دہکتے انگارے کی حدت محسوس ہوئی۔ وہ تڑپ کر ادھر ادھر سر مارنے لگی۔

''نہیں پلیز.....نہیں.....''

اس لمحے اس نے بہت دل سے دعا کی تھی کہ کوئی آ جائے اور اس پست قد روسی سے اسے نجات دلا دے۔ کوئی آ جائے، چاہے وہ عبدالرحمن پاشا ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی تو.....

روسی نے دہکتا ہوا لوہا اس کے بازو کے اوپر حصے پہ رکھ کر دبایا۔ وہ بری طرح سے بلبلا اٹھی۔ اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ نکلی تھی مگر وہ اسی طرح زور دے کر سلاخ دبائے کھڑا تھا۔

اندر سے ماس جلنے لگا تھا۔ وہ روح میں اتر جانے والی، زخمی کر دینے والی بدترین جلن تھی۔ وہ چیخ رہی تھی، وہ رو رہی تھی۔

چند لمحے بعد اس نے سلاخ اٹھالی۔ وہ مکمل طور پہ جل گئی تھی۔

روسی دوبارہ پلٹا اور سلاخ رکھ دی۔ اس کے دائیں بازو کے اوپری حصے پہ سیاہ، جلا ہوا حرف لکھا تھا۔

روسی واپس اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ حیا نے متورم، سرخ نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور دہل کر رہ گئی۔ اس کے ہاتھ میں دوسری سلاخ تھی جس پہ HO لکھا تھا، اور اوپر تلے لکھے دونوں حروف انگارہ بن چکے تھے۔

''نہیں.....تمہیں اللہ کا واسطہ.....نہیں۔'' وہ وحشت سے تڑپتی خود کو پیچھے دھکیلنے لگی مگر رسیوں نے اسے اتنی مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا کہ وہ ہل بھی نہ پائی۔

''نہیں.....'' وہ خوف سے چلا رہی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا سیاہ داغے گئے حرف تلے سلاخ گاڑ دی۔

کھولتا ہوا گرم درد، دہکتے انگارے، آگ اس کی تکلیف آخری حد کو چھونے لگی۔ وہ درد سے گھٹی گھٹی سی چیخ رہی تھی۔ اسے لگا وہ اس تکلیف میں مرنے والی ہے۔ وہ جسم کے اندر تک گھس کر جلا دینے والا درد تھا۔

چند لمحوں بعد اس نے سلاخ ہٹائی تو حیا کی گردن بے دم سی ہو کر ایک جانب ڈھلک گئی۔ اس کا تنفس آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ تکلیف سے وہ ہوش کھونے والی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا مگر مزید رونے کی سکت وہ خود میں نہیں پاتی تھی۔

روسی اب تیسری سلاخ اٹھا لایا تھا۔ اس پہ RE لکھا تھا۔ حیا نے تکلیف سے بند ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس میں مزید کچھ کہنے کی سکت نہیں رہی تھی، اپنی ساری زندگی فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ بچپن کے دن، یادیں، اس کے نانا کا گھر، اس کی نانی اس کے لمبے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھیں۔ منظر بدل گیا۔ وہ اور روحیل کار کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھے تھے، اسکول بیگ لیے، وہ اسکول جا رہے تھے، روحیل کچھ بتا رہا تھا اور وہ ہنس رہی تھی۔ پھر اس نے خود کو ابا کی لائبریری میں دیکھا۔ وہ ان کی ایک موٹی سی کتاب کھول رہی تھی جس میں سوکھا پھول رکھا تھا، وہ اس نے خود ہی وہاں رکھا تھا۔ اب وہ تایا فرقان کو اپنے عید کے کپڑے ہینگر سے اٹھائے دکھا رہی تھی، اور وہ اس کا جوش و خروش اور خوشی دیکھ کر مسکرا رہے تھے روحیل اس کے ساتھ لان میں بھاگ رہا تھا، ان کے آگے دو خرگوش دوڑ رہے تھے۔ وہ دوڑ دوڑ کر تھک گئی تھی۔ اس کے لمبے بال کمر پہ بکھرے تھے۔ خرگوش گھاس پہ دور بھاگتے جا رہے تھے۔ سفید.....نرم نرم سے خرگوش.....

روسی نے گرم سلاخ اس کے بازو میں مس کی، ایک کھولن سی اس کے اندر اترتی گئی۔ اگلے ہی پل، اس نے کرنٹ کھا کر سلاخ ہٹائی کہیں فون کی گھنٹی بجی تھی۔

خرگوش غائب ہو گئے۔ درد ہر شے پہ غالب ہو گیا۔ وہ پہلی دو دفعہ سے کئی گناہ زیادہ شدید درد تھا کیونکہ سلاخ جلدی ہٹانے کے باعث جلد پوری نہیں جلی تھی اور حسیات باقی تھیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کی ہمت ختم ہو گئی ہے، مگر وہ پھر سے رو رہی تھی۔

''فون؟ یورفون؟'' آواز کے تعاقب میں وہ آگے بڑھا اور اس کے فراک کی بیلٹ سے لگا پرس نوچا۔ سیفٹی پن ٹوٹ گئی، کپڑا پھٹ گیا۔ اس نے تیزی سے پرس کھولا اور فون نکالا۔ وہ زور زور سے بج رہا تھا۔

شدید تکلیف میں بھی وہ پہلی بات اس کے ذہن میں آئی تھی وہ یہی تھی کہ اس کا فون رومنگ پہ تھا اور بیلنس ختم، پھر فون کیسے بجا؟ روسی کبھی بے یقینی سے اسے دیکھتا، کبھی فون کو۔ پھر اس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ اس پہ اس نے جلدی سے فون بند کیا اور پوری قوت سے اسے دیوار پہ دے مارا۔ فون کی اسکرین چکنا چور ہوتی زمین پر جا گری۔

''یو کالڈ سم ون؟'' وہ وحشیوں کی طرح اس پہ جھپٹا، اور گردن کے پیچھے سے بال دبوچ کر اس کے چہرہ سامنے کیا۔ حیا نے نیم جاں، نڈھال آنکھوں سے اس کو دیکھا اور پھر اس کے منہ پہ تھوک دیا۔

وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے بال چھوڑے اور انگیٹھی پہ دہکتا برتن ہینڈل سے اٹھایا۔ کھولتی ہوئی ویکس۔

''یو...... یو بچ!'' وہ غصے سے مغلظات بکتا اس کے قریب آیا اور برتن اس کے سر پہ اونچا کیا۔

''نن...... نو......'' اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ ''میرے بال......'' اس کے لبوں سے بس اتنا ہی نکل پایا تھا کہ روسی نے برتن اس کے سر پہ الٹ دیا۔

گرم، کھولتی ہوئی ویکس تیزی سے اس کے بالوں کی مانگ پہ گری اور ہر طرف سے نیچے لڑھکنے لگی۔ اس کی لخراش چیخ نکلی۔ ابلتے مادے نے اس کے سر کی جلد کو گلا دیا تھا۔ بازو کا درد غائب ہو گیا، وہ وحشیانہ انداز میں زور زور سے چیخ رہی تھی، اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ بھی چیخ رہا تھا۔ اور تب اس نے زور سے اس کی کرسی کو دھکا دے کر الٹ دیا۔ وہ کرسی سمیت اوندھے منہ زمین پہ جا گری۔ آتش دان کے بالکل قریب۔

کمرے میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔ ویکس اس کے سر پر جمنے لگا تھا۔ اس کا سر بے حد زخمی ہو گیا تھا۔ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ کمرے میں دھواں بڑھتا جا رہا تھا۔ آتش دان سے آگ کی لپیٹیں لپک لپک کر اس کی طرف آ رہی تھیں۔

اس نے زمین پہ گرے، گال فرش پہ رکھے بند ہوتی آنکھوں سے اس دھندلے منظر کو دیکھا۔ دھوئیں کے اس پار کوئی اس روسی کا سر پکڑ کر دیوار سے مار رہا تھا۔ چیخیں، دھواں، آگ، خون۔ اس کا پورا جسم آگ میں دہک رہا تھا۔

جو آخری شے اس نے دیکھی، وہ اس کا سیاہ فراک کا دامن تھا، آگ کی ایک لپیٹ نے اسے چھو لیا تھا۔ اس نے سیاہ کپڑے کو زرد شعلے میں بدلتے دیکھا۔ ہر طرف دھواں تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ وہ مر رہی تھی۔ اس کے سفید خرگوش اس دھوئیں میں غائب ہو رہے تھے۔ وہ جل کر مر رہی تھی، ہراقلیطس کی دائمی آگ ہر سو پھیل رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ وہ...... سفید چھت اس کی نگاہوں کے سامنے تھی جس پہ خوبصورت نقش و نگار بنے تھے۔ درمیان میں ایک قیمتی نفیس فانوس لٹک رہا تھا۔

اس کا سر ایک نرم، گداز تکیے پہ تھا اور مخملیں کمبل گردن تک ڈالا تھا۔ اس نے ایک خالی خالی سی نگاہ کمرے پہ دوڑائی۔ وسیع و عریض، پرتعیش بیڈ روم، ایک طرف دیوار گیر کھڑکی کے آگے برابر کیے گئے سفید جالی دار پردے جن سے صبح کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

اس نے آنکھیں پھر سے موند لیں اور ان پہ بازو رکھ لیا۔ ان گزرے دنوں میں سوتی جاگتی کیفیت میں وہ بہت روئی تھی، بہت چلائی تھی۔ یہ کمرا اس نے دیکھا تھا۔

وہ ادھر ہی لائی گئی تھی۔ ہاتھ سے لگی ڈرپ اپنے بالوں میں نرمی سے چلتے اس بھوری آنکھوں والی لڑکی کے ہاتھ، وہ انجکشن، نیم بے ہوشی۔ اسے ٹوٹا ٹوٹا سا سب یاد تھا اور اس ڈوبتی، ابھرتی نیند میں بھی وہ جانتی تھی کہ وہ بیوک ادا میں ہے، عبدالرحمن پاشا کے سفید محل میں۔

دروازے پہ دھیرے سے دستک ہوئی اور پھر وہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ قدموں کی نرم سی آواز بیڈ کے قریب آئی۔ اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کون تھی۔

''صبح بخیر! نیند پوری ہو گئی ہے تو اٹھ جاؤ، ناشتا کر لو۔''

✿......✿......✿

باب 6

نرم لہجے کے ساتھ اسے سائیڈ ٹیبل پہ ٹرے رکھنے کی آواز آئی۔ وہ ہلی تک نہیں۔
''نیند اچھی ہے لیکن زیادتی اگر اچھی چیز کی بھی ہو تو نقصان دہ ہوتی ہے۔ یہ کھیرے کا سوپ ہے اور ساتھ ناشتہ''۔
حیا ہنوز آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی رہی۔
''اور یہ عبدالرحمٰن کی کال ہے، وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے''۔
اس نے بازو چہرے سے ہٹایا۔ سبز اسکارف چہرے کے گرد لپیٹے، نیچے سرمئی اور گلابی پھول دار اسکرٹ پہ لمبا سفید سوئیٹر پہنے وہ ہاتھ میں پکڑا کارڈلیس فون اس کی جانب بڑھائے ہوئے تھی۔
''لو، بات کرو!'' اس کے کم عمر چہرے پہ ایک معصومیت بھری شفافیت تھی اور اس کی آنکھیں جو رات میں حیا کو بھوری لگی تھیں، صبح کی روشنی میں سبز لگ رہی تھیں۔ وہ دنیا کا سب سے شفاف، سب سے خوب صورت چہرہ تھا۔
''مجھے اس سے بات نہیں کرنی''۔ وہ بولی تو اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت چیخنے کے باعث اب گلا جواب دے گیا تھا۔
''وہ کہہ رہی ہے، اسے تم سے بات نہیں کرنی''۔ اس نے فون کان سے لگا کر نرم لہجے میں انگریزی میں بتایا۔
''وہ کہہ رہا ہے، ایک دفعہ اس کی بات سن لو''۔
''اس سے کہو، جو اس نے میرے لیے کیا، میں اس کی احسان مند ہوں، شکر گزار ہوں لیکن اگر اس کے بدلے میں وہ مجھے یوں اذیت دینا چاہتا ہے تو میں ابھی اسی وقت اس کے گھر سے چلی جاؤں گی''۔ وہ بے حد رکھائی سے بولی۔ عائشے گل کا چہرہ جوابا ویسا ہی نرم اور شفاف رہا۔ اس نے سن کر فون کان سے لگایا اور ساری بات من وعن انگریزی میں دہرا دی۔ پھر فون بند کر دیا۔
''وہ کہہ رہا ہے کہ وہ انڈیا میں ذرا پھنس گیا ہے، وہ ادھر نہیں آسکے گا اور آئے گا بھی نہیں اگر تم یہ نہیں چاہتیں اور تم جب تک چاہے ادھر رہ سکتی ہو۔ میں یہاں بیٹھ جاؤں؟'' اس نے کارڈلیس میز پہ رکھتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
وہ نہ اجنبیوں سے جلدی گھلتی ملتی تھی اور نہ ہی اسے پاشا کے گھر والوں سے راہ و رسم بڑھانے میں دلچسپی تھی مگر اس لڑکی کا چہرہ اتنا نرم اور دوستانہ تھا کہ خود بخود اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔
''شکریہ''۔ وہ اسی مدھر مسکراہٹ کے ساتھ کہتی کرسی پہ ٹیک لگا کر بیٹھی، سفید سوئیٹر میں مقید کہنیاں کرسی کے دونوں بازوؤں پہ رکھیں اور ہتھیلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے عادتاً اپنی انگوٹھی انگلی میں گھمانے لگی۔
''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''
''ٹھیک ہے''۔ وہ کہنی کے بل ذرا سی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔
''تم عبدالرحمٰن کی طرف سے پریشان مت ہونا اس نے کہا کہ نہیں آئے گا تو نہیں آئے گا۔ جو اس نے تمہارے لیے کیا، وہ اس کا فرض تھا۔ سفیر کی فیملی سے ہمارے پرانے تعلقات ہیں جب تم نے سفیر کو فون کیا تو اس نے فوراً عبدالرحمٰن کو اپروچ کیا، یوں پولیس کی مدد لے کر وہ تمہیں وہاں سے نکال لائے''۔
''مجھے کس نے اغوا کیا تھا؟'' وہ بہت دیر بعد بس اتنا ہی کہہ پائی۔
''یہاں بہت سے ایسے گروہ ہیں جو روس، مالدووا اور یوکرائن سے لڑکیاں اغوا کر کے یا دھوکے سے ادھر لاتے ہیں، اس کے علاوہ ان ٹورسٹ لڑکیوں کو جن کا تعلق کسی ایسے غریب ملک سے ہو کہ ان کے گھر والے ترکی آ کر زیادہ دیر تک کیس کا تعاقب نہ کر سکیں، ان کو بھی یہ اغوا کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کے پاس پہنچنے کے بعد سب لڑکیاں 'نتاشا' بن جاتی ہیں۔ یہ ان نتاشاز کو آگے بیچ دیتے ہیں اور ان سے

وائٹ سلیوری White Slavery کروائی جاتی ہے“۔
اس نے تکلیف سے آنکھیں موند لیں۔ اسے یاد آ گیا تھا۔ نتاشا، ترکی میں کام کرنے والی روسی کال گرل کو کہتے ہیں۔
”تم چھوڑو یہ سب، اپنے گھر فون کر لو۔ دو دن ہو گئے ہیں، تمہیں انہیں اپنی خیریت کی اطلاع تو دینی چاہیے“۔
اس نے جواب نہیں دیا۔ بس خالی خالی نگاہوں سے کھڑکی کے جالی دار پردے کو دیکھتی رہی جو ہوا سے ہولے ہولے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کے پاس جواب تھا بھی نہیں۔
”میں اور بہارے جنگل تک جا رہے ہیں، تم چلو گی؟“
اس نے بنا تردد کے نفی میں گردن ہلا دی۔ عائشے کے چہرے پہ ذرا سی اُداسی پھیلی۔
”چلو، جیسے تمہاری خوشی۔ آج نہیں تو کل تم ضرور ہمارے ساتھ چلنا“۔ اس نے فوراً خود ہی نئی اُمید ڈھونڈ نکالی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ”ناشتہ ضرور کرنا، مہمان بھوکا رہے تو میزبان کا دل بہت دکھتا ہے“۔ شگفتگی سے کہتے ہوئے اس نے کرسی واپس رکھی اور باہر چلی گئی۔
حیا نے کمبل اُتارا اور اُٹھ کر پاؤں نیچے رکھے۔ نرم گداز قالین میں پاؤں گویا دھنس سے گئے۔ وہ اپنے پیروں پہ کھڑی ہوئی تو کمر میں درد کی لہر اُٹھی۔ کرسی سمیت گرنے سے اس کے کندھوں، کمر اور گھٹنوں پہ بہت سی چوٹیں آئی تھیں۔
وہ قالین پہ ننگے پاؤں چلتی ڈریسنگ ٹیبل کے قد آور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کا عکس بہت تھکا تھکا، نقاہت زدہ سا لگ رہا تھا۔ متورم آنکھوں تلے حلقے، ایک آنکھ کے نیچے گہرا جامنی سا نیل، پیشانی پہ چند خراشیں، ٹھوڑی پہ بڑی سی خراش، ہونٹ کا دایاں کنارہ سوجا ہوا اور...... اس نے اُنگلیاں اوپر سے نیچے اپنے بالوں پہ پھیریں۔
وہ ایسے ہی تھے، اتنے ہی لمبے اتنے ہی گھنے، مگر ان کی چمک کھو گئی تھی۔ وہ ریشمی پن جو ہمیشہ ان میں چمکتا تھا، اب وہاں نہیں تھا۔ جانے کیسے عائشے نے وہ ویکس اُتاری اور اس دوران کتنے بال ٹوٹے وہ نہیں جانتی تھی۔ ویکس ڈھل گئی مگر جو تکلیف اس نے سہی تھی، وہ ایسے نہیں ڈھل سکتی تھی۔
پولیس یا پاشا کے بندے، جو بھی اس وقت دروازہ توڑ کر اندر آئے تھے، انہوں نے اس کے فراک کے دامن کو آگ پکڑتے ہی بجھا دیا تھا مگر جتنا وہ پستہ قد روسی اسے جلا چکا تھا، حیا کو لگا وہ جلن ساری زندگی تکلیف دیتی رہے گی۔
وہ اس وقت ڈھیلے ڈھالے اسپتال کے گاؤن میں تھی۔ اس نے دائیں آستین دوسرے ہاتھ سے اوپر کندھے تک اُٹھائی۔ بازو کے اوپری حصے پہ اوپر سے نیچے سیاہ راکھ کی طرح کے لکھے تین حروف ویسے ہی تھے۔ ”WHO“۔ باقی کے دو حروف RE چونکہ داغے ٹھیک سے نہیں گئے تھے اس لیے ان پہ چھالا سا بن گیا تھا۔ چھالا ختم ہونے کے بعد ان کا نشان نہیں رہنا تھا۔ جو رہ گیا تھا، وہ WHO تھا۔
”WHO!“ اس نے زیرِ لب دہرایا۔ وہ کون تھی؟ کیوں کسی دوسرے کے گھر یوں پڑی تھی، وہ بھی ایک ایسے شخص کے گھر جس کو وہ سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس کا گھر کال کرنے یا واپس سبانجی جانے کا دل کیوں نہیں چاہا تھا؟
شاید اس لیے کہ اس رات پھپھو اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے اس کے نہ آنے پہ ان دو دنوں میں ہر جگہ پتا کیا ہو گا اور اب تک پاکستان میں یہ بات پہنچ گئی ہو گی۔ کیا اب وہ کبھی واپس جا سکے گی؟ عزت سے جی سکے گی؟ کسی کو منہ دکھا سکے گی؟ کیا ابا، تایا فرقان اور صائمہ تائی کا سامنا کر سکیں گے؟ یا اس نے اپنے ماں باپ کو سارے خاندان میں بے عزت کر دیا تھا؟ کون اس کی دہائی سنے گا کہ وہ بھاگی نہیں تھی، اغوا ہوئی تھی۔ اس کے خاندان میں اور اس کے ملک میں اغوا ہونے والی لڑکی اور گھر سے بھاگنے والی لڑکی میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔
اسے لگا ”شریفوں کا مجرا“ بھرے بازار میں چلا دیا گیا تھا۔ وہ واقعی بدنام ہو گئی تھی۔
وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی اور جالی دار پردہ ہٹایا۔ پھر کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ سمندر کی سرد برفیلی ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی اور کھلے بال پیچھے کو اُڑانے لگی۔
وہ دوسری منزل کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ نیچے اسے باغیچہ نظر آ رہا تھا اور اس کے پار لکڑی کا گیٹ جسے ایک بیتی شام اس نے ہذیانی انداز میں بھاگتے ہوئے پار کیا تھا۔

باغیچے میں ایک خوب صورت، شاہانہ سی بگھی کھڑی تھی۔ اس میں ایک چکنا سفید گھوڑا جتا تھا۔ بگھی کے پیچھے ایک لکڑی کا صندوق نصب تھا جس کا ڈھکن کھولے کھڑی عائشے گھاس سے چیزیں اُٹھا کر اس میں رکھ رہی تھی۔ آرے، کلہاڑے، چاقو اور ایسے کئی اوزار۔ چھوٹی بچی بہارے سرخ چمکتے سیبوں سے بھری ٹوکری لیے بگھی میں اوپر چڑھ رہی تھی۔ اندر بیٹھ کر اس نے ٹوکری گود میں رکھ لی۔ وہ جس حصے میں بیٹھی تھی، وہ حیا کے سامنے تھا۔ عائشے، صندوق کا ڈھکن بند کر کے پیچھے سے گھوم کر دوسری طرف آ بیٹھی۔

دفعتاً بہارے کی نگاہ اوپر کھلی کھڑکی میں کھڑی حیا پہ پڑی۔

"حیا!" اس نے جلدی سے ہاتھ ہلایا۔ اس کے پکارنے پہ اس کے بائیں جانب بیٹھی عائشے نے آگے ہو کر چہرہ بہارے کے کندھے سے اس طرف نکال کر حیا کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

وہ مسکرا نہیں سکی، بس تھوڑا سا ہاتھ اُٹھا کر واپس گرا دیا۔

دفعتاً عائشے نے جھک کر بہارے کے کان میں کچھ کہا تو بچی نے "اوہ" کہہ کر جلدی سے ٹوکری سے ایک سرخ سیب نکالا اسے اپنے فراک سے رگڑا اور "کیچ" کہتے ہوئے اوپر کی سمت اُچھالا۔ لاشعوری طور پہ اس نے ہاتھ بڑھائے مگر اُڑ کر آتا سیب اوپر بالکونی کی ریلنگ میں اٹک گیا۔

"اوہ نو!" بہارے نے مایوسی سے گردن پیچھے کو پھینکی۔ اسی اثنا میں بگھی بان گھوڑے کو چابک مار چکا تھا۔ بگھی گھوڑے کے پیچھے کھنچتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔

وہ کھڑکی سے ہٹ آئی۔ بہارے کا سیب وہیں ریلنگ گرل کے ڈیزائن میں پھنسا رہ گیا۔

وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ لکڑی کے فرش کی چمکتی راہ داری سنسان پڑی تھی۔ وہ ننگے پاؤں چلتی آگے آئی۔ راہ داری کے سرے پہ ایک کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ اس کے آگے جہاں راہداری ختم ہوتی تھی وہاں ایک گول چکر کھاتا لکڑی کا زینہ تھا جو نیچے لونگ روم سے شروع ہو کر بالائی منزل کی راہداری، جہاں وہ کھڑی تھی، سے ہوتا ہوا اوپر تیسری منزل تک جاتا تھا۔ اس نے گردن اُٹھا کر اس بلند و بالا سفید محل کو دیکھا۔ اگر کبھی اسے اس محل سے بھاگنا ہو تو سارے چور راستے اسے معلوم ہوں۔ اسے اب کسی پہ بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔

حیا نے کمرے کا نیم وا دروازہ پورا کھول دیا۔ وہ ایک چھوٹا اسٹڈی روم تھا جس میں آبنوسی اور صنوبر کی لکڑی کے بک شیلف بنے تھے، وہاں، بہت سی بیش قیمت کتب سجی تھیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی اندر آئی۔

اسٹڈی کی دیواروں پہ جابجا بڑے بڑے فوٹو فریم نصب تھے۔ وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں انہیں دیکھے گئی۔ وہ سب اس کی تصاویر تھیں۔ کب لی گئیں، کیسے لی گئیں، وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ تو بس مبہوت سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ دادر بھائی کی مہندی والے روز اپنے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ ایک ہاتھ سے لہنگا ذرا سا اُٹھائے، دوسرے سے آنکھ کا کنارہ صاف کرتی ہوئی۔

وہ کار کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی تھی۔ ریڈ فراک میں ملبوس، بال کانوں کے پیچھے اڑستی، مضطرب سی کچھ کہتی ہوئی۔ دادر بھائی کی شادی کی شام البتہ ساتھ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا ولید تصویر میں نہیں تھا۔

اور یہ تصویر جناح سپر کی تھی۔ وہ سر جھکائے، جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس نیم تاریک چبوترے کے سامنے چل رہی تھی۔ سڑک پہ دکانوں کی زرد روشنیوں کا عکس جھلملا رہا تھا اور بھی بہت سی تصویریں...... بہت سے واقعات......

وہ ایک دم پلٹی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

ہر سُو آگ پھیلی تھی۔ زرد، سرخ لپیٹیں کسی اژدہے کی زبان کی مانند لپک لپک کر اس کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ وہ وسط میں کھڑی تھی اور اطراف میں دائرے کی صورت میں الاؤ بھڑک رہا تھا۔ شعلے ہر گزرتے پل بڑھتے جا رہے تھے، ہر سُو دھواں تھا۔ اس کے سیاہ فراک کا دامن جل رہا تھا۔ دھواں، سرخ شعلے...... ہراقلیطس کی دائمی آگ......

گرمی کی حدت ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی۔ وہ بری طرح سے جل رہی تھی۔

"پانی...... پانی ڈالو میرے اوپر......" وہ تکیے پہ بند آنکھوں سے گردن اِدھر اُدھر مارتی، ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگا تھا۔ تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔ گرمی...... اسے گرمی لگ رہی تھی۔

وہ لحاف پھینک کر تیزی سے باہر بھاگی۔ لکڑی کا گول چکر کھاتا زینہ اس نے دوڑتے قدموں سے عبور کیا اور بنا کسی طرف دیکھے، باہر کا دروازہ پار کر گئی۔ باغیچے میں اُتر کر وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔

رات ہر سُو پھیلی تھی۔ بارش تڑاتڑ برس رہی تھی۔ سیاہ آسمان پہ کبھی کبھی چمکیلی بجلی نمودار ہوتی تو پل بھر کو سڑک اور سارے بنگلے روشن ہو جاتے، پھر اندھیرا چھا جاتا۔ وہ دونوں بازو سینے پہ لپیٹے اس برستی بارش میں سڑک پہ چلتی جا رہی تھی۔ آسمان کے تھال گویا اُلٹ گئے تھے، بارش تڑاتڑ گرتی اس کو بھگو رہی تھی۔

اس کا پاؤں کسی پتھر سے ٹکرایا تو اسے ٹھوکر لگی۔ وہ گھٹنوں کے بل پتھریلی زمین پہ گر گئی۔ ہتھیلیاں چھل گئیں، گھٹنوں پہ بھی خراشیں آئیں۔ اس نے ہتھیلیاں جھاڑتے ہوئے اُٹھنا چاہا، کمر میں درد کی شدید لہر اُٹھی۔ وہ واپس بیٹھ گئی، گھٹنوں کے بل، سڑک کے وسط میں۔

پانی سے اس کا لباس بھیگ چکا تھا۔ بال موٹی لٹوں کی صورت چہرے کے اطراف سے چپک گئے تھے، اس کے اندر کی آگ سرد پڑنے لگی تھی۔ جامنی پڑتے لب کپکپانے لگے تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کسی معمول کی طرح چلتی ہوئی وہ واپس اس سفید محل تک آئی تھی۔

لونگ روم کی انگیٹھی میں دو لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اندھیرے کمرے میں آگ اور اوپر لگے مدھم سے زرد بلب کی روشنی نے عجب فسوں طاری کر رکھا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے یہ سب نہیں دیکھا تھا مگر اب چوکھٹ پہ کھڑی وہ دیکھ رہی تھی۔ عائشے بڑے صوفے پہ سر جھکائے بیٹھی، سامنے میز پہ رکھے کاغذ پہ پیمانے سے لکیر کھینچ رہی تھی۔ آہٹ پہ اس نے گردن موڑی۔

"آؤ، بیٹھو"۔ وہ نرمی سے کہتی صوفے کے ایک طرف ہوگئی اور دونوں ہاتھوں سے وہ لمبا سا کاغذ رول کرنے لگی۔

"یہ آگ بجھا دو!" وہ آتش دان میں بھڑکتے شعلوں کو دیکھتے ہوئے بولی تو اس کی آواز بیوک ادا کی بارش کی طرح گیلی تھی۔

عائشے بنا تردد کے اُٹھی اور آتش دان کے ساتھ لگا سوئچ گھمایا۔ آگ بجھ گئی۔ مصنوعی انگارے سرخ رہ گئے جو دراصل ہیٹر کے راڈ تھے جس سے بھڑکنے والی آگ اس مصنوعی لکڑیوں کے اوپر یوں اُبھرتی گویا اصلی لکڑیاں جل رہی ہوں۔

"اب آؤ"۔ اپنی بات دُہرا کر عائشے رول کر کے لپیٹے کاغذ پہ ربڑ بینڈ چڑھانے لگی۔

وہ میکانکی انداز میں چلتی آگے آئی اور صوفے کے دوسرے کنارے پہ ٹک گئی۔ اس کی نگاہیں بجھتے انگاروں پہ تھیں جو اپنا سرخ رنگ کھو رہے تھے۔

"اپنے گھر فون کرلو، وہ لوگ پریشان ہوں گے"۔

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں سب کو کیسے فیس کروں گی؟" آتش دان پہ جمی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں سراسیمگی تیر رہی تھی۔

"جس اللہ نے تمہاری پہلے مدد کی ہے، وہ اب بھی کرے گا"۔

"تین دن ہوگئے ہیں، اب تک سب کو پتا چل گیا ہوگا"۔

"جب تمہارا قصور نہیں ہے تو ڈرو بھی مت"۔ عائشے نے کارڈلیس اس کی طرف بڑھایا۔ "اگر انہوں نے کوئی غلط بات کی تو میں دوبارہ نہیں کہوں گی مگر ایک دفعہ کوشش کرلو"۔

اس نے کارڈلیس پکڑتے ہوئے عائشے کو دیکھا۔ سیاہ اسکارف میں لپٹا اس کا چہرہ مدھم روشنی میں بھی دمک رہا تھا۔ اب اس کی آنکھیں گہری لگ رہی تھیں۔ سیاہی مائل گہری۔

اس نے وال کلاک کو دیکھا۔ یہاں آدھی رات تھی تو وہاں نو، دس بجے ہوں گے۔ گھر کا نمبر اسے زبانی یاد تھا، وہ بھیگی اُنگلیوں سے بٹن پش کرنے لگی، پھر فون کان سے لگایا۔

عائشے اپنے پیمانے، پرکار اور پنسل سمیٹ کر چھوٹی تھیلی میں ڈالنے لگی۔

''ہیلو''۔ وہ فاطمہ کی آواز تھی۔

''ہیلواماں؟ میں حیا۔...''اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔''کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں، سوری بیٹا! میں تمہیں اتنے دن فون ہی نہیں کرسکی۔ اصل میں مہوش کی دعوتیں ہورہی ہیں، آج کل پوری فیملی میں، کبھی کدھر تو کبھی کدھر۔ اتنی مصروف رہی کہ روز فون کرنا ہی رہ جاتا تھا''۔

''ابا......ابا کدھر......؟''اس سے بولا نہیں جارہا تھا۔

''وہ یہ سامنے ہی بیٹھے ہیں، کراچی گئے تھے، آج ہی واپسی ہوئی ہے......''اماں اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کے سینے میں اٹکی سانسیں بالآخر بحال ہوئیں۔ دکھتے سر میں درد ذرا کم ہوا۔

کسی کو پتا نہیں چلا تھا۔

اماں سے پھپھو کا نمبر لے کر اس نے انہیں کال کی۔

''اچھی بھتیجی ہو تم بھی۔ کھانے کا کہہ کر غائب ہی ہو گئیں۔ میں پہلے تو اتنی پریشان رہی، سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ جہان کو پوری رات سخت بخار رہا، اس کو بھی نہیں اٹھا سکتی تھی۔ تمہارے دونوں نمبرز بھی بند تھے۔ صبح ہوتے ہی تمہارے ہاسٹل گئی تو وہ جو فلسطینی لڑکا ہے نا......''

''معتصم الرتضٰی؟''

''ہاں وہی، اس نے بتایا کہ تم نے اپنی ہوسٹ آنٹی کے گھر رُکنا تھا، مجھے بتا تو دیا ہوتا حیا......''پھپھو فکر مند سی تھیں۔ اوہ! معتصم......وہ اس پزل میں اتنا اُلجھا ہوا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ حیا نے پھپھو کے گھر رُکنا ہے یا ہوسٹ آنٹی کی طرف۔ ان کی تسلی تشفی کروا کر، پرس میں پانی جانے سے دونوں فونز خراب ہونے کی یقین دہانی کروا کر جب اس نے فون بند کیا تو عائشے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''میں نے کہا تھا نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تم آرام سے ڈھیر سارے دن ہمارے ساتھ رہو۔ کل ہم تمہیں اپنے ساتھ جنگل لے جائیں گے، چلو گی نا''۔

''ہاں......چلوں گی''۔ وہ ذرا سا مسکرائی۔ اس کے بالوں کے سروں سے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے۔

''آگ سے مت ڈرا کرو۔ آگ سے اسے ڈرنا چاہیے جس کے پاس اللہ کو دکھانے کے لیے کوئی اچھا عمل نہ ہو۔ تم تو اتنی اچھی لڑکی ہو، تم کیوں ڈرتی ہو؟''

اس نے ویران نگاہوں سے عائشے کا چہرہ دیکھا۔ ذہن کے پردے پہ ایک ویڈیو لہرائی تھی اور اس کے نیچے لکھے کمنٹس۔

''میں اچھی لڑکی نہیں ہوں''۔

''کوئی لڑکی بری نہیں ہوتی، بس اس سے کبھی کبھی کچھ برا ہو جاتا ہے اور تم سے بہت کچھ اچھا بھی تو ہوا ہے نا۔ تم نے ایک امیر اور طاقت ور شخص کے لیے اپنے شوہر کو نہیں چھوڑا، تم نے وفا نبھائی۔ اس سے بڑی اچھائی کیا ہو گی؟''

''میری دُنیا تمہاری دنیا سے مختلف ہے عائشے! ہم میں بہت فرق ہے''۔

''چلو پھر تم ڈھیر سارے دن میری دُنیا میں رہو اور پھر تم مجھے بتانا کہ اُمید اور انجام کے اعتبار سے کس کی دُنیا زیادہ اچھی ہے؟'' ساتھ ہی اس نے مسکرا کر نرمی سے حیا کا ہاتھ دبایا۔

''تم کون ہو عائشے؟ میرا مطلب ہے تمہارا......؟''اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں اس گھر کی مالکن ہوں۔ بہارے میری بہن ہے اور آنے میری دادی کی سگی بہن ہے۔ آنے ترک ہے، مگر اس کا شوہر انڈین تھا''۔

''آنے، عبدالرحمٰن پاشا کی ماں؟''

''ہاں وہی، مگر ہم آنے کو آنے کہتے ہیں، دادی وغیرہ نہیں''۔

''تو عبدالرحمٰن تمہارا چچا لگا؟''وہ سوچ سوچ کر کہہ رہی تھی۔ جواباً وہ سادگی سے مسکرائی۔

''چچا، باپ کا سگا بھائی ہوتا ہے، اس لحاظ سے وہ میرا اور بہارے کا چچا ہے، نہ ہی محرم۔ خیر اب تم سو جاؤ، صبح ملتے ہیں''۔
وہ سر ہلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے واقعی نیند کی ضرورت تھی۔

☆ ☆ ☆

عائشے گل نے کہا تھا کہ اس سفید محل کی مالکن وہ ہے، اس لیے وہ ادھر رک گئی تھی۔ ذہنی اور جسمانی طور پہ وہ قطعاً اتنی صحت یاب نہیں تھی کہ وہ واپس جاتی، ابھی وہ اکیلی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اسے کوئی سہارا چاہیے تھا اور اس نے ان تین عورتوں کو اپنا سہارا بنا لیا۔ آنے آج کل استنبول گئی ہوئی تھیں اور پیچھے گھر میں صرف وہ دونوں بہنیں اس کے ساتھ تھیں۔

صبح اس نے عائشے کا لایا ہوا لباس زیب تن کیا۔ پوری آستینوں والی پاؤں کو چھوتی آف وائٹ میکسی جس کا گلا گردن تک بند تھا اور جگہ جگہ سفید ننھے ننھے موتی لگے تھے۔ بال چہرے کے ایک طرف ڈالے وہ دونوں پہلوؤں سے میکسی ذرا سی اُٹھائے لکڑی کے زینے اُتر رہی تھی جب اس نے عائشے کی آواز سنی۔ وہ نیچے اپنے بیڈ روم کے ادھ کھلے دروازے سے کمبل تہہ کرتے ہوئے بہارے کو آوازیں دیتی نظر آ رہی تھی۔

''بہارے گل، اُٹھ جاؤ۔ اور کتنا سوؤ گی؟'' فیروزی اسکارف اور اسکرٹ بلاؤز پہ لمبا سوئیٹر پہنے، وہ باہر جانے کے لیے تیار تھی۔

''بس پانچ منٹ اور، عائشے گل!'' کمبل سے بہارے کی آواز آئی۔

''ہماری اُمت کے صبح کے کاموں میں برکت ہوتی ہے بہارے! جو علی الصبح روزی کی تلاش میں نکلتے ہیں، ان کا رزق بڑھتا ہے۔ جو پڑھتے ہیں، ان کا علم بڑھتا ہے اور جو سوتے رہتے ہیں، ان کی نیند بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ سارا دن سوتے ہی رہتے ہیں''۔

بہارے منہ بسورتی کمبل پھینک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عائشے اس کا کمبل بھی تہہ کرنے لگی۔

''تم ہمارے ساتھ چلو گی حیا؟'' بہارے نے مندی مندی آنکھوں سے اسے چوکھٹ میں کھڑے دیکھا تو پوچھ اُٹھی۔

''ہاں، ابھی تم جنگل جاؤ گی؟''

''نہیں، پہلے ہم سفیر کی ممی کی طرف جائیں گے، مجھے ذرا کام تھا ان سے۔ ٹھیک ہے نا؟'' عائشے نے تائید چاہی۔

''شیور!'' اس نے شانے اُچکا دیے۔ وہ خود کو ان دو بہنوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ چکی تھی۔

''یہ سب کس لیے؟'' عائشے بگھی کے صندوق میں جھکتے ہوئے اوزار رکھ رہی تھی تو حیا پوچھ اُٹھی۔

''ہم جنگل لکڑیاں کاٹنے جاتے ہیں۔ یہاں لکڑیاں کاٹنے کی اجازت ہے تو نہیں مگر ہمارے پاس خصوصی پرمٹ ہے۔ ہم لکڑی کی چیزیں بنا کر بازار بیچتے ہیں''۔

''اتنے بڑے گھر کی مالکن کو بڑھئی بننے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ بگھی میں چڑھتے ہوئے مسکرا کر بولی تھی۔

''حیا سلیمان، ہمیں انڈر اسٹیمیٹ مت کرو۔ ہم بہت مہنگی چیزیں بناتے ہیں''۔ وہ ہنس کر کہتے ہوئے اندر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں اطراف میں تھیں اور بہارے ان کے درمیان۔

بگھی اب بنگلوں سے گھری سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سارے ماحول میں گونج رہی تھی۔

''عثمان انکل کا گھر کہاں ہے؟''

''وہیں مسجد کے پاس۔ تم نے ہماری مسجد دیکھی ہے نا، وہاں تم ایک دفعہ آئی تھیں''۔

''ہاں مجھے یاد ہے۔ میں نے تب تم دونوں کو دیکھا تھا''۔ وہ ہوا سے اُڑتے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بولی تھی۔ بہارے کے چہرے پہ بار بار اس کے بال اُڑ کر آ رہے تھے، مگر بہارے برا مانے بغیر اپنے گلابی بڑے سے پرس کو سینے سے لگائے خاموش سی بیٹھی تھی، اس کے گھنگھریالے، بھورے بال پونی میں بندھے تھے۔

''تمہارے ساتھ اس دن کوئی تھا؟'' عائشے نے آنکھیں بند کر کے لمحے بھر کو جیسے یاد کیا۔ فیروزی اسکارف میں اس کی بھوری، سبز آنکھیں اب نیلی سبز لگ رہی تھیں۔

''ہاں، وہ میرا کزن ہے اور..... شوہر بھی''۔

''اچھا تھا!'' عائشے مسکرا دی۔

وہ بھی جواباً ذرا سا مسکرائی۔ اس پل اسے وہ اچھا شخص بہت یاد آیا تھا۔

شیخ عثمان شبیر کا بنگلہ بیوک ادا کے دوسرے بنگلوں کی نسبت ذرا سادہ تھا۔ ایک بڑے کمرے میں جہاں فرشی نشست تھی، حلیمہ آنٹی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بہت ملن سار، بہت خوب صورت خاتون تھیں۔ شلوار قمیص پہ بڑا سا دوپٹہ چہرے کے گرد لپیٹے، وہ پہلی ہی نظر میں اسے بہت اچھی لگی تھیں۔

''یہ حیا ہے، میں نے بتایا تھا نا؟'' عائشے قالین پہ ان کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی، دونوں کے درمیان ایک چھوٹی میز تھی جس پہ عائشے نے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

حیا اور بہارے ایک طرف بیٹھ گئیں۔

''میں جانتی ہوں۔ مجھے اچھا لگا کہ تم حیا کو ساتھ لائی ہو''۔ وہ مسکرا کر عائشے کے ہاتھ کی پشت پہ اسپرے کر رہی تھیں۔ حیا جواباً مسکرائی، پھر بہارے کے قریب، بہت دھیمی سی سرگوشی کی۔

''یہ کیا کر رہی ہیں؟''

''آج چاند کی 21 ویں تاریخ ہے نا، آج عائشے اپنا خون نکلوائے گی۔ ابھی دیکھنا، آنٹی اس کے ہاتھ میں بلیڈ سے کٹ لگائیں گی''۔

اس نے بے یقینی سے بہارے کو دیکھا اور پھر قدرے فاصلے پر بیٹھی عائشے اور حلیمہ آنٹی کو۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پہ کچھ لگا رہی تھیں۔ عائشے کی اس کی جانب کمر تھی، سو وہ ٹھیک سے دیکھ نہیں سکتی تھی کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔

قریباً دس منٹ بعد عائشے اٹھی تو اس کے ہاتھ کی پشت پہ ایک گول، سرخ نشان سا بنا تھا۔ وہ یک ٹک اس کے ہاتھ کو دیکھے گئی۔

''یہ کیا......؟'' اس نے نا سمجھی سے عائشے کو دیکھا۔

''بہت عرصہ ہو گیا میں نے Cupping (سینگی لگوانا) نہیں کروائی تھی، سو چا آج کروا لوں۔ تم نے کبھی کروائی ہے یہ تھراپی؟''

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے لاشعوری طور پہ اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''تم......کیوں کرواتی ہو یہ؟'' وہ ابھی تک دزدیدہ نگاہوں سے عائشے کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔

''میں یہ اس لیے کرواتی ہوں کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ معراج پر گئے تھے تو ادھر فرشتوں نے انہیں ہماری اُمت کے لیے جو بہت پُرزور تاکید کی تھی، وہ کپنگ کروانے کی تھی۔ اللہ نے اس میں بڑا سکون رکھا ہے۔ تم آنٹی سے باتیں کرو، تب تک میں اور بہارے گل بہار باغ سے پھول توڑ لیں''۔

وہ دونوں باہر چلی گئیں۔ تو وہ قدرے ہچکچاتے ہوئے اُٹھ کر ان کے سامنے آ بیٹھی۔ انہوں نے نرمی سے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے ہاتھ بڑھایا تو بلا ارادہ حیا نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ تب اسے محسوس ہوا کہ انہوں نے شفاف پتلا دستانہ پہن رکھا تھا۔

''تم اچھا محسوس کرو گی۔ یہ تمہاری اُداسی لے جائے گا''۔

''مجھے نہیں لگتا کہ میری اُداسی ان چیزوں سے دور ہو سکتی ہے''۔ وہ ان کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی جس کی پشت پہ وہ کوئی اسپرے کر رہی تھیں۔

''وہ کیوں؟''

''میری زندگی بہت پیچیدہ اور مسئلوں سے بھری ہے''۔ اس نے اُداسی سے کہتے ہوئے نفی میں سر جھٹکا۔ کھڑکی سے چھن کر آتی صبح کی روشنی اس کے چہرے پر پڑے نیلوں کو واضح کر رہی تھی۔ ''میری بیسٹ فرینڈ میرے سامنے دم توڑ گئی اور میں کچھ نہیں کر سکی۔ میں نے بہت دُعا کی تھی حلیمہ آنٹی! مگر وہ پھر بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی''۔

''وہ نہ مرتی تو کل کو تم خود ہی اسے چھوڑ جاتیں۔ بعض چیزیں ہمیں ناگوار لگتی ہیں مگر وہ ہمارے لیے اچھی ہوتی ہیں۔ اگر وہ اس بیماری سے بچ جاتی مگر معذور ہو جاتی اور کسی بھی وجہ سے اس کا گھر چھوٹ جاتا، وہ تمہارے آسرے پر آ پڑتی اور تمہیں ساری زندگی اس کی

خدمت کرنی پڑتی تو تم چند ماہ یہ کر پاتیں، پھر تنگ آ کر خود ہی اس کو چھوڑ دیتیں۔ بعض دفعہ موت میں بھی ایک ریلیف ہوتا ہے"۔ وہ اس کے ہاتھ کی پشت پہ زیتون کا تیل ملتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"مگر میں نے اسے اللہ سے ویسا ہی مانگا تھا جیسی وہ تھی!"

"وہ تمہیں اگلے جہاں میں اسے ویسا ہی واپس کر دے گا اور وہی تم دونوں کے لیے بہتر ہوگا"۔ وہ رسان سے کہتے ہوئے اب ایک شیشے کا کپ جس کے پیندے پہ کوئی آلہ لگا تھا، اُلٹا کر کے اس کی ہتھیلی کی پشت پہ رکھ رہی تھیں۔

"مگر میں اس غم کا کیا کروں جو میرے اندر سلگ رہا ہے؟"

"غم؟" سر جھکائے، اُلٹے رکھے کپ کو دباتے ہوئے انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ہم مرنے والے کے لیے تھوڑی روتے ہیں، بچے! مرنے والے کے لیے کوئی بھی نہیں روتا۔ ہم سب تو اپنے نقصان پہ روتے ہیں، ہمارا غم تو بس یہی ہوتا ہے کہ وہ "ہمیں" اکیلا چھوڑ کر چلا گیا"۔

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھے گئی۔ اسے اپنے ہاتھ پہ کپ کا دباؤ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے ہر شے سے دور چلی گئی تھی۔

"میری زندگی میں اتنے مسئلے کیوں ہیں حلیمہ آنٹی؟"

"تمہیں لگتا ہے حیا! کہ صرف تمہاری زندگی میں مسئلے ہیں؟ باقی سب خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں؟ نہیں بچے! یہاں تو ہر شخص دکھی ہے۔ ہر ایک کا دل ٹوٹا ہوا ہے۔ سب کو کسی "ایک" چیز کی طلب ہے۔ کسی کو مال چاہیے، کسی کو اولاد، کسی کو صحت تو کسی کو رتبہ۔ کوئی ایک محبوب شخص یا کوئی ایک محبوب چیز، بس یہی ایک مسئلہ ہے ہماری زندگی میں، ہم سب کو ایک شے کی تمنا ہے۔ وہی ہماری دعاؤں کا موضوع ہوتی ہے اور وہ ہمیں نہیں مل رہی ہوتی۔ وہی چیز ہمارے آس پاس کے لوگوں کو بے حد آسانی سے مل جاتی ہے اور ہم ان پہ رشک کرتے رہ جاتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ ان لوگوں کی خاص تمنا وہ چیز ہے ہی نہیں۔ وہ تو کسی اور چیز کے لیے دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ یوں ہم اس ایک شے کے لیے اتنا رو دیتے ہیں کہ وہ ہماری زندگی پہ حاوی ہو جاتی ہے اور یہ شے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ تم مجھے ایک بات بتاؤ، تمہاری زندگی میں بہت سے مسئلے آئے ہوں گے۔ لمحے بھر کو اپنے سارے مسئلے یاد کرو"۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اب کپ ہٹا کر اس گول نشان کے اندر موجود جلد میں نشتر کی سوئی سے کٹ لگا رہی تھیں۔ اسے تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ کچھ اور یاد کر رہی تھی۔

"سفید پھول..... شریفوں کا مجرا کی ویڈیو..... ارم کے رشتے کے لیے آئے لڑکے کا انہیں پہچان جانا..... ولید کی بدتمیزی..... ترکی کا ویزا نہ ملنا..... پھر یہاں آ کر پھولوں کا سلسلہ..... اس کا بیوک ادا میں قید ہو جانا..... پھر اس کا اغوا..... اور آگ کا وہ بھڑکتا الاؤ....."

اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کی ہتھیلی کی پشت پہ خون کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ حلیمہ آنٹی نے کپ واپس ہتھیلی پہ رکھ کر دباتے ہوئے اس کو دیکھا۔

"اب بتاؤ، ان مسئلوں کا کیا بنا؟"

"کیا بنا؟" وہ غائب دماغی سے کپ کو دیکھ رہی تھی۔ اوپر لگا Sucker اندر سے خون کھینچ رہا تھا۔ شیشے کا کپ سرخ ہونے لگا تھا۔

"میں تمہیں بتاؤں ان مسئلوں کا کیا بنا؟ وہ مسئلے حل ہو گئے۔ سارے مسئلے ایک ایک کر کے حل ہوتے گئے مگر نئے مسئلوں نے تمہیں اتنا اُلجھا دیا کہ تمہارے پاس ان بھولے بسرے مسئلوں سے نکلنے پہ اللہ کا شکر ادا کرنے کا وقت ہی نہیں رہا"۔

وہ بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ واقعی، اس کے وہ سارے مسئلے تو حل ہو گئے تھے..... اس نے کبھی سوچا ہی نہیں.....

"ہر شخص کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جب وہ تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے راز کھلنے والے ہوتے ہیں اور اس وقت جب وہ خوف کے کوہِ طور تلے کھڑا کپکپا رہا ہوتا ہے تو اللہ اسے بچا لیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اور اسے اپنا ایک ایک احسان

یاد ہے، ہم بھول جاتے ہیں، وہ نہیں بھولتا۔ تم اپنے حل ہوئے مسئلوں کے لیے اس کا شکر ادا کیا کرو۔ جو ساری زندگی تمہارے مسئلے حل کرتا آیا ہے، وہ آگے بھی کر دے گا۔ تم وہی کرو جو وہ کہتا ہے، پھر وہ وہی کرے گا جو تم کہتی ہو۔ پھر جن کے لیے تم روتی ہو، وہ تمہارے لیے روئیں گے، مگر تب تمہیں فرق نہیں پڑے گا"۔

کپ کا شیشہ سرخ ہو چکا تھا۔ اس میں اوپر تک خون بھرتا جا رہا تھا۔

"میں..... میرا لائف اسٹائل بہت مختلف ہے، میں ان چیزوں سے خود کو ریلیٹ نہیں کر پاتی۔ لمبی لمبی نمازیں، تسبیحات، یہ سب نہیں ہوتا مجھ سے۔ میں زبان پہ آئے طنز کو نہیں روک سکتی، میں عائشے گل کی طرح کبھی نہیں بن سکتی۔ میں ان چیزوں سے بہت دور آ گئی ہوں"۔

"دور ہمیشہ ہم آتے ہیں۔ اللہ وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔ فاصلہ ہم پیدا کرتے ہیں اور اس کو مٹانا بھی ہمیں ہوتا ہے"۔ انہوں نے خون سے بھرا کپ سیدھا کر کے ایک طرف رکھا اور ٹشو سے اس کا ہاتھ صاف کیا۔ ہاتھ کی پشت پہ گول دائرے میں جگہ خاصی اونچی اُبھر گئی تھی، کسی بیک شدہ کیک کی طرح جس کا درمیان کناروں سے زیادہ اونچا اُبھر جاتا ہے۔

"حلیمہ آنٹی! کیا میرے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے؟"

"پہلے جس نے حل کیے تھے، وہ اب بھی حل کر دے گا۔ حیا! لوگ کہتے ہیں کہ زندگی میں یہ ضروری ہے اور وہ ضروری ہے۔ میں تمہیں بتاؤں، زندگی میں کچھ بھی ضروری نہیں ہوتا، نہ مال، نہ اولاد، نہ رتبہ، نہ لوگوں کی محبت۔ بس آپ ہونے چاہئیں اور آپ کا اللہ تعالیٰ سے ایک ہر پل بڑھتا تعلق ہونا چاہیے۔ باقی یہ مسئلے تو بادل کی طرح ہوتے ہیں۔ جہاز کی کھڑکی سے کبھی نیچے تیرتا کوئی بادل دیکھا ہے؟ اوپر سے دیکھو تو وہ کتنا بے ضرر لگتا ہے مگر جو اس بادل تلے کھڑا ہوتا ہے نا، اس کا پورا آسمان بادل ڈھانپ لیتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ روشنی ختم ہو گئی اور دنیا تاریک ہو گئی ہے۔ غم بھی ایسے ہوتے ہیں۔ جب زندگی پہ چھاتے ہیں تو سب تاریک لگتا ہے لیکن اگر تم اس زمین سے اوپر اٹھ کر آسمانوں سے پورا منظر دیکھو تو تم جانو گی کہ یہ تو ایک ننھا سا ٹکڑا ہے جو ابھی ہٹ جائے گا۔ اگر یہ سیاہ بادل زندگی پہ نہ چھائیں ناں حیا! تو ہماری زندگی میں رحمت کی کوئی بارش نہ ہو"۔

انہوں نے تیل لگا کر اس کا ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھ چہرے کے قریب لے جا کر دیکھا۔

"میں اتنا جلی ہوں آنٹی! کہ مجھے لگتا ہے میرا دل ہی مر گیا ہے"۔

"جلنا تو پڑتا ہے بچے۔ جلے بغیر کبھی سونا کندن نہیں بنتا"۔ ان کی بات پہ وہ آزردگی سے مسکرائی۔

"یہ بھی ٹھیک ہو جائے گا اور تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گی"۔

"تھینک یو آنٹی! مجھے آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگا۔ ایک آخری بات، کیا یہ اتفاق تھا کہ عثمان انکل اور ہم ایک ہی فلائٹ میں آئے تھے؟"

"اس دنیا میں اتفاق کم ہی ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے عثمان کو عبدالرحمٰن نے ایسا کہا تھا"۔

وہ سمجھ کر سر ہلا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کبھی اسے لگتا، اسے زندگی میں سب سے زیادہ تکلیف پاشا نے دی ہے اور کبھی لگتا کہ اس کے احسان اس کی دی گئی اذیت سے زیادہ ہیں۔

ٹیکسی سڑک پہ رواں دواں تھی۔ رات کی بارش اب سوکھ چکی تھی اور ہر جگہ نکھری نکھری، دُھلی دُھلائی لگ رہی تھی۔ سبزہ، ہوا، سرمئی سڑک، وہ چھوٹا سا جزیرہ جنت کا ٹکڑا لگتا تھا۔ وہ کبھی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی ان باتوں کو سوچ رہی تھی، جو حلیمہ آنٹی نے اس سے کہی تھیں۔

"عائشے"۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے گردن ان دونوں کی طرف پھیری تو ایک دم ٹھہر گئی۔ درمیان میں بیٹھی بہارے اپنے گلابی پرس سے کچھ نکال رہی تھی۔ حیا بالکل ساکت، سانس روکے اسے دیکھے گئی۔

وہ حیا کا بھورے رنگ کا لکڑی کا پزل باکس تھا۔

"بہارے..... یہ تم نے کہاں سے لیا؟" وہ بنا پلک جھپکے اس باکس کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ مجھے عبدالرحمٰن نے میری برتھ ڈے پہ گفٹ کیا تھا، اس میں میرا گفٹ ہے، مگر ابھی یہ مجھ سے کھلا نہیں ہے"۔ وہ مایوسی سے

بتاتی اس کی سلائیڈ پہ انگلی پھیر رہی تھی جس میں پانچ حروف بنے تھے۔ باکس کے اوپر ڈھکن کی سطح پہ انگریزی میں ایک لمبی سی نظم کھدی تھی۔ یہ حیا کا باکس نہیں تھا مگر یہ بالکل اس جیسا تھا۔

''یہ..... یہ اس نے کہاں سے لیا؟''

''ہم سے ہی لیا تھا۔ عائشے نے بتایا نہیں، ہم جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر یہی پزل باکسز تو بناتے ہیں۔ بہت مہنگے بکتے ہیں یہ۔ ان میں فائیو لیٹر کوڈ لگتا ہے، جس کے بغیر یہ نہیں کھلتے''۔

عائشے مسکراتی ہوئی بہارے کی بات سن رہی تھی۔

''سنو.....'' وہ بہت دیر بعد بولی۔ اس کی نگاہیں ابھی تک اس باکس پہ تھیں۔ ''تم نے کبھی کوئی ایسا باکس بنایا ہے جس میں چھ حروف کا کوڈ ہو؟''

وہ دونوں ایک دم چونکیں۔

''ہاں، میں نے بنایا تھا''۔

''کس کے لیے؟'' وہ بےچینی سے بولی۔

''عبدالرحمٰن کا کوئی ملازم تھا، اس نے چھ حرفی کوڈ بار کا آرڈر دیا تھا تو میں نے بنا دیا۔ مہینہ پہلے کی بات ہے''۔ وہ سوچ کر بتانے لگی۔

''تو اس کا کوڈ تم نے ہی رکھا ہوگا۔ تمہیں وہ یاد ہے؟''

''یاد؟'' عائشے ذرا جھینپ کر ہنسی۔ ''چھ حروف کا کوئی لفظ ذہن میں نہیں آ رہا تھا تو میں نے اس کا کوڈ Ayeshe رکھ دیا۔ عائشے میں چھ حروف ہوتے ہیں نا!''

''ترک جی میں عائشے کو بھی ایسے لکھتے ہیں کیا؟'' اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

''نہیں، نہیں، ترک جی میں Aysegul لکھتے ہیں مگر یہ باکس انگریزی حروف تہجی میں تھا، اس لیے انگریزی میں لکھا!''

''جو شخص یہ تم سے خریدنے آیا تھا، اس کو جانتی ہو تم؟'' چند لمحے کے توقف کے بعد وہ ذرا سوچ کر پوچھنے لگی۔

''میں اس کا نام تو نہیں جانتی مگر وہ اونچے قد کا حبشی تھا اور اس کے بال گھنگھریالے تھے''۔

''اچھا!'' حیا نے بہارے کو اس کا پزل باکس واپس کر دیا۔ اب وہ اپنے پزل باکس کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کے کمرے میں رکھا تھا۔ اگر وہ وہی باکس تھا جو عائشے نے بنایا تھا اور اسے عبدالرحمٰن کے ہی کسی آدمی نے عائشے سے خریدا تھا اور قوی امکان تھا کہ اس نے وہ ''ڈولی'' کے پاس بھجوایا تھا تو کیا عبدالرحمٰن اس بات سے واقف تھا؟ یا پھر عائشے سے خریدنے والا شخص ہی ڈولی تھا کیونکہ ڈولی بھی تو پاشا کا خاندانی ملازم تھا۔ کچھ ایسا ہی بتایا تھا اے آر پی کی ماں نے اسے۔

''سنو! کیا عبدالرحمٰن پاشا کو معلوم ہے کہ تم نے اس کے کسی ملازم کے لیے باکس بنایا ہے؟''

''حیا! مجھ سے بہت سے لوگ پزل باکسز خریدتے ہیں، میں ہر ایک کی خبر عبدالرحمٰن کو نہیں کرتی اور اس نے تو مجھے عبدالرحمٰن کو بتانے سے منع کیا تھا۔ تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کیونکہ اس نے صرف عبدالرحمٰن کو بتانے سے منع کیا تھا''۔ عائشے ذرا سا مسکرا کر بولی۔

حیا نے اثبات میں گردن ہلا دی اور باہر دیکھنے لگی۔ بگھی اس بل کھاتی سڑک پہ اوپر چڑھ رہی تھی۔ وہاں دونوں اطراف میں سرسبز اونچے درخت تھے۔ مری میں عموماً سڑک کے ایک جانب ایسے اونچے درخت ہوتے تھے اور دوسری جانب کھائی، مگر یہاں دونوں جانب ہی گھنا جنگل تھا۔

بالآخر ایک جگہ بگھی بان نے بگھی روک دی۔ عائشے نیچے اُتری اور بگھی کے پیچھے مرصع صندوق سے اوزاروں کا بھاری تھیلا نکالا۔ حیا اور بہارے بھی اس کے پیچھے اُتر آئیں۔ اب آگے انہوں نے پیدل چلنا تھا۔

''تم چل لو گی؟'' عائشے نے تھیلا اُٹھاتے ہوئے ذرا فکرمندی سے اسے دیکھا۔

''ہاں، میں بہتر محسوس کر رہی ہوں''۔ اس نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ عائشے کو تسلی دی۔

بہارے سب سے آگے اُچھلتی، کودتی، ذرا لہک لہک کر کچھ گاتی چل رہی تھی۔

''کائنات وہ ہے جسے تو نے بنایا

اور سیدھا راستہ وہ ہے جسے تو نے دکھایا

پس تو قدموں کو پھیر دے

اپنی رضا کی طرف

اے بلندیوں کے رب!''

وہ ایک عربی گیت گنگناتی ادھر ادھر پودوں پہ ہاتھ مارتی چل رہی تھی۔ عائشے اس کے عقب میں تھی اور سب سے پیچھے حیا تھی جو اپنی سفید میکسی کو دونوں پہلوؤں سے اُٹھائے سنبھل سنبھل کر پتھروں پہ پاؤں رکھ رہی تھی۔

وہاں ہر سو سرخ صنوبر اور ببول کے درخت تھے۔ کچھ ایسے درخت بھی تھے جن کو وہ نہیں پہچانتی تھی۔ سرخ اور جامنی پھولوں کی جھاڑیاں بھی جابجا تھیں۔

جنگل میں کافی آگے جا کر عائشے ایک جگہ رُکی۔ وہاں ایک درخت کا کٹا ہوا تنا پڑا تھا۔ اس نے تھیلا زمین پہ رکھا اور اندر سے کلہاڑے نکالنے لگی۔

ٹھنڈی ہوا صنوبر کے پتوں کو ہولے ہولے جھلا رہی تھی۔ حیا ایک بڑے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور عائشے کو کٹے ہوئے تنے پہ کلہاڑے سے ضربیں مارتے دیکھتی رہی۔ اس کی اتنے دنوں کی تھکن، نقاہت اور بیماری حلیمہ آنٹی کے شیشے کے پیالے میں رہ گئی تھی۔ وہ اب خود کو بہت ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔ نیا چہرہ، نئی روح، نئی زندگی...... بہارے بھی اس کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ حیا کے بال ہوا سے اُڑ کر اس کے چہرے کو چھونے لگے۔ اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے نرمی سے ان کو سمیٹا۔

''تمہارے بال کتنے خوب صورت ہیں حیا''۔

اس نے گردن ذرا سی موڑ کر مسکراتے ہوئے بہارے کو دیکھا۔ وہ بہت محویت سے اس کے بالوں پہ ہاتھ اوپر سے نیچے پھیرتے کہہ رہی تھی۔

''میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میرے بال اتنا ہی لمبے اور ملائم ہوں اور میں انہیں ایسے ہی کھولوں مگر......'' جوش سے کہتے کہتے اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ ''مگر عائشے کہتی ہے، اچھی لڑکیاں بال کھول کر باہر نہیں نکلتیں''۔

بہارے کی بات پہ اس نے ایک نظر عائشے کو دیکھا، جو کوٹ کی آستینیں موڑے رکوع میں جھکی لکڑی پہ کلہاڑا مار رہی تھی۔ ہر ضرب کے بعد وہ سیدھی ہوتی، اور پیشانی پہ آیا پسینہ آستین سے پونچھ کر پھر سے جھک جاتی۔

''وہ تمہیں منع کرتی ہے؟''

''نہیں، وہ کہتی ہے، بہارے تمہاری مرضی، جب تم میں حیا نہ رہے تو جو جی چاہے کرو''۔ اس نے عائشے کے خفگی بھرے انداز کی نقل کر کے دکھائی۔

''تم ساری دُنیا میں سب سے زیادہ عائشے کی بات مانتی ہو؟''

''نہیں، پہلے عبدالرحمٰن کی، پھر عائشے کی!''

''تم عبدالرحمٰن کو بہت پسند کرتی ہو بہارے؟'' وہ اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے استفسار کرنے لگی۔ کیا یہ بہنیں عبدالرحمٰن کی شہرت نہیں جانتیں؟ یا یہ اسے لوگوں سے زیادہ جانتی ہے''۔

''بہت زیادہ۔ وہ ہے ہی اتنا اچھا''۔ وہ اس کے بالوں کو ہاتھ میں لیے بہت محبت سے کہہ رہی تھی۔ حیا نے اپنے کھلے بالوں کو دیکھا اور پھر بہارے کی نفاست سے بندھی گھنگھریالی پونی۔

''میں بال باندھ لوں بہارے؟ مجھے ہوا تنگ کر رہی ہے''۔ اس نے جیسے خود کو وضاحت دی کہ وہ عائشے کی اچھی لڑکیوں والی

نشانیوں کا اثر نہیں لے رہی۔ ہوا کی وجہ سے بال باندھنا چاہ رہی ہے۔

"میں باندھ دوں۔ میرے پاس فالتو پونی ہے۔"

اس نے اپنے گلابی پرس میں ہاتھ ڈال کر جھٹ سے ایک سرخ رنگ کا بینڈ نکالا۔ حیا نے ذرا سا رخ موڑ لیا۔ بہارے اس کی پشت پہ گھٹنوں کے بل اونچی ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے نرم ہاتھوں سے اس کے بال سمیٹنے لگی۔ حیا نے آنکھیں بند کر لیں۔

"عثمانی سلطنت کی شہزادیاں تمہاری طرح خوب صورت ہوتی ہوں گی حیا! ہے نا؟" وہ نرمی سے اس کے بالوں میں اُنگلیاں چلاتی اس کی ایک ڈھیلی سی چوٹی بنا رہی تھی۔ بینڈ باندھ کر اس نے چوٹی حیا کے کندھے پہ آگے کو ڈال دی۔ حیا نے اپنی موٹی، سیاہ چوٹی پہ ہاتھ پھیرا اور گردن موڑ کر ممنونیت سے بہارے کو دیکھا۔

"میری اماں کہتی ہیں کہ میں اتنی خوب صورت نہ لگتی اگر میں اپنی گرومنگ پہ اتنی محنت نہ کرتی۔ تمہارا اور عائشے کا شکریہ، ورنہ میرے بال نہ بچ پاتے۔"

"دوست کس لیے ہوتے ہیں؟" بہارے نے مسکرا کر شانے اُچکائے۔ اس نے اور عائشے نے کن جوکھوں سے اس کے بالوں سے ویکس اُتاری تھی۔ یہ روداد بہارے اسے سنا چکی تھی۔ ویکس بال ضائع تب کرتی اگر کھینچ کر اُتاری جاتی، جبکہ انہوں نے اسے پگھلا کر نرم کر کے اُتارا تھا۔

"اچھا اپنا پزل باکس دکھاؤ، میں اس کی پہیلی دیکھوں"۔ بہارے گل نے سر ہلا کر بیگ سے باکس نکال کر اسے تھمایا۔ اس کا گلابی بیگ ایک زنبیل تھی جس میں ہر شے موجود ہوتی تھی۔

"بہارے! تم نے حیا کا گفٹ نہیں بنایا؟" عائشے نے ہاتھ روک کر رکوع میں جھکے جھکے سر اُٹھا کر خفگی سے اپنی بہن کو دیکھا۔

"اوہ ہاں۔ میں ابھی آئی"۔ بہارے ماتھے پہ ہاتھ مارتی اُٹھی، بڑے تھیلے میں سے ایک خالی ٹوکری نکال اور درختوں کے درمیان اُچھلتی، پھدکتی آگے بھاگ گئی۔

عائشے واپس کام میں مصروف ہوگئی۔

حیا سر تنے سے ٹکائے باکس کو چہرے کے سامنے لا کر دیکھنے لگی۔ اس کے ڈھکن پہ انگریزی میں چند فقرے کھدے تھے جو شاید ایک نظم تھی۔

A creamy eye in silver chest

Sleeps in a salty depth

Rises from a prison grain

Shines as its veil is slain

پزل باکس کے کوڈ بار میں پانچ چوکھٹے بنے تھے۔ حیا نے تین چار دفعہ اس نظم کو پڑھا تو اسے وہ پانچ حرفی لفظ سمجھ میں آ گیا۔ جو اس باکس کی کنجی تھا۔ پہیلی آسان تھی مگر ظاہر ہے، وہ بہارے کو جواب نہیں بتا سکتی تھی وہ بہارے کا تحفہ تھا اور وہ اسے خود ہی کھولنا تھا۔

مگر کون لکھتا تھا یہ نظمیں؟ یہ پہیلیاں؟

باکس گود میں رکھے، اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے جسم کا سارا درد دھیرے دھیرے غائب ہو رہا تھا۔ ہر سو میٹھی نیند تھی، بہت دنوں بعد اس پہ سکون سا چھا رہا تھا۔ وہ حلیمہ آنٹی کی باتوں کو سوچتی، اپنے حل ہوئے مسئلوں کو یاد کرتی، کب سو گئی، اسے پتا نہیں چلا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ جنگل میں اکیلی تھی۔ عائشے اور بہارے وہاں نہیں تھیں۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی۔

"عائشے ...... بہارے"۔ وہ متوحش انداز میں ان کو پکارتی درختوں کے درمیان آگے کو بھاگی۔

"حیا! ہم اِدھر ہیں"۔ عائشے نے کہیں قریب سے پکارا۔ وہ آواز کا تعاقب کرتی اس گھنے جھنڈ تک آئی تو دیکھا، عائشے ان درختوں کے پاس کلہاڑا پکڑے کھڑی تھی۔ ساتھ ہی بہارے زمین پہ بیٹھی تھی۔ کٹا تنا ساتھ ہی رکھا تھا۔

''تم سو گئی تھیں تو مجھے لگا، ہماری آوازیں تمہیں ڈسٹرب نہیں کریں، سو ہم سب کچھ اِدھر لے آئے''۔
''خیر تھی عائشے''۔ اس نے خفت سے ان دونوں کو دیکھا۔ تنا، لکڑیاں، اوزار وہ ہر چیز بنا آواز پیدا کیے وہاں سے لے گئی تھیں، وہ بھی صرف اس کے خیال سے۔ اسے ان دو پریوں کی طرح معصوم لڑکیوں پہ بے حد پیار آیا۔
''تم بتاؤ، تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''
''بہت بہتر''۔ وہ بہارے کے ساتھ خشک گھاس پہ بیٹھ گئی۔
بہارے کی گود میں سفید پھولوں کی لڑی رکھی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ایک موٹی سبز ٹہنی پکڑے، اس کے دونوں سرے ملا کر ان کو باندھ رہی تھی، یوں کہ وہ ایک گول، سبز سا رنگ بن گیا تھا۔
''تم کیا کر رہی ہو؟''
''تمہارا گفٹ بنا رہی ہوں۔ تمہیں پہیلی سمجھ میں آئی؟''
''فوراً ہی آ گئی۔ بہت آسان تھی''۔ اور کم از کم اس کے لیے اسے کسی فلاسفر کے گدھوں اور کتوں والے اقوال زریں نہیں پڑھنے پڑے تھے۔
''عائشے کی بھی سمجھ میں آ گئی تھی، مگر یہ مجھے نہیں بتاتی''۔
''ٹھیک کرتی ہوں۔ یہ تمہارا تحفہ ہے اور تمہیں خود نکالنا ہے۔ تحفہ خوشی کے لیے ہوتا ہے، اگر تم اسے خود بوجھ کر نکالو گی تو تمہیں اصلی خوشی ہو گی ورنہ توڑ کر بھی نکال سکتی ہو''۔ عائشے نے کہا۔
''عائشے ٹھیک کہہ رہی ہے، ویسے یہ پہیلیاں کون لکھتا ہے؟''
''عبدالرحمٰن کے پاس ہر کام کے لیے بہت سے بندے ہوتے ہیں۔ اس نے کسی سے لکھوائی ہو گی''۔ بہارے نے شانے اُچکا کر کہا۔ گویا عبدالرحمٰن سے بہت محبت و عقیدت کے باوجود اس کا خیال تھا کہ وہ اس نے خود نہیں لکھی تھی۔ تو پھر شاید ڈولی نے......؟
بہارے، بہت مہارت سے سفید پھولوں کی لڑی کو سبز ٹہنی پر لپیٹ رہی تھی۔ یہاں تک کہ سبز رنگ، ایک سفید پھول دار حلقے میں تبدیل ہو گیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے وہ تاج حیا کے سر پہ رکھا۔
''بہارے گل اور عائشے گل کی طرف سے!''
اس کے انداز پہ کام کرتی عائشے نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
''بہارے گل اور عائشے گل کا بہت شکریہ!'' اس نے مسکراتے ہوئے سر پہ پہنے تاج کو چھوا۔ مری میں ایسے تاج بکثرت ملتے تھے مگر ان میں سے کوئی تاج اتنا خوب صورت نہ تھا۔ کوئی تاج اتنا خوب صورت ہو بھی نہیں سکتا تھا۔
بہارے اب پزل باکس اور سوئی دھاگہ احتیاط سے اپنی گلابی زنبیل میں رکھ کر عائشے کے ساتھ کام کروانے لگی تھی۔ اس نے بھی اُٹھنا چاہا مگر عائشے نے روک دیا۔
''تم مہمان ہو اور تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جب ٹھیک ہو جائے گی تو کروا لینا''۔
پھر کام ختم کر کے بہارے نے چٹائی بچھائی اور بڑی باسکٹ سے پانی کی بوتل نکال کر حیا اور عائشے کے ہاتھ دُھلائے۔ پھر لنچ باکسز کھول کھول کر چٹائی پہ رکھنے لگی۔
''یہ تلی ہوئی مچھلی ہے، یہ سلاد ہے اور یہ مرغابی کا سالن ہے''۔ کھانا ابھی تک گرم تھا اور اس کی خوشبو بہت اشتہا انگیز تھی۔
اسے یاد تھا، شروع شروع میں وہ اور ڈی جے ترک کھانے سے کتنی متنفر ہو گئی تھیں مگر چند ہی روز بعد ان کو ترک کھانے سے اچھا کھانا کوئی نہیں لگتا تھا۔
یوں سنسان جنگل میں درختوں کے بیچ زمین پہ بیٹھے ٹھنڈی سی دوپہر میں وہ اس کا پہلا کھانا تھا۔ استنبول کی چہل پہل اور ہنگامہ خیز زندگی سے دور ایک تنہا جزیرے پہ، جہاں وہ خود کو فطرت سے زیادہ قریب محسوس کر رہی تھی۔

کھانا کھا کر چیزیں، سمیٹ کر وہ لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے گٹھے سروں پہ اُٹھائے ڈھلان سے اُتر کر واپس بگھی تک آ گئیں۔
عائشے نے ساری لکڑیاں اور اوزار صندوق میں رکھے اور پھر وہ بگھی کو وہیں چھوڑ کر دوسری سمت چل دیں۔ اس نے نہیں پوچھا تھا کہ اب وہ کدھر جا رہے ہیں۔ وہ خود کو ان دو بہنوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ چکی تھی۔ پھر بھی عائشے خود سے ہی بتانے لگی۔

"اب ہم ساحل کی طرف جا رہے ہیں"۔

"مگر فائدہ کوئی نہیں ہے"۔ اس کے ساتھ چلتی بہارے نے ذرا خفگی سے سرگوشی کی۔ وہ جو دونوں پہلوؤں سے میکسی ذرا سی اُٹھا کر چل رہی تھی، ذرا چونکی۔

"وہ کیوں؟"

"ہم سمندر پہ سیپ چننے جا رہے ہیں، مگر کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرے کسی سیپ سے موتی نہیں نکلتا اور عائشے کے ہر سیپ سے موتی نکلتا ہے"۔

"اچھا؟ وہ کیوں؟"

"عبدالرحمٰن کہتا ہے، عائشے کے سیپ سے موتی اس لیے نکلتے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ سچ بولتی ہے"۔

"نہیں، یہ کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ بہارے کے سیپ سے موتی اس لیے نہیں نکلتے کیونکہ بہارے ہمیشہ اللہ سے برا گمان رکھتی ہے، جس دن بہارے اچھا گمان رکھے گی، اس دن موتی نکل آئیں گے اور ایک دفعہ تو موتی نکلا بھی تھا۔" آگے چلتی عائشے نے گردن موڑے بغیر کہا۔ اس کی آخری بات پہ حیا نے سوالیہ نگاہوں سے بہارے کو دیکھا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"ہاں...... بس ایک ہی دفعہ موتی نکلا تھا، سفید موتی اور وہ بہت خوب صورت تھا۔ میں نے وہ عبدالرحمٰن کو گفٹ کر دیا"۔

"وہ اس کا کیا کرے گا؟ تم اپنے پاس رکھتیں نا!"

جواباً بہارے نے ملال بھری "تم نہیں سمجھ سکتیں" والی نظروں سے اسے دیکھا اور سر جھٹکا۔
ساحل کا یہ حصہ قدرے سنسان پڑا تھا۔ نیلے سمندر کی لہریں اُمڈ اُمڈ کر پتھروں سے سر پٹختیں اور واپس لوٹ جاتیں۔ ساحل کی ریت گیلی تھی اور اس پہ قطار میں بہت سے پتھر پڑے تھے۔ کراچی کا ساحل ریت والا ہوتا تھا مگر یہ ساحل پتھروں والا تھا۔

وہ چیزیں محفوظ جگہ پہ رکھ کر، جوتے اُتار کر ننگے پاؤں چلتی پانی میں آ کھڑی ہوئیں۔

"ادھر سمندر اکثر سیپ ڈال دیتا ہے مگر روز نہیں"۔ عائشے پاؤں پاؤں بھر پانی میں چلتی کہہ رہی تھی۔

لہریں اُمڈ اُمڈ کر تیں، اس سے ٹکراتی اور اسے گھٹنوں تک بھگو کر واپس چلی جاتیں۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے فاصلے پہ کھڑی اپنی اپنی ٹوکریاں اُٹھائے سیپ ڈھونڈ رہی تھیں۔

پانی یخ بستہ تھا اور ہوا سرد تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو عائشے اور بہارے ریت سے سیپ اُٹھا اُٹھا کر اپنی ٹوکریوں میں بھر رہی تھیں مگر اسے اپنے پاس کوئی سیپ نظر نہیں آیا۔ وہ متلاشی نگاہوں سے پانی کی تہہ تلے جھلکتی ریت کو دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ تب ہی ایک تیز لہر آئی تو وہ لڑکھڑا کر پھسلی اور کمر کے بل ریت پہ جا گری۔ صد شکر کہ پتھروں کا ساحل چند قدم دور تھا۔ لہر واپس پلٹ گئی۔ وہ ریت پر گری پڑی تھی۔ مکمل طور پہ بھیگی ہوئی۔ اس کی چوٹی بھیگ گئی تھی۔ ریت کے ذرے سفید بالوں پہ جا بجا لگے تھے۔ وہ درد سے دُکھی کمر کو سہلاتی بمشکل اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ عائشے اور بہارے نے اسے گرتے دیکھا نہ اُٹھتے۔ اس نے بھی واویلا نہ کیا۔ پانی کا درد، آگ کے درد سے کم ہی ہوتا ہے۔ وہ برداشت کر گئی۔

اسے گرانے والی لہر اس کے قدموں میں ایک سیپ ڈال گئی تھی۔ اس جھک کر سیپ اُٹھالی۔ وہ ایک شامی کباب کے سائز جتنا تھا وراس کا خول سفید، سرمئی اور گلابی رنگوں سے بنا تھا۔

"اوہ تم تو بھیگ گئیں، ٹھہرو، یہ شال لے لو"۔

پتھروں کے پار چٹائی پر بیٹھتے ہوئے عائشے نے فکرمندی سے اسے دیکھا اور ایک شال ٹوکری سے نکال کر دی جو اس نے شانوں

کے گرد لپیٹ لی۔

"چلو، اب سیپ کھولتے ہیں"۔ وہ تینوں تکون کی صورت بیٹھی تھیں۔ اپنی اپنی ٹوکریاں اپنے سامنے رکھے۔ عائشے نے بڑے سے چپٹے بلیڈ والا چھرا اٹھایا اور اپنی ایک سیپ نکال کر پھر اس کے خول کے دونوں حصوں کی درمیانی درز میں رکھ کر "بسم اللہ" پڑھتے ہوئے سیدھا سیدھا چھرا چلا دیا۔ چٹخنے کی ذرا سی آواز آئی۔ عائشے نے چھرا ایک طرف رکھا اور دونوں ہاتھوں سے سیپ کے خول کو یوں کھولا جیسے کوئی کتاب کھولتے ہیں۔

اندر موجود سمندری جانور کا گودا خون آلود تھا۔ وہ مر چکا تھا مگر اس کے اوپر ایک مٹر کے دانے جتنا سفید موتی جگمگا رہا تھا۔

عائشے نرمی سے مسکرائی اور پلکر (Plucker) سے موتی اٹھا کر ایک مخملیں تھیلی میں ڈالا۔ وہ مسحور سی یہ سارا عمل دیکھ رہی تھی۔ بہارے البتہ آلتی پالتی مارے بیٹھی، ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے منہ بسورے عائشے کو دیکھ رہی تھی۔ عائشے نے ایک کے بعد ایک اپنے ساتوں سیپ کھولے۔ سب میں سے موتی نکلے۔ سات موتی اس کی مخملیں تھیلی میں جمع ہو چکے تھے۔

پھر اس نے چھرا بہارے کی طرف بڑھایا۔

"اب تم کھولو"۔

بہارے نے بے دلی سے چھرا پکڑا اور ایک ایک کر کے اپنے پانچوں سیپ کھولے۔ ان کے اندر سوائے خون آلود Mollusk کے، کچھ بھی نہ تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ سات تو نکل آئے ہیں، یہ بھی تمہارے ہیں"۔ عائشے نے نرمی سے اس کا گال تھپتھپایا۔ وہ خفا خفا سی بیٹھی رہی۔

حیا نے چھرا پکڑا اور سیپ کے دونوں حصوں کی درز میں رکھا پھر دل مضبوط کر کے چھرا چلایا۔ لمحے بھر کو اسے یوں لگا جیسے اس نے کسی نرم سے گوشت کو کاٹ دیا ہو۔ بہارے اور عائشے منتظر سی اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے سیپ کے دونوں حصوں کو پکڑے رکھے، کسی کتاب کی طرح اسے کھولا۔

سمندری جانور کے خون آلود لوتھڑے کے سوا سیپ میں کچھ نہ تھا۔ وہ موتی سے خالی تھا۔

اس نے بہارے کی سی بے دلی سے سیپ ایک طرف ڈال دی۔

"تم دونوں نے پہلے سے سوچ لیا تھا کہ تمہارا موتی نہیں نکلے گا۔ کل سے تم اچھے گمان کے ساتھ سیپ چنو گی"۔

عائشے نے بے بسی سے انہیں دیکھ کر کہا۔ وہ دونوں یونہی خفا خفا سی بیٹھی رہیں۔

☆ ☆ ☆

رات بیوک ادا پہ سیاہ چادر تان چکی تھی جس میں جھلملاتے سے تارے ٹکے تھے۔ اس کے کمرے کی کھڑکی کے جالی دار پردے ہٹے ہوئے تھے اور ان سے منقش کی وہ سیاہ چادر صاف دکھائی دے رہی تھی۔

وہ گردن تک کمبل ڈالے، پہلو کے بل لیٹی تھی۔ لمبے بال تکیے پہ بکھرے تھے۔ نگاہیں کھڑکی سے نظر آتے آسمان پہ ٹکی تھیں۔

صبح اس نے عائشے سے کہا تھا کہ اب وہ واپس جانا چاہتی ہے مگر ان دونوں بہنوں کے چہرے پہ اتنی اُداسی آگئی اور انہوں نے صرف چند دن کے لیے، جب تک اس کی خراشیں اور سارے زخم مندمل نہیں ہو جاتے اور نیل غائب نہیں ہو جاتے، اس سے رُکنے کو کہا تو وہ رُک گئی۔ اسے بیوک ادا اچھا لگا تھا یا پھر شاید اسے یہ خوف تھا کہ ابھی سبانجی...... میں لوگ اس کے چہرے کے زخموں کے متعلق استفسار کریں گے۔ وہ اس پُر فضا مقام پہ مکمل صحت مند ہو کر پہلے جیسا چہرہ لے کر واپس پلٹنا چاہتی تھی اور پھر بیوک ادا اسے کھینچتا بھی تھا۔ اس سفید محل میں کوئی مقناطیسی کشش تھی اور ان بہنوں کا خلوص تھا جو اسے باندھے رکھ رہا تھا۔

وہ گھر عائشے گل کا تھا، یہی وہ دل سے سارے بوجھ اُتار دینے والا احساس تھا جس کے باعث وہ اِدھر رُک گئی تھی۔ سبانجی سے آج کل اسپرنگ بریک کی چھٹیاں تھیں، اور بریک ختم ہونے تک وہ ادھر رہ سکتی تھی۔ ابھی واپس جانا، دوسروں کو اپنے بارے میں مشکوک کرنا ہوگا۔ چہرے کے زخم بھرنے میں ابھی وقت تھا اور دل کے پتا نہیں کب بھر پائیں گے!

ایک لمحے کے لیے اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ کہیں وہ اس گھر میں اس لیے تو نہیں رُک گئی کہ اس کا تعلق عبدالرحمٰن پاشا سے ہے؟ مگر نہیں اس کے دل میں تو جہان سکندر کے علاوہ کسی کی گنجائش نہ تھی۔ ٹھیک ہے پاشا نے اس پہ بہت بڑا احسان کیا تھا اور وہ اس ممنون تھی مگر اس کے دل میں پاشا کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اس نے ابھی تک موبائل نہیں لیا تھا۔ عائشے نے کہا تھا کہ کل تک ان کے ہوٹل کا ملازم موبائل اور سم پہنچا دے گا، بل سمیت۔ اس نے ابا سے کچھ پیسے عائشے کے اکاؤنٹ میں منگوا لیے تھے تاکہ وہ اپنے اخراجات خود اٹھا سکے۔ البتہ نہ اس نے اماں، ابا اور نہ ہی جہان کو بتایا تھا کہ وہ کدھر رہ رہی ہے۔ وہ پہلے ہی ان سے دور تھی، جہاں بھی رہے، کیا فرق پڑتا تھا اور پھر استنبول میں عبدالرحمٰن پاشا کی رہائش سے بڑھ کر محفوظ جگہ کوئی نہ تھی، اس کا اندازہ اسے ہو چکا تھا۔

مگر جہان...... جانے وہ کیسا ہوگا۔ اتنے دنوں سے اس سے بات بھی نہیں ہوئی۔ آخری دفعہ اسے تب دیکھا تھا جب وہ اسے تقسیم پہ چھوڑنے آیا تھا۔ تب بخار کے باعث اس کی آنکھیں اور ناک سرخ تھی۔ ''پتا نہیں اس کا بخار ٹھیک ہی ہوا یا نہیں''۔ وہ اسے فون کرنے کا سوچ کر اٹھی اور باہر آ کر گول چکر زینہ اُترنے لگی۔

آخری سیڑھی پہ اس کے قدم سست پڑ گئے۔ لونگ روم میں انگیٹھی دہک رہی تھی اور اس کے سامنے عائشے گل صوفے پہ پاؤں اوپر کیے بیٹھی تھی۔ حیا کی جانب پشت کیے، وہ ہاتھوں میں قرآن پکڑے پڑھ رہی تھی، مدھر، دھیمی، خوب صورت آواز، جو آیات کے ساتھ اوپر نیچے ہوتی تھی۔

''اور آگ والے جنت والوں کو پکار پکار کر کہیں گے کہ ڈالو ہم پر پانی میں سے یا اس میں سے جو اللہ نے تمہیں بخشا ہے۔ وہ کہیں گے، بے شک اللہ نے ان دونوں کو حرام کر دیا ہے انکار کرنے والوں پر''۔

وہ وہیں ریلنگ پہ ہاتھ رکھے، ساکت سی کھڑی رہ گئی۔ ایک دم سے وقت پانچ روز پیچھے چلا گیا۔ وہ کرسی سے بندھی ہوئی اسی کمرے میں گری پڑی تھی جس میں بہت سے آگ تھی۔ الاؤ، انگیٹھی، اُبلتا ویکس، دہکتی سلاخیں۔ اسے اپنی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ''پانی ڈالو مجھ پر...... پانی ڈالو مجھ پر......'' وہ اگلے تین روز سوتی جاگتی کیفیت میں یہی چلاتی رہی تھی۔

عائشے اسی طرح پڑھ رہی تھی۔

''بے شک اللہ نے اِن دونوں کو حرام کر دیا ہے انکار کرنے والوں پر، وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین کو شغل اور کھیل بنا لیا تھا......''

وہ بے دم سی ہو کر وہیں آخری سیڑھی پہ بیٹھتی چلی گئی۔

''وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنے دین کو شغل اور کھیل بنا لیا تھا اور ان کی دُنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا......''

انگیٹھی میں جلتی مصنوعی لکڑیوں سے چنگاریاں اُٹھ اُٹھ کر فضا میں گم ہو رہی تھی۔ وہ یک ٹک گم صم سی دہکتی لکڑیوں کو دیکھے گئی۔

''تو آج کے دن، ہم بھلا دیں گے ان کو جیسا کہ وہ اپنی اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے اور وہ ہماری نشانیوں کا انکار کیا کرتے تھے''۔ (الاعراف 51-50)

دفعتاً عائشے نے کسی احساس کے تحت گردن موڑی۔ اسے یوں آخری زینے پہ بیٹھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں فکرمندی اُبھری۔ اس نے قرآن بند کیا اور اُٹھ کر احتیاط سے شیلف کے اوپری خانے میں رکھا، پھر اس کے ساتھ زینے پہ آ بیٹھی۔

''ایسے کیوں بیٹھی ہو حیا؟'' وہ نرمی سے پوچھ رہی تھی۔

حیا گم صم سی اس کا چہرہ دیکھے گئی۔ اسکارف میں لپٹا عائشے کا چہرہ نیم اندھیرے میں بھی دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب سیاہ لگ رہی تھی۔ یہ لڑکی اتنی پُرسکون، اتنی نرم کیسے رہتی تھی ہر وقت؟ اس کے چہرے پہ کوئی دھول، کوئی دھند، کوئی مبہم پن کیوں نہیں ہوتا تھا؟ صاف، شفاف، اُجلا چہرہ۔ معصومیت، کم عمری۔

''حیا!'' اس نے دھیرے سے حیا کی بند مٹھی پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ حیا نے چہرہ ذرا سا پھیرا تھا، اس سے روشنی نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے کی بہت عادی ہو چکی تھیں۔

"یہ دُنیا دھوکے میں کیسے ڈالتی ہے عائشے؟" وہ اب بالکل بھی اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ الاؤ کو دیکھ رہی تھی جس سے سرخ دانے اُڑ اُڑ کر فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔

"جب یہ اپنی چمکنے والی چیزوں میں اتنا گم کر لیتی ہے کہ اللہ بھول جاتا ہے"۔

"کیا مجھے بھی دُنیا نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟"

"پہلی دفعہ دھوکا انسان بھولپن میں کھاتا ہے مگر بار بار کھائے تو وہ اس کا گناہ بن جاتا ہے اور اگر کسی احساس ہونے کے بعد نہ کھائے تو اسے ایک بری یاد سمجھ کر بھول جانا چاہیے اور زندگی نئے سرے سے شروع کرنا چاہیے"۔

"نئے سرے سے؟ اسے یوٹرن لینا آسان ہوتا ہے کیا؟ انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ خوب صورت لگے، خوب صورت لباس پہنے، کیا یہ بری بات ہے؟" اس کی آواز میں بے بسی در آئی تھی، جیسے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کیا غلط تھا کیا صحیح، سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

"نہیں! اللہ تعالیٰ خوب صورت ہے اور خوب صورتی کو پسند کرتا ہے۔ یہ چیزیں زندگی کا حصہ ہونی چاہئیں۔ مگر ان کو آپ کی پوری زندگی نہیں بننا چاہیے۔ انسان کو ان چیزوں سے اوپر ہونا چاہیے۔ کچھ لوگ میری طرح ہوتے ہیں جن کی زندگی لکڑی کے کھلونے بنانے، مچھلی پکڑنے اور سیپ موتی چننے تک محدود ہوتی ہے اور کچھ لوگ بڑے مقاصد لے کر جیتے ہیں۔ پھر وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر پریشان نہیں ہوتے"۔

حیا نے غیر ارادی طور پہ ایک نگاہ اپنے کندھے پہ ڈالی جہاں آستین کے نیچے Who لکھا تھا۔

"اور جن کی زندگی میں بڑا مقصد نہ ہو، وہ کیا کریں؟"

"وہی جو میں کرتی ہوں۔ عبادت! ہم عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، سو ہمیں اپنے ہر کام کو عبادت بنا لینا چاہیے۔ عبادت صرف روزہ، نوافل اور تسبیح کا نام نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر انسان کا ٹیلنٹ بھی اس کی عبادت بن سکتا ہے۔ میں بہارے کے لیے پھولوں کے ہار اور آنے کے لیے کھانا بناتی ہوں۔ میری یہ صلہ رحمی میری عبادت ہے۔ میں پزل باکسز اور موتیوں کے ہار بیچتی ہوں، میرا یہ رزق تلاشنا میری عبادت ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام کرتے کرتے انسان بڑے بڑے مقاصد پا لیتا ہے"۔

"اور انسان ان چیزوں کے لیے مضبوطی کہاں سے لائے؟"

"حیا! مجھے لگتا ہے ہم لڑکیوں نے اپنے اوپر Fragile stickers (نازک) اسٹکرز لگا رکھے ہیں۔ فریجائل اسٹکرز سمجھتی ہو نا؟ وہ جو نازک اشیاء کی پیکنگ کے اوپر چسپاں ہوتے ہیں، اور ان پہ لکھا ہوتا ہے "ہینڈل ود کیئر!" وہی اسٹکرز ہم لڑکیاں اپنی پیشانی پہ لگائے رکھتی ہیں۔ پھر کسی کا ذرا سا طنز ہو یا بے جا پڑی ڈانٹ، ذرا سا کانٹا چبھ جائے یا دل ٹوٹ جائے، ہم گھنٹوں روتی ہیں۔ اللہ نے ہمیں اتنا نازک نہیں بنایا تھا، ہم نے خود کو بہت نازک بنا لیا ہے اور جب ہم لڑکیاں ان چیزوں سے اوپر اُٹھ جائیں گی تو ہمیں زندگی میں بڑے مقصد نظر آ جائیں گے"۔ عائشے خاموش ہو گئی۔ اب لونگ روم میں صرف لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔

"عائشے گل، تم بہت پیاری باتیں کرتی ہو"۔ وہ تھکان سے ذرا سا مسکرا کر بولی تو عائشے دھیرے سے ہنس دی۔

"تم بھی بہت پیاری ہو!"

"یہ تو تم نے مروت میں کہا! اچھا عائشے! میں کل سے تم دونوں کے کمرے میں سو جایا کروں؟ مجھے اوپر والے کمرے میں تنہائی محسوس ہوتی ہے"۔

"ٹھیک ہے پھر ہم کل اپنے کمرے کی سیٹنگ بدل دیں گے۔ بڑا والا ڈبل بیڈ گیسٹ روم سے ادھر لے آئیں گے"۔ عائشے اُٹھتے ہوئے بولی۔ اس نے مسکرا کر دھیرے سے سر ہلا دیا۔ جو بھی تھا، عائشے کی باتیں اس کے دل کو بہت اُلجھا دیا کرتی تھیں۔ وہ کبھی بھی زندگی میں ایسے تذبذب اور کشمکش میں مبتلا نہیں رہی تھی جس سے اب گزر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز اسے موبائل تو ہوٹل گرینڈ (وہ ہوٹل جو بیوک ادا میں اے آر پاشا کا گڑھ سمجھا جاتا تھا) کے ایک ملازم نے سم سمیت لا

دیا۔ مگر بیڈ وہ شفٹ نہ کر سکیں کہ وہ مکمل نہیں رہا تھا۔ انہوں نے یہ کام ایک دن کے لیے ملتوی کر دیا۔ سو رات کو جب وہ سونے لیٹی تو اوپر اپنے کمرے میں اکیلی ہی تھی۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کے ذہن کے پردوں پہ وہی رات، دہکتی سلاخیں اور بھڑکتا الاؤ چھانے لگا تو وہ مضطرب سی اُٹھ بیٹھی۔ وہ رات اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی۔ اس کے مسئلے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ پہلے وہ سفید پھول اور پاشا کا تعاقب اور اب یہ یادیں۔ اگر وہ اس روز اکیلی مسز عبداللہ کے گھر سے نہ نکلی ہوتی اور اگر پانچ چھ ماہ قبل وہ اس چیریٹی لنچ پہ اس فائیو سٹار ہوٹل میں نہ گئی ہوتی تو یہ مسئلے پیش نہ آتے۔ اس نے بہت اضطراب سے سوچا تھا۔

یقیناً پاشا اسی چیریٹی لنچ پہ مدعو ہوگا۔ اسے اس سفید محل میں جگہ جگہ پاشا اور آنے کی تصاویر آویزاں نظر آئی تھیں اور اب تک تو اسے عبدالرحمٰن پاشا کی شکل حفظ ہو چکی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کی سعی کی۔ کیا اس نے اس لنچ پہ پاشا کو دیکھا تھا؟''

اسے فون نمبرز یاد نہیں رہتے تھے کیونکہ وہ انہیں یاد رکھنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ ہاں اس کے بچپن میں ہوتا تھا۔ وہ ڈائری پہ نمبرز لکھنے اور زبانی یاد کرنے کا رواج، مگر جب سے موبائل کلچر عام ہوا تھا، اس نے فون بک میں نمبرز محفوظ کر کے انہیں یاد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ البتہ چہرے، مناظر، چھوٹی چھوٹی جزیات، کپڑوں کے ڈیزائن پوری تفصیل کے ساتھ اسے یاد رہا کرتے تھے اور اسے نہیں یاد تھا کہ اس نے پاشا کو اس لنچ پہ دیکھا ہو۔ وہاں بہت سے لوگ تھے۔ وہ یقیناً وہاں ہوگا مگر حیا کی نگاہ ہی اس پہ نہیں پڑی ہوگی ورنہ پاشا کی تصویر دیکھ کر اسے وہ چہرہ جانا پہچانا لگتا۔ اس لنچ پہ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو معمول سے ہٹ کر ہو سوائے اس لڑکی کے جس کی ٹرے میں چار کپ تھے۔

اس نے قدرے اچنبھے سے آنکھیں کھولیں۔ اسے وہ لڑکی کیوں یاد آئی تھی؟ ہال میں نہیں، البتہ ہوٹل کی لابی سے ہو کر جب وہ ریسٹورنٹ سے گزر رہی تھی تب وہ اسے ملی تھی۔ حالانکہ حیا اسے نہیں جانتی تھی مگر اس نے کہا تھا کہ وہ اس سے یونیورسٹی میں مل چکی ہے۔ حیا کو ایسا کوئی واقعہ یاد نہ تھا، مگر وہ لڑکی مصر تھی کہ وہ مل چکی ہیں۔

اس نے آنکھیں موند کر دوبارہ وہ منظر یاد کرنے کی سعی کی۔ وہ زارا کے ساتھ چلتی ہوئی جا رہی تھی کہ سامنے سے ٹرے میں چار کپ لیے وہ دراز قد لڑکی چلتی ہوئی آئی، پھر۔۔۔۔

اس کے تخیل میں مخل ہونے والی آواز فون کی تھی۔ اس نے کوفت سے آنکھیں کھولیں اور فون کو دیکھا، وہاں پاکستان کا نمبر لکھا آ رہا تھا۔

ابھی تو یہ نمبر اس نے کسی کو نہیں دیا تھا، پھر......؟

''ہیلو؟'' اس نے فون کال سے لگایا۔

''حیا...... میجر احمد ہیئر!'' وہی بھاری، خوب صورت، شائستہ آواز۔ اس نے گہری سانس لی۔ یہ لوگ اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے، وہ جتنا ان کو پرے دھتکارے، وہ اس کا سائے کی طرح تعاقب کرتے رہیں گے۔

''کہیے! کس لیے فون کیا ہے آپ نے؟'' اس کی آواز میں خود بخود رکھائی در آئی۔ یہ پوچھنا بے سود تھا کہ میجر احمد کو اس کا نمبر کیسے ملا اور فون بند کرنا بھی بے سود تھا۔ وہ پھر فون کرے گا اور کرتا ہی رہے گا۔ اسے کسی اور طرح سے اب اسے ڈیل کرنا ہوگا۔

''کیا ہم کچھ دیر کے لیے بات کر سکتے ہیں؟'' اس کی آواز بوجھل تھی۔ تکان سے بھری۔ غم سے لبریز۔ اُداس، متفکر۔

حیا نے لمحے بھر کو سوچا، اس کا ذہن چند خیالات کو ترتیب دینے لگا تھا۔

''دیکھیں میجر احمد''۔ اس نے سوچ سوچ کر کہنا شروع کیا۔ ''اگر تو آپ کوئی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جو کسی شادی شدہ عورت سے کرنا غیر مناسب ہے تو مت کیجیے، لیکن اگر آپ کوئی باہمی مفاد کی بات کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو سن رہی ہوں''۔

وہ چند لمحے خاموش رہا، پھر اس کی آواز فون میں اُبھری۔

''مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے جو آپ کے ساتھ ہوا''۔ وہ ایک دم بالکل ساکت ہو گئی۔ اس کے اغوا کی خبر پھیل چکی تھی۔

''تو کیا وہ سب راز نہیں رہا؟'' ایک بوجھ سا اس کے دل پہ آن گرا تھا۔

''فکر نہ کریں، پاکستان میں کسی کو علم نہیں ہوا''۔

وہ اس کے لہجے پہ غور کرنے لگی۔ یہ کیا کوئی دھمکی تھی کہ وہ چاہے تو پاکستان میں سب کو علم ہو سکتا ہے؟ اس کے پاس یقیناً اس کی ویڈیو تھی اور پاشا کے پاس اس کی بہت سی تصاویر۔ بلیک میلرز!

"میں نے آپ سے کہا تھا نا، اگر زندگی میں کوئی آپ کو جنت کے پتے لا کر دے تو انہیں تھام لیجئے گا۔ وہ آپ کو رسوا نہیں ہونے دیں گے"۔ اس کی آواز میں دل کو چیرتا ہوا درد تھا۔

"اور میں نے بھی آپ سے کہا تھا کہ ہم دُنیا والوں نے جنتیں کہاں دیکھی ہیں"

"آپ نے میری بات نہیں مانی۔ مجھے اس واقعے نے جتنی تکلیف دی، شاید زندگی میں کسی اور شے نے اتنی تکلیف نہیں دی"۔

"میں اغوا ہوئی، ظلم میرے ساتھ ہوا، تو آپ مجھے کیوں قصوروار ٹھہرا رہے ہیں؟"

"وہ ہر کسی کو نہیں اغوا کرتے۔ خوب صورت لڑکیوں کو کرتے ہیں"۔

"میں خوب صورت ہوں تو اس میں میرا قصور ہے؟"

وہ حیران نہیں ہو رہی تھی، وہ پوچھ رہی تھی۔

"نہیں یہ پتا چلا کہ آپ خوب صورت ہیں، اس میں آپ کا قصور ہے"۔ وہ بھی طنز نہیں کر رہا تھا، بس مغموم انداز میں کہہ رہا تھا۔

"تو اب میں کیا کروں؟ اب ان سارے مسائل سے کیسے جان چھڑاؤں؟"

"کون سا مسئلہ ہے؟ مجھے بتائیں، آپ مجھے ہمیشہ اپنا خیر خواہ پائیں گی"۔

وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر کہنے لگی۔

"اگر کوئی آپ کو بلیک میل کرنے لگے تو کیا کرنا چاہیے؟"

"بلیک میلر ایک بے تحاشا بیل کی طرح ہوتا ہے حیا! اس سے بھاگیں گی تو وہ آپ کا تعاقب کرے گا اور تھکا تھکا کر مار دے گا۔ سو اس سے ٹکر کر کے بھاگنے کے بجائے اس کا سامنا کریں اور آگے بڑھ کر اس کو سینگوں سے پکڑ لیں۔ دُنیا کا کوئی ایسا بلیک میلر نہیں ہے جس کی اپنی کوئی ایسی کمزوری نہ ہو جس پہ اسے بلیک میل نہ کیا جا سکے"۔

"آپ کی کمزوری کیا ہے؟"

"بہت سی ہیں۔ کمزوریاں پوچھی نہیں، تلاشی جاتی ہیں، لیکن میں بلیک میلر نہیں ہوں"۔

"اگر مجھے آپ کی کمزوری تلاشنی ہوتی تو پوچھتی نہیں"۔ اس نے ذرا محظوظ سے انداز میں جتایا۔

"ویسے وہ پزل باکس مجھے کس نے بھیجا تھا؟" وہ جواباً خاموش رہا۔

"میجر احمد! میرا خیال ہے اب ہم یہ ڈمب گیم بند کر دیں اور یہ بات تسلیم کر لیں کہ آپ مجھ سے ایک خواجہ سرا بن کر ملتے رہے ہیں"۔ اس نے پنکی کے بجائے خواجہ سرا کہنا مناسب سمجھا۔

"میں تسلیم کرتا ہوں"۔

"آپ پنکی تھے مگر ڈولی کون تھا؟"

"ارے آر پی کی ماں نے بتایا تو تھا آپ کو"۔

"کیا میں نے کبھی ڈولی کا اصلی چہرہ دیکھا ہے؟"

"نہیں، آپ اسے نہیں جانتیں"۔

"وہ باکس مجھے ڈولی نے بھیجا ہے مگر اس کی پہیلی، وہ کس نے لکھی تھی؟ کون لکھتا ہے یہ پہیلیاں؟ کیا آپ لکھتے ہیں؟" وہ خاموش رہا۔

"میجر صاحب! مجھے سچ سچ بتا دیں۔ ویسے میں جانتی ہوں کہ وہ آپ ہی لکھتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ منظر عام پہ آنے کے بجائے پس منظر میں بیٹھ کر عقل کی ڈوریں ہلاتے رہتے ہیں"۔

"جی، وہ میں ہی لکھتا ہوں"۔

''وہ کریبی آئی'' والی پہیلی بھی آپ نے لکھی تھی، بلکہ آپ سے لکھوائی گئی تھی؟''

''جی وہ میں نے ہی لکھی تھی۔ ویسے پزل باکس کھول لیا آپ نے؟'' اس نے پہلی دفعہ میجر احمد کی آواز میں سرسری سا تجسس محسوس کیا۔ کیا اس کی کمزوری اس کے ہاتھ میں آنے لگی تھی؟

''جی، کھول لیا اور مجھے وہ مل گیا جو ڈولی مجھ تک پہنچانا چاہتا تھا''۔

وہ بالوں کی لٹ انگلی پہ لپیٹتی بڑے اطمینان سے کہہ رہی تھی۔ اپنی بات کے اختتام پہ اس نے واضح طور پہ کرسی کے پہیوں کی آواز سنی، جیسے ریوالونگ چیئر پہ ٹیک لگا کر بیٹھا میجر احمد کرنٹ کھا کر آگے کو ہوا تھا۔

''واقعی؟'' اس کی آواز میں محتاط سی حیرت تھی۔

''جی! پہیلی آسان تھی۔ میں نے بوجھ لی۔ ویسے جو اس میں تھا، وہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور اس نے مجھ پر ایک بہت حیرت انگیز انکشاف کیا ہے''۔

''جو باکس میں تھا، وہ آپ کے ہاتھ میں ہے اور اس نے آپ پر ایک انکشاف کیا ہے؟'' وہ رُک رُک کر اس کے الفاظ دہرا کر جیسے تصدیق چاہ رہا تھا۔

''جی بالکل!''

جواباً وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''نہیں! آپ سے ابھی تک وہ باکس نہیں کھلا لیکن مجھے آپ کا یوں ذہن استعمال کر کے مجھے گھیر کر کچھ اگلوانے کی کوشش اچھی لگی۔''

حیا نے تلملا کر موبائل کو دیکھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے؟

''اچھا مجھے نیند آ رہی ہے''۔ وہ ذرا بے زاری سے بولی۔

''آپ بے شک سو جائیں مگر پلیز فون بند مت کیجیے گا''۔ وہ جیسے التجا کر رہا تھا۔

''جب میں کچھ بولوں گی ہی نہیں تو آپ کیا سنیں گے؟''

''میں آپ کی خاموشی سنوں گا''۔

''میں سو رہی ہوں۔ ہائے!'' اس نے تکیے پہ سر رکھتے ہوئے ''جان چھوڑو'' والے انداز میں کہا، مگر پھر اس نے واقعی موبائل بند نہیں کیا۔ ایک ہاتھ سے فون کان پہ سے لگائے دوسرا بازو آنکھوں پہ رکھے، وہ کب سو گئی، اسے علم نہیں ہوا۔

صبح اُٹھتے ہی اس نے موبائل چیک کیا تو میجر احمد کی کال کا دورانیہ تین گھنٹے اور بیس منٹ لکھا آ رہا تھا۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ اس نے تو بمشکل دس منٹ میجر احمد سے بات کی تھی، تو کیا تین گھنٹے وہ اس کی خاموشی سنتا رہا تھا؟ عجیب آدمی تھا یہ بھی!

☆ ☆ ☆

پھر جس روز اس نے عائشے کے ساتھ ان دونوں بہنوں کے کمرے کی سیٹنگ تبدیل کرنے کا پروگرام بنایا، اس صبح اس نے جہان کو اپنا نمبر میسج کر دیا، بغیر کسی بات کے۔

جب وہ عائشے کے ہمراہ بڑا بیڈ اندر رکھ کر اور چھوٹا بیڈ باہر نکال کر، شاور لینے کے بعد تولیے سے بال تھپتھپا کر سکھاتی باہر آئی تو بیڈ پہ رکھا اس کا موبائل بج رہا تھا۔

''جہان کالنگ''۔

اماں سے جب اس نے جہان کا نمبر لیا تھا تو صرف موبائل میں محفوظ ہی نہیں کیا بلکہ زبانی یاد بھی کر لیا۔ اگر کبھی دوبارہ......

''السلام علیکم!'' اس نے ایک دل نشین مسکراہٹ کے ساتھ فون کان سے لگایا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ تولیہ نرمی سے گیلے بالوں میں رگڑ رہی تھی۔

''وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟'' وہ بھی دوسری طرف جیسے بہت اچھے موڈ میں تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"بہت اچھی اور تم؟"

"جیسا پہلے تھا۔ اور تم نے فون ٹھیک کرالیا؟ ممی کہہ رہی تھیں، تمہارا فون خراب ہو گیا تھا"۔

"ہاں، بہت کچھ خراب ہو گیا تھا۔ ویسے ابھی ایک دو روز پہلے نیا فون لیا ہے"۔ وہ تولیہ کرسی کی پشت پہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"پھر تو بہت جلدی نمبر دے دیا تم نے"۔

"مجھے توقع نہیں تھی کہ کسی کو مجھ سے بات کرنے کی جلدی ہو گی، اسی لیے"۔

"اچھا! اپنے یہ طنز چھوڑو، مجھے بتاؤ، تم ڈورم میں ہو؟ میں ذرا مضافات میں آیا ہوا تھا، تمہارے کیمپس سے دس منٹ کی ڈرائیو پہ ہوں۔ چلو پھر ساتھ لنچ کرتے ہیں"۔

اسی پل عائشے کچھ لینے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر رک گئی۔ وہ متذبذب سی فون پہ کہہ رہی تھی۔

"نہیں، میں...... ابھی کیمپس تو......"

عائشے نے لمحے بھر کو غور سے اسے دیکھا پھر جیسے سمجھ کر سر ہلاتی آگے آئی اور رائٹنگ ٹیبل پہ رکھے مگ سے پین نکالا۔ نوٹ پیڈ کے اوپری صفحے پہ کچھ لکھ کر اس نے پیڈ اسے تھمایا۔ پھر خود باہر چلی گئی۔ حیا نے رک کر صفحے پہ لکھے الفاظ پڑھے۔

"سچ سے بہتر جواب کوئی نہیں ہوتا"۔

"حیا؟" دوسری جانب وہ پوچھ رہا تھا۔

"جہان! میں بیوک ادا میں ہوں"۔ وہ پیڈ پکڑے، اس پہ لکھی تحریر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"اوہ، فرینڈز ٹرپ تھا کوئی؟ مجھے پہلے بتا دیتیں تو......"

"میں ادھر کچھ دن سے رہ رہی ہوں۔ میری فرینڈ کا گھر ہے ادھر۔ اور پھر تمہیں کیا بتاتی، تم تو ہمیشہ مصروف ہوتے ہو"۔ اس نے حملے کا رخ بدلا تو وہ دفاعی پوزیشن میں آ گیا۔

"اتنا مصروف کہاں ہوتا ہوں؟"

"پھر کل ملتے ہیں۔ تم کل بیوک ادا آ جاؤ کیونکہ میں تو چند دن اپنی فرینڈز کے ساتھ ادھر ہی رہوں گی"۔

"کل میں مصروف ہوں"۔

"اچھا پرسوں؟"

"میں اگلا سارا ہفتہ مصروف ہوں۔ تم اپنی فرینڈز کے ساتھ انجوائے کرو، میں کال کرتا ہوں۔ اللہ حافظ"۔ اس نے ٹھک سے فون رکھ دیا تھا۔

"جہان!" اس نے جھنجھلا کر موبائل کان سے ہٹایا۔ اس شخص کا کوئی پتا نہیں چلتا تھا کہ اسے کب کیا برا لگ جائے۔

باہر سے بہارے پھر سے آوازیں دینے لگی تھی۔

"حیا...... یہ کریمی آئی کیا ہے؟ کوئی ہنٹ دے دو"۔

"جو بوجھے گا، گفٹ اسی کا ہو گا"۔ اس نے جواباً زور سے آواز دی۔ بہارے فوراً خاموش ہو گئی۔ عبدالرحمٰن کا تحفہ کسی دوسرے سے شیئر کرنے کا تصور بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔

☆ ☆ ☆

اس صبح وہ ابھی گہری نیند میں تھی جب موبائل اچانک بجنے لگا۔ چمکتی اسکرین پہ جہان کا نام جل بجھ رہا تھا۔ اس نے خمار آلود سا ہیلو کہتے ہوئے فون کان سے لگایا۔

"میں فیری سے بیوک ادا آ رہا ہوں، تم پورٹ پہ پہنچ جاؤ"۔

"کیا؟" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ "تم آ رہے ہو؟" اس کے لہجے میں سارے زمانے کی خوشی در آئی تھی۔

''ہاں، میں نے سوچا، بندے کو اتنا مصروف بھی نہیں ہونا چاہیے''۔ وہ ہنس کر بولا۔
وہ لحاف پھینک کر باہر کو بھاگی۔ عائشے کچن میں کام کرتی نظر آ رہی تھی۔ بہارے کرسی پہ بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔
''آج تم جنگل نہیں جاؤ گی، بس میں نے کہہ دیا، حلیمہ آنٹی نے کہا ہے کہ تمہیں پورا سبق دوبارہ یاد کرنے کی ضرورت ہے''۔
''مگر عائشے.....'' بہارے نے منہ بسور کر پلیٹ پرے ہٹائی۔
''عائشے! مجھے پورٹ جانا ہے''۔ وہ بھاگتی ہوئی چوکھٹ میں آن رکی۔ ''میرا کزن آ رہا ہے۔ استنبول سے''۔
''ٹھیک ہے، پھر ہم پہلے پورٹ چلے جائیں گے''۔
''ٹھیک!'' وہ اپنی خوشی چھپاتی تیار ہونے واپس بھاگ گئی۔
دو روز قبل حلیمہ آنٹی نے عائشے کے ہاتھ اس کے لیے ایک میرون رنگ کا شیشوں کے کام والا کرتا بھیجا تھا۔ اس نے نیلی جینز پہ وہی گھٹنوں تک آتا کرتا پہن لیا اور گیلے بال کھلے چھوڑ دیے۔ کندھوں پہ اس نے عائشے کا میرون پونچو پہن لیا تھا۔
بہارے کو حلیمہ آنٹی کے پاس چھوڑ کر وہ دونوں فیری پورٹ پر آ گئیں، فیری ابھی پانچ منٹ قبل پہنچا تھا۔ ٹورسٹس کا ایک جم غفیر اس سے اتر رہا تھا۔ وہ آنکھوں پہ ہاتھ کا سایہ کیے، فیری سے اترتے لوگوں کو متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگی، تب ہی اسے جہان نظر آ گیا۔
وہ نیلی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سامنے سے چلتا ہوا آ رہا تھا، اس نے بھی اوپر میرون سوئٹر پہن رکھا تھا۔ جہان کو اپنے قریب دیکھ کر وہ بے اختیار مسکرا دی۔
''جہان! اوور ہیئر!'' اس نے ہاتھ اونچا کر کے ہلایا۔ جہان نے دیکھ لیا تھا، تب ہی دھیما سا مسکراتا ان کی طرف آ گیا۔
''واؤ، تم تو ٹائم پہ پہنچ گئیں''۔
''تھینکس۔ یہ میری فرینڈ ہے، عائشے گل۔ میں اسی کے ساتھ رہ رہی ہوں اور عائشے! یہ میرا کزن ہے، جہان سکندر''۔
''السلام علیکم!'' عائشے نے اپنے نرم، ازلی خوش اخلاق انداز میں سلام کیا۔
''وعلیکم السلام!'' اس نے مسکراتے ہوئے سر کو جنبش دی۔ ''تو تم ان کی بن بلائی مہمان بنی ہوئی ہو؟''
''ارے نہیں، بن بلائی کیوں؟ ہم نے تو خود حیا کو بصد اصرار چند دن ادھر رکنے کا کہا تھا''۔ عائشے ذرا جھینپ گئی۔
پھر تھوڑی دیر ہی وہ رک پائی کہ اسے جنگل جانا تھا۔ وہ چلی گئی تو وہ دونوں بندگاہ سے ہٹ کر سڑک کی طرف آ گئے۔ میرون اور نیلے رنگ میں ملبوس، وہ سڑک کے کنارے چلتے بالکل ایک سے لگ رہے تھے۔
''تمہارا فون اتنی افراتفری میں آیا کہ میں ناشتہ بھی نہیں کر سکی''۔ مین بازار میں ریسٹورنٹس کے کھلے فرنٹس سے اشتہا انگیز سی خوشبو باہر آ رہی تھی۔
''پھر جاؤ، اور میرے لیے بھی ناشتہ لے آؤ۔ مگر پے میں کروں گا''۔ اس نے والٹ نکال کر چند نوٹ نکالے۔
''ترک رسم و رواج کے مطابق ادائیگی ہمیشہ میزبان کرتا ہے اور ادھر میزبان میں ہوں جہان!''
''چھوڑو ترک رسوم کو۔ ہم پاکستانی ہیں''۔
''شکر۔ تمہیں یاد تو رہا''۔ اس نے نوٹ پکڑے اور ریسٹورنٹس کی قطار کی سمت چلی گئی۔
وہاں سڑک کے ایک طرف ریسٹورنٹس تھے تو دوسری طرف قطار میں بنچ اور میزیں ایسے لگی تھیں جیسے کسی چرچ میں لگی ہوتی ہیں۔ درمیان میں کھلی، سرمئی سڑک تھی جو گزشتہ رات کی بارش سے ابھی تک نم تھی۔
جہان ایک بنچ پہ بیٹھ گیا اور کہنیاں میز پہ رکھ کر دونوں مٹھیاں باہم ملا کر ہونٹوں پہ رکھے اسے دیکھنے لگا، جو سڑک کے پار ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ چند ثانیے کے بعد وہ پلٹی تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں کافی کے کپ اور سینڈوچز رکھے تھے۔ اس نے سڑک پار کی اور ٹرے میز پہ جہان کے سامنے رکھی۔
''شکریہ''۔ اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے ایک کپ اٹھا لیا۔

''اور اب تم واپس استنبول آ جاؤ۔ بہت رہ لیا ادھر''۔
''کیوں؟'' کافی کا کپ لبوں تک لے جاتے ہوئے وہ ساختہ رُکی تھی۔
''ممی تمہیں یاد کر رہی تھیں''۔
''صرف ممی؟'' اس نے آزردگی سے سوچا، پھر سر جھٹک کر پھیکا سا مسکرائی۔
''تو پھر جہان سکندر ایک گھنٹے کی مسافت طے کر کے مجھ سے ملنے آنے کا احسان کتنے دن تک جتائیں گے''۔
''قریباً......'' جہان مسکرا کر کچھ کہتے کہتے رُکا، اس کی آنکھوں میں اُلجھن بھری۔
''تمہاری آنکھ پہ کیا ہوا ہے؟'' اس کی نگاہیں حیا کے چہرے پر سے پھسلتی گردن پہ جا ٹکیں۔ ''اور ہونٹ، اور گردن پہ؟ تمہیں چوٹ لگی ہے؟''
''ہاں، بہت گہری چوٹ لگ گئی تھی''۔
''کیسے؟'' وہ ذرا تفکر سے کہتا آگے کو ہوا اور کپ میز پہ رکھا۔
''میں گر گئی تھی۔ بہت بری طرح سے گر گئی تھی''۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بھی کہیں دور چلی گئی تھی۔
''اوہ۔ اب ٹھیک ہو؟''
حیا نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔
''اور یہ تم نے اپنی عمر سے اتنی چھوٹی لڑکی سے دوستی کرنا کب سے شروع کر دی؟''
''جب سے اپنی عمر والی ساتھ چھوڑ گئی''۔
ایک بوجھل سی خاموشی دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ ایک نہ ختم ہونے والے کرب نے سڑک کنارے لگے بنچز کی قطار کو گھیرے میں لے لیا۔ قریب میں ایک بچہ تین گیندیں جو موٹے موٹے زرد لیموں سے مشابہ تھیں، یوں اُچھالتے ہوئے چلا آ رہا تھا کہ کوئی گیند گرنے نہ پاتی تھی۔
''خیر۔ یہ دو بہنیں عمر میں اتنی چھوٹی نہیں ہیں۔ بس چہرے سے لگتی ہیں۔ عائشے بیس سال کی ہے اور چھوٹی بہارے نو سال کی۔ انہوں نے میری مدد کی تھی، یوں ہماری دوستی ہو گئی''۔
''کیسی مدد؟''
''میرے بالوں پہ کچھ گر گیا تھا، حادثاتی طور پہ، وہ عائشے نے اُتار دیا۔ مگر تم فکر نہ کرو، اب سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا ہے''۔
''مگر کچھ تو بدلا ہے حیا!'' وہ کافی کے گھونٹ لیتا ذرا اُلجھن سے اس کو دیکھ رہا تھا۔
''ہاں، کچھ تو بدلا ہے''۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر گیندوں کا کرتب دکھاتے لڑکے کو دیکھنے لگی۔
ایک ڈولی تھا جو کسی نگران فرشتے کی طرح اس کا پہرہ دیا کرتا تھا، ایک میجر احمد تھا جو اس کی خاموشی سننے کے لیے تین گھنٹے تک فون کان سے لگائے رکھتا تھا، ایک عبدالرحمٰن تھا جو دوسرے ملک میں ہونے کے باوجود اس کی مدد کے لیے آتا تھا اور ایک جہان سکندر تھا جو اس کی ایک وضاحت پہ مطمئن ہو جاتا تھا، جو اس کے چہرے کے زخم تو دیکھ سکتا تھا مگر ان کے پیچھے اس کی جلی ہوئی روح اسے نظر نہیں آتی تھی، جو نظر آتا ہے وہ تو سب دیکھ لیتے ہیں، جو نہیں نظر آتا وہ کوئی کوئی ہی دیکھ سکتا ہے اور جہان ایسے لوگوں میں شامل نہیں تھا۔
دفعتاً میسج ٹون بجی تو جہان نے موبائل جیب سے نکالا اور دیکھا۔
''ممی کو بتا کر نہیں آیا تھا، اب ان کی تفتیش شروع ہو گئی ہے''۔ وہ پیغام کا جواب ٹائپ کرتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگا۔
''تم جتنی ان کی مانتے ہو، میں جانتی ہوں''۔
''وہ مجھ سے کچھ منواتی نہیں ہیں، ورنہ شاید میں ان کی واقعی مانتا''۔ اس نے پیغام بھیج کر سیل فون وہیں میز پر ڈال دیا۔ حیا نے ایک نظر اس کے فون کو دیکھا۔

''تو وہ سم ون اسپیشل کون تھا جس نے تمہیں یہ فون گفٹ کیا تھا؟'' جہان نے موبائل اُٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ تم رکھ لو، میں اور لے لوں گا۔ اتنے سوال پوچھتی ہو تم میرے فون کے بارے میں''۔ حیا نے فون اس کے ہاتھ سے لے کر واپس میز پہ رکھا۔

''بات کو مت ٹالو۔ میرے سوال کا جواب دو''۔

''نہیں، تم فکر نہ کرو، کسی لڑکی نے نہیں دیا تھا۔ یہ میرا آفیشل فون تھا، میری جاب کا فون۔ میرے باس نے دیا تھا''۔

''تمہارا باس؟'' اس کی آنکھوں میں اُلجھن اُبھری۔ ''مگر تم تو اپنا کام کرتے ہو نا؟''

''ہمیشہ سے تو اپنا نہیں کرتا تھا۔ یہ ریسٹورنٹ تو ڈیڑھ دو سال پہلے کھولا تھا، اس سے پہلے تو بہت سی جابز کی ہیں''۔ وہ زرد گیندیں اُچھالتے بچے کو دیکھ کر دھیما سا مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں کوئی ایسا نرم سا تأثر تھا جو حیا نے صرف ایک دفعہ پہلے دیکھا تھا۔ جیسے وہ کچھ یاد کر رہا تھا۔ کوئی گم گشتہ قصہ۔

''ایک بات کہوں جہان؟ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں اپنی جاب اور اپنا باس بہت پسند تھا''۔ وہ بغور اس کے چہرے کے تأثرات کو دیکھتے ہوئے بولی تو جہان نے بری طرح سے چونک کر اسے دیکھا۔

''تمہیں ایسا کیوں لگا؟''

''کیونکہ ابھی اپنے باس اور جاب کا ذکر کرتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں جو چمک اور محبت در آئی ہے نا، یہ میں نے پہلے تب دیکھی تھی جب تم ہمارے کچن میں مجھے اس اسپیشل گفٹ کے بارے میں بتا رہے تھے اور اب بھی یہ سب کہتے ہوئے تمہارا چہرہ ایک دم سے اتنا Glow کرنے لگ گیا کہ مجھے لگا اس ذکر سے وابستہ کوئی خاص یاد تمہارے ذہن میں چل رہی ہے''۔

''تم تو چہرے پڑھنے لگ گئی ہو؟'' وہ جیسے سنبھل کر مسکرایا۔

''بتاؤ نا، تمہیں اپنی پچھلی جاب بہت پسند تھی؟''

''ہاں، بہت زیادہ۔ بڑے عیش تھے تب، اپنی راجدھانی، اپنی جگہ کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے''۔ وہ اپنے چہرے کے تأثرات کو ہموار رکھے۔ دوبارہ ''کہیں'' پیچھے نہ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تو وہ جاب کیوں چھوڑ دی؟''

''بعض دفعہ انسان کو بہت کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اپنی سلطنت سے خود کو خود جلاوطن کرنا پڑتا ہے۔ ان شہزادوں کے جزیروں کو ترک میں ''ادالار'' Adalar کہتے ہیں کیونکہ یہاں ان شہزادوں کو جلاوطن کر کے بھیجا جاتا تھا جو سلاطین کو اپنے تخت کے لیے خطرہ لگتے تھے''۔ وہ بات کو کہیں اور لے گیا۔

''ہاں، اور میں سوچتی ہوں جہان! وہ جلاوطن شہزادے اپنے پرانے شاہانہ دور کو کتنا یاد کرتے ہوں گے''۔

''اور جو خود کو خود ہی جلاوطن کرتے ہیں، ان کی یاد میں تکلیف بھی در آتی ہو گی''۔ پھر اس نے دھیرے سے سر جھٹکا۔ ''آؤ سمندر پہ چلتے ہیں''۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ساحل سمندر پہ پتھروں کی قطار پہ چل رہے تھے۔ ہوا سے حیا کے بال اُڑ اُڑ کر جہان کے کندھے سے ٹکرا رہے تھے مگر وہ انہیں نہیں سمیٹ رہی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر جھکائے قدم اُٹھا رہا تھا۔

''تمہارا ریسٹورنٹ کیسا جا رہا ہے؟''

''رینوویشن کروا رہا ہوں اور میری لینڈ لیڈی بھی کوئی لائیر (وکیل) کر رہی ہے میرے خلاف۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے پاس ایک دم سے خود کا اتنا پیسہ کہاں سے آ گیا کہ وہ اتنا مہنگا لائیر کر سکے''۔

حیا کا دل آزردگی کے سمندر میں ڈوب کر اُبھرا۔ وہ جانتی تھی کہ اچانک سے اس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آیا تھا۔ وہ سب اس کی غلطی تھی۔

''تو تم اب کیا کرو گے؟''

''آج کل بس چھپا ہوا ہوں، اسی لیے ریسٹورنٹ سے بھاگ کر ادھر آ گیا ہوں۔ ذرا لو پروفائل رکھی ہوئی ہے''۔ وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔

''تم اس سے اتنا ڈرتے ہو؟''

''ڈرتا تو میں فرقان ماموں اور صائمہ مامی کے سوا کسی سے نہیں ہوں''۔ سمندر کی ایک تیز لہر آئی اور ان کے قدموں کو بھگو کر واپس پلٹ گئی۔

''اوہ فرقان ماموں کی بیٹی کی منگنی ہو رہی ہے''۔ اسے اچانک یاد آیا۔ حیا حیرت سے رُک کر اسے دیکھنے لگی۔

''ارم کی؟ کب؟ کس سے؟''

''کل رات مامی کا فون آیا تھا ممی کو۔ انہوں نے ہی بتایا تھا۔ فنکشن تو معلوم نہیں کب ہے، البتہ رشتہ طے ہو گیا ہے''۔

''مگر کس سے؟''

''فرقان ماموں کے کسی دوست کی فیملی ہے۔ زیادہ تفصیل مجھے نہیں معلوم!'' وہ شانے اُچکا کر بولا۔ وہ دونوں پھر سے چلنے لگے تھے۔

(ارم نہیں مانی ہوگی، تایا نے زبردستی کی ہوگی) وہ یہی سوچ رہی تھی۔

''تمہیں پتا ہے جہان! اماں، ابا اور تایا، تائی کی بڑی خواہش تھی کہ ارم کا رشتہ روحیل سے ہو۔ اب پتا نہیں تایا، تائی نے کہیں اور کیوں کر دیا رشتہ''۔

''مگر روحیل تو......'' وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم رُکا۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے لگا کہ جہان کے لبوں سے کوئی بات غیر ارادی طور پر پھسلی تھی۔

''مگر روحیل کیا؟'' وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''روحیل کی تو ابھی کافی اسٹڈیز رہتی ہیں''۔ وہ بات بدل گیا تھا، وہ شرطیہ کہہ سکتی تھی۔

''روحیل کی پڑھائی ختم ہو چکی ہے، جب میں پاکستان واپس جاؤں گی، وہ تب آنے والا ہی ہوگا''۔

جواباً جہان نے ایک گہری پرکھتی نظر اس پر ڈالی۔

''تمہارا روحیل سے رابطہ ہے جہان؟ پھپھو نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ تم لوگ ان ٹچ ہو''۔ اس نے اپنی پرانی اُلجھن کو الفاظ پہنا دیے۔

''ہاں کبھی کبھی بات ہو جاتی ہے۔ میں اس سے ملا تھا امریکہ میں''۔

''اچھا؟ کب؟ اس نے تو نہیں بتایا''۔ وہ خوشگوار حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''پرانی بات ہے۔ تین سال تو ہو ہی گئے ہیں''۔ وہ شانے اُچکا کر بولا۔ اسے بہت حیرت ہوئی تھی۔

ایک تو پتا نہیں اس کے گھر والوں کو ہر بات اپنے تک محدود رکھنے کا شوق کیوں تھا۔ ابھی پاکستان میں اس نے اماں سے سکندر انکل کے کیس کا پوچھا تو اسے معلوم ہوا کہ اماں ابا کو سب پتا تھا اور اب، روحیل جہان سے مل بھی چکا تھا مگر اس نے کبھی نہیں بتایا۔ آج تو وہ روحیل سے ضرور پوچھے گی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا۔

لہریں اسی طرح اُنڈ اُنڈ کر ان کے پیر چھو رہی تھیں۔

جہان! تم نے کبھی سیپ چنے ہیں؟''

''یہاں سیپ ہوتے ہیں؟'' وہ ذرا حیران ہوا۔

''ہاں، تمہیں نہیں پتا؟ آؤ سیپ چنتے ہیں۔ ان سے موتی نکلیں گے؟''

''واقعی؟''

''اب دیکھتے ہیں کہ تمہارا موتی نکلتا ہے یا نہیں''۔ وہ چیلنجنگ انداز میں مسکراتی آگے بڑھ گئی۔

ان دونوں کو ایک ایک سیپ ہی ملی۔ حیا نے دور بیٹھے ٹورسٹس کی ایک ٹولی سے ایک بڑا چھرا لیا جو وہ فروٹ کاٹنے کے لیے لائے تھے اور جہان کے پاس واپس پتھروں پہ آ بیٹھی۔

پہلے اس نے اپنی سیپ کھولی۔ وہ خالی تھی۔ مولسک پہ خون کے قطرے لگے تھے، اس نے مایوسی سے چھرا جہان کی طرف بڑھا دیا۔

جہان نے بلیڈ سیپ کے خول کے درز میں رکھ کر احتیاط سے اسے کاٹا اور کتاب کی مانند سے کھول لیا۔ حیا نے گردن آگے کر کے دیکھا۔ مولسک کے خون آلود لوتھڑے کے عین اوپر قطار میں مٹر کے دانوں جتنے تین سفید موتی جگمگا رہے تھے۔

وہ متحیر سی ان چمکتے موتیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جہان نے چھری کی نوک سے موتی اکھاڑے، ان کو پانی سے دھویا اور جیب سے ایک ٹشو نکال کر ان میں لپیٹا۔

''یہ تمہارے ہوئے''۔ اس نے ٹشو حیا کی طرف بڑھایا۔

اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

''تم اتنے قیمتی موتی کسی دوسرے کو کیسے دے سکتے ہو؟'' وہ ابھی تک اسی لمحے کے زیرِ اثر تھی۔

''یہ لڑکیوں کے شوق ہوتے ہیں۔ میں ان کا کیا کروں گا''۔ وہ لاپروائی سے بولا تھا۔

''تمہیں نہیں معلوم کہ اگر یہ بہارے گل کے نکلتے تو اس کے لیے کتنی قیمتی ہوتے۔ اس کی زندگی کا واحد ''مسئلہ'' موتی ہیں جو اس کی سیپ سے کبھی نہیں نکلتے''۔ اس نے بے دلی سے ٹشو تھام لیا۔ اسے اپنے نکلے موتیوں سے زیادہ خوشی کوئی شے نہیں دے سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

شام میں وہ عائشے کے لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی، روحیل سے اسکائپ پہ بات کر رہی تھی۔ جہان دوپہر میں ہی واپس چلا گیا تھا اور وہ اس کے بعد سیدھی گھر آ گئی تھی۔

جب تک روحیل آن لائن نہیں ہوا، وہ سوچتی رہی تھی کہ تین سال پرانی بات روحیل نے کبھی کیوں نہیں بتائی۔ تین سال پہلے کیا کبھی اس نے اشاروں کنایوں میں بھی بتایا کہ اسے سبین پھپھو کا بیٹا ملا تھا۔ اس کی ہر سوچ کا جواب نفی میں تھا۔ تین سال پہلے ان کی زندگیوں میں کیا ہو رہا تھا؟ وہ شریعہ اینڈ لاء کے دوسرے سال میں تھی۔ ان کے ایک دور کے چچا کی شادی ہوئی تھی، اور...... اور...... روحیل نے ایک دن بہت ہنگامی انداز میں کال کر کے ابا سے پیسے مانگے تھے۔

وہ ایک دم سے چونکی۔ تین، ساڑھے تین سال قبل ایک دن روحیل کا اچانک ہی فون آیا تھا، اس نے ابا سے دو یا تین لاکھ روپے منگوائے تھے۔

''ابا! میں جھوٹ نہیں بول رہا، مجھے واقعی ضرورت ہے''۔

اور ہر ''کیوں'' کے جواب میں وہ یہی کہتا کہ پاکستان آ کر بتاؤں گا۔

حیا کو اس کی پریشانی دیکھ کر پکا یقین تھا کہ اس نے کسی دوست کی کوئی قیمتی شے گم کر دی ہے اور اسی کی قیمت بھرنے کے لیے مانگ رہا ہے۔ پھر پتا نہیں روحیل نے ابا کو وجہ بتائی یا نہیں مگر اب سارے معاملے کو دوبارہ یاد کرتے ہوئے وہ سوچنے لگی کہ کیا ان دو واقعات کا کوئی باہمی تعلق تھا؟ سیدھا سیدھا پوچھا تو روحیل شاید چھپا جائے، سو اسے اندھیرے میں نشانہ باندھنا پڑے گا۔

روحیل آن لائن آ گیا تھا اور اب اس کا چہرہ اسکرین پہ نظر آ رہا تھا۔ رسمی باتوں کے بعد اس نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

''تم نے جہان کا کون سا نقصان بھرنے کے لیے ابا سے پیسے منگوائے تھے؟''

لمحے بھر کو تو روحیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، پھر وہ ذرا حیرت سے بولا۔

''یہ تم سے کس نے کہا ہے؟''

''تم پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ تم سے جہان کا کوئی نقصان ہوا تھا نا؟ جب وہ تمہارے پاس امریکہ آیا ہوا تھا تو تم نے ابا سے پیسے منگوائے تھے''۔ اندر ہی اندر وہ خود بھی گزبڑا رہی تھی، کیا پتا ایسی کوئی بات ہی نہ ہو۔

"تم سے یہ جہان نے کہا ہے؟" وہ اچھنبے سے پوچھ رہا تھا۔
"جس نے بھی کہا ہو، تم میرے سوال کا جواب دو، روحیل"۔
وہ چند لمحے خاموش رہا، جیسے شش و پنج میں ہو۔
"تم جہان سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟"
"وہ سب کچھ بتا چکا ہے مگر تم سے اس لیے پوچھ رہی ہوں تاکہ یہ جان سکوں کہ میرا بھائی مجھ سے کتنا جھوٹ بول سکتا ہے؟" تلخ لہجے میں کہہ کر اس نے روحیل کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں واضح تلملاہٹ در آئی تھی۔ جذباتی بلیک میلنگ کام کر گئی تھی۔
"بات جھوٹ بولنے کی نہیں ہے اور مجھے پتا ہے اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا، وہ بتائے گا بھی نہیں کیونکہ اس نے مجھے بھی منع کر رکھا تھا۔ پھر بھی، میں تمہیں بتائے دیتا ہوں"۔ پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ "وہ ایک رات کے لیے بہت اچانک میرے پاس آیا تھا، اس کے بائیں کندھے پہ گولی لگی تھی اور اسے بروقت طبی امداد چاہیے تھی مگر وہ اسپتال نہیں جانا چاہتا تھا، سو اس کے کہنے پہ میں نے اپنی ایک ڈاکٹر فرینڈ کو بلایا جو تب اپنی ریزی ڈینس کر رہی تھی۔ اس نے میرے اپارٹمنٹ پہ جہان کو ٹریٹ کیا اور بینڈ یج وغیرہ کیا۔ پھر جہان نے مجھے بس اتنا بتایا کہ اس کے پیچھے کوئی ہے اور وہ کسی سے بھاگتا پھر رہا ہے۔ اس کے پاس ترکی کے ٹکٹ کے لیے پیسے بھی نہیں تھے، سو اس کے پیسے مانگنے پہ میں نے ابا سے کہہ کر راتوں رات پیسے ارینج کیے تھے۔ وہ صبح ہوتے ہی واپس ترکی چلا گیا پھر ہفتے بعد ہی اس نے پیسے واپس بھجوا دیے۔ بس یہی بات تھی"۔
وہ حق دق سنے جا رہی تھی۔
"ابا کو پتا ہے اس بات کا؟"
"نہیں اور تم مت بتانا۔ وہ پہلے ہی جہان سے متنفر رہتے ہیں۔ یہ بات بتائی تو......"
"وہ تو بس جہان کی لاپروائی کی وجہ سے اس سے کھنچے کھنچے سے تھے مگر اب ایسا نہیں ہے"۔
"نہیں، وہ کسی اور بات پہ اس سے برگشتہ تھے، اب مت پوچھنا کہ وہ کیا بات تھی۔ میں ابھی جلدی میں ہوں، بعد میں بتا دوں گا، مگر اتنا یقین رکھو کہ وہ جس زخمی حالت میں میرے پاس آیا تھا، مجھے وہ اسی دن سے اچھا لگنے لگا تھا اور میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ سچ بول رہا تھا جب اس نے اس رات مجھے کہا تھا کہ روحیل، آئی ایم ناٹ دی بیڈ گائے، بلکہ جو میرے پیچھے ہیں، وہ برے ہیں"۔
"اور وہ دوسری بات؟" اس نے اصرار کرنا چاہا مگر روحیل اسے کوئی موقع دیئے بغیر میز سے اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ اسے باہر جانا تھا اور وہ جلدی میں تھا۔
حیا نے بے دلی سے لاگ آؤٹ کیا۔ اس کا دل ایک دم بہت بوجھل ہو گیا تھا۔
اس کے گھر والے اس کو چھوٹا سمجھ کر اس سے اتنی باتیں چھپاتے کیوں تھے آخر؟

☆ ☆ ☆

عائشے نے لیٹتے ہوئے بہارے پہ کمبل برابر کیا، پھر ایک نظر اسے دیکھا جو بہارے کے اس طرف لیٹی، چھت کو تکے جا رہی تھی۔ وہ تینوں یوں سوتیں کہ بہارے درمیان میں ہوتی۔
"عائشے!" اس نے عائشے کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس کیا تھا یا شاید وہ اسے پکارنے کا ارادہ پہلے سے رکھتی تھی۔
"کہو!" عائشے پہلو کے بل لیٹی، نرمی سے بہارے کے گھنگھریالے بالوں کو سہلا رہی تھی۔
"میری سیپ سے موتی کیوں نہیں نکلتے؟ میں اتنا جھوٹ تو نہیں بولتی"۔ وہ چھت کو تکتی کہنے لگی۔
"تم بہارے کے فلسفے کو ذہن سے نکال دو۔ یہ تو رزق ہوتا ہے۔ کبھی نکل آتا ہے تو کبھی نہیں"۔
چند لمحے کمرے کی تاریکی میں ڈوب گئے جس میں سبز نائٹ بلب کی مدھم روشنی پھیلی تھی۔ بہارے کی بند آنکھوں سے سانس لینے کی آواز ہولے ہولے اُبھرتی رہی تھی۔

"عائشے"۔ اس نے اسی طرح چھت کو تکتے ہوئے پھر سے پکارا۔ "کیا مجھے دُنیا نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے؟"

"پتا نہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں بہت دور نکل آتی ہوں، اتنی دور کہ میں ان باتوں سے خود کو ریلیٹ نہیں کر پاتی، جو تمہاری زندگی کا حصہ ہیں"۔

"حیا! دور ہمیشہ ہم جاتے ہیں۔ اللہ دور نہیں جاتا"۔

وہ نگاہوں کا زاویہ موڑ کر عائشے کو سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

"اگر تمہیں لگتا ہے کہ دوریاں بہت بڑھ گئی ہیں تو انہیں ختم کرنے کی کوشش میں پہل بھی تمہیں کرنی ہوگی"۔

"کیسے؟" وہ بے اختیار بول اُٹھی۔

"تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"میرا اباز د مجھ سے روز یہ سوال کرتا ہے کہ میں کون ہوں، میں چاہتی ہوں کہ میرے پاس اس کے سوال کا کوئی اچھا جواب ہو۔ میں زندگی میں کچھ اچھا کرنا چاہتی ہوں"۔

"اس لیے تا کہ تمہاری سیپ سے موتی نکل آئیں؟"

"نہیں"۔ وہ ذرا خفت زدہ ہوئی۔ "بلکہ اس لیے تا کہ مجھے اس آگ میں کبھی نہ جلنا پڑے جس سے مجھے اب بہت ڈر لگتا ہے"۔

"پھر اس فاصلے کو سمیٹنے کی کوشش کرو"۔

"کیسے؟"

"حیا، یہ جو ہمارا اللہ سے فاصلہ آجاتا ہے نا، یہ سیدھی سڑک کی طرح نہیں ہوتا۔ یہ پہاڑ کی طرح ہوتا ہے۔ اس کو بھاگ کر طے کرنے کی کوشش کرو گی تو جلدی تھک جاؤ گی، جست لگاؤ گی تو درمیان میں گر جاؤ گی، اُڑنے کی کوشش کرو گی تو ہوا ساتھ نہیں دے گی"۔

عائشے سانس لینے کو لحظہ بھر کے لیے رُکی۔

"یہ فاصلہ بے بی اسٹیپس سے عبور کیا جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا کر چوٹی پہ پہنچا جاتا ہے۔ کبھی بھی درمیان میں پلٹ کر نیچے اُترنا چاہو گی تو پرانی زندگی کی کشش ثقل کھینچ لے گی اور قدم اُترتے چلے جائیں گے اور اوپر چڑھنا اتنا ہی دشوار ہوگا مگر ہر اوپر چڑھتے قدم بہ بلندی ملے گی۔ سو بھاگ نامت، جست لگانے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ بس چھوٹے چھوٹے اچھے کام کرنا اور چھوٹے چھوٹے گناہ چھوڑ دینا"۔

عائشے گل کا چہرہ مدھم سبز روشنی میں دمک رہا تھا۔ وہ اتنا نرم بولتی کہ لگتا جیسے گلاب کی پنکھڑیاں اوپر سے گر رہی ہوں، جیسے شہد کی ری بہہ رہی ہو، جیسے شام کی بارش کے ملائم قطرے ٹپک رہے ہوں۔

"تو میں کیا کروں؟"

"تم اپنی کوئی بہت محبوب شے اللہ تعالیٰ کے لیے قربان کر دو"۔

اس کی بات پہ حیا نے لمحے بھر کے لیے سوچا۔ اس کے پاس ایسی کون سی شے تھی؟

"سبانجی کے ڈروم میں میرے پاس ایک ڈائمنڈ رنگ پڑی ہے، وہ بہت قیمتی ہے"۔

"قیمتی چیز نہیں، محبوب چیز قربان کرو۔ ضروری نہیں ہے کہ تمہاری محبوب چیز قیمتی بھی ہو"۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "اور میں بتاؤں کہ تمہاری محبوب ترین شے کیا ہے؟"

"کیا؟"

"تمہاری انا۔ تم اسے قربان کر دو"۔

"مگر کس کے لیے؟" وہ ذرا حیرت سے بولی۔

"اپنے چچا کی کسی بیٹی کے لیے۔ تمہارے کوئی چچا اور ان کی بیٹیاں ہیں؟" حیا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم ان کے لیے وہ کرو جو تم کبھی نہیں کرتیں۔ سب سے مشکل قربانی دینا چچا کے بچوں کے لیے ہوتا ہے، کیونکہ سب سے زیادہ مقابلہ ان سے رہتا ہے اور سب سے زیادہ ناقدرے بھی وہی ہوتے ہیں"۔

"میں ان کے لیے کیا کروں؟ میں ان سے کبھی زیادتی نہیں کرتی۔ بس میں ان کے طنز کے جواب میں زبان پہ آئے طنز کو روک نہیں پاتی"۔

"حیا! یہ جو چھوٹے چھوٹے طنز اور طعنے ہوتے ہیں نا، ان سے بچا کرو۔ مکہ میں چند بڑے بڑے سردار تھے، جو یونہی چھوٹے چھوٹے طنز کر جاتے تھے، پھر کیا ہوا؟ وہ بدر سے پہلے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں سے مر گئے۔ کوئی خراش سے مرا تو کوئی چھوٹے سے پھوڑے سے۔ تم اپنی کزن کے لیے اپنی انا کی ضرب کو بھول جاؤ"۔

"میں کوشش کروں گی۔ ویسے عائشے!" وہ ذرا سا مسکرائی۔ "تم بہت پیاری ہو"۔

جواباً عائشے دھیرے سے ہنس دی۔

"تم بھی بہت پیاری ہو حیا!"

"اور میں بھی بہت پیاری ہوں"۔ بہارے نے بند آنکھوں سے کہا تو وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"گندی بچی! تم جاگ رہی تھیں؟ چلو سو جاؤ۔ صبح کام پہ بھی جانا ہے"۔

عائشے نے بہارے کو مصنوعی خفگی سے ڈانٹتے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کیا، سبز روشنی غائب ہو گئی۔ کمرہ تاریکی میں ڈوب گیا۔

صبح سویرے کچن سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ کھلے بال انگلیوں سے سمیٹ کر جوڑے میں لپیٹتی چوکھٹ تک آئی۔

عائشے کرسی پہ بیٹھی تھی اور اپنے آگے کھڑی بہارے کے بال بنا رہی تھی۔ آج گھر کے کام تھے، سو جنگل نہیں جانا تھا تو بہارے باہر جدیسی (گلی) میں بچوں کے ساتھ کھیلنے جا رہی تھی۔

"اب بہارے گل اکیلی جائے گی تو اچھی لڑکی بن کر جائے گی، ٹھیک ہے نا؟" عائشے نرمی سے تائید چاہتی اس کی چوٹی گوندھ رہی تھی۔

"ٹھیک!" بہارے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور اچھی لڑکیاں جب بازار سے گزرتی ہیں تو نظریں جھکا کر گزرتی ہیں"۔

"ایسے اگر ٹھوکر لگ جائے تو؟"

عائشے نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے چوٹی کے آخری بل ایک دوسرے میں گوندھے۔

"جو لڑکی اللہ کی بات مانتی ہے، اسے اللہ ٹھوکر لگنے نہیں دیتا"۔

"اور جو نہیں مانتی؟"

"اسے لگنے دیتا ہے"۔ اس نے پونی باندھ کر نچلے بالوں کو برش کیا۔ پھر شانوں سے تھام کر بہارے کا رخ اپنی جانب کیا۔

"اور اچھی لڑکیاں جب باہر نکلتی ہیں تو کیسے چلتی ہیں؟" بہارے کی پیشانی کے بال نرمی سے سنوارتے اس نے روز کا دہرایا جانے والا سبق پھر سے پوچھا۔

"وہ ان دو لڑکیوں کی طرح چلتی ہیں جو کنویں پہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئی تھیں"۔

"اور وہ دو لڑکیاں کیسے چل رہی تھیں؟" اس نے بہارے کی بھوری گھنگھریالی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔

"حیا کے ساتھ....."

"اور عمر بن خطابؓ نے کیا کہا تھا۔ حیا والی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں؟"

"وہ ہر جگہ نہیں چلی جاتیں، ہر بات نہیں کر لیتیں۔ ہر کسی سے نہیں مل لیتیں"۔ بہارے نے انگلیوں پہ تینوں نکات جلدی جلدی دہرائے، جیسے اسے بھاگنے کی جلدی ہو۔

"اور یاد رکھنا کہ جب تم میں حیا نہ رہے، تو پھر جو جی چاہے کرنا"۔ بظاہر نرمی سے کہتے عائشے کی آنکھوں میں وہ تنبیہہ ابھری جو بہارے کو سیدھا رکھتی تھی۔

بہارے نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ کر باری باری عائشے کے دونوں رُخسار چومے۔

"عائشے گل! بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے"۔

وہ بھاگ کر دروازے میں آئی، تو حیا اس سے ملنے کے لیے جھکی، اس نے اسی طرح حیا کے دونوں گال چومے۔

"حیا سلیمان! بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے"۔ کہہ کر وہ باہر بھاگ گئی۔

"تم بہت محنت کرتی ہو، اس کی ذہن سازی کے لیے"۔ وہ آگے چلی آئی۔ وہ جب تک بیدار ہوتی تھی، وہ دونوں بہنیں حلیمہ آنٹی کے گھر سے قرآن پڑھ کر آ چکی ہوتی تھیں۔

"کرنی پڑتی ہے۔ چھوٹی لڑکیاں تو نرم ٹہنی کی طرح ہوتی ہیں۔ جہاں موڑو، مڑ جائیں گی، اگر وقت گزرنے کے ساتھ ٹہنی رنگ بدل لے، سوکھ بھی جائے تو بھی اس کا رخ وہی رہتا ہے مگر جو بڑی لڑکیاں ہوتی ہیں نا، وہ کانچ کی طرح ہوتی ہیں۔ اسے موڑو تو مڑتا نہیں ہے، زبردستی کرو تو ٹوٹ جاتا ہے۔ کانچ کو تراشنا پڑتا ہے اور جب تک اس کی کرچیاں نہیں ٹوٹتیں اور اپنے ہاتھ زخمی نہیں ہوتے، وہ مرضی کے مطابق نہیں ڈھلتا"۔

"صحیح کہہ رہی ہو"۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اچھا فون کدھر ہے؟ میرا کریڈٹ ختم ہے۔ پاکستان فون کرنا تھا"۔

"اوہ سوری! یہ پڑا ہے، عبدالرحمان کا فون آیا تھا تو میں نے ادھر ہی رکھ دیا اور یہ تمہاری چائے"۔ اس نے کارڈلیس فون اور حیا کے ناشتہ کا واحد جز چائے اس کے سامنے رکھی۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟" بے اختیار ہی وہ پوچھ اٹھی۔ حالانکہ اسے پاشا میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"بس کچھ پیپرز کا پوچھ رہا تھا۔ اس کے کمرے میں رکھے تھے"۔

"بہارے تو خوش ہوئی ہوگی اس سے بات کر کے"۔

ناشتے کے برتن سمیٹتی عائشے کے ہاتھ ذرا سست پڑے۔ ایک آزردگی اس کے چہرے پہ بکھر گئی۔

"تم بہارے کو مت بتانا۔ میں نے بھی اسے نہیں بتایا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے فون نہیں کرتا، اپنے کام کے لیے کرتا ہے بس"۔ وہ اُداسی سے سر جھٹک کر کام کرنے لگی۔

حیا خاموشی سے فون اور چائے کا کپ لیے باہر آ گئی۔ گھاس پہ شبنم کے قطروں کی چادر چڑھی تھی۔ بہار کے پھول ہر سُو خوشبو بکھیرے ہوئے تھے۔ وہ گھاس پہ بیٹھ کر چائے کے گھونٹ بھرتی تایا فرقان کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

فون ارم نے ہی اُٹھایا۔ دُعا، سلام اور رسمی سے حال احوال کے بعد وہ بہت چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہیں آج کیسے خیال آ گیا فون کرنے کا؟"

عام دنوں میں حیا کو اس فقرے سے زیادہ تپ کسی شے سے نہیں چڑھتی تھی۔ انسان جب کسی کو فون کرے، چاہے سال بعد ہی سہی تو وہ اگلے کا خیال کر کے ہی فون کرتا ہے۔ اس پہ کسی گلے سے بات کا آغاز کرنا مخاطب کو یہ کہنے کے برابر ہے کہ آئندہ یہ خیال کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، مگر اس نے اب زندگی میں اتنی تکلیف سہہ لی تھی کہ اسے محسوس نہیں ہوا، یا پھر وہ خود ہی نظر انداز کر گئی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو، میں بھی بس مصروفیت کے باعث کر ہی نہیں پاتی۔ تم سناؤ کیسی ہو؟ اور ہاں، منگنی کی بہت مبارک ہو"۔

"بہت شکریہ!" ارم کا لہجہ خاصا روکھا تھا۔

چند چھوٹی چھوٹی نرم سی باتیں کر کے اور ارم کی چھوٹی چھوٹی تند باتوں کو نظر انداز کر کے اس نے فون رکھا تو اس کا دل پہلے سے بہت ہلکا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس روز شام میں عائشے اور بہارے جب اپنے جاننے والوں میں کسی کی فوتگی پہ گئی تھیں تو حیا نے گھر ٹھہرنا زیادہ مناسب سمجھا، مگر اب تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔

وہ سارا دن اکٹھی ہوتی تھیں، پھر رات کو ہوٹل گرینڈ کے گارڈز گیٹ پہ اور دو گارڈز جدیسی (گلی) کے سرے پہ آ کر پہرہ دیتے تھے تو ایک تحفظ کا احساس گھیرے رہتا تھا۔ البتہ اب وہ بہت تنہائی محسوس کر رہی تھی۔

پہلے تو وہ اوپر اسٹڈی روم میں آ گئی، جہاں اس کی تصاویر دیواروں پہ آویزاں تھیں۔ اسے یوں اپنی تصاویر ادھر دیکھ کر ہمیشہ بہت کوفت ہوتی تھی۔

وہ میٹرو اسٹیشن کی سیڑھیوں کے دہانے پہ ذرا سی لڑکھڑائی تھی۔ ٹوٹی سرخ جوتی پاؤں سے لٹک رہی تھی۔

وہ اپنے سنہری سکوں والے فراک میں پاشا کی سیاہ کار سے نکل رہی تھی۔

اور بھی ترکی اور پاکستان کی بہت سی تصاویر، پاشا کے بندے ہر پل اس کا تعاقب کرتے تھے۔ اسے یقین تھا۔ وہ بے دلی سے باہر آ گئی۔ اس کو بلیک میل کرنے کے لیے اس نے بہت سا سامان اکٹھا کر رکھا تھا مگر کوئی کمزوری تو پاشا کی بھی ہو گی۔

کچھ سوچ کر اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ گول چکر کھاتا لکڑی کا زینہ تیسری منزل تک جاتا تھا۔ وہاں پاشا کا کمرہ تھا۔ بہارے بات بے بات ذکر کرتی۔ راہداری کا آخری کمرہ۔ وہ ادھر گئی تو نہیں تھی۔ مگر جانے میں حرج بھی نہ تھا۔ اسے اس گھر کے بارے میں جتنا پتا ہوتا اچھا تھا۔

وہ ننگے پاؤں زینے چڑھتی اوپر آئی۔ چابیوں کا گچھا اس نے عائشے کی دراز سے نکال لیا تھا۔ آخری کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے چابیاں لگانی شروع کیں۔ چوتھی چابی پہ لاک کھل گیا۔ اس نے دھیرے سے دروازہ دھکیلا۔

وہ بہت شاہانہ طرز کا بیڈ روم تھا۔ اونچی چھت، جھلملاتا فانوس۔ دیوار گیر کھڑکی کے ہلکے سرمئی مخملیں پردے۔ قالین بھی سرمئی۔ سارا کمرہ گہرے نیلے اور سرمئی شیڈز میں آراستہ کیا گیا تھا۔

کمرے میں پرفیوم کی خوشبو پھیلی تھی۔ خوشبو پرفیوم کے بے حد قیمتی ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھی نازک شیشیوں کو دیکھا۔ ایک سے ایک مہنگا پرفیوم ادھر رکھا تھا۔

وہ ادھر اُدھر کمرے میں ٹہلتی ہر شے کا جائزہ لیتے ہوئے الماریوں کی طرف آئی۔ ایک ایک کر کے اس نے پانچوں پٹ کھولنے کی کوشش کی..... پہلے چار لاکڈ تھے۔ آخری کھلا تھا۔ اس نے پٹ کھولا تو اندر بہت سے قیمتی، نفیس تھری پیس سوٹ ہینگرز میں لٹکے تھے۔ نچلے خانے میں ایک بریف کیس رکھا تھا۔

اس نے احتیاط سے بریف کیس اُٹھایا اور بیڈ پہ آ بیٹھی۔ بریف کیس لاکڈ نہیں تھا۔ حیا نے اسے کھولا۔ اندر چند فائلز رکھی تھیں اور اوپر ایک نوٹ پیڈ پہ سیاہ روشنائی سے ترکی میں کچھ نام فہرست کی صورت میں لکھے تھے۔ وہ فہرست اُٹھا کر پڑھنے لگی۔ تب ہی بریف کیس میں سے بیپ کی آواز آنے لگی۔ وہ چونکی، اندر کچھ بج رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے کاغذ اندر ڈالا تو انگوٹھے پہ ایک حرف کی سیاہ روشنائی لگ گئی۔ بہت تیزی سے بریف کیس کو واپس رکھ کر بستر کی چادر کی شکن درست کرتی وہ باہر نکل آئی۔

کمرہ لاک کر کے جب وہ زینے اُتر رہی تھی تو لاؤنج کا فون بج رہا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتی ہوئی نیچے آئی اور فون اُٹھایا۔

"ہیلو؟"

جواباً لمحے بھر کو خاموشی چھائی رہی۔ پھر ایئر پیس میں سے عبدالرحمان پاشا کی آواز گونجی۔

"عائشے کدھر ہے؟"

"وہ دونوں کسی کے گھر گئی ہیں۔" وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

چند لمحے کے لیے وہ خاموش رہا۔ پھر بولا تو اس کی آواز بے حد سرد تھی۔

"آئندہ اگر آپ میرے کمرے میں گئیں یا میرے بریف کیس کو کھولنے کی کوشش کی تو اپنے پیروں پہ گھر نہیں جا سکیں گی، سمجھیں؟" بہت ضبط سے بولا تھا۔

حیا کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس نے گھبرا کر ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔ پھر انگوٹھے پہ لگے سیاہی کے دھبے کو کپڑے سے رگڑ رگڑ گویا ثبوت مٹانے کی کوشش کی۔

عبدالرحمان کو کیسے علم ہوا؟ اس کا دماغ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ البتہ اس کے اندر کوئی اسے کہہ رہا تھا کہ اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے، لیکن قصر بیوک ادا اور ان بہنوں کی کشش..... وہ عجیب مخمصے میں پڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

"یہ ادا چائے کے کھیت ہیں" اگلے روز عائشے نے اسے اپنی ایک عزیزہ کبریٰ خانم کا لہلاتا ہوا کھیت دکھاتے ہوئے بتایا تھا۔

"ادا چائے کیا ہوتی ہے؟" اس نے اس پودے کے ترکی نام کا مطلب پوچھا۔

"ادا یعنی جزیرہ، اور چائے یعنی ٹی"۔

"اور اچھا..... ہم بھی ٹی کو چائے ہی کہتے ہیں"۔ وہ دھیرے سے ہنس دی۔ کبریٰ خانم ایک معمر خاتون تھیں۔ ان کی فصل تیار تھی مگر ان کے پاس کوئی ہیلپر نہ تھا جو ان کے ساتھ فصل چنتا، سو عائشے کے کہنے پہ حیا نے لکڑیاں کاٹنے کے بجائے کبریٰ خانم کے ساتھ ادا چائے کے پتے چننے شروع کر دیے۔ چمکتے سورج اور ٹھنڈی ہوا کے امتزاج میں کام کرنا مشقت طلب تھا مگر وہ اس فطرت کے قریب ماحول میں خوش تھی۔ کبریٰ خانم سے وہ چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتی رہی تھی اور جو باتیں وہ عبدالرحمان پاشا کے بارے میں کر جاتی، وہ انہیں ذہن میں محفوظ کرتی جاتی۔ اسے ہوٹل گرینڈ کے معاملات میں دلچسپی ہونے لگی تھی۔ وہ اب تنہا کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ ورنہ کئی دفعہ اس کا جی ہوٹل گرینڈ کا چکر لگانے کو چاہا تھا۔ واپس جانے کا ارادہ اس نے فی الحال ملتوی کر دیا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہتی تھی کہ بیوک ادا میں کچھ ہے۔ کچھ ایسا جو اسے اگر معلوم ہو گیا تو اس کے پاس ایک قیمتی ہتھیار آ جائے گا جو مستقبل میں اس کے کام آ سکتا ہے۔

شام میں وہ تینوں ساحل کنارے چٹائی پہ بیٹھی تھیں۔ عائشے کو آج دو سیپ ملے تھے۔ سو وہ انہیں کھول رہی تھی۔ حیا اب بڑے سیپ نہیں چنتی تھی۔ بلکہ بادام کے سائز کی سیپوں کے خالی خول ریت سے اُٹھا لیتی اور اب ان ہی کے ڈھیر کو لیے وہ ایک مالا میں پرو رہی تھی۔ ساتھ ہی بہارے اپنے پزل باکس کے سلائیڈز کو اوپر نیچے کر رہی تھی۔

"حیا.....! میں اسے کبھی نہیں کھول پاؤں گی"۔ اس کا لہجہ مایوس کن تھا۔ حیا نے ننھے خول کو سوئی میں پروتے سر اُٹھا کر اس کا اُداس چہرہ دیکھا۔ پھر گردن آگے جھکا کر اس پہ لکھی نظم کو پڑھا۔ "یہ بہت آسان ہے بہارے۔ ٹھہرو..... میں تمہیں ایک ہنٹ دیتی ہوں"۔

اس نے دوبارہ سے وہ نظم پڑھی۔ پھر سمجھ کر بولی۔ "یہ ایک سفید چھوٹی سے آنکھ ہے جو چاندی کے صندوق میں بند ہوتی ہے اور وہ صندوق نمکین گہرائی میں رکھا ہوتا ہے۔ بہارے! وہ کون سی گہرائی ہے جو نمکین ہوتی ہے؟"

بہارے جو اُداس نظروں سے پزل باکس کو دیکھ رہی تھی۔ ایک دم چونکی۔

۞......۞......۞

باب 7

''مرمرا..... سمندر..... نمکین پانی''۔
عائشے نے مسکرا کران کو دیکھتے ہوئے چھرا اپنے سیپ کے ایک طرف رکھا۔
''ہاں تو بہارے، وہ کیا چیز ہے جو پانی کے اندر ایک صندوق میں ریت کے ذرے سے بنتی ہے؟''۔
''حیا..... حیا..... وہ مٹی کے ذرے سے بنتا ہے..... اور..... اور اس کا صندوق جب قتل کیا جاتا ہے تو..... چھرا گھونپ کر قتل.....'' وہ جوش سے بے ربط جملے بولتی عائشے کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی جو ایک چاندی سے چمکتے سیپ میں چھرا چلا رہی تھی۔ سیپ کا خول چٹخا۔ عائشے نے کتاب کی طرح سے اسے کھولا۔ اندر دم توڑتے جانور پہ ایک سفید موتی جگمگا رہا تھا۔
''موتی..... پرل..... پورے پانچ حروف.....''۔ بہارے خوشی سے چلائی اور پھر جلدی جلدی ڈبے کے کوڈ بار کی سلائیڈز اوپر نیچے کرنے لگی۔ وہ اب اس پہ Pearl لکھ رہی تھی۔
حیا اور عائشے بے اختیار اپنا کام چھوڑ کر آگے ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔ جیسے ہی بہارے آخری حرف ''ایل'' سامنے لائی، کلک کی آواز کے ساتھ باکس کے سائیڈ سے دروازہ باہر کو کھلا۔ حیا کی توقع کے برعکس وہ باکس اوپر ڈھکن کے بجائے سائیڈ کی دراز سے کھلتا تھا۔
دراز میں سیاہ مخملیں کپڑا بچھا تھا اور اس پہ ایک نازک سا نیکلس رکھا تھا۔ نیکلس دراصل پلاٹینم کی زنجیر تھی۔ جس پر ہر دو کڑیاں چھوڑ کر ننھے ننھے ہیرے لٹک رہے تھے۔ زنجیر کے بالکل وسط میں ہیرے کے بجائے تین کڑیاں لٹکتی تھیں جن کے آخر سرے پہ ایک سفید موتی پرویا ہوا تھا۔
وہ تینوں مبہوت سی اس بیش قیمت، جگمگاتے ہوئے نیکلس کو دیکھ رہی تھیں۔
''بہارے! یہ تو وہی موتی ہے جو تمہاری سیپ سے نکلا تھا۔ جو تم نے عبدالرحمٰن کو دے دیا تھا''۔ عائشے ششدر سی اس موتی کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔
''ہاں یہ تو وہی ہے۔ عبدالرحمٰن نے وہ مجھے گفٹ کر دیا''۔
''اور وہ بھی اتنے خوب صورت انداز میں''۔ حیا بس اتنا ہی کہہ سکی۔ اسے اس تحفے اور اس تحفے کو دینے کے انداز نے بہت متاثر کیا تھا۔
بہارے نے اپنی ننھی انگلیوں سے نیکلس اٹھایا اور گردن سے لگایا، پھر چہرہ اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔
''یہ کیسا لگ رہا ہے؟''۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔
''بہت پیارا''۔
''عبدالرحمٰن نے مجھے کتنا پیارا گفٹ دیا ہے۔ اللہ، اللہ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا''۔ وہ اپنے پرس سے آئینہ نکال کر اب ہر زاویے سے اس کو اپنی گردن سے لگا لگا کر دیکھ رہی تھی۔
''تم عبدالرحمٰن کو ضرور تھینک یو کرنا''۔
''اللہ..... اللہ!'' بہارے کی خوشی بیان سے باہر تھی۔ ''حیا! میں تم سے بھی خوب صورت لگ رہی ہوں، ہے نا''۔
''ہاں! تم مجھ سے بھی خوب صورت لگ رہی ہو''۔ وہ مسکرا کر اسے تسلی دیتی سیپ کے خول اٹھانے لگی۔ ابھی اسے پوری مالا بنانی تھی۔
''حیا! تم میری تصویر کھینچو۔ میں اسے سر پہ کراؤن کی طرح پہنتی ہوں۔ کیونکہ میں پرنسس ہوں''۔ وہ نیکلس اپنے سر پہ تاج کی طرح پہنے اٹھ کر ساحل پہ جا کھڑی ہوئی۔ اس نے وہ تحفہ دو، ڈھائی ماہ بعد کھولا تھا۔ سو آج اس کا دن تھا۔

"دھیان سے بہارے! ہوا تیز ہے"۔ سمندر کی طرف پشت کیے کھڑی بہارے نے عائشے کی بات نہیں سنی تھی۔ حیا نے موبائل نکال کر کیمرا آن کیا۔ پھر موبائل چہرے کے سامنے لا کر بہارے کو فوکس کیا۔

"پرنسس! اب تم ذرا مسکراؤ"۔

بہارے بڑے معصوم انداز میں مسکرا دی۔ اسے بے اختیار بیوک ادا کے بازار میں سڑک کے وسط میں کھڑی بہارے یاد آ گئی، جس کے گرد سیاحوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ ریڈ کارپٹ شو پھر سے شروع ہو گیا تھا۔

اسی لمحے ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور ساتھ پانی بھی۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کسی کی کچھ بھی سمجھ میں آتا، بہارے کے سر سے نیکلس اُڑتا ہوا پانی میں جا گرا۔ وہ بوکھلا کر پلٹی اور پھر اس کی چیخیں ہر سو بلند ہوئیں۔

حیا تیزی سے اُٹھی۔ گود میں رکھی لڑی گر گئی۔ سیپوں کے خول بکھر گئے۔ وہ بھاگ کر پانی میں آئی۔ بہارے چیختی ہوئی پانی میں ہاتھ مارتی اپنا نیکلس تلاش کر رہی تھی۔ جو لہر اس کا نیکلس چھین کر لے گئی تھی۔ وہ واپس جا رہی تھی۔ حیا ننگے پیر بھاگتی ہوئی لہر کے پیچھے گئی، مگر پانی جیت گیا، لہر پلٹ گئی۔ ہار پانی میں گم ہو گیا۔ بہارے زور، زور سے روتے ہوئے چیخ رہی تھی۔

"میرا نیکلس......حیا......میرا نیکلس......" عائشے پیچھے سے اسے بازوؤں میں لیے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر وہ کسی بے آب مچھلی کی طرح تڑپتے ہوئے خود کو چھڑا رہی تھی۔

"حیا......آگے مت جاؤ......پانی گہرا ہے......وہ گم جائے گا"۔ عائشے اسے آواز دے رہی تھی، مگر وہ سب کچھ بھلائے بیوک ادا کی شہزادی کی تاج ڈھونڈ رہی تھی۔ ساحل کی گیلی ریت، پانی، سمندر، وہ پانی میں ہاتھ مارتی پوری طرح بھیگ چکی تھی، مگر نیکلس کہیں نہیں تھا۔ اس نے تھک کر اپنے عقب میں دیکھا، جہاں عائشے بمشکل آنسو روکے، تڑپتی، بلکتی بہارے کو پکڑے کھڑی تھی۔

"عائشے! میرا نیکلس...... عائشے! مجھے نیکلس واپس لا دو"۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی عائشے کے بازو خود سے ہٹانے کی سعی کر رہی تھی۔

نیکلس وہاں کہیں بھی نہیں تھا۔ اسے نمکین گہرائی واپس اپنے اندر لے گئی تھی۔ بہارے کی زندگی کا پہلا اور واحد موتی اس سے کھو گیا تھا۔

"بہارے! میں نے بہت ڈھونڈا مگر دیکھو، جو اللہ کی مرضی"۔ وہ واپس آئی اور اپنے گیلے ہاتھوں میں بہارے کے ہاتھ تھام کر کہا۔ بہارے کچھ نہیں سن رہی تھی۔ وہ گردن ادھر اُدھر مارتی چلی جا رہی تھی۔

"مجھے نیکلس واپس لا دو۔ کوئی مجھے نیکلس واپس لا دے"۔ وہ انگریزی اور پھر ترک میں ایک ہی بات دہراتی بلک بلک کر رو رہی تھی۔

حیا کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا پڑ گیا۔

اسے لگا وہ خود بھی ابھی رو دے گی۔ وہ بمشکل لب بھینچ کر ضبط کیے ہوئے تھے۔ پا کر کھو دینے کا دکھ وہ پہچانتی تھی۔ جب اس کا جنجر بریڈ ہاؤس ٹوٹا تھا۔ جب استقلال اسٹریٹ کی اس شاپ میں ڈی جے سر پکڑ کر گر گئی تھی۔ پا کر کھو دینے سے بڑا کرب کوئی نہیں ہوتا۔

اس شام وہ دونوں بمشکل بہارے کو سنبھالتی، گھر واپس لائی تھیں اور اب لونگ روم میں بڑے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ یوں کہ بہارے درمیان میں تھی اور اسے حیا نے اپنے ساتھ لگا ہوا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی اور کھڑکیوں کے پار اندھیرا اُتر آیا تھا۔ آتش دان میں مصنوعی لکڑیاں بھڑک رہی تھیں۔ بہارے اسی طرح روئے جا رہی تھی۔ اس کے پاس آنسوؤں کا مرمرا تھا جو ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

"بہارے! میں تمہیں اور نیکلس لا دوں گی"۔ وہ اسے اپنے ساتھ لگائے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"مگر وہ ایسا نہیں ہو گا"۔ وہ نفی میں سر ہلاتی روئے جا رہی تھی۔

"بالکل اس جیسا لا دوں گی......پرامس!"۔

''مگر وہ عبدالرحمٰن کا گفٹ نہیں ہوگا''۔

''عبدالرحمٰن تمہیں خود ویسا ہی نیکلس گفٹ کرے گا۔ میں اسے کہوں گی''۔

''مگر اس میں میرا موتی نہیں ہوگا۔ عائشے...... ممی......'' وہ روتے روتے اپنی ماں کو یاد کرتی، تو کبھی عائشے کو پکارتی۔ عائشے سر گھٹنوں پہ رکھے مغموم سی بیٹھی تھی۔

''تمہارا جب دوبارہ موتی نکلے گا تو میں اسے نیکلس میں پرو دوں گی''۔ مگر بہارے اس کی کوئی بات نہیں مان رہی تھی۔ اس کے لیے اس نیکلس کا متبادل کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ ہر شے کا متبادل نہیں ہوا کرتا۔

''بہارے! اب بس کرو''۔ جب وہ سر پٹخ پٹخ کر مزید بلند آواز میں رونے لگی تو عائشے نے برہمی سے ڈانٹا۔ ''وہ کب سے تمہیں منا رہی ہے اور تم ہو کہ بدتمیزی کیے جا رہی ہو؟''۔

جواباً بہارے نے غصے اور پانی سے بھری آنکھوں سے عائشے کو دیکھا۔

''تم mean ہو عائشے...... تمہیں اچھا نہیں لگتا کہ عبدالرحمٰن مجھے گفٹ دے''۔

''ہا؟'' عائشے ہکا بکا رہ گئی۔ ''میں...... میں ایسی ہوں؟ تمہیں پتا ہے، تم کیا کہہ رہی ہو؟''۔

''ہاں تم mean ہو''۔ وہ آگے بڑھ کر اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں سے عائشے کے گھٹنے پہ مکے مارنے لگی۔ حیا نے پیچھے سے اسے بازوؤں میں لیتے ہوئے ہٹایا۔

''میں نے کیا، کیا ہے؟'' عائشے روہانسی ہوگئی۔

''تم...... تم لڑ رہی تھیں عبدالرحمٰن سے۔ وہ اسی لیے انڈیا چلا گیا ہے کیونکہ تم اس سے لڑ رہی تھیں۔ تم نے اسے تھپڑ بھی مارا تھا اور تم نے اس سے کہا تھا کہ وہ بہارے کے گلے سے بے تکلف نہ ہوا کرے۔ وہ تمہاری وجہ سے یہاں سے گیا ہے۔ میں نے خود دیکھا تھا سوراخ سے''۔

عائشے کا چہرہ ایک دم سرخ پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے، بہت سے زخم ابھرے۔

''سنو بہارے!'' وہ آگے بڑھی اور ایک دم بے حد جارحانہ انداز سے بہارے کے کندھے دبوچ کر اس کا چہرہ سامنے کیا۔

''عبدالرحمٰن ہمارا نہیں ہے اور وہ جلد یا بدیر ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جائے گا''۔

''تم گندی ہو، تم جھوٹ بول رہی ہو''۔

''میں جھوٹ نہیں بولتی، میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ اب میری بات غور سے سنو''۔ اس نے غصے سے بہارے کو جھٹکا دیا۔

''عبدالرحمٰن مر گیا ہے ہمارے لیے''۔ ایک جھٹکے سے اس نے بہارے کے کندھے چھوڑے اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی اوپر چلی گئی۔

بہارے کے آنسو ایک دم سے رک گئے۔ وہ بالکل ساکت و جامد ہو چکی تھی۔ لب آپس میں پیوست کیے، وہ گویا سانس روکے بیٹھی تھی۔

''بہارے!'' اس نے تاسف سے اسے پکارا۔

وہ ایک دم اٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

حیا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ان کے مشترکہ بیڈروم کا دروازہ کھلا تھا اور بہارے بیڈ پہ چت لیٹی نظر آ رہی تھی۔ ابھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ سو وہ عائشے کی تلاش میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

عائشے چھت پہ تھی۔ وہ ٹیرس کی ریلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے پیچھے کھلا سیاہ آسمان تھا اور نیچے جدیسی کے اونچے پولز کی مدھم بتیاں۔ اندھیرے میں بھی وہ اس کے سیاہ اسکارف میں دمکتے چہرے پہ لڑھکتے آنسو دیکھ سکتی تھی۔ اسے بے اختیار ڈی جے یاد آئی، جب وہ ان سے ناراض ہو کر اسٹڈی میں چلی گئی تھی۔

''عائشے!'' وہ دکھی دل سے کہتی اس کے ساتھ آ بیٹھی اور ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما۔ عائشے نے ہاتھ نہیں چھڑایا۔ وہ بس اپنے گھٹنوں کو دیکھتی بے آواز روئے گئی۔

''عائشے! یوں مت رووَ۔ وہ بچی ہے۔ اس نے یوں ہی کہہ دی وہ بات۔ مجھے پتا ہے، تم کسی سے نہیں لڑ سکتیں''۔

''بہارے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں واقعی عبدالرحمٰن سے لڑی تھی، مگر صرف اس وقت جب میں بہت پریشان تھی لیکن وہ میری وجہ سے واپس نہیں گیا۔ وہ ہماری وجہ سے کچھ نہیں کرتا۔ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتا ہے لیکن میں کیا کرتی؟ مجھ سے آنے کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی''۔

''کیا ہوا آنے کو؟'' عائشے نے بھیگی نگاہیں اُٹھا کر اسے دیکھا۔

''کیا تمہیں عبدالرحمٰن نے بتایا ہے کہ اس کا ایک بھائی بھی ہے؟''۔

''نہیں!'' وہ بری طرح سے چونکی۔

''میں اور بہارے اپنے والدین کے ساتھ اناطولیہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ایک سال پہلے ہمارے والدین کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تو ہماری سب سے قریبی عزیزہ، یعنی ہماری دادی (آنے) ہمیں ادھر لے آئیں۔ یہ گھر آنے کا اپنا نہیں تھا۔ یہ گھر آنے کے والد کی ملکیت تھا۔ بعد میں یہ نسل در نسل چلتا میرے باپ اور پھر مجھ تک آیا۔ آنے کے دونوں بیٹوں نے اس سے اپنا حصہ نہیں لیا۔ سو آنے نے قانونی کارروائی کے بعد اسے میرے نام کر دیا۔ جب ہم یہاں آئے تھے، تب یہاں صرف آنے اور عبدالرحمٰن رہتے تھے، مگر مجھے یاد تھا کہ آنے کا ایک اور بیٹا بھی تھا۔ تب آنے نے بہت دُکھ سے بتایا کہ ان کا دوسرا بیٹا ہمارے آنے سے چند ماہ قبل گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کیوں، کیسے، عبدالرحمٰن لاعلم تھا۔ مگر آج سے تین ماہ قبل مجھے کسی نے بتایا کہ وہ عبدالرحمٰن کے آفس میں جاتے دیکھا گیا ہے اور یہ کہ وہاں سے کسی جھگڑے کی آواز آ رہی تھی۔ تب میں عبدالرحمٰن سے بہت لڑی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بھائی کدھر ہے مگر اس نے ہم سب سے جھوٹ بولا۔ آنے کو تو ابھی تک نہیں معلوم کہ عبدالرحمٰن اس کے بارے میں جانتا ہے''۔

''مگر اس کا بھائی کہاں گیا؟''۔

''یہی تو میں نے عبدالرحمٰن سے پوچھا تھا مگر وہ کسی بات کا ٹھیک جواب دے تب نا۔ وہ کہتا ہے اس نے اپنے بھائی کو نہیں نکالا، وہ خود سب کچھ چھوڑ کر گیا ہے۔ پہلے تو ان دونوں کی بہت دوستی تھی۔ عبدالرحمٰن پانی کی طرح اس پہ پیسہ بہایا کرتا تھا، پھر ایک دم سے وہ کیوں سب کچھ چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ آنے اس کو بہت یاد کرتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیسے ان کے لیے کچھ کروں''۔

''تم نے دیکھا ہوا ہے ان کے دوسرے بیٹے کو؟''۔

''جب میں گیارہ سال کی تھی تب آخری بار اسے اپنے سامنے دیکھا تھا۔ پتا نہیں وہ اب کہاں ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ استنبول میں ہی ہے، مگر ہوٹل گرینڈ میں عموی تاثر یہی ہے کہ وہ یونان چلا گیا اور وہاں پہ ہوٹل گرینڈ کی چین میں کام کر رہا ہے مگر یقین مانو، یونان میں ہمارے ہوٹل کی کوئی شاخ نہیں ہے''۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی مگر اس کی آواز آنسوؤں سے بوجھل تھی۔

''عائشے! تم اور بہارے عبدالرحمٰن کی اتنی تعریفیں کرتے ہو، میں نے تم سے کبھی یہ نہیں کہا مگر آج مجھے یہ کہنے دو کہ وہ استنبول میں خاصا بدنام ہے۔ لوگ اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتے''۔

''میرا دل ان باتوں کو نہیں مانتا۔ لوگ مجھے بھی آ کر یہ باتیں کہہ دیتے ہیں، مگر میں جانتی ہوں کہ وہ بہت اچھا ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ واقعی بہت اچھا ہے۔ بس اس نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت غلط کیا ہے''۔ وہ عائشے کی بات نہیں سن رہی تھی۔ اس کا دماغ اسی ایک نکتہ پہ مرکوز ہو گیا تھا۔ عبدالرحمٰن پاشا کا ایک گمشدہ بھائی۔ کوئی بھی شخص یوں ہی اتنا بڑا بزنس چھوڑ کر نہیں جاتا، کوئی تو بات تھی۔ بالآخر اسے عبدالرحمٰن کی ایک کمزوری مل گئی تھی۔

''اب آئے گا اونٹ پہاڑ کے نیچے''۔

☆ ☆ ☆

''حیا..... حیا''۔ صبح وہ عائشے کے زور، زور سے چلانے پہ ہڑبڑا کر اُٹھی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پریشانی سے عائشے کو دیکھا۔ جس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''بہارے گھر پہ نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں ہے۔ ساری میری غلطی ہے۔ میں نے کل اسے ڈانٹا تھا''۔ عائشے بس رو دینے کو تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے بستر سے نکلی تھی۔
باہر کھڑے گارڈ نے بتایا کہ اس نے بہارے کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔
"وہ پچھلے دروازے سے نکلی ہوگی۔ اس گھر میں ایک پچھلا دروازہ بھی ہے۔ عبدالرحمٰن کی عنایات۔ وہ ہر شے میں بیک ڈور رکھتا ہے"۔ عائشے تلخی سے بڑبڑاتی اس کے ساتھ باہر نکلی۔
"عائشے! مجھے پتا ہے، وہ کدھر ہوگی" ۔ اسے یقین تھا کہ وہ سمندر پہ گئی ہوگی۔
جب وہ اس ویران ساحل پر پہنچیں تو وہ انہیں دور سے ہی نظر آ گئی۔ وہ وہیں اس پتھر پہ بیٹھی تھی جہاں وہ تینوں کل چٹائی ڈالے بیٹھی تھیں۔ اس کے گھنگھریالے بال ہوا سے اُڑ رہے تھے اور وہ خالی خالی نگاہوں سے سامنے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیپ اور دوسرا میں پتھر اتھا۔
"بہارے!" عائشے بمشکل آنسو روکتی، بھاگتی ہوئی بہارے کے گلے لگ گئی۔ "تم ایسے کیوں آ گئیں؟ میں اتنی پریشان ہوگئی تھی"۔
بہارے نے ویران سی نگاہیں اُٹھا کر اسے دیکھا، پھر ہاتھ میں پکڑی سیپ عائشے کے سامنے کی۔
"عائشے! میرا سیپ پھر خالی نکلا" ۔ اس نے بہت دُکھ سے سیپ کھول کر دکھائی۔
"تم میرے سارے موتی لے لینا، میں انہیں اب بازار میں نہیں بیچوں گی، تم حیا کے تینوں موتی بھی لے لینا جو اس کے کزن نے دیے تھے۔ مگر اب تم روؤ گی نہیں"۔
"نہیں عائشے!" بہارے نے نفی میں سر ہلایا۔
"میرا موتی کھو گیا ہے، وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا"۔
حیا، بہارے کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھی اور اس کے گیلے ہاتھ تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگی۔
"چیزیں وقتی ہوتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں۔ رویے دائمی ہوتے ہیں۔ صدیوں کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی۔ جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے اور آج تم نے ایک کھوئے ہوئے موتی سے ہار مان لی؟"
بہارے نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ جیسے کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔
"اپنے دُکھ میں دوسرے کا دل نہیں دکھاتے بہارے! میں تمہیں بالکل ویسا ہی نیکلس لا دوں گی، پرامس!"۔
اور پھر شام میں اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے اس نے عائشے سے کہا کہ جب عبدالرحمٰن کا فون آئے، وہ اسے بتائے، سو جب اس کا فون آیا تو عائشے نے کارڈلیس اسے تھما دیا اور خود دوسرے کمرے میں چلی گئی۔
"السلام علیکم!" وہ بہت دھیمی آواز میں بولی تھی۔
"وعلیکم السلام...... خیریت؟" وہ جیسے بہت حیران ہوا تھا۔
"جی...... وہ...... مجھے کچھ کام تھا"۔ اسے یاد تھا کہ آخری دفعہ اس نے جب عبدالرحمٰن کو کام کہا تھا تو اس کا نتیجہ بہت بھیانک نکلا تھا مگر اب وہ اسے ایک اور موقع دے رہی تھی۔
"کہیے...... آپ کو ہم سے بات کرنے کا خیال صرف کام کے وقت ہی آتا ہے، مگر کہیے"۔
دل تو اس کا چاہا کہ فون دیوار پہ دے مارے، مگر برداشت کر گئی اور ساری بات کہہ سنائی۔ آخر میں بولی۔ "آپ مجھے اس شاپ کا نام بتا سکتے ہیں جہاں سے آپ نے وہ نیکلس لیا تھا؟"
"وہ میرا گفٹ تھا۔ سو مجھے ہی دوبارہ لینا چاہیے، لیکن چونکہ میں ابھی ملک سے باہر ہوں، تو میرا بندہ اس شاپ کے واؤچرز آپ کو دے جائے گا۔ آپ جواہر کی اس شاپ سے وہ نیکلس خرید کر بہارے کو دے دیجیے گا۔ السلام علیکم"۔
بے لچک اور خشک انداز میں کہہ کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ حیا نے ایک تندنگاہ کارڈلیس پہ ڈالی اور تہیہ کیا کہ آئندہ وہ کبھی اس شخص سے دوبارہ بات کرنے کی زحمت نہیں کرے گی۔

اس کا خیال بہت جلد غلط ثابت ہونے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہوٹل گرینڈ کا ملازم اگلی صبح واؤچر لے کر آیا، مگر تب جب وہ تینوں استنبول جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ عائشے کو بینک میں کوئی کام تھا۔ سو وہ اور بہارے اس کے ہمراہ چل رہی تھیں۔ حیا نے واؤچر زلے کر کمرے میں رکھے، مگر فیری کے لیے روانہ ہوتے وقت وہ انہیں اُٹھانا بھول گئی۔ سو استنبول آ کر وہ جواہر نہیں گئی۔ نیکلس پھر بھی خرید لے گی، کیونکہ اس میں پرونا تو بہارے کا موتی ہی تھا جو جانے کب نکلے، مگر سبانجی کے ڈورم میں جا کر وہ اپنا پزل باکس ضرور اُٹھا لائی تھی۔ وہ صبح کی کلاسز کا ٹائم تھا اور ڈورم خالی پڑا تھا۔ سو نہ وہ کسی سے خود ملی، نہ ہی کسی سے سامنا ہوا۔ اس کی اسپرنگ بریک ختم ہوگئی تھی مگر ابھی وہ اس سے اوپر دو تین دن کی چھٹی کر سکتی تھی۔

پزل باکس اور چند ضروری چیزیں لے کر جب وہ باہر آئی تو عائشے کے کاموں میں اتنا وقت ہی نہیں ملا کہ استقلال اسٹریٹ جا سکتی۔

وہ دوپہر تک ہی واپس آ گئے۔ اپنا پزل باکس اس نے احتیاط سے الماری میں کپڑوں کے نیچے رکھا۔ اب اس نے جلد از جلد اسے کھولنا تھا۔

رات وہ عائشے اور بہارے کے سونے کے بعد پزل باکس نکال کر دبے قدموں میں چلتی باہر آئی۔ اس کا رُخ کچن کی طرف تھا۔

کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کھڑے اس نے کوڈ بار کی سلائیڈز اوپر نیچے کرنا شروع کیں۔ پہلے اس نے Ayeshe لکھا، مگر باکس جامد رہا۔ اسے یہی توقع تھی۔ یقیناً باکس لیتے ہی خریدار نے پاس ورڈ بدل دیا ہوگا۔ پھر اس نے Yangin لکھا جو "آگ" کو ترکی میں کہتے ہیں۔ باکس جوں کا توں رہا۔ اسے یہی اُمید تھی۔ اب اسے وہ کرنا تھا جس کی طرف ہرا قلیطس کا قول اشارہ کر رہا تھا۔ آگ، اصلی والی آگ۔

اس نے ماچس اُٹھائی اور تیلی سلگا کر باکس کے قریب لائی مگر آنچ لکڑی کو سیاہ کرنے لگی اور شعلہ تیلی کو کھا کر اس کی اُنگلی تک پہنچنے لگا تو اس نے جھنجھلا کر تیلی پھینکی۔ چند لمحے وہ کچھ سوچتی رہی، پھر باکس لیے باہر آئی۔

لونگ روم کا آتش دان سرد پڑا تھا۔ اس نے ناب پھیر کر آگ لگائی تو مصنوعی لکڑیوں والا ہیٹر جل اُٹھا۔ وہ باکس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے اس جگہ کے قریب لائی جہاں صرف دہکتے انگارے تھے۔ شعلے نہ تھے۔

ہیٹر کی تپش اس کی اُنگلیوں کو چھونے لگی۔ وہ ضبط کر کے باکس پکڑے بیٹھی رہی۔ بار بار نگاہوں کے سامنے وہ تکلیف دہ رات اُبھرتی۔ الاؤ، کھولتا مائع، دہکتی سلاخیں...... اس نے سر جھٹک کر توجہ پزل باکس کی طرف مرکوز کی۔ اس نے اسے ذرا ترچھا پکڑ رکھا تھا۔ یوں کہ اس کی دو اطراف انگاروں کے سامنے تھیں، جو طرف ذرا زیادہ سامنے تھی۔ اس پہ حروف اُبھرنے شروع ہو گئے تھے۔

حروف...... بلکہ الفاظ...... فقرے۔

اس نے حیرت سے باکس کی اس سائیڈ کو دیکھا جس کا رنگ تپش کے ساتھ سیاہ ہو رہا تھا اور پر سنہری سے الفاظ اُبھر رہے تھے۔

وہ شاید لاشعور طور پر کسی چھ حرفی لفظ کی توقع کر رہی تھی، مگر یہاں تو...... حیا نے باکس آگ سے ہٹا کر دیکھا۔ اس پہ لکھے دو فقرے واضح تھے۔

وہ کوئی نظمیہ شعر تھا۔

Marked on Homer's doubts

A Stick with twin Sprouts

(ہومر کے شبہات پہ نشان زدہ ایک چھڑی، جس کی دو نوکیں ہوتی ہیں)۔

وہ ابھی ان الفاظ پہ ٹھیک سے اُلجھ بھی نہ سکی کہ اس کی نگاہ اس سیاہ ہوتی طرف سے متصل طرف پہ پڑی۔ جو ذرا سی تپش اس جگہ کو ملی تھی، اس نے وہاں چند ادھورے حروف ظاہر کیے تھے۔ حیا نے وہ طرف آگ کے سامنے کی۔ ادھورے الفاظ مکمل ہو کر ایک شعر میں ڈھل گئے۔

Round the emeralad crusified

And the Freedom Petrified

(مصلوب زدہ زمرد اور ٹھہری ہوئی آزادی کے گرد)۔

کسی احساس کے تحت اس نے تیسری متصل دیوار کو آنچ دکھائی۔ باکس کی تیسری طرف بھی کسی جادوئی اثر کی طرح سیاہ پڑنے

لگی اور اوپر جیسے کوئی اَن دیکھا قلم سنہری روشنائی سے لکھنے لگا۔

Snapped there a blooded pine

Split there some tears divine

(ادھر خون میں ڈوبا صنوبر چٹخا تھا اور آفاقی آنسو بکھرتے تھے)۔

اب کوڈبار سے متصل دو دیواریں اور تیسری جو کوڈ بار کے بالکل متوازی تھی، حروف سے بھری جا چکی تھیں۔ باقی اوپر ڈھکن کی سطح جہاں ہراقلیطس کا قول لکھا تھا، رہ گئی تھی، یا پھر نچلی طرف۔ اس نے دونوں کو آنچ دکھائی، مگر کچھ نہ ہوا۔ اب صرف کوڈ بار والی طرف بچی تھی۔ حیا نے احتیاط سے اس کو انگاروں کے قریب کیا۔ جیسے جیسے تپش لکڑی کو چھوتی گئی، کوڈ بار کے چھ چوکھٹوں کے اوپر ایک شعر اُبھرتا گیا۔

A Love lost in symbolic smell

Under which the lines dwell

(علامتی خوشبو میں ایک پیار کھو گیا، جس کے نیچے لکیریں رہتی ہیں)۔

پزل باکس کا آخری شعر۔

آٹھ مصرعوں کی نظم مکمل ہو گئی تھی۔ اب یہ نظم کس طرف اشارہ کر رہی تھی۔ یہ اس کو ابھی سوچنا تھا۔

پہلی بار اسے بری طرح سے معتصم کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

بہارے پھول چننے کے لیے گئی تھی اور اب نیچے درختوں میں اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ نیکلس کا غم اب تک اسے بھول بھال چکا تھا۔ وہ عائشے کے ساتھ ایک درخت تلے چٹائی پہ بیٹھی، اس کی ہدایت کے مطابق ہاتھ میں پکڑے لکڑی کے ٹکڑے کو تراش رہی تھی، سہ پہر کی نرم سی دھوپ، سرخ صنوبر کے درختوں سے چھن چھن کر ان پہ گر رہی تھی۔

ایک پزل باکس بنانے کے لیے پانچ سو سات (507) لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے درکار ہوتے تھے۔ خاصا محنت طلب کام تھا۔ عائشے نے اناطولیہ کے ایک گاؤں میں کسی معمر چینی کاری گر سے یہ فن سیکھا تھا۔

”تمہیں واؤچر زمنگوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ عبدالرحمٰن کی تو قیمتی تحائف دینے کی عادت ہے۔ یوں ہی بہارے کی عادتیں بگڑتی جائیں گی“۔

اس کی بات پہ حیا نے سر اُٹھایا۔ اس نے ڈھیلی چوٹی باندھ کر آگے کو ڈال رکھی تھی اور چند لٹیں چہرے کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔

”میں تو اپنی طرف سے دینا چاہتی تھی مگر اس نے میری پوری بات ہی نہیں سنی۔ اب لے ہی آیا ہے تو واپس کیا کرنا“۔ وہ سر جھکا کر رندا لکڑی کے ٹکڑے پہ آگے پیچھے رگڑنے لگی۔ لکڑی کے باریک رول شدہ چپس سے نیچے گر رہے تھے۔

”اور وہاں، بہارے نے تمہارے لیے کچھ خریدا تھا۔ اسے لگا اس نے تم سے اس دن بہت بدتمیزی کر دی تھی“۔

”اچھا؟ کیا خریدا ہے؟“ وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی۔

”ایک ریشمی اسکارف ہے“۔

”مگر میں تو سر پہ اسکارف نہیں لیتی“۔ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر پچھتائی، کسی کے تحفے کے لیے ایسے تو نہیں کہنا چاہیے۔

”کوئی بات نہیں، تم گردن میں لے لینا“۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے“۔ وہ مسکرا کر دوبارہ رندا لکڑی پہ رگڑنے لگی۔

”تمہیں پتا ہے عائشے! جب میں چھوٹی تھی نا، دس، گیارہ سال کی، تب مجھے اسکارف پہننے کا بہت شوق تھا۔ میرے ابا اور تایا فرقان دونوں مجھے اکثر سر ڈھانپنے کو کہا کرتے تھے۔ انہیں ایسے بہت اچھا لگتا تھا۔ میری اماں بھی چاہتی تھیں کہ میں سر ڈھکا کروں، تا کہ میرے چہرے پہ نور آ جائے اور میں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب ہو جاؤں، انہوں نے مجھے قرآن حفظ کرنے کے لیے ایک اسلامک اسکول میں

بھی داخل کرایا، مگر میں وہاں سے تیسرے روز ہی بھاگ آئی۔ تب میرا اسکارف پہننے کو بہت دل چاہتا تھا''۔

''تو کیوں نہیں لیا؟''۔

جواباً حیا نے دھیرے سے شانے اُچکائے۔

''مجھے آہستہ آہستہ سمجھ آ گئی کہ میرا فیس کٹ ایسا ہے کہ میں اسکارف میں اچھی نہیں لگوں گی''۔ وہ کہہ کر سر جھکائے کام کرنے لگی۔ عائشے اسی طرح ہاتھ روکے اس کو دیکھ رہی تھی۔

''کس کو؟''۔

''ہاں؟'' اس نے ناسمجھی سے سر اُٹھا کر عائشے کو دیکھا۔

''تم کس کو اسکارف میں اچھی نہیں لگو گی؟''۔

''لوگوں کو''۔

''اور......؟''

''اور کیمرے کو۔ مثلاً تصویروں میں''۔

''اور؟''

''اور خود کو؟''

''اور اللہ تعالیٰ کو؟'' عائشے دھیرے سے مسکرائی۔ اس کی سبز آنکھیں نرم دھوپ میں سنہری لگ رہی تھیں۔ ''ہوسکتا ہے تم اللہ تعالیٰ کو اسکارف میں بہت اچھی لگتی ہو''۔ وہ ایک دم، بالکل سن ہوئی، عائشے کو دیکھے گئی۔

''تم نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا حیا! کہ میں ہر وقت اسکارف کیوں پہنتی ہوں''۔ عائشے سر جھکائے لکڑی کے ٹکڑے کا کنارہ تراشتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''میں تمہیں بتاؤں، میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں وہ خوب صورت ملبوسات پہنوں جو بیوک ادا میں استنبول یا اٹلی اور اسپین کی لڑکیاں پہن کر آتی ہیں۔ بالکل جیسے ماڈلز پہنتی ہیں اور جب وہ اونچی ہیل کے ساتھ ریمپ پہ چلتی آ رہی ہوتی ہیں تو ایک دنیا ان کو مسحور ہو کر دیکھ رہی ہوتی ہے۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں بھی ایسے اسمارٹ اور ٹرینڈی ڈیزائنر لباس پہن کر جب سڑک پہ چلوں تو لوگ مسحور و متاثر ہو کر مجھے دیکھیں...... لیکن......'' وہ سانس لینے کو رکی، حیا بنا پلک جھپکے، سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔

''لیکن...... پھر مجھے ایک خیال آتا ہے۔ یہ خیال کہ ایک دن میں مر جاؤں گی، جیسے تمہاری دوست مر گئی تھی اور میں اس مٹی میں چلی جاؤں گی، جس کے اوپر میں چلتی ہوں۔ پھر ایک دن سورج مغرب سے نکلے گا اور زمین کا جانور زمین سے نکل کر لوگوں سے باتیں کرے گا اور لال آندھی ہر سو چلے گی۔ اس دن مجھے بھی سب کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔ تم نے کبھی اولمپکس کے وہ اسٹیڈیمز دیکھے ہیں جن میں بڑی بڑی اسکرینز نصب ہوتی ہیں؟ میں خود کو ایک ایسے ہی اسٹیڈیم میں دیکھتی ہوں۔ میدان کے عین وسط میں کھڑے۔ اسکرین پہ میرا چہرہ ہوتا ہے اور پورا میدان لوگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ سب مجھے ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں اور میں اکیلی وہاں کھڑی ہوتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں حیا، اگر اس وقت میرے رب نے مجھ سے پوچھ لیا کہ اناطولیہ کی عائشے گل، اب بتاؤ تم نے کیا، کیا؟ یہ بال، یہ چہرہ، یہ جسم، یہ سب تو میں نے تمہیں دیا تھا۔ یہ نہ تم نے مجھ سے مانگ کر حاصل کیا تھا اور نہ ہی اس کی قیمت ادا کی تھی۔ یہ تو میری امانت تھی۔ پھر تم نے اسے میری مرضی کے مطابق استعمال کیوں نہیں کیا؟ تم نے اس سے وہ کام کیوں کیے جن کو میں ناپسند کرتا ہوں؟ تم نے ان عورتوں کا رستہ کیوں چن لیا جن سے میں ناراض تھا؟''۔

میں نے ان سوالوں کے بہت جواب سوچے ہیں، مگر مجھے کوئی جواب مطمئن نہیں کرتا۔ روز صبح اسکارف لینے سے پہلے میری آنکھوں کے سامنے ان تمام حسین عورتوں کے دل کش سراپے گردش کرتے ہیں جو ٹی وی پہ میں نے کبھی دیکھی ہوتی ہیں اور میرا دل کرتا ہے کہ میں بھی ان کا راستہ چن لوں، مگر پھر مجھے وہ آخری عدالت یاد آ جاتی ہے، تب میں سوچتی ہوں کہ اس دن میں اللہ کو کیا جواب دوں گی؟ میں ترازو کے ایک پلڑے میں وہ سراپا ڈالتی ہوں جس میں مَیں خود کو اچھی لگتی ہوں اور دوسرے میں وہ جس میں مَیں اللہ تعالیٰ کو اچھی لگتی ہوں۔ میری پسند کا پلڑا کبھی نہیں جھکتا۔ اللہ تعالیٰ کی پسند کا پلڑا کبھی نہیں اُٹھتا۔ تم نے پوچھا تھا کہ میں اسکارف کیوں لیتی ہوں؟ سو میں یہ اس لیے

کرتی ہوں کیونکہ میں اللہ کو ایسے اچھی لگتی ہوں"۔

وہ اب چھرے کی نوک سے لکڑی کے کنارے میں خم ڈال رہی تھی۔

"لڑکیاں سمندر کی ریت کی مانند ہوتی ہیں حیا! عیاں پڑی ریت، اگر ساحل پہ ہو تو قدموں تلے روندی جاتی ہے اور اگر سمندر کی تہ میں ہو تو کیچڑ بن جاتی ہے، لیکن اسی ریت کا وہ ذرہ جو خود کو ایک مضبوط سیپ میں ڈھک لے، وہ موتی بن جاتا ہے۔ جوہری اس ایک موتی کے لیے کتنے ہی سیپ چنتا ہے اور پھر اس موتی کو مخملیں ڈبوں میں بند کر کے محفوظ تجوریوں میں رکھ دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی جوہری اپنی دکان کے شوکیس میں اصلی جیولری نہیں رکھتا، مگر ریت کے ذرے کے لیے موتی بننا آسان نہیں ہوتا، وہ ڈوبے بغیر سیپ کو کبھی نہیں پا سکتا"۔

حیا اب اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے ریگ مال لکڑی کے ٹکڑے پہ رگڑ رہی تھی۔ لکڑی کی کنکھر یالی پتریاں اُتر اُتر کر نیچے گر رہی تھیں۔ اس کے اندر بھی کچھ ایسا ہی چیخ رہا تھا۔ کیا؟ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی اور کبھی کبھی اسے لگتا وہ کبھی نہیں سمجھ سکے گی۔

کبریٰ بہلول کے گھر اور ان کے کھیت میں کام کرتے، ادا جائے کے پتے چنتے، ان کی مرغابیوں کو دانہ ڈالتے، وہ اب ان سے چھوٹے چھوٹے بظاہر بے ضرر سے سوال کثرت سے پوچھنے لگی تھی۔ وہ عائشے کے بتائے گئے دو کو کبریٰ بہلو کے دو سے جمع کر کے دیکھتی جواب چار کے بجائے چار سو نکلتا۔ اب اسے پھر سے عبدالرحمٰن پاشا کے فون کا انتظار تھا۔ کب وہ فون کرے اور وہ اپنے پتے پھینکے۔ کھیل پاشا نے شروع کیا تھا۔ اسے ختم اب وہ کرے گی۔

چند ہی روز میں اسے یہ موقع مل گیا۔ فون کی گھنٹی بجی تو اس نے کارڈلیس اُٹھالیا اور اوپر اسٹڈی میں آگئی۔

"ہیلو؟" اس نے بظاہر سادگی سے کہا۔

دوسری جانب چند لمحوں کی خاموشی چھائی رہی، پھر اس کی بھاری، کھردری آواز سنائی دی۔

"حیا بی بی...... کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں، آپ سنائیے"۔

"جی الحمدللہ...... آپ...... کیا کر رہی تھیں؟" وہ محتاط لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے اس کا فون اُٹھانے کا مقصد نہ سمجھا ہو۔

"میں ایک کہانی لکھ رہی تھی، کہیں تو سناؤں؟"۔

اب کی بار دوسری جانب متذبذب خاموشی چھائی رہی، پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "جی، سنا دیجیے"۔

"تین سال پہلے کی بات ہے، انڈیا کا ایک عام سا اسمگلر اپنی ماں اور بھائی کے پاس بیوک ادا آتا ہے۔ اس کا بھائی ادا میں ایک بہت کامیاب ہوٹل چلا رہا ہوتا ہے۔ نووارد بھائی اس کے ساتھ ہوٹل کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔ بظاہر اسے اپنے بھائی کا بہت خیال ہے، مگر آہستہ آہستہ وہ ہوٹل پہ قبضہ کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کے تعلقات استعمال کر کے اپنے تعلقات وسیع کرتا ہے۔ مافیا کے ساتھ روابط بڑھاتا ہے اور تو اور، اس کی ایک عالمی دہشت گرد تنظیم سے بھی روابط ہیں۔ پھر آج سے ٹھیک دو سال پہلے وہ اپنے بھائی کو کچھ یوں ہراساں کرتا ہے کہ ایک روز بے چارا بھائی چپ چاپ ہوٹل چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ یونان میں ہے، مگر وہ در حقیقت کہاں ہے، یہ اس بڑے بھائی سے بہتر کوئی نہیں جانتا اور اس سے باز پرس کرنے والا کوئی ہے بھی نہیں، سوائے ایک بوڑھی عورت اور دو معصوم لڑکیوں کے، یوں وہ عام اسمگلر استنبول کے بارسوخ ترین افراد میں شامل ہو جاتا ہے، اب بتائیے کیسی لگی کہانی؟ کہتے ہیں تو پبلشنگ کے لیے دے دوں؟"۔

اس نے بہت معصومیت سے پوچھا تھا۔

"میں اس ساری بکواس سے کیا مطلب لوں؟"۔

"یہی کہ میرے بارے میں ذرا احتیاط سے کام لیجیے گا، ورنہ پیر کے نیچے دباؤ تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے"۔

"بہت احسان فراموش لڑکی ہو۔ تمہیں بھول گیا ہے کہ اس رات تمہیں اس بحری جہاز سے نیم مردہ حالت میں کون ادھر لایا تھا؟"۔

لمحے بھر کو وہ بالکل چپ رہ گئی۔

"میں پرسوں بیوک ادا واپس آ رہا ہوں۔ تم نے جب تک ادھر رہنا ہے، تم رہو، میں ادھر نہیں آؤں گا اور نہ ہی تمہارے راستے میں آؤں گا، سو تم بھی میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرنا"۔ دھمکی آمیز لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ اس نے وہیں ہاتھ رکھا ہے، جہاں سب سے زیادہ درد ہوتا تھا۔

"میں نے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں، اس کا فیصلہ ابھی نہیں کیا میں نے"۔ اس نے مطلوبہ انداز میں کہہ کر فون رکھ دیا۔

میجر احمد کا شکریہ، جس نے اسے ایک دوسرے نہج پہ سوچنا سکھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اور کیا قربان کر سکتی ہو تم اپنا فاصلہ گھٹانے کے لیے؟"۔ رات سونے سے قبل یہ آخری بات تھی جو عائشے نے اس سے پوچھی تھی۔ اس نے نیند میں ڈوبی آنکھیں کھول کر سوالیہ نگاہوں سے عائشے کو دیکھا، بولی کچھ نہیں۔

"میں بتاؤں؟ تم اپنی نیند قربان کرنا سیکھ لو"۔ وہ کہہ کر لیٹ گئی تو حیا نے بوجھل ہوتی آنکھیں بند کر لیں۔ صبح فجر کی اذان کے ساتھ ہی بہارے اس کا کندھا جھنجھوڑ کر اسے اُٹھا رہی تھی۔

"اُٹھ جاؤ! عائشے نے کہا آج سے تم بھی ہمارے ساتھ قرآن پڑھنے جاؤ گی"۔

"میں؟" اس نے کسل مندی سے آنکھیں ذرا کھولیں۔ "مجھے نیند آ رہی ہے"۔

"نہیں، نہیں، اب تو تمہیں بھی جانا پڑے گا۔ یہ ٹارچر تم بھی سہو ناں۔ میں اکیلے کیوں برداشت کروں؟ اب اُٹھ جاؤ"۔ دم کٹی لومڑی دوسری کی دم پھندے میں پھنستے دیکھ کر بہت خوشی خوشی اُچھلتی کودتی تیار ہو رہی تھی۔

حیا بدقت تمام کمبل پھینک کر اُٹھی۔ اسے اور ڈی جے کو صبح خیزی کی عادت تو تھی، مگر ان کی صبح فجر قضا ہونے کے بعد ہوتی تھی اور پھر بھاگم بھاگ کیمپس کی تیاری۔

اس نے اپنا لیموں کے رنگ کا زرد فراک پہنا، جو ایک دفعہ جہان کے گھر پہن کر گئی تھی اور گیلے بال کھلے چھوڑ کر سنگھار میز کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ابھی اس نے پرفیوم کی شیشی اُٹھائی ہی تھی، بہارے عقب میں زور سے چیخی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"۔

"کیا؟" وہ اس کے اچانک چلانے پہ ڈر کر پلٹی۔

"تم باہر جانے سے پہلے پرفیوم لگا رہی ہو؟" بہارے نے بے یقینی سے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"آ...... ہاں۔ کیا ہوا؟"

"عائشے گل کہتی ہے، اچھی لڑکیاں باہر جانے سے پہلے اتنا تیز پرفیوم نہیں لگاتیں۔ تم یہ باڈی اسپرے لگا لو، مگر پرفیوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے"۔ وہ بہت خفگی سے ڈانٹتی حیا کے ساتھ آ کھڑی ہوئی اور پھر ایڑیاں اونچی اُٹھا کر خود کو آئینے میں دیکھتی سر پہ اسکارف لپیٹنے لگی۔

حیا نے ایک ہاتھ میں پکڑے پرفیوم کو دیکھا، اور پھر ذرا سا خفت سے اسے واپس رکھ کر باڈی مسٹ اُٹھا لیا۔

حلیمہ آنٹی کے لان میں چاندنی بچھی تھی۔ وہ مرکزی جگہ پہ بیٹھی تھیں اور سارے چھوٹے بڑے بچے ان کے گرد نیم دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔ وہ تینوں جس وقت داخل ہوئیں، ایک جگہ سے بچوں نے فوراً جگہ چھوڑ کر دائرہ بڑا کر دیا۔ حلیمہ آنٹی نے ایک نرم مسکراہٹ ان کی طرف اُچھال کر سر کو جنبش دی۔ وہ تینوں ساتھ ساتھ بیٹھ گئیں۔

"میں پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کی دھتکارے ہوئے شیطان سے۔ اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان اور بار بار رحم کرنے والا ہے"۔

قرأت کرنے والا بچہ سنہرے بالوں والا ترک تھا، جس نے سر پہ جالی دار ٹوپی لے رکھی تھی۔ باقی بچے خاموش تھے۔ وہ اپنی باریک، مدھر آواز میں پڑھ رہا تھا۔

"آپ ایمان لانے والی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ اپنی نگاہیں جھکا کر رکھا کریں اور اپنے قابل ستر اعضا کی حفاظت کیا کریں"۔

وہ جو جمائی روکتی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی، ایک دم گڑبڑا کر سیدھی ہو بیٹھی۔

''اور وہ اپنی زینت ظاہر نہ کیا کریں، سوا اس کے جو خود ظاہر ہو جائے''۔

کم سن بچے کی آواز نے سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر سو ایک سحر سا طاری ہو رہا تھا۔ حیا نے بے اختیار سر پہ اوڑھے دوپٹے سے کان ڈھکے، جن میں اس نے موتی والی بالیاں پہن رکھی تھیں۔ وہی موتی جو جہان کے سیپ سے نکلے تھے۔ بہارے نے اسے ایک ایک موتی دونوں بالیوں میں پرو دیا تھا۔ تیسرا موتی حیا نے سنبھال رکھا تھا۔

''اور انہیں چاہیے کہ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پہ ڈالے رکھا کریں''۔

کسی معمول کی سی کیفیت میں اس نے گردن جھکا کر دیکھا۔ اس کا شیفون کا دوپٹا سر پہ تو تھا مگر گردن پہ اس نے مفلر کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ قدرے عجلت سے اس نے دوپٹہ کھول کر شانوں پہ ٹھیک سے پھیلا کر لپیٹا، اس وقت سوائے حکم ماننے کے اسے کوئی چارہ نظر نہیں آیا تھا۔ یہ عائشے گل کی باتیں نہیں تھیں، جن پہ اُلجھ کر ان کو ذہن سے جھٹکا جا سکتا تھا۔ یہ حکم بہت اوپر آسمانوں سے آیا تھا۔ وہاں سے، جہاں انکار نہیں سنا جاتا تھا، جہاں صرف سر جھکایا جاتا تھا۔

ترک بچہ اپنا سبق ختم کر چکا تھا۔ حلیمہ آنٹی نے بہارے کو اشارہ کیا۔ وہ اپنا قرآن سامنے کیے، تعوذ پڑھ کر اپنا سبق پڑھنے لگی۔

''اللہ نور ہے آسمانوں کا اور زمین کا۔

اس کے نور کی مثال ایک طاق کی طرح ہے جس میں چراغ ہیں۔

چراغ فانوس میں ہے۔

فانوس گویا ایک چمکتا ہوا تارہ ہے۔

وہ ایک بابرکت زیتون کے درخت سے روشن کیا جاتا ہے۔

نہ مشرقی ہے اور نہ مغربی۔

قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے۔

اور اگرچہ اسے آگ بھی نہ چھوئی ہو۔

نور ہے اوپر نور کے۔

اللہ اپنے نور کی طرف راستہ دکھاتا ہے، جسے وہ چاہتا ہے.....''۔

لان میں ایک دم بہت سی روشنی اُتر آئی تھی۔ جیسے چمکتا چاند پورے اُفق پہ چھا گیا ہو۔ جیسے سونے کے پتنگے ہر سُو آہستہ آہستہ نیچے گر رہے ہوں، جیسے نیلا آسمان سنہری قندیلوں سے جگمگا اُٹھا ہو۔ وہ اس طلسم میں گھری، سحر زدہ سی ہوئی سنے جا رہی تھی۔

بہارے پڑھ رہی تھی۔

''اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا......

ان کے اعمال ایک چٹیل میدان میں سراب کی مانند ہیں۔

پیاسا اس کو پانی سمجھتا ہے۔

حتیٰ کہ جب وہ اس کے قریب آتا ہے تو اس کو کچھ بھی نہیں پاتا۔

اور وہ وہاں اللہ کو پاتا ہے۔

پھر اللہ اس کو اس کا پورا پورا حساب دیتا ہے۔

اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے''۔

نیلا آسمان ان دیکھی مشعلوں سے روشن تھا۔ چاندی کی مشعلیں وہاں روشن نہیں تھیں، مگر وہاں روشنی تھی۔ نور تھا اوپر نور کے۔

''یا ان کی مثال سمندر کے گہرے اندھیروں کی مانند ہے۔

پھر اسے ایک لہر ڈھانپ لیتی ہے۔ اس کے اوپر ایک اور لہر۔ اس کے اوپر بادل۔ ان میں سے بعض کے اوپر بعض اندھیرے

ہیں۔اتنا اندھیرا کہ جب وہ شخص اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا۔

اور جس کا نہیں بنایا اللہ نے کوئی نور۔

تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور!''۔

بہارے اپنا سبق ختم کر چکی تھی۔ دور مرمرا کی لہریں کناروں پہ سر پٹخ کر پلٹ رہی تھیں، واپس اپنے اندھیروں میں۔کلاس کا وقت ختم ہوا تو سحر ٹوٹا۔قندیلیں غائب ہوگئیں۔صبح کی روشنی میں آسمان کے چراغ چھپ گئے۔

بچے اُٹھ اُٹھ کر جانے لگے۔حلیمہ آنٹی ان کی طرف ہی آ رہی تھیں،مگر وہ اپنی جگہ سُن سی بیٹھی کہیں بہت اندر گم تھی۔اپنی ذات کے اندھیروں میں۔اندھیری لہر کے اوپر ایک اور لہر اور اس کے اوپر غم کے بادل۔اتنا اندھیرا کہ مشکلوں کا سرا بھائی نہ دیتا تھا اور جس کا نہیں بنایا اللہ نے کوئی نور،تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور!

وہ بالکل چپ سی اپنی جگہ پہ اسی طرح بیٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہوٹل گرینڈ بیوک ادا کے ایک نسبتاً ویران ساحل کے قریب واقع تھا۔ جزیرے کے بازار کے رش اور سیاحوں کے شور و ہنگامے سے دور وہ ایک بہت پُرسکون سی جگہ تھی۔ ہوٹل کی بلند و بالا عمارت کی کھڑکیوں سے مرمرا کا سمندر بالکل سامنے دکھائی دیتا تھا۔وہ ادا کا سب سے بڑا،سب سے مہنگا ہوٹل تھا۔

''دیمت فردوس'' پچھلے ساڑھے تین سال سے ہوٹل کے مالک کی پرسنل سیکریٹری تھی۔اس کا عہدہ ساڑھے تین برس میں وہی رہا تھا،البتہ اس کا باس ایک دفعہ ضرور بدلا تھا۔ جب وہ تازہ تازہ ازمیر (ترکی کا ایک شہر) چھوڑ کر استنبول آئی تھی اور کئی جگہ نوکری کے لیے دھکے کھانے کے بعد اسے استنبول سے دور اس جزیرے پہ یہ جاب ملی تھی، تب دیمت کا باس عبدالرحمٰن پاشا نہیں تھا۔اس وقت وہ اس کے چھوٹے بھائی کی سیکریٹری تھی، مگر ان پچھلے تین برسوں میں بہت کچھ بدلا تھا۔

اس نرم سی صبح میں اپنے ڈیسک کی کرسی سنبھالتے، پرس اُتار کر میز پہ رکھتے ہوئے بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ہوٹل گرینڈ اب بہت بدل گیا تھا۔اس کا پچھلا باس بہت خوش خلق اور سادہ لوح سا آدمی تھا۔ایسا آدمی جس میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی۔وہ ہوٹل کا مالک ہونے کے باوجود اکثر نیچے ریسٹورنٹ کے کچن میں کام کرتا پایا جاتا تھا۔اس کے عام سے حلیے کو دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ شخص بیوک ادا کے رئیسوں میں سے ہے۔پھر وقت بدلتا گیا۔دیمت عبدالرحمٰن پاشا کو پہلے کبھی کبھار اور پھر اکثر ہوٹل میں اپنے بھائی کے ساتھ آتے دیکھتی رہی۔یہاں تک کہ آہستہ آہستہ ہوٹل کا کنٹرول اور وہ آفس عبدالرحمٰن پاشا کی دسترس میں چلا گیا۔عبدالرحمٰن پاشا نے کیسے سب کچھ اپنے قابو میں کیا کہ کوئی چوں بھی نہ کر سکا اور اس کا بھائی کہاں چلا گیا، وہ کبھی نہیں جان سکی تھی۔وہ اس کی سیکریٹری ہو کر بھی اپنے اور اس کے درمیان موجود فاصلے کو نہیں پاٹ سکی تھی۔اسے عبدالرحمٰن پاشا کے سوائے چھوٹے موٹے دفتری کاموں کے علاوہ کچھ بھی کرنے کو نہیں دیا جاتا تھا۔کبھی کبھی دیمت کو شک گزرتا کہ اے آر پی نے اپنی کوئی اور سیکریٹری رکھی ہوئی ہوگی، جو اس کے معمولات سے باخبر ہوگی،ورنہ اس کے پاور آفس میں کیا ہوتا ہے،وہ اس سے قطعاً بے خبر تھی۔یہ الگ بات ہے کہ پچھلے چند ماہ میں اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہوٹل گرینڈ میں کچھ اور بھی ہو رہا ہے، کچھ ایسا، جو غلط تھا۔ کچھ ایسا جو ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناتے اسے کبھی ہونے نہیں دینا چاہیے تھا،مگر کیا......وہ سمجھنے سے قاصر تھی اور کھوج لگانے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

اپنی دراز سے ایک فائل نکالتے ہوئے اس نے یونہی ایک سرسری سی نگاہ سامنے......اس بند دروازے پہ ڈالی، جس پہ اے آر پاشا کی تختی لگی تھی،اور ٹھٹک کر رُک گئی۔

دروازے کی نچلی دراز سے روشنی جھانک رہی تھی۔

کیا عبدالرحمٰن واپس آ گیا ہے؟ کب؟ اسے پتا ہی نہیں چلا۔

وہ خوشگوار حیرت میں گھری جلدی جلدی اپنی چیزوں کو ترتیب دینے لگی۔دنیا چاہے جو بھی کہے وہ عبدالرحمٰن پاشا کی سب سے

ہوئے بغیر عورت اپنے شوہر کو کبھی نہیں چھوڑتی''۔
''تمہارا مطلب ہے کہ کوئی اس عورت کو اس کے شوہر کے خلاف بہکائے؟ اونہوں!''اس نے ناگواری سے سر ذرا سا جھٹکا۔''وہ کیوں کسی کی بات پر یقین کرے گی؟''
''جی سر! وہ کسی دوسرے کی بات پہ یقین نہیں کرے گی، وہ صرف اپنے شوہر کی بات پر یقین کرے گی''۔
''اور کوئی شوہر اپنے دھوکے یا اپنی بداعمالیوں کی داستان اپنے منہ سے اپنی بیوی کو کیوں سنائے گا؟''
''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ یہ سب اپنی بیوی کو کہے''۔اب کے دیمت ذرا معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔''وہ یہ سب کسی اور سے کہے گا اور اگر ٹائمنگ صحیح رکھی جائے تو اس کی بیوی اس کے علم میں لائے بغیر اس کی باتیں سن لے گی۔ایک معصوم سا اتفاق''۔بات ختم کر کے دیمت نے ذرا سے شانے اُچکائے۔
عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں ایک چمک در آئی۔اس نے سگریٹ کا ٹکڑا ایش ٹرے میں پھینکا اور ذرا آگے ہو کر بیٹھا۔
''مگر دیمت! کوئی آدمی کسی دوسرے کے بھی سامنے اپنے کسی بدعمل کا ذکر کیوں کرے گا؟''
''میں نے کہا نا سر! ٹائمنگ صحیح رکھی جائے تو سب ٹھیک رہے گا۔وہ آدمی اپنے بدعمل کی داستان نہیں سنائے گا۔وہ عمل کوئی بھی ہو سکتا ہے۔بعض کام ایسے ہوتے ہیں، جو کسی کو ہیرو بنا دیتے ہیں لیکن اگر سیاق و سباق کے بغیر پیش کیے جائیں تو وہ ہیرو کو ولن بھی بنا دیتے ہیں''
عبدالرحمٰن پاشا کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔اس کے چہرے پہ چھائی فکر غائب ہو رہی تھی۔
''دیمت! جو کام میں پچھلے پانچ مہینوں میں نہیں کر سکا، وہ تم نے پانچ منٹ میں کر دکھایا ہے۔تھینک یو سو مچ''۔وہ واقعتاً اس کا بہت ممنون تھا۔
دیمت کا دل خوشی سے بھر گیا۔وہ بہت مسرت سے اُٹھی تھی۔گو کہ اندر سے وہ جانتی تھی کہ عبدالرحمٰن کسی بیوی کو اس کے شوہر سے بدظن کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ غلط کام تھا، مگر عبدالرحمٰن کا تشکر ہر شے پہ چھانے لگا۔
''تمہارا شوہر کیسا ہے، ابھی تک ریسٹ پہ ہے؟''۔
''جی سر!'' کرسی سے اُٹھتے ہوئے اس نے معمول انداز میں بتایا۔ایک حادثے کے بعد اس کا شوہر کچھ عرصے سے ڈیٹی لیٹر پہ تھا اور یہ پورا ہوٹل گرینڈ جانتا تھا۔
''ایڈوانس سیلری چاہیے ہو تو بتا دینا''۔
''تھینک یو سر!'' وہ پورے دل سے مسکرائی۔عبدالرحمٰن اسے ''لالچ'' دے رہا تھا۔یہ اس کے مشورے کا انعام تھا۔وہ بہت فرحت سے واپس جانے کے لیے مڑی تھی۔
''تمہارا ہیئر اسٹائل اچھا ہے دیمت!''۔
عبدالرحمٰن نے اس کے عقب سے پکارا تھا۔اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔وہ بہت اُلجھن سے واپس پلٹی۔عبدالرحمٰن اب ایک فائل اُٹھا کر اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔وہ بظاہر اس کی طرف متوجہ نہ تھا مگر اس نے یہ بات کیوں کہی؟ پچھلے تین برسوں میں تو اسے کبھی دیمت کے بالوں کا خیال نہیں آیا تھا، نہ ہی وہ عورتوں سے شغف رکھنے والا بندہ تھا۔پھر اس نے یہ کیوں کہا؟
''تھینک...... تھینک یو سر!'' وہ ذرا تذبذب سے بولی۔
''ویسے تمہارا پچھلا ہیئر اسٹائل بھی اچھا تھا''۔
''پچھلا؟'' اس نے بہت اُلجھ کر اپنے باس کو دیکھا۔وہ کیا کہہ رہا تھا۔دیمت نے تو پچھلے تین برسوں میں سوائے اس کٹنگ کے، دوسری کوئی کٹنگ نہیں کرائی تھی۔
''ہاں، جو اناطالیہ کے ساحل پہ تھا۔تم پہ گھنگھریالے سرخ بال اچھے لگتے ہیں''۔وہ فائل کی طرف متوجہ بہت سرسری انداز میں کہہ رہا تھا۔
دیمت کے قدموں کے نیچے سے زمین سرک گئی۔وہ پتھر کا بت بنی رہ گئی۔ایک دم کمرے میں گھٹن بہت بڑھ گئی تھی۔اسے

سانس نہیں آ رہا تھا۔ وہ بدقت تمام باہر نکلی اور اپنی کرسی پہ ڈھے سی گئی۔

انتالیہ کا ساحل، سرخ گھنگھریالے بال..... چھ سال پہلے اس نے ایک ایکس ریٹ میگزین کے لیے ماڈلنگ کی تھی۔ وہ بدنام زمانہ میگزین صرف انتالیہ میں چھپتا تھا اور وہاں سے باہر نہیں جایا کرتا تھا مگر..... مگر تب اسے پیسے چاہیے تھے اور وہ نشے میں تھی۔ بعد میں وہ شرمندہ تھی۔ اس نے وہ شہر، وہ جگہ، سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے خاندان، اس کے دوستوں، کبھی کسی کو اس میگزین کی ان چند کا پیز کا علم تک نہیں ہوا تھا۔ وہ میگزین تو شاید اب ردی کا ڈھیر بن کر اس دنیا سے ہی غائب ہو گیا ہو، تو عبدالرحمٰن پاشا کو کیسے پتا چلا؟

وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے بیٹھی تھی۔ اس کی بے لچک آواز کی دھمکی وہ سمجھتی تھی۔ اگر اس نے یہ گفتگو کسی کے سامنے دہرائی تو وہ میگزین منظر عام پہ آ جائے گا اور..... اور اس کا گھر، بچے، زندگی، سب تباہ ہو جائے گا۔

اس نے چہرہ اُٹھا کر بے بس، متنفر نگاہوں سے اے آر پی کے آفس کے بند دروازے کو دیکھا۔

''بلیک میلر!'' اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے تھے۔ اسے آج علم ہوا تھا کہ عبدالرحمٰن پاشا نے کیسے ہر شے کو اپنے قابو میں کیا تھا۔

بند دروازے کے اس پار وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا قیمتی موبائل تھا، جس میں وہ کوئی نمبر ڈھونڈ رہا تھا، ایک نمبر پہ آ کر اس کا ہاتھ تھم گیا۔ وہ نمبر اس نے انگریزی میں "Brother Dearest'' کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا۔

اب اس نمبر پہ رابطہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اگر ہر چیز ویسے ہی ہوتی جائے جیسے وہ سوچ رہا تھا تو..... اس نے مسکرا کر اس نمبر کو دیکھا اور پھر اس کے نام پیغام لکھنے لگا۔

''میں انڈیا سے واپس بیوک ادا آ چکا ہوں۔ کیا ہم مل سکتے ہیں؟''۔

پیغام جانے کے پورے ڈیڑھ منٹ بعد اسی نمبر سے جواب آیا تھا۔

''جہنم میں جاؤ تم۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا''۔

وہ پیغام پڑھتے ہوئے محظوظ سے انداز میں ہنس پڑا۔ پھر مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے جوابی پیغام لکھنے لگا۔

''میں جہنم میں بعد میں جاؤں گا، پہلے تم سے تو مل لوں۔ تم ہوٹل گرینڈ آؤ گے یا میں استقلال اسٹریٹ میں برگر کنگ پہ آ جاؤں؟''۔

سینڈ کا بٹن دباتے وقت وہ جانتا تھا کہ اس کے برادر ڈیرسٹ کا جواب ان دونوں جگہوں میں سے کوئی ہو گا۔ وہ انکار نہیں کرے گا۔ اس نے آج تک عبدالرحمٰن کو ''ناں'' نہیں کی تھی۔ وہ اسے ''ناں'' کبھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

حیا اس صبح جب حلیمہ آنٹی کے گھر سے واپس آ رہی تھی تو اس کے موبائل پہ جہان کا پیغام آیا تھا۔

سیڑھی سے اُترتے ہوئے اس نے پیغام کھول کر پڑھا۔

''سنو! میں ابھی ذرا کام سے بیوک ادا آ رہا ہوں۔ دوپہر میں ملتے ہیں۔ لنچ ساتھ کریں گے ٹھیک!''۔

حیا نے حیرت سے ٹائم دیکھا۔ صبح کے ساتھ بجے تھے، اگر وہ ابھی چلا تو آٹھ، ساڑھے آٹھ تک پہنچ جائے گا، پھر وہ دوپہر تک بیوک ادا میں کیا کرے گا؟ اس کا کب سے اس جزیرے میں کوئی کام ہونے لگا؟

وہ اُلجھتی اندر آئی تھی۔

بیگ بیڈ پہ رکھتے ہوئے اس نے موبائل پہ جہان کا نمبر ملایا۔ نمبر بزی جا رہا تھا۔ اس نے فون رکھا اور چوکھٹ میں آ کھڑی ہوئی۔ سامنے عائشے اور بہارے اپنی چیزیں اکٹھی کرتی نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے اب جنگل جانا تھا۔

''آج میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکوں گی عائشے! جہان آ رہا ہے''۔ وہ ذرا اُلجھی اُلجھی سی بتا رہی تھی۔

''شیور!'' عائشے نے سمجھ کر سر ہلا دیا اور تھیلا لیے باہر چلی گئی۔ پھر آٹھ بجے کے قریب وہ سنگھار میز کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

جہان آرہا تھا، اسے ڈھنگ سے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس نے ہلکے ہلکے نم بالوں میں برش پھیرا، پھر ایک دراز سے وہ تھیلی نکالی جس میں اس کا تیسرا موتی رکھا تھا۔ بہارے کی سلور چین میں اس نے وہ موتی ویسے ہی پرو دیا جیسے وہ دونوں بہنیں پروتی تھیں اور چین گردن سے لگا کر دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر ہک بند کیا۔ تنگ زنجیر گردن سے چپک گئی تھی اور درمیان میں اکلا موتی مزید چمکنے لگا تھا۔

اب اس نے پھر سے جہان کا نمبر ملایا، گھنٹی جا رہی تھی۔

''ہیلو؟'' جہان بولا تو پیچھے بازار کا مخصوص شور تھا۔ بہت سے بندے ایک ساتھ بول رہے تھے۔

''جہان تم پہنچ گئے؟''۔

''ہاں، میں تم سے دوپہر میں ملتا ہوں''۔

''تو تم دوپہر تک کیا کرو گے ادھر؟''۔

''میں وہ.....'' وہ ذرا رکا ''میں ایک دوست سے ملنے آیا تھا، ابھی اس کے پاس جا رہا ہوں''۔

''کون سا دوست؟'' اچنبھے سے پوچھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ جہان نے سوائے علی کرامت اور اس کی ماں کے، کبھی اپنے دوستوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کیا اس کا کوئی دوست نہیں تھا یا وہ اپنے دوستوں کا ذکر مستور رکھتا تھا؟

''ہے کوئی، تم نہیں جانتیں۔ اچھا۔ میں فارغ ہو کر کال کرتا ہوں''۔ وہ عجلت میں لگ رہا تھا۔

''او کے!'' اس نے فون کان سے ہٹایا، پھر سوچا کہ لنچ پر ہی پوچھ لے گی کیونکہ وہ جہان کو اس سفید محل میں نہیں بلانا چاہتی تھی۔ سو جلدی سے فون کان سے لگا کر ''ہیلو جہان؟'' کہا کہ مبادا اس نے فون بند نہ کر دیا ہو۔

جہان بھی فون بند کرنے کے بجائے کان سے ہٹا کر دوسری طرف کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ اس نے یقیناً حیا کا ہیلو نہیں سنا تھا۔ وہ ترکی میں کچھ کہہ رہا تھا۔

''کوئی مبہم سا فقرہ جس میں حیا کو صرف ''اوتل گرینڈ'' سمجھ میں آیا تھا۔ ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

''اوتل گرینڈ؟ یعنی ہوٹل گرینڈ؟ جہان نے ہوٹل گرینڈ کا ذکر کیا؟ یعنی وہ ہوٹل گرینڈ جا رہا تھا؟'' وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہو گئی۔ کیا جہان کو علم نہیں کہ وہ عبدالرحمٰن پاشا کا ہوٹل ہے اور پاشا تو اب بیوک ادا واپس آ گیا ہے''۔ لوگ عموماً ریسٹورانٹس میں ہی ملتے ہیں، اس لیے اس نے یقیناً اپنے دوست کو وہی مقام بتا دیا ہوگا اور جہان تو سرے سے کسی عبدالرحمٰن پاشا کو نہیں جانتا تھا۔ پھر؟۔

''اچھا چھوڑو سب۔ دوپہر میں اس سے ملنا تو پوچھ لینا''۔

سارے خیالات ذہن سے جھٹکتی، وہ پزل باکس لے کر اٹھی اور اسٹڈی میں آ بیٹھی۔ کچھ دیر تو وہ باکس کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، پھر ایک دم ایک نتیجے پہ پہنچ کر وہ باکس میز پہ رکھ کر اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی۔ زرد لمبے فراک پہ اس نے بھورا اسٹول شانوں کے گرد سختی سے لپیٹ لیا، بال یونہی کھلے رہنے دیے اور پرس میں کالی مرچ کا اسپرے رکھ کر وہ باہر نکل آئی۔

اسے معلوم تھا کہ وہ اب جب تک جہان کو اور ہوٹل گرینڈ کو دیکھ نہیں لے گی، اسے بے چینی رہے گی، اب چاہے اس کے لیے اسے تنہا کیوں نہ سفر کرنا پڑے۔ ویسے بھی جزیرہ چھوٹا سا تھا۔ ہوٹل گرینڈ اور اس کی عقبی پھولوں کی مارکیٹ اس محل سے قریباً پندرہ منٹ کی ہارس رائیڈ پہ تھی، مگر بندرگاہ سے اس جگہ کا فاصلہ پانچ دس منٹ اوپر تھا۔

''کیا تم مجھے دس منٹ میں پھولوں کی مارکیٹ پہنچا سکتے ہو؟'' اس نے پانچ لیرا کے دو کڑکڑاتے نوٹ بگھی بان کے سامنے کر کے سنجیدگی سے پوچھا۔ بگھی بان نے ایک نظر نوٹوں کو دیکھا اور دوسری نظر اس پہ ڈالی۔

''تمام! (او کے)'' اگلے ہی لمحے اس کی بگھی کے دونوں گھوڑے پتھریلی سڑک پہ دوڑ رہے تھے۔

وہ ایک لمبی، سیدھی، سڑک تھی جو دو رویہ درختوں سے گھری تھی اور اس کے آخری سرے پہ ہوٹل گرینڈ کی بلند و بالا عمارت کھڑی تھی۔ عمارت کے پیچھے ساحل تھا، گو وہ یہاں سے نظر نہیں آتا تھا۔ عمارت پوری کالونی میں ممتاز دکھتی تھی کیونکہ آس پاس چھوٹے موٹے کیفے تھے یا پھر پھولوں کی دکانیں۔ پھولوں کی مارکیٹ یہاں سے شروع ہو کر ہوٹل کے عقب میں پچھلی گلی تک پھیلی تھی۔

وہ پھولوں کے ایک اسٹال پہ جا کھڑی ہوئی اور یونہی بے توجہی سے پھول اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ بے چین نگاہیں بار بار اُٹھ کر ہوٹل کے دروازے کا طواف کرتیں۔ پتا نہیں جہان نے آنا بھی تھا یا اس نے یونہی اس ہوٹل کا تذکرہ کیا تھا؟

تب ہی گلی کے سرے پہ ایک ٹیکسی رُکتی دکھائی دی۔ اس میں سے نیچے اُترنے والا بلاشبہ جہان ہی تھا۔ اس نے سر پہ سرخ پی کیپ لے رکھی تھی اور اب وہ والٹ سے پیسے نکال کر ٹیکسی بان کو دے رہا تھا۔

حیا جلدی سے ایک اونچے شیلف کے پیچھے جا کھڑی ہوئی جس پہ گملے رکھے تھے۔ گملوں اور پھولوں کی جھکی ٹہنیوں کی درمیانی درزوں سے اسے وہ منظر نظر آ رہا تھا۔

پیسے دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ اب ہوٹل کی مخالف سمت میں سر جھکائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا جا رہا تھا۔ اس کا رُخ ہوٹل کی عقبی گلی کی جانب تھا۔

''بے چارا آیا ہوگا کسی دوست سے ملنے، وہ کیوں اس کے پیچھے پڑ گئی ہے؟ وہ کیوں اس کا تعاقب کر رہی ہے؟'' اس نے جھنجھلا کر خود کو کوسا۔ جہان کے آس پاس سڑک پہ بہت سے لوگ دوسری سمت میں جا رہے تھے۔ وہ بھی اس ریلے کے پیچھے چل دی۔ اب جہان کو پکارنا بے وقوفی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بس وہ کہیں کسی کیفے میں چلا جائے تو وہ واپس چلی جائے گی۔

گلی کے دوراہے پہ پھولوں کا ایک بڑا سا اسٹال لگا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ایک فلورل میگزین اُٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیا۔ میگزین کے اطراف سے اسے گلی کا عقبی حصہ نظر آ رہا تھا، جہاں دور آخری سرے پہ ہوٹل گرینڈ کی پشت تھی۔ وہاں ایک چھوٹا سا پرائیویٹ پارکنگ لاٹ بنا تھا اور مستعد گارڈز پہرہ دے رہے تھے۔ یقیناً وہ ہوٹل کے مالکان کے لیے تھا اور یقیناً وہاں پر کوئی پرائیویٹ لفٹ بھی ہوگی جو ہوٹل کے اعلیٰ عہدے داران کو ڈائریکٹ اپنے فلور تک پہنچا دیتی ہوگی۔

اس نے میگزین کے کور کا کنارہ ذرا سا موڑ کر دیکھا۔ جہان اسی طرح سر جھکائے چلتا ہوا سامنے جا رہا تھا۔ گرینڈ کی عقبی طرف۔ سیلز مین اب اس سے ''کیا چاہیے؟'' پوچھ رہا تھا۔

''ٹیولپس..... سبز رنگ کا ٹولپ مل سکتا ہے؟''۔ اس نے اردگرد ٹیولپ کے پھولوں کو دیکھتے ہوئے وہ رنگ پوچھا جو استنبول کیا کرۂ ارض پہ بھی شاید ہی ملتا۔ اس کے خیال میں!

''سبز رنگ کا ٹیولپ؟'' دکان دار ذرا حیران ہوا پھر بولا ''مل جائے گا''۔

''اتنے زیادہ کیوں ہوتے ہیں ٹیولپس استنبول میں؟ جہاں دیکھو، ٹیولپس ہی نظر آتے ہیں''۔ اس نے جلدی سے دوسرا سوال جھاڑا۔ کن انکھیوں سے اسے جہان اب پارکنگ لاٹ تک پہنچتا نظر آ رہا تھا۔ وہاں رُک کر اس نے والٹ نکال کر گارڈ کو کچھ دکھایا، شاید اپنا آئی ڈی کارڈ۔ نفی میں سر ہلا کر جواباً کچھ کہہ رہا تھا۔

''ٹیولپس تو استنبول کا سمبل ہیں۔ کیا آپ نے ٹیولپ فیسٹیول کے بارے میں.....''۔

دکان دار جوش و خروش سے اسے فیسٹول کے بارے میں بتانے لگا۔ جس میں اسے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ بظاہر سر ہلا کر سنتی، گاہے بگاہے ایک نگاہ ہوٹل کے عقبی پارکنگ لاٹ پہ ڈال لیتی، جہاں وہ ابھی تک کھڑا گارڈ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ جب تک وہ واپس پلٹا، حیا اسٹول پہ بیٹھ کر میگزین چہرے کے سامنے کیے پھولوں میں کیموفلاج ہوئی بیٹھی تھی۔ اب بس جہان چلا جائے تو وہ بھی خاموشی سے نکل جائے گی۔

کسی نے نرمی سے میگزین اس کے ہاتھ سے کھینچا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

''جب اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میگزین اس کے سامنے کرتے ہیں تو اس کو اُلٹا نہیں پکڑتے''۔

عین اس کے سر پہ کھڑے جہان سکندر نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر میگزین سیدھا کر کے اسے تھمایا۔

اگر زمین میں گڑ جانے سے زیادہ مبالغہ آمیز محاورہ ہوتا تو وہ اس وقت حیا سلیمان پہ صادق اُترتا۔

وہ قدرے بوکھلا کر کھڑی ہوئی۔

''اوہ..... تم، تم ادھر کیا کر رہے ہو؟''۔

جواباً جہان نے مسکراہٹ دبائے سوالیہ ابرو اُٹھائی۔

"نہیں، بلکہ، میں...... میں ادھر کیا کر رہی ہوں"۔ وہ ذرا خفت سے مسکرائی۔

"میں ایک کام سے آیا تھا اور تم شاید میرے پیچھے"۔ وہ مسکرا کر بولا، مگر اس کا چہرہ ذرا ستا ہوا لگ رہا تھا۔

"نہیں تمہارے پیچھے کیوں، میں بھی ایک کام سے آئی تھی"۔ وہ سنبھل کر مسکرا کر بولی، البتہ دل ابھی تک یونہی دھک دھک کر رہا تھا۔

"واقعی؟"۔

"ہاں، میں اس علاقے پہ ایک رپورٹ لکھ رہی ہوں۔ ہالے کی ایک جرنلسٹ دوست کے لیے۔ بہت دلچسپ ہے"۔

جہان نے جواباً نگاہیں جھکا کر اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔

"اور تم کاغذ کے بغیر ہی رپورٹ لکھتی ہو؟"۔

"یہ نوٹ بک کہاں گئی؟ او یہ رکھی ہے۔ اس نے اب بہت اطمینان سے اسٹال کے اس طرف دکان کے کاؤنٹر پہ رکھی نوٹ بک اُٹھائی اور اسے سینے سے لگا کر بازو لپیٹتے ہوئے مسکرا کر جہان کو دیکھا۔ جہان نے گردن موڑ کر دکان دار کو دیکھا۔ دکان دار نے ایک قلم میز سے اُٹھا کر حیا کی طرف بڑھایا۔

"یہ آپ کا قلم! کیا میرے انٹرویو کے ساتھ میری تصویر بھی چھپے گی؟" ترک دکان دار نے بہت سادگی سے پوچھا تھا۔

"کوشش کروں گی!" اس نے مسکراہٹ دبائے سر ہلا دیا۔ جہان شانے اُچکا کر پلٹ گیا تو اس نے ایک ممنون نگاہ دکان دار پہ ڈالی جو جواباً مسکرا دیا تھا۔ وہ جلدی سے جہان کے پیچھے لپکی۔

"مل لیے دوست سے؟"۔

"نہیں۔ بعد میں ملوں گا۔ سلیمان ماموں پرسوں استنبول آ رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے؟" وہ دونوں ساتھ ساتھ جزیرے کی ایک گلی میں چل رہے تھے جب جہان نے بتایا۔

"ہوں، معلوم ہے۔ اس لیے آج میں تمہارے ساتھ واپس چلی جاؤں گی"۔ اس نے ابھی ابھی کا ترتیب دیا ہوا پروگرام بتایا۔ ابا نے جب اپنے کاروباری ٹرپ کا ذکر کیا تھا تو اس نے استنبول واپس جانے کا تہیہ کر لیا تھا، اب جہان کے آنے سے آسانی ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ چھٹیاں وہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔

"عیسیٰ کی پہاڑی کس طرف تھی؟"

جب سڑک ختم ہو گئی اور وہ پہاڑی راستے پر چڑھنے لگے تو جہان ایک جگہ رُک گیا اور ذرا متذبذب انداز میں دو مخالف سمتوں میں جانے والے پہاڑی راستوں کو دیکھا۔

"یہ کیسے ہو گیا کہ جہان سکندر کو اپنے ترکی کے راستے بھول گئے؟" وہ جتا کر مسکراتی ایک سمت اوپر چڑھنے لگی۔ ٹھنڈی ہوا سے اُڑتی شال کو اس نے سختی سے شانوں کے گرد لپیٹ کر پکڑ رکھا تھا۔

"جہان سکندر جب بیوک ادا تمہارے اور ڈی جے کے ساتھ آیا تھا تو اس وقت وہ دو سال بعد ادھر آیا تھا"۔

"اور مجھے یاد ہے، تب بھی ڈی جے کے فون کرنے پہ تم بمشکل راضی ہوئے تھے"۔

"او تم اس وقت ڈی جے کے ساتھ بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھیں؟ مجھے تو ڈی جے نے بتایا تھا کہ تم مصروف ہو"۔ وہ اس کے پیچھے پہاڑی پہ چڑھتے ہوئے ہلکے سے مسکرا کر بولا۔

"اس نے بعد میں بتایا تھا"۔

وہ مڑی نہیں، مگر اسے حیرت ہوئی تھی کہ جہان کو اتنی پرانی بات اتنی جزئیات سے یاد تھی۔

عیسیٰ تیپسی (عیسیٰ کی پہاڑی) کی چوٹی پہ وہ یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے پہنچ ہی گئے تھے۔ پہاڑی کی چوٹی کسی سرسبز لان کی طرح چپٹی اور گھاس سے ڈھکی تھی۔ وہاں فاصلے فاصلے پہ بہت اونچے درخت لگے تھے یوں جیسے کسی یونیورسٹی کیمپس کا لان ہو۔ دور دور ٹولیوں

میں لوگ بیٹھے تھے۔

ایک طرف ایک چوکور بلاک کی مانند لکڑی کی عظیم الشان قدیم عمارت تھی۔ وہ ایک خستہ حال، قدیم یونانی یتیم خانہ تھا جس کو دیکھنے لوگ دور دور سے Jesus Hill (عیسیٰ کی پہاڑی) پہ آتے تھے۔

وہ دونوں ایک درخت تلے آبیٹھے۔ حیا نے تنے سے ٹیک لگالی، جب کہ جہان اس کے قریب ہی کہنی کے بل گھاس پہ نیم دراز ہو گیا۔ اسے بے اختیار ٹاپ قپی کے عقبی برآمدے کا منظر یاد آیا جب وہ دونوں اسی طرح بیٹھے تھے۔ لمبے جزیرے کی ہواؤں سے پھسلتے لکڑی کی قدیم عمارت پہ گر رہے تھے گویا بارش کے ان دیکھے قطرے ہوں۔

عمارت کے قریب چند لڑکے گھاس سے ہٹ کر ایک الاؤ کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ الاؤ سے آگ کی لپیٹیں اُٹھ اُٹھ کر فضا میں گم ہو رہی تھیں۔

''جہان...... کبھی تم نے اپنی جلد پہ جلنے کا زخم محسوس کیا ہے؟'' وہ دور اس الاؤ کو دیکھتی پوچھ رہی تھی۔

''غریب شیف دن میں کئی بار ہاتھ جلاتا ہے مادام!''۔

اس نے ایک نگاہ جہان پہ ڈالی۔ اس نے سوال ضائع کیا تھا۔ یہ بات اسے میجر احمد سے پوچھنی چاہیے تھی۔ اس نے سوال غلط بندے سے کیا تھا۔

''تم ہر وقت اپنے آپ کو اتنا غریب کیوں کہتے ہو؟'' لمحے بھر کو اسے جہان پہ بے طرح غصہ آیا تھا۔ استقلال اسٹریٹ میں تمہارا ریسٹورنٹ ہے؟ جہانگیر میں تمہارا گھر ہے اور جس روز ہم پاکستان میں آئے تھے، میں نے دیکھا تھا...... ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی Gadget تمہارے کمرے میں رکھا تھا۔ اب وہ سب تو تمہیں گفٹ نہیں ملے تھے نا''۔

''تم زخم کی بات کر رہی تھیں۔ تمہاری گردن کا زخم ٹھیک ہوا؟'' وہ بغیر شرمندہ ہوئے بہت ڈھٹائی سے موضوع بدل گیا۔

''میرے زخم بہت سے ہیں، میں نے ان کا شمار چھوڑ دیا ہے۔'' وہ ذرا تلخی سے کہتی رُخ موڑ کر قدیم، خستہ حال عمارت کو دیکھنے لگی۔ حرکت کرنے سے اس کے کان کی بالی میں موجود موتی ہلنے لگا تھا، مگر جہان کو تو یاد بھی نہیں ہوگا کہ یہ موتی اس نے حیا کو دیا تھا۔

''تمہاری رپورٹ کہاں تک پہنچی؟'' وہ مسکراہٹ دبائے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا جیسے اسے ابھی تک یقین نہیں ہو کہ حیا ''اتفاق'' سے پھولوں کی مارکیٹ میں تھی۔

''بہت دور تک...... سننا چاہو گے؟''

''ہاں تم نے اس بے چارے دُکان دار سے پھولوں کے متعلق کون سا راز اُگلوایا، ذرا میں بھی تو سنوں'۔ وہ کہنی کے بل ذرا اوپر کو ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں پھولوں کے متعلق نہیں عبدالرحمٰن پاشا، اس کے گمشدہ بھائی اور ہوٹل گرینڈ کے متعلق رپورٹ لکھ رہی ہوں!''۔

اور زندگی میں پہلی بار اس نے جہان کے چہرے سے رنگ اُڑتا دیکھا۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔

''تم مذاق کر رہی ہو؟''۔

''نہیں، مگر اب تم یہ مت کہنا کہ استنبول میں عبدالرحمٰن پاشا نامی کوئی بندہ نہیں ہے۔ وہ ہے اور وہ ہوٹل گرینڈ کا مالک ہے، لیکن تم جانتے ہو، اس ہوٹل کا اصل مالک کون تھا؟''

جہان نے جواباً سوال نہیں کیا، وہ بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اس کا چھوٹا بھائی۔ عبدالرحمٰن کا ایک چھوٹا بھائی تھا، جو اچانک ڈیڑھ دو سال قبل منظر عام سے غائب ہو گیا۔ اگر آج وہ ادھر ہوتا تو عبدالرحمٰن پاشا اتنا مضبوط اور نا قابلِ شکست نہ بنا بیٹھا ہوتا۔ میں وہ وجہ تلاش کر رہی ہوں جس کے باعث اس کا بھائی یوں روپوش ہوا ہے''۔

''تم یہ سب جان کر کیا کرو گی؟'' وہ بہت اُلجھن سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں یہ اسٹوری ہالے کو دوں گی اور وہ اپنی صحافی دوست کو۔ یوں معصوم سی یہ کہانی اخبار میں چھپے گی اور اگر یہ چیز ایک دفعہ میڈیا

کے ہاتھ لگ جائے، تو پریشر کے باعث یا تو عبدالرحمن اپنے بھائی کو ڈھونڈ نکالے گا یا میڈیا"۔ وہ بہت جوش سے بولتی جا رہی تھی۔

"اگر یہ اتنا آسان ہوتا تو کوئی پہلے ہی کر چکا ہوتا اور تم...... تم اس کے بھائی کو منظر عام پہ لا کر کیا کرو گی؟"۔

"میں چاہتی ہوں کہ لوگ۔ اس غلط فہمی سے نکل آئیں کہ عبدالرحمن پاشا کسی Voldemort Lord کا نام ہے۔ تم یقین کرو جہان! میں نے جتنی اس معاملے پہ تحقیق کی ہے، اتنا ہی مجھے اندازہ ہوا ہے کہ پاشا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ محض ایک جعلی پروپیگنڈا مہم ہے۔ بعض لوگ خود کو طاقت ور کہلا کر اپنی اَنا کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ میں قانون پڑھ رہی ہوں، مجھے ان باریکیوں کا پتا ہے"۔

"اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ تم قانون پڑھ رہی ہو، ورنہ میں تو اب تک بھول ہی چکا تھا"۔

"بات مت بدلو۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ جب میڈیا میں یہ بات آئے گی کہ ہوٹل گرینڈ کا اصل مالک یونان نہیں، بلکہ کسی چھوٹی سی جگہ پہ گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو اس بات کو کتنا اُچھالا جائے گا"۔

"اسٹاپ دس حیا!" وہ ایک دم جھنجھلایا تھا۔ "تم، تم...... کیا ضرورت ہے، تمہیں پرائے مسئلے میں پڑنے کی؟ ضروری تو نہیں ہے کہ پاشا نے اپنے بھائی کو نکالا ہو، ہو سکتا ہے وہ خود گیا ہو، ہو سکتا ہے ان دونوں کے درمیان کوئی سیٹل منٹ ہو۔ ہزار ممکنات ہو سکتی ہیں"۔

"اور ہو سکتا ہے، اس نے خود اپنے بھائی کو واپس آنے سے روک رکھا ہو، اگر اخبارات اس خبر کو اُچھالیں گے تو عبدالرحمن پاشا کی اس خود ساختہ شہرت کے غبارے سے ساری ہوا نکل جائے گی"۔ وہ بہت مزے سے بولی تھی، پھر جہان کے تاثرات دیکھ کر اچنبھا ہوا۔ وہ بہت مضطرب اور کوفت زدہ سا لگ رہا تھا۔

"عبدالرحمن پاشا کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ فرق پڑے گا تو اس کے بھائی کو حیا! بہت سے لوگ نئی زندگیاں شروع کر لیتے ہیں، وہ خود ہی اپنی پرانی زندگی میں نہیں لوٹنا چاہتے۔ اس طرح اس کو ایکسپوز کر کے تم اس کی زندگی مشکل میں ڈال دو گی۔ خوامخواہ مت پڑو ان لوگوں کے مسئلوں میں۔ چلو چلتے ہیں، مجھے واپس کام پہ بھی پہنچنا ہے"۔

وہ ایک دم ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے انداز میں واضح اضطراب تھا۔

"تم کو اپنے دوست سے نہیں ملنا؟"۔

جہان نے رُک کر ایک نظر اسے دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں، پھر کبھی مل لوں گا"۔

"مجھے سامان پیک کرنے میں ذرا وقت لگے گا تم پورٹ پہ میرا انتظار کر سکتے ہو؟ میں تب سامان لے کر سیدھی وہیں آ جاؤں گی"۔

"میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں، تمہاری دوست کے گھر"۔

"نہیں، تم بور ہو جاؤ گے، مجھے ساتھ والی آنٹی سے کچھ چیزیں لینی ہیں، وقت لگ جائے گا۔ میں تمہیں پورٹ پہ ملوں گی"۔ وہ جہان کو عائشے گل کے گھر کے باہر لگی اے آر پاشا کی تختی دکھانے کی متحمل ہرگز نہیں تھی۔

"او کے!" اس نے زور نہیں دیا۔ وہ شانے اُچکا کر سر جھکائے نیچے اُترنے لگا۔ وہ کسی اور بات پہ اُلجھا ہوا لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

گھر آ کر اس نے جلدی جلدی سامان پیک کیا۔ فون کر کے عائشے سے معذرت کی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے، ابا کی آمد کا بتا کر جب وہ اپنا بیگ لیے نہایت عجلت میں بندرگاہ جانے کے لیے نکلی تو اسے بھول چکا تھا کہ اس کا پزل باکس اوپر اسٹڈی کی میز پہ پڑا رہ گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

دوپہر کی سرخی بیوک ادا کی اس سرسبز درختوں سے گھری گلی پہ چھا رہی تھی۔ بلند و بالا عثمانی محل کے سفید ستون سنہری روشنی میں چمک رہے تھے۔

عبدالرحمن ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا گول چکردار زینے اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس کے جوتوں کی دھمک پہ کچن میں کام کرتی عائشے کے سبزی کاٹتے ہاتھ رُک گئے۔ گھر میں جوتوں سمیت صرف عبدالرحمن ہی گھوما کرتا تھا۔ وہ مڈل کلاس ترکوں کی طرح گھر سے باہر بھی جوتے نہیں

اُتارتا تھا بلکہ استنبول کی ہائی ایلیٹ کی طرح قالین پہ بھی جوتے پہن کر بہت تفاخر سے چلا کرتا تھا۔
عائشے نے صبح ہی اسے ایم ایس ایم کر دیا تھا کہ حیا کل چلی گئی ہے اور رات میں آنے بھی آ گئی تھیں، وہ چاہے تو گھر آ سکتا ہے۔ سو وہ آ گیا تھا۔
اس نے جلدی سے سنک کی ٹونٹی کھولی، ہاتھ دھوئے اور انہیں خشک کیے بنا باہر نکلی تو اسے عبدالرحمٰن بالائی منزل کی راہ داری کے پہلے دروازے میں داخل ہوتا دکھائی دیا تھا۔ وہ اسٹڈی میں جا رہا تھا۔ عائشے تیز قدموں سے اس کے پیچھے زینے چڑھنے لگی۔
اسٹڈی روم کا دروازہ پورا کھلا تھا۔ عبدالرحمٰن ایک بک شیلف کے سامنے کھڑا کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔
''السلام علیکم!'' اس نے چوکھٹ میں رُک کر سلام کیا۔
''ہوں وعلیکم!'' وہ ہاتھ میں پکڑی کتاب کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ وہ اتنے دن بعد گھر آیا تھا، مگر اس کا انداز ویسا ہی تھا۔
''تم کب آئے؟''۔
''ابھی''۔ وہ کتاب رکھ کر اسٹڈی ٹیبل کی طرف آیا اور دراز کھول کر اندر رکھی اشیاء اِدھر اُدھر کرنے لگا۔
''کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''۔ عائشے کو بے چینی ہوئی۔
''کچھ پیپرز تھے اور ایک کتاب بھی''۔ وہ اب گھٹنے کے بل زمین پہ بیٹھا نچلی دراز کھول رہا تھا۔
''تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟''۔ وہ اُداسی سے بولی۔
''نہیں!'' وہ بنا پلٹے بولا تھا۔
''میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے جو بھی کہا تھا، آنے کے لیے کہا تھا۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے مگر تم نے اس دن کے بعد مجھ سے بھی ٹھیک سے بات نہیں کی''۔
''عائشے! میرے معاملات میں مت بولا کرو!'' اس نے مڑ کر ایک سخت نگاہ عائشے پہ ڈال کر کہا اور واپس پلٹ گیا۔ ''تم نے اپنی دوست کو میرے سو کالڈ بھائی کے بارے میں بتایا ہے نا، اس نے مجھے خصوصاً یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا، تمہیں یہ نہیں کرنا چاہیے تھا''۔
''میں تمہارے حکم کی پابند تو نہیں ہوں عبدالرحمٰن!'' عائشے نے نرمی سے مگر خفا لہجے میں کہا۔ ''بہارے نے ہماری لڑائی کا ذکر کیا تو میں نے پوری بات بتا دی۔ اس سے کیا ہوتا ہے''۔
''آنے کدھر ہیں؟'' وہ اب ٹیبل پہ رکھی کتابیں اُٹھا اُٹھا کر کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔
''وہ سو رہی ہیں''۔ وہ کہہ کر پلٹ گئی۔ جاتے ہوئے اس کا چہرہ بہت خفا اور اُداس تھا۔ وہ چلی گئی تو عبدالرحمٰن نے پلٹ کر دیکھا پھر برہمی سے سر جھٹکا۔ ''یہ لڑکی مروائے گی اسے کسی دن''۔
سرخ جلد والی کتاب ایک فائل تلے رکھی تھی، اس نے گہری سانس لے کر کتاب اُٹھائی۔ اس کے اندر وہ کاغذات پڑے تھے جو اس نے پہلے وہاں رکھے تھے۔ کتاب اُٹھا کر وہ پلٹنے ہی لگا تھا کہ اس کی نگاہ ایک شے پہ رُک گئی۔
وہ ایک سیاہی مائل پزل باکس تھا جس کی چاروں اطراف جلی ہوئی لگتی تھیں اور ان پہ سنہری حروف اُبھرے ہوئے تھے۔
عبدالرحمٰن نے کتاب واپس رکھی اور آہستہ سے وہ باکس اُٹھایا، پھر اس کو الٹ پلٹ کر کے وہ سطور دیکھنے لگا۔ ایک شعر تلے کوڈ بار کے چھے چوکھٹے بنے تھے اور ان میں متفرق حروف اُبھرے ہوئے تھے۔
وہ باکس پکڑے باہر آیا۔ عائشے کچن سے اسی وقت نکلی جب وہ سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ عبدالرحمٰن نے نامحسوس انداز میں باکس والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ عائشے نے اسے نہیں دیکھا تھا، وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔
وہ راہ داری سے گزر کر پچھلے دروازے سے ہوتا ہوا عقبی باغیچے میں آ گیا۔ وہاں کونے میں عائشے کی ورک ٹیبل رکھی تھی جس پہ بہارے کوئی کلرنگ بک رکھے رنگ بھر رہی تھی۔ بہارے سے وہ آتے ہوئے مل چکا تھا، سو اب اسے آتے دیکھ کر وہ سادگی سے مسکرا دی۔
''بہارے!'' وہ مدھم مسکراہٹ لبوں پہ سجائے اس کے قریب آیا اور پزل باکس اس کے سامنے کیا۔ ''یہ کس کا ہے؟''۔

''اوہ یہ تو حیا کا ہے، وہ یہیں بھول گئی؟''۔ وہ حیرت سے بولی۔ ''کل اس کا کزن آیا تھا تو اسے جلدی میں جانا پڑا۔ تمہیں پتا ہے، اس کا کزن، بہت ہینڈسم ہے''۔

''یہ حیا کا ہے؟'' عبدالرحمٰن نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دُہرایا۔

''ہاں یہ اسے کسی نے دیا تھا''۔

''کس نے؟'' وہ بنا پلک جھپکے بہارے کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا''۔ بہارے نے شانے اُچکا دیے

''کیا یہ عائشے نے بنایا ہے؟''۔

''ہاں، مگر تم اس سے پوچھنا نہیں۔ اس کے خریدار نے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا''۔ بہارے کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ وہ مسکرا دیا۔

''اسی لیے تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم اس کو کھول سکتی ہو؟''۔

''نہیں، اس کی پہیلی ابھی حیا نہیں حل کر سکی تھی۔ تم کر سکتے ہو؟'' بہارے کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

''شاید، مگر بہارے گل!'' وہ ذرا سا جھکا اور دھیرے سے بولا۔ ''یہ باکس میرے پاس ہے، یہ بات میرے اور تمہارے درمیان راز رہے گی۔ تم حیا یا عائشے کو نہیں بتاؤ گی اس بارے میں۔ ٹھیک؟''

''ٹھیک!'' بہارے نے اُلجھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ ''مگر تم اس کو توڑنا نہیں توڑ کر کھولنے سے اس کے اندر کی موجود شے تمہارے کام کی نہیں رہے گی''۔

وہ سر ہلا کر واپس پلٹ گیا۔ بہارے اپنی کلرنگ بک چھوڑ کر اس کے پیچھے آئی۔ وہ جب تک اندر آئی، عبدالرحمٰن اوپر جا چکا تھا۔ وہ دبے پاؤں زینے چڑھنے لگی۔

تیسری منزل پہ عبدالرحمٰن کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ بہارے نے چوکھٹ کے قریب سر نکال کر جھانکا۔

عبدالرحمٰن پزل باکس الماری میں رکھ رہا تھا۔ الماری کا پٹ بند کر کے اس نے لاک لگایا اور چابی اپنے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ڈال دی۔ بہارے جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور بلی کی چال چلتی واپس اُتر گئی۔

عبدالرحمٰن نے وہ باکس کیوں رکھ لیا، اس کا ذہن کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

☆ ☆ ☆

ابا آج صبح پہنچے تھے اور اب وہ ''مرمرا ہوٹل'' میں تھے۔ مرمرا ہوٹل ٹاقسم میں واقع تھا۔ حیا اور ڈی جے نے غریب عوام کی طرح وہ شان دار ہوٹل باہر سے ہی دیکھا تھا۔ اگر ڈی جے ہوتی تو وہ دونوں اس بات کو بہت انجوائے کرتیں کہ ابا اب اسی ہوٹل میں رہ رہے تھے۔

اس کا ڈورم ڈی جے کے بغیر بہت ادھورا سا تھا۔ ڈی جے ابھی تک وہیں تھی، وہ تو جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھی۔ ہالے نے کل ڈورم بدل لیا تھا، اب وہ ڈی جے کے بینک پہ منتقل ہو گئی تھی۔ البتہ ان دونوں نے اس بینک سے ملحقہ میز پہ ڈی جے کی ٹوٹی عینک ٹیپ سے جوڑ کر رکھ دی تھی۔

رات انجم باجی اور ہالے اسی کے پاس رُک گئی تھیں۔ وہ تینوں گھنٹوں ڈی جے کی باتیں کرتی رہی تھیں۔

''جب ہم پہلی دفعہ آپ سے ملے تھے تو اسے آپ کے انڈین ہونے پہ بہت اعتراض تھا۔ اسے پاکستان کا ٹی ٹوئنٹی فائنل میں آخری بال پہ مصباح کے آؤٹ ہونے کا بہت دُکھ تھا۔ اس نے اس کے بعد کرکٹ دیکھنی ہی چھوڑ دی تھی۔ بعض دُکھ اصل واقعات سے بڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے ڈی جے کی محبت سے ڈی جے کا دُکھ بڑھ گیا ہے''۔

''اور استقلال اسٹریٹ میں جب......''

اس کے اور ہالے کے پاس بہت سے واقعات تھے۔ وہ یادوں سے نکل کر جب سوئیں تو صبح دیر سے اُٹھیں۔ آج چھٹی تھی اور

اب اسے ابا سے ملنے جانا تھا۔ سو اب وہ اسی لیے تیار ہو رہی تھی۔

جو گہرا سبز فراک اس نے پہنا تھا یہ وہی تھا جو وہ ڈی جے کے ساتھ آخری دفعہ پھپھو کے گھر پہن کر گئی تھی۔

"بالکل پاکستان کا جھنڈا لگ رہی ہو"۔

کچھ یاد کر کے وہ اُداسی سے مسکرائی اور پرفیوم اُٹھایا۔ ابھی اس نے اسپرے نوزل پہ انگوٹھا رکھا ہی تھا کہ بہارے کہیں آس پاس سے چیخی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" "اچھی لڑکیاں اتنا تیز پرفیوم لگا کر باہر نہیں جاتیں"۔

وہ ایک دم رُک گئی۔ اُف، عائشے گل اور اس کی "اچھی لڑکی!" اسے ان باتوں کو اپنے ذہن پہ حاوی نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے دوبارہ نوزل دبانا چاہا مگر پتا نہیں کیوں اس نے پرفیوم واپس رکھ دیا۔

اپنے بازو کے اوپری حصے پہ داغے گئے الفاظ پہ وہ پہلے ہی اسکن کلر کا بینڈ ایج لگا چکی تھی۔ فراک کی شیفون کی آستینوں سے بازو جھلکتے تھے۔ کلر بینڈ ایج نے ان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس نے سبز دوپٹہ ٹھیک سے شانوں پہ پھیلایا اور کھلے بالوں کو کندھے کے ایک طرف ڈالتی باہر نکل آئی۔

"اچھی لڑکیاں بال کھول کر باہر نہیں نکلتیں"۔

وہ اپنے ذہن میں گونجتی آوازوں کو نظر انداز کرتی سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔

"اچھی لڑکیاں اللہ تعالیٰ کی بات مانتی ہیں"۔

وہ سر جھٹکتی آخری زینہ پھلانگ آئی۔

"اچھی لڑکیاں......اچھی لڑکیاں"۔

اس نے اپنا سر اُٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ اندھیرے پہ اندھیرے۔ لہر پہ لہر۔ صبح کے وقت بھی اسے ہر طرف اندھیرا لگنے لگا تھا۔ اس کی روشنی کہاں تھی؟۔

وہ بے دلی سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی انجم باجی کے اپارٹمنٹ کی طرف آ گئی۔ انجم باجی اپنا چارجر اس کے کمرے میں بھول گئی تھیں۔ ان کا چارجر لوٹا کر اس نے اب چلے جانا تھا مگر پتا نہیں کیوں رُک گئی۔

"انجم باجی! میرے بالوں کی فرنچ بریڈ بنا دیں گی؟" اس نے خود کو کہتے سنا۔

"ہاں۔ شیور ادھر بیٹھو!" انجم باجی برش لے کر اس کے بال سنوارنے لگیں۔

"حیا! تمہارے بالوں کو کیا ہوا ہے؟" فرانسیسی طرز کی چوٹی کے باریک بل باندھتے ہوئے وہ حیرت سے کہہ اٹھیں۔ وہ ذرا سی چونکی۔

"کیا ہوا؟"۔

"تمہاری Scalp کی جلد کا رنگ ایسا سرخ بھورا سا ہو رہا ہے، چھالے ہوئے تھے بالوں میں؟"۔

"نہیں، ایک شیمپوری ایکٹ کر گیا تھا۔ بس چند دن میں ٹھیک ہو جائیں گے"۔ اس نے ان سے زیادہ خود کو تسلی دی۔

چوٹی بناتے ہوئے بال کھنچ رہے تھے اور سر کی جلد درد کر رہی تھی، مگر وہ برداشت کر کے بیٹھی رہی۔ عائشے نے جب وہ ویکس اُتاری تھی تو اس کے بالوں کو کتنا نقصان ہوا، کتنا نہیں، عائشے نے تفصیل اسے کبھی نہیں بتائی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کبھی وہ اس سارے واقعے کی تفصیل دوبارہ سے سنے گی۔

اس نے انجم باجی کے اپارٹمنٹ سے نکلنے سے قبل خود کو آئینے میں نہیں دیکھا۔ اسے پتا تھا، وہ فرنچ بریڈ میں بہت اچھی نہیں لگ رہی ہوگی۔

حسین اور مومن کورسل شٹل سے اُتر رہے تھے جب وہ اسٹاپ پہ پہنچی۔

"معتصم سے کہنا، مجھے اس کو کچھ دکھانا ہے"۔ وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ حسین سے کہہ کر بس میں چڑھ گئی۔ وہ واپس آ جائے پھر

معتصم کے ساتھ مل کر پزل باکس کی پہیلی حل کرنے کی کوشش کرے گی۔

مرمرا ہوٹل، ٹاقسم ڈسٹرکٹ میں واقع تھا۔ شیشوں سے ڈھکی بلند و بالا عمارت، گویا کوئی اونچا سا ٹاور ہو۔ اندر سے بھی ویسی ہی چمکتا، آنکھوں کو خیرہ کرتا منظر۔

وہ پتلی ہیل سے پُر اعتماد انداز میں چلتی لابی میں آئی تھی۔ ابا نے بتایا تھا کہ وہ لابی میں ہی ہوں گے اور وہ اسے دور سے ہی نظر آ گئے تھے۔ ان کا اس کی طرف نیم رُخ تھا۔ وہ کھڑے کسی سے محوِ گفتگو تھے۔

وہ ان کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ نگاہ ابا کے ساتھ کھڑے دونوں افراد پہ پڑی۔ ایک دم سے اس کے پاؤں برف کی سل بن گئے۔

ابا کے ساتھ کوئی اور نہیں، ان کے کاروباری شراکت دار لغاری انکل اور ولید لغاری تھے۔

گویا کرنٹ کھا کر حیا مڑی اور تیزی سے ایک دوسری راہ داری میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ صد شکر کہ ان میں سے کسی کی نظر ابھی اس پہ نہیں پڑی تھی۔

یہ قابلِ نفرت شخص کہاں سے آ گیا؟ وہ اس کا سامنا کیسے کرے؟ وہ کیا کرے؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس وہ بنا دیکھے لیڈیز ریسٹ روم کی طرف آ گئی۔

وہاں آئینے سے ڈھکی دیوار کے آگے قطار میں بیسن لگے تھے۔ ایک طرف باتھ رومز کے دروازے تھے۔ ایک ترک لڑکی ایک بیسن کے سامنے کھڑی آئینے میں دیکھتی لپ اسٹک درست کر رہی تھی۔

حیا اس سے فاصلے پہ آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی۔ اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے بے اختیار گردن پہ ہاتھ رکھا۔ جب ولید نے اس کا دوپٹہ کھینچا تھا تو اس کی گردن پہ رگڑ آئی تھی۔ ڈولی کا کھردرا ہاتھ، اس کا فرائنگ پین مگر یہاں کوئی ڈولی نہیں تھا، جو اس کے لیے آ جاتا۔ وہ اکیلی تھی۔ کس سے مدد مانگے، اس سے جو کسی مشکل میں اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا؟ مگر شاید اب کی بار......

اس نے جلدی سے موبائل پہ جہان کا نمبر ملایا۔ طویل گھنٹیاں جا رہی تھیں۔

"اُٹھا بھی چکو!" وہ فون کان سے لگائے کوفت زدہ سی کھڑی تھی۔ آئینے میں جھلکتے اس کے چہرے پہ اب تک زخموں کے نشان مندمل ہو چکے تھے۔

پانچویں گھنٹی پہ جہان کی خمار آلود آواز گونجی۔

"آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت سو رہا ہے۔ براہ مہربانی، کافی دیر بعد رابطہ کریں۔ شکریہ"۔

"جہان! اُٹھو اور میری بات سنو!" وہ جھلاسی گئی تھی۔

"میں بہت تھکا ہوا ہوں، مجھے سونے دو، میں نے ریسٹورنٹ......"

"جہنم میں گیا تمہارا ریسٹورنٹ۔ تم ابھی اسی وقت مرمرا ہوٹل پہنچو۔ ابا آئے ہوئے ہیں اور ساتھ ان کے دوست وغیرہ بھی ہیں، مجھے اکیلے ان سے ملنا اچھا نہیں لگ رہا"۔ اس کی آواز میں بے بسی در آئی تھی۔

ساتھ کھڑی لڑکی اب بالوں کو اونچے جوڑے میں باندھ رہی تھی۔

"میں نہیں آ رہا، مجھے آرام کرنے دو"۔

"ٹھیک ہے۔ جہنم میں جاؤ تم اور تمہارا ریسٹورنٹ۔ وہ جن لوگوں نے تمہارے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کی تھی نا، انہوں نے بہت اچھا کیا تھا، تم ہو ہی اسی قابل"۔ اس نے زور سے بٹن دبا کر کال کاٹی۔

ترک لڑکی اب بیسن کی سلیب پہ رکھا اسکارف اُٹھا کر چہرے کے گرد لپیٹ رہی تھی۔ حیا چند لمحے اسے بے خیالی میں تکتی رہی، پھر کسی میکانکی عمل کے تحت اس نے شانوں پہ پھیلا دوپٹہ اُتارا اور سر پہ رکھ کر چہرے کے گرد تنگ ہالہ بنا کر پلو بائیں کندھے پہ ڈال لیا۔ سبز دوپٹہ کرنکل جارجٹ کا تھا اور چاروں اطراف سفید سوئی پائی پن ہوئی تھی۔ پاکستان کا جھنڈا۔ کندھے، آستین، کلائیاں تک دوپٹے میں چھپ گئی تھیں، مگر کیا وہ اچھی بھی لگ رہی تھی؟ شاید نہیں۔

لیکن کس کو؟ کسی نے اس سے پوچھا اور ایک دم سے اس کا دل پُرسکون ہو گیا۔ اس وقت وہ لوگوں کو اچھی لگنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ یہ سب اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے نہیں کر رہی تھی، وہ تو شاید صرف اپنا دفاع کر رہی تھی۔ نیکی، اللہ تعالیٰ کا خوف، اسے اب بھی ان میں سے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔

''ابا!'' ان کے عقب میں جا کر اس نے ان کو پکارا تو وہ تینوں ایک ساتھ پلٹے۔

''اوہ مائی چائلڈ!'' ابا خوشی سے آگے بڑھے۔ وہ ایک رسمی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے ابا سے ملی اور لغاری انکل کو فاصلے سے سلام کر لیا۔

''بیٹا! یہ لغاری ہیں، میرے دوست، اور یہ ان کے صاحب زادے ہیں ولید''۔

''مجھے تو آپ جانتی ہوں گی، ہم پہلے مل چکے ہیں''۔ ولید ایک محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''مجھے یاد نہیں، میں ہر کسی کو یاد نہیں رکھتی''۔ ذرا رکھائی سے کہہ کر وہ ابا کی طرف مڑی اور اپنی بات کا ردعمل آنے سے قبل ہی بولی۔

''آپ کو کدھر لے کر جاؤں ابا! استنبول کی سیر آپ کہاں سے شروع کرنا چاہیں گے؟''۔

''میرا خیال ہے انکل! استقلال اسٹریٹ چلتے ہیں، اس رونق کے بارے میں بہت سنا ہے''۔ ولید کی مسکراہٹ ذرا مدھم تو تھی مگر وہ ابھی بھی مایوس نہیں ہوا تھا۔ استقلال اسٹریٹ کی رونق سے اس کا اشارہ اس جگہ کے بارز اور نائٹ کلبز کی طرف ہی تھا۔

''جہاں تم کہو، تم زیادہ جانتی ہو گی استنبول کو''۔ ابا مسکرا کر بولے تھے۔

''میرا خیال ہے ابا، ہم بلیو موسق (نیلی مسجد) چلتے ہیں۔ میں جہان کو بھی بتا دوں''۔ وہ سارا پروگرام بنا کر موبائل پہ جہان کو میسج کرنے لگی۔ جان بوجھ کر بھی جہان کا نام لینے کے باوجود ان باپ بیٹے نے نہیں پوچھا کہ کون جہان؟'' اسے مزید کوفت ہوئی۔ اسی کوفت زدہ انداز میں اس نے میسج لکھا۔

''ہم بلیو موسق، آیا صوفیہ اور ٹاپ قپی جا رہے ہیں، تم اسی جگہ آ جاؤ اور اگر تم نہ آئے تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی''۔

''یہ بات اسٹامپ پیپر پہ لکھ کر دو!'' فوراً جواب آیا تھا۔

''فائن۔ اب میں تم سے واقعی کبھی بات نہیں کروں گی''۔

''تو کیا ٹیکسٹ کرو گی؟'' ساتھ ایک معصوم سا مسکراتا چہرہ بھی تھا۔ اس نے جواب نہیں دیا، اگر وہ سامنے ہوتا تو وہ اس کی گردن دبوچ لیتی۔

آیا صوفیہ اور ٹاپ قپی پیلس ساتھ ساتھ ہی واقع تھے اور ان کے سامنے سڑک کی دوسری جانب استنبول کی مشہور زمانہ نیلی مسجد تھی، پچھلی دفعہ اگر ڈی جے اور پھر جہان کی طبیعت خراب نہ ہو جاتی تو وہ لوگ نیلی مسجد ضرور جاتے مگر اب سب بدل چکا تھا۔

نیلی مسجد (سلطان احمت مسجد) کا رنگ نیلا نہیں تھا، مگر اس کی اندرونی ازنک ٹائلز نیلی تھیں۔ باہر سے اس کے گنبد یوں تھے گویا چھوٹے چھوٹے پیالے اُلٹے رکھے ہوں۔ مسجد کے احاطے کے آگے گیٹ تھا اور اس کے باہر قطار میں بنچ لگے تھے۔ یوں کہ ہر دو بنچز کے درمیان ایک میز تھی۔

بنچ پر وہ اور ابا میز کے ایک طرف جب کہ ولید اور لغاری صاحب دوسری طرف بیٹھ گئے تھے۔ موبائل حیا نے گود میں رکھا ہوا تھا گو کہ اب وہ جہان کی طرف سے مایوس ہو چکی تھی۔

وہاں ہر سو کبوتر پھڑ پھڑاتے ہوئے اُڑ رہے تھے۔ ہوا سے اس کا دوپٹا بھی پھسلنے لگتا، وہ بار بار اسے دو انگلیوں سے پیشانی پہ آگے کو کھینچتی۔ آج اسے اپنے سر سے دوپٹا نہیں گرنے دینا تھا۔ آج نہیں۔

''رات کے سیمینار کے بعد یوں کرتے ہیں کہ عبسر خان سے مل لیں گے''۔ ابا اور لغاری انکل آپس میں محو گفتگو تھے۔ ولید اسے نظروں کے حصار میں لیے اس کے مقابل بیٹھا تھا۔ وہ گردن موڑ کر لاتعلق سی اُڑتے کبوتر دیکھ رہی تھی۔

دفعتاً اس نے ابا اور لغاری انکل کو اُٹھتے دیکھا۔ چونک کر اس نے گردن موڑی۔

''تم لوگ بیٹھو، ہم ابھی آتے ہیں''۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

انہیں کچھ دیکھنا تھا یا کوئی مل گیا تھا یا پھر شاید ولید نے اپنے باپ کو کلیو...... دیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھی رہی۔ دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ ابا کو بھی ترکی آ کر اتاترک کا اثر ہو گیا تھا۔ پاکستان ہوتا تو وہ کبھی یوں اپنی بیٹی کو دوست کے بیٹے کے ساتھ تنہا چھوڑ کر نہ جاتے۔

''تو میں آپ کو واقعی یاد نہیں؟'' وہ محظوظ انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ حیا نے گردن پھیر کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

''میرے ابا کے دوستوں کے پاس بہت سے کتے ہیں، مجھے کبھی کسی ایک کتے کا بھی نام یاد نہیں رہا''۔

وہ جواباً اسی طرح مسکرائے گیا۔

''بہت نیک ہو گئی ہیں آپ مگر اس سرخ رنگ میں آپ بہت اچھی لگتی تھیں''۔

وہ لب بھینچے رُخ موڑے بیٹھی رہی۔

''کچھ کھائیں گی آپ؟ کیا پسند ہے آپ کو کھانے میں؟''۔

''آپ کو کیا پسند ہے کھانے میں؟ فرائنگ پین؟''۔

اب کے وہ بھی تمسخرانہ مسکرا کر بولی تھی۔ وہ پھر بھی ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔

''گاڑی نہیں ہے آپ کے پاس ادھر؟ آپ کے ساتھ ڈرائیو پہ جانا مجھے اچھا لگتا''۔ وہ اسے یاد دلا رہا تھا۔ ایک سنگین غلطی جس کا پردہ وہ کبھی بھی کھول سکتا تھا۔ نے [illegible] ندر تک کانپ گئی تھی۔

''اپنی حد میں رہیں ولید صاحب! جو رات کے اندھیرے میں آپ کو فرائنگ پین کی ایک ضرب سے زمین بوس کر سکتا ہے، وہ دن کی روشنی میں تو اس سے بھی بدتر کر سکتا ہے''۔ کسی احساس کے تحت اس نے چہرہ موڑا تھا۔

دور سے جہان نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ وہ ان ہی کی طرف آ رہا تھا۔ نیلی جینز پہ سفید ٹی شرٹ میں ملبوس، اس کے چہرے سے لگ رہا تھا، وہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے۔

حیا کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔ اسے زندگی میں کبھی جہان سکندر کو دیکھ کر اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی، جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔

وہ بے اختیار اُٹھی، گود میں رکھا موبائل زمین پہ جا گرا۔ وہ چونکی اور جلدی سے جھک کر فون اُٹھایا۔ اس کی اسکرین پہ بڑی سی خراش پڑ گئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے ولید بھی ساتھ ہی اُٹھا تھا۔

''جی میڈم! آپ اپنی بات پہ قائم ہیں؟'' وہ مسکرا کر کہتا اس کے قریب آیا''۔ پھر نگاہ ولید پہ پڑی تو اس نے سوالیہ نظروں سے حیا کو دیکھا۔

''جہان! یہ ابا کے دوست کے بیٹے ہیں، ابا ان کے والد کے ساتھ ابھی...... وہ آ گئے''۔ ابا اور لغاری انکل سامنے سے چلتے آ رہے تھے۔ جہان کو دیکھ کر ابا کے چہرے پہ خوش گوار حیرت اُبھری۔

''سوری ماموں! میں ایئرپورٹ نہیں آ سکا۔ ممی نے بتایا تھا کہ آپ نے خود منع کر دیا تھا''۔ ابا سے مل کر وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بتا رہا تھا۔ لغاری انکل اور ولید سے بھی وہ اسی خوش دلی سے ملا تھا، البتہ وہ دونوں استفہامیہ نظروں سے سلیمان صاحب کو دیکھ رہے تھے۔

''اٹس او کے، آفیشلی پک کر لیا گیا تھا ہمیں، اسی لیے میں نے سبین کو منع کر دیا تھا''۔ جہان نے مسکرا کر سر کو جنبش دی، پھر نگاہ لغاری انکل کے سوالیہ تاثرات پہ پڑی تو جیسے جلدی سے وضاحت دی۔

''میں جہان سکندر ہوں، سلیمان ماموں کا بھانجا اور داماد۔ حیا کا ہزبینڈ!''۔

مرمرا کا سمندر ایک دم آسمان تک اُٹھا اور کسی تھال کی طرح اس پہ انڈیل دیا گیا تھا۔ وہ اس بوچھاڑ میں بالکل سن سی ہوئی جہان کو دیکھ رہی تھی۔ جس رشتے کے متعلق نہ پوچھنے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی، اس رشتے کا اقرار یوں اس منظرنامے میں ہوگا، اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''داماد؟ اوہ آئی سی!'' لغاری انکل نے بمشکل مسکرا کر سر ہلایا، پھر ایک نظر ابا پہ ڈالی، جو لمحے بھر کو گنگ رہ گئے تھے، مگر جلدی ہی

سنبھل گئے تھے۔

"مجھے خوشی ہے جہان! کہ تم آئے"۔ حالانکہ وہ اس کے آنے کے بجائے کسی اور بات پہ خوش تھے۔

"سوری ماموں! مجھے پہلے آنا چاہیے تھا اور اگر اب بھی نہ آتا تو حیا نے مجھ سے ساری زندگی بات نہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا"۔ اس نے مسکرا کر کہتے حیا کو دیکھا، وہ جواباً دھیرے سے مسکرائی۔ جیسے وہ دونوں ہمیشہ سے ہی ایسے ہی آئیڈیل کپل کی طرح بات کرتے رہے ہوں۔ جیسے ان کے درمیان کبھی کوئی تلخ کلامی ہوئی ہی نہ ہو۔

ولید لغاری کے چہرے کی مسکراہٹ پھر یوں غائب ہوئی کہ وہ دوبارہ مسکرا نہ سکا۔ بعد میں سارا وقت وہ محتاط انداز میں اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا رہا۔ وہ اپنے سامنے، اپنے شوہر اور باپ کے درمیان بیٹھی لڑکی پہ اب نظر ڈالنے کی بھی جرأت نہیں کر رہا تھا۔

اس سہ پہر جہان نے ان تینوں مہمانوں کی بہت اچھے طریقے سے تواضع کی۔ ٹاپ قپی اور آیا صوفیہ (میوزیم) کی راہ داریوں میں ان کو ساتھ لیے وہ ایک اچھے گائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ آج استنبول میں حیا کا پہلا دن تھا، جب وہ بہت اعتماد سے جہان کے پہلو میں چل رہی تھی۔

"تم ان دونوں کو ہوٹل ڈراپ کر کے ابا کو گھر لے جانا، میں خود ہی گھر آ جاؤں گی۔ ابھی مجھے یہاں کچھ کام ہے"۔ واپسی کے وقت اس نے جہان سے دھیرے سے کہا تھا۔ وہ شانے اُچکا کر بنا اعتراض کے ساتھ چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد وہ نیلی مسجد کے گیٹ کے اندر چلی آئی۔ اسے یہاں کوئی کام نہیں تھا، اسے بس کچھ وقت کے لیے تنہائی چاہیے تھی۔

مسجد کے احاطے میں سبزہ زار پہ پانی کا فوارہ اُبل رہا تھا۔ اونچے گنبدوں پر چھاؤں سی چھائی تھی۔ وہ سر جھکائے روش پہ چلتی اندر جا رہی تھی۔

"اندھیروں پہ اندھیرے، اس کے اوپر لہر۔ اس کے اوپر بادل"۔

اس کے قدموں میں تھکاوٹ تھی۔ اس شخص کی سی تھکاوٹ جس کا سراب اسے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔ زندگی کے بائیس برس ایک دھوکے میں گزار دینے کے بعد اس کو آج پہلی بار لگا تھا کہ وہ سب صرف ایک سراب تھا۔ چمکتی ریت جسے وہ آبِ حیات سمجھی تھی۔

"اور نہیں بنایا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے نور، تو نہیں ہے اس کے لیے کوئی نور"۔

اندر اس عظیم الشان ہال میں وہ گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے ٹھوڑی ان پہ جمائے ساری دُنیا سے لاتعلق بیٹھی تھی۔

"تو نہیں اس کے لیے کوئی نور......"۔

اس نے ہمیشہ اپنی مرضی کی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنی مرضی کر کے غلط کیا تھا۔ اس نے بہت دفعہ اللہ تعالیٰ کو "ناں" کی تھی۔ اسے کبھی اس بات سے فرق نہیں پڑا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے کیسا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہمیشہ وہی بنی رہی جیسے وہ خود کو دیکھنا چاہتی تھی۔

"وہ سمجھتا ہے اسے پانی، یہاں تک کہ وہ اس کے قریب پہنچتا تو وہاں کچھ نہیں پاتا اور وہ اس کے قریب اللہ تعالیٰ کو پاتا ہے"۔

اس نے آنکھیں بند کر کے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔

جن دنوں اس کا تازہ تازہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا، اس نے دوپٹا بالکل گردن میں لینا شروع کر دیا تھا۔ کتنا ڈانٹتے تھے تایا فرقان اور ابا بھی شروع شروع میں کچھ کہہ دیتے، مگر جب وہ خاموشی سے ان کی بات سنی اَن سنی کر کے آگے نکل جاتی تو رفتہ رفتہ سب نے کہنا چھوڑ دیا اور پھر اس سفر کی نوبت کہاں آ پہنچی؟ اس کی ویڈیو کو مجرے کا نام دیا گیا، ایک بدنام زمانہ آدمی اس کے پیچھے پڑا تھا، صائمہ تائی اس کے بارے میں آگے پیچھے ہر جگہ نازیبا باتیں کہتی پھرتی تھیں اور ایک اغوا کار شخص نے اس کے بازو پہ وہ نام داغ دیا تھا جو شرفا اپنے منہ سے نہیں نکالا کرتے تھے۔

اس نے دھیرے سے سر اُٹھایا۔

"اللہ نور ہے، آسمانوں اور زمین کا......"

لوگ کہتے ہیں، مسجدوں میں سکون ہوتا ہے، کوئی اس سے پوچھتا تو وہ کہتی، مسجدوں میں نور ہوتا ہے۔نور، اور پرنور کے۔
اس نے آہستگی سے گردن موڑی۔ اس کے بائیں طرف ایک تیرہ چودہ سال کا ترک لڑکا آ بیٹھا تھا جس کے ایک بازو پہ پلستر چڑھا تھا۔ وہ گم صم سی نگاہوں سے اوپر مسجد کی منقش چھت کو دیکھ رہا تھا۔
"نور کیا ہوتا ہے؟ تم جانتے ہو؟" وہ اتنے ہولے سے بولی تھی کہ اپنی آواز بھی سنائی نہ دی۔
"نور وہ ہوتا ہے جو اندھیری سرنگ کے دوسرے سرے پہ نظر آتا ہے، گویا کسی پہاڑ سے گرتا پگھلے سونے کا چشمہ ہو"۔ وہ اسی چھت کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"اور کیسے ملتا ہے نور؟"۔
"جو اللہ تعالیٰ کی جتنی مانتا ہے، اسے اتنا ہی نور ملتا ہے۔ کسی کا نور پہاڑ جتنا ہوتا ہے، کسی کا درخت جتنا، کسی کا شعلے جتنا اور کسی کا پاؤں کے انگوٹھے جتنا....."
لڑکے نے سر جھکا کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔
"انگوٹھے جتنا نور، جو جلتا بجھتا، بجھتا جلتا ہے۔ یہ ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو کچھ دن بہت دل لگا کر نیک عمل کرتے ہیں اور پھر کچھ دن سب چھوڑ چھاڑ کر ڈپریشن میں گھر کر بیٹھ جاتے ہیں"۔
"اور انسان کیا کرے کہ اسے آسمانوں اور زمین جتنا نور مل جائے؟"۔
وہ اللہ کو ناں کہنا چھوڑ دے۔ اسے اتنا نور ملے گا کہ اس کی ساری دنیا روشن ہو جائے گی"۔ وہ پھر سے گردن اُٹھائے مسجد کی اونچی چھت کو دیکھنے لگا تھا۔
اسے محسوس ہوا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا ہے۔ وہ دھیرے سے اُٹھی اور باہر کی طرف چل دی۔
"سنو!" وہ پیچھے سے بولا تھا۔ حیا لمحے بھر کو رکی۔
"دل کو مارے بغیر نور نہیں ملا کرتا"۔
وہ پلٹے بغیر آگے بڑھ گئی۔ دل تو مارنا پڑتا ہے، مگر ضروری تو نہیں ہے کہ ٹھوکر بھی کھائی جائے۔ انسان ٹھوکر کھائے بغیر، زخم لیے بغیر، خود کو جلائے بغیر بات کیوں نہیں مانتا؟ پہلی دفعہ میں ہاں کیوں نہیں کہتا؟ نیلی مسجد کے کبوتروں کی طرح اوپر اُڑنا کیوں چاہتا ہے؟ پہلے حکم پہ سر کیوں نہیں جھکاتا؟ ہم سب کو آخر منہ کے بل گرنے کا انتظار کیوں ہوتا ہے؟ اور گرنے کے بعد ہی بات کیوں سمجھ میں آتی ہے؟
اس نے ہتھیلی کی پشت سے دھیرے سے آنکھیں رگڑیں اور باہر نکل آئی۔
ایک فیصلہ تھا جو اس نے نیلی مسجد کے گنبدوں کو گواہ بنا کر کیا تھا۔ اب اسے اس فیصلے کو نبھانا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھپھو اور ابا لاؤنج میں بیٹھے بیتے دنوں کی باتیں کر رہے تھے۔ پھپھو بہت خوش تھیں۔ بار بار نم آنکھیں پونچھتیں۔ وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی، جہان کیک ٹرے میں سیٹ کر رہا تھا۔ آج اس نے کون سا اعتراف کیا ہے۔ وہ سب یوں ظاہر کر رہے تھے، گویا انہیں یاد ہی نہ ہو۔
"تمہاری پڑھائی کا حرج تو بہت ہو گیا ہوگا؟ اتنے دن لگا دیے ادالار میں، ڈورم آفیسر نے طلبی کی ہوگی؟"۔ وہ کیک پہ چھری کتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
"نہیں، ڈورم میں حاضری مارکنگ کا کوئی نظام نہیں ہے۔ ہاں کلاسز کا حرج ہوا تو ہے، پانچ دن تو اسپرنگ بریک میں شامل ہو گئے تھے۔ اوپر کے چھ دن کی غیر حاضری لگی ہوگی۔ اب مزید صرف ایک چھٹی کی گنجائش ہے میرے پاس!" وہ کیتلی میں چائے ڈالتے ہوئے بولی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نہیں دیکھ رہے تھے۔
"ایگزامز کب ہیں؟"۔
"مئی کے آخر سے جون کے پہلے ہفتے تک"۔

''اور پاکستان تم نے پانچ جولائی کو جانا ہے نا؟ یہ آخری مہینہ تو شاید صرف ترکی گھومنے کے لیے ہے''۔

''ہاں مگر ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی کوشش ہوتی ہے کہ قریبی ممالک بھی دیکھ لیں۔ کوئی قطر جا رہا ہے تو کوئی پیرس''۔ وہ ٹرے اُٹھا کر جانے کے لیے مڑی۔

''ہم لندن چلیں؟''۔

حیا نے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اوون سے اسنیکس کی پلیٹ نکالتے ہوئے دھیرے سے مسکرایا تھا۔

''ہم لندن جا رہے ہیں کچھ عرصے تک، ابا کے علاج کے لیے۔ تم بھی چلو''۔

''آئیڈیا تو اچھا ہے، سوچوں گی''۔ وہ جواباً مسکرائی اور ٹرے لیے باہر آ گئی۔

''میری بہت خواہش تھی بھائی کہ یہ سب پاکستان میں، سب رشتے داروں کے ساتھ ہو، لیکن شاید ایسا جلد ممکن نہ ہو اور پھر ہم دونوں ہیں تو یہاں، اس لیے میں نے سوچا کہ غیر رسمی انداز میں رسم کر لیں''۔

پھپھو شاید ابا سے بات کر چکی تھیں، تب ہی وہ مسکرا رہی تھیں، وہ جو کارپٹ پہ پنجوں کے بل بیٹھی ٹرے سے پیالیاں نکال کر میز پہ رکھ رہی تھی، ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی۔

پھپھو مسکراتے ہوئے اُٹھیں اور چند لمحوں بعد چھوٹی سلور ٹرے لیے آئیں جس میں سرخ فیتہ رکھا نظر آ رہا تھا۔ حیا نے ناسمجھی سے ٹرے کو دیکھا، پھر کچن سے ٹرالی دھکیل کر لاتے جہان کو وہ بھی پھپھو کے ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر رُکا، پھر سوالیہ نگاہوں سے ان کا چہرہ دیکھا۔

''جہان سکندر! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟'' پھپھو نے بظاہر مسکراتے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے متنبہ کیا۔ وہ شاید راضی نہیں تھا، مگر ''نہیں'' کہہ کر ٹرالی آگے لے آیا۔ حیا ٹرے میز پہ ہی چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اب نظر آیا تھا، سرخ فیتے کے دونوں سروں پہ ایک ایک انگوٹھی بندھی تھی۔

''شادی کا وقت تو ظاہر ہے، ہم بعد میں ڈیسائیڈ کریں گے، مگر ہر ماں کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ میں اپنی بہو کو نسبت کی انگوٹھی پہنا دوں۔ فاطمہ بھی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ وہ دونوں انگوٹھیوں کو پکڑے ان دونوں کے پاس آ گئیں۔

ان کے ہاتھ بڑھانے پہ حیا نے کسی خواب کی سی کیفیت میں اپنا ہاتھ آگے کیا، انہوں نے مسکراتے ہوئے اس میں انگوٹھی ڈالی۔ وہ ایک سادہ، پلاٹینم بینڈ تھا۔ سرخ ربن کے دوسرے سرے سے بندھا بینڈ انہوں نے جہان کی اُنگلی میں ڈالا، پھر ٹرے سے چھوٹی قینچی اُٹھا کر ربن درمیان سے کاٹا۔ دونوں کی انگوٹھیوں سے بندھا ربن ان کی اُنگلیوں کے ساتھ جھولتا رہ گیا۔ ترکی میں منگنی شاید اسی طرح ہوا کرتی تھی۔

حیا نے سن ہوتے دماغ کے ساتھ سر اُٹھایا۔ جہان پھپھو کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور وہ اس کی پیشانی چوم کر دعا دے رہی تھیں۔ ابا بھی اُٹھ کر اس کو گلے سے لگائے دُعا دے رہے تھے۔ وہ سب کتنا حسین تھا، کسی خواب کی طرح۔ دھنک کے سارے رنگوں سے مزین کوئی بلبلہ جو کشش ثقل سے آزاد ہو کر اوپر اُڑتا جا رہا ہو۔ اوپر...... اور اوپر......

''تم کیوں چپ بیٹھے ہو برخوردار؟'' ابا شاید جہان سے پوچھ رہے تھے۔

''میں سوچ رہا ہوں، میں وہ پہلا آدمی ہوں گا جس کی منگنی، اس کی شادی کے بعد ہوئی ہے''۔

وہ دھیرے سے ہنس کر بولا تھا۔ وہ نچلا لب دبائے جلدی سے ٹرے لیے کچن میں آ گئی۔ اس کا ست رنگا بلبلہ اوپر، بہت اوپر تیرتا جا رہا تھا۔

شام میں دیر سے جہان، ابا کو واپس چھوڑنے گیا اور پھپھو اپنے کام نپٹانے لگیں تو وہ لاؤنج میں آ بیٹھی۔ اپنی اُنگلی میں پہنی انگوٹھی سے بندھے ربن کو دیکھتے ہوئے وہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ تب ہی لینڈ لائن فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو؟'' اس نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری جانب کوئی نسوانی آواز تھی۔

''کیا میں مسٹر جہان سکندر سے بات کر سکتی ہوں؟''۔

''نہیں، وہ ذرا باہر تک گئے ہیں۔ کوئی پیغام ہو تو دے دیجیے''۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی

''جہان کو کہنا، اس نے جو پارسل مجھے بھجوایا تھا، وہ کھو گیا ہے۔ کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے شاید۔ میں اسے رات میں کال کروں گی''۔

اس کے ساتھ ہی اس نے فون رکھ دیا تھا۔

حیا نے ایک نظر ریسیور کو دیکھا اور پھر شانے اُچکاتے ہوئے اسے کریڈل پہ ڈال دیا۔

جہان جب واپس آیا تو وہ لاؤنج میں منتظر بیٹھی تھی۔ پھپھو اب تک سونے جا چکی تھیں۔ حیا کا ارادہ تھا کہ وہ لندن کے ٹرپ کا پروگرام جہان سے ڈسکس کرے، اور بھی بہت سی باتیں تھیں مگر پہلے اس کا پیغام۔

''ماموں صبح ہوٹل سے ہی ایئرپورٹ چلے جائیں گے، ہمیں آنے سے منع کر دیا ہے۔ تم یوں کرو، دو کپ کافی بنا لاؤ، میں کچھ نئی موویز لایا تھا۔ دیکھتے ہیں''۔

وہ بہت اچھے موڈ میں کہتے ہوئے ٹی وی کے نیچے بنے ریک کی طرف آیا تھا۔

''او کے لاتی ہوں اور ہاں، تمہارے لیے فون آیا تھا''۔ وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''کوئی لڑکی تھی، نام تو نہیں بتایا مگر کہہ رہی تھی کہ تمہارا پارسل اسے نہیں ملا، کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے۔ شاید وہ رات میں کال کرے''۔

وہ تیزی سے مڑتے ہوئے اُٹھا تھا۔

''میرا پارسل اسے نہیں ملا اور کیا کہا؟'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کچھ نہیں۔ کافی لاؤں؟''۔

''نہیں، رہنے دو''۔ وہ قدرے مضطرب انداز میں کہتے ہوئے صوفے کی طرف آیا اور فون اُٹھا کر سی ایل آئی چیک کرنے لگا۔

اس کی اُنگلی میں انگوٹھی اب بھی تھی، مگر ربن نہیں تھا۔

''تم..... تمہیں صبح کیمپس بھی جانا ہوگا، تم یوں کرو سو جاؤ۔ میں بس تھوڑا کام کروں گا''۔ وہ اُلجھے اُلجھے متفکر انداز میں سی ایل آئی چیک کرتے ہوئے بولا۔

ست رنگا بلبلہ پھٹ گیا تھا۔

سارا موڈ غارت، سارا پلان ختم۔

وہ ''اچھا'' کہہ کر بددلی سے کمرے میں چلی آئی۔

اس کا کمرہ لاؤنج سے ملحقہ تھا۔ دروازے کی ہلکی سی درز اس نے کھلی رہنے دی۔ جب تک وہ سو نہیں گئی، اسے جہان صوفے پہ مضطرب سا بیٹھا فون کو دیکھتا نظر آتا رہا تھا۔

وہ صبح فجر پہ اُٹھی تو دیکھا، جہان اسی طرح صوفے پہ بیٹھا، فون کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں رت جگے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس لڑکی کا فون نہیں آیا تھا شاید۔ انتظار لاحاصل۔ اس کے دل پہ بہت سا بوجھ آن پڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

کلاس میں وہ سر سے دوپٹا اُتار کر گئی تھی اور بالکل پیچھے بیٹھی رہی۔ باہر نکلتے ہی اس نے دوپٹا پھر ٹھیک سے سر پہ لے لیا۔ کامن روم میں واپس آئی تو معتصم مل گیا۔

''حیا..... کیا حال ہے؟'' حسین اور معتصم اس کے لیے کھڑے ہو گئے تھے۔ ڈی جے کی سکھائی گئی اردو۔ وہ اداس مسکراہٹ کے ساتھ ان کے پاس آئی۔

''میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور آپ کی خیریت ٹھیک چاہتی ہوں۔ مجھے تمہیں کچھ دکھانا تھا'' آخری فقرہ اس نے انگریزی میں ادا کیا۔

''پزل باکس؟ وہ کھلا؟''

"نہیں، مگر اس پہ لکھی پہیلی مل گئی ہے۔ ٹھہرو میں لے آؤں"۔ وہ اُلٹے قدموں واپس پلٹ گئی۔ کمرے میں آ کر اس نے بیگ کھولا، کپڑے، جوتے، سوئٹرز، پرس، ہر چیز اُلٹ پلٹ کی، مگر پزل باکس وہاں نہیں تھا۔

"کدھر گیا؟ یہیں تو تھا۔ آخری دفعہ رکھا تھا اس نے؟" وہ سوچنے لگی۔ "ہاں، اسٹڈی میں" جب وہ جہان کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ "اوہ، خدا نہ کرے وہ پاشا کے ہاتھ لگے"۔

اس نے جلدی سے موبائل اُٹھایا اور اس کی ٹوٹی اسکرین کو دیکھتے ہوئے عائشے کا نمبر ملانے لگی۔

☆ ☆ ☆

سفید محل کے عقبی باغیچے میں سہ پہر اُتری تھی۔ عائشے اسٹول پہ بیٹھی، ورک ٹیبل پہ لکڑی کا ٹکڑا رکھے، نوک دار چھرے سے اس کو چھید رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مکمل اپنے کام پہ مرکوز تھیں۔

"عائشے! حیا کی کال!" بہارے اس کا موبائل پکڑے بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی۔ عائشے نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا اور پھر موبائل تھام لیا۔

"سلام علیکم حیا"۔ اب وہ فون کان سے لگائے ازلی خوش دلی سے رسمی باتیں کر رہی تھی۔ بہارے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ باتیں سننے لگی۔

"پزل باکس؟" عائشے کی مسکراہٹ ذرا سمٹی بھنویں اُلجھن سے سکڑیں۔ "تمہارا والا کدھر رکھا تھا؟"۔

بہارے نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا دل اس لمحے زور سے دھڑکا تھا۔

"میں نے کل ہی پوری اسٹڈی کی صفائی اپنے سامنے کروائی ہے۔ اگر ہوتا تو مل جاتا۔ ہو سکتا ہے تم ساتھ لے گئی ہو؟ اچھا تم فکر نہ کرو۔ میں دوبارہ دیکھ کر کرتی ہوں"۔ اس نے موبائل بند کر کے میز پہ رکھا۔

"بہارے! تم نے حیا کا پزل باکس تو نہیں دیکھا؟"۔

"نہیں!" بہارے نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔

"چلو پھر یوں کرتے ہیں کہ مل کر تلاش کرتے ہیں۔ مہمان کی چیز میزبان کے گھر میں کبھی کھونی نہیں چاہیے۔ بہت شرمندگی کی بات ہوتی ہے"۔

وہ چیزیں سمیٹتے ہوئے اُٹھ گئی۔ بہارے سر جھکائے اپنی بڑی بہن کے پیچھے چل دی۔ اس کے ذہن کے پردے پہ صرف ایک آواز گونج رہی تھی۔

"یہ باکس میرے پاس ہے۔ یہ بات میرے اور تمہارے درمیان راز رہے گی۔ تم حیا یا عائشے کو نہیں بتاؤ گی اس بارے میں۔ ٹھیک؟"۔

"ٹھیک عبدالرحمٰن!" اس نے بے دلی سے زیرِ لب دہرایا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس روز جب عائشے نے اسے ایس ایم ایس کیا تب وہ ہالے کے ساتھ جمعہ کی نماز پہ ایوب سلطان جامعہ آئی ہوئی تھی۔

نمازِ جمعہ پہ جامعہ میں خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ ترک رسم کے مطابق کم سن بچے جمعے کی نماز پڑھنے سلطان کے مخصوص لباس میں آتے۔ سنہری پگڑی، سنہرا اور سفید زرتار لباس، میان میں تلوار، کامدار جوتے پہنے وہ ننھے سلاطین اپنی ماؤں کی اُنگلیاں تھامے ہر جگہ پھر رہے ہوتے۔

انصاری محلے میں ہالے کے ساتھ چلتے ہوئے اسے بے اختیار اپنا اور ڈی جے کا ترکی میں پہلا دن یاد آیا تھا۔ وہ دن جو بہت طویل تھا۔ اب ان ساڑھے تین ماہ میں کتنا کچھ بدل چکا تھا۔

انصاری محلے میں استنبول کے بہترین اور سستے اسکارف ملا کرتے تھے۔ وہ اب سر ڈھکے بغیر باہر نہیں نکلتی تھی، مگر اس کے سارے

دوپٹے شیفون کے یا ریشمی ہوتے، جو سر پہ نہیں ٹکتے تھے۔ اب وہ یہاں ایسے اسکارف لینے آتی تھی، جو سادہ اور ایک رنگ کے ہوں نہ کہ ایسے شوخ اور کام دار کہ ہر کسی کی توجہ کھینچیں۔ اسے اب کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا تھا۔ جہان اس کا تھا، اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔

وہ اپنے چند جوڑوں کے ساتھ ہم رنگ اسکارف پیک کروا رہی تھی، جب میسج ٹون بجی۔ اس نے فون نکال کر خراش زدہ اسکرین کو دیکھا۔ عائشے کا پیغام جگمگا رہا تھا۔

''میں نے سارے گھر میں ڈھونڈا، مگر نہیں ملا۔ تم خود کسی دن آ جاؤ، دوبارہ مل کر ڈھونڈ لیتے ہیں''۔

اس نے ویک اینڈ پہ آنے کا وعدہ کر کے موبائل پرس میں رکھ دیا۔

''واپسی پہ جواہر چلتے ہیں، مجھے فون کی اسکرین ٹھیک کروانی ہے''۔

''شیور!'' ہالے نے ہامی بھر لی۔ وہ ڈی جے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔ ہالے ان لوگوں میں سے تھی جو دوسروں کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور بدلے کی توقع کے بغیر مدد کرتے رہتے ہیں۔ ترکی کے پُرخلوص لوگ!

ٹاقسم سے انہوں نے انڈر گراؤنڈ میٹرو پکڑی۔ پہلا اسٹاپ چھوڑ کر وہ دوسرے پہ اُتر گئیں۔ اسٹیشن سے باہر سامنے ہی جواہر شاپنگ مال تھا۔ بلند و بالا کھجور کے درخت۔ لش چمکتا مال۔ روشنیوں کا سمندر۔

ہالے کچھ کھانے کے لیے ٹیک اوے کرنے ایک ریسٹورنٹ میں چلی گئی اور وہ بالائی فلور پہ فون ریپئرنگ شاپ پہ آ گئی۔

''پانچ دس منٹ کا کام ہے میم! آپ کاؤچ پہ بیٹھ جائیں۔ میں ابھی کر دیتا ہوں''۔ جس ترک دکان دار لڑکے نے اس سے فون لیا تھا، وہ فون کا معائنہ کر کے بولا۔

''وہ سر ہلا کر سامنے کاؤچ پہ آ بیٹھی اور ریک سے ایک میگزین اُٹھا کر یونہی ورق گردانی کرنے لگی۔

لڑکا اب شوکیس کے پیچھے کھڑا، اس کے موبائل کے ٹکڑے الگ کر رہا تھا۔ کیسنگ اُتار کر اس نے بیٹری نکالی تو ایک دم رُک گیا اور سر اُٹھا کر قدرے تذبذب سے حیا کو دیکھا۔

''میڈم!'' اس نے ذرا اُلجھن سے پکارا۔ حیا نے میگزین سے سر اُٹھا کر اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''۔

''یہ لگا رہنے دوں؟''۔

''کیا؟'' وہ رسالہ رکھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

''آپ کے فون میں جی پی ایس ٹریسر ہے۔ اسے لگا رہنے دوں؟''۔

''ٹریسر؟ میرے فون میں ٹریسر ہے؟'' وہ سانس لینا بھی بھول گئی تھی۔

''اوہ! آپ کو نہیں معلوم تھا اور جس نے یہ ٹریسر ڈالا ہے، وہ تو ہمہ وقت آپ کی لوکیشن ٹریس کر رہا ہوگا''۔

وہ بنا پلک جھپکے اپنے موبائل کے اندر لگے ناخن برابر باریک ٹریسر کو دیکھے گئی۔

اور وہ سوچتی تھی، پاشا کو اس کی لوکیشن کا کیسے پتا چلتا ہے؟ یقیناً اس کے پچھلے فونز میں بھی ٹریسرز ہوں گے۔ تب ہی۔

''یہ بہت سوفسٹی کیٹڈ ہے میم! وہ جب چاہے اس سے فون کا مائیک آن کر کے آپ کی گفتگو بھی سن سکتا ہے۔ اب اس کا کیا کروں؟''۔

وہ چند لمحے اسے دیکھے گئی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''اسے لگا رہنے دو''۔

''ریئلی؟'' لڑکا حیران ہوا تھا۔

''ایک ٹریسر نکالوں گی تو وہ دس اور ڈال دے گا۔ اس لیے بہتر ہے میں اس کو اسی ٹریسر سے دھوکا دیتی رہوں۔ میں ہر جگہ اسے ساتھ نہیں لے کر جاؤں گی۔

خصوصاً اس جگہ نہیں، جہاں میں نہیں چاہتی کہ اس کو پتا چلے''۔

''اوہ ویری اسمارٹ!'' لڑکا مسکرا دیا۔ ''میں آپ کو کسی چھوٹی سی ڈبی میں یہ ڈال دیتا ہوں تاکہ آپ کو اسے بار بار فون سے علیحدہ نہ کرنا پڑے''۔

وہ اب احتیاط سے وہ ننھا سا ٹریسر نکال رہا تھا۔ حیا ابھی تک بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی۔

عبدالرحمٰن پاشا...... وہ کیا کرے اس آدمی کا؟ وہ اپنا اتنا وقت اور توانائی اس پہ کیوں صرف کرتا تھا؟ کیا یہ اندھی محبت تھی؟ شاید کچھ اور؟

☆ ☆ ☆

اندھیرے کمرے میں مدھم سبز نائٹ بلب کی روشنی بکھری تھی اور جزیرے کے ساحل سے سر ٹکراتی لہروں کی سرسراہٹ یہاں تک محسوس ہوتی تھی۔ عائشے آنکھوں پہ بازو رکھے قریباً نیند میں جا چکی تھی۔ جب بہارے نے پکارا۔

''عائشے، بات سنو!'' وہ چت لیٹی چھت پہ کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

''ہوں؟'' عائشے کی آواز نیم غنودگی سے بوجھل تھی۔

''جب بندہ بار بار جھوٹ بولتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟''۔

''اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس ''بہت جھوٹ بولنے والا'' لکھ لیتا ہے''۔

بہارے نے چونک کر اسے دیکھا۔ عائشے کی آنکھوں پہ بازو تھا۔ شکر کہ وہ بہارے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''اپنے پاس کدھر؟ آسمانوں پہ؟''۔

''ہاں، آسمانوں پہ''۔

''کیا اس کے نام کے ساتھ ''جھوٹا'' کسی بڑے پوسٹر پہ لکھا جاتا ہے؟''۔

''شاید ایسا ہی ہو۔ اب سو جاؤ''۔

''عائشے! اگر اللہ تعالیٰ وہ پوسٹر آسمان پہ بچھا دے تو کیا سب کو اس کے نام کے ساتھ جھوٹا لکھا نظر آئے گا؟''۔

اس کی آواز میں انجانا سا خوف تھا۔

چشم تصور میں اس نے دیکھا، باہر تاریک آسمان پہ سرخ انگاروں سے لکھا تھا۔

''اناطولیہ کی بہارے گل...... بہت جھوٹ بولنے والی''۔

''ہاں، سب کو ہر جگہ سے وہ نظر آئے گا''۔

''جو گھر کے اندر، کمرے کے اندر ہوگا اسے بھی؟''۔

''ہاں، اب سو جاؤ بچے! صبح کام پہ بھی جانا ہے''۔

''اور اگر کوئی بیڈ کے نیچے گھس جائے تو وہاں سے بھی آسمان نظر آئے گا؟''۔

''ہاں اور بہارے گل! تم اب بولیں تو میں تمہیں ٹرنک میں بند کر دوں گی''۔

عائشے جھنجلا کر بولی تھی۔ اس کی نیند بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ وہ سارے دن کی تھکی ہوئی تھی۔ بہارے ذرا سی عائشے کے قریب کھسکی اور چہرہ اس کے کان کے قریب لے آئی۔

''عائشے!'' اس نے بہت دھیمی سی سرگوشی کی۔ کیا ٹرنک کے اندر سے آسمان نظر آئے گا؟''۔

''اللہ اللہ!'' عائشے نے غصے سے بازو ہٹایا۔ بہارے نے غڑاپ سے منہ کمبل کے اندر کر لیا۔

مگر اسے کمبل کے اندر سے بھی آسمان نظر آ رہا تھا۔ سرخ انگارے اسی طرح دہک رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس شام وہ تاقسم اپنی سرخ ہیل ٹھیک کروانے آئی تھی۔ جب ہیل جڑ گئی تو وہ کسی خیال کے تحت شاپر لیے اسکوائر کے مجسمے کی

طرف آگئی۔ ''استقلال میٹی'' (مجسمہ آزادی)۔

مجسمے کے گرد گھاس کے گول قطعہ اراضی کو مثبت کے نشان کی طرح دو گزرگاہوں نے کاٹ رکھا تھا، جس سے گول قطعہ چار برابر خانوں میں بٹ گیا تھا۔ کمپاس کے چار خانے۔ ہر سوٹیولپس کی مہک تھی۔

بہادر جرنیل اب مجسم صورت اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اتاترک مصطفیٰ کمال پاشا۔ یہ وہ دوسرا پاشا تھا، جس سے اس کو شدید نفرت ہونے لگی تھی۔ صرف اس کی وجہ سے وہ روز کلاس میں اسکارف اُتارتی تھی اور ٹالی اس کو ایک استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا کرتی۔ اس ایک آدمی نے اسے ہرادیا تھا مگر۔

''انسان کو کوئی چیز نہیں ہراسکتی، جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے''۔ ڈی جے کہیں دور سے بولی تھی۔

وہ چند قدم مزید آگے چل کر آئی۔ اس نے مجسم ہوئے جنگجو کی پتھر آنکھوں میں دیکھا۔ یہ آدمی کیوں جیتا؟ کیونکہ یہ لڑنا جانتا تھا، کیونکہ اس نے شکست تسلیم نہیں کی تھی، کیونکہ وہ لڑتا رہا تھا یہاں تک کہ اسے فتح مل گئی اور ایک جنگجو کو کیسے ہرایا جاتا ہے؟ اس نے میجر احمد سے دل ہی دل میں پوچھا تھا۔

''اس سے مقابلہ کر کے۔ اس سے تب تک لڑ کے، جب تک فتح نہ مل جائے یا جان نہ چلی جائے''۔

جواب فوراً آیا تھا۔ اگر وہ غلط ہو کر اتنا پُر اعتماد تھا، تو وہ صحیح ہو کر پُر اعتماد کیوں نہیں تھی؟ وہ غلط ہو کر جیت سکتا ہے تو وہ صحیح ہو کر کیوں نہیں جیت سکتی؟ وہ کیوں اُتارے اسکارف؟ وہ ان لوگوں کے پیچھے اللہ تعالیٰ کو کیوں ناں کرے؟ زیادہ سے زیادہ سبانجی والے نکال دیں گے، تو نکال دیں، مگر کیوں نکال دیں؟ نہیں، وہ نہ اسکارف اُتارے گی، نہ میدان چھوڑے گی۔

وہ اتاترک کے مجسمے کو یہی اسکارف لپیٹ کر سبانجی کے کلاس روم میں بیٹھ کر پڑھ کر دکھائے گی۔ مسجد میں جو فیصلہ میں نے کیا تھا، اسے بس اب پورا کرنا ہے۔ طیب اردگان کو قانون بدلنا پڑے، سو پڑے۔ وہ مزید اس ذلت سے نہیں گزرے گی۔ اللہ تعالیٰ کی حدود مذاق نہیں ہوتیں۔ اب وہ اسکارف پہن کر ہی پڑھے گی، دیکھتے ہیں کون روکتا ہے اسے۔ اس کی ماں اسے روئے!

اتاترک کے مجسمے کو دیکھتے ہوئے اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اسے زندگی بھر اپنے اسکارف پہ سمجھوتا نہیں کرتا۔ وہ نقاب نہیں کرسکتی، وہ برقع نہیں اوڑھ سکتی، مگر اسکارف اوڑھنا۔ یہ ایک کام ہے جو وہ کرسکتی ہے، تو پھر اسے روکنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ کوئی رستہ تو ہوگا۔

''رستہ ضرور ہوتا ہے''۔ میجر احمد نے کہا تھا۔

رستے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ اسے بھی رستہ ڈھونڈنا تھا۔

☆ ☆ ☆

آئینے میں اپنے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے اسکارف کو ٹھوڑی تلے پن سے جوڑا، پھر سامنے کے دو لٹکونے پلوؤں میں سے ایک کو مخالف سمت چہرے کے گرد لپیٹ کر سر کی پشت پہ پن سے لگا دیا۔ اسکارف خاصا بڑا تھا۔ دوسرے پلو نے سامنے سے اسے ڈھک دیا۔ نیچے سیاہ اسکرٹ پہ اس نے پوری آستینوں والا میرون پھول دار بلاؤز پہن رکھا تھا۔ توقع کے برخلاف، میرون اسکارف کے ہالے میں دمکتا اس کا چہرہ کافی اچھا لگ رہا تھا۔

کتابیں اُٹھائے، بیگ کندھے پہ ڈالے جب وہ سبانجی کی مرکزی عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تو سامنے ہی ٹالی چند یورپین اسٹوڈنٹس کے ساتھ آتی دکھائی دی۔ وہ گزرتے گزرتے آج کل حیا کے اسکارف پہ کوئی تبصرہ کر دیا کرتی تھی۔ اب بھی حیا کو آتا دیکھ کر اس کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری۔

''حیا!'' اس نے زور سے آواز دی۔

حیا اسے نظر انداز کر کے تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ آج اس کی پہلی کلاس ٹالی کے ہی ساتھ تھی۔

"Haya! What Colour is your hair today? blue?"

حیا بنا کچھ کہے اندر کی جانب بڑھ گی۔ پیچھے سے آتے قہقہے کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا، آج کل جہاں ان لڑکیوں سے سامنا

ہوتا، وہ اسے تمسخر سے عرب لڑکی کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ بدتمیز نہ ہوں تو......

آج وہ بنا اسکارف اُتارے کلاس میں چلی آئی اور دوسری قطار میں، بہت اعتماد سے بیٹھ گئی۔ چند ہی لمحوں بعد ثالی اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

''تم نے اسکارف نہیں اُتارا؟ کیا ابھی سب کے سامنے اُتارو گی؟''۔

جواباً اس نے بہت اعتماد سے مسکرا کر ثالی کو دیکھا۔

''دیکھتے ہیں!'' جتانے والے انداز میں کہہ کر وہ کتابیں جوڑنے لگی۔ اندر سے اس کا دل بھی عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔ آج کیا ہوگا؟ وہ اسے نکال دیں گے کیا؟۔

پروفیسر ہابر صاحت نے ابھی لیکچر شروع بھی نہیں کیا تھا کہ ان کی نگاہ حیا پہ پڑ گئی۔

''مس...... میرا نہیں خیال آپ کو کلاس روم میں اسکارف کرنے کی اجازت ہے''۔ وہ براہِ راست اسے مخاطب کر کے بولے۔

بہت سے طلباء و طالبات گردنیں موڑ کر اسے دیکھنے لگے، جو ساری بڑی بڑی باتیں، احادیث، آیات، اقوال اس نے اس موقع کے یاد کر رکھے تھے، وہ سب اسے بھول گئے۔ اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ وہ بالکل خالی خالی نگاہوں سے پروفیسر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ثالی بھی مسکراہٹ دبائے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مس...... آپ ہیڈ کورنگ ریموو کریں''۔ انہوں نے دہرایا۔

''جو اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لیے راستہ نکال دیتا ہے''۔

عائشے نے ایک دفعہ کہا تھا مگر اسے سارے راستے بند نظر آ رہے تھے۔ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، تب ہی پیچھے سے کوئی ترک لڑکی بول اُٹھی۔

''سر! یہ ایکسچینج اسٹوڈنٹ ہے۔ مہمان اور بیرول مہمانوں پہ اپلائی نہیں ہوتا''۔ اس نے جلدی سے اپنے پروفیسر کو کچھ یاد دلایا تھا۔

''اوہ سوری، آپ مہمان ہیں؟ پلیز تشریف رکھیے''۔ پروفیسر بہت شائستگی سے معذرت کر کے لیکچر شروع کرنے لگے۔

ثالی کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ حیا نے ایک نظر اسے دیکھا اور دھیرے سے مسکرائی، پھر گردن موڑ کر پیچھے اپنی محسنہ کو دیکھنا چاہا، لیکچر شروع ہو چکا تھا، تمام سر جھکنے لگے تھے۔ وہ اس لڑکی کو دیکھ نہیں پائی، سو چہرہ واپس موڑ لیا۔ اس کے دل و دماغ سن سے ہو چکے تھے۔ کسی خواب کی سی کیفیت میں اس نے لکھنا شروع کیا۔ سب اتنا آسان ہوگا، اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

''یہیں رکھا تھا، کہاں جا سکتا ہے''۔ وہ ویک انڈ پہ بیوک ادا آئی تھی اور اب عائشے اور بہارے کے ساتھ مل کر ساری اسٹڈی چھان کر مایوسی سے کہہ رہی تھی۔ ''وہ بہت قیمتی تھا۔ میں اسے کھونے کی متحمل نہیں ہو سکتی''۔

ساتھ کھڑی بہارے کا چہرہ زرد اور سر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت دھیرے سے چل رہے تھے آج۔ شاید وہ بیمار تھی۔

''تمہیں کیا ہوا بہار کا پھول؟'' وہ بہارے کا یہ پژمردہ انداز کافی دیر سے محسوس کر رہی تھی، سو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

بہارے نے گردن اُٹھا کر خالی خالی، خاموش نظروں سے اسے دیکھا۔

''وہی پرانا مسئلہ، صبح بہارے کو ایک سیپ ملا، جس میں موتی نہیں تھا، حالانکہ مجھے تو آج ایک بھی سیپ نہیں ملا''۔ عائشے اپنے گھر سے پزل باکس کھو جانے پہ بہت اُداس تھی۔

''اب میرے سیپ سے موتی کبھی نہیں نکلے گا''۔ بہارے بڑبڑائی۔ وہ دونوں محسوس کیے بنا اسٹڈی ٹیبل کے دراز کھول کھول کر دیکھ رہی تھیں۔

''وہ باکس عبدالرحمٰن کے ہاتھ نہ لگ جائے، مجھے اسی بات کا ڈر ہے۔ وہ باکس اس کو نہیں ملنا چاہیے عائشے!''۔

بہارے کی جھکی گردن مزید جھک گئی۔

''ملازمہ کبھی چوری نہیں کرتی، اس نے بھی باکس نہیں دیکھا۔ کہاں ڈھونڈیں''۔

حیا تھکے تھکے سے انداز میں کرسی پہ گر سی گئی۔ اس کا دل بہت بُرا ہو رہا تھا۔

"آئی ایم سوری حیا!" عائشے نے آزردگی سے کہا۔ اسی پل کمرے میں دبی دبی سسکیاں گونجنے لگیں۔ حیا نے چونک کر بہارے کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہولے ہولے رو رہی تھی۔

"بہارے! کیا ہوا؟" وہ دونوں بھاگ کر اس کے پاس آئیں۔ بہارے نے بھیگا چہرہ اُٹھایا۔

"وہ باکس عبدالرحمٰن کے پاس ہے۔ اس نے مجھے تمہیں بتانے سے منع کیا تھا"۔

"کیا؟" وہ سانس لینا بھول گئی۔ عائشے خود ششدر سی کھڑی رہ گئی۔

"مگر مجھے پتا ہے کہ اس نے وہ کدھر رکھا ہے۔ میں تمہیں لا دیتی ہوں"۔ بہارے ایک دم اُٹھی اور باہر بھاگ گئی۔ وہ دونوں ساکت، ششدر سی اپنی جگہ کھڑی تھیں۔

پانچ منٹ بعد ہی بہارے واپس آئی تو اس کا بھیگا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پزل باکس تھا۔ وہ حیا کا پزل باکس ہی ہے، اس میں کوئی شک نہیں تھا۔

"یہ لو، تمہاری امانت"۔ اس نے باکس حیا کی طرف بڑھایا۔

"بہارے گل! حیا سلیمان تم سے بہت پیار کرتی ہے"۔ اس نے بے اختیار جھک کر اس ننھی پری کے دونوں گال چومے"۔ اور تم اس کو ڈانٹنا مت۔ سچ بولنے پہ کسی کو ڈانٹا نہیں کرتے"۔ اس نے ساتھ ہی عائشے کو کہہ دیا تھا، جو بہارے سے ذرا سی خفا لگ رہی تھی، مگر اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔

آنے کسی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد وہ حیا کو واپس چھوڑنے کے لیے گھر سے نکل آئیں۔ بہارے قریبی کلب سے عبدالرحمٰن کا گھوڑا لے آئی تھی اور اب اس پہ بیٹھی ان دونوں کے عقب میں چلی آ رہی تھی۔

"اسے عبدالرحمٰن نے رائیڈنگ سکھائی ہے۔ بہارے سے اچھی رائیڈنگ پورے ادالار میں کوئی بھی نہیں کر سکتا"۔

وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔ عبدالرحمٰن کا نام وہ آخری نام تھا، جو اس وقت وہ سننا چاہتی تھی۔ اس نے اس کا باکس کیوں رکھا، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"تم پہ یہ اسکارف بہت اچھا لگتا ہے حیا! اسے کبھی مت چھوڑنا"۔

"نہیں چھوڑوں گی۔ میں سبانجی سے جیت گئی، میں اتاترک سے جیت گئی، مجھے اور کیا چاہیے"۔

"تمہیں کچھ بھی چھوڑنا پڑے، اسے مت چھوڑنا!" عائشے نے دہرایا۔ حیا نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

ان کے عقب میں گھوڑے کی پیٹھ پہ بیٹھی بہارے نے اچنبھے سے عائشے کو دیکھا تھا۔ اس کی بہن اتنے اصرار سے اپنی بات دُہراتی تو نہیں تھی، پھر اب کیوں؟

☆ ☆ ☆

معتصم نے جلی ہوئی اطراف والے پزل باکس کو الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر ایک بڑے ڈبے کی طرف اشارہ کیا، جو اس کے ساتھ گھاس پہ پڑا تھا۔

"پہلے فلوٹیلا کے لیے فنڈ دو"۔

"اوہ شیور!" وہ گھاس پہ بیٹھتے ہوئے پرس سے پیسے نکالنے لگی۔ چند نوٹ ڈبے کی درز میں ڈال کر اس نے دیکھا، اس پہ جلی حروف میں لکھا تھا۔

"فریڈم فلوٹیلا 2010"۔

وہ مئی 2010 تھا اور اسی ماہ کے آخر تک فلوٹیلا نے غزہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ یہ بات اب تک فلسطینی بہت دفعہ دُہرا چکے تھے۔

گھاس کے آگے مصنوعی جھیل دوپہر کی کرنوں سے چمک رہی تھی۔ معتصم اس چمکتی دھوپ میں باکس پکڑے کافی دیر تک اسے

اُلٹ پلٹ کر کے دیکھتا رہا۔

''یقین کرو! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا مگر اس ''ہومر'' والی پہیلی کو حل کرنا آسان ہوگا۔ٹھہرو! کوشش کرتے ہیں''۔اس نے جلی لکڑی پہ لکھے سنہرے حروف پڑھے۔

Marked on homer's doubts

A Stick with twin sprouts

''ہومر وہی فلسفی تھا نا جس کے بارے میں ہراقلیطس نے کہا تھا کہ اسے درے مارے جانے چاہئیں؟''۔

اس کے کہنے پہ معتصم نے سر اُٹھا کر خفگی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ شانے اُچکا کر رہ گئی۔ یونانی فلسفہ وہ آخری شے تھی جو اسے دلچسپ لگتی تھی مگر شاید میجر احمد کا حساب اُلٹا تھا۔

''ہومر کے شبہات پہ نشان زدہ اسٹک۔ یہاں کسی نشان کی بات ہو رہی ہے۔ہومر کے شبہات ،مگر کیسے شبہات؟''وہ سوچنے لگا۔

''معتصم! نشان تو کسی کے لکھے ہوئے کام پہ ہی لگایا جاسکتا ہے نا،تو کیا ہومر کے لکھے ہوئے کام میں کسی کے شکوک و شبہات کا ذکر ہے؟''۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا،مگر اس کے اپنے کام میں جو حصہ بعد میں آنے والے ناقدین کو مشکوک لگتا ہے،اسے مارک ضرور کیا گیا ہے''۔

''کیسے مارک کیا گیا ہے؟''۔وہ چونکی۔''کسی خاص نشان سے؟''۔

''مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ ہومر کے کام میں مشتبہ حصہ ہوتا ہے،اس پہ Obelus کا نشان لگا کر مارک کیا جاتا ہے''۔

''Obelus کیا ہوتا ہے؟''۔

''تمہیں اوبلس کا نہیں پتا؟ یہ ہوتا ہے اوبلس!''اس نے رجسٹر کے صفحے پہ ایک سیدھی لکیر کھینچی اور اس کے اوپر اور نیچے ایک ایک نقطہ لگا دیا۔

''یہ تو تقسیم کا سمبل ہے۔اس طرح کہونا''۔اس نے پزل باکس کی سلائیڈ اوپر نیچے کیں،یہاں تک کہ پورا لفظ''اوبلس'' لکھا گیا مگر باکس جامد رہا۔

''یہ صرف پہلی پہیلی کا جواب ہے حیا! ہمیں ان چاروں کے جواب تلاش کر کے ان میں سے مشترک بات ڈھونڈنی ہے''۔اس نے یاد دلایا۔

حیا نے بددلی سے پزل باکس اسے تھما دیا۔ وہ اس وقت خود کو بہارے کی طرح محسوس کر رہی تھی،اپنے تحفے کے اتنے قریب مگر اتنی ہی دور اور بے بس۔ بہت بے بس۔

☆ ☆ ☆

شام کا اندھیرا استقلال اسٹریٹ پہ اُتر آیا تھا۔گلی کی رونق اور روشنیاں اپنے عروج پہ تھیں۔وہ اور ہالے کافی دنوں بعد استقلال اسٹریٹ آئی تھیں۔ امتحان قریب تھے سو نکل ہی نہیں پائی تھیں۔اب نکلیں تو ڈی جے کی یادیں تازہ ہوگئیں۔خریدا انہوں نے کچھ نہیں،بس ونڈو شاپنگ کرتی رہیں۔وہ آٹھ بجے والے گورسل سے آئی تھیں۔گورسل کو واپس رات کے ڈیڑھ بجے جانا تھا،سو تب تک ان کا ارادہ خوب اچھی طرح سے جدیسی میں گھومنے کا تھا۔

''پہلے تو برگر کنگ میں ڈنر کر لیتے ہیں،ٹھیک؟''وہ اس روز کے بعد جہان سے بھی نہیں ملی تھی،سو چاہا اب مل لے۔

''تمہاری صلح ہوگئی اس سے؟''وہ برگر کنگ کے دروازے پر تھیں۔ جب ہالے نے پوچھا۔حیا نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا، پھر ہنس دی۔

''وہ بات تو بہت پرانی ہوگئی۔اب تک بہت کچھ بدل چکا ہے''۔وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔سیاہ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور اس میں دمکتا اس کا چہرہ بہت مطمئن لگ رہا تھا۔

"ہاں! لگ تو رہا ہے"۔ ہالے شرارت سے مسکرائی۔
حیا نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کیا۔ پلاٹینم رنگ رات کی مصنوعی روشنیوں میں چمک رہی تھی۔
"واٹ؟ تمہاری جہان سکندر سے منگنی ہوگئی اور تم نے مجھے بتایا نہیں؟" ہالے خوش گوار حیرت سے کہہ اٹھی۔ وہ دونوں ریسٹورنٹ کے دروازے میں کھڑی تھیں۔ اطراف میں لوگ آ جا رہے تھے۔
"مگر ہماری شادی منگنی سے پہلے ہوئی تھی۔ یہی کوئی بیس، اکیس سال پہلے۔ لمبی کہانی ہے، ڈنر کے بعد سناؤں گی"۔ وہ جلدی سے ہالے کا بازو تھامے اندر چلی آئی۔ آج اس نے وہی سرخ ہیل پہن رکھی تھی اور ذرا احتیاط سے چل رہی تھی۔
"جہان تو چھ بجے آف کر گیا تھا۔ ابھی گھر پہ ہوگا"۔ وہاں کام کرنے والے لڑکے نے بتایا۔ اسے مایوسی ہوئی مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
"مجھے پوری کہانی سناؤ۔ تم نے اتنی بڑی بات نہیں بتائی؟" ہالے پُر جوش بھی تھی اور سارا قصہ سننے کے لیے بے تاب بھی۔
"چلو! تاقسم چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر سناتی ہوں"۔ وہ ہنس کر بولی۔
چند قدم کا تو فاصلہ تھا۔ باتوں میں ہی کٹ گیا۔ وہ اسکوائر پہ آئیں تو شام میں ہوئی بارش سے گیلی سڑک ابھی تک چمک رہی تھی۔ حیا نے بے اختیار اپنے پاؤں کو دیکھا۔
"یہیں ٹوٹی تھی میری ہیل"۔ اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اپنی مرمت شدہ ہیل کو دیکھا۔ لکڑی کی بہت باریک ہیل اب بالکل ٹھیک لگ رہی تھی۔ پھر کتنا خوار کرایا تھا اس نے اس دن۔ سرخ ہیل، سرخ کوٹ، برستی بارش۔ اسے بہت کچھ یاد آیا تھا۔
"آؤ پارک میں چلتے ہیں"۔ ہالے اسے بلا رہی تھی مگر وہ اسی طرح کھڑی سر جھکائے اپنی ہیل کو دیکھ رہی تھی۔ لمحے بھر کو اس کے گرد جگمگاتا اسکوائر ہوا میں تحلیل ہوگیا۔ ساری آوازیں بند ہوگئیں۔ وہ بالکل ساکت کھڑی اپنی ہیل دیکھ رہی تھی۔
یہیں ٹوٹی تھی اس کی ہیل۔ یہیں...... یہیں

Snapped there a blooded pine

بلڈڈ؟ یعنی خون...... مگر خون سرخ ہوتا ہے۔ سرخ لکڑی...... لکڑی کی ہیل......

Split there some tears divine

اس کی متحیر نگاہوں نے تاقسم اسکوائر کا احاطہ کیا۔
آفاقی آنسو، آسمان کے آنسو...... بارش۔ نہریں "تقسیم" ہوتی تھیں اس جگہ۔

Round the emerald crusified

اس کی نظریں مجسمے کے گرد پھیلے گھاس کے قطعہ اراضی پہ جم گئیں، جنہیں دو گزرگاہیں صلیب کے نشان کی طرح کاٹ رہی تھیں۔ زمرد گھاس جو مصلوب تھی۔

And the freedom petrified

ساکن ہوئی، پتھر بنی آزادی۔ یقیناً مجسمہ آزادی
...... اتاترک کا مجسمہ استقلال یمینی

A love lost in symbolic smell

پیار جو کھو گیا؟
"ڈی جے......" اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا۔ ادھر ساتھ استقلال جدیسی میں ڈی جے گری تھی اور روز تاقسم اسکوائر میں ٹیولپس کی مہک پھیلی تھی۔ علامتی خوشبو...... ٹیولپس جو استنبول کی علامت تھے۔

Under which the lines dwell

اس جگہ کے نیچے کیا تھا؟ لکیریں نہیں، لائنز۔ ہاں! میٹرو لائنز، ریلوے لائنز۔ نیچے ریلوے اسٹیشن تھا۔

ایک ایک کر کے پزل کے سارے ٹکڑے جڑتے جا رہے تھے۔

Obelus کا نشان کس چیز کا نشان تھا بھلا؟

"حیا.....! یہ آدمی ہمیں فالو کر رہا ہے"۔ ہالے نے اس کا بازو جھنجھوڑا۔ وہ ہالے کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ کسی خوابیدہ کیفیت میں۔ وہ بڑبڑائی۔

"Taksim پورے چھ حروف"۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، اس نے پزل حل کر لیا تھا۔

"حیا.....! یہ آدمی ہمارے پیچھے آ رہا ہے"۔ ہالے کی آواز میں ذرا سی گھبراہٹ تھی۔ وہ جیسے کسی خواب سے جاگی اور پلٹ کر دیکھا۔

سڑک کے اس پار کھڑا شخص اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ ایک دم برف کا مجسمہ بن گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

وہ اس چہرے کو کیسے بھول سکتی تھی؟

عبدالرحمٰن پاشا۔

آنے کے ساتھ اور انفرادی کتنی ہی تصویروں میں وہ اسے دیکھ چکی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر جس شناسائی سے مسکرایا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے۔

"چلو! واپس اسٹریٹ میں چلتے ہیں"۔ وہ ہالے کا ہاتھ تھامے تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ لوگوں کے رش میں سے جگہ بناتے، تیز تیز قدموں سے فٹ پاتھ پہ چلتے ہوئے وہ دونوں اس شخص سے دور جا رہی تھیں۔ جب حیا کو یقین ہو گیا کہ وہ ان کو کھو چکا ہے، تو اس طرح ہالے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ایک کافی شاپ میں آ گئی۔

"پتا نہیں کون تھا"۔ انہوں نے ایک کونے والی میز کا انتخاب کیا تھا۔ ہالے دو مگ گرما گرم کافی کے لے آئی اور اب وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی، اس آدمی کے بارے میں تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔

"ہاں! پتا نہیں کون تھا؟" اس نے لاتعلقی سے شانے اچکائے اور گرم کپ لبوں سے لگایا۔ ایک دم ہی کافی کا گھونٹ کسی تلخ زہر کی طرح اس کی گردن کو جکڑ گیا۔ اسے سامنے سے پاشا آتا دکھائی دیا تھا۔ وہ کافی شاپ میں کب داخل ہوا، انہیں پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"ہالے وہ ادھر ہی آ گیا"۔ اس نے سراسیمگی کی سی کیفیت میں کپ نیچے کیا۔ ہالے نے پریشانی سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ عین ان کے سر پہ آ پہنچا تھا۔

"کیا میں آپ کو جوائن کر سکتا ہوں مسز جہان سکندر؟" کرسی کی پشت پہ ہاتھ رکھ کر کھڑے اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ لمبی سرمئی برساتی میں ملبوس، وہ اچھا خاصا لحیم شحیم آدمی تھا۔ فریم لیس گلاسز کے پیچھے سے چھلکتی آنکھوں میں واضح مسکراہٹ تھی۔ وہ لمحہ ملاقات جس سے اس کو کبھی ڈر نہیں لگا تھا، اس وقت بے حد خوف زدہ کر گیا تھا۔

"جی! ضرور بیٹھیے"۔ اس نے کپ پہ اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بظاہر مسکرا کر کہا۔

ہالے نے اسے آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا تھا۔ حیا نے سمجھ کر سر کو اثبات میں ذرا سی جنبش دی۔ جیسے ہی وہ کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا، حیا نے گرما گرم کافی اس کے چہرے پہ الٹ دی۔

☆.....☆.....☆

باب 8

پاشا کے لیے یہ حملہ قطعاً غیر متوقع تھا۔ گو کہ ردعمل کے طور پر اس نے چہرہ فوراً پیچھے کیا تھا، اس کے باوجود کافی اس کے رخسار کو جھلسا گئی تھی۔

"تھبک ،تھبک ۔" (جلدی، جلدی) ہالے نے اس کا ہاتھ تھاما اور دوسرے ہی لمحے وہ دونوں باہر بھاگی تھیں۔

کافی گرم تھی، اور اس نے پاشا کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔ وہ بلبلا کر چہرہ ہاتھوں سے صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرے گاہک اور ویٹرز اس کی جانب لپکے تھے۔ یہ وہ آخری منظر تھا جو حیا نے باہر نکلنے سے پہلے دیکھا تھا۔

"وہ نہیں آ رہا، جلدی چلو!" گلی میں لوگوں کے رش میں سے رستہ بناتے ہوئے تیز قدموں سے دوڑتے، ہالے بار بار گردن موڑ کر دیکھتی تھی۔

"برگر کنگ سامنے ہی ہے، جلدی سے اس میں چلے جاتے ہیں، اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلے۔"

"مگر تمہیں اس پہ کافی الٹنے کی کیا ضرورت تھی؟" ہالے جھنجھلائی۔

(کچھ پرانے حساب اتارنے تھے۔)

"تم خود ہی تو میرے کپ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ کپ چھوڑو اور باہر نکلو۔"

وہ مزید بحث کیے بنا ہاتھ سے ہالے کو ساتھ کھینچتی برگر کنگ کا گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ وہ دونوں ایسے اندھا دھند طریقے سے دوڑتی آئی اور استقبالیہ کاؤنٹر پہ آ کر دم لیا کہ وہاں موجود لڑکا قدرے بوکھلا گیا۔

"کیا ہوا؟ جہان نہیں ہے ادھر۔" وہ سمجھا وہ دوبارہ جہان کے لیے آئی ہیں۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!" حیا نے پھولے تنفس کے درمیان ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "تمہارے کچن میں کوئی دروازہ ہے جو پچھلی گلی میں کھلتا ہے؟"

"کچن میں نہیں، مگر پینٹری میں بیک ڈور ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔" شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ دونوں کسی سے بچنا چاہ رہی ہیں، سو بنا کوئی مزید سوال کیے وہ انہیں اپنی رہنمائی میں پینٹری میں لے آیا۔

پینٹری مستطیل سی تھی اور اس میں اسٹوریج شیلف اور بڑے بڑے فریزر رکھے تھے۔ کچھ دوسرا کاٹھ کباڑ بھی تھا۔

"وہ رہا دروازہ۔" اس نے ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا اور ایک مشکوک نظر ان پہ ڈالتا واپس پلٹ گیا۔

ہالے نے پینٹری سے کچن میں کھلنے والا دروازہ بند کیا اور پھر قدرے تذبذب سے پچھلی گلی کے دروازے کو دیکھا۔

"ابھی باہر نکلنے کا فائدہ؟ گورسل تو ڈیڑھ بجے آئے گی تب تک یہیں بیٹھتے ہیں۔" وہ ایک کونے سے دو پلاسٹک کی کرسیاں اٹھا لائی اور کمرے کے وسط میں فرش پہ آمنے سامنے رکھیں۔

"ویسے اب میں سوچ رہی ہوں کہ تم نے ٹھیک ہی کیا، استقلال جدیسی میں اکثر ایسے ڈرنک لوگوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے جو عجیب حرکتیں کرتے ہیں۔"

"تب ہی میں نے کافی الٹی، تا کہ وہ فوراً ہمارے پیچھے نہ آ سکے۔"

وہ کرسی پہ نہیں بیٹھی، بلکہ دروازے کے قریب چلی آئی تھی۔ دروازے کے ساتھ ایک چوکور کھڑکی نما روشن دان تھا۔ وہ بہت اونچا نہیں تھا، بلکہ حیا کے چہرے کے بالکل برابر آتا تھا۔ اس نے روشن دان کی شیشے کی سلائیڈ ایک طرف کی تو ٹھنڈی ہوا اور پچھلی گلی کی آوازیں

اندر آنے لگیں۔

وہ استقلال اسٹریٹ کی بغلی گلی تھی۔ استقلال اسٹریٹ کی دونوں جانب ایسی ہی گلیاں تھیں جو ذرا تنگ اور چھوٹی مگر دونوں اطراف سے عمارتوں سے گھری تھیں۔

''اب تم مجھے بتاؤ، یہ منگنی کا کیا قصہ ہے؟'' ذرا سکون کا سانس ملا تو ہالے کو ادھوری بات یاد آ گئی۔ وہ پرجوش سی کرسی پہ آگے ہو کر بیٹھی۔

حیا نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ جو تناؤ اور پریشانی وہ تھوڑی دیر قبل محسوس کر رہی تھیں، وہ پینٹری کی فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔

''بتاتی ہوں۔'' وہ کرسی پہ آ بیٹھی اور گورسل شٹل آتے تک وہ سارا قصہ سنا چکی تھی۔ بس میں بھی سارا راستہ وہ دونوں یہی باتیں کرتی رہیں۔

''اگر وہ جانتا تھا تو اس نے پہلے اظہار کیوں نہیں کیا؟''

''اب کر دیا، یہی بات ہے۔ وہ بہت پریکٹیکل اور کم گو سا آدمی ہے۔ اس سے وابستہ توقعات میں نے اب کم کر دی ہیں۔'' اس نے شانے اچکا کر کہا تھا۔

کمرے میں آ کر ہالے تو سونے چلی گئی۔ ٹالی اور چیری بھی تب تک سو چکی تھیں۔ جبکہ اس نے پہلے تو اپنی میز کی دراز میں اس ڈبیا کی تصدیق کی جس میں موبائل شاپ کے لڑکے نے جی پی ایس ٹریسر ڈال کر دیا تھا۔ وہ دراز میں ہی رکھی تھی، جہاں وہ چھوڑ کر گئی تھی، پھر پاشا کو کیسے پتا چلا کہ وہ کہاں ہے؟ ہو سکتا ہے اس کی کسی اور شے میں بھی ٹریسر ہو، یا پھر وہ محض اتفاق ہو، لیکن اس کے اتفاقات تو کم ہی ہوتے تھے، اتنا تو اسے یقین تھا۔

جو بھی ہے، وہ ہر شے کو ذہن سے جھٹک کر اپنا پزل باکس نکال کر دبے قدموں باہر آ گئی۔ بالکونی کی بتی اسے دیکھتے ہی جل اٹھی۔ وہ وہیں پہلے زینے پہ بیٹھ گئی اور پزل باکس چہرے کے سامنے کیا۔

چاروں پہیلیاں ایک چوکور کی صورت میں باکس کی چاروں اطراف پہ لکھی تھیں۔ چوکور اسکوائر، تاقسم اسکوائر۔

دھڑکتے دل اور نم ہتھیلیوں کے ساتھ وہ سلائیڈز اوپر نیچے کرنے لگی۔ Taksim کا آخری حرف ایم جیسے ہی جگہ پہ آیا۔ کلک کی آواز کے ساتھ باکس کی دراز اسپرنگ کی طرح باہر نکلی۔

وہ بنا پلک جھپکے بے یقینی سے باکس کے اندر دیکھ رہی تھی۔ اس نے میجر احمد کا پزل حل کر لیا تھا۔ وہ باکس کھول چکی تھی۔

دراز میں ایک سفید مستطیل کاغذ رکھا تھا۔ وہ کاغذ پوری دراز پہ فٹ آ رہا تھا۔ اس نے دو انگلیوں سے پکڑ کر کاغذ باہر نکالا۔ بالکونی کی مدھم روشنی میں وہ کاغذ پہ لکھی تحریر بنا کسی دقت کے پڑھ سکتی تھی۔

Two full stops under the key

(چابی کے نیچے دو فل اسٹاپس)

اس نے بے یقینی سے وہ سطر پڑھی جو کاغذ کے اوپری حصے پہ لکھی تھی۔ کیا یہ کوئی مذاق تھا۔ اپریل فول؟ اس کاغذ کے ٹکڑے کے لیے اس نے اتنی محنت کی؟

کاغذ کے چاروں کونوں میں چھوٹا چھوٹا سا چھ (6) کا ہندسہ بھی لکھا تھا۔ اس نے کاغذ پلٹا۔ اس کی پشت پہ بالکل وسط میں ایک بارکوڈ چھپا تھا۔ موٹی پتلی ایک انچ کی لکیریں اور ان کے نیچے ایک سیریل نمبر، شیمپوز، لوشن اور ان گنت دوسری اشیا کے لفافوں اور ڈبوں کے کونوں میں اکثر ایسے ہی بارکوڈ چھپے ہوتے تھے۔ اس بارکوڈ کا وہ کیا کرے گی؟

مگر نہیں، باکس میں کچھ اور بھی تھا۔

دراز کی زمین سے ایک لوہے کی لمبی اور عجیب وضع کی چابی چپکی تھی۔ اس نے دو انگلیوں سے چابی کو کھینچا تو وہ جو گوند کے محض ایک قطرے سے چپکائی گئی تھی، اکھڑ کر حیا کے ہاتھ میں آ گئی۔ حیا نے دیکھا، چابی کے نیچے موجود لکڑی پہ دو موٹے موٹے نقطے لگے تھے اور ان کے درمیان لکھا تھا۔ "Emanet"

پھر کوئی پزل؟ پھر پہیلیاں؟ چابی تلے دو قفل اسٹاپ؟
وہ دونوں نقطے اسے حل کیے مگر اب وہ ان کا کیا کرے؟ کاش! وہ یہ سب اٹھا کر میجر احمد کے منہ پہ دے مار سکتی۔
یہ چابی کس شے کی تھی؟
کسی کمرے، کسی گاڑی، کسی گھر کی؟ اگر پہاڑ کھودنے پہ یہ مرا ہوا چوہا ہی نکلنا تھا تو بہتر تھا وہ اسے توڑ کر ہی نکال لیتی، اچھا مذاق تھا۔
اس نے خفگی سے دراز بند کی تو وہ پھر باہر نکل آئی۔ اس نے دوبارہ دراز کو اندر دھکیلا اور اسے پکڑے پکڑے سلائیڈز اوپر نیچے کیں۔ کوڈ بار کا سہ حرفی اللفظ بگڑ گیا۔ باکس پھر سے لاک ہو گیا۔ اس نے ہاتھ ہٹایا تو دراز باہر نہیں آئی۔
واپس بستر پہ لیٹتے ہوئے وہ بے حد کڑھ رہی تھی۔ ایک چابی سے کوئی اور پزل باکس کھلے گا، اس سے کوئی اور، اس سے کوئی اور......
کیا وہ ساری زندگی مقفل تالے ہی کھولتی رہے گی؟
اچھا مذاق تھا۔
پھر وہ ذہن سے یہ سوچیں جھٹک کر پاشا کے بارے میں سوچنے لگی۔ ایک مطمئن مسکراہٹ خود بخود اس کے لبوں پر بکھر گئی۔
بہت اچھا کیا اس نے کافی الٹ کر۔ وہ اسی قابل تھا۔
حقیقت میں اپنے روبرو پاشا کو دیکھتے ہوئے اسے تصاویر سے بہتر لگا تھا۔ اس کا قد کافی اونچا تھا۔ چھ فٹ سے بھی اوپر اور لباس بھی مناسب تھا۔ آنکھوں پہ بغیر فریم کی گلاسز لگائے اور ذرا، ذرا سی بڑھی شیو۔
وہ روبرو دیکھنے میں بس ایسا تھا کہ مقابل اس کی عزت کرے۔ مگر اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ہینڈسم تو وہ اسے کبھی نہیں لگا تھا، نہ ہی اس کی شخصیت میں کوئی سحر تھا۔ (جس کی باتیں بہارے کرتی تھی) وہ دیکھنے میں بس ایک درمیانے درجے کا آدمی لگتا تھا یا شاید استقلال اسٹریٹ میں چہل قدمی کرنے کے لیے اس نے خود کو ایک عام آدمی کی طرح ڈریس اپ کر کے کیموفلاج کر رکھا تھا۔ شاید یہی بات ہو۔
وہ ان ہی سوچوں میں گھری کب نیند کے سمندر میں ڈوب گئی، اسے علم ہی نہ ہو سکا۔

☆ ☆ ☆

اس نے چابی کی ہول میں گھمائی اور پھر الماری کا پٹ کھولا۔ سامنے والے خانے میں جہاں چند کاغذات کے اوپر اس نے جلی ہوئی اطراف والا پزل باکس رکھا تھا۔ اب وہ وہاں نہیں تھا۔ اس کے ذہن نے لمحوں میں کڑیوں سے کڑیاں ملائیں، اگلے ہی پل وہ پٹ بند کر کے باہر آیا تھا۔
''بہارے گل!'' سیڑھیوں کے دہانے پہ کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔
بہارے کافی دنوں سے اس آواز کی منتظر تھی، مگر عبدالرحمٰن کو اپنی مصروفیت میں الماری کھولنے کا موقع شاید آج ملا تھا۔ اس لیے اب آواز سن کر وہ جو ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی، تابعداری سے اٹھی اور سر جھکائے مؤدب انداز میں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
تیسری منزل کے دہانے پہ پہنچ کر اس نے جھکا سر اٹھایا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ابھی ابھی ہوٹل سے آیا تھا، سوٹائی کی ناٹ ڈھیلی کیے، کوٹ کے بغیر تھا۔ اسے متوجہ پا کر عبدالرحمٰن نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔
''کیا بہارے گل مجھے بتانا پسند کریں گی کہ وہ پزل باکس کہاں ہے؟''
''میں پسند کروں گی۔'' بہارے نے سادگی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں نے وہ حیا کو واپس کر دیا۔''
وہ چند لمحے کچھ کہہ ہی نہیں سکا۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا، مگر بہارے جانتی تھی کہ اسے دھچکا لگا ہے۔
''کس کی اجازت سے؟''
''وہ تمہاری چیز نہیں تھی عبدالرحمٰن! جس کی تھی، میں نے اسے دے دی۔''
وہ چند ثانیے اسے دیکھتا رہا، پھر اس کے سامنے ایک پنجے کے بل فرش پہ بیٹھا اور سیدھا بہارے کی آنکھوں میں دیکھا۔
''کیا تم نے مجھ سے رازداری کا وعدہ نہیں کیا تھا؟''

''میں رحمٰن کے بندے کو خوش کرنے کے لیے رحمٰن کو ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ میں جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔'' اس کی بڑی بڑی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''جو جتنا اچھا جھوٹ بولتا ہے بہارے! یہ دنیا اسی کی ہوتی ہے۔''

''لیکن پھر اس کی آخرت نہیں ہوتی، یہ عائشے گل کہتی ہے۔''

وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔

''پھر تو مجھے تمہارے دوسرے وعدے کا بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔''

''نہیں! ہم واقعی جزیرے پہ کسی سے تمہارے بارے میں بات نہیں کرتے۔''

''وہ نہیں، ایک اور وعدہ بھی تھا ہمارے درمیان، ہمارا لٹل سیکرٹ۔''

بہارے کے کندھوں پہ ایک دم بہت بھاری بوجھ سا آ گرا۔ اس نے اداسی سے عبدالرحمٰن کو دیکھا جو منتظر سا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بہت پہلے عبدالرحمٰن نے اس سے عہد لیا تھا کہ اگر وہ مر گیا تو وہ اسے جنازہ بھی دے گی اور اس کی میت کو اون بھی کرے گی۔

''تم سچ بولنے والی بہارے گل پہ اعتبار کر سکتے ہو۔ پورا ادالار، بلکہ پورا ترکی تمہیں چھوڑ دے، مگر بہارے گل تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گی۔''

''اور ہو سکتا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے، جب تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو۔ تم کہو، کون عبدالرحمٰن، کہاں کا عبدالرحمٰن؟''

''تم ایسی باتیں مت کیا کرو، مجھے دکھ ہوتا ہے۔''

''اور اس بارے میں بھی عائشے گل کی کوئی کہاوت ضرور ہو گی۔'' وہ ذرا سا مسکرایا۔

''اس کو چھوڑو، وہ تو بہت کچھ کہتی رہتی ہے۔ میں دوسرے کان سے نکال دیتی ہوں۔'' اس نے ناک پہ سے مکھی اڑا کر گویا عبدالرحمٰن کو زبانی وفاداری کا یقین دلایا۔ ''وہ تو مجھ سے اتنی خفا ہوئی تھی کہ میں نے تم سے شادی کی بات کیوں کی۔'' لحظہ بھر کو رک کر بہارے ذرا تشویش سے بولی۔ ''تم مجھ سے شادی کرو گے نا عبدالرحمٰن؟'' ساتھ ہی اس نے گردن موڑ کر ارد گرد دیکھ بھی لیا۔ عائشے قریب میں کہیں نہیں تھی۔

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

''مگر میں تمہاری نئی دوست میں دلچسپی رکھتا ہوں۔''

''وہ تم سے شادی کیوں کرے گی؟ وہ اپنے کزن کو پسند کرتی ہے اور اس کا کزن بہت ہینڈسم ہے۔'' بہارے کو جیسے بہت غصہ آیا تھا۔

''اور تمہاری دوست کو عبدالرحمٰن جیسا کوئی بدصورت نہیں لگتا ہو گا، ہے نا؟''

''یہ سچ ہے۔ اسے تم بالکل پسند نہیں ہو، مگر مجھے تم سے زیادہ کوئی ہینڈسم نہیں لگتا۔''

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ بہارے نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔

''سنو! وہ حیا کے پزل باکس پہ جو پہیلی کھدی تھی، وہ کس نے لکھی تھی؟'' وہ جاتے جاتے ذرا چونک کر واپس پلٹا۔

''مجھے کیسے علم ہو سکتا ہے؟ میں نے تو ابھی تک اس باکس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔''

''نہیں! دراصل میرے باکس کی پہیلی اور حیا کی پہیلی بالکل ایک سی لکھی تھیں، تب ہی حیا نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میری پہیلی کس نے لکھی ہے؟''

وہ واقعتاً چونکا تھا۔ اس نے یہ محسوس کیوں نہیں کیا؟ وہ یہ بات نظر انداز کیوں کر گیا؟

''پھر تم نے کیا کہا؟ بلکہ ٹھہرو! تم نے کہا ہو گا کہ عبدالرحمٰن کے پاس ہر کام کے لیے بہت سے بندے ہوتے ہیں۔''

بہارے کا منہ کھل گیا۔ ''تمہیں کیسے پتا؟''

''بہارے گل! میں تمہاری سوچ سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے تمہیں جانتا ہوں۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں۔ بہارے نے آزردگی سے اسے جاتے دیکھا۔ وہ اس سے خفا تھا، وہ جانتی تھی مگر عائشے کہتی تھی، بندہ خفا ہو جائے، خیر ہے، بس رحمٰن خفا نہ ہو۔

''اف!'' اس نے سر جھٹکا۔ ''عائشے گل کی کہاوتیں!!''

☆ ☆ ☆

آڈیٹوریم اسٹوڈنٹس سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ باسکٹ بال کا میچ جاری تھا۔ کورٹ میں لڑکے نارنجی گیند اچھالتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ تماشائیوں کی نگاہیں بھی گیند پہ لگی تھیں۔ مخصوص شور، ہنگامہ اور رش۔

حیا ان سب سے بے نیاز، اپنا بیگ تھامے کرسیوں کی قطاروں کے درمیان...... رستہ بناتی آگے بڑھ رہی تھی۔ امتحان قریب تھے اور ان دنوں وہ اتنی مصروف رہی تھی کہ معتصم سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ابھی لطیف نے بتایا کہ وہ آڈیٹوریم میں ہے تو وہ یہاں آ گئی۔ ویسے بھی اب وہ فلسطینی لڑکوں سے بات چیت میں ذرا احتیاط کرتی تھی۔

نہیں، وہ تو ویسے ہی ڈیسنٹ اور بھائیوں جیسے تھے، مگر وہ وہی نہیں رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ اسکارف لیتی ہے، سو اس کے نام کے ساتھ کوئی غلط بات جڑی تو بدنام اس کا اسکارف ہوگا۔ اس لیے اس کی کوشش ہوتی کہ وہ معتصم یا حسین وغیرہ سے تنہائی میں نہ ملے بلکہ کسی ایسی جگہ پہ ملے، جہاں سب سامنے ہی ہوں۔

وہ تیسری قطار میں بیٹھا تھا۔ نگاہیں کھیل پہ مرکوز کیے، کرسی پر آگے ہو کر بیٹھا وہ میچ کی طرف متوجہ تھا۔ اس کے بائیں طرف دو کرسیاں خالی تھیں۔ وہ ایک کرسی اپنے اور اس کے درمیان چھوڑ کر بیٹھ گئی اور بیگ سے پزل باکس نکال کر اس کے سامنے کیا۔ وہ چونکا۔

''میں نے اسے کھول لیا۔ اس کا کوڈ ''نامحرم'' تھا۔ کیا تم آگے میری مدد کر سکتے ہو؟''

''اوہ سلام! ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔'' معتصم نے دراز کھولی اور کاغذ پہ لکھی تحریر پڑھی، پھر اسے پلٹا۔

''بارکوڈ؟ بارکوڈ تو اشیاء کے پیکٹس پہ لگا ہوتا ہے، اسے کوئی مشین ہی ڈی ٹیکٹ کرتی ہے۔ یہ بارکوڈ بھی کسی مشین کے لیے ہے تاکہ وہ اسے پہچانے، مگر کدھر؟ ہوں...... شاید اس سطر سے کوئی مدد ملے۔'' وہ پھر سے کاغذ پلٹ کر سطر پڑھنے لگا، پھر نفی میں سر ہلا کر دراز سے چابی اٹھائی۔

''بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ یہ سطر اس چابی تلے لکھے دو نقطوں اور اس لفظ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔''

''اور یہ لفظ کسی تالے کی طرف اشارہ کر رہا ہے، ویسے emanet کہتے کسے ہیں؟'' اس نے ذرا الجھن سے پوچھا۔

''یہ امانت ہے نا، ہمارا والا امانت، ترک میں بھی اس کو یہی کہتے ہیں۔ اس نے بے اختیار گہری سانس اندر کھینچی۔

ایک تو ترک اور اردو کی مماثلت!

''مجھے یہ لگتا ہے حیا! کہ اس نے تمہاری کوئی امانت کہیں لاک لگا کر رکھی ہے اور اس کی چابی تمہیں دی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی عظیم الشان ساحل ہو یا کوئی برانڈ نیو گاڑی۔'' وہ اپنی بات پہ خود ہی دھیرے سے ہنسا۔

''مجھے ایسا کچھ بھی نہیں لگتا۔''

''ہو سکتا ہے اس باکس میں کوئی نادیدہ لکھائی ہو اور آنچ دکھانے سے......''

''میں کوشش کر چکی ہوں۔ اس ایک لفظ امانت کے سوا اس میں کچھ نہیں لکھا ہے۔'' اس نے باکس میں ساری چیزیں واپس ڈالیں اور اسے بند کر کے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ معتصم مزید اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا، اب جو بھی کرنا تھا، اسے خود کرنا تھا۔

''امتحانوں کے بعد کچھ سوچوں گی۔ ابھی تو اس قصے کو بند ہی کر دیتے ہیں۔'' جواباً معتصم نے مسکرا کر شانے اچکا دیے۔

وہ آڈیٹوریم سے نکل رہی تھی جب اس کا موبائل بجا۔ اماں اس وقت تو فون نہیں کرتی تھیں، پھر؟ اس نے بیگ سے موبائل نکال کر دیکھا۔ یہ وہی پاکستان کا نمبر تھا جس سے پہلے بھی میجر احمد نے فون کیا تھا۔

''ہیلو!'' کرسیوں کی قطار سے راستہ بناتے وہ ذرا اونچا بولی تھی۔ ارد گرد کے شور میں میجر احمد کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔

''السلام علیکم! کیسی ہیں آپ حیا؟'' وہی نرم، خوبصورت، ٹھہرا ہوا انداز۔ اب وہ اس سے چڑتی نہیں تھی بلکہ ذرا احتیاط سے بات کر ہی لیتی تھی۔

"وعلیکم السلام! میری خیریت تو آپ کو پتا لگتی ہی رہتی ہوگی۔" وہ باہر کاریڈور میں تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔ جواباً وہ دھیرے سے ہنسا۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ آپ کو لگتا ہے، مجھے آپ کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے؟"

"مجھے لگتا تو خیر یہی ہے کہ آپ کو اور پاشا کو میرے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔"

"غصے میں ہیں، خیریت؟"

"کوئی مذاق کر رہے ہیں آپ میرے ساتھ؟ میں کتنی پہیلیاں بوجھوں؟" اس نے زچ سے انداز میں کہتے ہوئے اپنا بیگ اتار کر سبانجی کی عمارت کی بیرونی سیڑھیوں پہ رکھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔ بعض چیزیں اتنی حساس ہوتی ہیں کہ انہیں بہت راز داری سے کسی کے حوالے کرنا پڑتا ہے، تاکہ وہ غلط شخص کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ویسے ایک گھنٹے کا کام تھا، آپ نے ہی اتنے دن لگا دیے۔"

خیر! آپ کا پزل تو میں حل کر ہی لوں گی، مگر کیا گارنٹی ہے کہ آخر میں مجھے 'اپریل فول' کے الفاظ نہیں ملیں گے؟" وہ وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی تھی۔ استنبول کی دھوپ ارد گرد سبزہ زار کو سنہری پن عطا کر رہی تھی۔

اتنا غیر سنجیدہ سمجھتی ہیں آپ مجھے؟

"کیوں؟ کیا آپ ہی نہیں ہیں جو خواجہ سرا بن کر مجھ سے ملے تھے؟ کبھی شرمندگی نہیں ہوئی آپ کو اس بات پہ؟"

"شرمندگی کیسی؟ میں خواجہ سرا بن کر آپ سے ملا ہی تھا، خواجہ سرا بن کر کوئی محفل تو نہیں لگائی تھی۔" وہ شاید برا مان گیا تھا۔

"مگر خواجہ سرا بننا بذات خود بہت عجیب ہے۔"

"کیوں؟ کیا خواجہ سرا انسان نہیں ہوتے؟ کیا وہ جانور ہوتے ہیں؟ میں نے ان کا حلیہ اپنایا تھا، مگر آپ کے لیے نہیں۔ میں تو اپنے کام سے وہ سب بنا تھا۔ بس اسی دوران..... آپ مل گئیں۔"

"آپ اپنے کام خواجہ سرا بن کر نکلواتے ہیں؟" وہ دم بخود رہ گئی۔ پہلی دفعہ کوئی سوال اس نے بچوں کی سی دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"کبھی میرے آفس آئیے گا۔ میں آپ کو اپنے کام کی تفصیل بتاؤں گا۔"

"آپ کے آفس میں کبھی نہیں آرہی، مگر وہ امانت، وہ کیسے ڈھونڈوں میں؟"

"جو لکھا ہے، اس پہ غور کریں۔ وہ ڈولی کی امانت ہے اور وہ اسی کو ملنی چاہیے، جو اپنی صلاحیتوں سے خود کو اس کے قابل ثابت کر سکے۔ کیا آپ اتنی باصلاحیت ہیں؟"

"ٹرائی می!" اس نے جتا کر کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ سبانجی کی دھوپ ابھی تک سیڑھیوں پہ اس کے قدموں میں گر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کلینک کی انتظار گاہ میں ٹھنڈی سی خنکی چھائی تھی۔ وہ کاؤچ پہ خاموش سی بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ ہالے کے توسط سے اس نے ایک ڈرماٹولوجسٹ سے وقت لیا تھا، اس کے بال بظاہر ٹھیک نظر آتے تھے، اور عائشے کے دیے گئے لوشن کام کر رہے تھے مگر ہاتھ لگانے پہ وہ پہلے سے ذرا روکھے لگتے اور سر کی جلد جو خراب ہوئی، وہ الگ۔

حیا نے اپنا پرس ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ ٹریسر والی ڈبیا ڈورم میں ہی تھی، اب وہ اسے استنبول میں اپنے ساتھ لے کر نہیں جاتی تھی۔

تب ہی اس کے ساتھ والی نشست پہ ایک سیاہ عبایا والی لڑکی آ بیٹھی۔ بیٹھتے ہی اس نے چند گہرے سانس لے کر تنفس بحال کیا، پھر ٹشو سے نقاب کے اندر چہرہ تھپتھپانے لگی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پیدل آئی ہے اور بہت تھک گئی ہے۔

حیا لاشعوری طور پر نگاہوں کا زاویہ موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ جانے کیوں آج کل وہ عبایا اور حجاب والی لڑکیوں کو بہت غور سے دیکھا کرتی تھی۔ استنبول میں ایسی لڑکیاں بہت کم ہی نظر آتی تھیں، البتہ اسکارف اور لانگ اسکرٹس والی مل جاتی۔ اکثریت ایسی لڑکیوں کی ہوتی جن میں سے ایک اس کے سامنے کاؤچ پہ بیٹھی تھی۔ مختصر اسکرٹ بنا آستین کے بلاؤز اور خوب صورت بال۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی گھٹنے پہ پھیلا میگزین پڑھنے میں مگن تھی۔ استنبول کی علامتی لڑکی۔ اس کے اسکرٹ کا رنگ نارنجی تھا، بالکل ان دو کراؤن فش جیسا جوان دونوں کا ڈچز

کے درمیان رکھی میز پہ سجے ایکوریم میں تیر رہی تھیں۔ ننھی ننھی سی نارنجی مچھلیاں، جن کی زندگی، جن کی سانس اور جن کی آواز سب پانی تھا۔

عبایا والی لڑکی اب پرس کھول کر کچھ تلاش کر رہی تھی۔ حیا ابھی تک اسے یوں ہی دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اس نے پرس سے ایک اورنج جوس کی بوتل نکالی اور اس کا ڈھکن اتارا، پھر ذرا رکی اور حیا کی طرف بڑھائی۔

"نو تھینک یو۔" وہ ذرا سنبھل کر سیدھی ہوئی۔

وہ لڑکی مسکرا کر بوتل میں اسٹرا ڈالنے لگی۔ سیاہ نقاب میں اس کی سرمئی آنکھیں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔

"آپ ہمیشہ یہ عبایا کرتی ہیں؟" وہ رہ نہیں سکی اور پوچھ ہی بیٹھی۔

"ہوں۔" نقاب تلے ایک گھونٹ لیتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کو گھٹن نہیں ہوتی اس میں؟"

"میرا دل اللہ نے اس کے لیے کھول دیا ہے، سو گھٹن کیسی..... اور ویسے بھی مسلمان لڑکی تو بہت مضبوط ہوتی ہے۔" اس نے بوتل کا ڈھکن بند کرتے ہوئے کہا۔ "مگر مجھے تو نقاب کا سوچ کر ہی گھٹن ہوتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے، یہ سب صرف آپ کے ذہن میں ہو۔"

"آپ کے ذہن میں بھی ایسی باتیں آتی ہوں گی نا۔" وہ اس کی طرف رخ موڑے غیر ارادی طور پہ بحث کرنے لگی تھی۔

"کیا بہت پڑھے لکھے، ماڈرن قسم کے لوگوں کے درمیان بیٹھے آپ کو احساس کمتری نہیں ہوتا؟" ساتھ ہی ایک نگاہ اس نے ایکوریم کے پار بیٹھی ترک لڑکی پہ ڈالی جو ابھی تک اپنے میگزین میں گم تھی۔

"بہت ماڈرن قسم کے لوگ تو میرے جیسے ہی ہوتے ہیں نا۔ میری شریعت تو دنیا کی سب سے ماڈرن (جدید) شریعت ہے۔ احساس کمتری تو انہیں ہونا چاہیے، جو جاہلیت کے زمانے کا تبرج کرتے ہیں۔ تبرج سمجھتی ہو؟"

اسے اندازہ تھا، پھر بھی اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

"تبرج..... اوہ..... کیسے سمجھاؤں؟" اس لڑکی نے لمحے بھر کو سوچا۔ "تم نے دبئی کے وہ اونچے اونچے ٹاورز تو دیکھے ہوں گے۔ برج العرب، برج الخلیفہ؟"

"ہاں تصاویر میں۔"

"بس! اسی برج سے یہ تبرج نکلا ہے۔ کسی شے کو اتنا نمایاں اور خوبصورت بنانا کہ دور سے نظر آئے۔ وہ صدیوں پہلے یوسف علیہ السلام کے مصر کی عورتیں تھیں، جو تبرج کرتی تھیں۔ وہ ابوجہل کے عرب کی عورتیں تھیں، جو زیب و زینت کر کے مردوں کے درمیان سے گزرتی تھیں۔ اگر استنبول کی لڑکیاں ان زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی پیروی کرتی ہیں تو وہ ماڈرن تو نہ ہوئیں نا۔ ماڈرن تو میں ہوں، تم ہو، پھر کیسی شرمندگی۔" اس نے رسان سے کہتے ہوئے شانے اچکائے۔

"اللہ، اللہ، یہ اعتماد؟" وہ دم بخود رہ گئی (ترکوں کا اثر تھا۔ وہ بھی اللہ، اللہ، کہنے لگی تھی۔)

"تمہیں لگتا ہے، تم کبھی نقاب نہیں پہن سکتیں؟" وہ اب ٹشو سے پیشانی پہ آئے پسینے کے قطرے تھپتھپا رہی تھی۔

"شاید نہیں، میری دوستوں اور فرسٹ کزنز میں سے کوئی نقاب نہیں لیتا۔" اسے شہلا یاد تھی، مگر وہ اس کے سیکنڈ کزن کی بیوی تھی۔

"تو تم یہ رواج ڈالنے والی پہلی لڑکی بن جاؤ۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" جواب میں اس لڑکی نے مسکرا کر ذرا سے شانے اچکائے۔

"جو غار ثور کے آخری سوراخ پہ اپنا پاؤں رکھ دیتا ہے اور ساری رات سانپ سے ڈسے جانے کے باوجود اف نہیں کرتا، اس کی اس ایک رات کی نیکیاں عمر بن خطابؓ کی زندگی بھر کی نیکیاں کے برابر ہوتی ہیں۔ مگر ہر شخص ابو بکر نہیں بن سکتا۔ ابو بکر صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ پہلوں میں پہل کرنے والا۔"

اس کی باری پکاری گئی تو وہ چونکی۔ پھر سلام کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اب اس لڑکی سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ اس کا ذہن صاف تھا،

اس کراؤن فش کے نارنجی بن کی طرح، شفاف اور صاف، مگر وہ جانتی تھی کہ وہ کبھی اپنا چہرہ نہیں لپیٹ سکتی۔ اس تصور سے ہی اس کا دم گھٹتا تھا۔

ایکوریم کے پانی میں اسی طرح بلبلے بن اور مٹ رہے تھے۔ دونوں مچھلیاں بنا تھکے ایک دوسرے سے پیچھے دائرہ میں دوڑ رہی تھیں۔ دائرہ...... جس میں آغاز اور اختتام کی تفریق مٹ جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

استقلال جدیسی میں معمول کی چہل پہل تھی۔ ٹھنڈی سی دھوپ گلی کی دونوں اطراف میں اٹھی قدیم عمارتوں پہ گر رہی تھی، گویا سنہری برف ہو۔

وہ جہان کے ساتھ ساتھ چلتی گلی میں آگے بڑھ رہی تھی۔ پھر اتفاق ہوا تھا کہ اس نے سیاہ اسکارف اور سیاہ اسکرٹ کے ساتھ گرے بلاؤز پہن رکھا تھا اور جہان نے سیاہ جینز پہ گرے آدھی آستین والی ٹی شرٹ۔ آج جب وہ ادھر آئی تھی تو اس نے خواہش کی تھی کہ وہ استقلال اسٹریٹ کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اسے اس گلی کا انت دیکھنا تھا۔ اب وہ اسی لیے چلتے جا رہے تھے۔

''کچھ پیو گی؟'' جہان نے رک کر پوچھا، پھر جواب کا انتظار کیے بنا ایک کیفے میں چلا گیا۔ جب باہر آیا تو اس کے ہاتھوں میں دو ڈسپوزیبل گلاس تھے اور بغل میں رول شدہ اخبار۔

''شکریہ......'' اس نے مسکراتے ہوئے گلاس تھاما۔ جھاگ سے بھرا پینا کولاڈا۔ ناریل اور انناس کی رسیلی خوشبو اور دور تاقسم اسکوائر سے اٹھتی نیو لیس کی مہک۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سانس اندر کھینچی۔ جہان سکندر کا استنبول بہت خوب صورت تھا۔

''ہوں، اچھا ہے۔'' وہ خود ہی تبصرہ کرتا گھونٹ بھر رہا تھا۔ حیا نے اس کے گلاس پکڑے ہاتھ کو دیکھا۔ اس نے وہ پلاٹینم بینڈ نہیں پہن رکھا تھا۔ یہ ان کی منگنی کے بعد پہلی ملاقات تھی اور اس میں اتنی انا تو تھی کہ اسے خود سے کبھی اس موضوع کو نہیں چھیڑنا تھا۔

''تم اس روز دو دفعہ آئی تھیں؟ بیک ڈور کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟'' وہ سرسری انداز میں پوچھ رہا تھا۔ یقیناً اس کے ورکر نے اسے پوری رپورٹ دی ہوگی، مگر جواب اس کے پاس تیار تھا۔ عائشے گل نے بے شک کہا تھا کہ سچ سے بہتر جواب کوئی نہیں ہوتا، مگر اس وقت عائشے کون سا دیکھ رہی تھی۔

''کوئی جاننے والا نظر آ گیا تھا۔ ہالے اور میں نے اس سے ٹکرانے سے بہتر سمجھا کہ دوسری گلی میں چلے جائیں، ویسے بھی شٹل کے آنے تک ہمیں انتظار تو کرنا تھا نا۔''

''اگر کبھی پچھلی گلی میں کوئی جاننے والا ملے اور تمہیں استقلال میں آنا پڑے تو بے شک برگر کنگ کے اسی دروازے کو استعمال کر لینا۔ اس کے پچھلی طرف گھنٹی لگی ہے۔'' گلاس خالی کر کے جہان نے کچرے دان میں اچھال دیا۔ حیا کا ابھی آدھا گلاس باقی تھا۔

''تم بتاؤ! تمہیں لندن کب جانا ہے۔'' وہ کافی بلند آواز میں بول رہی تھی۔ قریب سے گزرتے تاریخی، سرخ ٹرام میں سوار سیاحوں کا گروہ اونچی اونچی سیٹیاں بجا رہا تھا۔ جس کے باعث کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

''اگلے ماہ کا سوچ رہے ہیں۔ تب تک تم بھی فارغ ہو گی۔ باقی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کہاں جا رہے ہیں؟''

''کچھ ترکی میں ہی گھومیں پھریں گے، اور کچھ قطر، پیرس، دبئی وغیرہ جا رہے ہیں۔''

''تو تم ہمارے ساتھ لندن چلو نا۔ پھر جولائی میں واپس آ کر کلیئرنس کروانا اور پاکستان چلی جانا۔''

''میں اپنی دوستوں کے ساتھ بیوک ادا میں رہنا چاہتی ہوں۔'' گو کہ جہان کے ساتھ لندن جانے کا خیال کافی پرکشش تھا، مگر اس نے فوراً ہامی بھرنا مناسب نہ سمجھا۔

''اوہ! ڈونٹ ٹیل می کہ تم ابھی تک وہی رپورٹ لکھ رہی ہو۔''

جہان نے ہاتھ ہلا کر گویا ناک سے مکھی اڑائی۔ حیا نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ ہالے کی دوست چھاپنے کے لیے تیار تھی، مگر جہان کے منع کرنے پہ اس نے وہ رپورٹ بند کر دی تھی۔ آج صبح ہی جب وہ اس بارے میں سوچ رہی تھی تو اسے لگا اسے یہ سب کسی بااعتماد شخص سے شیئر کرنا چاہیے اور میجر احمد سے بڑھ کر کسی پہ اعتبار نہیں تھا۔ تب ہی صبح اس نے میجر احمد کو ٹیکسٹ کیا تھا کہ وہ بات کرنا چاہتی ہے، مگر

کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

"نہیں! میں نے اسے ذہن سے نکال دیا ہے۔"

"گڈ گرل!" وہ ایک دم اس کے بالکل مقابل آ کھڑا ہوا، یوں کہ حیا کے سامنے کا منظر چھپ گیا۔ وہ نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

"بعض دفعہ جو ہم دیکھتے ہیں، وہ ہو نہیں رہا ہوتا اور جو ہو رہا ہوتا ہے، وہ ہم دیکھ نہیں رہے ہوتے۔"

کہتے ہوئے اس نے رول شدہ اخبار کھولا اور پھر سے لپیٹنے لگا، یہاں تک کہ کون آئس کریم کی سنہری کون کی طرح اس نے اخبار کو رول کر دیا۔ پھر اس نے حیا کا گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حیا نے نا سمجھی سے گلاس اسے پکڑا دیا۔

"ایک چیز ہوتی ہے، نظر کا دھوکا، لوگ وہ نہیں ہوتے، جو وہ نظر آتے ہیں اور جو وہ ہوتے ہیں، اسے وہ چھپا کر رکھتے ہیں۔" اس نے گلاس کون کے منہ میں انڈیل دیا۔ جوس دھار کی صورت اخبار کی کون میں گرنے لگا۔ جہان نے خالی گلاس حیا کو تھمایا اور اخبار کی کون کو مزید لپیٹنا شروع کیا۔ پھر اس کا منہ بند کر دیا اور مخالف سمت سے اخبار کھولنے لگا۔ تہیں کھلتی گئیں اور پورا اخبار سیدھا کھل کر سامنے آ گیا۔ صفحے سوکھے تھے اور جوس غائب۔

"زبردست!" وہ مسکراتے ہوئے تالی بجانے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی ٹرک تھی۔ اس نے یقیناً کمال مہارت سے جوس کہیں آس پاس گرا دیا تھا یا پھر کچھ اور کیا ہوگا، بہرحال اس کا انداز متاثر کن تھا۔

وہ دونوں پھر سے ساتھ چلنے لگے تھے۔ جہان نے اخبار اب دو رویہ تہہ کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

دفعتاً حیا کا فون بجا۔ اس نے پرس سے موبائل نکال کر دیکھا۔ میجر احمد کی کال آ رہی تھی۔ اس نے کال کاٹ دی اور فون رکھ دیا۔

جہان اتنا مہذب تو تھا کہ کوئی سوال نہ کرتا، مگر وہ خود بتانا چاہتی تھی۔

"میجر احمد کی کال تھی، کچھ کام تھا ان سے۔" وہ چلتے ہوئے سرسری انداز میں بولی۔ یہ سراسر جواء تھا۔ جہان کے موڈ کا کچھ بھروسا نہ تھا، مگر وہ اس پہ بھروسا کرنا چاہتی تھی۔

"میجر احمد کون؟" اس نے نا سمجھی سے حیا کو دیکھا۔

"پاکستان میں ہوتے ہیں، سائبر کرائم سیل میں انٹیلی جنس آفیسر ہیں۔ تمہارے ابا کو بھی جانتے ہیں۔" وہ ذرا رکی۔ "میں ان سے بات کروں تو تمہیں برا تو نہیں لگے گا نا؟"

"آف کورس نہیں!" اس نے شانے اچکا دیے۔ "کون کتنا قابل اعتبار ہے، یہ فیصلہ تم خود کر سکتی ہو، کیونکہ میرے نزدیک تو سب لوگ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔"

"اتنی بے یقینی بھی اچھی نہیں ہوتی جہان!"

"رئیلی؟ جیسے تمہیں یقین ہے کہ تمہارا جوس میں نے کہیں گرا دیا تھا؟" وہ پھر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا اور گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو جانے کیوں ابھی تک وہ پکڑے کھڑی تھی۔

"یقیناً تم نے ایسا کیا ہوگا۔" اس نے گلاس جہان کو تھما دیا۔ تب تک وہ اخبار کو دوبارہ کون کی شکل میں لپیٹ چکا تھا۔ گلاس لے کر اس نے اخبار کی کون کا کھلا منہ گلاس میں الٹا۔ پینا کولاڈا ایک دھار کی صورت گلاس میں گرنے لگا۔

وہ بے یقینی سے ساکت کھڑی دیکھ رہی تھی۔

"یہ تم نے کیسے کیا؟ میں نے...... میں نے خود دیکھا تھا کہ اخبار سوکھا تھا۔ پھر یہ جوس کہاں سے آیا؟"

"اگر جادوگر اپنی ٹرک کے فوراً بعد ہی راز بتا دے تو کیا فائدہ؟ کبھی فرصت میں بتاؤں گا کہ یہ کیسے ہوا۔ البتہ اگر تم میری جگہ پہ کھڑی ہو کر دیکھتیں تو جان پاتیں کہ میں نے یہ کیسے کیا ہے جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا ہو کر نہیں دیکھتا، اسے پوری بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"تم عجیب ہو جہان!" اس نے تحیر سے سر جھٹکا۔ "ان دونوں چیزوں کو ٹریش میں پھینک دو، میری پیاس مر گئی ہے۔"

وہ ہنس پڑا۔ "نہیں! تمہاری پیاس ڈر گئی ہے۔" پھر شعبدہ باز نے دونوں چیزیں ایک قریبی کچرے دان میں اچھال دیں۔
دور سامنے گلی کے اختتام پہ ایک اونچا ٹاور تھا۔ جس نے گلی کا دہانہ بالکل بلاک کر رکھا تھا، جیسے زمین سے اگ آیا ہو۔ وہ یوں تھا جیسے پاکستان میں اونچی گول سی اینٹوں کی بھٹی ہوتی ہے، ویسا ہی سلنڈر نما ٹاور جس کا گنبد کون کی شکل کا تھا۔
"یہ رہا وہ انت...... Galata ٹاور (غلطہ ٹاور) جسے جاننے کا تمہیں تجسس تھا۔" اس نے ٹاور کی طرف اشارہ کیا۔
"اور انت جاننے کا سب سے بڑا نقصان پتا ہے کیا ہوتا ہے جہان؟"
جہان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"انسان کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔" اس نے گہری سانس لی اور پلٹ گئی۔ وہ شانے اچکا کر اس کے پیچھے ہو لیا۔

☆ ☆ ☆

"ترکی والوں کو سلام۔" واپسی پہ گورسل میں بیٹھے جب اس نے میجر احمد کو کال کی اور جواباً احمد نے کال کاٹ کر خود سے فون کیا تو اس کا ہیلو سنتے ہی وہ جیسے کسی خوشگوار حیرت کے زیر اثر بولا تھا۔
"زندگی میں پہلی دفعہ آپ نے میجر احمد کو خود یاد کیا ہے، مگر جب آپ نے کال نہیں اٹھائی تو میں سمجھا کہ وہ ٹیکسٹ آپ نے غلطی سے کیا ہوگا۔"
"یہ بات نہیں ہے۔ میں اس وقت جہان کے ساتھ تھی۔ سوچا بعد میں تفصیلی بات کروں گی۔"
"اچھا۔" وہ جیسے چپ ہو گیا۔ شاید اسے جہان کا ذکر ناگوار گزرا تھا۔
"میں نے جہان کو آپ کے بارے میں بتایا، مگر وہ آپ کو نہیں جانتا تھا۔"
"کیوں؟ آپ نے کیوں بتایا؟" وہ بہت حیران ہوا۔
"شوہر کو علم ہونا چاہیے کہ اس کی بیوی کس سے بات کرتی ہے۔" وہ ذرا جتا کر بولی۔ جانتی تھی کہ اس کا استحقاق سے شوہر کی بات کرنا احمد کو کتنا برا لگتا تھا۔
"شوہروں کا بھروسا نہیں ہوتا۔ احتیاط کیجیے گا، آپ پھنس ہی نہ جائیں۔"
"غلط کام تو نہیں کر رہی کہ پھنسوں۔ بہر حال! ہم کام کی بات کریں؟" اس کا لہجہ بے لچک ہو گیا۔ ساتھ ہی جو کچھ بیوک ادا میں وہ جان پائی تھی، اس نے وہ احمد کو بتا دیا۔
"میں وہ رپورٹ شائع کرانا چاہتی تھی، مگر جہان نے منع کر دیا۔" روانی میں وہ کہہ گئی، پھر ایک دم خاموش ہو گئی۔
"وہ تو منع کرے گا، اس کا بہت کچھ داؤ پہ جو لگے گا۔ خیر! آپ بالکل وہ رپورٹ شائع کروائیں، مگر حیا! اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"
"کیا مطلب؟" وہ جہان والی بات نظر انداز کر گئی۔ وہ ذاتی عناد کے باعث کہہ رہا تھا یقیناً۔
"ایک رپورٹ سے اے آر پی جیسے بندے کا کیا بگڑے گا؟ مافیا کے ایک ایک آدمی کے پیچھے پوری کی پوری نیٹ ورکنگ ہوتی ہے۔ عبدالرحمٰن جیسے "شہرت زدہ" مہرے تو صرف پل کا کام کرتے ہیں۔ ایسے کہ اپنے دامن پہ کوئی چھینٹا نہ پڑے۔ سو ان کے خلاف نہ ثبوت ہوتے ہیں، نہ کبھی فائلز کھلتی ہیں۔"
"مگر میں نے سنا ہے کہ اس کے عالمی دہشت گرد تنظیموں سے بھی......"
"کس سے سنا ہے؟" وہ بات کاٹ کر بولا۔
"لیڈی کبریٰ سے۔ ادالار میں۔"
"بہر حال! یہ دوسری دنیا کے لوگ ہیں۔ آپ ان معاملوں میں مت پڑیں۔"
"تو پھر یہ پاشا میرے پیچھے کیوں پڑا ہے آخر؟" وہ زچ ہو کر بولی۔

''مجھے تو لگتا ہے حیا! کہ اس نے آپ کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ اب صرف آپ اس کے پیچھے پڑی ہیں۔''
وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔
''ویسے ضروری نہیں تھا کہ آپ جہان سکندر کو میرے بارے میں بتائیں۔ انسان کو کچھ باتیں اپنے تک بھی رکھنی چاہئیں۔''
بس باسفورس برج سے گزر رہی تھی اور وہ کھڑکی سے باہر پل تلے بہتا سمندر دیکھ سکتی تھی۔ وہاں حسب معمول ایک فیری تیر رہا تھا۔
''میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی میرے اور آپ کے اس رابطے کو کبھی بھی غلط طریقے سے استعمال کرے مجھے رسوا کر سکے۔''
''اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا حیا! جنت کے پتے تھامنے والوں کو اللہ رسوا نہیں کرتا۔''
اسی لمحے دور نیچے سمندر کے کناروں پر بگلوں کا ایک غول پھڑ پھڑاتا ہوا اڑا تھا۔ وہ نگاہیں ان کے بھورے سفید پروں پہ مرکوز کیے، بالکل ٹھہری گئی تھی۔
''آپ جنت کے پتے کسے کہتے ہیں۔''
احمد نے گہری سانس لی اور کہنے لگا۔
''آپ جانتی ہیں، جب آدم علیہ السلام اور حوا جنت میں رہا کرتے تھے، اس جنت میں، جہاں نہ بھوک تھی، نہ پیاس، نہ دھوپ اور نہ ہی برہنگی۔ تب اللہ نے انہیں ایک ترغیب دلاتے درخت کے قریب جانے سے روکا تھا، تاکہ وہ دونوں مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔'' وہ سانس لینے کو رکا۔
بس اب پل کے آخری حصے پہ تھی۔ بگلوں کا غول فیری کے اوپر سے پھڑ پھڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ سمندر پیچھے کو جا رہا تھا۔
''اس وقت شیطان نے ان دونوں کو ترغیب دلائی کہ اگر وہ اس ہمیشگی کے درخت کو چھو لیں تو فرشتے بن جائیں گے یا پھر ہمیشہ رہیں گے۔ انہیں کبھی نہ پرانی ہونے والی بادشاہت ملے گی۔''
پل پیچھے رہ گیا۔ گورسل اب پرانے شہر (اناطولیہ یا ایشیائی حصے) میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ ہر شے سے بے نیاز یکسوئی سے سن رہی تھی۔
''سو انہوں نے درخت کو چکھ لیا۔ حد پار کر لی...... تو ان کو فوراً بے لباس کر دیا گیا۔ اس پہلی رسوائی میں جو سب سے پہلی شے جس سے انسان نے خود کو ڈھکا تھا، وہ جنت کے پتے تھے، ورق الجنتہ۔''
پرانے شہر کی سڑک پہ کوئی ٹریفک جام تھا۔ گورسل بہت سست روی سے چل رہی تھی۔ سڑک کنارے چلتے لوگ اور دکانوں پہ لگا رش، اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بس سن رہی تھی۔
''آپ جانتی ہیں، ابلیس نے انسان کو کس شے کی ترغیب دلا کر اللہ کی حد پار کروائی تھی؟'' فرشتہ بننے کی اور ہمیشہ رہنے کی۔ جانتی ہیں حیا! فرشتے کیسے ہوتے ہیں؟''
اس نے نفی میں گردن ہلائی، گو کہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے نہیں دیکھ سکتا۔
''فرشتے خوب صورت ہوتے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کو رکا۔ ''اور ہمیشہ کی بادشاہت کسے ملتی ہے؟ کون ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتا ہے؟ وہ جسے لوگ بھول نہ سکیں، جو انہیں مسحور کر دے، ان کے دلوں پہ قبضہ کر لے۔ خوب صورتی اور امر ہونے کی چاہ، یہ دونوں چیزیں انسان کو دھوکے میں ڈال کر ممنوعہ حد پار کراتی ہیں اور پھل کھانے کا وقت نہیں ملتا۔ انسان چکھتے ہی بھری دنیا میں رسوا ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر وہ خود کو ڈھکے تو اسے ڈھکنے والے جنت کے پتے ہوتے ہیں۔ لوگ اسے کپڑے کا ٹکڑا کہیں یا کچھ اور، میرے نزدیک یہ ورق الجنتہ ہیں۔''
پرانے شہر کی قدیم اونچی عمارتوں پر سے دھوپ رینگ گئی تھی اور اب چھاؤں کی نیلاہٹ ان پہ چھا رہی تھی۔ وہ سانس روکے موبائل کان سے لگائے دم سادھے بیٹھی سن رہی تھی۔
''جنت کے پتے صرف اسی کو ملتے ہیں، جس نے ترغیب کو چکھنے کی کوشش کی ہوتی ہے اور ان کا سفر ان کو خود پہ لگا لینے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا، کیونکہ ان کو تھامنے سے پہلے انسان جنت میں ہوتا ہے۔ تھامنے کے بعد وہ دنیا میں اتار دیا جاتا ہے، بخشش مل جاتی ہے، مگر دنیا

شروع ہو جاتی ہے اور پھر......''

وہ جیسے دھیرے سے مسکرایا۔

''دنیا والوں نے جنت تو نہیں دیکھی ہوتی نا! سو ان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ جنت کے پتے کیسے دکھتے ہیں۔ سو وہ ان کے ساتھ سلوک بھی وہی کرتے ہیں، جو کسی شے کی اصل جانے بغیر اس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ آپ دنیا میں اترنے کے بعد دنیا والوں کے رویے سے پریشان مت ہوئیے گا۔''

وہ خاموش ہوا تو کوئی طلسم ٹوٹا۔ سحر کا ایک بلبلہ جو اس کے گرد تن چکا تھا، پھٹ کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

''تھینکس میجر احمد!'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔ اس وقت کچھ زیادہ کہنے کے قابل نہیں تھی۔

''آپ اچھے انسان ہیں، اچھی باتیں کرتے ہیں۔''

''شکریہ! میں اب فون رکھتا ہوں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔'' اس نے فون کان سے ہٹایا۔ اس کا کان سن ہو چکا تھا۔

قدیم شہر کی عمارتوں میں اس کو ابھی تک میجر احمد کی باتوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

''اناطولین سٹی میں ایک سیمینار ہے، چلو گی؟'' ہالے نے ڈورم کے دروازے سے جھانک کر اسے مخاطب کیا۔ وہ جو اپنی کرسی پہ بیٹھی میز پہ پھیلی کتابوں میں منہمک تھی، چونک کر پلٹی۔

''ابھی تو ممکن نہیں ہے، میرے پورے دو چیپٹرز رہ گئے ہیں۔'' حیا نے صفحے آگے پلٹ کر دیکھا اور پھر نفی میں گردن ہلائی۔

''کار میں پڑھ لینا۔ کتاب ساتھ لے چلو۔''

''اتنا ضروری کیا ہے؟''

''تم پچھتاؤ گی نہیں۔ لکھ کر رکھ لو۔'' ہالے مصر تھی، سو اس نے کتاب ساتھ رکھ لی۔ پزل باکس بھی بیگ میں ڈال لیا اور بھنی مونگ پھلی کا پیکٹ جو کل ہی دیا اسٹور سے لائی تھی، ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''کپڑے ٹھیک ہیں؟'' اس نے گردن جھکا کر صبح کے پہنے لباس کو دیکھا۔ گرے اسکرٹ کے ساتھ لائم گرین بلاؤز اور اوپر گرے اسکارف جو ابھی ابھی پن اپ کیا تھا۔

''ہاں! ٹھیک ہیں، چلو۔'' ہالے نے پرس اور چابی سنبھالی۔ یہ اس کا خوش قسمت دن تھا کہ آج اس کے پاس کار تھی۔

وہ سیمینار ہوٹل کے جس ہال میں تھا، وہ ہال سب سے اوپر والے فلور پہ تھا۔ اس کی دو متوازی دیواریں گلاس کی بنی تھیں..........

ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ لڑکیاں، عورتیں اور بے حد معمر خواتین، خالص نسوانی ماحول تھا۔

ان دونوں کو شیشے کی دیوار کے ساتھ جگہ ملی۔ حیا کی کرسی قطار کی پہلی کرسی تھی، سو اب اس کے دائیں طرف گلاس وال تھی اور بائیں جانب ہالے۔ درمیان میں اس نے مونگ پھلی کا پیکٹ کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہی ڈی جے کے ساتھ بیچ کلاس میں کھانے کی عادت۔

روسٹرم کے عقب میں دیوار اس خوب صورت بینر سے ڈھکی تھی، جس پہ انگریزی میں چھپا تھا۔

Face Veil Mandatory or Recommended

(چہرے کا حجاب، واجب یا مستحب؟)

اس نے دو انگلیوں اور انگوٹھے کو پیکٹ میں ڈال کر چند دانے نکالے اور منہ میں رکھے۔ وہ اسکارف کر لے، یہ اس کے تقویٰ کی انتہا تھی۔ سو اب چہرے کا نقاب واجب تھا یا مستحب، کیا فرق پڑتا تھا؟

سیمینار انگریزی میں تھا۔ سو ڈائس سنبھالے کھڑی میرون اسکارف والی عربی خاتون انگریزی میں ہی کہہ رہی تھیں۔

''واجب وہ چیز ہوتی جو کریں تو ثواب، نہ کریں تو گناہ ہے، جبکہ مستحب وہ کام ہے جو کریں تو ثواب، مگر نہ کرنے پہ گناہ نہیں ہے۔ اب اس بات پہ تو سب راضی ہیں کہ لڑکیوں کا سر اور جسم ڈھکنا واجب، لیکن کیا چہرہ بھی ڈھکنا لازمی ہے؟''

حیا کے دائیں جانب گلاس وال پہ ایک دم سے کوئی پرندہ آٹکرایا تھا۔ وہ چونکی۔ وہ ننھی سی چڑیا تھی جو شیشے سے ٹکرا کر نیچے گر گئی تھی۔

''جب میں کہتی ہوں کہ چہرہ ڈھکنا واجب نہیں، صرف مستحب ہے تو اس کی وجہ وہ حدیث ہے کہ جب حضرت اسمٰا بنت ابوبکر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور ان کا لباس ذرا باریک تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اسما! جب لڑکی جوان ہو جاتی ہے تو سوائے اس اور اس کے (چہرے اور ہاتھوں کی طرف اشارہ کر کے) کچھ نظر نہیں آنا چاہیے۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چہرہ کھلا رہنے پہ گناہ نہیں ہوتا۔''

گری ہوئی چڑیا اب سنبھل کر فرش پہ پھدک رہی تھی۔ چند ایک بار اس نے شیشے کی دیوار پر پنجے مار کر چڑھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی۔

''اور پھر جب حج کے موقع پہ ایک لڑکی جو اونٹ پہ بیٹھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بچے کے حج کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے فضلؓ لاشعوری طور پہ اس لڑکی کے چہرے کو دیکھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے ہاتھ پیچھے کر کے فضلؓ کا چہرہ دوسری جانب پھیر دیا، جبکہ اس لڑکی کو چہرہ ڈھکنے کا نہیں کہا۔ دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ازواج مطہرات اور صحابیات جو حجاب اوڑھتی تھیں، وہ مستحب کے درجے کا تھا۔ واجب کا نہیں۔ سو جو آیت سورۃ نور میں ہے کہ وہ اپنی زینتیں چھپائیں، سوائے اس کے کہ جو خود ظاہر ہو جائے تو اس ''وہ جو خود ظاہر ہو جائے'' میں سرمہ، انگوٹھی وغیرہ کے ساتھ چہرہ بھی شامل ہے۔''

چڑیا پھڑ پھڑاتی ہوئی کب کی اڑ چکی تھی۔ وہ مونگ پھلی چباتے ہوئے سر اثبات میں ہلاتی مقررہ کو سن رہی تھی۔ وہ مزید چند دلائل دے کر اپنی کرسی پہ واپس جا چکی تھیں اور تب تک وہ مطمئن ہو چکی تھی۔ اسے ان کی ساری بات ٹھیک لگی تھی۔

''میں ڈاکٹر فریحہ سے اختلاف کی جسارت کروں گی۔'' ڈائس پہ آنے والی گرے اسکارف والی مقررہ اپنی بات شروع کر چکی تھیں۔ وہ دراصل بحث تھی۔ حیا اور ہالے باری باری پیکٹ میں انگلیاں ڈال کر مونگ پھلی نکالتے ہوئے، پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھیں۔

''رہی اسما بنت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث، اس کی تشریح تو محرم رشتوں کے لحاظ سے بھی کی جا سکتی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سالی تھیں اور اسی حدیث سے ہم دلیل لیتے ہیں کہ بہنوئی سے چہرے کا پردہ نہیں ہوتا اور حضرت فضلؓ والا واقعہ حج کے موقع کا تھا اور حج پہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے نقاب یا دستانے پہننے سے منع فرمایا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نقاب کرنا اس زمانے میں ایک کامن پریکٹس تھی۔''

دو فاختائیں تیزی سے اڑتی آئیں اور شیشے کی دیوار سے ٹکرائیں۔ حیا نے ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ اب ٹکرا کر نیچے جا گری تھیں اور اگلے ہی پل اٹھ کر اڑ گئیں۔

''عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب گریبانوں کو ڈھانپ لینے کا حکم نازل ہوا تھا تو مدینے کی عورتوں نے وہ حکم سنتے ہی اپنی اوڑھنیاں حصوں میں پھاڑیں اور سر سے پاؤں تک خود کو اس سے ڈھانپ لیا۔ یہاں ڈھانپنے سے مراد چہرہ ڈھانپنا بھی ہے۔ سو ''وہ جو خود ظاہر ہو جائے'' میں انگوٹھی، سرمہ، جوتی تو آتی ہے، مگر چہرہ نہیں۔ پھر جب ابن عباسؓ سے آیت حجاب کی تفسیر پوچھی گئی تھی تو آپؓ نے اپنی چادر سر پہ لپیٹ کر بکل مار کے دکھائی، یوں کہ بس ایک آنکھ واضح تھی۔ آیت حجاب میں اللہ نے ''اے ایمان والو!'' کہہ کر حکم دیا ہے اور جب اللہ تعالیٰ مومن کو اس کے ایمان کا واسطہ دے کر حکم دیتا ہے تو وہ حکم بے حد اہم ہوتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ صرف سر اور جسم ڈھکنا واجب نہیں، بلکہ چہرہ ڈھکنا بھی واجب ہے۔''

وہ گردن ذرا سی پھیرے شیشے کی دیوار کو دیکھ رہی تھی، جہاں تھوڑی سی دیر میں بہت سے پرندے ٹکرائے تھے۔ تایا فرقان کہتے تھے کہ پرندے یوں اس لیے کرتے ہیں، کیونکہ وہ پچھلے سال جب یہاں سے گزرے تھے تو وہ عمارت وہاں نہیں تھی۔ اب وہ راستے پہ اپنی رو میں اڑتے جا رہے ہوتے ہیں تو ٹکر لگنے پہ معلوم ہوتا ہے کہ راستہ بلاک ہے۔ معلوم نہیں، تایا کی فلاسفی کتنی درست تھی، مگر وہ ہوٹل نیا تعمیر شدہ ہی تھا۔ شاید وہ واقعی پرندوں کی گزرگاہ کے درمیان بن گیا تھا۔

''مستحب اور واجب، بحث بہت پرانی ہے۔'' ڈائس پہ اب ایک سیاہ عبایا اور سیاہ اسکارف والی دراز قد، شہد رنگ آنکھوں والی خاتون آ چکی تھیں۔ خوب صورت، شفاف چہرہ، نرم سی مسکراہٹ، سب بہت توجہ سے انہیں سن رہے تھے۔

''آپ نے مستحب والوں کے دلائل سنے، آپ کو لگا ہوگا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ نے پھر واجب والوں کا بیان سنا، تو لگا کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ اب آپ کہیں گے کہ دونوں ٹھیک کہہ سکتے ہیں؟ تو وہی لطیفہ ہو جائے گا کہ آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں۔''

ہال میں بے اختیار قہقہہ بلند ہوا۔ شیشے کی دیواریں بھی مسکرا اٹھیں۔

''ایسا ہے کہ میں ان دنوں میں سے کسی گروہ کی حمایت یا مخالفت کرنے کے لیے نہیں آئی۔ میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں۔''

وہ لمحے بھر کو رکیں۔ پورا ہال بہت دلچسپی سے سن رہا تھا۔

''ہم عموماً دنیا اور آخرت کی مثال کسی کالج ایگزام سے دیتے ہیں، رائٹ؟ تو وہی مثال لے لیتے ہیں۔ دنیا اور آخرت کے کسی بھی اسکول یا کالج کا جب پیپر سیٹ کیا جاتا ہے تو اس میں چند سوال بہت آسان رکھے جاتے ہیں۔ جو کوئی اوسط درجے کا طالب علم بھی حل کر کے 33% سے زیادہ نمبر لے کر پاس ہو سکتا ہے۔ پھر چند سوال ذرا مشکل ہوتے ہیں جو صرف اچھے طلبہ حل کر کے ستر، اسی فیصد نمبر لے جاتے ہیں اور آخر میں ہر پیپر میں کچھ سوال بہت پیچ دار...... اور مشکل رکھے جاتے ہیں۔ وہ سوال پوزیشن ہولڈرز کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اسی لیے عموماً پوزیشن ہولڈرز کے آپس میں چند نمبرز یا پرسنٹیج کے ذرا سے تناسب کا فرق ہوتا ہے۔ یہ سوال ''مستحب'' ہوتے ہیں۔ ہم عموماً سمجھتے ہیں کہ مستحب وہ ہوتا ہے کہ جب پانچ میں سے چار سوال حل کرنے ہوں، تو چاروں میں سے کوئی غلط ہونے کے ڈر سے پانچواں بھی اٹیمپٹ کر دیا جائے، ایکسٹرا سوال جبکہ وہ مستحب نہیں ہوتا۔''

وہ اب کرسی پہ ذرا آگے ہو کر بیٹھی غور سے سن رہی تھی۔ استنبول کی خوب صورت عورتوں کی خوب صورت باتوں کا بھی ایک اپنا سحر تھا۔

''اب ہوتا یہ ہے کہ....'' شفاف چہرے والی ڈاکٹر شائستہ کہہ رہی تھیں۔ ''کہ اس مسئلے پہ واجب والے، مستحب والوں پہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ اپنی مرضی کا دین چاہتے ہیں اور خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔ جبکہ مستحب والے انہیں کہتے ہیں کہ آپ شدت پسند ہو رہے ہیں۔ الزامات کی اس جنگ میں لڑکیوں کے پاس بہانہ آ جاتا ہے کہ انہیں حجاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ایسے ہی ٹھیک ہیں، کیونکہ یہ تو ثابت ہی نہیں ہے کہ اسلام میں چہرے کا پردہ ہے بھی یا نہیں۔ جبکہ یہ غلط تاثر ہے۔ بحث نقاب کے ''ہونے'' یا ''نہ ہونے'' کی نہیں ہے، بلکہ بحث اس کے واجب یا مستحب ہونے کی ہے۔ آسان الفاظ میں کہتی ہوں، اس پہ سب راضی ہیں کہ نقاب کرنے پہ ثواب ہے، جبکہ اختلافی نقطہ یہ ہے کہ کیا نقاب نہ کرنے پہ گناہ بھی ہے یا نہیں؟''

اس نے اسکالر کے چہرے کو دیکھتے انگلیاں پیکٹ میں ڈالیں تو پوروں نے خالی پلاسٹک کو چھوا۔ مونگ پھلی کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس نے انگلیاں نہیں نکالیں، وہ ویسے ہی پوری یکسوئی سے اسٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میں سوچتی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے ہم اختلافی نقطہ یعنی گناہ ہے یا نہیں۔'' چھوڑ دیں اور صرف ''متفق نقطے'' پہ غور کریں تو اس مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ ''گناہ کو چھوڑ دیں۔'' کامن پوائنٹ دیکھیں کہ نقاب کرنا ایک نیکی ہے۔ بہت بڑی نیکی۔ تو کیا جو چیز مستحب ہوتی ہے، اسے فالتو سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے؟ جیسے مستحب والے کرتے ہیں۔ وہ نقاب کو غیر واجب قرار دے کر اس کی ترویج و تبلیغ کرنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف 33 فیصد والے جواب دے کر کسی فالتو سوال کے بغیر ہی ہم پاس ہو جائیں گے؟ کیا ہمیں یقین ہے کہ ہمارا 33 فیصد کا جواب نامہ بھی درست لکھا گیا ہے؟''

ان کے سوال پہ ہال میں خاموشی چھائی رہی مرعوب سی خاموشی۔

''ادھر ہم سب عورتیں اور لڑکیاں ہی موجود ہیں۔ ایک بات کہوں آپ سے؟ ہم میں یہ چند باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ ساری نہیں تو کچھ تو ضرور ہی۔ ہم جلد جیلس ہو جاتی ہیں، کسی کے پیچھے اس کی برائی بھی کر لیتی ہیں۔ منہ سے جھوٹ بھی پھسل جاتا ہے۔ نمازیں ہم پوری پڑھتی نہیں۔ جو پڑھیں، ان میں بھی دھیاں کہیں اور ہوتا ہے۔ ان کا بھی پتا نہیں کتنا، پانچواں، نواں یا دسواں حصہ لکھا جاتا ہوگا۔ رمضان کے روزے رکھ لیں تو چھوٹے روزوں کی قضا دینا بھول جاتے ہیں۔ یہ تھا وہ 33 فیصد پرچہ۔ یہ کتنا اچھا ہم حل کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں لگتا ہے کہ ہمیں کسی ایکسٹرا ٹائسل کی ضرورت نہیں؟ مائی ڈیئر لیڈیز! جنت صرف خواہش کرنے سے نہیں مل جاتی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آدم کی اولاد میں ہر ایک ہزار میں سے 999 جہنم میں ڈالے جائیں گے اور صرف ایک جنت میں داخل کیا جائے گا؟ یہ میں نہیں کہہ رہی،

یہ بخاری کی حدیث ہے۔ کیا ہم اس اعمال نامے کے ساتھ اس ''ایک'' میں شامل ہو سکتے ہیں؟''

وہ بالکل ساکت بیٹھی، بنا پلک جھپکے مقررہ کو دیکھ رہی تھی۔ ''جہنم'' کے لفظ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک فلم چلا دی تھی۔

ہرا قلیطس کی دائمی آگ، بھڑکتا آتش دان، دہکتے انگارے۔

''آج ہم بحث کرتے ہیں کہ نقاب واجب ہے یا نہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ کل کو قیامت کے دن جب ہم ایک ایک نیکی کی تلاش میں ہوں گے تب ہم شاید رو رو کر کہیں کہ آخر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ حجاب واجب تھا یا مستحب، تھا تو نیک عمل..... تھا تو ثواب ہی نا، تو ہم نے کیوں نہیں کیا؟'' انہوں نے رک کر ایک گہری سانس پرکھینچی۔ ''یقین کریں! میں واجب والوں اور مستحب والوں، کسی کی حمایت یا مخالفت نہیں کر رہی۔ میں بس ایک بات کہہ رہی ہوں کہ حجاب کرنا نیکی ہے، سوچا ہے آپ اسے واجب سمجھ کر کریں یا مستحب سمجھ کر..... اسے کریں ضرور اور اسے پھیلائیں بھی ضرور۔ ہمارے جھوٹ، خیانتیں اور دھوکے ہمارے لیے جو آگ تیار کر رہے ہیں، اس سے دور ہونے کے لیے جو کرنا پڑے کریں اور ایک آخری بات.....'' وہ پھر سانس لینے کو رکیں۔ ہال میں اسی طرح مکمل خاموشی تھی۔

''آپ حجاب کے جس بھی درجے پہ ہوں، صرف اسکارف لیں یا عبایا بھی لیں یا ساتھ میں نقاب بھی کریں، جو بھی کریں، اس پہ قائم ہو جائیں۔ اس سے نیچے کبھی نہ جائیں اور پھر اس کے لیے لڑنا پڑے تو لڑیں۔ مرنا پڑے تو مریں، مگر اس پہ سمجھوتا کبھی نہ کریں۔ مجھے نہیں معلوم کہ حجاب واجب ہے یا مستحب، میں بس یہ جانتی ہوں کہ یہ اللہ کو پسند ہے تو پھر یہ مجھے بھی پسند ہونا چاہیے۔''

وہ اسٹیج سے اتریں تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ گرے اسکارف والی اور میرون اسکارف والی دونوں خواتین متفق انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلا کر تالی بجا رہی تھیں۔

وہ بالکل چپ، خاموش سی بیٹھی تھی۔ دل و دماغ جیسے بالکل خالی ہو گئے تھے۔ جیسے ہی وہ سیاہ عبایا والی ڈاکٹر شائستہ ہمدانی دروازے کی طرف بڑھیں۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور ان کی جانب لپکی۔

''میم!'' وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے ان تک آئی۔

''یس؟'' وہ پلٹیں۔ ساتھ ہی وہ ایک ہاتھ میں اپنا فون پکڑے تیز تیز کچھ ٹائپ کر رہی تھیں۔

''وہ..... میں بھی..... میں بھی کرنا چاہتی ہوں نقاب..... مگر.....'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنی بات سمجھائے۔

''مگر..... میں کیسے کروں؟''

''بہت آسان!'' ڈاکٹر شائستہ نے موبائل بیگ میں ڈالا اور پھر آگے بڑھ کر اس کے اسکارف کا سامنے کو گرا دایاں تکونا پلو اٹھایا۔ اسے پہلے بائیں گال کے ساتھ اسکارف کے ہالے میں اڑسا، پھر کچھ حصہ دائیں گال کے اس طرف اڑسا، یوں کہ اس کے چہرے کو ایک نفیس سے نقاب نے ڈھانپ دیا۔

''بس..... اتنی سی بات تھی!'' مسکرا کر کندھوں کو ذرا سی جنبش دے کر وہ موبائل نکالنے کے لیے پرس کھنگالتے ہوئے پلٹ گئیں۔

اتنی سی بات تھی؟ وہ اپنی جگہ منجمد سی کھڑی رہ گئی۔

بس؟ اتنی سی بات تھی؟ اس کا سانس گھٹا، نہ دل تنگ ہوا، نہ ہی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھایا۔ سب ویسا ہی تھا۔ بس اتنی سی بات تھی؟

اناطولیہ کے بازار میں چہل قدمی کرتے، گورسل کی نشست سے کھڑکی کے باہر دیکھتے، سبانجی کے کیمپس میں واپس بس سے اترتے، ہر جگہ اس نے لوگوں کو، دیواروں کو، مناظر کو کھوجنے کی سعی کی۔ کیا کوئی فرق پڑا تھا؟ مگر اسے احساس ہوا کہ سب ویسا ہی تھا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ ڈاکٹر شائستہ کا پہنایا گیا نقاب اتار سکتی، سو وہ استنبول میں اسی نقاب کے ساتھ لمبے بتاتی رہی۔ پر کہیں کوئی گھٹن، کوئی تنگی نہ تھی۔ انسان دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، نہ کہ رخسار، ناک، ٹھوڑی یا پیشانی سے، سو ان کے ڈھکے ہونے کے باوجود منظر وہی رہتی ہے، پھر کیسی پریشانی؟

لیکن پھر بھی اسے عجیب سی خفت ہو رہی تھی۔ باوجود اس کے بالے کا انداز ویسا ہی تھا، جیسا پہلے تھا۔ ڈورم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے حسین اور معتصم اترتے دکھائی دیے۔ حسین بس لمحے بھر کو ٹھٹکا تھا، پھر دونوں مسکرا کر سلام کرتے نیچے اتر گئے۔ سب پہلے جیسا تھا۔

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیں اپنی بیویوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکالیا کریں، تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور وہ ستائی نہ جائیں۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

وہ اپنی کرسی پہ بیٹھی، کتاب پہ جھکی، ذہنی طور پہ ابھی تک اسی ہال میں تھی، جہاں شیشے کی دیواروں سے پرندے ٹکرا جایا کرتے تھے۔ جب واپسی کے وقت پس منظر میں کسی نے یہ آیت چلادی تھی تو وہ اس کے ٹرانس سے باہر ہی نہ آسکی۔ اسے لگا، وہ کبھی اس کے اثر سے نہیں نکل سکے گی۔ لمحے بھر میں اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ آج تک حجاب یا نقاب کیوں نہیں پہن سکی تھی۔ باوجود اس کے کہ تایا، ابا اور روحیل بھی اسے بہت تاکید کرتے تھے۔ وہ یہ نہیں کر سکی۔ اس لیے کیونکہ انہوں نے ہمیشہ اپنی کہی۔ کبھی اللہ کی بات سنائی ہی نہیں۔ جبر کی طرح اپنی بات مسلط کرنی چاہی اور اکثر باپ، بھائی یہی تو کرتے ہیں۔ اپنی ہی کہتے رہتے ہیں۔ پھر شکایت کرتے ہیں کہ بچیاں مانتی کیوں نہیں ہیں؟ کبھی اللہ کی سنوا کر تو دیکھتے، پھر علم ہوتا کہ مسلمان لڑکی چھوٹی ہو یا بڑی، نرم ٹہنی ہو یا سخت کا نچ، دل اس کا ایک ہی ہوتا ہے۔ وہ دل جو اللہ کی سن کر جھک ہی جاتا ہے۔ پھر کسی وعظ، تقریر یا درس کی ضرورت نہیں رہتی۔

ایک آیت...... ایک آیت زندگی بدل دیتی ہے۔ بس ایک آیت۔

☆ ☆ ☆

بیوک ادا کے ساحل پہ لہریں پتھروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ ان کا شور اس اونچے، سفید قصر عثمانی کے اندر تک سنائی دے رہا تھا۔ محل اندھیرے میں ڈوبا تھا، راہداریاں تاریک تھیں۔ صرف دوسری منزل کی اسٹڈی میں نیم روشنی سی چھائی تھی۔ اندر ایک مدھم سا بلب جل رہا تھا یا پھر میز پہ کھلا پڑا عبدالرحمن کا لیپ ٹاپ۔ البتہ وہ اسکرین کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ ریوالونگ چیئر کی پشت پہ سر گرائے، سوچتی نگاہوں سے چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی دونوں سونے کی انگوٹھیاں اور موٹے فریم کے گلاسز میز پہ لیپ ٹاپ کے ساتھ رکھے تھے۔

بے خیالی میں اس نے ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی۔ اسے دیکھا اور پھر ذرا کوفت سے واپس میز پہ پھینک دیا۔ اس سگریٹ نوشی سے اسے چھٹکارا لینا چاہیے تھا اب تک۔ بلکہ اور بھی بہت چیزوں سے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور انگلیوں سے کنپٹیوں کو دھیرے دھیرے مسلنے لگا۔ اس کے سر میں کافی دیر سے درد تھا، شاید بہت سوچنے کے باعث اعصابی دباؤ۔

''اوں ہوں!'' اس نے نفی میں سر جھٹکا۔ اس کے اعصاب بہت مضبوط تھے اور وہ کبھی بھی اس قسم کے دباؤ سے نہیں ہار سکتا۔ اس نے خود کو یقین دلایا۔ ویسے بھی سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ ہر شے حسب منشا جا رہی تھی۔ جو تاش کے پتوں کا گھر اس نے بنا رکھا تھا۔ وہ اپنے آخری مرحلے میں تھا۔ کامیابی بہت نزدیک تھی۔ جو وہ چاہتا تھا، سب ویسے ہی ہو رہا تھا۔ مگر اب اسے زیادہ توانائی اور زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ پچھلی دفعہ کھیل آخری مرحلے میں بگڑ گیا تھا۔ ہر شے دھپ سے اس پہ آ گری تھی اور وہ بھی اس دوست کے طفیل "دوست" دھوکا دے، اس سے بڑھ کر تکلیف دہ شے کوئی نہیں ہوتی۔ کچھ پل کے لیے وہ اذیت ناک دن اس کی نگاہوں کے سامنے لہرائے تھے۔ اپنے قابل سے قابل دوستوں اور جاننے والوں کو چھوڑ کر، وہ اس قابل نفرت آدمی کے پاس گیا تھا مدد کے لیے اور اس نے جو کیا، وہ بہت برا تھا۔

عبدالرحمن نے تلخی سے سر جھٹکا۔ اس وقت کم از کم وہ اس واقعے اور اس شخص کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔ اللہ ضرور اسے موقع دے گا کہ وہ اس سے اپنا انتقام لے اور وہ کبھی وہ موقع ضائع نہیں کرے گا۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی، مگر اس وقت اسے وہ سب بھلا کر ان مواقع پہ توجہ مرکوز رکھنی تھی جو اس کے سامنے تھے۔ عبدالرحمن نے کبھی موقعوں کا انتظار نہیں کیا تھا۔ اس نے موقعے ہمیشہ خود پیدا کیے تھے اور پھر اپنے کام نکلوائے تھے۔ اب بھی وہ یہی کر رہا تھا۔

مگر اس سب سے پہلے اسے اس چھوٹے سے مسئلے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا جو چار، پانچ ماہ قبل اس نے خود کھڑا کیا تھا۔ گو کہ ہر چیز ویسے نہیں ہوئی تھی جیسے اس نے سوچا تھا۔ بڑی غلطی ہوئی اس سے ہاشم پہ اعتبار کر کے، مگر پھر بھی اس سب کا اختتام ویسے ہی ہوگا، جیسے اس

نے سوچا تھا۔ جیسے اس نے پلان کیا تھا، جیسے دیمت فردوس نے مشورہ دیا تھا۔

ایک اتفاقیہ موقع اسے مزید پیدا کرنا تھا۔

اس نے میز پہ رکھا اپنا فون اٹھایا اور فون بک کھولی۔ وہ نمبرز کبھی لوگوں کے اصل نام سے محفوظ نہیں کرتا تھا۔ یہ نمبر بھی اس نے ایکسچینج اسٹوڈنٹ کے نام سے محفوظ کر رکھا تھا۔

کچھ سوچتے ہوئے وہ اس نمبر پہ میسج لکھنے لگا۔

☆ ☆ ☆

چھبیس مئی سے سبانجی میں امتحانات کا موسم چھا گیا۔ اس کٹھن موسم کو نو جون تک جاری رہنا تھا۔ ناقسم کا مجسمہ...... استقلال جدیسی کے چکر، جواہر کی شاپنگ اور پزل باکس کی پہیلیاں، اسے سب بھول گیا تھا۔ اوالار میں رکنے کے باعث ہونے والا نقصان تو وہ پورا کر چکی تھی، مگر یہاں صرف پاس نہیں ہونا تھا، بلکہ ڈسٹنکشن لینی تھی۔ اس کا رزلٹ برا ہوا تو پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس کی ناکامی ہوگی اور رزلٹ اچھا آیا تو پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ کی کامیابی ہوگی۔ وہ حیا سلیمان کو بھلا کر صرف اور صرف ”پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹس“ رہ گئی تھی۔

اکتیس مئی کی صبح استنبول پہ کسی قہر کی طرح نازل ہوئی تھی۔ وہ رات دیر تک پڑھنے کے بعد فجر کے قریب سوئی تھی کہ آج چھٹی تھی، مگر صبح ہی صبح ہالے کسی آندھی طوفان کی طرح ڈورم میں بھاگتی آئی تھی۔

”حیا...... حیا...... اٹھو!“ وہ ہالے کے زور، زور سے پکارنے پہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”کیا ہوا؟“ نیچے اپنے بینک کی سیڑھی کے ساتھ کھڑی ہالے کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ لحاف پھینک کر تیزی سے نیچے اتری۔

”حیا......“ ہالے کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔ حیا نے بے اختیار اس کے ہاتھ پکڑے، جو سرد ہو رہے تھے۔

”ہالے؟“

”حیا...... فریڈم فلوٹیلا...... جو غزہ جا رہا تھا...... اسے روک دیا گیا ہے، اسرائیل نے اس پہ اٹیک کر دیا ہے۔ پتا نہیں، کتنے فلسطینی اور ترک مارے جا چکے ہیں۔“

”اللہ!“ اس نے بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھا...... ”مگر...... مگر وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ ان بحری جہازوں میں تو خوراک تھی، دوائیاں تھیں۔“

”وہ کہتے ہیں کہ ان میں اسلحہ تھا اور دہشت گرد بھی۔ پھر انہیں پوچھنے والا کون ہے؟“

”خدایا! معتصم وغیرہ کتنے پریشان ہوں گے۔ ان کے تو دوست بھی تھے مسافر بردار جہاز میں۔“ اسے بے اختیار یاد آیا۔

ہمیں ان کے پاس جانا چاہیے چلو، جلدی کرو۔“ اس نے جلدی جلدی بال جوڑے میں لپیٹے اور پھر لباس بدل کر، اسکارف لپیٹ کر اور نقاب نفاست سے سیٹ کر کے وہ ہالے کے ساتھ باہر آ گئی۔ کامن روم کے راستے میں اس نے موبائل چیک کیا تو ادھر رات کے کسی ایک پہر ترک موبائل نمبر سے پیغام آیا ہوا تھا۔

”میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے، اے آر پی۔“

”جہنم میں جائے اے آر پی۔“ وہ اس وقت اس پریشانی میں اے آر پی کے سرپرائز کے بارے میں کہاں سوچتی۔

کامن روم میں پانچوں فلسطینی لڑکے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ میز پہ لیپ ٹاپس کھلے پڑے تھے اور موبائل ہاتھوں میں لیے وہ سب اپ ڈیٹس کے منتظر تھے۔ ان کے چہرے دیکھے تو وہ افسوس کے سارے الفاظ بھول گئی۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا کہے۔ وہ اور ہالے خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔

”آئی ایم سوسوری معتصم“ اس کے کہنے پہ معتصم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ہلکی سی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دی اور دوبارہ اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا۔ وہ اس کی تکلیف محسوس کر سکتی تھی، بلکہ نہیں وہ کیسے محسوس کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ وہ خود کو ان کی جگہ پہ

رکھے۔ وہ تصور کرے کہ (اس نے لمبے بھر کو آنکھیں میچ کر سوچا) اگر خدانخواستہ اسلام آباد میں جنگ جاری ہو، پورا شہر اپنے گھروں میں محصور ہو، اس کے گھر والے بیمار اور زخمی ہوں اور پھر وہ ادھر ترکی سے ایک فلوٹیلا پہ انہیں دوائیاں اور خوراک بھیجے، مگر وہ فلوٹیلا کراچی کے ساحل پہ روک لیا جائے، اس میں سوار کچھ لوگوں کو مار دیا جائے اور اس کے گھر والے تڑپتے رہیں۔ ہاں! (اس نے تکلیف سے آنکھیں کھولیں۔) اب وہ محسوس کرسکتی تھی۔ جب تک اپنے ملک اور اپنے گھر پہ بات نہ آئے، کسی دوسرے کا درد محسوس ہی نہیں ہوتا۔

کامن روم کا دروازہ کھول کر ٹالی اندر داخل ہوئی۔ حیا اور ہالے نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو۔ ٹالی چلتی ہوئی سامنے آئی۔ وہ لڑکوں کو دیکھ رہی تھی، مگر ان میں سے کسی نے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔

''معتصم! کیا ہم بات کرسکتے ہیں؟''

معتصم اپنے جوتوں کو دیکھتا رہا، اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

''حسین......!'' وہ حسین کے قریب صوفے پہ بیٹھی، اس کا بیٹھنا گویا کسی کرنٹ کا جھٹکا تھا۔ حسین تیزی سے اٹھا۔ ساتھ ہی چاروں لڑکے اٹھے اور وہ سب اکٹھے باہر نکل گئے۔

ٹالی لب کاٹتے ہوئے انہیں جاتے دیکھتی رہی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دن اس کی اور فلسطینیوں کی مثالی دوستی کا آخری دن تھا۔

ان کے نکلتے ہی دوسری طرف سے لطیف کمرے میں داخل ہوا۔ آہٹ پہ ٹالی اور ان دونوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ لطیف نے جینز پہ سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی، جس پہ کالے مارکر سے نمایاں کر کے لکھا تھا۔

''شیم آن یو اسرائیل!''

ٹالی نے وہ تحریر پڑھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ہالے زیرلب مسکرائی اور حیا کو دیکھا۔ وہ بھی جواباً مسکرائی۔

''ٹالی......ٹرسٹ می، یہ صرف......'' لطیف ہاتھ اٹھا کر بہت دھیمے انداز میں اب ٹالی کو سمجھا رہا تھا کہ اس کی یہ تحریر صرف اسرائیلی حکومت اور اسرائیلی فوج کے لیے تھی۔ اسے ٹالی سے کوئی مسئلہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس سے ناراض تھا۔ ٹالی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ سرہلاتے ہوئے سمجھنے والے انداز میں سنتی رہی۔ لطیف کیتھولک تھا، ڈچ تھا۔ وہ یہ سب کہہ سکتا تھا، مگر فلسطینیوں کی بات اور تھی۔ جو انہوں نے کیا، ہالے اور حیا کو وہ بالکل درست لگا تھا۔

وہ ماتم کا دن تھا۔ گو کہ یونیورسٹی میں سارے کام معمول کے مطابق ہو رہے تھے، مگر در و دیوار پہ چھایا سوگ اور اذیت دل کو کاٹتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں، کس سے انصاف مانگیں۔

''ہٹلر کہتا تھا، میں چاہتا تو تمام یہودیوں کو مار دیتا، مگر میں نے بہت سوں کو چھوڑ دیا، تاکہ دنیا جان سکے کہ میں نے ان کے بھائی بندوں کو کیوں مارا تھا۔''

اور اس جیسی دوسری بہت سی ''کہاوتیں'' اسٹوڈنٹس اپنی اپنی شرٹس پہ لکھ کر پہنے گھوم رہے تھے۔ وہ اور ہالے بھی سارا دن سناٹے میں ڈوبی راہداریوں میں بے مقصد چلتی رہی تھیں۔

پاکستان میں اپنے لاؤنج میں بیٹھے ریموٹ پکڑے ٹی وی پہ فریڈم فلوٹیلا کی خبر دیکھنا اور افسوس کر کے چینل بدل دینا اور بات تھی، مگر ترکی میں رہ کر اس ساری اذیت و تکلیف کا حصہ بننا دوسری بات تھی۔

وہ اینکر پرسن طلعت حسین کا شو کبھی بھی نہیں دیکھتی تھی، مگر یہ بات کہ وہ بھی ان سیکڑوں لوگوں کے ساتھ قید تھے، بہت دل دکھانے والا تھا۔ وہ چھ جہاز تھے، تین کارگو اور تین مسافر بردار۔ یہ سب مختلف جگہوں سے آکر مرمرا میں ایک مقام پہ اکٹھے ہوئے تھے۔ وہاں سے یہ پورا فلوٹیلا غزہ کی جانب گامزن ہوا تھا، تاکہ غزہ کے محصورین کو امداد پہنچا سکے۔ جب فلوٹیلا غزہ کے قریب پہنچا تو اسرائیلی فوج نے جہازوں پر حملہ کر دیا۔ کتنے ہی لوگ شہید کر دیے اور باقی سب قید۔

دوپہر میں وہ اور ہالے باہر سبانجی کے کیفے کے فوارے کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھی، چارٹس اور پلے کارڈز بنا رہی تھیں۔

انہوں نے سنا تھا کہ پورا استنبول سڑکوں پر نکل آیا ہے۔ (سبانجی شہر میں نہیں، بلکہ دور مضافات میں واقع تھی) سو ان کا ارادہ بھی

آج جا کر اس احتجاج میں شامل ہونے کا تھا۔
مئی کے آخر کی دھوپ فوارے کے پانی سے ابل رہی تھی۔ وہ کہنیاں میز پہ ٹکائے سر جھکائے پوسٹر میں رنگ کر رہی تھی۔ اسکارف کے ایک پلو سے نفاست سے کیا گیا نقاب اس کے چہرے کا حصہ بن گیا تھا۔ صرف بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نظر آتیں جو پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ انسان ایک ہی دریا میں دو مرتبہ نہیں اتر سکتا۔ وہ بھی اب وہ والی حیا سلیمان نہیں رہی تھی جو چار ماہ قبل ترکی آئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نامحسوس طریقے سے بدلتی جا رہی تھی۔
ایک ثانیے کو اس کا ذہن صبح آئے پیغام کی جانب بھٹک گیا۔
"کون سا سرپرائز؟" کیسا سرپرائز؟ خیر! عبدالرحمٰن کی ہر بات ہی سرپرائز ہوتی تھی۔ اب تو اس نے حیران ہونا بھی ترک کر دیا تھا۔
پلے کارڈز اور پوسٹرز پیک کر جب وہ کامن روم میں آئی تو سینڈرا، چیری اور سارہ کتابیں گود میں رکھے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ ہالے میز پہ رکھے اپنے بیگ میں کچھ چیزیں ڈال رہی تھیں اور فلسطینی لڑکے بھی افراتفری کے عالم میں آ جا رہے تھے۔ سب کو احتجاج کے لیے استنبول جانا تھا۔
"کیا تم لوگ آؤ گے سارہ؟" اس نے ٹی وی میں مگن تینوں لڑکیوں کو مخاطب کیا۔
"نہیں....." سارہ نے اسکرین پہ نگاہیں جمائے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ چیری اور سینڈرا نے تو اسے دیکھا تک نہیں۔ وہ اسی طرح کھڑی ٹکر ٹکر ان کے چہرے دیکھے گئی۔
ہالے اور فلسطینیوں کے ساتھ سامان پیک کروانے اور احتجاجی شرٹس پہن کر اس کاررواں میں شامل ہونے کے لیے بہت سے ترک اسٹوڈنٹس بھی آ گئے تھے۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو گرمی، سردی، ہر موسم میں منی اسکرٹس میں ملبوس ہوتی تھیں۔ وہ لڑکے جن کا دین، مذہب سے کوئی دور، دور کا واسطہ بھی نہ تھا، کانوں میں بالی اور قابل اعتراض تصاویر والی ٹی شرٹس اور جینز پہننے والے لڑکے اب سب ایک ہو گئے تھے۔ مگر وہ لڑکیاں چیری، سارہ، سینڈرا، تالی، وہ جن کے ساتھ حیا اور ڈی جے رات کو گھنٹوں باتیں کرتی تھیں، جو ساتھ کھاتی پیتی، سوتی جاگتی، ہنستی بولتی تھیں، اب وہی لڑکیاں اجنبی بنی بیٹھی تھیں۔
"یہ لوگ کیوں نہیں چل رہے؟" سب واضح تھا، پھر بھی اس نے الجھن بھرے انداز میں ہالے سے دھیرے سے پوچھا۔ ہالے نے سارہ والی بے نیازی سے شانے اچکائے۔
"کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہیں حیا!"
وہ بالکل چپ کھڑی رہ گئی۔ ان چار ماہ میں انہیں ترک، پاکستانی، فلسطینی، نارویجن، ڈچ، چائنیز، اسرائیل اور ایسی ہی درجنوں تفریقات میں بانٹا گیا تھا، مگر آج قومیت کے سارے فرق مٹ گئے تھے۔ یہودی، عیسائی، بدھسٹ، سب ایک طرف ہو گئے تھے اور مسلمان اسٹوڈنٹس ایک طرف۔
اور وہ بھی کن سرابوں کے پیچھے دوڑا کرتی تھی؟ اسے بھی کن لوگوں کا لباس، کن کا رہن سہن اچھا لگتا تھا؟
انجم باجی اور جاوید بھائی سمیت وہ سب جب ٹاقسم پہ پہنچے تو وہ پانچ منٹ کے لیے معذرت کر کے تیزی سے استقلال اسٹریٹ کی طرف چلی آئی۔ اسے جہان کو بھی اپنے ساتھ لینا تھا۔ جتنے زیادہ مسلمان ہوں، اتنا بہتر تھا۔ برگر کنگ پہ معمول کی گہما گہمی تھی۔ وہ ریسٹورنٹ کی میزوں سے ہٹ کر اندر جانے والے دروازے میں داخل ہو گئی۔ کچن میں ایک ترک لڑکی اور ایک نیا لڑکا کام کر رہے تھے۔ دونوں شیف تھے۔
"سلام! جہان کہاں ہے؟" اس نے ارد گرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے لڑکے کو مخاطب کیا۔
"وہ ابھی تو یہیں تھا۔ گوشت کاٹ رہا تھا۔ اب شاید....." لڑکے نے مڑ کر ایک دوسرے دروازے کی طرف دیکھا۔ "شاید ڈریسنگ روم میں ہو یا پھر باتھ روم میں۔"
اسی پل ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا۔ حیا نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔ جہان اندر داخل ہو رہا تھا، یوں کہ سر جھکائے وہ

آنکھوں کو انگلیوں سے رگڑ رہا تھا۔

"جہان!" اس نے پکارا تو جہان نے چونک کر گردن اٹھائی۔ اس کی آنکھیں بھیگی اور سرخ سی ہو رہی تھیں۔ وہ بمشکل مسکرایا اور سلیب کی طرف آیا۔

"السلام علیکم! تم کب آئیں؟" وہ اس سے نظر ملائے بغیر گردن جھکا کر ٹرے سے گوشت کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔

"ابھی......تم......تم ٹھیک ہو؟" وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"ہاں! بس پیاز کاٹنے سے آنکھوں میں تھوڑی جلن ہو رہی تھی، تو ابھی منہ دھونے گیا تھا۔" اتنی لمبی وضاحت؟ وہ بھی جہان دے؟ اور پیاز......اس نے ارد گرد دیکھا، پیاز تو کہیں نہیں تھی۔

"تم بتاؤ! کیسے آئیں؟"

"وہ......ہم اسٹریٹ پروٹیسٹ کے لیے جا رہے ہیں، فریڈم فلوٹیلا پہ حملے کے خلاف۔ تم چلو گے؟"

"پروٹیسٹ کیوں؟ ان بحری جہازوں میں اسلحہ نہیں تھا؟"

"اسلحہ؟ نہیں جہان! ان میں دوا اور خوراک تھی۔" اس نے اچنبھے سے جہان کو دیکھا۔ کیا وہ اتنا بے خبر تھا؟

"یہ تو تم کہہ رہی ہو......اسلحہ نہ ہوتا تو اسرائیلی کیوں روکتے اسے؟" وہ لاپروائی سے کہتے ہوئے گوشت کے قتلے کھٹا کھٹ کاٹ رہا تھا۔

"جہان! کیا تمہیں لگتا ہے کہ ان کو کسی وجہ کی ضرورت ہے؟"

"یہ ان کی آپس کی جنگ ہے حیا! یہ فلسطینی بھی اتنے سیدھے نہیں ہوتے۔ یہ جہاد وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ سب دہشت گردی کی قسمیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ فلوٹیلا کو واقعی ناجائز روکا گیا ہو، مگر ہمیں فلسطینیوں سے زیادہ فلسطینی بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔"

"جہان! یہ کیسے ہمارا مسئلہ نہیں ہے، ہمارے ریجن کو ہماری ضرورت ہے۔"

"ہمارا ریجن ہمارے پیدا ہونے سے پہلے بھی تھا اور ہمارے مرنے کے بعد بھی رہے گا۔ اسے ہماری قطعاً ضرورت نہیں ہے اور پلیز! تم اس محمد بن قاسم ایرا کے رومانس سے نکل آؤ۔"

وہ بہت بے زاری سے گردن جھکائے کام کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

یہ کیسا جہاد ہے کہ بوڑھے ماں، باپ کو چھوڑ کر بندوق اٹھائے نکل پڑو۔ جہاد تو وہ ہوتا ہے جو ایک آدمی اپنے گھر والوں کے لیے مشقت کر کے روزی کماتا ہے، جو میں کرتا ہوں، جو اس ریسٹورنٹ میں میرے ورکرز کرتے ہیں۔"

"جہنم میں گیا تمہارا ریسٹورنٹ......بہر حال میں تم سے متفق نہیں ہوں......اور اگر تم غلط ہو کر اتنے پراعتماد ہو سکتے ہو تو میں صحیح ہو کر پراعتماد کیوں نہ ہوؤں؟" وہ تلخی سے کہہ کر پلٹ گئی۔

جہان نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا، پھر سر جھٹک کر کام کرنے لگا۔

مسلمان اسٹوڈنٹس کا دوسرے ترک باسیوں کے ساتھ اسٹریٹ پروٹیسٹ جاری تھا۔ پلے کارڈز اور بینرز اٹھائے وہ نعرے بلند کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک شخص زور سے پکارتا تھا "ڈاؤن ود؟" تو باقی لوگ ہم آواز ہو کر "اسرائیل" چلاتے۔ ہر طرف "Down with Israel" کے نعروں کی گونج تھی۔ پاکستان میں ایسے مظاہروں میں عموماً مردوں، عورتوں کے درمیان تفریق سی ہوتی تھی، مگر ترکی میں دونوں صنف اکٹھے ہی ریلی میں چل رہے تھے۔ یوں بہت بچ بچ کر چلنا پڑتا، لیکن اس کا ذہن ابھی تک جہان میں اٹکا تھا۔

ہر ایک کے سیاسی تجزیات الگ ہوتے ہیں سب کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے، پھر اسے کیوں بار بار رونا......آ رہا تھا اور وہ کیوں بار بار اپنے آنسو بمشکل روک رہی ہے؟

وہ اسرائیلی ایمبیسی کے قریب بھی نہیں پہنچ سکے۔ معتصم کا وعدہ پورا نہ ہو سکا، مگر ان کا احتجاج شاندار رہا۔ اگلے روز اس کا پیپر تھا۔

وہ بے دلی سے تھوڑا بہت پڑھ کر جلدی سو گئی اور پھر صبح منہ اندھیرے اٹھ کر کتابیں لیے جھیل پہ آ گئی۔

ہر سو نیلا سا اندھیرا چھایا تھا۔ جون شروع ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گرمی صرف دن میں ہوا کرتی تھی۔ وہ پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ گئی اور گھٹنوں پہ کتاب رکھ لی۔ ہوا کے باعث شال سر سے پھسل کر گردن کی پشت پہ جا ٹھہری۔ دور، دور تک کوئی نہ تھا، وہ وہاں اکیلی تھی۔

رونا تو اسے رات سے ہی آ رہا تھا، مگر اب اس میں شدت آ گئی تھی۔ وہ سر جھکائے بے آواز آنسو بہاتی رہی۔ گھر، ابا، اماں، روحیل سب بہت یاد آ رہے تھے۔

دفعتاً اس کا فون بجا۔ اس نے گھاس پہ رکھا موبائل اٹھایا۔

''جہان کالنگ'' اس وقت؟ خیریت! وہ حیران ہوئی۔

''جہان! کیا ہوا؟'' وہ زکام زدہ آواز میں ذرا پریشانی سے بولی۔

''تم جاگ رہی ہو؟ آج تمہارا پیپر ہے نا۔''

''ہاں! میں جھیل پہ ہوں، تم کہاں ہو؟''

''ایک کام سے قریب میں آیا تھا، بس تم رکو! میں آ رہا ہوں۔''

حیا نے موبائل بند کیا اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑے۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنا غیر متوقع رویے رکھنے والا شخص نہیں دیکھا تھا۔

''ہیلو!'' چند ہی منٹ بعد وہ اس کے ساتھ آ بیٹھا تھا۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ جینز اور چاکلیٹ کلر کی شرٹ میں وہ بہت ترو تازہ لگ رہا تھا۔

''تم اتنی صبح کیسے؟''

''یہاں مجھے قریب میں پہنچنا تھا، سات بجے تک۔ سوچا جلدی آ جاؤں تاکہ پہلے تم سے مل لوں۔ مجھے لگا تم کل ذرا ناراض ہو گئی تھیں۔'' وہ اسی کے انداز میں اکڑوں بیٹھا اب جھیل کے پانی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی پانی کو ہی دیکھ رہی تھی۔

''نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

''حیا! ایک بات کہوں؟ کبھی بھی اپنے قرابت داروں سے ان کی پولیٹیکل ویوز کے باعث ناراض نہیں ہوتے۔'' وہ بہت نرمی سے دھیمے انداز میں سمجھا رہا تھا۔ وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے کچھ یاد آیا تھا۔

''ہر شخص کے رویے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ جب تک آپ کسی دوسرے کی جگہ پہ کھڑے ہو کر نہیں دیکھتے، آپ کی سمجھ میں پوری بات نہیں آ سکتی۔ ہر کہانی کی ایک دوسری سائیڈ ضرور ہوتی ہے۔'' اس نے چہرہ موڑ کر حیا کو دیکھا۔ ''اب بتاؤ کیوں رو رہی تھیں؟''

''یوں ہی۔'' وہ فوراً نگاہ چرا کر پانی کو دیکھنے لگی۔ ''بس گھر یاد آ رہا تھا۔''

''صبر کر لو، انسان کو ہمیشہ اتنی ہی تکلیف ملتی ہے جتنی وہ سہہ سکے۔''

''اور اگر وہ نہ سہنا چاہے؟ آخر کیوں انسان کو سہنا پڑتا ہے سب کچھ؟ زندگی آسان کیوں نہیں ہوتی جہان؟'' اس کی آنکھیں پھر سے بھیگ گئیں۔ وہ ابھی تک پانی کو دیکھ رہی تھی جو چمک رہا تھا۔ جیسے نیلے آسمان پہ چاندی کے تھال کی طرح کے چاند سے قطرہ قطرہ چاندی پگھل کر جھیل کی سطح پہ گر رہی تھی۔

''ابھی تمہاری اسٹوڈنٹ لائف ہے، اسے جتنا انجوائے کر سکتی ہو، کرو۔ کیونکہ اس کے بعد زندگی اپنا نقاب اتار پھینکتی ہے اور چیزیں بہت مشکل ہو جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی تمہاری زندگی مشکل ہو جائے گی۔ تم کرو گی مجھ سے شادی؟''

لمحے بھر کو چاندی کی تہہ جھیل کی سطح سے پھیل کر سارے سبزہ زار پہ چڑھتی گئی۔ وہ ہر شے کو چاندی بنا گئی اور وہ دونوں بھی چاندی

کے مجسمے بنے رہ گئے، چمکتے ہوئے سلور مجسمے۔

"ہماری شادی ہو نہیں چکی؟"

"وہ تو ہمارے بڑوں نے کی تھی۔ اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ تم مجھے جانتی ہو۔ میں کوئی ہر وقت ہنستا مسکراتا آدمی نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں، میں بعض دفعہ بہت سخت ہو جاتا ہوں اور تب تمہیں میں بہت برا لگتا ہوں۔ مجھے پتا ہے، مگر میں ایسا ہی ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ ساری زندگی رہ لوگی؟" وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ حیا نے دھیرے سے شانے اچکائے۔

"استنبول میں ہر حالات میں رہنے کے لیے تیار ہوں میں۔"

"اللہ نہ کرے، جو ہم یہاں رہیں۔" وہ ایک بالکل غیر ارادی طور پہ چونک کر بولا۔ چاندی کے دوسرے مجسمے نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟"

"یوں ہی کہہ رہا تھا۔" پہلے مجسمے نے گردن موڑ لی۔

"تمہیں پھپھو نے کب بتایا کہ ہم.....؟" وہ بات ادھوری چھوڑ گئی۔

"وہ کیوں بتاتیں؟ میں اس وقت آٹھ سال کا تھا اور آٹھ سال کے بچے کا حافظہ اچھا خاصا ہوتا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے پتا تھا۔"

"میں سمجھی تھی کہ تمہیں نہیں پتا۔" بے اختیار اس نے زبان دانتوں تلے دبائی۔ زبان بھی چاندی بن چکی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، میں ہر کسی سے معذرت کرنے آجاتا ہوں یا..... ہر لڑکی کو ڈنر کے لیے لے جاتا ہوں؟" وہ ذرا خفگی سے اس معذرت کا حوالہ دینے لگا، جب اس نے اس کا جنجر بریڈ ہاؤس توڑا تھا۔

"تم میری بیوی ہو اور میرے لیے بہت خاص ہو۔ بس میرے کچھ مسئلے ہیں۔ وہ ٹھیک ہو جائیں تو ہم اپنی زندگی شروع کریں گے۔"

چاندی کی تہ اب سبزہ کے دہانوں سے پھیلتی ڈورم بلاکس پہ چھاتی جا رہی تھی۔ پوری دنیا، زمین، آسمان، سب چاندی بنتا جا رہا تھا۔

"حیا! ہمارے بہت مسئلے رہے ہیں، مگر میری ماں..... ہم انہیں ٹھیک کر لیں گے۔" وہ زخمی انداز سے مسکرایا۔ "ہم ہمیشہ سے ساتھ مل کر اپنے مسئلے ٹھیک کرتے آئے ہیں۔ ہم نے بہت اذیتیں کاٹی ہیں۔ بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ مگر میری ماں بہت مضبوط عورت ہے، بہت نڈر، بہت بہادر۔ انہوں نے ساری زندگی بوتیکس کے لیے کپڑے سی کر مجھے کسی قابل بنایا ہے وہ اب بھی یہ کام کرتی ہیں، مگر انہوں نے تمہیں نہیں بتایا ہوگا۔ وہ اپنے مسئلے کسی سے بیان نہیں کرتیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اتنی ہی مضبوط اور بہادر بن جاؤ۔" وجیہہ مجسمہ اٹھ کھڑا ہوا تو چاندی کا خول چٹخا۔ سبزہ زار پہ چڑھے ورق میں دراڑیں پڑ گئیں۔

"میں چاہتا ہوں، تم اچھا سا ایگزام دو اور اگر لندن چلنے کا موڈ ہو تو بتانا۔" ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتا، وہ جانے کے لیے مڑ گیا۔

وہ بھیگی آنکھوں اور نیم مسکان کے ساتھ اسے جاتے دیکھتی رہی۔

چاندی کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر جھیل کے پانی میں گم ہو رہے تھے۔ چاند اب سرخ نارنجی روشنی کے نقطوں میں ڈر کر بالوں کی اوٹ میں تیرنے لگا تھا۔ فسوں ختم ہو چکا تھا، حقیقی دن کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

چھ جون کو جب تک اسرائیل نے سارے قیدی رہا کر دیے تب تک سبانجی اور استنبول میں غم و غصے کی فضا چھائی رہی۔ قیدیوں کی رہائی کے لیے مظاہرے، طیب اردگان کے سخت بیانات اور فلسطینی اسٹوڈنٹس کا تناؤ اور بھی بہت کچھ ہوا جو ہماری کہانی کے دائرہ کار سے باہر ہے۔ بہر حال، ماوی مرمرا اور فریڈم فلوٹیلا کی پریشانی ختم ہوئی تو سب ایگزامز کی طرف متوجہ ہو گئے۔

وہ امتحان بھی اسی لمبے اسکرٹ، فل سلیو بلاؤز اور اسکارف سے کیے گئے نقاب میں ویتی گئی اور اب اسے اپنے چہرے کی عادت ہوتی جا رہی تھی۔ کندھے پہ بیگ لٹکائے اور سینے سے فائل لگا کر بازو لپیٹے وہ سر اٹھا کر بہت اعتماد سے جب سبانجی کی راہداری میں چلتی تو اسے ٹالی اور اس کی دوستوں کی آوازوں کی پروا نہ ہوتی۔

تالی ابھی بھی اسے استہزائیہ انداز میں Arap baci کہتی تھی۔ (عرب باجی، یہ اردو والا باجی ہی تھا کہ ترکوں کا "C" جیم کی آواز سے پڑھا جاتا تھا۔) البتہ تالی اور فلسطینی لڑکوں کے درمیان فریڈم فلوٹیلا کی کھینچی گئی لکیر ہنوز قائم تھی گو کہ ڈی جے اپنی دلی خواہش کی تکمیل دیکھنے کے لیے زندہ نہیں تھی۔

نو جون کو امتحان ختم ہوئے تو الوداعی دعوتوں کا آغاز ہو گیا۔ پچاس ممالک کے ایکسچینج اسٹوڈنٹس میں سے کچھ آخری مہینے میں دوسرے ممالک جا رہے تھے، جبکہ کچھ ترکی میں ہی رہ رہے تھے۔ وہ عائشے کے پاس بیوک ادا جانا چاہتی تھی، مگر وہاں عبدالرحمٰن تھا اور ابھی کافی تو اسے یاد ہو گی۔ وہ بدلہ بھی لے گا، مگر اسے پروا نہیں تھی۔ بس چند دن ہیں، پھر وہ پاکستان چلی جائے گی تو نہ وہاں عبدالرحمٰن ہوگا، نہ آواز گھنے والی تالی۔ وہاں اس کے حجاب کی عزت ہو گی۔ پہلی دفعہ اسے تایا فرقان کے الفاظ برے نہیں لگے تھے۔ وہ ٹھیک ہی ارم پہ روک ٹوک کرتے تھے۔ ابا اور تایا کتنے خوش ہوں گے اس کے حجاب پہ۔ مگر نہیں اسے ان کی خوشی سے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ وہ کسی کی ستائش کے لیے تو یہ سب نہیں کر رہی۔

"ستائش کے لیے اگر کوئی حجاب لے تو جلد ہی چھوڑ دے، کیونکہ یہ وہ کام ہے، جس میں ریا ہو ہی نہیں سکتی۔" عائشے نے اس کی بات پہ ہنس کر کہا تھا۔ وہ اتنے دنوں بعد آج بیوک ادا آئی تھی اور اب وہ تینوں ساحل کے کنارے ایک اوپن ایئر کیفے میں بیٹھی تھیں۔

اس سے قبل وہ ان دونوں بہنوں کے ساتھ حلیمہ آنٹی کی طرف بھی ہو آئی تھی۔ آنٹی، عثمان انکل اور سفیر کے ساتھ کہیں نکل رہی تھیں۔ بس دروازے پہ ہی کھڑے کھڑے سلام دعا ہو سکی۔ عثمان انکل ویسے ہی تھے، بھاری بھرکم اور خوش مزاج۔ ڈی جے کا افسوس کرنے لگے تو عادتاً بولتے ہی چلے گئے اور بہارے گل برے برے منہ بنا کر سننے گئی۔ ایک وہی تھی جو اپنے تاثرات نہیں چھپایا کرتی تھی۔ سفیر سے البتہ بہارے اور عائشے دونوں بور نہیں ہوتی تھیں۔ وہ اکثر اس کا ذکر کرتی تھیں اور اب حیا کی سفیر سے سرسری سی ملاقات بھی ہو گئی تھی۔ وہ تیئس، چوبیس برس کا خوش مزاج سا لڑکا تھا جیسا کہ یورپ میں مقیم پاکستانی لڑکے ہوتے ہیں۔

اس کی شادی اس کے والدین پاکستان میں زبردستی کرنے کے خواہاں تھے اور یہ قصہ بہارے اتنی دفعہ دہرا چکی تھی کہ وہ حیا کے لیے اہمیت کھو چکا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا ہوٹل گرینڈ میں کام کرتے تھے اور اس دس منٹ کی ملاقات میں بھی چند ایک بار سفیر کے لبوں سے "عبدالرحمٰن بھائی" ضرور نکلا تھا۔ وہی ستائش بھرا، فخر سے نام لینے کا انداز جو ان دونوں بہنوں کا بھی خاصہ تھا۔ پتا نہیں، ان سب کو عبدالرحمٰن میں کیا نظر آتا تھا۔

جانے سے قبل اس نے ایک دفعہ سوچا کہ عثمان شبیر سے پوچھ لے کہ جہاز میں انہوں نے اگلی نشست پہ بیٹھی ترک عورت کو کیا کہا تھا کہ وہ خفگی سے واپس مڑ گئی تھی، مگر پھر اس نے جانے دیا۔ بعض باتیں ادھوری ہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے۔

"اور ریاکاری کی ایک پہچان ہوتی ہے حیا!" عائشے کہہ رہی تھی۔ "بعض دفعہ بندے کو خود بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ دکھاوا کر رہا ہے، مگر ایسے کام کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اللہ اس پہ کبھی ثابت قدمی عطا نہیں کرتا۔" ساحل کے کنارے پر سیاحوں کا خاصا رش تھا۔ بیوک ادا، استنبول والوں کا "مری" تھا۔ موسم گرما شروع ہوتے ہی سیاحوں کا رش لگ جاتا تھا۔

بھورے، سرمئی پروں والے سمندری بگلے بھی ساحل کی پٹی کے ساتھ ساتھ اڑ رہے تھے۔

بہارے کے ہاتھ میں روٹی تھی اور وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بگلوں کی طرف اچھال رہی تھی۔ ایک ٹکڑا ابھی زمین پہ نہ گرتا، بگلے فضا میں ہی اسے چونچ میں دبا لیتے۔

"ثابت قدمی واقعی مشکل ہوتی ہے عائشے! میری ساتھی اسٹوڈنٹس اکثر مجھ پہ آواز کس کر پوچھتی ہیں کہ میں نے اس بڑے سے اسکارف کے اندر کیا چھپا رکھا ہے؟"

"تم آگے سے کہا کرو، خودکش بم چھپا رکھا ہے۔" بہارے نے اس کی طرف گردن جھکا کر رازداری سے کہا تھا، مگر اس کی بہن نے سن لیا۔

"بری بات، بہارے!" عائشے نے خفگی سے اسے دیکھا۔ "جب اچھی لڑکیاں کوئی فضول بات سنتی ہیں تو اسے بہت باوقار طریقے

سے نظر انداز کر دیتی ہیں۔'' بہارے نے اتنی ہی خفگی سے سر جھٹکا اور روٹی کے ٹکڑے توڑنے لگی۔

''خیر ہے بہارے! بس جولائی میں، میں واپس چلی جاؤں گی اور وہاں نہ ترک حکومت کی سختی ہوگی، نہ اسرائیلی طعنے، میں ادھر پوری آزادی کے ساتھ حجاب لے سکوں گی۔''

''ضرور، مگر خندق کی جنگ میں ایک بنو قریظہ مل ہی جاتا ہے حیا!''

''مطلب؟'' اس نے ناسمجھی سے ابرو اٹھائی۔ جواباً عائشے اپنے خاص انداز میں مسکرائی، جیسے اس کے پاس دکھانے کے لیے کوئی خاص جواہر ہو۔

''تم نے کبھی سوچا ہے حیا کہ آیت حجاب سورہ احزاب میں ہی کیوں آئی ہے؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے ایک نیا سوال کیا۔

اس نے ذہن پر زور دیا، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''شاید اس لیے کہ یہ حکم غزوہ احزاب کے قریب ہی اترا تھا۔''

''یہ تو سب کو نظر آتا ہے حیا!'' میں تمہیں وہ سمجھاؤں جو سب کو نظر نہیں آتا؟ یقین کرو، یہ تھی تمہارے پزل باکس کی پہیلیوں سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوگی۔''

حیا لاشعوری طور پر کرسی پہ ذرا آگے ہوئی۔ بہارے برے برے منہ بناتی روٹی کے ٹکڑے اچھال رہی تھی۔ وہ بول نہیں سکتی تھی کہ عائشے سن لیتی اور سب کے سامنے وہ ہمیشہ عائشے کی وفادار رہتی تھی، لیکن اس نے ایک قدیم لوک کہانی میں پڑھا تھا کہ مرمرا کے بگلے ان کہی باتیں بھی سن لیتے ہیں، سو اس نے دل ہی دل میں ان پھڑ پھڑاتے بگلوں کو مخاطب کیا تھا۔

(عبدالرحمٰن ٹھیک کہتا ہے، میری بہن کو لیکچر دینے کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ کیا تم نے سنا، میں نے کیا کہا؟)

''اللہ چاہتا تو کسی اور سورہ میں یہ حکم نازل کر دیتا، یا اس سورہ احزاب کا نام کچھ اور رکھ دیتا، مگر یہی نام کیوں؟''

ایک چھوٹے بگلے نے فضا میں ہی بہارے کا پھینکا ٹکڑا اچکا اور پر پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑ گیا۔ بہارے نے گردن اٹھا کر اسے اوپر اڑتے دیکھا۔ کیا اس نے سنا تھا جو وہ اس سے کہہ رہی تھی؟

''تمہیں پتا ہے، احزاب کہتے ہیں گروہوں کو اور ''غزوہ احزاب'' دراصل غزوہ خندق کا دوسرا نام ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم یہ سارا واقعہ جانتی ہو کہ کس طرح مسلمانوں نے خندق کھودی، مگر پھر بھی میں تمہیں یہ دوبارہ سنانا چاہتی ہوں۔''

(میری بہن حیا کو بور کر رہی ہے، اگر عبدالرحمٰن ادھر ہوتا تو یہی کہتا، کیا تم نے اب سنا؟) مگر بگلے بس روٹی چونچوں میں دبا کر اڑ جاتے۔

''تمہیں پتا ہے مدینہ میں یہود کے ساتھ مومنین کا معاہدہ تھا کہ مدینہ پر حملہ ہوا تو مل کر دفاع کریں گے، مگر یہود تو پھر یہود ہوتے ہیں۔ بنو قریظہ، یہود کے گروہ نے اہل مکہ سمیت کئی گروہوں کو جا جا کر اکسایا کہ مدینہ پہ حملہ کر دیں، وہ ان کے ساتھ ہیں۔ یوں جب سارے گروہوں نے لشکر کی صورت مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈال دیا تو بنو قریظہ، آپ کا اعتماد توڑ کر ''گروہوں'' کے ساتھ جا ملا۔'' عائشے سانس لینے کو رکی۔ بہارے بگلوں کو بھول کر، روٹی توڑنا چھوڑ کر عائشے کو دیکھ رہی تھی۔

''تب مسلمانوں نے اپنے دشمن کے ''گروہوں'' کے درمیان ایک بہت لمبی، بہت گہری خندق کھودی تھی۔ سردی اور بھوک کی تکلیف واحد تکلیف نہیں تھی۔ اصل اذیت کسی حلیف کے دھوکا دینے کی ہوتی ہے۔ باہر والے تو دشمن ہوتے ہیں، مگر جب کوئی اپنا بیچ جنگ میں چھوڑ کر چلا جائے، وہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی لیے جب یہ ''گروہ'' محاصرے سے تنگ آ کر ایک عرصے بعد واپس چلے گئے اور بنو قریظہ خوف کے مارے اپنے قلعوں میں چھپ گئے، تو ان کو سزا یہ ملی کہ بنو قریظہ کے ایک ایک مرد کو چن چن کر مارا گیا کہ یہ اللہ کا حکم تھا۔ جانتی ہو، میں نے تمہیں اتنی لمبی کہانی کیوں سنائی؟''

''کیوں؟'' حیا کے بجائے، بہارے کے لبوں سے پھسلا۔ وہ اب ساری خفگی بھلائے عائشے کی طرف پوری گھومی بیٹھی تھی۔

''کیونکہ حجاب پہننا، جنگ خندق کو دعوت دینا ہے۔ گروہوں کی جنگ میں حجابی لڑکی کو دل پہ پتھر باندھ کر اپنے گرد خندق کھودنی پڑتی ہے، اتنی گہری کہ کوئی پاٹنے کی جرات نہ کر سکے۔ اور پھر اسے اس خندق کے پار محصور رہنا پڑتا ہے۔ اس جنگ میں اصل دشمن اہل مکہ نہیں

ہوتے، بلکہ اصل تکلیف بنو قریظہ سے ملتی ہے۔ یہ جنگ ہوتی ہی بنو قریظہ سے ہے اور خندق کی جنگ بھی کبھی بنو قریظہ کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔"

عائشے خاموش ہوئی تو کوئی سحر سا ٹوٹا۔ حیا نے سمجھ کر سر ہلایا۔ قرآن کی پہیلی زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔

"تم صحیح کہہ رہی ہو مگر شکر ہے میری فیملی حجاب کی بہت بڑی حامی ہے۔ میرا ان سے ساری زندگی نقطہ اختلاف ہی یہ رہا ہے۔"

"ہوسکتا ہے تمہاری اس جنگ میں کوئی بنو قریظہ نہ ہو۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" عائشے نے مسکرا کر دعا دی تھی۔

"مگر عائشے......!" بہارے کچھ کہتے کہتے الجھ کر رک گئی، ان دونوں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ وہ قدرے مبہم سے تاثرات کے ساتھ کچھ سوچ رہی تھی۔

"کیا ہوا بہارے؟"

"کچھ نہیں۔" بہارے سنبھل کر مسکرائی۔ اسے حیا کے سامنے عائشے کا ہمیشہ وفادار رہنا تھا، لیکن بعد میں تنہائی میں وہ اسے بتائے گی کہ اس نے ابھی پوری پہیلی حل نہیں کی، وہ احزاب کی پزل میں کچھ مس کر گئی تھی۔ وہ اصل نتیجہ نہیں جان سکی تھی اور وہ تو کتنے سامنے کی بات تھی۔ بہارے نے ذرا سا غور کیا تو اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے دل ہی دل میں وہ بات بگلوں سے دہرائی۔

(کیا تم نے اب سنا؟ کیا تم نے سنا؟)

قریب ہی ساحل پہ پھدکتے بگلے نے ریت میں کچھ ڈھونڈنے کے لیے گردن جھکائی تھی۔ کیا یہ اثبات کا اشارہ تھا؟ بہارے گل سمجھ نہیں سکی۔

☆ ☆ ☆

امتحانات کا موسم ختم ہوا تو الوداعی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسٹوڈنٹس نے اب آخری مہینے کی سیاحت کے لیے روانہ ہونا تھا، سو سبانجی میں ایک دفعہ پھر سے وہی ماحول چھا گیا جو اسپرنگ بریک سے پہلے چھایا تھا۔ روانگی کی تیاریاں، پیکنگ، آخری شاپنگز، نقشے، گائیڈ بکس، صرف وہی تھی جس نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

اس رات ان کے ڈورم میں پوٹ لک Potluck ڈنر تھا۔ سب ایکسچینج اسٹوڈنٹس اپنے ممالک کی ڈشز تیار کر کے لا رہے تھے۔ دیسی کھانوں میں بریانی کے علاوہ اسے صرف چکن کڑاہی بنانی آتی تھی، سو انجم باجی کے اپارٹمنٹ پہ ان کے ساتھ مل کر اس نے وہی بنائی۔ نمک مرچ البتہ ذرا تیز ہو گیا تھا۔

"چلو خیر ہے، کم بنی ہے تو کم ہی کھائیں گے سب۔" انجم باجی نے اسے تسلی دی۔ ابھی وہ دونوں ان کے کمرے میں بڑے آئینے کے سامنے کھڑی تیار ہو رہی تھیں۔ حیا اپنا سیاہ اسکارف ٹھوڑی تلے پن اپ کر رہی تھی، جبکہ انجم باجی آئی شیڈ لگا رہی تھیں۔ انہوں نے سلک کا نارنجی سا جوڑا پہن رکھا تھا۔ جوڑا اچھا تھا، مگر قمیص کافی چھوٹی اور شلوار کھلی تھی یا تو انجم باجی ذرا آؤٹ ڈیٹڈ تھیں یا انڈیا میں ابھی تک پٹیالہ شلوار اور چھوٹی قمیص کا فیشن چل رہا تھا (پاکستان سے تو وہ عرصہ ہوا غائب ہو چکا تھا) اس نے سوچا مگر کہا نہیں۔

"تم آج تو نقاب مت کرو، آج تو پارٹی ہے۔" اسے نقاب اڑستے دیکھ کر انجم باجی ذرا بے چینی سے بولی تھیں۔ وہ ذرا چونکی، پھر دھیرے سے مسکرائی۔

"پارٹی تو ہے انجو باجی! مگر لوگ تو وہی ہیں جن سے سارا دن نقاب کرتی ہوں۔ اب اتارا تو کتنا برا لگے گا۔"

اس نے بے حد رسان سے سمجھایا، تو انہوں نے سر ہلا دیا۔

"ہاں، یہ تو ہے۔"

"اپنے دیسی لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں نا، حجاب پہ آپ کو ویسے اذیت نہیں دیتے جیسے ٹالی جیسے لوگ دیتے ہیں۔"

شکر ہے انجم باجی نے دوبارہ اعتراض نہیں کیا۔ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ وہ بھی تو ان کے پرانے فیشن پہ کچھ نہیں بولی تھی۔ اس نے پیشانی سے اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے سوچا تھا۔

آج اس نے سیاہ سلک بلاوز اور اسکرٹ کے ساتھ سیاہ اسکارف لیا تھا۔ پورا لباس سیاہ تھا، بس آستین پہ کلائیوں کے گرد سفید

موتیوں کی دہری لڑی لگی تھی۔ جو مدھم سی چمکتی تھی۔

ڈورم بلاک کے کامن روم میں روشنیوں کا سا سماں تھا۔ کرسیوں کے پھول ویسے ہی بنے تھے جیسے حسین کی سالگرہ کے دن بنائے گئے تھے۔ (آہ، اس کا جنجر بریڈ ہاؤس اور ڈی جے!) یورپین لڑکیاں بہت دل سے تیار ہوئی تھیں۔ شولڈر لیس ملبوسات جو گھٹنوں پر سے اوپر آتے تھے۔ جیسے وہ کوئی ہر وم نائٹ ہو۔ ایسے میں وہ سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں خاموش سی بیٹھی تھی۔ فلسطینی لڑکے اور ہالے، اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے سو نہیں آسکے تھے۔ وہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ دل میں عجیب سی ویرانی چھائی تھی، جیسے وہ کسی غلط جگہ پہ آگئی ہو۔

اگر وہ پہلے والی حیا ہوتی تو ایسے تیار ہوتی کہ کوئی اسے نظر انداز نہ کر پاتا۔ وہ موقع کی مناسبت سے ساڑھی، اونچا جوڑا اور ہائی ہیلز پہنتی اور۔ اس نے سر جھٹکا زمانہ جاہلیت کی کشش ثقل آخر مرتی کیوں نہیں ہے؟ وہ کیوں بار بار کھینچتی رہتی ہے؟ حالانکہ وہ قطعاً واپس اس دور میں نہیں لوٹنا چاہتی تھی، وہ تو اس پہاڑی پہ قدم بہ قدم اوپر چڑھنا چاہتی تھی، پھر اب وہ نیچے کیوں دیکھ رہی تھی؟ نیچے تو کھائی تھی۔

کھانا شروع ہو چکا تھا۔ اسٹوڈنٹس ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے پلیٹیں لیے ادھر ادھر گھوم رہے تھے ٹالی اپنی ڈش اٹھائے لے آئی تھی۔ پتا نہیں گوشت اور گاجر کا کیا ملغوبہ تھا جس کا وہ ایک بہت مشکل سا عبرانی نام لے رہی تھی۔ اس نے بہت خوش دلی سے حیا کے آگے ڈش کی تو حیا نے شکریہ کہتے ذرا سا پلیٹ میں ڈالا۔ ٹالی مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ حیا نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹکتے کانٹے میں گوشت کا ٹکڑا پھنسایا، پھر ایک دم ٹھہر گئی۔

وہ تو نقاب میں بیٹھی تھی۔ نقاب کے ساتھ وہ کیسے کھا سکتی تھی، اسے کیوں بھول گیا کہ وہ نقاب کے ساتھ نہیں کھا سکتی؟

اس نے بے بسی سے ارد گرد دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا مگر وہاں بہت سے لڑکے تھے۔ وہ نقاب نہیں اتار سکتی تھی، کم از کم ٹالی کے اس ملغوبے کے لیے تو نہیں۔

اس نے بے دلی سے کانٹا پلیٹ میں گرا دیا۔ دل کی ویرانی بڑھ گئی تھی۔ اتنے سارے ایک جیسے لوگوں میں ایک ہی مختلف سی لڑکی پتا نہیں کہاں سے آگئی تھی۔ وہ ان سب میں بالکل مس فٹ تھی۔ اجنبی، ایلین کسی اور دنیا سے تعلق رکھنے والی۔ یہ اس کی دنیا نہیں تھی۔ آگے پاکستان میں بھی تو دعوتیں اور تقریبات ہوں گی۔ وہ تو ادھر بھی مس فٹ لگے گی۔ یوں اس لبادے میں خود کو لپیٹے، الگ تھلگ، خاموش سی، لوگ تو اسے پاگل کہیں گے۔ اسے اجنبی کہیں گے۔ اسے لوگوں کی باتوں سے فرق نہیں پڑتا تھا، مگر خود اس کو سارا منظر بہت اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ وہ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں ''اوڈ ون آؤٹ'' وہ وہی بن چکی تھی۔

گھٹن بڑھ گئی تھی۔ اسے لگا اگر وہ کچھ دیر مزید بیٹھی تو رو دے گی۔ اسے یہاں سے کہیں بہت دور چلے جانا چاہیے، کسی جنگل میں، جہاں وہ اجنبی نہ ہو۔ وہ تیزی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ راستے میں ٹالی، دو لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، اسے آتے دیکھ کر وہ شرارت سے مسکرائی۔

''حیا! تم نے اپنے اسکارف میں کیا چھپا رکھا ہے؟''

ڈور ناب گھماتے ہوئے حیا نے پلٹ کر دیکھا اور سنجیدگی سے بولی۔

''خودکش بم! کیا دکھاؤں؟'' اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

ٹالی کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ اس کے سنبھلنے کا انتظار کیے بغیر باہر نکل آئی۔

اپنے ڈورم میں آکر اس نے زور سے دروازہ بند کیا اور پھر دروازے سے کمر ٹکائے آنکھیں بند کیے، تیز تیز سانس لینے لگی۔ چند ثانیے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمرہ خالی تھا۔ چاروں ڈبل اسٹوری بنکس نفاست سے بنے پڑے تھے۔

وہ اسی طرح دروازے سے لگی زمین پہ بیٹھتی گئی۔ اسکارف کی پن نوچ کر اتاری اور اسے اپنی میز کی طرف اچھالا۔ وہ کرسی پہ جا گرا، ایک پلو لٹکتا ہوا زمین کو چھونے لگا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے نہیں اٹھی۔ بس نم آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

وہ تو کبھی محفلوں کی جان ہوتی تھی۔ اتنی سحر انگیز کہ اسے کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اب؟ اب وہ کیسے ایک دم سے اجنبی بن

گئی تھی؟

بپ کی آواز کے ساتھ پاکٹ میں رکھا فون بجا۔ اس نے فون نکال کر دھندلائی آنکھوں سے دیکھا۔ میجر احمد کا میسج آیا تھا۔
"کیسی ہیں آپ؟" بس تین الفاظ۔ شاید اس کے دل نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ بہت ٹوٹی ہوئی، بکھری ہوئی سی ہے اس وقت یہ کوئی جی پی ایس ٹریکنگ نہیں تھی، وہ وجدان کا تعلق تھا۔ خیال کا رشتہ۔
وہ جواباً ٹائپ کرنے لگی۔
"مجھے جنت کے ان پتوں نے دنیا والوں کے لیے اجنبی بنا دیا ہے۔۔ میجر احمد!"
پیغام چلا گیا۔ آنسو اسی طرح اس کے چہرے پہ لڑھکتے رہے۔ اسے پرانی زندگی یاد نہیں آ رہی تھی۔ اسے نئی زندگی مشکل لگ رہی تھی۔ احزاب کی جنگ کی یہ خندق تو بہت گہری، بہت تاریک تھی۔ اس میں تو دم گھٹتا تھا۔ وہ کیسے اس پہ قائم رہ پائے گی؟
احمد کا جواب آیا تو اسکرین جگمگا اٹھی۔ اس نے پیغام کھولا۔
اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔
اسلام شروع میں اجنبی تھا۔
عنقریب یہ پھر اجنبی ہو جائے گا۔

اور

سلام ہو ان اجنبیوں پہ!"
اسکرین پہ ٹپ ٹپ اس کے آنسو گرنے لگے۔ اوہ اللہ! اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں میں سر گرا لیا۔
وہ کیوں نہیں سمجھ سکی کہ یہی اجنبی پن تو اسلام تھا۔
ایسی ہی تو ہوتی ہیں اچھی لڑکیاں۔ عام لڑکیوں سے الگ، منفرد، مختلف۔ وہ دنیا میں گم، بے فکری سے قہقہے لگاتی، کپڑوں، جوتوں اور ڈراموں میں مگن لڑکیوں جیسی تو نہیں ہوتیں۔ اجنبیت ہی ان کی شناخت ہوتی ہے۔ وہ ساحل کی کیچڑ پہ چمکنے والا الگ سا موتی ہوتی ہیں۔ اجنبی موتی۔

وہ دھیرے سے مسکرائی اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑے۔ وہ ایک مضبوط لڑکی ہے، اسے اتنی جلدی ہار نہیں ماننی۔ وہ اسی اجنبی طریقے سے اس دنیا میں سر اٹھا کر سب کے درمیان جیے گی اور وہ دنیا والوں کو یہ کر کے دکھائے گی۔ آئندہ..... وہ کوئی پارٹی چھوڑ کر نہیں آئے گی، وہ پورے اعتماد سے ان میں بیٹھے گی۔

وہ اٹھی اور اپنا اسکارف اٹھایا۔ پھر فون پہ عائشے کا نمبر ملانے لگی۔ اجنبی لڑکیوں کو اپنے جیسی ایلینز سے زیادہ سے زیادہ ان ٹچ رہنا چاہیے تاکہ جب خندق کھودتے کوئی اپنے دل پہ رکھا ایک پتھر دکھائے تو آپ اسے اپنے دو پتھر دکھا سکیں۔
"اسلام علیکم حیا!" دوسری جانب بہارے چہکی تھی۔ "میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔"
"اچھا تم کیا سوچ رہی تھیں؟" وہ آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کا جوڑا کھولنے لگی۔ نرم، ریشمی بال کھل کر کمر پہ گرتے چلے گئے۔ وہ اب بھی اتنی ہی خوب صورت تھی جتنی پہلے تھی۔
"میں سوچ رہی تھی کہ میں نے تم سے پوچھا ہی نہیں کہ تمہارا باکس کھلا یا نہیں؟"
"ارے ہاں، وہ کھل گیا۔ مگر اس میں صرف ایک چابی تھی۔"
"کھل گیا؟ تم نے پہیلی بوجھ لی؟" بہارے ایک دم سے بہت پرجوش ہو گئی۔
"ہاں میں نے بوجھ لی۔"
"تو اس باکس کی "کی" کیا تھی؟ کون سا لفظ تھا؟" بہارے کو بہت بے چینی تھی۔ اس نے بھی حیا کے باکس پہ زور آزمائی کی تھی مگر سب اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔

''اس کی Key تاقسم ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ عائشے اور بہارے، باکس کے کوڈ کو ''کی'' کہا کرتی تھیں۔ مقفل باکس کی چابی۔

بالوں میں برش چلاتی، وہ ایک دم بالکل ٹھہر گئی۔ اس کے ذہن میں روشنی کا کوندا سا لپکا تھا۔

''کی؟'' اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ ''بہارے! میں تمہیں بعد میں کال کرتی ہوں۔ ابھی کچھ کام آن پڑا ہے۔'' اس نے جلدی سے فون بند کیا، اور اپنے دراز سے پزل باکس نکالا۔ بہت تیزی سے اس نے سلائیڈز اوپر نیچے کیں تاقسم کا لفظ سامنے آیا تو مقفل باکس کھل پڑا۔ مقفل باکس کی کنجی تاقسم تھی۔

اندر رکھے کاغذ پہ لکھی تحریر واضح تھی۔

چابی کے نیچے دو فل اسٹاپس۔

چابی! او خدایا، اسے پہلے کیوں سمجھ میں نہیں آیا۔ پنکی نے کہا تھا، توڑ کر کھولنے پہ یہ کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اس نے وہ تحریر توڑ کر کھولنے والے کے لیے لکھی تھی تاکہ وہ سمجھے کہ ''چابی'' سے مراد وہ لوہے کی چابی ہے جبکہ پہیلی بوجھ کر کھولنے والے کو علم ہوگا کہ چابی سے مراد ''تاقسم'' ہے۔

تاقسم کے نیچے ڈوفل اسٹاپس لگانے سے کیا بنتا تھا؟ وہ سوچنا چاہتی تھی، مگر لڑکیاں واپس آگئیں تو اس کی یکسوئی متاثر ہونے لگی۔

اس نے باکس لیا، اسکارف لپیٹا اور اسٹڈی روم میں آگئی۔ وہاں ان کے ڈورم بلاک کی دو ترک اسٹوڈنٹس بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ وہ بھی ایک کرسی پر آبیٹھی اور ایک کاغذ پہ لکھا ''تاقسم'' پھر اس کے نیچے کئی جگہوں پہ نقطے لگا کر دیکھے، مگر کچھ نہیں بن رہا تھا۔ انگریزی حروف میں لکھا تب بھی کچھ نہیں بنا۔

''سنو!'' اس نے ان دونوں لڑکیوں کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں۔

''تاقسم کے نیچے آئی مین، تاقسم اسکوائر کے نیچے اگر ہم فل اسٹاپس لگائیں تو ہمیں کیا ملے گا؟''

ایک لڑکی الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔ جبکہ دوسری نے بہت بے نیازی سے شانے اچکائے۔ ''لگانے سے اگر تمہارا مطلب ٹریول کرنا ہے تو پھر سسلی!''

''کیا؟'' حیا کو سمجھ نہیں آیا۔

''تاقسم کے نیچے اگر تم میٹرو لائن پہ دو پورے اسٹاپ ٹریول کرو تو سسلی کا اسٹاپ آئے گا نا.....!''

وہ بالکل سناٹے میں رہ گئی۔

''اوہو، وہ تاقسم لفظ کی بات کر رہی ہے، اصلی والے اسکوائر کی نہیں۔'' دوسری لڑکی نے اپنی ساتھی کو ٹوکا تھا۔ جواباً اس لڑکی نے سوالیہ نگاہوں سے حیا کو دیکھا۔ وہ بدقت مسکرائی۔

''نہیں میں اصلی والے تاقسم اسکوائر کی ہی بات کر رہی تھی۔'' وہ کرسی پہ واپس گھوم گئی اور وہ تحریر پڑھی۔

چابی تلے دو فل اسٹاپس۔ یعنی تاقسم کے نیچے دو (پورے اسٹاپس) فل اسٹاپس سے مراد نقطے نہیں، بلکہ میٹرو کے اسٹاپ تھے اور لوہے کی چابی تلے وہ نقطے اس نے توڑ کر کھولنے والے کے لیے بطور دھوکے لگائے تھے۔

''سسلی!'' اس نے زیرلب دہرایا۔ سسلی میں اس کی امانت تھی۔ ڈولی کی امانت، جسے میجر احمد نے چھپایا تھا۔ اسے اب کل صبح تاقسم کے نیچے پورے دو اسٹاپس تک سفر کرنا تھا۔

میجر احمد کا پزل آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح بہت سنہری، نرم گرم سی طلوع ہوئی تھی۔ وہ تاقسم جانے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑی گیلے بال ڈرائر سے سکھا رہی تھی۔ وہ کبھی بھی نم بالوں کو اسکارف میں نہیں باندھتی تھی۔ اسکارف پہننے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ گندا میلا رہا جائے۔ وہ اب بھی اپنے بالوں کی خوب صورتی کا اتنا ہی خیال رکھتی تھی جتنا کہ پہلے۔ جب تک بال خشک ہوئے، ہالے ایک پیکٹ اٹھائے اندر چلی آئی۔

''فلسطینی اسٹوڈنٹس صبح سویرے قطر جانے کے لیے نکل گئے تھے۔ وہ مجھے یہ تمہارا گفٹ دے گئے تھے۔ تب تم سو رہی تھیں۔

انہوں نے سب کو گفٹس دیے ہیں۔"

"اچھا، دکھاؤ۔" وہ برش رکھ کر بہت اشتیاق سے پیکٹ کھولنے لگی۔ اندر اس کے تختے پہ ایک سادہ موٹے کارڈ پہ لکھا تھا۔

"لطیف نے بتایا تھا کہ کل ہماری پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ اپنے نقاب کی وجہ سے کھانا نہیں کھا سکی تھیں۔ اس لیے ہم یہ لے آئے۔ اس میں آپ کو کبھی بھوکا نہیں رہنا پڑے گا۔ منجانب فلسطینی ایکسچینج اسٹوڈنٹس!"

اس کے نیچے ایک سیاہ سلک کا لبادہ رکھا تھا۔ اس نے وہ اٹھایا تو وہ نرم، ریشمی سا کپڑا انگلیوں سے پھسلنے لگا۔ سیاہ، لمبا، عبایا، جو "حریر" کا بنا تھا۔ وہ عام ریشم نہیں تھا بلکہ ذرا مختلف تھا۔ اس میں بہت ہلکی سی چمک تھی جتنی چائنا سلک کے ڈوپٹے میں ہوتی ہے۔ آستین پہ کلائیوں کے گرد موٹے موٹے سبز پتھر لگے تھے کسی لیس کی طرح وہ بادام کے سائز کے تھے اور بالکل زمرد کی طرح لگے تھے۔ سوائے سبز اسٹونز کی لیس کے سارا عبایا سادہ تھا۔ اس کی اسٹول البتہ ریشم کے بجائے کسی نرم کپڑے کی تھی اور ساتھ میں ایک علیحدہ نقاب بھی تھا۔ اسے کارڈ پہ لکھی تحریر کا مطلب سمجھ آ گیا۔ اس علیحدہ نقاب کو (جس میں آنکھوں کا خلا بنا تھا) پیشانی پر رکھ کر سر کے پیچھے پن اپ کرنا تھا۔ یوں نقاب کی سائیڈ کھلی ہوتیں اور وہ اس سے کھا سکتی۔

"یہ تو بہت مہنگا لگ رہا ہے، تمہیں پتا ہے یہ انہوں نے ضرور جواہر سے لیا ہوگا۔ وہاں ایک شاپ سے سعودیہ کے امپورٹڈ عبایا ملتے ہیں، یہ وہی ہے اور تمہارے پاکستانی روپوں میں یہ دس، پندرہ ہزار سے کم کا نہیں ہوگا۔" ہالے ستائش سے اس خوب صورت عبایا کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اور ان کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں گرمی نہیں لگتی۔ پتا نہیں کیا میکانزم ہے، مگر اس کو تم گرم سے گرم ماحول میں بھی پہنو تو تمہیں گھٹن یا گرمی نہیں لگے گی۔"

"واقعی!" وہ بہت متاثر سی عبایا کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنا خوب صورت اور باوقار تھا کہ نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔ اس نے اپنے لباس پہ ہی اس کو پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بٹن بند کرنے لگی۔ عبایا اس کے قدموں تک گرتا تھا۔ جیسے کسی رائل پرنس کا ریشمی لبادہ ہو۔ ایک بہت شاہانہ سی جھلک تھی اس میں۔

"بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔ کہیں جا رہی ہو تم؟" ہالے کو کچھ یاد آیا۔ "اگر مارکیٹ جا رہی ہو تو مجھے کچھ منگوانا تھا۔" وہ جلدی سے ایک کاغذ پہ کچھ چیزیں لکھنے لگی۔

"ہاں، ٹھیک ہے لے آؤں گی۔" اس نے عبایا کی اسٹول چہرے کے گرد لپیٹے ہوئے کہا۔ "بس مجھے سسلی سے ایک امانت اٹھانی ہے۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

ہالے نے جو میز پہ کاغذ رکھے لکھ رہی تھی نا سمجھی سے سر اٹھایا۔

"امانت؟ کیا کسی نے تمہارے لیے رکھوائی ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔" اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

"چابی ہے تمہارے پاس؟" ہالے نے عادتاً پوچھا وہ ہمیشہ باہر جانے سے قبل پوچھ لیا کرتی تھی کہ کون سی شے رکھی اور کون سی نہیں، مگر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"کس چیز کی چابی؟"

"امانت کی چابی۔ اس کے بغیر تو نہیں کھلے گی نا۔"

"ہالے!" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "تم..... تم امانت کسے کہتی ہو؟"

"امانت لاکرز کو۔ تم ان ہی کی بات کر رہی ہو نا؟ ہم لیفٹ لگیج Left Luggage لاکرز کو لگیج امانت بولتے ہیں نا۔"

"اوہ..... لیفٹ لگیج لاکرز!" اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ "وہ لاکرز جہاں لوگ سامان محفوظ کر کے چلے جاتے ہیں کہ بعد میں اٹھا لیں گے؟" اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ چابی کسی لیفٹ لگیج لاکر کی بھی ہو سکتی ہے۔

"ہالے..... ہالے۔" وہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔ "تمہیں پتا ہے سسلی میں امانت لاکرز کہاں ہوں گے؟" اس کی بات پہ

ہالے متذبذب سی سوچنے لگی۔

"سچ کہوں تو میں نے کبھی استنبول میں کوئی پبلک لاکر ٹرائی نہیں کیا، عموماً ریلوے اسٹیشنز پہ لاکرز ہوتے ہیں۔" تم سسلی کے اسٹاپ پہ دیکھنا، وہاں شاید کوئی مل جائے۔

تاقسم کے پیچھے دو پورے میٹرو اسٹاپس۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں کوئی امانت لاکر تھا۔ اس نے ذہن میں اس پہیلی کو ڈی کوڈ کیا۔

☆ ☆ ☆

سسلی کے میٹرو اسٹاپ پہ معمول کی گہما گہمی تھی۔ وہ پرس کندھے پہ لٹکائے بہت پر اعتماد طریقے سے چلتی ٹکٹ کاؤنٹر تک آئی۔

"اسلام علیکم۔ مجھے کچھ سامان ڈمپ کرنا ہے تو امانت کس طرف ہے؟" اس نے سرسری سے انداز میں لاکرز کا پوچھا۔ اس لیے کہ وہ مشتبہ نہ لگے، اس نے یہ نہ بتانا ہی بہتر سمجھا کہ کسی نے اس کے لیے امانت رکھوائی ہے۔

"میڈم! یہاں اس اسٹاپ میں تو کوئی لاکر نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟ یہاں کوئی لاکر نہیں ہے؟" اس نے اچنبھے سے اردگرد نگاہ دوڑائی۔

"جب سے میں یہاں کام کر رہا ہوں، تب سے تو اس اسٹاپ پہ کوئی لاکر نہیں ہے۔ شاید پہلے ہوتے ہوں۔ آپ کو پتا ہے نائن الیون کے بعد یورپ کے بہت سے ریلوے اسٹیشن سے لاکرز ختم کر دیے گئے تھے۔" معمر ترک کلرک نے تفصیلاً بتایا۔

"اچھا!" اس کا دل مایوسی میں ڈوب گیا۔ تاقسم سے میٹرو میں سوار ہونے کے بعد وہ پہلے اسٹیشن پہ نہیں اتری پھر دوسرے، یعنی سسلی پہ اتر گئی۔ تاقسم سے میٹرو لائن کا آغاز ہوتا تھا، میٹرو ایک ہی سمت میں جاتی تھی، سو دو پورے اسٹاپس کا اختتام سسلی پہ ہی ہوتا تھا۔

"آپ کو سامان رکھوانا ہے تو میرے پاس رکھوا دیں پھر بعد میں لے لیجیے گا۔" وہ جانے لگی تو کلرک نے بہت خلوص سے پیش کش کی۔

"نہیں خیر ہے۔ میں اٹھا لوں گی۔" اس نے شعوری طور پہ پرس کو ذرا مضبوط پکڑ لیا۔ "بس مجھے جواہر سے ذرا سی شاپنگ کرنی ہے، میں مینج کر لوں گی۔" اس کی آواز میں واضح مایوسی تھی۔

"اچھا آپ جواہر جا رہی ہیں؟ تو پھر آپ سامان وہیں رکھوا دیجیے گا۔ بلکہ....." وہ ذرا سا رکا۔ "جواہر میں امانت لاکرز ہوتے ہیں۔ وہ انٹرنس کے قریب ہی بنے ہیں۔"

"واقعی؟" وہ جھٹکے سے واپس پلٹی تھی۔ "امانت لاکرز؟ جو چابی سے کھلتے ہیں؟"

"ارے میم! وہ زمانے گئے، جب لاکرز چابی سے کھلا کرتے تھے۔ سلطنت ترکیہ اب ترقی کر چکا ہے۔" ترک بوڑھے نے فخر سے گردن اٹھا کر کہا۔ "ہمارے امانت لاکر بارکوڈ سے کھلتے ہیں۔"

"آف کورس!" حیا نے گہری سانس لی اور مسکرائی۔ "اللہ ترقی یافتہ سلطنت ترکیہ کو سلامت رکھے! بارکوڈ!" اس نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

بالآخر اسے سارے بریڈ کرمبز ملتے جا رہے تھے۔

سسلی کے اسٹاپ سے ایک ڈائریکٹ ایگزٹ تھی جو جواہر مال میں کھلتی تھی۔ وہ مال میں آئی اور تیزی سے ان لاکرز کی طرف لپکی جو داخلی حصے کے قریب ہی بنے تھے۔ ایک دیوار پہ پھیلے نارنجی لاکرز، جیسے کچن کیبنٹس ہوں۔ سب پہ ایک ایک نمبر لکھا تھا۔ اس نے پرس سے چابی اور بارکوڈ سلپ نکالی، اور پورے اعتماد سے چلتی لاکرز کے قریب آئی۔ وہاں کھڑا گارڈ بے اختیار اسے دیکھنے لگا۔

حیا نے وہاں لاکرز کی مشین کا طریقہ دیکھا۔ اسے پہلے لاکر نمبر ٹائپ کرنا تھا۔ وہاں بنے کی پیڈ پہ اس نے 6 ہندسہ دبایا۔ یہی ہندسہ اس کی بارکوڈ کی رسید کے چار کونوں میں لکھا تھا۔ یہی لاکر نمبر ہو سکتا تھا۔

مشین کی سیاہ اسکرین پہ چھ لکھا آیا، پھر اس نے بارکوڈ مانگا۔ حیا نے بارکوڈ والی طرف سے کاغذ شناخت کے لیے مشین کے سامنے کیا۔ ٹوں ٹوں کی آواز آئی اور اسکرین پہ سرخ عبارت ابھری۔ بارکوڈ غلط تھا۔

اس نے بے یقینی سے رسید کو دیکھا اور پھر مشین کو، شاید کوئی غلطی ہو گئی ہو۔ گارڈ اب پوری گردن موڑ کر مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ حیا نے جلدی سے مشین ری سیٹ کی اور 6 پہ انگلی رکھی، پھر بارکوڈ سامنے کیا سرخ عبارت پھر سے ابھری۔ کچھ غلط تھا۔

گارڈ کی نظریں اور بے بسی بھری پریشانی۔ وہ کپکپاتی انگلیوں سے تیسری دفعہ مشین ری سیٹ کرنے لگی تو رسید ہاتھ سے پھسل کر فرش پہ جا گری۔ وہ تیزی سے اسے اٹھانے کے لیے جھکی۔

رسید کا کاغذ الٹا گرا تھا۔ یوں کہ الفاظ سر کے بل الٹے نظر آ رہے تھے۔ چاروں کونوں میں لکھا 6 اب الٹا ہو کر 9 لگ رہا تھا۔ کاغذ اٹھا کر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ 9 نمبر لاکر اوپر والی قطار میں سب سے آخری تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے مشین کے کی پیڈ پہ 9 پر انگلی رکھی، پھر بار کوڈ سامنے کیا۔ بپ کی آواز آئی اور سبز رنگ کی عبارت ابھری۔ 9 نمبر لاکر کھل گیا تھا۔

وہ جلدی سے آگے بڑھی اور 9 نمبر لاکر کا دروازہ کھولا (جیسے کچن کیبنٹ کو کھولتے ہیں) اندر ایک چوکور سی تجوری رکھی تھی جو پیچھے کہیں سے چپکی تھی۔ (یہ وہ تجوری تھی جس کی دھات کی تہوں میں شیشے کی تہہ ہوتی ہے، اور اگر اسے غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش کی جائے تو اندرونی شیشہ ٹوٹ کر تجوری کو جام کر دیتا ہے۔) اس نے تجوری کے کی ہول میں وہ چابی ڈال کر گھمائی۔ تجوری کھل گئی۔ حیا نے جلدی سے اسے کھولا۔ اندر ایک چھوٹی سی سیاہ مخملیں ڈبی رکھی تھی جیسے انگوٹھی کی ڈبی ہوتی ہے۔ اس نے وہ ڈبی مٹھی میں دبائی اور اس احتیاط سے اپنے کھلے بیگ کے اندر گرا دیا کہ پیچھے کھڑا گارڈ نہ دیکھ سکے۔

دو منٹ بعد وہ مال کے باہر کھڑی تھی۔ اس نے بیگ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ترکی اور ترکی ایڈونچرز۔ کبھی وہ ان پہ ایک کتاب ضرور لکھے گی، اس نے مسکراتے ہوئے سوچا تھا۔ فی الحال اسے ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں بیٹھ کر وہ آرام سے وہ ڈبی کھول سکے۔

دفعتاً اس کا موبائل بجا۔

"آپ کا سرپرائز برگر کنگ کی پینٹری میں آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ اے آر پی۔" دو سطور کا وہ مختصر سا پیغام اس کو سن کر گیا۔ کہیں عبدالرحمٰن، جہان کے پاس تو نہیں چلا گیا؟ اس کی نگاہوں کے سامنے جہان کا ننھا چھوٹا ریسٹورنٹ گھوما تھا۔ اوہ نہیں۔

وہ واپس زیر زمین میٹرو کی طرف بھاگی تھی۔

برگر کنگ میں معمول کا شور اور رش تھا۔ وہ قریباً دوڑتی ہوئی کچن میں آئی تھی۔

"جہان کہاں ہے؟" اس کے حواس باختہ انداز پہ وہاں شیف لڑکے نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔ "وہ..... پینٹری میں ہے، مگر ٹھہریں، آپ ادھر نہ جائیں۔" وہ پینٹری کی طرف بڑھی تو وہ لڑکا سامنے آ گیا۔

"مگر....."

"میم پلیز، اس کا کوئی مہمان آیا ہے، وہ اندر ہے، اس نے کہا ہے..... کسی کو اندر نہ آنے دوں، ورنہ میری نوکری چلی جائے گی۔"

"کچھ نہیں ہوگا، مجھے دیکھنے دو۔"

"پلیز مجھے سسٹر کی فیس دینی ہے، آپ ادھر مت جائیں، وہ مجھے واقعی جان سے مار دے گا۔ اگر..... اگر آپ کو اندر جانا ہی ہے تو آپ پچھلی گلی سے چلی جائیں پچھلے دروازے کی گھنٹی بجا دیجئے گا اور....." اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ باہر نکل چکی تھی۔

دس منٹ بھی نہیں لگے تھے اسے پچھلی گلی سے پینٹری کے دروازے تک پہنچتے۔ اگر عبدالرحمٰن ادھر آیا تو وہ اسے جان سے مار دے گی، اس نے سوچ لیا تھا۔

پینٹری کا روشن دان کھلا تھا۔ وہ حیا کے چہرے کے برابر آتا تھا۔ اس سے اندر کا منظر اور آوازیں صاف سنائی دے رہا تھا۔ وہ جو گھنٹی بجانے ہی لگی تھی، بے اختیار رک گئی۔

جہان، جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، حیا کی طرف پشت کیے کھڑا کہہ رہا تھا۔

"آواز نیچی رکھو۔ یہ تمہارا اڈا نہیں ہے جہاں میں تمہاری ساری بکواس چپ کر کے سنتا رہوں گا۔ یہ میری جگہ ہے!"

"اس کے مخاطب نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ سرمئی برساتی، آنکھوں پہ عینک اور ناقابل فراموش چہرہ جس پہ چند روز قبل اس نے کافی الٹی تھی۔ وہ پاشا کا چہرہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔

"ہا! تمہاری جگہ! مت بھولو کہ یہ جگہ میں نے تمہیں دی تھی جب تمہیں بیوک ادا سے فرار ہو کر چھپنے کی جگہ چاہیے تھی، مگر تم دنیا کے

سب سے بڑے احسان فراموش ہو جہان!''

وہ دیوار سے لگی، پتھر کا مجسمہ بنی رہ گئی۔ استقلال اسٹریٹ کا شور غائب ہو گیا۔

''میرا بھی اپنے بارے میں یہی خیال ہے۔'' وہ جواباً کمال بے نیازی سے شانے اچکا کر بولا تھا۔

''اور میرے کام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ اڑتالیس گھنٹے میں ہو جائے گا؟''

''نہیں۔'' جہان اسی رکھائی سے بولا تھا۔ ''کیوں پہلی بات تو یہ ہے کہ میں تمہارے باپ کا ملازم نہیں ہوں اور دوسری یہ کہ تم اپنے لالچ کے ہاتھوں بے صبرے ہونے کی بجائے تھوڑا انتظار کرو تو بہتر ہوگا۔''

''لالچ؟'' پاشا نے بے یقینی سے دہرایا۔ ''میرا سب کچھ داؤ پہ لگا ہے تم کہتے ہو کہ میں لالچی ہوں۔''

جہان نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

''تمہارے اپنے جرائم کی سزا ہے، میرا کیا قصور؟''

''اور تمہیں تمہارے جرائم کی سزا کب ملے گی جہان سکندر؟'' وہ لب بھینچے اتنی سختی سے بول رہا تھا کہ جبڑے کی رگیں تن گئی تھیں۔ ''یاد رکھنا، جس دن میں نے زبان کھولی، اس دن تم سیدھے پھانسی چڑھو گے۔''

جہان بے اختیار ہنس پڑا۔

''اور تمہیں لگتا ہے کہ میں پھانسی چڑھ کر تمہیں ادلار میں عیش کرنے کے لیے چھوڑ جاؤں گا؟ ایسی فیری ٹیل تم ہی گھڑ سکتے ہو، پاشا بے!''

بے ترک میں صاحب یا مسٹر کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

پاشا بہت تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم ایک دفعہ پہلے بھی مجھے دھوکا دے چکے ہو، میں اس دفعہ تمہارا اعتبار نہیں کروں گا۔''

''تو نہ کرو!'' اس نے بے نیازی سے کندھوں کو جنبش دی۔ ''جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔''

پاشا چند لمحے بہت ضبط کیے اسے دیکھتا رہا، پھر کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ نگاہ روشن دان سے جھانکتے چہرے پہ پڑی۔ سیاہ لبادے میں سے صرف اس کی بڑی بڑی آنکھیں نظر آ رہی تھیں، جن میں سارے زمانے کی بے یقینی تھی۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

''تمہاری بیوی باہر کھڑی ہے جہان! اسے اندر نہیں بلاؤ گے؟''

وہ جو چہرے پہ ڈھیروں بے زاری لیے کھڑا تھا، کرنٹ کھا کر پلٹا۔ حیا اسی طرح ساکت سی روشن دان کے پار کھڑی تھی۔

''کیا؟'' جہان نے بے یقینی سے دہرایا، اسے شاید لگ رہا تھا کہ اس نے غلط سنا ہے۔ پاشا زیر لب مسکرایا۔

''تمہاری بیوی، سبانجی یونیورسٹی کی ایکسچینج اسٹوڈنٹ، ڈورم نمبر بھی بتاؤں؟ حیران مت ہو جہان! تم نے پاشا بے کو انڈر اسٹیمیٹ کیا ہے۔ میں تمہاری بیوی کو اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ کچھ دن پہلے ہی ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ کیوں مادام؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟'' اس نے آگے بڑھ کر پینٹری کا دروازہ کھولا اور اسے جیسے اندر آنے کا راستہ دیا۔

''ملاقات؟'' جہان کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ اس نے ششدر نگاہوں سے حیا کو دیکھا۔ وہ اتنی ہی بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ بے یقینی، بے اعتبار، فریب، جھوٹ۔

''حیا...... یہ تم اس کو جانتی ہو؟'' وہ متحیر سا تھا، جیسے اسے یقین ہی نہ آیا ہو وہ اس سب سے بے خبر تھا۔ ''یہ...... یہ سچ کہہ رہا ہے؟''

اس نے بمشکل اثبات میں گردن ہلائی، وہ ان ہی بے اعتبار نگاہوں سے پلک جھپکے بنا جہان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کون تھا، وہ نہیں جانتی تھی۔

''اب بتاؤ، جہان! میرا کام اڑتالیس گھنٹوں میں ہو جائے گا یا نہیں؟ وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ جہان نے اسے دیکھا، پھر اس کی پیشانی کی رگیں تن گئیں۔ وہ آگے بڑھا اور اپنے ساتھی کو گریبان سے پکڑ لیا۔

''میری بات کان کھول کر سن لو۔ میں تمہارا کام کر دوں گا، اڑتالیس گھنٹوں سے پہلے، لیکن اگر تم نے میری بیوی کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا، تو استنبول کے کتوں کو کھانے کے لیے تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔''

ایک جھٹکے سے اس نے پاشا کا گریبان چھوڑا۔ اس کی آنکھوں میں وہ خون اترا تھا کہ حیا دو قدم پیچھے ہٹی، اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ پاشا کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔

''مجھے تمہاری بیوی سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، نہ میں نے پہلے اسے کچھ کہا، نہ اب کہوں گا۔ مجھے صرف اپنے کام سے غرض ہے۔''

''ہو جائے گا۔ ناؤ گیٹ لاسٹ!'' وہ بہت ضبط سے بولا تھا۔

پاشا نے اپنی برساتی کا کالر ٹھیک کیا اور پھر بنا کسی کو دیکھے باہر نکل گیا۔ حیا ابھی تک بغیر پلک جھپکے جہان کو دیکھتی دروازے میں کھڑی تھی۔

''تم اسے کیسے جانتی ہو، میں سمجھ نہیں پا رہا۔'' وہ اس کے قریب آیا تو وہ بے اختیار دو قدم مزید پیچھے ہٹی۔ وہ رُک گیا۔

''میں نہیں جانتا کہ تم نے کیا سنا، مگر تم نے ادھوری باتیں سنی ہیں۔ میرا اس آدمی سے کوئی تعلق نہیں ہے حیا...... تم تمہیں مجھ پہ اعتبار ہے نا، میری بات سنو!'' وہ بے بسی سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا، مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسے اب جہان سکندر کی کسی بات کا اعتبار نہیں رہا تھا۔

وہ ایک دم مڑی اور اسکوائر کی جانب واپس بھاگی۔ وہ اسے پکار رہا تھا، پریشانی سے، بے بسی سے، مگر وہ کچھ بھی سنے بغیر روتی جا رہی تھی۔

''میری لینڈ لیڈی نے خوب ہنگامہ کیا...... میں آج کل اس سے چھپتا پھر رہا ہوں...... یہاں کوئی عبدالرحمن پاشا نہیں ہے۔ یونہی کسی نے اپنے بارے میں افواہیں پھیلائی ہوں گی۔''

''جھوٹ...... جھوٹ تھا۔ سب فریب تھا۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے گرتے حجاب کو بھگو رہے تھے۔ ایک لمحہ بس، ایک لمحہ لگتا ہے اعتبار ٹوٹنے میں اور سب ختم ہو جاتا ہے۔

وہ اسے مسلسل فون کر رہا تھا، مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔ سبانجی واپس پہنچنے تک وہ فیصلہ کر چکی تھی اسے معلوم تھا کہ اسے جہان کی بات سن لینی چاہیے ایک دفعہ اسے وضاحت دینے کا موقع دینا چاہیے، مگر وہ خوف، بے اعتباری کے دکھ سے بڑا تھا جو اسے اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ پاشا نے اسے مہرے کے طور پہ استعمال کیا۔ ایک بلیک میلنگ ہتھیار کے طور پہ۔ یہ سب جرم کی دنیا کے ساتھی تھے۔ کرمنلز۔ اسے ان کے درمیان نہیں رہنا تھا اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ پہلی دفعہ اسے استنبول سے بہت ڈر لگا تھا۔ اسے جلد از جلد واپس پاکستان پہنچنا تھا۔ اس کا گھر دنیا میں ان کی واحد محفوظ پناہ گاہ تھی۔

ہالے اس سے پوچھ رہی تھی، مگر وہ کچھ بھی بتائے بغیر مسلسل بے آواز روتی، سامان پیک کر رہی تھی، نہ بیوک ادا، نہ لندن، اسے اپنا آخری مہینہ پاکستان میں گزارنا تھا۔ پھر جولائی میں دو دن کے لیے وہ آ کر کلیئرنس کروا لے گی۔

فلائٹ رات کو ملی، اور تب تک ہر مرحلے پہ ہالے نے اس کی بہت مدد کی۔ سبانجی کو وہ ایسے چھوڑے گی، اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ سب کچھ ادھورا رہ گیا تھا۔ وہ لڑکا بھی کبھی نہیں ملا جو ڈی جے کے گڈ مارننگ کا جواب دیا کرتا تھا۔ ادھوری یادیں۔ پورے دکھ۔

اس نے ابا کو مختصر سا بتا کر فون آف کر دیا تھا۔ وہ واقعی بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔ اسے بس جلد از جلد وہاں سے نکلنا تھا۔ ایئرپورٹ پہ بھی وہ بہت پریشان اور چڑچڑی سی ہو رہی تھی۔ جب آفیسر نے اسے لیپ ٹاپ ہینڈ کیری میں رکھنے کو کہا تو وہ اڑ گئی۔

''مجھے اتنا بھاری ہینڈ کیری نہیں اٹھانا بس۔'' یہ اس کا ڈی جے کو ایک آخری خراج تھا۔

جب فلائٹ نے استنبول سے ٹیک آف کر لیا اور مرمران کے قدموں تلے آ گیا تو اس کے دل کو ذرا سکون ملا۔ بالآخر۔ وہ اپنے گھر واپس جا رہی تھی۔ بس، بہت ہو گیا ایڈونچر، بہت ہو گئے پزل۔

''پزل؟'' وہ چونکی اور پھر جلدی سے پرس کھولا۔ مخملیں، سیاہ ڈبی اندر محفوظ پڑی تھی۔ وہ سارا دن اتنی پریشان رہی کہ اسے بھول ہی گئی۔ جانے اس میں کیا تھا؟

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ایک ہاتھ میں ڈبی پکڑ کر، دوسرے ہاتھ سے اس کا ڈھکن کھولا۔

باب 9

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ایک ہاتھ میں ڈبی پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے اس کا ڈھکن کھولا۔ اندر سیاہ مخمل پہ ایک چھوٹی سی فلیش ڈرائیو رکھی تھی۔ اس نے فلیش ڈرائیو اٹھا کر کھولی۔ ڈرائیو کا سلور، یو ایس بی پلگ چمک رہا تھا۔ حیا نے ڈھکن بند کیا، اور اچنبھے سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ انگلی کے دو پوروں برابر ننھی سی ڈرائیو کا کور سیاہ تھا وہاں کہیں کچھ نہیں لکھا تھا۔

اس میں کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ تصاویر؟ ڈاکومنٹس؟ کتابیں؟ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی میموری کتنی ہے کیونکہ اس کے اوپر لکھا نہیں تھا، مگر یہ تو واضح تھا کہ اس میں دنیا جہاں کی چیزیں سما سکتی تھیں۔ اندر جو بھی تھا، وہ تب ہی کھلتا، جب وہ اسے کمپیوٹر سے جوڑتی اور کمپیوٹر......اوہ۔! ڈی جے کو خراج دیتے ہوئے وہ لیپ ٹاپ اپنے پاس نہیں رکھ سکی تھی۔ اب اس میں جو بھی تھا، وہ اسے گھر پہنچ کر ہی دیکھ سکتی تھی۔

اس نے فلیش ڈرائیو واپس ڈبیا میں ڈالی اور احتیاط سے پرس کے اندرونی خانے میں رکھ دی یہ قیمتی چیز تھی اور اسے اس کی حفاظت کرنی تھی۔

حیا نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا اور جلتی آنکھیں موند لیں۔ صبح کے واقعات اور اس ہنگامہ خیز فیصلے و تیاری نے اسے تھکا دیا تھا۔ بخار، سر درد اور تکان، ان سب کی تکلیف اس تکلیف سے کہیں چھوٹی تھی، جو آج جہان نے اسے دی تھی۔ وہ کچھ بھی یاد نہیں کرنا چاہتی تھی، مگر تمام واقعات لڈ لڈ کر آنکھوں کے سامنے چلتے نظر آ رہے تھے۔

بے اعتباری کا دکھ زیادہ بڑا تھا یا خود کو جہان کے لیے بلیک میلنگ کا ہتھیار بنائے جانے کا خوف، وہ فیصلہ نہیں کر سکی۔ البتہ ایک بات طے تھی۔ اگر ان پچھلے پانچ ماہ میں اس نے کچھ فیصلے صحیح کیے تھے تو پاکستان واپس جانے کا فیصلہ ان میں سے ایک تھا۔ اپنے گھر، باپ اور بھائی کے تحفظ سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ اسے ترکی اب بھی اتنا ہی پسند تھا، مگر ترکی کے کچھ لوگوں سے اب اسے خوف آنے لگا تھا۔ بس بہت ہو گئے ایڈونچرز، اس نے ہار مان لی تھی۔ وہ جہان کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر ہی چلی آئی تھی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ یہی صحیح تھا۔ اس کو سنبھلنے اور سوچنے کے لیے وقت چاہیے تھا۔

جہان کے لیے بھی شاید یہ درست تھا۔ اب کم از کم پاشا اسے حیا کی وجہ سے بلیک میل نہیں کر سکے گا۔ جہان سکندر سے شدید ناراضی کے باوجود لاشعوری طور پر بھی اس نے اس کا اچھا ہی سوچا تھا۔

فجر کے قریب وہ اسلام آباد پہنچی۔ ابا کو آنے سے منع کر دیا تھا، سو اس کی تاکید کے مطابق انہوں نے ڈرائیور بھیج دیا تھا۔

سر درد، بخار اور بوجھل دل......وہ گولی لے کر سوئی تو ظہر کے قریب اٹھی۔

''اتنا بڑا سرپرائز!'' اسے ہاتھوں سے بال لپیٹتے ہوئے لاؤنج میں آتے دیکھ کر فاطمہ نے مسکرا کر کہا۔ صبح وہ سو رہی تھیں اور ان کی ملاقات اب ہو رہی تھی۔

''اماں!'' وہ آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گئی۔ گھر، تحفظ، امان۔ اس کے آنسو لڈ لڈ کر آ رہے تھے۔

''سبین پریشان ہو رہی تھی کہ اتنی اچانک حیا کیوں چلی گئی؟''

اپنے بیٹے سے پوچھنا تھا نا!

''جہان کو بتایا تھا، وہ شاید بتانا بھول گیا ہو......کچھ کھانے کو ہے؟'' وہ نگاہیں چرا کر کچن کی طرف جانے لگی۔ وہی سبانجی سے پڑی ہر کام خود کرنے کی عادت۔ فاطمہ نے ہاتھ سے پکڑ کر واپس بٹھایا۔

''آرام سے بیٹھو۔ نور بانو کھانا لگا ہی رہی ہے۔'' پھر ذرا چونکیں ''تمہیں بخار ہے۔'' جب وہ گلے لگی تھی تو اس وقت اتنے عرصے بعد ملنے کے جوش میں انہیں محسوس نہیں ہوا تھا شاید۔

''نہیں، سفر کی وجہ سے۔'' اس نے دھیرے سے ہاتھ چھڑایا۔

پچھلی دفعہ جب وہ پاکستان آئی تھی، تب بھی اسے بخار تھا۔ تب اس نے استقلال اسٹریٹ میں ڈی جے کو کھویا تھا۔ اب بھی اسے بخار تھا..... اور اس دفعہ شاید اس نے جہان کو کھویا تھا۔ اسی جگہ۔ استقلال اسٹریٹ میں۔ آزادی کی گلی..... جس سے وہ کبھی اپنی زندگی آزاد نہیں کر سکتی تھی۔

شام میں جب وہ عصر پڑھ کر جائے نماز تہہ کر رہی تھی تو لاؤنج کی چوکھٹ پر تایا فرقان نے ہولے سے دستک دی۔ وہ چونک کر مڑی، پھر مسکرا دی۔

''تایا ابا!'' وہ آگے بڑھ کر ان سے ملی۔

''ارے یہ ترکی والے کہاں سے آگئے؟'' انہیں جیسے اس کا نماز کے انداز میں لیا دوپٹا بہت اچھا لگا تھا۔

''بس ایگزامز ختم ہو گئے تھے۔ آخری مہینہ ترکی گھومنے کے لیے تھا۔ میں نے سوچا اس میں پاکستان آجاتی ہوں، پھر جولائی میں کلیئرنس کروانے چلی جاؤں گی۔'' اس نے رسان سے وضاحت دی جواب اسے بہت سی جگہوں پہ دینی تھی۔

''یہ تو بہت اچھا کیا۔ ابا کدھر ہیں تمہارے؟ کچھ کام تھا۔''

''پتا نہیں! آفس میں ہوں گے۔ گھر پہ تو نہیں ہیں۔''

''اچھا! میں کال کر لیتا ہوں۔'' وہ کہہ کر مڑنے لگے تو وہ جائے نماز رکھ کر ان کے ساتھ ہی چلی آئی تاکہ سب سے مل لے۔

صائمہ تائی اپنے مخصوص ''مسکراتے'' انداز سے ملیں۔ ارم کمرے میں تھی۔ اسے دیکھ کر ذرا حیران ہوئی۔

''خیر! اچھا کیا، اب کم از کم تم میری ''منگنی'' تو اٹینڈ کر ہی لو گی۔'' تلخ مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی مگر اسے خوش گوار سی حیرت ہوئی۔

''تمہاری منگنی، کب؟''

''ایک ڈیڑھ ہفتے تک ہے۔ ان کے کچھ رشتے دار باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی روانگی سے پہلے پہلے ہی فنکشن ہوگا۔'' ارم بہت ناخوش لگ رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر اس کے پاس بیٹھ نہیں سکی اور باہر آگئی۔

سونیا کچن میں تھی۔ اس سے اپنے فطری خوش خلق انداز میں ملی۔ بیٹھنے کو کہا، مگر وہ بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ پاکستان اور خاندان والے۔ وہی پرانی زندگی لوٹ آئی تھی، ترکی اور ترکی کے وہ چار ماہ کسی ست رنگے بلبلے کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

اسٹڈی روم کی کھڑکی کے سامنے کھڑا وہ نیچے نظر آتی گلی کو دیکھ رہا تھا۔ پتھریلی سڑک پہ بگھی سیاحوں کو لیے جا رہی تھی۔ ادالار کی سب سے شاہانہ سواری۔ مگر اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کھلے دروازے سے عائشے اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں پرچ پیالی تھی۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ اس نے اسٹڈی ٹیبل پہ پیالی رکھی۔

''عبدالرحمٰن! تمہاری کافی۔''

عبدالرحمٰن نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ عائشے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ روئی روئی سبز آنکھیں، اس کے دیکھنے پہ اس نے نگاہیں جھکا دیں۔ اس کا مطلب تھا آنے اسے مطلع کر چکی تھیں اور وہ دکھی تھی۔

''میں امید کرتا ہوں، تم میرے ساتھ تعاون کرو گی۔''

وہ اپنے ازلی خشک انداز میں کہتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ''آنے کو ان کا بیٹا واپس مل رہا ہے، اس سے زیادہ بڑی خوشی ان کو کبھی نہیں مل سکتی۔ تم ان ماں بیٹے کے فیصلے میں ان کا ساتھ نہ دے کر ان کی خوشی ختم کر دو گی، مگر میں جانتا ہوں کہ تم ایسا نہیں کرو گی۔''

عائشے نے بھیگی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

''میں جانتی ہوں کہ مجھے اور بہارے کو وہیں رہنا ہے، جہاں آنے کو رہنا ہے۔ اگر وہ ادالار نہیں آسکتا..... اور یہ ضروری ہے کہ ہم سب یہاں سے چلے جائیں تو میں رکاوٹ نہیں ہوں گی۔ میں نے پیکنگ شروع کر دی ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکی۔ ''کیا واقعی سب ایسا ہی ہوگا، جیسا تم کہہ رہے تھے؟ کیا واقعی باہر جا کر وہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا؟''

''ہاں! اور تم جانتی ہو، میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتا۔'' وہ اب بھی کھڑکی سے باہر ہی دیکھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے! میں بہارے کو سمجھا دوں گی۔ وہ کوئی مسئلہ نہیں کرے گی۔ ہم اتنی ہی خاموشی سے ترکی سے چلے جائیں گے۔ جتنی خاموشی سے تم چاہتے ہو۔''

''شیور! کیا اب تم مجھے اکیلا چھوڑ سکتی ہو؟''

''عائشے سر ہلا کر پلٹ گئی۔ عبدالرحمن نے گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھا...... اور پھر دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ کاریڈور کے سرے کے آگے غائب ہو گئی۔ پھر اس نے گہری سانس لی اور بولا۔

''بہارے گل! کیا تم میز کے نیچے سے نکلنا پسند کرو گی؟''

اور اسٹڈی ٹیبل تلے بیٹھی، کان لگا کر باتیں سنتی بہارے گل نے بے اختیار زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔ اللہ، اللہ، وہ ہر بار کیوں پکڑی جاتی تھی؟ جب وہ دونوں باتیں کر رہے تھے، تب وہ اتنی خاموشی سے دبے قدموں آئی تھی اور میز تلے چھپ گئی تھی۔ زمین تک لٹکتے میز پوش نے چاروں اطرف سے اسے ڈھانپ دیا تھا، مگر عبدالرحمن پھر بھی جان گیا تھا۔

''بہارے گل!'' وہ ذرا سختی سے بولا تو وہ رینگتی ہوئی باہر نکلی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ معصومیت سے مسکراتے ہوئے کپڑے جھاڑتی اٹھی۔

''کیا کر رہی تھیں تم؟''

وہ شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ باندھے خاموشی سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''کچھ بولو گی نہیں؟''

بہارے نے نفی میں سر ہلایا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ بہارے گل چپ زیادہ اچھی لگتی ہے۔''

عبدالرحمن سر جھٹک کر واپس کھڑکی کی طرف مڑ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ وہ جیسے کچھ سوچ رہا تھا یا شاید پریشان تھا۔

''میں ادھر بیٹھ جاؤں؟'' بہارے نے اسٹڈی ٹیبل کی ریوالونگ چیئر جس کے ساتھ ہی عبدالرحمن کھڑا تھا کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے دھیرے سے گردن اثبات میں ہلائی۔ وہ بڑی سی کرسی پہ بیٹھ گئی اور میز کی سطح پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھے۔

''جب حیا ادھر تھی تو وہ یہیں بیٹھ کر اپنے پزل باکس پہ غور کیا کرتی تھی۔'' وہ چونکا۔

''وہ چلی گئی ہے۔''

بہارے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں حیرت پنہاں تھی۔

''کہاں؟''

''اپنے ملک، واپس۔''

''مگر کیوں؟ اس نے بتایا بھی نہیں۔ میرا نیکلس بھی نہیں خریدا۔ میں اسے فون کروں؟''

''نہیں! بالکل نہیں۔'' وہ سختی سے بولا تو بہارے کرسی سے اٹھتے اٹھتے ٹھہر گئی۔

''اور اب تم اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گی۔ سمجھیں؟''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' اس کے چہرے پر اداسی اتر آئی۔ وہ ان ہی سخت تنبیہ بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بس! کہہ دیا تو کہہ دیا۔''

چند لمحے دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ پھر وہ جیسے ڈرتے ڈرتے آہستہ سے بولی۔

''کیا ہم کہیں جا رہے ہیں؟ نہیں! میں نے کچھ نہیں سنا۔ میں تو بس دیکھ رہی تھی کہ تمہاری میز نیچے سے کیسی لگتی ہے۔ بس! تھوڑا سا خود بخود سنائی دیا تھا۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرنے لگی۔

''تمہارا ''خود بخود'' سمجھتا ہوں میں اچھی طرح۔'' اسے گھور کر واپس باہر دیکھنے لگا۔ بہارے کی سمجھ میں نہیں آیا، اس کا موڈ کس بات پہ خراب تھا۔

''عبدالرحمن!''

''بہارے! میری بات غور سے سنو۔ بعض دفعہ انسان کو اپنا گھر، شہر، ملک، سب چھوڑنا پڑتا ہے۔ قربانی دینی پڑتی ہے۔ میں تم سے

ایک قربانی مانگ رہا ہوں۔ میں تمہارے انکل کو واپس لے آیا ہوں۔ وہ اب تمہارے ساتھ رہے گا، مگر اس کی مجبوری یہ ہے کہ وہ ادالار میں نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اس نے ایک دوسرے ملک میں تم سب کے رہنے کا انتظام کیا ہے۔ وہ ادھر ہی ہے اور تمہارے، عائشے اور آنے کے لیے گھر سیٹ کروا رہا ہے۔ اسی ہفتے تم لوگ ادھر چلے جاؤ گے۔ اور پلیز! نہ روؤ گی، نہ ہی شور ڈالو گی، نہ تم مجھے تنگ کرو گی۔ تم ادالار چھوڑ دو گی اور میرے خلاف جانے کی ضد نہیں کرو گی، سمجھیں؟'' وہ باہر دیکھتے ہوئے بے لچک، سرد انداز میں کہتا گیا۔ بہارے کا چہرہ بجھتا چلا گیا۔

''یہ رہا تمہارا پاسپورٹ۔'' اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک ننھی سی کتاب نکال کر بہارے کو تھمائی۔ بہارے نے بے دلی سے اسے کھولا۔ اندر اس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

''ہم یہاں کیوں نہیں رہ سکتے؟''

''سوال نہیں کرو گی تم، سنا تم نے؟''

بہارے کا سر مزید جھک گیا۔ وہ پژمردگی سے پاسپورٹ کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ ایک جگہ وہ ٹھہر سی گئی۔ وہ نہ پاسپورٹ کے رنگ کو دیکھ رہی تھی، نہ ہی دوسری تفصیلات کو۔ وہ صرف ان دو حروف کو پڑھ رہی تھی، جو وہاں نمایاں کر کے لکھے تھے۔

"Hannah Kareem"

''عبدالرحمن! غلطی ہو گئی ہے۔ میرا نام غلط لکھ دیا ہے۔ حنہ کریم..... یہ تو میرا نام نہیں ہے۔'' وہ حیرت اور الجھن سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''اب یہی تمہارا نام ہے۔''

بہارے حیرت زدہ رہ گئی۔ کبھی وہ اس پاسپورٹ کو دیکھتی تو کبھی عبدالرحمن کے بے تاثر چہرے کو۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

''اور ایک آخری بات۔'' وہ اس کی طرف مڑا اور سابقہ انداز میں بولا۔ ''میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔''

سفید محل، ادالار، ترکی، اپنا نام، شناخت، بہارے گل ہر چیز چھوڑ سکتی تھی، مگر اس آخری بات نے تو اس کی سانس ہی روک دی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر عبدالرحمن کا چہرہ دیکھنے لگی۔

''تم..... تم ہمارے ساتھ نہیں رہو گے؟''

''نہیں! اور تم کوئی رونا نہیں ڈالو گی۔''

''مگر تم ہمیں ایسے نہیں چھوڑ سکتے۔ تمہیں..... تمہیں میری ضرورت ہے۔'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''اوہ کم آن! مجھے تمہاری بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بڑہی سے کہتے ہوئے مڑا اور باہر نکل گیا۔

بہارے کو اپنے اندر سے ایک آواز آئی تھی۔ جیسی مرمرا کے پانی میں پتھر پھینکنے کی ہوتی ہے۔ جیسی دل ٹوٹنے کی ہوتی ہے۔

آنسو لڑیوں کی صورت اس کے رخساروں پہ گرنے لگے۔ عبدالرحمن کو اس کی ضرورت تھی، تب ہی تو اس نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ اگر وہ مر گیا تو بہارے اسے جنازہ دے گی اور اس کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گی۔ چاہے پورا ترکی اسے چھوڑ دے، بہارے گل اسے کبھی نہیں چھوڑے گی۔

اس نے اپنی کمر سے بندھے گلابی پرس کو کھولا اور پاسپورٹ اس میں ڈال دیا۔ پھر وہ کرسی سے اتری اور دبے قدموں میز کے نیچے چلی آئی۔ چاروں طرف سے گرتے میز پوش نے پھر اسے ڈھک دیا۔

وہ لکڑی کی ٹانگ سے سر لگائے بیٹھی ہولے ہولے سسکنے لگی۔ وہ سب کچھ چھوڑ سکتی تھی، مگر عبدالرحمن کو نہیں۔ پھر اب کیوں.....

آنسو اس کی گردن سے پھسلتے ہوئے فراک کے کالر میں جذب ہو رہے تھے۔ اس نے دیکھنا چاہا کہ نیچے سے میز کیسی لگتی ہے، مگر وہ اسے دھندلی ہی دکھائی دی۔

بھیگی، آنسوؤں سے لدی۔

عبدالرحمن نے باہر نکلتے ہوئے جب آخری دفعہ گردن موڑ کر دیکھا تو بہارے اسے کرسی پہ ہی بیٹھی، بے آواز روتی دکھائی دی تھی۔ وہ اس سے زیادہ نہیں دیکھ سکتا تھا، سو تیزی سے باہر آ گیا۔

(جاری ہے)

جنت کے پتے

نمرہ احمد

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40-اُردو بازار، لاہور۔
فون: 37232336'37352332 فیکس: 37223584
www.ilmoirfanpublishers.com
E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

پچھلے باغیچے میں وہ عائشے کی ورک ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھا اور یوں ہی آسمان کو دیکھنے لگا۔ اس کا اپنا دل بھی بہت دکھی تھا۔ ان دونوں بہنوں کو اس کی وجہ سے اتنی تکلیف اٹھانی پڑے گی، اس نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اس سب کا ذمہ دار ہے۔ اس کی اور اس کے کاموں کی وجہ سے یہ سب ہوا تھا، مگر پھر بھی وہ بے قصور تھا۔ بہارے سے سختی اور سرد مہری سے بات کر کے اس نے اپنے تئیں ان کی روانگی آسان بنانے کی کوشش کی تھی، شاید یوں کرنے سے بہارے اس سے محبت کرنا چھوڑ دے اور پھر جلد اسے بھول جائے۔ یہ سب آسان نہیں ہوگا، مگر عائشے سنبھال لے گی اسے۔

اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے باغیچے میں بیٹھے دیکھ کر عائشے نے بے اختیار سوچا تھا کہ بہارے کو تو وہ سنبھال لے گی، مگر خود کو کیسے سنبھالے گی؟ چند ماہ قبل اس کی اور عبدالرحمٰن کی شدید لڑائی کے بعد اسے علم ہو گیا تھا کہ جلد یا بدیر وہ عبدالرحمٰن سے الگ ہو جائیں گی۔ وہ ان کا کبھی نہیں تھا۔ وہ ان کے لیے بنا ہی نہیں تھا۔ وہ ایک غیر فطری زندگی گزار رہے تھے، مگر اب وہ فطری طریقے پہ واپس آ جائیں گے۔ دادی، چچا، چھوٹی بہن...... عائشے کے تین ساتھی، فیملی ممبرز۔ اصل زندگی، حقیقی گھر، مکمل فیملی۔

اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا بھیگا گوشہ صاف کیا اور الماری کی طرف بڑھ گئی۔ آنے صبح سے تیاری میں لگی تھیں۔ وہ بہت خوش تھیں، سو اسے بھی اب تیاری مکمل کر لینی چاہیے۔

رہی محبت...... تو وہ اچھی لڑکیوں کو بھی ہو ہی جاتی ہے، لیکن جب انہیں یہ پتا چل جائے کہ وہ محبت انہیں مل ہی نہیں سکتی، تو وہ خاموش رہتی ہیں۔ اچھی لڑکیاں خاموش ہی اچھی لگتی ہیں۔

دکھی دل کے ساتھ اس نے دراز سے اپنی قیمتی چیزیں نکالنی شروع کیں۔ وہ ان سب کو ایک جیولری باکس میں ڈال رہی تھی۔ سب سے اوپر اس نے اپنی انگلی میں انگوٹھی اتار کر رکھی۔ یہ اسے عبدالرحمٰن نے اس کی سالگرہ پہ تحفے میں دی تھی اور وہ اسے کبھی نہیں اتارتی تھی۔ جواب میں اس نے عبدالرحمٰن کو اپنی سالگرہ پہ کیا دیا تھا۔ اس نے اپنے جیولری باکس کی سب سے آخری، چھوٹی سی دراز کھولی۔ وہ خالی تھی۔ کبھی اس میں وہ شے ہوتی تھی، جو اس نے عبدالرحمٰن کو دے دی تھی۔ مگر اس بے رحم آدمی نے اس کے تحفے کے ساتھ کیا کیا؟

عائشے نے آزردگی سے سر جھٹکا۔ زندگی میں سب سے زیادہ خوف اسے اسی بات پر آتا تھا کہ کہیں وہ جانتا تو نہیں کہ وہ کیا سوچتی ہے۔

مگر نہیں، وہ کبھی نہیں جان سکتا تھا۔ اس نے خود کو تسلی دی۔

وہ غلط تھی۔

☆ ☆ ☆

زارا اس سے ملنے آئی تھی۔ اتنے عرصے میں زارا کو تو وہ جیسے بھول ہی گئی تھی۔ اب دونوں مل کر بیٹھیں تو وہ ترکی کی باتیں ہی کیے گئی۔ بس یہی وہ موضوع تھا جس پر وہ زارا سے بات کر سکتی تھی۔ بعض دفعہ دوست تو وہی ہوتے ہیں، مگر وقت انسان کو اتنا آگے لے جاتا کہ وہ اپنے دوست کے مدار سے ہی نکل آتا ہے۔ پھر کتنا ہی میل ملاقات رکھ لے، وہ درمیانی فاصلہ ناقابل عبور بن جاتا ہے۔ وہ بھی زارا کے مدار سے نکل آئی

تھی۔ اس کی دوستیں تو صرف عائشے گل اور بہارے گل تھیں، جن کو وہ بتا کر بھی نہیں آئی تھی۔

آج فون کیا تو عائشے کا سیل آف تھا سو اس نے میل کر دی۔ ابھی تک جواب نہیں آیا تھا۔

زارا گئی تو فاطمہ نے اسے بلا لیا۔ صائمہ تائی آئی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔

''شکر ہے بیٹا! تم ہو...... ورنہ میں کیا کرتی۔ ارم کے سسرال والوں کی شاپنگ کرنی ہے۔ منگنی کے تحائف وغیرہ۔ ارم کو تو کچھ سمجھ نہیں ہے۔ تمہارا ٹیسٹ اچھا ہے۔ میرے ساتھ چلو'' تائی کی زبان میں جو حلاوت تھی، چکنائی بھری حلاوت عائشے، بہارے، ہالے، معتصم، ڈی جے یہ لوگ اس چکنائی سے کتنے دور تھے نا۔

شیور تائی اماں! میں ذرا عبایا لے آؤں'' وہ ہامی بھر کر اٹھنے لگی تو فاطمہ چونکیں۔

''تم نے عبایا لیا ہے؟''

''جی اماں! ایک فرینڈ نے گفٹ کیا تھا۔ میں نے سوچا، اب باہر جاتے ہوئے لے لیا کروں گی۔'' وہ بظاہر بہت لاپروائی سے کہتی اٹھ آئی۔

پھر تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے پاؤں کو چھوتے، حریر کے عبایا میں سیاہ اسٹول سلیقے سے چہرے کے گرد لپیٹ کر باہر آئی تو وہ دونوں پل بھر کو حیران رہ گئیں۔

''یہ اچھا کیا تم نے...... تم پہ اچھا بھی بہت لگ رہا ہے۔ فیشن بھی ہے آج کل عبایا کا'' صائمہ تائی مسکرا کر بولیں۔ ''ویسے! تمہارے تایا نے دیکھا تو بہت خوش ہوں گے۔''

(مجھے تایا سے سرٹیفکیٹ تو نہیں چاہیے تائی اماں!)

''ہاں! عبایا تو اچھا ہے، مگر بہت سمپل نہیں ہے؟'' فاطمہ ذرا متذبذب تھیں۔

چونکہ اس کا عبایا سادہ تھا اور سوائے آستین کے سبز اسٹونز کے جو اتنے مدھم تھے کہ توجہ نہ کھینچتے، کوئی کام نہ تھا، سو انہیں قلق تھا۔

''اور میں جب حج پہ گئی تو کتنا کہتی رہی کہ تمہارے لیے عبایا لے آؤں، مگر تم نے انکار کر دیا تھا۔'' فاطمہ تین چار سال پرانی بات دہرانے لگیں۔ وہ اس لیے اصرار کرتی رہی تھیں کہ ان کی بھابھی جو ان کے ساتھ حج پر تھیں، اپنی بیٹیوں کے لیے قیمتی اور کامدار عبایا لے رہی تھیں۔ حیا نے صاف منع کر دیا تھا۔ عبایا کے بجائے اس کی کزنز کے برقعے عروسی ملبوسات لگتے تھے۔

''بس! اب دل چاہ رہا تھا۔'' وہ نقاب کی پٹی سر کے پیچھے باندھنے لگی۔

''تم نے نقاب بھی شروع کر دیا؟'' صائمہ تائی کو اب واقعتاً جھٹکا لگا تھا۔

''چلیں تائی!'' وہ گاڑی کی چابی پرس سے نکالتے ہوئے بولی۔ اس کے نظر انداز کرنے کے باوجود تائی کہنے لگیں۔

''چلو اچھا لگ رہا ہے، مگر دیکھتے ہیں کہ تم کتنے دن کرتی ہو۔''

''اس نے دو دن بعد ہی چھوڑ دینا ہے۔'' فاطمہ مسکرا کر بولیں۔

''چلیں! دیکھتے ہیں لیڈیز۔'' وہ شانے اچکا کر کہتی باہر نکل آئی۔

استنبول بلاشک وشبہ ایک خوب صورت اور شان دار قسم کا شہر تھا۔ وہ مانتی تھی، مگر جو بھی ہو، پاکستان، پاکستان تھا۔ اپنے ملک کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔ بہت عرصے بعد وہ اپنے اسلام آباد کی سڑکیں، درخت اور مارکیٹ دیکھ رہی تھی۔

تائی کو پورا ایف ٹین پھرا کر وہ دونوں شام ڈھلے واپس آئیں تو ابا اور تایا فرقان لان میں ہی بیٹھے تھے۔ حیا شاپرز اٹھائے چلتی ہوئی آئی تو تایا ذرا سیدھے ہوئے۔ شاید انہیں لگا، کوئی مہمان ہے۔

''میں ہوں تایا!'' اس نے سر کے پیچھے بندھی پٹی اتار کر نقاب چہرے سے علیحدہ کیا تو وہ دونوں واقعی حیرت زدہ رہ گئے۔

''تم نے کب سے برقع لینا شروع کر دیا؟''

''ترکی میں شروع کیا تھا اور بس! ایسے ہی شروع کر دیا تھا۔'' وہ بہت عام سے انداز میں اپنے برقعے کی بات کر رہی تھی۔ تاکہ کوئی مذاق نہ اڑا پائے۔

مگر صائمہ تائی کسی اور ہی موڈ میں تھیں۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے حیا کے برقعے کی تعریفیں کرنے لگیں۔ ابا اب مسکرا رہے تھے۔ انہیں کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ تایا البتہ بہت خوش ہوئے۔

''ہم آج حیا سے کہہ رہے تھے کہ دیکھتے ہیں! کتنے دن تم برقع کرتی ہو۔''

''نہیں! ان شاء اللہ میری بیٹی قائم رہے گی۔'' تایا کی بات پہ وہ پھیکا سا مسکرادی اور اندر چلی آئی۔

برقع ہی تھا، اتنا کیوں ڈسکس کرنے لگے تھے سب۔ اسے اچھا نہیں لگا تھا، مگر شاید وہ بھی حق بجانب تھے۔ وہ پہلے اس کے برعکس لباس پہنتی تھی، سوان کی حیرانی بجا تھی۔

خیر! جو بھی ہے۔ عبایا اتار کر لٹکانے تک وہ ان تمام سوچوں سے چھٹکارا پا چکی تھی۔ اب اسے وہ کام کرنا تھا جس کے لیے وہ سارا دن مارکیٹ میں مضطرب رہی تھی۔ کل اسے یاد ہی نہیں رہا۔ تھکاوٹ ہی اتنی تھی اور آج موقع نہیں ملا۔ مگر اب مزید انتظار نہیں۔

اس نے لیپ ٹاپ آن کر کے بیڈ پہ رکھا اور پرس سے وہ مخملیں ڈبی نکالی۔ وہ جب بھی اسے کھولتی، دل عجیب طرح سے دھڑکتا تھا۔

پتا نہیں، کیا ہوگا اس میں؟

اس نے فلیش ڈرائیو کا پلگ لیپ ٹاپ میں لگایا۔ روشن اسکرین پہ ایک چوکھٹا ابھرا۔ اس پہ ایک مختصر سا پیغام تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس فائل پہ پاس ورڈ تھا اور پاس ورڈ درج کرنے کے لیے ایک ہی کوشش کی جا سکتی تھی۔ صحیح پاس ورڈ درج کیا تو فائل کھل جائے گی۔ غلط درج کیا تو فائل خود کو خود ہی ختم کر دے گی یعنی وہ کبھی نہیں جان سکے گی کہ اس میں کیا تھا۔

پیغام چند لمحوں بعد غائب ہو گیا۔ اب اسکرین پہ ایک خالی چوکھٹا چمک رہا تھا، جس میں آٹھ خانے بنے تھے۔ کسی آٹھ حرفی لفظ کے لیے یا کسی آٹھ ہندسوں کے عدد کے لیے۔

ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ ابھری۔ اسے ایک نئی پہیلی دیکھ کر بالکل بھی غصہ نہیں چڑھا۔ میجر احمد نے اسے چیلنج کیا تھا اور اسے اب یہ چیلنج جیت کر دکھانا تھا۔ کہیں نہ کہیں سے اسے اس کا پاس ورڈ مل ہی جائے گا اور پھر وہ اسے کھول لے گی۔

اس نے فائل کو آگے پیچھے ہر طرح سے کھولنے کی کوشش کی، مگر اس کا پروگرام خاصا پیچیدہ تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے یہ عجیب بات تھی کہ اس دفعہ احمد نے پہیلی نہیں دی تھی۔ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا، ورنہ وہ پہیلی ہمیشہ ساتھ ہی دیتا تھا۔ اب وہ پاس ورڈ کیسے ڈھونڈے؟ خیر! کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ وہ پرامید تھی۔

ترکی سے واپس آنے کے بعد آج اس نے فون آن کیا تھا۔ اپنی پرانی سم وہ نکلوا چکی تھی۔ ابھی دو گھنٹے ہی گزرے تھے کہ فون بجنے لگا۔

وہ جو لیپ ٹاپ پہ اپنی اور ڈی جے کی تصاویر دیکھ رہی تھی، چونک کر سیدھی ہوئی۔ جلتی بجھتی اسکرین پہ چمکتے الفاظ دیکھ کر ایک گہری سانس اس کے لبوں سے آزاد ہوئی۔

''خبر مل گئی آپ کو میجر صاحب؟'' فون کان سے لگاتے ہوئے وہ بولی۔

''مل تو گئی، مگر میں کافی حیران رہ گیا۔ آپ واپس کیوں آگئیں؟'' وہی نرمی، دھیما، شائستہ انداز۔ وہ جیسے اس کے انداز پر مسکرایا تھا۔

''حیرت ہے، آپ کو پہلی دفعہ پوری بات کا علم نہیں ہوا۔''

''لگتا ہے، آپ بہت غصے میں ہیں۔ کیا ہوا ہے؟''

''پتا نہیں۔'' وہ بے زاری بولی۔ پہلی بار اسے شدید احساس ہوا کہ وہ میجر احمد سے مزید بات نہیں کرنا چاہتی۔

''آپ کی آواز کافی بوجھل لگ رہی ہے۔ اداس بھی ہیں اور پریشان بھی۔ اگر آپ وجہ نہیں بتائیں گی تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ بس اتنا بتائیں! آپ ٹھیک تو ہیں؟'' وہی فکرمند انداز۔ وہ کیوں کرتا تھا اس کی اتنی فکر۔

''جی! میں ٹھیک ہوں اور کچھ نہیں ہوا۔'' اگر اسے نہیں معلوم تھا تو وہ خود...... اپنے شوہر کی کسی کمزوری سے اسے آگاہ نہیں کرے گی۔

اور بتاتی بھی تو کیا، کہ اس نے عبدالرحمٰن کے ساتھ دیکھا ہے جہان کو؟ اور وہ ان کی باتیں؟

ان ساری باتوں کو از سرِ نو یاد کرتے ہوئے وہ ٹھہر سی گئی۔ عبدالرحمٰن نے اسے ٹیکسٹ کر کے بلایا تھا۔ جب وہ پینٹری کی کھڑکی کے قریب پہنچی تو اسے وہاں سے پاشا کا چہرہ سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے، اس نے اسے آتے ہی دیکھ لیا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ جان بوجھ کر یہ سب کہہ رہا ہو تاکہ وہ بددل ہو جائے اور جہان کو چھوڑ دے۔ ہو سکتا ہے اس نے حیا کو ''سیٹ اپ'' کیا ہو۔ آخر! اس نے جہان کی طرف کی کہانی تو نہیں سنی تھی۔ ابھی پورا مہینہ حائل تھا، اس کی اور جہان کی ملاقات میں۔ تب تک وہ......

''حیا؟'' وہ چونکی، پھر سر جھٹکا۔

"یہ جو آپ کی فلیش ڈرائیو پہ پاس ورڈ ہے، اسے کھول کر کوئی اور پزل بھی نکلے گا کیا؟"

"نہیں! یہ آخری لاک ہے۔ پھر میری امانت آپ دیکھ لیں گی۔"

"اور اس کا پاس ورڈ کیا ہے؟"

"وہ آپ جیسی ذہین خاتون کو چند منٹ میں ہی مل جائے گا۔"

"اچھا! آپ طنز کر رہے ہیں" وہ بے اختیار ہنس دی۔

"نہیں! سچ کہہ رہا ہوں۔ بہت ہی آسان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرے پزل کا آخری ٹکڑا بھی جوڑ لیں گی۔"

"ٹھیک ہے! اگر مجھے مزید آپ کی ضرورت نہیں ہے تو پھر آپ آئندہ مجھے کال مت کیجئے گا۔ میں مزید آپ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔" اس کا لہجہ بہت خشک ہو گیا تھا۔ چند ثانیے وہ کچھ کہہ نہیں پایا۔

"مگر آپ کے شوہر کو علم تو ہے، پھر......؟ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے حیا......" اس کی آواز میں دکھ سا تھا۔

"میں بغیر کسی ضرورت کے آپ سے بات نہیں کرنا چاہتی اور اب مجھے ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے آئندہ میں آپ کی کال اٹینڈ نہیں کروں گی۔ خدا حافظ۔"

کسی لمبی بحث سے بچنے کے لیے اس نے از خود کال بند کر دی۔ احمد نے فوراً دوبارہ کال کی۔ اس نے نہیں اٹھائی۔ اب اسے احمد کی مزید کال نہیں اٹھانی تھی۔ کل کو کوئی اونچ نیچ ہوئی تو سب سے پہلے اس کا حجاب بدنام ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ اب اسے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس نے موبائل تکیے پہ ڈال دیا۔ احمد سے قطع تعلق کر کے اسے کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے لیے کبھی بھی، کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ مطمئن تھی۔

☆ ☆ ☆

اس شام وہ کچن میں کھڑی سلاد تیار کر رہی تھی۔ فاطمہ بھی ساتھ ہی کام میں مصروف تھیں۔ نور بانو برتن دھو رہی تھی۔ ابا لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ ذرا بلند آواز میں ان تینوں افراد کی مصروفیت سے بے نیاز ان کو ترکی کی باتیں سنا رہی تھی۔ جب اپنے اندر کی اداسی، جہان کی خاموشی اور یادوں سے تنگ آ جاتی تو اسی طرح بولنے لگ جاتی اور آج کل تو اس کی ہر بات ترکی سے شروع ہو کر ترکی پہ ختم ہوتی تھی۔ سفرنامہ استنبول، یہ وہ موضوع تھا جس سے گھر والے اب بور ہو چکے تھے۔ مگر وہاں پروا کسے تھی۔

اپنے گھر میں یہ سہولت تھی کہ کوئی مرد ملازم نہ تھا۔ تایا فرقان کا کک ظفر بہت ہی کم ادھر آیا کرتا تھا۔ ان کا خاندان ویسے بھی روایتی تھا۔ تایا کی تربیت تھی کہ روحیل نہیں ہے تو ان کے بیٹوں کو ادھر نہیں آنا اور خود بہت کم، سوائے کسی کام کے، ادھر نہیں آتے تھے۔ سو وہ اپنے گھر میں آزادی سے گھوم پھر سکتی تھی۔

"پتا ہے نور بانو! وہاں ٹاپ قپی پیلس کے پیچھے والے ریسٹورنٹ میں کیا ملتا تھا؟"

اب نور بانو کے تو فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ ٹاپ قپی پیلس کس جگہ کا نام ہے۔ وہ بے چارگی سے نفی میں سر ہلائے گئی۔ مگر وہاں جواب کا انتظار کر کون رہا تھا۔ وہ کٹنگ بورڈ پہ سبزیاں کھٹ کھٹ کاٹتی بولتے چلی جا رہی تھی۔

"وہاں ایک مشروب ملتا تھا، ایران نام کا۔ بالکل لسی کی طرح تھا۔ اتنا مزے دار کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ میں ریسیپی لائی ہوں۔ کبھی مل کر بنائیں گے۔"

لاؤنج میں رکھا لینڈ لائن فون بجنے لگا تو ابا نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔ حیا نے گردن اٹھا کر ان کو دیکھا۔ لاؤنج اور کچن کے درمیانی دیوار اوپر سے آدھی کھلی تھی، وہ ان کو باآسانی دیکھ سکتی تھی۔

"ہاں سبین! کیسی ہو؟" وہ اب مسکرا کر بات کرنے لگے تھے۔

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ لمحے بھر کو اسے ٹاپ قپی اور ایران بھول گیا۔ وہ بالکل چپ سی ہوئی، ذرا سست روی سے ہاتھ چلانے لگی۔ سماعت ادھر ہی لگی تھی۔

"کیا..... کب؟" ابا کے تاثرات بدلے۔ وہ ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھے۔

اس نے چھری گاجر میں لگی چھوڑ دی اور پریشانی سے ابا کو دیکھا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون!'' وہ بہت دکھ سے کہہ رہے تھے۔ فاطمہ بھی جیسے گھبرا کر باہر گئیں۔ تب تک ابا فون رکھ چکے تھے۔

''کیا ہوا؟'' فاطمہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔ حیا اسی طرح مجسمہ بنے کھڑی، سانس روکے ان کو دیکھ رہی تھی۔

''سکندر کا انتقال ہو گیا ہے۔''

ابا کے الفاظ نے پورے لاؤنج کو سکتے میں ڈال دیا۔ ملال بھرے سکتے میں۔ حیرت، شاک، دکھ، وہ ملی جلی کیفیات میں گھری کھڑی تھی۔

''وہ لوگ دو، ایک روز میں باڈی لے کر آ رہے ہیں۔ میں فرقان بھائی کو بتا دوں۔'' ابا تاسف سے کہتے فون اٹھا کر نمبر ملانے لگے۔

ایک لمحہ، بس ایک لمحہ انسان سے اس کی شناخت چھین کر اسے باڈی بنا دیتا ہے۔

اس کے اندر کہیں بہت سے آنسو گرے تھے۔ بے اختیار اسے ڈی جے یاد آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

سلیمان صاحب کے بنگلے پہ فوتگی والے گھر کی سوگواریت چھائی تھی۔ لان میں قنات لگا کر مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ جبکہ خواتین اندر لاؤنج میں تھیں، جہاں فرنیچر ہٹا کر چاندنیاں بچھا دی گئی تھیں درمیان میں کھجور کی گٹھلیوں کا ڈھیر تھا۔ رشتے دار خواتین سادہ حلیوں میں تھیں، مگر عابدہ چچی، سحرش اور ثنا بالکل سفید، نئے لباس پہن کر آئی تھیں۔ پتا نہیں یہ رواج کہاں سے چل نکلے تھے۔ اس نے البتہ چاکلیٹی رنگ کی لمبی قمیص، چوڑی دار کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ ہم رنگ دوپٹا ٹھیک سے سر پہ لیے، گٹھلیاں پڑھتے وہ لاشعوری طور پہ ایسی جگہ پہ بیٹھی تھی، جہاں سے کھڑکی کے باہر لان صاف نظر آتا مگر باہر والوں کو اندر نہیں نظر آتا تھا کہ دوپہر کا وقت تھا اور کھڑکیوں کے شیشے باہر سے ری فلیکٹ کرتے تھے۔ لان میں خاندان کے مرد جمع تھے۔ ابا، تایا اور کچھ کزنز البتہ نہیں تھے۔ وہ لوگ پھپھو اور میت کو لینے ایئرپورٹ گئے تھے۔ آج تین روز بعد سکندر انکل کی باڈی کلیئرنس حاصل کر کے اپنے ملک لائی جا رہی تھی۔

اور وہ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ وہ جہان کا سامنا کیسے کرے گی؟

خیر! خفت اسے ہونی چاہیے، نہ کہ حیا کو۔ وہی قصوروار تھا، وہی پاشا کا ساتھی تھا اور اتنی تو وہ مضبوط تھی ہی کہ اپنے تاثرات چہرے پہ نہیں آنے دے گی۔ جو بھی ہو گا، دیکھا جائے گا۔ اس کے باوجود جب باہر شور سا مچا اور وہ لوگ پہنچ گئے تو اس کا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ وہ خود حیرت زدہ رہ گئی۔

اتنے برس بعد پھپھو آئی تھیں، وہ بھی تابوت کے ساتھ۔ لاؤنج کے دروازے پہ خواتین ان سے ملتے ہوئے رو رہی تھیں۔ اونچا بین، بلند سسکیاں۔ وہ دور دراز کی رشتہ دار عورتیں جو ہر شادی میں سب کی طرف سے گاتی اور ہر فوتگی میں سب کی طرف سے روتی تھیں، سب سے آگے تھیں۔

پھپھو بہت نڈھال لگ رہی تھیں۔ بھیگی آنکھوں کے ساتھ فاطمہ سے مل رہی تھیں۔ وہ سب ہی کھڑے ہو چکے تھے۔ لڑکے تابوت اندر لا رہے تھے۔ حیا ذرا ایک طرف ہو گئی۔ اور دوپٹے کا پلو ذرا ترچھا کر کے چہرے پہ ڈال کے، ہاتھ سے پکڑ لیا۔ دوپٹا پیشانی سے کافی آگے تھا اور یوں ترچھا کر کے ڈالنے سے گال، ہونٹ، ناک، سب چھپ گیا تھا۔ یہ اس کا غیر محسوس سا نقاب تھا۔ اب اگر وہ نقاب کرتی ہی تھی تو منافقت کیسی کہ باہر کے مردوں سے کرے اور کزنز سے نہ کرے؟ ایک فیصلہ کیا ہے تو اسے صحیح سے نبھائے بھی۔

مرد باہر چلے گئے تو وہ آگے بڑھ کر پھپھو کے گلے لگی۔

''حیا..... تم کہاں چلی گئی تھیں؟ جہان بہت اپ سیٹ تھا۔'' بے آواز آنسو بہاتی پھپھو اس سے الگ ہو کر آہستہ سے بولی تھیں۔ وہ سخت شرمندہ ہوئی۔ کیا تھا اگر پھپھو کو ایک فون ہی کر لیتی؟ اس نے جواب نہیں دیا۔ جواب تھا بھی نہیں۔

پھر جب وہ اپنی جگہ پہ آ کر بیٹھی تو نگاہ کھڑکی پہ پھسل گئی۔ باہر لگے مجمع میں وہ جہان کو کھوجنے لگی اور پھر ایک دم وہ چونکی۔

اس نے بہت سی باتیں سوچی تھیں۔ جہان اتنا غیر متوقع تھا کہ اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ کیسا رویہ رکھے گا، مگر جو جہان نے کیا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

جہان سکندر پاکستان آیا ہی نہیں تھا۔

''جہان نہیں آیا چچی!'' فرخ پتا نہیں کب اندر آیا تھا اور قریب ہی کھڑا فاطمہ کو بتا رہا تھا۔ ''پھپھو بتا رہی تھیں کہ وہ کاموں میں پھنسا ہوا ہے۔''

فرخ بتا کر آگے بڑھ گیا۔ فاطمہ تو فاطمہ، وہ خود بھی ششدر رہ گئی۔ ایسی بھی کیا مجبوری کہ بندہ باپ کے جنازے پہ بھی نہ آئے۔ وہ اتنی حیران تھی کہ گٹھلیاں بھی نہیں پڑھ پا رہی تھی۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا۔ صرف حیا کا ساتھ دینے وہ ڈی جے کے وقت آ سکتا تھا تو اپنے باپ کے ساتھ کیوں نہیں......؟

"جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا ہو کر نہیں دیکھتا، اسے پوری بات سمجھ نہیں آتی"

کہیں دور سے جہان کی آواز ابھری تھی۔ شاید وہ وضاحت اس نے اسی لمحے کے لیے دی تھی۔ مگر......وہ کیوں نہیں آیا! کیوں!

☆ ☆ ☆

سب بہت متاسف اور غمزدہ سے تھے۔ گھر میں خاموشی نے سوگواریت طاری کی ہوئی تھی۔

اگلی روز قل تھے۔ گھر میں کچھ کرنے کے بجائے تایا اور ابا نے وہی کیا تھا، جس کا رواج آج کل اسلام آباد میں چل نکلا تھا۔ تمام عزیز و اقارب کو کسی فائیو سٹار ہوٹل میں ڈنر کے لیے فیملی واؤچرز دے دیے گئے کہ بمع خاندان جا کر ڈنر کریں اور مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے دعا کریں۔ اسلام آباد بھی کبھی کبھی اسے لگتا کہ استنبول بنتا جا رہا ہے۔ اس سے یہ ہوا کہ لوگوں کے سوال اور گڑے مردے اکھاڑے جانے سے تایا اور ابا محفوظ رہے۔ مگر حیا نے سوچا ضرور کہ تایا فرقان کے اسلام کو اب کیا ہوا؟

فاطمہ فون سننے اٹھیں تو وہ کافی کا کپ لیے پھپھو کے پاس آ گئی۔ وہ اکیلی بیٹھی تھیں۔ خاموش، تھکی ہوئی۔ ایک سفر تھا جو تمام ہوا۔ ایک مشقت تھی جو ختم ہوئی۔

"تھینک یو بیٹا!" اس نے کپ بڑھایا تو وہ چونکیں، پھر بھیگی آنکھوں سے مسکرائیں اور کپ تھام لیا۔ "تمہارے ساتھ بیٹھ ہی نہیں سکی۔"

"شرمندہ مت کریں پھپھو! میری ہی غلطی ہے، میں نے سوچا، جہان کو میرا میسج مل گیا ہوگا اور وہ آپ کو بتا دے گا۔" ایک مبہم سی وضاحت دے کر وہ اپنا کپ لیے ان کے ساتھ آ بیٹھی۔

"نہیں! وہ کہہ رہا تھا، تم بغیر بتائے چلی گئی ہو۔ بہت پریشان تھا۔ شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"وہ......آیا کیوں نہیں؟" سرسری سے انداز میں اس نے پوچھ ہی لیا۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہیں، جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہوں کہ وہ کتنا جانتی ہے۔

"وہ ترکی سے باہر گیا ہوا تھا۔ فلائٹ کا مسئلہ تھا کچھ ابھی ایک دو روز میں آ جائے گا۔"

"پھر آپ کو تو بہت مشکل ہوئی ہوگی، اکیلے سب کچھ مینج کرنا۔"

"حیا! میں نے ساری زندگی سب کچھ تنہا ہی مینج کیا ہے۔ میرے ساتھ تب بھی کوئی نہیں تھا، جب میں اور میرا بیٹا جلاوطنی کاٹ رہے تھے۔" وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔ "اور اب تو میں اتنی مضبوط ہو چکی ہوں کہ اپنے مسئلے حل کرنے کے لیے مجھے اپنے خاندان کے مردوں کے سہارے کی ضرورت نہیں رہی۔"

وہ بس ان کو دیکھے گئی۔ ان کے چہرے کی لکیروں میں برسوں کی مشقت کی داستان تھی، جسے پڑھنے کی آنکھ حیا کے پاس نہیں تھی۔

"تمہیں بھی اتنا ہی مضبوط بننا چاہیے۔"

ان کی آخری بات پہ بے اختیار وہ چونکی تھی۔

یہ ماں بیٹا بعض اوقات کتنی مبہم باتیں کر جاتے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ گہری نیند میں تھی، جب کوئی آواز سیٹی کی طرح اس کی سماعت میں گونجی۔ کافی دیر بعد اس نے بھاری پپوٹے بمشکل اٹھائے اور اندھیرے میں جلتے بجھتے روشنی کے منبع کی طرف دیکھا۔

موبائل۔

بدقت اس نے بازو بڑھا کر بجتا ہوا موبائل اٹھایا۔

جہان کالنگ۔

اس کی ساری نیند اڑ گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی اور کال پک کی۔ ساری ناراضی رات کی خاموشی میں تحلیل ہوگئی تھی۔

''جہان؟'' اس کی آواز ابھی بھی نیند سے بوجھل تھی۔

''حیا......!'' وہ دھیمی آواز میں کہتا ذرا رکا ''کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں اور تم؟'' بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے اس نے ریموٹ اٹھا کر اے سی آف کیا۔ کمرا بہت ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

''فائن۔ تم سو رہی تھیں؟''

''ہاں!''

اس وقت میں فٹ بال تو کھیلنے سے رہی، اس نے سوچا۔

''ممی سو رہی ہیں؟''

''ظاہر ہے! اٹھاؤں انہیں؟''

''نہیں نہیں! ان کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ ماموں ہیں یا ڈرائیور؟'' وہ جیسے سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

''نہیں! ابا اور اماں شام میں لاہور گئے ہیں۔ کوئی فوتگی ہوگئی تھی۔ صبح ہی آجائیں گے، کیوں؟'' وہ ایک دم چونکی۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں ایرپورٹ پہ ہوں اور مجھے تمہارے گھر کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ تم مجھے لینے آسکتی ہو؟''

''اوہ ہاں! تم رکو۔ میں آرہی ہوں۔'' وہ لحاف پھینک کر تیزی سے بستر سے اتری۔

منہ دھو کر عبایا پہن کر وہ چابی لیے خاموشی سے باہر نکل آئی۔ ڈرائیور ابا کے ساتھ گیا تھا۔ ویسے بھی وہ پارٹ ٹائم تھا۔ ایسے میں وہ خود جائے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا حل نہیں تھا۔

اسلام آباد کی خوب صورت، صاف ستھری سڑکیں خالی پڑی تھیں۔ ابھی رات باقی تھی۔ اسٹریٹ پولز کی زرد روشنی سڑک کو جگمگا رہی تھی۔ ایرپورٹ پہ پہنچ کر اس نے جہان کو کال کر کے آنے کا پیغام دیا۔ اس کا ترکی کا نمبر رومنگ پہ تھا۔

''السلام علیکم!'' چند ہی منٹ بعد وہ دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا۔ ایک چمڑے کا بھورا دستی بیگ اپنے قدموں میں رکھا اور سیٹ بیلٹ پہننے لگا۔

''وعلیکم السلام!'' اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے حیا نے ذرا کی ذرا نگاہ پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ سیاہ پینٹ پہ آدھے آستین والی گرے ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہی ماتھے پہ گرتے ذرا بکھرے بکھرے بال۔ ایرپورٹ کی بتیاں اندھیرے میں اس کے چہرے کو نیم روشن کیے ہوئے تھیں۔ وہ اسے پہلے سے ذرا کمزور لگا۔ اسے ترکی سے آئے ڈیڑھ ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا، مگر پھر بھی فرق واضح تھا۔

کار سڑک پہ رواں دواں تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ آخری ملاقات کا بوجھل پل اور تناؤ ابھی درمیان میں حائل تھا۔

''ممی اٹھیں تو نہیں؟''

''نہیں!'' وہ ذرا دیر کو رکی۔ ''تم آئے کیوں نہیں؟ سب پوچھ رہے تھے۔''

''مصروف تھا۔'' وہ گردن ذرا ترچھی کیے باہر ویران اندھیری سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش ہوگئی۔ کہنے کو جیسے کچھ نہیں تھا۔

''کیا تم مجھے پہلے قبرستان لے جاسکتی ہو؟''

''حیا نے سر ہلا دیا۔ قبرستان گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ جلدی ہی وہ پہنچ گئے۔ باہر نیلا سا اندھیرا چھایا تھا۔ سوالیہ نشان کی صورت بنے سات بہن بھائی، ستارے آسمان پہ چمک رہے تھے۔

''پھوپھا کی قبر آپ کے دادا کی قبر کے ساتھ ہی ہے۔'' حیا نے اسے بتایا۔

احاطے میں جہان کے والد اور دادا کی قبریں داخلی دروازے کے ساتھ ہی ایک طرف تھیں۔ ایک درخت اس کے دادا کی قبر پہ سایہ کر رہا تھا۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے قبرستان کے داخلی دروازے پر ہی کھڑی ہوگئی۔ یہاں سے وہ جہان کو بہ آسانی دیکھ سکتی تھی۔ جہان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دونوں قبروں کے پاس آیا پھر دھیرے سے وہ سکندر شاہ کی قبر کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھتا گیا۔ دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اب وہ دعا مانگ رہا تھا۔ حیا اس کے عقب میں تھی، سو اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

دعا کے بعد وہ کافی دیر سر جھکائے، ایک پنجے کے بل قبر کے سامنے بیٹھا رہا۔ انگلی سے وہ مٹی پر لکیریں کھینچ رہا تھا، پھر جب وہ اٹھا تو حیا جانے کے لیے پلٹ گئی۔

گھر آ کر وہ اندر داخل ہوا تو حیا نے آہستگی سے لاؤنج کا دروازہ بند کیا اور دو انگلیوں سے نقاب نیچے کھینچتے ہوئے اتارا۔

"تم آرام کرلو۔ میں اوپر کمرا دکھاتی ہوں۔" وہ اجنبی سے انداز میں کہتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ جہان خاموشی سے اس کے پیچھے اوپر آیا۔ دستی بیگ ہاتھ سے پکڑ کر کندھے پہ ڈال رکھا تھا۔

حیا دروازہ کھول کر ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ صاف ستھرا سا گیسٹ روم۔

"کچھ کھاؤ گے؟" اس نے چوکھٹ پہ کھڑے کسی رسمی میزبان کے لہجے میں پوچھا۔ جہان نے بیگ بیڈ پہ رکھا اور ساتھ بیٹھا۔

"بس ایک کپ چائے۔ میرے سر میں درد ہے۔" وہ جھک کر جوگرز کے تسمے کھول رہا تھا۔

وہ الٹے قدموں واپس پلٹی۔ چند منٹ بعد جلدی جلدی چائے بنا کر لائی۔

وہ بیڈ پہ نیم دراز آنکھوں پہ بازو رکھے ہوئے تھا۔

"چائے!" اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا۔ وہ ہلا تک نہیں۔

"جہان!"

مگر وہ سو چکا تھا۔

حیا کی نگاہیں اس کے پاؤں پہ پھسلیں۔ جوگرز کے تسمے کھول چکا تھا، مگر اتارے نہیں۔ پتا نہیں کیوں اسے ترس سا آیا۔ شاید وہ تھکا ہوا تھا۔ شاید بیمار تھا۔ اس نے اے سی آن کیا اور دروازہ بند کر کے باہر آگئی۔

صبح وہ دیر سے اٹھی۔ لاؤنج میں آئی تو فاطمہ اور پھپھو چائے پی رہی تھیں۔ گیارہ بج چکے تھے۔

"نور بانو! میرا ناشتا!" نور بانو کو پکار کر وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔ فاطمہ لاہور والوں کا تذکرہ ہی کر رہی تھیں۔

"آپ لوگ کب آئے؟"

"صبح آٹھ بجے پہنچ گئے تھے۔ تم سو رہی تھیں۔" فاطمہ مسکرا کر کہنے لگیں۔

"ہوں، اچھا! جہان اٹھ گیا؟" حیا کی نگاہ سیڑھیوں کے اوپر پھسلی تو یونہی لبوں سے نکلا وہ دونوں ایک دم اسے دیکھنے لگیں۔

"جہان؟"

"اوہ......" وہ ایک دم سیدھی ہوئی۔ "وہ صبح پہنچ گیا تھا۔ اوپر کمرے میں ہے۔ آپ کو نہیں پتا چلا؟"

"نہیں......وہ آ گیا؟" سبین سکندر کے چہرے پہ ایک دم چمک سی ابھری۔ خوش گوار سی حیرت۔ وہ باپ کے جنازے کے تیسرے دن پہنچ رہا ہے، مگر ادھر کوئی ناراضی نہیں۔

"جی! میں دیکھتی ہوں۔" وہ خود ہی اٹھ آئی۔

اوپر اس کے کمرے کا دروازہ کھولا تو یخ بستہ ہو چکا تھا۔ اے سی تب کا آن تھا۔ اس نے جلدی سے اے سی بند کیا اور پنکھا چلا دیا۔

جہان اسی حالت میں جوتوں سمیت لیٹا تھا۔ آنکھوں پہ بازو رکھے۔ وہ شاید نیند میں بھی کسی کو اپنی آنکھیں پڑھنے نہیں دیتا تھا۔ تپائی پہ دھری چائے ٹھنڈی اور پرانی ہو چکی تھی۔ سوچا، اٹھالے، پھر خیال آیا کہ رہنے دے۔ اس کو پتا تو چلے کہ وہ اس کے لیے چائے لے آئی تھی۔

وہ دوپہر کے کھانے تک بھی نہیں اٹھا۔ پھپھو اس کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھیں، سو اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ سہ پہر میں ذرا را آ گئی۔ موسم اچھا تھا۔ دونوں نے شاپنگ پلان کر لی، مگر جب وہ عبایا پہن کر باہر آئی تو پھر سے ایکشن ری پلے شروع ہو گیا۔

"تم نے عبایا کب سے لینا شروع کر دیا؟"

وہی حیرت، سوال تفتیش، تشویش۔

ایک لمبا اور جامع سا جواب دے کر بھی اسے لگا کہ ذرا غیر مطمئن ہے اور غیر آرام دہ بھی۔ شاپنگ کرتے، جوتے دیکھتے، کپڑے نکلواتے اور پھر آخر میں راحت بیکرز کے سامنے پارکنگ لاٹ میں بیٹھے "اسکوپ" کا سلش پیتے ہوئے ذرا بار بار ایک غیر آرام نگاہ اس پہ ڈالتی جو پورے اعتماد سے عبایا اور نقاب میں بیٹھی، سلش پی رہی تھی۔

"یار! چہرے سے تو اتار دو۔"

"زارا! میرا نہ دم گھٹ رہا ہے، نہ ہی مرنے لگی ہوں۔ میں بالکل کمفرٹیبل ہوں۔ اگر تم نہیں ہو تو بتاؤ۔" وہ ایک دم بہت سنجیدگی سے کہنے لگی۔

وہ حیا سلیمان تھی۔ وہ عائشے گل کی طرح ہر بات نرمی سے سہہ جانے والی نہیں تھی۔ جب وہ اپنے زمانہ جاہلیت کے لباس پہ کسی کو بولنے کا موقع نہیں دیتی تھی تو اب نقاب پہ کیوں کسی کو بولنے دے؟ صرف حجابی لڑکی صبر کیوں کرے؟ اس کی رائے میں بہت زیادہ چپ رہنے کو بھی کمزوری سمجھا جاتا تھا۔

"نہیں نہیں! میں تو تمہارے لیے کہہ رہی تھی۔" زارا ذرا بوکھلا گئی تھی۔

وہ سر جھٹک کر سلش پینے لگی۔

باہر پارکنگ لاٹ میں چند ماہ پہلے کے مناظر اب بھی رقم تھے۔ ڈولی اسے سب سے پہلے اسی جگہ پہ ملا تھا۔ میجر احمد یعنی پنکی سے مل کر جو اسے الجھن ہوتی تھی کہ وہ پنکی کیسے بنا، اب وہ ختم ہو گئی تھی۔ وہ تو اس کی جاب کا حصہ تھا۔ پتا نہیں، وہ بات پہلے کیوں نہیں سمجھ سکی؟

وہ واپس آئی تو دل ذرا بوجھل تھا۔ زارا اور اس کا مدار اب مختلف ہو گیا تھا۔ پتا نہیں، ڈی جے اگر ہوتی تو کیسا رد عمل دیتی؟ اب اجنبی کا ٹیگ جو پیشانی پہ لگ گیا تھا۔

لاؤنج میں سب بڑے بیٹھے تھے۔ تایا، تائی، ابا، اماں، پھپھو اور سامنے ایک صوفے پہ سنجیدہ سا بیٹھا جہان۔ وہی صبح والے کپڑے، مگر بال گیلے تھے۔ شاید ابھی ابھی فریش ہو کر نیچے آیا تھا۔ وہ سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے پہ پہنچ کر اسے لگا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ جہان تایا فرقان کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر اندر آ گئی۔

دوبارہ اس کی جہان سے ملاقات رات کے کھانے پہ ہوئی۔

وہ ذرا دیر سے ڈائننگ ٹیبل پہ پہنچا تھا۔ ابا مرکزی کرسی پہ تھے۔ حیا، فاطمہ کے ساتھ ایک طرف تھی۔ جہان نے جو کرسی کھینچی، وہ حیا کے بالمقابل تھی، مگر وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ وہ بھی یہی کر رہا تھا۔ بلکہ وہ تو شاید ہمیشہ سے یہی کرتا آیا تھا۔

"کتنی چھٹی ہے تمہاری؟" ابا کھانے کے دوران پوچھنے لگے۔ وہ سر جھکائے، کانٹے سے سلاد کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے بولا۔

"کچھ کنفرم نہیں ہے۔"

"چھٹی کیسی؟ اپنا ریسٹورنٹ ہے اس کا۔ بلکہ پاشا کا۔" اس نے تلخی سے سوچا۔

"ایک ڈیڑھ ہفتہ تو ہوں، پھر شاید چلا جاؤں۔ ممی کو یہیں اپارٹمنٹ لے دوں گا۔"

حیا نے چونک کر سر اٹھایا۔

"پھپھو! آپ اب یہیں رہیں گی؟" اس کے چہرے پہ خوش گوار سی حیرت امڈ آئی تھی۔ سبین پھپھو نے ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔

صرف سکندر کے لیے وہاں تھی۔ اب ادھر رہنے کا جواز نہیں ہے۔"

"تو جہان! آپ بھی یہیں شفٹ ہو جاؤ۔"

فاطمہ نے ذرا دبے دبے سے جوش سے کہتے ہوئے ایک نظر سلیمان صاحب کو دیکھا۔ وہ بھی ذرا امید سے جہان کو دیکھنے لگے۔ وہی، بیٹی کو اپنے قریب رکھنے کی خواہش۔

"اور اپارٹمنٹ کی کیا ضرورت ہے؟ یہی گھر ہے سبین کا۔"

جہان ہلکا سا مسکرایا۔ وہ پورے دن میں پہلی دفعہ مسکرایا تھا۔

"رہنے دیں ماموں! میرے نصیب میں پاکستان میں رہنا لکھا ہی نہیں ہے۔"

اس کی آواز میں کچھ تھا کہ حیا ہاتھ روک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ سر جھکائے کھانا کھا رہا تھا، مگر چہرے پہ وہی مسکراہٹ، وہی چمک تھی، جو وہ کبھی کبھی اس کے چہرے پہ دیکھا کرتی تھی۔ خاص موقعوں پہ، خاص باتوں پہ۔

خیر! کبھی وہ اس کی وجہ بھی جان ہی لے گی۔ وہ دھیرے سے سر جھٹک کر کھانا کھانے لگی۔

☆　☆　☆

صبح فجر پڑھ کر سونے کی بجائے وہ اوپر آ گئی۔ جہان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک نظر اس نے بند دروازے پہ ضرور ڈالی تھی۔ کچھ چیزیں کرنے سے انسان خود کو کبھی روک نہیں پاتا۔

چھت پہ ہر طرف لہلاتے گملوں کی سرحد بنی تھی۔ ابا کا شوق، منڈیر وہاں سے کافی اونچی تھی۔ منڈیر کے ساتھ ہی کین کا ایک جھولا رکھا تھا۔ اس خوب صورت صبح میں وہ جھولے پہ آ بیٹھی اور گردن موڑ کر منڈیر کے سوراخ سے باہر دیکھا۔ منڈیر اس کے سر سے اونچی تھی، مگر ڈیزائن کے طور پہ بڑے بڑے سوراخوں سے نیچے کالونی اور سڑک صاف نظر آتی تھی۔ وہ یونہی ترچھی ہو کر بیٹھی کالونی پہ اترتی صبح دیکھنے گئی۔ ہر سو خاموشی اور تازگی تھی۔ کبھی کبھی پرندوں کے بولنے کی آواز آ جاتی یا پھر کسی کے بھاگنے کی۔

وہ ذرا چونکی۔ دور سڑک پر کوئی بھاگتا آ رہا تھا۔ ٹریک سوٹ میں ملبوس، جاگنگ کرتا شخص۔ اسے ایک لمحہ لگا تھا پہچاننے میں۔

"جہان!"

وہ حیران ہوئی تھی۔ وہ کب اٹھا، کب گھر سے نکلا، معلوم نہیں۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ جہان اب گھر کے سامنے سے گزر کر مخالف سمت دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ گردن پوری موڑ کر اس کو دیکھنے گئی۔

چند قدم دور وہ رکا، اور ٹھٹک کر پیچھے سڑک کو دیکھا۔ جیسے اسے محسوس ہوا ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ مگر وہ سڑک پہ ہی دیکھ رہا تھا، اوپر نہیں۔ وہ جلدی سے جھولے پر سے اٹھی اور اندر دوڑ گئی۔

وہ پھر سے پکڑے نہیں جانا چاہتی تھی۔ سبز ٹیولپ، پھولوں کی مارکیٹ اور وہ دکاندار...... اسے سب یاد تھا۔

☆　☆　☆

جب جہان نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ کتابیں کھولے بیٹھی تھی۔ دستک پہ چونکی اور پھر اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اسے سامنے کھڑے دیکھ کر دل عجیب سی متضاد کیفیات کا شکار ہونے لگا۔

"حیا! کیا تم فارغ ہو؟" وہ بہت دوستانہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

"ہاں! کیوں؟" اس نے دروازہ ذرا زیادہ کھول دیا تاکہ وہ بستر پہ پھیلی اس کی کتابیں دیکھ کر جان لے کہ وہ ہرگز بھی فارغ نہیں ہے۔

"اوکے! تم فارغ ہی ہو ٹھیک۔" اس نے سمجھ کر سر ہلایا۔ "یعنی تم میرے ساتھ مارکیٹ چل سکتی ہو؟"

"شیور!" اس نے شانے اچکا دیے۔

حالانکہ اسے اس پہ بہت غصہ تھا۔ وہ اس سے مخاطب بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس نے ہمیشہ غلط بیانی ہی کی تھی۔ اسے جہان سے بہت گلے تھے، مگر پھر بھی جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ اسے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا خریدنا ہے؟ تاکہ اسی حساب سے مطلوبہ جگہ پہ جائیں۔"

"کپڑے وغیرہ۔ جلدی میں نکلا تھا۔ زیادہ سامان نہیں اٹھا سکا۔"

ایک تو جب وہ مہذب اور شائستہ ہوتا تھا تو اس سے زیادہ نرم خو کوئی نہیں تھا۔ وہ اندر ہی اندر تلملاتی ہوئی باہر آئی تھی۔ کوئی اور نہیں ملا تھا اسے ساتھ لے جانے کے لیے۔ اسے ضرور گھسیٹنا تھا اپنے ہمراہ۔

شاپ پہ اس کا ساتھ دینے کے لیے وہ بھی ریک پر کپڑوں کے ہینگرز الٹ پلٹ کے دیکھتی رہی۔ جہان ایک کرتے کا ہینگر کندھے سے لگاتے ہوئے سامنے قد آور آئینے میں خود کو دیکھ رہا تھا۔ حیا اس کے قریب ہی کھڑی تھی، سو آئینے میں وہ بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کا عکس دیکھتے ہوئے جہان ذرا سا مسکرایا۔

"تم نے وہ کارٹون دیکھے ہیں ننجا ٹرٹلز؟" وہ مسکراہٹ دبائے سنجیدگی سے پوچھنے لگا تو اس نے سادگی سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"ہاں تو؟" وہ جواب دیے بنا بے ساختہ امڈ آتی مسکراہٹ دباتے ہوئے ہینگر پکڑے پلٹ گیا۔

چند لمحے وہ الجھی کھڑی رہی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ پھر قد آور آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو فوراً سمجھ میں آ گیا۔ غصے کا شدید ابال اس کے اندر اٹھا تھا۔ بمشکل ضبط کرتے ہوئے اس نے نگاہوں سے جہان کو تلاشا۔ وہ وہی کرتا لیے کاؤنٹر کی طرف جا رہا تھا۔

وہ بدتمیز انسان اس کے نقاب کو ننجا ٹرٹلز کی آنکھوں کی پٹی سے تشبیہ دے گیا تھا؟ اس کا موڈ واپسی کا سارا راستہ آف رہا، مگر وہاں پردا

کیے تھی۔

☆　☆　☆

کچن میں شام کی چائے دم پہ چڑھی تھی۔ الائچی اور تلتے کبابوں کی ملی جلی خوشبو سارے کچن میں پھیلی تھی۔ وہ نور بانو کے سر پہ کھڑی ٹرالی میں برتن رکھوا رہی تھی۔ ذمہ دار وہ پہلے بھی تھی، مگر ترکی سے آنے کے بعد ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنے لگی تھی۔ اب بھی نور بانو سے زیادہ وہ کام کر رہی تھی۔

باہر لاؤنج میں تایا فرقان اور صائمہ تائی آ کے بیٹھے تھے۔

اماں، ابا، پھپھو اور جہان بھی وہیں تھے۔ کام کرتے ہوئے مسلسل اسے احساس ہوتا رہا کہ جہان اسے دیکھ رہا ہے، مگر جب وہ رک کر گردن موڑ کر دیکھتی تو وہ کسی اور جانب دیکھ رہا ہوتا۔

جہان کے ساتھ ایک ہی گھر میں وہ دو دفعہ رہی تھی۔ ایک جب ڈی جے کی بار وہ اکٹھے پاکستان آئے تھے تب اسے اپنے غم سے وقت نہ ملا تھا۔ دوسرا جب اپنی "منگنی" کی رات وہ پھپھو کے گھر رک گئی تھی اور تب جہان کو اپنی فون کال کے انتظار سے وقت نہ ملا تھا۔ یوں اب نارمل حالات میں پہلی دفعہ وہ ایک چھت تلے تھے اور اسے احساس ہوا تھا کہ بہت بے ضرر، خاموش اور دھیما سا انسان تھا۔

یہ اس کا ایٹی ٹیوڈ نہیں، فطرت تھی۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ سلام کر لیتا، حال احوال پوچھتا اور بس۔ ہاں! گھر میں فارغ رہ رہ کر وہ اکتا جاتا تو نور بانو کے ساتھ کچن میں کبھی برتن دھونے لگ جاتا تو کبھی اسے سبزیاں کاٹ کر دیتا۔ نور بانو بے چاری حق دق رہ جاتی۔ اگر باہر جاتا تو صبح جاگنگ۔

اسے پہلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ وہ جاگنگ، واک، ورزش، ان چیزوں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ پھر جب گھر میں بہت بور ہو گیا تو ایک دفعہ فاطمہ کے کہنے پہ حیا اسے باہر لے گئی، مگر وہ اتنا تنگ کر دینے والا تھا "یہاں سے مڑ جاؤ، وہاں لے جاؤ نہیں! اب پیچھے چلو۔ لیفٹ سے کیوں مڑ رہی ہو، رائٹ سے مڑو۔"

"کیونکہ میں رائٹ ہینڈ ڈرائیو کر رہی ہوں جہان!" اب اس نے اپنی گاڑی کی چابی جہان کو دے دی تھی۔ جہاں جانا ہے، خود چلے جاؤ، جیسے تاثرات کے ساتھ۔ اس کے پاس انٹرنیشنل لائسنس تھا، سو مسئلہ نہیں تھا۔

اب وہ کبھی کبھی باہر نکل جاتا۔ گھر کے قریب اس نے جم بھی ڈھونڈ لیا تھا...... جہان کے ساتھ رہنے میں ایک مسئلہ تھا۔ وہ اتنی خاموشی سے بنا چاپ پیدا کیے گھر میں داخل ہوتا کہ پتا ہی نہ چلتا اور وہ آپ کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ اب آتے جاتے چند ایک رسمی باتوں کے علاوہ ان کی بات نہ ہو پاتی۔ چاندی کے مجسمے یا تو چٹخ چکے تھے یا بالکل پتھر چکے تھے۔

آج بھی وہ اسے دیکھ رہا تھا، مگر وہ اسے پکڑ نہیں پائی تھی۔ وہ کچھ کہتا کیوں نہیں ہے۔ اسے الجھن ہوتی۔ وہ اسے بے اعتبار قرار دے کر چھوڑ آئی تھی۔ وہ گلہ کیوں نہیں کرتا۔ صفائی نہ دے، مگر شکایت تو کرے...... لیکن وہاں ازلی خاموشی تھی۔

وہ ٹرالی دھکیلتی لاؤنج میں لائی۔ دوپٹا شانوں پہ پھیلا کر اس نے لمبے بالوں کو سمیٹ کر کندھے پہ آگے کو ڈالا ہوا تھا۔

"واقعی! دل تو نہیں کرتا۔ سکندر بھائی کو گئے ہفتہ بھی نہیں ہوا، مگر وہ لوگ سمجھتے ہی نہیں۔ جلدی مچائی ہوئی ہے۔" صائمہ تائی کہہ رہی تھی۔ شاید ارم کی منگنی کا معاملہ تھا۔

حیا پنجوں کے بل کارپٹ پہ بیٹھی، چائے کے کپ پرچ میں رکھ کر باری باری سب کو پکڑانے لگی۔

"بھابھی! آپ فکر نہ کریں۔ جب ہمیں اعتراض نہیں ہے تو لوگوں کا کیا ہے۔ آپ اللہ توکل کر کے فنکشن کی تیاری شروع کریں۔" پھپھو بہت رسان سے واضح کر رہی تھیں کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

"اصل میں اسجد کے بھائی اور بھابھی باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی موجودگی میں وہ فنکشن کرنا چاہتے ہیں تھینکس!"

تایا نے مسکرا کر اس سے کپ پکڑا تو وہ واپس آئی اور آخری کپ جہان کی طرف بڑھایا۔ وہ جو غور سے اب تائی کی بات سن رہا تھا، ذرا سی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور کپ پکڑ لیا۔

"وہ اسی اتوار کا کہہ رہے تھے۔"

"تو بھائی! آپ ہاں کر دیں نا۔ مجھے خوشی ہو گی۔"

''اتوار کا فنکشن!'' حیا نے سوچا۔ کیا پہنے گی؟ وہ چائے سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی اور الماری کھول کر کپڑے الٹ پلٹ کرنے لگی۔ کوئی سلیولیس تھا، کسی کی آستین شیفون کی تھیں۔ کسی کا دوپٹا باریک تھا۔ اس کا ایک جوڑا بھی ''آئیڈیل حجابی لباس'' پہ پورا نہیں اترتا تھا۔

دوسری الماری کو لاک لگا تھا۔ اس نے چابی نکالنے کے لیے پرس میں ہاتھ ڈالا تو انگلیاں مخملیں ڈبی سے ٹکرائیں۔ وہ مسکرا اٹھی۔ میجر احمد کا چیلنج ڈولی کی امانت۔

اس نے ڈبی کھولی۔ سیاہ یو ایس بی فلیش اندر محفوظ رکھی تھی۔ پزل باکس کھل گیا۔ جواہر کا لاکر بھی کھل گیا، مگر اس لاک کو کیسے کھولے؟ آخری لاک۔ اس کی تو پہیلی بھی نہیں تھی، مگر پہیلی ہونی چاہیے تھی۔ میجر احمد نے پہیلی کے بغیر کبھی کوئی پزل اسے نہیں دیا تھا۔ وہ تالے کے ساتھ اس کی چابی بھی ہمیشہ دیا کرتا تھا۔

''اوہ... ڈبی تو میں نے دیکھی ہی نہیں۔'' ایک دم اسے خیال آیا۔

وہ بیڈ پہ آبیٹھی اور فلیش باہر نکالی۔ وہ صاف تھی۔ کوئی لفظ نشان وغیرہ نہیں۔ اب اس نے ڈبی اوپر نیچے سے دیکھی۔ کچھ بھی نہیں۔ اس نے اندر رکھے مخملیں فوم کو انگلیوں سے پکڑ کر باہر نکالا۔ نیچے ڈبی کے پیندے پہ سیاہ مخمل کا ایک اور ٹکڑا رکھا تھا اس نے ٹکڑا نکال کر پلٹ کر دیکھا۔

وہاں سنہری دھاگے سے دو الفاظ سلے تھے۔

Story Swapped

''اسٹوری سویپڈ؟'' اس نے اچنبھے سے دہرایا۔ یہ فلیش ڈرائیو کی پہیلی تھی۔ اس کو حل کر کے ہی وہ آخری تالا کھول سکتی تھی۔ مگر اس سطر کا مطلب کیا تھا۔ کہ کہانی کو ''Swap'' کرنے سے کیا مراد ہوا بھلا؟ کیا یہ سطر انگریزی گرامر کے لحاظ سے درست بھی تھی؟ ادل بدل کی گئی کہانی؟ کہانی کو Swap کرنے سے مراد تو یہی ہوتا ہے نا! کہ آپ اپنی کہانی کسی کو پڑھنے دیں اور وہ جواب میں اپنی کہانی آپ کو پڑھنے دے۔ اس عجیب سی سطر کا یہی مطلب نکلتا تھا۔ مگر کون سی کہانی؟

شاید پروفیسر گوگل کچھ کر سکے۔ یہی سوچ کر اس نے کمپیوٹر آن کیا اور گوگل پہ یہی الفاظ لکھ کر ڈھونڈا، مگر لا حاصل۔ دو متفرق سے الفاظ تھے جن کو احمد نے جمع کر دیا تھا۔ یہ کل بارہ حروف تھے، سو پاس ورڈ نہیں ہو سکتے تھے، مگر پاس ورڈ ان ہی میں چھپا تھا۔

رات سونے سے پہلے تک وہ ان ہی دو الفاظ کو سوچتی رہی تھی، مگر کسی بھی نتیجے پہ پہنچنے سے قبل ہی نیند آگئی۔

☆ ☆ ☆

ارم کی منگنی کا فنکشن تایا فرقان کے لان میں منعقد کیا گیا تھا۔ فنکشن خواتین کا تھا۔ مردوں کا انتظام باہر تھا، مگر تیار ہوتے وقت وہ جانتی تھی کہ یہ فنکشن بھی اتنا ہی سیگریگیٹڈ (غیر مخلوط) ہوگا، جتنا داور بھائی کی مہندی کا فنکشن تھا۔ برائے نام ''زنانہ حصہ'' جہاں ویٹرز، مووی میکر، لڑکے کزنز، سب آجا رہے ہوں گے۔ پتا نہیں، پھر بے چارے باقی مردوں کو علیحدہ کیوں بٹھایا جاتا تھا، یا پھر ایسی شادیوں کو سیگریگیٹڈ کہنے کی منافقت کیوں تھی؟ سوسائٹی کے...... معیارات جن پہ کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس نے اپنی بائیس سالہ زندگی میں کبھی کوئی مکمل طور پر سیگریگیٹڈ شادی نہیں دیکھی تھی۔ تایا کی سختی تھی کہ منگنی پہ دلہا نہیں آئے گا، انگوٹھی ساس پہنائے گی، مگر جو خاندان کے لڑکے کام کے بہانے چکر لگا رہے ہوں گے، ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

باہر وہ عبایا لیتی تھی۔ اصولاً اسے ادھر بھی عبایا لینا چاہیے تھا، مگر منگنی کا فنکشن برائے نام ہی سہی تھا تو سیگریگیٹڈ۔ لڑکے وغیرہ تھے، مگر ذرا دور تھے۔ وہ مکمل طور پہ مکسڈ گیدرنگ نہیں تھی۔

عبایا کا مقصد زینت چھپانا اور چہرہ چھپانا ہی تھا تو وہ یہ کام اپنے لباس سے بھی کر سکتی تھی، سو اس نے عبایا نہیں لیا، مگر لباس کا انتخاب عبایا کے متبادل اور مترادف کے طور پہ کیا۔

کچے سیب کے رنگ کا سبز پاؤں کو چھوتا فراک، نیچے ٹراؤزر اور کلائی تک آتی آستین۔ یہ ایک مشہور برانڈ کا جوڑا تھا اور اس کے ساتھ نیٹ کا دوپٹا تھا، سو اس نے الگ سے بڑا سا دوپٹا بنوا لیا تھا، کچے سیب کے رنگ کا۔ یوں گلے کا کام دوپٹے میں چھپ گیا۔ چہرے کے گرد بھی دوپٹا یوں لپیٹا کہ وہ پیشانی سے کافی آگے گیا تھا۔ کان بھی چھپ گئے۔ سہولت تھی کہ کسی آدمی کو دیکھتے ہی وہ تھوڑی سے انگلی سے دوپٹا پکڑ کر اوپر لے جا کر نقاب لے سکتی تھی۔ یوں عبایا کے بغیر بھی زینت چھپ گئی، نقاب بھی ہو گیا اور اچھا لباس بھی پہن لیا۔ بیٹھی بھی وہ ذرا کونے کی میز پہ تھی۔

گلابی پھولوں سے آراستہ اسٹیج پہ ارم کامدار گلابی لباس میں گردن اونچی کیے اور نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ ارم کو جانتی تھی۔ اسے معلوم

تھا کہ وہ زبردستی بٹھائی گئی ہے۔ اس کی ساس اب اسے انگوٹھی پہنا رہی تھیں۔ مووی میکر مووی بنا رہا تھا۔ پتا نہیں یہاں تایا کے اسلام کو کیا ہوا تھا۔ ویٹرز، مووی میکرز، یہ بھی تو مرد تھے، مگر وہی سوسائٹی کے دہرے معیارات۔

حجاب کپڑے کا ایک ٹکڑا تو نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک مکمل الگ طرز زندگی ہوتا ہے۔ اور یہ طرز زندگی اتنا آسان نہیں تھا۔ اسے جلد ہی اندازہ ہوگیا۔

"تم نے دوپٹا سر پہ کیوں لے رکھا ہے؟"

"گلے کا کام ہی نظر نہیں آ رہا۔"

"چہرے سے تو ہٹاؤ۔" مووی میکر ویڈیو بنا رہا تھا، سو وہ چہرے کو ڈھکے، رخ موڑے بیٹھی تھی، اور فاطمہ جو ذرا دیر کو ادھر آئی تھی، اپنی حیرت ظاہر کرنے میں ساتھی خواتین کے ہمراہ مل گئی تھیں۔

"نہیں ہٹا سکتی لیڈیز! میں اب نقاب کرتی ہوں۔" وہ رسان سے جواب دے رہی تھی مگر پھر......

"کیوں؟ اور یار! فنکشن پہ تو خیر ہوتی ہے۔"

"خیر؟ مجھ سے پوچھو کہ کتنا بڑا شر ہوتا ہے۔" وہ اب بددل ہو رہی تھی۔ حجاب سے نہیں۔ لوگوں سے۔

"یا اللہ! لوگ خاموش کیوں نہیں رہتے؟ اتنا کیوں سوال کرتے ہیں؟"

سحرش، ثنا اور اسجد کی بہنیں اب ڈانس کی تیاری کر رہی تھیں۔ انہیں کوئی نہیں ٹوک رہا تھا، سلیولیس پہنے پھرتی کسی لڑکی کو کوئی نہیں ٹوک رہا تھا، مگر حجابی لڑکی کے سب پیچھے پڑ گئے تھے۔

"کیا لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ وہ کہیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے؟"

وہ اپنے آنسو اندر ہی اتارتی رہی۔ لڑکیاں رقص کے لیے پوزیشنز سنبھالے کھڑی تھیں۔ مووی میکر کا کیمرا ریڈی تھا۔ اس نے رخ موڑ لیا۔ دل اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ وہ کسی کو منع نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی کوئی نہ سنتا۔

تباہی...... تباہی کتنی قریب تھی اور سب بےخبر تھے۔ ہر اقلیطس کی دائمی آگ، بھڑکتے الاؤ، دہکتے انگارے انسان بھی خود ہی اپنے لیے کیا کیا کما لیتا ہے؟"

اور یادیں بھی کتنی عجیب ہوتی ہیں۔ جب بندہ اندھیرے سے نور میں آتا ہے تو ہر شے سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ اسے یاد آ رہا تھا، شریعہ اینڈ لاء کے دوسرے سمسٹر میں اصول الدین ڈیپارٹمنٹ کے ہی ایک پروفیسر ڈاکٹر عبدالباری نے یونہی ایک قصہ سنایا تھا۔ اسے وہ قصہ آج پوری جزئیات کے ساتھ یاد آ رہا تھا۔

"میری بیٹی کی جب شادی ہونے لگی تو میں نے اسے منع کیا کہ بیٹا مووی اور فوٹو سیشن وغیرہ مت کروانا، مگر وہ مجھ سے بہت خفا ہوئی۔ وہ مجھ سے لڑتی رہی کہ ابا میں نے ہمیشہ پردہ کیا۔ آپ کی ساری باتیں مانیں۔ اب میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی پہ مجھے بددل نہ کریں۔ میں خاموش ہوگیا۔ اصرار نہیں کیا کہ میں زبردستی کا قائل نہیں تھا۔ شادی ہوئی۔ اس کی سسرال نے فوٹو سیشن کا مکمل انتظام کروا رکھا تھا۔ میں چپ رہا۔ شادی کے چوتھے روز میں اپنے کمرے میں آرام کرسی پہ بیٹھا تھا کہ میری بیٹی آئی اور میرے قدموں میں بیٹھ کر چپ چاپ رونے لگی۔ میں نے بہتیرا پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بس یہی کہا۔

"ابا! آپ ٹھیک کہتے تھے۔"

میری بیٹی کے آنسو میرے دل پہ اس دن سے گڑ گئے ہیں اور یہی سوچتا ہوں کہ پتا نہیں، ہم اپنی خوشی کے موقع پہ اللہ کو ناخوش کیوں کر دیتے ہیں؟"

جب ڈاکٹر عبدالباری نے وہ قصہ سنایا تھا تو اس نے چند حجابی لڑکیوں کی آنکھوں سے آنسو گرتے دیکھے تھے تب کندھے اچکا کر وہ حیران ہو کر سوچتی تھی کہ یہ کیوں رو رہی ہیں؟

اب اسے پتا چلا تھا کہ وہ کیوں رو رہی تھیں۔

فنکشن ختم ہونے تک اس کا دل اچاٹ ہو چکا تھا۔ رات اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے وہ بالیاں اتارنے کے ارادے سے بےدلی سے کھڑی تھی۔ کچے سیب کے رنگ کا دوپٹا کندھے پہ تھا اور بال کھول کر آگے کو ڈال رکھے تھے۔ بہارے بھی اس کی نقل میں گھنگریالے

پونی آگے کو ڈال لیتی تھی۔

"پتا نہیں، وہ بہنیں فون کیوں نہیں اٹھاتیں اور میل کا جواب بھی نہیں دیتیں۔ خیر! دو ہفتے ہی تو رہ گئے تھے، جا کر پوچھ لوں گی۔"

دروازے پہ دستک ہوئی تو وہ چونکی، پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہاں جہان کھڑا تھا۔ زمرد رنگ کرتا اور سفید شلوار پہنے۔ پتا نہیں، کہاں سے کرتا خرید کر لایا تھا مگر اچھا تھا۔ آستین عادتاً کہنیوں تک موڑے وہ ہاتھ میں دو مگ لیے کھڑا تھا۔

"کافی پیو گی؟" وہ پھر سے وہی دوستانہ سے انداز والا جہان سکندر بن چکا تھا۔

"میں سونے سے پہلے کافی نہیں پیتی۔" کہہ دینے کے بعد اسے لہجے کی سرد مہری کا احساس ہوا تو رکی، پھر زبردستی مسکرائی۔

"ہاں! لیکن اگر استنبول کے بہترین شیف، مکینک اور کارپینٹر نے بنائی ہے تو ضرور پیوں گی۔"

"تم ایک لفظ کا اضافہ کرتے کرتے رہ گئیں..... کریمنل۔" وہ مسکرایا تو حیا کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"کیا مجھے اس الفاظ کا اضافہ کرنا چاہیے؟"

"ہم اس بارے میں بات کر سکتے ہیں؟"

دو ہفتے بعد اسے بالآخر اس کے متعلق بات کرنے کا خیال آ ہی گیا تھا۔

"ٹھیک ہے! چھت پہ چلتے ہیں۔"

اس نے کانوں سے بالیاں نہیں اتاریں، جن میں موتی پروئے تھے۔ جہان کے موتی۔ وہ سچ نہیں بولتا تھا تو اس کے موتی کیسے نکل آئے؟ وہ ان دو ہفتوں میں یہ سوچتی رہی تھی۔ نامحسوس طور پہ بھی وہ عبدالرحمٰن پاشا سے متفق تھی کہ وہ "سچے موتی" ہی تھے۔ مگر جہان کو تو یاد بھی نہیں ہوگا کہ یہ وہی موتی ہیں۔

چھت پہ اندھیرا تھا۔ دور نیچے کالونی کی بتیاں جل رہی تھیں۔ وہ دونوں منڈیر کے ساتھ لگے جھولے پہ آ بیٹھے۔ ہلکا ہلکا ہلتا جھولا ان کے بیٹھنے سے بالکل تھم گیا۔ حیا نے کافی کا مگ لبوں سے لگایا۔

"ہوں! اچھی بنی ہے۔"

"آخر! استنبول کے بہترین شیف، مکینک اور کارپینٹر نے بنائی ہے۔"

"اوہ! تم نے بھی کریمنل کا اضافہ نہیں کیا۔"

"کیونکہ میں کریمنل ہوں بھی نہیں۔ کیا تمہیں میرا اعتبار ہے؟"

"ہاں!" اس نے سوچنے کا وقت بھی نہیں لیا۔ سامنے دیوار پہ ابا کے گملوں سے اوپر ان دونوں کے سائے گر رہے تھے۔ پودوں کی ٹہنیوں سے اوپر وہ عجیب سی ہیئت بنا رہے تھے۔

"ٹھیک ہے! پھر تم مجھے بتاؤ کہ تم اس شخص کو کیسے جانتی ہو، جو اس روز میرے ساتھ تھا؟"

"عبدالرحمٰن پاشا؟ امت اللہ حبیب پاشا کا بیٹا؟" اس نے آنے کا پورا نام لیا۔ وہ ذرا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"آ..... ہاں..... تم کیسے؟"

"لمبی کہانی ہے۔ سنو گے؟" اس نے بے نیازی سے شانوں کو جنبش دے کر پوچھا۔ وہ سامنے دیوار پہ ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے دوسرے سائے کو اثبات میں سر ہلاتے دیکھا تو وہ کہنا شروع ہوئی۔ اپنے سائے کے ہلتے لب دکھائی نہیں دیتے تھے۔ نہ ہی کان میں پڑی بالی کے موتی کی چمک۔ اگر دکھائی دے رہی تھی تو وہ پریشانی، اذیت اور اضطراب جسے وہ پچھلے پانچ ماہ سے اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھی۔ جس کا ایک حصہ اس نے ڈی جے کے ساتھ بانٹا بھی تھا اور اب اس نے پورا ہی بانٹ دیا۔ سانجی کی طرف سے میل وصول ہونے والی رات جب پہلی دفعہ پھول آئے تھے، اس سے لے کر اس روز کے واقعے تک، اس نے سب کہہ سنایا۔ وہ بالکل خاموشی سے سنتا رہا۔ اگر بولا تو صرف اس وقت جب اس نے استقلال جدیسی میں پاشا کے چہرے پہ کافی الٹنے کا واقعہ بتایا۔

"اچھا! تم نے پاشا بے کے اوپر کافی الٹ دی؟" وہ جیسے بہت محظوظ ہوا تھا۔

"ہاں! تم اسے پاشا بے کیوں کہتے ہو؟"

"اسے سب پاشا بے کہتے ہیں، مسٹر پاشا۔ شوق ہے خود کو مسٹر کہلوانے کا۔"

کافی کے مگ خالی ہو کر زمین پہ پڑے تھے۔
دیوار پہ سائے ویسے ہی چپکے بیٹھے، ساری داستان سنتے رہے۔ پودے بھی متوجہ تھے۔ جب وہ خاموش ہوئی تو وہ جیسے سوچتے ہوئے بولا۔
"یعنی کہ اس نے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کیں، مجھے بلیک میل کرنے کے لیے، مگر میں صرف ایک بات نہیں سمجھ سکا۔ اتنا سب کچھ ہوا اور تم نے کبھی اپنے پیرنٹس کو نہیں بتایا..... کیوں؟ تم نے کسی سے مدد کیوں نہیں لی؟"
"میں کبھی بھی ان کو یہ سب نہیں بتا سکتی جہان! اب تو معاملہ ختم ہو گیا ہے، مگر جب یہ شروع ہوا تھا تو مجھے ترکی جانا تھا۔ اگر میں بتاتی تو وہ مجھ سے فون لے لیتے اور گھر سے نکلنے پہ پابندی لگا دیتے۔ ترکی تو جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ویسے بھی میں جانتی تھی کہ جو میرے گھر کے اندر پھول رکھ کر جا سکتا ہے، میرے فون میں ٹریسر لگوا سکتا ہے، اس کے خلاف ابا بھی کچھ نہیں کر سکتے اور ابا کو بتانے کا مطلب تھا کہ تایا فرقان کو بھی بتا دینا یعنی پورے خاندان میں تماشا۔ ابا، تایا ابا کو نہ بتائیں، یہ نہیں ہو سکتا اور اتنی بہادر تو میں تھی ہی کہ خود اپنے مسائل حل کر سکتی۔"
"سو تو ہے!" اس نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔ "کیا تم واقعی جاننا چاہتی ہو کہ میں پاشا بے کو کیسے جانتا ہوں؟"
"دیکھ لو! تم نہ بھی بتاؤ، میں نے جان تب بھی لینا ہے۔ تمہارے پاس کوئی دوسرا آپشن نہیں ہے۔"
"اللہ، اللہ! یہ اعتماد۔" وہ پہلی دفعہ ہنسا تھا۔ وہ ہولے سے مسکرا دی۔
"اصل میں، میں نے کچھ عرصہ ہوٹل گرینڈ پہ کام کیا ہے۔ اس لیے میں ان سو کالڈ بھائیوں کو قریب سے جانتا ہوں۔ یہ سگے بھائی نہیں ہیں۔ یہ مافیا بھائی ہیں، ایک ہی مافیا فیملی کا حصہ، مگر یہ بات ادالار میں ہر کوئی میرے علاوہ جانتا ہے کہ وہ سگے بھائی نہیں ہیں تو وہ امت اللہ حبیب پاشا ہیں۔ خیر! میرا پاشا بے سے کچھ مسئلہ ہو گیا اور میں استقلال اسٹریٹ پہ آ گیا۔ وہ ریسٹورنٹ اس کا ہی ہے اور وہ عورت جس کو میں اپنی لینڈ لیڈی بتاتا ہوں، اس کو دس بھیجتا ہے وہ اس کی ساتھی شیئر ہولڈر ہے۔ وہ مجھے ریسٹورنٹ کی قسطوں کے لیے تنگ نہیں کرتا۔ یہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ سوری! مگر اس نے میرے ذمہ ایک کام لگایا تھا، جو میں کر نہیں سکا، جس کی وجہ سے اس روز ہماری تلخ کلامی ہوئی تھی۔"
"کون سا کام؟" وہ چونکی۔
"وہ اپنی فیملی کو بیرون ملک شفٹ کروانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اسے اس ملک کی جعلی دستاویزات اور نئی شناختیں چاہیے تھیں۔ میں اپنے ایک دوست سے اس کے لیے وہی بنوا رہا تھا۔ اینڈ تھینکس ٹو یو! میں نے اب وہ بنوا دیے ہیں اور اس کی فیملی ترکی سے جا چکی ہے۔"
"کیا؟" اسے دھچکا لگا۔ "عائشے اور بہارے چلی گئیں؟" (تو وہ عائشے، بہارے، سب کو جانتا تھا!)
"ہاں! مزید میں کچھ نہیں جانتا، اس لیے اس موضوع کو ختم کر دو۔"
"اور..... اور وہ اس کا بھائی؟ وہ کہاں چلا گیا؟"
"میں نہیں جانتا، وہ اب کہاں ہے۔" اس نے شانے اچکا دیے۔ وہ جیسے اس موضوع سے بچنا چاہتا تھا۔ پھر حیا نے دیکھا، اس کا سایہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پودوں کے اوپر سے ہوتا، پوری دیوار پہ پھیل گیا۔ اس نے سائے میں اس کا چہرہ تلاشنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی۔ کتنا سچ تھا، کتنا جھوٹ، سائے میں سب گڈمڈ ہو چکا تھا۔
"تم کیا کرتے پھرتے ہو جہان! مجھے یقین ہے کہ تم کریمنل نہیں ہو، مگر تم ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھا کرو پلیز۔"
"جو آپ کا حکم!" سایہ مسکرایا تھا۔
وہ بس تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی۔ اس کی ساری کتھا سن کر بھی وہ اپنی دفعہ پھر بہت کچھ چھپا گیا تھا۔
اور عائشے بہارے، وہ کہاں چلی گئی تھیں؟
وہ دونوں آگے پیچھے زینے اترتے نیچے آ رہے تھے، جب اس نے ابا کو لاؤنج میں کھڑے اپنی جانب متوجہ پایا۔
"جہان!" وہ صرف جہان کی طرف متوجہ تھے۔
"جی ماموں!" وہ پرسکون انداز میں قدم اٹھاتا سیڑھیوں سے نیچے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
"مجھے کچھ پوچھنا ہے تم سے۔" وہ بہت سنجیدہ لگ رہے تھے۔ وہ پہلی سیڑھی پہ ریلنگ پہ ہاتھ رکھے کھڑی ان کو دیکھنے لگی۔
"میں سن رہا ہوں۔"
"تم روحیل سے ان ٹچ ہو، یہ میں جانتا ہوں، مگر کیا کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھے بتانا چاہو، جو کہ میں نہیں جانتا؟" جہان نے لمحے بھر

کی خاموشی کے بعد نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں! میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"یعنی کہ کوئی بات ہے؟"

"ماموں! میں دوسروں کے معاملے میں مداخلت کبھی نہیں کرتا، اس لیے خاموش رہوں گا۔ البتہ آپ اپنے طور پہ کسی سے بھی پتا کروا سکتے ہیں۔"

"پتا کروالیا تھا۔ تم سے تصدیق چاہ رہا تھا، بہر حال مجھے اپنا جواب مل گیا ہے۔ تم آرام کرو۔"

اس کا شانہ تھپتھپا کر وہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے چہرے کی سنجیدگی اور اضطراب پہلے سے بڑھ چکا تھا۔ جہان واپس سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا کہ اس کا کمرا اوپر تھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"جواباً جہان نے ذرا سے شانے اچکائے۔

"تمہیں پتا چل جائے گا۔ اب ذہن پہ زور مت دو، سو جاؤ۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سایہ غائب ہو گیا، روشنی عیاں تھی۔

وہ الجھی ہوئی واپس کمرے میں آئی تھی۔ جہان سکندر کے ساتھ رہنے کا مطلب تھا، انسان بہت سے رازوں کے ساتھ رہے اور پھر صبر سے ان کے کھلنے کا انتظار کرے۔

وہ تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر عائشے کو ای میل کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

جہان نے ٹھیک کہا تھا۔ اسے پتا چل جائے گا۔ مگر حیا کو اندازہ نہیں تھا کہ اسے اتنی جلدی پتا چل جائے گا۔ اسی رات وہ ابھی کچی نیند میں ہی تھی کہ سبین پھپھو نے پریشانی کے عالم میں جھنجوڑ کر اسے اٹھایا۔

"حیا..... جلدی اٹھو۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔

"تمہارے ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ چلو! ہسپتال چلنا ہے۔"

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے پھپھو کو دیکھے گئی۔ زندگی ایک دفعہ پھر استقلال اسٹریٹ میں پہنچ گئی تھی۔ اس کے سامنے ڈی جے گری تھی اور کسی کا جوتا اس کی عینک پہ آیا تھا۔ ایک آواز کے ساتھ عینک ٹوٹی تھی۔ وہ آواز جو کانچ ٹوٹنے کی ہوتی ہے۔ وہ آواز جو زندگی کی ڈور ٹوٹنے کی ہوتی ہے۔

☆ ☆ ☆

سلیمان صاحب کو شدید قسم کا دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ سی سی یو (کارڈیک کیئر یونٹ) میں تھے اور ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ باقی سب کہاں تھے، اسے کچھ نہیں پتا تھا۔ وہ تو بس دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بنچ پہ بیٹھی، روئے جا رہی تھی۔ کاریڈور میں کون آ جا رہا تھا، اسے ہوش نہ تھا۔ وہ پھر سے ٹاقسم فرسٹ ایڈ ہسپتال کے سرد، موت کے سناٹے جیسے کاریڈور میں پہنچ گئی تھی۔

"وہ اب بہتر ہیں۔ یقین کرو! وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔" جہان اس کے ساتھ بنچ پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ رات سے وہی تھا جو ساری بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ تایا وغیرہ تو صبح آئے تھے اور اب تک پورے خاندان کو وہ وجہ بھی پتا چل چکی تھی جو ابا کی بیماری کا باعث بنی تھی۔

روحیل نے شادی کر لی تھی۔

ٹھیک ہے! بہت سے لڑکے امریکا میں شادی کر لیتے ہیں۔ سب کے والدین کو ہارٹ اٹیک نہیں ہوتا، مگر روحیل نے دو سال سے شادی کر رکھی تھی..... اور سب سے بڑھ کر اس نے ایک نیپالی بدھسٹ سے شادی کی تھی۔ ابا قدرے روشن خیال تھے، مگر اپنی اقدار اور مذہبی حدود کا پاس انہیں بہت تھا۔ روحیل کے حوالے سے انہوں نے بہت خواب دیکھے تھے۔ بہت مان تھا ان کو اس پہ۔ وہ ایک دفعہ کہتا تو سہی، مگر اس نے خود ہی سارے فیصلے کر لیے۔ شاید وہ جانتا تھا کہ کہنے کا فائدہ نہیں ہے، کیونکہ وہ لڑکی بدھ مت کی پیروکار تھی۔ مسلمان تو چھوڑ، وہ تو اہل کتاب بھی نہ تھی کہ ایسی شادی جائز ہوتی۔ وہ مسلمان ہونے کو تیار نہ تھی اور روحیل اس کو چھوڑنے پہ راضی نہ تھا۔ اپنی حدود کا مذاق بنانے پہ ابا کا دکھ الگ۔ جہان سے

تصدیق کر لینے کے بعد انہوں نے روحیل کو فون کر کے جب باز پرس کی تو پھر تلخ کلامی سے ہوتی ہوئی بات باپ بیٹے کے ایک سنگین جھگڑے تک پہنچ گئی۔ ابا نے غصے میں اسے سخت برا بھلا کہا اور پھر ہر تعلق توڑ دیا، مگر فون کال کی ڈور ٹوٹنے سے قبل ہی وہ ڈھے گئے تھے۔ پھپھو اور فاطمہ اس سارے معاملے کی گواہ تھیں۔ معلوم نہیں وہ کیوں سوتی رہ گئی۔

''جب میں روحیل کے پاس رات رہا تھا، تب اس لڑکی نے مجھے ٹریٹمنٹ دی تھی۔ انہوں نے کچھ نہیں بتایا، مگر میں جان گیا تھا کہ ان کے درمیان کیا ہے۔ اس کے کوئی سال ڈیڑھ بعد انہوں نے شادی کی تھی۔ یہ مجھے بعد میں امریکا میں مقیم ایک دوست نے بتایا۔ کتنی دیر ایسی باتیں چھپتی ہیں۔ ماموں کو بھی کسی عزیز سے خبر مل ہی گئی۔''

وہ نم آنکھوں سے سر ہاتھوں میں دیے سنتی رہی۔ اسے روحیل یا اس کی بیوی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے صرف ابا کی فکر تھی۔ ڈھائی ماہ قبل کا واقعہ پھر دہرایا جانے لگا تھا کیا؟ وہ پھر علامتی خوشبو میں ایک محبت کو کھونے لگی تھی کیا؟

جب بمشکل انہیں ابا سے ملنے کی اجازت ملی، تب وہ غنودگی میں تھے اور وہ ان کے قریب بیٹھی اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ آنکھیں خشک ہو چکی تھیں، مگر ہر آنسو آنکھ سے تو نہیں گرتا نا۔ شاید اگر ابا کے دوست ذیشان انکل ملنے نہ آئے ہوتے تو وہ آنکھوں سے بھی رونے لگ جاتی، مگر ان سب کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرنا تھا۔ فاطمہ نڈھال تھیں، مگر سبین پھپھو بہت ہمت سے کام لے رہی تھیں۔

''سلیمان بہت مضبوط ہے بیٹا! فکر نہ کرو، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔''

ذیشان انکل کو چھوڑنے وہ فاطمہ کے ساتھ باہر تک آئی تو وہ تسلی دینے لگے۔

وہ ابا کے سب سے اچھے دوست تھے۔ وہ ان کو زیادہ نہیں جانتی تھی، مگر فاطمہ واقف تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی تھی، پندرہ سولہ سالہ رجا جو قد اور ذہنی طور پہ اپنی عمر سے پیچھے تھی۔ قدرے ابنارمل بچی جو گھنگھریالے بالوں والا سر جھکائے مسلسل اخبار پہ قلم سے کچھ لکھتی رہی تھی۔

''رجا بہت ذہین ہے۔'' اس کی نگاہوں کو اپنی بیٹی پہ پا کر ذیشان انکل مسکرا کر بتانے لگے۔ ''اسے ورڈ پزل اور کراس ورڈز کھیلنے کا بہت شوق ہے۔ پورا چارٹ حل کرنے میں کئی دن لگاتی ہے، مگر کر لیتی ہے۔''

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سنتی رہی۔ وہ اپنی بیٹی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، چاہے گھر ہو یا آفس۔ محبت تھی یا فکر یا پھر دونوں۔

ان کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے گھر آئی تھی۔ گھر پہ وحشت اور ویرانی چھائی تھی۔ جیسے سب کچھ تھم گیا ہو۔ وہ ابھی عبایا اتار رہی تھی کہ فون بجنے لگا۔ پرائیویٹ نمبر کالنگ۔

اس روز کے بعد میجر احمد نے آج کال کی تھی، مگر اس نے کال کاٹ دی۔ وہ بار بار فون کرنے لگا، مگر حیا نے فون بند کر دیا۔ وہ اس آدمی سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ ضرورت ہی نہیں تھی۔

ابا ابھی ہسپتال میں تھے۔ آج سبین پھپھو اور فاطمہ ان کے پاس تھیں، سو وہ اور جہان گھر پہ تھے۔ وہ شام کا وقت تھا، مگر روشنی باقی تھی۔ حیا چھت پر منڈیر کے ساتھ لگے جھولے پہ بیٹھی ابا کے گملوں کو دیکھ رہی تھی۔ آج ان پہ سائے نہیں گر رہے تھے۔ مگر وہ پھر بھی مرجھائے ہوئے لگ رہے تھے۔ ان کا اس گھر میں خیال رکھنے والا جو تھا، وہ اب خیال رکھنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ اس نے بہت سے آنسو اپنے اندر اتارے۔ ابا کے پودے اکیلے ہو گئے تھے۔

''کیسی ہو؟'' جہان ہولے سے اس کے ساتھ آ کر بیٹھا۔

''تمہارے سامنے ہوں۔ تم نے کھانا کھا لیا؟''

''ہاں! نور بانو میرا کھانا لے آئی تھی۔ اور تم نے؟''

''موڈ نہیں ہے۔'' وہ ابھی تک گملوں کو دیکھ رہی تھی۔

وہ اسے سرزنش کرنے ہی لگا، مگر رک گیا۔ منڈیر کے سوراخ سے اسے جیسے کچھ نظر آیا تھا۔

''سنو! یہ آدمی کون ہے؟''

''کون؟'' حیا نے ذرا چونک کر گردن پھیری۔ منڈیر کے سوراخ سے نیچے تایا کے لان کا منظر واضح تھا۔ وہ اپنے ڈرائیو وے پہ کھڑے ایک صاحب کے ساتھ باتیں کر رہے تھے، جو سیاہ سوٹ میں ملبوس، بریف کیس ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ وہ انہیں نہیں پہچانتی تھی۔

''پتا نہیں۔'' اس نے لاتعلقی سے شانے اچکائے۔

''میرا خیال ہے، وکیل ہے۔''
''تمہیں کیسے پتا؟ اس کے سوٹ کا رنگ تو سمپل بلیک ہے، لائرز والا تو نہیں ہے۔''
''مگر ٹائی دیکھو، جیٹ بلیک ہے۔ وکیل کی مخصوص ٹائی۔'' وہ آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے ان کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''اور میرا خیال ہے وہ ابھی ادھر آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' حیا نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔
''وہ اپنے ڈرائیو وے پہ کھڑے ہیں، تمہیں کیسے پتا کہ ان کا کیا ارادہ ہے؟''
''غور سے دیکھو! فرقان ماموں کے جوتوں کا رخ کس طرف ہے؟''
حیا نے گردن ذرا اونچی کر کے دیکھا۔ تایا ابا کے جوتوں کا رخ نامحسوس سے انداز میں ان کے گھروں کے درمیان دروازے کی طرف تھا۔
''انسان جدھر جانے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کے پاؤں خود بخود ادھر ہی مڑ جاتے ہیں، چاہے وہ ساکن کھڑا یا بیٹھا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر دوران گفتگو تمہارے مخاطب کے جوتے تمہاری مخالف سمت ہوں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ بور ہو رہا ہے تم سے۔''
حیا نے بے اختیار جہان کے جوتوں کو دیکھا اس کے سیاہ تسمے والے بوٹ سیڑھیوں کے دروازے کی سمت تھے۔
''اس فائل میں کیا ہو سکتا ہے؟'' اب وہ ذرا الجھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ حیا نے گردن پھر سے منڈیر کی جانب موڑی۔ نیچے وکیل صاحب اپنے بریف کیس سے ایک فائل نکال کر تایا ابا کو دکھا رہے تھے۔
''سلیمان ماموں کمپنی کے ایم ڈی ہیں نا؟''
''ہاں......! اور باقی شیئر ہولڈرز ہیں۔''
''ہوں! اس کا مطلب ہے کہ ماموں کی بیماری کے باعث کچھ کام رک گئے ہوں گے، سو باقی شیئر ہولڈرز ان سے کچھ دستخط کروانا چاہتے ہوں گے۔ ماموں کا پاور آف اٹارنی کس کے پاس ہے۔''
''میرے پاس!'' وہ بے اختیار بولی۔ جہان ذرا سا چونکا۔
''اصل میں بہت پہلے ابا نے مجھے اپنا Attorney-in-fact بنایا تھا اور وہ صرف اس صورت میں، جب وہ خدانخواستہ کام کرنے کے اہل نہ رہیں۔''
''یعنی کہ میں اس وقت اصغر اینڈ سنز کی ایم ڈی سے مخاطب ہوں۔'' وہ مسکرایا۔
''ارے نہیں! میں تو بس اٹارنی ان فیکٹ ہوں۔ ابا ٹھیک ہو جائیں گے تو خود سنبھال لیں گے۔ سب کچھ۔''
''اور جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوتے؟''
''تب تک تایا فرقان سنبھال لیں گے۔'' اس نے کہنے کے ساتھ نیچے دیکھا۔ تایا فرقان اب سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتے فائل کے صفحے پلٹ رہے تھے۔
''اس کے لیے انہیں سلیمان ماموں کا پاور آف اٹارنی چاہیے ہوگا...... اور شاید وہ ان سے اسی پہ دستخط کروانا چاہتے ہوں گے۔''
''جہان! ہو سکتا ہے، یہ ان کا کوئی دوست ہو اور تمہارے سارے اندازے غلط ہوں۔''
''اور اگر میرے اندازے درست ہوئے تب؟ تم انہیں پاور آف اٹارنی لینے دوگی؟''
''ہاں! کیوں نہیں؟ تایا فرقان، ابا کے بھائی ہیں آخر!''
جہان نے جیسے افسوس سے اسے دیکھا۔
''مادام! ایک بات کہوں؟ جب باپ کسی قابل نہیں رہتا تو اولاد کے لیے زندگی بدل جاتی ہے۔ یہ جو آج تمہارے ساتھ ہیں نا، ایک دفعہ کاروبار تمہارے ہاتھ سے گیا تو تمہیں کنارے سے لگا دیں گے۔''
''ہر کسی پہ شک مت کیا کرو جہان!'' وہ بےزار ہوئی۔
''یہ فرقان ماموں ہی ہیں نا، جن کی ہم بات کر رہے ہیں؟ آنکھیں کھولو اپنی، تم انہیں اپنے باپ کی کرسی نہیں دے سکتیں حیا! اور دیکھو! وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔''
وہ بے اختیار چونکی۔ وہ دونوں حضرات واقعی تیز قدموں سے درمیانی دیوار کے منقش لکڑی کے دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ

ذرا سیدھی ہوئی۔ جہان کے لبوں پہ ہلکی سی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

"مگر جہان　　ابا کی غیر موجودگی میں ان کے علاوہ کون سنبھال سکتا ہے کاروبار؟ مجھے تو بزنس ایڈمنسٹریشن کا کچھ نہیں پتا۔" وہ مضطرب سی کھڑی ہوگئی۔

تایا ابا نے گھنٹی بجائی۔ نور بانو کچن سے نکل کر دروازہ کھولنے بھاگی۔

"پتا ہو یا نہ پتا ہو، تم انہیں اپنی کرسی نہیں لینے دو گی۔ اپنی جگہ کبھی نہیں چھوڑتے۔ ہوٹل گرینڈ کی مثال یاد رکھنا۔ ایک پاشا نے جگہ چھوڑی تو دوسرے پاشا نے قبضہ کرلیا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جھولا دھیرے دھیرے ہلنے لگا۔

"اب چلو! وہ اندر آرہے ہیں۔"

وہ ابھی ابھی جہان کے ساتھ سیڑھیاں اترتی نیچے آئی۔ تایا ابا وکیل صاحب کو باہر چھوڑ کر خود لاؤنج میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں فائل تھی، مگر حیا کو تب بھی لگ رہا تھا کہ جہان کے اندازے غلط ہیں۔

"حیا......!" تایا نے عجلت بھرے انداز میں اسے پکارا "تمہارے ابا اس کنڈیشن میں سائن کر سکتے ہیں؟"

وہ آخری سیڑھی پہ ٹھہری گئی۔ حالات اتنے حساس ہو چکے تھے کہ معمولی سی بات بھی بہت زور سے لگتی تھی۔ اب بھی لگی۔ انہوں نے ابا کا حال پوچھنے کی بجائے صرف دستخط کا پوچھا۔

"آپ کو کیا سائن کروانا ہے؟" سپاٹ سے انداز میں پوچھتی، وہ ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ جہان بہت سکون سے آخری سیڑھی پہ بیٹھ گیا تھا اور اب گویا تماشا دیکھ رہا تھا۔

"تمہارے کام کی چیز نہیں ہے...... اور وہ سائن کر سکتے ہیں یا نہیں؟" تایا ابا کو اس کا سوال کرنا سخت ناگوار گزرا تھا۔ جہان ہلکا سا مسکرایا، مگر حیا تایا ابا کی طرف متوجہ تھی۔

"وہ نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر نے ان سے زیادہ بات چیت سے منع کیا ہے۔" وہ دانستہ لمحے بھر کو رکی۔ "آپ مجھے بتادیں تایا ابا! شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔ آخر میں ابا کی اٹارنی ان فیکٹ ہوں۔"

تایا فرقان کو جیسے جھٹکا لگا۔ وہ حیرت بھری الجھن سے اسے دیکھنے لگے۔

"تم؟ سلیمان نے تمہیں کب اٹارنی ان فیکٹ بنایا؟"

"بہت پہلے ابا نے اپنا ڈیوریبل (Durable) پاور آف اٹارنی مجھے دیا تھا اور اس کے مطابق میں ابا کی جگہ کام کرسکتی ہوں۔" پُراعتماد وہ ہمیشہ سے تھی اور اب بھی تایا فرقان کی بارعب شخصیت کے سامنے کھڑی بہت اطمینان سے انہیں بتا رہی تھی۔ خلاف توقع وہ ایک دم غصے میں آ گئے۔

"دماغ خراب ہے سلیمان کا۔ وہ اس طرح کیسے کرسکتا ہے؟"

اب تو وہ کر چکے ہیں۔ آخر! میں ان کی بیٹی ہوں۔ انہیں مجھ پہ بھروسا ہے۔"

"کیا مذاق ہے یہ؟" وہ جیسے جھنجھلائے تھے۔ "اب سارا کام کیسے چلے گا؟ کیا میں ذرا ذرا سی بات کے لیے تمہارے پاس ادھر آتا رہا ہوں؟"

"او نہیں تایا ابا! میں آپ سب کو اپنی وجہ سے زحمت نہیں دوں گی۔ کسی کو ادھر نہیں آنا پڑے گا۔ میں کل سے خود ہی آفس آجاؤں گی۔"

"انٹرسٹنگ!" آخری زینے پہ مطمئن سے بیٹھے تماشائی نے دلچسپی سے انہیں دیکھا جو آمنے سامنے کھڑے تھے۔ وہ جیسے دونوں کو تقریباً لڑوا کر بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"تم......تم آفس آؤ گی؟ تمہیں کیا پتا بزنس ایڈمنسٹریشن کا؟" دبے دبے غصے سے انہوں نے ہاتھ سے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

"کیا فرق پڑتا ہے تایا ابا! داور بھائی جب پولیٹیکل سائنس میں سمپل ایم اے کر کے آج بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ہو سکتے ہیں تو پھر چند دن کے لیے ابا کی کرسی میں بھی سنبھال سکتی ہوں۔"

وہ لب بھینچ کر بمشکل ضبط کر کے رہ گئے۔

"ہمارے خاندان کی بچی اب آفس آئے گی، لوگ کیا کہیں گے آخر؟" وہ ذرا اسے دھیمے پڑے۔

"جب وہ اپنے تایا، چچا اور تایا زاد بھائی کے ہمراہ آفس آئے گی تو لوگ کچھ نہیں کہیں گے۔" وہ پہلی دفعہ ذرا سی مسکرائی۔

"عجیب رواج چل نکلے ہیں۔" تایا ابا ماتھے پہ بل لیے پلٹ گئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ اپنے پیچھے دروازہ انہوں نے زوردار آواز سے بند کیا تھا۔

"کیا بات ہے؟" وہ مسکرا کر شائستہ انداز سے کہتا میز کی سے اٹھا۔ اس کا تاثر نہیں، بحالی وہ وہ انداز ہی الگ تھا۔

"تایا ابا نے مجھ سے کبھی ایسے بات نہیں کی۔" وہ ابھی تک ملال سے دروازے کو دیکھ رہی تھی، جہاں سے وہ گئے تھے۔

"آہستہ آہستہ وہ اس سے بھی زیادہ تحقیر سے بات کرنے لگیں گے۔ بس! دیکھتی جاؤ۔"

"مگر وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں کیسے ابا کی سیٹ پہ بیٹھ سکتی ہوں؟ مجھے واقعی ان کے کاروبار کا کچھ نہیں پتا۔" اب پہلی دفعہ اسے فکر ستانے لگی۔ تایا کے سامنے جو بڑے بڑے دعوے کیے تھے، ان کو ثابت کرنے کے لیے وہ کیا کرے گی؟ ایک دم سے بہت سا بوجھ اس کے کندھوں پہ آ گرا تھا۔

"حیا! جب تم نے اس رات مجھے وہ ساری باتیں بتائیں تھیں تو میں نے تمہارے بارے میں دو آراء قائم کی تھیں۔ پہلی یہ کہ جو لڑکی کسی کی مدد لیے بغیر اتنا کچھ خود ہی تنہا سہتی ہے، وہ بہت مضبوط لڑکی ہوتی ہے۔ شاید چند ماہ قبل تم اتنی مضبوط نہ ہو، مگر اب ہو گئی ہو۔"

وہ نرمی سے کہتا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ ابھی تک دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

"اور دوسری یہ کہ تم نے اس سائیکو آفیسر کا پزل حل کر لیا جس سے مجھے لگا کہ تم ایک سمجھدار اور ذہین لڑکی ہو، جو معمولی سی باتوں سے بھی اپنے مسائل کے حل ڈھونڈ لیتی ہے۔ یقین کرو! بزنس سنبھالنے کے لیے کسی ڈگری سے زیادہ کامن سینس، مضبوط اعصاب اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب تمہارے پاس ہے، پھر فکر کیسی؟"

اس نے دروازے سے نگاہیں ہٹا کر جہان کو دیکھا۔

"کیا تم میری مدد کرو گے؟" بہت پر امید انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ جو کرنا ہے، اکیلے کرو اور خود کرو کیونکہ تم کر سکتی ہو۔" ایک لاتعلق سا تبصرہ کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے تلملا کر اسے جاتے دیکھا۔ آخر اس نے مدد مانگی ہی کیوں اس آدمی سے؟ سوچا بھی کیسے کہ وہ اس کی مدد کرے گا؟ وہ تو جہان تھا، وہ تو ہمیشہ سے اسے تنہا چھوڑ کر چلے جانے کا عادی تھا۔

اب وہ کیا کرے گی؟ سر ہاتھوں میں تھامے وہ صوفے پہ گر سی گئی۔ اس کی انا کا سوال تھا۔ تایا کے سامنے اتنے دعوے کر کے وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ پیچھے ہٹنے کا راستہ اب بند تھا۔ اسے کل سے واقعی آفس جانا پڑے گا، وہ جانتی تھی۔

"چند دن کی ہی تو بات ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

رات وہ ابا سے ملنے گئی۔ جب فاطمہ قریب نہیں تھیں تو ان کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے انہیں اس نے اپنے فیصلے کا بتایا۔ ساری بات سن کر وہ نحیف سے انداز میں ہلکا سا مسکرائے۔

"باقر صاحب سے مل لینا، وہ تمہیں کام سمجھا دیں گے۔" بہت دھیمی آواز میں وہ بس اتنا سا کہہ پائے تھے۔ "اور ذیشان میرا دوست ہے۔ کوئی مدد چاہیے ہو تو اسے کہہ دینا۔"

پھر انہوں نے آنکھیں موند لیں۔ بیماری واحد شے نہیں ہوتی جو انسان کو ڈھا سکتی ہے۔ دکھ زیادہ زور آور ہوتے ہیں۔ وہ بھی ٹوٹ چکے تھے۔ اسے روحیل پہ پہلے سے بھی زیادہ غصہ آیا۔

فاطمہ سے سامنا ہوا تو بس سرسری سا بتایا۔

"کل میں ابا کے آفس جاؤں گی۔" انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟"

"ابا نے کہا تھا۔ اچھا! آپ یہ کاروباری باتیں ان سے مت کیجیے گا۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔"

وہ نگاہ بچا کر پاس سے نکل گئی۔ وہ فاطمہ کو جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس کے فیصلے پہ بہت خوش نہیں ہوں گی اور خوش تو شاید خود بھی

نہیں تھی۔ وہ خود بھی ایسا نہیں چاہتی تھی۔ یہ تو جہان تھا، جس نے اسے پھنسوایا تھا اور پھر خود پیچھے ہٹ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سلیمان صاحب کا آفس نہایت پرتعیش انداز میں آراستہ کیا گیا تھا۔ کریم اور گہرے نیلے کی تھیم کے ساتھ، سفید چمکتا ماربل کا فرش، قیمتی پردے، شاہانہ سا فرنیچر اور اس اونچی، سیاہ، گھومنے والی کرسی کی تو شان ہی الگ تھی، جس پر وہ اس وقت بیٹھی تھی۔

اپنے سلک کے سیاہ عبایا میں ملبوس، دونوں کہنیاں کرسی کے ہتھے پہ جمائے، انگلیوں سے دوسرے ہاتھ میں موجود پلاٹینم گھماتے ہوئے، ٹیک لگا کر بیٹھی، وہ سنجیدگی سے سر ہلاتی باقر صاحب کی بریفنگ سن رہی تھی۔ نفاست سے کیے گئے نقاب میں سے جھلکتی آنکھیں متوجہ انداز میں سکڑی ہوئی تھیں۔ وہ ادھیڑ عمر اور شریف النفس سے انسان لگتے تھے اور اب پوری جانفشانی سے اسے ابا کی کنسٹرکشن کمپنی کے بارے میں آگاہی دے رہے تھے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز، شیئر ہولڈرز، کمپنی کے زیر تعمیر پروجیکٹس، ٹینڈرز، وہ سن سب رہی تھی، مگر بعض اصطلاحات بہت مشکل تھیں۔ اسے سب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رہ رہ کر اسے کاروباری معاملات میں اپنی کم علمی کا افسوس ہو رہا تھا۔ وہ خود کو سمجھا رہی تھی کہ یہ افسوس بھی کم علمی کا ہے، نہ کہ تایا کو یوں چیلنج کرنے کا، مگر شاید آخر الذکر پہ اسے زیادہ افسوس تھا۔

"کمپنی میں چالیس فیصد شیئرز آپ کے والد کے ہیں میم! بیس فیصد فرقان صاحب کے، بیس فیصد زاہد صاحب کے اور دس فیصد سیٹھی صاحب کے ہیں۔"

"اور آخری دس فیصد؟" پہلی دفعہ اس نے زبان کھولی اور ساتھ ہی آفس کا دروازہ کھلا۔ حیا نے چونک کر دیکھا اور پھر ناگواری کی ایک لہر نے اسے سر سے پاؤں تک گھیر لیا۔ اگر اسے تھوڑا سا بھی خیال آتا کہ آخری دس فیصد شیئرز ہولڈر ولید لغاری ہو سکتا ہے تو وہ کبھی آفس نہ آتی۔

"اوہ! آپ..... آفس آئی ہیں؟" وہ "آپ" پہ زور دیتا، طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بہت اعتماد سے چلتا اندر آیا۔ باقر صاحب کے چہرے پہ ناگواری ابھری، مگر وہ خاموش رہے۔

"تو سلیمان انکل کی سیٹ آپ سنبھال لیں گی؟" اس کے سامنے کرسی کھینچ کر وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھا۔ "کیا بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری آپ نے ترکی سے لی ہے؟ مگر ابا کو تو آپ نے بتایا تھا کہ آپ ایل ایل بی کر رہی ہیں؟"

تمسخرانہ انداز میں کہتا وہ واضح طور پہ اس رات کا حوالہ دے رہا تھا۔ یہ طے تھا کہ پہلی دفعہ نقاب میں دیکھ کر اگر وہ فوراً اسے پہچان گیا تھا تو وجہ یہی تھی کہ اس نے باہر اسٹاف سے اس کی آمد کے بارے میں سنا تھا، تب ہی وہ اتنے ہی اعتماد سے بے دھڑک اس آفس میں داخل ہوا تھا، جس سے وہ غالباً ہمیشہ ہوتا تھا۔

"تو میڈم ایم ڈی! کیا ارادے ہیں آپ کے؟ کیا اب اس آفس میں طالبانائزیشن رائج ہو جائے گی؟"

وہ جو خاموشی سے لب بھینچے اس کی بات سن رہی تھی، اس نے دائیں ابرو سوالیہ اٹھائی۔ سیاہ نقاب سے جھلکتی آنکھوں کی سختی واضح تھی۔

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ آپ کی تعریف؟" باقر صاحب! یہ کون صاحب ہیں؟"

"میم! یہ لغاری صاحب کے....."

"پہچان تو خیر آپ گئی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا، آپ کبھی بھول پائیں گی۔ ولید لغاری کہتے ہیں مجھے اور....."

"ولید صاحب! میری ایک بات کا جواب دیں۔" متوازن لہجے میں بات کاٹتے ہوئے وہ آگے کو ہوئی اور ایک دوسرے میں پھنسے ہاتھ میز پہ رکھے۔ وہ جو استہزائیہ انداز سے بولے جا رہا تھا، رک گیا۔

"ولید صاحب! کیا میں نے آپ کو اپنے آفس میں بلایا تھا؟" ولید نے ہنس کر سر جھٹکا۔

"میڈم حیا! بلکہ مسز حیا! اب جب آپ کو ادھر کام....."

"ولید صاحب! کیا میں نے آپ کو بلایا تھا؟" وہ پہلے سے بلند اور درشت آواز میں بولی۔ ولید کی بھنویں سکڑیں۔

"سلیمان انکل کے آفس میں آنے کے لیے مجھے اجازت....."

"ولید صاحب! کیا میں نے آپ کو بلایا تھا؟"

وہ بے حد اونچی آواز میں کہتی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ باقر صاحب بھی احتراماً ساتھ ہی اٹھے۔ تابعداری کا ثبوت۔ وفاداری کا احساس۔ ولید کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔ وہ تیزی سے اٹھا۔

"سلیمان انکل میرے ساتھ یہ سلوک کبھی برداشت نہ کرتے۔"
"میں آپ کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کر سکتی ہوں۔ باقر صاحب! ان صاحب کو باہر جانا ہے۔ پلیز! دروازہ کھول دیں۔"
باقر صاحب نے ذرا تذبذب سے اسے دیکھا، پھر پلٹنے ہی لگے تھے کہ ولید نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔
"میں دیکھتا ہوں، آپ اس آفس میں کتنے دن رہتی ہیں۔" ایک خشمگیں نگاہ باقر صاحب پہ ڈالتا وہ تیزی سے پلٹا۔
حیا نے کرسی پہ واپس بیٹھتے ہوئے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔
"درخشاں! اگر یہ آدمی مجھے دوبارہ بلا اجازت اپنے آفس میں داخل ہوتا نظر آیا تو آپ کی چھٹی۔ سن لیا آپ نے!" اور سنایا تو اس نے ولید کو تھا، جو اس کی بات ختم کرنے کے بعد ہی باہر نکلا تھا۔
"جی...... جی میم!" ابا کی سیکریٹری بوکھلا گئی تھی۔
"بیٹھیے!" ریسیور واپس رکھتے ہوئے اس نے باقر صاحب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"باقی دس فیصد شیئرز ان کے پاس ہیں میم!" باقر صاحب نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ تب تک وہ چند گہرے سانس لے کر خود کو کمپوز کر چکی تھی۔
"پہلے عمیر لغاری آفس آیا کرتے تھے، مگر گزشتہ ایک ماہ سے وہ علاج کے سلسلے میں بیرون ملک ہیں۔"
چند مزید تفصیلات کے بعد وہ اسے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی آج متوقع میٹنگ کے بارے میں بتانے لگے۔
"میم! ایک ٹریڈ سینٹر کا پروجیکٹ ہے۔ ہمیں وہ حاصل کرنا ہے اور......"
"یعنی کہ ٹینڈر کی نیلامی ہے اور ہمیں نیلامی جیتنی ہے؟" اس نے دبے دبے جوش سے ان کی بات کاٹی۔ گزرتے گزرتے کبھی کوئی سوپ سیریل دیکھتی تھی تو اس میں عموماً ٹینڈرز کی نیلامی ہو رہی ہوتی اور مخالف کمپنیاں بولی لگا رہی ہوتیں۔ سو کم از کم کچھ تو پتا تھا اسے کنسٹرکشن کمپنی کے متعلق۔

باقر صاحب لمحے بھر کو خاموش رہے، پھر نفی میں سر ہلایا۔
"نہیں میم! ٹینڈر کی نیلامی کا معاملہ نہیں ہے۔"
"اچھا!" اس نے خفت چھپاتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اب وہ درمیان میں نہیں بولے گی۔ خاموش رہ کر بس سنے گی۔
"اصل میں ایک گروپ ٹریڈ سینٹر بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ اس کے لیے مختلف کمپنیوں کے آئیڈیاز دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون ان کی زمین کو بہترین طور پہ استعمال کر کے ٹریڈ سینٹر بنا سکتا ہے۔ اگر ہمارا آئیڈیا اپروو ہو گیا تو پروجیکٹ ہمیں مل جائے گا۔ میں ہیڈ آرکیٹیکٹ کو بھیجتا ہوں۔ وہ آپ کو مزید بریف کر دیں گے۔" باقر صاحب مؤدب انداز میں اٹھتے ہوئے بولے۔
ہیڈ آرکیٹیکٹ رضوان بیگ صاحب درمیان عمر کے تجربہ کار انسان تھے، مگر ان کا انداز یوں تھا، گویا ان کے سامنے کوئی ان پڑھ لڑکی بیٹھی ہو، جس کو بریف کرنا وہ اپنی شان میں توہین سمجھتے ہوں۔ جان بوجھ کر مشکل اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے وہ بہت لاپروائی سے اس کو اپنا کام دکھا رہے تھے۔
"یہ ٹریڈ سنٹر ہے، یہ پارکنگ لاٹ ہے، یہاں ہم یوں کریں گے، یہاں یوں......" حیا اسی انداز میں کمر سیٹ سے لگائے، ہتھیلیاں ملائے بیٹھی، بہت تحمل سے ان کی بات سن رہی تھی۔
"اب آپ کو تو اتنا پتا نہیں ہو گا میم! بہرحال یہ اتنا شان دار پروجیکٹ پلان ہے کہ عمارت دیکھتے ہی گاہک فوراً سے کار ادھر پارک کرے گا اور شاپنگ شروع کر دے گا۔"
"خیر! میں تو اس موت کے کنوئیں میں کبھی کار پارک نہ کروں۔ کار کو کچھ ہو گیا تو روحیل کبھی نہیں چھوڑے گا کہ وہ اس کی کار تھی، مگر اب تو روحیل نے بہت کچھ چھوڑ دیا...... اور کار تو جہان کے پاس تھی۔ پتا نہیں، وہ اس وقت کیا کر رہا ہو گا۔ اف حیا کام پہ توجہ دو۔"
وہ سر جھٹک کر ان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ڈیزائن کی اسے واقعی کچھ سمجھ نہیں تھی، لیکن اگر وہ اتنے قابل آرکیٹیکٹ اس کی اتنی تعریف کر رہے تھے تو یقیناً وہ بہت اچھا ہو گا، وہ قائل ہو گئی تھی۔
بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ اس کی توقع سے زیادہ بری رہی۔ جب وہ کانفرنس روم میں داخل ہوئی تو لمبی کانفرنس ٹیبل کے دونوں

اطراف کرسیوں کی قطاروں پہ سوٹڈ بوٹڈ افراد منتظر سے بیٹھے تھے۔ سربراہی کرسی خالی تھی۔ وہ فائل سنبھالے، تیز تیز قدموں سے چلتی کرسی تک آئی۔ کوئی اس کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔ اس نے میز پر پرس رکھا اور کرسی سنبھالتے ہوئے فائل کھولی۔ پھر گردن اٹھا کر دیکھا تو سب مرد حضرات اسی کی طرف متوجہ تھے۔ تایا فرقان، زاہد چچا، داور بھائی، ولید، چند غیر شناسا چہرے۔ لمحے بھر کو اس کا اعتماد ڈانواں ڈول ہوا۔

''جولڑکی اتنا کچھ تنہا سہتی ہے۔ وہ بہت مضبوط لڑکی ہوتی ہے۔'' اس نے فوراً سے خود کو سنبھال لیا۔

تمہید کے بعد وہ اپنے ازلی پراعتماد اور دوٹوک میں انداز میں کہنے لگی۔

''سلیمان اصغر کی اٹارنی ان فیکٹ ہونے کے ناتے ان کی صحت یابی تک میں ان کی سیٹ سنبھالوں گی۔ مجھے امید ہے کہ کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''

''اعتراض تو خیر ہے، مگر کیا کیا جاسکتا ہے؟'' تایا فرقان نے ناگواری چھپانے کی کوشش کیے بغیر ہاتھ جھلا کر کہا۔ اس نے گردن موڑ کر بہت سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

''جی سر!'' میں جانتی ہوں کہ بہت سے لوگوں کو اعتراض ہوگا، مگر چونکہ آپ میرے ساتھ ہیں، اس لیے مجھے ان کی پروا نہیں ہے۔ اب کام کی بات پہ آتے ہیں۔''

ان کو کچھ اس طرح سے گھیرا کہ نہ وہ ہاں کر سکے نہ ہی ناں۔ وہ میٹنگ کے مقاصد کی طرف آ گئی۔

اس کی غلط فہمی تھی کہ ولید دوبارہ اس کے راستے میں نہیں آئے گا۔ ولید سمیت قریباً سب ہی حتیٰ کہ داور بھائی بھی تمام عرصے میں اس سے بات بہ بات سوال کرتے رہے۔ جان بوجھ کر کنفیوژ کرنے والے سوال اور پھر اس کی توجیہ پہ استہزائیہ انداز میں سر جھٹک دیا جاتا۔ غصہ اسے آیا، مگر اسے عائشے گل کی اچھی لڑکی کی طرح تحمل سے کام لینا تھا۔ لیکن آخر میں اس کا صبر جواب دے گیا، جب داور بھائی نے بہت چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔

''میڈم! آپ کا تو ایل ایل بی بھی مکمل نہیں ہوا، تو آپ ایک کنسٹرکشن فرم کی پیچیدگیاں کیسے سمجھ پائیں گی؟''

''جب آپ چار سال میں دو دفعہ انگلش لینگویج میں سپلی لے کر بی اے کر سکتے ہیں اور سپلی ایم اے کر کے آج ادھر بیٹھ کر مجھ سے سوال و جواب کر سکتے ہیں تو پھر مجھے یقین ہے کہ میں بھی جلد ہی کمپنی کی ساری پیچیدگیاں سمجھ جاؤں گی۔''

بہت سکون سے کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کانفرنس روم میں سناٹا چھا گیا۔ داور بھائی کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ وہاں پروا کسے تھی۔

وہ ''السلام علیکم'' کہہ کر اپنی چیزیں اٹھا کر اسی اعتماد اور وقار کے ساتھ چلتی دروازے کی سمت بڑھ گئی، جس کے ساتھ وہ اندر آئی تھی۔

''سلیمان اصغر کی مغرور بیٹی......''

پیچھے سے اس نے کسی کو کہتے سنا تھا، مگر وہ باہر نکل آئی۔ پرسوں پریزنٹیشن تھی اور اگر وہ اچھی سی پریزنٹیشن دے کر پروجیکٹ اپروو کروالے تو وہ ان شاؤنسٹ مردوں پہ یہ ثابت کردے گی کہ سلیمان اصغر کا انتخاب درست تھا۔

☆ ☆ ☆

بیڈ پہ لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی کی پیڈ پہ انگلیاں تیز تیز چلاتی، وہ پورے انہماک سے اپنے کام کی طرف متوجہ تھی۔ پریزنٹیشن کے لیے وہ مکمل تیاری سے جانا چاہتی تھی تاکہ کوئی اس پہ انگلی نہ اٹھا سکے۔ مسلسل کام کے باعث اس کے ہاتھوں میں درد ہو رہا تھا۔ سر کے پیچھے حصے میں بھی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا ارادہ کام ختم کر کے دوا لے کر سونے کا تھا۔

''حیا!'' فاطمہ اسے پکارتے ہوئے کمرے تک آئیں۔ صبح ابا کو گھر شفٹ کر دیا گیا تھا، جس کے باعث اب وہ بالآخر سب ایک چھت تلے تھے۔

''کیا کر رہی ہو؟'' اس کے گرد کاغذوں، فائلز اور لیپ ٹاپ کو دیکھ کر فاطمہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی؟ صائمہ بھابھی بہت خفا ہو رہی تھیں کہ جب تایا کی موجودگی میں تم خود کرو گی تو سب کہیں گے کہ ان پہ بے اعتباری ظاہر کی جا رہی ہے۔''

''مجھے یہی بہتر لگا تھا اماں! ابا نے مجھے اپنا اٹارنی ان فیکٹ بنایا تھا تو کچھ سوچ کر ہی بنایا ہوگا۔'' وہ اسکرین سے نگاہیں ہٹائے بنا بولی۔

''اچھا! کل ارسل کا بیمہ ہے۔ کیا پہنو گی؟''

''اف! یہ شادیاں۔'' جب سے ابا بیمار ہوئے تھے، ان چیزوں کا دل ہی نہیں کرتا تھا۔ ارسل ان کا سیکنڈ کزن تھا، پھر بھی مہندی د

شادی پہ وہ اور فاطمہ نہیں گئی تھیں۔ اب ولیمہ پہ جانا ضروری تھا۔

"کچھ بھی پہن لوں گی۔ مکسڈ گیدرنگ ہوگی" ان کی انگلیوں سے درداب کلائیوں تک سرایت کر رہا تھا۔

"ہاں! مکسڈ ہی ہے، مگر پلیز! اس دن کی طرح دوپٹا مت لپیٹنا" فاطمہ اس کے قریب بیڈ پہ بیٹھتی نرد ٹھے پن سے بولیں۔

"پر اماں مکسڈ گیدرنگ جو ہے۔ نقاب تو کرنا پڑے گا" وہ ابھی تک اسکرین کی جانب متوجہ تھی۔ اسے پتا نہیں چلا کہ اس نے کس شے کو دعوت دے ڈالی تھی۔

"نقاب کس لیے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ وہاں کس سے ۔۔۔ ہے نقاب؟ کزن کی شادی ہے۔ وہاں سب اپنے ہی ہوں گے۔" وہ حیرت اور غصے سے بولیں۔ حیا نے رک کر انہیں دیکھا۔

"اپنا تو کوئی نہیں ہوتا اماں! وہ کزنز ہیں۔ سگے بھائی تو نہیں۔ اب جب کرتی ہوں نقاب تو ٹھیک سے کروں نا۔" اسے سر کے پچھلے حصے سے درد اپنے بازو تک بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، یوں جیسے اس کی ان دیکھی انگلیاں ہوں اور اس کے سر کو آہستہ آہستہ اپنے شکنجے میں لے رہا ہو۔

"تم پاگل ہو گئی ہو؟ تم فنکشن میں برقع اوڑھو گی؟"

"برقع نہیں اوڑھ رہی۔ بڑے دوپٹے سے ہی کام چلا لوں گی۔ مکسڈ گیدرنگ جو ہے۔" اس نے حتی الوسع لہجے کو نرم اور دھیما رکھنے کی کوشش کی۔

"مگر مکسڈ گیدرنگ میں بھی مردوں اور عورتوں کی ٹیبلز الگ الگ ہوتی ہیں حیا! مرد دور ہوتے ہیں۔"

"دور کہاں، سامنے ہی تو بیٹھے ہوتے ہیں سب۔ درمیان میں اسکرین تو نہیں حائل ہوتی ۔۔۔ اور پھر جو ویٹرز عورتوں کی طرف پھر رہے ہوتے ہیں اور ارسل کے بھائی ۔۔۔۔ وہ تو ہمیشہ ہی عورتوں کی طرف ہوتے ہیں۔"

"وہ تو بچے ہیں حیا!"

"بیس بیس سال کے بچے ہیں؟"

"تم بحث کیوں کر رہی ہو؟"

درد کی لمبی انگلیاں اب اس کی کنپٹی سے ہوتی، پیشانی کو اپنے شکنجے میں لے رہی تھیں۔ تکلیف ہر پل بڑھتی جا رہی تھی۔

"نہیں اماں! بحث تو نہیں کر رہی صرف وضاحت کر رہی ہوں اپنے نقاب کی۔"

"اچھا! پہلے تو تم نقاب نہیں لیتی تھیں۔ پہلے تو تم بہت ماڈرن تھیں۔"

وہ چپ ہو گئی۔ زمانہ جاہلیت کا طعنہ کیسے چابک کی طرح لگتا ہے۔ کاش! یہ طعنہ دینے والوں کو معلوم ہو سکے۔

"جی! میں پہلے نہیں لیتی تھی، لیکن اگر اب کرتی ہوں تو مجھے پراپر طریقے سے کرنا چاہیے۔"

"تم شادی پہ نقاب لو گی تو لوگ کیا کہیں گے؟" وہ جھنجھلائیں۔

"نہیں لوں گی تو اللہ تعالیٰ کیا کہے گا؟"

"کچھ نہیں ہوتا حیا! ایسے بھی تو کتنے گناہ کر لیتے ہیں۔ غیبت، گلے، یہ سب گناہ نہیں ہوتا؟ کیا صرف نقاب نہ کرنا گناہ ہے؟"

درد کی فولادی گرفت اس کے سر کو جکڑ لینے کے بعد اب گردن تک پھیلتی جا رہی تھی۔ اسے کندھوں پہ شدید دباؤ محسوس ہونے لگا۔

"اماں! میں نے کب کہا کہ میں بہت نیک ہوں یا کوئی گناہ نہیں کرتی، لیکن اگر میں کوئی نیک کام کرنا چاہتی ہوں تو مجھے مت روکیں۔"

اسے لگا، وہ التجا کر رہی ہے، منت کر رہی ہے۔ وہ بنو قریظہ سے منت کر رہی ہے۔

"اچھا! پہلے تو تم نے کبھی احساس نہیں کیا گناہ ثواب کا۔ جب ابا اور تایا کہتے تھے، تب تو تم نہیں مانتی تھیں۔ پھر وہی پہلے کا طعنہ۔

"تو اماں! اگر میں تایا کے کہنے پہ اللہ کی مانتی تو میں قابل قبول ہوتی، مجھے شاباش بھی ملتی اور واہ واہ بھی، لیکن اگر میں اپنی مرضی سے اللہ کی مانوں تو میں قابل قبول نہیں ہوں؟" اس نے دکھ سے انہیں دیکھا۔ وہ ماس کو برچھی کی طرح زخمی کرتی اذیت کندھوں سے گزرتی، سینے میں اتر رہی تھی۔

"مجھے بے کار کے دلائل مت دو۔ اپنا ایل ایل بی مجھ پہ مت آزماؤ۔ ارم کی منگنی پہ تھوڑے لوگ تھے، بات دب گئی، لیکن اگر اب اتنے بڑے فنکشن پہ نقاب لو گی تو جانتی ہو، لوگ کتنی باتیں بنائیں گے؟"

"آپ لوگوں سے ڈرتی ہیں، جبکہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ اس سے ڈرا جائے......اور لوگوں کا کیا ہے......صائمہ تائی تو پہلے بھی مجھ پہ باتیں بناتی آئی ہیں۔" مگر فاطمہ بے زار ہو چکی تھیں۔

"حیا! شادیوں پہ کون حجاب لیتا ہے؟"

"میں لیتی ہوں......اور میں نے کر دکھاؤں گی۔ نہیں! میں کوئی دعوا نہیں کر رہی، لیکن اگر میں اپنے خاندان کی وہ پہلی لڑکی ہوں جو شادیوں میں بھی حجاب لے......تو میں وہ پہلی لڑکی بنوں گی اماں!"

تکلیف اس کی شریانوں میں کسی سیال مادے کی طرح تیرتی اندر سب کچھ جلاتی، دل میں قطرہ قطرہ گرنے لگی تھی۔

"حیا! شادیوں پہ تو خیر ہوتی ہے۔"

"نہیں اماں! شادیوں پہ ہی تو......ان تقریبات سے ہی تو خیر کم اور شر زیادہ نکلتے ہیں۔"

"کتنا برا لگے گا، تم نقاب میں بیٹھی ہوگی؟" انہیں رہ رہ کر اس کی کم عقلی پہ افسوس ہو رہا تھا۔

"کس کو برا لگے گا......لوگوں کو؟ مگر اللہ تعالیٰ کو اچھا لگے گا۔"

"اچھا! یعنی ہم جو نقاب نہیں کرتے تو ہم سب کافر ہوئے......؟ ہاں! ہم سب بہت برے ہوئے؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے اماں؟ میں خود نقاب لیتی ہوں، مگر کسی دوسرے پر تو تنقید نہیں کرتی۔ میں تو کسی سے کچھ بھی نہیں کہتی اماں!"

اس کی آواز بھیگ گئی۔ درد اب اس کے دل کو کاٹ رہا تھا۔ الٹی چھری سے ذبح کر رہا تھا۔ خندق کی کوئی جنگ بنو قریظہ کے بغیر نہیں لڑی جاتی۔ اسے بھی بنو قریظہ مل گیا تھا اور وہاں سے ملا، جہاں سے اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"تم مت کہو، مگر تمہارا حجاب چیخ چیخ کر یہی کہتا ہے کہ میں بہت اچھی ہوں اور باقی سب برے ہیں۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر چمک کر کہا۔ وہ کہیں سے بھی ایک مہذب اور تعلیم یافتہ خاتون نہیں لگ رہی تھیں۔

"اماں! اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ اس کے اپنے اندر کی ان سیکیورٹی ہے۔ میرا کیا قصور؟ میں تو کسی کو برا نہیں سمجھتی۔ میں تو بس آگ سے بچنا چاہتی ہوں۔"

"تو یہ سب پہلے کیوں نہیں کرتی تھیں؟ بچپن سے علم تھا تمہیں جہنم کی آگ کا یا نہیں علم تھا؟"

"پہلے صرف علم تھا اماں! اب یقین آ گیا۔" اس نے بہت سے آنسو اپنے اندر اتارے۔

کیا لوگوں نے واقعی سمجھ لیا ہے کہ وہ کہیں گے، ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جائیں گے؟

"اچھا! صرف پردہ نہ کرنا گناہ ہے، ماں کی بات نہ ماننا گناہ نہیں ہے؟" کیا قرآن نہیں پڑھا تم نے کہ والدین کو اف بھی نہیں کرتے؟"

"اس نے جواب میں ایک گہری سانس لی۔

"اماں! آپ کو بھی پتا ہے اور مجھے بھی پتا ہے کہ آپ اس آیت کو غلط جگہ پہ غلط طریقے سے کوٹ کر رہی ہیں۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی، مگر میں اللہ تعالیٰ کو بھی ناراض نہیں کر سکتی۔"

"بس کرو! پتا ہے مجھے، یہ سب تم جہان کے لیے کر رہی ہو۔ وہی ہے ایسی دقیانوسی سوچ کا حامل۔ ترکی میں رہ کر بھی فرق نہیں پڑا اسے۔ دیکھتی ہوں میں، کس طرح روز فجر پہ مسجد جا رہا ہوتا ہے۔"

"اماں! کوئی لڑکی اپنی مرضی سے حجاب لینے لگے تو سب یہ کیوں فرض کر لیتے ہیں کہ وہ کسی کے دباؤ میں آ کر یہ کر رہی ہے؟ کوئی یہ ماننے کو تیار کیوں نہیں ہوتا کہ اس لڑکی کا اپنا دل بھی کچھ کہہ سکتا ہے؟"

"مگر پہلے تو تم نہیں کرتی تھیں نا" وہ غصے سے کہتی اٹھیں۔ "اور کرو! جس سے بھی کرنا ہے نقاب۔ میں کون ہوتی ہوں کچھ کہنے والی" وہ تن فن کرتی باہر نکل گئیں۔

الٹی چھری ابھی تک اس کے دل کو کاٹے جا رہی تھی۔ خون کے قطرے اندر ہی اندر گر رہے تھے۔ مائیں بھی بعض دفعہ کتنا دل دکھاتی ہیں، مگر انہیں کبھی احساس نہیں ہوتا۔

اس نے آنکھوں کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑا، مگر آنسو پھر بھی ابل پڑے۔

"جاڑے اور بھوک کی تکلیف میں خندق کھودنا کٹھن ہوتا ہے یا بنو قریظہ کی بے وفائی سہنا؟ اس نے خود سے پوچھا۔" اور اگر یہ دونوں ساتھ مل جائیں تب......؟"

اس کا دل ابھی تک تکلیف سے رس رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

پریزنٹیشن اچھی چلی گئی، جبکہ ولیمہ کا فنکشن اس سے بھی اچھا۔ آج اس نے نیوی بلیو لباس پہنا تھا اور بڑا سادہ دوپٹہ ویسے ہی لیا، جیسے ارم کی منگنی پہ لیا تھا۔ نیچے بھی ذرا الگ تھی، مگر یہ نہیں کہ کٹ کر رہی، بلکہ ہر ایک سے ملی۔ وہی سوال رجواب کا سلسلہ البتہ جاری رہا۔

"چہرے سے تو ہٹاؤ۔" یہ وہ فقرہ تھا جو حیرت اور اچنبھے سے بہت لوگوں نے آ کر دہرایا اور جواب میں وہ ایک سادہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتی بس۔

"تھینک یو! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

البتہ سب کی باتیں دل پہ بہت زور سے لگتی تھیں۔ فاطمہ نے کتنی ہی دفعہ اسے آنکھ سے اشارہ کیا کہ چہرہ پورا کھول لے مگر جواب میں وہ ابرو سے پیچھے کی طرف اشارہ کرتی، جہاں مووی میکر مووی بنا رہا تھا۔ وہ جھنجھلا گئیں۔

"او ہو! فیملی ویڈیو ہے۔ اپنوں میں ہی رہے گی۔ باہر تھوڑی دکھائیں گے۔"

"بالکل!" وہ اثبات میں سر ہلا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

صرف شہلا تھی جو اسے یوں ملی جیسے کوئی تبدیلی ہی نہ آئی ہو۔ اس کی آنکھیں البتہ اب بھی ویسی ہی اداس اور تکان سے بھرپور تھیں۔ مگر اب حیا کو وجہ جاننے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے ابھی ایک دو فنکشنز حجاب میں اٹینڈ کیے تھے، کل فاطمہ سے بحث کی تکلیف کا اثر ابھی تک دل پہ تھا اور شہلا تو پچھلے دو برس سے ہر غمی، خوشی میں اسی طرح شرکت کرتی رہی تھی۔

اور پھر جب انسان کہتا ہے کہ وہ ایمان لایا ہے تو وہ آزمایا بھی ضرور جاتا ہے۔ جانے شہلا کی تکلیف کتنی تھی اور کب سے تھی۔"

سلام ہو ہم اجنبیوں پہ!" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔

شادی کے لیے دوسرے شہروں سے آئے کچھ رشتہ دار تایا فرقان کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ تایا نے رات میں سب کا کھانا کیا تھا۔ اس وقت بھی ان کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ جب وہ پریزنٹیشن کا بتانے ان کی طرف آئی۔

لان میں اندھیرا اتر آیا تھا۔ تایا برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔ اندر جانے والا دروازہ کھلا تھا، مگر آس پاس کوئی نہ تھا۔ اندر سے البتہ گہما گہمی اور رونق کی سی آوازیں آ رہی تھیں۔

"آج پریزنٹیشن اچھی ہو گئی ہے۔ امید ہے پروجیکٹ ہمیں ہی ملے گا۔"

وہ نرمی و بشاشت سے بتانے لگی۔ جو سرد مہری کی دیوار ان دونوں کے بیچ در آئی تھی۔ وہ اسے گرانا چاہتی تھی۔ جو بھی تھا، اسے فطری طور پہ اپنے تایا سے بہت محبت تھی۔

"خیر! مجھے تو اتنی امید نہیں ہے۔ پتا نہیں، تم ٹھیک سے کر کے بھی آئی ہو یا نہیں۔" وہاں ہنوز رکھائی تھی۔ وہ بہت اکھڑے اکھڑے سے لگ رہے تھے۔

"نہیں تایا ابا! سب بہت اچھا ہو گیا۔ وہ پورا ہوم ورک کر کے گئی تھی۔"

وہ خاموش رہے۔ تنے ہوئے ابرو اور ماتھے کے بل۔ وہ اس سے خوش نہیں تھے۔ اس نے ایک اور کوشش کرنی چاہی۔

"اچھا! باقر صاحب بتا رہے تھے کہ سائٹ بی میں وینڈر کچھ مسئلہ کر رہا ہے۔ سپلائی روک دی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر میں خود......" وہ ایک دم رکی۔ دروازہ کھول کر داور بھائی باہر آ رہے تھے۔ حیا کسی میکانکی عمل کے تحت دوپٹا دو انگلیوں سے تھوڑی سے اٹھا کر ناک تک لے گئی۔ تایا نے چونک کر اس کی حرکت کو دیکھا اور پھر اندر سے آتے داور بھائی کو، جو اسے دیکھ کر رک گئے تھے، جیسے متذبذب ہوں کہ کھڑا رہوں یا واپس چلا جاؤں۔

"یہ تم کس سے پردہ کر رہی ہو؟" تایا نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔ لمحے بھر کو تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

"جی؟"

''تم میرے بیٹے سے پردہ کر رہی ہو؟''

''تایا ابا! میں تو ....'' اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ ایک دم بہت بلند آواز میں بولنے لگے۔

''میرے بیٹے آوارہ ہیں؟ لوفر لفنگے ہیں؟ بدنیت ہیں؟ کیا کیا ہے میرے بیٹوں نے جو تم ان کے سامنے پردے ڈالنے لگتی ہو؟'' اونچی غصیلی آواز نے اندر باہر خاموشی طاری کر دی۔

وہ بالکل ساکت سی بنا پلک جھپکے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔

''تم میرے ہی گھر میں کھڑے ہو کر میرے بیٹوں کو گھٹیا اور نیچ ثابت کرنا چاہتی ہو؟ تم میرے بیٹوں کو ذلیل کر رہی ہو'' وہ غصے سے دھاڑے۔ داور بھائی نے نفی میں سر ہلایا، جیسے انہیں قطعاً نہ لگا ہو کہ ان کو ذلیل کیا گیا ہے۔

اندر سے لوگ باہر آنے لگے۔ کوئی کچن کے دروازے سے باہر نکلا۔ کوئی برآمدے کے دروازے سے تماشا سج گیا تھا۔ اور تماشائی جمع ہو رہے تھے۔

''میرے بیٹوں نے ساری عمر بھائیوں کی طرح خیال رکھا تمہارا۔ اپنا بھائی تو اس کافر عورت کے ساتھ منہ کالا کر کے بیٹھ گیا سب نا! اگر تم الٹا میرے بیٹوں کے خلاف محاذ بنا رہی ہو؟ پورے ترکی میں آوارہ پھرتے تمہیں پردے کا خیال نہیں آیا تھا؟''

اس کا جیسے سانس رک گیا۔ اسی پل ان کو دیکھا۔ بمشکل وہ چند لفظ کہہ پائی۔

''زاہد چچا! آپ تایا ابا کو سمجھائیں، انہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو .....''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی! یہ ڈھکوسلے تم کس کے لیے کرتی ہو؟ پہلے ساری زندگی خیال نہیں آیا، اب کہاں کا اسلام شروع ہو گیا ہے تمہارا؟'' وہ جواباً اتنے ہی غصے سے بولے۔

''پورے خاندان میں ہمارا تماشا بنا کر رکھ دیا۔ سب باتیں بنا رہے ہیں کہ حیا بی بی نقاب میں کھانا کھا رہی تھیں۔''

''وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ارد گرد لگے مجمع کی نظریں، تحقیر، طنز، ذلت۔ اس نے کیا کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔

''آپ سب کو کیا ہو گیا ہے؟'' وہ بولنا چاہتی تھی مگر لبوں سے بس یہی نکلا۔''

''تایا! آپ کو تو حجاب بہت پسند تھا۔ آپ تو.....''

''بکواس مت کرو میرے سامنے، اور میری بات کان کھول کر سن لو! اگر تم آئندہ میرے گھر آؤ گی تو منہ لپیٹے بغیر آؤ گی۔ اگر تمہیں میرے بیٹوں کو اس طرح ذلیل کرنا ہے تو میرے گھر میں آئندہ قدم مت رکھنا۔''

انگلی اٹھا کر متنبہ کرتے وہ سرخ چہرہ لیے بولے۔ اس سے مزید کھڑا نہیں ہوا گیا۔ وہ ایک دم پلٹی اور اپنے گھر کی طرف دوڑتی چلی گئی۔

پیچھے تماشائیوں کے مجمع میں کہیں فاطمہ بھی تھیں مگر وہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے آگے نہیں بڑھی تھیں۔ ان سب نے اسے اندھیری خندق میں تنہا چھوڑ دیا تھا۔

اپنے لان میں وہ برآمدے کی سیڑھیوں پہ ہی گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور قدموں میں سکت نہیں رہی تھی۔ آنکھوں سے گرم گرم آنسو ابل کر گرتے جا رہے تھے۔

اتنی ذلت؟ اتنی تحقیر، اتنا تماشا؟

یہ تایا فرقان تھے۔ ساری عمر اس حجاب پہ ہی اختلاف رکھنے والے تایا فرقان اب حجاب پر ہی اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ ان کا دین، شریعت، سب کدھر گیا تھا؟

اس کی گردن گھٹنوں پہ جھکی تھی۔ وہ روئے چلی جا رہی تھی۔ پورے خاندان کے سامنے تایا نے اسے ذلیل کیا تھا اسے لگا، وہ اب کبھی سر نہیں اٹھا سکے گی۔

گاڑی کے اندر آنے کی آواز آئی، پھر کوئی اس کے ساتھ آ بیٹھا۔

آج میرا چالان ہوتے ہوتے بچا۔ پوچھو کیوں؟ کسی اور ہی دھن میں محظوظ سا بتا رہا تھا۔

وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔ جہان نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

''حیا! کیا ہوا؟ ماموں ٹھیک ہو جائیں گے۔ پریشان مت ہو'' اس نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ ابا کی وجہ سے رو رہی ہے۔

"کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اب کبھی کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔" وہ روتے ہوئے اتنا ہی کہہ پائی، پھر آنسو ہر منظر پہ غالب آنے لگے وہ پوچھتا رہ گیا، مگر وہ اندر دوڑی چلی آئی تھی۔

پوری رات وہ سو نہیں سکی۔ اتنی ذلت، اتنا تماشا؟ تایا درست بھی ہوتے، پھر بھی یہ کون سا طریقہ تھا بات کرنے کا؟ اب تک پورے خاندان کو پتا چل چکا ہوگا۔ وہ ہر جگہ بے عزت ہو کر رہ گئی تھی۔ رات بھر وہ روتی رہی۔ صبح سر بھاری ہو رہا تھا۔ فریش ہونے تک اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ ابا سے بات کر کے تایا ابا کو ان کا اٹارنی ان ایفیکٹ بنا دے گی۔ تایا ابا کو مسئلہ اس کے حجاب سے نہیں، اس کے آفس آنے سے تھا، سو اب وہ یہ سارا مسئلہ ہی ختم کر دے گی۔

ناشتے کی میز پر وہ اور فاطمہ اکیلی تھیں۔ سبین پھپھو ابا کو ناشتا کروا رہی تھیں۔ اور جہان پتا نہیں کہاں تھا۔

"یہ ہوتا ہے ماں باپ کی نافرمانی کا انجام۔ سارے خاندان میں بے عزتی کروا کر رکھ دی۔" فاطمہ خفگی سے بولی جا رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے چند لقمے بمشکل زہر مار کر سکی، پھر اٹھ آئی۔

ایسے لمحوں میں وہ اس سیمینار میں واپس پہنچ جایا کرتی تھی جو اس نے اناطولین استنبول میں اٹینڈ کیا تھا۔ اسے شیشے کی دیواروں سے ٹکرا کر گرتی چڑیاں یاد آتی تھیں۔ اس نے بھی تو اپنے گرد ایسی ہی دیوار کھڑی کر دی تھی اور یہ لوگ تو ان ہی پرندوں کی طرح تھے۔ پہلے وہ ان کی بات سن لیتی تھی تو وہ سمجھتے تھے کہ اب بھی سنتی رہے گی۔ وہ اس طرح اس کو تھکا نہیں سکتے تھے۔ شیشے کی دیواروں سے ٹکرانے میں نقصان پرندوں کا ہی ہوتا ہے۔ دیوار کو کیا فرق پڑتا ہے؟

ابا اسی طرح نحیف و کمزور سے لگ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر ذرا سے مسکرائے۔

"کام کیسا جا رہا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے ابا!" اس نے بہت سے آنسو اپنے اندر اتار لیے اور بظاہر مسکرا کر بولی۔

"بہت محنت کر رہی ہے یہ لڑکی!" پھپھو مسکرا کر کہتی ناشتے کے برتن اٹھا رہی تھیں۔ پتا نہیں، انہیں رات کے واقعے کا علم تھا یا نہیں۔ پھر بھی ان سے نگاہ نہ ملا سکی۔

☆ ☆ ☆

آفس میں ایک بری خبر اس کی منتظر تھی۔ ٹریڈ سینٹر کا پروجیکٹ انہیں نہیں ملا تھا۔ اس بات نے تو اسے مزید شکستہ دل کر دیا۔ اس نے باقر صاحب کو بلوایا تاکہ ان کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دے اور وکیل صاحب کو بلوا سکے، مگر پہلے اس نے بے اختیار ہی وہ تکلیف دہ موضوع خود ہی اٹھا لیا۔

"اتنی اچھی پریزنٹیشن دی تھی، پھر ہمیں پروجیکٹ کیوں نہیں ملا؟" رات کے واقعے کی تھکن اور اذیت اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی۔

"انہیں ہمارا پلان پسند نہیں آیا۔ وہ شاید کچھ اور چاہتے تھے۔"

"اچھا!" وہ خاموش ہو گئی۔ کچھ سوچ کر اس نے باقر صاحب سے کوئی بات نہیں کی اور انہیں بھیج دیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے سارا پروجیکٹ پلان نکالا اور از سر نو جائزہ لینے لگی۔ ٹھیک ہے کہ وہ آج آفس چھوڑ دے گی اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اسے ان معاملات کا کوئی تجربہ نہیں، مگر وہ صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس سے غلطی کہاں ہوئی۔

تمام خاکے اچھے تھے۔ بقول آرکیٹکٹ بے حد شاندار۔ مگر جب اس نے پہلی دفعہ ان کو دیکھا تھا تو اس کے ذہن میں کیا بات آئی تھی؟ کچھ غیر آرام دہ لگا تھا اسے۔ اس نے ذہن پہ زور دیا اور ایک دم کسی بہتی ندی کی طرح وہ خیال امڈ آیا۔

موت کا کنواں۔

اور اگلے ہی لمحے اسے غلطی نظر آ گئی۔

داور بھائی کی شادی کی کچھ شاپنگ فاطمہ اور اس نے لاہور سے کی تھی۔ کسی کام سے وہ شاہ عالمی مارکیٹ چلے گئے۔ غلطی یہ کی کہ اپنی کار لے گئی۔ وہاں ایک ملٹی اسٹوری پارکنگ بلڈنگ میں کار پارک کرنا پڑی، وہ بھی چوتھی منزل پہ۔ گول گول گھومتی منزلیں، تنگ تاریک جگہ، گاڑی اوپر چڑھانا گویا یوں تھا جیسے موت کے کنویں میں ڈرائیو کرنا۔ تب سے اسے ملٹی اسٹوری پارکنگ عمارات بہت بری لگتی تھیں اور اب اس کے پلان میں ٹریڈ سینٹر کی پارکنگ ایک چھوٹے رقبے پہ ملٹی اسٹوری بنائی گئی تھی۔

اسے تعمیراتی کاموں کا تجربہ نہ تھا۔ مگر شاپنگ کا ایک طویل اور وسیع تجربہ تھا، پھر یہ اتنی بڑی غلطی اسے پہلے کیوں نظر نہیں آئی؟ شاید اس لیے کہ وہ پہلے خود کو کم علم سمجھ کر آرکیٹکٹ پہ بھروسا کر رہی تھی۔ اندھی تقلید، مگر اب اپنی عقل سے سوچا تو چونک گئی۔ لوگ ایک کھلا اور "زمینی" پارکنگ لاٹ پسند کرتے اور ملٹی اسٹوری پارکنگ بلڈنگز تو ادھر کم ہی بنتی ہیں۔ پھر آرکیٹکٹ نے ایسا کیوں کیا؟

وہ جا ہی رہی ہے تو ذرا ان صاحب سے دوٹوک بات تو کر لے۔ یہی سوچ کر وہ باہر آئی۔ ترکوں سے اس نے خود چل کر جانا سیکھا تھا۔ وہاں کسی سے راستہ پوچھو تو وہ آپ کے ساتھ چل کر آخر منزل تک چھوڑ آتا تھا۔ سو وہ خود آرکیٹکٹ صاحب سے ملنے چلی آئی، لیکن کوریڈور کے سرے پہ وہ ایک دم پیچھے ہوئی۔

ولید اور آرکیٹکٹ رضوان صاحب کسی بات پہ ہنستے ہوئے اندر جا رہے تھے۔ وہ الٹے قدموں واپس آئی۔ ایک سرخ بتی جلنے بجھنے لگی تھی۔ کہیں کچھ غلط تھا۔ کوئی گڑبڑ تھی۔

واپس اپنی سیٹ پہ بیٹھی، وہ کتنی ہی دیر سوچتی رہی۔ پھر اپنے پرس میں موبائل کے لیے ہاتھ ڈالا تو وہ مخمل کا ٹکڑا بھی نظر آ گیا جس پہ سنہری دھاگے سے دو الفاظ لکھے تھے۔ وہ اسے دو انگلیوں سے گھماتی، الٹ پلٹ کرتی، سوچتی رہی۔ فرار ہر مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ مسئلوں کا حل ڈھونڈنا پڑتا ہے، راستہ تلاش کیا جاتا ہے۔ میجر احمد کا سبق اسے یاد تھا۔

چند منٹ میں اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ پھر سے کام کرنے کے لیے تیار تھی۔ کوئی اس کے باپ سے غداری کر رہا تھا۔ اسے ساری گڑبڑ کے منبع کو ڈھونڈنا تھا۔

☆ ☆ ☆

کانفرنس روم میں سب جمع تھے۔ وہ بنا کسی کو دیکھے سربراہی کرسی پہ آ کر بیٹھ تو گئی تھی، مگر سر اٹھا کر تایا فرقان، داور اور زاہد چچا کو دیکھنا، ان سے نگاہ ملانا کتنا اذیت ناک تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔ رات کے زخموں سے پھر سے خون رسنے لگا تھا۔ مگر وہ کتنے آرام سے اس کے سامنے بیٹھے تھے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"تو آپ نے پروجیکٹ ہار دیا" تایا فرقان نے نخوت بھری سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ وہ تایا فرقان کی بیٹی کی طرح رات گئے پکڑی نہیں گئی تھی۔ (جیسا کہ تایا نے ایک دفعہ اسے فون کیا تھا) کہ وہ سر اٹھا نہ سکتی۔ نہ ہی وہ زاہد چچا کی بیٹی کی طرح پورے خاندان میں چیخ چلا کر واور بھائی کو بے عزت کرنے کی مجرم تھی۔ زاہد چچا نے اسے سخت سناتے ہوئے اپنی بیٹی کی حرکت کو کیوں فراموش کر دیا؟ اور تایا نے بھی کبھی داور کی اس بے عزتی پہ باز پرس کی؟ پھر اب..... ؟ مگر وہ حجابی لڑکی تھی اور کوئی حجابی لڑکی پہ کتنا ہی کیچڑ اچھالنے کی کوشش کرے اسے میلا نہیں کر سکتا تھا۔

"جی سر! میں نے ہار دیا۔" تایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

"کیا آپ وجہ بتانا پسند کریں گی؟" ولید کی بات پہ اس نے گردن موڑ کر اسی سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں ولید صاحب۔"

"درست! پھر میں آپ کو مطلع کرنا چاہوں گا کہ ہم گرین ہاؤس اسکیم والا پروجیکٹ ڈیلے (Delay) کرنے پہ مجبور ہو چکے ہیں۔"

"کیوں؟" وہ چونکی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کتنا اہم پروجیکٹ تھا۔

"کیونکہ بجٹ نہیں ہے۔ فنڈز کم پڑ رہے ہیں۔ ہمارے پاس اس کو کیری آن کرنے کے لیے اتنا پیسہ نہیں ہے۔" اس نے ایک کاغذ حیا کی طرف بڑھایا، جس پہ ایک لمبا سا فیگر لکھا تھا۔

اتنی رقم کا انتظام کیسے ہوگا؟ وہ سچ میں مضطرب ہو گئی۔

"مگر اس طرح پروجیکٹ بند کرنے سے تو بہت نقصان ہوگا۔"

"پھر کیا کریں؟"

"یہ میرے ابا کا پروجیکٹ تھا۔ ہم اس کو یوں کال آف نہیں کر سکتے۔" وہ فکرمندی سے کہہ رہی تھی۔

"تم ہمیں یہ اماؤنٹ لا دو۔ ہم اس کو جاری رکھیں گے، بات ختم۔" زاہد چچا نے بےزاری سے کہا۔ وہ دونوں تایا، چچا اسے یوں مخاطب کرتے تھے، گویا وہ ان کے بھائی کی بیٹی نہیں، ملازمہ ہو۔

''واقعی؟'' اگر میں آپ کو یہ اماؤنٹ لا دوں تو آپ کام جاری رکھیں گے؟ کیا آپ زبان دے رہے ہیں؟'' اس کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ان کا چیلنج کرتا، مذاق اڑاتا انداز اسے پہلے سے زیادہ برا لگا تھا۔ رات کے زخم پھر سے کھرچنے لگے تھے۔

''بالکل!'' تایا فرقان نے شانے جھٹکے۔

''ٹھیک ہے! میں پیر کی صبح آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گی۔'' وہ فائل بند کرتے ہوئے حتمی انداز میں بولی۔

پھر جب وہ اپنے آفس واپس آئی تو موبائل بج رہا تھا۔ اس نے کرسی پہ تھکے تھکے انداز میں گرتے ہوئے فون اٹھایا۔ نمبر جہان کا تھا۔

''کیسی ہو؟'' وہ چھوٹتے ہی فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے انگلیوں سے پیشانی مسلتے ہوئے جواب دیا۔ بے خوابی کے باعث سر بے حد درد کر رہا تھا۔

''چلو! پھر لنچ ساتھ کرتے ہیں۔ میں نے ایک چھوٹا سا اٹالین ریسٹورنٹ دیکھا ہے۔ تمہیں ایڈریس سمجھاؤں؟''

سارے دن میں وہ پہلی دفعہ ہنسی تھی۔

''یہ میرا شہر ہے جہان بے! مجھے اس کے سارے راستے معلوم ہیں۔ ریسٹورنٹ کا نام بتاؤ۔'' وہ بھی ہلکا سا ہنس دیا۔

''اوہ سوری! الف نیمن میں اٹالین اودن پہ آ جاؤ۔''

☆ ☆ ☆

کار ڈرائیور چلا رہا تھا۔ وہ پچھلی نشست پہ بیٹھی سیل فون پہ نمبر ملا رہی تھی۔ اس نے ابا کی نصیحت پہ عمل کرنے کا سوچا تھا۔ کال ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔ صد شکر کہ انہوں نے کال ریسیو کر لی۔

''السلام علیکم ذیشان انکل! میں حیا بات کر رہی ہوں۔''

کار ٹریفک کے ساتھ بہتی چلی جا رہی تھی۔ اسی طرح اس کے تنے، پریشان اعصاب ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ ان سے بات ختم کی تو آفس سے فون آ گیا۔ وینڈر مال کی سپلائی کھولنے پہ تیار نہ تھا اور پرانی قیمت پہ تو ہرگز نہیں۔ سراسر بلیک میلنگ تھی اور بلیک میلرز۔ سے تو اسے نفرت تھی۔

''کل میری میٹنگ ارینج کروا دیں وینڈر سے۔ میں ان صاحب سے خود بات کرنا چاہوں گی۔'' اس نے بند کر دیا۔ کار ریسٹورنٹ کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ اطالوی ریسٹورنٹ کی بالائی منزل کی سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تمام میزیں خالی تھیں۔ ہال کی ایک دیوار شیشے کی بنی تھی، جس سے نیچے ڈبل روڈ اور اس کے پار گرین بیلٹ کے درخت و سبزہ نظر آ رہا تھا۔ شیشے کی دیوار کے ساتھ کونے کی میز پہ وہ بیٹھا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرایا۔ وہ ہاں کسی وقت کے اسے نقاب میں پہچان لیتا تھا۔ پہلی دفعہ جب وہ نقاب میں اس کے پاس گئی تھی، فریڈم فلوٹیلا کے احتجاج کے دن، تب بھی اس نے کوئی حیرانی ظاہر نہیں کی تھی۔ شاید وہ حیران کم ہی ہوتا تھا۔

''پہلے فیصلہ کر لو کہ لنچ کس کی طرف سے ہے؟'' کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے میز پہ اپنا پرس رکھا۔

''آف کورس! تمہاری طرف سے ہے۔ اصغر اینڈ سنز کی قائم مقام ایم ڈی مجھ غریب آدمی کو لنچ تو کروا ہی سکتی ہے۔''

''شیور!'' اس نے بشاشت سے کہتے ہوئے موبائل پرس میں رکھنے کے لیے پرس کھولا۔ مخمل کا ٹکڑا اندرونی جیب میں ہزار کے ایک نوٹ کے ساتھ رکھا تھا۔

ہزار کا نوٹ؟ وہ زپ بند کرتے ہوئے چونکی۔ پھر بنا محسوس سے انداز میں پرس کو اندر سے دیکھا۔ اس کا روپوں والا پاؤچ آفس میں ہی رہ گیا تھا۔ اب سوائے اس لاوارث سے نیلے نوٹ کے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اللہ، اللہ کاروباری الجھنوں میں پاؤچ اٹھانا یاد ہی نہیں رہا۔ اب کیا کرے؟

''کیا ہوا؟ ایم ڈی صاحبہ! پیسے تو نہیں بھول آئیں؟'' وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک تو اس آدمی کی عقابی نظریں، اس نے سنبھل کر پرس بند کیا۔

''تم ایم ڈی صاحبہ سے ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کی توقع کر سکتے ہو؟ بظاہر مسکراتے ہوئے وہ سیدھی ہوئی۔

''نہیں! خیر آرڈر کرو۔ تمہارا شہر ہے۔ تمہیں زیادہ پتا ہو گا۔'' وہ پیچھے ہو کر بیٹھ گیا۔

حیا نے ''شیور'' کہتے ہوئے مینیو کارڈ اٹھا لیا۔ اس کو لنچ کروانا تھا اور وہ بھی ہزار کے نوٹ سے۔ اے ٹی ایم بھی پاؤچ میں تھا اور وہ کوئی

ایسی حرکت نہیں کر سکتی تھی، جس سے جہان کو پتا چلے کہ وہ پیسے واقعی بھول آئی ہے، ورنہ ادائیگی کر دے گا۔ سوال انا کا تھا۔

"لیکن ایک ہزار میں اسے اطالوی لنچ کیسے کرواؤں؟" اس نے قدرے اضطراب سے فہرست دیکھی۔

"سنو! صرف مین کورس منگوانا، سلاد، اسٹارٹر اور ڈرنکس کے فالتو اخراجات مجھے پسند نہیں ہیں۔" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، مسکراہٹ دبائے اسے بغور دیکھتا کہہ رہا تھا۔

"اوکے! مجھے تو کوئی خاص بھوک نہیں ہے، دل ہی نہیں چاہ رہا۔" آرڈر دے کر اس نے کارڈ رکھ دیا۔ جہان نے مسکراہٹ دباتے ہوئے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ وہ شیشے کی دیوار سے باہر دیکھنے لگی۔ اس شیشے سے تو کوئی پرندہ نہیں آ ٹکرایا تھا۔ شاید پرندے تعمیر کے بعد صرف پہلے موسم میں ٹکراتے ہوں۔ بعد میں عادی ہو کر راستہ بدل لیتے ہوں۔ راستہ پرندوں کو ہی بدلنا پڑتا ہے، دیوار ویسی ہی کھڑی رہتی ہے۔

"کل کیا ہوا تھا؟"

حیا نے نگاہیں موڑ کر اسے دیکھا۔

"اب تک تم نے پتا تو کر ہی لیا ہوگا۔ بہرحال! تایا نے سارے خاندان کے سامنے میرے پردے کی وجہ سے مجھے بے عزت کیا، تماشا بنایا اور گھر سے نکال دیا۔ اس کے علاوہ کچھ خاص نہیں۔"

جہان نے قدرے تاسف سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پرانی عادتیں آسانی سے نہیں جاتیں۔ اس طرح لوگوں کو ذلیل کرنے کے وہ عادی ہیں۔ کتنا آسان ہے ان کے لیے اپنی انا کے پیچھے رشتے توڑ دینا۔"

"جو بھی ہے، میں ابا کی کرسی ان کے لیے خالی نہیں کروں گی۔ یہ فیصلہ میں نے کر لیا ہے۔ اب اس قصے کو بند کر دیتے ہیں۔ تم بتاؤ! تم نے ترکی واپسی کا کیا سوچا ہے؟"

"سب مجھ سے یہی پوچھتے ہیں کہ واپسی کا کیا پروگرام ہے۔ لگتا ہے مجھ سے تنگ آ گئے ہیں۔ دل کرتا ہے میرا کہ 'ماہ سن' کی طرح کبوتر بن کر کسی غار میں چھپ جاؤں۔" اس نے غالباً کوئی ترک محاورہ بولا تھا۔

"خیر! ابھی کچھ دن ادھر ہوں۔ تمہیں کب جانا ہے؟"

"جولائی شروع ہو چکا ہے۔ مجھے پانچ جولائی کے بعد کلیئرنس کروانی ہے۔ ابا کی طبیعت ذرا سنبھل جائے، پھر جاؤں گی۔"

"لنچ آ گیا تو وہ اپنے نقاب سے بہ آسانی چھری کانٹے کی مدد سے کھانے لگی۔ پھر کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"جہان! تمہیں میرا نقاب...... میرا مطلب ہے تمہیں اچھا لگتا ہے میرا یوں نقاب لینا؟"

وہ ذرا چونکا تھا۔

"آ...... ہاں! ٹھیک ہے۔" اس نے ذرا الجھتے ہوئے شانے اچکائے۔ وہ مطمئن ہو کر کھانے لگی، مگر وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا تھا۔

بل آیا تو اس نے ایک مطمئن سی سانس اندر کو اتاری۔ نو سو پچاس صرف دو مین کورس منگوائے تھے اس لیے۔ ثابت ہوا کہ اگر پیسے کم ہوں تو بندے کو لڈ ڈرنکس، سلاد اور اسٹارٹر جیسے فالتو لوازمات سے پرہیز کرنا چاہیے۔

یکایک کسی خیال کے تحت وہ چونکی۔

"فالتو لوازمات؟" اس کا ذہن آفس کی طرف بھٹک گیا۔ جہان نے نرمی سے اس سے بل لے لیا۔

"میں پے کروں گا۔"

وہ چونکی۔ "نہیں یہ تو مجھے......"

"میں مذاق کر رہا تھا، لنچ میری طرف سے تھا۔" وہ بنا ایک لفظ سنے فائل میں پیسے رکھنے لگا۔ اس نے اصرار نہیں کیا۔ اس کا ذہن کسی اور ہی طرف الجھا تھا۔

"فالتو لوازمات؟"

☆ ☆ ☆

ادھیڑ عمر صاحب نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پھر ایک طرف ہٹ گئے۔ وہ پراعتماد اور سبک قدموں سے چلتی اندر آئی۔ دروازے سے نجمی صاحب (وینڈر) کی کرسی میز کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ وہ سیدھ میں چلتی میز تک آئی اور بیٹھنے کے لیے کرسی کھینچی۔

نجمی صاحب نے انگلیوں میں پکڑی سگریٹ لبوں میں دبا کر سانس اندر کو کھینچی اور سر سے پاؤں تک سیاہ عبایا میں ملبوس دراز قد لڑکی کا جائزہ لیا جو بہت اطمینان سے کرسی کھینچ کر بیٹھ رہی تھی۔ انہوں نے سگریٹ ہٹائی، دھوئیں کا مرغولہ اڑ کر فضا میں تحلیل ہوا۔

''میں حیا سلیمان ہوں، اصغر اینڈ سنز کی منیجنگ ڈائریکٹر.....'' کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر، ٹانگ پہ ٹانگ رکھے کہنیاں ہاتھ پر جما کر ہتھیلیاں ملائے بیٹھی وہ بہت سنجیدگی سے بولی۔

نجمی صاحب نے کندھوں کو ذرا سی جنبش دی، یعنی وہ جانتے ہیں، اب آگے بات کرے۔ ادھیڑ عمر صاحب اس لڑکی کے پیچھے ہاتھ باندھے مؤدب سے آکھڑے ہوئے تھے۔ ان کے لیے دوسری کرسی موجود نہیں تھی۔ نجمی صاحب نے کرسی منگوانے کی ضرورت بھی نہ سمجھی۔

''ہماری سائٹ پہ سپلائی آپ نے روک دی ہے جس سے ہمارا پروجیکٹ تاخیر کا شکار ہوسکتا ہے۔''

''دیکھیں بی بی! میں نے اپنی ڈیمانڈ آپ کے .....''

''میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی نجمی صاحب!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک دم بہت سخت لہجے میں انہیں روکا۔ اس کی آواز میں کچھ تھا کہ وہ رک گئے۔

''چند باتیں ہیں جو میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں۔'' ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بنا کسی تمہید کے وہ کہہ رہی تھی۔

''آپ کے پیچھے جو کھڑکی ہے، اس سے جھانک کر دیکھیں تو دائیں جانب، دور کہیں ایک زیر تعمیر منصوبہ دکھائی دے رہا ہے۔ کس چیز کا منصوبہ ہے وہ باقر صاحب؟'' لڑکی نے رک کر پیچھے کھڑے آدمی کو مخاطب کیا، مگر دیکھ وہ ابھی تک نجمی صاحب کو رہی تھی۔

''اوور ہیڈ ہے میم!'' انہوں نے فوراً بتایا۔

''بالکل! اوور ہیڈ تعمیر ہو رہا ہے وہاں اور کیا آپ جانتے ہیں کہ اس میں سینڈ (Sand) اور سلٹ (Slit) استعمال ہو رہا ہے، اور وہ بھی کس کی جگہ؟ (Crusher) میٹریل کی جگہ!''

نفیس سے نقاب سے جھلکتی اس کی بڑی بڑی، سیاہ آنکھیں مسکرائی تھیں۔ نجمی صاحب نے سگریٹ والا ہاتھ نیچے کر دیا ان کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ چکے تھے اور وہ پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ تھے۔

''آپ اس اوور ہیڈ سے دو کلومیٹر دائیں چلے جائیں۔ تو ایک سکس اسٹار ہوٹل زیر تعمیر نظر آئے گا، اس کی تکمیل آخری مراحل میں ہے، مگر اس کے مالکان کو یہ علم نہیں ہے کہ اس کی روفنگ (roofing) اور واٹر پروفنگ میں سب اسٹینڈرڈ میٹریل استعمال کیا گیا ہے۔ بے حد سستا اور گھٹیا میٹریل۔'' اس کی مسکراتی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

نجمی صاحب نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

''میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔''

وہ لب بھینچ کر رہ گئے۔ پیشانی پہ بلوں کا اضافہ ہونے لگا۔

''ایک روڈ بھی حال ہی میں مکمل ہوئی ہے اور اس کا بھی ان دونوں پروجیکٹس سے تعلق ہے۔'' نگاہیں ان پہ جمائے وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''اور جو تعلق ہے، وہ آپ بہتر جانتے ہیں، میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اس سڑک کے اطراف کو سیمینٹڈ (Cemented) نہیں کیا گیا اور اندر ہول چھوڑ دیے گئے ہیں۔ وہ کون سا مسئلہ ہوگا جو سب سے پہلے چند دن میں منظر عام پہ آئے گا باقر صاحب؟''

نجمی صاحب کو بے سابقہ انداز میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ وہ اسی تابع داری سے بولے۔

''ڈرینج کا مسئلہ میم!''

''بالکل! ڈرینج کا مسئلہ۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ کون سا ہوگا؟ انسپکشن کا مسئلہ۔ چار انسپکشن ٹیمیں ان تینوں پروجیکٹس کو چند روپے رشوت لے کر اپروو کر چکی ہیں، لیکن وہ کیا ہے نجمی صاحب! کہ جو ہمارا میڈیا ہے نا، وہ ذرا سی ریٹنگ کے لیے ایسی ایسی خبروں کو خوب اچھالتا ہے اور یوں اس وینڈر کی ساکھ تباہ ہو کر رہ جاتی ہے، بالخصوص تب جب ان کے ہاتھ ڈاکومنٹڈ پروف بھی لگ جائے۔ باقر صاحب!''

اس نے انگلی سے اشارہ کیا تو باقر صاحب نے چند کاغذات میز پہ رکھے نجمی صاحب ان کو اٹھانے کے لیے آگے نہیں بڑھے۔ وہ بمشکل ضبط کرتے ہوئے بولے۔

''مجھ پہ ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں ہے۔''

''ارے!'' اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت ابھری۔ ''آپ کی بات کس نے کی؟'' پھر وہ ذرا سا مسکرائی۔ ''میں تو اپنی سپلائی کی بات کر رہی تھی۔ کل ہفتہ ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ سوموار کی صبح مجھے اپنی کنسٹرکشن سائٹ پہ سپلائی کی بحالی کی خبر مل جائے گی۔'' اپنا پرس اٹھاتے ہوئے وہ کھڑی ہوئی۔

''اور وہ بھی میری پرانی قیمت پہ۔ چلیں باقر صاحب!''

وہ مزید کچھ کہے بنا پلٹی اور میجر عمر صاحب نے ہاتھ آگے بڑھا کر دروازہ کھولا۔ وہ ان ہی سبک قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔

سگریٹ نے نجمی صاحب کی انگلی کو جلایا تو وہ چونکے، پھر غصے سے اسے ایش ٹرے میں پھینکا اور میز پر رکھے کاغذات اٹھائے۔

جیسے جیسے وہ انہیں پڑھتے جا رہے تھے، ان کی پیشانی پہ پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

''مجھے آپ کو ایک اچھی خبر دینی تھی جنٹلمین!'' میٹنگ کے آغاز پہ اس نے مسرور و مطمئن انداز میں انہیں مخاطب کیا جو اپنے سابقہ رویے کو برقرار رکھے اس کی طرف متوجہ تھے۔

''ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ وینڈر عارف نجمی نے سپلائی بحال کر دی ہے اور وہ بھی پرانی قیمت پہ۔''

''واقعی؟'' فرقان تایا حیران ہوئے تو زاہد چچا سیدھے ہو بیٹھے۔

''مگر اس نے تو اس روز فنانس ڈیپارٹمنٹ کے رؤف صاحب سے خاصی بدتمیزی کی تھی اور وہ سراسر بلیک میلنگ پہ اترا ہوا تھا۔ میں نے خود اسے فون کیا تھا مگر وہ تو سیدھے منہ بات کرنے کا روادار بھی نہیں تھا۔''

''پھر آپ کو بلیک میلرز سے نمٹنے کا فن سیکھ لینا چاہیے سر! کیونکہ میں نے اس سے بات کی ہے اور وہ غیر مشروط طور پہ سپلائی بحال کرنے پر راضی ہو گیا ہے۔''

زاہد چچا خاموش ہو گئے۔ ان کے لیے یہ سب خاصا غیر متوقع تھا۔ اگر سلیمان صاحب ان کو آ کر بتاتے کہ انہوں نے وینڈر کو راضی کر لیا ہے تو انہیں حیرانی نہ ہوتی، کیونکہ وہ اس قابل تھے، تب ہی تو اپنے بڑے بھائی سے زیادہ مضبوط شیئر ہولڈر اور ایم ڈی تھے، مگر حیا.....؟ یہ بات نگلنا بھی دشوار تھا۔

''آپ کو گرین ہاؤس اسکیم کے لیے بجٹ کم پڑ رہا تھا، اس لیے میں نے بجٹ کو ری شیپ کیا ہے۔'' وہ اپنے کاغذات آگے پلٹ کر بتانے لگی۔ ''ہمیں جتنی رقم چاہیے، وہ ہمارے بجٹ کے اندر ہی پوری ہو سکتی ہے، اگر ہم فالتو لوازمات کو نکال دیں۔''

''مطلب؟'' تایا فرقان نے ابرو اٹھائے۔

''ہم ہر سال تمام شیئر ہولڈرز کو سالانہ پروفٹ کا ایک منقسم حصہ دیتے ہیں، جبکہ بہت سی کمپنیاں شیئر ہولڈرز کو سالانہ پروفٹ dividend دینے کے بجائے اس کو ری انویسٹ کرتی ہیں۔ ہم بھی اس دفعہ شیئر ہولڈرز کو وہ حصہ دینے کے بجائے اسے اس پروجیکٹ میں لگا دیں گے۔''

''مگر اس طرح تو مطلوبہ رقم پوری نہیں ہو گی۔''

''ولید! آپ ان کو بات مکمل کرنے دیں۔'' سیٹھی صاحب نے پہلی دفعہ ولید کو ٹوکا۔ پہلی دفعہ بورڈ میٹنگ میں اس کی سائیڈ لی گئی تھی۔ سب خاموش ہوئے تو اس نے کہنا شروع کیا۔

''ہم اپنے بجٹ کا پندرہ سے بیس فیصد حصہ مارکیٹنگ اور ایڈورٹائزمنٹ پر خرچ کرتے ہیں۔ ہم فی الحال بھی یہی کر رہے ہیں۔ ہم مارکیٹنگ کر رہے ہیں تاکہ مستقبل میں ہمیں پروجیکٹس ملیں۔'' وہ لمحے بھر کو رکی۔ لمبی میز کے گرد موجود تمام ایگزیکٹیوز اب واقعتاً بغور اسے سن رہے تھے۔

''مستقبل کے پروجیکٹس جو ابھی ملے نہیں اور جن پہ کام کرنے کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں، ان کے لیے ہم اپنے حالیہ پروجیکٹ کو قربان نہیں کر سکتے۔ میں نے مارکیٹنگ بجٹ کو گھٹا کر پانچ فیصد کر دیا ہے۔ یوں ہم بہ آسانی وہ رقم آہستہ آہستہ اس پروجیکٹ میں منتقل

کر سکتے ہیں۔ کیا کسی کو کوئی اعتراض ہے؟"

پیچھے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے اس نے ذرا مسکرا کر خاموش پڑے کانفرنس روم پہ نگاہ دوڑائی۔ وہ جانتی تھی کہ اب کوئی اس پہ اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنا انتخاب درست ثابت کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج تایا فرقان کے گھر حیا کے دادا کی برسی کی قرآن خوانی تھی۔ خیرات کی دیگیں الگ تھیں۔ سب مدعو تھے، سوائے اس کے۔ اس کو جانے کی خواہش بھی نہیں تھی۔

وہ مغرب پڑھ کر لاؤنج میں آئی تو فاطمہ، جہان سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

"اچھا! میں جا رہی ہوں۔" سرسری سا مطلع کر کے وہ باہر نکل گئیں۔ پھپھو پہلے ہی جا چکی تھیں۔ ابا کمرے میں سو رہے تھے۔ ان کے پاس نرس تھی۔

وہ خاموشی سے صوفے پہ آ بیٹھی اور ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا۔ انکھیوں سے اس نے لاؤنج کی بڑی کھڑکی کے پار اماں کو لان عبور کرتے دیکھا۔ وہ اس سے ناراض نہیں تھیں، بات بھی ٹھیک سے کرتیں، مگر ایسے جیسے کہ انہیں بہت دکھ پہنچایا گیا ہو۔

باہر بجلی زور کی چمکی۔ پل بھر کو کھڑکیوں کے باہر سارا لان روشن ہو گیا۔ پھر اندھیرا چھا گیا۔

وہ کچھ سوچتے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھا۔ حیا نے ٹی وی نہیں چلایا۔ وہ ریموٹ پکڑے بیٹھی بس اس کو دیکھتی رہی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا شاید۔

"اماں کیا کہہ رہی تھیں؟" اس نے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ جہان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ نیلی جینز پہ سیاہ ٹی شرٹ پہنے، گیلے بالوں کو پیچھے کیے، وہ جیسے کہیں جانے کے لیے تیار لگ رہا تھا۔

"وہ چاہتی ہیں کہ میں تمہیں سمجھاؤں کہ تم یہ برقع وغیرہ چھوڑ دو۔" وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔ اس کی پشت پہ لاؤنج کی دیوار گیر کھڑکی پہ ٹپ ٹپ قطرے گرنے لگے تھے۔ تاریک پڑا آسمان پہلے ہی بادلوں سے ڈھک چکا تھا۔

"تو تم نے کیا کہا؟" وہ اسی طرح مطمئن سے انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی، جیسے وہ اپنے آفس میں بیٹھا کرتی تھی۔

"بات تو ٹھیک ہے ان کی۔ تم ایک برقعے کے لیے اپنے اتنے رشتے نہیں کھو سکتیں۔"

باہر بادل زور سے گرجے تھے۔ کھڑکی کے شیشوں پہ تڑاتڑ گرتے قطروں کی اب آوازیں آنے لگی تھیں۔

"دوسروں کو چھوڑو، تم اپنی بات کرو جہان۔ کیا تم بھی میرے حجاب سے خوش نہیں ہو؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تو اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"اگر میں کہوں کہ میں نہیں ہوں، تب؟ اگر میں کہوں کہ تم میرے لیے اسے چھوڑ دو، تب؟"

دور کہیں زوردار آواز آئی تھی۔ جیسے بجلی گرنے کی ہوتی ہے۔ جیسے صدمہ پہنچنے کی ہوتی ہے۔

"کیا تم مجھے چوائس دے رہے ہو؟" یکا یک اس کی آواز میں سرد مہری در آئی۔

"اگر میں کہوں، ہاں تب؟"

وہ اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی دیوار گیر کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس نے سیاہ لمبی قمیص اور چوڑی دار پہن رکھا تھا۔ بال بھی سیدھے کمر پہ گر رہے تھے۔ قمیص اور بالوں کے رنگ کا فرق غیر واضح سا تھا۔ سیاہی جس کا نہ آغاز تھا نہ اختتام۔

"مجھے کبھی کسی نے کہا تھا کہ خندق کی کوئی جنگ بنو قریظہ کے بغیر وجود میں نہیں آئی اور تب میں نے سوچا تھا کہ میرے سارے قرابت دار تو میرے ساتھ ہی ہوں گے۔" وہ بھیگتے شیشے کے پار تاریک لان کو دیکھتی کہہ رہی تھی۔

"تایا ابا، حجاب کے سب سے بڑے علم بردار، اماں جن کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ میں اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاؤں اور میرا شوہر جو روز صبح فجر پڑھنے مسجد جاتا ہے، لیکن آج مجھے پتا چلا کہ عائشے ٹھیک کہتی تھی۔ خندق کی جنگ بنو قریظہ کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔"

بارش کے ٹپ ٹپ گرتے قطرے شیشے سے لڑھک کر زمین پہ گر رہے تھے جب بجلی چمکتی تو پل بھر کو ان میں قوس قزح کے ساتوں رنگ جھلکتے اور پھر اندھیرا چھا جاتا۔ وہ صوفے سے نہیں اٹھا تھا۔ بس گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"اگر میں لوگوں کے لیے حجاب لیتی ہوتی تو لوگوں کے کہنے پہ چھوڑ بھی دیتی، لیکن میں اب نہیں چھوڑ سکتی۔" آنسو اس کی آنکھ سے ٹوٹ کر گال پہ پھسلتا گیا۔

"کیوں؟ میں یہی نہیں سمجھ پا رہا کہ آخر کیوں؟" وہ اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ بادل ابھی تک گرج رہے تھے۔

حیا نے جواب نہیں دیا۔ اس نے ایک نظر جہان کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر کونے میں رکھی منی پلانٹ کی سبز بوتل اٹھائی۔ پودے کی بیل جھٹک کر نکال پھینکی اور بوتل کو ہاتھ سے پکڑے ہوئے دیوار پہ مارا۔ کانچ ٹوٹا۔ ٹکڑے گرتے گئے اور ایک نوک دار بڑا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔

"یہ پکڑو۔" اس نے بوتل کی گردن کا وہ ٹکڑا جہان کی طرف بڑھایا۔ "اور جا کر اپنی ماں کی گردن اتار دو۔"

"حیا!" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ حیا نے افسوس سے سر نفی میں ہلایا اور آخری ٹکڑا باقی ماندہ کرچیوں پہ پھینک دیا۔

"نہیں کر سکتے نا؟ کانپ اٹھتا ہے نا دل؟ لگتا ہے نا جیسے آسمان پھٹ پڑے گا اگر تم نے ایسا سوچا بھی؟" اس نے گردن موڑ کر بھیگی آنکھوں سے باہر برستی موسلا دھار بارش کو دیکھا۔

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔" وہ بولی تو اس کی آواز آنسوؤں سے بھاری تھی۔ "مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے جہان! اللہ نے امانت کو آسمان و زمین پہ پیش کیا تھا، مگر دونوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور اسے انسان نے اٹھا لیا تھا۔ تمہاری ماں، ایک انسانی جان تم پہ امانت ہے۔ ایسے ہی مجھ پہ میرا وعدہ امانت ہے۔ میں نے زندگی میں بس، ایک دفعہ کوئی وعدہ کیا اللہ تعالیٰ سے۔ کوئی مجھے اسے نبھانے کیوں نہیں دیتا؟"

بجلی نے اپنی چاندنی پھر سے ہر سو بکھیر دی۔ بس لمحے بھر کی چاندنی اور پھر...... اندھیری رات چھا گئی۔

"مجھے کسی نے کہا تھا کہ دل مارے بغیر نور نہیں ملتا اور میں سوچتی تھی کہ نور کیا ہوتا ہے؟ جانتے ہو نور کیا ہوتا ہے؟" آنسوؤں نے گلے میں پھندا ڈال دیا تھا، دم گھوٹنے والا پھندا۔

"نور قرآن ہوتا ہے۔ اللہ کا حکم جس کو پورے کا پورا لیا جاتا ہے۔ ایک حصہ لے کر دوسرے سے انکار نہیں کیا جاتا جہان! میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ اللہ کیوں کہتا ہے کہ اگر وہ قرآن کو پہاڑ پہ نازل کرتا تو وہ ٹوٹ جاتا۔ مجھے کبھی اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ مگر آج آ گئی ہے۔"

گرم، ابلتے آنسو اس کی ٹھوڑی سے پھسلتے ہوئے، گردن تک لڑھک رہے تھے۔ وہ کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی اور وہ اسے۔

"جانتے ہو پہاڑ کیوں ٹوٹتا؟ کیونکہ وہ قرآن کو پورے کا پورا لیتا...... اور جو شخص قرآن کو پورے کا پورا اپنے دل پہ اتارتا ہے نا، اسے ایک بار تو ٹوٹنا پڑتا ہے۔" اس نے جلتی آنکھیں بند کیں۔ اب ہر طرف اندھیرا تھا۔ پل بھر کو بجلی چمکی بھی تو اسے پروا نہیں تھی۔

"لوگوں نے مجھے اس لیے چھوڑا، کیونکہ میں نے اللہ کو نہیں چھوڑا...... تو مجھے واقعی ایسے لوگوں کا ساتھ نہیں چاہیے۔"

اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ واپس پلٹ رہا تھا۔ اس نے دھندلی بصارت سے گردن موڑ کر اس شخص کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا، جس سے اس کی زندگی کا ایک حصہ محبت کرنے میں گزرا تھا۔ وہ اوپر چلا گیا، مگر حیا اسی طرح سیڑھیوں کو دیکھتی رہی۔

چند منٹ بعد وہ اترتا دکھائی دیا۔ اس کا دستی بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بنا اس کی طرف دیکھے، بنا کچھ کہے، باہر نکل گیا۔ اس نے اسے نہیں روکا، آواز تک نہیں دی۔ دے ہی نہیں سکی۔ آنسوؤں نے ہر راستہ روک دیا۔ وہ جا رہا تھا۔ وہ جانے کے لیے ہی تو آیا تھا۔

✿......✿......✿

باب 10

وہ جا رہا تھا۔ وہ جانے کے لیے ہی تو آیا تھا۔

اس نے بھیگا چہرہ کھڑکی کی طرف موڑا۔ وہ اب اسے تیز بارش میں سبک قدموں سے لان عبور کرتا نظر آ رہا تھا۔ بوچھاڑ اسے بھگو رہی تھی مگر اس نے اس سے بچنے کو اپنے سر پر کچھ بھی نہیں تانا تھا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر وہ لمحے بھر کو رکا اور پلٹ کر دیکھا۔

حیا کا دل ڈوب کر ابھرا۔ رُخسار پہ بہتے گرم آنسو مزید تیزی سے نیچے لڑھکنے لگے۔ جہان نے آخری بار پلٹ کر اسے نہیں بلکہ اوپر اپنی ماں کے کمرے کی کھڑکی کو دیکھا تھا، چونکہ پھپھو ادھر نہیں تھیں، سو اگلے ہی پل جہان نے گردن ذرا سی تایا فرقان کے گھر کھلنے والے درمیانی دروازے کی طرف موڑی اس کی ماں وہاں تھی۔

اسے اب بھی صرف اپنی ماں کی فکر تھی۔ پھر وہ مڑا اور گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ حیا پلٹنے لگی، تب ہی اس کو باہر درمیانی دروازے کی اوٹ میں کچھ غائب ہوتا دکھائی دیا۔ گلابی اور پیلا آنچل۔ ارم کا دوپٹہ جو وہ پہچانتی تھی۔ یقیناً ارم ادھر آئی تھی اور وہ سب سن چکی ہوگی۔ اس نے گہری، تھکی تھکی سی سانس اندر کو کھینچی۔

ارم کس سلسلے میں ادھر آئی تھی، وہ نہیں جانتی تھی، نہ ہی یہ کہ جہان نے اسے دیکھا تھا یا نہیں، مگر وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ واپس جا کر وہ تمام رشتے داروں کے بیچ کھڑے ہو کر سارا قصہ مزے سے دُہرا دے گی۔ قرآن خوانی کی تقریب میں گویا رنگ بھر جائے گا۔

گوسپ کا ایک نیا موضوع۔

لاؤنج میں دروازہ اماں پورا بند کر کے نہیں گئی تھیں، سو اسے یہ خام خیالی ہرگز نہ تھی کہ ارم نے کچھ نہ سنا ہوگا۔ بس چند ہی منٹ بعد پورے خاندان کو پتا چل جائے گا کہ حیا نے جہان کو گنوا دیا ہے۔ وہ حیا کے پردے سے تنگ آ کر اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

وہ تھکے تھکے سے انداز میں واپس صوفے پہ آ گری۔ کھڑکی کے ساتھ سبز بوتل کی کرچیاں ابھی تک بکھری تھیں۔ اس میں انہیں اُٹھانے کی ہمت نہیں کی۔ اس میں ابھی کسی شے کی ہمت نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ارم ہی تھی اور اس نے وہی کیا جو حیا نے سوچا تھا۔ فاطمہ واپس آئیں تو سخت متاسف تھیں۔ وہ سبین پھپھو کی بات سن ہی نہیں رہی تھیں جو بار بار کہہ رہی تھیں۔

"بھابھی! وہ اس وجہ سے نہیں گیا، اس نے صبح مجھے بتا دیا تھا کہ وہ آج چلا جائے گا۔ اس نے ویسے ہی چلے جانا تھا۔"

پھپھو کو ارم سے بھی شکوہ تھا۔ انہوں نے ارم کو ہلکا سا ڈانٹ بھی دیا تھا کہ وہ غلط بات نہ کرے مگر فاطمہ کا انداز بتا رہا تھا کہ انہیں یقین نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی اس سب کا ذمہ دار تھا تو وہ حیا تھی جس نے اپنی "ضد" کے پیچھے سب کچھ کھو دیا تھا۔

جب تایا نے اسے بے عزت کر کے گھر سے نکالا تھا، تب وہ روئی تھی لیکن جب جہان چلا گیا تو اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے تھے۔

خندق کی جنگ میں صرف بنو قریظہ تو نہیں ہوتا نا۔ اس میں جاڑے کی سختی بھی ہوتی ہے، وہ سردی اور خشکی جو لوگوں کے رویوں میں در آتی ہے۔ رشتے سرد مہر ہو جاتے ہیں اور اس میں بھوک کی تنگی بھی ہوتی ہے۔ معاشی دباؤ اور فکر بھی ہوتی ہے۔ وہ اب پروا کیے بنا کان لپیٹے اماں کی ساری باتیں سنتی رہتی اور آگے نکل جاتی۔ آفس میں البتہ اب رویہ ذرا بدلا تھا۔ اس کی بات سنی جاتی تھی، کبھی کبھار تائید بھی ہو جاتی۔ وہ کاریڈور میں چل کر جا رہی ہوتی یا لفٹ کے انتظار میں کھڑی ہوتی، لوگ ادھر اُدھر ہٹ جاتے۔ اس کے لیے رستہ چھوڑ دیتے۔ اس کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

ہیڈ آرکیٹیکٹ رضوان بیگ کو اس نے اگلے ہی روز اپنے آفس میں بلایا تھا۔

"بیٹھیے۔" اپنے مخصوص انداز میں پاور سیٹ پہ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے، اس نے ہاتھ سے سامنے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے البتہ ان کے چہرے پہ ذرا اُلجھن تھی۔

"کچھ پئیں گے؟"

''کافی ٹھیک رہے گی!''

''ظہیر!'' اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔

''ایک اچھی کڑوی سی بلیک کافی اندر بھیجیں، بغیر چینی کے!''

رضوان صاحب ذرا چونکے۔ ریسیور رکھ کر وہ واپس کرسی پہ پیچھے ہو کر بیٹھی اور سنجیدگی سے ان کو دیکھا۔

''بیگ صاحب! ادھر آپ نے کون سی ملٹی اسٹوری پارکنگ دیکھ لی جو آپ کو لگا کہ اس ٹریڈ سینٹر میں اسے ہونا چاہیے؟''

''میرا خیال تھا کہ وہ ایک منفرد آئیڈیا ہے۔ جس میں کم جگہ پر ایک بہت بڑی پارکنگ بن سکتی تھی۔''

''آپ کے ساتھ اور کس کا خیال تھا یہ؟''

رضوان صاحب نے ابرو اٹھائی۔

''آپ مجھ پہ الزام لگا رہی ہیں؟'' بنا گھبرائے وہ قدرے ناگواری سے بولے۔

''بیگ صاحب! آواز نیچی رکھ کر بات کریں کیونکہ آپ کے پارٹنر نے ایک دو جگہ بہت فخر سے آپ کا اور اپنا کارنامہ بیان کیا ہے، میں تو پھر آپ سے بند کمرے میں پوچھ رہی ہوں۔''

''میرا کوئی پارٹنر نہیں ہے، یہ دھمکیاں آپ کسی اور کو دیں۔ ایک عمر گزری ہے کارپوریٹ ورلڈ میں، آپ کی طرح وراثت میں کرسی نہیں ملی۔''

استہزائیہ انداز میں کہتے وہ اٹھے۔

''اگر میرا آئیڈیا ان کو پسند نہیں آیا تو اس کی ذمہ داری ہم دونوں پر ہے۔ میں نے ڈیزائن بنایا، آپ نے پیش کیا۔ اگر کوئی مسئلہ تھا تو اس وقت آپ کی سمجھداری کدھر تھی؟ جو آپ نے تب کچھ نہیں کیا؟ اب اپنی ناکامی چھپانے کے لیے آپ مجھ پہ الزام لگا رہی ہیں۔ مائی فٹ!'' وہ سر جھٹک کر تیزی سے مڑے اور باہر نکل گئے۔

اس نے جیسے سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور فون کا ریسیور اٹھایا۔ ایک نمبر ڈائل کر کے وہ دھیرے سے بولی۔

''عمران صاحب! پورے آفس میں موبائل جیمر آن کر دیں جیسا کہ ہم نے پہلے بات کی تھی اور بیگ صاحب کے آفس فون کی ایک لائن مجھے ٹرانسفر کر دیں۔''

ریسیور واپس رکھتے ہوئے ایک طویل سانس اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے رضوان بیگ کو اکسا دیا ہے۔ وہ اب پہلی کال اسے ہی کریں گے جو ان کا ساتھی تھا۔ اخلاقی حرکت تھی یا غیر اخلاقی، اسے یہی درست لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

سمندری بگلے ساحل کنارے پھڑ پھڑاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ نیلا، خوب صورت باسفورس آج صبح بہت ہی پرسکون تھا۔ وہ ہاربر کے قریب سڑک پر ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کی توجہ سمندر کی طرف تھی، نہ موسم کی جانب، وہ قدرے تشویش کے عالم میں ایک ہاتھ سے موبائل پہ نمبر ملا رہا تھا جب سلسلہ ملا تو اس نے فون کان سے لگایا۔

''ہاں بولو سفیر! کیا مسئلہ ہوا ہے؟'' دوسری جانب سے آواز سن کر وہ بھنویں سکیڑ کر بولا تھا۔

''عبدالرحمٰن بھائی! میں نے بہت کوشش کی مگر معاملہ میرے ہاتھ سے باہر ہے۔ میں.....''

''سفیر! مجھے تمہید سے نفرت ہے۔ سیدھی بات کرو۔'' وہ ذرا بےزاری سے بات کاٹ کر بولا تھا۔ کار کی رفتار اس نے قدرے آہستہ کر دی تھی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب پوری طرح فون کی طرف متوجہ تھے۔

''بھائی! میں..... اصل میں بہارے مسئلہ کر رہی ہے۔ اس نے پہلے ہمیں کہا کہ وہ آخری فلائٹ سے جائے گی، سب کے جانے کے بعد۔ اس نے سب کو راضی کر لیا کہ اسی شرط پہ وہ بغیر کوئی شور ڈالے آرام سے چلی جائے گی۔''

''پھر، وہ نہیں جا رہی؟'' اس نے بمشکل اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''صرف یہی نہیں، اس نے اپنا پاسپورٹ بھی جلا دیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ جب تک آپ نہیں آئیں گے اس کے پاس، وہ نہیں جائے گی۔''

بہارے، عائشے اور آنے کے جانے کے بعد عثمان شبیر کے گھر پہ تھی اور وہ یقیناً وہیں اسے بلا رہی تھی۔

"سفیر! میں نے تمہیں ایک کام کہا تھا، وہ بھی تم سے نہیں ہوا۔ بہت اچھے!" وہ برہمی سے گویا ہوا۔

"سوری بھائی!" وہ نادم تھا۔

"پھر آپ کب آئیں گے؟"

"میں کیوں آؤں گا؟ اتنا فارغ ہوں میں کہ ایک ضدی بچے کی مرضی پہ چلا آؤں؟ اسے بولو، اس نے جانا ہے تو جائے نہیں تو نہ جائے۔ مجھے پروا نہیں ہے اور سنو! اب اتنی غیر اہم باتوں کے لیے مجھے تنگ مت کرنا۔" قریباً جھڑکتے ہوئے اس نے فون بند کیا اور ڈیش بورڈ پہ ڈال دیا۔

مسائل پہلے کم تھے جو یہ ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ اب اس کا پاسپورٹ پھر سے بنوانا پڑے گا۔ اور یہ بہارے کی شرائط...... ذرا ایک دو کام کرلے پھر نپٹے گا وہ اس ٹانگ برابر لڑکی سے۔

ناگواری سے سر جھٹکتے ہوئے اس نے سوچا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے میں پھر سے درد اٹھنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ لاؤنج میں صوفے پہ پیر اوپر کیے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دیسلین کی ڈبی تھی، جس میں سے وہ دو انگلیوں پہ کریم نکال کر ایڑیوں پہ مل رہی تھی۔ فاطمہ اور سبین شام کی چائے پی کر ابھی ابھی اٹھی تھیں۔ ارم کے سسرال والے آئے تھے، شادی کی تاریخ رکھی جا رہی تھی، سو ان کا وہاں ہونا ضروری تھا۔ حیا کا دل بھی نہیں چاہا کہ وہ وہاں ان کے ساتھ ہو جائے، وہ بہت پتھر دل ہو گئی تھی، یا بہت مضبوط، جو دل پہ لگنے والی چوٹوں کو سہنا سیکھ گئی تھی۔

دروازہ ہولے سے بجا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سونیا دروازے میں کھڑی تھی۔

"بھابھی! آیئے، پلیز۔" وہ خوشگوار حیرت سے مسکراتی اٹھی اور دیسلین کی ڈبی بند کر کے میز پر رکھی۔

"تھینکس!" سونیا خوش دلی سے مسکراتی صوفے پہ آ بیٹھی۔ حیا نے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر ہاتھ پونچھے اور اس کے قریب آ بیٹھی۔

سونیا بظاہر مسکرا رہی تھی مگر اس کے انداز میں قدرے ہچکچاہٹ تھی، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر متذبذب ہو۔

"کہیے بھابھی؟" وہ بغور اس کو دیکھ رہی تھی۔

"اصل میں حیا! میں تمہیں لینے آئی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم آ کر ابا سے معافی مانگ لو، ان کی ناراضی دور ہو جائے گی اور ہم سب پھر سے ساتھ مل کر بیٹھ سکیں گے۔ دیکھو، اب سب ادھر ہیں، مگر تمہاری کمی پھر بھی محسوس ہو رہی ہے۔"

حیا نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ آفس سیٹ پہ بیٹھ کر جس طرح وہ معاملات کا تجزیہ کرتی تھی، ویسے ہی اس کے دماغ نے فوراً کڑیاں ملانی شروع کیں۔ ظفر اور دوسرے ملازموں کے ہوتے ہوئے بھی مہمانوں کی آمد پہ تائی سارا کام سونیا سے کرواتی تھیں۔ اس کو لمحے بھر کی بھی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ سو یہ تو طے تھا کہ وہ خود سے یعنی تائی سے چھپ کر نہیں آئی تھی، مطلب اسے تائی نے ہی بھیجا تھا۔ تاکہ وہ حیا کو جھکا سکیں اور ان کی انا کی تسکین ہو سکے۔ دوسری طرف اسے "معاف" کر کے تایا اور تائی ایثار اور عظمت کا پرچم بلند کریں گے۔ زبردست۔

"میں تیار ہوں بھابھی!" وہ بولی تو اس کا لہجہ بے تاثر تھا۔ "میں تایا ابا سے ہر اس وقت کی معافی مانگنے کو تیار ہوں جب میں نے ان کا دل دکھایا، جب میں نے کوئی گستاخی کی یا مجھ سے کوئی بدتمیزی سرزد ہوئی۔ ان سے کہیے میں پوری دنیا کے سامنے معافی مانگنے پہ تیار ہوں۔ وہ بڑے ہیں، میں چھوٹی۔ مجھے جھکنا چاہیے، میں جھک جاؤں گی، لیکن...... لیکن بھابھی! تایا ابا نے ایک شرط رکھی تھی۔"

وہ لمحے بھر کو رکی۔

"اور وہ شرط یہ تھی کہ میں ان کے گھر ان کے بیٹوں سے منہ لپیٹے بغیر داخل ہوں گی، ورنہ نہیں ہوں گی۔ میں ان کی اس بات کا بھی مان رکھوں گی۔ میں ہر بات کی معافی مانگ لوں گی، سوائے اپنے حجاب کے۔ یہاں میں ٹھیک ہوں، وہ غلط ہیں۔ میں ان کے گھر میں داخل نہیں ہوں گی۔ یہ بات آپ ان کو بتا دیں۔"

"حیا!" سونیا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ "اب اتنا بھی کیا پردہ؟ دیکھو اس دن ڈاکٹر ذاکر نائیک کہہ رہے تھے کہ......"

"بھابھی پلیز، کوئی میرے حق میں بات کرے یا خلاف، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہت سی لڑکیاں صرف اسکارف لیتی ہیں، چہرہ نہیں

و علتیں کیونکہ انہوں نے اللہ سے اتنا ہی وعدہ کیا ہوتا ہے۔ سو جتنا وہ کرتی ہیں، اس پہ قائم رہتی ہیں، اس سے نیچے نہیں جاتیں۔ میں نے بھی ایک وعدہ کیا تھا کہ جو حکم سن لوں گی اور اس پہ دل کھل جائے گا، اسے اپنا لوں گی۔ اب میرا دل نقاب کے لیے کھل چکا ہے۔ پلیز مجھے اسے نبھانے دیں۔"

وہ بات کرنے کے ساتھ ساتھ ایڑی پہ لگائی چکنائی کو انگلیوں سے مل بھی رہی تھی۔ ذرا سی سخت پڑی ایڑی اس کی پوروں کو کھردری محسوس ہو رہی تھی۔

"دیکھو! تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر حیا! تم جانتی ہو پورا خاندان باتیں بنا رہا ہے کہ جہان تمہیں صرف اس لیے ٹھکرا کر گیا ہے کیونکہ تم نے اپنی دقیانوسی ضد نہیں چھوڑی۔"

"بھابھی! جب ارم نے یہ بات سرعام کہی تھی، تب پھپھو نے یہ کہا تھا کہ وہ صرف اپنی چھٹی ختم ہونے پہ واپس گیا ہے مگر لوگوں نے ان کی بات پہ یقین نہیں کیا۔ انہوں نے ارم کی بات پہ یقین کیا۔ لوگ اسی بات پہ یقین کرتے ہیں جس پہ وہ یقین کرنا چاہتے ہیں۔"

ساری کریم ایڑی میں جذب ہو گئی تھی، اس نے میز پہ رکھی ڈبی کھولی۔ انگلی اندر ڈال کر پورے پہ ذرا سی ویسلین نکالی اور پھر سے کھردری ایڑی پہ لگانے لگی۔

"اور اگر جہان نے واقعی تمہیں اسی وجہ سے چھوڑا ہو، تب تم کیا کرو گی؟" وہ جیسے بہت فرصت سے اسے سمجھانے آئی تھی۔ یقیناً اسے بھیجا گیا تھا۔

"بھابھی! یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے، جسے ہم ہینڈل کر لیں گے۔ میں نیکسٹ ویک ترکی جا رہی ہوں نا، بات کر لوں گی اس سے۔ پورے خاندان کو اس بات کی کیوں اتنی فکر ہے، میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔" وہ غصے سے نہیں بلکہ بہت نرمی سے ہموار لہجے میں بول رہی تھی۔ بات کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی انگلیاں ایڑی کا مساج بدستور کر رہی تھیں۔

"مگر حیا! تم یہ بھی تو دیکھو کہ کزنز سے پردہ کون کرتا ہے۔ میری ایک فرینڈ کا تعلق بہت سخت قسم کی پٹھان فیملی سے ہے مگر ان کے ہاں بھی کزنز سے چہرے کا پردہ نہیں کیا جاتا۔ ٹھیک ہے، وہ سب اسلام کا حصہ ہے مگر اب اس سب کو دقیانوسی سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔"

اس نے بہت دکھ سے سونیا کو دیکھا۔

"اگر میرے اور آپ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج ہمارے سامنے ہوتے تو کیا ان کی موجودگی میں بھی آپ یہی بات کہہ سکتیں؟"

سونیا ایک دم بالکل چپ ہو گئی۔

"بتائیں نا بھابھی! ان کے سامنے آپ سے پوچھا جاتا تو آپ ان کے بتائے ہوئے اصولوں کو سپورٹ کرتیں یا اپنے ساس سسر کو؟"

سونیا نے لب کھولے، مگر کچھ نہیں کہہ سکی۔ اس کے پاس سارے الفاظ ختم ہو گئے تھے۔ حیا نے ڈبی سے ذرا سی مزید ویسلین نکالی اور دوسری ایڑی پہ دھیرے دھیرے رگڑتے ہوئے بولی۔

"کیا آپ جانتی ہیں کہ داور بھائی پہلے مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے؟" سونیا کی آنکھیں حیرت سے ذرا سی کھلیں۔ دھیرے سے اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"بالکل ایسے جیسے فرخ کچھ عرصہ پہلے تک مجھ سے شادی کے لیے تائی اماں کو تنگ کرتا رہا ہے، ویسے ہی داور بھائی نے بھی بہت اصرار کیا تھا۔ یہ بات میں نے تائی کے منہ سے آپ کی شادی سے دو روز قبل سنی تھی۔ جانتی ہیں داور بھائی ایسا کیوں چاہتے تھے؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔ وہ بس بنا پلک جھپکے شاک کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیونکہ میں ہمیشہ بہت تیار رہا کرتی تھی۔ اب بھی رہتی ہوں۔ میری کپڑے، جوتے، بال، ناخن...... میں ہر چیز آج بھی اتنی ہی تراش خراش کر سیٹ رکھتی ہوں جتنا پہلے رکھتی تھی۔ فرق بس اتنا ہے کہ اب میں باہر نکلتے ہوئے خود کو ڈھک لیتی ہوں۔ جانتی ہیں اس سے کیا ہوتا ہے؟ بس اتنا کہ دوسری عورتوں کے شوہر میری طرف متوجہ نہیں ہوتے اور یوں اپنی بیوی سے ناخوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں رہتی ان کے پاس۔"

ایڑی میں ساری چکنائی جذب ہو چکی تھی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح کھردری تھی مگر وہ جانتی تھی کہ یہ چکنائی ایک دم سے اثر نہیں کرتی۔ آہستہ آہستہ وہ کھردرے پن کو نرم کرے گی اور یوں پھٹی ہوئی جلد ویسی ہو جائے گی جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔

"کیا آپ اب بھی مجھے غلط سمجھتی ہیں؟" ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے بہت اطمینان سے دیکھا۔ وہ جو بالکل گم صم سی بیٹھی

تھی۔ کچھ کہے بنا اُٹھ کھڑی ہوئی۔

حیا نے دور تک سونیا کو جاتے دیکھا اور پھر اپنی چھلی ایڑیوں کو۔ آہستہ آہستہ یہ زخم پڑ جائیں گی۔ وہ جانتی تھی کچھ چیزیں کافی وقت لیا کرتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

اس دن اس سے صرف اتنی غلطی ہوئی کہ وہ بغیر بتائے زارا سے ملنے چلی آئی تھی۔ آج آفس میں زیادہ کام نہیں تھا، ویسے بھی ہافر صاحب کو وہ اپنی ٹاپ Heirarchy کو از سرِ نو تشکیل دے کر نگرانی بنا چکی تھی، سو اس پہ کام کا بوجھ ذرا کم تھا۔ فراغت ملی تو سوچا زارا سے مل لے۔ پانچ جولائی آ کر گزر بھی چکی تھی۔ اب اس کو اسی ہفتے واپس ترکی جا کر کلیئرنس کروانی تھی انہی سوچوں میں غلطاں وہ اس کے گھر آئی۔

''زارا اندر کمرے میں ہے، فارینہ وغیرہ آئی ہوئی ہیں۔ تم اندر چلی جاؤ۔'' زارا کی ممی اسے دروازے پہ ہی مل گئیں۔ وہ کہیں جانے کے لیے نکل رہی تھیں۔ خوش اخلاقی سے بتا کر وہ باہر نکل گئیں۔ وہ سر ہلا کر اندر آ گئی۔

زارا کا کمرا کاریڈور کے آخری سرے پہ تھا۔ گھر میں خاموشی تھی۔ کمرے سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ فارینہ اور مشال کی آوازیں، ان کی کلاس فیلوز اور فرینڈز، وہ یقیناً اچھے وقت پہ آئی تھی۔ ان سے بھی مل لے گی۔ یہی سوچ کر وہ چند قدم آگے آئی مگر اس سے پہلے کہ مانوسیت پیدا کرنے کے لیے کوئی آواز دیتی اَدھ کھلے دروازے سے آتی آوازوں نے اسے روک دیا۔

''حیا کو مت بلانا پلیز!'' بے زاری سے بولتی وہ زارا تھی۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹتی دیوار سے جا لگی۔ سانس بالکل رک گئے۔ وہ اب ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

''کیا یار! اکٹھے ہو جائیں گے تو مزا آئے گا نا۔'' فارینہ ذرا حیران ہوئی۔

''تم اس سے ملی نہیں ہو نا ترکی سے واپسی پہ، اسی لیے کہہ رہی ہو۔ ورنہ وہ اتنی بور ہو گئی ہے کہ کوئی حد نہیں۔ تمہیں پتا ہے اس نے برقع پہننا شروع کر دیا ہے۔ اینڈ آئی مین رئیل برقع!'' وہ 'رئیل' پہ زور دے کر جیسے بے یقینی کا اظہار کر رہی تھی۔

''برقع؟'' ''ڈونٹ ٹیل می زارا!''

''ہاں، میں نے اسے بولا تم ترکی سے آئی ہو یا عمرے سے۔''

''یہ جھوٹ تھا۔ زارا نے کبھی اسے ایسے نہیں کہا تھا۔ وہ دم ساد ھے سنے گئی۔

''میں اس کا وہ کالا طالبان والا برقع نہیں برداشت کر سکتی۔ پلیز اسے کال مت کرنا۔ اسے دیکھ کر میرا دم گھٹتا ہے۔ پتا نہیں اپنا کیا حال ہوتا ہوگا۔''

''خیر! حیا کو میں جتنا جانتی ہوں، اس لحاظ سے اس نے برقع بھی ڈیزائنر لیا ہوگا، برانڈڈ برقع۔ شاید فیشن میں کر رہی ہو۔''

اب مزید کھڑے ہونا خود کو ذلیل کرنا تھا۔ وہ بنا چاپ پیدا کیے واپس پلٹ گئی۔ باہر گیٹ کیپر کے قریب وہ رکی تھی۔

''زارا کو بتا دینا کہ میں آئی تھی مگر جا رہی ہوں۔ وجہ پوچھیں تو کہنا انہیں معلوم ہے۔'' سختی سے دو ٹوک انداز میں کہہ کر وہ باہر کار کی طرف بڑھ گئی۔

''چلو اور کہیں دور لے جاؤ۔ میں ذرا دور جانا چاہتی ہوں۔'' پچھلی سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے اس نے تھکے تھکے انداز میں ڈرائیور سے کہا، جس نے سر ہلا کر کار اسٹارٹ کر دی۔

اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ گردن کے پچھلے حصے اور کندھوں پہ عجب دباؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ جیسے اب اعصاب تھکان کا شکار ہو رہے ہوں۔ وہ انسان ہی تھی۔ اس کی قوت برداشت اور اعصاب کی مضبوطی کی بھی ایک حد تھی۔ اس سے زیادہ پریشر وہ نہیں لے سکتی تھی۔ ہر دروازے سے دھتکارے جانا، ہر جگہ سے ٹھکرائے جانا، ہر دوست کا چھوٹ جانا، کیا مشکلات کی کوئی حد تھی؟ صبر، صبر، صبر...... انسان کتنا صبر کرے؟ ایک نقاب ہی تو کرنا شروع کیا تھا اس نے، ایک دم سے اتنے چہروں سے نقاب کیسے اُتر گئے تھے؟

ڈرائیور بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی چلاتا گیا۔ بہت دیر بعد جب اس کا سر درد سے پھٹنے لگا تو اس نے گھر چلنے کا کہا۔

ابا کمرے میں تھے۔ آج ٹیک لگا کر بیٹھے، عینک لگائے اخبار دیکھ رہے تھے۔ اس نے دروازے کی درز سے ان کو دیکھا۔ ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔ پھر وہ بنا انہیں تنگ کیے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

زارا کی باتوں نے اتنا ڈسٹرب کیا تھا کہ وہ رات کا کھانا بھی نہیں کھا سکی۔ فاطمہ نے پوچھا۔ ان کا رویہ ذرا بہتر تھا۔ آخر ماں تھیں، مگر اس نے بھوک نہ لگنے کا بہانہ کر دیا، پھر وہ اوپر چھت پہ چلی آئی۔

کین کا جھولا منڈیر سے لگا ویران پڑا تھا۔ وہ اس پہ آ بیٹھی تو ڈھیرے سے بہت سی یادیں سامنے دیوار سے لگے ابا کے گملوں کے اوپر سائے بن کر ناچنے لگیں۔ آج چاند کی روشنی کافی تیز تھی، پودوں کے پتے چمک رہے تھے۔ اسے سبانجی میں جھیل کنارے پہ چھائی چاندی کی تہہ یاد آئی اور چاندی کے مجسمے اور اسی جگہ بیٹھا وہ شخص جو خاموشی سے اس کی کہانی سنے گیا تھا، مگر اپنی نہیں سنائی تھی۔ واپس جا کر فون بھی نہیں کیا۔ وہ تھا ہی ایسا، پھر بھی وہ اس سے اُمید وابستہ کر لیتی تھی۔ پاگل تھی وہ۔

بہت دیر وہ جھولے پہ بیٹھی ابا کے گملوں کو دیکھتی رہی۔ وہ پہلے سے زیادہ مرجھا گئے تھے۔ ابا بیمار پڑے تو ملازموں نے بھی ان کا خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ منڈیر کے سامنے والی دیوار کے ساتھ رکھے تھے۔ ان کے اور منڈیر کے درمیان قریباً چار گز چوڑا صحن تھا۔ وہ چھت کا پچھلا حصہ تھا۔ ٹیرس دوسری طرف تھا۔ وہ اب ٹیرس پہ نہیں بیٹھتی تھی کہ وہاں بے پردگی ہوتی تھی سامنے گھروں میں نظر آتا تھا، اللہ، اللہ، پھر پردہ!

اس نے بددلی سے سر جھٹکا، نہیں، وہ اپنے پردے سے تنگ نہیں پڑ رہی، مگر پھر وہ بے زاری کیوں محسوس کر رہی ہے؟

اپنی سوچوں سے اُکتا کر وہ ایک دم کھڑی ہوئی اور اندر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی، مگر پھر رُک گئی۔ گملوں اور منڈیر کے درمیان کچھ تھا۔ کچھ چمکا تھا۔

''کون؟'' وہ ذرا چونکی ہو کر پیچھے ہوئی۔ ''کوئی ہے؟''

وہاں ہر طرف سناٹا تھا۔ خاموشی۔ اندھیرا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر شاید اس کا وہم ہو۔ اس نے سر جھٹک کر پھر سے قدم اندر کی جانب بڑھانے چاہے، مگر لمحے بھر کو پھر سے کچھ چمکا۔

''کون..... کون ہے؟'' وہ بالکل ساکن کھڑی پلکیں سکیڑے اس جگہ کو دیکھے گئی۔ اسے ڈر نہیں لگ رہا ہے۔ وہ بالکل بھی خوف زدہ نہیں ہے۔ اس نے خود کو بتانے کی کوشش کی، مگر فطری خوف نے اسے چھوا تھا۔ پھر بھی وہ کچھ سوچ کر آگے بڑھی۔ گملوں کی قطار کے ساتھ چلتی وہ آخری گملے تک پہنچی، جس میں لگا منی پلانٹ ڈنڈی کی مدد سے قریباً چھ فٹ اونچا کھڑا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا، مگر کچھ تھا۔ کسی احساس کے تحت وہ ذرا سی آگے ہوئی اور پھر ایک دم رُک گئی۔

''خدایا!'' وہ جیسے کرنٹ کھا کر دو قدم پیچھے ہٹی اور پھر بے یقینی سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے گردن اونچی کر کے دیکھا۔

اونچے منی پلانٹ سے لے کر چھت کی منڈیر تک ایک اَن دیکھی دیوار سی بنی تھی، مکڑی کے جالے کی دیوار۔ جیسے کسی بیڈمنٹن کورٹ میں جالی دار نیٹ لگا ہوتا ہے۔ وہ چھ فٹ اونچا اور بے حد لمبا سا جالا بے حد خوب صورت اور سحر انگیز تھا۔ اس کے تانے بانے بہت نفاست سے بنے تھے گو کہ وہ بہت پتلا تھا، پھر بھی چاند کی روشنی کسی خاص زاویے سے پڑتی تو دھنک کے ساتوں رنگ چمکتے۔

وہ اسے تحیر سے دیکھتی اُلٹے قدموں پیچھے آئی۔ اگلے ہی پل وہ اندر سیڑھیوں کے دہانے پہ غصے سے نور بانو کو پکار رہی تھی۔

''جی، جی آئی۔'' نور بانو جو کچن میں کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی، بھاگتی ہوئی باہر آئی۔

''جاؤ کوئی جھاڑو لے کر آؤ۔ اتنے جالے لگے ہیں چھت پہ۔ تم صفائی کیوں نہیں کرتیں ٹھیک سے؟'' پتا نہیں اسے کس بات پہ زیادہ غصہ چڑھا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر نور بانو بھاگتی ہوئی لمبی والی جھاڑو لیے اوپر آئی۔

''اتنا بڑا جالا یہاں بنا ہی کیسے؟'' جب نور بانو اس کے ساتھ باہر چھت پہ آئی تو وہ حیرت سے اُلجھنے سے جیسے خود سے بولی تھی۔

''حیا باجی! دیکھیں نا، یہاں کی صفائی کی ذمہ داری نسرین (جز وقتی ملازمہ) کی ہے، وہ روز چھت صاف نہیں کرتی۔ مجھے تو لگتا ہے کافی دن سے ادھر سے گزری بھی نہیں ہے۔ گزری ہوتی تو جالا نہ بنتا۔ یہ مکڑیاں جالے ادھر ہی بناتی ہیں جہاں کچھ عرصہ کچھ گزرا نہ ہو، چاہے بندہ، چاہے جھاڑو۔ جتنے اُتار لو جالے، پر کچھ روز بعد بُن لیتی ہیں۔ سدا کی کام چور ہے نسرین، ذرا سا کام نہیں ہوتا۔ یہ جالا دیکھنے میں کتنا بڑا تھا جی، مگر جھاڑو ایک دفعہ ماری اور اُتر گیا۔ اتنی سی بات تھی۔''

نور بانو جھاڑو ہوا میں اوپر نیچے مارتی جلدی جلدی وضاحتیں دے رہی تھیں۔ حیا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ وہاں سے کافی دنوں سے کوئی نہیں گزرا تھا۔ وہ بھی ادھر آتی تو جھولے پہ بیٹھ کر تھوڑی دیر بعد اندر چلی جاتی۔ اسی لیے تو جالا بنا تھا۔ اسی لیے تو جالے بنتے ہیں۔ اس کے دل میں بھی بن گئے تھے۔ اب اسے ان کو صاف کرنا تھا۔ کیسے؟ لمحے بھر بعد ہی اس کے دل نے اسے جواب دے دیا تھا۔

اب اسے صبح کا انتظار تھا۔

☆ ☆ ☆

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی ویسی ہی خوب صورت اور پُرسکون تھی جیسی وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ لہلہاتا سبزہ، کشادہ سڑکیں اور کیمپس کے سرخ اینٹوں والے بلاکس۔ کیمپس میں رش بہت کم تھا۔ وہ بنا کچھ دیکھے، سیدھی ڈاکٹر ابراہیم حسن کے آفس آئی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے ان کا نمبر مل گیا تھا اور چونکہ وہ ان کی ایک اچھی اسٹوڈنٹ تھی، اس لیے انہوں نے ملاقات کا وقت طے کر لیا تھا۔

''السلام علیکم سر!'' اجازت ملنے پہ ان کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے وہ بولی۔ وہ معمر مگر پُروقار سے استاد تھے۔ مسکراتے ہوئے اس کے لیے اُٹھے، اور ''وعلیکم السلام'' کہتے ہوئے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''بہت شکریہ آپ نے ٹائم دیا۔ میں کچھ پریشان تھی، سوچا آپ سے ڈسکس کر لوں، شاید کوئی حل نکل آئے۔'' کرسی کھینچتے ہوئے اس نے وہی بات دہرائی جو فون پہ کہی تھی۔ اپنے سیاہ عبایا اور نفاست سے لیے گئے نقاب میں وہ بہت تھکی تھکی لگ رہی تھی۔

''شیور۔ آپ بتائیے اور چائے لیں گی یا.....؟''

''نہیں نہیں سر! پلیز، کچھ بھی نہیں۔ بس میں بولنا چاہتی ہوں۔ مجھے ایک سامع چاہیے۔''

انہوں نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ وہ منتظر تھے۔ حیا ایک گہری سانس لے کر ٹیک لگا کر بیٹھی کہنیاں کرسی کی ہتھی پہ رکھے، ہتھیلیاں ملائے، وہ پلاٹینم کی انگوٹھی انگلی میں گھماتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں جانتی ہوں کہ ایک مسلمان کا بہترین ساتھی قرآن ہوتا ہے اور اسے اپنی تمام کنسولیشن (ہدایت) اللہ تعالیٰ سے لینی چاہیے، اپنا مسئلہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے رکھنا چاہیے، لیکن اگر یہی کافی ہوتا تو اللہ سورہ عصر میں یہ نہ فرماتا کہ 'انسان خسارے میں ہے، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی۔ اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔'' سر! یہ جو تواصو بالصبر ہوتا ہے نا، یہ بندے کو بندوں سے ہی چاہیے ہوتا ہے، خصوصاً تب جب دل میں مکڑی کے جالے بن جائیں۔''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کرسی پہ قدرے آگے ہو کر بیٹھے وہ بہت توجہ سے اسے سن رہے تھے۔

''آپ مجھے جانتے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ میں ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ میرے لیے دین کبھی بھی لائف اسٹائل کا حصہ نہیں رہا تھا، پھر بھی میں ایک بری لڑکی کبھی بھی نہیں تھی۔ ہر انسان اپنی کہانی خود سناتے ہوئے خود کو مارجن دے دیا کرتا ہے، شاید میں بھی دے رہی ہوں۔ پھر بھی میں بے شک حجاب نہیں لیتی تھی، مگر لڑکوں سے بات نہیں کرتی تھی۔ میری کسی لڑکے سے خفیہ دوستی نہیں تھی۔ میں دکان دار سے پیسے پکڑتے ہوئے بھی احتیاط کرتی تھی کہ ہاتھ نہ چھوئے۔ میرا نکاح بچپن میں ہوا تھا اور میں اتنی وفادار تھی کہ اگر کبھی کسی لڑکے سے یوں ملی تو اسی نکاح کو بچانے کے لیے۔''

وہ کہہ رہی تھی اور ہر ہر لفظ...... سے تکلیف عیاں تھیں۔ دل میں چبھے کانٹے اتنی اذیت نہیں دیتے جتنا ان کو نوچ کر نکالنے کا عمل اذیت دیتا ہے۔

''پھر میں باہر چلی گئی۔ وہاں بھی دین میرے لیے بس اتنا ہی تھا کہ میلاد اٹینڈ کر لیا اور ٹاپ قمیص میں متبرکات دیکھ کر سر ڈھانپ لیا، بس ثواب مل گیا، پھر جو چاہے کرو، مگر پھر میں نے محسوس کیا کہ میری عزت نہیں ہے۔ میں نے خود کو بے عزت اور رسوا ہوتے دیکھا۔ میری نیت کبھی بھی غلط نہیں ہوتی تھی، پھر بھی میں رسوا ہو جاتی تھی۔ تب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیوں ہوتا ہے۔ پھر مجھے اللہ نے دو قسم کے عذاب چکھائے۔ روحانی اور جسمانی۔ پہلے میں نے موت دیکھی، اور موت کے بعد کا جہنم۔'' درد سے اس نے آنکھیں میچ لیں۔ بھڑکتا الاؤ، دہکتے انگارے۔ سب کچھ سامنے ہی تھا۔

''میری جلد پہ آج بھی وہ زخم تازہ ہیں جو اس بھیانک حادثے نے مجھے دیے اور تب مجھے سمجھ میں آ گیا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا صرف تمنا اور خواہش سے نہیں ملتی۔ اس کے لیے دل مارنا پڑتا ہے۔ محنت کرنی پڑتی ہے اور میں نے دل مارا۔ تاکہ میری آنکھ میں اور دل میں اور وجود میں نور داخل ہو جائے اور میں نے وہ سب کرنا چاہا جو اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ میں کروں مگر تب مجھے کسی نے کہا تھا کہ قرآن کی پہیلیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں اور یہ کہ 'احزاب' میں آیت حجاب اُترنا بھی ایک پہیلی ہے۔ اس نے اس پہیلی کو یوں حل کیا کہ حجاب لینا خندق کی جنگ کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جہاں کسی عہد میں بندھے بنو قریظہ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، جہاں جاڑے کی سختی اور بھوک کی تنگی ہوتی ہے اور پھر میں نے خود کو اسی خندق میں

پایا۔ اب جب کہ میں اس دوسرے لائف اسٹائل کو نہیں چھوڑنا چاہتی تو لوگ مجھے اس پہ مجبور کر رہے ہیں۔ میرے سگے تایا جو اپنی بیٹی کو ساری عمر اسکارف کرواتے آئے ہیں، وہی اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔ میں کیسے اس دل کی ویرانی پہ قابو پاؤں جو میرے اندر اتر آئی ہے؟ میں کیسے ان جالوں کو صاف کروں؟

بہت بے بسی اور شکستگی سے کہتے اس نے اپنا سوال ان کے سامنے رکھا۔ دل جیسے ایک غبار سے صاف ہوا تھا۔ ایک بوجھ سا کندھوں سے اُترا تھا۔

''میں جہاں تک آپ کی بات سمجھ سکا ہوں۔'' بہت دھیمے مگر مضبوط لہجے میں انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''تو آپ کے دل میں مکڑی کے جالے اسی لیے بن رہے ہیں کہ آپ لوگوں کے ان رویوں کو دائمی سمجھ رہی ہیں۔ دیکھیں! قرآن کیا کہتا ہے؟ ایک سورہ ہے جس کا نام عنکبوت یعنی ''مکڑی'' ہے، اس میں یہی لکھا ہے نا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بناتا ہے، اس کی مثال مکڑی کی سی ہے جو اپنا گھر بُنتی ہے اور بے شک گھروں میں سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے تو بیٹا یہ جو ''کارساز'' بنانا ہوتا ہے نا، یہ صرف کسی انسان کو خدا کے برابر سمجھنا نہیں ہوتا بلکہ کسی کو زور آور تسلیم کرنا اور اس کے رویے کو خود پہ طاری کر لینا بھی ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے حجاب کے لیے بہت فائٹ کی، یہی تو عورت کا جہاد ہوتا ہے، اس کی الٹی میٹ اسٹرگل۔ مگر آہستہ آہستہ فطری طور پہ آپ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ لوگوں کا رویہ ہمیشہ یہی رہے گا۔''

''آپ کو لگتا ہے وہ بدل لیں گے؟ نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے تایا کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کریں گے، آپ ان کو نہیں جانتے۔''

''آپ کے تایا کا مسئلہ پتا ہے کیا ہے حیا؟ بہت سے لوگوں کی طرح انہوں نے بھی اپنی بیٹی کو اسکارف اللہ کی رضا کے لیے کروایا ہوگا، انہوں نے حجاب کے لیے اسٹینڈ لیا ہوگا، جیسے آج آپ لے رہی ہیں اور حجاب کے لیے ہر اسٹینڈ لینے والے کو آزمایا جاتا ہے۔ آپ کو طنز و طعنے کے نشتروں سے آزمایا گیا کیونکہ یہی آپ کی کمزوری ہے کہ آپ کسی کی ٹیڑھی بات زیادہ برداشت نہیں کر سکتیں اور آپ کے تایا کو ''تعریف، ستائش اور واہ واہ'' سے آزمایا گیا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔ یہ بات ان سے لوگوں نے کہی ہوگی اور یوں ان کا وہ کام جو اللہ کی رضا کے لیے شروع ہوا تھا، اس میں تکبر اور خود پسندی شامل ہوگئی۔''

وہ بالکل یک ٹک ان کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے تو کبھی اس نہج پہ سوچا بھی نہیں تھا۔

''اب اس خود پسندی میں وہ اتنے راسخ ہو گئے کہ اپنی ہر بات ان کو درست لگتی ہے۔ یہاں ہر شخص نے اپنا دین بنا رکھا ہے، اصولوں کا ایک سیٹ اسٹینڈرڈ جس سے آگے پیچھے ہونے کو وہ تیار نہیں۔ آپ کے تایا کا بھی اپنا دین ہے، جو اس تک عمل کرے مثلاً صرف اسکارف لے، اس کو وہ سراہیں گے مگر جو اس سے آگے بڑھے، شرعی حجاب شروع کرے، مثلاً ان کے بیٹے یا داماد سے پردہ کرنے لگے، اس نے ان کے دین سے آگے نکلنے کی کوشش کی، نتیجتاً وہ ان کے عتاب کا شکار ہوا۔''

اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جو اسے لگتا تھا کہ تایا اس کی مخالفت میں دین کے دشمن ہو گئے ہیں تو وہ غلط تھی۔ وہ یہ سب دین اور صحیح کام سمجھ کر ہی تو کر رہے تھے۔

''مگر اب اس سب کا انجام کیا ہوگا؟ یہ سب کدھر ختم ہوگا؟ انا اور اپنی نیکی پہ تکبر کی یہ جنگ...... کیا بنے گا اس کا؟''

اس کی بات پہ وہ دھیرے سے مسکرائے۔

''حیا! ابھی آپ نے احزاب کی پہیلی کی بات کی۔ اسے آپ نے حجاب سے تشبیہ دی۔''

''میں نے نہیں، میری دوست نے۔'' اس نے فوراً تصحیح کی۔

''دوست۔ آپ کی دوست نے یہ سب کہا؟ خندق، بنو قریظہ، بھوک اور جاڑا۔ سب کی حجاب سے تشبیہ دی جا سکتی ہے، مگر پھر بھی آپ ایک آخری چیز مس کر گئی ہیں۔''

''کیا؟'' وہ چونکی۔ کیا عائشے کچھ مس کر گئی تھی؟

''آپ نے احزاب کی پہیلی ابھی مکمل حل نہیں کی۔ آپ بس ایک چیز نہیں دیکھ رہیں، وہ جو اس پہیلی کی اصل ہے، اس کی بنیاد ہے، ایک چیز جو آپ بھول گئی ہیں۔''

''کیا سر؟'' وہ آگے ہو کر بیٹھی۔

"اگر وہ میں آپ کو بتاؤں یا سمجھاؤں تو آپ کو اس کا اتنا فائدہ نہیں ہوگا جتنا آپ کے خود سوچنے سے ہوگا۔ قرآن کی پہیلیاں خود حل کرنی پڑتی ہیں۔ خود سوچیں، خود ڈھونڈیں، آپ کو اپنے مسئلے کا سیدھا سیدھا حل نظر آجائے گا۔"

اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔ اب اسے پہیلیاں بوجھنا اچھا لگتا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں خود سوچوں گی۔ مگر سر! لوگ مجھے دقیانوسی کہتے ہیں تو میرا دل دُکھتا ہے، میں اپنے دل کا کیا کروں؟" وہ ایک ایک کر کے دل میں چبھے سارے کانٹے باہر نکال رہی تھی۔ اذیت ہی اذیت تھی۔

"دقیانوسی کیا ہوتا ہے حیا؟"

اس نے جواب دینے کے لیے لب کھولے، وہ کہنا چاہتی تھی کہ پرانا، بیک ورڈ، پینڈو، مگر رُک گئی۔ اہل علم کے سوالات کا جواب کسی اور طریقے سے دینا چاہیے۔

"آپ بتائیں سر! کیا ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر حسن ذرا سے مسکرائے۔ "اصحاب کہف کا قصہ تو سنا ہوگا آپ نے؟ جس بادشاہ کے ظلم و جبر سے، اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری سے روکے جانے پہ انہوں نے اپنے گھر چھوڑ کر غار میں پناہ لی تھی، اس بادشاہ کا نام دقیانوس تھا۔

King Decius دقیانوس کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری سے روکنا تھا۔ سو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی کوئی بھی چیز دقیانوسی کیسے ہو سکتی ہے؟" وہ لمحے بھر کو بالکل چپ رہ گئی۔

"میں تو یہ سمجھ جاؤں، مگر ان کو کیسے سمجھاؤں؟ میں نے اپنی اماں سے ایک گھنٹہ بحث کی مگر وہ نہیں سمجھیں۔"

"آپ کی عمر کتنی ہوگی؟"

"تئیس سال کی ہونے والی ہوں۔" اس نے بنا حیران ہوئے تحمل سے بتایا۔

"آپ کو بارہ، تیرہ برس کی عمر سے اسکاہف لینا چاہیے تھا، مگر آپ نے بائیس، تیئس برس کی عمر میں لیا۔ جو بات دس سال، ایک دوست کی موت اور ایک بھیانک حادثے کے بعد آپ کی سمجھ میں آئی، آپ دوسروں سے کیسے توقع کرتی ہیں کہ وہ ایک گھنٹے کی بحث سے اسے سمجھ لیں گے؟" وہ بہت نرمی سے اس سے پوچھ رہے تھے۔

"تو کیا ان کو بھی میرا موقف سمجھنے میں دس سال لگیں گے؟"

"اس سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے اور کم بھی، مگر آپ نہیں ان کا وقت تو دیں۔ کچھ چیزیں وقت لیتی ہیں حیا!"

"مگر انسان کتنا صبر کرے سر! کب تک صبر کرے؟" وہ اضطراب سے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"جب زخم پہ تازہ تازہ دوا کا قطرہ گرتا ہے تو ایسی ہی جلن اور تکلیف ہوتی ہے۔ میرے بچے! صبر کی ایک شرط ہوتی ہے، یہ صرف اسی مصیبت پہ کیا جاتا ہے جس سے نکلنے کا راستہ موجود نہ ہو۔ جہاں آپ اپنے دین کے لیے لڑ سکتی ہوں، وہاں لڑیں وہاں خاموش نہ رہیں۔ آپ سے آیت حجاب میں اللہ نے کیا وعدہ کیا ہے؟ یہی کہ آپ چادریں اپنے اوپر لٹکائیں تاکہ آپ پہچان لی جائیں۔ یہ جو 'پہچان لی جائیں' ہے نا، عربی میں 'عرف' کہتے ہیں۔ اس کا مطلب 'تاکہ آپ عزت سے جانی جائیں' بھی ہوتا ہے۔ آپ اپنا وعدہ نبھا رہی ہیں تو اللہ تعالیٰ سے کیا توقع کرتی ہیں؟ وہ آپ کو عزت دینے اور اذیت سے بچانے کا وعدہ نہیں نبھائے گا کیا؟"

مرہم لگنے کے باوجود زخم درد کر رہے تھے۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولا سا بنتا گیا۔

"مگر کب سر؟ کب میں تبدیلی دیکھوں گی؟" اس کی آواز میں نمی تھی۔

"مزدور کو اُجرت مزدوری شروع کرتے ہی نہیں ملتی حیا! بلکہ جب مطلوبہ کام لے لیا جاتا ہے تب ملتی ہے، شام ڈھلے، مگر کام ختم ہوتے ہی مل جاتی ہے، اس کے پسینے کے خشک ہونے کا انتظار کیے بغیر۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا صرف تمنا اور خواہش سے نہیں مل جاتی۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے میں تھکنا پڑتا ہے، پھر ہی اُجرت ملتی ہے۔" فون کی گھنٹی بجی تو وہ رُکے اور ریسیور اُٹھایا۔ چند ثانیے کو وہ عربی میں بات کرتے رہے، پھر ریسیور رکھ کر اُٹھے۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں، تب تک آپ بیٹھیں۔ سوری! میں آپ کو زیادہ کچھ آفر نہیں کر سکتا، سوائے اس کے۔" انہوں نے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا شیشے کا جار اس کے سامنے میز پہ رکھا جو گلابی ریپر والی کینڈیز سے بھرا تھا۔

"اٹس او کے سر!" وہ خفیف سی ہوگئی۔
"دو ہفتے قبل ہم ترکی گئے تھے، یونیورسٹی آف استنبول میں ایک کانفرنس تھی، اس سلسلے میں۔ یہ میں کپادوکیہ سے لایا تھا۔ آپ کو ترکی پسند ہے، سو یہ بھی اچھی لگے گی۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ مسکرا کر بتاتے ہوئے چند کتب اٹھائے، جن میں سرفہرست ہولی بائبل تھی، باہر نکل گئے۔
اس نے بھیگی آنکھیں رگڑیں اور پھر مسکرا کر جار کھولا۔ اندر ہاتھ ڈال کر دو کینڈیز نکالیں۔ گلابی ریپر اتار کر اس نے کینڈی منہ میں رکھی، پھر ریپر کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پہ کوئی عجیب و غریب سا غار بنا تھا۔ جو بھی تھا، اس نے دوسری کینڈی اور ریپر پرس میں ڈال دیے۔ ترکی سے متعلقہ ہر چیز اسے بہت پیاری تھی۔
کینڈی کو اپنے منہ میں محسوس کرتے، اس نے گردن موڑ کر بند دروازے کو دیکھا جہاں سے ابھی ابھی سر گئے تھے۔
کچھ لوگ صرف دین کی وجہ سے آپ کے کتنا قریب آجاتے ہیں نا۔

☆ ☆ ☆

صبح آفس جانے سے قبل وہ ڈائننگ ٹیبل پہ جلدی جلدی ناشتا کر رہی تھی۔ کل سے اس کا دل اتنا پرسکون تھا کہ کوئی حد نہیں۔ کبھی کبھی انسان کو اپنا بوجھ بانٹ لینا چاہیے، مگر صحیح بندے کے ساتھ اور صحیح وقت پہ۔
"نور بانو!" فاطمہ قریب ہی کچن میں کھڑی نور بانو کو ہدایات دے رہی تھیں۔
"عابدہ بھابھی اور سحرش دوپہر کے کھانے پہ یہاں ہوں گی، تم لنچ کی تیاری ابھی سے شروع کر دو۔ یوں کرنا کہ....."
جوس کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے وہ ٹھہر گئی۔
یہ عابدہ چچی اور سحرش کے چکر ان کے گھر بڑھ نہیں گئے تھے؟ پرسوں ہی تو وہ آئی تھیں اور پھپھو کے لیے ایک بہت قیمتی جوڑا بھی لائی تھیں۔ آج پھر آرہی تھیں۔ کیوں بھلا؟
"اماں!" کرسی سے اٹھ کر ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اس نے فاطمہ کو آتے دیکھا تو پکار لیا۔
"چچی کیوں آرہی ہیں، ابا سے ملنے؟"
"نہیں! تمہاری پھپھو کے ساتھ شاپنگ پہ جانا چاہتی ہیں۔ سحرش کے کالج میں کوئی فنکشن ہے۔ اسے آرش طرز کی دلہن بننا ہے۔ وہ اس کے لیے کوئی خاص ڈریس بنوانا چاہتی ہے۔ سبین کو تجربہ ہے نا کپڑوں وغیرہ کا، اس لیے۔"
"اچھا۔" وہ اچنبھے سے عبایا پہننے لگی۔
"پہلے تو سحرش کسی سے مشورے نہیں لیتی تھی، اب کیوں؟ اور پھپھو ہی کیوں؟ یا پھر وہ جہان سکندر بنتی جا رہی تھی۔ ہر ایک پہ شک کرنا۔ اف!" وہ نقاب کی پٹی سر کے پیچھے باندھ کر باہر نکل آئی۔
"خیر جو بھی ہے۔" اسے آتے دیکھ کر ڈرائیور نے فوراً پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ وہ اندر بیٹھنے ہی لگی تھی کہ.....
"حیا!" ارم کی آواز نے اسے چونکایا۔ وہ بیٹھتے بیٹھتے رکی اور حیرت سے پلٹی۔ ارم سامنے ہی کھڑی تھی۔ سر پہ دوپٹا لیے، آنکھوں تلے حلقے چہرے پہ سنجیدگی۔
"ارم؟" اسے حیرت ہوئی۔ ارم چلتی ہوئی اس کے سامنے آئی۔
"بات کرنی تھی تم سے۔" پھر اس نے ڈرائیور کو دیکھا۔
"تم باہر جاؤ۔" وہ جیسے اسی جگہ پہ بات کرنا چاہتی تھی۔ ڈرائیور فوراً تابع داری سے وہاں سے ہٹ گیا۔
"بتاؤ، کیا بات ہے؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ ارم چند لمحے اسے سنجیدگی سے دیکھتی رہی، پھر دھیرے سے بولی۔
"اس روز میں نے جو سنا، وہ وہاں جا کر بتا دیا، صرف اس لیے کیونکہ مجھے تم پہ غصہ تھا۔ کیونکہ تم نے بھی میرا پردہ نہیں رکھا تھا۔"
"ارم! اگر تم نہ بھی بتاتیں اور مجھ سے کوئی پوچھتا کہ وہ کیوں گیا ہے تو میں خود ہی بتا دیتی۔ جہاں تک بات ہے میری..... مجھے تایا نے رات کے تین بجے فون کر کے پوچھا تھا کہ میرے پاس کوئی دوسرا نمبر ہے یا نہیں، اگر تم نے مجھ پہ بھروسا کیا ہوتا تو میں بھی تم پہ بھروسا کرتی کہ تم مجھے پھنساؤ گی نہیں۔" وہ گاڑی کے کھلے دروازے کے ساتھ ہی کھڑی، بہت سکون سے کہہ رہی تھی۔ ارم چند لمحے لب کاٹتی رہی، پھر نفی میں سر ہلایا۔
"مگر میں نے اس روز زیادتی کر دی تمہارے ساتھ۔ آئی ایم سوری فار دیٹ۔ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" حیا نے بغور اسے دیکھا۔

وہ واقعی نادم تھی یا اس کے پیچھے کوئی اور مقصد تھا۔ البتہ اس کا دل پسیجنے لگا تھا۔
''کوئی بات نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟''
''فرق تو پڑا ہے نا، اسی وقت سے عابدہ چچی، پھپھو کے پیچھے پڑی ہیں کہ تمہارا پتا صاف ہو اور وہ جہان کے لیے سحرش کی بات چلا سکیں۔''
''کیا؟'' وہ چونکی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اُبھری۔
''ہاں! اسی لیے تو روز ہی پھپھو کے پاس آئی بیٹھی ہوتی ہیں۔ کیا تم نہیں جانتیں؟'' اب کے ارم کو حیرت ہوئی۔ حیا نے بمشکل شانے اُچکائے۔
''جو بھی ہے، مجھے ان باتوں سے فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے بظاہر لاپروائی سے کہا، البتہ اس کا دل اتھل پتھل ہو رہا تھا۔
''مگر..... خیر۔'' ارم نے گہری سانس لی۔ لمحے بھر کو وہ خاموش رہی پھر بولی۔
''کیا مجھے تمہارا فون مل سکتا ہے، مجھے ایک کال کرنی ہے بس!'' اس کا لہجہ ملتجی نہیں ہوا، بلکہ ہموار رہا۔ ''بس مجھے اس قصے کو ختم کرنا ہے، بس اسے خدا حافظ کہنا ہے۔''
تو یہ بات تھی۔ حیا نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔ ارم نے ''جسے'' بھی فون کرنا وہ اسے اپنے لینڈ لائن یا کسی بھی طرح ماں، بھابھی کسی کا بھی فون لے کر سکتی تھی، مگر غالباً وہ پہلے پکڑی گئی ہوگی یا پھر سختی بڑھ گئی تھی، تب ہی وہ خطرہ مول نہیں لیتی تھی۔
''ٹھیک ہے! مگر بہتر ہے کہ تم میرا فون استعمال مت کرو..... الٰہی بخش!'' اس نے دور کھڑے ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ فوراً ہاتھ باندھے ان کے پاس آیا۔
''کیا میں تمہارا فون لے سکتی ہوں ایک منٹ کے لیے؟''
''جی، جی!'' اس نے فوراً اپنا موبائل پیش کیا اور دور چلا گیا۔
''لو۔'' حیا نے موبائل ارم کی طرف بڑھایا۔ ارم نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے فون تھاما اور تیزی سے نمبر ملانے لگی۔
وہ گاڑی میں بیٹھی اور دروازہ بند کیا۔ باہر ارم جلدی جلدی فون پہ دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔ اسے کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔ نہ اس نے سننے کی کوشش کی۔ ایک منٹ بعد ہی ارم نے فون بند کر دیا۔ حیا نے بٹن دبایا، شیشہ نیچے ہوا۔
''تھینکس حیا!'' ممنونیت سے کہتے ہوئے اس نے فون حیا کو تھمایا۔ ''میں چلتی ہوں۔'' وہ تیزی سے واپس مڑ گئی۔ جب وہ درمیانی دروازہ پار کر گئی تو حیا نے موبائل کے کال ریکارڈز چیک کیے۔ اس نے ڈائلڈ کالز میں سے کال مٹا دی تھی مگر یہ تو کیا کا وہ ماڈل تھا جس میں ایک کال لاگ الگ سے موجود تھا۔ حیا نے اسے کھولا۔ وہاں نمبر محفوظ تھا۔ اس نے وہ نمبر اپنے موبائل میں اُتارا اور محفوظ کر لیا۔
''الٰہی بخش!'' اب وہ دور کھڑے الٰہی بخش کو واپس آنے کے لیے کہہ رہی تھی۔
''کبھی اگر ارم نے اسے پھنسانے کی کوشش کی، تو اس کے پاس ثبوت بھی تھا اور موقع کا گواہ بھی۔'' الٰہی بخش کو آتے دیکھ کر اس نے سوچا تھا۔
''ذیشان صاحب کے آفس لے چلو! جہاں اس دن گئے تھے۔'' فون آگے ہو کر اسے تھماتے ہوئے اس نے الٰہی بخش کو ہدایت دی۔
''اور ارم بی بی نے تمہارا فون استعمال کیا ہے، یہ بات کسی اور کو پتا نہیں لگنی چاہیے۔''
''جی میم!'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔

☆ ☆ ☆

ذیشان انکل آفس میں نہیں تھے۔ ان کی سیکریٹری پھر بھی اسے آفس میں لے گئی کیونکہ رجا (ان کی ایب نارمل بیٹی) اندر تھی۔
''آپ بیٹھ جائیے۔ سر ابھی آتے ہوں گے۔'' جاتے ہوئے ان کی سیکریٹری نے اوپر سے نیچے تک ایک عجیب سی نظر اس پہ ڈالی تھی۔
وہ بنا اثر لیے کاؤچ پہ بیٹھ گئی۔ اس کے عبایا کو بہت سی جگہوں پہ اسی طرح دیکھا جاتا تھا مگر جب دوسرے غلط ہو کر اتنے پُراعتماد تھے تو وہ درست ہو کر بے اعتماد کیوں نہ ہو؟ اور وہ بھی کتنی پاگل تھی جو تائی اور اس کی باتوں کو دل سے لگا لیتی تھی۔ تائی بے چاری نے چند ایک بار فقرے اُچھالنے کے سوا کہا ہی کیا تھا۔ وہ تو اہل مکہ تھی، ان سے کیا گلہ؟ اصل اذیت دینے والے تو بنو قریظہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ جنگ وہی جیتتا ہے جو ہار نہیں

مانتا، اور پھر انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔

اس لمحے ڈی جے اسے بہت یاد آئی تھی۔ دھیان بٹانے کے لیے اس نے سر جھٹکا تو خیال آیا، رجا اس لمبے سے کاؤچ کے دوسرے سرے پہ بیٹھی تھی۔ چہرہ اخبار پہ اتنا جھکائے کہ گھنگھریالے بال صفحے کو چھو رہے تھے، وہ قلم سے اخبار پہ نشان لگا رہی تھی۔ اسے ورڈ پزل اچھے لگتے تھے۔ حیا کو بھی اب اچھے لگتے تھے، مگر وہ آخری پزل ابھی تک حل نہیں ہو سکا تھا۔ رجا تو اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی مگر شاید وہ رجا کی کوئی مدد کر سکے۔

''رجا! کیا کر رہی ہو؟'' وہ نرمی سے کہتی اُٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی۔ رجا نے آہستہ سے سر اُٹھایا۔ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر اخبار اس کے سامنے کیا۔ اس کی حرکات بہت آہستہ تھیں۔ اسے بچی پہ بہت ترس آیا۔ مگر پھر سوچا، وہ کیوں ترس کھا رہی ہے؟ جب وہ ایب نارمل لڑکی اپنی تمام تر ہمت مجتمع کر کے محنت کر رہی ہے تو وہ اس کے بارے میں ہمدردی اور تاسف سے کیوں سوچے؟ اسے تو ستائش سے سوچنا چاہیے۔

''دکھاؤ! کیا ہے یہ؟'' اس نے وہ پرانا، مڑا تڑا ہوا اخبار رجا کے ہاتھ سے لیا۔ ایک ہی پزل پہ وہ کافی دن سے لگی ہوئی تھی شاید، اسی لیے وہ جگہ کافی خستہ حال لگ رہی تھی۔ ذیشان انکل یقیناً اپنی محبت میں سمجھتے تھے کہ رجا یہ پزل حل کر لے گی ورنہ...... وہ شاید ذہنی طور پر کافی پیچھے تھی۔

''تم سے یہ حل نہیں ہو رہا؟'' اس نے پیار سے پوچھا۔ رجا نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ ایک ثانیے کو اسے بے اختیار بہارے گل یاد آئی۔

''اچھا! یہ دیکھو۔ یہ جو پہلا لفظ ہے نا، یہ ایک اینا گرام ہے، اینا گرام یوں ہوتا ہے جیسے کسی لفظ کے حروف آگے پیچھے کر دو تو نیا لفظ بن جائے، جیسے Silent (سائلنٹ) کے حروف ادل بدل کر دو تو Listen (لسن) بن جاتا ہے۔ کہتے ہیں اینا گرامز میں بہت حکمت اور دانائی چھپی ہوئی ہے۔ اب یہ پہلا لفظ دیکھو!'' وہ اخبار سے پڑھ کر بتانے لگی۔

''یہ لکھا ہے Try Hero Part (ٹرائی ہیرو پارٹ)۔ یہ کسی مووی کا نام ہے، تمہیں بتانا ہے کہ اس کے حروف ادل بدل کر دو تو کس مووی کا نام بنتا ہے۔ ٹھیک؟''

رجا نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بنا تاثر کے خالی خالی آنکھوں سے حیا کو دیکھتی رہی۔

حیا نے چند ثانیے اس لفظ کو غور سے دیکھا اور پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ ٹرائی ہیرو پارٹ کے حروف کی جگہیں آگے پیچھے کرنے سے کیا بنتا ہے۔

''Harry Potter دیکھو! اس سے 'ہیری پوٹر' بنتا ہے۔ اب یہاں لکھو 'ہیری پوٹر'۔'' اس نے اخبار رجا کو تھمایا۔

رجا نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلائی اور بہت آہستگی سے ایک ایک حرف خالی جگہ پہ اُتارنے لگی۔

''اب یہ اگلا مجموعہ دیکھو۔ Old Vest Action (اولڈ ویسٹ ایکشن) اس سے کسی مشہور ایکٹر کا نام بنتا ہے۔ جو پرانی انگریزی ایکشن فلموں میں کام کیا کرتا تھا۔ کیا ہو سکتا ہے؟'' وہ ان تین الفاظ کو دیکھتے ہوئے سوچ میں پڑ گئی۔ ذیشان انکل کے پاس وہ کس کام سے آئی تھی، اسے سب بھول چکا تھا۔

''اوہ ہاں! Clint Eastwood (کلائنٹ ایسٹ ووڈ)۔'' وہ ایک دم چونکی۔ بہت ہی دلچسپ پزل تھا۔

''ویسے میں تمہیں چیٹنگ کروا رہی ہوں، یہ غلط بات ہے، چلو! اب باقی تم خود سولو کرو۔ بس تمہیں ان الفاظ کے حروف کی جگہوں کو ادل بدل کرنا ہے، جیسے میں نے کیا تھا، پھر تم نئے الفاظ بنا سکو گی، ٹھیک؟'' بات ختم کرنے سے قبل ہی اس کا ذہن اپنے اس آخری پزل کی طرف بھٹک گیا۔

Swap؟ ساپ کرنے کا بھی یہ مطلب ہوتا ہے نا، کیا وہ کوئی ہنٹ تھا کہ اسے حروف کی جگہوں کو Swap کرنا ہے اور کوئی نیا لفظ بنانا ہے؟ مگر وہ کل بارہ حروف تھے، اور پاس ورڈ تو آٹھ حرفی ہونا چاہیے تھا، پھر وہ اس سے کیا بنا سکتی تھی؟ ایک دم وہ بے چینی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

ہو سکتا ہے وہ دو الفاظ کوئی اینا گرام ہی ہو۔ اینا گرام کے ذریعے کوڈ لکھنا تو بہت قدیم طریقہ تھا، یہ ہر دور میں استعمال ہوتا رہا تھا۔ فلسفے میں، آرٹ، فکشن، جاسوسی، ہر چیز میں کہیں نہ کہیں اینا گرامز کا ایک کردار ہوتا تھا۔ اسے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا بھلا؟

فلیش ڈرائیو اس کے پاس پرس میں ہی تھا، مگر اسے اس کو صرف اپنے لیپ ٹاپ میں لگانا چاہیے اور ابھی ابھی وہ کام اسے کرنا تھا۔ ذیشان انکل سے وہ بعد میں مل لے گی۔ ابھی اسے اپنے آفس پہنچنا تھا جہاں تنہائی میں وہ یہ کام کر سکے۔

باہر سیکریٹری کو بتا کر، رجا کو 'بائے' کہہ کر وہ تیزی سے باہر آئی تھی۔ گاڑی میں ہی اس نے اپنے موبائل سے گوگل آن کیا اور ایک

اینا گرام فائنڈر ویب سائٹ کھولی تا کہ وہ دیکھ سکے کہ سائیڈ اسٹور سے کتنے ممکن الفاظ بن سکتے ہیں۔

''پانچ ہزار چار سو تراسی مجموعات؟'' نتیجہ دیکھ کر اس نے گہری سانس لی۔ اب ان میں سے کون سا درست ہو سکتا ہے بھلا؟ خیر، وہ ان تمام الفاظ کو دیکھتی ہے، شاید کچھ مل جائے۔

پہلا مجموعہ تھا۔ ''Pasty Powders''

''اونہوں!'' اس نے خفگی سے نفی میں سر ہلایا۔

''Trays Swopped''، ''So Try Swopped''

وہ ان عجیب و غریب مجموعات پر سے نظر گزارتی تیزی سے موبائل اسکرین کو انگلی سے اوپر نیچے کر رہی تھی کہ ایک مجموعہ الفاظ پہ ٹھہر گئی۔

Story Swapped کے حروف کو آگے پیچھے کرنے سے بننے والے یہ دو الفاظ تھے۔

Type Password

''ٹائپ پاس ورڈ؟'' اس نے اچھنبے سے دہرایا۔ ''یعنی کہ پاس ورڈ ٹائپ کرو۔ کیا مطلب؟'' اور پھر روشنی کے کسی کوندے کی طرح وہ اس کے دل و دماغ کو روشن کر گیا۔

''پاس ورڈ..... پاس ورڈ میں پورے آٹھ حروف ہوتے ہیں۔ ٹائپ پاس ورڈ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی خفیہ لفظ ٹائپ کرے، بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لفظ ''پاس ورڈ'' ہی ٹائپ کر دے۔

لفظ ''پاس ورڈ'' جو آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا پاس ورڈ ہے، لاکھوں ای میل ہولڈرز کا پاس ورڈ آج بھی یہی لفظ ''پاس ورڈ'' ہی ہے۔ دنیا کا سب سے کامن، سب سے آسان پاس ورڈ۔ اس نے موبائل بند کیا اور پرس میں ڈالا۔

''تیز چلاؤ الہی بخش!'' وہ بے چینی سے بولی۔ اپنے آفس پہنچنے کی اتنی جلدی اسے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

''میں آفس جا رہی ہوں مگر پلیز! میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی، سو مجھے کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ ٹھیک؟'' ابا کی سیکریٹری کو حکمیہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔

آفس مقفل کرنے اور نقاب اُتارنے کے بعد اس نے لیپ ٹاپ کھول کر میز پہ رکھا اور پرس سے مخملیں ڈبی نکالی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اندر سیاہ فلیش ڈرائیو ویسی ہی رکھی تھی۔ اس نے اسے باہر نکالا اور ڈھکن کھول کر ساکٹ میں ڈالا۔

چند لمحوں بعد اسکرین پہ آٹھ چوکھٹے اس کے سامنے چمک رہے تھے۔ کی بورڈ پہ انگلیاں رکھ کر اس نے لمحے بھر کو آنکھیں بند کر کے گہری سانس اندر کو کھینچی اور پھر آنکھیں کھولی۔ اگر وہ غلط ہوئی تو وہ اس فائل کو کھو دے گی، مگر اسے یقین تھا کہ ''پاس ورڈ'' ہی وہ لفظ تھا جو اسے اس فائل میں داخل کر دے گا۔ ٹھنڈی پڑتی انگلیوں سے اس نے ٹائپ کیا۔

''پی اے ایس ایس ڈبلیو او آر ڈی۔''

اور انٹر پہ انگلی رکھ دی۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر ہرا سگنل چمکا۔ Acces Granted (ایکسیس گرانٹڈ) پاس ورڈ درست تھا۔

''یا اللہ!'' وہ خوش ہو، یا حیران، اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، مگر دل کی دھڑکن مزید تیز ہو گئی تھی۔ اسکرین پہ اب وہ فائل کھل رہی تھی۔ اس کے لیے جو پروگرام کمپیوٹر نے کھولا وہ ونڈوز میڈیا پلیئر تھا۔

''میڈیا پلیئر؟'' اس نے اچھنبے سے اسکرین کو دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ فائل کوئی ویڈیو یا آڈیو تھی۔ اس کا پہلا خیال اپنی اور ارم کی ویڈیو کی طرف گیا تھا، داور بھائی کی مہندی کی......

مگر اسے زیادہ کچھ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ کوئی ویڈیو تھی اور شروع ہو چکی تھی۔

اس کے پہلے منظر پہ نظر پڑتے ہی حیا سلیمان کا سانس رُک گیا۔ اسے لگا وہ کبھی ہل نہیں سکے گی۔

''اللہ، اللہ، یہ کیسے......؟'' وہ سفید پڑتا چہرہ لیے چمکتی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جو کام نپٹا کر اسے بہارے گل سے نپٹنا تھا، وہ کام ابھی نہیں ہوئے تھے، مگر وہ جانتا تھا کہ آج دوپہر سے اچھا موقع اسے حلیمہ عثمان

کے گھر جانے کا نہیں ملے گا، اس لیے وہ ادھر آ گیا تھا۔
حلیمہ آنٹی نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ سوٹ میں ملبوس، وہی گلاسز، جیل سے پیچھے کیے بال اور عبدالرحمٰن کے ماتھے کے مخصوص بل۔
"عبدالرحمٰن؟ آ جاؤ۔" وہ خوش گوار حیرت سے کہتے ہوئے ایک طرف ہوئیں۔
"سفیر کدھر ہے حلیمہ؟" بے تاثر اور سپاٹ انداز میں پوچھتے ہوئے اس نے اندر قدم رکھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ لوگوں کو کبھی ریلیشن شپ ٹائٹل سے نہیں بلایا کرتا تھا۔ صرف ان کے پہلے نام لیا کرتا تھا۔
"ہوٹل میں ہوگا، کال کروں اسے؟"
"نہیں! آپ اسے کال نہیں کریں گی..... اور بہارے؟" اس نے یک لفظی استفسار کیا۔ جتنا حلیمہ عثمان اسے جانتی تھیں، وہ بھانپ گئیں کہ وہ بہت بُرے موڈ میں تھا۔
"وہ اندر اسٹڈی روم میں بیٹھی ہے۔ بہت اُداس ہے۔" انہوں نے ملال سے بتایا۔ شاید اس کا دل نرم کرنے کی کوشش کی۔
"حرکتیں جو ایسی ہیں اس کی۔" وہ بے حد بے غصے سے کہتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھر کر اسٹڈی روم کی جانب بڑھ گیا۔
بنا دستک کے دروازہ دھکیلا تو کرسی پہ بیٹھی بہارے گل نے چونک کر سر اُٹھایا۔ پورے گھنگھریالے بالوں کی پونی بنائے، لمبے فراک میں ملبوس وہ جو واقعی غم زدہ لگ رہی تھی، اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔
"عبدالرحمٰن!" وہ کرسی سے اُٹھی اور میز کے پیچھے سے گھوم کر سامنے آئی۔ بہارے کا پھول جیسا چہرہ کھل اُٹھا تھا۔
"بہت اچھا لگتا ہے تمہیں دوسروں کو اذیت دینا؟" وہ اتنے غصے سے بولا تھا کہ وہ وہیں رُک گئی۔ چہرے کی جوت بجھ سی گئی۔
"میں تمہارے لیے کیا نہیں کرتا اور تم بدلے میں میرے مسائل بڑھانے پہ تلی ہو۔ تم میری دشمن ہو یا دوست؟" اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں نمی اُتر آئی۔
"تم مجھ سے ناراض ہو عبدالرحمٰن؟"
"نہیں، نہیں! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اتنا پیسہ خرچ کر کے، اتنی مشکل سے میں نے تمہارے لیے پاسپورٹ بنوایا تھا۔ نئی شناخت، نیا گھر، نئی زندگی..... مگر تم نے اسے جلا دیا۔" وہ اتنی برہمی سے جھڑک رہا تھا کہ کوئی حد نہیں۔
بہارے خفگی سے سر جھکائے واپس کرسی پہ جا بیٹھی۔
"مجھے نیا گھر نہیں چاہیے۔ اگر میں چلی جاتی تو تمہاری مدد کون کرتا؟ میں نے تم سے مدد کا وعدہ کیا تھا نا۔ تمہیں میری ضرورت ہے، میں اس لیے نہیں گئی۔" چند لمحے بعد سر اُٹھا کر بہت سمجھداری سے اس نے سمجھایا۔
"اچھا! مجھے تمہاری ضرورت ہے؟" وہ استہزائیہ انداز میں کہتا آیا اور کرسی کھینچ کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھا۔ اب دونوں کے درمیان میز حائل تھی۔
"ہاں! ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"
"مجھے ایک بے وقوف بچے کی کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے، سنا تم نے!"
"مجھے بچہ مت کہو۔" بہارے نے دبے دبے غصے سے اسے دیکھا۔ میں پورے ساڑھے پانچ سال بعد پندرہ سال کی ہو جاؤں گی۔
"اور پھر؟"
"اور..... اور تم مجھ سے تب شادی کرو گے۔ کرو گے نا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ عائشے نہ بھی ہو، تب بھی اسے لگتا کہ وہ کہیں نہ کہیں سے خفگی سے اسے دیکھ رہی ہے۔
"بہارے گل!" اس نے بے زاری سے سر جھٹکا۔ "میں تم سے کبھی شادی نہیں کروں گا، بلکہ جو تم کر رہی ہو، اس سے تم مجھے مروا ضرور دو گی۔"
"نہیں! ایسے مت کہو۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کر سکتی۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ "مگر تم ہمیشہ مجھے ہرٹ کرتے ہو، تم ہمیشہ مجھ سے جھوٹ بولتے ہو۔"

"اچھا! کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔" اس کے تیور ویسے ہی لگ رہے تھے، مگر پلکیں سکیڑے اب وہ جس طرح اسے دیکھ رہا تھا، بہارے کو محسوس ہوا وہ دلچسپی سے اس کی بات سننے کا منتظر ہے اور اس کا غصہ بھی ذرا کم ہوا ہے۔

"بہت سارے جھوٹ...... اتنے تو اوالار میں بگلے نہیں ہیں، جتنے جھوٹ تم نے مجھ سے بولے ہیں۔" وہ خفا سے انداز میں مگر ڈرتے ڈرتے کہہ رہی تھی۔ "مگر اب مجھے سب پتا چل گیا ہے۔"

"مثلاً کیا پتا چل گیا ہے تمہیں میرے بارے میں؟" بہارے کو لگا وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔ چیلنج دیتی مسکراہٹ۔ اکساتی ہوئی مسکراہٹ۔

"بہت سی باتیں...... یہ کہ تمہارا اصلی نام عبدالرحمٰن نہیں ہے اور یہ بھی کہ تمہارا نام جہان سکندر ہے اور تم ہی حیا کے کزن ہو۔"

جہان ایک دم ہنس پڑا۔ بہارے کو حوصلہ ہوا۔ اسے برا نہیں لگا، وہ اسے ڈانٹے گا نہیں۔ اس کو ذرا تقویت ملی۔

"صبر نہیں ہوا عائشے سے...... میں نے اسے کہا تھا کہ جاتے وقت بتائے۔ اس نے ابھی بتا دیا۔" وہ جیسے بہت محظوظ ہوا تھا۔

"اس نے اپنے جاتے وقت ہی بتایا تھا۔ تم بہت جھوٹ بولتے ہو عبدالرحمٰن۔" بہارے نے خفگی سے اسے دیکھا تھا۔

"اور یہ بات تم نے کتنے لوگوں کو بتائی ہے؟" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے تاثرات اب تک ہموار ہو چکے تھے۔ نہ غصہ تھا، نہ محظوظ سی مسکراہٹ۔

"کسی کو نہیں۔ پرامس۔"

"مجھے امید ہے کہ تم اسے راز رکھو گی۔ کیا تمہیں راز رکھنے آتے ہیں بہارے گل؟" میز پہ دونوں ہتھیلیاں رکھ کر اس کی طرف جھک کر وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ بہارے نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔"

"تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟"

"میں نے جلا دیا اور میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔" اس پہ تھوڑی دیر قبل ہنسنے کا اثر تھا، جو وہ ذرا روٹھے انداز میں بولی تھی۔

"میں تمہارا نیا پاسپورٹ جلد بھجوا دوں گا اور تمہیں جانا پڑے گا، کیونکہ میں بھی یہاں سے جا رہا ہوں۔" وہ واپس سیدھا ہوا۔

"کدھر ہمارے ساتھ؟" اس کا چہرہ چمک اٹھا۔

"نہیں! بلکہ یہاں سے بہت دور اور میں تم سے آخری دفعہ مل رہا ہوں۔ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔ تم مجھے ایک اچھی یا بری یاد سمجھ کر بھلا دینا۔ مجھے یہاں سے نکلنا ہے اس سے قبل کہ میں گرفتار ہو جاؤں اور اگر میں گرفتار ہوا تو مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ اگر تم نہیں چاہتیں کہ میرے ساتھ یہ سب ہو تو میری بات مانو۔ جب پاسپورٹ آ جائے تو چلی جانا۔" وہ بے تاثر لہجے میں کہہ کر جانے کے لیے مڑا۔

"مگر تم کہاں جا رہے ہو؟" وہ پریشانی سے کہہ اٹھی۔

جہان نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"میں جہاں بھی جا رہا ہوں، اس کے بارے میں تمہیں، عائشے، آنے یا پاشا بے کو نہیں بتا سکتا۔ اس لیے یہ سوال مت کرو۔"

"کیا تم نے کسی کو نہیں بتایا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟" وہ آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بمشکل بول پائی تھی۔

"میں نے آنے سے کچھ دن پہلے حیا کو بتایا تھا، اسے معلوم ہے میں کدھر جا رہا ہوں۔ اسے راز رکھنے آتے ہیں۔" وہ کہہ کر دروازہ کھولتا باہر نکل گیا۔

بہارے گل بھاگ کر باہر آئی۔ بھیگی آنکھوں سے اس نے اپنے عبدالرحمٰن کو بیرونی دروازہ پار کرتے دیکھا۔ یہ خیال کہ وہ اسے آخری دفعہ دیکھ رہی ہے، بہت اذیت ناک تھا۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کے چہرے پہ لڑھکنے لگے۔

آج پہلی دفعہ اسے یقین آیا تھا کہ وہ آخری دفعہ عبدالرحمٰن کو دیکھ رہی ہے۔

مگر بہت جلد وہ غلط ثابت ہونے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسکرین کی روشنی اس کے سفید پڑتے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ وہ سانس روکے، یک ٹک اس منظر کو دیکھ رہی تھی جو اس کے سامنے چل

رہا تھا۔

وہ ایک کمرے کا منظر تھا۔ نفاست سے بنا بیڈ، کھڑکی کے آگے گرے پردے۔ کیمرا کسی اونچی جگہ پہ رکھا تھا، کیونکہ اسے سامنے رائٹنگ ٹیبل کی خالی کرسی نظر آ رہی تھی۔ کیمرہ یقیناً کمپیوٹر مانیٹر کے اوپر رکھا گیا تھا۔ مانیٹر نظر نہیں آ رہا تھا، مگر وہ جانتی تھی کہ یہاں کمپیوٹر ہی رکھا ہوتا ہے۔ وہ کمرا پہلے کئی بار دیکھ چکی تھی۔ کمرے نے اسے نہیں چونکایا تھا، اس شخص نے چونکایا تھا جو ابھی کرسی پہ آ کر بیٹھا تھا۔

''میں اُمید کرتا ہوں مادام! آپ وہ پہلی اور آخری شخصیت ہوں گی جو اس فائل کو کھول پائیں گی۔'' اس کے ہاتھ میں مونگ پھلی کا پیکٹ تھا، جسے کھولتے ہوئے وہ مخاطب تھا۔ کس سے..... یقیناً حیا سے۔

وہ سانس روکے اسے دیکھے گئی۔

''میرا نام جہان سکندر احمد ہے۔'' بہت پُرسکون سے انداز میں گویا اسے دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

''میجر جہان سکندر احمد! احمد میرے دادا کا نام تھا اور یہی میرا سرنیم ہے۔ میں جانتا ہوں، تم یہ سمجھتی ہو کہ میں یعنی میجر احمد، پنکی تھا۔ ایسا نہیں ہے۔ میں پنکی نہیں تھا۔'' بات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مونگ پھلی نکال کر منہ میں رکھتا تھا۔

وہ بت بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ بنا پلک جھپکے، دم سادھے۔ چند لمحے ٹھہر کر وہ بولا۔

''میں ڈولی تھا۔ یاد ہے تمہیں؟'' وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔ گیم جیتنے کے بعد کنگ میکر کی مخصوص مسکراہٹ۔ وہ اسے نہیں جانتی تھی، نہیں پہچانتی تھی۔

''ایک چوتھے نام سے بھی تم مجھے جانتی ہو۔ عبدالرحمٰن پاشا۔ ہوٹل گرینڈ کا مالک، ایک بُرا آدمی۔'' وہ گویا سانس لینے کے لیے رُکا، پھر نفی میں سر ہلایا۔

''میں بُرا آدمی نہیں ہوں، نہ ہی کبھی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم مجھے خود تلاش کرو۔ مجھے خود ڈھونڈو، مجھے ڈسکور کرو۔ بہت بار میں نے تمہیں بتانے کی کوشش کی، مگر تم نہیں سمجھ سکیں۔ سو میں نے چاہا کہ میں تمہیں خود بتا دوں۔''

وہ اب ٹیک لگا کر کرسی پہ بیٹھا جیسے یاد کر کے، سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ اس کی نگاہیں دور کسی غیر مرئی نقطے پہ جمی تھیں۔

وہ بالکل سانس روکے، دم سادھے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز تھا۔

''میں نے تمہیں سب کچھ ڈائریکٹلی اسی لیے نہیں بتایا، کیونکہ میں کبھی اتنی آسانی سے، اتنے صاف لفظوں میں کسی کو کچھ نہیں کہا کرتا۔ میرے پیشے کا یہی تقاضا ہے اور میں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ انفارمیشن کو ان کوڈ اور ڈی کوڈ کرنے میں صرف کیا ہے۔ اس لیے میں نے ایک پزل ترتیب دیا۔ ایک ٹریژر ہنٹ۔''

اور تم اسے حل کر لو گی۔ یہ میں جانتا ہوں۔ کب کرو گی، تب میں کہاں ہوں گا۔ زندہ بھی ہوں گا یا نہیں، باہر ہوں گا یا پھر سے جیل میں.....

میں نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ تم اسے حل کر لو گی۔''

جولائی کی گرمی میں ہی اس کے ہاتھ، پیر برف بن رہے تھے۔ وہ پلکیں بالکل بھی نہیں جھپک پا رہی تھی۔ وہ بس اسکرین کو دیکھ رہی تھی، ایسے جیسے اس نے کبھی اسے نہ دیکھا ہو۔ وہ واقعی پہلی دفعہ اس شخص سے مل رہی تھی۔

''جب تک انسان کسی دوسرے کی جگہ پہ کھڑا نہیں ہوتا، وہ نہیں جان پاتا کہ اصل کہانی کیا ہے۔ ایک ہی روایت میں اگر راوی اور مروی کی جگہیں بدل دو تو سارا قصہ ہی بدل کر رہ جاتا۔ پچھلے چند ماہ میں تمہاری زندگی کی کہانی کا حصہ رہا ہوں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم میری طرف کی کہانی سنو۔'' بات کے اختتام پہ وہ مسکرایا تھا۔

''اسے کہتے ہیں اپنی کہانیوں کو Swap کرنا، رائٹ؟''

''یو اِڈیٹ!'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ وہ ابھی تک پلکیں نہیں جھپک پا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ماہ دسمبر کے اسلام آباد کی خوب صورت، ٹھنڈی سی سہ پہر تھی۔ بادل ہر سو چھائے تھے۔ سبز درخت، سیاہ بادل، سرمئی سڑک، ایک پُرسکون ٹھنڈا سا امتزاج۔

وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ جس ہوٹل میں اسے جانا تھا وہ وہاں سے چند گز کے فاصلے پہ تھا۔ وہ عادتاً ٹیکسی سے مطلوبہ مقام سے ذرا دور اترا تھا۔ اب اسے پیدل چل کر ہوٹل تک جانا تھا۔

وہ وہی کر رہا تھا، مگر سر کے پچھلے حصے میں اُٹھتا درد شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ وہ میگرین نہیں تھا، مگر شدت ویسی ہی تھی۔ وہ ظاہر نہیں کرتا تھا، لیکن تکلیف کبھی کبھی ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ ابھی اس کی ذہنی اذیت کا بڑا سبب ممی کی باتیں ہی ہوئی تھیں، جو صبح سے اس کے دماغ میں گھوم رہی تھیں۔ جب ممی غصے سے اسے ''جہان سکندر'' کہہ کر مخاطب کرتیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب اگر وہ بات نہیں مانے گا تو وہ ہرٹ ہوں گی۔ ایسے مواقع کم آتے تھے، مگر جب آتے تو اسے دُکھی کر جاتے۔ تب اس کے پاس بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی نہیں تھا۔ آج تو ممی نے کال کے اختتام پہ طعنہ بھی دے دیا تھا۔

''جہان سکندر! تم مجھ سے زیادہ اپنے باس کی مانتے ہو، مجھے اب یہی لگا ہے۔''

ہوٹل کا بیرونی گیٹ سامنے تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا اندر داخل ہوا۔ اسے کسی نے نہیں روکا، البتہ آج معمول سے زیادہ سیکیورٹی نظر آ رہی تھی۔ اینٹرنس کینوپی کی طرف جاتے ہوئے وہ محتاط نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ یقیناً ہوٹل میں کوئی خاص تقریب ہوئی تھی، جس کی وجہ سے سیکیورٹی عام دنوں سے کہیں زیادہ تعینات کی گئی تھی۔

ابھی وہ انٹرنس سے ذرا دور تھا۔ جب اس کا موبائل بجا۔ وہ رُکا اور سیاہ جیکٹ کی جیب سے موبائل نکالا۔ اس کا سلور اسمارٹ فون جو کچھ عرصہ قبل اسے دیا گیا تھا، جس میں لگے بے حد بیش قیمت سرویلینس (نگرانی کرنے والے) آلات اس کی قیمت کو اسی ماڈل کے کسی بھی فون سے کئی گنا زیادہ بنا چکے تھے اور وہ جانتا تھا کہ موجودہ کام ختم ہوتے ہی اسے یہ سب واپس کرنا ہوگا، سیکرٹ فنڈ کی ایک ایک پائی کا حساب اور جسٹی فیکیشن انہیں ہی دینی پڑتی تھی۔

''مسز پارٹنر!'' اسکرین پہ یہ نام جل بجھ رہا تھا۔ وہ عادتاً کبھی بھی نمبرز لوگوں کے اصل ناموں سے محفوظ نہیں کرتا تھا۔ حماد پارٹنر کے نام سے اور اس کی منگیتر ثانیہ جوان کے ساتھ ہی کام کرتی تھی، مسز پارٹنر کے نام سے اس کے فون میں موجود تھی۔

''ہیلو!'' اس نے فون کان سے لگایا۔ پہلے دوسرے کو بولنے کا موقع دینا بھی اس کی عادت بن چکی تھی۔ بہت سی عادات جوان بارہ سالوں نے اسے دی تھیں۔

''تم کہاں ہو؟ میں لابی میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں؟''

''بس آ رہا ہوں۔'' اس نے موبائل بند کر کے جیکٹ کی جیب میں رکھا اور داخلی دروازے تک آیا۔ گارڈ نے کافی رکھائی سے اس سے شناخت طلب کی۔ آج واقعی حد سے زیادہ سختی تھی۔ ایسے مواقعے پہ جو کم ہی آتے تھے۔ وہ اپنی اصل شناخت ہی دکھایا کرتا تھا۔

اس نے اندرونی جیب سے والٹ نکالا، اسے کھولا اور اندر والٹ کے ایک خانے میں پلاسٹک کور میں مقید کارڈ کچھ اس طرح سے سامنے کیا کہ اس کا انگوٹھا اس کے نام کو چھپا گیا، مگر تصویر، ایجنسی کا سہ حرفی مخفف اور وہ مشہورِ زمانہ پھول بوٹوں سے مزید چار چوکھٹوں کا نشان واضح تھا۔

گارڈ کی تنی ابرو سیدھی ہوئیں، ایڑھیاں خود بخود مل گئیں اور ''سر'' کہتے ہوئے اس نے ذرا پیچھے ہٹ کر راستہ دیا۔

وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ والٹ واپس رکھتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔

کبھی کبھی جب وہ پاکستان میں ہوتا تھا تو یہ عیش اسے بہت اچھے لگتے تھے۔

لابی میں داخل ہوتے ہی اس نے بنا گردن گھمائے بس نگاہوں سے چھت، فانوس اور دیواروں کے کونوں میں لگے سیکیورٹی کیمروں کا جائزہ لیا۔ کتنے کیمرے تھے، ان کا رُخ کیا تھا۔ ڈیوٹی پہ کتنے گارڈز موجود تھے، اگر آگ لگ جائے یا ایمرجنسی ہو تو فائر ایگزٹ کس طرف تھی اور اس جیسی بہت سی باریکیوں کو جانچ کر وہ لابی میں ایک طرف لگے صوفوں کی جانب بڑھ گیا۔ جدھر ایک صوفے پہ ثانیہ بیٹھی تھی۔

اس نے سیاہ سفید دھاریوں والی شلوار قمیص پہ بلیک سویٹر پہن رکھا تھا، گلے میں دوپٹا، گہرے بھورے بالوں کی اونچی پونی اور اپنے مخصوص انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی ثانیہ اسے اپنی جانب متوجہ پا کر شناسائی سے مسکرائی تھی۔ وہ اس کی ایک بہت اچھی دوست تھی، ان سے جونیئر تھی مگر حماد کی فیملی سے گہرے تعلقات کے باعث وہ ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

وہ بھی جواباً ہلکے سے مسکرا کر اس کی طرف آیا۔ وہ دو صوفے آمنے سامنے لگے تھے۔ درمیان میں چھوٹی میز تھی۔ جس پہ ثانیہ کا سیاہ پاؤچ رکھا تھا۔ ایک قدرے بڑا پرس بھی ساتھ ہی پڑا تھا۔ وہ قریب آیا تو ثانیہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''السلام علیکم! کیسے ہو اور کب سے ہو ادھر؟''

''وعلیکم السلام۔ فائن، تھینکس۔ زیادہ دن نہیں ہوئے۔ کام سے آیا تھا۔'' مقابل صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے بتایا۔ وہ کتنے دنوں سے اسلام آباد میں تھا، تعداد اس نے نہیں بتائی۔ دوسرے آپ کے بارے میں جتنا کم جانیں، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔

''وہ تو مجھے اندازہ تھا۔ تمہارا کام!'' اس نے بیٹھتے ہوئے ابرو سے سیاہ پاؤچ کی طرف اشارہ کیا۔ جہان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''جتنا کر سکی، کر دیا۔ تمہاری معلومات ٹھیک تھیں۔ وہ سفارت خانے کی کار استعمال نہیں کرتی۔''

اب اس کے سامنے بیٹھی وہ اسے دھیمی آواز میں امریکی سفارت خانے کی سیکنڈ سیکریٹری کے متعلق بتا رہی تھی، جو ویزا سیکشن کی ہیڈ تھی اور بھارتی نژاد امریکی شہری تھی۔ اسے سفارت خانے کی سیکنڈ سیکریٹری کے متعلق چند معلومات درکار تھیں، وہ بھی بہت جلد۔ اس لیے اس نے صبح ثانیہ کو فون کیا تھا۔ ثانیہ تمام ضروری چیزیں لے آئی تھی اور اب زبانی بریفنگ دے رہی تھی۔

''یو نو واٹ! وہ امریکی سفارت خانے کی ان گاڑیوں میں سے کوئی استعمال نہیں کرتی جو ہر وقت اسلام آباد میں گردش کرتی رہتی ہیں ویسے ان گاڑیوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہے۔''

''ایک سو چالیس!'' اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ تصیح کی۔ ثانیہ سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ ہمیشہ اس سے زیادہ باخبر رہتا تھا۔

''بہر حال، وہ ان میں سے کسی گاڑی پہ سفر نہیں کرتی کیونکہ اس کو ایک جگہ یہ کہتے سنا گیا تھا کہ اگر ان ڈیڑھ سو...... ایک سو چالیس گاڑیوں میں سے کسی ایک کا دروازہ بھی کھلے تو ایجنسی کو خبر ہو جاتی ہے، اسی لیے اسے ایجنسی کی گاڑیوں سے چڑ ہے اور یہ بھی کہ ان کی اتنی سیکیورٹی ڈی سی میں نہیں ہوتی جتنی اسلام آباد میں ہوتی ہے۔''

''اس کے باوجود امریکی سفارت کار خود کہہ کہہ کر اپنی پوسٹنگ اسلام آباد میں کرواتے ہیں۔ کراچی سے بھاگتے ہیں مگر اسلام آباد تو ان کے لیے جنت ہے۔''

چند منٹ وہ دونوں سفارت خانے کی باتیں کرتے رہے۔ نام لیے بغیر، بے ضرر سی باتیں، پھر لمحے بھر کو جب وہ دونوں خاموش ہو گئے تو ثانیہ نے موضوع بدلا۔

''کوئی اور کام بھی ہے اسلام آباد میں؟'' اس نے سرسری سا پوچھا مگر وہ جانتا تھا وہ کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔

''ہاں! دو دن بعد میرے کزن کی مہندی ہے اور ممی چاہتی ہیں کہ میں وہ اٹینڈ کروں۔''

''اور تم کیا چاہتے ہو؟'' وہ پتلیاں سکیڑے بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ وہی تیکھا انداز جو ان کے ہم پیشہ افراد میں کثرت سے پایا جاتا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ بس میں ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہتا۔''

''ملو گے نہیں تو بات آگے کیسے بڑھے گی؟ تمہارا نکاح ہو چکا ہے تمہارے ماموں کے گھر۔ اس طرح اس بے چاری لڑکی کی زندگی تو مت لٹکاؤ یا نبھاؤ یا چھوڑ دو!'' بات کے اختتام پہ اس نے ذرا سے کندھے اچکائے۔

جہان نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ثانیہ کے لیے یہ تبصرہ کرنا کتنا آسان تھا۔

''چھوڑ ہی تو نہیں کر سکتا۔ ممی بہت ہرٹ ہوں گی۔ ایک ہی تو صورت ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ پھر سے ایک ہو جائیں، یہ راستہ میں کیسے بند کر دوں؟''

''تو پھر نبھاؤ۔ کتنے عرصے سے تم اس بات کو لٹکا رہے ہو۔ جا کر مل لو نا اپنے ماموؤں سے۔''

''میں ان کے گھر جاؤں، ان سے ملوں، ان کے ساتھ تعلقات پھر سے استوار کروں، میرا دل نہیں چاہتا یہ سب کرنے کو۔'' اس نے بے بسی سے سر جھٹک کر کہا تھا۔ اپنے ملک میں اپنے دوستوں کے ساتھ، بس یہی وہ مقام تھا، جہاں وہ اپنے دل کی بات کہہ دیا کرتا تھا۔

''دیکھو جہان! انسان اپنا کیا بہت جلد بھول جاتا ہے، وہ بھی بھول چکے ہوں گے۔ تم جاؤ اور ان کو ایک مثبت اشارہ دو۔ اس سے وہ یہ جان لیں گے کہ تم اور تمہاری ممی ان کے ساتھ رشتہ رکھنا چاہتے ہو۔ وہ تمہیں بہت اچھا ویلکم دیں گے۔'' وہ کرسی پہ ذرا آگے ہو کر بیٹھی، گویا سمجھا رہی تھی مگر وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

''میں رشتہ نہیں نبھا پاؤں گا، میں کیوں ان کو دھوکا دوں؟ کیوں ان کی بیٹی کے ساتھ زیادتی کروں؟ دیکھو! میں جھوٹ بول کر شادی نہیں کروں گا اور سچ جاننے کے بعد وہ اپنی بیٹی سے میری شادی نہیں کریں گے۔ بات پھر وہیں آجائے گی کہ ممی ہرٹ ہوں گی۔'' وہ شدید قسم کے

مخمصے میں تھا یا شاید وہ مسئلہ حل کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

''ضروری نہیں ہے کہ چیزیں ویسی ہی ہوں جیسے تم سوچ رہے ہو۔ تم انہیں بتانا کہ تم کیا جاب کرتے ہو۔ اس کی کیا پیچیدگیاں ہیں۔ کیا مجبوریاں ہیں اور یہ کہ تم یہ جاب نہیں چھوڑ سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ انڈرسٹینڈ کریں گے۔'' جہان نے نفی میں سر ہلایا۔ لابی میں پس منظر میں دھیما سا بجتا میوزک جیسے ایک دم سے بہت تلخ ہو گیا تھا۔

''تم میرے ماموؤں کو نہیں جانتی۔ وہ ذرا ذرا سی بات پہ ایشو بنانے والے لوگ ہیں۔ وہ اس بات کو ایشو بنا لیں گے کہ ہم نے پہلے انہیں بے خبر کیوں رکھا۔ اتنے سال میں کبھی ان سے ملنے نہیں آیا، وغیرہ وغیرہ۔ اپنے تمام رویے، سب تلخ باتیں، سب بھلا کر وہ پھر سے ممی پہ چڑھ دوڑیں گے اور نتیجتاً ممی ہرٹ ہوں گی۔ میں ان کو مزید دکھی ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ اب میں کیا کروں، میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' ثانیہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے بولی۔

''جہان! اگر ہر چیز بالکل ویسے ہو جیسے تم کہہ رہے ہو اور وہ واقعی تمہاری ممی کو پھر سے ہرٹ کریں، تب بھی وہ اتنی مضبوط تو ہیں کہ بہادری سے مقابلہ کر سکیں اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تم صرف اور صرف اپنے رویے کی صفائیاں دے رہے ہو۔ اصل وجہ یہ نہیں ہے۔''

تم بتاؤ! کیا ہے اصل وجہ؟'' اس نے سنجیدگی سے ثانیہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی، پھر بھی وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

''اصل وجہ یہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو کیونکہ میں تمہیں جانتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم جب انہیں بتاؤ گے کہ تم صرف ایک آرمی آفیسر نہیں بلکہ ایک جاسوس بھی ہو اور وہ اس پہ ردعمل ظاہر کریں، تب بھی تم آدھے گھنٹے میں انہیں مطمئن اور قائل کر لو گے۔''

''نہیں! میں انہیں قائل نہیں کر سکتا۔ وہ جانتے بوجھتے کبھی بھی اپنی بیٹی کی شادی کسی ایسے جاسوس سے نہیں کریں گے جس کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہو۔ جوان کی بیٹی کے ساتھ نہ رہے بلکہ دور کسی دوسرے ملک میں کسی دوسرے نام کے ساتھ زندگی گزارے، جو وہاں مر بھی جائے تو مہینوں ان کی بیٹی کو پتا نہ چلے کہ اس کی قبر کہاں ہے۔'' اذیت سے کہتے ہوئے وہ کرسی پہ پیچھے کو ہوا۔ آنکھوں کے سامنے ایک روح کو زخمی کر دینے والا منظر پھر سے لہرایا تھا۔

انطاکیہ کے قدیم شہر میں اس بڑے سے دالان کے فوارے کے ساتھ کھڑا گھوڑا اور اس کی کمر پہ اوندھے منہ لادا گیا وہ وجود...... اس نے سر جھٹکا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ اصل وجہ نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے تمہارا مسئلہ کیا ہے؟'' قدرے خفگی سے کہتی وہ باہم ملی مٹھیاں میز پہ رکھتی آگے ہوئی۔ ''تم اپنے ماموؤں سے ڈرتے ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' بےزاری سے ہاتھ جھلا کر وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''ایسی ہی بات ہے، تم اپنے احساسِ کمتری سے ابھی تک چھٹکارا نہیں پا سکے کہ وہ تمہیں تمہارے ابا کا طعنہ دیں گے اور تم ان کے سامنے سر نہیں اُٹھا سکو گے۔ کم آن جہان! اب اس چیز سے باہر نکل آؤ۔'' جہان نے جواب نہیں دیا۔ وہ گردن ذرا سی موڑے دائیں طرف دیکھتا رہا۔

''مجھے حیرت ہوتی ہے کبھی کبھی تم پہ۔ اتنا قابل آفیسر، اتنا شاندار ٹریک ریکارڈ، ایجنسی کے بہترین ایجنٹس میں سے ایک۔ پھر بھی اپنے اندر کے احساسِ کمتری سے تم نہیں لڑ سکے۔ تم اپنے ابا کے کسی جرم میں شریک نہیں رہے ہو جہان!''

جہان اس کی بات نہیں سن رہا تھا، وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

لابی کے دوسرے کونے میں دو لڑکیاں صوفوں پہ بیٹھ رہی تھیں۔ ایک نیلے لباس میں تھی اور دوسری سیاہ میں۔ سیاہ لباس والی دراز قد لڑکی جس نے سیاہ لمبے بال آگے کندھے پہ دائیں طرف کو ڈالے ہوئے تھے، کافی خوب صورت تھی۔ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے دوسری لڑکی کے ہاتھ سے کینڈی پکڑی اور منہ میں رکھی۔ دوسری لڑکی ساتھ ہی کچھ کہے جا رہی تھی۔

''جہان!'' ثانیہ نے اسے پکارا۔ وہ ذرا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ''کیوں دیکھ رہے ہو ایسے؟ یہ پاکستان ہے!'' وہ خجل ہوا، نہ شرمندہ، بلکہ دوبارہ ان دو لڑکیوں کو دیکھا۔

''ثانیہ! یہ بلیک کپڑوں والی میری بیوی ہے۔''

''اوہ اچھا!'' ثانیہ تجربے اور ذہنی پختگی کے اس درجے پہ تھی کہ بنا چونکے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہوں! اچھی ہے۔ تم نے بلایا ہے اسے؟"
"نہیں! میں تو خود اسے دیکھ کر حیران رہا ہوں۔" اس نے لاعلمی سے شانے اُچکائے۔
"آر یو شیور یہ وہی ہے؟"
"ہاں! میں نے اس کی پکچرز دیکھ رکھی ہیں۔" ثانیہ نے اب کے ذرا احتیاط سے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ سیاہ لباس والی لڑکی کو جیسے مرچیں لگی تھیں۔ کینڈی غالباً مرچ والی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا اور ناک سرخ پڑ گئی تھی۔ وہ جیسے خفگی سے ساتھ والی کو ڈانٹنے لگی جو ہنس رہی تھی۔
"کیا وہ تمہیں پہچان لے گی؟"
"معلوم نہیں۔ میں تصویروں کے معاملے میں احتیاط برتتا ہوں، سو شاید نہیں!" وہ بہت غور سے دور بیٹھی لڑکی کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ رہا تھا۔
"اتنی نزاکت؟" اسے مایوسی ہوئی تھی۔
"یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟" وہ جیسے خود سے بولا۔
"پتا کروں؟" ثانیہ کی بات پہ اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ وہ اُٹھ گئی۔ اسی وقت سیاہ لباس والی لڑکی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی اٹھی تھی۔ انہیں شاید کہیں پہنچنا تھا۔
"یہ کہاں پڑھتی ہے؟" ثانیہ نے جاتے ہوئے پوچھا۔
"انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، شریعہ اینڈ لاء، ساتواں سمسٹر!" ممی کی دی ہوئی معلومات اس نے جوں کی توں دُہرا دی۔ "اور اس کا نام حیا سلیمان ہے۔"
ثانیہ سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ وہ دونوں لڑکیاں اب لابی پار کر رہی تھیں۔ ثانیہ سیدھی ان کے پاس نہیں گئی، بلکہ پہلے اس نے قریب بنے کیفے کی طرف جاتے راستے پہ تیز تیز چلتے ایک ویٹر کو روکا اور اس سے ٹرے لی جس میں کافی کے چار کپ رکھے تھے۔ وہ یقیناً عملے سے واقف تھی، سو ویٹر سر ہلا کر آگے چلا گیا۔ ثانیہ ٹرے اُٹھائے ان دو لڑکیوں کی جانب بڑھ گئی، جو اب لابی کے آخری سرے تک پہنچ چکی تھیں۔

اس نے کچھ کہہ کر انہیں روکا۔ وہ دونوں پلٹی تھیں۔ اتنی دور سے وہ ان کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا مگر ان کے تاثرات بخوبی دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ نے ٹرے اسی لیے پکڑ رکھی تھی تاکہ وہ یہ تاثر دے سکے کہ وہ لابی کے قریب ہی بنے کیفے (جس میں سیلف سروس موجود تھی) سے اُٹھ کر آئی ہے، (اس کیفے کی انٹرنس پہ اگر آپ موجود ہوں تو لابی وہاں سے صاف نظر آتی ہے)، اور ان سے بات کر کے وہ فوراً واپس جہان کی طرف آنے کے بجائے اندر کیفے میں چلی جائے گی تاکہ وہ لڑکیاں اس طرف نہ دیکھ پائیں جہاں وہ بیٹھا تھا۔
سیاہ لباس والی لڑکی اچنبھے سے نفی میں سر ہلاتی کچھ کہہ رہی تھی۔ ان سے کافی فاصلے پہ بیٹھا وہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ دوسرے بھی بہت سے لوگ جو آس پاس سے گزر رہے تھے، گردن موڑ کر ایک دفعہ اس پہ نگاہ ضرور ڈالتے تھے۔ اس نے قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔
اسے کیا برا لگا تھا، وہ فیصلہ نہ کر سکا۔
"چیریٹی لنچ ہے کوئی، اسی لیے آئی ہے۔" ثانیہ ان کو بھیجنے کے بعد کیفے میں چلی گئی تھی اور اب جب کہ وہ لڑکیاں اندر جا چکی تھیں، وہ واپس آئی اور صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بتانے لگی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ غیر معمولی سکیورٹی کی وجہ اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔
کیا بات ہوئی؟" وہ سرسری سے انداز میں پوچھنے لگا۔
"بس وہی پرانا حربہ کہ آپ کو میں نے اصول الدین ڈپارٹمنٹ میں دیکھا تھا اور متوقع طور پر اس نے مجھے نہیں پہچانا، پھر میں نے پوچھ لیا کہ ادھر کس لیے آئی ہیں وہ، سو اس نے بتا دیا۔ اچھی ہے ویسے۔" اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھا رہا۔ کچھ اسے بہت برا لگا تھا۔
"پھر جاؤ گے آج اس کے گھر؟"
"ہاں! جاؤں گا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا مگر وہ اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس عجیب سے اتفاق نے ایک دم بہت کچھ بدل دیا تھا۔ "خالی ہاتھ مت جانا۔ کچھ لے کر جانا۔"
"میں ترکی سے ان کے لیے کچھ نہیں لایا۔ خالی ہاتھ ہی جاؤں گا۔"

"اچھا! پھر کچھ خرید کے لے جانا، اچھا امپریشن پڑے گا۔ چلو! چل کر کچھ کھاتے ہیں۔" وہ جیسے جان گئی تھی کہ اس کا موڈ اچھا نہیں ہے، سوا ٹھتے ہوئے بولی۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور میز پہ رکھا سیاہ پاؤچ اُٹھا کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

"تم اَپ سیٹ لگ رہے ہو۔"

"نہیں! بالکل نہیں۔" وہ زبردستی مسکرایا۔ "تم سناؤ کب تک تمہارا منگیتر دوبارہ مجھ جتنا ہینڈسم ہو جائے گا؟"

"چند سیشن مزید لگیں گے، برن کافی زیادہ تھا۔" بات کا رُخ بدلنے پہ ثانیہ اسے حماد کے بارے میں بتانے لگی۔ کچھ عرصہ قبل ایک حادثے میں اس کا چہرہ قدرے مسخ ہو گیا تھا، البتہ سرجری سے وہ بہتر ہو رہا تھا۔ وہ بے توجہی سے سنتا گیا۔ اس کا ذہن وہیں پیچھے تھا۔

پھر جب ثانیہ چلی گئی تو وہ باہر آ گیا۔ اسلام آباد کی ٹھنڈی سرمئی سڑک کے کنارے چلتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں ثانیہ کی باتیں مسلسل گونج رہی تھیں۔

"اس چیز سے باہر نکل آؤ..... تم اپنے ابا کے کسی جرم میں شریک نہیں رہے ہو جہان! اس چیز سے باہر نکل آؤ....."

اذیت کی ایک شدید لہر اس کے اندر اٹھی۔ آنکھوں کے سامنے وہ زخمی کر دینے والا منظر پھر سے لہرایا۔ ثانیہ غلط تھی۔ ایک جرم میں وہ اپنے باپ کے ساتھ کسی حد تک شریک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

بچپن کی یادیں اس کے ذہن میں بہت ٹوٹی پھوٹی، بکھری، مدھم مدھم سی تھیں۔ باسفورس کا نیلا سمندر، سمندری بگلے، جہانگیر میں واقع ان کا گھر اور دادا۔ یہ وہ سب تھے جو اس کے بچپن میں اس کے ساتھ تھے۔ دادا ابا کا ساتھ ان میں سب سے زیادہ اثر انگیز تھا۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ شادی کے ساتویں برس ملنے والی پہلی اور آخری اولاد۔ احمد شاہ کا اکلوتا پوتا۔

دادا کاروبار کے سلسلے میں ترکی آیا کرتے تھے۔ وہ فوج سے میجر ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ وقت سے قبل ریٹائرمنٹ کی وجہ ان کی خرابیٔ صحت تھی۔ فوج سے باعزت طور پہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے اور تب ہی وہ ترکی آئے اور پھر آتے جاتے رہے۔ ترکی میں ان کا علاج، جو پاکستان میں ممکن نہ تھا، قدرے سستا ہوتا رہا۔

جب ابا کا تبادلہ ترکی ہوا تو ممی بھی ساتھ آئیں۔ دادا نے تب ہی چند پیسے جوڑ کر جہانگیر (Cihangir) کے علاقے میں زمین خریدی۔ وہ خوش قسمتی کا دور تھا۔ ابا نے بعد میں اس جگہ گھر بنوانا شروع کیا۔ وہ تب ہی پیدا ہوا تھا۔ دادا کی گویا آدھی بیماری دور ہو گئی۔ وہ تب بہت خوش رہا کرتے تھے۔ باقی بچی آدھی بیماری کے بہترین علاج کی سہولتوں کے باعث وہ استنبول نہ چھوڑ سکے۔ اس وقت سلطنت ترکیہ اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی۔ ابھی پاپا کی حکومت آنے میں کئی دہائیاں پڑی تھیں۔ (پاپا یعنی طیب اردگان) مگر ترکی تب بھی خوب صورت تھا۔

ابا واپس چلے گئے تھے مگر ممی، دادا اور وہ ادھر ہی رہے۔ دادا بگڑتی صحت کے باعث کاروبار میں بہت زیادہ فائدہ نہ حاصل کر سکے، سو گھر کے حالات قدرے خراب ہوتے گئے۔ کچھ عرصہ قبل کی خوش حالی روٹھ گئی۔ ابا کی تنخواہ پہ گزارا کرنا تو ناممکن سی بات لگتی تھی۔ تب ہی اس نے ممی کو کام تلاش کرتے اور پھر نوکری کرتے دیکھا۔ تب وہ بہت چھوٹا تھا، وہ عمر جس میں محنت اور مشقت کے معانی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔

ممی ایک فیکٹری میں معمولی ملازمت کرنے لگی تھیں۔ پتا نہیں وہ کیا کام کرتی تھیں مگر ملک کے برے حالات کے باعث وہ نوکری ان کی تعلیمی قابلیت سے کم ہی تھی۔ گھر سے جیسے قسمت ہی روٹھ گئی تھی۔

دادا ابا کو کاروبار میں شدید گھاٹا ہوا اور ناسازیٔ صحت کے باعث ان کا کام کرنا نہ کرنا برابر ہو گیا، مگر وہ کام پھر بھی کرتے تھے۔ وہ محنت کرنے والے، مضبوط ہاتھوں والے، مشقت اُٹھانے والے آدمی تھے۔ بظاہر رعب دار لگتے، مگر بات کرنے پر اتنے ہی مہربان اور شفیق۔ جہان کو وہ کبھی بیمار نہیں لگتے تھے۔ روز صبح وہ اسے ساتھ لے کر واک پہ جایا کرتے تھے۔ وہ تھک جاتا، دادا نہیں تھکتے تھے۔ وہ بہت مضبوط، بہت بہادر انسان تھے۔ وہ اس کے آئیڈیل تھے، اس کے ہیرو۔

برا وقت کم نہیں ہوا، بڑھتا گیا تو ایک روز اس نے دادا کو افسردہ دیکھا۔ جہانگیر والا گھر جو انہوں نے بہت چاہ سے بنوایا تھا، انہیں بیچنا پڑ رہا تھا۔

"دادا! ہم وہ گھر کیوں چھوڑ رہے ہیں؟" جب وہ واک کے لیے باہر نکلے، تو ان کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے اس نے گردن اُٹھا کر ان کو دیکھتے پوچھا تھا۔ انہوں نے ملال سے اسے دیکھا مگر بولے تو آواز مضبوط تھی۔

''یہ گھر بہت بڑا ہے، ہماری ضرورت سے بھی زیادہ۔ اس کو بیچ کر ہم کوئی چھوٹا گھر لے لیں گے۔''

''کیا ہم نیا گھر خریدیں گے؟''

''نہیں بیٹا! ہم ابھی اس کے متحمل نہیں ہیں مگر یہ بات تم اپنی ماں سے مت کرنا۔ تم تو جانتے ہو، یہ جان کر وہ غمگین ہوگی۔ کیا تم کو راز رکھنے آتے ہیں میرے بیٹے؟'' اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔

''جی دادا! مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔''

پھر انہوں نے جہانگیر چھوڑ دیا اور وہ سمندر کنارے ایک قدرے خستہ حال جگہ پہ آبسے۔ یہاں ان کا گھر چھوٹا اور پہلے سے کمتر تھا۔ کرائے کا گھر۔ تب اس کے قریب پھیلا ساحل سمندر آج کی طرح خوب صورت پختہ فٹ پاتھ سے مزین نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہاں پتھروں کا کچا پکا سا ساحل تھا۔ بگلے ہر وقت وہاں پھڑ پھڑاتے ہوئے اُڑا کرتے۔ دادا کہتے تھے۔

استنبول مسجدوں کا شہر ہے، مگر جہان کو وہ ہمیشہ بگلوں کا شہر لگتا تھا۔ اپنے گھر کی بالکونی سے وہ ان بگلوں کو اکثر دیکھا کرتا تھا۔ شام میں وہاں بیٹھ کر وہ ان کو یوں شمار کرتا جیسے لوگ تارے شمار کرتے تھے۔ وہ تھک جاتا، مگر بگلے ختم نہ ہوتے۔

وہ اب بھی صبح دادا کے ساتھ باسفورس کنارے واک پہ جایا کرتا تھا۔ وہ اپنی بیماری کے باوجود بہت تیز تیز چلا کرتے، جہان بگلوں کے لیے روٹی کا ٹکڑا پکڑے ان کی رفتار سے ملنے کی کوشش میں لگا رہتا مگر وہ ہمیشہ آگے نکل جاتے، پھر رُک جاتے اور تب تک نہ چلتے جب تک وہ ان کے ساتھ نہ آملتا۔

''آپ رُکتے کیوں ہیں؟'' وہ تنگ کر پوچھتا۔

''میں چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا مجھ سے آگے نکلے، پیچھے نہ رہے۔'' وہ اسے ہمیشہ ''میرا بیٹا'' کہتے تھے۔

بہت بعد میں اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے اصل بیٹے کو بہت پسند نہیں کرتے۔ ابا عرصے بعد آیا کرتے اور جب بھی آتے، دادا کے ساتھ تلخ کلامی ضرور ہو جاتی۔ ممی اب کسی جگہ سے کپڑوں پہ مختلف قسم کے موتیوں کا کام سیکھتی تھیں، ساتھ میں نوکری۔ ابا ان سے بھی لڑ پڑتے مگر اس نے ہمیشہ اپنی ماں کو صبر شکر کر کے، خاموشی سے اپنا کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ ابا کو بہت رسان سے جواب دے کر انہیں خاموش کرا دیتیں اور ساتھ ساتھ اپنا کام کرتی رہتیں۔ ممی اور دادا، یہ دونوں افراد کبھی فارغ نہیں بیٹھتے تھے۔ بے کار رہنا، یہ لفظ ان کی لغت میں نہیں تھا۔

بہت بچپن سے وہ ان کی طرح بنتا گیا۔ اسے کام کی عادت پڑ گئی اور پھر اسے فارغ بیٹھنے کا مطلب بھول گیا۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ وہ ورکنگ کلاس لوگ ہیں۔ انہیں ہر وقت کام کرنا چاہیے۔ فارغ صرف ان لوگوں کو بیٹھنا چاہیے، جو امیر ہوں اور جن کے پاس ہر سہولت میسر ہو۔ جیسا کہ اس کے ماموں لوگ۔

وہ ان سے تب ہی مل پاتا جب کبھی شادو نادر وہ ترکی آتے۔ وہ اسے ہمیشہ ناپسند رہے تھے۔ اس کے دونوں بڑے ماموں رُعب دار، دبنگ اور مغرور سے تھے۔ ان کے سامنے بیٹھ کر ہی لگتا کہ وہ بہت شاہانہ قسم کے لوگ ہیں، جبکہ وہ، دادا اور ممی بہت غریب اور معمولی انسان ہیں۔ اس نے ممی کو بڑے ماموں کے سامنے سختی سے نفی میں سر ہلاتے، جیسے انکار کرتے یا منع کرتے ہیں، دیکھا تھا۔ ممی استفسار پہ کچھ نہ بتاتیں، دادا سے پوچھا تو انہوں نے بتا دیا۔

''وہ تمہاری ممی کو پیسے دینا چاہتے ہیں مگر وہ نہیں لیتیں۔''

''کیوں؟'' وہ حیرت سے سوال کرتا۔

''جب انسان کے یہ دو ہاتھ سلامت ہوں تو اس کی عزت کسی سے کچھ نہ لینے میں ہی ہوتی ہے۔ جو ہاتھ پھیلاتا ہے میرے بیٹے! وہ اپنا سب کچھ کھو دیتا ہے۔''

دادا کہتے تھے، انسان کو عزت سے جینا اور وقار سے مرنا چاہیے۔ جیسے دادا تھے، بہت عزت والے اور جیسی ممی تھیں۔ محنت کر کے، مشقت کر کے زندگی بسر کرنے والے لوگ مگر پتا نہیں کیوں ابا ایسے نہ تھے۔

وہ آٹھ برس کا تھا، جب ابا ایک روز ترکی آئے۔ تب وہ ایک اعلا عہدے پہ پہنچ کر کافی بہتر کمانے لگ گئے تھے، مگر تب بھی ان کے حالات نہ بدل پائے۔ البتہ اس بار اس نے پہلی دفعہ ابا اور دادا کو لڑتے ہوئے سنا تھا۔ بلند آواز سے، غصے سے بحث کرتے۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ ممی اس وقت گھر پہ نہیں تھیں۔ ابا لڑ جھگڑ کر سامان پیک کر کے باہر چلے گئے اور دادا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔

رات وہ ڈرتے ڈرتے، خاموشی سے دادا کے کمرے میں آیا۔ وہ چپ چاپ لیٹے تھے۔ لحاف اوڑھے، چھت کو تکتے۔ ان کا چہرہ پیلا، سفید اور ستا ہوا تھا اور آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔

"دادا!" وہ دھیرے سے ان کے پاس آ بیٹھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ اس نے پوچھا کہ "کیا وہ ٹھیک ہیں، انہوں نے کھانا کھایا ہے، ان کو کچھ چاہیے۔" دادا ابا نم آنکھوں سے اسے دیکھتے نفی میں سر ہلائے گئے۔

"تمہیں پتا ہے جہان!" اپنے بوڑھے ہاتھوں میں اس کا چھوٹا سا ہاتھ تھام کر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے کہنے لگے۔ "سلطان ٹیپو کو جس نے دھوکا دیا تھا، وہ میر صادق تھا۔ اس نے سلطان سے دغا کیا، مگر یز سے وفا کی۔ انگریز نے انعام کے طور پہ اس کی کئی پشتوں کو نوازا۔ انہیں ماہانہ وظیفہ ملا کرتا تھا، مگر پتا ہے جہان! جب میر صادق کی اگلی نسلوں میں سے کوئی نہ کوئی ہر ماہ وظیفہ وصول کرنے عدالت آتا تو چپڑاسی صدا لگایا کرتا۔

"میر صادق غدار کے ورثا حاضر ہوں"

ایک آنسو ان کی آنکھ سے پھسلا اور تکیے میں جذب ہو گیا۔

"میرے بیٹے! میری بات یاد رکھنا، جیسے شہید قبر میں جا کر بھی سینکڑوں سال زندہ رہتا ہے، ایسے ہی غدار کی غداری بھی صدیوں یاد رکھی جاتی ہے۔ دن کے اختتام پہ فرق صرف اس چیز سے پڑتا ہے کہ انسان تاریخ میں صحیح طرف تھا یا غلط طرف پہ۔"

پھر انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اسے آج بھی یاد تھا، دادا کے ہاتھ اس روز کپکپا رہے تھے۔

"میرے بیٹے! مجھ سے ایک وعدہ کرو گے؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ تمہارا ملک نہیں ہے، مگر تم اس کا کھا رہے ہو، کبھی اس کو نقصان مت پہنچانا۔ لیکن وہ جو تمہارا ملک ہے نا، جس نے تمہیں سب کچھ دیا ہے اور تم سے کچھ نہیں لیا، اس کا کبھی کوئی قرض آ پڑے تو اسے اٹھا لینا۔ میں وہ بوجھ نہیں اٹھ سکتا، جو تم پہ آن پڑا ہے۔ تم اسے اٹھا لینا۔" پھر انہوں نے لحاف میں جیسے جگہ بنائی۔ "آؤ میرے پاس لیٹ جاؤ۔"

وہ وہیں دادا کے بازو سے لگا، ان کے لحاف میں لیٹ گیا۔ دادا بہت گرم ہو رہے تھے، ان کا بستر بھی گرم تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ سو گیا۔

صبح وہ اٹھا تو دادا فوت ہو چکے تھے۔

اس روز وہ بہت رویا تھا۔ ممی بھی بہت روئی تھیں۔ اس نے پہلی بار جانا تھا کہ موت کیا ہوتی ہے۔ موت کی شکل اور ہیئت کیا تھی، وہ کچھ نہیں جانتا تھا، سوائے اس کے کہ موت بہت سرد ہوتی ہے۔ دادا کے جسم کی طرح۔ اس نے بہت بار ان کا ماتھا، ان کی آنکھیں اور ہاتھوں کو چھوا۔ وہ برف ہو رہے تھے۔ سرد اور ساکن۔

اسی شام ایک سمندری بگلا ان کی بالکونی میں آ گرا تھا۔ وہ زخمی تھا، جب تک اس نے دیکھا، وہ مر چکا تھا۔ جہان نے اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھا، وہ بھی سرد تھا۔ سرد اور سخت۔

یہی موت تھی۔

ابا ان کے ساتھ نہیں تھے، وہ کہاں تھے، اسے نہیں معلوم تھا۔ بس ممی اور وہ دادا کو پاکستان لے آئے۔ وہیں ان کو دفنایا گیا، وہیں وہ ابدی نیند جا سوئے، مگر ابا کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔

ممی ان دنوں بہت غم زدہ رہتی تھیں۔ غم بہت سے تھے، مگر تب وہ ان کی شدت کو نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اپنے بڑے ماموں کے گھر تھا، جب ایک روز ممی نے اسے بتایا کہ وہ اس کا نکاح ماموں کی بیٹی سے کر رہی ہیں۔

"کیوں؟" اس نے اپنا پسندیدہ سوال کیا تھا۔

"کیونکہ کچھ ایسا ہوا ہے کہ شاید ہم پھر یہاں نہ آسکیں۔ میں چاہتی ہوں کہ تعلق کی ڈور بندھی رہے۔ میرے بھائی مجھ سے نہ چھوٹیں۔" ممی نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا مگر اسے یاد نہیں تھا۔ اسے صرف دادا کی باتیں یاد تھیں۔

ماموں کا گھر، ممانیاں اور ان کے بچے، اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہاں رہ کر اسے مزید احساس دلایا جاتا کہ وہ ان سے کم تر ہے۔ وہ بہت حساس ہوتا جا رہا تھا۔ اسے یاد تھا۔

وہ اس روز فرقان ماموں کے کچن میں پانی لینے آیا تھا۔ جب اس نے اپنے سے تھوڑے سے بڑے داور کو غصے سے فریج کا دروازہ بند

کرتے دیکھا۔

"نہیں! مجھے انڈا ہی کھانا ہے۔" صائمہ ممانی اس کو اصرار کر کے منانے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر وہ بگڑے بگڑے انداز میں ضد کر رہا تھا۔

"کیوں انڈے ختم ہو گئے ہیں؟ میرے لیے انڈے کیوں نہیں بچے؟" دفعتاً اس کی نگاہ دروازے میں کھڑے گھرے بھورے بالوں والے لڑکے پہ پڑی تو اس کی آنکھوں میں مزید غصہ در آیا۔

"یہ لوگ ہمارے گھر کے سارے انڈے کھا جاتے ہیں، یہ کیوں آئے ہیں ہمارے گھر؟"

"بس کرو داور! کوفتوں میں ڈال دیے تھے، اسی لیے ختم ہو گئے۔ میں منگوا دیتی ہوں ابھی۔" ممانی نے پتا نہیں اسے دیکھا تھا یا نہیں، مگر وہ فوراً پلٹ گیا۔

اسے اپنے اندر سے ایک ہلکی سی آواز آئی تھی، جو انڈے کو ضرب لگا کر توڑنے کی ہوتی ہے، جو کسی کی عزت نفس مجروح کرنے کی ہوتی ہے۔

اس روز کھانے میں نرگسی کوفتے بنے تھے۔ اسے کوفتوں میں انڈے دکھائی دیے تو اس نے پلیٹ پرے کر دی۔ رات کو بھی اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اس کا اب ماموں کے گھر کسی بھی شے کو کھانے کا دل نہیں چاہتا تھا، انڈے تو کبھی بھی نہیں۔

ممی رات کو بہت حیرت سے وجہ پوچھنے لگیں تو اس نے صاف صاف وہ بتا دیا جو صبح ہوا تھا۔ ممی چپ ہو گئیں، پھر انہوں نے اسے توس اور ساتھ کچھ اور لا دیا۔ جتنے دن وہاں رہے، اس نے انڈوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ممی نے ایک دفعہ بھی اصرار نہیں کیا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ غم زدہ لگتی تھیں۔

وہ واپس آئے تو چند روز بعد ابا بھی آ گئے۔ وہ اب ان کے ساتھ رہتے تھے مگر گھر کا ماحول بہت تلخ اور خراب ہو گیا تھا۔ ممی اور ابا کی اکثر لڑائی ہو جاتی۔ ابا ہی بولتے رہتے، ممی خاموشی سے کام کیے جاتیں۔ اس نے بھی اپنی ماں کی عادت اپنالی۔ وہ بھی خاموشی سے ممی کا ہاتھ بٹاتا رہتا۔

پھر جلد ہی انہوں نے استنبول چھوڑ دیا۔ صرف ایک گھر، ایک شہر نہیں، انہوں نے بہت سے گھر اور بہت سے شہر بدلے۔ وہ جیسے کسی سے بھاگ رہے تھے۔ کسی سے اور کیوں؟ وہ نہیں جانتا تھا مگر اس نے ابا کو پھر ہمیشہ پریشان اور مضطرب ہی دیکھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا وہ دس برس کا تھا جب اس نے جان لیا کہ ابا کس سے بھاگتے تھے اور یہ اس نے تب جانا جب اس نے دنیا کا سب سے خوب صورت آدمی دیکھا۔

ان دنوں وہ انطاکیہ میں تھے۔ ابا کے ایک دوست کے فارم ہاؤس میں دو کمرے ان کے پاس تھے۔ ممی ان لوگوں کے باڑے اور کھیت میں کام کرتی تھیں۔ وہ فصل کے دن تھے۔ انطاکیہ میں کٹائی کے موسم کی خوشبو بسی تھی۔ فارم کی چھت پہ چڑھ کر دیکھو تو دور شام کی سرحدی باڑ دکھائی دیتی تھی۔ وہ اکثر وہاں سے شام کی سرزمین کو دیکھا کرتا تھا، مگر اس رات وہ سو رہا تھا۔ جب اس نے وہ آواز سنی۔

وہ ایک دم اٹھ بیٹھا، ممی ادھر نہیں تھیں...... ان کو آج رات دیر تک فصل کا کام نپٹانا تھا، وہ جانتا تھا۔ پھر آواز کس کی تھی؟ جیسے کوئی درد سے چلایا تھا۔ آواز ساتھ والے کمرے سے آئی تھی۔ وہ فوراً بستر سے اترا۔ وہ ڈرا نہیں، وہ میجر احمد شاہ کا بہادر پوتا تھا۔ اس نے سلیپرز پہنے اور دروازہ کھول کر باہر آیا۔

دوسرا کمرا جو سامان کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس کی بتی جلی ہوئی تھی۔ جہان نے اس کا دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر کا منظر بہت بھیانک تھا۔

کمرے میں چیزیں ادھر ادھر بکھری تھیں، جیسے بہت دھینگا مشتی کی گئی ہو۔ ابا ایک کونے میں شل سے کھڑے تھے، ان کے ہاتھ میں ایک چاقو تھا جس کے پھل سے خون کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ وہ خود بھی جیسے شاکڈ سے ہوئے سامنے فرش پہ دیکھ رہے تھے جہاں کوئی اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔

"ابا!" اس نے پکارا۔ جیسے کرنٹ کھا کر انہوں نے سر اٹھایا۔ اسے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خوف در آیا۔ انہوں نے گھبرا کر چاقو پھینکا۔

"یہ...... یہ میں نے نہیں...... یہ مجھے مارنا چاہتا تھا، میں کیا کرتا؟" بے ربط سی صفائیاں دیتے وہ آگے آئے اور جلدی سے دروازہ بند کیا۔

جہان پھٹی پھٹی نگاہوں سے فرش پہ اوندھے منہ گرے شخص کو دیکھ رہا تھا، بلکہ نہیں، وہ اس خون کو دیکھ رہا تھا جو اس کے اوندھے گرے جسم کے نیچے سے کہیں سے نکلتا فرش پہ بہہ رہا تھا۔

"جہان! میری بات سنو میرے بیٹے!" ابا نے بہت بے چارگی سے اسے کندھوں سے تھام کر سامنے کیا۔ ان کا میرے بیٹے کہنے کا انداز بالکل بھی دادا جیسا نہ تھا۔

"یہ آدمی مجھ سے لڑ رہا تھا، میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا سوائے اس کے کہ میں اس کو روکوں۔ ورنہ یہ مجھے پاکستان لے جاتا۔ میرے بیٹے! تم یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گے، ٹھیک ہے؟" اس نے خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتے اثبات میں سر ہلایا وہ بہت گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔

"تم کسی کو بتاؤ گے تو نہیں؟ اپنی ماں کو بھی نہیں۔"

"نہیں ابا! مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔" اس نے خود کو کہتے سنا۔

"چلو! پھر جلدی کرو۔ اس جگہ کو ہمیں صاف کرنا ہے اور اس کی لاش کو کہیں دور لے کر جانا ہے۔ میں گھوڑا لاتا ہوں، تب تک تم تولیہ لے کر یہ جگہ صاف کر دو۔"

اس نے فرماں برداری سے سر اثبات میں ہلایا۔ چند روز پہلے باڑے میں ایک گائے زخمی ہو کر مرگئی تھی، اس کا خون جو دیوار پہ لگ گیا تھا، اسی نے صاف کیا تھا ممی کے ہمراہ۔ اب بھی وہ کر لے گا۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" ابا تیزی سے باہر نکل گئے۔ اسے لگا شاید وہ اب کبھی واپس نہ آئیں، جیسے دادا نہیں آئے تھے۔ پہلی دفعہ اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کو ابا پہ بھروسہ نہ تھا مگر کام تو اسے کرنا تھا۔ وہ بھاگ کر دو تین تولیے لے آیا اور پنجوں کے بل پکے فرش پہ جھکا خون صاف کرنے لگا۔

وہ باڑے کی گائے نہیں تھی، وہ کوئی انسان تھا، جیتا جاگتا وجود جو اب لاش بن چکا تھا۔ چند لمحے بعد ہی وہ شدید خوف کے زیرِ اثر آنے لگا۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش آ گئی۔ مگر کام تو اسے کرنا تھا۔

کچھ ثانیے بعد کسی خیال کے تحت اس نے خون سے تر تولیہ چہرے کے قریب لے جا کر سونگھا۔ پھر ناک اس اوندھے منہ گرے وجود کے اوپر جھکا کر سانس اندر کو کھینچی۔

اس آدمی کے وجود سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ایسی خوشبو جو اس نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ وہ خوشبو دھیرے دھیرے اس کا خوف زائل کر گئی۔ بہت زور لگا کر اس نے اس آدمی کو سیدھا کیا۔ پھر اس کے سینے پہ، جہاں سے خون اُبل رہا تھا، تولیہ زور سے دبا کر رکھا۔ اپنے سامنے ایک نعش کو دیکھ کر بھی اسے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ احمد شاہ کا بہادر پوتا تھا، بلکہ اس شخص میں ہی کچھ ایسا تھا جو ہر طرف خوشبو بکھیر رہا تھا۔

اس نے سیاہ پینٹ، سیاہ سویٹر اور سر پہ سیاہ اونی ٹوپی لے رکھی تھی۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا، وہ بہت خوب صورت اور وجیہہ آدمی تھا۔ سیدھا کرنے پہ اس کی ٹھوڑی جو سینے سے جا لگی تھی، ذرا اوپر کو ہوگئی تو گردن پہ پسینے کے قطرے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ جہان نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا، وہ گرم تھا۔ دادا کے جسم کی طرح ٹھنڈا نہیں، سخت نہیں، اکڑا ہوا نہیں۔ وہ بہت نرم اور گرم تھا۔

کیا وہ واقعی مر چکا تھا؟

اسی اثنا میں ابا آ گئے۔ وہ اب پہلے سے زیادہ سنبھلے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس کے زخم پہ ایک کپڑا کس کر باندھنے کے بعد ابا اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ وہاں ایک گھوڑا کھڑا تھا۔ اسے بمشکل گھوڑے پہ اوندھا لاد کر ابا نے باگ تھام لی۔ وہ بھی ساتھ ہی ہولیا۔ رات کا وقت تھا، ہر سو سناٹا تھا، مہیب تاریکی۔

ابا فارم کی پچھلی طرف آ گئے۔ وہاں بڑے سے کچے صحن کے وسط میں ایک فوارہ بنا تھا۔ ابا دو بیلچے کہیں سے لے آئے اور زمین کھودنے لگے۔ اس نے بھی بیلچہ تھام لیا۔ وہ ان کی مدد کرنے لگا۔

کافی دیر بعد جب گڑھا کھد گیا تو ابا نے اس لاش کو بمشکل اُتار کر گڑھے میں ڈالا۔

"ابا! کیا یہ مر چکا ہے؟" وہ متذبذب تھا۔ تب بول اُٹھا۔ انہوں نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں! یہ مر چکا ہے، نہ سانس ہے نہ دھڑکن۔"

"یہ کون تھا ابا؟"

مٹی ڈالتے ہوئے وہ لمحے بھر کو رُکے، جیسے فیصلہ کر رہے ہوں کہ اسے بتانا چاہیے یا نہیں، مگر پھر بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"یہ پاک اسپائی تھا، اور مزید کوئی سوال نہیں۔"

جہان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ مزید کوئی سوال کر بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اس سیاہ پوش شخص پہ جمی تھیں، جس پہ ابا اب مٹی گرا رہے تھے۔ بلاشبہ وہ اس دنیا کا خوب صورت ترین آدمی تھا۔

پاک اسپائی۔ پاکستانی جاسوس۔

واپسی پہ ابا نے کمال مہارت سے تمام نشانات صاف کر دیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کمرا یوں ہو گیا جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چیزیں درست کرتے ہوئے اب اسے پتا نہیں کیوں پھر سے ڈر لگنے لگا تھا۔ جب تک وہ آدمی قریب تھا، اس کا سارا خوف زائل ہو گیا تھا، مگر جب وہ دفن ہو گیا تو وہ خوف پھر سے عود کر آ گیا۔ ابا نے ہر نشان مٹا ڈالا، ممی کو بھی کچھ پتا نہ لگ سکا۔

مگر اسے یاد تھا، دادا کہا کرتے تھے، انسان جس جگہ پہ جو کرتا ہے، اس کا اثر وہ اس جگہ پہ چھوڑ جاتا ہے۔ آثار ہمیشہ وہیں رہتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ سورہ یٰسین میں لکھا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ انسان جو بولتا ہے، اس کے الفاظ ہوا میں ٹھہر جاتے ہیں۔ آثار کبھی نہیں مٹتے۔

اس پاک اسپائی کے آثار بھی اس کے ذہن پہ، اس کمرے کے فرش پہ اور فوارے کے سنگ مرمر پہ نقش ہو چکے تھے۔

اگلے تین روز وہ بخار میں پھنکتا رہا۔ ایک عجیب سا احساس کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ فوارے کے ساتھ کچے صحن کی قبر سے کوئی اسے آواز دے رہا ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ اس کا بدلہ ضرور لیا جائے گا، یہ احساس ہر شے پہ حاوی تھا۔

تب پہلی دفعہ اس نے وہی منظر خواب میں دیکھا۔ حقیقت میں وہ اسے دفنا کر آ گئے تھے، مگر خواب میں ہمیشہ یوں دکھائی دیتا کہ جب وہ دفنا کر پلٹتے ہیں تو وہ قبر سے اسے پکارتا ہے۔ خوب صورت سحر انگیز سی آواز۔ مگر الفاظ اسے سمجھ میں نہیں آتے۔ وہ بہت مدھم، مبہم سا کچھ کہتا تھا، وہ کبھی نہ جان پایا کہ وہ کیا کہتا تھا لیکن تب بھی اسے لگتا کہ شاید وہ بتا رہا ہے کہ اس کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔

وہ لوگ جلد ہی اطاکیہ چھوڑ کر اوانہ چلے آئے۔ یہاں سے وہ کچھ عرصے بعد قونیہ منتقل ہو گئے اور جب وہ بارہ برس کا ہوا، تب چار برس کی خانہ بدوشی کے بعد وہ استنبول واپس آ گئے۔ ممی نے بتایا کہ اب انہیں حکومت نے اجازت دے دی ہے اور یہ کہ اب وہ آرام سے استنبول میں رہ سکتے ہیں۔

مگر آرام سے وہ تب بھی نہیں رہنے لگے تھے۔ ممی ویسے ہی جاب کرتیں، البتہ ابا بدلتے جا رہے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ مضطرب اور چڑچڑے رہنے لگے تھے۔ کبھی کبھی وہ غصے میں اتنے بے قابو ہوتے کہ اسے لگتا، وہ پاگل ہوتے جا رہے ہیں۔

تب اسے وہ پاک اسپائی بہت یاد آتا۔ پھر ایک رات ممی کے ساتھ لیٹے ہوئے، چھت کو تکتے اس نے ان سے پوچھ ہی لیا۔

”ممی! یہ پاک اسپائی کون ہوتا ہے؟“

ممی چند لمحے خاموش رہیں، پھر کہنے لگیں۔

”بیٹا! پاکستان کی فوج میں جو خفیہ ایجنسیز ہوتی ہیں، ان میں بہت سے فوجی اور غیر فوجی کام کرتے ہیں۔ ان اہل کاروں میں سے کچھ تربیت یافتہ ایجنٹ ہوتے ہیں، وہ اپنے ملک کے رازوں کی حفاظت کے لیے دوسرے ممالک کے راز چرایا کرتے ہیں۔“

”مگر وہ کرتے کیا ہیں؟“

”وہ دوسرے ممالک میں جا کر جاسوسی کرتے ہیں۔ بھیس بدل بدل کر وہ ہر جگہ پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی ایک نام یا شناخت نہیں ہوتی۔ ان کا کوئی ایک گھر یا ایک فیملی نہیں ہوتی۔ وہ کبھی کچھ اور کبھی کچھ بن جاتے ہیں۔ ان کو یہ سب سکھایا جاتا ہے، تاکہ وہ جاگیں اور پاکستان کے لوگ سکون سے سو سکیں۔ وہ اپنے ملک کی آنکھیں ہوتے ہیں۔“

”اور پھر ان کو کیا ملتا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ ممی نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”جب کوئی وردی والا سپاہی محاذ پہ لڑتا ہے تو اگر وہ زندہ رہ جائے تو غازی کہلاتا ہے۔ جان قربان کر دے تو شہید، اعزازات صرف وردی والے کو ملتے ہیں۔ ان کے نام سے سڑکیں اور چوک منسوب کیے جاتے ہیں، ان پہ فلمیں بنائی جاتی ہیں مگر جو جاسوس ہوتا ہے نا، وہ Unsung Hero ہوتا ہے۔ بے نام و نشان، خاموشی سے کسی دوسرے ملک میں زندگی بسر کرتا، وہ اکیلا، تنہا ہی کام کیا کرتا ہے اور اگر گرفتار ہو جائے تو اسے بچانے کے لیے عموماً کوئی نہیں آتا۔“

”کیوں؟“ وہ حیران ہوا۔

”بیٹا! یہی اس پیشے کی مجبوری ہوتی ہے۔ گرفتار ہونے کی صورت میں جاسوس کا ملک، حکومت، فوج، ایجنسی کوئی بھی کھلم کھلا اسے اون نہیں کرتی، اگر پوچھا جائے تو صاف انکار کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے طریقوں سے وہ اسے جیل سے بھگانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن اگر یہ نہ ہو سکے تو جاسوس کو ساری زندگی جیل میں رہنا پڑتا ہے۔ اگر وہ راز اگل دے تو وہ غدار کہلاتا ہے، اس لیے اسے یہ تک چھپانا ہوتا ہے کہ وہ جاسوس ہے، کیونکہ ہر ملک میں جاسوسی کی سزا موت ہوتی ہے۔ پھر اگر اس پہ جاسوسی ثابت ہو جائے تو اسے مار دیا جاتا ہے اور اس کی لاش کہیں بے نام و

نشان دفن کی جاتی ہے یا کسی بھی طرح ڈسپوز آف کر دی جاتی ہے اور بعض دفعہ کتنے ہی عرصے تک اس کے خاندان والوں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کا جنازہ تک نہیں پڑھایا جاتا۔"

اس کی آنکھوں کے سامنے انطاکیہ میں فوارے کے ساتھ کھودی گئی قبر گھوم گئی۔ بے نام ونشان قبر۔

"پھر تو اس کو کچھ بھی نہ ملا ممی!"

"بیٹا! جو آدمی خود کو اس کام کے لیے پیش کرتا ہے، وہ اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ گرفتار ہونے یا دیار غیر میں مارے جانے کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوگا۔ اس کو تاریخ کبھی ہیرو کے نام سے یاد نہیں کرے گی۔ اس کے ملک میں اس کی فائل پہ ٹاپ سیکرٹ یا کلاسیفائیڈ کی مہر لگا کر بند کر دی جائے گی۔ وہ یہ سب جانتے بوجھتے بھی خود کو اس جاب کے لیے پیش کرتا ہے۔ پتا ہے کیوں؟"

"کیوں؟" اس نے اپنا پسندیدہ سوال پھر سے دہرایا۔

"کیونکہ بیٹا! جو شخص اپنی جان کے ذریعے اللہ کی راہ میں لڑتا ہے اسے دنیا کے اعزازات اور تاریخ میں یاد رکھے جانے یا نہ رکھے جانے سے فرق نہیں پڑتا۔ اسے اس بات سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ گرفتاری کی صورت میں سب اسے چھوڑ دیں گے اور موت کی صورت میں کوئی اس کا جنازہ بھی اُٹھانے نہیں آئے گا، کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہیے ہوتی ہے اور جسے یہ مل جائے، اسے اور کچھ نہیں چاہیے ہوتا۔"

ممی اکثر اسے ایسی باتیں بتایا کرتیں۔ پھر ایک دم چپ ہو جاتیں اور پھر اپنی رو میں کہتیں۔ "اپنے ملک کے راز کبھی نہیں بیچنے چاہئیں۔ انسان بھی کتنی تھوڑی قیمت پہ راضی ہو جاتا ہے۔" اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک لو دیتی اذیت ہوتی۔ بہت عرصے بعد جہان کو اس تاثر کی وجہ سمجھ آئی تھی۔

اور یہ تب ہوا جب ان کی جدیسی (گلی) سے پچھلی جدیسی میں رہنے والے ایک لڑکے حاقان نے اس پہ راہ چلتے فقرہ اُچھالا کہ وہ پناہ گزین ہے، اور یہ کہ اس کا باپ ایک مفرور مجرم ہے۔

اس نے حاقان کو کچھ بھی نہیں کہا مگر رات جب ممی سے پوچھا تو انہوں نے بتا دیا۔ سب کچھ صاف صاف کہ کس طرح ابا سے غلطی ہوئی اور اس کی سزا وہ بھگت رہے تھے۔ جلاوطنی کی سزا۔ اور ترک حکومت نے رحم کھاتے ہوئے انہیں سیاسی پناہ بخشی تھی۔ تب اسے لگا، وہ بھی وظیفہ لینے والوں کی قطار میں عدالت میں کھڑا ہے اور چیراہی زور زور سے صدا لگا رہا ہے۔

"سکندر شاہ غدار کے ورثاء حاضر ہوں۔"

اس سب کے باوجود وہ ابا سے نفرت نہ کر سکا۔ وہ ان سے اتنی ہی محبت کرتا تھا جتنی پہلے۔ ابا ویسے ہی اب بیمار رہنے لگے تھے۔ ممی کبھی کبھی ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا کرتی تھیں۔ مگر ان کے اخراجات، اس کی پڑھائی ممی کو ڈبل شفٹ کام کرنا پڑتا۔ رات میں کبھی کبھار وہ ممی کو لاؤنج میں پاؤں اوپر کر کے بیٹھے تلوؤں پہ بنے چھالوں پہ دوا لگاتے دیکھتا۔ ان کے ہاتھ سوئی، موتی، کپڑے، دھاگے اور قینچی سے آشنا ہو کر اب سخت پڑتے جا رہے تھے۔

تب وہ سوچتا کہ وہ بہت محنت کر کے بہت امیر آدمی بنے گا، تاکہ ممی کو کام نہ کرنا پڑے اور وہ انہیں جہانگیر والا گھر دوبارہ خرید کر دے سکے۔ مگر وہ وقت قوس قزح کی طرح دور چمکتا تو دکھائی دیتا لیکن اگر وہ اس کے پیچھے بھاگتا تو وہ غائب ہو جاتا۔

ایک روز وہ اسکول سے آیا تو ممی اپنا زیور الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں، ان کے چہرے کے افسردہ تاثرات کو دیکھتے ہوئے ان کے پاس آبیٹھا۔

"ممی! کیا آپ اپنا زیور بیچ دیں گی؟ جیسے دادا نے جہانگیر والا گھر بیچا تھا؟"

ممی بے دلی سے مسکرا دیں۔

"چیزیں اسی لیے تو ہوتی ہیں۔ میں تمہارے ابا کے اس پیسے کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتی، جو بینک میں رکھا ہے اور جس نے ہم دونوں کو اپنے ملک کے سامنے شرمندہ کر دیا ہے۔ اس لیے زیور بیچ رہی ہوں۔ مگر تم یہ بات کسی کو نہیں بتاؤ گے۔ کیا تمہیں راز رکھنے آتے ہیں جہان؟" وہ اکثر دادا کو جہان سے یہ فقرہ کہتے سنتی تھیں، اس لیے دہرایا تو اس نے پُر ملال مسکراہٹ کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔

ممی نے زیور بیچ دیا۔ کچھ وقت کے لیے گزارہ ہونے لگا، مگر پھر اس کا دل چاہنے لگا کہ وہ بھی کچھ کام کر کے پیسہ کمائے۔ تاکہ اس کی ماں کے ہاتھ نرم پڑ جائیں اور ان کے پیروں کے چھالے مٹ جائیں۔ یہی سوچ کر اس نے پچھلی جدیسی کے حاقان کے چچا کرامت کی ورکشاپ

میں کام کرنے کے لیے خود کو پیش کر دیا۔ کرامت بے کا بیٹا علی کرامت اس کا کلاس فیلو بھی تھا، سو اس کو کام مل گیا۔ اسے راز رکھنے آتے تھے۔ سو یہ بات اس نے ممی سے راز رکھی۔

کرامت بے کی گاڑیوں کی ورکشاپ ان کے گھر کے ساتھ تھی، یعنی جہان کے گھر سے پچھلی گلی میں۔ جہان کا کمرا بالائی منزل پہ تھا، اگر وہاں سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو کرامت بے کا گھر اور ورکشاپ دونوں دکھائی دیتی تھیں۔ ورکشاپ گلی کے بالکل نکڑ پہ تھی، اس سے آگے دوسری گلی میں مڑو تو کمرشل ایریا شروع ہو جاتا تھا۔

ایک روز ممی نے اس کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا تو ورکشاپ میں ہاتھ منہ کالا کیے، کام کرتا نظر آ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ کھیلنے کے لیے جانے کی اجازت لے کر جایا کرتا تھا اور ممی کو علم ہوتا تھا کہ وہ علی کرامت کے گھر جا رہا ہے۔ آج ان کو پتا لگ گیا کہ وہ اصل میں کہاں جاتا تھا۔ جب وہ گھر آیا تو انہوں نے ساری بات دہرا دی، مگر نہ اسے ڈانٹا، نہ ہی خفا ہوئیں۔

"تم ورکشاپ میں کام کرو، اخبار بیچو یا پھولوں کے گلدستے بناؤ۔ کبھی ان کاموں میں اتنا پیسہ نہیں کما سکو گے کہ اپنی پوری کتابیں بھی خرید سکو۔ اس کے باوجود میں تمہیں نہیں روکوں گی۔ میں اپنے بیٹے کو مضبوط اور محنتی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

اس نے ہمیشہ کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔ کمائی نہ ہونے کے برابر تھی، مگر پھر بھی اسے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ اس نے ممی سے کہا کہ وہ بڑا ہو کر مکینک بنے گا۔ ممی خوب ہنسیں۔

"ابھی تم نے زندگی میں بہت کچھ دیکھنا ہے۔ بہت سے پیشے دیکھ کر تم کہو گے، تمہیں وہی بننا ہے لیکن اصل میں انسان کو وہی پیشہ اپنانا چاہیے جس کے مطابق اس کی صلاحیت ہو۔ ابھی یہ فیصلہ بہت دور ہے کہ تم کیا بنو گے۔"

مگر تب بھی وہ جانتا تھا کہ وہ مکینک ہی بنے گا۔ یہی اس کی منزل تھی۔ پھر کبھی کبھی وہ خواب اسے ستاتا۔ وہ خواب جس نے ان برسوں میں کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ پاک اسپائی اور اس کا روشن چہرہ، تب اس کی خواہش ہوتی کہ وہ بھی اس جیسا ہی بنے لیکن پھر وہ ڈر جاتا۔ معلوم نہیں کیوں۔

اس کا یہ خوف، یہ عجیب سا اُلجھن بھرا ڈر کب نکلا؟ شاید تب جب اس نے فریحہ سے دشمنی مول لی۔

فریحہ کرامت بے کے بھائی کی بیوی تھی۔ دراز قد، اسمارٹ، خوب صورت سبز آنکھوں اور کندھوں تک کرتے اخروٹی بالوں والی۔ اس کا لباس، اس کا اُٹھنا بیٹھنا، اس کے ناز و انداز، سب میں ایک شاہانہ سی جھلک ہوتی تھی۔ وہ بہت مغرور، بہت طرح دار سی تھی۔ اس کا بیٹا حاقان بھی اتنا ہی مغرور اور نک چڑھا تھا۔ فریحہ کا شوہر ایکان معمولی صورت کا تھا، جب کہ کرامت بے کافی وجیہہ تھے۔ اسی لیے حاقان، جو عمر میں جہان سے دو برس ہی بڑا تھا، ہر جگہ اپنی ماں کے حسن کے قصے سنایا کرتا تھا۔ وہ لوگ پیچھے سے عرب تھے، آپس میں عربی بولا کرتے۔ ایک روز فریحہ ایکان ان کے اسکول آئی تو حاقان نے سب کے سامنے اپنی ماں کو گلاب کا پھول پیش کرتے ہوئے عربی میں کچھ کہا۔ میں "انت مرہ جمیلہ" ہی اسے سمجھ آیا۔

اس نے علی کرامت سے مطلب پوچھا تو اس نے بتایا کہ "مرہ جمیلہ" بہت بہت خوب صورت عورت کو کہتے ہیں۔ اسے "انت" بھی بھول گیا۔ صرف "مرہ جمیلہ" ذہن پہ نقش رہ گیا۔

بے حد حسین عورت...... مرہ جمیلہ......

جب ممی اپنے زیور بیچ رہی تھیں تو انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے ایک نیکلس رکھ لیا ہے، وہ اسے نہیں بیچیں گے کیونکہ وہ اسے حیا کو دیں گی۔

"تم ہمیشہ یاد رکھنا۔ میں تمہاری شادی اپنے بھائی کے گھر ہی کروں گی، اس لیے تمہیں استنبول میں کوئی لڑکی بہت خوب صورت نہیں لگنی چاہیے۔ سن لیا تم نے؟"

مگر فریحہ کافی خوب صورت تھی، اسے بھی اچھی لگی، لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ اسے مرہ جمیلہ ہی کہہ دے۔

حاقان سے اس کا جھگڑا گیم کے دوران ہوا تھا۔ ورکشاپ میں کام ختم کر کے وہ جدیسی میں کھیلتے علی کرامت، حاقان اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ آ شریک ہوا تھا۔ حاقان کو اعتراض تھا، مگر علی کرامت کا کہنا تھا کہ جب دوسرے آدھے گیم کے دوران شامل ہو سکتے ہیں۔ تو جہان کیوں نہیں (اس کا اشارہ حاقان کی جانب تھا جو گزشتہ روز اسی طرح شامل ہوا تھا)۔

"مجھ میں اور اس میں فرق ہے۔ میں حاقان ایکان رضا ہوں اور یہ ایک پناہ گزین کی اولاد۔"

جہان نے ہاتھ میں پکڑی سرخ گیند کھینچ کر اس کو دے ماری۔ اس نے بروقت سر نیچے کر لیا مگر پھر تن فن کرتا آگے بڑھا۔ تھوڑی سی ہاتھاپائی کے بعد لڑکوں نے انہیں چھڑا لیا۔ وہ وہاں سے یوں بکھرے کہ حاقان کا ہونٹ پھٹا ہوا تھا اور جہان کی نکسیر پھوٹی تھی۔

گھر آ کر اس نے چپ چاپ خون صاف کر لیا۔

اصل اذیت اس طعنہ کی تھی، جو اسے دیا گیا تھا۔ جیسے منہ پہ چابک دے مارا ہو۔ وہ تکلیف بہت زیادہ تھی۔ پھر بھی وہ ابا کے خلاف نہ جا سکا۔ شاید اس لیے کہ اس کی ماں نے کبھی اسے باپ کے خلاف نہیں بھرا، بلکہ ہمیشہ یہی سکھایا کہ نفرت گناہ سے کی جاتی ہے، گناہ گار سے نہیں۔

حاقان نے البتہ چپ چاپ اپنا خون نہیں صاف کیا۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ فریحہ تن فن کرتی ان کے گھر آتی، بلند آواز اور رعونت سے اس کو بہت سی باتیں سنا کر گئی (اس کا شوہر کاروباری آدمی تھا، اور مالی حالات کرامت بے سے اچھے تھے، اسے اسی پیسے کا غرور تھا) یہی نہیں، اس نے جا کر میونسپلٹی والوں سے بات بھی کی کہ ان سیاسی پناہ گزینوں کو کہیں، اور رہائش اختیار کرنے کا کہا جائے ورنہ وہ ماحول خراب کریں گے۔

ممی کو اس بات کا علم نہ ہو سکا، وہ گھر پہ نہیں تھیں۔ ابا ان دنوں بیمار رہنے لگے تھے، سو کمرے میں تھے۔ اس نے اکیلے فریحہ کی باتیں سنیں، مگر چپ رہا۔ میونسپلٹی والی بات اسے علی نے بتائی۔ اس کا دل جیسے ٹوٹ سا گیا۔ ابا کی وجہ سے، بلکہ اس کے اپنے جھگڑے کی وجہ سے ان کو یہ گھر چھوڑنا پڑے گا۔ اتنی مشکل سے ممی خرچے کی گاڑی کھینچ رہی تھیں، اب ان کو مزید تکلیف سہنی پڑے گی۔ وہ بہت پریشان ہو گیا۔

''تم ان باتوں سے پریشان مت ہو بچے! کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ راستہ ہمیشہ ہوتا ہے، بس ڈھونڈنا پڑتا ہے۔'' علی کی بات سن کر اس کی ممی نے کہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر ان کو دیکھا۔

وہ اس وقت کچن سلیب کے سامنے کھڑی تھیں۔ وہ باہر کام سے آئی تھیں اور ابھی ابھی انہوں نے اسکارف سے کیا گیا، نقاب اتارا تھا۔ اب وہ ٹشو سے چہرے پہ آیا پسینہ تھپتھپا رہی تھیں۔ ان کا رنگ سیاہ تھا، وہ مصری تھیں، مصری سیاہ فام مگر پھر بھی ان کے چہرے پہ ایسی روشنی ایسا نور تھا کہ وہ نگاہ نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اسے وہ بہت خوب صورت لگتی تھیں۔ اس دن ان کی بات سن کر وہ خاموشی سے اٹھ گیا، مگر بعد میں مارکیٹ جا کر اس نے ایک کارڈ خریدا اور اس پہ انگریزی میں لکھا۔

''You are my marrah jameelah''

ساتھ میں ان کا نام اور رفقط میں اپنا نام لکھ کر اس نے کارڈ کو خط کے لفافے میں ڈالا اور گوند سے لفافہ بند کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ صبح جا کر چپکے سے یہ ان کو دے آئے گا۔ ٹھیک ہے کہ ممی نے کہا تھا کہ اسے کوئی دوسری لڑکی خوب صورت نہیں لگنی چاہیے۔ مگر وہ لڑکی تو نہ تھیں۔ وہ تو ایک درمیانی عمر کی خاتون تھیں، اپنی جیٹھانی فریحہ سے بالکل مختلف۔

جس پل وہ کارڈ اپنے بیگ میں رکھ رہا تھا، اسے کھڑکی کے باہر کچھ دکھائی دیا۔ اس نے جلدی سے بتی گل کی اور کھڑکی کے شیشے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

باہر رات پھیلی تھی۔ فریحہ کا گھر (جہاں کرامت بے اور ایکان دونوں کے خاندان اکٹھے رہتے تھے) اور کرامت بے کی ورکشاپ سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ ورکشاپ کے دروازے کے پاس دو ہیولے سے کھڑے تھے۔ ایک لاک کھول رہا تھا جبکہ دوسرا ساتھ میں چپکا کھڑا تھا۔

لاک کھول کر وہ اندر چلے گئے، جب دروازہ بند کرنے کے لیے وہ سایہ پلٹا تو اسٹریٹ پول کی روشنی ان دونوں پہ پڑی۔ لاک کھولنے والے شخص کا چہرہ واضح ہوا، جو کرامت بے کا تھا جب کہ اس کے پیچھے موجود لڑکی اسی وقت پلٹی تھی۔ روشنی نے اس کے اخروٹی بالوں کو چمکایا اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔

فریحہ......اور وہ بھی کرامت بے کے ساتھ اس وقت؟

استنبول میں رہنے والے ایک تیرہ سالہ لڑکے کے لیے یہ سب سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا، مگر یقین کرنا اور اس دھوکے کو جذب کرنا، یہ بہت مشکل تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تو تحیر کے عالم میں وہیں بیٹھا رہا تھا۔ پھر ہر رات اس نے ان پہ نظر رکھنی شروع کر دی۔ وہ ہر رات نہیں آتے تھے۔ دو، دو، تین، تین دن بعد آیا کرتے۔

قریباً ایک مہینے بعد اس نے فریحہ کو سرِ راہ اس وقت روکا، جب وہ صبح واک پہ تیز تیز چلتی جا رہی تھی۔

''لیڈی ایکان...... کیا آپ مجھے ایک منٹ دے سکتی ہیں؟''

فریحہ نے گردن موڑ کر کچھ اچنبھے، کچھ نخوت سے اسے دیکھا۔

"بولو!"

☆ ☆ ☆

ثانیہ کی باتیں تب بھی اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔ جب وہ اپنے اپارٹمنٹ بلڈنگ کی لفٹ سے نکلا۔ پرانی یادیں، کسی ٹوٹے کانچ کی سی صورت ماس میں کھب گئی تھیں۔ ان کو کھینچ کر نکالنے کی تکلیف کا تصور ہی جان لیوا تھا۔

اس نے سست روی سے فلیٹ کے دروازے میں چابی گھمائی اور دروازہ کھولا تو اوپر کہیں سے پانی سے بھری ڈبی آ گری۔ وہ عین ڈور میٹ پر گری تھی اور کارپٹ گیلا ہو گیا تھا۔ اس نے توجہ دیے بغیر دروازہ بند کیا۔ وہ اکثر ایسی چیزیں گھر میں چھوڑ دیتا تھا۔ اگر ڈبی ابھی گری تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اس کے بعد فلیٹ میں کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ ڈبی دوبارہ بھر کر رکھی جا سکتی تھی مگر کارپٹ پہ نشانات ضرور ملتے۔

اس کے باوجود عادت سے مجبور اس نے اندر آ کر کچن کی کھڑکی کی کنڈی چیک کی، پھر باتھ روم کے روشن دان کو دیکھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔

اس نے ٹی وی آن کیا اور لیپ ٹاپ گود میں رکھ کر پاؤں لمبے کر کے میز پہ رکھے، صوفے پہ بیٹھ گیا۔ وہ ان تمام ڈاکومنٹس کو دیکھنا چاہتا تھا جو ثانیہ نے اسے سی ڈی کی صورت میں دیے تھے۔

ثانیہ نے فائل پہ سہ حرفی پاس ورڈ لگا دیا تھا اور وہ اسے بتا چکی تھی کہ پاس ورڈ کیا تھا اگر وہ اس سے کچھ بھی لیتا تو اس کو اس فائل پہ یہی پاس ورڈ لگانے کا کہا کرتا تھا۔ "ARP"۔

لمحے بھر کو اس کا دھیان بھٹک کر اسلام آباد میں اپنے ہوٹل گرینڈ کے آفس کے باہر لگی تختی کی طرف چلا گیا۔ وہاں بھی اس نے یہی لکھوا رکھا تھا۔ اس سے عمومی تاثر یہی پڑتا تھا کہ اے آر پی کا مطلب عبدالرحمان پاشا ہے جب کہ ایسا نہیں تھا۔ وہ جب بھی خود کو اے آر پی لکھتا، وہ اس سے مراد کبھی بھی عبدالرحمان پاشا نہیں لیا کرتا تھا۔ اے آر پی کا مطلب اس کے نزدیک کچھ اور تھا۔

فائلز کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی وہ ذہنی طور پر الجھا ہوا تھا۔ ممی نے صبح اسے جتنی تاکید سے کہا تھا کہ وہ ماموں سے مل لے، اب اگر وہ نہیں جائے گا تو وہ ہرٹ ہوں گی اور یہی وہ چیز تھی جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ اسے جانا ہی پڑے گا۔ وہ جتنا اس رشتے اور ان رشتہ داروں سے احتراز برتنے کی کوشش کر رہا تھا، اب اتنے ہی وہ اس کے سامنے آ چکے تھے۔

بہت بے دلی سے اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ ماموں کا گھر یہاں سے دس منٹ کی ڈرائیو پہ تھا۔ کیا وہ ابھی ہی چلا جائے؟ گاڑی آج اس کے پاس نہیں تھی۔ سروس کے لیے دی ہوئی تھی، اسے کل ملنا تھی۔ اگر ہوتی تب بھی وہ ٹیکسی پر ہی جاتا، کیونکہ وہ ان کو یہی تاثر دے گا کہ وہ ترکی سے آج آیا ہے، دو ہفتے قبل نہیں۔ البتہ وہ ان کے گھر رکے گا نہیں۔ واپس آ جائے گا، کہہ دے گا کہ وہ ہوٹل میں رہائش پذیر ہے وغیرہ وغیرہ۔ کور اسٹوری تو اس کے پاس ہمیشہ تیار ہوتی تھی۔

وہ اٹھا، اپنی جیکٹ پہنی، جوگرز کے تسمے باندھے اور والٹ اٹھا کر جانے لگا، پھر خیال آیا کہ وہ خط کے لفافے اٹھا لے جن کو اسے پرانی تاریخوں میں اسٹیمپ کروا کے میڈم سیکنڈ سیکریٹری کو بھیجنا تھا۔ یہ کام ماموں کے گھر جانے سے زیادہ ضروری تھا، پہلے اسے یہی کرنا چاہیے۔

پانی کی ڈبی دروازے کی اوپری جگہ پہ احتیاط سے رکھ کر، اس کی ڈور پھنسا کر وہ باہر نکل آیا۔ ٹیکسی نے اسے ماموں کے سیکٹر کے مرکز پہ اتارا۔ یہاں سے ان کا گھر سو قدم کے فاصلے پہ تھا۔ جس دن وہ اسلام آباد پہنچا تھا، اس نے یونہی سرسری سادہ راستہ سمجھ لیا تھا۔ شاید اس کے لاشعور میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ اس دفعہ اسے جانا ہی پڑے گا۔

مرکز پہ ایک کوریئر سروس کی شاپ سامنے ہی تھی۔ اس کے سامنے پھول والا بیٹھا تھا۔ مختلف رنگوں اور قسموں کے پھول سجائے، وہ ان پہ پانی چھڑک رہا تھا۔ پھول...... اسے چاہیے کہ وہ ان کے گھر کچھ لے کر جائے، پھولوں سے بہتر کوئی تحفہ نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ ہی ایک بہت قیمتی اور خوب صورت تحفہ ہوتے ہیں۔ اس نے سوچا وہ لڑکے کو گلدستہ بنانے کا کہہ دے اور تب تک وہ اندر کوریئر سروس سے لفافے اسٹیمپ کروا لے۔

"بات سنو!" اس نے پھول بیچنے والے لڑکے کو پکارا۔ وہ جو پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا، فوراً پلٹا۔

"جی صاحب!" اپنے سامنے موجود آدمی کو دیکھ کر، جو سیاہ جیکٹ میں ملبوس، پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا، وہ جلدی سے پانی کا برتن رکھ کر مؤدب سا ہوا، اس کے پاس آیا۔

"گلاب کے پھول ہیں تمہارے پاس؟"

"کون سا رنگ چاہیے صاحب؟"

"سرخ!اس نے بنا سوچے کہہ دیا۔لڑکے نے ذرا تاسف سے سر ہلایا۔

"صاحب!سرخ پھول ختم ہو گیا ہے۔تھوڑے سے سفید گلاب پڑے ہیں۔وہ کر دوں؟"

"نہیں،نہیں۔"اس نے قدرے برہمی سے نفی میں سر ہلایا۔سفید گلاب،دشمنی کی علامت۔ممی کو پتا چلے،وہ پہلے ہی دن ماموں کے گھر سفید گلاب لے گیا ہے تو وہ از حد خفا ہوں گی۔

"مجھے سرخ ہی چاہئیں۔کہاں سے ملیں گے۔"

"صاحب!میرے پاس سرخ اسپرے ہے،ان سفید پھولوں کو اسپرے کر دوں؟قسم سے صاحب اتنی مہارت سے کروں گا،بالکل پتا نہیں چلے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے،یہی کر دو۔"اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔نقلی سرخ رنگ کے گلاب،سفید گلاب سے پھر بھی بہتر تھے۔

باب 11

پھولوں والا لڑکا جلدی جلدی باسکٹ سے سفید گلاب نکالنے لگا۔
"تم گلدستہ بناؤ، میں آتا ہوں۔" اس کی رفتار دیکھ کر وہ جان گیا کہ ابھی اسے کافی وقت لگے گا، اس لیے وہ اندر کوریئر شاپ کی طرف بڑھ گیا۔ اسے اگر کسی شے سے ازحد چڑ تھی تو وہ وقت ضائع کرنے سے تھی۔
کوریئر شاپ میں دو افراد کھڑے اپنے اپنے لفافے جمع کروا رہے تھے۔ ڈیسک کے پیچھے بیٹھا، پی کیپ پہنے لڑکا کمپیوٹر پہ مصروف نظر آ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے جا کر ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ دفعتاً ملازم لڑکے نے ٹائپ کرتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا۔ جہان پہ نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پہ شناسائی کی رمق ابھری۔ وہ جلدی جلدی کام نپٹانے لگا۔
دونوں افراد کو فارغ کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔
"جی احمد بھائی! کوئی خدمت؟"
"ہاں، چھوٹا سا کام ہے۔" وہ جیکٹ کی جیب سے چند صاف لفافے نکالتے ہوئے اس کے سامنے کاؤنٹر پہ آیا۔
"ان کو کچھ بیک ڈیٹس میں اسٹیمپ کرنا ہے اور کچھ کو آگے کی ڈیٹس میں۔ یہ دیکھو....." وہ اسے کام سمجھانے لگا۔ غضنفر اس کو جانتا تھا، اس سے پہلے وہ جہان کا اس سے ہٹ کر بھی ایک اضافی کام کر چکا تھا، نہ بھی کر چکا ہوتا تب بھی اس کے کارڈ کے باعث کر ہی دیتا۔
"انٹری نہیں کرنی بھائی؟" جب وہ لفافے واپس جیکٹ میں رکھنے لگا تو غضنفر حیرت سے بولا۔
"اوں ہوں..... میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ لمبا کام ہو جائے گا اور گھر میں سب ٹھیک ہے؟"
"جی بھائی!" غضنفر اسے گھر کی باتیں بتانے لگا۔ اس کا وہ بھائی جس کو جیل سے نکلوانے میں جہان نے مدد کی تھی، اب کام پہ لگ گیا تھا اور وہ اس بات سے کافی آسودہ لگ رہا تھا۔

"میں چلتا ہوں، تمہارا ابھی آف کرنے کا ٹائم ہو رہا ہے۔" اس کی بات تحمل سے سن کر اور تبصرہ کر کے اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ ماموں کے گھر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غضنفر سے مصافحہ کر کے وہ باہر آیا۔
سست رو لڑکا ابھی بو کے پلاسٹک کور کے گرد ربن باندھ رہا تھا۔
"اسپرے نہیں کیا؟" اس نے سفید گلاب کے پھولوں کو دیکھ کر اچنبھے سے ابرو اٹھائی۔
"میں نے ابھی دیکھا صاب! اسپرے ختم ہو گیا ہے۔ آپ ایسے ہی لے جائیں۔ دیکھیں! یہ سبز پتے ساتھ میں لگائے ہیں، کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔"
"اچھا، زیادہ لیکچر مت دو۔ کتنے پیسے ہوئے؟" ناگواری سے ٹوکتے ہوئے اس نے بٹوہ نکالا۔ اندر سے چند نوٹ نکالتے ہوئے اس کی نگاہ اپنے سروس کارڈ پہ پڑی۔ کیا ماموں کو یہ دکھانا تھا؟ نہیں، ابھی بہت جلدی ہو گا۔ پہلے اسے ان کا اعتماد جیتنا ہو گا اور وہ ان کی نازک اندام، مغرور سی بیٹی..... ان سب لوگوں کی زندگی کا حصہ بننا مشکل لگ رہا تھا۔
بو کے چھوٹا سا تھا۔ اس کو پہلو میں لٹکے ہاتھ میں لاپروائی سے پکڑے وہ سڑک کنارے چلنے لگا۔ ماموں کا گھر یہاں سے قریب تھا۔ مگر وہ کچھ دیر مرکز کی سڑکوں کے کنارے چلنا چاہتا تھا۔ ابھی وہ صرف اپنی سوچوں کو مجتمع کرنا چاہتا تھا۔
وہ کیا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی پُر یقین نہیں تھا۔ یا پھر وہ جو چاہتا تھا، اسے کہنے سے ڈرتا تھا۔ ماں سے کہنے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر خود سے تو کہہ ہی سکتا تھا اور اصل بات وہی تھی، جو ثانیہ نے آج دوپہر میں کہی تھی۔ وہ اپنے ماموؤں سے ڈرتا تھا۔ وہ ان کے طعنے سے ڈرتا تھا۔ اتنے سالوں بعد بھی وہ ان کے سامنے سر اٹھانے سے ڈرتا تھا۔ مگر ممی کہتی تھیں، وقت بدل گیا ہے۔ فرقان ماموں اور سلیمان ماموں نرم ہو گئے ہیں۔ البتہ پچھلے برس ہونے والی سلیمان ماموں سے ملاقات کے بعد اسے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی کہ ان کے مزاج کی سختی اور غرور ختم ہو گیا ہے۔ وہ ویسے ہی تھے۔ فرق یہ تھا کہ اب سلیمان ماموں کو اپنی بیٹی کی فکر تھی، اب وہ بیٹی والے تھے۔ ان کا ہاتھ نیچے تھا اور اس کا اوپر۔ پہلے کی بات اور تھی۔ تب ان

کی بیٹی چھوٹی تھی۔ انہیں مستقبل کی فکر نہیں تھی لیکن اب اس کی شادی کی عمر تھی۔ رشتے بھی آتے ہوں گے۔ اب وہ اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہوں گے اور ان کی پہلی ترجیح ان کا بھانجا ہی تھا۔ کوئی بھی اپنی خوشی سے بچپن کا نکاح نہیں توڑتا۔ سلیمان ماموں سے بھی اسے یہ اُمید تھی کہ وہ اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہوں گے نہ وہ خود چاہتا تھا۔ لیکن نبھانا...... یہیں آ کر وہ رک جاتا تھا۔ یہ رشتہ نبھانا بہت مشکل تھا۔

وہ ایسی چھوٹی سوچ کا حامل آدمی تو تھا نہیں کہ پرانے انتقام لینے کے لیے ان کی بیٹی کو لٹکائے رکھتا۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ وہ ان سے مل لے تا کہ دونوں فریقین دیکھ لیں کہ یہ رشتہ چل سکتا ہے یا نہیں۔ اگر اسے محسوس ہوا کہ وہ نبھا سکتا ہے تو ممی کو آگاہ کر دے گا اور اگر اسے لگا کہ وہ نہیں نبھا پائے گا تو...... وہ پھر اسی مقام پہ آ کر رک گیا۔ ممی ہرٹ ہوں گی۔ یہ وہ آخری چیز تھی جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ اتنے سال اگر اس نے جان بوجھ کر ماموں کی فیملی سے لاتعلقی اختیار کیے رکھی تو اس لیے کہ دور اندر وہ یہ رشتہ نہیں چاہتا تھا۔

سڑک کنارے سر جھکا کر چلتے ہوئے اس نے خود سے سچ بولنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ خود ہی یہ رشتہ نہیں چاہتا تھا۔ اس کی یہ ساری بے رخی، لاتعلقی اور اعراض برتنا، سب لاشعوری طور پہ اسی لیے تھا کہ وہ لوگ تنگ آ کر خود ہی رشتہ ختم کر دیں اور وہ ماں کو دکھ دینے کے بوجھ سے آزاد ہو جائے۔ یہ الگ بات تھی کہ یہ خود کو دھوکا دینے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ جو بھی یہ رشتہ ختم کرے، ذمہ دار تو وہی ہوتا۔ اس کے خشک رویے کے باعث ہی یہ رشتہ ٹوٹے گا۔

لیکن وہ لوگ اس سے اور کیا توقع رکھتے ہیں؟ کس نے کہا تھا انہیں کہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کا رشتہ طے کر دیں؟ اسے کبھی کبھی ان سب ذمہ داران پہ از حد غصہ چڑھتا تھا۔ ممی پہ البتہ نہیں چڑھتا۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ صرف اپنے بھائیوں کے ساتھ تعلق قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا، بس رشتے بچانے کے لیے ہی کیا۔ وہ جان بوجھ کر ماں کو شک کا فائدہ دے دیا کرتا تھا مگر ماموں کو نہیں۔ بے انصافی ہے تو بے انصافی سہی۔

بہت دیر وہ سڑکوں پہ بے مقصد چلتا سوچوں میں غلطاں رہا۔ وہ ابھی ان کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا مگر ماں کے سامنے اس کے ''میں ابھی ذہنی طور پہ تیار نہیں'' اور ''یہ بہت جلدی ہے، مجھے سوچنے کا وقت دیں'' جیسے بہانے نہیں چلتے تھے۔ اسے ایک دفعہ جانا ہی پڑے گا۔

گھڑی کی سوئیاں دس سے اوپر آ چکی تھیں۔ جب اس نے خود کو سلیمان ماموں کے گھر کے بیرونی گیٹ کے سامنے کھڑے پایا۔ گیٹ بند تھا۔ اندر گھر کی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس کی نگاہیں ساتھ والے گیٹ پر پھسلیں۔ یہ فرقان ماموں کا گھر تھا۔ وہ پہلے ایک دن آ کر یہ گھر دیکھ گیا تھا اور پھر فیس بک پہ روحیل نے ان دونوں گھروں کے اندر باہر کی اتنی تصاویر لگا رکھی تھیں کہ اسے اندرونی نقشہ بھی حفظ تھا۔

وہ ان دونوں وسیع و عریض اور خوب صورت بنگلوں کے سامنے سڑک پہ گویا کسی دوراہے پہ کھڑا تھا۔ اندر جائے، یا یہیں سے پلٹ جائے؟ اسے صرف ایک بہانہ درکار تھا، اس گھر اور اس کے مکینوں سے دور بھاگنے کا۔ صرف ایک وجہ وہ ڈھونڈ لے اور واپس پلٹ جائے لیکن کوئی وجہ تھی ہی نہیں۔ اسے اندر جانا ہی تھا۔

دفعتاً فرقان ماموں کے گیٹ کے پیچھے کھڑکا ہوا اور پھر بولنے کی آوازیں، قریب آتے قدم۔ وہ غیر اختیاری طور پہ تیزی سے ایک طرف ہوا۔ کالونی میں نیم اندھیرا سا تھا۔ گھروں کی بیرونی بتیاں بھی اس جگہ کو روشن کرنے میں ناکام تھیں۔ وہ فرقان ماموں کے گیٹ کے دائیں طرف ایک گھاس سے بھرے جنگلے کی اوٹ میں ہو گیا۔

گیٹ سے فرقان ماموں چند افراد سمیت باہر نکل رہے تھے۔ شلوار قمیص میں ملبوس مسکراتے ہوئے وہ خوش اخلاقی سے اپنے مہمانوں کو چھوڑنے باہر آئے تھے۔ مہمان تین مرد حضرات تھے، جن کی کار سڑک کے پار ایک خالی پلاٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ یہاں سے ذرا دور، نہ جانے کیوں ماموں اب ان افراد کے ساتھ باتوں میں مگن اسی طرف جا رہے تھے، پیچھے گیٹ کھلا رہ گیا تھا۔ گارڈ، چوکیدار، فی الوقت کوئی بھی نہ تھا۔ شادی قریب تھی۔ سو مصروفیت نے ملازموں کو بھی گھیر رکھا ہو گا۔

وہ اندھیری جگہ پہ دم سادھے کھڑا فرقان ماموں کو دیکھتا رہا۔ دل میں ایک عجیب سی ہوک اٹھی تھی۔ پرانی باتیں پھر سے یاد آنے لگی تھیں۔ اس نے بے اختیار سر جھٹکا اور جیسے امڈتی یادوں کو رفع کرنا چاہا۔

ماموں اب اپنے مہمانوں کی گاڑی کے ساتھ کھڑے ان سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اسے یوں وقت ضائع ہونے پہ الجھن ہو رہی تھی۔ چند منٹ تو وہ کھڑا رہا، مگر جب اسے لگا کہ ماموں اور ان کے مہمانوں کی گفتگو لمبی ہوتی جا رہی ہے تو وہ جنگلے کے عقب سے نکل آیا۔ وہ لوگ بہت دور تو نہیں تھے۔ البتہ ایسے رخ سے کھڑے تھے کہ کسی کا بھی چہرہ گیٹ کی جانب نہیں تھا۔

وہ فرقان ماموں کا سامنا کیے بغیر اندر جانا چاہتا تھا۔ کیا حرج تھا اگر وہ یوں ہی اندر داخل ہو جائے۔ فرقان ماموں کو متوجہ کرنا اور ان کے سوالات کا جواب دینا؟ نہیں، ابھی نہیں۔

بہت آرام اور آہستہ سے وہ کھلے گیٹ کے اندر چلا آیا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ لان خالی تھا۔ سب اندر تھے۔ اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر درمیانی دروازہ تلاش کیا۔ وہ سامنے ہی تھا۔ اس پہ گھنٹی لگی تھی لیکن اس نے پہلے دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اسے جانا تو سلیمان ماموں کی طرف تھا، سو ادھر رکنا بے سود تھا۔ وہ دروازے سے گزر کر سلیمان ماموں کے لان میں داخل ہو گیا۔

اتنے برسوں سے بنا اجازت دوسروں کے گھروں، لاکرز، موبائلز اور ای میلز میں خاموشی سے داخل ہونے اور نکلنے کی عادت کے باوجود وہ آفیشل کام کے بغیر ٹریس پاسنگ نہیں کیا کرتا تھا۔ اب بھی یہ کرتے وقت اس کے ذہن میں یہی بات تھی کہ وہ اس کے ماموں کا نہیں، بلکہ سسر کا بھی گھر ہے۔ اندر جا کر وہ بتا دے گا کہ وہ کس طرح داخل ہوا۔ بات ختم!

سلیمان ماموں کا ہرا ابھرا لان بھی سنسان اور سرد پڑا تھا۔ اسے پچھتاوا ہوا کہ اس نے پھول اٹھانے کا تکلف کیوں کیا۔ خوامخواہ ایک بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے۔ اس نے گلدستہ لان کی میز پہ رکھ دیا اور خود گھر کے داخلی دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

گھنٹی باہر گیٹ پہ تھی اندر اس داخلی دروازے پہ نہیں۔ اب کیا صرف دروازہ کھٹکھٹانے پہ کوئی نکلے گا؟ بہت تذبذب سے اس نے داخلی دروازے پہ دستک دی۔ البتہ وہ خود بھی جانتا تھا کہ اندر کمروں میں موجود افراد اس وقت یہ دستک نہیں سن پائیں گے۔ وہ جان بوجھ کر اس طرح کر رہا تھا، تاکہ اسے ان سے ملنا نہ پڑے اور وہ کہہ سکے "ممی میں گیا تھا، مگر آپ کے بھائیوں نے دروازہ ہی نہیں کھولا، میں کیا کرتا، سو واپس آ گیا۔"

حسب توقع دروازہ کسی نے نہیں کھولا۔ وہ سرد پڑتے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے گھر کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے یوں ہی جائزہ لینے لگا۔ اس گھر میں کون کون ہے۔ مہمان بھی آئے ہوں گے شادی کے۔ کوئی جاگ رہا ہے یا نہیں اور ایسی ہی باتوں کا سرسری سا معلوم کرنے وہ گھوم پھر کر گھر کو دیکھنے لگا۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ البتہ لان کے دائیں رخ پہ کھلتی ایک کھڑکی کے دو شیشے کے پٹ کھلے تھے۔ اتنی سردی میں کون کھڑکی کھول کر بیٹھا ہے؟

وہ اچنبھے سے بھنویں سکیڑے اس طرف آیا۔

شیشے کھلے تھے، البتہ جالی بند تھی۔ اس کے پیچھے پردے بھی گرے تھے۔ دو پردوں کے درمیان ایک درز سی تھی، جس سے کمرے کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ یہاں وہ عادت سے مجبور تھا۔ نچلا لب دانت سے دبائے، اس نے احتیاط سے گردن ذرا اونچی کر کے اندر دیکھا۔ کمرے میں مدھم روشنی پھیلی تھی۔ صرف ایک ہی بلب جل رہا تھا۔ روشنی کا دوسرا منبع بیڈ کے تکیے پہ رکھا لیپ ٹاپ تھا۔ جس کے سامنے وہ کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی تھی۔ اسکرین کی روشنی اس کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ وہ ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھے، دوسرے ہاتھ کی انگلی لیپ ٹاپ کے ٹچ پیڈ پہ پھیر رہی تھی۔

یہ وہی تھی جس کو اس نے دوپہر میں دیکھا تھا۔ اس نے وہی سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سلکی بال ملائی سے بنی جلد۔

اس کی کزن، اس کی بیوی، کیسا عجیب رشتہ تھا کہ دل میں کوئی احساس نہیں جاگتا تھا۔ نہ ہی اس سے ملنے کی کوئی خواہش تھی۔ نہ جانے کیوں، وہ مایوس ہوا تھا۔ جس طرح لوگ مڑ مڑ کر اسے ہوٹل کی لابی میں دیکھ رہے تھے، اسے وہ سب کچھ ناگوار لگا تھا۔ اس کا لباس گو کہ ایسا نہ تھا، آستین پوری تھیں، قمیض لمبی تھی، نیچے کھلا ٹراؤزر تھا۔ مگر اس کے کپڑوں کی فال ہی کچھ ایسی تھی اور کچھ اس کا انداز کہ وہ توجہ کھینچتے تھے۔ اسے ایسی لڑکیاں کبھی بھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اسے یہ لڑکی بھی قطعاً اچھی نہیں لگی تھی۔

رات کی مقدس خاموشی میں بٹنوں کی آواز نے ارتعاش پیدا کیا تو وہ چونکا۔ وہ اب اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بے چینی سے موبائل پہ کال ملا رہی تھی۔

"ہیلو زارا!" شاید رابطہ مل گیا تھا۔ تب ہی وہ دبے دبے جوش سے چہکی۔ "کیسی ہو؟ سو تو نہیں گئی تھیں؟ حیا بول رہی ہوں۔"

جہان نے سوچا، وہ کیوں سردی میں باہر کھڑا کسی کے کمرے میں جھانک رہا ہے؟ اس کو ممی نے ماموں وغیرہ کے سارے نمبرز دے رکھے تھے، پھر وہ ان کو کال کر کے بتا کیوں نہیں رہا کہ وہ ان کے گھر آ چکا ہے۔ اگر اس کی نیت اندر جانے کی ہوتی تو وہ لاک توڑ کر بھی اندر داخل ہو جاتا۔ ساری بات نیت کی تھی۔

"ساری باتیں چھوڑو زارا اور میرے پاس جو بڑی خبر ہے وہ سنو اور تم یقین نہیں کرو گی، میں جانتی ہوں۔"

وہ اندر موجود لڑکی کی باتیں بے توجہی سے سن رہا تھا۔ موبائل جیب سے نکالتے ہوئے وہ سلیمان ماموں کو فون کرنے کے بارے میں

سوچ رہا تھا۔ اس نے نمبر ملایا، پھر بند کر دیا۔ پھر ملایا، پھر بند کر دیا۔

"کین یو بلیو اٹ زارا گر مجھے یورپی یونین نے اسکالرشپ کے لیے سلیکٹ کر لیا ہے؟"

موبائل کی اسکرین پر انگلی سے نمبر لکھتا وہ جیسے چونکا تھا۔ یورپی یونین کا اسکالرشپ، ارسمس منڈس ایکسچینج پروگرام؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی دوست سے جو گفتگو کر رہی تھی، اس میں یہی نام اس نے لیا تھا۔ کیا وہ اسکالرشپ کے لیے کہیں جا رہی تھی؟

اس نے موبائل واپس جیب میں ڈالا۔ اس کی ساری حسیات اندر ہوتی گفتگو پہ لگ گئیں۔

"بالکل سچ کہہ رہی ہوں زارا۔" اب وہ کسی یونیورسٹی کی طرف سے آنے والی ای میل کا بتا کر اپنی دوست کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بالکل دم سادھے کھڑا سنے گیا۔ اسے صرف یورپ کی اس یونیورسٹی کا نام سننے میں دلچسپی تھی، جہاں وہ جا رہی تھی۔

"نہیں، اسپین کی Deusto نہیں، بلکہ ترکی کی سبانجی یونیورسٹی نے ہمیں سلیکٹ کیا ہے اور اب ہم ایک سمسٹر پڑھنے پانچ ماہ کے لیے استنبول جا رہے ہیں۔"

باہر سردی اور تاریکی میں کھڑکی کے ساتھ کھڑے جہان کو محسوس ہوا، کسی نے اس کا سانس روک دیا ہو۔ ترکی؟ استنبول؟ پانچ ماہ؟ اس نے بے یقینی سے پردوں کی درز سے جھلکتے منظر کو دیکھا۔ اس کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔

وہ اب اپنی دوست کو سبانجی میں ہیڈ اسکارف پہ پابندی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کی توجہ پھر بھٹک گئی۔ اسے لگا اسے پیشانی پہ پسینہ آ گیا ہے، جیکٹ کی آستین سے ماتھا صاف کرتے ہوئے وہ ذرا پیچھے کو ہوا تو ساتھ میں لگے گملوں سے ہاتھ ٹکرایا۔ بے خیالی میں ہونے والے اس عمل سے گملا لڑھک گیا۔ نیچے گھاس تھی، اس لیے وہ ٹوٹا نہیں، مگر پتوں کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ بھی اندر سنائی دی تھی، تب ہی اس نے اس لڑکی کو چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھتے دیکھا۔

وہ بہت احتیاط سے ایک طرف ہو گیا۔ وہ اتنی بے وقوف یا لا پروا نہیں تھی، اس کی حسیات کافی تیز تھیں۔ اسے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے، اس سے قبل کہ وہ پکڑا جائے۔

"ابا نے مجھے کبھی اسکارف لینے یا سر ڈھکنے پہ مجبور نہیں کیا، تھینک گاڈ....." وہ کھڑکی کی طرف نہیں آئی، بلکہ سلسلہ کلام وہیں سے جوڑے کہنے لگی۔ وہ دوسری دفعہ چونکا تھا۔ تھینک گاڈ؟ اس بات پہ تھینک گاڈ کہ اس کے باپ نے کبھی اسے سر ڈھکنے کو نہیں کہا؟ عجیب لڑکی تھی یہ۔

چند لمحوں میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے اندر نہیں جانا۔ اسے ان لوگوں سے ابھی نہیں ملنا، اسے پہلے اپنی "بیوی" سے بات کرنی ہوگی۔ اسے ان سے ملنے اور ان کو اپنی جانب سے کوئی بھی امید دلانے سے قبل اس لڑکی کو جاننا اور اعتماد میں لینا ہوگا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کو ترکی کا اسکالرشپ حاصل کرنے سے روکنا تھا۔ اللہ، اللہ، اگر وہ ترکی آ گئی تو وہ بری طرح سے پھنس جائے گا۔ کیسے سنبھالے گا وہ سب کچھ؟

اس نے گردن موڑ کر لان کی میز پہ رکھے گلدستے کو دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر جیب سے لفافوں کا بنڈل نکالا۔ وہ لفافہ جس پہ ایک روز قبل کی مہر درج تھی، اس نے وہ علیحدہ کیا، پھر اندرونی جیب سے پین نکالا۔

چند لمحے سوچتا رہا، پھر لفافے کے اندر رکھا چوکور سفید موٹا کاغذ باہر نکالا اور اس پہ لکھا "ویلکم ٹو سبانجی" یہ اس کو چونکانے کے لیے بہت ہوگا۔ کسی اور مقصد سے لیے گئے لفافے پہ اس کا نام لکھ کر اس نے ٹھیک سے اسے بند کیا۔

اندر وہ اپنی دوست کو ابھی تک پرسوں ہونے والی مہندی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

وہ دبے قدموں چلتا لان میں رکھی کرسیوں تک آیا، میز پہ رکھا بوکے اٹھایا اور متلاشی نگاہوں سے گھر کو دیکھا۔ کدھر رکھے وہ اس کو؟ کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سب سے پہلے حیا دیکھے۔ اس کے ماں باپ نہیں۔

حیا..... یہ نام بھی کتنا غیر مانوس تھا نا۔

اسے یہ گھر کے اندر رکھنا چاہیے۔ کچن کا ایک دروازہ عموماً باہر کی طرف کھلتا ہے، شاید وہ کھلا ہو۔ یہی سوچ کر وہ گھوم کر گھر کے دوسری طرف آیا۔ کچن کا بیرونی دروازہ بند تھا لیکن ایک کھڑکی جو باہر کی طرف کھلتی تھی، اس میں سے وہ یہ بوکے اندر رکھ سکتا تھا۔ کھڑکی اس طرح سے بنی تھی کہ باہر کی طرف شیشے کے پٹ تھے اور اندر کی طرف گرل لگی تھی۔ گرل کا ڈیزائن کچھ ایسا تھا کہ وہ بوکے اس کے اندر سے گزار کر سامنے کاؤنٹر پہ رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے لیے پہلے شیشے والے پٹ کو کھولنا ہوگا۔

اس نے بس دو دفعہ کھینچا اور پٹ کی کنڈی اکھڑ گئی۔ دیسی چیزیں، خیر! اسے صرف پھول اندر رکھنے سے غرض تھی۔ نہایت آہستگی سے گلدستہ اور بند لفافہ گرل میں سے گزار کر اس نے کاؤنٹر پہ رکھا، پھر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ شیشے والا پٹ احتیاط سے بند کرتے ہوئے وہ پلٹ گیا۔

صبح جو بھی وہ پھول دیکھے گا، لفافے پہ درج نام پڑھ کر ان کو حیا کے حوالے کر دے گا۔ وہ ضرور سوچے گی کہ رات کو ان کے گھر کے اندر کون پھول رکھ کر جا سکتا ہے۔ اس سے آگے کیا ہوگا، یہ اسے ابھی طے کرنا تھا، لیکن جو بات اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اس زبردستی کی ملاقات سے بچ گیا۔ ایک ان چاہے، مجبوری کے بندھن سے فرار کی مہلت میں چند دن کا اضافہ ہو گیا۔ اب وہ ممی کو کہہ سکتا تھا کہ وہ اس لیے اندر نہیں گیا کیونکہ ان کی بھتیجی ترکی آ رہی ہے اور یہ بات ممی کو پریشان کر دینے کے لیے کافی تھی۔

گھر سے نکلنے سے قبل کچھ سوچ کر وہ پورچ میں کھڑی گاڑیوں کی طرف آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فریحہ نے گردن موڑ کر کچھ اچنبھے، کچھ نخوت سے اسے دیکھا۔

"بولو!"

"میرا خیال ہے، ہم ادھر بینچ پہ بیٹھ جاتے ہیں۔" پُر اعتماد سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے ہاتھ سے سڑک کنارے بنی بینچ کی طرف اشارہ کیا۔

"لڑکے! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، جو کہنا ہے یہیں کہو۔"

"ٹھیک ہے۔ اب آپ میری بات سنیں۔" کندھوں کو ذرا سا اچکا کر وہ اس کے سامنے کھڑا کہنے لگا۔ "آپ نے مجھے پناہ گزین کی اولاد کہا تھا۔"

"اب بھی کہتی ہوں اور بہت جلد تمہیں اس جگہ سے نکلوا کر بھی دکھاؤں گی۔" اس نے ہلکی سی استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"لیڈی فریحہ! پناہ گزین کی اولاد ہونا بہتر ہوتا ہے، اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی کے ساتھ تعلقات استوار کرنے اور ہر دوسرے روز بعد رات کے ساڑھے بارہ بجے سنیک شاپ میں وہ کرنے سے، جسے گناہ کہتے ہیں۔"

اپنی زندگی میں پہلی دفعہ اس نے کسی گلابی، سنہری سے انسانی چہرے کو سفید پڑتے دیکھا تھا۔ ایسا جیسے کسی نے سفید پینٹ کر دیا ہو۔ فریحہ کا سارا خون ہی نچڑ گیا۔ کتنے ہی پل تو وہ شل کھڑی رہی۔

"اب آپ میری بات سنیں۔ مجھے اور میری فیملی کو اگر آپ نے یہاں سے نکلوانے کی کوشش کی تو میں آپ کے شوہر کے پاس چلا جاؤں گا اور یہ مت سوچیے گا کہ وہ میری بات نہیں مانیں گے۔ میں ان کو وہ ثبوت بھی دکھاؤں گا، جو میں نے اکٹھے کیے ہیں۔ یہ مت بھولیے گا کہ کیمرا ہر گھر میں ہوتا ہے۔"

فریحہ نے شاید کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یوں پکڑی جائے گی۔ وہ اتنی ششدر تھی کہ جواباً کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ اسے یوں ہی ہکا بکا چھوڑ کر پلٹ آیا۔ اس کا اپنا دل بھی زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ بہت دنوں سے اس نے فریحہ کے سامنے خود پہ اعتماد قائم کیا تھا اور یہ کیمرے والی بات تو ایک خالی دھمکی تھی، اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ سامنے کوئی مرد ہوتا تو رکھ کے دو تھپڑ لگاتا اور بک جھک کر چلتا کرتا، مگر فریحہ کا غرور کچھ ایسے گھائل ہوا تھا کہ وہ سنبھل ہی نہ سکی اور وہ دبی مسکراہٹ کے ساتھ واپس آ گیا۔

پھر دوبارہ وہ کبھی کرامت بے کی دکان پہ نہیں گیا۔ علی کرامت کے گھر جانا بھی اس نے ترک کر دیا۔ اس کی عزتِ نفس کو گوارا نہیں تھا کہ اب وہ ان کے گھر جائے۔ لیکن اکثر اسکول سے جاتے ہوئے بس اسٹاپ پہ شٹل کا انتظار کرتے وہ علی کرامت کو اپنی ڈاکٹر ممی کے ساتھ آتے دیکھتا تو پھر کافی دیر ان کو دیکھتا رہتا۔ نقاب سے بھی ان کی آنکھوں کی مسکراہٹ اور نرمی چھپتی نہ تھی۔

عمر حاقان اکثر نخوت سے کہتا نظر آتا کہ اس کی چچی ایک بدصورت، سیاہ فام عورت ہے۔ مگر جہان کو وہ عورت بہت خوب صورت لگتی تھی۔ مرو جمیلہ۔ اس کی مرہ جمیلہ۔ اس نے بہت عرصے بعد بالآخر ایک دن وہ مرہ جمیلہ والا کارڈ ان کو دے ہی ڈالا۔ وہیں بس اسٹاپ پہ کھڑے کارڈ پلٹ کر دیکھتے وہ بے اختیار ہنس دی تھیں۔

پھر بہت عرصہ نہیں گزرا، جب اس نے سنا، نانا کی طبیعت خراب تھی۔ ممی کو اس خبر نے بے چین کر دیا تھا۔ وہ بار بار پاکستان فون کرتیں۔ اسے نہ بتاتیں، مگر وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑا سنتا رہتا۔

"پلیز بھائی! مجھے اس طرح منع مت کریں۔ میں ابا سے ملنا چاہتی ہوں۔ بس میں اور جہان آئیں گے، کسی کو پتا نہیں چلے گا، پلیز آپ مجھے آنے دیں۔"

وہ آنسو پونچھتی منت بھرے لہجے میں کہہ رہی ہوتیں۔ ایک شام اس نے ہمت مجتمع کر کے ابا کے کمرے کا ایکسٹینشن ریسیور اٹھایا، جب ابا سو رہے تھے اور ممی لونگ روم میں بیٹھی پاکستان بات کر رہی تھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے سبین! ابا بالکل ٹھیک ہیں۔ تم یہاں آنے کا مت سوچو۔" دوسری طرف فرقان ماموں کہہ رہے تھے۔

"مگر میرا دل کہتا ہے کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ میں آنا چاہتی ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔ تمہارے اس مفرور شوہر نے سارے زمانے میں ہمیں بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم پہلے ہی لوگوں سے اس بات پہ منہ چھپاتے پھرتے ہیں کہ ہمارا بہنوئی مفرور ہے اور سیاسی پناہ لے کر رہ رہا ہے۔ اب تم آؤ گی تو ساری دنیا کیا کہے گی؟"

"مجھے ابا سے زیادہ کسی کی پروا نہیں ہے اور سکندر میرے ساتھ تو نہیں آ رہے۔ میں بس ایک دن کے لیے آ جاتی ہوں، اگر رشتہ داروں سے سامنا ہو گیا، تب بھی وہ مجھے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ابا سے ملنے آنے پہ کون مجھ پہ انگلی اٹھا سکتا ہے بھائی؟" ممی کو ماموں کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"میری بات سنو سبین! ہم نے تمہارے شوہر کے اس کارنامے کے بعد لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ سکندر دولت دشمندگی کے باعث ساری زندگی پاکستان کا رخ نہیں کر سکتا۔ آخر کارنامہ بھی تو خاصا شرم ناک انجام دیا ہے نا۔ ہم نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم نے تم لوگوں سے قطع تعلق کر لیا ہے۔"

فون لائن پہ چند لمحے کو ایک ششدر سی خاموشی چھا گئی، پھر ممی کی ڈوبتی آواز سنائی دی۔

"آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں بھائی؟ میں آپ کی بہن ہوں، آپ مجھے یوں ڈس اون نہیں کر سکتے۔ ہمارے..... ہمارے بچوں کا رشتہ ہوا ہے۔"

"سلیمان کی بیٹی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اس رشتے کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ ویسے بھی یہ تم نے اپنی خود غرضی کے باعث کیا۔ تم جانتی تھی کہ سکندر نے کیا، کیا ہے اور تمہیں ڈر تھا کہ ہم لوگ تمہیں چھوڑ نہ دیں، اس لیے تم نے یہ رشتہ کیا۔"

"ہاں! میں نے دکھائی خود غرضی۔ ہاں! میں نے چھپائی حقیقت۔ مگر میں نے یہ رشتہ جوڑنے کے لیے کیا۔ صرف اس لیے کہ میں آپ سے نہ کٹوں۔ اب آپ مجھے میرے باپ سے ملنے سے روک رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپ لوگوں کے سامنے جھوٹے ثابت نہ ہو جائیں؟" ممی دبی دبی چیخی تھیں۔

"اگر تم اس طرح آؤ گی تو نہ صرف ہم میں سے کوئی تمہیں لینے نہیں جائے گا، بلکہ ہم واقعتاً تمہارے ساتھ قطع تعلق کر لیں گے اور جب ابا جان کو یہ معلوم ہو گا تو ان پہ کیا گزرے گی، یہ سوچ لینا اور یہ بھی کہ اگر ان کو کچھ ہوا تو اس کی ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو گی۔"

"بھائی!" ممی کہتی رہ گئیں مگر دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے ممی کے ریسیور رکھنے کا انتظار کیا۔ پھر آہستہ سے فون رکھ کر باہر آیا۔ ممی صوفے پہ بیٹھی سر ہاتھوں میں دیے، دبی دبی سسکیوں سے رو رہی تھیں۔

اس نے ٹشو کے ڈبے سے دو ٹشو نکالے اور ان کے سامنے لا کر دیے۔ ممی نے پھیکا چہرہ اٹھایا۔

"ممی! آپ ماموں کی بات نہ سنیں، ہم پاکستان ضرور جائیں گے۔ اگر وہ ہمیں لینے نہیں آئیں گے تو ہمارے پاس ان کا ایڈریس ہے، ہم کیب کر کے ان کے گھر چلے جائیں گے۔"

وہ بس نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ شاید انہیں معلوم تھا کہ وہ دوسرے فون پہ سب سنتا رہا ہے۔

"ہم ان کے گھر جائیں گے، مگر ہم وہاں کچھ کھائیں گے نہیں۔" اس نے جیسے انہیں یاد دلایا۔ وہ آنسوؤں کے درمیان ہلکا سا مسکرائیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں مسکرائی ہیں۔ بہت سال بعد اسے احساس ہوا کہ وہ شاید اپنے کم عمر بیٹے کی خود داری اور عزت نفس کے پاس پہ فخر سے مسکرائی تھیں۔

ممی نے ماموؤں کی ایک نہیں سنی۔ انہوں نے پیسے جوڑنے شروع کیے۔ وہ زیور جو انہوں نے اپنی بھتیجی کے لیے رکھا ہوا تھا، وہ بھی بیچ دیا۔ اب وہ صرف روانگی کے انتظامات میں لگی تھیں۔ ابا کی طبیعت بہت بگڑتی جا رہی تھی۔ ممی کو ان کے ساتھ کسی کے رہنے کا انتظام بھی کرنا تھا۔

ابھی روانگی میں دو دن تھے کہ ماموں کا فون آ گیا۔ نانا جان کا انتقال ہو گیا تھا۔

ممی کے لیے نانا کے انتقال کی خبر کا صدمہ اس صدمے سے کہیں چھوٹا تھا جو انہیں یہ جان کر لگا تھا کہ نانا کا انتقال اس روز نہیں، بلکہ ایک ہفتہ قبل ہوا تھا، مگر چونکہ ممی کے آنے سے ماموؤں کی عزت اور شان پہ انگلی اٹھائی جانے کا خدشہ تھا، اس لیے ان کو اطلاع ہی دیر سے دی گئی، تا کہ وہ ان کی وفات کی رسومات میں بھی شامل نہ ہو سکیں۔

وہ انٹرنیٹ کا دور نہیں تھا، خط اور فون کا زمانہ تھا، مگر ممی کا نمبر اور ایڈریس (بہت دفعہ گھر بدلنے اور دیگر رشتہ داروں سے رابطہ نہ رکھنے کے باعث) فقط ماموؤں کے پاس تھا۔ اس لیے کسی اور سے بھی اطلاع نہ پہنچ سکی۔

اس روز اس نے پہلی دفعہ اپنی بہت صبر والی مضبوط ماں کو، جن کی سسکیوں کی آواز سانس کی آواز سے اونچی نہیں ہوتی تھی، پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح روتے دیکھا۔ ان کا تو جیسے سب کچھ لٹ گیا تھا۔ ان کے پاس رونے کو بہت سے غم تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کس بات کا ماتم کریں۔ باپ کے مرنے کا، یا بھائیوں کے رویے کا۔

دو روز تک وہ ٹھیک سے کچھ کھا بھی نہ سکیں۔ وہ بس خاموشی سے ان کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔ تیسرے روز وہ علی کرامت کی ممی کو بلا لایا۔ وہ آئیں اور ممی کو تسلی دینے لگیں۔ ممی ذرا سنبھل گئیں۔ انہوں نے کھانا بھی کھا لیا۔ مگر ان کے جانے کے بعد وہ اس سے بولیں۔

''سنو جہان! میرا خیال تھا کہ تم راز رکھنا جانتے ہو۔ ہمارے مسئلے اور ہماری پریشانیاں بھی راز ہی ہوتی ہیں۔ ان کا دوسروں کے سامنے اشتہار نہیں لگاتے بیٹا! جو انسان اپنے آنسو دوسروں سے صاف کرواتا ہے، وہ خود کو بے عزت کر دیتا ہے اور جو اپنے آنسو خود پونچھتا ہے، وہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط بن جاتا ہے۔''

اس نے خفت سے سر ہلا دیا۔ یہ بات اس نے اپنے ذہن میں، دل میں اور ہاتھ کی لکیروں میں نقش کر لی کہ اسے اپنے مسئلے خود ہی، اکیلے اور تنہا حل کرنے ہیں۔ کبھی بھی لوگوں کو بتا کر نہ ہمدردی لینی ہے اور نہ ہی تحسین مانگنی ہے۔

ممی نے پاکستان جانے کا ارادہ بدل دیا۔ نانا جان رہے نہیں اور جن لوگوں کے دل میں ان کی اور ان کے شوہر کی عزت و حرمت نہ تھی، ان لوگوں کے درمیان جا کر وہ کیا کرتیں؟

دوبارہ وہ اس کے سامنے نہیں روئیں، مگر اب وہ بہت دکھی رہنے لگی تھیں۔

ابا کی طبیعت ان ڈراؤنے خوابوں سے بگڑنے لگی تھی، جو ان کو اب قریباً ہر رات ستاتے تھے۔ کچھ خواب تو اسے بھی آتے تھے، مگر اس کے خواب میں اس کو ملامت نہیں کیا جاتا تھا، بس وہ آواز...... وہ پاک اسپائی، وہ گھوڑا، وہ فوارہ...... وہ سارا منظر پھر سے تازہ ہو جاتا، ایسے جیسے زخم تازہ ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں ابا کیا دیکھتے تھے، مگر وہ اکثر راتوں کو جاگ کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ممی کے چہرے پہ کوئی نشان دیکھتا تو جان جاتا کہ ابا نے ہاتھ میں اٹھائی چیز ان کو دے ماری ہوگی، مگر ممی کوئی شکایت نہیں کرتی تھیں۔ یہ وہ سکندر احمد شاہ نہیں تھے جنہوں نے اپنے ملک سے غداری کی تھی۔ یہ ایک ذہنی مریض قابل رحم آدمی تھے اور اب انہیں ممی کی ضرورت تھی۔

پھر کچھ عرصہ وہ ہسپتال بھی داخل رہے، پھر جب واپس آئے تو ان کو مستقل رکھنا پڑا۔ یہ دوائیں ان کو سارا دن خاموش اور پُر سکون رکھتیں، چاہے وہ جاگ رہے ہوتے یا سو رہے ہوتے۔ کچھ ہی عرصے بعد ابا ایک انسان سے ایک ایسے مریض بن گئے تھے جو کمرے تک محدود ہو گئے۔ ہاں، ہر پندرہ، بیس دن بعد ایک دورہ ان کو پڑتا اور وہ توڑ پھوڑ کرتے، چیختے چلاتے، مگر ممی سنبھال لیتیں۔ اپنے مسئلے خود ہی حل کرتے کرتے، وہ پہلے سے بہت مضبوط ہو گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

کرامت بے کی دکان چھوڑنے کے کچھ عرصہ بعد اس نے ایک چابی ساز کے پاس نوکری کر لی تھی۔ شام میں اب وہ اس کی دکان پہ جاتا جو ان کے گھر سے دس منٹ کے پیدل راستے پہ تھی۔ اگر اسے کسی کام میں مزا آتا تھا تو وہ چابیاں بنانے میں تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ صرف سیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ عام چابیوں کے بعد وہ چائنیز تالوں اور پیچیدہ اقسام کے سیف کی کنجی سازی سیکھنے لگا۔ اس کے پاس لائبریری سے لی گئی ان کتابوں کا ڈھیر ہوا کرتا تھا، جن میں لاک توڑنے یا کنجی سازی کے متعلق کوئی بھی معلومات ہوتی۔ بہت مہارت سے بنا ضرب لگائے تالا توڑنا، چاہے وہ ماسٹر کی سے یا لوہے کی پن سے، وہ اس فن میں طاق ہوتا جا رہا تھا۔

ان سب مشغلوں کا اثر اس کی پڑھائی پہ البتہ ضرور پڑا۔ وہ کبھی بھی بہت لائق قسم کا طالب علم نہیں بن سکا۔ اس کے گریڈز ہمیشہ میڈیم رہے۔ وہ ذہین تھا، مگر اس کو پڑھائی میں دلچسپی نہ تھی۔ دوسرے کام اسے زیادہ دلچسپ لگتے تھے۔

اس کی چودھویں سالگرہ گزرے زیادہ وقت نہیں بیتا تھا۔ جب فرقان ماموں نے اطلاع دی کہ وہ اور سلیمان ماموں ترکی آ رہے ہیں۔ خون، پانی سے گاڑھا ہوتا ہے، اس نے یہ دیکھ لیا۔ ممی پرانی تلخیاں بھلا کر ان کے آنے کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ انہوں نے جیسے دل سے ماموں کو معاف کر دیا تھا۔ ان کے خیال میں ماموں ان کے اس سوال کے جواب میں یہاں آ رہے تھے جو چند روز پہلے انہوں نے فون پہ ان سے پوچھا تھا کہ اگر وہ اور جہان، سکندر شاہ کو لے کر پاکستان...... آئیں اور ان کا مقدمہ لڑیں تو کیا ماموں ان کو مورل سپورٹ دیں گے۔ مالی مدد کا ایک ٹکا نہیں چاہیے تھا انہیں، بس ماموؤں کا ساتھ درکار تھا۔ فرقان ماموں جواباً خاموش ہو گئے تھے، پھر انہوں نے بتایا کہ وہ اور سلیمان کچھ روز تک آئیں گے، تب اس بارے میں بات کریں گے۔

ممی کی اور بات تھی، مگر اس کا دل اپنے ماموں سے اتنا بدظن ہو چکا تھا کہ اسے ان کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے ہوئے ممی کو سنتا رہتا جو اب اٹھتے بیٹھتے کہا کرتیں۔

"ہم پاکستان ضرور واپس جائیں گے، اتنے برس ہو چکے ہیں، لوگ بھول بھال گئے ہوں گے۔ اب یہ جلاوطنی ختم ہونی چاہیے۔ بھائی ضرور میرا ساتھ دیں گے۔ میرے بھائی، بہت......"

اور ممی ڈھونڈ ڈھونڈ کر ماموؤں کی خوبیاں گنواتی رہتیں۔ اس نے بہت عرصہ بعد انہیں اس طرح خوش اور پُر امید دیکھا تھا۔ وہ انہیں کہہ نہیں سکا کہ اپنے مسائل کے حل کے لیے انہیں اب دوسروں کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ انہیں اپنی کہی بات یاد رکھنی چاہیے، مگر ممی بھائیوں کے نرم رویے دیکھ کر انہیں دوسروں کی فہرست سے نکال کر اپنوں میں لے آئی تھیں۔

اس میں ہمت نہیں تھی کہ یہ سب کہہ کر ماں کو مغموم کرے۔ ابا کا ہونا، نہ ہونا برابر تھا، مگر ممی اس کے لیے سب کچھ تھیں۔ ان کی مشقت، محنت، قربانیاں اور ایک کمزور عورت سے ایک مضبوط عورت میں ارتقا کا عمل جو اس نے عمر کی منزلیں طے کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے بہت دعا کی کہ ممی دکھی نہ ہوں، مگر اسے لگتا تھا کہ ممی غلط لوگوں سے امید لگا کر دکھی ضرور ہوں گی۔ لیکن جو ہوا، وہ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

دونوں ماموں آ ہی گئے دوپہر کے کھانے کے بعد جب وہ برتن اٹھا کر انہیں کچن کے سنک میں دھونے کے لیے جمع کر رہا تھا تو ممی اور ماموؤں کے درمیان ہونے والی گفتگو اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔

"بالکل، میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب تم لوگ پاکستان آ جاؤ" صوفے پہ بہت کروفر سے بیٹھے رعب دار سے فرقان ماموں کہہ رہے تھے۔ ان کی بات پہ کچن میں کھڑا جہان تو ایک طرف، ممی بھی حیرت زدہ رہ گئیں۔ اتنی جلدی ماموں مان جائیں گے، ان دونوں نے نہیں سوچا تھا۔

"تم لوگ ہمارے ساتھ آ کر رہو۔ وہ سب تمہارا ہی ہے سبین! پرانی باتیں بھول جاؤ، آگے کی سوچو۔ جہان کی پوری زندگی پڑی ہے۔ وہ بھی وہیں پڑھ لے گا، پھر ہائی اسکول کے بعد ہم اسے باہر بھیج دیں گے، کسی بہت اچھی یونیورسٹی میں۔ آخر وہ ہمارا بیٹا ہے اور پھر ہمارا داماد بھی تو بنے گا۔"

فرقان ماموں نے کہتے ہوئے ایک نظر سلیمان ماموں پہ ڈالی۔ انہوں نے تائیدی انداز میں سر کو اثبات میں جنبش دی۔ وہ ایسے ہی تھے، بڑے بھائی کے ادب میں ان کی ہر بات کی تائید کرنے والے۔

"تم جہان کی زندگی کا سوچو سبین! اس کو ایک بہترین مستقبل دو، ہم اس کے بڑے ہیں، ہم اس کو باپ بن کر پالیں گے۔"

باپ بن کر؟ وہ بالکل ٹھہر گیا۔ اس نے نل بند کر دیا۔ لاؤنج میں خاموشی تھی، مگر ایک آواز اب بھی آ رہی تھی۔ جو بند نل کے منہ سے قطرے ٹپکنے کی ہوتی ہے، جو اس کی ماں کی ساری امیدوں، خوابوں اور توقعات کے بہنے کی تھی۔ اسے ماموں کی بات ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آئی تھی، مگر کئی دن سے خود کو بہلانے والی اس کی ماں فوراً سمجھ گئی تھی۔

جب ممی بولیں تو ان کی آواز میں بھائیوں کی محبت کو ترسی، رشتوں پہ مان رکھنے والی عورت نہیں، بلکہ ایک خوددار عورت کی جھلک تھی، جس کے نزدیک اپنے گھر کی خودداری سب سے بڑھ کر تھی۔

"میرے بیٹے کا باپ ابھی زندہ ہے بھائی! اور اس کی ماں کے ہاتھ بھی سلامت ہیں۔ میں خود محنت کر کے اسے پاکستان بھی لے جا سکتی ہوں اور سکندر کا کیس بھی لڑ سکتی ہوں۔ مجھے سکندر کو مظلوم ثابت نہیں کرنا، بلکہ بیماری کے باعث سزا میں کمی کی اپیل کرنی ہے اور مجھے آپ سے مورل سپورٹ کے علاوہ کچھ نہیں درکار تھا۔"

"تم ایک انتہائی ضدی عورت ہو" فرقان ماموں ایک دم بھڑک اٹھے تھے۔ "جس مغرور اور بد دماغ آدمی نے ہمیں کہیں کا نہیں

چھوڑا، تم اس کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو؟ تم اس کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

"وہ آدمی میرا شوہر ہے اور بیمار ہے۔ وہ مجھ پہ انحصار کرتا ہے اور آپ کہتے ہیں، میں اسے چھوڑ دوں؟"

"اور جو اس نے کیا، وہ؟"

"اس کا فیصلہ کرنے والے آپ یا میں نہیں، عدالت ہے اور اب تو وہ بیمار ہیں۔ ان کو میں کس طرح اکیلا چھوڑ سکتی ہوں؟ نفرت گناہ سے کی جاتی ہے، گناہ گار سے تو نہیں۔"

"یعنی کہ تم اس کو ہر جرم سے بری الذمہ قرار دے رہی ہو؟" ماموں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

"میں یہ نہیں کہہ رہی، لیکن آپ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ہم نے جلاوطنی کاٹی ہے اور کئی برس کاٹی ہے۔ اب وہ بیمار ہیں۔ سکندر وہ انسان نہیں رہے جنہوں نے جرم کیا تھا، وہ صرف ایک مریض رہ گئے ہیں۔ آپ مجھ سے یہ کہہ بھی کیسے سکتے ہیں کہ میں انہیں چھوڑ دوں؟" ممی کی آنکھیں حیرت اور دکھ سے بھر گئیں۔

"اگر تم یوں اس کا ساتھ دو گی تو تم ہر رشتہ کھو دو گی۔ سب تم سے دور ہو جائیں گے سبین! تم غلط کر رہی ہو۔" سلیمان ماموں نے دھیمے مگر افسردہ انداز میں کہا۔

"اگر میری فیملی کو کاٹ کر سب مجھ سے خوش رہتے ہیں تو مجھے یہ خوشی نہیں چاہیے، نہ ہی ایسے رشتے۔" انہوں نے اپنی آنکھ سے ایک آنسو نہیں ٹپکنے دیا۔ رندھی ہوئی آواز میں وہ سر اٹھا کر مضبوطی سے بولی تھیں۔

"تم ہماری بات مان لیتیں۔ سکندر سے طلاق لے کر ہمارے ساتھ چلتیں تو ہم تمہارے بیٹے کو بھی پڑھاتے اور اسے سر اٹھا کر جینے کے قابل بناتے لیکن اگر تم ہماری بات یوں رد کرو گی تو ہم بھی کبھی تمہارا ساتھ نہیں دے پائیں گے۔" فرقان ماموں کا انداز دوٹوک اور مزید سخت ہو گیا تھا۔ وہ ترکی فتح حاصل کرنے آئے تھے تاکہ جب بہن کو اپنے ساتھ واپس لے کر جائیں تو سر اٹھا کر لوگوں سے کہہ سکیں کہ انہوں نے ایک قابل نفرت آدمی کو اپنے خاندان سے نکال پھینکا اور پھر بہن، بھانجے کے سر پہ ہاتھ رکھنے پہ انہیں تحسین و تحفے بھی مل جائیں مگر ممی کو اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے یہ مظلوم، ترحم آمیز کردار منظور نہ تھا۔ وہ سر اٹھا کر جینا چاہتی تھیں۔

"پہلے بھی آپ نے کب میرا ساتھ دیا جو اگر اب نہیں دیں گے تو کوئی فرق پڑے گا۔"

"تم رشتوں کو کھو کر پچھتاؤ گی۔"

"میں رشتوں کو جان کر بھی پچھتا ہی رہی ہوں بھائی! کتنے ہی سیاست دان ہیں جو ملک سے غداری کر کے باہر چلے جاتے ہیں، مگر ان کی واپسی پہ آپ ہی ان کو ووٹ دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ امیر لوگ ہوتے ہیں، ہم آپ کی نظروں میں معیوب اس لیے ہیں کیونکہ ہم غریب ہیں۔ ہمارے پاس ترکی میں لمبی چوڑی جائیداد نہیں ہے۔ کوئی بہت اونچا سوشل اسٹیٹس نہیں ہے اگر ہوتا تو آپ کبھی ہم سے یوں قطع تعلق نہ کرتے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے، تم یہاں رہو گی تو کیا عزت سے رہو گی؟ نہیں۔ تم ہمیشہ معیوب ہی رہو گی۔ ایک مفرور قومی مجرم کی بیوی بن کر ذلیل ہو گی ہمیشہ۔"

فرقان ماموں غصے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلیمان ماموں بھی ساتھ ہی اٹھے۔ ان کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ بڑے ماموں سے متفق ہیں۔ البتہ ان کو اس طریقہ کار سے اختلاف تھا، لیکن وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔

"اور تم......" بڑے ماموں کی نظر کچن کے دروازے میں کھڑے اس دبلے پتلے لڑکے پہ پڑی تو انہوں نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔ "تمہیں کیا لگتا ہے، تم یہاں عزت سے جی سکو گے؟ کبھی نہیں۔ تم ذلیل ہو گے۔ تم خوار ہو گے، کیونکہ تمہارا باپ تمہارے نام یہ ایک شرم ناک دھبہ ہے۔ تم کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکو گے۔ تمہارے باپ کا نام تمہارا سر ہمیشہ شرم سے جھکاتا رہے گا۔ تم کتوں کی سی زندگی گزارو گے۔ کبھی عزت اور وقار سے اپنے ملک کا رخ نہیں کر سکو گے۔"

وہ غصے میں بولتے کانپنے لگے تھے اور کانپ تو اس کا دل بھی رہا تھا۔ وہ بہت ہراساں سا دروازے کو مضبوطی سے پکڑے کھڑا تھا۔

"بس کریں بھائی! میرے بیٹے کو یوں ٹارچر مت کریں!" اس نے اپنی ماں کو اپنے سامنے آ کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس کا قد اپنی ماں سے ذرا سا اونچا تھا، پھر بھی وہ اس کے سامنے ایک ڈھال تھیں۔

"کیوں؟ اسے بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ اس کی ماں نے اس کے لیے کتنا غلط فیصلہ کیا ہے۔ میں نے تمہیں ایک آپشن دیا تھا، جو تمہارے

بیٹے کے لیے اپنے ملک عزت سے لوٹنے کا واحد راستہ تھا مگر تم نے وہ ٹھکرا دیا۔ تم نے اپنی ضد کی وجہ سے اس کی زندگی بھی جہنم بنا دی ہے۔"

"میں اس کی زندگی جہنم نہیں بننے دوں گی۔ سنا آپ نے؟ یہ سر اٹھا کر جیے گا۔ یہ سکندر احمد کا پوتا ہے۔ یہ ان ہی کی طرح فوج میں جائے گا۔ مجھے آپ کی کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود بھیجوں گی اپنے بیٹے کو فوج میں اور آپ دیکھیے گا، میرا بیٹا ایک دن سر اٹھا کر ضرور جیے گا۔" اس نے اپنی نرم خو ماں کو اپنے سامنے ڈھال بن کر کہتے سنا۔

"فوج؟ مائی فٹ!" فرقان ماموں نے میز پہ رکھا اپنا سگریٹ لائٹر اٹھاتے ہوئے استہزائیہ سر جھٹکا۔ "تم بھول رہی ہو بہن! تمہارا بیٹا "غدار کا بیٹا" ہے اور غدار کے بیٹے کو فوج میں کبھی نوکری نہیں ملتی۔ ارے! وہ تو اسے چھاؤنی کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔ اس لیے ایسی کوشش بھی مت کرنا اور اگر کرنے کے بعد بے عزت کر کے نکالے جاؤ تو مدد کے لیے میرا دروازہ نہ کھٹکھٹانا۔"

بات کرتے ہوئے انہوں نے اپنی شعلہ بار نگاہوں کا رخ جہان کی طرف کیا جو بالکل دم سادھے انہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر اسی طرح انگشت شہادت اٹھائے انہوں نے اسے ان آخری الفاظ سے متنبہ کیا جو ایک عمر اس کے ذہن میں گونجتے رہے تھے۔

"تم لوگوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اب جب تمہیں مدد چاہیے ہو تو ہمارے پاس مت آنا۔ ہمارا در مت کھٹکھٹانا لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد پچھتاوؤں کا شکار ہو کر ہمارے دروازے پہ ضرور آؤ گے۔" اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ ملال زدہ سے سلیمان ماموں بھی ان کے پیچھے ہو لیے۔

ممی سر ہاتھوں میں لیے صوفے پہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئیں اور وہ اسی طرح بت بنا کچن کی چوکھٹ پہ کھڑا رہا۔ فرقان ماموں کے الفاظ نے اس کا اندر باہر توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اتنی ذلت، اتنی بے عزتی، کتوں کی سی زندگی گزارنے کی بددعا...... ماموں نے اپنی زخمی انا کی تسکین کے لیے کیا کچھ نہیں کہہ دیا تھا۔ تب اسے لگتا تھا کہ وہ کبھی سر اٹھا کر نہیں جی پائے گا۔ وہ فوجی چھاؤنی کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا، پاک اسپائی بننا تو پھر دور کی بات تھی۔ یہ احساس ہی اس کے سارے خوابوں کو ڈبو گیا۔ کئی دن تک تو وہ اور ممی نارمل ہی نہیں ہو سکے۔ دونوں چپ چپ سے رہتے تھے، ایک دوسرے سے نگاہیں چرائے، اپنے کام نپٹاتے رہتے، آہ! وہ بہت تکلیف دہ دن تھے۔

مگر ممی روئیں نہیں۔ انہوں نے اپنا کام بڑھا لیا۔ اس نے بھی اپنے کام کا دائرہ کار بڑھا دیا۔ ابا کی بیماری بھی بڑھتی گئی۔ کبھی کبھی تو وہ بہت ہی قابو سے باہر ہو جاتے۔ چیختے چلاتے، ہاتھ میں آئی چیز دے مارتے، ان بلیو پرنٹس کا ذکر کرتے جو انہوں نے آگے بیچے تھے۔ اس پاک اسپائی کا ذکر کرتے، جس کو انہوں نے قتل کیا تھا مگر اب ممی اور وہ انہیں سنبھال لیا کرتے۔ بس خود کو سنبھالنے میں انہیں بہت عرصہ لگا تھا۔ کہنے والے تو کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں مگر سننے والوں کے لیے وہ باتیں ساری زندگی کے لیے ایک چبھن بن جاتی ہیں۔

وقت پھر بھی گزرتا گیا۔ باسفورس کے پل تلے پانی بہتا گیا۔ سمندری بگلے استنبول کے اوپر پرواز کرتے رہے۔

وہ ہائی اسکول کے آخری سال میں تھا، جب پیون نے آ کر اسے اطلاع دی کہ ہاؤس ماسٹر کے آفس میں کوئی ملاقاتی اس کا منتظر ہے۔ وہ الجھتا ہوا کلاس سے نکلا اور ہاؤس ماسٹر کے آفس کے دروازے تک آیا۔

اندر جیسے کوئی طوفان بدتمیزی مچا ہوا تھا۔

☆　☆　☆

ہاؤس ماسٹر کے آفس کے اندر جیسے کوئی طوفان بدتمیزی مچا ہوا تھا۔

کھلی درازیں، بکھرے کاغذ، ہر چیز الٹ پلٹ پڑی تھی۔ ہاؤس ماسٹر احمت طور پریشانی کے عالم میں ایک دراز کھنگال رہے تھے۔ ان کا اسسٹنٹ دوسری دراز کی چیزیں نکال نکال کر باہر رکھ رہا تھا۔ ذرا دور رکھی...... کرسی پہ ایک صاحب خاموشی سے بیٹھے تھے۔

"آخر چابی گئی کدھر؟" احمت بے جھنجلا کر کہہ رہے تھے۔ جہان کی نظریں دیوار کے ساتھ لگے لاکر پہ پھنس گئیں، جو مقفل تھا۔ یقیناً اس کی چابی نہیں مل رہی تھی۔

"بولو! بتاؤ، اب میں ہیڈ ماسٹر کو کیا کہوں کہ میرے اسسٹنٹ کی لاپروائی کی وجہ سے لاکر نہیں کھل رہا اور فائل نہیں نکالی جا سکتی؟" اپنی جھنجلاہٹ اور پریشانی میں انہوں نے دروازے میں کھڑے لڑکے کو نہیں دیکھا تھا۔

"سر! میں نے یہیں رکھی تھی، میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ ابھی......" اسسٹنٹ کی بات کو فون کی گھنٹی نے کاٹا۔ اس نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔

"جی، جی سر! بس احمت بے آپ کے پاس فائل لا رہے ہیں۔ جی بس ایک منٹ!" بمشکل اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے اس نے فون پہ کہا اور پھر ہاؤس ماسٹر کو دیکھا، جن کے سرخ پڑتے چہرے کے تاثرات ناقابل بیان ہو رہے تھے۔

"سر!" اس نے انگلی کی پشت سے دروازہ بجایا۔

انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ جیسے انہیں بھول گیا تھا کہ اسے وہاں کیوں بلایا گیا تھا۔ کرسی پہ بیٹھے صاحب نے بھی گردن پھیر کر اسے دیکھا تھا۔

"میں مدد کروں؟"

"کیا؟" ان کے چہرے پہ الجھن در آئی۔

وہ خاموشی سے آگے آیا اور لاکر کے کی ہول کو انگلی سے چھو کر جیسے کچھ محسوس کیا۔ کمرے میں یک دم خاموشی چھا گئی۔ ساری کھڑ پڑ، متحرک ہاتھ، سب ٹھہر گیا۔

اس نے پینٹ کی جیب سے تین پنیں نکالیں، پھر ان میں سے ایک الگ کی اور باقی واپس جیب میں ڈال دیں۔ آگے ہو کر اس نے وہ پن ترچھی کر کے کی ہول میں ڈالی، پھر گردن اٹھا کر وال کلاک کو دیکھا۔

وہ تینوں نفوس جیسے دم سادھے اس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نچلا لب دانت سے دبائے، اپنے ہاتھ کو مخصوص سمتوں میں اوپر نیچے کر رہا تھا، جیسے موسیقی کا کوئی ردھم ہو۔ چند لمحے سرکے اور کلک کی آواز کے ساتھ لاک کھل گیا۔ اس نے پھر گردن موڑ کر وال کلاک کو دیکھا۔ ایک منٹ اور گیارہ سیکنڈ لگے تھے۔ اسے مایوسی ہوئی۔ شاپ پہ اس طرز کا سیف کھولنے میں اسے کم سے کم پچاس سے بچپن سیکنڈ لگتے تھے۔

اس نے ہینڈل گھمایا۔ سیف کا دروازہ کھولا اور بہت ادب سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوا۔

"تم نے...... تم نے یہ کیسے کیا؟" ہاؤس ماسٹر ششدر تھے۔

"سر! اگر آپ میری کہانی سننے میں وقت ضائع کریں گے تو فائل ہیڈ ماسٹر کے پاس کب پہنچے گی؟" کسی اچھے چابی ساز کی طرح اس نے اپنا راز نہیں کھولا۔

"اوہ ہاں!" وہ پیشانی کو ہاتھ سے چھوتے اٹھے۔ "تمہارا شکریہ ینگ مین!"

ان کے جانے کے بعد وہ ان صاحب کی جانب متوجہ ہوا جو کرسی پہ بیٹھے بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"میں جہان سکندر ہوں۔ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اسکول ریکارڈ میں تمہارا نام جہان سکندر احمد لکھا تھا، حالانکہ سکندر کا سرنیم "شاہ" ہے۔"

"احمد میرے دادا کا نام تھا، میں ان کا نام ساتھ لگاتا ہوں، مگر آپ میرے ابا کو کیسے جانتے ہیں؟"

بات کرتے ہوئے اس کے اندر کچھ اتھل پتھل سی ہوئی تھی۔ فرقان ماموں سے آخری ملاقات پھر سے تازہ ہو گئی۔ ان لوگوں کا سامنا کرنا جو اس سے اس کے باپ کے حوالے سے واقف ہوں، بہت اذیت ناک تھا۔

"ہم باہر چل کر بات کر سکتے ہیں؟" وہ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ پلٹ گیا۔

"میں تمہارے ابا کا ایک زمانے میں بہت اچھا دوست رہا ہوں۔ کرنل رؤف گیلانی، شاید تم نے میرا نام سنا ہو؟" باہر اسکول کے فٹ بال کے میدان کے کنارے پہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے بتایا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے غور سے ان کو دیکھا۔

وہ سفید اوورکوٹ میں ملبوس اچھے قد کاٹھ کے مہذب سے انسان لگتے تھے۔ مگر ان کے چہرے پہ ایک نقاہت تھی اور ان کی آواز سے کمزوری جھلکتی تھی۔ اگر وہ ابا کے دوست تھے تو ان کو اتنا معمر نہیں لگنا چاہیے تھا، جتنے وہ لگ رہے تھے۔ شاید بیمار تھے۔ اسے بے اختیار دادا کا چہرہ یاد آیا جو ان کی زندگی کی آخری رات اس نے دیکھا تھا۔ تھکا زدہ، بیمار چہرہ۔

"تمہارے ابا قصور وار تھے مگر انہوں نے بہت کچھ میرے اوپر ڈال دیا اور ملک سے فرار ہو گئے۔ میں نے بے قصور ہوتے ہوئے بھی کئی سال ٹارچر سیل میں سزا کاٹی۔ تین برس ہوئے میں باعزت بری کر دیا گیا ہوں۔ سارے چارجز ہٹ گئے ہیں۔ میرے بچے پھر سے سر اٹھانے کے قابل ہو گئے ہیں اور اب جب کہ میں علاج کے لیے لندن جا رہا تھا تو سوچا ایک دن کے لیے ترکی آجاؤں۔ اس لیے نہیں کہ میں سکندر کی بربادی کا تماشا دیکھوں، بلکہ اس لیے کہ میں تمہیں دیکھ سکوں۔"

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جس شخص نے ان کی زندگی کے کئی برس برباد کر دیے۔ اس کے بیٹے کو وہ کیوں دیکھنا چاہتے تھے، وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

"میرا بیٹا حماد بھی تمہاری عمر کا ہے۔ اس نے بھی بہت بُرا وقت گزارا ہے۔ میری بیوی نے بھی سزا کاٹی ہے۔ وہ بھی اتنے بے قصور تھے جتنے تم اور تمہاری والدہ۔"

"ہم سکندر شاہ کے گھر والے ہیں اور ہم یہ سب ڈیزرو کرتے ہیں۔ مجھے آپ کی ہمدردی نہیں چاہیے سر!" اس کی آواز میں تلخی گھل گئی تھی۔

"نہیں، تم یہ ڈیزرو نہیں کرتے تھے۔ جلاوطنی کی سزا سب سے اذیت ناک سزا ہوتی ہے۔ تم لوگوں نے بہت عرصہ یہ سزا کاٹی ہے۔ کیا اب وہ وقت نہیں آ گیا کہ تم سر اٹھا کر جیو، جیسے اب حماد جیے گا؟"

"اس کے فادر بے قصور تھے، میرے قصوروار ہیں۔ میں کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکتا، میں جانتا ہوں۔" وہ دونوں ایک درخت تلے نصب بینچ پہ بیٹھ گئے تھے۔ سامنے سرسبز سا میدان تھا جس پہ سورج کی کرنیں ترچھی ہو کر پڑ رہی تھیں۔ استنبول میں سرما کا سورج ایسا ہی ٹھنڈا ہوتا تھا۔

"مجھے تم سے ہمدردی نہیں ہے۔ مجھے صرف تمہارا خیال ہے۔ میں نے اپنے گھر والوں کی اذیت دیکھی ہے بچے! اور میں آج تمہاری ماں سے جب ملا تو میں نے انہیں بھی اسی اذیت میں دیکھا۔ وہ سکندر کو نہیں چھوڑ سکتیں، مگر تم تو اپنے ملک واپس جا سکتے ہو۔"

"میں نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ میں جانتا ہوں، میں کبھی فوج میں نہیں جا سکتا۔ مجھے وہ کبھی چھاؤنی کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیں گے۔ میں پھر سے ذلیل ہونے وہاں نہیں جانا چاہتا۔"

وہ بہت تکلیف سے بول رہا تھا۔ فرقان ماموں کی باتیں کسی انی کی مانند ابھی تک دل میں گڑی تھیں۔

"یہ تمہیں کس نے کہا کہ تمہیں فوج میں کمیشن نہیں مل سکتا؟" وہ حیران ہوئے۔

"کیونکہ میں ایک غدار کا بیٹا ہوں اور غدار کے بیٹے کو فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تمہیں کسی نے غلط گائیڈ کیا ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ میں تمہیں نامور ملکی غداروں کے نام گنوا سکتا ہوں۔ جن کے خاندان کے کتنے ہی لڑکے فوج میں کام کر رہے ہیں۔ اگر تم قابل ہو اور تم ایک دفعہ پھر سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ رکھتے ہو تو تمہیں چاہیے کہ تم اپنے ملک واپس آ جاؤ۔"

وہ کتنی ہی دیر بیٹھے اسے سمجھاتے رہے کہ اسے ایک دفعہ کوشش کرنا چاہیے اور پھر ملک کے لیے قابل قدر خدمت سرانجام دے کر وہ اپنے خاندان کے نام پہ لگا دھبہ مٹا سکتا ہے۔ اچھائی برائی کو ڈھانپ دیتی ہے۔ ان کا اپنا بیٹا بھی اگلے سال آرمی میں کمیشن کے لیے درخواست دینے جا رہا تھا، وہ بھی ہائی اسکول ختم کر کے ان کے پاس آ جائے اور ساتھ ہی امتحان دے۔

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اگر اسے کوئی شک و شبہ تھا کہ وہ دھوکے سے اس کے باپ کو ملک واپس لے جانے اور سزا دلوانے کے لیے یہ سب کر رہے تھے تو وہ زائل ہو گیا۔ پھر بھی اس نے ان کو کوئی خاص جواب نہیں دیا۔ وہ اس نہج پہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ فرقان ماموں کی خواہش کے مطابق وہ کتوں کی طرح ذلیل ہو کر زندگی گزار تو رہے تھے، باعزت جینے کا حق ان کو نہیں تھا۔

سہ پہر میں جب وہ گھر لوٹا تو ممی نے کرنل گیلانی کی آمد کا بتایا اور یہ بھی کہ وہ ان سے اسکول کا پتا پوچھ کر گئے تھے۔ ان کی فلائٹ شام میں تھی اور وہ آج ہی اس سے ملنا چاہتے تھے۔ پھر اس نے بھی سب کچھ بتا دیا۔

"مگر میں ادھر نہیں جاؤں گا۔ مجھے فرقان ماموں کے گھر نہیں جانا۔ میں ان لوگوں سے پھر کبھی نہیں ملنا چاہوں گا۔" اس نے اپنے تئیں بات ختم کر دی تو ممی خاموش ہو گئیں۔

لیکن سوچیں خاموش نہیں ہوئیں۔ خواب خاموش نہیں ہوئے۔ وہ خواب کسی بوجھ کی طرح دل کو گھیرے رہا۔ کچھ دن بعد نیند میں وہ خود کو وہیں پاتا۔ انطاکیہ میں وہ بڑا سا دالان، فوارہ اور ساتھ کھڑا گھوڑا اور جب وہ پلٹنے لگتا تو اسے پکارا جاتا۔ شعور کی منزلیں طے کرتے کرتے وہ خواب جو آغاز میں "خوف" تھا، اب "دکھ" بنتا گیا۔ جانے وہ کون تھا، اس نے اپنے ہاتھوں سے اس وجیہہ آدمی کو دفنایا تھا، مگر وہ کبھی اس کے خاندان کو نہیں تلاش کر سکے گا۔ اس کی بیوی، بچے، برسوں اس کی راہ تکیں گے۔ حکومت، فوج، ایجنسی، کسی کو علم نہیں ہو سکے گا کہ وہ کہاں دفن تھا۔ جاسوس کی زندگی، جاسوس کی موت، یہی تھی جاسوس کی قسمت۔

پھر کیوں جوانوں میں یہ ہمت ہوتی تھی کہ وہ اپنی گردنیں اللہ کے پاس رہن رکھوا دیں؟ وہ کہاں سے یہ جذبہ اپنے اندر لاتے تھے کہ بنا

وردی، بنا تمغوں اور بنا ستائش کے خود کو کسی عظیم مقصد کے لیے صرف کردیں؟ چپ چاپ اپنا فرض نبھائیں اور چپ چاپ مر جائیں؟ بلاشبہ وہ عظیم لوگ تھے اور وہ ان میں سے کبھی نہیں ہوسکتا تھا۔ بعض دفعہ انسان اپنے خواب کسی شے میں ڈال کر ان کو سیل بند کر دیتا ہے۔ موم کی ایسی سیل جو کوئی کھول نہ سکے۔ اس نے بھی اپنے خواب مہر بند کر دیے تھے۔

یہ چند ماہ بعد کی بات تھی۔ ابھی اس کا ہائی اسکول ختم نہیں ہوا تھا کہ اسکول کا ایک ٹرپ اطالیہ کے لیے پلان ہونے لگا۔ تاریخی اور قدیم شہر اطالیہ جانے کے لیے تمام طلبا و طالبات بہت پُر جوش تھے۔ وہ بھی تھا مگر اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ اس کو اپنے خوابوں سے پیچھا چھڑانے کا راستہ نظر آگیا تھا۔ ممی سے اس نے بہت اصرار سے اس فارم ہاؤس کا پتا پوچھ لیا جس کے دالان میں فوارے کے ساتھ کچھ "آثار" ثبت تھے۔ وہ ان آثار کو کھوجنا چاہتا تھا۔ اس نے ممی کو کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی ابا کا راز اور نہ ہی اپنا ارادہ جو کہ اس فارم ہاؤس کے مالک کو یہ کہانی سنانے کا تھا کہ وہ اس جگہ کو اکثر خواب میں دیکھتا ہے، شاید یہاں کوئی دفن ہے۔ وہ اسے راضی کر لے گا، وہ اس جگہ کی کھدائی کرے، پھر جب وہ لوگ اس پاک اسپائی کی نعش ڈھونڈ لیں گے تو وہ پاکستانی سفارت خانے اطلاع کر دے گا۔ شاید اس کی نعش واپس پاکستان بھجوانے کی کوئی سبیل نکل آئے۔

اس وجیہہ صورت پاکستانی اسپائی کو اس کے خاندان کو واپس لوٹانے کا اس سے بہتر لائحہ عمل اسے نہیں معلوم تھا۔ بالآخر وہ اس قرض کو اتار دے گا جو دادا نے کہا تھا کہ اس کے کندھوں پہ آگرا ہے۔ بالآخر وہ ابا کے راز کے بوجھ سے نجات حاصل کر لے گا۔ اسے یقین تھا کہ وہ نعش آج بھی ویسی ہی گرم اور نرم ہوگی۔ اس کا خون اب بھی بہہ رہا ہوگا اور اس کی گردن پہ اب بھی پسینے کے قطرے ہوں گے۔ شہید مرتے تھوڑا ہی ہیں۔ وہ تو ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

بہت دقتوں سے وقت نکال کر، ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس فارم ہاؤس پہنچا۔ اندر کا راستہ اسے ابھی تک یاد تھا۔ بس اس گیٹ کو عبور کر کے ذرا آگے جا کر دائیں طرف مڑ جائے گا تو وہاں سے فوارے والا دالان صاف نظر آئے گا۔ گیٹ سے وہ جگہ نظر نہیں آتی تھی۔ ملازم نے اسے اندر آنے دیا اور فارم کے مالک کو بلانے چلا گیا۔ جہان ادھر نہیں رکا، وہ تیز قدموں اور دھڑکتے دل کے ساتھ بھاگتا ہوا آگے آیا اور عمارت کے دائیں جانب سے آ مڑا تا کہ دالان...... مگر......

وہ دالان کے عین سرے پہ ٹھٹک کر رک گیا۔ پھر بے یقینی سے پلکیں جھپکیں۔ چند لمحے کے لیے ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔

اس نے ہر چیز سوچی تھی، سوائے اس کے کہ آٹھ برس بیت چکے تھے۔ سامنے، جہاں پہلے کچی مٹی کا وسیع احاطہ اور درمیان میں فوارہ تھا، اب وہاں ایک گہرا اور خوب لمبا چوڑا سا تالاب تھا۔

وہ بے دم سا گھٹنوں کے بل زمین پہ آگرا۔ تالاب؟ اتنا بڑا تالاب؟ اس کو تعمیر کرنے کے لیے تو کئی فٹ نیچے تک زمین کھودنی پڑی ہو گی، تو کھدائی کے دوران اس نعش کا کیا بنا ہوگا؟

"آپ کو یقیناً خواب میں ایسا کچھ نظر آتا ہوگا، مگر یقین کریں! چار سال پہلے اس پوری جگہ کی کھدائی میرے سامنے ہوئی تھی۔ میں ایک دن بھی مزدوروں کے سر سے نہیں ہٹا اور ہم نے بہت نیچے تک زمین کھودی تھی۔ یہاں سے کچھ نہیں ملا تھا۔ انسانی لاش تو دور کی بات، کپڑے کا ٹکڑا بھی نہیں ملا۔"

جب فارم کا مالک آیا تو اس کی کہانی سن کر بہت وثوق سے بتانے لگا۔ اس کے لہجے اور آنکھوں سے سچائی جھلک رہی تھی۔

"ہاں! صرف ایک بات تھی۔" وہ کہتے کہتے ذرا رکا، اور پھر جیسے یاد کر کے بولا۔ "اس جگہ کی مٹی بہت اچھی تھی۔ اس سے عجیب سی خوشبو آتی تھی۔ ایسی خوشبو جو ہم نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ اس کی وجہ میں شاید کبھی معلوم نہ کر سکوں۔"

بہت سے آنسو اس نے اپنے اندر اتارے تھے۔ وہ خوشبو کی وجہ جانتا تھا، مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا وہ پاک اسپائی کی نعش کہاں گئی مگر یہ تو طے تھا کہ اس زندگی میں وہ کبھی نہیں جان پائے گا اور طے تو یہ بھی تھا کہ اس نے اس پاک اسپائی کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔

اس واقعے نے اسے ایک بات سمجھا دی تھی۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ جاسوس لاوارث خاموشی سے مر جاتا ہے تو وہ غلط تھا۔ اللہ بہت غیرت والا ہے۔ کسی کا احسان نہیں رکھتا۔ جو آدمی اس کے لیے جان دے دے، وہ اسے لاوارث چھوڑ دے گا؟ اس کو اپنی زمین میں باعزت جگہ بھی نہیں دے گا؟ یہ نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ نہیں ہوتا تھا۔

اس روز اسے شدت سے فرقان ماموں کی باتیں یاد آئیں مگر آج ان باتوں کی تکلیف پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے۔

"تم ذلیل ہو گے، تم خوار ہو گے، تم کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکو گے۔ تم کتوں کی سی ذلیل زندگی گزارو گے۔"

مگر اب بلآخر اس کے خوابوں پہ لگی موم کی مہر پگھل گئی تھی۔ سارے خواب پھر سے لفافے سے باہر آ گئے تھے۔
نہیں، وہ ان کی باتوں کو درست ثابت نہیں ہونے دے گا۔
وہ واپس جائے گا اور وہ بہت محنت کرے گا۔ وہ اپنے ملک سے وفاداری کا عہد نبھائے گا۔ یوں مفرور مجرموں کی طرح ایک دوسرے ملک میں ساری زندگی چھپ کر نہیں گزارے گا۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ وہ سر اٹھا کر کیوں نہیں جی سکتا؟ نہیں۔ وہ کتوں کی سی ذلیل ورسوا کن زندگی نہیں جیے گا۔ وہ حشر کے بڑے دن اپنے دادا کو کیا چہرہ دکھائے گا۔ اسے سرخرو ہونے کے لیے وہی نوکری کرنی تھی جو اس کے باپ نے کی مگر اسے اپنے خاندان اور دادا کے نام پر سے ذلت کا دھبہ اتارنے کے لیے وہ نہیں کرنا تھا، جو اس کے باپ نے کیا۔ اس کو یہ ثابت کرنا تھا کہ اچھائی، برائی کو رفع کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ سب کر کے دکھائے گا۔ وہ فرقان ماموں کو یہ ثابت کر کے دکھائے گا کہ وہ اپنے باپ جیسا نہیں ہے۔ ایک دن آئے گا، جب وہ ان کے سامنے سر اٹھا کر کھڑا ہوگا۔ اس دن سرخرو ہو جائے گا، اس کی ماں اور دادا سرخرو ہو جائیں گے۔
اپنے تمام تر عزم و ہمت کے باوجود ایک بات طے تھی۔ اگر وہ پاکستان جائے گا تو کرنل گیلانی کے پاس جائے گا، یا کسی اور کے پاس یا فٹ پاتھ پہ رات بسر کر لے گا مگر ماموں کے گھر نہیں جائے گا۔
"تم نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ اب جب تمہیں مدد چاہیے ہو تو ہمارے پاس مت آنا۔ ہمارا در مت کھٹکھٹانا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد پچھتاووں کا شکار ہو کر ہمارے دروازے پہ ضرور آؤ گے۔" یہی کہا تھا انہوں نے۔ اب اس کی عزت اسی میں تھی کہ وہ ماموں کی طرف نہ جائے۔ اس کے لیے یہ عزت نفس کا مسئلہ تھا، مگر ممی یہ سب کسی اور وجہ سے چاہتی تھیں۔
"میں ہمیشہ سے چاہتی تھی کہ تم بھی فوج میں جاؤ اور میں تمہارے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں مگر میں نہیں چاہتی کہ تمہارے ماموں اس بارے میں کچھ جانیں۔ میں اپنے بھائیوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ اس چیز کو اپنی شکست سمجھتے ہوئے ہر ممکن کوشش کریں گے کہ تمہیں کامیاب نہ ہونے دیں۔ تم ان کے سہارے کے بغیر کچھ بن جاؤ، اور سب سے بڑی بات، آرمی میں کوئی عہدہ پالو، وہ یہ کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ وہ تمہارے خلاف ہو کر تمہیں اپ سیٹ کر دیں گے۔"
"پھر ہم اسے راز کیسے رکھیں ممی؟"
اس کی بات پہ ممی مسکرائی تھیں۔
"کم آن جہان! تمہیں راز رکھنے آتے ہیں۔"
"مگر انہیں پتا چل جائے گا ممی!"
"دیکھو! ایک نہ ایک دن ان کو پتا تو لگنا ہی ہے، مگر تب تک تمہیں اس قابل ہو جانا چاہیے کہ تم ان کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہو سکو۔ ویسے بھی ہر سال سیکڑوں کیڈٹ بھرتی ہوتے ہیں، تمہارے ماموں کو کیا معلوم کہ ان کے نام کیا ہیں اور وہ کون ہیں؟"
اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ یہ اتنا مشکل بھی نہیں تھا، جتنا وہ پہلے سمجھ رہا تھا۔
"ہمارا استنبول میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ حلقہ احباب بھی تھوڑا سا ہے۔ میں سب کو کہہ دوں گی کہ تم انقرہ گئے ہو، وہاں کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔"
"نہیں! انقرہ میں سلجوق عمران کے کزنز پڑھتے ہیں، وہ میرے ہم عمر ہیں، انقرہ کہا تو پول کھل جائے گا۔ یونان ٹھیک رہے گا۔" ممی نے نم مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔
"ہاں، تمہیں راز رکھنے آتے ہیں۔"
ممی کے بقول، ماموں کے آس پاس خاندان میں دور دور تک کوئی فوج میں نہ تھا۔ وہ سب کاروباری لوگ تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں اگر کوئی آرمی فیملی تھی بھی تو سکندر شاہ کے مشہور زمانہ کیس کے بعد فرقان ماموں وغیرہ اب ایسے دوستوں سے احتراز برتتے ہیں۔ کرنل گیلانی ویسے بھی لاہور میں رہائش پذیر تھے، یوں جب وہ پاکستان گیا تو اسے اپنے ماموں کے شہر نہیں جانا پڑا تھا۔
ان سب احتیاطی تدابیر کے باوجود اسے علم تھا کہ جلد یا بدیر فرقان ماموں جان لیں گے کہ وہ ادھر ہی ہے اور اس وقت کا سوچ کر وہ خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ ممی کے سامنے وہ ہمیشہ یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ یہ سب اپنی انا کے لیے کر رہا ہے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی، اس کی عزت نفس بلاشبہ بہت مجروح ہوئی تھی، مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ اپنے ماموؤں کے سامنے خود کو بہت کمزور محسوس کرتا تھا۔ وہ واقعی ان کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا

تھا۔ اسے یہی خوف تھا کہ وہ اسے اس کے باپ کا طعنہ دیں گے اور وہ ایک دفعہ پھر ٹوٹ جائے گا۔

رؤف گیلانی بہت اچھے اور دھیمے مزاج کے حامل انسان تھے۔ وہ ان کی بہت قدر کرتا تھا۔ اس کے باپ کی ساری زیادتیاں نظر انداز کر کے انہوں نے اسے اپنے گھر جگہ دی اور پھر ہر موقع پہ اس کی مدد کی۔ صرف مالی مدد وہ ان سے نہیں لیتا تھا، مگر اخلاقی طور پہ وہ ہمیشہ اس کا سہارا بنے رہے۔ وہ اور حماد اکٹھے کیڈٹ بھرتی ہوئے تھے اور ترقی کی منازل انہوں نے اکٹھے طے کی تھیں۔ وہ سکندر شاہ غدار کا بیٹا ہے، یہ بات کبھی بھی اس کے لیے تازیانہ نہیں بنائی گئی۔ اب رؤف گیلانی، ان کی بیگم ارسلہ، حماد اور اس کی چھوٹی بہن نور العین (عینی) اس کے لیے دوسری فیملی کی طرح تھے۔ چھاؤنی میں عموی طور پہ آپ کے اپنے کردار اور اعمال کو آپ کی پہچان کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، نہ کہ آپ کے پرکھوں کے کردار اور اعمال کو۔ اس نے اپنا نام جہان ایس احمد لکھنا شروع کر دیا۔ زیادہ تر وہ اپنے سر نیم احمد کے ساتھ ہی پکارا جاتا تھا مگر جب کبھی پورا نام لکھنا یا بتانا ہوتا، وہ جہان سکندر احمد ہی لکھا اور بتایا کرتا۔

کرنل گیلانی کہتے تھے، مسلمان اپنی زندگی میں اپنے باپ کے نام سے ہی پکارا جانا چاہیے اور باپ کا نام اسے کبھی اپنے نام کے آگے سے ہٹانا نہیں چاہیے، چاہے باپ جیسا بھی ہو۔ بہت عرصے بعد اس نے بالآخر اپنے احساس کمتری کو دبا لیا تھا۔ رشتے ختم نہیں کر سکا تھا۔ ختم کرنے اور دبانے میں خلیج جتنا فرق تھا، اور یہی فرق اس کی ذات میں ایک خلیج چھوڑ گیا تھا۔

وہ چلا گیا تو ممی نے مصلحتاً ماموؤں سے ٹیلی فونک رابطہ استوار کر لیا، تاکہ اگر کبھی وہ یہ خبر جان لیں تو ممی کو معلوم ہو جائے اور ایک دفعہ فرقان ماموں نے باتوں باتوں میں کہہ بھی دیا کہ کسی نے ان سے استفسار کیا تھا کہ کیا کرنل سکندر کا بیٹا لاہور میں پوسٹڈ ہے؟ تو جواباً ماموں نے بہت فخر سے بتایا کہ ذلت و شرمندگی کے مارے سکندر شاہ کا خاندان کبھی بھی پاکستان کا رخ نہیں کرے گا۔ آخر کارنامہ بھی تو خاصا شرمناک سرانجام دیا تھا انہوں نے۔ وہ کوئی اور جہان ہوگا۔

ممی خاموش ہو گئیں، پھر انہوں نے ماموں کو یہی کہا کہ وہ کوئی اور ہی ہوگا۔ ماموں کے ذہن میں ایک غلط تصور قائم تھا کہ غدار کا بیٹا فوج میں کبھی بھرتی نہیں ہو سکتا، اس لیے انہوں نے اس معاملے کی کبھی چھان پھٹک نہیں کی۔ شاید کچھ عرصے بعد وہ جان بھی لیتے، مگر تب تک اس کا تبادلہ وہاں ہو گیا، جہاں کبھی کوشش کرنے سے بھی پوسٹ نہیں ملتی اور جو خود کو ''خفیہ والوں'' میں شامل کروانے کی رتی بھر بھی کوشش نہ کرے، وہ وہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ اب اس جاب کی ضرورت تھی کہ وہ اپنا سوشل سرکل محدود رکھے۔ منہ بند اور آنکھیں و کان کھلے رکھے اور اپنے کام کو بھی خفیہ رکھے۔

بالآخر وہ پچیس برس کی عمر میں، چھ ماہ کی ٹریننگ چار ماہ دس دن میں مکمل کر کے ایک ایجنٹ بننے جا رہا تھا۔ ''پاکستانی جاسوس'' جس کا وہ ہمیشہ خواب دیکھا کرتا تھا۔ اب اسے امید تھی کہ شاید وہ برسوں دیکھا جانے والا خواب اسے دکھائی دینا بند ہو جائے۔ گو کہ اس کی شدت میں کمی آ چکی تھی مگر بہر حال وہ اب بھی اس کے ماضی کا آسیب بن کر اس کے ساتھ تھا۔

فوج اور ایجنسی میں (اس زمانے میں) آپ کا ایک ہی ہدف، ایک ہی دشمن، ایک ہی تعصب، ایک ہی نفرت کا منبع ہوتا تھا۔

Dear Neighbours.!

جس رات اسے پہلی دفعہ غیر قانونی طور پہ بھارت جانا تھا، اس سے پچھلے روز اس کے انسٹرکٹر کی موجودگی میں، مروجہ اصول کے مطابق ڈاکٹر نے اس کی دائیں طرف کی ایک ڈاڑھ نکال کر اس کی جگہ ایک خاص پلاسٹک کی بنی مصنوعی ڈاڑھ لگا دی تھی جس میں سائنائڈ سے بھرا کیپسول تھا۔ سائنائڈ جو کنگ آف پوائزنز تھا۔ یہ کیپسول ایک شیشے کے خول میں بند تھا اور زبان کی مدد سے باہر نکل آتا تھا۔ اگر غلطی سے نگل لیا جائے تو جب تک شیشہ نہ ٹوٹے، یہ بہ آسانی کوئی نقصان دیے بغیر جسم سے گزر جاتا ہے۔

لیکن اگر چبا لیا جائے تو شیشہ ٹوٹ جائے گا اور انسان چند پل میں مر جائے گا۔ یہ اس لیے تھا کہ اگر کبھی وہ گرفتار ہو جائے اور تشدد برداشت نہ کر سکے اور اسے خدشہ ہو کہ مزید تشدد کی صورت میں وہ اپنے راز اگل دے گا، تو بہتر تھا کہ وہ اپنی اس زہر بھری ڈاڑھ کو نکال کر چبا لے اور خاموشی سے جان دے دے۔

یہ اس سے بہتر تھا کہ وہ تفتیشی افسران کے سامنے بولنا شروع کرے، اپنے ساتھیوں کی جان خطرے میں ڈالے اور ملک کو نقصان پہنچائے۔ مر جانا، راز اگل دینے سے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔

وہ سوا سال انڈیا میں ایک دوسری شناخت کے ساتھ رہا۔ کور شناخت وہ جعلی شناخت ہوتی ہے جس کے ذریعے جاسوس اس معاشرے میں متعارف ہوتا ہے۔ ہر کور کے ساتھ ایک لیجنڈ بھی ہوتا ہے۔ لیجنڈ اس فرضی ماضی کو کہا جاتا ہے جو اس جعلی کور کے پیچھے گھڑا جاتا ہے، مثلاً یہ

آدمی کہاں پیدا ہوا، کہاں سے گریجویٹ ہوا، سابقہ بیوی کا نام، وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے پیچھے آپ کی ایجنسی اس لیجنڈ کو اتنے اچھے طریقے سے نبھاتی ہے کہ اگر کوئی آپ کے بارے میں تحقیق کرنے نکلے تو اس کو آپ کی جائے پیدائش کے ہسپتال میں آپ کا نام رجسٹر میں لکھا بھی مل جائے گا۔ گریجوایشن سرٹیفکیٹ بھی وہ دیکھ لے گا اور آپ کی سابقہ بیوی سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ یہ سب تاش کے پتوں کے گھر کی مانند ہوتا تھا، جس کو بعض دفعہ ایک پھونک ہی اڑا کر بکھیر دیتی تھی۔ اس چیز کو ایجنٹ کا کور بلو (Cover Blow) ہونا کہتے تھے۔

سوا سال اس کا اپنی ماں سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اس کا پاکستان میں صرف ایک شخص سے رابطہ تھا، جو اس کے "باس" تھے۔ وہ لوگ اپنا باس اس کنٹرولر یا ہینڈلر کو کہتے تھے جو ہر وقت جاسوس سے رابطے میں رہتا تھا۔ ممی کو کوئی پیغام دینا ہوتا تو باس تک پہنچاتیں اور وہ اس تک پہنچاتے۔ باس کی ہر بات ماننا فرض تھا۔ بعض دفعہ اچھے بھلے حالات میں بھی وہ دو ماہ خاموشی سے گھر میں بیٹھنے اور اپنی سرگرمیاں محدود کرنے کا حکم ملتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کرنا پڑتا۔ بعض دفعہ مسلسل کام کرنا ہوتا، بس جو ادھر سے حکم آئے، وہی کرنا ہوتا تھا۔ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ جو اپنی گردنیں اللہ کے پاس رہن رکھوا دیتے ہیں۔ اس نے بھی رکھوا دی تھی۔

اور اپنی گردن رہن رکھوانا کیا ہوتا ہے، یہ اس کو تب علم ہوا تھا، جب سوا سال تک ریذیڈنٹ اسپائی کے طور پہ کام کرنے کے بعد ایک دن بہت اچانک وہ گرفتار ہو گیا تھا۔

☆　☆　☆

اس نے ہمیشہ گرفتاری کے امکان کو مدنظر رکھا تھا مگر "را" کی تحویل اور تشدد کیا ہوتا ہے، یہ اسے تب معلوم ہوا جب اس نے خود کو ان کی حراست میں پایا۔

ایک مقامی بینک کے باہر وہ وقت مقررہ پہ "دوست" سے ملنے آیا تھا۔ دوست سے مراد اس کا کوئی فرینڈ یا عزیز نہیں جس سے اس کی دوستی تھی بلکہ وہ اپنے ملک کے ایجنٹس کو "دوست" کہا کرتے تھے۔ اس مقامی دوست کو اس تک چند اشیاء پہنچانی تھیں۔ وقت جگہ سب کچھ دوست کا مقرر کردہ تھا۔ وہ پہلے بھی اس ساتھی جاسوس سے کئی بار مل چکا تھا۔ وہ تیس بتیس برس کا خوش شکل سا پاکستانی تھا، جو بھارت میں بھارتیوں کی طرح ہی رہ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر کبھی جہان کو نہیں لگا تھا کہ یہی دوست اس کو یوں دھوکا دے گا۔

وقت مقررہ پہ اسے بلا کردہ خود نہیں آیا۔ وہ اس جگہ کے قریب ہی انتظار کرتا رہا، جب تک دوست نے نہیں آ جانا تھا، وہ ادھر سے نہیں جا سکتا تھا، مگر پھر ایک دم سے پیچھے سے کسی نے اس کے سر پہ کچھ دے مارا اور وہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ چند لمحے کے لیے واقعتاً سنبھل نہ سکا اور بس..... وہ چند لمحے اسے زندگی کے بدترین دور میں لے گئے۔

را کی تحویل جو جہنم سے بھی بدتر تھی۔

وہ اس کے بے ہوش ہوتے وجود کو گھسیٹتے، دھکیلتے اس کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ہاتھ، آنکھیں سب باندھ دیا تھا۔ وہ اندھا، مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اتنے سارے اہلکار تھے اور وہ اکیلا تھا۔ وہ ان سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ اس پہلی ہی ضرب نے اسے بے بس کر دیا تھا۔

کہیں کسی عمارت کے اندر ایک کال کوٹھڑی نما سیل میں لے جا کر اس کی آنکھوں سے پٹی اتاری گئی، پھر ایک آفیسر نے اس کو بالوں سے پکڑ کر چہرہ اونچا کیا، منہ پہ لگی ٹیپ اتاری اور پلاس کی قسم کے آلے سے اس کے ہر ایک دانت اور داڑھ کو باری باری کھینچا۔ جیسے ہی وہ آلہ نقلی داڑھ پہ آیا، زہر بھری ڈاڑھ کھینچ کر الگ ہو گئی۔

یہ نقلی ڈاڑھیں لگانے کا طریقہ دنیا کی ہر انٹیلی جنس ایجنسی میں پایا جاتا ہے، سو ہر ایجنٹ کو گرفتار کرتے ہوئے وہ سب سے پہلے اس کی داڑھ الگ کرتے ہیں۔ سو انہوں نے پاکستانی جاسوس کو گرفتار کرتے ہی سب سے پہلے اس کا فرار کا واحد راستہ ختم کیا، پھر دوبارہ سے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے اپنے ساتھ چلاتے باہر لے گئے۔

ایسی جیلوں میں قیدی کے فرار کا ہر امکان ختم کرنے کے لیے، کہ کہیں وہ اپنے سیل سے تفتیشی سیل کا فاصلہ اور سمت نہ جان لے اور اس طرح فرار ہونے کا کوئی منصوبہ ترتیب دے لے، اسے ہر چند قدم بعد لٹو کی طرح گھمایا جاتا تاکہ وہ سمت کھو دے اور پھر وہ آگے چلاتے۔ اسے تربیت کے دوران بتایا گیا تھا کہ ایسے میں کیا کرنا چاہیے۔ اپنے قدم گننے چاہئیں، اور آس پاس کی خوشبو سونگھنی چاہیے۔ آوازیں سننی چاہئیں۔ اس نے یہی کیا۔ ہر طرف کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی آواز تھی۔ پھر جب قریباً ساٹھ قدم ہو گئے تو وہ اسے ایک کمرے میں لائے، کرسی پہ بٹھایا اور ہاتھ پاؤں

کرسی کے ساتھ باندھے پھر آنکھوں سے پٹی اتاری۔

تاریکی سے تیز روشنی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ سامنے میز پہ ایک بڑے ریفلیکٹر میں لگا بلب روشنی کے ٹارچر کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ اس کی روشنی سے آنکھوں میں تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے بے اختیار چہرہ پیچھے کر کے آنکھیں سکیٹریں اور سامنے دیکھنا چاہا۔ میز کے اس پار ایک آدمی کرسی پہ بیٹھا تھا جو اپنے حلیے سے کوئی اعلیٰ افسر لگتا تھا۔ میز پہ ایک ہنٹر سے ملتی جلتی چیز بھی رکھی تھی۔

ایک طرف دیوار میں شیشہ لگا تھا۔ جہان نے ذرا سی گردن موڑ کر ادھر دیکھا۔ اسے اس آئینے میں اپنا عکس نظر آیا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ یہ اس کی طرف سے آئینہ تھا، جب کہ اس کی دوسری طرف یہ شیشے کا کام دے رہا تھا۔ یعنی اندر بیٹھے آدمی کو اس میں اپنا عکس نظر آئے گا، لیکن جو آفیسرز اور سائیکاٹرسٹ اس شیشے کے پار کھڑے ہوں گے، وہ اس کو شیشے کی طرح سے استعمال کرتے ہوئے اس میں سے اندر کا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔

وہاں ہونے والی تمام گفتگو انگریزی میں ہوتی تھی۔ انہوں نے اس پہلی گفتگو میں اس کو بتایا کہ اس کے پاس فرار کا راستہ نہیں ہے۔ ان کی جیلوں سے مردہ یا اپاہج ہو کر ہی لوگ نکلتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ پاک اسپائی (پاکستانی جاسوس) ہے، اس لیے وہ سب سچ سچ بتا دے۔ اس صورت میں وہ اس کے ساتھ رعایت برتیں گے۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی گرفتاری دوست کے کہنے پہ عمل میں آئی ہے، اور صاف ظاہر تھا کہ وہ بخوبی واقف ہیں کہ وہ جاسوس ہے لیکن اس کے پاس جو اسمگلر والا کور تھا، (یہ کہ وہ ایک اسمگلر ہے اور اس دوست نے کسی پرانے بدلے کے باعث اسے جاسوس کہہ کر پھنسوایا ہے) وہ کور اسے اب مرتے دم تک قائم رکھنا تھا۔

اس کا انٹرویو شروع ہو چکا تھا۔

نام؟ فرید حیات۔

قومیت؟ پاکستانی۔

دین؟ اسلام۔

شہر؟ سیالکوٹ

کس نے تربیت دی؟

"جدی پشتی اسمگلرز ہیں ہم، ہمارے باپ دادا ہماری تربیت کرتے ہیں۔" اس نے اپنی ازلی بے نیازی سے کہا۔

"میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ایک موقع اور دیتا ہوں۔" اس رعب دار آفیسر نے غصے سے کہا تھا۔ "بتاؤ، بھارت کس لیے آئے تھے؟"

"ہیروئن اسمگلنگ کے لیے۔"

افسر اٹھا، اور وہ شے اٹھا کر پوری قوت سے اس کے سر پہ ماری۔ ایک، دو، تین پوری تین ضربوں کے بعد اس کا دماغ جیسے گھوم گیا۔ وہ سر کے پچھلے حصے میں پڑنے والی بدترین ضرب تھی۔

"ہاں اب بولو! کس لیے آئے تھے؟"

"تمہاری ماں سے ملنے۔"

ایک دفعہ پھر اس آدمی نے اس کے سر پہ وہ چیز ماری۔ ایسے لگتا تھا جیسے کھال تک کٹ گئی ہو۔ اذیت ہی اذیت تھی۔ وہ کرسی پہ پیچھے بندھے ہاتھوں کے ساتھ، آنکھیں سختی سے میچے ذرا سا کراہا تھا۔

درد..... تکلیف..... جلن۔

"اب بتاؤ! کس لیے آئے تھے؟" وہ پھر پوچھ رہے تھے۔

ہر بار اس نے وہی جواب دیا۔ ان گنت دفعہ انہوں نے سوال دہرایا اور اتنی ہی ضربتیں اس کے سر پہ پڑیں۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو وہ واپس اپنے سیل میں زمین پہ لیٹا تھا۔ سر اتنا دکھ رہا تھا کہ لگتا تھا ابھی پھٹ جائے گا۔ کنپٹی کے قریب سے خون نکل کر چہرے پہ جم گیا تھا۔ سر میں گومڑ اور جسم پہ کئی جگہ نیل تھے جیسے اس کے بے ہوش ہونے کے باوجود انہوں نے تشدد ختم نہیں کیا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کیں تو وقت جیسے کئی برس پیچھے استنبول پہنچ گیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے بگلوں

کی طرف اچھالتے ہوئے سمندر کنارے چل رہا تھا۔ دادا بھی ساتھ تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح آگے نکل گئے تھے۔ پھر ایک دم وہ پیچھے مڑے اور اسے دیکھ کر مسکرائے۔

"کل تمہاری ماں کی سالگرہ ہے۔ اسے تو یاد بھی نہیں ہوگا۔ ہر وقت کاموں میں جو الجھی رہتی ہے۔ یوں کرتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی تحفہ لے جاتے ہیں۔"

"ٹھیک۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مگر اس کو بتانا مت۔ کل اسے سرپرائز دیں گے۔ نہیں بتاؤ گے نا؟" پھر رک کر انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہیں راز رکھنے آتے ہیں جہان؟"

جہان نے آنکھیں کھولیں۔

ٹھنڈے فرش پہ دکھتے جسم کو اس نے محسوس کیا اور دھیرے سے بڑبڑایا۔ "مجھے راز رکھنے آتے ہیں دادا!"

اس کا وہ بدترین درد جو پھر ہمیشہ اس کے ساتھ رہا تھا، اس کا آغاز اسی جیل سے اسی روز ہوا تھا۔

پھر چند گھنٹے بیتے تو ایک ڈاکٹر آ گیا۔ اس نے اس کے زخموں پہ دوا لگائی۔ کھانے کو اسپرین کی دو گولیاں دیں اور چند مزید درد کی دوائیں اس اینٹ کے ساتھ رکھ دیں جس کو تکیہ بنا کر وہ آنکھیں موندے فرش پہ لیٹا تھا۔

رات میں وہ ڈاکٹر دوبارہ آیا۔ اب کی بار اس کی موجودگی میں ہی چند تفتیشی اہلکار اسے اپنے مخصوص کمرے میں لے جانے کے لیے آئے تو ڈاکٹر نے انہیں سختی سے جھڑک دیا۔

"تم دیکھ نہیں رہے، اس کا سر کیسے زخمی ہے۔ مجھے اس کو زندہ رکھنے کا حکم ہے، میں اس کو زندہ رکھوں گا۔ اپنی تفتیش بعد میں کرنا۔ آج تم نے مزید اس کو ٹارچر کیا تو یہ مر جائے گا۔"

جہان نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھول کر ڈاکٹر کو دیکھا جو ان اہلکاروں پہ غصہ ہو رہا تھا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے واپس ہو لیے۔ ڈاکٹر اب تاسف سے سر جھٹکتا اس کے سر کی پٹی کرنے لگا تھا۔

"یہ انسان نہیں ہیں، یہ درندے ہیں۔" وہ ساتھ ہی زیر لب انگریزی میں کہہ رہا تھا۔ جہان بس اپنی نڈھال، نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"تم فکر مت کرو، میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔" پھر وہ اس کے قریب جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "میں مسلمان ہوں۔ اگر تمہیں قرآن یا جائے نماز چاہیے تو اس کا بندوبست بھی کر دوں گا۔"

جہان چند لمحے خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

"کیا تم مجھے سورۃ الایمان لا کر دے سکتے ہو؟"

"ہاں، بلکہ میں تمہیں پورا قرآن منگوا دیتا ہوں۔"

"منگوا دو۔" وہ ہولے سے مسکرایا اور آنکھیں پھر سے موند لیں۔

کیسا مسلمان تھا یہ ڈاکٹر جسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ قرآن میں الایمان نام کی کوئی سورۃ نہیں ہے..... گدھا نہ ہو تو۔

وہ جانتا تھا کہ یہ مجرموں، خصوصاً جاسوسی کے مجرموں کی تفتیش کا پرانا طریقہ تھا۔ ایک آفیسر آپ پہ بے حد سختی اور ٹارچر کرتا ہے، جبکہ دوسرا آپ کی طرف داری کرتا ہے۔ خود کو آپ کا ہمدرد ثابت کرتا ہے، تاکہ ایسے حالات میں جب انسان کو اپنے قریب کوئی نظر نہ آئے، وہ خود کو مدد کے لیے آنے والا فرشتہ ثابت کرے اور اہم معلومات اگلوا لے۔

بہر حال اسے اردو ترجمے والا قرآن، نماز والی ٹوپی اور جائے نماز لا دی گئی۔ وضو کا پانی بھی دیا گیا۔ یہ اس کال کوٹھڑی کا واحد روزن تھا اور نہ وہ دن، بہت تاریک تھے۔ اپنے ملک سے دور ایک دشمن ملک میں دشمنوں کے درمیان زخمی ہو کر قید رہنا، یہ اس دنیا کا سب سے تکلیف دہ امر تھا۔

وہ روزانہ اس کو تفتیشی کمرے میں لے جاتے۔ کبھی بازوؤں کے درمیان راڈ پھنسا کر دیوار سے لگا کر بیٹھا جاتا، کبھی الٹا لٹکا کر گرم پانی کی بالٹی میں سر ڈبویا جاتا۔ اس کے پاس کہنے کو بس ایک ہی بات تھی۔

"I am not a spy۔"

(میں جاسوس نہیں ہوں)

وہ چونکہ ایک دوست کے ہاتھوں پکڑوایا گیا تھا، اس لیے ان کو اس بات میں قطعاً کوئی شک نہ تھا کہ وہ جاسوس نہیں ہے۔ ان تکلیف دہ، پرتشدد دنوں میں جہان نے اس ساتھی ایجنٹ سے، بہت نفرت کی تھی جس نے چند پیسوں کے لیے اسے اور نہ جانے کتنے لڑکوں کو پکڑوایا تھا۔ اس نے واقعتاً قسم اٹھائی کہ زندگی میں اگر کبھی اسے موقع ملا تو وہ اس آدمی سے بدلہ ضرور لے گا لیکن یہ موقع اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ وہ اپنے اس دوست کا نام جانتا تھا، نہ ہی کوئی دوسری شناخت اور اس دنیا کے ساڑھے چھ ارب انسانوں میں اس ایک آدمی کو وہ تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اگر کبھی وہ واپس جا سکا تو اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ یہ الگ بات تھی کہ ایسی کوششیں عموماً کامیاب نہیں ہوا کرتیں اور یہ بھی کہ واپسی ان دنوں بہت ناممکن سی چیز لگتی تھی۔

قریباً بارہ دن بعد اس نے سورج اس وقت دیکھا جب وہ اسے اس کے سیل سے نکال کر باہر برآمدے میں لائے، جہاں لوہے کے بڑے بڑے بلاک تپتی گرمی میں تپ رہے تھے۔ وہ اس کو باری باری ان بلاکس پہ لٹاتے تھے۔ جلن، آگ، تپش... جلنے سے زیادہ بڑا عذاب بھی کوئی ہو سکتا ہے بھلا؟ اس کی انا اور مردانگی کو گوارا نہ تھا کہ ان لوگوں کے سامنے اس کے لبوں سے اف تک نکلے، مگر بعض اوقات کراہنے اور درد سے بلبلا اٹھنے سے وہ خود کو روک نہیں پاتا تھا۔ تب اسے، بہت غصہ، بہت بے بسی محسوس ہوئی تھی۔

مگر ایک بات طے تھی۔

He will not sing.

(وہ اپنی زبان نہیں کھولے گا!)

پھر وہ اندھیر دن اور رات اس کے اندر سے ہر چیز آہستہ آہستہ نکلنے لگے۔ اپنی ذات کا وقار اور عزت نفس تو وہ کھو چکا تھا، پھر جب ہر روز وہ اسے بے پناہ تشدد کر کے نیم جاں حالت میں سیل کے سخت فرش پہ پھینک کر چلے جاتے تو اندر موجود ہر جذبہ فرش کی گرمی میں بھسم ہونے لگتا۔ جیل جانے سے قبل وہ اتنا تلخ اور بے حس نہیں تھا۔ زندگی اور زندگی کی تمام ترنرمی اس کے اندر موجود تھی۔ مگر ان تاریک دنوں نے ہر چیز اپنے اندر جذب کر لی۔ وہ دن اور رات کا حساب نہ کر پاتا۔ آہستہ آہستہ رات دن برابر ہو گئے۔

اس نے وقت کا حساب مکمل طور پہ کھو دیا۔ جب کھانا آتا تو معلوم ہوتا کہ رات ہو گئی ہے۔ کھانے کی پلیٹ جو پہرے دار دروازے کی درز سے جان بوجھ کر یوں ترچھا کر کے تھماتا کہ اس کے پکڑتے پکڑتے پلیٹ زمین پہ گر جاتی۔ اسے اس گندی زمین سے سالن اٹھا کر کھانا پڑتا جس کو چباتے ہوئے بھی اندر ریت اور پتھر محسوس ہوتے تھے۔

جب کبھی پاکستان یا انڈیا کا میچ لگا ہوتا تو پہرے دار کمنٹری سنتے ہوئے، زور زور سے پاکستان، محمد علی جناح، اور مسلمانوں کو گالیاں دیتے، ایسے ایسے الفاظ سے انہیں نوازتے کہ اس کا خون کھول اٹھتا، مگر وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلتا۔

زندگی، خواہشات، امیدیں، امنگیں، اس کے اندر سب کچھ مر گیا تھا۔ ساری دنیا اور اس کی ہر چیز من گھڑت فسانہ تھی۔ اگر کہیں کوئی حقیقت تھی تو وہ یہ تنگ، تاریک، غلیظ سا سیل تھا۔

وہ اس روز بھی فرش پہ لیٹا چھت کو خالی خالی نگاہوں سے تک رہا تھا۔ اسے ممی یاد آ رہی تھیں۔ وہ ہر روز رات کو سونے سے پہلے سوچتی ہوں گی کہ ان کا بیٹا کہاں ہے۔ وہ ان سے عرصے سے رابطے میں نہیں تھا مگر اب تک تو شاید ان کو علم ہو گیا ہو کہ وہ زیرِ حراست ہے۔ کیا وہ پھر کبھی ان سے دوبارہ مل سکے گا؟ کیا وہ پھر کبھی پاکستان کو دیکھ سکے گا؟ اس نے سوچنا چاہا تو ہر طرف مہیب اندھیر انظر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا جائے گا، نہ ہی اس کا ملک کبھی اسے تسلیم کرے گا۔ کوئی ملک اپنے جاسوس کو تسلیم نہیں کرتا۔ مگر یہ اس کا اپنا انتخاب تھا۔

اس نے خود یہ زندگی چنی تھی اور اس تمام اذیت کے باوجود وہ جانتا تھا کہ اگر اسے دس زندگیاں دی جائیں، تب بھی وہ یہی جاب چنے گا۔ اسے اپنے کام سے محبت تھی۔ وہ پچھتا نہیں رہا تھا۔ مگر وہ یہ ضرور سوچتا تھا کہ اس پاکستانی جاسوس کے گھر والوں نے نہ جانے کتنا عرصہ اس کا انتظار کیا ہو گا، جس کو اس نے اپنے ہاتھوں سے دفنایا تھا لیکن اسے لاوارث نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اس کی نعش کی بے حرمتی اللہ کی زمین نے نہیں ہونے دی تھی۔ تب اس کی صرف یہی خواہش تھی کہ اسے بھی لاوارث نہ چھوڑا جائے۔ پچھلی رات بھی پہرے داروں نے سیل میں دو سنپولیے چھوڑ دیے تھے، جنہیں اس نے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے جوتے کی نوک سے مارا تھا۔ اگر کل کو اس کے سوتے ہوئے وہ اس کو مار دیں اور اس کی لاش کو دریا میں بہا دیں تب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے نہ نام چاہیے تھا، نہ شہرت، نہ ستائش، اسے بس ایک عزت دار جنازہ چاہیے تھا۔

وہ بہت اذیت ناک روز و شب تھے۔

اسی وقت، جب وہ سوچوں میں غلطاں تھا، پہرے دار اس کے سیل میں لا کر کسی کو پھینک گئے تھے۔ اس نے آنکھیں کھول کر گردن ذرا سی موڑ کر دیکھا۔

وہ ایک کم عمر لڑکی تھی، جو بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس نے پاکستانی طرز کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور دوپٹا پھٹا ہوا تھا۔ چوٹی سے الجھے ہوئے بال نکل رہے تھے۔ اس کے حلیے سے لگ رہا تھا، اسے شدید ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

''کون ہو تم؟'' وہ بولا تو اس کی آواز دھیمی تھی۔ وہ اسی طرح لیٹے ہوئے گردن ذرا سی موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ ہم پوری فیملی کرکٹ میچ دیکھنے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں جانے نہیں دیا۔ یہ کہتے ہیں، ہم پاکستانی جاسوس ہیں۔''

وہ روتے روتے اسے اپنے بارے میں بتانے لگی۔ اسے بیس دن ہو گئے تھے، ان لوگوں کی قید میں اور وہ بہت دکھی تھی۔ وہ چپ چاپ اس کی روداد سنتا رہا۔ ابھی وہ بول ہی رہی تھی کہ سپاہی دوبارہ آئے اور اسے کھینچتے گھسیٹتے ہوئے باہر لے جانے لگے۔ وہ بے اختیار خوف سے روتی چلاتی، جہان کو دیکھ کر اسے مدد کے لیے بلاتی رہی۔

جہان نے گردن واپس موڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تین دن تک روز رات کو وہ اس لڑکی کو لے جاتے۔ ٹارچر سیل قریب ہی تھا۔ وہاں سے اس کی دردناک چیخیں، آہیں، سسکیاں، یہاں تک صاف سنائی دیتیں۔

صبح کے قریب وہ اسے سیل میں واپس پھینک جاتے، اس حالت میں کہ وہ مزید زخمی ہوتی اور مزید رو رہی ہوتی۔

تیسری صبح وہ اٹھا، اپنے درد کو بھلائے، اس نے پانی کے برتن سے ایک گلاس بھرا اور اس کے قریب لے کر آیا۔ وہ بند آنکھوں سے نڈھال سی کراہ رہی تھی۔ اس نے اس لڑکی کی آنکھوں کو دیکھا تو ایک دم جیسے کوئی یاد ہر سو چھانے لگی......

فریحہ ابکان رضا...... خوب صورت اور طرحدار فریحہ......

وہ ایک روز ان کے گھر گیا تو اس نے لاؤنج میں بیٹھی فریحہ کو آئینہ پکڑے، موچنے سے اپنی بھنوؤں کو تراشتے دیکھا تھا۔ علی کرامت کی ممی اپنی بھنوؤں کو نہیں تراشتی تھیں۔ ان کے ابرو قدرتی تھے مگر اچھے لگتے۔

''آپ کیوں مسز فریحہ کی طرح اپنی آئی بروز کو شیپ نہیں دیتیں؟'' اس نے ان سے پوچھ ہی لیا تو وہ ہنس کر بولیں۔

''اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چیزیں اپنی مرضی سے رد و بدل نہیں کرتے بیٹا! اللہ تعالیٰ کو یہ اچھا نہیں لگے گا۔''

وہ اس نیم بے ہوش پڑی لڑکی کی بھنویں دیکھ رہا تھا۔ بالکل فریحہ کی طرح کمان کی شکل میں بنی ابرو بہت صاف تھیں۔ اگر وہ ایک ماہ سے زیر حراست تھی تو ابھی تک ابرو کی شیپ خراب کیوں نہیں ہوئی تھی؟ کیا اسے جیل میں ابرو تراش ملا کرتا تھا؟

''لعنت ہے!'' اس نے گلاس پورا کا پورا اس کے چہرے پہ انڈیلا اور اٹھ کر واپس اپنی جگہ پہ آ گیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی مگر زیادہ حرکت نہیں کی۔

ایسے اسٹول پیجین stool pigeons اکثر جیل میں مطلوبہ ملزم کے ساتھ ڈالے جاتے تھے تاکہ وہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم کی داستان اور اپنی چیخیں سنا کر ملزم کو ڈرا سکے اور وہ اپنی زبان کھول دے یا کم از کم اس کی ہمدردی لے کر وہ اسٹول پیجین اس کے بارے میں کچھ جان سکے۔

وہ اب دن رات اپنے فرار کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ وہ جیل اتنے زیادہ پہروں میں بند تھی کہ وہاں سے بھاگنا ناممکن تھا۔ کرے تو کیا کرے؟ وہ اسے پولی گراف ٹیسٹ پہ لے کر گئے تھے، اور اس کو تربیت کے دوران اس مشین کو دھوکہ دینا سکھایا گیا تھا، سو وہ اس کو نہیں توڑ سکے، لیکن اسے خوف تھا کہ مخصوص انجکشن دے کر وہ اس سے بہت کچھ اگلوا لیں گے۔ پھر اس کی ایجنسی اس کا کبھی اعتبار نہیں کرے گی۔ وہاں یہی کہا جائے گا، وہ غدار کا بیٹا تھا، وہ باپ جیسا ہی نکلا۔ کیا کرے، کدھر جائے؟

پھر کئی دن بعد ایک روز وہ اسے سیل سے نکال کر ایک مختلف کمرے میں لے آئے جہاں الیکٹرک شاکس کا انتظام تھا۔ بجلی کے جھٹکے لینے کا مطلب تھا، ساری عمر صحت کے مختلف مسائل کا شکار ہو کر وہ فوج کے لیے ناکارہ ہو جائے۔ اس نے سوچنے میں بس ایک منٹ لگایا۔

''او کے، او کے! آئی ایم اے اسپائی۔'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اعتراف کر لیا۔ ''مجھے شاکس مت دو، میں سب بتاتا ہوں۔''

تفتیشی ٹیم دوبارہ بیٹھی۔ ریکارڈنگ کا انتظام ہوا۔ سوال و جواب اور بیان دوبارہ لیے گئے۔ اس نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ان کو بتانا شروع کیا کہ وہ سویلین جاسوس ہے۔ اپنی ایجنسی کا نام اسے نہیں معلوم، اور چند دوسری کہانیوں کے بعد اس نے بتایا کہ اس ماہ کی تیرہ تاریخ کو اس کو اپنے ساتھی جاسوس سے ملنا ہے۔ وہ ان کو وہاں لے جائے گا، تاکہ وہ اس ساتھی کو گرفتار کرلیں اور اس کے ساتھ رعایت برتیں۔

وہ جانتا تھا کہ اس جیل سے وہ نہیں بھاگ سکتا، ہاں کھلی فضا میں شاید یہ ممکن ہو۔ اس نے کہا کہ اگر تیرہ تاریخ کو وہ نہیں آیا تو پھر ایک یا دو ہفتے بعد اسی جگہ پہ وہ دوبارہ آئے گا۔

خوب وارن کرنے اور جھوٹ بولنے یا فرار کی کوشش میں ملنے والی سزا کے بارے میں ڈرا دھمکا کر وہ یہ خطرہ لینے کو تیار ہو گئے۔ اس کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، اور ان کے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ انہیں ایک پُر ہجوم جگہ پہ لے آیا مگر وہاں اتنی سیکیورٹی اور مکمل انتظامات تھے کہ ادھر سے فرار ہونا کسی اسپائیڈر مین کے لیے تو ممکن تھا، مگر انسان کے لیے نہیں۔ اس نے وہاں ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے بہت دفعہ کوشش کی کہ کہیں کوئی جھول مل جائے، مگر یہ ناممکن تھا۔

وہ چپ چاپ واپس آ گیا۔

اگلے ہفتے وہ پہلے سے زیادہ سیکیورٹی کے ساتھ اسی جگہ پہ لے جایا گیا۔ اس کا کوئی دوست ادھر نہیں آنا تھا۔ سو کوئی نہ آیا۔ تین گھنٹے اس مِل پہ ادھر اُدھر ٹہل کر وہ اس سے ہٹ کر ایک بک اسٹال پہ چلا آیا۔ ہر طرف سادہ کپڑوں میں موجود سیکیورٹی اہلکار اس پہ نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھے۔ وہ ایک رسالہ اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس کا ارادہ گھنٹہ بھر مزید ٹہل کر یہاں سے واپس ہو لینے کا تھا۔ کون سا کسی نے آنا تھا۔ اب اتنی گرمی میں وہ کیوں خوار ہوتا رہے؟

رسالہ رکھ کر وہ مڑنے ہی لگا تھا کہ شاپ سے نکلتی تین لڑکیاں ہنستی باتیں کرتی یوں ایک دم اس کے سامنے آئیں کہ وہ ان سے ٹکرا گیا۔

''اوہ!'' جس لڑکی سے وہ ٹکرایا تھا، وہ ایک دم اتنی بوکھلائی کہ اس کی کتابیں اور فائل نیچے جا گریں۔ وہ جلدی جلدی معذرت کرتا اس کی کتابیں اٹھانے لگا۔

وہ کالج یونیفارم میں ملبوس لڑکیاں تھیں۔ جس سے وہ ٹکرایا تھا، اس نے سر پہ دوپٹا لے رکھا تھا۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں چمکتا چہرہ بہت معصوم، بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ جہان کے ساتھ جھک کر اس نے اپنی فائل اٹھائی اور کچھ اس طرح سے اٹھائی کہ اس پہ لکھے الفاظ واضح ہو گئے۔

وہ بہت کوشش سے اپنی حیرانی ظاہر کیے بغیر اٹھا۔ دل ایک دم زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ لڑکیاں جلدی جلدی اپنی چیزیں سنبھال کر واپس مڑ گئیں۔ وہ خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے پھر سے بک ریک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک کتاب اٹھا کر اس نے چہرے کے سامنے تان لی تاکہ اس کے تاثرات اس کے نگرانوں سے چھپ سکیں۔

اس لڑکی کی فائل پہ ایک آفیسر کا نام، رینک اور اس کی تفتیشی ٹیم میں شمولیت کا دن لکھا تھا۔ ساتھ میں پہچان کے لیے جہان کا اپنا کوڈ نمبر اور اس کے کوڈ نیم کا مخفف بھی لکھا تھا۔ اے آر پی۔

Agent Rose Petal

اس میں اور گلاب کی پنکھڑی میں کوئی مماثلت نہیں تھی۔ یہ بس ایک کوڈ نیم تھا، جیسے عموماً ہوا کرتے تھے۔ شاید جس نے الاٹ کیا تھا، اس کے سامنے اس وقت روز پٹیل ٹشو کا ڈبا رکھا ہو، بہرحال اس لڑکی کی فائل پہ لکھے یہ الفاظ پہچان کے لیے کافی تھے۔ اس نے کتاب واپس رکھتے ہوئے سرسری سے انداز میں دکان کے شیشے کے دروازے کو دیکھا جہاں دور مخالف سمت جاتی تین لڑکیوں کا عکس نمایاں تھا۔

اسی پل فائل والی لڑکی نے گردن ذرا موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مسکراہٹ تھی۔

مرہ جمیلہ

خوب صورت عورت......

اگلے ہی لمحے مرہ جمیلہ واپس پلٹ گئی۔ وہ تینوں لڑکیاں اب بس پوائنٹ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ سب کچھ اتنے عام سے انداز میں ہوا تھا کہ ان درجنوں نگرانوں نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ واپس چلے آئے۔

اب اس کے پاس مزید ایک ہفتے کا وقت تھا۔ اگلے ہفتے اس کو آخری دفعہ ان لوگوں کو اسی جگہ پہ لے کر جانا تھا۔ اس کے تعاون کے پیش نظر ہفتے دس دن اس پہ تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ کھانا بھی قدرے بہتر مل رہا تھا۔ شاید وہ سمجھے کہ اگر وہ راز اگل دے تو وہ اس کو چھوڑ دیں گے۔

حالانکہ وہ جانتا تھا کہ تب بھی وہ مارا جائے گا مگر اب اسے امید تھی۔ اسے لاوارث نہیں چھوڑا گیا تھا۔ اسے بس اس آفیسر کا انتظار کرنا تھا جو چند دن میں ادھر آ جائے گا اور فرار میں اس کی مدد کرے گا۔

اور پھر ایک روز وہ آفیسر اس کی تفتیش پہ تعینات ہو ہی گیا۔ اس کو امید تھی کہ وہ اس کی مدد کرے گا، مگر اس نے اس پر تفتیش اور تشدد کے پہاڑ توڑ ڈالے۔ وہ اس پہ چلاتا تھا، اس کو گالیاں دیتا تھا، اور بہت ظلم کیا کرتا تھا۔ جیسے اس قیدی کی زبان کھلوانا اس کے کیریئر کا مسئلہ تھا۔ وہ اس آفیسر کے بارے میں کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گیا۔ ہو سکتا ہے وہ لڑکی بھی ان ہی بھارتیوں کی بھیجی گئی ہو تا کہ وہ اس آفیسر کو اپنا ہمدرد خیال کر کے اس سے دل کی بات کر بیٹھے۔

مگر پھر اس لڑکی کی فائل پہ اس کا کوڈ نمبر کیسے لکھا تھا؟

وہ کوڈ نمبر پاکستان میں بہت اہم جگہ محفوظ تھا، وہ یوں کسی کو نہیں مل سکتا تھا! وہ کیا کرے؟

صبر... اور انتظار!!!

اور لیسی ہی ایک شام جب بھارت اور پاکستان کے کرکٹ میچ میں پاکستان جیت گیا، تو اس آفیسر نے غصے اور اشتعال میں تمام گارڈز کو اس پہ کھلا چھوڑ دیا، وہ اس کو پیٹتے رہے، مارتے رہے، ٹھڈوں سے، مکوں سے، لاتوں سے، اور گالیاں دیتے رہے۔

وہ سہتا رہا۔

اور جب یہ سیشن ختم ہوا تو وہ سب باہر چلے گئے۔ آخری جانے والوں میں وہ آفیسر تھا۔

جب اس نے درد سے کراہتے سر کو سیدھا کیا، اور نیم جاں آنکھوں کو کھول کر دیکھنا چاہا تو اس کے سیل کی چابی اس کے ساتھ گری پڑی تھی۔

یہ یقیناً بظاہر ان گارڈز کی دھکم پیل میں گری تھی۔

مگر وہ جان گیا تھا کہ وہ آفیسر ان کا اپنا تھا۔

اب وہ یہاں سے نکل سکتا تھا۔

اور اس آفیسر پہ کوئی شک بھی نہیں کر سکے گا۔

اس نے اپنی اور جہان، دونوں کی چمڑی بچانی چاہی تھی۔

کبھی زندگی نے موقع دیا تو وہ اس ہندو آفیسر کے احسان کا بدلہ ضرور پورا کرے گا۔ کاش وہ اس کے لیے کچھ کر سکتا......

تین دن تک اس نے خاموشی سے انتظار کیا۔ چابی اس نے چھپائی تھی۔ جب زخم ذرا بھر گئے، تو ہولی آ گئی۔

تہوار کا دن۔

سب اس روز مگن تھے۔

وہ اپنا کام کر سکتا تھا۔

اور وہ موقع کا انتظار کرتا رہ گیا جب اچانک سے ہر طرف شور اٹھا۔ دھکم پیل، افراتفری۔

کہیں کسی کمرے میں آگ لگ گئی تھی۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ اور وہ جان گیا تھا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔

باقی سب تاریخ کا حصہ بن گیا۔

اس افراتفری میں سیل سے نکلنا، ایک آفیسر کو گرا کر اس کا لباس، اور کارڈ ہتھیانا کچھ مشکل نہ تھا۔

یہاں تک کہ وہ اس بلڈنگ سے باہر نکل آیا۔

پورے ایک ماہ دس دن بعد اس کو اس عقوبت خانے سے رہائی ملی تھی۔ چند دن بعد ہی وہ راجستھان کے قریب کی سرحد عبور کر کے اپنے ملک واپس پہنچ چکا تھا۔

ڈیڑھ برس بعد وہ جن حالات سے گزر کر پاکستان پہنچا، وہ ناقابل بیان تھے۔ جب وہ واپس لاہور پہنچا تو اس کے زخم ابھی بھرے نہیں تھے۔ مسلسل علاج اور دیکھ بھال کے بعد ظاہری زخم تو مندمل ہو گئے مگر وہ سر کا بدترین درد اس کے ساتھ رہا۔ اس نے کبھی اپنے اس سر درد کو ظاہر نہیں کیا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی بیماری یا معذوری اس کے سروس ریکارڈ کو خراب کرے اور وہ میدان جنگ سے واپس بیرکوں میں بھیج دیا جائے۔ ان کی

ہنجنسی کا ایک مشہور زمانہ مقولہ تھا کہ "ہم زمانہ امن میں جنگ کرتے ہیں اور زمانہ جنگ میں اپنی کی ہوئی جنگ کا نتیجہ دیکھتے ہیں۔" ابھی وہ مزید جنگ کرنا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

("جنت کے پتے" ایک فرضی داستان ہے مگر جیل کے دوران تشدد کے مختلف طریقے جو یہاں بیان کیے گئے ہیں وہ بالکل درست اور حقیقت پہ مبنی ہیں۔ یہ چند واقعات ابوشجاع، ابووقار کی کتاب "غازی" میں بیان کی گئی سچی داستان جو سلیم نامی ایک حقیقی جاسوس کی داستان ہے سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں، جس کے لیے ہم اس کتاب کے لکھاریوں کے احسان مند ہیں، اور سر سلیم کے ایصال ثواب اور مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔)

☆ ☆ ☆

مگر اس جنگ اور قید نے اسے ایک مختلف انسان بنا دیا تھا۔ جہاں ایک طرف وہ اپنے سروس ریکارڈ میں Reliable Under Torture (ریلائبل انڈر ٹارچر) کی ڈگری میں آ گیا تھا، وہاں دوسری طرف اس کے اندر بہت کچھ مر گیا تھا۔ وہ جو ایک فیملی بنانے کی، ایک حسین لڑکی سے شادی کر کے اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے، وہ خواہش مر گئی تھی۔ وہ دنیا سے بے اعتبار ہو چکا تھا۔ اس کے اندر اتنی تلخی بس چکی تھی کہ اب وہ ایک فیملی مین نہیں رہا تھا۔ وہ بس ایک ایجنٹ تھا۔ یہی اس کی زندگی، اس کی محبت، اس کی فیملی تھی۔ جب حکومت نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اس کو ملک کی خدمت کے قابل بنایا تھا تو بہتر تھا کہ وہ یہی کام کرے۔ ماموؤں سے بغض و عناد، انتقام لینے کی خواہش، سب جیل نے نگل لیا تھا۔ اگر کچھ بچا تھا تو وہی ایک احساس کمتری جو ماموؤں کا سامنا کرنے کا سوچ کر اسے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا۔ بس، اور کچھ نہیں۔

رہائی کے کچھ عرصے بعد وہ ممی کے پاس ترکی گیا تو ایک اچھی خبر اس کی منتظر تھی۔ ممی نے اپنی جمع پونجی ملا کر جہانگیر والا گھر پھر سے خرید لیا تھا۔ دادا کا بنایا گھر، ان کا اپنا گھر۔ مگر اب اس کو اس گھر نے بھی بہت زیادہ خوشی نہیں دی۔ وہ تو بس ایک خواہش تھی، پوری ہو گئی۔

قریباً تین برس قبل وہ اپنے ترک پس منظر کے باعث ترکی بھیجا گیا وہاں وہ دو کورز کے ساتھ رہ رہا تھا۔ ایک اپنی پاکستانی شناخت "جہان سکندر" اور دوسری ایک انڈین شناخت "عبدالرحمٰن پاشا"۔

اپنے کام کے سلسلے میں آج کل وہ اسلام آباد واپس آیا ہوا تھا اور ممی کے مسلسل زور دینے پہ وہ بالآخر ماموں کے گھر جانے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ہوٹل میں اپنی منکوحہ کو اتفاقیہ دیکھ لینے کے بعد اس کا ارادہ مزید ڈانواں ڈول ہو گیا تھا اور بعد میں بھی شاید وہ ماموں سے ملنے کی کوشش کرتا، مگر وہ لڑکی استنبول آ رہی تھی، یہ خیال اسے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ ایسا کرنا تھا جس سے وہ اس لڑکی کو روک پائے، مگر کیا، یہ ابھی اسے طے کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ بیسن کی ٹونٹی پہ جھکا چہرے پہ پانی کے چھینٹے ڈال رہا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مکروہ صورت اس کی جلد سے ہر نشان چھوڑ کر چکی ہے تو اس نے چہرہ اٹھا کر باتھ روم کے آئینے میں دیکھا۔ ماتھے پہ سامنے کو گرتے اس کے گہرے بھورے بال گیلے اور منہ دھلا دھلایا ہو چکا تھا۔ اس نے اسٹینڈ سے لٹکتا تولیہ اتارا اور چہرے کو رگڑتا باہر آیا۔

لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا۔ اس کا لیپ ٹاپ بھی آن پڑا تھا۔ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے تولیہ ایک طرف ڈالا، پھر لیپ ٹاپ گود میں رکھتے ہوئے اپنا موبائل نکالا۔ اسے ممی کو فون کرنا تھا۔

دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی۔ وہ منتظر سا اسے سنتا گیا۔ ذہن کے پردوں پہ آج کے واقعات پھر سے چلنے لگے تھے۔

گزشتہ رات ماموں کے گھر سے نکلتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک لائحہ عمل تشکیل پا رہا تھا۔ جو آخری چیز وہ اپنی مشکل زندگی میں نہیں چاہتا تھا، وہ اپنی بیوی کا اس شہر میں آ کر رہنا تھا، جہاں وہ پہلے ہی ایک مقیم ایجنٹ کی حیثیت سے دو زندگیاں گزار رہا تھا۔ اب اسے کسی نہ کسی طرح اس لڑکی کو روکنا تھا۔ جب اس نے کچن میں سفید پھول رکھے تھے تو اس کے ذہن میں مکمل لائحہ عمل نہیں تھا، مگر پھر بھی وہ جاتے وقت اس کی کار پہ ایک جی پی ایس ٹریسر چسپاں کر آیا تھا۔ وہاں کھڑی دو گاڑیوں میں سے چھوٹی والی یقیناً اسی کی تھی۔ وہ اس لڑکی پہ نظر رکھنا چاہتا تھا اور آج کل اس کے پاس اتنا ڈھیر سارا وقت تھا کہ وہ اس پہ نظر رکھ سکے۔ پتا نہیں کیوں، جب بھی وہ اس کے بارے میں سوچتا اس کو وہ لڑکی کے نام سے ہی سوچتا۔ وہ اس کا نام نہیں لیا کرتا تھا۔ کچھ تھا، جو اسے پسند نہیں آ رہا تھا۔

وہ امریکی سفارت خانے کی سیکنڈ سیکریٹری کی وجہ سے آج کل لاہور تھا۔ وہ بھارتی نژاد امریکی شہری تھی اور اس کی پاکستان سے دو ماہ بعد روانگی تھی۔ جہان کی دلچسپی کی بات یہ تھی کہ اس کی اگلی پوسٹنگ استنبول میں امریکی سفارت خانے میں ہو رہی تھی۔ اگر اس تک رسائی حاصل کر لے تو استنبول میں اس کے بہت سے کام آسان ہو سکتے تھے۔ مسئلہ بس اتنا تھا کہ وہ اس کی کار تک بھی رسائی حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اپنی کار کا شیشہ صرف اور صرف کسی خواجہ سرا بھکاری کے لیے کھولتی تھی کیونکہ اسے خواجہ سرا کی بددعا سے ڈر لگتا تھا۔ غالباً خاندانی وہم تھا، جسے وہ آفیسر امریکا میں اتنے برس رہنے کے بعد بھی نہیں ختم کر سکی تھی۔ صرف اس کی کار کے انتظار میں اب اسے روز شام میں خواجہ سرا کا روپ دھار کر ان راستوں پہ پھرنا تھا جہاں سے وہ گزرتی تھی۔

کسی دوسرے کے لیے شاید یہ بہت عجیب بات ہو، مگر اس کے لیے نہیں تھی۔ اس کے نزدیک خوانچہ سرا بننا بالکل ایسے تھا، جیسے کسی ڈاکٹر کے لیے مسلسل سفید اوورآل کی بجائے آف وائٹ اوورآل پہننا۔ ایسی تبدیلی جو محسوس ہوتی نہ ہی بری لگتی۔ اپنے کیریئر کے دوران وہ اتنا کچھ بن چکا تھا کہ، بہت عرصہ ہوا وہ حس ہی ختم ہو چکی تھی جو عجیب وغریب حلیے کا احساس دلاتی۔

اپنے ذاتی کاموں کے لیے البتہ ایسے حلیے اس نے کبھی نہیں بدلے تھے، لیکن اب اس کی زندگی ذاتی رہی ہی نہیں تھی۔ اگر آج وہ حیا کی گاڑی کو ٹریس کر کے اس سے ملنے گیا تھا، تب بھی اس کے ذہن میں اپنی اسی ''جعلی'' زندگی کی فکر تھی جو وہ استنبول میں گزار رہا تھا۔

وہ آئس کریم پارلر جہاں وہ اس لڑکی کی گاڑی کی موجودگی کا علم ہونے کے باعث آیا تھا، اس جگہ سے زیادہ دور نہ تھا، جہاں آج کل اس کی ڈیوٹی تھی۔ وہاں خوانچہ سرا اکثر نظر آتے تھے، اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ان میں سے شاید ہی کوئی اصلی خوانچہ سرا ہو۔ آدھے پروفیشنل اور باقی آدھے خفیہ والے ہوتے تھے، جو ایسے روپ دھار کر حساس جگہوں کی نگرانی کیا کرتے تھے۔

وہ اس لڑکی کو ترکی جانے سے روکنا چاہتا تھا اور کل تک تو وہ اس سے ملنا بھی نہیں چاہتا تھا، مگر آج پتا نہیں کیوں، اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے۔ وہ اسے کبھی نہیں پہچان سکتی۔ اسے یقین تھا وہ کیا ممی بھی اسے اس حلیے میں نہیں پہچان سکتی تھیں۔

اس روز اس لڑکی نے ہلکے آسمانی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ بال حسب معمول کھلے تھے۔ وہ سلش پیتے ہوئے سوچ میں گم، غالباً شیشہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ وہ اس کے شیشے پہ جھکا تو وہ چونک گئی اور پھر اس نے اس کے سفید، گلابی چہرے کو خوفزدہ ہوتے دیکھا۔ تمام تر گھبراہٹ کے باوجود اس نے ٹھنڈا ٹھار سلش جہان کے منہ پہ الٹ دیا۔ تب وہ پیچھے ہوا تھا۔ اسے سلش نے پیچھے نہیں دھکیلا تھا، بلکہ اس کی جرأت پہ وہ حیران ہوا تھا۔ گذشتہ روز اگر اسے لگا تھا کہ وہ کوئی بہت ہی نازک سی لڑکی ہے، تو ایسا نہیں تھا۔ وہ کافی پُر اعتماد اور ایک دم سے ردعمل ظاہر کر دینے والی لڑکی تھی۔ چلو، کوئی تو اچھی بات تھی۔

وہ وہاں سے سیدھا اپنے اپارٹمنٹ آیا تھا اور اب حلیہ ٹھیک کر کے ممی کو فون کر رہا تھا۔ ممی نے فون اٹھاتے ہی سب سے پہلے وہی پوچھا جس کی اسے توقع تھی۔

''تم ماموں سے ملنے گئے تھے؟''

''جی، مگر......''

''ابھی میری صائمہ بھابھی سے بات ہوئی ہے، انہوں نے تو نہیں بتایا۔'' وہ حیران ہوئیں۔

''آپ دو منٹ تسلی سے میری بات سنیں گی؟'' پورے دو منٹ اس کی بات تسلی سے سن لینے کے بعد بھی ممی بولی تھیں۔

''تم آج چلے جاؤ، آج فرقان بھائی کے گھر رات میں کھانا بھی ہے۔ سب اکٹھے ہوں گے۔ تم ان سے ایک دفعہ مل لو، پھر بعد میں حیا کو اعتماد میں لے کر بتا دینا۔ بات ختم۔''

اور اس کے جو ہاتھ میں آیا، اٹھا کر بہرے اوپر دے مارنا ہے۔ اس نے بے اختیار سوچا تھا، پھر چند منٹ لگے اسے ممی کو راضی کرنے میں اور بمشکل وہ اس بات پہ متفق ہوئیں کہ ابھی ماموں سے ملنے کے بجائے بہتر ہے کہ پہلے وہ ماموں کی بیٹی سے ملے، ہو سکے تو اسے روک دے اور اگر اس کے رکنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور وہ پانچ ماہ کے لیے استنبول آ رہی ہے، تو پھر اسے ان لوگوں کو اپنے بارے میں آگاہی نہیں دینی چاہیے۔ یہ اس کی جاب کے اصول کے خلاف تھا۔ اسے ترکی میں اپنے اردگرد کوئی ایسا شخص چاہیے تھا جو اس بات سے واقف ہو کہ اس کا نام عبدالرحمٰن پاشا نہیں، یا جہان سکندر نہیں، بلکہ میجر جہان سکندر احمد ہے۔ اس نہج پہ پہنچ کر ممی راضی ہو گئیں۔

''ٹھیک ہے، تم کرو جو تم کرنا چاہتے ہو میں انہیں نہیں بتاؤں گی کہ تم اسلام آباد میں ہو۔'' وہ خوش نہیں تھیں مگر خفا بھی نہیں تھیں۔ اس نے سکون کی گہری سانس اندر کھینچی۔ اب اس کے پاس اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے چند روز تھے۔

فون بند کرنے کے بعد وہ فوراً اٹھا اور اپارٹمنٹ مقفل کر کے باہر آیا۔ ممی نے فرقان ماموں کے گھر فیملی ڈنر کا بتایا تھا۔ اگر وہ یہی بات کارڈ پہ لکھ کر ایک روز پرانی تاریخ کے مہر زدہ لفافے میں ڈال کر گلاب کے پھولوں کے ہمراہ اس کے گھر دے آئے تو یقیناً وہ اس کی توجہ پا لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہی وہ اس کی کوئی بات سنے گی۔

آج بھی وہ اسی پھول والے کے پاس آیا تھا، اور آج بھی اس کے پاس سرخ گلاب نہیں تھے۔ اس نے دل ہی دل میں پھول والے اور سرخ گلاب، دونوں پہ لعنت بھیجتے ہوئے سفید گلاب خرید لیے۔ بار بار وہ موبائل پہ اپنے ٹریسر کا اسٹیٹس چیک کرتا تھا۔ اس کی کار ابھی تک گھر

نہیں پہنچی تھی۔

اپنی مصروفیات میں سے اس لڑکی کے لیے وقت نکالنا ایک دم ہی اسے، بہت دلچسپ لگنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ داور کی مہندی کی دوپہر تھی۔ جب ممی کا فون آیا۔ وہ اس وقت آفس سے نکل رہا تھا، یہاں سے اسے اپنی وہ کار لینے جانا تھا، جو اسے اسلام آباد میں استعمال کرنی تھی۔ ممی کا نمبر اسکرین پہ جلتا بجھتا دیکھ کر وہ ذرا چونکا۔ شاید ممی نے ذہن بدل لیا تھا، ورنہ وہ اس طرح اچانک کال نہیں کرتی تھیں، ماسوائے ہنگامی صورت حال کے۔

"جی ممی! خیریت؟" اپنے دفتر کی مین بلڈنگ سے دور ہٹ کر سڑک کنارے چلتے وہ ان سے بات کرنے لگا۔

"تم آج جا کر ماموں سے مل لو۔"

وہی ڈھاک کے تین پات، وہ جی بھر کر بے زار ہوا۔

"ممی! کل رات ہم نے کس بات پہ اتفاق کیا تھا، آپ بھول گئیں؟"

"جہان! میری بات سنو۔ مجھے خدشہ ہے کہ سلیمان بھائی حیا کی شادی کہیں اور نہ کر دیں۔"

"تو کر دیں!" وہ یہ نہ کہہ سکا، گو کہ وہ یہی کہنا چاہتا تھا مگر جب بولا تو آواز میں پتا نہیں کہاں سے خفگی در آئی تھی۔

"وہ اس طرح کیسے کر سکتے ہیں کسی اور سے اس کی شادی؟ ہمارا نکاح ہوا تھا، منگنی نہیں جو وہ اپنی مرضی سے توڑ دیں۔"

"وہ خلع بھی لے سکتے ہیں اور تم جانتے ہو ایک دو پیشیوں میں فیصلہ ہو جایا کرتا ہے بچپن کے نکاح کا اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو اس کے ذمے دار ہم ہوں گے۔"

"اور وہ خود کسی چیز کے ذمے دار نہیں ہیں؟"

"جہان سکندر! میں نے تمہاری پرورش اس منتقم مزاج سوچ کے ساتھ تو نہیں کی تھی۔" انہیں جیسے دکھ ہوا تھا۔ وہ فوراً نادم ہوا۔

"اچھا، آئی ایم سوری۔ میرا مطلب تھا کہ اگر ہم اس رشتے پہ خاموش ہیں تو بات وہ بھی نہیں کرتے۔"

"وہ بیٹی والے ہو کر کیسے خود سے بات کریں؟ کیسے کہیں کہ ہماری بیٹی کو رخصت کروا کر لے جاؤ؟ ایسے اپنی بیٹی کو کوئی ہلکا نہیں کرتا۔"

"ہاں، میرے ماموؤں کا غرور اور انا....." ادھر ممی کہہ رہی تھیں۔

"وہ ہماری طرف سے مایوس ہو چکے ہیں، اسی لیے سلیمان بھائی حیا کے نئے آنے والے رشتوں پہ غور کر رہے ہیں۔" وہ ایک دم بالکل چپ ہو گیا۔

"آپ کو کس نے کہا یہ؟" یہ تو طے تھا کہ وہ بلا تحقیق کسی بات پہ یقین نہیں کر سکتا تھا۔

"صائمہ بھابھی نے ابھی فون کر کے بتایا ہے۔ ان کے بقول سلیمان بھائی کو ہمارا انتظار بھی نہیں ہے۔ انہوں نے فرقان بھائی سے خود کہا ہے کہ ان کے کسی دوست نے اپنے بیٹے کے لیے حیا کا رشتہ بھجوایا ہے اور آج وہ فرقان بھائی کو اس لڑکی سے ملوائیں گے۔ شاید ان کے کسی بزنس پارٹنر کا بیٹا ہے، باہر سے پڑھ کر ابھی آیا ہے، فرقان بھائی نہیں ملے ابھی اس سے۔"

وہ بالکل خاموشی سے سنتا رہا۔ اسے یہ سب بہت برا لگ رہا تھا۔ کیوں، وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا۔

"تم آج چلے جاؤ۔ میں اس رشتے کو توڑنا نہیں چاہتی جہان!" وہ بے بسی سے کہہ رہی تھیں۔

"جب وہ لوگ مجھے بے حد غیر اہم سمجھ کر میرے منتظر ہی نہیں ہیں تو کیا فائدہ جانے کا؟"

"بھابھی بتا رہی تھیں، حیا ہمارا پوچھ رہی تھی۔ اسے انتظار ہوگا۔"

"کیوں؟" وہ بے اختیار کہہ اٹھا۔

"لڑکیوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں بیٹا! میں کبھی کبھی خود کو اپنی بھتیجی کی مجرم سمجھتی ہوں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں، میں یہ رشتہ نہیں ٹوٹنے دوں گا۔"

"یعنی تم جا رہے ہو؟" وہ جیسے کھل اٹھیں۔

"اب یہ بھی نہیں کہا تھا میں نے۔ بس آپ مجھ پہ بھروسا رکھیں، میں سب فکس کر لوں گا۔"

اور ممی خاموش ہو گئیں ان کو شاید اس کی اس قابلیت پہ بھروسا تھا کہ وہ اپنے اردگرد موجود ہر خراب چیز کو فکس کر لیا کرتا تھا۔ رشتوں اور چیزوں میں فرق ہوتا ہے۔ شاید ممی نے یہ بھی سوچا ہو۔

آج اس کو دیکھتے ہی پھول والے لڑکے کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

"صاب! آج سرخ گلاب بہت سارے ہیں۔"

"مگر مجھے سفید ہی چاہئیں۔" اس نے بٹوہ نکالتے ہوئے دوٹوک انداز میں سنجیدگی سے کہا۔ لڑکے کا چہرہ جیسے اتر سا گیا، مگر پھر بھی وہ جلدی جلدی سفید گلابوں کو اکٹھا کرنے لگا۔

سفید گلاب بے شک، بہت سے لوگوں کے نزدیک دشمنی کی علامت تھے مگر بہت سے اسے امن اور صلح کی نشانی ہی گردانتے تھے۔

وہ آج ان کے گھر کے اندر نہیں گیا، بلکہ ان کے گھر کے مقابل ایک زیر تعمیر بنگلے میں چلا آیا۔

سریے، اینٹیں، آدھی بنی دیواریں، وہ گھر رات کے وقت ویران پڑا تھا۔ مزدور وغیرہ کب کے جا چکے تھے اور اب وہ وہاں اوپری منزل کے کمرے میں بیٹھ کر با آسانی سامنے سلیمان ماموں کے گھر کے کھلے گیٹ سے سب دیکھ سکتا تھا۔

مہندی کا فنکشن دونوں گھروں کے قریب ہی ایک کھلے پلاٹ میں شان دار سی قناتیں لگا کر کیا گیا تھا۔ اسے تقریب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ صرف سلیمان ماموں کے کھلے گیٹ کو دیکھ رہا تھا جہاں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ خواتین کی تیاری اور الٹے سیدھے فیشن! وہ روایات اور قدریں جن کا ذکر ممی اکثر کیا کرتی تھیں، وہ اسے اپنے ننھیال کی خواتین میں کہیں نظر نہیں آئی تھیں۔ داور کی بہن تو شاید باقاعدہ اسکارف لیا کرتی تھی مگر وہ بھی اسے سلور لہنگے میں بنا سر ڈھکے ادھر ادھر پھرتی نظر آ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں شادیوں پہ لوگ سب بھلا دیتے ہیں؟ اسے افسوس ہو رہا تھا۔

بہت دیر بعد جہان نے بالآخر اسے دیکھ ہی لیا۔ وہ اپنی ممی کے عقب میں چلتی برآمدے سے اترتی ڈرائیو وے تک آ رہی تھی، جہاں سلیمان ماموں ایک فیملی کے ہمراہ کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ سنہرا لہنگا اور ٹیکا اسے مزید حسین بنا رہا تھا مگر وہ اسے پھر بھی "مرہ جمیلہ" نہیں لگی تھی۔

سلیمان ماموں اب اس کا تعارف ان لوگوں سے کروا رہے تھے جو ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ صاحب، خاتون، اور غالباً ان کا بیٹا۔

اس نے اپنے سیل فون میں دوربین کا لینس نکالا اور ان کو فوکس کیا۔ اب وہ ان کے چہرے صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ تینوں مہمان بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے، بالخصوص ان کا بیٹا۔ اس کی نظریں تو بہت ہی...... اسے پتا نہیں کیوں پھر سے غصہ آنے لگا اور تب ہی اس نے حیا کے چہرے کی جوت کو ماند پڑتے دیکھا۔ وہ خوش نہیں لگ رہی تھی۔ ذرا سی دیر میں ہی وہ ان کے پاس سے ہٹ آئی۔ گیٹ سے باہر آ کر اس نے انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارا صاف کیا۔

اس نے موبائل کے بٹن کو چند ایک دفعہ دبایا۔ وہ اس کی تصویر لینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی کوئی تصویر اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ان لوگوں سے مل کر خوش نہیں تھی شاید یہی وہ رشتے والے تھے، جن سے آج سلیمان ماموں نے فرقان ماموں سے ملوانا تھا۔ وہ اس پہ خوش اس لیے نہیں تھی کہ یہ رشتہ اس کے لیے ان چاہا تھا۔

دل کے کسی کونے میں اسے یک گونہ اطمینان سا نصیب ہوا۔ جیسے تسلی سی ملی ہو، جیسے ڈھارس سی بندھ گئی ہو، وہ اب پہلے جتنا ناخوش نہیں تھا۔

وہ بہت دیر ادھر ہی بیٹھا رہا۔ اسے فنکشن دیکھنے کی آرزو نہ تھی، بس وہ اس کی واپسی کے انتظار میں وہیں موجود تھا۔ وہ اسے ایک دفعہ پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ کافی دیر گزری، تب وہ اسے واپس آتی دکھائی دی۔ وہ گھر کے اندر جا رہی تھی۔ کیا اسے اس سے ملنا چاہیے؟ یا اس کے ترکی آنے کا انتظار کرے؟ وہ یہی سوچ رہا تھا جب اس کا فون بجا۔

اس نے سیل فون کی اسکرین کو دیکھا، پھر بے اختیار چونکا۔ یہ اس کی ترکی والی وہ سم تھی جو پوسٹ پیڈ تھی اور کبھی اس کے اور کبھی ممی کے زیر استعمال رہتی تھی۔ یہ نمبر ماموں کے پاس تھا اور اس میں ماموں کا نمبر محفوظ بھی تھا اور اب اس نمبر سے کال آ رہی تھی۔ ماموں کے گھر سے کال؟ وہ لمحے بھر کو گڑبڑا سا گیا۔

مگر اس نے فون اٹھا لیا چونکہ یہ ترک نمبر تھا اس لیے وہ ایک ہی لمحے میں خود کو ترکی لے گیا۔ ایک پیشہ ور ایجنٹ ہونے کے ناطے اس کو

یہ ظاہر نہیں کرنا تھا کہ وہ ترکی سے باہر ہے اور اس کا نمبر رومنگ پہ ہے۔

وہ حیا تھی، نا قابل یقین...... اور وہ ممی کا پوچھ رہی تھی۔ وہ ان کی منتظر تھی، ممی ٹھیک کہتی تھیں۔ اس سب کے باوجود جب وہ بات کرنے لگا تو اس کا لہجہ خشک ہی تھا۔ وہ اتنی جلدی کسی کے ساتھ نرمی سے یا کھل کر بات نہیں کرتا تھا اور اس کو تو وہ ویسے بھی کوئی امید نہیں دلانا چاہتا تھا۔ پھر بھی، جب بات کے اختتام پہ اس نے حیا کی آواز کو بھیگتے ہوئے سنا تو اس کا دل دکھا تھا۔

فون بند کرتے ہی اس نے وہ خط کا لفافہ نکالا جو وہ پھولوں کے ساتھ رکھنے کے لیے لایا تھا۔ ابھی اندر موجود سفید موٹے کاغذ پہ اس نے لکھا نہیں تھا اور اب اسے معلوم تھا کہ اس کو کیا لکھنا ہے۔

''اس لڑکی کے نام جو کبھی کسی ان چاہے رشتے کے بننے کے خوف سے روتی ہے، تو کبھی کسی بن چکے ان چاہے رشتے کے ٹوٹنے کے خوف سے۔''

یہ آخری بات محض اس کا گمان تھا، مگر کیا پتا وہ صحیح بھی ہو۔ اس نے پی کیپ سر پہ لی اور مفلر گردن کے گرد یوں لپیٹا کہ اگر اب وہ خود کو کوریئر سروس مین کہہ کر گھر کے کسی ملازم کے حوالے وہ پھول کرے تو کل کو دن کی روشنی میں وہ اسے پہچان نہیں پائیں گے۔ پھول اور خط ایک ملازم کے حوالے کر کے وہ واپس چلا آیا۔ وہ صرف حیا کو چونکانا چاہتا تھا اور اسے امید تھی کہ اس کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

☆ ☆ ☆

داور کی بارات کے روز اس کا قطعاً ارادہ نہ تھا کہ وہ آج بھی حیا کے لیے ادھر جائے گا۔ آج ویسے بھی اسے اپنے کام بہت تھے۔ سیکنڈ سیکریٹری تک رسائی وہ ابھی تک حاصل نہیں کر سکا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ یہ کام وقت طلب ہوتے ہیں۔ صبر، انتظار اور خاموشی، یہ تین چیزیں اس نے اپنی جاسوسی مہمات کے دوران سیکھی تھیں۔ آج بھی اس کا کام نہیں ہو سکا تھا اور وہ واپس گھر جا رہا تھا، مگر صرف آخری منٹ میں اس نے یونہی سرسری سا سلیمان ماموں کے گھر کا جائزہ لینے کا سوچا۔ معلوم نہیں وہ بار بار وہاں کیوں جاتا تھا۔

جب وہ ان کی گلی کے دہانے پہ پہنچا تو اس نے زن سے اپنے سامنے گزرتی گاڑی میں حیا کو دیکھا۔ وہ بے اختیار چونکا تھا۔ اس گاڑی میں اسے وہی کل والی فیملی نظر آئی تھی اور وہی بے باک نگاہوں والا فضول انسان گاڑی چلا رہا تھا۔

آخر وہ ان کے ساتھ کیوں جا رہی تھی۔

وہ فارغ تھا، اگر نہ ہوتا تب بھی ان کے پیچھے ضرور جاتا۔ جو بھی تھا، وہ اس کی بیوی تھی اور وہ اس وقت کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ تھی، جو اسے پہلی نظر میں ہی اچھے نہیں لگے تھے۔ کل اسے وہ ان سے مل کر ناخوش لگی تھی، مگر آج وہ ان ہی کے ساتھ تھی۔ وہ کل غلط تھا یا آج؟ وہ یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اور جب اس نے میرج ہال کے ایک طرف حیا کو گاڑی سے اتر کر دوبارہ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھتے دیکھا تو اسے دھچکا سا لگا تھا۔ وہ کیسے یوں کسی کے ساتھ بیٹھ سکتی تھی؟ کیا وہ ہر ایک کے ساتھ بیٹھ جانے والی لڑکی تھی؟ اسے شدید غصہ آیا تھا۔ ایک تو اس کا لباس، پھر وہ اتنا میک اپ کرتی تھی۔ اتنی نک سک سے تیار ہوتی تھی، اوپر سے رات کا وقت۔ اس کا دل چاہا تھا وہ ابھی اس کو ہاتھ سے پکڑ کر اس آدمی کی کار سے نکال لے اور اگر اس نے وہ عجیب سا حلیہ نہ اپنایا ہوتا تو شاید وہ یہ کر بھی دیتا۔

جب وہ گاڑی سے نکلا تھا تو فرائی پان بھی ساتھ ہی اٹھا لیا جو اپنے اس گیٹ اپ کے ساتھ وہ رکھا کرتا تھا۔ کاملیت اس کے ہر ''کور'' میں نمایاں ہوتی تھی۔ اور جب اس نے اس نوجوان کے سر کے پچھلے حصے پہ فرائی پان مار کر اسے گرایا تو بھی اس کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا، کوئی حق نہیں جتا سکتا تھا، مگر وہ اس لڑکی کو گردن سے پکڑ کر میرج ہال کے دروازے تک چھوڑ سکتا تھا۔

اور یہ اس نے کیا۔ اپنے لباس کا وہ گھٹیا سے رنگ کا دوپٹا بھی اس پہ اچھال دیا مگر جب جانے لگا تو ایک دفعہ بہت سلگتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اگر وہ بولا تو صرف ایک لفظ، جو اس کی زبان پہ آیا تھا۔ ''بے حیا''۔

ہاں وہ اسی قابل تھی۔ پچھلے دو روز میں اگر اس کے دل میں کوئی نرم گوشہ جاگا تھا تو اب وہ ختم ہو چکا تھا۔ جیسے کوئی دل سے اتر جاتا ہے، جیسے کسی کے بارے میں انسان شک و شبہ میں پڑ جاتا ہے۔ وہ اس وقت ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔

اب وہ اس سے نہیں ملنا چاہتا تھا اور اگر وہ اسے استنبول آنے سے روک سکا تو ضرور روکے گا لیکن وہ ان کے گھر نہیں جائے گا۔ اس کا فیصلہ آسان ہو گیا تھا۔ ہر مشرقی مرد کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کی بیوی ہر کسی کی گاڑی میں بیٹھ جانے والی لڑکی نہ ہو اور آج جو اس نے دیکھا، اس سے نہ صرف وہ بدظن ہوا تھا بلکہ وہ اس لڑکی کے بارے میں شدید قسم کے شک و شبے میں پڑ گیا تھا۔

یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ اس لڑکے کو پسند کرتی ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی جرأت نے اسے بوکھلا دیا ہو اور وہ فطری ردعمل کے تحت بھاگی ہو مگر کم از کم ایک بات واضح تھی کہ پسند ناپسند ایک طرف، مگر وہ کسی کو اپنے قریب آنے نہیں دیتی تھی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے اس لڑکے کے والد کے رشتہ بھیجنے میں حیا کی رضا شامل ہو اور اسی لیے وہ جہان یا ممی کی آمد کا پوچھ رہی تھی تاکہ جلد از جلد یہ رشتہ منطقی انجام تک پہنچ جائے اور وہ اپنی مرضی سے کسی اور سے شادی کر سکے۔

"لعنت ہے مجھ پر جو میں نے سلیمان ماموں کی بیٹی اور فرقان ماموں کی بھتیجی سے یہ اچھی امید رکھی۔"

دل میں آئے بغض کو ختم کرنے کے لیے اسے بہت سا وقت چاہیے تھا۔ وہ ایسا آدمی نہیں تھا کہ چند گھنٹوں بعد ٹھنڈا ہو کر سوچنے پہ دل صاف کر لے۔ برسوں اس نے اس دنیا میں کام کیا تھا، جہاں ہر شخص کے دو سے زیادہ چہرے ہوتے تھے۔ دوسرے انسانوں پر سے اعتبار تو وہ بہت پہلے کھو چکا تھا، اب اپنی بیوی پر سے بھی کھو دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ ماموں سے ملنے نہیں گیا۔ امید دلائے بغیر رشتہ ختم کرنا زیادہ بہتر تھا۔ بس چند دن وہ اس لڑکی پہ مزید نظر رکھے گا۔ آخر اسے ممی کو اس رشتے کو توڑنے کے لیے ٹھوس وجوہات بھی تو دینی تھیں۔

ایک دفعہ پھر وہ اپنی سوچ میں "حیا" سے واپس "اس لڑکی" تک آ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ نوجوان جس کے ساتھ اس نے اس لڑکی کو بیٹھے دیکھا تھا اور بعد ازاں اسے فرائی پان بھی دے مارا تھا وہ اس کے ذہن سے نکل نہیں پا رہا تھا۔ اگلے کچھ دن وہ بہت مصروف رہا اور اسے اپنے ماموؤں کے گھر کے قریب سے بھی گزرنے کا وقت نہ ملا لیکن شک کا جو کھٹکا اس کے دل میں پڑ گیا تھا، اس کی تصدیق کے لیے اس نے حیا کے ای میل ایڈریس پہ "کلون" لگا دیا تھا (اس کا ای میل ایڈریس ممی نے روحیل سے لے کر دیا تھا اسے) اس کلون ہیکر کے باعث اب اس ای میل ایڈریس میں جیسے ہی کوئی میل آتی یا باہر جاتی تو اگلے ہی سیکنڈ وہ اسے اپنے فون پہ موصول ہو جاتی۔ وہ اس لڑکے کا نام نہیں جانتا تھا اور اتنا وقت بھی نہ تھا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا پھرے۔ اسے بس یہی معلوم کرنا تھا کہ اس کی منکوحہ کسی اور کے ساتھ وابستہ تو نہیں۔ اگر ہے تو بہت اچھا، کوئی ٹھوس چیز اس کے ہاتھ لگ جائے پھر ممی کو راضی کر لے گا۔ ابھی تک اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تھی، مگر اس کا تذبذب بہرحال ختم نہیں ہوا تھا۔

داور کی شادی کو آٹھ، نو دن گزر چکے تھے۔ اس سہ پہر جب وہ اپنے اپارٹمنٹ کا لاک کھول رہا تھا، اس کا موبائل بجا۔ دروازہ احتیاط سے تھوڑا سا کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے آنے والا پیغام کھولا۔ وہ حیا کی ایک ای میل کی کاپی تھی، جو اس نے ابھی ابھی بھیجی تھی۔ دروازہ دوبارہ اندر سے لاک کرتے ہوئے جہان نے موبائل کی اسکرین پہ چمکتا پیغام پڑھا۔

"نیشنل رسپانس سینٹر فار سائبر کرائم، اس نے اچنبھے سے اس ایڈریس کو دیکھا جس کو ای میل بھیجی گئی تھی۔ اس کو کیا ضرورت پڑ گئی سائبر کرائم سیل کو میل کرنے کی؟

میل میں ایک ویب سائٹ پہ کسی ویڈیو کا پتا لکھا تھا اور ساتھ میں ایک مختصر سی شکایت تھی، جس کے مطابق اس کے کزن کی مہندی کی تقریب جو کہ چند روز قبل منعقد ہوئی تھی، کی کوئی فیملی ویڈیو انٹرنیٹ پہ ڈال دی گئی تھی۔ وہ اس کے خلاف پرائیویسی ایکٹ کے تحت شکایت کر رہی تھی کہ اسے فوری طور پر ہٹایا جائے۔

جہان نے ویڈیو کے پتے کو چھوا مگر بہت بھاری ہونے یا نیٹ کی رفتار کم ہونے کے باعث کھل نہ سکی۔

خیر ویڈیو بعد میں دیکھ لے گا، ابھی اسے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ تو طے تھا کہ جس سائبر کرائم سیل سے اس نے رجوع کیا تھا، وہ ایک غیر فوجی ایجنسی کا سیل تھا اور وہ میل کا جواب تین چار دن بعد ہی دیا کرتے تھے اور ان کا طریقہ کار ذرا پیچیدہ تھا۔ وہ پہلے شکایتی فارم بھیجتے، جو ایف آئی آر کے مترادف ہوتا اور پھر ایک دفعہ بیان لینے کے لیے ایجنسی کے تھانے ضرور بلایا کرتے تھے۔ اب یہ خاندانی لڑکیاں کدھر تھانے کچہری کے چکر کاٹتی پھریں گی، اس لیے اسے کچھ کرنا چاہیے۔ اس سے لاکھ گلے شکوؤں کے باوجود وہ اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

ممی سے اس نے حیا کا موبائل نمبر بھی ای میل ایڈریس کے ساتھ لیا تھا۔ (ممی سے حیا کا کوئی خاص رابطہ تو نہ تھا، بس ایک دفعہ فاطمہ مامی نے حیا کے موبائل سے کال کیا تھا تو نمبر آ گیا۔) اس نے چند لمحے سوچا اور پھر اپنے لینڈ لائن سے اس کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ سرکاری فون تھا، اس کا نمبر کسی کی سی ایل آئی پہ نہیں آتا تھا۔ صرف "پرائیویٹ نمبر" لکھا آتا تھا۔

آواز بدلنا کبھی بھی اس کے لیے مسئلہ نہیں رہا تھا۔ ان کو اس چیز کی بہت اچھی تربیت دی جاتی تھی، مگر صرف آواز بدلنے میں

غلطی کا، یا پکڑے جانے کا احتمال کافی زیادہ تھا۔ اس لیے اس نے Voice changing application بھی آن کر دی۔ یہ خودکار نظام اس کے لبوں سے نکلے ہر لفظ کو سیکنڈ کے دسویں حصے بعد حیا کی سماعت تک ایک مختلف مردانہ آواز میں پہنچاتا تھا۔

جب وہ اس سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز دھیمی تھی۔ خوب صورت، مگر مدھم سا گمبھیر پن لیے۔ صوفے پہ نیم دراز ہوئے، وہ بہت اطمینان سے ایسی باتیں کر رہا تھا، جو اس لڑکی کو چونکانے کے لیے کافی تھیں۔ ویڈیو ہٹانے کا وعدہ لے کر اس نے وہی بات کہی جو سائبر کرائم والے بھی لازماً کہتے...... ہمارے آفس آ کر باقاعدہ رپورٹ کریں۔ اس بات پہ وہ باقاعدہ ٹپٹا گئی اور پھر جلدی سے فون بند کر دیا۔ جہان نے قدرے اچنبھے سے ریسیور کو دیکھا۔ وہ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں لگ رہی تھی؟ شاید مسئلہ سنگین تھا۔ اسے وہ ویڈیو دیکھ لینی چاہیے۔

قریباً دس منٹ بعد وہ اپنے لیپ ٹاپ پہ اس ویڈیو کو کھول رہا تھا۔ جیسے ہی صفحہ لوڈ ہوا اور اوپر ویڈیو کا نام جگمگایا، وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہوا۔ جیسے جیسے ویڈیو چلتی جا رہی تھی، اس کے چہرے کے تاثرات سخت ہوتے گئے۔ پیشانی کی رگیں تن گئیں اور آنکھوں میں شدید غصہ در آیا۔

یہ تھا اس کے ماموں کا عزت دار خاندان؟ فرقان ماموں اور سلیمان ماموں کی عزت و عصمت والی بیٹیاں؟ وہ مکمل طور پہ زنانہ فنکشن نہیں تھا۔ اسے پیچھے پس منظر میں ویٹرز اور ڈی جے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی تو مرد تھے۔ ان سے کوئی پردہ نہیں؟ کوئی شرم، لحاظ نہیں؟ کیسے لوگ تھے یہ؟ کیا ہو گیا تھا پاکستان کو؟

دکھ، طیش، استعجاب۔ ایک دم وہ بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ بے حد غصے سے اس نے لیپ ٹاپ بند کیا اور اٹھ کر کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ جیل میں گزرے وہ ایک ماہ دس دن اس کے اندر بہت تلخی بھر گئے تھے اور گو کہ وہ اس تلخی کو دبا گیا تھا، مگر ختم نہیں کر پایا تھا اور دبانے اور ختم کرنے میں خلیج بھر فرق ہوتا ہے۔

اسے اتنا غصہ تو اس لڑکی کو اس گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر بھی نہیں آیا تھا جتنا اس واہیات ویڈیو کو دیکھ کر آ رہا تھا۔ یہ لڑکی اس جیسے آدمی کے ساتھ تو کبھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ بہت باکردار اور اچھا تھا۔ بس وہ دونوں دو مختلف طریقوں سے پروان چڑھنے والے دو مختلف انسان تھے۔ دریا کے دو کنارے اور اب تو وہ ممی کی خوشی کے لیے بھی اس کے ساتھ باقاعدہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسے پچھتاوا ہوا کہ اس نے "میجر احمد" یعنی اپنا نام فون پہ کیوں بتایا۔ بہرحال اس غلطی کو وہ کور کر لے گا۔ وہ اسے معلوم نہیں ہونے دے گا کہ وہی میجر احمد ہے۔ یہ بعد کی بات تھی۔ ابھی مسئلہ اس کے اسکالرشپ کا تھا۔ جب یہ طے تھا کہ وہ اس کے ساتھ رشتہ نہیں رکھنا چاہتا، تو پھر وہ کیوں اگلے پانچ ماہ استنبول میں اس کے لیے ہلکان ہو؟ ممی کا خیال تھا کہ وہ آئے گی تو ان ہی کے پاس رہے گی۔ اس صورت میں تو اور بھی مسئلہ ہو گا کہ وہ استنبول میں دو شناختوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ کبھی جہانگیر میں رہنا پڑتا تو کبھی بیوک ادا میں۔ اگر وہ دو دن بھی اس کے گھر رہی تو جان جائے گی کہ اس کی سرگرمیاں مشکوک ہیں۔ ایسے میں اس کے لیے خود کو چھپا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا اور اب جب کہ اسے زندگی میں شامل نہیں کرنا تو پھر رازوں میں بھی شریک نہیں کرنا۔

وہ یہی بات بار بار سوچے جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ان کے ہاں کام کرنے کے دو طریقے بتائے جاتے تھے۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ۔ بلاواسطہ طریقہ وہ عموماً پہلے استعمال کرتا تھا، اگر وہ ناکام ہو جائے، تب بالواسطہ راستہ چنا جاتا۔

فی الحال وہ یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ لڑکی ترکی نہ آئے۔ اس کی وجہ اس نے اپنے آپ کو یہی بتائی کہ وہ یہ صرف اور صرف اپنی دوسری زندگی میں کوئی گڑبڑ ہونے سے بچاؤ کے لیے کر رہا ہے۔ وہ آئے گی اور پھر وہ اس سے ملے گی، اس سے امیدیں وابستہ کرے گی یا شاید وہ طلاق لینا چاہے، اس صورت میں ممی ہرٹ ہوں گی، اف...... ان سارے مسئلوں سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ کچھ ایسا ہو جائے جس سے وہ رک جائے اور استنبول جانے کا پروگرام منسوخ کر دے۔

حماد اس کے آفیشل کام میں آج کل اس کی مدد کروا رہا تھا۔ وہ اپنے ایکسیڈنٹ کے بعد لمبی چھٹی پہ تھا، اس لیے بہ آسانی اس کے ساتھ کام کر سکتا تھا۔ اس نے حماد سے مدد لینے کا سوچا۔

"دیکھو! میں صرف تمہاری تسلی کے لیے تمہاری مدد کرنے پہ تیار ہوں، ورنہ میرا ذاتی خیال ہے کہ تمہاری بیوی ترکی پڑھنے جا رہی ہے، تمہاری نگرانی کرنے نہیں۔ اس کو کبھی بھی تمہاری سرگرمیوں پہ شک نہیں ہو گا۔ تم ہر چیز ٹھیک سے سنبھالنا جانتے ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ تم اس کو وہاں اپنے قریب نہیں دیکھنا چاہتے، تمہیں ڈر ہے کہ کہیں تم اس سے محبت نہ کرنے لگ جاؤ اور اس صورت میں تمہیں اپنے ماموؤں کے سامنے ہارنا پڑے گا۔ تمہارا دل اس رشتے کو رکھنے پہ راضی ہے، مگر دماغ جو آج بھی اپنے ماموں سے انتقام لینے کا خواہش مند ہے، خائف ہے کہ کہیں دل کے جذبات انا پہ حاوی نہ ہو جائیں۔ پھر بھی میں جو کر سکا، کروں گا۔"

حماد نے بہت اطمینان سے کہا تھا۔ جہان خفگی سے سر جھٹک کر رہ گیا، جیسے اسے سچ سن کر برا لگا ہو۔ بہر حال، وجہ جو بھی ہو، وہ پاکستان سے روانگی سے قبل اس درد سر سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اس نے وہ ویڈیو انٹرنیٹ پہ ڈالنے والے کو بھی ٹریس کر لیا تھا۔ وہ وہی مووی میکر تھا جو مہندی کی تقریب کی ویڈیو بنانے وہاں گیا تھا اور یہ کام اس نے اپنے موبائل کے کیمرے کے ذریعے ایک ویٹر سے لیا تھا۔ اس نے اپنی ایجنسی کے سائبر کرائم سیل والوں کے حوالے اس آدمی کو کرا دیا تھا، اور اس نے جس جس کو وہ ویڈیو دی تھی، وہ بھی نکلوالی تھی۔ پھر بھی، اگر نیٹ پر سے کسی نے اسے اپنے کمپیوٹر میں محفوظ کر لیا ہو تو اس کا کوئی ریکارڈ نہ تھا۔ کہیں نہ کہیں تو وہ ویڈیو ضرور ہوگی۔ ساری دنیا سے تو وہ نہیں نکلوا سکتا تھا۔ بہر حال اس نے اس مووی میکر کے اکاؤنٹ کو اپنی دسترس میں لے لیا تھا۔ ویڈیو اس نے ہٹائی نہیں کہ ہٹانے کی صورت میں وہ لڑکی کبھی اس سے ملنے نہ آتی۔ مگر اس کا صفحہ بلاک ضرور کر دیا، یوں کہ اس کے ماموں کے گھر کے سیکٹر کے علاوہ وہ ملک میں کہیں بھی نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اپنی ویڈیو ہٹوانے کے لیے وہ اس کے پاس ضرور آئے گی۔

اگلے روز اس کو حماد کے ساتھ چار پانچ گھنٹے سڑک پہ میڈم سیکنڈ سیکریٹری کی کار کے انتظار میں گزارنے تھے۔ وہ ایک ایسی مرکزی شاہراہ تھی جہاں ہر پل رش ہوتا تھا۔ اس کو موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ بھی یہاں سے گزرے۔ وہ عموماً ہر وقت باہر ہی نکلی ہوتی تھی۔ وہ گھر میں بیٹھنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی۔

اس سڑک پر تو نہیں مگر قریب میں ایک ذیلی سڑک پر وہ ایک ٹریفک جام میں ضرور پھنسی ہوئی تھی۔ جہان اور حماد کا کام آج بھی نہیں ہو سکا تھا سو اس نے سوچا، وہ یہ دوسرا کام نپٹا ہی دے۔ پاکستان میں اس نے عورتوں کو اگر کسی شے سے بہت ڈرتے دیکھا تھا تو وہ خواجہ سرا کی بددعا تھی، بالخصوص سفر سے پہلے اگر خواجہ سرا بددعا دے دے تو اس بدشگونی کے بعد لوگ سفر ترک کر دیا کرتے تھے۔ وہ اس وقت بددعا کے اس اصل کو بھول جایا کرتے تھے کہ بددعا چاہے نیک آدمی دے، یا فاسق، چاہے مندر دے یا صحت مند، وہ تب تک آپ کو نہیں لگ سکتی، جب تک آپ اس کے اہل نہ ہوں اور اگر آپ اس کے اہل نہ ہوں تو وہ دینے والے پہ پلٹ آتی ہے مگر اسے امید تھی کہ اس کی بیوی بھی ان ہی ضعیف العقیدہ لوگوں میں سے ہوگی جو خواجہ سرا کی بددعا سے ڈرتے تھے۔

وہ صرف پانچ منٹ اس کام کے لیے نکال سکتا تھا، اسے واپس جا کر رپورٹ کرنی تھی۔ مگر جب ان دونوں نے اسے متوجہ کیا تو وہ ایک دم اتنے غصے میں آ گئی کہ ان کی کوئی بات سنی ہی نہیں۔ حماد تو جانے کون سی باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ مگر وہ کچھ سننے پہ تیار نہ تھی۔ اس نے جیسے بھلا دیا تھا کہ ڈولی نے اس پہ کبھی کوئی احسان کیا تھا۔ وہ کوئی بات سننے پہ تیار ہی نہ تھی، بلکہ مسلسل ان کو ہٹنے اور جانے کا کہہ رہی تھی۔ یہاں تک ہوتا تو ٹھیک تھا، مگر وہی اس لڑکی کی ایک دم سے ری ایکٹ کر دینے کی عادت۔

اس نے حماد کی انگلیاں شیشے میں دے دیں۔

وہ ذرا سا زخم اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا، اگر حماد کا وہ ہاتھ فریکچر کے بعد اب تندرستی کی طرف نہ بڑھ رہا ہوتا۔ ایسے میں اس کی وجہ سے وہ ہاتھ زخمی ہوا، اسے شدید غصہ آیا۔ دوسری طرف اس کا دوسرا کام بھی نہیں ہو سکا تھا، ان دونوں باتوں پہ وہ شدید غصے کا شکار ہو رہا تھا۔

وہ اسے نہیں روک سکا۔ اسے اپنی یہ بے بسی غصہ دلا رہی تھی۔ اس رات وہ بہت دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ منظر جب وہ اس لڑکے کی کار میں بیٹھ رہی تھی اور وہ ویڈیو۔ وہ کبھی بھی فراموش نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے اس لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا تھا، پھر بھی ایک دفعہ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اسے کسی طرح اسکالرشپ لینے سے باز رکھ سکتا تھا تو یقیناً وہ اسے ترکی میں نہیں دیکھے گا۔ اس لیے یہ ملاقات اہم اور ضروری تھی۔

وہیں بستر پہ لیٹے لیٹے اس نے اپنے لینڈ لائن سے اس کا نمبر ملایا۔ کافی گھنٹیوں بعد اس نے فون اٹھایا اور چھوٹتے ہی ملنے کے لیے رضامندی ظاہر کر دی۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ نیند سے بیدار ہوئی ہو اور اس کے انداز سے یہ بھی ظاہر تھا کہ وہ گھر والوں کو بتائے بغیر ملنے آئے گی۔ پتا نہیں اس نے ان سفید پھولوں کے بارے میں اپنے گھر میں کیا بتایا ہوگا۔ شاید اس نے کوئی بہانہ کر دیا ہو۔ شاید پھول چھپا دیے ہوں۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ کل اپنے ابا کو ساتھ لے آئے۔ ویسے اسے امید نہیں تھی کہ وہ گھر والوں کو درمیان میں لائے گی۔ جو بھی تھا، وہ لڑکی کافی باہمت اور اپنے مسائل خود حل کرنے والی لڑکی لگتی تھی۔

اس سے ملنے کے لیے ایک جعلی سیف ہاؤس کا انتظام زیادہ مشکل نہیں تھا۔ سب انتظام اس نے خود ذاتی طور پہ کیا تھا۔ البتہ یہ طے تھا کہ وہ اس سے اسکرین کے پیچھے سے بات کرے گا۔ جیسے بعض اوقات کچھ لوگوں کو تفتیش یا پوچھ گچھ کے لیے بلا کر بات کی جاتی تھی۔ اس نے اپنا درست نام میجر احمد بتا کر البتہ غلطی کی تھی۔ ہوسکتا ہے فرقان ماموں کی وہ بات کہ سکندر کا بیٹا لاہور میں پوسٹڈ ہے، اس نے سن رکھی ہو اور وہ اس بارے میں شبہات کا شکار ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے دادا کا نام بھی معلوم ہو اور اب اگر ایک میجر احمد اس کے سامنے خود کو چھپاتا ہے تو وہ دو جمع دو کر کے یہ جان سکتی تھی کہ وہ کون ہے۔

وہ اتنی ذہین تھی یا نہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ خود ایک کاملیت پسند تھا۔ اس کی کور اسٹوری میں کوئی خامی، کوئی جھول نہیں ہونا چاہیے، یہ اس نے اپنی جاب کے دوران سیکھا تھا۔ اس کے پاس حیا کو دینے کے لیے کوئی ٹھوس وجہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ کیوں اس سے اسکرین کے پیچھے بات کر رہا ہے اور وجہ بہت سادہ سی تھی۔

وہ اسے یہ تاثر دے گا کہ اس کا چہرہ جھلسا ہوا ہے۔ اسکرین چونکہ فروسٹڈ گلاس کی تھی تو اس کے پیچھے اگر وہ احمد کا آدھا جھلسا چہرہ دیکھتی تو جھلسا ہوا حصہ نمایاں نہ ہوتا، دھندلے شیشے کے باعث اسے کافی گہرے رنگ کا برن بنانا تھا۔ وہ یہی قیاس کرے گی کہ وہ اپنے احساس کمتری کا شکار ہے اور اسی لیے ایک خوب صورت لڑکی کے سامنے آنے سے خائف ہے۔ ایک کامل اور ٹھوس وجہ۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ اگر وہ اس کی بات نہیں سمجھتی اور اسکالرشپ سے پیچھے نہیں ہٹتی تو وہ ایک آخری کوشش کے طور پہ حماد کو اس سے بات کرنے کو کہے گا اور حماد کے نزدیک اس مسئلے کا سب سے بہترین حل یہی تھا کہ وہ خود کو میجر احمد ظاہر کر کے اس سے مل لے اور کسی بھی طرح اسے سمجھا دے کہ اس کے شوہر کے لیے یہ درست نہیں ہوگا کہ وہ وہاں جائے اور یہ کہ اس کا شوہر کہیں اس کی وجہ سے مصیبت میں نہ پڑ جائے۔ ابھی اس گفتگو کا پورا متن طے ہونا باقی تھا، مگر یہ طے تھا کہ وہ یہ کوشش ضرور کرے گا۔ اس کا کوئی رشتے دار ان کے قریب استنبول میں رہے۔ یہ اس کے لیے کوئی خوش آئند بات نہیں تھی۔

"مجھے لگتا ہے تم اپنی مسز کے آنے سے خائف اس لیے ہو کہ تم کہیں ان کی محبت میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ کہیں تم ان سے متاثر نہ ہونے لگو اور کہیں تمہارے پاس ان کو اپنی زندگی سے نکالنے کی وجہ ختم نہ ہو جائے۔" حماد اس کا مکمل ساتھ دے رہا تھا، مگر ساتھ میں وہ مسکرا کر ایسا تبصرہ بھی کر دیا کرتا تھا۔ وہ سر جھٹک کر نظر انداز کر دیتا۔

جب وہ میجر احمد کے اس خود ساختہ آفس آئی تو چیکنگ کے بہانے اس کا موبائل اس سے لے لیا گیا اور اس میں ایک بہت وسیع رینج کا حامل جی پی ایس ٹریسنگ ڈیوائس ڈال کر واپس کر دیا گیا۔ اگر وہ ترکی چلی جائے، تب یہ ڈیوائس اس کے بہت کام آئے گا۔

جب وہ اندر آئی اور جہان اس سے مخاطب ہوا تو سب سے پہلے اس نے اسے یقین دلایا کہ اس ویڈیو کو وہ شہر کے ایک ایک بندے سے نکلوا چکا ہے۔ یہ سچ تھا۔ کم از کم شادی کے فنکشن کی مووی بنانے والے جس مووی میکر کی یہ حرکت تھی، اس نے پوچھ گچھ پہ ہر اس شخص تک ان کو رسائی دے دی تھی، جس کو اس نے یہ ویڈیو دی تھی، پھر بھی وہ جانتا تھا کہ اگر ان لوگوں نے ویڈیو مزید آگے کی ہو، یا لوگوں نے انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کر لی ہو، یا کسی بھی دوسری صورت میں کہیں نہ کہیں وہ ویڈیو ضرور کسی کے کمپیوٹر میں پڑی ہوگی۔

لیکن بعض باتیں انسان غیر ارادی طور پہ کہہ دیتا ہے۔ جیسے جب اس نے بتایا کہ اس نے صرف صبر نہ کر سکنے کے باعث ملاقات کا بہانہ بنایا تھا تو لمحے بھر کو وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ ان پچھلے چند دنوں میں دیکھے جانے والے ناقابل برداشت مناظر کے باوجود وہ اس لڑکی سے بغیر کسی وجہ کے ملنا چاہتا تھا؟ یا پھر جو وجوہات اس کے پاس تھیں، وہ محض اس کے قریب رہنے کا جواز تھا؟ شاید حماد ٹھیک کہتا ہے۔ پھر بھی وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں دو بہت مختلف سے لوگ کبھی بھی ایک نہیں ہو سکیں گے۔

اس ملاقات میں اس نے اس لڑکی سے چند ایک سوال پوچھے، جن پہ حسب عادت وہ تپ اٹھی۔ یہاں تک کہ جب وہ اسے نصیحت کرنا چاہ رہا تھا، اس نے ٹھیک سے جواب بھی نہیں دیا، نہ ہی اس کی بات میں دلچسپی لی۔ تب اس نے وہ سوال کیا، جس سے وہ شادی کے بارے میں اس کی ترجیحات جان سکے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ فوراً انکار کر دے گی، مگر کس وجہ کی بنا پہ؟ اور جب اس نے وجہ بتائی تو لمحے بھر کو وہ خود بھی چونک کر رہ گیا۔ وہ جتنے یقین اور استحقاق سے "میرا شوہر، میرا شوہر" کہہ رہی تھی۔ وہ پھر سے اپنے بارے میں بے یقین ہونے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے فرقان ماموں کے وہ الفاظ دہرائے جو انہوں نے ممی، ابا اور اس کی پاکستان واپسی کے بارے میں کہے تھے۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس کے ابا کے بارے میں کتنا جانتی ہے؟ مگر وہ حسب عادت بھڑک کر اٹھ گئی۔

تب اس نے اپنے قریب رکھے سرخ گلابوں کے بکے میں (کہ آج اسے واقعتاً سفید گلاب نہیں ملے تھے، نہ اس نے تگ ودو کی تھی۔) ایک ننھا سا کارڈ لکھ کر ڈالا۔

"آنے کا شکریہ۔ اے آر پی۔"

کارڈ اس نے پھولوں کے اندر رکھ دیا۔ اس کے ساتھی نے بعد میں باہر جا کر حیا کو پھول دینے چاہے، مگر اس نے تو ان کو دیکھا تک نہیں اور چلی گئی۔ وہ جیسے بہت غصے میں تھی۔

ان تمام دنوں میں یہ وہ پہلا دن تھا، جب جہان نے اس پہ بہت وقت صرف کیا تھا۔ گو کہ وہ بنیادی طور پہ اتنا چوکس آدمی تھا کہ اسے وقت نکالنا آتا تھا، مگر ابھی تک جو وہ خود سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہ صرف اسے اسکالرشپ لینے سے روکنے کے لیے کر رہا ہے۔ خود بھی نہیں سمجھ پایا کہ اگر وہ اس کے سامنے آ بیٹھی تھی تو اس نے ہر بات کہہ دی، سوائے اسکالرشپ نہ لینے کے۔ وہ اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ ان کی گفتگو جس تلخ موڑ پہ آ رکی تھی، اس کے بعد اس کو کسی کام سے منع کرنے کا مطلب تھا کہ وہ جان بوجھ کر وہی کام کرے گی۔

مگر وہ ایک دفعہ پھر سے کوشش کرنا چاہتا تھا۔ اگلے دو دن وہ اپنے کام پیک اپ کرتا رہا۔ اس کا کام ٹھیک سے نہیں ہو پایا تھا کیونکہ میڈم سیکنڈ سیکریٹری واپس جا رہی تھیں کسی میٹنگ کے سلسلے میں۔ اس کے پیشے میں اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔ بہت دن بہت صبر و تحمل سے کسی معلومات کے ملنے کے انتظار کے بعد ایک دم سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔

تیسرے روز وہ رات میں پھر جناح سپر مارکیٹ کے ایک ویران سے چبوترے پہ اسے ملا تھا۔ دنیا کے ہر حساس ادارے میں سب سے زیادہ قدیم اور کسی حد تک گھسا پٹا طریقہ جو کسی بھی شخص کا احسان و اعتماد جیتنے کا بتایا جاتا تھا۔ وہ یہی تھا کہ پہلے آپ اپنے مطلوبہ شخص کو کسی مصیبت میں گرفتار کروائیں، پھر عین وقت پہ پہنچ کر خود کو ہیرو ثابت کر دیں۔ اگر اگلا شخص عقل مند ہوا تو آپ کی حرکت جان جائے گا اور کبھی بھی آپ کا احسان مند نہیں ہوگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنی عقل مند ہے۔ البتہ وہ یہ نہیں جان پائی کہ لڑکے اسے کس کے کہنے پہ ستا رہے تھے۔ اسے اس روز وہ ذرا غائب دماغ لگی تھی۔ جیسے کسی بات پہ الجھی ہوئی ہو۔ وہ اپنے شوہر کو ڈھونڈنا چاہ رہی تھی۔ آج پھر اس کی گفتگو میں شوہر کا تذکرہ تھا۔ وہ اب بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کا انتظار کیوں کر رہی ہے؟ تاکہ رشتہ ختم کر سکے؟ یا پھر رشتہ نبھا سکے؟

جو بھی تھا، وہ میجر احمد کا امپریشن اس پہ بہت اچھا ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے شک بھی پڑے کہ وہی ڈولی دراصل میجر احمد ہے۔ چبوترے پہ جانے سے قبل اس نے چند ایک رسمی فقرے ریکارڈ کر کے اس ریکارڈنگ کا ٹائم لگا دیا تھا۔ عین وقت ہونے پہ حیا کا فون بج اٹھا۔ وہ یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میجر احمد کی احسان مند ہے بھی یا نہیں، مگر اس نے عادت کے مطابق پوری بات سنے بغیر ہی جھڑک کر فون رکھ دیا۔ وہ میجر احمد کو پسند نہیں کرتی، وہ جان گیا تھا۔

پھر اسے وہ گاڑی والا لڑکا یاد آتا تو لگتا کہ وہ واقعی جہان سے رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ شاید میجر احمد کے سامنے وہ اپنے شوہر کا ذکر صرف دھمکی کے طور پہ کر رہی تھی تاکہ وہ اسے تنگ نہ کر سکے۔

جب وہ جانے لگی تو اس نے وہی کہا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ شاید اس کی بددعا سن کر وہ رک جائے۔ پھر وہ چبوترے کی دیوار کے عقب میں جا کھڑا ہوا تھا۔ تب بھی اسے امید تھی کہ وہ مڑ کر ضرور آئے گی۔ یہ دیکھنے کہ وہ کون ہے اور کیوں ہے؟ مگر وہ ذرا سی رکی، مڑ کر دیکھا اور پھر واپس آگے بڑھ گئی۔ اس کا ذہن واضح طور پہ کہیں اور الجھا تھا۔

جہان کا کام نہیں ہو سکا تھا۔ اب مزید یہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ اس کو اب واپس جانا تھا۔ پندرہ جنوری کو اس کی فلائٹ تھی۔ اس کے پاس اب صرف ایک دن تھا۔ صرف اور صرف اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے وہ ایک آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔

"میں صرف تمہاری تسلی کے لیے ان سے بات کر لوں گا، ورنہ مجھے یقین ہے کہ تم اب خود نہیں چاہتے کہ وہ رک جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو تم اس کے لیے کوئی مؤثر طریقہ اپناتے۔ ان کے پیپر ورک میں مسئلہ کرواتے۔ ان کے والدین کو کسی طرح اپروچ کر کے انہیں باز رکھنے کا کہتے۔ مگر تم جو بھی کر رہے ہو، وہ اس لیے نہیں ہے کہ ان کو روک سکو، بلکہ اس لیے ہے تاکہ تم ہر دوسرے دن ان سے ملنے یا ان کو دیکھنے کا موقع پیدا کر لو۔ تمہارا دل کہتا ہے کہ تم یہ رشتہ نبھاؤ اور یہ کہ وہ ضرور ترکی آئیں تاکہ تم ان کو بہتر طور پہ جان سکو مگر تمہارے دماغ میں تمہارے ماموؤں کے خلاف جو عناد بھرا ہے۔ وہ تمہیں یہ رشتہ توڑنے پر اکساتا ہے۔ تم خود بھی کنفیوژڈ ہو جہان! کہ تمہیں کیا کرنا ہے مگر کبھی کبھی انسان کو خود سے سچ بول لینا چاہیے۔ اس سے بہت سی کنفیوژن ختم ہو جاتی ہے۔"

مگر وہ حماد کی ایسی ساری باتیں نظر انداز کر رہا تھا۔ اب بھی وہ اسی بات پہ قائم تھا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے قریب ترکی میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ چونکہ اب اس کو روانگی کا حکم مل چکا تھا اور کل دوپہر میں اس کی فلائٹ تھی۔ سو وہ ایک آخری کوشش آج کے دن کرنا چاہتا تھا۔

حماد کو آج اپنی امی اور بہن عینی کے ساتھ شاپنگ پر جانا تھا۔ وہ لوگ اس کی شادی کی شاپنگ کر رہے تھے۔ دوسری طرف جہان اپنے اپارٹمنٹ میں پیکنگ کر رہا تھا۔ ساتھ میں وہ اپنے ٹریسر کا اسٹیٹس ضرور چیک کرتا تھا۔ صبح وہ ڈپلومیٹک انکلیو میں تھی، پھر پنڈی چلی گئی شاید۔

اس نے وہاں سے کچھ اٹھانا ہو، کیونکہ پھر وہ واپس ڈپلومیٹک انکلیو چلی گئی تھی۔ ابھی دوپہر پوری طرح سے نہیں چھائی تھی، جب جہان نے اسے ایف سیون کی طرف جاتے دیکھا۔ کل رات بھی وہ جناح سپر میں تھی، سو آج بھی شاید وہیں جا رہی ہو۔ اس لڑکی کو شاپنگ کا بہت شوق تھا۔ بہرحال اس نے حماد سے بات کی۔ وہ لوگ ایف ٹین جا رہے تھے، مگر چونکہ وہ حیا سے بات کرنے کے لیے راضی تھا، اس لیے وہ جناح سپر چلا آیا۔

حماد اس سب کو ایک اتفاقیہ ملاقات کی طرح پلان کرنا چاہ رہا تھا چونکہ یہ طے تھا کہ وہ اسے اپنے میجر احمد ہونے کا تاثر دے گا۔ اس لیے یہ غلط لگتا کہ جو شخص اپنی بدصورتی کے باعث پہلے اس کے سامنے نہیں آ رہا تھا۔ اب بالمشافہ ملاقات پہ راضی ہو گیا تھا۔ اپنی جاب میں وہ اکثر ایسے اتفاقیہ مواقع پیدا کرتے رہتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ لوگ احمق تھے، جو موقع ملنے کا انتظار کیا کرتے تھے۔ مواقع ڈھونڈے نہیں، پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب ایک بہت معصوم سے اتفاق میں وہ ایک ہی دکان میں اس سے ٹکرا جاتا۔ وہ یقیناً اس کا آدھا جھلسا چہرہ دیکھ کر چونکتی، اسی پل عینی اسے احمد بھائی کہہ کر پکارتی۔ عینی کو وہ پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ آج وہ اسے مارکیٹ میں احمد بھائی کہہ کر پکارے گی۔ کیونکہ وہ کسی کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ اس کا نام حماد نہیں احمد ہے۔ عینی اپنے بھائی کی ان مشکوک حرکتوں کی عادی تھی۔ وہ شانے اچکا کر راضی ہو گئی۔ جو بھی تھا۔ اپنے بھائی کی مدد کر کے اسے ہمیشہ خوشی ہوتی تھی۔

”میں فیملی کے ساتھ مارکیٹ میں ہوں، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس شاپ میں جائیں گی؟“ حماد نے وہیں سے اسے فون کیا تھا۔ وہ اس وقت اپنا بیگ چیک کر رہا تھا۔

”وہ جو سعید بک بینک والا پلازہ ہے، اس میں جہاں ایک خالی چبوترہ سا بنا ہے۔“

”ہاں، مگر پھر کوئی بک فیئر لگا ہوا ہے۔ وہ خالی نہیں ہے۔“

”اس کے آس پاس کوئی کپڑوں یا جوتوں کی ایسی شاپ ہے، جس پہ سیل لگی ہو؟“ وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔ اس نے اتنے دنوں میں ایک چیز کا اندازہ کر لیا تھا کہ وہ لڑکی کپڑوں، جوتوں کی بہت شوقین تھی۔

”ہاں..... آگے ایک جگہ سیل لگی ہوئی ہے۔“

”تم وہاں جاؤ، وہ ادھر ضرور آئے گی۔“ وہ بہت وثوق سے بولا تھا۔

وہ کپڑے تہہ کرتے ہوئے پھر اسی نہج پہ سوچنے لگا۔ کیا وہ واقعی چاہتا تھا کہ وہ نہ جائے، یا پھر بس اس کی ہر پل خبر رکھنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا؟ ”جہان! تم کنفیوژڈ ہو۔“ اس نے خود کو سرزنش کی۔

پورا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا جب حماد کا دوبارہ فون آیا۔ وہ لیپ ٹاپ سامنے رکھے کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ حماد کا نمبر فون پہ دیکھ کر ایک دم اس کا دل بہت اداس ہوا۔ یقیناً حماد نے اس سے بات کر لی ہوگی اور اب وہ ترکی نہیں آ رہی ہوگی۔ اس نے کال موصول کی۔

”اچھی بے عزتی کروائی آج تم نے میری۔“ حماد ایک دم شروع ہوا۔ جہان سیدھا ہو بیٹھا وہ سخت غصے میں اس کو ملامت کیے جا رہا تھا۔

”میرے بھائی! ہوا کیا ہے؟“

”بھابھی نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے پوری شاپ میں سب کے سامنے اعلانیہ بتایا کہ میں چنگی بنا سڑک پہ گداگری کر رہا تھا۔ لعنت ہے مجھ پہ اور لعنت ہے اس دن پہ جب میں نے تمہاری مدد کرنے کا سوچا۔“

”اس نے..... اس نے کیسے پہچانا؟“ جب اس کے منہ پہ سلش گرا تھا۔ تب بھی اسے جھٹکا لگا تھا اور اب بھی ایسا ہی جھٹکا لگا تھا۔

”میرے ہاتھ پہ جو نشان ہے اور انگلیوں پہ جو انہوں نے اس دن زخم دیے تھے۔ ان ہی سے انہوں نے پہچان لیا اور میری فیملی کے سامنے اچھی خاصی میری بے عزتی کر دی۔“

”تو تم نے اس سے بات نہیں کی؟“

”میں اس سارے ہنگامے کے بعد کیا بات کرتا؟ میں تو جلدی سے وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ شاپ کیپر آ گیا۔ اس دن

ثانیہ اور میں نے یہیں سے شاپنگ کی تھی۔ وہ ہمیں جانتا تھا۔ بس شکر تھا کہ اس نے میرا نام نہیں لیا۔ مگر.....'' غصے سے بولتے بولتے وہ ایک دم رکا۔
''تم جو چاہ رہے تھے کہ میجر احمد کا امپریشن اچھا پڑے، وہ اب نہیں ہو سکے گا، کیونکہ میں نے عینی سے کہا تھا کہ وہ مجھے احمد کہہ کر پکارے گی اور اس نے تمہاری مسز سے لڑتے ہوئے بھی میری ہدایت یاد رکھی۔''

''اس سے بہتر تھا، میں تمہیں کام نہ ہی کہتا۔''

''جہان! ایک منٹ، مجھ سے بول لو، خیر ہے، مگر خود سے جھوٹ مت بولو۔ سچے دل سے تسلیم کر لو کہ تم کبھی ان کو روکنا نہیں چاہتے تھے۔ تم اب بھی چاہتے ہو کہ وہ تمہارے استنبول ضرور آئیں۔ اس لیے اس بارے میں پریشان مت ہو اور جانے کی تیاری کرو۔ ویسے اچھی خاصی خوش اخلاق بیگم ہیں آپ کی۔''

اس کی آخری بات پہ وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔

حماد ٹھیک کہتا تھا۔ اسے اپنے اندر کی کنفیوژن ختم کر دینی چاہیے۔ وہ اس کے ترکی آنے سے پریشان تھا مگر ناخوش نہیں۔ اس نے بالآخر خود سے سچ بول ہی لیا۔ وہ کسی لڑکی کے اپنے اعصاب پہ حاوی ہو جانے سے ڈرتا تھا۔ لڑکی بھی وہ جو سلیمان ماموں کی بیٹی تھی۔ مگر اسے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ جب اسے ماموں سے انتقام لینا ہی نہیں ہے تو پھر ان کے خلاف دل میں عناد کیوں رکھے؟ اور شاید وہ خود بھی یہ رشتہ نہ چاہتی ہو۔ جہان کو اس کا اس لڑکے کی گاڑی میں بیٹھنا یاد تھا۔ ''چلو ٹھیک ہے، وہ آ جائے گی تو کبھی نہ کبھی وہ اس سے یہ بات کلیئر کر لے گا۔''

اب وہ مطمئن تھا۔

☆ ☆ ☆

آفس میں نیم اندھیرا پھیلا تھا۔ کھڑکیوں کے باہر شام اتر آئی تھی۔ وہ ابھی تک اسی پوزیشن میں بیٹھی یک ٹک لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں پہ لڑھک لڑھک کر اب سوکھ چکے تھے۔ کہیں پس منظر میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی مگر وہ اس جانب متوجہ نہیں تھی۔ وہ صرف اس ایک شخص کو دیکھ رہی تھی، جو اس سے ہم کلام تھا۔ بہت مختصر الفاظ میں اپنی کہانی سناتے ہوئے بھی درمیان میں اٹھ کر وہ کافی بنا لایا تھا۔ فارغ تو وہ بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے جانتی تھی۔ مگر آج جب اس نے ویڈیو کے کھلتے ہی جہان کو بیوک ادا کے سفید محل میں موجود عبدالرحمٰن پاشا کے کمرے کی کمپیوٹر چیئر پہ بیٹھتے دیکھا تھا تو اسے لگا تھا وہ اس شخص کو نہیں جانتی، نہیں پہچانتی۔ وہ اس ویڈیو میں اور اے آر پی کے کمرے میں کیا کر رہا تھا؟ مگر پھر جیسے جیسے وہ سنتی گئی، اس کے اعصاب سن پڑ گئے۔

پہلے اسے شاک لگا، پھر غصہ چڑھا، مگر ایسا غصہ جو شطرنج میں اپنے ذہین مقابل کی چال پہ مات کھا جانے سے چڑھتا ہے اور پھر اس کی جگہ دکھ نے لے لی۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ جب تک انسان دوسرے کی جگہ پہ کھڑا نہ ہو، اسے پوری بات سمجھ میں نہیں آتی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی ابھی تک بج رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ویڈیو کو وہیں روکا۔ ابھی وہ آدھی بھی نہیں ہوئی تھی اور ابھی تک جہان نے اس آدمی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ جس کے چہرے پہ حیا نے کافی الٹی تھی۔ اگر اس کا وہ غریب سا ریسٹورنٹ اونر جہان، ہی عبدالرحمٰن پاشا تھا۔ عائشے اور بہارے کا عبدالرحمٰن پاشا۔ تو پھر بے چارا وہ کون تھا، جس پہ اس نے کافی الٹی تھی؟ اور وہ جس کو اس نے جہان کے ساتھ پینٹری میں دیکھا تھا۔

مگر ایک منٹ...... اس نے دونوں کنپٹیوں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے سوچنا چاہا...... اس کو کس نے کہا تھا کہ وہ عبدالرحمٰن ہے؟ کسی نے نہیں۔ اس نے آنے کے ساتھ اس کی تصاویر دیکھ کر از خود یہ فرض کر لیا تھا کہ وہی عبدالرحمٰن ہوگا۔ تب وہ نہیں جانتی تھی کہ آنے کا ایک دوسرا بیٹا بھی ہے۔ ان کا اصلی بیٹا، گمشدہ بیٹا، جو عرصہ پہلے ادالار چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ہاں، وہی تو تھا ان کا گمشدہ بیٹا۔ تب ہی تو اس کی تصاویر گھر میں ہر جگہ لگی ہوئی تھیں۔ پاشا بے (مسٹر پاشا) اسی نام سے جہان اسے ریسٹورنٹ میں پکار رہا تھا، جب اس نے ان کی باتیں سنی تھیں۔ عبدالرحمٰن پاشا اور پاشا بے دو الگ الگ لوگ تھے۔

فون مسلسل بجے جا رہا تھا۔ اس نے اکتا کر میز پہ رکھے فون کو دیکھا۔ ابا کی سیکریٹری کو کہا بھی تھا کہ اسے مت ڈسٹرب کرے، مگر کوئی سنے تو۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔

''جی؟''

''میم...... ولید صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اصرار کر رہے ہیں۔ میں......''

''انہیں بھیج دیں!'' اس نے ناگواری کی اٹھتی لہر کو دبا کر کہا اور فون رکھا۔ صرف اس فضول آدمی کی وجہ سے اس کا کردار جہان کی نظروں

میں مشکوک ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف یہی نہیں، وہ کمپنی کے ساتھ بھی وفادار نہیں تھا۔ آج تو وہ اچھی طرح نبٹے گی اس سے۔

اس نے آفس کا لاک کھولا اور نقاب کی پٹی سر کے پیچھے باندھ لی۔ پھر لیپ ٹاپ بند کر کے فلیش ڈرائیو ڈبی میں واپس ڈال دی۔ باقی ویڈیو وہ گھر جا کر دیکھے گی۔ ویسے بھی شام ہونے کو آئی تھی۔ وقت کا کچھ پتا ہی نہیں چلا تھا۔ ابھی تک اس کے اعصاب شل تھے۔

دروازہ کھلا اور ولید لمبے لمبے ڈگ اٹھاتا اندر داخل ہوا۔ اس کے لبوں پہ ہمیشہ کی طرح استہزائیہ مسکراہٹ بکھری تھی۔

وہ کرسی پہ ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں پہ کہنیاں جمائے اسے آتے دیکھتی رہی۔

''کیسی ہیں آپ میڈم ایم ڈی؟'' اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے وہ بولا۔

''آپ بتائیں، کیا کام تھا؟'' وہ خشک لہجے میں بولی۔ وہ رات پھر سے تازہ ہو گئی تھی۔ کیا سوچتا ہوگا جہان اس کے بارے میں؟ اف!

''کل بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں ہم آپ کے خلاف قرارداد لا رہے ہیں۔'' وہ پتہ دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے اس کی میز سے پیپر ویٹ اٹھا کر انگلیوں میں گھمانے لگا۔

''کیسی قرارداد؟'' اس نے حتی الامکان لہجے کو نارمل رکھنے کی سعی کی۔

''آپ جانتی ہیں کہ تمام ڈائریکٹرز اگر مل کر ایم ڈی کے خلاف قرارداد لائیں...... عدم اعتماد کی قرارداد تو ایم۔ڈی کو ہٹایا جا سکتا ہے۔''

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ شاید ولید نے تازہ تازہ کمپنی لاء پڑھا تھا۔ ورنہ اسے یہ خیال پہلے دن آ جانا چاہیے تھا۔ ''کل آپ اس آفس سے باہر ہوں گی۔ چچ چچ...... مجھے افسوس ہو رہا ہے مگر ہم نے بہت برداشت کر لیا آپ کو۔ آپ جیسی عورتوں کی جگہ گھر میں ہوتی ہے یا مدرسے میں، ادھر نہیں۔

وہ اب بھی لب بھینچے اسے دیکھتی رہی۔

''آپ یوں کریں، اپنی ضروری اشیا سمیٹ لیں۔ آخر کل آپ کو یہ جگہ چھوڑنی جو پڑے گی۔ میں یہی بتانے آیا تھا ادھر۔'' وہ فاتحانہ انداز میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھیں!'' اس نے انگلی سے ایک دم اتنے تحکم سے اشارہ کیا کہ وہ بے اختیار اگلے ہی پل واپس بیٹھا۔

''اب میری بات سنیں۔'' حیا دونوں ہتھیلیاں میز پہ رکھے، کرسی پہ ذرا آگے ہوئی۔

''میں نے منگل والے روز ہیڈ آرکیٹیکٹ اور آپ کی گفتگو ریکارڈ کی تھی، سننا چاہیں گے؟''

ولید کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم ہو گئے۔ اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

''کون سی گفتگو؟''

''انجان بننا آپ کو فائدہ نہیں دے گا۔ میں جانتی ہوں کہ اس ٹریڈ سینٹر کے پروجیکٹ پلان میں آپ کے کہنے پہ آرکیٹیکٹ نے گڑبڑ کی تھی۔ صرف یہی نہیں، بلکہ جس کمپنی کو وہ پروجیکٹ مل گیا تھا۔ ان کے مالکان سے آپ کے گہرے روابط ہیں۔ یہ ساری آپ کی اپنی کہی باتیں ہیں۔ میرے پاس ثبوت ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔ ولید کے لب بھینچ گئے اور ابرو تن گئے۔

''آڈیو کسی چیز کا ثبوت بھی نہیں ہو سکتی مادام!''

''مجھے کورٹ میں کسی کو کچھ نہیں دکھانا۔ مجھے صرف اپنے ابا کو یہ سب بتانا ہے۔ ویسے بھی وہ اب ٹھیک ہو رہے ہیں۔ اسی ہفتے دوبارہ جوائن کر لیں گے۔ آج جب گھر جا کر میں ان کو آپ کی اصلیت بتاؤں گی تو وہ اپنی بیٹی کی ہر بات فوراً مان لیں گے۔ ہماری کمپنی لاء کے مطابق اگر ایسا ٹریژن ثابت ہو جائے تو نہ صرف آپ کے شیئرز فریز ہو سکتے ہیں بلکہ ابا کو آپ جانتے ہی ہیں، وہ اپنے ساتھ دغا کرنے والوں کو یوں ہی نہیں چھوڑتے ہیں۔ سڑک پہ لے آئیں گے وہ آپ کو۔''

ولید کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔'' وہ غصے سے غرایا تھا۔

''میں نے کمپنی کے ساتھ کوئی دغا نہیں کیا۔ اگر تم نے اپنے ابا کو کوئی الٹی سیدھی بات بتانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

اس نے مسکرا کر سر اٹھا کر ولید کو دیکھا۔ کسی سے تو وہ بھی ڈرتا تھا۔

''میں دیکھ لوں گا تمہیں۔'' ایک شعلہ بار نگاہ اس پہ ڈال کر وہ مڑا اور تیز تیز چلتا باہر نکل گیا۔

اس آدمی کو وہ سمجھانے کے لیے اس کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کی اس ایک حرکت نے اسے جہان کی نظروں میں مشکوک بنا دیا تھا۔ جب جہان اس سے ملے گا تو وہ سب سے پہلے یہی بات کلیئر کرے گی۔

جہان؟ وہ ایک دم چونکی۔ یہ ویڈیو تو اس نے لاکر سے ایک ماہ قبل نکالی تھی، یہ ساری باتیں تو پرانی ہو گئیں۔ وہ ابھی کہاں تھا؟

چنگی نے پزل باکس اسے تھماتے ہوئے کہا تھا کہ جب تک وہ اسے کھول پائے گی تب تک وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔ نہیں وہ یوں ہی کہہ رہا ہوگا۔ اس نے سر جھٹکا۔ وہ جہان کو ڈھونڈ لے گی۔ وہ اسے کہیں نہ کہیں ضرور مل جائے گا۔

اس نے موبائل نکالا۔ صبح سے وہ سائلنٹ پہ تھا اور اماں کی کئی مسڈ کالز اور میسج آئے پڑے تھے۔ اس نے میسج کھولا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ انہیں ابا کی گاڑی اور ڈرائیور چاہیے تھے۔ اس لیے انہوں نے آفس فون کر کے دونوں کو منگوا لیا تھا۔ ایک اور پیغام میں انہوں نے بتایا کہ وہ ظفر کو اس کی گاڑی کے ساتھ بھیج رہی ہیں، وہ اسے گھر لے آئے گا۔

بس کار بھیج کر ظفر کو واپس جانے کا کہہ دیتیں، ضروری تھا کہ تایا ابا کا ملازم بھی ادھار لینے کا احسان لیا جائے؟ اسے خوامخواہ کوفت ہوئی۔ بہر حال اس نے سر جھٹک کر فون بک میں سے عائشے کے گھر کا نمبر ڈھونڈ کر ملایا۔ کوئی جواب نہیں۔ پھر اس نے حلیمہ آنٹی کا نمبر ملایا۔ وہ یقیناً ان سے ہوٹل گرینڈ کا نمبر لے سکتی تھی، جہان وہیں ہوگا۔

''آلو؟'' وہ اداس، مگر باریک سی آواز، اسے خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔

''بہارے! میں حیا بول رہی ہوں۔''

''اوہ حیا..... تم کہاں چلی گئی تھیں؟'' وہ جیسے بہت اداس سی لگ رہی تھی۔

''میں گھر آ گئی تھی مگر تم..... مجھے پتا چلا تھا کہ تم لوگ ملک چھوڑ کر چلے گئے ہو۔''

''سب چلے گئے ہیں، میں نہیں گئی، میں اکیلی رہ گئی ہوں۔'' وہ جیسے آنسو پیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''عائشے بھی نہیں ہے، آنے بھی نہیں ہے، سب چلے گئے۔''

''عب..... عبدالرحمٰن؟ وہ کہاں ہے؟'' اس کی آواز میں لرزش در آئی تھی۔

''وہ صبح آیا تھا۔ مجھے اتنا سارا ڈانٹ کر گیا ہے، اس نے کہا وہ جا رہا ہے اور یہ بھی کہ وہ اب مجھ سے ملنے نہیں آئے گا۔''

''کدھر..... کدھر گیا ہے وہ؟'' ایک دم بہت سے آنسو اس کی پلکوں پہ آ رکے تھے۔

''مجھے نہیں پتا مگر.....'' وہ جیسے ذرا ٹھہری۔ ''اس نے کہا تھا کہ اس نے تمہیں آنے سے کچھ دن پہلے بتا دیا تھا کہ وہ کدھر جائے گا۔ تمہیں پتا ہے حیا؟''

''نہیں۔'' وہ حیران ہوئی۔ ''اس نے تو مجھے نہیں بتایا۔'' آنکھیں اس نے ہاتھ سے رگڑ کر صاف کیں۔

''مگر تم فکر مت کرو بہارے! میں اگلے ہفتے ترکی آؤں گی نا، مجھے اپنی کلیئرنس کروانی ہے، تب میں اور تم مل کر اسے ڈھونڈیں گے۔ ہم اسے ڈھونڈ لیں گے، تم میرے آنے تک وہاں ہوگی نا؟''

''مجھے نہیں پتا۔ مجھے کچھ نہیں پتا۔'' وہ جیسے سارے زمانے سے خفا ہو رہی تھی۔

اس نے فون بند کر دیا۔ کتنی ہی دیر وہ سر ڈیسک پہ رکھ کر آنکھیں بند کیے بیٹھی رہی۔ اس کا ذہن صرف ایک بات پہ مرکوز تھا۔ جہان نے اسے جانے سے قبل نہیں بتایا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، پھر اس نے بہارے کو ایسا کیوں کہا؟ یہ ویڈیو تو پرانی تھی جبکہ بہارے نے جانے سے کچھ دن قبل کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ کب بتایا جہان نے اسے؟

جب وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھی تو بھی اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

شام ڈھل چکی تھی۔ سب جا چکے تھے۔ وہ شاید اکیلی رہ گئی تھی۔ جب وہ لفٹ میں داخل ہونے لگی تو تایا فرقان بھی ساتھ ہی داخل ہوئے۔

''آپ ابھی تک یہیں ہیں؟'' وہ ان کو دیکھ کر ذرا حیران ہوئی تھی۔

''ہوں! کچھ کاغذات لینے آیا تھا۔'' وہ اسی سرد مہر لہجے میں بولے۔ تناؤ اور برف کی دیوار ابھی تک بیچ میں حائل تھی۔ اسے پھر سے اماں پہ غصہ آیا کہ کیا ضرورت تھی ظفر کو بلوانے کی۔ وہ گاڑی چھوڑ کر چلا جاتا۔ وہ خود ڈرائیو کر کے آ جاتی۔ ان کا احسان لینا ضروری تھا؟ اور جہان اس

نے کب بتایا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے؟

لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکی تو اس نے پیچھے ہٹ کر تایا کو راستہ دیا، وہ نکل گئے تو وہ سست روی سے الجھی الجھی سی چلتی باہر آئی۔

جہان نے کب بتایا؟ جھولے پہ اس رات؟ یا ہسپتال میں جب وہ دونوں ابا کے ساتھ تھے؟ یا......

"بات سنو میری!" ولید پتا نہیں کہاں سے سامنے آیا تھا۔ حیا بے اختیار ایک قدم پیچھے ہوئی۔ لابی خالی تھی۔ سوائے شیشے کے دروازے کے ساتھ کھڑے گارڈ کے، جو ان کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہے؟"

"اگر تم نے سلیمان انکل سے کچھ کہنے کی کوشش کی تو میں تمہارے ساتھ بہت برا کروں گا۔" انگلی اٹھا کر چبا چبا کر بولتا وہ اسے تنبیہ کر رہا تھا۔ حیا نے کوفت سے اسے دیکھا۔

"یہ دھمکیاں کسی اور کو دو۔ میں جا رہی ہوں گھر اور میں ابا کو سب صاف صاف بتا دوں گی۔ کر لو جو تم کو کرنا ہے!" اپنی ساری فرسٹریشن باہر نکال کر وہ اس کے ایک طرف سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ ولید کچھ کہے بنا تیز قدموں سے چلتا اس کے دائیں طرف سے گزر کر باہر نکل گیا۔

وہ گارڈ کو معمول کی ہدایات دینے کے بعد باہر کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ باہر آسمان نیلاہٹ بھری سیاہی سے بھرتا جا رہا تھا۔ وہ اب بھی جہان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس نے کب بتایا تھا اسے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

وہ سیڑھیاں اتر کر اب ایک طرف بنے پارکنگ ایریا کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی گاڑی دوسری جانب کھڑی تھی۔ اس تک پہنچنے کے لیے اسے چند قدم اس لمبی، چوڑی سی روش پہ چل کر جانا تھا۔ وہ بہت غائب دماغی سے قدم اٹھا رہی تھی۔

اگر جہان کہہ رہا تھا کہ اس نے حیا کو بتایا تھا تو اس نے بتایا ہوگا۔ وہ سیدھی طرح کوئی بھی بات نہیں کہتا تھا۔ اس کی ہر بات پہیلی ہوتی تھی۔ آخر کب بتایا اس نے؟ روش پہ چلتے ہوئے اس نے ذہن پہ زور ڈالنے کی کوشش کی۔

کہیں دور سے کوئی پکار رہا تھا۔ اس کے نام کی پکار بار بار پڑ رہی تھی۔ وہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ سن نہیں پائی۔ تیز روشنی سی اس کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ ساتھ میں ٹائرز کی آواز۔

ایک دم جیسے کسی خواب سے جاگ کر وہ چونک کر پلٹی۔ وہ ولید کی گاڑی تھی اور وہ تیز رفتاری سے اسے روش پہ چلاتا آ رہا تھا اس کے اوپر چڑھانے کے لیے۔

"ولید رکو!" اس کے لبوں سے کراہ تک نہ نکل سکی۔ سانس رکا اور ساتھ میں پورا وجود شل ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ تیز ہیڈ لائٹس اتنے قریب تھیں کہ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے صرف چہرے کے آگے دونوں ہاتھ کیے۔

دوسرے ہی لمحے بہت زور کی ٹکر نے اسے سڑک کے دوسری جانب لڑھکا دیا۔

گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔

✿.....✿.....✿

باب 12

ہوٹل گرینڈ کی بالائی منزل کے اس پرتعیش پاور آفس میں پرفیوم کی خوشبو کے ساتھ سگریٹ کی مہک بھی پھیلی تھی۔ وہ ریوالونگ چیئر پہ بیٹھا، لیپ ٹاپ پہ ہوٹل کے ریکارڈز چیک کر رہا تھا۔ قریب رکھا ایش ٹرے سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑوں اور راکھ سے بھر چکا تھا۔ یہ اس کی واحد بری عادت تھی جسے وہ، بہت چاہ کر بھی نہیں چھوڑ سکا تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں ہوٹل عثمان شبیر دیکھتے تھے۔ وہ ایک اچھے اور ایمان دار آدمی تھے۔ ان کا بیٹا سفیر بھی ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ لیکن جہان کی کوشش ہوتی، وہ اس لڑکے کو ایڈمنسٹریشن کے معاملات سے دور ہی رکھے۔ سفیر قدرے غیر ذمے دار اور فطرتاً لالچی واقع ہوا تھا۔ عثمان شبیر کل پاکستان جا رہے تھے۔ سوان کی غیر موجودگی میں اسے سفیر کو ذرا کھینچ کر رکھنا تھا۔ کل! ہاں کل جا رہے تھے عثمان شبیر پاکستان!

ڈاکومنٹس دیکھتے ہوئے وہ ایک دم چونکا۔

عثمان شبیر کل پاکستان جا رہے تھے؟ اور ان کی واپسی بھی جلد ہی متوقع تھی۔ کیا وہ ان ہی تاریخوں میں واپس آئیں گے، جب پاکستان سے دو ایکسچینج اسٹوڈنٹس حیا سلیمان اور خدیجہ رانا استنبول آئیں گی؟

کچھ دیر وہ اسی نہج پہ سوچتا رہا، پھر سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ حیا کی ای میلز میل باکس پہ لگے کلون کے باعث اسے ملتی رہتی تھیں۔ اس نے آج کی میلز چیک کیں۔ تازہ ترین میل اس کے ٹکٹ کی کاپی اور الیکٹرونک فارم تھا جو ڈورم الاٹمنٹ کے لیے حیا نے پر کر کے بھیجا تھا۔ اسے یہ میل صبح ملی تھی۔ وہ مصروفیت کے باعث پڑھ نہیں سکا تھا۔ اب پڑھی تو بے اختیار چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔

اسموکنگ، ڈرنکنگ، سب کرتی ہوں۔ سخت جھگڑالو ہوں۔

پاگل لڑکی۔ کیا، کیا لکھ کر سبانجی والوں کو بھیج رہی تھی۔ انہیں واقعتاً اب اسے خونخوار قسم کی لڑکیوں کے ساتھ ڈورم دینا تھا۔ اس نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا اور پھر ٹکٹ والی میل چیک کی۔

پانچ فروری کو ان دونوں لڑکیوں کی فلائٹ تھی۔ ابھی اس میں پورے دو ہفتے تھے۔

اب کیا کرنا چاہئے اس کو؟

بالآخر ایک فیصلے پہ پہنچ کر اس نے فون اٹھایا اور عثمان صاحب کی ایکسٹینشن ملائی

”آلو؟“

”عثمان بے۔ آپ نے واپس کب آنا ہے۔“ بنا تمہید کے اس نے کام کی بات پوچھی۔ بلاوجہ کی تمہیدوں سے تو اسے نفرت تھی۔

”پندرہ، بیس دن تک“ کیوں؟

”پندرہ یا بیس؟“

”آٹھ فروری کی فلائٹ ہے، آپ حساب لگالیں، تقریباً.....“ وہ جیسے خود بھی گننے لگ گئے

”کیا آپ اتحاد ایئر لائنز کی پانچ فروری کی فلائٹ لے سکتے ہیں۔ اصل میں ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے، میرے ایک دوست کی بہن اپنی فرینڈ کے ساتھ استنبول آ رہی ہے۔“

پھر اس نے مختصر الفاظ میں ان کو سمجھایا کہ ان کے درمیان کچھ فیملی کلیش ہے۔ وہ ان کے بارے میں فکر مند ہے کہ پہلی دفعہ استنبول آنے کے پیش نظر ان کو یہاں کوئی مسئلہ نہ ہو، سو وہ چاہتا ہے کہ عثمان شبیر ان سے اپنا تعارف کروا دیں، تاکہ اگر وہ کبھی مشکل میں ان سے رابطہ کرے، تو وہ فوراً عبدالرحمٰن کو بتائیں۔ لیکن ظاہر ہے اس کا نام درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔ سخت قسم کا ایگو ایشو ہے۔

متوقع طور پہ عثمان شبیر نے فوراً حامی بھر لی۔

فون رکھتے ہوئے وہ اب پہلے سے زیادہ مطمئن تھا۔ پتا نہیں وہ کب اس سے اور ممی سے رابطہ کرتی ہے۔ اس دوران کہیں اس کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کی ذمہ داری اور اگر وہ جان بھی لے کہ عثمان شبیر، عبدالرحمٰن پاشا کے کہنے پہ یہ سب کر رہے تھے، تب بھی وہ نہیں جان سکتی تھی کہ عبدالرحمٰن پاشا کون تھا۔ آخر جان بھی وہ کیسے سکتی تھی؟

عبدالرحمٰن پاشا اور عبدالرحیم پاشا، یہ دونوں حبیب پاشا کی پہلی بیوی کی اولاد تھے۔
حبیب پاشا ایک درمیانے درجے کے بھارتی بزنس مین تھے۔ وہ کچھ وجوہات کی بنا پہ پہلی بیوی اور دو بیٹوں کو چھوڑ کر کئی برس قبل استنبول آ گئے تھے۔ ترکی میں انہوں نے امت اللہ نامی ترک خاتون سے شادی کی اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان دونوں کا ایک ہی بیٹا تھا۔ طیب حبیب پاشا، المعروف پاشا بے
(عربی اور اردو کے وہ نام جن کے آخر میں ب آتا ہے۔ ترک زبان میں وہاں سے ب ہٹا کر پ یا P لگا دیا جاتا ہے۔ وہ عرب کو Arap، زینب کو Zeynep اور طیب کو Tayyip لکھتے ہیں۔ مگر ہم اسے طیب ہی لکھیں گے۔)
(بیوک ادا میں امت اللہ کا خاندانی گھر، وہ عثمانی طرز کا سفید محل تھا۔ طیب حبیب ابھی چھوٹا تھا جب حبیب پاشا کا انتقال ہو گیا۔ تب امت اللہ اپنے بیٹے کو لے کر اناطولیہ کے ایک گاؤں چلی گئیں جہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ یوں وہ گھر بند ہو گیا۔ کئی برس وہ بند رہا۔ پھر طیب حبیب نوجوانی کی دہلیز عبور کرتے ہی فکرِ معاش کی خاطر ادالار (شہزادوں کے جزیروں) پہ آ گیا۔ اس نے وہ گھر کھولا اور پھر ایک شہزادے کی طرح جینے کی خواہش کے ساتھ بیوک ادا میں رہنے لگا۔
دور اناطولیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں بیٹھی اس کی سادہ سی ماں نہیں جانتی تھی کہ وہ ادالار میں کیسے لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ امت اللہ نے بہت دفعہ چاہا کہ وہ بیٹے کے پاس بیوک ادا چلی آئیں، مگر طیب حبیب نے ایسا کبھی نہ ہونے دیا۔ اس کی کمزوری اس کی ماں تھی۔ جو اسے بہت عزیز بھی اور وہ جانتا تھا کہ جس دن اس کی ماں کو علم ہوا کہ وہ مافیا کا حصہ بن چکا ہے، اس دن اس کی ماں مر جائے گی۔

☆ ☆ ☆

ترک ڈرگ اور آرم اسمگلنگ مافیا اپنی مثال آپ تھا۔ برطانیہ میں پہنچائی جانے والی اسی فیصد ڈرگز ترکی کے راستے ہی آتی تھیں۔ البتہ ادالار کا مافیا اطالوی یا Sicilian طرز کا مافیا نہیں تھا۔ اطالوی مافیا فیملیز مضبوط اور منظم طریقے سے ایک علاقے میں کام کرتی ہیں۔ لوگ کسی منظم فوج کی طرح درجہ بدرجہ اس میں عہدے پاتے ہیں۔ اس طرح کی مافیا فیملیز کو ٹریک کرنا اور پکڑنا پولیس کے لیے آسان ہوتا ہے۔ اگر اطالوی یا سسلین فیملی کے کسی ممبر کو کچھ بھی ہو جائے، فیملی وہیں رہتی ہے اور اپنا کام جاری رکھتی ہے۔
ترک مافیا ایسا نہیں تھا۔ وہ روس کے قریب ہونے کے باعث روسی مافیا کی طرح کام کرتے تھے۔ روسی فیملیز ایک علاقے میں اٹھتی تھیں۔ کچھ عرصہ وہاں وارداتیں کرتی تھیں اور پھر غائب ہو جاتیں۔ کچھ عرصے بعد چہروں کے نقاب بدل کر وہ کسی دوسرے علاقے میں اٹھتیں اور یوں ان کا کام جاری رہتا۔ ان پہ ہاتھ ڈالنا پولیس کے لیے بہت مشکل ہوتا تھا۔ اطالوی مافیا کی طرح وہ قدیم طرز کے جرائم میں نہیں، بلکہ جدید جرائم (جیسے سائبر کرائم، جعلی کمپنیاں، کریڈٹ کارڈ، فراڈز، اسمگلنگ وغیرہ) میں ملوث ہوتی تھیں۔
”یونان سے ترکی اور ایران کے راستے ایشیائی ملکوں بالخصوص پاکستان میں بڑے پیمانے پہ اسلحہ اسمگل کیا جاتا تھا اور بعد میں یہی اسلحہ دہشت گردی کی وارداتوں میں استعمال ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے متاثرہ ممالک کی ایجنسیوں کے قابل ایجنٹس ان فیملیز میں Penaterate کر کے، ان کا اعتماد جیت کر، ان کی شپ منٹس کی مخبری کیا کرتے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کون سا آدمی اصل مافیا فیملی ممبر ہے یا کسی دوسرے ملک کا جاسوس۔
طیب حبیب نے اپنی مافیا فیملی میں جگہ بنا لینے کے بعد دولت تو بہت کمائی، ساحل کنارے ایک اونچا سا ہوٹل بھی کھڑا کر لیا، مگر وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بہت زبوں حالی کے بعد کشتی کو اپنے قریب پاتے ہیں تو اپنا ماضی اور احساس کمتری چھپانے کے لیے خود پہ کسی جدی پشتی رئیس کا خول چڑھا لیتے ہیں، بلکہ خول چڑھانے کی کوشش ہی کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ فیشن خریدا جا سکتا ہے، مگر اسٹائل نہیں۔ طیب حبیب بھی کوے اور ہنس کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا۔ زندگی کا ایک لمبا عرصہ چھوٹے لوگوں کے ساتھ گزارنے کے باعث وہ ذہنی طور پہ آج بھی اسی کلاس میں تھا۔ بھاؤ تاؤ کر کے خریداری کرنے والا، کسی ڈھابے نما ہوٹل کے شیف کے ساتھ بیٹھ کر ملکی حالات پہ تبصرہ کرنے والا۔ خود بھی وہ ہوٹل میں اپنے پاور آفس کی بجائے نیچے کچن میں پایا جاتا تھا۔ ہوٹل کو اس نے کبھی اپنی مافیا سرگرمیوں کا مرکز نہیں بنایا تھا اور وہاں ایک شریف آدمی کے طور پہ جانا جاتا تھا۔ اس کی اسی فطرت کے باعث اس کے ورکرز اس سے خاصے بے تکلف تھے۔ یہاں پہ آ کر اس کے مصنوعی خول میں دراڑیں پڑنے لگتی تھیں۔ تب ہی اس نے خود کو پاشا بے کہلوانا شروع کر دیا۔
ترکی میں عموماً پہلے نام کے ساتھ ہی پکارا جاتا ہے، جبکہ ادالار میں آخری نام (سرنیم) کے ساتھ ”مسٹر“ کہلوانا، خود پسندی اور

تکبر کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ مگر طیب حبیب کبھی نہیں جان سکا کہ انسان کا قد اپنے نام یا لقب کی وجہ سے نہیں، اس کے اخلاق اور کردار کی وجہ سے بڑا ہوتا ہے۔

طیب حبیب نے اپنی مافیا فیملی میں ایک عرصہ بطور فیملی ممبر کام کیا، مگر پھر زیادہ پیسے کے لیے اس نے جہان کی ایجنسی سے ڈیلنگ شروع کر دی۔ بہت جلد وہ ان کے مہرے کے طور پہ کام کرنے لگا اور پھر اس نے اپنے تمام اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی ایجنٹ کو اپنے سوتیلے بھائی کی حیثیت سے اپنی فیملی میں متعارف کروایا۔ عبدالرحمٰن پاشا، جو واقعی اس کے سوتیلے بھائی کا نام تھا۔ جہان سکندر نے یہ نام استعمال کر کے بہت جلد طیب حبیب کی فیملی میں اپنا مقام بنا لیا۔ فیملی سے مراد اس کا خاندان نہیں، بلکہ مافیا کا گروہ تھا اور چونکہ یہ اطالوی مافیا نہیں تھا اور اس میں Capo اور man-made نہیں ہوتے تھے۔ سو اس روسی مافیا میں اپنی جگہ بنانا بہت مشکل ثابت نہیں ہوا۔ پیسہ اس دنیا کے اکثر مسائل کا ریڈی میڈ حل ہوتا ہے، زندگی اور خوشی کے علاوہ اس سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔

طیب حبیب اور عبدالرحمٰن ایک ڈیل کے تحت بھائیوں کی طرح کام کرنے لگے تھے۔ طیب اسے اپنی ماں سے ملوانے بھی لے گیا تھا اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ایک سادہ لوح عورت کو اپنے نرم رویے اور محبت بھرے انداز سے کیسے اپنے لیے موم کرتا ہے۔ امت اللہ اس کے بارے میں بس اتنا جانتی تھیں کہ وہ ان کے بیٹے کا دوست ہے اور اس نے ان کے بیٹے کی جان بچائی ہے جس کے باعث وہ اس کی احسان مند تھیں۔ چونکہ وہ بیوک ادا میں نہیں رہتی تھیں، اس لیے طیب کو یہ سب ان کو بتانے میں عار محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ سب سے جھوٹ بول سکتا تھا، مگر آنے سے یہ بات نہیں چھپا سکتا تھا۔

حبیب پاشا کے انتقال پہ ان کے دونوں بیٹے انڈیا سے یہاں آئے تھے اور بھلے درمیان میں کتنے برس گزر جائیں، آنے کو ان کی شکلیں اور رنگ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ عبدالرحمٰن ان کے شوہر کا بیٹا نہیں ہے، مگر جب ان کا اپنا بیٹا بضد تھا کہ اپنے دوست کو اپنے بھائی کے طور پہ متعارف کروانے میں اس کا فائدہ ہے تو وہ بھی اس بات کو نبھانے کے لیے راضی ہو گئیں۔ ویسے بھی عبدالرحمٰن ایسا بیٹا تھا جیسا وہ طیب حبیب کو بنانا چاہتی تھیں۔ اس کے اقدار، تہذیب، اخلاق، غرض ہر شے آنے کے لیے فخر کا باعث تھی۔

کافی عرصہ ان دونوں نے بیوک ادا میں ایک ساتھ کام کیا۔ البتہ طیب حبیب یہ نہیں جانتا تھا کہ عبدالرحمٰن ٹرپل ایجنٹ کے طور پہ کام کر رہا ہے۔ اوالار میں اپنا نام بنانے کے لیے اسے ترک خفیہ ایجنسی کی مدد چاہیے تھی۔ تاکہ گرفتاری کی تلوار سر پہ لٹکنا بند ہو جائے۔ بدلے میں وہ مافیا کی معلومات ترکوں کو دیتا تھا اور اگر اسے ترکوں کی کوئی خبر ملتی تو اسے مافیا تک پہنچا دیتا تھا۔ یوں وہ ایک خالص ٹرپل ایجنٹ تھا۔ جو صرف اپنی ایجنسی کے ساتھ وفادار تھا۔ تاش کے پتوں کا گھر اس نے بہت محنت سے کھڑا کیا تھا اور اسے معلوم تھا کہ جس دن یہ پتے ذرا سی پھونک سے الٹے، اس روز وہ اپنی جان بچانے کے لیے ترکوں اور مافیا، دونوں سے بھاگ رہا ہوگا۔ مگر پھر، خطرات کے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے؟

اس نے نامحسوس انداز میں طیب حبیب کے ہوٹل گرینڈ میں عمل دخل شروع کر دیا تھا۔ وہ طیب حبیب سے برعکس شخصیت کا مالک، ورکرز سے خاص فاصلہ رکھنے والا باس تھا۔ اس کے بیش قیمت سوٹ، دو قیمتی پتھروں والی انگوٹھیاں جو بظاہر سونے کی لگتیں اور گلاسز، ہر شے طیب سے بہت مختلف اور پرفیکٹ ہوا کرتی تھی۔

پاکستان سے اسے اجازت تھی کہ وہ چاہے تو یہاں شادی کر سکتا ہے، وطن واپسی پہ اس کی بیوی کو پاکستانی شہریت دی جائے گی، مگر وہ اس نہج پہ نہیں سوچا کرتا تھا۔

پھر ایک روز طیب حبیب اچانک سے یونان میں گرفتار ہو گیا۔ اس میں جہان کا قصور نہیں تھا۔ ہاں وہ طیب کو چھڑانے کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا، لیکن اس نے نہیں کیا۔ اس کے باس نے کہہ دیا کہ وہ خاموشی سے اپنا کام کرے اور طیب کو اس کے حال پہ چھوڑ دے۔ اس نے بھی چھوڑ دیا۔ اپنی مرضی اس کام میں وہ نہیں چلا سکتا تھا۔ طیب نے کئی دفعہ اسے پیغام پہنچایا کہ وہ اس کے لیے کچھ کرے۔ مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔

البتہ ایک بات جہان نے اس کی مانی اور وہ یہ تھی کہ اس کی ماں کو کچھ خبر نہ ہو کہ وہ جیل میں ہے۔ اس نے سب کو کہہ دیا کہ وہ خود بھی لاعلم ہے کہ پاشا بے کہاں ہے۔

اس کام میں اس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ آنے کبھی ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ گواہ تھیں کہ عبدالرحمٰن، پاشا بے سے بہت محبت کرتا ہے اور اس پہ پانی کی طرح پیسہ بہاتا ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ ان کے بیٹے کے ہوٹل کو ترقی صرف اور صرف عبدالرحمٰن کے تجربے و سرمائے کی وجہ سے ملی ہے۔ وہ بھلا کیسے اس پہ شک کر سکتی تھیں۔ بس وہ بہت اداس، بہت پریشان رہنے لگی تھیں۔ وہ ان کے لیے دکھی تھا، مگر اسے حکم نہیں تھا کہ وہ سب چھوڑ چھاڑ کر پاشا بے کے لیے یونان چلا جائے۔

پھر گردونواح میں ہر جگہ اس نے کہنا شروع کر دیا کہ پاشا بے کام کے باعث یونان منتقل ہو گیا ہے۔ یہ گرفتاری صیغہ راز میں تھی۔ سو اس کی اس بات سے سب مطمئن تھے اور سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔

طیب حبیب پاشا کے جانے کے بعد اس نے ہوٹل کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ پہلے اس نے ملازمین کو قابو کیا۔ لوگ لالچ یا خوف سے ہی قابو ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان سے کام نکلوایا جاتا ہے۔ جس کو وہ لالچ دے کر وفادار بنا سکتا تھا۔ اس کو ویسے بنایا اور پھر ہر ایک ورکر کی زندگی کے سیاہ اوراق چھانے، تاکہ جب کبھی کوئی ٹیڑھ پن کرے، تو وہ اس کی رسی کھینچ سکے۔ اب وہ ہوٹل گرینڈ کا بلاشرکت غیرے مالک تھا اور اس نے ادالار میں اپنی ایک شہرت بنالی تھی۔

اور پھر تب آنے کے ساتھ وہ دو لڑکیاں آ گئیں۔

وہ امت اللہ حبیب کی رشتے کی پوتیاں تھیں۔ ان کے ماں، باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔

وہ گاؤں میں آنے کا واحد رشتے دار گھرانہ تھا، ماں باپ کی وفات کے بعد ان کا اکیلے گاؤں میں رہنے کا جواز نہیں بنتا تھا تو امت اللہ ان کو ساتھ لے آئیں۔

جہان کو آج بھی وہ دن یاد تھا، جب وہ پہلی دفعہ ان دو لڑکیوں سے ملا تھا۔ آنے نے اس کو فون پہ بتایا تھا کہ وہ ان بچیوں کو ساتھ لا رہی ہیں۔ وہ اس وقت ہوٹل میں تھا۔ بعد میں جب گھر پہنچا تو بنا چاپ اندر داخل ہوتے ہوئے وہ لاؤنج میں بیٹھی دو لڑکیوں کو دیکھ کر ٹھہر گیا۔ ایک اسکارف لپیٹے بڑی لڑکی تھی اور دوسری گھنگھریالی پونی والی چھوٹی بچی۔ وہ بچی پانی پی کر گلاس رکھ رہی تھی۔ جب اس نے بڑی لڑکی کو تاسف سے نفی میں سر ہلا کر کہتے سنا۔

"بہارے گل! پانی پی کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یاد ہے ہمارا وہ چوزہ جو اپنی کٹوری سے پانی چونچ میں لینے کے بعد گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھ کر پہلے شکر ادا کرتا تھا اور پھر گردن جھکا کر دوسرا گھونٹ پیتا تھا۔"

چھوٹی بچی نے اس سے بھی زیادہ تاسف سے پیشانی پہ ہاتھ مارا

"مگر عائشے گل! وہ تو اس لیے گردن اونچی کرتا تھا تاکہ پانی حلق سے نیچے اتر جائے، مجھے بابا نے خود بتایا تھا۔"

اسے جیسے اپنی بڑی بہن کی کم علمی پہ بہت افسوس ہو رہا تھا۔

"تم نہیں سدھرو گی۔" بڑی لڑکی گلاس اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ جو لابی کے دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ باہر نکل کر سامنے آیا۔ کسی مقیم ایجنٹ کے لیے کور فیملی میں کسی نئے فرد کا اضافہ خوش آئند بات نہیں ہوتی۔ وہ بھی ان کے آنے سے خوش نہیں تھا۔

چھوٹی بچی نے آہٹ پہ چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ پھر بے اختیار اس کے جوتوں کو۔ اس کی بھوری سبز آنکھوں میں حیرت ابھر آئی۔ وہ واقعی گاؤں کی لڑکیاں تھیں۔ جن کو نہیں معلوم تھا کہ استنبول کی ہائی ایلیٹ گھر میں جوتے پہن کر داخل ہوتی ہے۔

"مرحبا...... کیا تم آنے کے بیٹے ہو۔" اگلے ہی لمحے وہ حیرت بھلائے، دلچسپی سے اسے دیکھتی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"ہوں...... اور تم۔" وہ گردن ذرا جھکا کر اس ننھی سی لڑکی کو دیکھ رہا تھا

"میں بہارے گل ہوں۔ اناطولیہ کی بہارے گل"

"تمہارا مطلب ہے گل بہار" اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔ ترکی میں گل اور بہار کو کبھی بہارے گل کہہ کر نہیں ملاتے تھے۔ بلکہ گل بہار کا مرکب بنایا جاتا تھا۔

"نہیں! میں بہارے گل ہوں۔ یہ ایرانی نام ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے گلاب کے پھول پہ آئی بہار۔ پتا ہے میرا نام یہ کیوں ہے۔"

"کیوں۔"

"کیونکہ میری آنم (ماں) کا نام آئے گل تھا۔ یعنی چاند کا پھول، میری نانی کا نام غنچے گل تھا اور میری بہن کا نام ہے عائشے گل۔ یعنی وہ گلاب جو ہمیشہ زندہ رہے۔" اس نے بہت سمجھ داری سے کسی رٹے رٹائے سبق کی طرح اپنی نام کی وجہ تسمیہ بیان کی جو شاید محض ہم آواز کرنے کے لیے رکھا گیا تھا۔

"بہت دلچسپ...... ترکی کے سارے پھول تو تمہارے خاندان میں ہیں۔ تمہارے بابا کا نام کیا ہوگا پھر۔ شاید گوبھی کا پھول۔" وہ ذرا مسکراہٹ دبا کر بولا تو بہارے کی آنکھیں حیرت سے ہوا ہوئیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان میں شرارت کی چمک ابھری اور وہ مسکرائی۔

"نہیں! ان کا نام غفران تھا۔"

"بہارے گل!" اسی پل اس کی بہن کچن سے باہر نکلی۔ "جلدی سے ناخن کاٹ لو۔ لمبے ناخن بلیوں کے اچھے لگتے ہیں لڑکیوں کے نہیں۔" پھر اس پہ نگاہ پڑی تو سنجیدگی سے مرحبا کہہ کر آگے نکل گئی۔

بہارے گل نے افسوس سے اپنی بہن کو جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس کی طرف چہرہ کر کے بہت رازداری سے بتایا۔

"برا مت ماننا، میری بہن آدھی پاگل ہے۔"

"اور شاید بہت عرصے بعد وہ بہت زور سے ہنسا تھا۔"

اسی دن اس کی اس چھوٹی سی شرارتی اور ذہین سی لڑکی سے ایک وابستگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس کی ہر بات پہ نہیں ہنستا تھا۔ نہ ہی بہت زیادہ بے تکلف ہوتا تھا۔ مگر اس بچی کو تو جیسے وہ پسند آ گیا تھا۔ وہ اسٹڈی میں بیٹھا کام کر رہا ہے تو وہ دبے پاؤں آ کر اس کے قریب بیٹھ جائے گی۔ صبح وہ ہوٹل جانے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ تو وہ کبھی اس کے جوتے پالش کر کے لا دے گی تو کبھی گلاس صاف کر کے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ کام عائشے کرتی تھی یا ملازمہ، مگر مجال ہے جو بہارے گل نے کبھی کسی اور کو کریڈٹ لینے دیا ہو۔ وہ اپنی بہن سے بہت مختلف، ذرا باغی طبیعت کی مالک تھی۔

عائشے ایسی نہیں تھی۔ وہ کم بولنے والی، دھیمی اور سنجیدہ مزاج کی، ایک فاصلے پہ رہنے والی لڑکی تھی۔ ان دونوں کی بات چیت ڈائننگ ٹیبل پہ ہی ہو پاتی، یا یوں ہی گزرتے ہوئے۔

مگر وہ شروع سے ہی اس کی طرف سے لاشعوری طور پہ فکر مند رہنے لگا تھا۔ وہ اسے واقعی طیب حبیب کا سوتیلا بھائی سمجھتی تھی۔ لیکن جو بھی تھا وہ اس گھر کی مالکن بن گئی تھی۔ (یہ سفید محل آنے نے عائشے کے نام کر دیا تھا اور اس نے اعتراض نہیں کیا تھا) وہ قانونی طور پہ آنے اور طیب حبیب کی اصل وارث تھی۔ اگر کبھی وہ ہوٹل کے معاملات میں دخل دینے لگے تو وہ کیا کرے گا۔ بیس سال کی لڑکی سے اسے یہ امید نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر اس کا ماننا تھا کہ انسان کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور لوگوں پہ اعتبار تو وہ ویسے ہی نہیں کرتا تھا۔)

پھر کچھ عرصہ گزرا اور عائشے کے کانوں میں بھی لوگوں کی باتیں پڑنے لگیں۔ آنے تو عبادت میں مشغول رہنے والی، ایک بہت ہی غیر سوشل خاتون تھیں۔ ان کی طرف سے اس کو فکر نہیں تھی۔ مگر جب عائشے الجھی الجھی رہنے لگی اور ایک دن صبح اس نے جہان کو کہا کہ شام میں وہ اس سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے تو وہ اچھا کہہ کر باہر نکل گیا۔ مگر اندر سے وہ ذرا پریشان ہو گیا تھا۔

تاش کے پتوں کا گھر بکھیرنے کے لیے آنے والا جھونکا عموماً وہاں سے آتا ہے جہاں سے کبھی امید بھی نہیں کی جا سکتی۔ اب اسے اس لڑکی کو اچھے سے سنبھالنا تھا، تاکہ وہ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ پیدا کرے۔

انسانوں کو قابو ان کی کمزوریوں سے کیا جاتا ہے اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی آپ کے معاملے میں دخل نہ دے تو آپ کو نامحسوس طریقے سے اس شخص کو اس کے اپنے معاملات میں الجھانا و مصروف کرنا پڑتا ہے۔ عائشے کی کمزوری اس کا دین تھا۔ وہ بہت مذہبی اور practising قسم کی مسلمان تھی۔ اسے یاد تھا ایک روز وہ سوتی رہ گئی اور اس کی فجر چھوٹ گئی تو وہ پچھلے باغیچے میں بیٹھ کر کتنا روئی تھی۔ سو اس شام جب وہ اس سے بات کرنے آئی تو وہ اسٹڈی میں قرآن کھولے بیٹھا تھا۔

قرآن پڑھنے کا جو وقت اسے جیل میں ملا تھا، پھر دوبارہ کبھی نہیں مل سکا تھا۔ اب بس کبھی کبھی وہ قرآن پڑھ پاتا تھا۔ اب بھی عائشے آئی تو جہان نے اس کی بات سننے سے قبل اپنی کہنی شروع کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ عائشے کے نزدیک اسکارف لینا زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور بہارے گل اس چیز سے سخت بے زار تھی۔ اس نے سورہ الاحزاب کھولی اور اس سے پوچھنے لگا کہ کیا وہ جانتی ہے سورہ الاحزاب میں آیت حجاب کیوں اتری ہے۔ اور یہ کہ یہ بھی ایک پہیلی۔ ویسے تو سورہ نور میں بھی آیت خمار ہے، مگر اصل آیت حجاب سورہ الاحزاب میں ہے۔ کیا وہ یہ پہیلی حل کر سکتی ہے۔ یہ بات بہت پہلے اس نے کسی اسکالر سے سنی تھی۔ البتہ اس نے اسکالر کا پورا لیکچر نہیں سنا تھا۔ اس لیے وہ خود نہیں جانتا تھا کہ ان دو چیزوں میں کیا تشبیہ ہے۔

مگر عائشے اپنا مسئلہ بھول کر اسی بات میں اٹک گئی۔

اس کے بعد جہان نے اسے اپنے متعلق پھیلی خبروں کو دشمنوں کی پھیلائی ہوئی افواہیں سمجھ کر نظر انداز کرنے پر بہت اچھے سے قائل کر لیا۔ عائشے جب اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تو اس کا ذہن شکوک و شبہات سے خالی تھا، اور وہ صرف سورہ الاحزاب کی پہیلی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

پھر وہ ہر روز صبح پچھلے باغیچے میں قرآن اور ایک کاپی لے کر بیٹھ جاتی اور قلم سے اس کاپی پہ خدا جانے کیا، کیا لکھتی رہتی۔

ایک دن اس نے آخر جہان کو وہ پہیلی بھی اپنے طور پہ حل کر کے بتا دی۔ اب وہ اسے دوبارہ کیسے مصروف کرے۔ خیر، اس نے حل

نکال لیا۔ عثمان شبیر کی بیگم حلیمہ جدیسی کے بچوں کو قرآن پڑھایا کرتی تھیں، اس نے عائشے کو وہاں بھیج دیا اور وہ تو جیسے اپنے سے لوگ ڈھونڈ رہی تھی، وہ روز صبح ادھر جانے لگی۔ (بہارے نے البتہ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔)

عائشے کو مصروف کرنے کے لیے اس نے یہ بھی چاہا کہ وہ کالج میں داخلہ لے لے۔ مگر ان دونوں کا تعلیمی سال اپنا گاؤں چھوڑنے کے باعث ضائع ہو گیا تھا۔ سو وہ دونوں مصر تھیں کہ وہ اگلے سال داخلہ لیں گی۔

پھر ایک روز اس نے بہارے کے پاس ایک چائنیز پزل باکس دیکھا تو بہارے نے بتایا کہ ایک چینی بوڑھے نے عائشے کو یہ فن سکھایا تھا۔ یہ بات بہت حوصلہ افزا تھی۔ اس نے عائشے کو سمجھایا کہ اسے وہ باکسز دوبارہ سے بنا کر بیچنے چاہئیں۔ اس مقصد کے لیے کافی دقتوں سے اس نے عائشے کے لیے بالخصوص بیوک ادا کے جنگل میں لکڑی کاٹنے کا پرمٹ بنوا دیا تھا۔ بالآخر وہ دونوں لڑکیاں اپنے اپنے کاموں میں اتنی مصروف ہو گئی تھیں کہ ان کے پاس عبدالرحمن پاشا کے معاملات میں مداخلت کا وقت نہیں رہا تھا۔ عائشے تو جیسے اب اس پہ شک نہیں کر سکتی تھی۔ جو شخص قرآن کو اتنی گہرائی سے پڑھتا ہو، وہ بھلا برا آدمی کیسے ہو سکتا تھا۔

چند روز مزید آگے سرکے۔ ہر کام نپٹاتے ہوئے اس کے لاشعور میں دنوں کی گنتی جاری رہتی تھی۔

پانچ فروری، یعنی اس کی بیوی کے استنبول آنے میں کتنے دن رہ گئے ہیں۔ دس، نو، آٹھ

پھر اسے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اس کے بارے میں فکر مند بھی رہنے لگا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے، اتنا خیال تو اسے استنبول میں مقیم اپنی سگی ماں کا بھی تھا کہ وہ ان کے متعلق باخبر رہا کرتا اور بار بار ان کے بارے میں پتا کرتا رہتا تھا۔ اب اس کی بیوی کا بھی حق تھا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ پاکستان میں وہ ایک طرح سے فارغ تھا۔ وہاں ہر وقت گرفتاری کا خدشہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر استنبول میں وہ اپنی بیوی کی ہر موو پہ نظر نہیں رکھ سکتا تھا۔ مگر رکھنا ضرور چاہتا تھا۔ کوئی ایسا آدمی جو قابل اعتبار ہو۔ جو اس کی نگرانی کر سکے۔

ہاشم الحسان کا نام اس کے ذہن میں سب سے پہلے آیا تھا۔ ہاشم اس سے پہلے بھی اس کے ایسے کئی کام کر چکا تھا۔

جہان نے فوراً اس سے رابطہ کرنا چاہا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ دبئی گیا ہوا ہے۔ ہاشم چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث رہنے اور استنبول میں جیل ریکارڈ رکھنے کے باعث یہاں کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں کر سکتا تھا۔ پتا نہیں دبئی میں اس کا کون بیٹھا تھا، مگر وہ ادھر چلا گیا تھا۔ البتہ وہاں بھی اس کی کوئی خاص کمائی نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس کا بچہ بیمار تھا اور اس کو کافی رقم کی ضرورت تھی۔ جہان نے اسے بلوا لیا۔ مگر اس نے ہاشم کو ابوظہبی سے اسی فلائٹ پہ استنبول آنے کا کہا، یہ وہی فلائٹ تھی جو حیا اور اس کی دوست کو لینی تھی۔

وہ چاہتا تھا کہ ہاشم ایئرپورٹ پہ اسے سفید پھولوں کا گلدستہ پہنچا سکے۔ یہ اس لیے تھا تا کہ حیا ان سفید پھولوں کے بھیجنے والے کو نہ بھولے۔ مگر یہ نہیں ہو سکا۔

ہاشم نے واپس آ کر اسے بتایا کہ جب وہ فون پہ بات کر رہا تھا تو وہی لڑکی اس کے پاس کارڈ ڈالنے کا طریقہ پوچھنے آئی تھی۔ ایسے میں وہ اس کو چند منٹ بعد پھول لا کر دے، یہ ٹھیک نہیں تھا۔ ہاشم کی بات پہ وہ گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

زندگی میں ہر چیز پھر اپنی مرضی اور پلاننگ سے تو نہیں ہوتی نا!

پانچ فروری کو حیا نے آنا تھا، اور اسی صبح ایک سرپرائز اس کے آفس میں اس کا منتظر تھا۔

طیب حبیب پاشا!

وہ واپس آ گیا تھا۔

جانے وہ کیسے فرار ہو کر واپس پہنچا تھا۔ مگر وہ بہت برے حال میں تھا۔ استنبول میں اس کے دشمن بڑھ گئے تھے اور وہ ان سے بچنے کے چکر میں بالکل مفرور مجرم کی طرح گویا خانہ بدوش کی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ جہان سے سخت بدگمان تھا کہ اس نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ پاشا بے بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جہان نے اس کو دھوکا دیا ہے۔ (وہ اس کی دوسری شناخت سے واقف تھا۔ کیونکہ برگر کنگ اس کا ریسٹورنٹ تھا۔ جہان حالات خراب ہونے کی صورت میں جہان چلا جایا کرتا تھا۔) اب اس کا اصرار تھا کہ جہان اور اس کی ایجنسی اپنا وعدہ پورا کرے اور اس کو اپنے خاندان سمیت کسی دوسرے ملک میں سیٹل کروا دے۔ جہان جانتا تھا کہ ایجنسی یہ کروا دے گی۔ مگر پھر بھی وہ چاہتے تھے کہ پاشا بے ذرا صبر کرے۔ مگر پاشا بے کو بہت سا پیسہ اور نئی زندگی بہت جلدی چاہیے تھی۔

وہ بہت لڑ جھگڑ کر وہاں سے گیا اور اس کے جانے کے بعد جہان فیری لے کر استنبول آ گیا۔ برگر کنگ اور ہوٹل گرینڈ یہ دو واحد جگہیں

تھیں جہاں پاشا بے اس سے ملنے آسکتا تھا اور ایسے جھگڑے کو برگرکنگ پہ کرنے کا متحمل تھا، مگر ہوٹل گرینڈ پہ نہیں۔

ممی سے وہ آج ملا تھا۔ وہ اس کے آنے پہ حسب توقع بہت خوش تھیں۔ مگر زیادہ خوشی اپنی بھتیجی کے آنے کی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ کل یا پرسوں وہ جا کر حیا کو ہاسٹل مل آئیں۔ پتا نہیں وہ خود ادھر آئے یا نہیں۔

اس نے کہہ دیا کہ وہ نہیں جائے گا۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ سلیمان ماموں کی بیٹی اتنی جلدی تو خود ان سے ملنے نہیں آئے گی۔ مگر اگلے ہی دن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ کچن میں کھڑا ممی کا کیبنٹ جوڑ رہا تھا (ایسے کام ممی اس کے لیے رکھ دیا کرتی تھیں!) جب اس کا فون بجا۔

جہان نے فون نکال کر دیکھا۔ یہ اس کا جی پی ایس ٹریسر الرٹ تھا جو اگر اس کی حدود میں آتا تو بجنے لگتا۔ یعنی اگر اس سے ایک فاصلے تک حیا آئے گی تو ٹریسر جہان کو اطلاع دے دے گا۔ یہ اس نے اس لیے کر رکھا تھا تاکہ کبھی اگر وہ اپنے کسی خاص مہمان کے ساتھ کسی جگہ موجود ہے اور اسی جگہ پہ اتفاقیہ یا غیر اتفاقیہ طور پہ حیا آجائے، تو وہ بروقت اطلاع پالے۔

اس وقت اس کا ٹریسر اسے بتا رہا تھا کہ وہ اس کے قریب ہی ہے اور جس سڑک پہ وہ ہے، وہ جہانگیر کو ہی آتی ہے۔

وہ دوسرے ہی دن اس کے گھر آرہی تھی؟

ویری اسٹرینج!

اس نے ممی کو کچھ نہیں بتایا۔ مگر اپنے گھر سفید پھول ضرور منگوا لیے۔ وہ اسے ذرا ستانا چاہتا تھا۔ جس لڑکی کے لیے وہ اتنا عرصہ خوار ہوا تھا۔ اسے تھوڑا سا خوار کرنے میں کیا حرج تھا۔ چلو دیکھتے ہیں کہ وہ کیسا ردِعمل دیتی ہے!

گھنٹی ہوئی، تو اس نے خود جا کر دروازہ کھولا۔ پہلی دفعہ وہ اس سے بطور جہان سکندر کے مل رہا تھا۔ وہ آج بھی سیاہ رنگ میں ملبوس تھی، (اس رات کی طرح جب وہ ان کے گھر گیا تھا)، ذرا نروس، انگلیاں چٹخاتی ہوئی، اس کے جوتوں کا رخ سارا وقت دروازے کی سمت ہی رہا، جیسے وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہو۔ جیسے وہ اپنی مرضی کے بغیر، اچانک لائی گئی ہو ادھر۔

وہ اس سے اسی خشک طریقے سے ملا جیسے وہ اپنے ماموں کی بیٹی سے مل سکتا تھا، جیسے اسے ملنا چاہیے تھا۔ پھر بھی اسے امید تھی کہ اس کے "کون حیا سلیمان" کہنے کے جواب میں وہ شاید کہہ دے، تمہاری بیوی اور کون۔ مگر وہ بہت نروس اور الجھی الجھی لگ رہی تھی۔ وہ جہان سے اتنی مختلف تھی کہ وہ پھر سے بددل ہونے لگا۔ پتا نہیں کیا بنے گا ہمارا؟؟؟

☆ ☆ ☆

ممی اس سے مل کر خوش ہوئیں۔ ہونا بھی چاہیے تھا، مگر سارا ماحول تب بدلا جب وہ اسی اپنے باپ اور تایا والی طنزیہ ٹون میں ان کو احساس دلانے لگی کہ وہ رشتے داروں کے ساتھ بنا کر نہیں رکھتے۔ وہ بظاہر کام کرتے ہوئے سب سن رہا تھا۔ غصہ آیا، افسوس بھی ہوا، اگر ممی سامنے نہ ہوتیں تو وہ اسے بتاتا کہ کس نے کس سے رشتہ توڑا تھا۔

پھر اس لڑکی نے ابا کے آرمی سے تعلق کا پوچھا۔ یا تو وہ نہیں جانتی تھی، یا پھر طنز کرنے کا کوئی اور بہانہ۔ اس کے اندر مزید تلخی بھرتی گئی۔ وہ شاید واقعی یہ رشتہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ پہلے اس کا ارادہ محض سفید پھول بھیجنے کا تھا مگر اس ساری تلخ گفتگو کے بعد جب وہ پھول لینے گیا تو داخلی دروازے کے اندر کی طرف رکھے اسٹینڈ سے قلم کاغذ اٹھایا، اور موٹے گتے کے گروسری لکھنے کے پیڈ پہ ویلنٹائن کا پیغام لکھ کر اندر ڈال دیا۔ یہ اس کا طریقہ تھا بدلہ لینے کا۔ اور وہ بھی جیسے وہاں سے بھاگنا چاہتی تھی۔ ایک منٹ نہیں رکی پھر۔ کھانا بھی ادھورا چھوڑ دیا اور چلی گئی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے وہ اسے اس وقت تک جاتے دیکھتا رہا جب تک کہ وہ سڑک پہ دور نہ چلی گئی۔

بعد میں ممی بہت خفا ہوئیں۔ وہ اپنے بیٹے اور اس کے انداز کو بہت اچھے سے پہچانتی تھیں۔ مگر وہ ان کی سرزنش اور ساری خفگی کو سنی ان سنی کر گیا۔ اسے لگا اسے سلیمان ماموں کی بیٹی کے ساتھ یہی کرنا چاہیے تھا، لیکن پھر بعد میں اسے پتا نہیں کیوں افسوس ہونے لگا۔ اس میں اضافہ تب ہوا جب ممی نے فاطمہ مامی سے فون پہ بات کی تو انہوں نے بتایا کہ حیا کو اس کی دوست اچانک وہاں لے گئی تھی۔ اس وقت جلدی میں تھی۔ بعد میں تسلی سے اس ہفتے کسی دن آئے گی، تحائف وغیرہ اسی لیے نہیں لا سکی۔ سو وہ مغرور لڑکی اپنی مرضی سے واقعی نہیں آئی تھی۔ خیر، اب کیا ہو سکتا تھا؟

وہ آج کل استقلال اسٹریٹ میں ہی ہوتا تھا۔ یہ گلی مافیا راج کے لیے خاصی مشہور تھی۔ چھوٹے چھوٹے بھکاری بچے جو بھیک مانگنے کے بہانے سیاحوں کے قریب آتے اور پرس جھپٹ کر بھاگ جاتے۔ ان بچوں سے لے کر ڈرگز بیچنے والوں تک، سب آرگنائزڈ کرائم کا حصہ تھے۔ برگرکنگ طیب حبیب کا تھا۔ مگر اس کا انتظام بھی جہان ہی سنبھالتا تھا۔ جب اسے deactivate ہونا پڑتا تو وہ یہیں

آ کر چھپ جاتا۔ کچن میں کھڑے ہو کر عام سے حلیے میں سارا دن چند ورکرز کے ساتھ کام کرتے ہوئے یہ اندیشہ کبھی نہ تھا کہ کوئی اولار کا بندہ وہاں آ کر اسے پہچان لے گا۔ استنبول بہت بڑا شہر تھا۔ اتنا بڑا کہ انسان اس میں گم ہو جائے۔ سو یہ تاش کے پتوں کے سارے گھر بہت اچھے سے چل رہے تھے اور اس کا ارادہ اس دفعہ حیا کے اپنے گھر آنے پہ اس سے ملنے کا تھا تا کہ وہ ذرا تمیز سے بات کر کے اپنے پچھلے رویے کی معذرت کر لے۔ مگر اس سے پہلے پاکستان سے کال آ گئی۔

پاکستان کی کال تو حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ ایسا حکم جس پہ آنکھیں بند کر کے عمل کرنا ہوتا۔ چاہے آپ مر بھی رہے ہیں، آرڈر، آرڈر ہوتا تھا۔ اب اسے کہا گیا تھا کہ اسے دو دن کے لیے اسلام آباد آنا تھا۔ ویک اینڈ تک وہ واپس آ جائے گا۔ کوئی اہم بریفنگ تھی۔ اب جس طرح بھی آئے فوراً آئے۔

اس سہ پہر اس نے اپنا ٹریسر چیک کیا تو حیا تاقسم سے قریب ہی تھی۔ گورسل بس اس کو تاقسم پہ اتارتی تھی۔ وہ گورسل کا سارا شیڈول نیٹ پہ دیکھ کر حفظ کر چکا تھا۔ یعنی ابھی وہ تاقسم پہ اترے گی۔ اگر وہ وہیں اس سے مل لے اور اسے ویک اینڈ پہ گھر آنے کا کہہ دے تو وہ اس کی موجودگی میں ہی آئے گی۔ اگر غیر موجودگی میں آتی تو ابا کا بھروسا نہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ پاکستان جاتا ہے اور وہ اولار بھی جانتا تو بھی ان کی زبان پہ اس کے لیے محض گالیاں اور لعنتیں ہوتیں کہ وہ پاکستان کیوں جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ حیا ایسی کوئی بات سنے۔

اس لیے اس برستی بارش میں وہ اس کے لیے تاقسم آیا تھا۔ اور چونکہ اس سے مل کر وہ فیری لے کر اولار چلا جائے گا۔ تب ہی اس نے اپنا بریف کیس بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ اس وقت وہ ایک مکمل انگریز یکٹو لگ رہا تھا، اور ابھی وہ حیا کو اپنا یہی کور بتانا چاہتا تھا، کہ وہ بیوک ادا کے ایک ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ برگرکنگ والی بات ابھی وہ نہیں بتائے گا، اس نے طے کر رکھا تھا۔

وہ جب میٹرو کی سیڑھیوں پہ تھی تو جہان نے دور سے اسے لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا۔ تب اس نے اس کی ایک تصویر کھینچی تھی۔ کبھی بعد میں وہ اسے وہ تصویر دکھائے گا کہ ہاں وہ اس وقت بھی اس کے ساتھ تھا جب اس کی جوتی ٹوٹی تھی۔ وہ اسے پسند کرے یا نہ کرے، وہ اس کے ساتھ تھا۔

اندر ٹرین میں وہ اتفاقیہ طور پہ اسے ملا اور پہلی بات اس نے حیا کو ویک اینڈ پہ گھر آنے کی کہی۔ وہ اس کے رویے پہ حیران تھی۔ (وہ خود بھی حیران تھا!) البتہ اس سارے میں صرف ایک بات اسے مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھی کہ میٹرو میں کچھ لوگ مڑ مڑ کر اس کی بیوی کو دیکھ رہے تھے۔ بات سرخ کوٹ کی نہیں تھی۔ بات سرخ کوٹ کے ساتھ گہری سرخ لپ اسٹک کی تھی۔ مگر شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ اکیلی لڑکی جمع سرخ کوٹ جمع گہرا میک اپ، برابر ہیں کس کے استنبول میں!

اور سرخ ہیل بھی تو تھی۔ وہ ٹوٹے جوتے کے ساتھ بیٹھی رہے، اور ایسے ہی چل کر مارکیٹ تک جائے تو پھر لعنت ہے جہان سکندر پر۔ ساری باتیں ایک طرف، وہ ننگے پاؤں پورے استنبول میں پیدل چل سکتا تھا، مگر حیا نہیں۔ اس نے فوراً سے اپنے جوتے اتار دیے۔ وہ پہلے سے زیادہ حیران تھی۔ (اب کی بار وہ حیران نہیں تھا۔ ایسے ہے تو ایسے ہی سہی!)

ریسٹورنٹ میں اس نے یوں ہی مذاقاً اس کے کوٹ کا حوالہ دیا تا کہ وہ واپس جا کر کسی سے اس بات کا مطلب پوچھے اور آئندہ اس طرح کا لباس پہن کر نہ نکلے۔

مگر ساری گڑبڑ تب ہوئی جب کافی کا کپ لبوں تک لے کر جاتے ہوئے اس نے حیا کو عبدالرحمٰن پاشا کے بارے میں استفسار کرتے سنا۔ کافی کی بھاپ نے لمحے بھر کو اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا اور گو کہ وہ ایک سیکنڈ میں ہی سنبھل چکا تھا۔ مگر وہ سیکنڈ بہت بھاری تھا۔ اگر اس وقت وہ اس کا چہرہ دیکھ لیتی تو ایک پل نہ لگتا اسے جاننے میں کہ اس کے سامنے بیٹھا گدھا ہی عبدالرحمٰن تھا۔ گدھا ہی تو تھا وہ کہ وہ جان ہی نہ پایا کہ اس کی بیوی اس کے کور سے واقف ہے!

وہ مگر کیسے جانتی تھی؟

اس نے بالخصوص اس سے ہی عبدالرحمٰن پاشا کا کیوں پوچھا؟

وہ اندر تک گڑبڑا گیا اور بات کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے شاید لمحے بھر کو وہ ذہنی طور پہ اتنا الجھ گیا تھا کہ بل کی فائل میں اپنا کریڈٹ کارڈ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ کر سکا کہ اس پہ عبدالرحمٰن پاشا لکھا ہے۔

یہ خیال اسے تب آیا جب اس نے حیا کو غصے سے اپنے ملک کی حمایت کرتے ہوئے فائل کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا۔ اللہ اللہ، آج کا دن ہی خراب تھا۔

اسی وقت قریب سے دو ویٹرز ایک ساتھ گزر رہے تھے۔ میزوں کے میز پوش زمین تک گرتے تھے۔ ایسے میں جب اس نے اپنے بریف کیس کے ساتھ رکھی تہہ شدہ چھتری کو راستے پہ ذرا سا سرکایا، تو اس کی یہ حرکت نہ حیا نے دیکھی، نہ ہی سزلر پلیٹر sizzler platter اٹھائے ویٹر نے اور نتیجتاً سب کچھ الٹ گیا۔ اس سارے میس میں حیا کو بل والی بات بھول چکی تھی۔ اس نے بہت آرام سے فائل سے کریڈٹ کارڈ نکال کر کرنسی نوٹ رکھ دیے۔ ہاں مگر حیا کا ہاتھ جلا تھا، اور پتا نہیں کیوں تکلیف اسے ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

اور پتا نہیں وہ اس کے بارے میں کتنا جانتی تھی؟ کہیں وہ اس کے ساتھ کوئی گیم تو نہیں کھیل رہی تھی؟ اس دنیا میں کچھ بھی ممکن تھا۔

یہی جاننے کے لیے اس نے واپسی پہ حیا سے کہا کہ وہ کپچر ٹھیک سے گھٹنے پہ لگائے، کیونکہ اس کی کور اسٹوری میں جھول ہے۔ اس نے کور اسٹوری کے الفاظ کہتے ہوئے بغور حیا کا چہرہ دیکھا کور اسٹوریز جاسوس ہی بنایا کرتے ہیں، اور اگر وہ کچھ جانتی تھی تو اس بات پہ ضرور چونکتی، مگر وہ نہیں چونکی۔

اسے ذرا اطمینان ہوا۔ وہ اتنا مشہور نہیں تھا کہ باہر سے آنے والا کوئی سیاح پہلے ہی روز اسے جان لے، مگر شاید اس نے کسی ایسے شخص سے عبدالرحمٰن پاشا کے بارے میں سنا ہو جو اس کو ذاتی طور پہ جانتا ہو۔ بہرحال پہلے اس نے سوچا تھا کہ اسے کہے گا کہ وہ ادالار میں کام کرتا ہے۔ مگر اب یہ خطرے والی بات تھی۔ سو اس نے دوسرا کور ڈھونڈا۔

وہ بے چارا تو استقلال اسٹریٹ کا ایک معمولی سا ریسٹورنٹ اونر تھا۔ حیا نے یقین کر لیا۔

☆ ☆ ☆

پاکستان جانے سے قبل وہ ممی سے کہہ کر گیا تھا کہ اگر وہ اس کی غیر موجودگی میں آ جاتی ہے تو وہ ابا کو اس سے ملنے مت دیں۔ وہ بہت تاکید کر کے گیا تھا۔ پھر پاکستان جا کر وہ ذرا مصروف ہو گیا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ارم کے پاس جا سکے، مگر وہ ''ڈولی'' کو ارم کے پاس بھیجنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے ایک پروفیشنل کو اس کام کے لیے بھیجا تھا۔ اسے معلوم تھا ارم ضرور حیا کو فون کر کے بتائے گی۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ حیا اسے نہ بھولے۔ کہیں دور اندر اس کو یہ ان سیکورٹی تھی کہ وہ اسے بھول جائے گی اور اس خیال کے بعد دل جیسے خالی ہو جاتا تھا۔

ویک اینڈ پہ وہ واپس آ گیا۔ ابھی ایئرپورٹ کے راستے میں تھا، پرانے شہر میں، جب حیا کا اس کو فون آیا۔ وہ ان کے گھر آ رہی تھی۔ وہ پتا نہیں کیوں ذرا سرور ہوا۔ اسے اچھا لگ رہا تھا کہ وہ ان کے گھر آ رہی تھی۔ مگر جب تک وہ پہنچا، وہاں ایک ناگوار واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ کتنی ہی دفعہ وہ کہہ کر گیا تھا کہ ابا کو اس سے مت ملنے دینا، مگر ممی بھی تو اس کی بات پہ دھیان نہیں دیتی تھیں۔ اسے سخت غصہ اور افسوس تھا۔ پتا نہیں ابا نے کیا، کیا کہہ دیا ہوگا۔ وہ اکثر اس پاک اسپائی کا ذکر کرتے جس کو انہوں نے مارا تھا۔ ممی تو ان باتوں کو پاگل پن پہ محمول کرتیں۔ مگر وہ ان کا پس منظر جانتا تھا۔ سو اس کو تکلیف ہوتی۔ البتہ کوئی دوسرا ان باتوں سے کھٹک بھی سکتا تھا۔

حیا شاید ابا کے بارے میں نہیں جانتی تھی ہاں، ماموؤں نے اس بات کو ہر ممکن طور پہ دبانے کی کوشش کی ہوگی سو اس نے گھر کی بیرونی سیڑھیوں پہ بیٹھے ہوئے حیا کو ابا کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا، اور یہ بھی کہ ''ہم پاکستان نہیں جا سکتے۔'' بات ٹھیک بھی تھی، وہ، ممی اور ابا اکٹھے پاکستان کبھی نہیں جا سکتے تھے، مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے الفاظ کی پہیلیاں نہیں پکڑ سکتی۔

مگر اس واقعے نے اس کا سارا موڈ برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ پھر بھی وہ جاتے ہوئے اس کو کہہ کر گیا تھا کہ وہ کھانا ضرور کھا کر جائے۔ پچھلی دفعہ بھی وہ نہیں کھا کر گئی تھی وہ اس کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔

حیا کو وہیں چھوڑ کر وہ ادالار چلا آیا۔ ہوٹل جانے کی بجائے وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا تاکہ ذرا حلیہ ٹھیک کر کے باہر نکلے۔ تب ہی عائشے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ اس سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔

جب وہ بولنا شروع ہوئی تو اس کی وہ خوش گمانی کہ اس نے عائشے کو اپنے کاموں میں مصروف کر دیا ہے ہوا میں اڑ گئی۔ یہ لڑکی واقعتاً اس کے لیے مصیبت کھڑی کرنا چاہتی تھی۔

''کیا پاشا بے کا تم سے کوئی رابطہ ہے۔''

''میں نے تو پچھلے برس سے اسے نہیں دیکھا۔'' اس نے شانے اچکا کر لاپرواہی سے کہا۔

وہ چند لمحے لب بھینچے اسے دیکھتی رہی، پھر ایک دم زور سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔ اسے عائشے سے کبھی یہ امید نہیں تھی۔ لمحے بھر کو وہ خود بھی سناٹے میں رہ گیا۔

"تم دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے ہو۔ تم نے خود اس کو نکالا ہے۔ مجھے کبریٰ خانم کے بیٹے نے بتایا ہے کہ کچھ دن پہلے وہ تمہارے آفس میں آیا تھا اور تم دونوں جھگڑ رہے تھے۔ تم جانتے ہو اس کی وجہ سے آنے کتنی تکلیف میں ہیں اور تم پھر بھی ان کو دکھ میں دیکھ رہے ہو۔ ان کو بتا کیوں نہیں دیتے کہ پاشا بے زندہ ہے، وہ ٹھیک ہے۔ تم سچ کیوں نہیں بولتے۔" وہ بھیگی آنکھوں سے کہتی، اپنا سرخ پڑتا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے دبا بھی رہی تھی۔ اس کا اپنا ہاتھ بھی، بہت دکھ گیا تھا، اور وہ جیسے یہ سب کر کے ذرا خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔

"مجھے تمہاری کسی بات کا اعتبار نہیں رہا اب۔ تم ہماری زندگیوں سے دور کیوں نہیں چلے جاتے۔ اور تم کسی دن سارا مال سمیٹ کر دور چلے بھی جاؤ گے، میں جانتی ہوں۔ اور پھر کیا ہوگا۔ آنے، وہ کتنا ہرٹ ہوں گی۔ اور میری بہن!" اس کی آواز میں دکھ کی جگہ غصے نے لے لی۔

"میری بہن سے بے تکلف مت ہوا کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ تمہاری وجہ سے ہرٹ ہو۔ سنا تم نے!" وہ سرخ ہاتھ کی انگشت شہادت اٹھا کر تنبیہ کرتے ہوئے بولی تھی۔

جہان نے اسی کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"نکل جاؤ اس کمرے سے۔ ابھی اسی وقت نکل جاؤ۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔"

وہ مزید کوئی لفظ کہے بنا گیلے چہرے کے ساتھ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد جہان نے ہاتھ سے اپنے رخسار کو چھوا۔

کیا یہ صلہ ہوتا ہے قربانیوں کا۔ ساری زندگی غارت کر دو اور بدلے میں کیا ملے؟ گالیاں؟ تھپڑ؟ لعنت ملامت؟

مگر نہیں، انسان تو کبھی کسی چیز کا صلہ نہیں دیا کرتے، پھر ان کے رویے کا افسوس کیا کرنا۔

رات کھانے کے بعد وہ بہت سوچ کر عائشے کے پاس پچھلے باغیچے میں آیا۔ وہ اپنی ورک ٹیبل پہ کام کر رہی تھی، اسے بس نظر اٹھا کر دیکھا اور خاموشی سے کام کرنے لگی۔

وہ اسے مزید جھوٹ بول کر نہیں رام کر سکتا تھا۔ سو اس نے سچ کی ذرا سی ملاوٹ کر کے اسے بتایا کہ وہ دراصل ترک انٹیلی جنس کے لیے کام کرتا ہے، اس کی اور پاشا بے کی یہی ڈیل تھی، اسی لیے وہ ساتھ کام کرتے ہیں، مگر پاشا بے گرفتار ہو گیا تھا اور اگر آنے کو یہ بتایا جاتا تو وہ زیادہ ہرٹ ہوتیں۔ ہاں وہ پاشا بے سے اس دن جھگڑا ضرور تھا مگر صرف اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ طیب حبیب پاشا آنے سے آ کر مل لے، مگر پاشا اپنی مجبوریوں کا رونا روئے جا رہا تھا جن کی وجہ سے وہ آنے سے نہیں مل سکتا۔

"کون سی مجبوریاں۔ اگر وہ جیل سے رہا ہو گیا ہے، تو وہ یہاں کیوں نہیں آتا۔" وہ متذبذب سی پوچھ رہی تھی۔

"دیکھو! وہ رہا نہیں ہوا، وہ مفرور ہے، اب وہ انڈر گراؤنڈ ہے، اس طرح آزادی سے نہیں گھوم پھر سکتا۔ مگر بہت جلد وہ واپس آ جائے گا لیکن یہ جیل والی بات تم وعدہ کرو، کسی کو نہیں بتاؤ گی۔" اس کے سنجیدگی سے کہنے پہ عائشے نے وعدہ کر لیا اور معذرت بھی کر لی۔ مگر اس نے عائشے کی معذرت قبول نہیں کی۔

آخر اس نے بہت سختی سے کہا کہ "مجھے تمہارے رویے سے دکھ پہنچا ہے۔ میں اپنا کام ختم کر کے تمہارے خاندان کا سارا پیسہ تمہیں لوٹا کر یہاں سے چلا جاؤں گا اور تم یا تمہاری بہن سے بے تکلف نہیں ہوں گا لیکن تمہاری اس بدتمیزی کو بھلانے کے لیے مجھے کچھ وقت لگے گا۔"

"سوری!" اس نے ندامت سے سر جھکا دیا۔ وہ بنا کچھ کہے اٹھ آیا۔ ایک دفعہ پھر وہ عائشے کو مصروف کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب کتنے ہی دن تو وہ اس ندامت سے ہی باہر نہیں نکل پائے گی۔ گڈ، ویری گڈ!

......ویلنٹائن کی رات اس نے ہاشم کے ذریعے حیا کے کمرے کے باہر پھول رکھوائے تھے، البتہ آج اس نے کاغذ پہ اپنے پیغام کے ساتھ نیچے لائم انک سے اے آر پی بھی لکھ دیا تھا۔ ساتھ میں اس نے کاغذ کو ذرا لائم کی خوشبو کا اسپرے کر کے بند کیا تھا تاکہ کھولنے پہ وہ گیلا ہی محسوس ہو، اور وہ اسے آنچ ضرور دکھائے۔ پتا نہیں وہ 'اے آر پی' سے کیا اخذ کرتی ہے۔ اس نے اے آر پی کے نام کی تختی ادالار میں اپنے آفس کے باہر بھی لگا رکھی تھی۔ لوگ اس کو عبدالرحمٰن پاشا کا مخفف ہی اخذ کرتے تھے جبکہ وہ اس سے اپنے کوڈ نیم Agent Rose Petal مراد لیا کرتا تھا، شاید اس لیے کہ عبدالرحمٰن پاشا کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے بھی وہ کبھی نہ بھول سکے کہ اس کی اصلیت کیا ہے۔

مگر ایک بات اسے تنگ کر رہی تھی۔ حیا کو کس نے بتایا کہ عبدالرحمٰن پاشا کون ہے؟ وہ ادالار میں مشہور تھا، مگر استنبول تو ایک پوری دنیا تھی، وہاں اس کو کم ہی لوگ جانتے تھے۔ یقیناً وہ کسی ایسے شخص سے ملی ہو گی جس کا عبدالرحمٰن پاشا سے ماضی میں کوئی واسطہ رہ چکا ہوگا۔ جو بھی

تھا، دنیا واقعی گول تھی۔ مگر وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہ یہ جانتی ہے کہ جہان ہی عبدالرحمٰن ہے۔ وہ ایک دن اسے ضرور بتا دے گا، مگر اس دن کے آنے تک اسے اس چیز کو راز رکھنا ہوگا جب تک وہ یہ نہ جان لے کہ وہ دونوں زندگی کے سفر میں ایک ساتھ چل سکتے ہیں یا نہیں۔ ہاں تب تک وہ ایک اچھے ایجنٹ کی طرح اپنے اوالار والے کور کو استقلال اسٹریٹ والے کور سے الگ رکھے گا۔

بہارے سے اس نے بے تکلف ہونا واقعی چھوڑ دیا تھا۔ عائشے سے وہ خود سے مخاطب بھی نہیں ہوتا تھا۔ آج کل ویسے بھی اوالار میں حالات اتنے اچھے نہیں جا رہے تھے کہ وہ زیادہ وقت ادھر گزارتا۔ اسے معلوم تھا طیب حبیب پاشا پھر کسی دن جھگڑا کرنے پہنچ جائے گا۔ لالچی انسان صبر نہیں کر پا رہا تھا۔ اور پھر ایک دن وہ خود تو نہیں آیا، مگر اپنی ایک ساتھی عورت کو برگر کنگ اس سے بات کرنے بھیج دیا۔ پاشا بے فوری طور پہ کسی دوسرے ملک میں سیٹل ہونا چاہ رہا تھا، مگر اسے اس کی فیملی سمیت یہاں سے ابھی بھیجنا جہان کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا۔ وہ کافی دیر اس کی ساتھی خاتون سے بحث کرتا رہا کہ وہ انتظار اور اعتبار کرنا سیکھ جائے، مگر گفتگو تلخ سے تلخ ہوتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی بار بار اس کا موبائل الرٹ دے رہا تھا۔ بالآخر اس نے گفتگو درمیان میں روک کر موبائل دیکھا۔ اس کا ٹریسر الرٹ۔ اس کی بیوی قریب میں ہی تھی۔ استقلال اسٹریٹ کے دہانے پر۔

"اللہ اللہ، یہ ساری عورتوں کو لڑنے کے لیے آج کا دن ہی ملا تھا؟!" وہ جی بھر کے بے زار ہوا تھا۔ یہی ڈر تھا اسے۔ اپنی ذاتی اور کاروباری زندگی کو الگ الگ رکھنے کی کوشش میں کچھ غلط نہ ہو جائے۔ اس کے کاروباری لوگ اس کی ذاتی زندگی سے وابستہ کسی لڑکی کو دیکھیں، دوسرے معنوں میں اس کی کوئی کمزوری پکڑنے کی کوشش کریں، یہ وہ آخری چیز تھی جو وہ چاہتا تھا۔ تب ہی وہ فوراً نباہت (پاشا بے کی ساتھی خاتون) سے کھلی فضا میں بات کرنے کا کہہ کر باہر نکلا تھا، مگر پھر بھی اس کا سامنا حیا سے ہوگیا، کیونکہ وہ سامنے سے آ رہی تھی۔

وہ اکیلی تھی، اور اس کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ چمک سی آ گئی تھی۔ وہ جیسے اس کو اپنے سامنے پا کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ یقیناً اسی سے ملنے آئی تھی، مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ نباہت اس کے بارے میں کچھ جانے، اسی لیے اسے سختی سے حیا سے بات کر کے اسے خود سے دور کرنا پڑا۔ مزید مسائل پالنے کا وہ متحمل نہیں تھا۔ مگر اس کا اپنا دل بہت دکھ گیا تھا۔ واپس مڑنے سے پہلے اس نے آخری پل میں حیا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ وہ بری طرح ہرٹ ہوئی تھی اور یہ بات اب جہان کو بہت ہرٹ کر رہی تھی۔

کچھ دن اس نے صبر کیا، پھر سوچا کہ اس سے معذرت کر لے۔ پتا نہیں کیوں، مگر وہ اس لڑکی کو دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ بھلے ان دونوں کا رشتہ قائم ہو یا نہ ہو، وہ اس کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ڈورم کا نمبر وغیرہ سب جانتا تھا، مگر پھر بھی اس نے ممی سے پاکستان فون کروا کر فاطمہ مامی سے ڈورم بلاک اور کمرے کا نمبر معلوم کروایا تھا تا کہ وہ بعد میں وضاحت کر سکے کہ اسے ڈورم نمبر کس طرح پتا چلا۔

جب وقت ملا تو ایک شب وہ سبانجی چلا آیا۔ حیا کے ڈورم بلاک کی بیرونی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے ایک لڑکی کو کتابیں تھامے، فون کان سے لگائے، زینے اترتے دیکھا۔ اسکارف میں لپٹا دودھیا چہرہ اور سرمئی آنکھیں۔ وہ بظاہر تیزی سے اوپر چڑھتا گیا، مگر اس کی بہت اچھی یادداشت اسے بتا رہی تھی کہ اس لڑکی کو اس نے پہلے بھی دیکھ رکھا ہے۔ مگر کہاں، کب اور کیسے۔ وہ یہی سوچتا ہوا اوپر آیا، اور انہی سوچوں میں غلطاں اس نے اپنے ازلی بنا چاپ پیدا کیے انداز میں چلتے ہوئے کامن روم کا دروازہ ذرا زور سے دھکیلا۔

اور پھر جو ہوا، وہ بہت برا تھا۔

حیا ہاتھ میں جنجر بریڈ ہاؤس کی ٹرے پکڑے دروازہ بند کر رہی تھی، اسے غیر متوقع سی ٹکر لگی اور ٹرے زمین بوس ہوئی۔ وہ سخت متاسف و ششدر رہ گیا۔ بہت محنت سے بنائی گئی چیز کو صرف اس کی لمحے بھر کی غفلت نے تباہ کر دیا گیا تھا وہ ایکسکیوز کرنا چاہ رہا تھا، اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا، مگر وہی اس کی بیوی کی ایک دم سے ری ایکٹ کر دینے کی عادت! پہلے سلش، پھر حماد کی انگلیاں اور اب جنجر بریڈ کا ٹکڑا اٹھا کر اس نے جہان کے منہ پہ دے مارا، مگر اسے زیادہ تکلیف اس کے الفاظ نے پہنچائی۔ وہ اس کی زندگی سے نکل جائے کیونکہ وہ اس کے لیے دکھ اور عذاب کے سوا کچھ نہیں لاتا؟ وہ واقعی چاہتی تھی کہ وہ اس کی زندگی سے نکل جائے؟

وہ جھیل تک اس کے پیچھے گیا، اس نے اسے بتانے کی کوشش کی کہ اپنی تیز زندگی میں، بہت تیز چلتے ہوئے وہ اس کا بہت سا نقصان کر بیٹھا ہے، مگر وہ اس کی کوئی بات نہیں سننا چاہتی تھی۔

اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک وہ جھیل کے کنارے بیٹھا رہا۔ آج وہ بہت غصے میں تھی اور یہ غصہ صرف جنجر بریڈ ہاؤس کے ٹوٹنے کا نہیں تھا۔ کیا ان دونوں کے درمیان کچھ باقی تھا۔ اس نے کہا اس کی زندگی میں جنجر بریڈ ہاؤس سے بڑے مسائل ہیں، کیا وہ اس سفید پھولوں کے بھیجنے والے سے بھی پریشان تھی؟ وہ خوامخواہ اس کو اذیت دے رہا تھا۔ کیسے وہ کچھ ایسا کرے کہ حیا کے مسائل حل کر لے یا کم از کم وہ اس

پہ اتنا بھروسا تو کرے کہ اپنے مسائل شیئر کرے۔ ہاں ایک کام ہو سکتا تھا۔ اگر وہ اپنی موجودگی میں عبدالرحمٰن پاشا کی طرف سے اسے کال کرے تو شاید وہ اس کو بتادے کہ یہ آدمی اسے ستا رہا ہے۔ تب وہ اس کو اکٹھے بیٹھ کر حل کرلیں گے، مگر وہ اس پہ اعتبار تو کرے نا!

اس نے ریکارڈڈ کال کا ٹائم سیٹ کیا، اور پھر حیا کے ڈورم تک گیا۔ اسے کال کی، اور حسب توقع اس نے کال اٹھالی۔ لیکن جیسے ہی حیا کو پتا چلا کہ وہ اس کے کمرے کے باہر ہے، وہ ایک دم بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ وہ حواس باختہ بھی ہوئی تھی، اور شرمندہ بھی۔ جیسے وہ سب کرنے کے بعد اسے پچھتاوا تھا۔ مگر یہ بات کہہ بھی نہیں پا رہی تھی۔ جہان نے سوچا، چائے کے ساتھ ڈسکس کرلیتے ہیں، سو وہ دونوں کچن میں چلے آئے۔

اگر جو بہارے گل اسے یوں کام کرتے ہوئے دیکھ لیتی، تو غش کھا کر گر پڑتی۔ مگر یہاں تو وہ برگر کنگ کا ہیڈ شیف تھا۔ اور اس کام میں اسے زیادہ آرام دہ احساس ہوتا تھا، شاید اس لیے کہ یہ اس کی فطرت کے زیادہ قریب تھا۔

وہ دونوں کچن میں تھے، جب اس کی ٹائمڈ کال بج اٹھی۔ اس نے سوچا تھا کہ دس سیکنڈ کی ریکارڈنگ کے بعد اسے فون حیا کے ہاتھ سے لے لینا ہے، اسی لیے کال دس سیکنڈ کی ریکارڈ کروائی تھی، اور پھر اس نے ایسا ہی کیا، مگر اس کے باوجود حیا نے اس کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ یا تو اس پہ بھروسا نہیں کرتی تھی یا پھر اپنے مسائل خود حل کرنا چاہتی تھی۔

اب وہ پچھلی باتیں بھلانا چاہ رہا تھا۔ چاہتا تھا کہ حیا اس پہ بھروسہ کرنے لگے۔ اس کے ساتھ کچھ تو شیئر کرے۔

سو اس نے ایک اور کوشش کرنی چاہی۔ حرج ہی کیا تھا آخر! ویسے بھی اس دن کے روپے کی معذرت ابھی قرض تھی۔ اسی لیے اس نے ہفتے کی رات کا ڈنر پلان کیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس پہ کتنا اعتبار کرتی ہے۔ وہ اس کو پھول بھیجے گا، وہ پھول لے کر جہان کے سامنے کیا ردعمل دے گی۔ اگر وہ اسے سچ سچ سب کچھ اول تا آخر بتا دیتی ہے تو وہ اسے سچ بتا دے گا۔ ہاں وہ اسے اسی وقت سب کچھ سچ سچ بتا دے گا۔ ایک ایک بات۔ تاقسیم اسکوائر کے گرد کسی تاریک گوشے میں بیٹھ کر وہ اپنی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پہ اس کے سامنے روشنی ڈال دے گا، ہاں ٹھیک ہے، وہ ایسا کردے گا۔ اس سے زیادہ اس ڈرامے کو وہ نہیں چلانا چاہتا تھا۔ اور آج تو اصولاً وہ اتنی پریشان ہوگی کہ لازمی اس ''اے آر پی'' کا سدِباب کرنے کی سعی کرے گی۔ کیونکہ وہ پہلے گاڑی بھی تو بھیجے گا، تاکہ وہ مزید پریشان ہو جائے۔ بس یہی چاہتا تھا وہ۔ اس کا ارادہ ڈنر پہ وہ سارا مس کری ایٹ کرنے کا ہرگز نہیں تھا، مگر جس چیز نے اسے غصہ چڑھایا وہ یہ تھی کہ وہ عبدالرحمٰن کی بھیجی ہوئی کار میں بیٹھ گئی۔

وہ اتنے آرام سے یوں کسی کی گاڑی میں بیٹھ گئی؟

گاڑی بھیجتے ہوئے ہاشم کو تاکید کی تھی کہ وہ عبدالرحمٰن کا نام صرف اس کے پوچھنے پہ لے گا، ورنہ وہ بس ''جہان سکندر، تاقسیم'' کہے گا اور کوئی بھی عقلمند لڑکی اس طرح کنفرم کیے بغیر نہیں بیٹھے گی کسی کے ڈرائیور کے ساتھ۔ مگر جب وہ اسی گاڑی میں آئی تو اسے بے اختیار دھکا سا لگا تھا۔

کیا وہ واقعی ہر ایک کی گاڑی میں بیٹھنے والی لڑکی تھی؟

بے اختیار اسے وہ رات یاد آئی جب اس نے حیا کو اس لڑکے کی گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔ جو نرم گوشہ پھر سے اس کے دل میں بننے لگا تھا، وہ پل بھر میں دب گیا۔ گو کہ وہ کہہ رہی تھی کہ وہ اسے جہان کی گاڑی ہی سمجھی تھی مگر اتنی بھی کیا لاپرواہی کہ آپ یونہی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ اسے سخت غصہ چڑھا تھا، مگر پھر، وہی حیا کی عادت۔

وہ غصے میں ہاتھ مار کر گلدان توڑ کر چلی گئی۔

اسے ذرا سا افسوس ہوا مگر یہ کوئی چھوٹی غلطی تو نہ تھی۔ اگر اس کی جگہ وہ گاڑی کسی اور نے بھیجی ہوتی تو......

اس نے گلدان کے پیسے ادا کیے، اور تب دیکھا کہ وہ اپنا موبائل بھی ادھر ہی بھول گئی تھی۔

اس نے موبائل اٹھایا اور برگر کنگ آ گیا۔ یہ حیا کا ترک سم والا موبائل تھا جس کو وہ عموماً اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اب کل وہ ادالار جائے گا تو وہاں رکھے سرویلنس آلات میں سے ایک اچھا سا ٹریسر اس میں بھی لگا دے گا۔ یہی سوچ کر وہ اس کا موبائل لیے بیوک ادا آ گیا۔

ہوٹل میں کچھ مسئلے بڑھ گئے تھے۔ اس طرح کا موقع چھ سات ماہ قبل آیا تھا اور ایسے وقت میں پیچھے سے آپ کا باس آپ کو deactivate ہو جانے کی ہدایت کر دیا کرتا ہے، اس کو بھی یہی ہدایت مل گئی تھی یعنی اب کچھ دنوں کے لیے وہ منظر سے غائب ہو جائے۔

یوں وہ آفیشلی کچھ ہفتوں کے لیے انڈیا جانے کا کہہ کر ادالار سے پیک اپ کرنے لگا تھا۔ درحقیقت جانا اس نے بس استقلال اسٹریٹ تک تھا، مگر آنے کو یہی بتایا تھا کہ وہ انڈیا جا رہا ہے، شاید اس دفعہ واپس نہ آ سکے۔ وہ ہر دفعہ جانے سے قبل یہی کہا کرتا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اگر اسے کچھ ہو جائے یا واپسی کا حکم نہ ملے تو کوئی ایک عمر اس کی راہ دیکھتا رہے۔ اور پھر دنیا میں تو سب کچھ ممکن تھا نا!

وہ ہوٹل میں ہی تھا جب اسے حیا کی دوست ڈی جے کا فون آ گیا۔ وہ دونوں لڑکیاں بیوک ادا جانا چاہتی تھیں اور ان کو کمپنی چاہیے تھی۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ جہان ان کے ساتھ ادالار تک آئے۔

اب وہ کیا کرے؟

''جہان سکندر'' تو پچھلے تین برس سے ادالار نہیں گیا تھا۔ وہاں تو ہمیشہ عبدالرحمٰن پاشا جاتا اور رہتا تھا مگر حیا ناراض تھی، اسی لیے اس نے اس دن کا انتخاب کیا جس کی صبح اسے ادالار چھوڑنا تھا۔ حیا کی ناراضگی دور بھی تو کرنی تھی۔ پتا نہیں کیوں کرنی تھی، مگر کرنی تھی۔

درمیان کے دو دن اپنے سارے کام پیک اپ کرتے ہوئے بھی وہ اپنے اور حیا کے رشتے کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

(نامحسوس طریقے سے وہ پھر سے ''اس لڑکی'' سے حیا پہ آ گیا تھا۔)

تب کچھ سوچ کر اس نے حیا کو فون کیا۔ عبدالرحمٰن پاشا کے نمبر سے۔ اس سے ملنا چاہتا ہے، یہ بات سن کر وہ کیا کہے گی۔ اب بالآخر اس ناٹک کو ختم ہونا چاہیے۔ میجر احمد کو جب اس نے انکار کیا تھا، تب وہ جہان جیسے بے مروت اور اکھڑ آدمی کو نہیں جانتی تھی، مگر اب وہ جانتی تھی۔ کیا اب وہ کسی امیر آدمی کی ساری جاہ و حشمت دیکھ کر بھی اسی معمولی سے ریسٹورنٹ اونر کی وجہ سے اس کو انکار کرے گی۔ اور ہر دفعہ یہ ''وجہ'' جہان کیوں ہو۔ وہ لڑکا جس کے ساتھ وہ گاڑی میں بیٹھی تھی، اس کا ذکر کیوں نہیں کرتی وہ۔

وہ انسانوں سے اتنا بے اعتبار اور مشکوک ہو چکا تھا کہ اتنا سب کچھ دیکھنے کے باوجود اس کا دماغ یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ لڑکی اس جیسے آدمی کے ساتھ رشتہ رکھنا چاہتی ہو گی۔ مگر حیا نے اس دفعہ بھی رکھائی سے بات کر کے فون بند کر دیا۔ چلو ایک آخری کوشش، اور پھر عبدالرحمٰن اس کا پیچھا ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا۔

☆　☆　☆

آنے ان لوگوں میں سے تھیں جو اس کی مٹھی میں تھے۔ اس نے آنے کی مدد چاہی۔ ان کو ایک اسکرپٹ یاد کروایا کہ اس لڑکی کو آپ نے یہ اور یہ کہنا ہے، اگر وہ ہاں کہے تب یہ کہنا ہے، اگر ناں کہے تب یہ۔ آنے کو اس نے یہ بتایا تھا کہ وہ اس لڑکی کو پسند کرتا ہے، مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ آنے مان گئیں۔ ویسے بھی جو باتیں انہوں نے اسے کہنی تھیں، ان میں کچھ بھی جھوٹ نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن نے واقعی اسے اس چیری پک والے دن دیکھا تھا۔ ڈولی اس کے آبائی گھر کا پرانا خادم تھا۔ خادم یعنی سرونٹ۔ سول سرونٹ، گورنمنٹ سرونٹ۔ وہ بے چارہ میجر جسے اس نے بے عزت کیا تھا وہ کرنل گیلانی کا بیٹا تھا اور حیا کی ویڈیو ہٹوانے کے لیے اس نے جہان کی مدد کی تھی۔۔ بہر حال، اہم بات یہ تھی کہ وہ انکار کرتی ہے یا سوچنے کے لیے وقت مانگتی ہے۔

اس نے سوچا تھا کہ بیوک ادا کی گلیوں میں اپنے رف سے جینز، سویٹر اور بکھرے بالوں والے حلیے میں پھرتے ہوئے اسے اپنا کوئی شناسا نہیں ملے گا، آخر بیوک ادا کے سات ہزار رہائشی افراد میں سے ہر شخص تو اس کا جاننے والا نہیں تھا، مگر وہ غلط تھا۔

وہ ان لڑکیوں کے ساتھ ادالار آ گیا، اور جب وہ تینوں ٹہلتے ہوئے مین بازار میں پہنچے تو سڑک کے عین وسط میں مجمع سا لگا تھا۔

بہارے گل کا ریڈ کارپٹ شو۔

اف!!!!

حیا اور ڈی جے بے اختیار اس کی تصاویر بنانے لگیں اور وہ ذرا سا رخ موڑے، ناگواری سے سارا تماشا دیکھنے لگا۔ وہ اس طرح کھڑا تھا کہ بہارے کی اس کی جانب پشت تھی۔ اب وہ ڈی جے اور حیا کو فوراً چلنے کا کہہ کر خود کو مشکوک نہیں کر سکتا تھا۔ سو ان کو مصروف پا کر اس نے موبائل پہ عائشے کو میسج لکھا۔

''تمہاری سات دن کی تربیت کا یہ اثر ہوا ہے کہ تمہاری بہن پورے ادالار کے سیاحوں سے تصاویر بنوا رہی ہے۔'' اسے معلوم تھا کہ عائشے سامنے دکان میں ہی ہو گی جہاں وہ اپنے پزل باکسز بیچا کرتی تھی۔ پچھلے سات دنوں سے وہ بہارے کو زبردستی اپنے ہمراہ حلیمہ عثمان کے گھر قرآن پڑھنے لے جاتی تھی۔ اور اس وقت وہ عموماً اس دکان پہ اپنے باکسز دینے آیا کرتی تھی۔ یہ اتفاق نہیں تھا، وہ بس غلط جگہ پہ غلط وقت پہ آ گیا تھا۔

''میں کچھ دوستوں کے ساتھ ہوں، مجھے پہچاننا نہیں۔'' ایک دوسرا پیغام احتیاطاً بھیج کر اس نے موبائل بند کر دیا۔ مگر وہ نہ بھی کہتا، تب بھی عائشے ایسی لڑکی نہیں تھی کہ بھرے مجمع میں اسے پکارے۔ اس کی پہلی بات پہ وہ ہرٹ ہوئی تھی، تبھی فوراً اپنی بہن کو لینے پہنچی اور اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجمع چھٹنے لگا اور اس سے پہلے کہ بہارے گل اسے دیکھتی، وہ دونوں لڑکیوں کو لیے پلٹ گیا۔

تبھی پہ حیا کے ہمراہ، بیوک ادا کی گلیوں سے گزرتے ہوئے، عائشے مسلسل اسے پیغامات بھیج رہی تھی۔

"آنے نے کہا تھا تم نے صبح کی فلائٹ سے انڈیا جانا ہے، مگر تم تو یہیں ہو۔ کیا خیریت ہے۔ اور کیا یہ وہی لڑکی ہے، جس کا ذکر آنے کر رہی تھیں۔"

وہی عائشے کی تفتیش کرنے کی عادت۔ اس کو یقیناً آنے نے بتایا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرنے لگا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

وہ حیا کے ساتھ بات کرتے ہوئے اسے جواباً یہی بتا رہا تھا کہ وہ بعد میں وضاحت کر دے گا اور ابھی وہ نماز پڑھنے ان کی مسجد ہی آئے گا اور اگر حسب معمول دونوں بہنیں مسجد میں ہوں تو اسے مت پہچانیں اور وہ بہارے کو اس معاملے سے دور رکھے۔

"ہم مسجد میں ہیں مگر اندر والے کمرے میں، تم آ جاؤ۔ ہم تمہیں ویسے ہی نہیں پہچانتے تو اب کیا کہیں گے۔"

عائشے کا ناراض سا جواب آیا تھا۔ اس نے مزید اسے ٹیکسٹ نہیں کیا۔ چھوڑو، بولنے دو جو بولتی ہے، سوچنے دو جو سوچتی ہے۔

اپنے سفید محل کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے برائے بات سرسری سا اشارہ ان گھروں کی جانب کیا تھا۔ حیا اس کی بات کو ہلکا لے رہی تھی مگر وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ وہ ان جیسا کوئی گھر اپنی تنخواہ سے نہیں بنا سکتا تھا۔ وہ فلموں میں ہوتا ہے کہ اسائنمنٹ ختم ہونے کے بعد ایجنٹ کو نوٹوں سے بھرا بریف کیس ملا کرتا ہے، اصل میں صرف پیٹھ پہ تھپکی ملتی تھی اور کچھ نہیں۔

انڈیا اور پاکستان میں اسپائز سے زیادہ انڈر paid شاید ہی کوئی ہو۔ معمولی تنخواہ اور آپ کے گرفتار ہونے یا مرنے کی صورت میں فیملی کو مالی امداد (ایک بہت قلیل مالی امداد) دینے کا وعدہ! بس یہی ملا کرتا تھا۔ بعد میں جب ایجنسی سے تبادلہ ہو کر واپس فوج میں چلا جائے گا اور اگر اس مستقل سر درد نے کوئی بڑا مسئلہ پیدا نہ کیا، تو ترقی ملنے کے بعد شاید وہ "غریب آدمی" نہ رہے، لیکن ابھی وہ غریب آدمی ہی تھا۔

مسجد سے نکلتے ہوئے حیا نے پوچھا کہ اس نے دعا میں کیا مانگا تو اس نے کہا، اس نے زندگی مانگی اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ زندگی وہ ہمیشہ مانگا کرتا تھا، مگر ابھی اس نے یہی مانگا تھا کہ تھوڑی دیر بعد اس کی بیوی ایک امیر آدمی کا عالیشان محل دیکھنے کے بعد اپنے غریب شوہر کو چھوڑنے کا نہ سوچے۔ اپنوں کا کوئی ایسے امتحان لیتا ہے بھلا۔ اسے خود پہ افسوس ہوا، مگر یہی تو وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے اپنوں میں سے ہے یا نہیں البتہ وہ اس کی 'زندگی' والی بات نہیں سمجھ سکی۔ وہ ان کی پہیلیوں کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔

'حیا' عبرانی زبان کے لفظ 'حوا' سے نکلا ہے جو کہ اماں حوا علیہ السلام کا نام تھا۔ حوا کا معنی ہوتا ہے، زندگی۔ سو حیا کا بھی یہی معنی ہے۔ اسی لیے عربی میں حیا کا لفظی معنی تروتازگی و شادابی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں زندگی کی علامت ہوتی ہیں۔ اسی سے لفظ "حیات" (زندگی) اور اللہ تعالیٰ کی صفت "الحیی" (ہمیشہ زندہ رہنے والا) ہے۔ اس کا اصطلاحی معنی عموماً شرم اور modesty chastity اس لیے کیا جاتا ہے کیونکہ شرم انسان کی اخلاقی زندگی اور کردار کو تر و تازہ اور زندہ رکھتی ہے، حیا میں انسان کے لیے زندگی ہوتی ہے، مگر وہ نہیں سمجھ سکی۔ وہ اس کی زبان سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ چلو کبھی نہ کبھی وہ اسے اپنی زبان بھی سمجھا دے گا۔

اس نے عادت کے مطابق سب کچھ پلان کیا تھا۔ بندرگاہ پہ جس بچے کو حیا کا پرس چھیننے آنا تھا، وہ اس کی ہدایت کے مطابق بالوں میں لگانے والی موتیوں کی مالائیں لے کر ہی آیا تھا۔ جس واحد چیز کے لیے وہ رکے گی، وہ اس کے بالوں کی خوب صورتی میں اضافہ کرنے والی کوئی چیز ہی ہونی چاہیے تھی اور جتنی جلدی ردعمل ظاہر کرنے والی وہ لڑکی تھی، وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے پاسپورٹ اور آئی ڈی کارڈ کے لیے ضرور بھاگے گی۔ ہاں اسے اچھی طرح پتا تھا کہ حیا کے اس گولڈن کلچ میں اس کے کون کون سے کاغذ ہیں۔

حسب توقع وہ اس بچے کے پیچھے بھاگ پڑی۔ کبھی جو یہ لڑکی ردعمل ظاہر کرنے سے پہلے دو منٹ سوچے؟ مگر پتا نہیں کیوں اسے اس کی یہی باتیں اچھی لگنے لگی تھیں۔ کم از کم وہ باہر سے بھی وہی تھی جو اندر سے تھی۔ ہاں، وہ اس پہ یقین کرنے لگا تھا۔

جب وہ دونوں دوبارہ تھانے میں ملے تو وہ رو رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کس بات پہ رو رہی تھی، آنے سے ابھی جہان کی بات نہیں ہوئی تھی، وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے آنے کو کیا کہا ہوگا۔ مگر اس روز پہلی دفعہ اس نے پورے استحقاق سے اپنی بیوی کو جھڑکا تھا۔ اسے لگا تھا، حیا نے اپنے غریب شوہر کو نہیں چھوڑا۔ اس کا کار والے اس لڑکے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کو عبدالرحمٰن یا اس کی جاہ و حشمت سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ واقعی جہان کے ساتھ رہنا چاہتی ہے، سو بس، سیڈ ڈراما ختم۔

رات آنے سے بات پہ اسی شے کی تصدیق کرنے کے بعد اس نے ہاشم کو کہا کہ وہ مزید اس لڑکی کا پیچھا نہیں کرے گا۔ معاملہ ختم ہو چکا ہے۔ بہت آزما لیا اس نے۔ اس سے زیادہ آزمائے گا تو اس کا گناہ گار ہو جائے گا۔

☆　☆　☆

ہاشم فون پہ اپنے بیٹے کی بیماری کا ذکر کر رہا تھا، مگر اس نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ ہوٹل گرینڈ کا پیسہ اس کا ذاتی پیسہ نہ تھا، ذاتی تو اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور ہاشم سدا کا جواری، اپنی ساری جمع پونجی تو وہ جوئے میں لٹا آتا تھا پھر وہ کیوں اس کی مدد کرے۔ اپنے تئیں اس نے بات ختم کر دی۔ جب ہی عائشے کا میسج آیا۔

''میں نے آنے سے پوچھا تھا، وہ کہہ رہی ہیں کہ تم صبح کی فلائٹ سے انڈیا چلے گئے تھے۔ ویسے اتنے سارے لوگوں سے ایک وقت میں اتنے سارے جھوٹے بولتے ہوئے تمہیں کبھی افسوس نہیں ہوتا؟''

''نہیں۔'' اس نے یک لفظی جواب بھیج کرائے آر پی والی سم بند کر دی۔ یہ عائشے بھی نا کسی دن مروائے گی اسے۔

......اگلے ہی روز اس نے ہاشم کو ادالار بھیجا۔ وہ اس وقت تک اس دکان پہ کھڑا رہا جب تک کہ عائشے نہیں آ گئی۔ عائشے کے آتے ہی ہاشم اس سے ملا، اور اس نے چھے چوکھٹوں والے پزل باکس کا آرڈر لکھوا دیا اور چوکھٹے بھی وہ جن پہ ترک کی بجائے انگریزی حروف تہجی ہوں۔ ساتھ میں اس نے عبدالرحمٰن کو بتانے سے سختی سے منع بھی کیا۔

وجہ صاف تھی۔ اسے وہ پزل باکس حیا کو دینا تھا۔ جیسے وہ اپنی معلومات اور کلاسیفائڈ ڈاکومنٹس ایک ایجنٹ سے دوسرے کو منتقل کرتے تھے کہ کہیں کسی لاکر میں کچھ چھوڑ دیا، یا ٹریشن کین میں، اور بعد میں کسی دوسرے ایجنٹ نے آ کر اسے اٹھا لیا، تاکہ کسی ایجنٹ کو معلوم نہ ہو سکے کہ اس کا دوسرا ساتھی کون ہے اور پکڑے جانے کی صورت میں وہ اپنے ساتھی کے لیے کوئی خطرہ نہ بنے۔ اس نے بھی اپنی اصلیت بتانے کے لیے کسی ایسے ہی ٹریژر ہنٹ کا سوچا تھا۔ خود آمنے سامنے وہ کبھی نہیں بتائے گا۔ اس کی بیوی کو اس کو سمجھ کر، اسے خود ڈھونڈنا چاہیے۔ نہیں وہ اسے آزما نہیں رہا تھا، وہ تو بس اپنے انداز میں بات پہنچا رہا تھا۔

ہاں مگر جب وہ پزل باکس اس تک پہنچے گا اور بالفرض کسی طرح اس نے ادالار تک اس باکس کے بنانے والوں کو ٹریس کر لیا تو وہاں سے وہ محض اتنا جان پائے گی کہ یہ کام عبدالرحمٰن کے علاوہ کسی کا بھی ہو سکتا ہے۔ بس عبدالرحمٰن اس میں ملوث نہیں ہے۔ حیا اس کو تلاش کرے، یہ وہ چاہتا تھا، مگر وہ اس کی جاسوسی کرے، یہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

اگلے چند روز خیریت سے گزر گئے۔ وہ ڈی ایکٹیویٹ ہو کر بس اپنے ریسٹورنٹ اور گھر تک محدود ہو گیا تھا۔ انہی دنوں اسے اس لڑکی کا خیال بار بار آتا رہا جو اس نے سبانجی میں دیکھی تھی، وہ اس کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اسے یاد تھا کہ پچھلے سال سبانجی کے کچھ اسٹوڈنٹس انٹرن شپ پروگرام کے تحت ہوٹل گرینڈ آئے تھے اور چند ہفتے انہوں نے وہاں کام کیا تھا۔ اس نے کمپیوٹر میں سارا ڈیٹا کھولا اور ایک ایک انٹری کو چیک کرتے ہوئے بالآخر وہ اسے مل ہی گئی۔

ہالے نور چولگ لو۔ روم فورم کی ایک کارکن۔ اس کا فیلڈ ریکارڈ بھی کافی اچھا تھا۔ وہ اس کی ایمپلائی تھی، اور اپنے ہر ایمپلائی کا سارا بائیوڈیٹا وہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ اپنے ہر ملازم کو وہ پہچانتا تھا۔ مگر اس کے ہر ملازم نے اسے نہیں دیکھ رکھا تھا۔

وہ ہوٹل مالکان کی طرح پرائیویٹ لفٹ استعمال کرتا تھا اور نچلے درجے کے عہدوں پہ کام کرنے والے ملازموں کی اس سے کوئی ملاقات نہ تھی، اور انٹرنیز سے کہاں اس کا رابطہ ہو پاتا تھا۔ پھر بھی، شاید یونہی آتے جاتے اس لڑکی نے اسے دیکھ رکھا ہو۔ وہ اسی ڈورم بلاک سے نکل رہی تھی جو حیا کا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں کسی کام سے آئی ہو اور اس کا اپنا بلاک کوئی دوسرا ہو اور اس کا حیا سے کوئی رابطہ نہ ہو اور اس نے کبھی ہوٹل گرینڈ کے اونر کو نہ دیکھ رکھا ہو۔ پھر بھی آئندہ وہ سبانجی جاتے ہوئے احتیاط کرے گا ورنہ دنیا واقعی بہت چھوٹی تھی۔

چند دن بعد ایک صبح جب وہ برگر کنگ کے کچن میں کام کر رہا تھا تو ایک دم سے اس کے سر میں بہت شدید درد اٹھنے لگا۔ یہ درد اسے بہت چڑچڑا بھی بنا دیتا تھا۔ سارا موڈ خراب ہو جاتا۔ اب بھی یہی ہوا۔ وہ تلخی بھرے انداز میں زور سے کھٹ کھٹ کرتا گوشت کاٹ رہا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے قبضہ مافیا کے کچھ لوگ اس کو تنگ بھی کر رہے تھے۔ ریسٹورنٹ کی لیز کا معاملہ تھا اور پاشا بے کے ساتھ ان کی کوئی تلخی ہو چکی تھی۔ ایسے میں اسے اپنے ریسٹورنٹ کی سیکورٹی کے لیے اپلائی کرنا تھا، مگر اس سے قبل وہ کوئی ٹھوس واقعہ ایسا چاہتا تھا کہ جس سے اس کا کیس آسان ہو جائے۔ ارادہ تھا کہ آج سہ پہر میں کچھ اپنے آدمیوں سے ریسٹورنٹ میں توڑ پھوڑ کروا کر سیکورٹی کلیم اور انشورنس کلیم دونوں حاصل کر لیں گے۔ ایسے وقت میں اسے موقع سے ہٹ جانا چاہیے۔ اور ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ حیا اور ڈی جے آ گئیں۔

وہ ٹاپ قپی جانا چاہتی تھیں۔ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد وہ ان کے ساتھ چل پڑا۔ سر کا درد بخار میں تبدیل ہوتا گیا، مگر وہ ان کا ساتھ دیتا رہا۔ پھر ڈی جے کو بھی سر درد کی شکایت ہونے لگی، وہ واپس جانا چاہتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد وہ دونوں ٹاپ قپی کے عقبی

برآمدے میں آ بیٹھے۔ حیا نے کہا بھی کہ وہ واپس چلا جائے، مگر ابھی ریسٹورنٹ پہ staged اسالٹ ہونا تھا، ابھی وہ کیسے واپس جا سکتا تھا۔ البتہ سر درد کے باعث وہ حیا کی شال تان کر لیٹ گیا۔ اس کو نیند ویسے بھی مشکل سے آتی تھی، پھر ابھی ایک پبلک پلیس پر وہ کیسے سو سکتا تھا۔ بس یونہی لیٹا رہا۔

تب ہی اس نے محسوس کیا کہ اس سے ایک زینہ نیچے بیٹھی حیا نے گردن موڑ کر اسے دیکھا ہے شاید یہ جاننے کے لیے وہ سو رہا ہے یا نہیں۔

وہ ذرا سا کھٹک گیا۔ اس نے آنکھوں سے بازو ذرا تر چھا کر کے دیکھا، حیا کی جہان کی طرف پشت تھی، وہ موبائل پہ کسی کو میسج کر رہی تھی۔ جہان نے ذرا سی گردن اٹھا کر دیکھا تو اسکرین پہ اوپر انڈیا کا نمبر نظر آ رہا تھا۔

اسی کا نمبر۔

وہ پیغام تو نہیں دیکھ سکا، مگر یہ وہی نمبر تھا جس سے چند روز قبل اس نے حیا کو میسج کیا تھا۔ اے آر پی تو اس کا پیچھا چھوڑ چکا تھا، پھر وہ اس سے کیوں رابطہ کر رہی تھی۔ اسے کچھ عجیب سا لگا۔ برا نہیں لگا مگر اچھا بھی نہیں لگا۔

چند منٹ ٹھہر کر اس نے بائیں ہاتھ سے جینز کی جیب سے موبائل نکالا۔ (حیا اس کے دائیں جانب، ایک زینہ نیچے بیٹھی تھی، سو دیکھ نہیں سکتی تھی۔) اس نے اسی طرح لیٹے لیٹے انڈین سم آن کی، پھر ذرا سا چہرہ موڑ کر "ایکسچینج اسٹوڈنٹ" کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے سامنے بات نہیں کرے گی اور واقعی وہ کال آتے ہی اٹھ کر منڈیر تک چلی گئی۔ وہیں شال گردن سے اوپر تک لیے، آنکھوں پہ بازو رکھے، وہ ہینڈز فری سے اس سے کچھ دیر بات کرتا رہا۔ حیا اگر اس سارا وقت میں اسے دیکھ رہی ہوتی تب بھی نہ جان پاتی کہ اس کے لب ہل رہے ہیں۔ اور اس نے فون کیوں کیا؟

وہ چاہتی تھی کہ عبدالرحمٰن اس کے کزن کی مدد کرے۔ اس کی بات سن کر جہان بے اختیار ہنس پڑا۔ مدد کا وعدہ کر کے اس نے فون بند کر دیا۔

حیا واپس آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ مضطرب سی تھی۔ خیر۔ پلان کے مطابق اسے ریسٹورنٹ سے کال آنے لگی۔ انہیں جانا پڑا۔ جب وہ واپس ریسٹورنٹ پہنچے تو توڑ پھوڑ دیکھ کر اسے احساس ہوا، حیا اسے عبدالرحمٰن پاشا کی حرکت سمجھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے۔ چلو، یہ بھی ٹھیک تھا۔ اسے سبق مل گیا ہوگا کہ اپنے مسائل حل کروانے کے لیے دوسروں کا رخ کبھی نہیں کرتے۔

☆ ☆ ☆

وہ دوبارہ پھر سبانجی نہیں گیا۔ بہار کے دن شروع ہوئے اور سارا استنبول مہکنے لگا۔ ایسے ہی ایک دن وہ گھر پہنچا تو حیا آئی ہوئی تھی۔ مگر اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ہمراہ تین لڑکیاں تھیں اور ان تین لڑکیوں میں ہالے نور کو دیکھ کر اس کا لمحے بھر کو سانس ہی رک گیا۔ ہالے نے اس کے سلام کا جواب دے کر بغور اس کو دیکھا تھا۔ وہ بنا مزید کچھ کہے کچن میں چلا آیا۔

یہ لڑکی جس کا تعلق ہوٹل گرینڈ سے رہ چکا تھا اس کو اس گھر میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے تھا۔ اب ان کو کیسے نکالے یہاں سے؟ بڑی مصیبت سے بہتر چھوٹی مصیبت ہوتی ہے۔ اس نے چھوٹی مصیبت لے لی۔ اس نے ترک میں وہ تکلیف دہ الفاظ جب کہے تو ممی تو شاکڈ رہ ہی گئیں، مگر وہ لڑکی بھی چونک گئی، لاؤنج تک کچن کی ساری باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ پانچ منٹ بھی نہیں گزرے اور وہ چاروں وہاں سے چلی گئیں۔

"یہ کیا بدتمیزی تھی جہان۔" ممی ابھی تک ششدر تھیں۔

"وہ اسکارف والی لڑکی مجھے کسی اور حوالے سے جانتی تھی، میری بیوی کی وجہ سے میرے کور کو نقصان پہنچا تو میرا کورٹ مارشل ہو جائے گا ممی"

"اوہ!" وہ خاموش ہو گئیں، مگر وہ خوش نہیں تھیں۔

اس نے سوچا تھا، وہ پھر حیا سے معذرت کر لے گا، جیسا کہ ہمیشہ ہوتا تھا۔ مگر موقع ملنے سے قبل ہی وہ انقرہ چلا گیا۔ وہاں کچھ کام تھا اور جس دن وہ واپس آ رہا تھا، اسے ایئرپورٹ پہ حیا کا میسج ملا۔

ڈی جے تاقسیم فرسٹ ایڈ میں ایڈمٹ تھی، اسے برین ہیمرج ہوا تھا۔

وہیں ایئرپورٹ سے اس نے تاقسیم فرسٹ ایڈ میں ایک جاننے والے کو فون کیا۔ ڈی جے کا بیری اینورزم پھٹا تھا اس نے جلدی سے حساب لگایا۔ اس سب کا مطلب تھا کہ اس کے پاس صرف چند گھنٹے تھے۔ اسے یاد آیا وہ ٹاپ قپی میں سر درد کی شکایت کر رہی تھی۔

وہ پرانے چہرہ والے ایئرپورٹ (صبیحہ گورچن ہوالانی) سے آیا تھا، سویہ پا استنبول پہنچتے ہی وہ سیدھا تاقسیم آیا اور وہاں سے حیا کے پاس۔ اس کے حساب کردہ گھنٹے ختم ہونے کو تھے۔ کسی بھی وقت وہ ڈی جے کی موت کی خبر دے دیں گے، پھر باڈی کلیئرنس کروانے میں وقت لگے

گا، باڈی پاکستان جائے گی، ظاہر ہے حیا بھی ساتھ ہی جائے گی یعنی دو تین دن تو کہیں نہیں گئے، اور موت کی خبر ملنے کے بعد وہ کچھ نہیں کھائے گی۔
حقیقت پسندی سے تجزیہ کرتے ہوئے اس کو صرف حیا کی فکر تھی۔ وہ جلدی سے کینٹین گیا اور اس کے لیے جوس اور سینڈوچ لایا۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر باہر آ گیا اور خبر بھی باہر آ گئی۔ پھر بھی اس نے یہ خبر حیا کو تب دی جب وہ تھوڑا بہت سینڈوچ کھا چکی تھی۔ اور کاش وہ، وہ آخری بندہ ہوتا جو اس کو یہ خبر دیتا۔

وہ دو تین دن بہت تکلیف دہ تھے۔ اسے ڈی جے کی موت کا بہت افسوس تھا، لیکن اپنی جاب کے دوران اتنے لوگوں کو اپنے سامنے مرتے دیکھا تھا کہ ڈاکٹرز کی طرح وہ بھی ذرا immune ہو چکا تھا۔ مگر حیا کو روتے دیکھ کر اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ جو سمجھتا تھا کہ جیل کے ان تاریک دنوں نے اس کے اندر سے ساری حساسیت کو نگل لیا ہے، تو شاید وہ غلط تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی، بہت زیادہ۔
ڈی جے کی موت سے بھی زیادہ۔

باڈی کلیئرنس ملنے سے قبل وہ حیا کے ہمراہ سبانجی گیا تھا، (ہالے نور سمیت اسٹوڈنٹس کی اکثریت اسپرنگ بریک پہ جا چکی تھی۔) ڈی جے کی چیزیں اس نے حیا کے ساتھ ہی پیک کروائی تھیں۔ اس کے رجسٹرز اکٹھے کرتے ہوئے وہ بھیگی آواز میں کہہ رہی تھی کہ ڈی جے اپنے نوٹس یا رجسٹرز فوٹو کاپیئر پہ بھول جاتی تھی، اس لیے وہ فوٹو کاپیئر تک گیا تا کہ اس کا اگر کچھ رہ گیا ہے تو وہ بھی اٹھا لائے مگر جب وہاں رکھے ڈی جے کے رجسٹر کا پہلا صفحہ اس نے پلٹایا تو اس پہ بڑا بڑا کر کے یونانی فلسفی ہراقلیطس کا ایک قول لکھا تھا۔

Into The Same River No Man Can Enter Twice Hearclitus.

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر رجسٹر وہیں چھوڑ کر واپس آ گیا۔ حیا اس وقت ذہنی طور پہ اتنی ڈسٹرب تھی کہ اس کو کچھ پوچھنے کا ہوش نہیں تھا۔
بعد میں وہ واپس آ کر یہ رجسٹر لے گی تو اس قول کو ضرور پڑھے گی، وہ اسے اپنے پزل باکس کے اوپر پہیلی کے طور پہ لکھ سکتا تھا۔ ڈی جے فلسفے کی طالبہ تھی تو شاید حیا بھی اس فلاسفی کے پس منظر سے واقف ہو...... شاید......

ممی کے مجبور کرنے پہ وہ اپنے کنٹرولر سے اجازت لے کر حیا کے ہمراہ پاکستان آ گیا۔ وہی موقع جس سے وہ بھاگتا تھا، بالآخر سامنے آ ہی گیا تھا مگر صرف حیا کے لیے اس نے یہ کر لیا۔ اپنے ماموؤں کے سامنے آج بھی وہ خود کو کمزور محسوس کرتا تھا۔ ان کی باتیں سننا، ان کے تیور برداشت کرنا، وہ کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا۔ لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔
حیا تو سیدھی اپنی امی کے ساتھ ڈی جے کی طرف چلی گئی، وہ سلیمان ماموں سے ملا، اور کچھ دیر حیا وغیرہ کے لاؤنج میں ان کے ساتھ بیٹھا رہا۔ ماموں ذرا رکھائی سے ملے تھے۔ سرد انداز۔ ٹھیک ہے، وہ بھی تو اسی طرح ملا تھا۔

''سبین ٹھیک ہے؟ اس کو بھی لے آتے؟''

''ابا کی وجہ سے نہیں آ سکتی تھیں وہ۔''

''اچھا!'' اور خاموشی۔ بس اسی طرح کی چند باتیں کر کے ملازمہ نے اسے اس کا کمرا دکھا دیا۔ وہ نیچے والا ایک کمرہ تھا، اس نے پوچھا کہ اگر اسے کوئی اوپر والا کمرہ مل جائے تو؟ ملازمہ نے فوراً اس کا سامان اوپر والے گیسٹ روم میں رکھ دیا۔
وہ کسی کے بھی گھر رہتا، ہمیشہ اوپر والی منزل میں ٹھہرتا۔ اوپر سے نیچے پورے گھر کا جائزہ لینا آسان ہوتا ہے، آپ کا پینوراما وسیع رہتا ہے، فرار کا راستہ بھی مل جاتا ہے، آس پاس کے گھروں پہ نظر رکھنا بھی سہل تھا۔

☆ ☆ ☆

دوپہر میں وہ سو نہیں سکا، بس ٹیرس سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ مسجد کدھر ہے، کالونی سے نکلنے کے راستے، سیکٹر کے مرکز کی سمت۔
دوپہر میں حیا اور اس کی امی واپس آ گئیں۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا تھا۔ حیا بیمار لگ رہی تھی مگر وہ اس طرح جا کر پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔
شام میں ذرا دیر کو آنکھ لگی ہی تھی کہ حیا کی امی، فاطمہ ممانی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ فرقان ماموں وغیرہ آئے تھے نیچے۔

''میں آ رہا ہوں بس فریش ہو کر۔''

''او کے! اچھا......'' وہ رکیں ''نور بانو بتا رہی تھی کہ آپ کو نیچے والا کمرہ پسند نہیں آیا؟ یہ ٹھیک ہے؟''

''جی۔'' اس نے تردید کیے بغیر بس اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تو ایسا ہی تھا، مگر فاطمہ ممانی کو شاید کچھ الجھا سا ہوا تھا مگر بولیں کچھ نہیں۔
کچھ دیر بعد وہ کمرے سے بنا چاپ کے نکلا تو ابھی سیڑھیوں کے گول چکر کے اوپر ہی تھا جب لاؤنج سے ملحقہ کچن کی آدھی کھلی دیوار کے پار فاطمہ ممانی حیا سے بات کرتی نظر آئیں۔ اس نے دانستہ طور پہ رک کر سنا۔

"یہ سیمین کا بیٹا ذرا پراؤڈ نہیں ہے؟"

چلو جی۔ پہلے اس کا باپ مغرور تھا، اب وہ مغرور ہو گیا۔ جو اپنی مرضی سے رہنا چاہے، وہ مغرور ہو گیا! وہ تو مغرور نہیں تھا۔ اسے تو کسی چیز کا غرور نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کے بارے میں ایسے اندازے قائم کر رہے تھے۔

"نہیں، وہ شروع شروع میں ایسا ہی رہتا ہے" حیا کہہ رہی تھی۔

"اور بعد میں؟"

"بعد میں بھی ایسا ہی رہتا ہے، اس شروع اور بعد کے درمیان کبھی کبھی نارمل ہو جاتا ہے!"

سیڑھیوں کے وسط میں دیوار پہ ایک لمبا سا آئینہ آویزاں تھا جس میں اسے وہ دونوں نظر آ رہی تھیں، اور یہ الفاظ کہتے ہوئے حیا کا چہرہ سپاٹ تھا۔

اسے برا لگا مگر پتا نہیں کیوں اب وہ اس کو مارجن دینے لگ گیا تھا۔ ایسے ہے تو ایسے سہی۔

لان میں فرقان ماموں اور صائمہ ممانی آئی ہوئی تھیں۔ جب وہ چلتا ہوا ان کے دہانے تک آیا تو وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، تم یہاں عزت سے جی سکو گے؟ کبھی نہیں۔ تم ذلیل ہو گے۔ تم خوار ہو گے"

وہ آوازیں آج بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ لوگ بہت عزت سے اب اس سے مل رہے تھے۔ سلام دعا، ممی کا حال، گلے، شکوے۔

"تمہارا باپ تمہارے نام یہ ایک شرمناک دھبہ ہے۔ تم کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکو گے۔ تمہارے باپ کا نام تمہارا سر ہمیشہ شرم سے جھکاتا رہے گا"

وہ ان کے سامنے کرسی پہ بیٹھا تھا۔ فاطمہ ممانی اس سے چائے کا پوچھ رہی تھیں، اس نے وہی کہا جو ایک ترک لڑکے کو کہنا چاہیے تھا۔ چپل ٹی۔

"تم کتوں کی سی زندگی گزارو گے۔ کبھی عزت اور وقار سے اپنے ملک کا رخ نہیں کر سکو گے"

وہ اب اس سے اس کی جاب اور دوسری مصروفیات کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جواب دیتا رہا۔ حیا اس سارے وقت لاتعلقی سے بیٹھی رہی، بس ایک دو دفعہ بولی، مگر وہ اسے نظرانداز کر رہی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اپنے تئیں جہان اسے نظرانداز نہیں کر رہا تھا، وہ تو ہمیشہ سے ہی اتنا ہی خاموش اور ریزروسا تھا۔ البتہ اپنے ماموؤں کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ نہیں تھا۔ ہاں نہیں تھا وہ اتنا بہت اعلیٰ ظرف۔ جن باتوں نے ایک عرصہ اس کو اور ممی کو ڈسٹرب رکھا، ان کے کہنے والے تو بڑے مزے سے اپنی زندگی میں مگن تھے۔ کسی کو کوئی غرض نہیں تھی کہ سیمین سکندر اور جہان سکندر کا کیا بنا ہے، کیونکہ ان کے ناموں کے ساتھ سکندر لگتا تھا۔

وہ پہلی ملاقات میں ان سے کوئی خاص بات نہ کر سکا۔ اس سے ہوئی ہی نہیں! کچھ زخم بھرنے میں بہت وقت لگتا ہے، اور اس کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔

چونکہ وہ ترک شہری کے طور پہ آیا تھا، اس لیے اس کی حرکات و سکنات اپنے کور کے مطابق تھیں۔ بھلے وہ انگریزی میں بات کرنا ہو، گھاس پہ جوتوں سمیت نہ چلنا ہو، یا بنا جوتوں کے گھر میں داخل ہونا، وہ وہی بنا رہا جو وہ لوگ اس کو سمجھتے تھے۔

اٹھنے سے قبل فرقان ماموں اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر گئے تھے۔

"تم نے میری بات نہیں مانی، اب جب مدد چاہیے ہو تو میرے طرف مت آنا"

وہ آوازیں پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔

سلیمان ماموں نے ان کے جاتے ہی قطعیت سے کہہ دیا تھا کہ اب حیا واپس نہیں جائے گی۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا، البتہ وہ جان گیا تھا کہ وہ واپس جانا چاہتی ہے۔ ہاں، واپس تو اسے جانا ہی تھا۔ وہ کرے گا اس بارے میں بھی کچھ۔

☆ ☆ ☆

اس پہلی ملاقات سے اس نے یہ اخذ کیا کہ فرقان ماموں کی باتیں اور طنزیہ انداز اس کی توقع کے مطابق ہی تھا، البتہ سلیمان ماموں یوں طنز نہیں کرتے تھے، بس اکھڑے اکھڑے سے رہتے تھے۔ وجہ شاید ان کا گزشتہ دفعہ استنبول کا دورہ تھا، جب وہ ادالار میں ہونے کے باعث ان کے لیے جہانگیر نہیں آ سکا تھا۔ اور جب آیا تو تھوڑی دیر ہی بیٹھ سکا۔ یہ وہ وقت تھا جب اس کے دل کے اندر ان کے لیے موجود شکوے ختم نہیں ہوئے تھے اور اپنے اکھڑ رویے کے باعث سلیمان ماموں بھی بدظن ہو چکے تھے، وہ جانتا تھا۔ اور ان کا رویہ اب بھی ویسا ہی تھا، حیا کے ساتھ پاکستان آنے، یعنی ان کی بیٹی کا اتنا خیال رکھنے پر بھی وہ اس سے راضی نہ تھے۔ فرقان ماموں کی اسے کوئی پروا نہ تھی، مگر سلیمان ماموں...... پتا نہیں

کیوں وہ ان کی پرواہ کرنے لگ گیا تھا۔
شاید اس لیے کہ پاکستان آ کر اس پہ ایک انکشاف بہت شدت سے ہوا تھا کہ وہ جو ہمیشہ "میرے دونوں ماموں" اور "میرے ماموؤں نے" جیسے صیغوں میں سوچتا تھا، تو وہ غلط تھا۔
وہ زمانے گئے جب دونوں ماموں ایک فریق تھے۔ اب وہ دو فریق تھے۔ سلیمان ماموں تو بڑے بھائی کی بہت عزت کرتے تھے، مگر ڈنر پہ فرقان ماموں اور صائمہ مامی کی گفتگو سے ہی یہ بات واضح تھی کہ اگر وہ حیا سے رشتہ توڑے گا تو وہ ہرگز ناخوش نہیں ہوں گے کیونکہ ان کے اور سلیمان ماموں کے درمیان اب وہ پہلے والا ایکا نہ تھا۔ اتنے برس ایک ساتھ رہنے کے باعث ہونے والی چھوٹی موٹی تلخیوں نے ان کے آپس کے رشتے میں بھی بہت سی دراڑیں ڈالی تھیں۔ ہاں بظاہر سب ٹھیک تھا، سلیمان ماموں کی طرف سے بھی سب ٹھیک تھا، البتہ فرقان ماموں اور صائمہ ممانی حیا کی زندگی میں آنے والی ہر تکلیف پہ اس کے ساتھ نہیں ہوں گے، وہ جان گیا تھا۔ وہ بیٹھ کر تماشا دیکھنے والوں میں سے تھے۔ یہ بات کاش اسے پہلے پتا چل جاتی، مگر کیسے چلتی؟ وہ اور ممی تو ابھی تک کئی سال پیچھے کھڑے تھے۔
اور اب اگر وہ فرقان ماموں کے اس برسوں پرانے رویے کی وجہ سے سلیمان ماموں سے تعلق خراب کرتا ہے تو یہ ناانصافی تھی۔ اب جب کہ یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ وہ یہ شادی قائم رکھنا چاہتا ہے تو پھر اسے اپنا رویہ بھی ٹھیک کرنا ہوگا۔ جتنے دن وہ یہاں ہے، وہ اس کی پوری کوشش کرے گا، اس نے خود سے عہد کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز زاہد ماموں کی بیٹی کی مہندی تھی۔ وہ ویسے ہی رش سے بھاگتا تھا، مگر یہاں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی فنکشن اٹینڈ کرے۔ اس پہ مستزاد، فاطمہ ممانی اس کے لیے کچھ کرتے وغیرہ لے آئی تھیں، پیسے البتہ انہوں نے اس کے بہت اصرار پہ بھی نہیں لیے۔ اب اس کو وہ پہننا ہی تھا۔
صبح حیا کمرے سے باہر نہیں آئی تھی۔ وہ کافی دیر اس کا انتظار کرتا رہا، کہنا کچھ بھی نہیں تھا، بس اسے دیکھنا تھا، مگر وہ شاید سو رہی تھی، سو بالآخر اس نے وہیں اوپر والے کمرے سے اسے کال کی۔
وہ اسے اس پزل باکس کے بارے میں بتانا چاہتا تھا مگر مجال ہے، جو وہ لڑکی کسی کی بات پوری سنے۔ اس نے حسب معمول اس کو لعنت ملامت کر کے فون بند کر دیا۔ اب کیا کرے؟ خیر، پزل باکس اس تک وہ پہنچا ہی دے گا کسی نہ کسی طرح۔
حماد نے تو سننے سے ہی انکار کر دیا۔
"معاف کرنا مگر میں ان کی خوش اخلاقی سہہ نہیں پاؤں گا، مجھے معاف رکھو بھائی!"
مگر وہ جانتا تھا کہ جب وہ اصرار کرے گا تو حماد کو ماننے ہی بنے گی۔ اور یہی ہوا۔
وہ مان گیا۔ بس یہ آخری دفعہ ہے، پھر نہیں۔
شام میں وہ پھر سے حیا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ دونوں کی کوئی خاص بات نہیں ہو سکی تھی پاکستان آ کر۔ اب اس کے پاس یہی بہانہ تھا کہ وہ اس سے فلائیٹ کا پوچھ لے گا۔ گریٹ!
وہ اس سے یہی پوچھنے فرقان ماموں کے گھر آیا تھا، اور اسے اس وقت وہ سیڑھیوں سے اترتی دکھائی دی۔ بہت سی لڑکیاں اچھے کپڑے پہنتی ہیں، مگر اس کی چال کی بے نیازی، کسی ملکہ کی طرح سج سج اترنا، وہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ مگر......
ہاں یہی "مگر" ہر دفعہ آ جاتا تھا۔ جس وقت وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی، وہاں آس پاس کتنے ہی کزنز گھوم رہے تھے۔ سب اس کو گاہے بگاہے دیکھ رہے تھے، اور یہیں آ کر اس کی پیشانی پہ بل پڑ جایا کرتے تھے۔
وہ اس سے کوئی بدتمیزی نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر اس وقت جب وہ بات کرتے ہوئے اس کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تو زاہد ماموں کی چھوٹی بیٹی ثناء ان کی تصویر کھینچنے لگی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ لڑکی فوراً سے یہ تصویر فیس بک پہ لگا دے گی، اور ایسی بد احتیاطی وہ افورڈ نہیں کر سکتا، سو ثناء کو ذرا سا ڈانٹ دیا۔ اب وہ دوبارہ اس کی تصویر کھینچنے کا سوچے گی بھی نہیں۔
اور حسب معمول، اس کے کسی اور مقصد کے لیے کیے جانے والے عمل سے آخر میں ہرٹ حیا ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

مہندی کے فنکشن میں وہ فرقان ماموں کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر وہی پرانے قصے لے کر بیٹھ گئے تھے۔ کس طرح انہوں نے سبین کی مدد کرنی چاہی، مگر کس طرح سبین نے مدد نہیں لی۔ وہ خاموشی سے سر ہلاتا رہا۔ کوئی اعتراض نہیں، کوئی اختلاف نہیں۔ کمانڈو ٹریننگ کے دوران ایک مرحلہ ایسا ہوا کرتا تھا جس پہ لڑکے ضبط ہار دیتے تھے، وہ تب ہارتے جب ٹریزان کے منہ پہ تھوکتا۔ اس کے ایک دوست نے ایسے موقعے پہ اپنے ٹرینر کو طمانچہ دے مارا تھا، سو اسی وقت اسے بتا دیا گیا کہ وہ کمانڈو نہیں بن سکتا۔ جہان کے منہ پہ بھی آفیسر نے تھوکا تھا، وہ خاموشی سے کھڑا رہا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، کئی دفعہ تھوکا گیا، گالیاں دی گئیں، مگر اس نے صبر نہ ہارا، اور وہ پاس ہو گیا۔

اب بھی اس نے خود کو ایسے ہی پاس کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فنکشن کے دوران بدمزگی اس وقت پھیلی جب ایک دم سے لائٹ چلی گئی۔ اس کے ماموؤں کے گھر میں لائٹ کا مسئلہ کبھی نہ ہوتا اگر جنریٹر جواب نہ دے دیتا۔ ایک دم سے دھکم پیل مچ گئی تھی۔ مکینک کا انتظار، شور، افراتفری۔ کوئی خود ہاتھ پیر ہلانے کے لیے تیار نہیں تھا، بس مکینک آئے گا تو ٹھیک کرے گا۔ وہ کچھ دیر بیٹھا رہا، پھر اسے کوفت ہونے لگی۔ یہ لوگ دوسروں پہ اتنا انحصار کیوں کرتے ہیں؟ اپنے مسئلے خود کیوں نہیں حل کرتے؟

وہ اٹھا، اور چپ چاپ جنریٹر کا معائنہ کرنے لگا۔ ذرا سا مسئلہ تھا، اور طوفان ایسے مچا دیا تھا سب نے۔ پانچ منٹ بھی نہیں لگے اسے سب ٹھیک کرنے میں اور تب تک وہ پورے مجمعے کی توجہ پا چکا تھا۔ یہ چیز زیادہ کوفت دلانے والی تھی۔ وہ ہاتھ دھونے کے بہانے جلد ہی اندر چلا گیا، البتہ وہ جانتا تھا کہ سارا وقت حیا بہت مسرور انداز میں اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ جیسے اس پہ فخر کر رہی تھی۔

بعد میں سب مرد لاؤنج میں بیٹھ گئے، تو وہ بھی وہیں بیٹھا رہا۔ لاشعوری طور وہ حیا کا منتظر تھا۔ کب وہ آئے گی، اور وہ اسے دیکھ سکے۔ بہت دیر بعد وہ نظر آئی، ساتھ میں زاہد ماموں کی چھوٹی بیٹی بھی تھی، دونوں کچن میں جا رہی تھیں۔ اسے ابھی حیا کو دیکھ لینے کی ٹھیک سے خوشی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے محسوس کیا، جب وہ چلتی ہوئی جا رہی تھی تو سب کزنز اسے ہی دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ داور بھی۔ اسے غصہ چڑھا، اتنا شدید کہ حد نہیں۔ مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ تو اپنی ماں تک پہ کچھ امپوز نہیں کر سکا تھا کبھی، اپنی بیوی پہ کیا کرتا؟

پھر ایک دم سے کہیں سے زاہد ماموں کی بیٹی جس کی شادی تھی، تن فن کرتی آئی اور داور کے اونچا بولنے کے سبب اس کو سنا کر واپس ہو لی۔ وہ واقعی شاکڈ رہ گیا، اور کچھ پچھلا غصہ بھی تھا، وہ ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ باقی سب بھی اس کے پیچھے باہر آئے تھے۔

کسی نے البتہ اس لڑکی کو نہیں ٹوکا۔ کسی نے اسے نہیں ڈانٹا۔ کسی نے اسے وہ باتیں نہیں سنائیں جو انہوں نے کئی برس پہلے اس کی ماں کو سنائی تھیں۔ تب بھی فرقان ماموں لوگ ان کے لاؤنج میں تھے، تب بھی وہ یونہی اٹھے تھے اور باہر نکل گئے تھے، مگر اب نکلنے سے قبل کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ کیا فرق تھا دونوں واقعات میں؟

ممی نے ان کی بے عزتی نہیں کی تھی، وہ گواہ تھا۔ مہوش نے داور کی بلکہ سب کی بے عزتی کی، وہ اس کا بھی گواہ تھا۔ پھر کیوں مہوش کو ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا؟

کیونکہ وہ اثر و رسوخ والے باپ کی بیٹی تھی، کیونکہ اس کا باپ سامنے بیٹھا تھا، کیونکہ اس کا ہونے والا شوہر بہت امیر کبیر تھا۔ اور ممی کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہیں تھا اس وقت۔

اور ہاں، یہ اس کا ہونے والا شوہر، چلو وہ بھی دیکھے گا کتنا عرصہ اس کے امیر ہونے کا ڈھکوسلہ چلتا ہے۔ جس طرح اس لڑکے کا بڑا بھائی بار بار اپنی دولت کی وجہ بتا رہا تھا، صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک دم سے آئی ہوئی بلیک منی کی صفائی دے رہے ہیں۔ گدھے!

مہوش کی بدتمیزی کے بعد جب سب بنا کھانا کھائے وہاں سے اٹھ آئے تو اس کے ذہن میں صرف یہی تھا کہ سلیمان ماموں نے کھانا نہیں کھایا۔ حیا نے باہر کھا لیا تھا، مگر ماموں ...... وہ ان کی اتنی پرواہ کیوں کر رہا ہے؟ پتا نہیں مگر جو بھی ہو، ماموں ماموں تھے۔ سو حیا کے ساتھ مل کر اس رات اس نے صرف سلیمان ماموں کے لیے پاستا بنایا تھا۔ اور یوں ان دونوں کے درمیان سرد مہری کی دیوار بھی اس سے پگھل گئی تھی۔

ماموں حیران تھے، مگر زیادہ ظاہر نہیں کیا۔ وہ اس سے خفا رہتے تھے وہ جانتا تھا، مگر اب شاید حالات بدل جائیں۔ شاید......

اگلے روز حماد کی بہت منت کر کے اس نے وہ باکس حیا تک پہنچا ہی دیا۔ اس کے اندر جواہر کے ایک لاکر کی بارکوڈ سلپ اور اندرونی تجوری کی چابی تھی۔ لاکر ابھی خالی تھا، مگر وہ واپس جاتے ہی کچھ ریکارڈ کر کے اس میں رکھ دے گا، اس نے سب سوچ رکھا تھا۔ بس اس کے لیے اسے حیا کو واپس لے جانا ہوگا۔

لازماً۔

ان چند دنوں میں اس کے باقی رشتہ داروں سے بھی تعلقات بہتر ہوتے گئے۔ مہوش کی چھوٹی بہن سے لے کر سلیمان ماموں تک، اب کوئی اس سے ناراض نہ تھا۔ جب وہ بعد میں اپنی جاب کے متعلق بتائے گا، تو ان کا کیا ردعمل ہوگا، وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی، ابھی تو اسے سب سیٹ رکھنا تھا۔

اس رات حیا نے پزل باکس اسے ہی لا کر تھما دیا۔ پہلے تو وہ واقعی گڑبڑا گیا کہ وہ جان چکی ہے، اور اب اس کا حساب لینے آئی تھی، مگر نہیں، وہ صرف باکس کھولنے میں مدد چاہ رہی تھی۔

پاگل لڑکی، یہ رازداری سے رکھنے والی چیز تھی، وہ کیا اب ہر کسی سے یوں ہی مدد مانگتی پھرے گی۔

اس کا علاج کرنا ضروری تھا۔ سو اس نے فوراً چھرا اور ہتھوڑا مانگا۔ حیا نے گھبرا کر باکس واپس لے لیا۔ چلو اس کو اس کی توڑ کر نہ کھولنے والی خواہش کا اتنا احترام تو تھا ہی۔ اب اس کے لاکر سے ویڈیو نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ واپس استنبول جائے۔ ایک وقت تھا جب وہ اسے روکنا چاہتا تھا، مگر آج وہ خود سلیمان ماموں کے پاس گیا تاکہ ان کو سمجھا سکے۔

وہ کمرے میں اکیلے تھے، وہ سامنے کرسی پہ بیٹھ گیا، چھوٹی چھوٹی باتوں سے آغاز کیا، وہ خاموشی سے اسے سنتے رہے۔

"تم اور کیا کرتے ہو، ریسٹورنٹ کے علاوہ؟"

انہوں نے سادہ سے انداز میں پوچھا تھا، مگر وہ ذرا دیر کو ٹھٹکا۔ وہ کچھ جانتے تو نہیں تھے؟ آرمی کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے تھے وہ، مگر کہیں اس کے عبدالرحمان پاشا والے کور کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتے تھے؟ یا شاید روحیل نے امریکہ والی بات کا ذکر کیا ہو، مگر نہیں......

وہ ان کی تسلی کرتا گیا، پورے اعتماد کے ساتھ۔ پھر اس نے حیا کی بات کی۔ اور جب یہ کہا کہ اگر وہ واپس نہیں جائے گی تو کبھی ڈی جے کے دکھ سے نہیں سنبھل پائے گی تو سلیمان ماموں نے بس اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اجازت دے دی۔ انہیں اس کا حیا کے لیے فکرمند ہونا اچھا لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

سب ٹھیک جا رہا تھا۔ وہ دونوں واپس آئے تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ دن اسے اپنے گھر رکنے کا کہے گا۔ آہستہ آہستہ وہ اس کا لاکر ڈھونڈ لے گی اور اس سے پہلے کہ کسی دوسرے کے منہ سے وہ کچھ سنے، وہ ویڈیو اسے مل جائے گی۔ پھر وہ مل کر کچھ فیصلہ کریں گے کہ آگے زندگی انہیں کیسے گزارنی ہے۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔

پاکستان سے واپسی پہ اس کے سر کا درد بڑھتا ہی گیا تھا، اور اس کے باعث اسے بخار ہو گیا تھا۔ پہلے دن تو حیا چلی گئی، اس نے کہا تھا وہ کل آئے گی، ابھی وہ سبانجی دیکھنا چاہتی تھی۔ ڈی جے کی وجہ سے یقیناً......

جس رات کے لیے حیا نے آنے کا کہا تھا، اس شام سے ہی اس کا سر درد ناقابل برداشت صورت اختیار کر گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا، ابھی سر پھٹ جائے گا۔ وہ اپنا کام خود کر لیتا تھا، مگر آج عرصے بعد اس نے ممی سے کہا کہ وہ اسے دودھ گرم کر کے لا دیں اور ساتھ میں نیند کی گولی بھی۔ ممی فوراً دونوں چیزیں لے آئیں۔ ذرا پریشان بھی ہو گئیں۔ ان کو فکر نہ کرنے کا کہہ کر اس نے دوائی اور پھر لیٹ گیا۔ حیا آئے گی تو وہ اٹھ جائے گا۔ ابھی تھوڑا سا سو لے۔ نیند میں جاتے ہوئے بھی اس کے اندر متضاد سی جنگ چھڑی ہوئی تھی کہ وہ اپنا ایم آر آئی پھر سے کروائے، یا اس درد کو نظرانداز کرتا رہے؟

وہ کسی بری خبر سے ڈرتا تھا۔

اس کا کیریئر...... اس کی منزل...... ناکارہ فوجی قرار دے کر ریٹائرمنٹ......

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ مسلسل بجتی گھنٹی سے کھلی۔ اس نے اٹھنا چاہا تو سر بے حد وزنی ہو رہا تھا۔ بمشکل وہ کہنی کا سہارا لے کر سیدھا ہوا، اور فون دیکھا۔

سفیر عثمان

جب اس نے فون کان سے لگایا تھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا اور جب اس نے سفیر کی بات سنی، تو اسے جیسے زور کا چکر آیا تھا۔

"آبی (بھائی) ایک لڑکی کا فون آیا ہے، وہ اپنا نام حیا بتا رہی ہے، اور وہ کہہ رہی ہے کہ اس کو اغوا کر لیا گیا ہے!"

وہ رات شاید اس کی زندگی کی طویل ترین رات تھی۔ انڈیا میں را کی تحویل میں گزری راتوں سے بھی زیادہ تلخ، زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ بھیانک۔

اسے لگا تھا، وہ حیا کو کھو چکا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ اس کی نگرانی نہیں کر سکا۔ وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکا، وہ لوگ اسے اغواء کر چکے تھے۔ صرف اس لیے کہ اس رات عبدالرحمٰن پاشا سو گیا تھا۔ وہ اس کو لے گئے تھے۔ وہ کیا کرے؟ وہ کدھر جائے؟ وہ کیا کرے گا اب؟

وہ بمشکل بستر سے اٹھا، چہرے پہ پانی بھی نہیں ڈالا، بس جیکٹ اٹھائی، پستول جیب میں رکھا، اپنا خاص چاقو جراب کے ساتھ باندھا، اور فون ہاتھ میں لیے باہر بھاگا۔ گاڑی تک آتے آتے اس کو چکر آ رہے تھے۔

باہر سردی تھی۔ ہڈیوں کو جما دینے والی سردی۔ اور اندھیرا۔ دنیا جیسے ختم ہو کر برف کا ڈھیر بن گئی تھی۔ وہ رات برف جیسے رات تھی۔ سرد اور کہر آلود۔ سفید اور ٹھنڈی۔

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے سفیر کو کال بیک کیا۔

"کچھ بتایا اس نے؟ وہ کدھر ہے؟"

"بوسفورس برج کہا تھا، میں کال بیک کر رہا ہوں مگر کال نہیں جا رہی۔ اس کا نمبر رومنگ پہ ہے، اور بیلنس ختم ہو گیا ہوگا۔"

مگر مسئلہ یہ تھا کہ بوسفورس برج بھی تو دو تھے۔ ایک فرسٹ بوسفورس برج جس کو عرف عام میں "بوسفورس برج" کہا جاتا تھا اور دوسرا سیکنڈ بوسفورس برج جس کا عام نام سلطان احمد برج تھا۔ یہ پل سلطان احمد مسجد (نیلی مسجد) کی پشت پہ ہی تھا۔

چونکہ حیا نے سفیر کو پاکستانی موبائل سے کال کی تھی، اس لیے اس نے سب سے پہلے اپنے ٹریسر کا اسٹیٹس چیک کیا۔ وہ واقعی سلطان احمد برج کے قریب میں ہی کہیں تھا۔ دوسرا ٹریسر جواب نہیں دے رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ حیا نے اسے کال کیوں نہیں کی۔ اس نے عثمان شبیر سے مدد مانگی، مگر اس سے کیوں نہیں۔ نہ جہان سے، نہ عبدالرحمٰن سے۔ کیوں؟ ان سے کیوں نہیں؟

لیکن ابھی یہ ثانوی باتیں تھیں۔ اسے جلد از جلد حیا کو ان لوگوں کے شکنجے سے نکالنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کون ہوں گے۔

وہ آرگنائزڈ کریمنلز تھے جو لڑکیوں کو اغوا کرتے تھے، اور استنبول میں ان کے بہت سے گروہ کام کر رہے تھے۔ ترکی اس شے کے لیے خاصا بدنام تھا۔ روس، یوکرائن اور مالدووا کی لڑکیاں نوکری کے لالچ میں ادھر لائی جاتیں اور بیچ دی جاتی تھیں پھر زبردستی ان سے وائٹ سلیوری کرائی جاتی، یعنی کال گرلز بنا دیا جاتا اور ان سے پیسے وصول لے جاتے۔

جتنا وہ سمجھ پایا تھا، وہ کسی شپ پہ تھی۔ وہ لوگ اسے کہیں دور لے جا رہے تھے۔ سلطان احمت برج پہ پہنچ کر اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ایک شپ سامنے ہی تھا۔ اس کا ٹریسر بھی وہیں کا اشارہ دے رہا تھا۔ وہ وہیں تھی۔ جہان پل پہ کھڑا تھا تو وہ چند کوس دور تھی۔ برف کی طرح ٹھنڈی رات میں وہ اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی، بہت دور تھا۔ سلیمان ماموں سے حیا کا خیال رکھنے کا وعدہ بھی نہیں نبھا سکا تھا وہ۔ بے بسی کی انتہا تھی۔

اس نے پھٹتے سر اور تناؤ کا شکار اعصاب کے ساتھ سوچنے کی کوشش کی، اب وہ کیا کرے؟ وہ اکیلا آدمی ان کے کسی شپ پہ حملہ تو نہیں کر سکتا تھا۔ اسے پولیس کی مدد چاہیے تھی۔ اسے فورس چاہیئے تھی۔ ایسے لوگ جو اس کے کہے سے آگے پیچھے نہ ہٹیں، سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اسے صرف حیا کو بچانا ہی نہیں بلکہ میڈیا اور تفتیشی افسران کی نظر سے اس کو دور بھی رکھنا تھا۔

اس کہر آلود، یخ بستہ رات میں وہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنے تمام کانٹیکٹس استعمال کیے۔ بے حد شدید سر درد اور بار بار دھندلی پڑتی بصارت کے ساتھ وہ پل کے اس پار کھڑا تھا۔ ایک خوف جو ہر سو اس کے ساتھ تھا۔ کہیں وہ دیر نہ کر دے، کہیں کچھ برا نہ ہو جائے۔ بہت عرصے بعد اس نے خود کو اتنا بے بس اور مضطرب محسوس کیا تھا۔ وہ عبدالرحمان پاشا تھا، مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ عبدالرحمان پاشا ایک بڑے نام کے سوا کچھ نہ تھا۔

استنبول میں خفیہ پولیس کی ایک برانچ "ٹرسٹ ٹیم" کہلاتی تھی، یہ سادہ کپڑوں میں سڑکوں پہ پٹرول کرنے والے اہلکار تھے۔ بہت قابل تھے اور ان سے اس کی اچھی شناسائی تھی۔ ایک آفیسر کے لیے تو اس نے کئی کام بھی کر کے دیے تھے، صرف اس لیے کہ کل کو وہ اس کے کام کر کے دے گا، اور اب وہ وقت آن پہنچا تھا جب اسے احسان کا بدلہ احسان سے چاہیے تھا۔

ٹرسٹ ٹیم کا وہ یونٹ جلد ہی جگہ پہ پہنچ گیا۔ ایک ایک منٹ قیمتی تھا۔ انہوں نے علاقے کو گھیر کر باری باری، خاموشی سے شپ پہ اترنا شروع کر دیا۔ چند بندے پکڑے، چند کو گرایا، کسی کے سر پہ پستول رکھ کر لڑکیوں کا پوچھا، اور بالآخر ان کو وہ راہداری مل ہی گئی جہاں ایک کمرے میں

لڑکیاں بند تھیں۔

وہ اس کمرے کا دروازہ کھول کر داخل ہونے والوں میں سب سے آگے تھا۔ اندر ایک دم روشنی کی گئی، اندھیرے میں بے ہوش، نیم جان پڑی لڑکیاں، بہت بری حالت میں تھیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور حیا کو ڈھونڈنا چاہا۔ کئی لڑکیوں کے چہرے دائیں بائیں ڈھلکے ہوئے تھے، اس نے ایک ایک چہرے کو موڑ کر دیکھا۔ حیا کہیں بھی نہیں تھی۔

یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

آفیسر اپنی کارروائی کر رہے تھے، وہ کمرے سے باہر بھاگا۔ ایک آفیسر اس کے پیچھے آیا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ اسے اس کی لڑکی ملی یا نہیں۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بس اس نے موبائل سے ٹریسر کا اسٹیٹس چیک کیا۔ وہ آس پاس ہی تھی۔ مگر کدھر؟

شپ کے ایک بندے کو ایک اہلکار نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ وہ ان سے ان کے بڑوں کا پوچھ رہے تھے۔ وہ ہکلاتے ہوئے ایک اندر کی سمت جاتی راہداری کا بتانے لگا۔ جہان نے پوری بات نہیں سنی۔ وہ اس طرف بھاگا۔ ساتھ ہی اس نے حیا کو کال ملائی۔ حیا کا فون رومنگ پہ تھا، اور کال نہیں جا سکتی تھی کہ بیلنس ختم تھا، مگر اس نے سسٹم ہیک کر کے کال ملائی، اور یہ سب تب ہوا جب وہ اور ساتھی افسر دوڑتے قدموں سے اس راہداری میں بھاگتے جا رہے تھے۔

☆　☆　☆

اور تبھی اس نے ایک کمرے کے پیچھے سے حیا کی چیخیں سنیں۔ وہ رک گیا۔ اس آواز کو وہ اچھے سے پہچانتا تھا۔ یہ حیا ہی تھی۔ اس کا دماغ گول گول گھومنے لگا۔ وہ دیوانہ وار چیخ رہی تھی۔ اسے لگا وہ اس کو کھو چکا ہے۔ وہ ناکام ہو چکا ہے۔ وہ اسے محفوظ نہیں رکھ سکا۔ وہ اپنی بیوی کی حفاظت نہیں کر سکا۔

وہاں مزید لوگ بھی آ گئے تھے۔ دو آفیسرز کمرے کے دروازے کی درز سے اندر دھواں پیدا کرنے والے بم چھوڑنے لگے، وہ ہر چیز سے بے نیاز زور زور سے دروازے کو بوٹ سے ٹھوکر مارنے لگا۔ وہ چیخ رہی تھی، کمرے میں یقیناً دھواں بھر رہا ہوگا، اور وہ چیخے جا رہی تھی۔ ایک مردانہ آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

زوردار ٹھوکر کے ساتھ دروازہ کھلا، اور وہ لوگ کسی بہتے سیلاب کی طرح اندر داخل ہوئے، عین اُسی وقت اس آدمی نے اس کی بیوی کو آتش دان پہ پھینکا تھا۔

وہ اس کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ منظر تھا۔ کمرے میں بہت سا دھواں پھیلا تھا۔ وہ برف کی رات نہیں تھی۔ وہ آگ کی رات تھی اور وہ کرسی پہ بندھی، زخمی، دہکائے گئے بازو کے ساتھ، آگ کے قریب اوندھے منہ گری ہوئی تھی۔ اس کے لباس کا دامن جل رہا تھا، مگر باقی اس کا لباس ٹھیک تھا۔

ایک آفیسر تیزی سے اس کے لباس کو بجھانے لگا۔ جہان حیا کی طرف نہیں گیا، وہ تیزی سے اس پست قد روسی کی جانب بڑھا تھا جس نے اس کی بیوی کو تشدد کا نشانہ بنایا تھا اس کی ہمت بھی کیسے ہوئی کہ وہ اس کی بیوی کو ہاتھ بھی لگائے؟

سر درد، بخار، فرسٹریشن اور غصہ، ایک جنون تھا جو اس پہ سوار ہو گیا تھا۔ اس نے اس روسی کو گردن سے پکڑا اور پھر اسے دھکیلتے ہوئے اس کا سر دیوار سے دے مارا۔ روسی نے جواب میں اس کے سینے پہ زور سے لات ماری، وہ لمحے بھر کو سنبھل نہیں پایا، اور پیچھے جا کر لگا۔ سر پہ چوٹ لگی، پہلے سے موجود درد جیسے پھٹنے کے قریب آ گیا۔ مگر اگلے ہی پل وہ دیوانہ وار آگے بڑھا اور روسی کو پھر سے گردن سے دبوچا۔ اسی جنون آمیز انداز میں اب وہ اس کا سر بار بار دیوار سے مار رہا تھا۔ لہولہان ہوئے روسی نے جوابی حملہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ نہیں رکا۔ اگر اس کا دوست آفیسر اس کو نہ پکڑتا تو شاید وہ اس کو جان سے مار چکا ہوتا۔ بمشکل ان لوگوں نے ان دونوں کو چھڑایا۔

اپنے ہونٹ سے رستا خون جیکٹ کی آستین سے صاف کرتے ہوئے وہ خود کو آفیسر کی گرفت سے چھڑاتا ہوا تیزی سے حیا کی جانب بڑھا۔

تب تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ شاید اس نے دھویں سے بھرے کمرے میں بھی اسے دیکھ کر پہچان لیا ہو، گو کہ یہ مشکل تھا، مگر یہ وقت یہ باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔ وہ ابھی صرف اور صرف اس کی خیریت چاہتا تھا۔ وہ زخمی تھی۔ اس کا خون نہیں نکل رہا تھا، مگر اس کو جلایا گیا تھا، داغا گیا تھا، اور اس کے سر پہ گرم مائع گرا تھا۔ اسے جلد از جلد طبی امداد چاہیے تھی۔

اگر وہ عبدالرحمٰن پاشا نہ ہوتا تو وہ سیکورٹی آفیسر کبھی بھی بازیاب ہونے والی لڑکیوں کی تعداد چونتیس سے پینتیس لکھنے پہ اور اسے

خاموشی سے اپنی دوست کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت نہ دیتا۔ ٹرسٹ ٹیم نے اس کے ساتھ تعاون کیا تھا، البتہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کیس کی مزید تفتیش کے لیے اسے بار بار بلایا جائے گا، بھلے اسے سینکڑوں دفعہ بلوالیں مگر حیا کو نہیں۔ وہ اسے ان سب سے دور کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے یہی کر سکتا تھا۔

اس سب کے باوجود وہ جانتا تھا کہ وہ اس پہ کوئی احسان نہیں کر رہا۔ یہ سب اس کی اپنی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ اس نے ہاشم کو گرفتار شدگان میں دیکھا تھا، اور جیسے کسی نے اس کے اوپر دہکتے کوئلے انڈیل دیے تھے۔ ہاشم، جس کو اس نے حیا کا تعاقب کرنے کو کہا تھا۔ وہ ہاشم اس کی بیوی کو بیچ آیا تھا۔ یہ سب اس کا اپنا قصور تھا۔ اس نے غلط آدمی پہ بھروسہ کیا، اس نے اپنی وجہ سے حیا کو اتنا نقصان اٹھانے پہ مجبور کو دیا۔ وہی ذمے دار تھا اس سب کا۔

اپنے آپ کو ملامت کرتا وہ حیا کو وہاں سے لے آیا تھا۔ ایک ہی جگہ تھی جہاں وہ اس کو لے جا سکتا تھا۔ جہانگیر ممی کے پاس بھی نہیں، ممی یا کسی بھی رشتے دار کو کچھ پتا لگے، یہ نہیں ہونا چاہیے تھا، چاہے وہ ممی ہی کیوں نہ ہوں۔ اب ایک ہی جگہ تھی۔

بیوک ادا۔

عائشے گل!

وہ اسے ہسپتال نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ اسے خود ہسپتال لے جائے گا تو صبح تک پورے ادالار کو خبر مل جائے گی۔ اپنے کسی آدمی پہ اسے بھروسہ نہ تھا کہ وہ حیا کو کسی دوسرے کے ساتھ ہسپتال بھیج دے۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ اتنا ہرٹ تھا، اتنا پریشان تھا کہ وہ آخری جگہ جہاں سے بات باہر نہیں نکلے گی اسے ادالار میں اپنا گھر ہی لگی تھی۔

حیا کے زخم ایسے نہ تھے کہ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت پڑتی۔ وہ خود بھی اس کی پٹی کر سکتا تھا، مگر سارا مسئلہ اس کے بالوں کا تھا، اگر وہ خراب ہو گئے تو وہ ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر سکے گا۔ ابھی جلد از جلد اسے اس کے بالوں پر سے وہ ویکس اتارنا تھا، اور اس سلسلے میں عائشے اس کے لیے کچھ کر سکتی تھی۔

عائشے کو یقیناً ان کاموں کا تجربہ نہ ہوگا، وہ کوئی پیرا میڈیکل اسٹاف نہیں تھی، وہ تو چھوٹی سی لڑکی تھی، مگر وہ ایک بات جانتا تھا۔ وہ اس لڑکی پہ بھروسہ کر سکتا تھا۔ آگے عائشے کیسے حیا کے بال ٹھیک کر سکتی تھی، یہ عائشے کا مسئلہ تھا۔ خوف اور اچانک پڑی افتاد انسان کا اصل پوٹینشل اس کے سامنے لاتے ہیں، اور وہ اس طرح کے شدید حالات میں ایسے کام کر جاتا ہے جو عام زندگی میں اسے لگتا ہے کہ اس سے کبھی نہیں ہو پائیں گے۔

اس وقت بھی اسے عائشے سے اسی پوٹینشل کی امید تھی۔ وہ عبدالرحمان کے لیے کچھ نہ کچھ کر لے گی۔

عائشے اور بہارے اس روز اکیلی تھیں۔ آنے کچھ رشتے داروں سے ملنے شہر سے باہر گئی تھیں۔ وہ پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہوا تھا، اور اس بے ہوش، زخمی لڑکی کو اس نے بالائی منزل پہ بنے اپنے پرتعیش سے بیڈروم کے بیڈ پہ لیٹا دیا۔ تب بھی وہ بے ہوش تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کون ادھر تک لایا ہے، اس برف اور آگ کی رات میں!

وہ تیزی سے زینے پھلانگتا نیچے آیا اور عائشے کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دھڑ، دھڑ، دھڑ، اس نے دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔

"کیا ہوا؟ کون؟"

عائشے سر پہ اسکارف لپیٹتی، نیند سے گھبرا کر اٹھی اور باہر نکلی تو اسے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"تم۔ تم انڈیا سے کب آئے؟"

اور تب اسے یاد آیا کہ ادالار والوں کے لیے وہ انڈیا میں ہی تھا۔

"آج ہی آیا تھا۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔ اوپر آؤ۔" جینز اور سوئیٹر، بکھرے بال، رف حلیہ، عینک غائب، یہ وہ عبدالرحمٰن تو نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی۔

مگر جیسے کہ اس نے کہا، وہ دونوں بہنیں اٹھ کر اوپر اس کے ساتھ آئیں۔ سارا معاملہ ان کو سمجھا کر جہان نے جب مدد کے لیے کہا تو عائشے تذبذب سے بیڈ پہ پڑی حیا کو دیکھنے لگی۔

"تم اسے ہسپتال لے جاؤ۔ یہی ٹھیک رہے گا، مجھے تو کچھ نہیں سمجھ آ رہا۔"

"نہیں! کل صبح ہم ڈاکٹر گھر پہ بلا لیں گے، ابھی مجھے صرف اس کے بال بچانے ہیں۔ تم کسی طرح یہ ویکس اتار دو!"

"تمہیں کیوں لگتا ہے، میں یہ کر سکوں گی۔ تم خود ہی تو کہتے ہو عائشے گل کبھی کچھ نہیں کر سکتی۔" اس نے ملال سے کہتے ہوئے بے ہوش پڑی لڑکی کے چہرے کو دیکھا۔ وہ اکثر یہ بات کہہ دیا کرتا تھا تا کہ عائشے سب کچھ کرنا سیکھ جائے۔

"پلیز عائشے! کچھ کرو۔ مجھے کسی پہ اعتبار نہیں ہے اور اگر تم کچھ نہ کر سکتی ہوتیں تو میں فیور لینے تمہارے پاس کیوں آتا۔"

وہ اس کے سامنے کھڑا، بہت ٹوٹے ہوئے لہجے اور ستے چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"اوکے! ہم کوشش کرتے ہیں۔" اس کے انداز میں کچھ تھا کہ عائشے سوئیٹر کی آستین پیچھے چڑھاتی اٹھی اور غنودہ لڑکی کے سرہانے آ بیٹھی۔ بہارے البتہ صوفے پہ بیٹھی، ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے گہری سوچ میں گم تھی۔

"کچھ بھی کرو، مگر مجھے اس کے بال واپس چاہئیں۔" وہ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے پھر سے جیسے منت کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ زمانوں کا کرب و تکلیف رقم تھی۔ "اس کے بال بہت خوب صورت ہیں اور مجھے وہ واپس چاہئیں۔"

"کیا وہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔" بہارے نے بہت سوچ کر سوال کیا، عائشے نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا، مگر وہ جہان کی طرف متوجہ تھی۔

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا۔

"بہت زیادہ"

"اور اگر اس کے بال خراب ہو گئے تو وہ تمہیں اچھی نہیں لگے گی۔"

"بہت ہو گیا، بہارے گل!" عائشے نے سختی سے ٹوکا تو بہارے نے منہ بسور کر سر جھکا۔

"وہ مجھے تب بھی اچھی لگے گی۔" کچھ دیر بعد وہ مضبوط لہجے میں بولا تو بہارے نے ناک سکیڑ کر چہرہ پھیر لیا۔ اسے جیسے یہ بات بالکل بھی پسند نہیں آئی تھی۔

عائشے اب اس کے بالوں کو چھو کر دیکھ رہی تھی۔

"ویکس..... ویکس کھینچ کر اتاری جائے تو بالوں کو نقصان دے گی، لیکن....." اس نے ذہن پہ زور ڈالنا چاہا۔ "لیکن اگر اس کو ہم پگھلا کر اتاریں، تو یہ اتر جائے گی، مگر Scalp کو جو نقصان پہنچا ہوگا، وہ۔"

"تم Scalp کے زخموں کی فکر مت کرو، صرف یہ ویکس اتارو۔"

"ہاں! بعض دفعہ ہاتھ پہ بھی گرم گرم ویکس گر جاتی ہے، اتنا نقصان نہیں ہوتا جو بھی زخم ہیں، وہ بھر جائیں گے مگر اس کو کیسے پگھلائیں؟" وہ بے بسی سے بولی۔ "آخر کونسی چیز ہے جو ویکس گھول سکتی ہے؟" عائشے جمے ہوئے ویکس کو ہاتھ سے چھو کر دیکھتی سوچ میں پڑ گئی۔

"گرم پانی؟" وہ بولا، مگر عائشے نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہم اس کا چہرہ بچائے بنا بال گرم پانی میں نہیں ڈال سکتے۔ ویکس اس کی مانگ پہ گری ہے۔ ہمیں بہت ابلتا ہوا گرم پانی چاہیے ہوگا، مگر اس کے چہرے کو وہ جلا دے گا! صرف بالوں پہ کچھ لگانا ہے!" پھر وہ ایک دم چونکی "شیمپو۔ ہاں شیمپو ہے جو ویکس کو گھول سکتا ہے۔ شیمپو بالوں پہ لگی چیزوں کو گھول سکتا ہے۔ مگر....." وہ جوش سے کہتی رکی۔ جہان اور بہارے منتظر سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"مگر مسئلہ یہ ہے کہ عموماً تمام شیمپوز میں ویکس پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ ہمیں کوئی ایسا شیمپو استعمال کرنا ہوگا۔ جس کے اجزاء میں ویکس نہ شامل ہو۔ ایسا کون سا شیمپو ہے، جس میں ویکس نہیں ہوتی؟"

"سن سلک!" وہ ایک دم سر اٹھا کر بولا۔ "سن سلک میں ویکس نہیں ہوتی۔"

"تمہیں کیسے پتا۔" بہارے نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"جب میں جیل میں تھا تو وہاں ایک دفعہ باتھ روم میں سن سلک کی بوتل قسمت سے مجھے دی گئی تھی، میں نے اس کے سارے اجزاء ترکیبی حفظ کر لیے تھے، مجھے یاد ہے ان میں ویکس نہیں تھی۔"

"تم جیل میں بھی رہ چکے ہو؟" عائشے کو جہاں شاک لگا، وہیں بہارے مارے ایکسائٹمنٹ کے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"واقعی، تم جیل میں بھی رہ چکے ہو۔؟" وہ بے حد متاثر ہو چکی تھی

"ہاں! بس ایک دفعہ غلطی سے۔ بس ایک رات کے لیے۔ جاؤ تم سن سلک لے کر آؤ، میں اسٹڈی میں ہوں، مجھ سے یہ سب نہیں

دیکھا جائے گا۔"

دکھتے سر کے ساتھ وہ ٹھیک سے بات بھی نہیں بتا پا رہا تھا۔ سو اٹھ کر اسٹڈی میں جا بیٹھا اور سگریٹ جلا لی۔ وہ آگ اور برف کی رات تھی۔ یہ خیال ہی کہ حیا کو نقصان پہنچا ہے، اس کے سارے جسم کو برف کی طرح ٹھنڈا اور مردہ کر دیتا تھا۔ اور پھر وہ آگ یاد آ جاتی جو اس لڑکی نے سہی تھی۔ سب اس کا قصور تھا۔ اس آگ اور برف کی رات پہ وہی قصوروار تھا۔ اس کا دل بہت بری طرح سے دکھا ہوا تھا۔

اندر عائشے نے پوری مستعدی سے کام شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ٹشو رول لیا، اور بہت سا ٹشو اچھے سے حیا کے سر پہ اس جگہ لپیٹا جہاں ویکس گری تھی۔ پھر اوپر سے اس نے ہیئر ڈرائیر چلا دیا۔ تیز گرم ہوا ٹشو سے گزر کر بالوں کو چھونے لگی۔

عائشے اسی طرح حیا کے سرہانے کارپٹ پہ گھٹنوں کے بل بیٹھی، ہیئر ڈرائیر پکڑے اس کے بالوں کے قریب آگے پیچھے کر رہی تھی۔

آہستہ آہستہ ٹشو تلے جمی ویکس پگھل کر ٹشو میں جذب ہونے لگی۔ جیسے ہی ٹشو کا وہ ڈھیر گیلا ہو گیا، بہارے نے جلدی سے اسے حیا کے بالوں سے اتارا اور ٹوکری میں پھینکا۔ تب تک عائشے نیا رول کھول کر حیا کے بالوں پہ لپیٹنے لگی تھی۔

یوں تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ٹشو بدل دیتیں۔ بہت سارا ویکس یوں ہی اتر گیا، یہاں تک کہ اب ویکس کی آخری تہہ بالوں پہ جمی رہ گئی جس سے بال نظر آ رہے تھے۔ پتلی مگر سب سے مشکل تہہ۔

اس کے لیے اس نے شیمپو استعمال کیا۔ تولیے کو اس کی گردن پہ آگے پیچھے پھیلا کر (کہ وہ عبدالرحمٰن کا بیڈ تھا اور اس پہ ایک داغ بھی وہ برداشت نہیں کرتا تھا) اس نے سپرے سے حیا کے بالوں کو گیلا کر کے نرمی سے ان پہ شیمپو کا مساج شروع کیا۔

"امی!" درمیان میں ایک دفعہ اس کی آنکھ بھی کھل گئی، شاید پانی اس کی آنکھوں پہ گرا تھا۔ اس نے فوراً بہارے کو آہستہ سے کہا۔

"عبدالرحمٰن کو کہہ کر آؤ کہ وہ جاگ گئی ہے!" عائشے کے ہاتھ ابھی جھاگ سے بھرے، حیا کے بالوں پہ تھے۔ بہارے سر ہلا کر تیزی سے باہر بھاگی۔

وہ اسی طرح اسٹڈی میں بیٹھا، کھڑکی سے باہر تاریک رات کو دیکھتا، سگریٹ پھونک رہا تھا۔ بہارے بھاگ کر اس کے پاس آئی۔

"وہ اٹھ گئی ہے، بس تھوڑی سی، زیادہ نہیں۔ اب کیا کریں؟"

اس کے پکارنے پہ وہ چونکا۔ پھر چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرا دیکھا، پھر فوراً اٹھ کر باہر گیا۔ اس کا رخ ایٹک کی طرف تھا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک Sleep Spray تھا۔

"اس کو اس کے تکیے پہ اسپرے کر دو، وہ پھر سے سو جائے گی!"

اس نے اسپرے بہارے کو دے دیا۔ وہ اسپرے پکڑے سر ہلا کر واپس اندر بھاگ گئی۔

اس کی ہدایت کے مطابق عائشے نے سلیپ اسپرے حیا کے تکیے پہ کر دیا۔ وہ جو ہلکی ہلکی جاگنے لگی تھی، پھر سے غنودگی میں چلی گئی۔

صبح فجر سے قبل اس کے بال، تھوڑے بہت ضیاع کے بعد واپس اپنی حالت پہ آ چکے تھے۔ دوسری طرف وہ بھی واپس اپنی حالت پہ آ چکا تھا۔ البتہ اس نے ایک کام اور کیا تھا کہ جو تصاویر اس کے پاس حیا کی تھیں، وہ اس نے اسٹڈی کے کمپیوٹر سے پرنٹ آؤٹ کر کے اسٹڈی کی دیواروں پہ آویزاں پینٹنگز کے فریم میں اصل پینٹنگ اور شیشے کے درمیان لگا دی تھیں، تا کہ یوں لگے کہ وہ تصاویر ہی فریم کی گئی ہیں۔ جب وہ ادھر رہے گی اور کسی دن وہ اس کمرے میں آ کر یہ دیکھے گی تو جان لے گی کہ وہ برا آدمی نہیں تھا۔ وہ اس کے بہت سے لمحوں میں اس کے ساتھ تھا، اور اس کا خیال رکھا کرتا تھا۔

"صبح تم ڈاکٹر کو لے آنا، باقی سارے کام وہ کر دے گی، مگر ایک بات!"

صبح جب وہ دونوں کمرے سے نکلیں تو وہ اپنے مخصوص حلیے میں، سوٹ میں ملبوس، بال جیل سے پیچھے کیے، عینک لگائے، بریف کیس اٹھائے، واپس جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"کیا؟"

"تم اس کو نہیں بتاؤ گی کہ میں یہاں آیا تھا۔ بہارے اگر تم نے منہ سے ایک لفظ بھی نکالا تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گا۔"

"اوکے! میں کیا کہہ رہی ہوں!" وہ روٹھے پن سے شانے اچکا کر بولی۔

جب بہارے منظر سے ہٹ گئی تو اس نے عائشے کو مخاطب کیا۔

"تم نے مجھے بہت بڑا فیور دیا ہے۔ تم اس کے بدلے مجھ سے کچھ بھی مانگ سکتی ہو۔ میں انکار نہیں کروں گا!" وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ عائشے کھلے دل سے مسکرا دی۔

"میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ زندگی میں دوبارہ کبھی اگر تمہیں کسی بڑے فیور کی ضرورت پڑے تو تم مجھ سے ضرور مانگو۔"

"بالکل۔ میں دوبارہ بھی مانگوں گا۔ وہ کیا ہوگا، میں نہیں جانتا، مگر ضرورت پڑنے پہ میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔ ایک اور بات۔" قدرے رک کر اس نے کچھ بتانا شروع کیا جس کو سن کر عائشے کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"وہ تمہاری بیوی ہے۔ اور وہ تمہیں کسی دوسرے نام سے جانتی ہے۔ پھر تم نے آنے سے کیوں کہا کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" وہ سچ بولنے والی لڑکی ایک دم ششدر رہ گئی تھی۔

"میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کسی امیر آدمی کے لیے اپنے شوہر کو چھوڑ سکتی ہے یا نہیں۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔" وہ اب عائشے کے سوالات سے جان چھڑانا چاہ رہا تھا۔

"اپنوں کو ہر وقت آزماتے نہیں ہیں عبدالرحمٰن"

"جو بھی ہے، تم بہارے کو یہ سب مت بتانا۔ میں نہیں چاہتا کہ حیا کسی اور کے منہ سے میرے بارے میں یہ سب سنے۔ ایسی صورت میں وہ کبھی میرا اعتبار نہیں کرے گی۔ میں اسے خود سب بتا دوں گا، مگر کچھ وقت بعد۔"

"تم بہت جھوٹ بولتے ہو۔" عائشے نے دکھ سے اسے دیکھا۔ اور جواباً اس کے تأثرات پھر سے سپاٹ ہو گئے۔

"پوری رات جس شخص کو عائشے نے دیکھا تھا، وہ چلا گیا تھا، اور پرانا عبدالرحمٰن واپس آ گیا تھا جو اس تھپڑ کی بابت ابھی تک اس سے خفا تھا۔ بس ایک ہی لمحے میں وہ ساری رات کے لیے بنا بکھرا بکھرا سا عبدالرحمان غائب ہو گیا تھا۔

"کوشش کرنا وہ کچھ دن تمہارے پاس ٹھہر جائے۔ میں جا رہا ہوں، فون کرتا رہوں گا۔" سنجیدگی سے کہہ کر وہ پلٹ گیا تھا۔ عائشے ملال سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔ اب اسے وہی کرنا تھا جو وہ کہہ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

چونکہ اسے واپس انڈر گراؤنڈ ہو جانا تھا، اس لیے اگلے ہی روز اس نے عائشے کو کال کر کے بتایا کہ وہ واپس انڈیا جا رہا ہے۔ حسب معمول وہ مان گئی۔ اب وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ جتنے دن حیا اس گھر میں رہے، امت اللہ حبیب واپس آئیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جائے گی کہ وہ عبدالرحمٰن کی اصلیت جان جائے گی۔ وہ اچھی خاصی ذہین لڑکی تھی۔ وہ اس کو انڈر اسٹیمیٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر کسی دوسرے کے منہ سے وہ سنے گی تو وہ اس کا اعتبار کھو دے گا۔ اس لیے بہتر تھا کہ جب تک وہ اپنا پزل باکس نہ کھولے، تب تک وہ عبدالرحمٰن کی حقیقت سے بے خبر رہے۔ اس لیے اس نے آنے کے ذمہ کچھ کام ایسے لگا دیے جوان کو چند دن مزید مصروف رکھیں گے۔ بس یہ چند دن ہی تو رہے گی حیا عائشے کے گھر۔ پھر بھلے آنے واپس آ جائیں، خیر تھی!

تیسرے روز اس نے عائشے کو انڈین نمبر سے کال کی۔ وہ حیا سے بات کرنا چاہتا تھا، وہ اس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اس کے دل کو اس دن سے اب تک قرار نصیب نہیں ہوا تھا۔

مگر وہ اس کی بات سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اگر وہ اسی میں خوش تھی تو ٹھیک ہے۔ اس نے کہلوا دیا کہ وہ ادالار نہیں آئے گا، وہ آرام سے ادھر رہے۔ اگر یہی حیا کے سکون کا باعث تھا تو وہ ایسے ہی کرے گا۔

مگر ان دنوں بار بار اس رات کے مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آتے اور اس کو تکلیف دیتے تھے۔ حیا کے بازو پہ داغا، WHO اور ساتھ میں آخری سلاخ کے دو حروف RE جو جلد ہی سلاخ ہٹا لینے کے باعث ٹھیک سے داغے نہ جا سکے تھے، اور آبلے سے بن گئے تھے، وہ منظر بہت اذیت رساں تھا۔ اگر وہ دو لفظ ٹھیک سے داغ دیے جاتے، تو؟ وہ کتنا عرصہ اسے اذیت دیتے، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے، سرجری سے وہ مٹ جاتے، مگر جب تک نہ مٹتے، تب تک تو وہ اسے اذیت دیتے نا! کاش وہ ذرا پہلے پہنچ گیا ہوتا۔ کاش وہ اس کو جلنے کی تکلیف سے بچا پاتا۔ کاش!

ممی البتہ ذرا پریشان تھیں کہ حیا کہنے کے باوجود کیوں نہیں آئی۔ اس صبح جب وہ گھر پہنچا تو ممی نہیں تھیں انہوں نے رات کو اسے جاتے نہیں دیکھا تھا سو ان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ رات کہاں رہا تھا۔ دوپہر میں دونوں کی ملاقات ہوئی تو ممی نے بتایا کہ وہ حیا کے ہاسٹل گئی تھیں، اور

ایک اسٹوڈنٹ نے بتایا کہ شاید اسے اپنی میزبان فیملی کی طرف رکنا تھا۔ اس کے دونوں نمبرز بند آ رہے تھے، یہی بات ممی کو پریشان کر رہی تھی۔ اس نے ممی کو کچھ نہیں بتایا، اس کو راز رکھنے آتے تھے، بس اس نے تسلی دی کہ فون خراب ہوگا۔ وہ فکر نہ کریں۔ البتہ عائشے کو اس نے فون پہ تاکید کی کہ وہ حیا سے کہے، وہ اپنے گھر فون کر لے۔ اگلے روز اس نے واقعی فون کر لیا، اب سرکاری طور پر جہان سکندر کے ہاں اس کا نمبر آ گیا تھا، مگر وہ اس کو وہاں فون کرے، یہ مناسب نہیں تھا۔ اس نے ہوٹل گرینڈ میں ایک بندے سے کہلوا کر حیا کے لیے نیا موبائل اور سم بھی دلوا دی تھی، اور ظاہر ہے، یہ نمبر بھی اس کے پاس تھا، لیکن اگر جہان اسے فون کرے تو اس کو نمبر کہاں سے ملا جیسے سوال کی کوئی لاجیکل وضاحت نہ بنتی تھی۔ عبدالرحمٰن سے بات وہ کرنا نہیں چاہتی تھی، جہان اسے کال کر نہیں سکتا تھا، پھر۔ وہ کیسے اس کی آواز سنے۔ کیسے اس سے بات کرے۔

میجر احمد...... ہاں، میجر احمد بھی تو ہے، وہ اسے کال کر سکتا تھا کیونکہ میجر احمد عموماً ہر بات جانتا ہوتا تھا۔ شاید تب وہ اس کی آواز سن سکے۔

اور یہ کوشش کامیاب رہی۔ کتنے دنوں بعد اس نے حیا کی آواز سنی تھی۔ وہ حسب معمول میجر احمد سے بے زار تھی، مگر یہ طے تھا کہ وہ اس پہ اعتبار کرتی تھی تب ہی وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ بلیک میلرز کو کیسے قابو کیا جاتا ہے، اسے کون بلیک میل کر رہا تھا؟۔ اس کا دھیان ہاشم کی طرف گیا، خیر اگر وہ عبدالرحمٰن پاشا تھا تو وہ ہاشم کو کئی سال تک جیل سے باہر آنے نہیں دے گا۔ پھر اس نے اندھیرے میں تیر چلا کر اسے بتایا کہ وہ پرانا باکس کھول چکی ہے۔ تب وہ ہنس دیا۔ اس کا لاکر ابھی تک خالی تھا، جب اس نے ویڈیو رکھی ہی نہیں تو کیسا انکشاف۔ وہ تلملا کر فون رکھنا چاہتی تھی، مگر وہ اس کو مزید سننا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سو گئی مگر وہ اس کی خاموشی سنتا رہا۔ اس وقت وہ اپنے ریسٹورنٹ کے کاؤنٹر پر بیٹھا رپینشمنٹ کے فرض سرانجام دے رہا تھا۔ وہ اپنے کام نپٹا رہا، اور دوسری جانب اسے حیا کے سانس لینے کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ابھی آدھا گھنٹہ گزرا تھا کہ اسے لگا اس کے نتھنے گیلے ہو رہے ہیں۔ تکلیف کی ہلکی سی لہر اٹھی، اور سر کا درد ہر چیز پہ چھانے لگا۔

اس نے ہاتھ سے ناک کو چھو کر دیکھا۔ خون۔ پہلی دفعہ سر درد سے اس کی نکسیر پھوٹی تھی، باتھ روم میں جا کر بیسن کے سامنے ناک اور سر کو دھوتے ہوئے بھی اس نے فون کا اسپیکر آن رکھا۔ وہ سو رہی تھی، اور وہ بیسن پہ نڈھال سا جھکا، گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ تین گھنٹے اور بیس منٹ کے بعد کال خود بخود کٹ گئی۔ چونکہ وہ انٹرنیٹ سے کنکیٹ کر کے کال کر رہا تھا، اس لیے وہ گھنٹے بعد کٹنے کی بجائے کافی دیر سے کٹی۔ موبائل بند کرتے ہوئے بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنا چیک اپ کروا لینا چاہیے۔ کہیں نہ کہیں کچھ غلط تھا۔

اگلی صبح حیا نے اسے نمبر بھیج دیا۔ اس نے نمبر ملتے ہی اسے فون کیا۔ کرنے کی بات کوئی نہیں تھی، بس وہ اس سے بات کرتے رہنا چاہتا تھا۔ اگلے روز وہ صرف اس سے ملنے ادالار آیا۔ اس نے عائشے سے کہہ دیا تھا کہ وہ جب پورٹ پہ آئے تو بہارے کو ساتھ نہ لائے۔ عائشے ظاہر نہیں کرے گی، مگر بہارے چھوٹی بچی ہی تو تھی۔ سو عائشے نے ایسا ہی کیا۔

کھلی فضا میں کرسیوں پہ بیٹھے، ناشتہ کرتے، اس نے چند ایک بار کریدنے کی کوشش کی، مگر حیا نے نہیں بتایا کہ عائشے بہارے سے اس کی دوستی کیسے ہوئی، اور نہ ہی یہ کہ اس کے زخم کیسے آئے۔ وہ ابھی اس پہ اعتبار نہیں کرتی تھی۔ البتہ وہ دوبارہ سے اس کے فون کے بارے میں پوچھنے لگی تھی۔ گو کہ اس نے اسے دو ایک بار ہنٹ دیا تھا کہ وہ اسپیشل گفٹ تھا، اور اسپیشل سے مراد ''اسپیشل سروسز'' ہی تھیں، مگر وہ ابھی تک بوجھ نہیں پائی تھی۔ خود سے یونہی وہ نہیں بتائے گا۔ وہ پہلے خود بوجھے گی، تب ہی وہ اسے ڈھونڈ پائے گی۔ البتہ تب وہ ذرا سا سنبھلا جب حیا نے کہا کہ اس کا چہرہ اپنے باس کے ذکر پہ چمکنے لگتا ہے۔ یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اپنا ملک، اپنی جاب، سب بہت یاد آتا تھا۔ مگر کیا اس کی صحت اسے مزید نوکری کرنے کی اجازت دے گی۔ یہیں وہ الجھ جاتا تھا۔

وہیں اس کے ساتھ بیٹھے، اس کو ممی اور عائشے دونوں کے ٹیکسٹ موصول ہوئے تھے۔ صرف ممی کے میسج کا اس نے حیا کو بتایا، اور عائشے کا پیغام پڑھ کر وہ صرف مسکرا دیا۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا۔ اتنے سارے لوگوں سے ایک وقت میں اتنے سارے جھوٹ بولتے تمہیں بالکل افسوس نہیں ہوتا۔ اب تو مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تم کبھی انڈیا گئے ہی نہیں تھے۔ تم استنبول میں ہی تھے۔''

''یہ لڑکی بھی نا۔'' اس نے مسکرا کر سر جھٹکتے ''شکریہ'' لکھ کر جوابی پیغام بھیج دیا۔

اس روز ساحل سمندر پہ چلتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے روحیل کا ذکر نکل آیا تھا۔ روحیل سے تین، ساڑھے تین برس قبل اس وقت ملا تھا جب وہ ایک چھوٹے سے کام کے سلسلے میں وہاں ایک تعلیمی ادارے میں گیا تھا۔ تب ایک طالب علم نے اندھا دھند فائرنگ

شروع کردی تھی، اور ایک گولی اس کو بھی لگ گئی تھی۔ چونکہ وہ الیگل کام کے سلسلے میں وہاں تھا، سو وہ جلد از جلد موقع سے فرار ہو گیا۔ خراب ہوتے زخم کے باعث اس کو کسی قابل اعتماد شخص کے پاس پناہ لینی تھی، اور چونکہ امریکہ آنے سے قبل وہ وہاں موجود ہر رشتے دار کا پتا کھوج کر لایا تھا، اس لیے وہ روحیل کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ بات اس نے روحیل کو صیغہ راز میں رکھنے کو کہی تھی، اور جواب میں وہ یہ بات راز رکھے گا کہ وہ لڑکی روحیل کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس ڈیل کے بارے میں وہ حیا کو تو نہیں بتا سکتا تھا سو بات ٹال گیا۔ اب وہ پوچھتی رہے اپنے بھائی سے۔ اسے کیا؟

ساحل پہ حیا نے سیپ چننے کی بات کی تھی۔ اس بات نے اسے اطمینان دلایا کہ اب وہ، وہ کام کر سکتا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ عائشے بہارے کے ساتھ سیپ چننے کی عادی ہو گئی تھی۔ عائشے کے اکثر سیپ موتی سے بھرے نکلتے تھے جبکہ بہارے کے اکثر خالی۔ جب جہان نے عائشے کی سالگرہ پہ پچھلے برس ایک قیمتی انگوٹھی بطور تحفہ دی تو دو ماہ بعد جب ”عبدالرحمٰن پاشا“ کے پاسپورٹ کے مطابق اس کی سالگرہ آئی تو عائشے نے اسے اپنے ایک سیپ سے اکٹھے نکلے تین موتی دیے تھے۔ وہ موتی ایک ایک ننھی سی قدرتی خراش لیے ہوئے تھے۔ یعنی کہ ان کو پہچاننا آسان تھا۔ اس نے عائشے کو گو کہ اس لڑائی کے بعد بتا دیا تھا کہ وہ جلد یا بدیر ان کو چھوڑ دے گا، مگر اب جب تک وہ یہاں ہے، اس کو خود کو ان دو معصوم لڑکیوں سے دور رکھنا چاہیے۔ اس طرح کی جذباتی وابستگیاں مستقبل میں ان دونوں کا دل بہت بری طرح سے توڑ سکتی تھیں۔ چھوٹا زخم، بڑے زخم سے، بہر حال بہتر ہوتا ہے۔ اس نے سوچا وہ عائشے کو چھوٹا زخم دے دے، تاکہ وہ مستقبل میں کبھی اس سے کوئی امید نہ رکھے۔

وہ تین موتی آج وہ اپنے ساتھ لایا تھا، البتہ اس نے کسی اور طرح سے ان کو حیا کو دینے کا سوچا تھا، مگر جب وہ سیپ کھولنے کے لیے چھری لینے دور بیٹھے ان ٹورسٹس کے پاس گئی تو جہان نے رخ موڑ کر، اپنی جراب کے ساتھ بندھا چاقو نکالا، اپنے سیپ کو آدھا کاٹا، اور تینوں موتی اندر کچھ اس طرح سے ڈالے کہ جب وہ حیا کے سامنے سیپ کاٹے گا تو وہ یہی سمجھے گی کہ موتی اندر قدرتی طور پر موجود تھے۔ اگر وہ یہ کام عائشے کے ساتھ کرتا تو وہ بھانپ لیتی، اس کو سیپوں کا تجربہ تھا، مگر حیا نہیں جان سکتی تھی۔ اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مواقع کا انتظار کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ وہ موقع خود پیدا کرنے پہ یقین رکھتا تھا۔

حیا اس کے نکلتے تین موتی دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔ اور متاثر بھی۔ وہ خاموش مسکراہٹ کے ساتھ اپنے لیے خاموش ستائش وصولتا گیا۔ کوئی اگر اس سے متاثر ہو رہا تھا تو اس کا کیا جاتا تھا بھلا؟؟؟

...... یہ چند روز بعد کی بات ہے، ایک روز ایک بہت ضروری کام آن پڑا۔ اسے اچانک سے کچھ بہت اہم پیپرز کی ضرورت پڑ گئی جو ادالار میں اس کے کمرے میں رکھے تھے۔ اس نے عائشے کو صبح میں فون کر کے پوچھا، مگر وہ مدد کرنے سے قاصر تھی۔

”تمہارا بریف کیس تمہاری الماری میں ہوگا، اور وہ لاک ہوتی ہے۔ چابی بھجوا دو تو میں نکال سکتی ہوں“ اس کا انداز سپاٹ تھا۔

”تم رہنے دو میں خود کچھ کرلوں گا۔“ عائشے کے لہجے کی خفگی وہ سمجھتا تھا۔ وہ یقیناً حیا کے پاس ان تین موتیوں کو دیکھ کر بہت ہرٹ ہوئی ہوگی۔ مگر ان دونوں کے لیے یہی بہتر تھا۔ جو بھی تھا، وہ سمجھدار لڑکی تھی، اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

ویسے بھی دلوں کا سکون محبت پا لینے میں نہیں، اللہ کے ذکر میں ہوتا ہے، اور وہ جانتا تھا کہ عائشے کو دل کا سکون ہمیشہ نصیب رہے گا۔

اسی شام عائشے اور بہارے کو ایک جاننے والوں کے گھر فونگی میں جانا پڑ گیا۔ سو شام میں جب وہ ادالار آیا تو وہ دونوں گھر نہیں تھیں۔

جہان گھر کے عقبی دروازے کو کھول کر ایک الگ تھلگ بنے زینے سے اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے کی ایک چابی عائشے کے پاس اور دوسری اس کے پاس ہوتی تھی۔

اندر آ کر اس نے کمرہ لاک کر دیا، پھر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ الماری سے اپنا بریف کیس نکال کر بیڈ پہ رکھا اور اسے کھول کر مطلوبہ فائلز دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا حیا نیچے ہی تھی، مگر وہ بھلا اوپر کیوں آئے گی۔ اتنا بڑا گھر اس کے لیے کافی تھا۔ اسے پتا ہی نہیں لگے گا کہ وہ اس وقت اوپر ہی موجود ہے۔

یہی سوچ کر اس نے نوٹ پیڈ اٹھایا، اور فائل میں سے کچھ نام دیکھ کر اس پہ لکھنے لگا۔ پہلے ہی لفظ پر پین کی روشنائی ختم ہو گئی۔ کیا مصیبت ہے۔ اس نے پین کو ذرا زور سے جھٹکا تو بریف کیس اور فائلز پہ سیاہی کے موٹے موٹے قطرے گر گئے۔ اس نے تاسف سے سر جھٹکتے ہوئے لکھنا شروع کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو قلم سے لکھ کر لائحہ عمل ترتیب دینے پر یقین رکھتے تھے۔ لکھے بغیر اسے اپنی سوچی گئی بات بھی بعض اوقات سمجھ نہیں آتی تھی۔

ابھی فہرست درمیان میں تھی کہ سیاہی پھر سے سوکھنے لگی۔ اس نے دوبارہ قلم جھٹکا، موٹی موٹی بوندیں پھر سے بریف کیس پہ گریں۔

اس سے قبل کہ وہ عبدالرحمٰن پاشا کی نفاست پسندی کے قتل پہ افسوس کرتا، کمرے کے دروازے کے لاک میں چابی گھمائے جانے کی آواز آئی۔
لمحے بھر کو تو وہ واقعی سکتے میں رہ گیا۔ عائشے بہارے واپس آ گئیں یا وہ حیا تھی؟
وہ جو بھی تھی، ایک ایک کر کے چابیاں لگا رہی تھی۔ وہ عائشے نہیں ہو سکتی تھی، عائشے کو پتا تھا کہ دروازہ کون سی چابی سے کھلتا ہے۔ اللہ، اللہ!
دوسری چابی تک اس نے آناً فاناً بریف کیس بند کیا، اور الماری میں ڈالا تیسری چابی تک وہ باتھ روم میں جا کر دروازے کے پیچھے کھڑا ہو چکا تھا۔ چوتھی چابی پہ دروازہ کھل گیا۔
وہ حیا ہی تھی، اور وہ اندر کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے باتھ روم کے دروازے کی درز سے دیکھا، وہ اب الماریاں کھول رہی تھی۔ جلدی میں وہ نہ بریف کیس بند کر سکا تھا نہ ہی آخری الماری، سو حیا سے بالآخر آخری الماری کھل گئی تھی، اور اب وہ اس کا بریف کیس نکال کر بیڈ پہ لے آئی جہاں چند لمحے قبل وہ بیٹھا تھا۔ اصولاً اس جگہ کو گرم ہونا چاہئے تھا، بلکہ چادر پہ شکنیں بھی پڑی تھیں، مگر وہ بریف کیس کی جانب اتنی متوجہ تھی سو محسوس نہ کر سکی۔
احمق لڑکی!
اندر تو اس کے ڈاکومنٹس تھے، برگر کنگ کی فائلز بھی تھیں۔ وہ ایسے پکڑے نہیں جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ ایسے پکڑا گیا تو وہ کبھی اس کا یقین نہیں کرے گی۔ اور..... اوہ نہیں..... اس کا Pager بھی اندر تھا۔ وہ اس کا پیجر ہی نہ کھول لے۔ اسے شدید غصہ آیا۔ خود پر بھی اور حیا پہ بھی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اسے کیسے وہاں سے نکالنا ہے۔ اس نے اپنے موبائل سے پیجر کو بیپ دی۔ نتیجتاً پیجر بجنے لگا۔ حسب توقع حیا نے گھبرا کر بریف کیس بند کیا، اور الماری میں ڈالا۔ وہ واقعی گھبرا گئی تھی سو چند لمحوں بعد وہ کمرے سے باہر تھی۔
دروازہ دوبارہ اندر سے لاک کرتے ہوئے اس نے دوسرے نمبر سے اسے گھر پہ فون کیا پانچویں گھنٹی پہ حیا نے بھاگ کر فون اٹھایا۔
"اگر آئندہ آپ نے میرے کمرے کی تلاشی لی تو اپنے پیروں پہ گھر نہیں جائیں گی!"
بہت غصے سے اس کو کھری کھری سناتے ہوئے وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اب اس لڑکی کو اس کے گھر سے چلے جانا چاہیئے۔ حیا وہاں رہ کر صحت یاب ہو، وہ یہ چاہتا تھا، مگر وہ اس کی جاسوسی کرے، یہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔
پھر رات میں یہی بات اس نے عائشے سے کہی کہ اب حیا کو وہاں سے چلے جانا چاہیئے۔
"ابھی اس کی اسپرنگ بریک بھی ختم نہیں ہوئی، دو چار دن تو وہ اور بھی ٹھہر سکتی ہے، اس سے زیادہ وہ نہیں رکے گی، اور میں اپنی مہمان کو خود سے جانے کے لیے نہیں کہوں گی۔"
مگر یہ دو چار دن بھی جہان کے لیے کسی سزا سے کم نہیں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ حیا صرف ادالار میں دو وجوہات کی بنا پہ رکی ہوئی ہے۔ ایک یہ کہ استنبول میں وہ زخموں والا چہرہ لے کر نہیں جانا چاہتی، اور دوسرا تجسس۔ وہ اس شخص کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتی تھی جو کافی عرصہ اسے ڈسٹرب کرتا رہا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے اس نے حیا کو بہت تنگ کیا تھا مگر اب تو وہ بے چارہ باز آ چکا تھا۔ مگر حیا باز نہیں آئی تھی۔
دو روز قبل کی ڈانٹ بھلا کر اس دن حیا نے خود اس کو کال کر کے اس سے بات کی تھی۔ اسے بہارے کے لیے اس جیولری شاپ کا پتا چاہیئے تھا۔ جواباً اس نے پتا دینے کی بجائے وہ چیز بھجوا دی۔ کون سا اس کا اپنا پیسہ تھا۔ سب انہی لڑکیوں، آنے اور پاشا بے کا ہی تو تھا، سو اس نے وہی کیا جو ٹھیک تھا۔
زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک روز بیوک ادا فون کرنے پہ اسے حیا کا "ہیلو" سنائی دیا۔ اس نے جلدی سے بنا کچھ بولے پہلے وائس کنورٹر آن کیا، اور پھر بات کرنے لگا۔ مگر جو بات حیا نے آگے سے کہی، وہ اسے غصہ دلانے کے لیے کافی تھی۔
بالآخر وہ جان ہی گئی تھی کہ عبدالرحمٰن پاشا کا ایک دوسرا بھائی بھی تھا۔ وہ پاشا بے کا نام نہیں لے رہی تھی، مگر نام بھی وہ جانتی ہی ہو گی یقیناً۔ ساتھ میں وہ اخبار میں اس کے متعلق آرٹیکل لکھنے کی بات بھی کر رہی تھی۔ اس سے آگے جہان کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ یہی ڈر تھا اسے، وہ دو زندگیاں مینیج نہیں کر پائے گا۔ اور اب وہی ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ حیا بیوک ادا میں رہے، اسے گوارا نہیں تھا۔ دو روز بعد یوں بھی اسے اپنے عبدالرحمٰن پاشا کے کور کو ایکٹیویٹ کرتا یعنی بیوک ادا واپس جا کر وہاں کچھ دن رہنا تھا، سو اب ان دونوں کو وہاں نہیں اکٹھا ہونا چاہیئے۔ حیا کو اس نے پرسوں کا کہا، مگر خود اگلی ہی صبح وہ بیوک ادا آ گیا۔ آتے وقت اس نے حیا کو میسج کر دیا تھا۔ اس کا ارادہ آج ایک مقامی "دوست" سے ملنے کا تھا۔ آر وی (وہ مقام جہاں دو جاسوس ملتے ہیں) اس کی اپنی طے کردہ تھی، اور وہ عیسیٰ کی پہاڑی تھی۔ وہاں اسے اپنے ساتھی کو چند چیزیں پہنچانی

تھیں۔ اس کے بعد وہ دوپہر میں حیا سے ملے گا، اور اسے واپس چلنے پہ راضی کرے گا۔ ویسے بھی سلیمان ماموں نے دو دن بعد استنبول آنا تھا۔ اچھا بہانہ تھا۔ اب وہ واپس آ جائے گی، اور وہ آرام سے بیوک ادا میں کام کر سکے گا۔ ویسے بھی حالات جیسے جا رہے تھے، یوں لگتا تھا ترکی میں اس کا قیام جلد ختم ہونے والا ہے۔ ایسے میں اسے اپنی فکر نہیں تھی۔ ممی، ابا اور حیا کی فکر تھی۔ وہ تینوں اس کی فیملی تھے۔ ممی کو ان تین برسوں میں وہ استنبول چھوڑنے پر راضی نہیں کر سکا تھا۔

پاکستان وہ جا نہیں سکتے تھے، اس نے بہت کوشش کی کہ وہ جرمنی ابا کو لے کر چلی جائیں، مگر پہلے وہ نہیں مانی تھیں۔ البتہ اب اس کے یہاں کام کرنے کے بعد کسی بھی طرح سے یہ خطرے والی بات تھی کہ اس کے ماں باپ یہاں ہیں۔ بالآخر ممی راضی ہو گئی تھیں کہ وہ ابا کے ساتھ جرمنی چلی جائیں گی، مگر جب تک جہان ادھر ہے، وہ یہیں رہیں گی۔

وہ پندرہ جون تک ادھر ہی تھا۔ پندرہ جون کو ایک اہم کنسائنمنٹ کے لیے اسے انقرہ جانا تھا، اور کام کچھ اس قسم کا leak out تھا کہ اس کے بعد پہلا شک اسی پہ جائے گا۔ اس لیے اسے کچھ عرصے کے لیے روپوش ہو جانا تھا۔ اس نے یہاں اتنے دشمن بنا لیے تھے کہ اس کے روپوش ہو جانے کے بعد کہیں کوئی اس کے قریبی عزیزوں کو نقصان نہ پہنچائے، اس لیے بہتر تھا کہ جانے سے قبل وہ اپنے گھر والوں کو محفوظ مقام پر منتقل کر دے۔ ممی، ابا اور حیا اس کی پہلی ترجیح تھے۔ پاشا بے کی فیملی دوسرے نمبر پہ تھی۔ سب کو وہ یہاں سے بھیج دے گا، مگر حیا کا سمسٹر پانچ جولائی کو ختم ہونا تھا۔ اسے وہ پندرہ جون سے پہلے پہلے کیسے بھیجے گا۔

اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے، کام شروع کرنے سے قبل وہ اس الجھن میں گرفتار تھا۔ مسائل کا حل وہ عموماً نکال ہی لیا کرتا تھا مگر یہاں وہ قدرے مخمصے میں تھا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے ساتھ میں کافی بھی منگوائی تھی، اور جب تک دیمت کافی لے کر نہیں آئی، وہ یہی سوچتا رہا کہ حیا کو یہاں سے کیسے بھیجے۔ ایک حل تھا بالواسطہ۔ یعنی جہان اسے کہے کہ وہ واپس چلی جائے، اور دوسرا تھا بلاواسطہ، یعنی میجر احمد یا عبدالرحمٰن پاشا میں سے کوئی کہے...... مگر وہ کسی کی کیوں مانے گی۔

جب اس کی سیکریٹری دیمت فردوس کافی لے کر آئی تو کچھ سوچ کر اس نے یہ بات دیمت سے پوچھ لی۔

"کسی غیر ملکی کو ترکی سے واپس بھیجنا ہو تو کیا کیا جائے۔"

دیمت ایک ایماندار اور مستعد سی ورکر تھی۔ وہ اس کو اپنے باس کی حیثیت سے پسند کرتی تھی مگر کبھی کبھی باتوں کے دوران وہ پاشا بے کا ذکر کر دیا کرتی۔ "آپ کے چھوٹے بھائی بھی بہت اچھے تھے۔" یہ فقرہ وہ اکثر دیمت سے سنا کرتا تھا۔ طیب حبیب شناختی کارڈ کے اعتبار سے اس سے دو سال چھوٹا دیکھنے میں کئی سال بڑا، اور درحقیقت ہم عمر ہی تھا۔ دیمت پاشا بے کی طبیعت کی بے تکلفی پسند تھی، کیوں نہ وہ خود چاہے عبدالرحمٰن ہو یا جہان ہو، اس کی طبیعت اور مزاج ایک سے ہی رہتے تھے۔ وہ عبدالرحمٰن پاشا کے روپ میں بھی اتنا ہی سنجیدہ مزاج، خاموش طبع اور قدرے تلخ تھا جتنا وہ فطری طور پہ تھا۔ دیمت اس کو پسند کرتی تھی مگر چونکہ پاشا بے کے برعکس جہان نے ہوٹل گرینڈ کو غیر قانونی سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، اس لیے دیمت اس قسم کے لوگوں کی ہوٹل آمد پہ ذرا الجھی الجھی رہتی تھی۔ خیر، اس کی ساری دکھتی رگیں وہ جانتا تھا، اسے معلوم تھا کب کس کو کہاں سے دبانا ہے۔

دیمت کے پاس اس مسئلے کا سادہ سا حل تھا جو معلوم نہیں اس کے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس لڑکی، جسے ترکی سے بھیجنا ہے، کی واحد کشش اگر یہاں اس کا شوہر ہے تو اسے شوہر سے بدگمان کر دیا جائے، اس کا شوہر کسی سے بھی اپنے کسی مشتبہ عمل کا ذکر کر سکتا تھا، اور اس لڑکی کو Setup کر کے وہ گفتگو بظاہر اتفاقیہ طور پر یہ سنوائی جائے تو وہ فوراً اپنے شوہر سے دور جانے کی کوشش کرے گی۔

دیمت شاید ساری بات کسی اور نقطہ نظر سے کہہ رہی تھی۔ مگر اس کا ذہن ایک ہی بات پہ اٹک کر رہ گیا تھا۔ معصوم سا اتفاق۔ درست ٹائمنگ، ہاں، وہ حیا کو جانتا تھا۔ وہ ایک دم سے ردعمل دے دینے والی، ایک دم سے بڑے فیصلے لے لینے والی لڑکی تھی۔ جس چیز سے وہ بچتا رہا تھا، کہ کہیں وہ پکڑا نہ جائے، اگر وہ چیز ہو بھی جائے، اور وہ از خود جان جائے کہ جہان ہی عبدالرحمٰن ہے، تو وہ وقتی طور پر بے شک اس کا اعتبار کھو دے گا لیکن بعد میں جب وہ ساری حقیقت جان لے گی تو وہ بدگمانی دور ہو جائے گی۔ پندرہ جون سے چند دن قبل ہی اس کے امتحان ختم ہونے تھے، اگر وہ یہ سب اس کے امتحان ختم ہونے کے فوراً بعد پلان کرے، تو وہ اپنا آخری مہینہ کسی دوسرے ملک میں گزارنا پسند کرے گی، نہ کہ ترکی میں ایک دو چہروں والے انسان کے ساتھ۔ وہ فوراً اس سے دور جانے کا سوچے گی۔ وہ ہمیشہ یہی کرتی تھی۔ جب وہ ایک دفعہ استقلال اسٹریٹ میں ریسٹورنٹ میں ڈنر کے لیے گئے تھے، وہ ڈرج جنجر بریڈ ہاؤس توڑنے کی معذرت کے طور پہ تھا، تب بھی غصے میں وہ فوراً اس کے پاس سے چلی گئی تھی۔ وہ غصے

میں ہمیشہ یہی کرتی تھی۔ وہ اب بھی یہی کرے گی۔ بھلے وہ بُرا بن جائے، مگر اسے اپنی بیوی کا تحفظ اپنی ذات سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ ترکی میں اسے اکیلے چھوڑ کر کبھی نہیں جاسکتا تھا۔ جانے سے قبل اس کو یہ مسئلہ نبٹانا تھا۔

دیمت کو اپنے انداز میں متنبہ کر دینے کے بعد وہ کچھ دیر سوچتا رہا کہ بیٹ اپ کس کے ساتھ ترتیب دیا جانا چاہیے۔ وہ کون ہوگا جس کو اس کے ساتھ دیکھ کر وہ اس سے دور جانے کا سوچے گی۔ طیب حبیب پاشا، وہ بہت متجسس تھی نا عبدالرحمٰن کے گمشدہ بھائی کے بارے میں تو چلو اس طرح وہ اس کا تجسس دور کردے گا۔ پاشا بے سے اسے ملنا ہی تھا، باقیوں کی طرح اس کے لیے بھی وہ انڈیا میں تھا، اور چونکہ پاشا بے اس سے ناراض بھی بہت تھا، اس لیے پہلے جہان کو اپنے اور اس کے تعلقات درست کرنے تھے۔ وہ اس سے بہت خفا سہی، مگر وہ اس کو "نہ" نہیں کر سکتا تھا۔ لالچی انسان کبھی اپنے عبدالرحمٰن پاشا جیسے بھائی کو نہ نہیں کیا کرتا۔

طیب حبیب پاشا کے لیے استنبول میں دو ہی جگہیں محفوظ تھیں جہاں وہ عبدالرحمٰن سے مل سکتا تھا۔ ایک برگر کنگ، اور دوسرا ہوٹل گرینڈ، وہ جانتا تھا کہ طیب حبیب استنبول میں ہی ہے، اور چونکہ وہ خود بیوک ادا آچکا تھا، اس لیے اس نے مناسب انداز سے اسے پیغام لکھا۔ آیا کہ وہ طیب ہوٹل گرینڈ آئے گا، یا وہ خود برگر کنگ آجائے۔

اسے معلوم تھا کہ طیب حبیب انکار نہیں کرے گا، اور اس نے انکار نہیں کیا۔ اسے عبدالرحمٰن کی ضرورت تھی۔ اس نے برگر کنگ پہ چند روز بعد ملنے کی حامی بھرلی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ابھی استنبول سے باہر ہے، واپس آتے ہی اس سے ملے گا۔ اب نہ معلوم یہ سچ تھا یا نہیں، بہر حال اسے اب طیب حبیب کا انتظار کرنا تھا۔

کافی پی کر اس نے ایک میٹنگ بلائی تھی۔ ابھی اس سے فارغ ہوا ہی تھا کہ حیا کا فون آنے لگا۔ پتا نہیں یہ کیسا رشتہ تھا جس کا وہ اس سے ذکر نہیں کرتا تھا مگر اس کا فون کاٹ بھی نہ سکا۔ میٹنگ اس وقت برخاست ہو رہی تھی، سب اٹھ رہے تھے، کانفرنس روم میں شور سا مچا تھا جب اس نے حیا کی کال وصول کی۔ حیا کو اس نے سچ ہی بتایا کہ وہ دوست سے ملنے آیا تھا۔ عجلت میں بات ختم کرتے ہوئے اس نے فون کان سے ہٹایا اور بورڈ ممبران سے اختتامی الفاظ با آواز بلند کہتے ہوئے کھڑا ہوگیا۔ اپنی چیزیں اٹھاتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ فون ابھی تک آن تھا۔ اس نے جلدی سے کال کاٹی، وہ ترک میں بات کر رہا تھا، حیا نے کچھ بھی نہیں سنا ہوگا یقیناً سو اسے پریشانی نہیں ہوئی۔

واپس اپنے آفس میں آکر بیٹھے اسے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی جب اس کے موبائل پہ ٹریسر الرٹ بجنے لگا۔ وہ چونک سا گیا۔ اس کا ٹریسر اسی علاقے کے قریب تھا۔ کیا حیا آس پاس تھی۔ وہ کیوں ادھر آرہی تھی۔

ابھی دوست سے ملاقات میں کافی وقت تھا اور ہوٹل کا کام وہ بعد میں دیکھ لے گا، پہلے اسے اپنی بیوی کو ہینڈل کرنا تھا۔

لباس بدل کر، جینز والا رف حلیہ بنا کر، سر پر پی کیپ لیے، وہ اپنے آفس کی پرائیوٹ لفٹ سے نیچے آیا، اور آخری فلور پہ پیچھے کی طرف سے باہر نکل آیا۔ قریب سے اس نے بگھی لی، اور اسے پھولوں کی مارکیٹ کا چکر لگانے کو کہا۔ جب اسے بالآخر وہ پھولوں کے اسٹال پہ نظر آگئی، تو وہ بگھی سے اترا، اور واپس ہوٹل کے عقبی پارکنگ ایریا تک آیا۔ ایک کام کرنا وہ بھول گیا تھا، اور بھلے وہ دیکھتی رہے، یہ کام اسے کرنا تھا۔ اس نے اپنے گارڈ کو اپنے والٹ میں لگی حیا کی ایک تصویر دکھائی۔

"یہ لڑکی کبھی تمہیں اپنے آس پاس نظر آئی ہے۔"

"نہیں سر!" گارڈ نے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے، اگر یہ کبھی ہوٹل میں داخل ہونے کے لیے اس طرف آئے تو اس کو اندر مت جانے دینا، اور فوراً مجھے اطلاع کرنا۔"

"تمام، تمام!" (اوکے، اوکے)، گارڈ نے فوراً تابعداری سے سر ہلایا۔ جہان نے والٹ جیب میں واپس ڈالا، اور پلٹ آیا۔ ابھی اسے اپنی بیوی کو رنگے ہاتھوں پکڑنا تھا جو اس کی جاسوسی کر رہی تھی۔ پھر اسے اچھا خاصا شرمندہ کر کے، تاکہ وہ دوبارہ اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہ کرے، وہ عیسیٰ کی پہاڑی کی طرف جاتے راستے پہ چل دیا۔ مگر چونکہ وہ پہلے اس کو کہہ چکا تھا کہ وہ دو تین سال بعد ادھر آیا ہے، اس لیے اس بات کو نبھانے کے لیے وہ کبھی کبھی ظاہر کر دیتا تھا کہ اسے راستہ یاد نہیں۔ توقع کے عین مطابق وہ اس کی طرف سے مطمئن تھی۔

"وہاں عیسیٰ کی پہاڑی کے سبزہ زار پہ بیٹھے، اس نے نوٹ کیا تھا کہ حیا نے ان تینوں موتیوں کو پہن رکھا تھا، اور یہ گردن والی چین تو بہارے کی تھی، وہ اسے پہچانتا تھا۔ البتہ ایک فرق اس نے محسوس کیا تھا۔ وہ عموماً گردن کے گرد دوپٹہ لیا کرتی تھی، البتہ آج اس نے اپنی شال شانوں کے گرد اچھے سے لپیٹ رکھی تھی۔ یا تو عائشے کی کمپنی کا اثر تھا، یا پھر وہ اسے حلیمہ عثمان کے پاس لے گئی ہوں گی۔ جو بھی تھا، اسے یہ نامحسوس سی تبدیلی

اچھی لگی تھی۔ اگر یہ نہ ہوتی، تب بھی وہ اسے اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کر چکا تھا۔“

جب ادھر بیٹھے حیا نے اس سے کبھی جلنے کا زخم محسوس کرنے کا پوچھا تو لمحے بھر میں جیل میں بیتے وہ تاریک دن اور اندھیری راتیں اس کے ذہن میں امڈ آئیں، مگر وہ بات ٹال گیا۔ اسے اپنے زخم دکھا کر ہمدردی حاصل کرنے کا شوق ہرگز نہیں تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے، دور لاؤنج کے پاس بیٹھے لڑکوں کے گروپ کو دیکھ رہا تھا۔ اسی میں ایک لڑکا اس کا ”دوست“ تھا۔ ابھی ملاقات میں وقت تھا، مگر وہ وہیں سے اسے پہچان گیا تھا۔ اس لڑکے کی عمر کم تھی، شاید پچیس برس، اس کے لیے تو وہ ایک جونیئر ایجنٹ ہی تھا۔ جونیئر مگر بہادر اور ذہین۔ اس کو پاکستان جانا تھا اور جہان سے کچھ چیزیں لے کر جانا تھا۔ دو ایک کام وہ پہلے بھی ساتھ کر چکے تھے اور اپنے سینئر ایجنٹ کی وہ لڑکا ”عمر“ بہت عزت کرتا تھا۔ اس کو عمر کا اصل نام معلوم نہ تھا، ہونہ وہ کبھی اپنے ملک کی باتیں کرتے تھے، اجازت ہی نہیں تھی، مگر وہاں بیٹھے، حیا سے اس کی رپورٹ کا پوچھتے ہوئے بھی وہ عمر کی موجودگی سے ہی بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ اپنے ملک کی تو ہوا بھی اپنی لگتی ہے، یہ تو پھر ہم پیشہ، ہم وطن تھا۔

”میں عبدالرحمٰن پاشا کے گمشدہ بھائی پہ رپورٹ لکھ رہی ہوں۔“ کسی اور دھیان میں اس نے حیا کی بات سنی اور اگلے ہی لمحے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ جب فون پہ حیا نے کہا تھا کہ وہ کچھ لکھ رہی ہے تو وہ اسے یونہی خالی خولی سی دھونس سمجھتا تھا، مگر اب جو کچھ وہ بتا رہی تھی، اس نے لمحے بھر کو تو جہان کا سانس ہی روک دیا۔

بات رپورٹ کی نہیں تھی، اس کی رپورٹ نہ کبھی لکھی جانی تھی نہ کسی نے شائع کرنی تھی۔ بات یہ تھی کہ اس کو یہ ساری باتیں کون بتا رہا تھا۔ اگر عائشے نے بتایا ہے تو پھر یہ بات خطرے کی علامت تھی کہ عبدالرحمٰن کے گھر سے باتیں باہر نکل رہی تھیں۔ پاشا بے نئی زندگی شروع کرنے جا رہا تھا۔ ذاتی اختلاف ایک طرف، وہ ان کا ایجنٹ تھا اور اس کی حفاظت کو یقینی بنانا ان کا فرض۔ اب اس کے گھر سے، اس کی بیوی کی طرف سے کوئی ایسی بات باہر نکلے جو پاشا بے کو نقصان پہنچائے یہ اس کو مضطرب کر دینے کے لیے کافی تھا۔ حیا اور عائشے پھر یہ باتیں اور لوگوں سے بھی کہتی ہوں گی، ایک صرف جہان سے تو ذکر نہیں کیا ہوگا نا۔ یہ باتیں ادالار میں نہیں پھیلنی چاہئیں۔ دنیا ویسے تو چھوٹی تھی ہی، مگر بیوک ادا تو بہت چھوٹا تھا۔ بہت مشکل سے اس نے بات کا رخ پھیرا۔ چونکہ وہ حیا سے ایسی بات کی توقع نہیں کر رہا تھا، اس لیے وہ خود بھی ذرا سا پریشان ہو گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پہاڑی کے نیچے تک آیا تھا، پھر وہ سامان لینے چلی گئی تو وہ واپس اوپر آیا، عمر سے ملا، امانت پہنچائی اور واپس بندرگاہ پہ آ گیا۔

کل وہ دوبارہ بیوک ادا آئے گا، پھر عائشے سے نپٹے گا، مگر آج کل اسے وہ ویڈیو لاکر میں رکھ دینی چاہیئے۔ ہو سکتا ہے وہ پزل باکس کھول چکی ہو، اور اب جب کہ وہ استنبول جا ہی رہی تھی تو وہ جلد یا بدیر لاکر ڈھونڈ ہی لے گی۔

اگلے روز وہ بیوک ادا آ گیا۔ وہ ہوٹل میں تھا جب عائشے نے اسے میسج کیا کہ حیا کل چلی گئی تھی سو وہ گھر آ سکتا ہے۔ عائشے جانتی تھی کہ وہ اسی کے ساتھ گئی ہے مگر اسے اطلاع دینے کا مقصد اسے گھر بلانا تھا۔ آنے بھی گزشتہ رات آ گئی تھیں۔ وہ زیادہ دیر تک ان کو ادالار سے دور نہیں رکھ سکتا تھا، سو اچھا ہوا کہ حیا ان کے آنے سے قبل جا چکی تھی۔

عائشے کو اس نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے سلام بھی نہیں کیا، نہ ہی اس کے مخاطب کرنے پہ ٹھیک سے بات کی۔ عائشے کو موتیوں والی بات معلوم ہو چکی تھی، اور اس نے یہی قیاس کیا کہ عبدالرحمٰن اس سے اسی تھپڑ پہ ابھی تک خفا تھا، تب ہی سوائے اس رات کے، اس نے عائشے سے ٹھیک سے بات نہیں کی تھی۔ وہ پھر سے معذرت کرنے آئی تھی مگر، جہان کے حیا کو پاشا بے کے متعلق بتانے پہ جھڑکنے پہ وہ خفا ہو کر واپس چلی گئی۔ وہ اسٹڈی سے مطلوبہ اشیاء لے کر پلٹنے ہی لگا تھا کہ اس کی نظر میز پہ رکھے پزل باکس پہ پڑی۔ وہ ایک دم ٹھہر گیا، پھر باکس اٹھا کر دیکھا۔ جلی ہوئی اطراف، ابھری ہوئی سطور، چھے چوکھٹے، الٹ پلٹ کر دیکھنے سے ہی وہ جان گیا تھا کہ یہ وہی پزل باکس ہے۔

جب اس نے عائشے سے باکس منگوایا تھا تو اس کی شکل یہ نہ تھی، اور اس کا کوڈ عائشے پہ سیٹ تھا۔ چونکہ وہ انگریزی حروف تہجی پہ بنایا گیا تھا، اس لیے عائشے کے نام کے ہجے انگریزی کے حساب سے تھے، ورنہ ترک میں اس کا نام Aysegul لکھا جاتا تھا۔ (اس میں انگریزی حرف ”S“ کے نیچے ننھی سی لکیر ہوتی تھی۔ ترک اگر عام ”S“ لکھتے تو اسے سین کی آواز سے پڑھتے، لیکن اگر ایس تلے لکیر ہوتی تو اسے شین کی طرح پڑھا جاتا۔)

بعد میں جہان نے اس کو کھول لینے کے بعد اس کا کوڈ تاقسم سیٹ کر دیا تھا۔ وہیں اسٹڈی میں کھڑے کھڑے اس نے کوڈ بر کو اوپر نیچے کیا، تاقسم پہ باکس کھل گیا۔ اندر اس کے لاکر کی سلپ، چابی اور کاغذ ویسے ہی پڑے تھے، اس نے پھر سے باکس بند کیا، سلائیڈز آگے پیچھے کیں اور وہیں کھڑے کھڑے سوچنا چاہا کہ اس لاپرواہی کی وہ اپنی بیوی کو کیا سزا دے۔ حد ہو گئی، جو چیز اس نے بہت احتیاط سے اس تک پہنچائی تھی، اس کو

یوں ادھر بھول کر چلی گئی تھی۔ غصہ اسے آیا، مگر وہ دبا گیا۔

اب وہ کیا کرے۔ یہ باکس یہیں پڑے رہنے دے۔ مگر ایسی صورت میں ملازمہ یا عائشے کے ہاتھ لگ سکتا تھا، اور عائشے سے وہ ویسے ہی ذرا احتیاط رہتا تھا۔ پھر کیا کرے۔ عائشے کو باکس دے دے کہ اسے بحفاظت حیا تک پہنچا دے۔ جو بھی تھا، عائشے امانت دار لڑکی تھی، امانت کو کھول کر نہیں دیکھے گی۔

"مگر نہیں۔" ہاشم نے باکس بنواتے وقت یہی کہا تھا کہ عبدالرحمٰن کو اس بات کی خبر نہیں ہونی چاہیے۔

پھر عبدالرحمٰن، جو کہ اس چیز میں ملوث ہی نہیں تھا، وہ باکس واپس حیا تک کیوں پہنچائے گا۔ اس کی کور اسٹوری میں جھول آ رہا تھا۔

کچھ دیر وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا، پھر ایک دم سے اسے خیال آیا۔

بہارے گل۔ وہ ہر کسی سے راز رکھ سکتی تھی سوائے اپنی بہن کے۔ وہ اپنا سارا کھایا پیا اپنی بڑی بہن کو ضرور بتاتی تھی۔ اس نے ذہن میں ایک لائحہ عمل ترتیب دیا، اور باکس پکڑے باہر آیا۔

"یہ تو حیا کا ہے۔" اس کے استفسار پہ بہارے نے حیرت سے باکس کو دیکھتے ہوئے بتایا۔ "وہ یہیں بھول گئی؟ کل اس کا کزن آیا تو اسے جلدی میں جانا پڑا، تمہیں پتا ہے اس کا کزن بہت ہینڈسم ہے" اس نے بڑے اشتیاق سے بتایا۔

بہارے نے حیا کے کزن کو کہاں دیکھا۔ اسے الجھا ہوا مگر جان بوجھ کر اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بہارے سے سوالات پوچھنے شروع کیے۔ باکس کس نے حیا کو دیا، کس نے بنایا وغیرہ۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا پکڑا جا سکتا تھا یا نہیں۔ مگر لگتا تھا حیا کو صرف باکس کھولنے میں دلچسپی تھی، اس نے بھیجنے والے کی زیادہ تحقیق نہیں کی تھی۔

اس نے بہارے سے کہہ دیا کہ وہ باکس اب اس کے پاس رہے گا، اور وہ جانتا تھا بہارے بہت دیر تک یہ راز نہیں رکھ سکے گی۔ وہ عائشے کو ضرور بتائے گی۔ آنے کہتی تھیں، یہ دونوں آنے گل کی بیٹیاں ہیں، ان کی ماں نے ان کو کچھ کھلایا نہیں جب تک کہ اس پہ اللہ کا نام نہ پڑھ لیا ہو، اس لیے یہ نہ کبھی خیانت کر سکتی ہیں، نہ کسی کو دھوکہ دے سکتی ہیں۔ بہارے کو لاکھ اپنی بہن کے درس سے چڑ ہو، وہ آخر میں تھی عائشے کی بہن۔ وہ حیا کی امانت، مہمان کی امانت اس تک ضرور واپس پہنچائے گی۔ ساتھ میں یہ بھی بتائے گی کہ عبدالرحمٰن اس باکس کو اس سے دور کرنا چاہتا تھا، شاید یہی سن کر حیا اگلی دفعہ اس کو کہیں رکھ کر بھولے گی نہیں۔

جب وہ واپس پلٹا تو اس کو معلوم تھا، بہارے اس کے پیچھے دبے قدموں ضرور آئے گی۔ اس کو میز تلے، دروازوں کے چابی کے سوراخ اور دیواروں کے پیچھے سے باتیں سننے کا بہت شوق تھا۔ اس لیے جب وہ اپنے کمرے میں گیا تو اس نے دروازہ ذرا سا کھلا رہنے دیا، اور بہارے کے سامنے الماری لاک کر کے چابی دراز میں ڈال دی۔

اب وہ پہلی فرصت میں جا کر اپنی بہن کو یہ بات بتائے گی، اور عائشے فوراً سے پیشتر حیا تک اس کا باکس واپس پہنچا دے گی۔ اور کم از کم اس سے وہ اتنا تو جان لے گا کہ بہارے گل راز رکھ سکتی ہے یا نہیں۔ اپنی بہن سے تو شاید بالکل نہیں۔

اسی رات اپنے کمرے میں اس نے وہ ویڈیو ریکارڈ کی، اور اس میں وہ سب کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ اگر کچھ نہیں بتایا تو ابا کے ہاتھوں مارے جانے والے جاسوس کا قصہ کہ وہ ابا کا راز تھا، اور فریحہ کی جاسوسی کا قصہ کہ وہ فریحہ کا راز تھا، اور اپنے سر درد کا قصہ، کہ وہ اس کا اپنا راز تھا اور راز نبھانے اسے بہت اچھے سے آتے تھے۔

اس رات وہ سو نہیں سکا۔ صبح جب وہ واپس استنبول آیا، تو سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ جواہر جا کر اس نے اپنے لاکر میں یو ایس بی فلیش رکھی، اور پھر واپس ریسٹورنٹ آ گیا۔ پوری رات کی بیداری کے بعد اب وہ پچھلے کمرے میں ایک صوفے پہ بیٹھا اور سر صوفے کی پشت سے لگایا ہی تھا کہ آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ابھی اسے نیند میں گئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ موبائل بجنے لگا۔ بدقت اس نے آنکھیں کھولیں، سیدھا ہوا اور جیب سے فون نکال کر دیکھا۔ ایکسچینج اسٹوڈنٹ کال کر رہی تھی۔ ایک تو یہ ایکسچینج اسٹوڈنٹ ٹھیک سے چین بھی نہیں لینے دیتی۔ ایک لمحے کے لیے جہان نے سوچا کہ نظر انداز کر دے، پھر پتا نہیں کیوں وہ نہیں کر سکا، اور کال اٹھالی۔

"آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت سو رہا ہے، براہ مہربانی کافی دیر بعد رابطہ کریں۔ شکریہ!" وہ بولا تو اس کی آواز خمار آلود تھی۔

"جہان! اٹھو اور میری بات سنو۔" وہ بہت جھلا کر کہہ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جہان ابھی اسی وقت تاقسم میں مرمرا ہوٹل پہنچے، سلیمان ماموں کے کوئی دوست آئے ہوئے تھے۔ وہ سخت کبیدہ خاطر ہوا۔

"میں نہیں آ رہا، مجھے آرام کرنے دو۔" جواب میں وہ بے حد خفا ہوئی اور اپنا پسندیدہ "جہنم میں جاؤ" بول کر فون رکھ دیا۔

جہان نے پھر سے سر صوفے کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں، مگر اب نیند کا آنا ناممکن تھا۔ کچھ دیر بعد حیا کا پھر میسج آیا۔ وہ اسے بلیو موسق بلا رہی تھی۔ اس کو جوابی ٹیکسٹ کر کے چھیڑتے ہوئے وہ اٹھا، شرٹ بدلی، چہرے پہ چھینٹے مارے، اور چابی اٹھا کر ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔

حیا نے میسج پہ بلیو موسق کا کہا تھا، اور نیلی مسجد کے باہر کے سبزہ زار پہ نصب بنچوں پہ ہی وہ اسے دور سے نظر آ گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ اسے واقعی پہچان نہیں پایا تھا۔

حیا نے سر پہ دوپٹا لے رکھا تھا۔ گہرے سبز رنگ کا دوپٹا جس کو وہ مستقل چہرے کے گرد ٹھیک کر رہی تھی۔ چونکہ اسے دوپٹا لینے کی عادت نہیں تھی، اس لیے وہ بار بار سر سے پھسل جاتا تھا۔

نیلی مسجد کے باہر کبوتر پر پھڑپھڑاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ کتنی ہی دیر تو وہ اس منظر کو ٹھہر کر دیکھے گیا۔ ایک دم سے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

جب وہ انڈیا میں تھا، اور اس بک اسٹال کے ساتھ وہ لڑکی ملی تھی، جسے ظاہر ہے کہ اس کے اپنوں نے ہی بھیجا تھا، اور وہ اسے اس آفیسر کا نام دکھا گئی تھی۔ جو اس کی مدد کرے گا، اور بعد میں اسی کی مدد سے وہ جیل سے فرار ہوا تھا، اس لڑکی کے سر پہ بھی ایسے ہی سفید دوپٹا تھا۔ خوب صورت، بہت خوب صورت جیسی علی کرامت کی ممی تھیں، جیسی آنے گل کی بیٹیاں تھیں، اور اب جیسی اس کی بیوی تھی۔

یہی تو چاہا تھا اس نے، کہ اس کی بیوی ایسی ہو۔ بھلے وہ چہرہ بے ڈھکے، مگر باقی ہر طرح سے خود کو ڈھکے اور آج اس کی ساری خواہشیں پوری ہو گئی تھیں۔ اس کو بھی ایک مرمرا جیسیلہ مل گئی تھی۔

اور تب ہی اس کی نگاہ حیا کے مقابل بیٹھے نوجوان پہ پڑی۔ وہ ریسٹورنٹ سے وہ فرائنگ پان کیوں نہیں لایا۔ آخر یہ شخص یہاں کیا کر رہا تھا۔ ایک لمحے کو اسے شدید غصہ چڑھا، مگر جب اس نے دوبارہ حیا کو دیکھا تو جیسے بہت سے مناظر اس ایک منظر کی روشنی میں غائب ہو گئے۔

داور کی مہندی کی ویڈیو، حیا کا اس آدمی کی کار میں بیٹھنا، بارش میں سرخ کوٹ میں ٹاقسم پہ چلتی لڑکی۔

سارے منظر غائب ہوتے گئے، ایسے جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔ پیچھے صرف ایک منظر بچا۔ بار بار چہرے کے گرد دوپٹا ٹھیک کرتی، خفا اور اداس سی بیٹھی لڑکی جو ذرا غصے سے سامنے بیٹھے شخص کو کچھ کہہ رہی تھی۔

جب وہ ان کے قریب آیا تو وہ چونکی، اور ایک دم اس کا چہرہ جیسے کھل اٹھا۔ وہ حیران تھی، اور خوش بھی۔ وہ اتنی بے اختیار ہو کر اٹھی کہ موبائل جو شاید اس کی گود میں تھا، زور سے نیچے جا گرا۔

"جہان! یہ ابا کے دوست کے بیٹے......" وہ تعارف کرانے لگے، اب وہ کیا بتاتا کہ وہ اس آدمی کو پہلے سے جانتا ہے، مگر ولید کو وہ ضرور کچھ بتانا چاہتا تھا۔ سلیمان ماموں اور حیا سے بہت ہی اپنائیت سے بات کرنے کے بعد اس نے لغاری صاحب کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں مسکراتے ہوئے اسی اپنائیت سے سارے رشتوں کی وضاحت ایک فقرے میں کر دی۔

"میں جہان سکندر ہوں، سلیمان ماموں کا بھانجا اور داماد، حیا کا ہزبینڈ۔" اور اس ایک فقرے نے اس کے اپنوں کو جو حیرت بھری خوشی عطا کی، اس سے سلیمان ماموں کا داماد اور بھانجا اور حیا کا ہزبینڈ بالآخر یہ بات جان گیا کہ وہ سب یہ رشتہ چاہتے تھے۔ ساری ناراضیاں دور ہوئیں سارے گلے ختم ہوئے۔ اس نے اپنی بیوی کو اس شخص کے سامنے مان دیا جس کے اور اس کی بیوی کے درمیان کبھی کچھ نہیں رہا تھا، ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

شام کو جب ماموں اور ممی لاؤنج میں تھے، وہ کچن میں حیا کی مدد کروا رہا تھا۔ تب اس نے حیا کا پلان جاننے کی کوشش کی۔ وہ اسے ترکی سے بھیجنا چاہتا تھا، مگر حیا نے ابھی کچھ طے نہیں کیا تھا کہ اسے ترکی میں رہنا ہے یا کسی دوسرے ملک۔ جہان نے لندن جانے کی بابت پوچھا۔ نیلی مسجد میں اس کے اعتراف کے بعد وہ ابھی تک ذرا ششدر تھی، سو فوری فیصلہ نہیں کر سکی۔ ممی اور ابا کو وہ لندن میں سیٹل کر رہا تھا، اگر حیا لندن جانے پہ راضی ہو گئی تو وہ اسے ان کے ساتھ لندن بھیج دے گا، لیکن اگر وہ نہیں راضی ہوتی، تو وہ دوسرا طریقہ استعمال کرے گا۔

شام میں ان کی منگنی ہوئی۔ ممی کو جیسے پتا چلا کہ اس نے سب کے سامنے یہ اعتراف کیا ہے، وہ بہت خوشی سے دو انگوٹھیاں نکال لائیں جو انہوں نے اس موقع کے لیے عرصے سے سنبھال کر رکھی تھیں۔

وہ واقعی اس روز مطمئن تھا۔ جب رات میں وہ ماموں کو چھوڑ کر گھر واپس آیا تو اس کا ارادہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھی سی کافی پینے اور کوئی اچھی سی مووی دیکھنے کا تھا۔ فیملی والا احساس، بہت عرصے بعد دل میں جاگا تھا، وہ اس احساس کو جینا چاہتا تھا۔

مگر اس سے قبل حیا نے اسے بری خبر سنا دی۔

"تمہارے لیے فون آیا تھا کوئی لڑکی تھی، نام تو نہیں بتایا مگر کہہ رہی تھی کہ تمہارا پارسل اسے نہیں ملا، کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا ہے۔"

اور کسی نے واقعتاً اس کا سانس روک دیا۔ اس کا گھر ایک سیف ہاؤس کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہاں شام سے ایک "کانٹیکٹ" کی کال ہی آ سکتی تھی، اور اس کو پارسل نہ ملنے کا مطلب بہت واضح تھا۔ جو کچھ اس نے یہاں سے بھیجا تھا، واپس نہیں پہنچا تھا، بلکہ کسی غلط ایڈریس پہ چلا گیا تھا۔ اس نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پیغام کو ڈی کوڈ کیا۔ اس کا بھیجا ہوا لڑکا، عمر واپس نہیں پہنچا تھا۔ بلکہ گرفتار ہو گیا تو یقیناً بہت ایمرجنسی سچوایشن تھی، اس لیے پیغام اس کے گھر چھوڑ دیا گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ پیغام جس نے بھیجا ہو، وہ بھی جلدی جلدی اپنی جگہ سے پیک اپ کر کے نکل رہی ہو۔ خدایا یہ کیا ہو گیا تھا۔

اس کا لڑکا پکڑا گیا تھا۔ جیل، تشدد، اذیت اس کے ہر طرف وہی تنگ تاریک سیل پھیلنے لگا۔ ایسے میں کافی، مووی، سب فضول تھا۔

پوری رات وہ اسی صوفے پہ بیٹھا ہینڈلر کی کال کا انتظار کرتا رہا، مگر کال نہیں آئی۔ دو راتوں کی بے خوابی کے باعث صبح تک اس کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں، مگر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ ہر کوئی جیل سے فرار نہیں ہو پاتا۔ لوگ برسوں جیل میں سزا اور تشدد کاٹ کر وہیں خاموشی سے جان دے دیتے ہیں۔ ایک اور اسپائی ضائع ہو گیا۔ ایک اثاثہ ضائع ہو گیا۔ اس کی اذیت کی کوئی حد نہیں تھی۔

اس سارے میں حیا کا خیال اس کے ذہن سے بالکل نکل گیا۔ صبح ہوتے ہی وہ واپس چلی گئی۔ جہان نے روکا بھی نہیں۔ اس کے پاس کرنے کو بہت سے دوسرے کام تھے۔

اگلے روز وہ بیوک ادا چلا گیا۔ حیا، پزل باکس، جواہر کالا کر، اس نے سب کچھ ذہن سے جھٹک کر خود کو ہوٹل گرینڈ میں مصروف کر لیا۔ ریسٹورنٹ میں اس نے بتا دیا تھا کہ اگر اس کی دوست (حیا) شام میں آئے تو کہنا، جہان جلدی اٹھ کر چلا گیا ہے، اگر صبح میں آئے تو کہنا، وہ آیا ہی نہیں۔ چند روز وہ واقعی نہیں آئی۔ عمر کی گرفتاری کی بھی تصدیق ہو گئی۔ پھر انہی دنوں وہ بالآخر خود کو راضی کر کے انقرہ لے آیا۔ یہاں اسے اپنا چیک اپ کرانا تھا، سر کا بدترین درد جو سر سے ہوتا ہوا اگر دن تک جاتا، اسے اب اس کا علاج چاہیے تھا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اس نے گردن کے ایک طرف کا ایم آر آئی کروایا تھا، مگر برین ایم آر آئی اس نے نہیں کروایا تھا۔ اپنا درد اس نے ہر جگہ چھپایا تھا، تب اتنی تکلیف ہوتی بھی نہیں تھی۔ یہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھی تھی۔ پانچ سال جہان نے اس اذیت کے ساتھ گزارے تھے، اب بالآخر وہ اس کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔

ایم آر آئی سے قبل، سادہ ایکسرے سے ہی سارا معاملہ صاف ہو گیا۔ اس کو ایکسرے دکھانے سے قبل ڈاکٹر نے پوچھا تھا۔

"کیا کبھی تمہیں سر پہ کوئی چوٹ آئی تھی۔ کوئی ایکسیڈنٹ جس میں سر کسی چیز سے ٹکرایا ہو۔"

"ہاں! میری لڑائی ہو گئی تھی کچھ لوگوں سے، انہوں نے مجھے سر پہ ایک تلے کی طرح کی چیز سے مارا تھا جس سے سر سے خون بھی نکلا تھا، مگر خون اتنا زیادہ نہیں تھا۔ آنکھ کے قریب زخم سا ہوا تھا جس سے تھوڑا سا خون نکل کر کنپٹی تک ہی گرا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے، لیکن....." ساتھ ہی ڈاکٹر نے اس کا ایکسرے اس کے سامنے رکھا۔ "شاید جس چیز سے انہوں نے تمہیں مارا تھا، اس پہ چھوٹی سی کیل لگی ہوئی تھی۔ ایک اعشاریہ ایک انچ کی کیل جو تمہاری آنکھ کے قریب گھس گئی تھی۔"

اس نے بے اختیار آنکھ کے قریب چہرے پہ ہاتھ رکھا۔ وہ ایک Foreign object کے ساتھ پچھلے پانچ برس سے رہ رہا تھا اور اسے کبھی پتا نہیں چل سکا۔

"اب کیا ہو گا" اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ ماضی کا افسوس کرے یا مستقبل کے لیے پریشان ہو۔ اسے واقعی کچھ نہیں سمجھ میں آ رہا تھا۔

"ہمیں سرجری کے ذریعے یہ فارن آبجیکٹ ریموو کرنا پڑے گا، مگر" ڈاکٹر متذبذب سا رک گیا۔

"آپ بتا دیں جو بھی بتانا چاہتے ہیں۔ میں تیار ہوں۔" بمشکل اس نے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔

"دیکھو! میڈیکل ہسٹری میں بہت سے ایسے کیسز آئے ہیں جس میں لوگ برسوں فارن آبجیکٹ کے ساتھ رہتے ہیں اور انہیں علم بھی نہیں ہوتا۔ وہ آدمی جس کے گلے کے قریب چاقو کا پھل، اور میرا مطلب ہے واقعی چاقو کا پھل گھس گیا تھا، چار برس تک اس کو علم ہی نہیں ہو سکا کہ اس کے گلے میں کچھ ہے اور جرمنی کی ایک عورت تیس پینتیس برس تک اپنے برین میں آٹھ سینٹی میٹر لمبی پینسل لیے رہی۔ سرجری سے ایسی بہت سی چیزیں نکالی جاتی رہی ہیں، مگر، وہ پھر رکا۔" یہ ننھی سی کیل تمہاری optic nerve کے بالکل ساتھ پھنسی ہے۔ چند ملی میٹر بھی آگے پیچھے ہوتی تو تم اندھے ہو جاتے۔ اب اس سرجری کا کم از کم میں رسک نہیں لوں گا، اس کی کامیابی کا چانس کم اور

تمہارے اندھے ہونے کا چانس زیادہ ہے۔

"وہ خاموشی سے عادتاً نچلا لب دانت سے دبائے بیٹھا رہا۔ کبھی وہ سوچتا تھا، وہ بہت خوش قسمت ہے کہ وہ بغیر کسی مستقل انجری کے جیل سے باہر آ گیا اور فوج کے لیے ناکارہ نہیں ہوا۔ مگر وہ غلط تھا۔ جیل افسران نے اسے پہلے دن کہا تھا کہ کوئی ان کی جیل سے مردہ یا اپاہج ہوئے بغیر نہیں جاتا۔ وہ ٹھیک کہتے تھے۔ وہ بالکل ٹھیک کہتے تھے۔"

"پھر میں کیا کروں۔" بہت دیر بعد اس نے پوچھا تو ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تم دوسری رائے کے لیے کسی اور کے پاس جا سکتے ہو۔ باہر چلے جاؤ۔ جرمنی بہتر رہے گا۔ یقیناً کوئی مجھ سے اچھا سرجن یہ رسک لینے پہ تیار ہو جائے گا۔"

وہ رات بہت تکلیف دہ تھی۔ ایک طرف یہ سر درد اور اب تکسیر پھوٹنا اور دوسری طرف اندھے ہونے کا خدشہ۔ وہ کس کا انتخاب کرے۔ کیا اس کیل کو سر میں پڑے رہنے دے۔ یا پھر نکلوانے کا خطرہ مول لے لے۔ اور اگر وہ اندھا ہو گیا یا اپاہج تو کیا ہو گا۔ کیریئر ختم، ملک کی خدمت ختم، حکومت کا لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اس کو تربیت دلانا ختم، زندگی ختم۔

صبح وہ سیدھا ریسٹورنٹ آیا۔ آج پہلی دفعہ اس کا دل کسی کام کے لیے نہیں چاہ رہا تھا۔ زندگی پہلے بھی بے یقین تھی، مگر اب تو مزید بے یقین ہو گئی تھی۔ کیریئر کا ختم ہونا اس کے لیے زندگی کے ختم ہونے کے برابر تھا۔ مگر پھر بھی وہ یہ رسک لے گا۔ خطرہ لیے بغیر بھی کوئی زندگی ہوتی ہے بھلا۔

"جہان بھائی، وہ آپ کی دوست آئی تھی رات کو۔" کاؤنٹر پہ جز وقتی بیٹھنے والے لڑکے نے بتایا تو وہ چونکا۔

"حیا۔" کیا کہہ رہی تھی۔

"اپنی دوست کے ساتھ آئی تھی، آپ کا پوچھا پھر چلی گئی۔ کافی دیر بعد دونوں دوبارہ آئیں، ان کے شاید کوئی پیچھے لگا ہوا تھا، انہوں نے بیک ڈور کا رستہ مانگا۔ پھر وہ وہیں پینٹری میں بیٹھی رہیں۔ سوا ایک بجے وہ پیچھے سے نکل گئیں۔"

"اور کچھ۔"

"اور پاشا بے بھی آئے تھے۔" اب کہ وہ بری طرح چونکا۔

"کیا کہہ رہا تھا وہ۔"

"آپ کا انتظار کرتے رہے۔ یہیں دروازے کے پاس کرسی پہ بیٹھے رہے۔ اچھے موڈ میں نہیں تھے۔ آپ سے ملنا چاہتے تھے۔"

"کیا وہ دونوں لڑکیاں اس کی موجودگی میں آئی تھیں۔" بہت دن اپنے مسئلوں میں الجھنے کے بعد آج اسے حیا کی پھر سے فکر ہوئی تھی۔

"جی... وہ دونوں دروازے کے پاس کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ ساتھ ہی بیٹھے تھے، انہوں نے چہرے کے آگے اخبار کر رکھا تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ہو گا۔ پھر جب وہ دوسری دفعہ آئیں تب تک وہ جا چکے تھے۔"

"اچھا۔" وہ مطمئن ہو کر اندر چلا گیا۔ پاشا بے نے حیا کو دیکھ لیا ہو تب بھی وہ ہرگز نہیں جان سکتا تھا کہ وہ جہان کی بیوی ہے۔ اسے جاننا بھی نہیں چاہیے تھا۔ کمزوریوں کو کیسے پکڑا جاتا ہے، جہان سے بہتر کون جانتا تھا، اس لیے کوئی اس کی اپنی کمزوری پکڑے، یہ وہ نہیں چاہتا تھا۔ بس اب وہ جلد از جلد حیا کو یہاں سے بھیج دے گا۔ استنبول غیر محفوظ تھا، کم از کم اس کی فیملی کے لیے۔

مگر اسے واپس بھیجنے سے قبل ضروری تھا کہ وہ اپنا پزل باکس کھول لے اور لاکر بھی۔ وہاں موجود گارڈ کو اس نے ہدایات دے دی تھیں۔ جب بھی کوئی نو نمبر کا لاکر کھولنے آئے گا، گارڈ اس کے ایک نمبر پہ میسج کر دے گا۔ چند پیسے لے کر گارڈ اس کام کے لیے راضی تھا۔ اور ابھی تک لاکر کھولنے کوئی نہیں آیا تھا۔

جب وہ دوبارہ بیوک ادا گیا تو اس نے اپنی الماری چیک کی۔ پزل باکس وہاں نہیں تھا۔ وہ عائشے نے رکھ لیا یا حیا تک واپس پہنچ گیا۔ یہی پوچھنے کے لیے اس نے بہارے کو بلایا۔

وہ سر جھکائے اوپر آئی اور صاف صاف بتا دیا کہ پزل باکس اس نے حیا کو دے دیا ہے۔ چند لمحے وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ اس کا اندازہ ٹھیک تھا۔ بہارے گل عائشے سے راز نہیں رکھ سکتی تھی۔ یقیناً اس نے سب سے پہلے عائشے کو بتایا ہو گا۔

اس نے بہارے پہ غصہ نہیں کیا۔ غصے والی بات ہی نہیں تھی۔ وہ اس کے سامنے ایک پنجے کے بل بیٹھا اور اس سے اپنے راز کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"پھر تو مجھے تمہارے دوسرے وعدے کا بھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔"

اور اب تو اسے اس وعدے کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اس پاک اسپائی کو جنازہ نہیں دے سکا تھا جس کو اس نے ابا کے ساتھ دفنایا تھا، مگر شاید بہارے اس کو جنازہ دے سکے۔ یہ الگ بات تھی کہ کور blow ہونے پہ سب لوگ آپ کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ مگر بہارے مصر تھی کہ ایسا نہیں ہوگا۔

"پورا ادالار، بلکہ پورا ترکی تمہیں چھوڑ دے، مگر بہارے گل تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گی۔"

"مگر بہارے گل کے چہرے پہ شدید غصہ ابھر آیا جب جہان نے اس کی "نئی دوست" کا ذکر کیا۔ وہ حیا کو بہت پسند کرتی تھی، مگر عبدالرحمٰن اس میں دلچسپی رکھتا ہے، یہ بات اس کو پسند نہیں تھی۔"

"وہ اپنے کزن کو پسند کرتی ہے اور اس کا کزن بہت ہینڈسم ہے۔" اس نے اپنے طور پہ عبدالرحمٰن کو دوبارہ سے مقابلے کا احساس دلایا۔ بہارے نے حیا کا کزن کہاں دیکھا، یہ وہ عائشے سے بعد میں پوچھے گا مگر پہلے اس نے عبدالرحمٰن کے متعلق حیا کی رائے جاننی چاہی تو وہ فوراً بولی۔

"یہ سچ ہے، اسے تم بالکل پسند نہیں ہو۔"

تب وہ بہارے کے سامنے سے اٹھ گیا۔ وہ زیادہ دیر رکے گا تو بہارے سمجھے گی، عبدالرحمٰن نے اسے معاف کر دیا، جبکہ وہ عائشے کی طرح اسے بھی یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ خفگی اتنی جلدی بھلانے والوں میں سے نہیں ہے۔

تب بہارے نے اسے پہیلی لکھنے والے کی بابت پوچھا۔ وہ ذرا چونکا، پھر لاعلمی ظاہر کی، مگر اس کی اگلی بات نے جہان کو واقعتاً چونکا دیا۔ اس نے کیوں نظر انداز کر دیا کہ جو باکس اس نے بہارے کو دیا تھا اور وہ جو حیا کو دیا تھا، دونوں کی پہیلیوں کی لکھائی کا انداز ایک سا تھا۔ جبکہ ایک میجر احمد نے دی تھی اور دوسری عبدالرحمٰن نے۔ دونوں کو ایک سا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ حیا نے محسوس کر لیا تو عائشے نے بھی کر لیا ہوگا۔ عبدالرحمٰن کا اصل تعارف میجر احمد عائشے کو نہیں پتا چلنا چاہیے۔

شام میں وہ عائشے کے پاس بالخصوص اسی مقصد کے لیے آیا، مگر حیا نے اس کے سامنے کسی میجر کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ پھر خیال آنے پہ پوچھا

"بہارے کہہ رہی تھی۔ حیا کا کزن کافی ہینڈسم ہے۔ تم تو اس دفعہ اسے ساتھ نہیں لائی تھی جب میں حیا سے ملنے آیا تھا۔ پھر بہارے کو کیسے پتا چلا؟" عائشے کا چہرہ خفت سے گلابی پڑ گیا۔

"نہیں، وہ دراصل حیا نے اسے کہا تھا کہ اس کی اپنے کزن سے شادی ہو چکی ہے، تو بہارے مجھ سے بار بار پوچھتی تھی کہ اس کا کزن کیسا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ بہت اچھا ہے جو سچ تھا وہی کہا۔" وہ ذرا گڑبڑا کر سر جھکائے لکڑی کو چھیدنے لگی۔

"تھینک یو عائشے! تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ میں کبھی تم سے کوئی اور فیور مانگوں تو کیا تم دو گی؟" بنا کسی تاثر کے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ عائشے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، چند لمحے دیکھتی رہی، پھر گردن اثبات میں ہلا دی۔

"تم مجھ پہ بھروسا نہیں کرتے، مگر تمہیں کرنا چاہیے۔" پھر جیسے وہ کچھ اور کہتے کہتے رک گئی، اور سر جھٹک کر دوبارہ سے کام کرنے لگی۔ وہ یقیناً موتیوں کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر کیا فائدہ۔

پھر ایک روز اس نے حیا کو میجر احمد کی طرف سے فون بھی کر لیا۔ اس کی باتوں سے اسے نہیں لگا کہ وہ باکس کے عبدالرحمٰن کی طرف سے ہونے کے بارے میں جان چکی ہے۔ اس روز وہ ذرا جھنجھلائی ہوئی تھی۔ شاید وہ تنگ آ گئی تھی، چلو خیر، جلد یا بدیر یہ کھیل ختم ہونے والا تھا۔

چند روز اسی روٹین میں گزر گئے۔ صبح ہوٹل گرینڈ، اور دوپہر کی فیری لے کر استنبول آ جانا۔ طیب حبیب واپس استنبول آ چکا تھا اور اس نے بار بار کی مداخلت شروع کر دی تھی۔ جو وعدے کیے تھے پورے کرو۔ وہ جواب میں اسے ٹال نہیں رہا تھا، مگر صرف تھوڑا سا وقت مزید مانگ رہا تھا۔ اپنی جگہ طیب حبیب بھی ٹھیک تھا۔ اس کی زندگی استنبول میں تنگ ہو چکی تھی۔ اس کے دشمن، عبدالرحمٰن کے دشمنوں سے زیادہ تھے۔ مگر وہ کیا کرتا کہ ہر چیز اس کے ہاتھ میں نہ تھی۔ سارے احکامات پیچھے سے آتے تھے، سو وہ طیب حبیب کو جھڑک کر خاموش کروا دینے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ طیب بکتا جھکتا، مگر پھر خاموش بھی ہو جاتا۔ وہ عبدالرحمٰن کو انکار نہیں کیا کرتا تھا۔ اپنے غصے کا اظہار کر دینے کے بعد پسپائی بھی اختیار کر لیا کرتا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کی بقا عبدالرحمٰن کے ساتھ میں ہے۔ اس کی دشمنی میں نہیں۔

چند روز بعد اسے احساس ہوا کہ حیا کو اپنے فون میں اس کے ٹریسر کے بارے میں علم ہو گیا تھا، کیونکہ اس روز جب وہ اچانک سے

برگر کنگ آئی تو وہ ذرا حیران ہوا۔ وہ چاہتی تھی کہ آج وہ دونوں مل کر استقلال اسٹریٹ کو چلتے چلتے ختم کر لیں۔ وہ کام چھوڑ کر باہر آیا اور ساتھ میں اپنا فون بھی چیک کیا۔ اس کا ریسیور اسے بتا رہا تھا کہ ٹریسر سبانجی میں ہی ہے، جبکہ حیا کا فون اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ اچھا تو، اس نے ٹریسر فون سے نکال لیا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے صبح میجر احمد کے نمبر پر ٹیکسٹ کیا تھا کہ وہ کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہے۔ جہان نے سوچا تھا، فارغ ہو کر اسے کال کرے گا، مگر فراغت سے قبل ہی وہ خود آ گئی تھی۔

وہ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے استقلال اسٹریٹ میں آگے بڑھنے لگے۔ جہان کو یاد تھا، جب حیا کا خنجر بریڈ ہاؤس توڑنے پہ وہ اس کے ڈورم کے باہر کھڑا رہا تھا تب اس نے اسے ٹائمڈ کال کی تھی۔ شاید اس کی موجودگی میں کال آنے پہ حیا اسے اپنا یہ مسئلہ بتا دے۔ اس روز وہ بات ادھر ادھر کر گئی تھی۔ آج، اس کے ساتھ جدیسی میں چلتے ہوئے اس نے پھر سے وہی کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیا اب ان دونوں میں اتنا اعتبار قائم ہو چکا تھا کہ حیا اسے سب کچھ بتا دے۔

وہ جوس لینے ایک کیفے میں گیا اور کال کا ٹائم سیٹ کر کے، جوس لیے باہر آ گیا۔ اس نے ریکارڈنگ نہیں لگائی تھی۔ جب حیا کال اٹھائے گی تو رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ وہ سمجھے گی دوسری جانب سے کاٹ دیا گیا ہے۔ وہ سننا چاہتا تھا کہ اس کال کی وہ کیا وضاحت دیتی ہے۔

وہ دونوں اب گلی میں کافی آگے تک بڑھ گئے تھے۔ حیا نے اس سے لندن جانے کا پوچھا ضرور، مگر خود اس کا اپنا ارادہ بیوک میں ادا میں رہنے کا تھا۔

''میں اپنی دوستوں کے ساتھ بیوک ادا میں رہنا چاہتی ہوں۔'' وہ بے نیازی سے شانے اچکا کر کہتی چل رہی تھی۔ اس روز بھی اس نے اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ جو وہ چاہتا تھا وہ اس نے کبھی حیا سے نہیں کہا پھر بھی وہ ہو گیا تھا۔ اس سے آگے وہ کیا چاہتا تھا۔ بس اعتبار کا ایک رشتہ جب وہ پیدا ہو جائے گا تو وہ اسے خود سے بتا دے گا کہ وہ ان جنت کے پتوں میں کتنی خوب صورت لگتی ہے۔

ابھی جہان نے اس کو ایک ٹرک دکھا کر اخبار تہہ کر کے پکڑا ہی تھا کہ حیا کا موبائل بج اٹھا۔ حیا نے فون نکال کر دیکھا، پھر کال کاٹ دی۔

''میجر احمد کی کال تھی، کچھ کام تھا ان سے۔'' وہ سرسری سے انداز میں بولی اور اسے سمجھ میں نہیں آیا وہ اس کو کیا کہے۔ وہ اتنی صاف گوئی سے بتا دے گی، اس نے توقع نہیں کی تھی۔

اس کے پوچھنے پہ حیا نے بس اتنا بتایا کہ میجر احمد کون ہیں، مگر آگے پیچھے کچھ نہیں۔ سچ بتانے اور اعتبار کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ان کے درمیان سچ بولنے کا تعلق قائم ہو چکا تھا، مگر اعتبار کا شاید نہیں۔ نہ اس نے حیا کو خود سے اپنے بارے میں سب سچ بتایا تھا، نہ ہی حیا نے اسے وہ تمام واقعات بتائے تھے جو اس کے ساتھ پچھلے چند ماہ سے ہو رہے تھے۔

جب وہ واپس چلی گئی تو وہ ریسٹورنٹ آ گیا۔ اس کا دل مطمئن تھا بھی اور نہیں بھی۔ حیا نے اس سے جھوٹ نہیں بولا، مگر اس پہ اعتبار بھی نہیں کیا۔ وہ لندن بھی اس کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ بیوک ادا میں رہے، یہ وہ نہیں چاہتا تھا، مگر جب دونوں کے درمیان اعتبار کا رشتہ تھا ہی نہیں، تو وہ کس مان پہ اس سے کچھ منوا سکتا تھا۔

وہ ترکی صرف جہان کے لیے آئی تھی، وہ جان گیا تھا۔ اب وہ اس کو یہاں سے صرف اپنی وجہ سے ہی بھیج سکتا تھا۔

تب ہی حیا کا فون آنے لگا۔ اس نے کال کاٹ کر خود فون کیا۔ یہ پہلی دفعہ تھی جب حیا نے خود اس سے بات کرنی چاہی تھی۔ زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب وہ اسے بتا رہی تھی کہ اس نے جہان سے میجر احمد کا تذکرہ کیا تھا۔

''کیوں۔ آپ نے کیوں بتایا۔'' وہ یہی جاننا چاہتا تھا۔

''شوہر کو علم ہونا چاہیے کہ اس کی بیوی کس سے بات کرتی ہے۔'' اس کے جا کر کہنے پہ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

اب وہ اسے وہ باتیں بتا رہی تھی جو اس نے ادالار میں عبدالرحمٰن اور طیب حبیب کے بارے میں سنی تھیں۔ وہ تحمل سے اس کی سنتا اور پھر اسے سمجھاتا رہا۔ اسے صرف یہ جاننے میں دلچسپی تھی کہ حیا نے یہ ساری باتیں کس سے سنی تھیں۔ کس بات کے جواب میں وہ ''میں نے سنا ہے کہ......'' کہہ ہی رہی تھی کہ جہان نے اس کی بات کاٹی۔

''کس سے سنا ہے۔'' اتنی تیزی سے پوچھنے پہ وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔

''کبریٰ خانم سے۔ ادالار میں''

تو یہ کبریٰ خانم تھیں۔ عائشے سے ان کی اچھی سلام دعا تھی، اور ان کا بیٹا ہوٹل گرینڈ میں ایک معمولی سی ملازمت کرتا تھا۔ ان خاتون سے تو وہ ذرا اواپس جا کر نپٹے گا۔ ابھی اسے حیا کے ذہن سے اس خیال کو نکالنا تھا۔ جو بھی تھا، وہ میجر احمد پہ بھروسا کرتی تھی۔

اس روز پہلی دفعہ اس سے حیا نے پوچھا تھا کہ وہ جنت کے پتے کسے کہتا ہے۔ جواب میں وہ اسے وہ سب بتاتا گیا جو اس نے علی کرامت کی ممی سے بچپن میں سنا تھا۔ وہ ادھوری، پوری باتیں، وہ نرم سا احساس، وہ دل میں اترتے لفظ، وہ ہر چیز دہراتا گیا، یہاں تک کہ وہ کہہ اٹھی۔

''آپ اچھے انسان ہیں، اچھی باتیں کرتے ہیں۔''

آہ کاش، وہ اسے بتا سکتا کہ اس نے اس اچھے انسان کو کب، کب، اور کیا کیا اٹھا کر دے مارا ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

......بیوک ادا کے ساحل پہ لہریں پتھروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔ ان کا شور اس اونچے، سفید قصر عثمانی کے اندر تک سنائی دے رہا تھا۔ محل اندھیرے میں ڈوبا تھا، سوائے اس کی اسٹڈی کے جہاں وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ سامنے لیپ ٹاپ کی چمکتی اسکرین پہ وہ پیغام کھلا تھا جو اس کے ''اپنوں'' کی طرف سے آیا تھا۔ اس کا کام ادالار میں آخری مراحل میں تھا۔ تاش کے پتوں کے گھر کا آخری مرحلہ۔ پھر اسے روپوش ہو جانا تھا۔

کچھ عرصہ روپوش رہ کر وہ دوبارہ استنبول آئے گا، ایک آخری کام نپٹائے گا اور پھر واپسی۔ اپنے ملک واپسی۔

جب سے اس نے میل پڑھی تھی، وہ انگوٹھیاں اور گلاسز خود سے علیحدہ کر کے میز پہ رکھ دی تھیں اور یہ سگریٹ نوشی، اس سے بھی اس کو جلد از جلد چھٹکارا حاصل کر لینا چاہیے۔ اب عبدالرحمٰن پاشا کو چھوڑنے میں کم وقت رہ گیا تھا۔

اس کے سر کا درد ویسا ہی تھا اور بہت سوچنے کے باعث اعصابی دباؤ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ جرمنی میں اس نے پندرہ جون کے بعد کی ایک تاریخ بھی اپنی سرجری کے لیے لے لی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے امید دلائی تھی کہ آپریشن کی کامیابی کا چانس اتنا ہی تھا جتنا ناکامی کا۔ چونکہ وہ بیوک ادا سے پیک اپ کرنے سے قبل آپریشن کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے تاریخ بعد کی لی تھی۔ یہ اس کے کام کا آخری مرحلہ تھا۔ انڈیا میں آخری مرحلے میں سب کچھ بگڑ گیا تھا، آخری مرحلے پہ اس کے دوست نے جس کے پاس وہ مدد کے لیے گیا تھا اس کو پکڑوا دیا تھا۔ سر کا درد ہمیشہ اسے اس دوست کی یاد دلاتا تھا۔ اس نے جہان کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔

لوگ بعض دفعہ آپ کے ساتھ بہت برا کر جاتے ہیں، اتنا برا کہ بس!

تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر اس نے فون اٹھایا اور ایکسچینج اسٹوڈنٹ کا نمبر نکالا۔

''میرے پاس آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے۔ اے آر پی۔''

مختصر پیغام لکھ کر اس نے حیا کو بھیج دیا۔ جب وہ جواب دے گی تو وہ اس کو برگر کنگ پہ بلائے گا۔ وہاں پاشا بے کو بھی وہ بلا لے گا۔ اسے پتا تھا کہ حیا کو وہ منظر کیسے دکھانا ہے۔ جب وہ اپنے شوہر کو اس ''گمشدہ شہزادے'' کے ساتھ دیکھے گی تو جہان کا کام آسان ہو جائے گا یا تو وہ جان لے گی کہ وہی عبدالرحمٰن ہے یا پھر وہ اسے طیب حبیب کا دوست سمجھے گی، دونوں صورتوں میں وہ اس سے دور چلی جائے گی۔ بھلے ترکی سے نہ جائے، بس استنبول سے چلی جائے۔ بعد میں ہمیشہ کی طرح وہ معذرت کرنے اس کے پاس چلا جائے گا اور اسے منا لے گا۔ مگر وہ وڈیو۔

اس نے گہری سانس لے کر موبائل رکھ دیا۔ وڈیو ابھی تک لاکر میں تھی۔ اگر وہ جانے سے قبل اسے نہیں نکال پاتی تو وہ وڈیو واپس رکھ لے گا۔

حیا یہ سب 9 جون سے 15 جون تک کے وقت میں سیٹ اپ کرنا ہو گا ابھی نہیں۔

وہ ریسٹورنٹ آیا تو طیب حبیب اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے مطالبے وہی تھے اور جہان کا رویہ بھی ویسا ہی تھا۔

''چند دن انتظار کر لو، میں تمہاری فیملی کو باہر بھجوا دوں گا۔ میں نے بات کی ہے، بہت جلد سب کچھ سیٹل ہو جائے گا۔'' وہ بے تاثر لہجے میں کہتے ہوئے رجسٹر چیک کر رہا تھا۔ آج پاشا بے نے جواباً غصہ نہیں کیا نہ ہی اسے لعن طعن کی بس اتنا کہا۔

''میں امید کرتا ہوں تم میرا کام جلد از جلد کر دو گے جہان بے، آخر فیملی سب کے لیے اہم ہوتی ہے۔ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔''

اس کے آخری الفاظ پہ جہان نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ پاشا بے نے کوٹ کا کالر درست کیا، اور الوداعی مسکراہٹ کے ساتھ پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

شاید وہ صرف دھمکی دے رہا تھا۔ وہ اس کی فیملی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ایسے ہی اسے دھمکانا چاہ رہا تھا۔ جہان سر جھٹک کر کام کرنے لگا۔

انسان کا اپنی انفرادی صلاحیتوں پہ حد سے اعتماد بعض دفعہ اسے دوسروں کو انڈر اسٹیمیٹ کرنے پہ مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا، مگر ابھی وہ یہ نہیں جانتا تھا۔

شام میں وہ معمول کے مطابق ریسٹورنٹ کے کچن میں کھڑا گوشت کاٹ رہا تھا، تب اس کا موبائل بلنک سے، جاوہ فون سے سمجھ گیا کہ پیغام کس کی طرف سے تھا۔ مگر اس نے فون جیب سے نہیں نکالا۔ قریب ہی اس کے دو شیف کام کر رہے تھے۔ ایک تو پرانی ورکر تھی، مگر دوسرا ترک لڑکا نیا تھا۔ اس کو جہان نے حال ہی میں رکھا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ ترک ایجنسی کا ہے اور صرف اس کی جاسوسی کے لیے یہاں کام کر رہا ہے۔ اس کو رکھنے کا فائدہ یہ تھا کہ اب وہ اپنی مرضی کی باتیں ترکوں تک پہنچا سکتا تھا۔ ٹرپل ایجنٹ بن کر کام کرنا اس طرح اور بھی آسان تھا۔

اس نے ہاتھ صاف کیے، گوشت رکھا اور خاموشی سے باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ اندر آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور پیغام کھولا۔ چند لمحوں میں اس نے پیغام ڈی کوڈ کیا اور پھر، جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

وہ لڑکا، عمر، وہ نہیں رہا تھا۔ اسے کس نے مارا، کب اور کہاں مارا، کچھ معلوم نہ تھا وقت جیسے ایک دفعہ پھر برسوں پہلے کے انطاکیہ میں پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مٹی کھود رہا تھا، وہ مٹی جس سے آج بھی خوشبو آتی تھی۔ کیا عمر کو دفن ہونے کے لیے مٹی ملی ہوگی۔ کیا اسے خود وہ مٹی مل پائے گی۔

اس کے دل میں تکلیف اٹھ رہی تھی، شدید تکلیف۔ اس نے فون جیب میں ڈالا، ٹونٹی کھولی اور سنک پہ جھک کر چہرے پہ پانی کے چھینٹے مارے، پھر سر اٹھا کر آئینے میں خود کو دیکھا۔ شدت ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ پڑ رہی تھیں۔

دادا کہتے تھے کہ مومن کے لیے دنیا قید خانہ ہوتی ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ اس وقت برگر کنگ ایک قید خانہ ہی تھا۔ وہ سارا کام چھوڑ کر کہیں دور جانا چاہتا تھا، وہ باسفورس کے کنارے بیٹھ کر ڈھیر سارا رونا چاہتا تھا۔ اگر دادا ہوتے تو کہتے، فوجی رویا نہیں کرتے۔ کاش وہ ان سے پوچھ سکتا کہ اگر فوجی کا دل درد سے پھٹنے لگے اور جیسے سارے جسم میں ٹوٹے کانچ اترنے لگیں، تو پھر وہ کیا کرے، کیا دنیا میں رونے سے بہتر دوا بھی کوئی ہوتی ہے۔

''سلام..... جہان کہاں ہے۔ بلند آواز سے اتھل پتھل سانسوں کے درمیان وہ باہر کہیں پوچھ رہی تھی، جیسے وہ دوڑ کر آئی تھی، جہان نے ہولے سے نفی میں سر جھٹکا، تولیے سے چہرہ خشک کیا اور نم آنکھیں رگڑتا باہر آیا۔''

وہ فریڈم فلوٹیلا کے اسٹریٹ پروٹیسٹ کے لیے آئی تھی اور اب وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے۔ جہان اس سے نظریں ملائے بغیر سر جھکائے گوشت کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔ انکھیوں سے وہ دیکھ رہا تھا کہ حیا نے نقاب لے رکھا تھا۔ اس کے نقاب کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے نیا نیا نقاب لینا سیکھا ہے، مگر پھر بھی نقاب نیٹ تھا۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ اتنا بدل کیسے گئی تھی؟ وہ بھی ایک دم سے نہیں، آہستہ آہستہ سے۔ مگر یہ تبدیلی کتنی اچھی لگتی تھی اس میں۔ ابھی وقت تھا نہیں تھا اس خوشی کو جینے کا، ابھی اور موقع تھا، دل میں کچھ مرسا گیا تھا۔

حیا بول رہی تھی مسلسل اور وہ کنکھیوں سے صرف اسے نہیں بلکہ پیچھے کام کرتے اپنے نئے شیف کو بھی دیکھ رہا تھا جس کے ڈریسنگ بناتے ہاتھ ذرا سست پڑ گئے تھے۔ بچہ ذرا کچا تھا، مگر اسے کچا کام نہیں کرنا تھا۔ یہاں کہی گئی ایک ایک بات کہیں اور پہنچائی جاتی تھی، اور یہ پاگل لڑکی ترک فوج کے ایک کارندے کے سامنے اسے کہہ رہی تھی کہ وہ فلسطینیوں کی حمایت کرے۔

گو کہ تربیت کے مطابق وہ کبھی کسی متنازعہ ہنگامے والی جگہوں پہ نہیں جاتا تھا کوئی اور موقع ہوتا تو بھی وہ حیا کو منع کر دیتا مگر پیچھے کھڑا لڑکا سب سن رہا تھا۔ ترک فوج بے حد سیکولر قسم کی فوج تھی جہاں عبداللہ گل، اور طیب اردگان کی حکومت کو ''ماڈرن مولویوں'' کی حکومت کہا جاتا تھا، وہیں ترک فوج اپنے دین سے بے حد متضاد خیالات رکھتی تھی اور اپنی بیوی کو مٹلسن کرنے کے لیے وہ ترکوں کی گڈ بکس سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ نتیجتاً وہ لڑکا تو پرسکون ہو گیا، مگر حیا پچھلی کئی دفعہ کی طرح ایک مرتبہ پھر اس کو اور اس کے ریسٹورنٹ کو جہنم میں بھیج کر غصے سے وہاں سے چلی گئی۔

وہ اس کے پیچھے نہیں گیا۔ اس کا موڈ پہلے ہی بہت خراب تھا، وہ وہیں کھڑا خاموشی سے کام کرتا رہا۔ کام اسے کرنا تھا، کیونکہ حیا کی طرح وہ موڈ خراب ہونے پہ دو چار چیزیں ہاتھ مار کر گراتے ہوئے، ہر کسی کو جہنم میں بھیج کر کہیں دور نہیں جا سکتا تھا۔ یقیناً اس معاملے میں وہ کافی خوش قسمت تھی۔

پوری رات وہ بے حد ڈسٹرب رہا، پھر صبح سب کچھ ذہن سے جھٹک کر وہ گھر سے نکل آیا۔

فیری اس نے کدی کوئے سے پکڑی تھی۔ کدی کوئے شہر کی ایشین سائیڈ کی بندرگاہ تھی اور سبانجی بھی ایشین سائیڈ پہ واقع تھی۔ سو وہ

منہ اندھیرے اس سے ملنے چلا گیا۔
وہ جھیل کے پاس بیٹھی تھی۔ کتابیں سامنے پھیلائے، وہ جیسے کافی دیر روتی رہی تھی۔ اسے بے اختیار وہ رات یاد آئی جب جنجر بریڈ ہاؤس ٹوٹا تھا اور وہ تب بھی ایسے ہی رو رہی تھی۔ اسے ایک لمحے کو اس لڑکی پہ بہت ترس آیا جس کی زندگی اس نے اتنی مشکل بنادی تھی۔
اس کے ساتھ چاندی کے پانی جیسی جھیل کے کنارے بیٹھے وہ بہت دیر تک اسے دھیرے دھیرے بہت کچھ سمجھاتا رہا۔ وہ اسے خواب نہیں دکھانا چاہتا تھا، سو حقیقت میں رہ کر مستقبل کے حوالے سے باتیں کر رہا تھا۔ اٹھنے سے قبل اس نے پھر سے "لندن چلنے کا موڈ ہو تو بتانا" کہا تھا۔ کتنا ہی اچھا ہو کہ وہ ممی کے ساتھ لندن چلی جائے، پھر بعد میں ایک دو روز کے لیے اپنی کلیئرنس کروانے بے شک آ جائے۔ مگر اپنا آخری مہینہ وہ اس شہر میں نہ گزارے اس روز اسے لگا تھا، حیا اس کو اس کی غیر متوقع فطرت کے ساتھ قبول کرنے پہ راضی تھی، مگر اعتبار وہ ابھی تک ان دونوں کے درمیان نہیں قائم ہوا تھا۔ وہ روٹھنے اور منانے سے آگے نہیں بڑھے تھے۔
جس روز اس کے امتحان ختم ہوئے، اس سے اگلے دن وہ بیوک ادا گئی تھی۔ یہ عائشے نے اسے بتایا تھا کیونکہ اب اس کا ٹریسر صرف سبانجی میں پڑا رہتا تھا۔ اس نے دوبارہ اس کو ٹریس کرنے کی خود ہی کوشش کی یا اتنا ضروری نہیں تھا۔
گیارہ جون کی رات وہ ممی کے ساتھ ان کی پیکنگ کروانے میں مصروف تھا جب ممی نے حیا کے بارے میں پوچھا:
"کیا وہ ہمارے ساتھ جائے گی۔"
"پتا نہیں آپ کی بھتیجی کہاں اپنا پروگرام ہمیں بتاتی ہے۔" اس نے شانے اچکا کر لاپروائی سے جواب دیا تھا۔ پھر اس نے سوچا، وہ حیا سے پوچھ ہی لے کہ اس کا کیا پروگرام ہے۔ وہ اپنا آخری مہینہ استنبول میں نہیں تو کدھر گزارے گی۔ یہی سوچ کر اس نے میجر احمد کی طرف سے اسے بس "کیسی ہیں آپ۔" لکھ کر بھیج دیا۔ پتا نہیں وہ کیسی تھی۔ پورے دس دن اس نے حیا کو نہیں دیکھا تھا نہ ہی کوئی بات ہوئی تھی۔
"مجھے جنت کے ان پتوں نے دنیا والوں کے لیے اجنبی بنا دیا ہے میجر احمد!" اس کے جواب میں بہت ٹوٹا بکھرا پن سا تھا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ وہ اس کی عادت کو اتنی اچھی طرح سے جاننے لگا تھا کہ اس کے انداز سے وہ اس کے موڈ کا اندازہ کر لیا کرتا تھا۔
وہ موبائل لے کر کچن میں آ گیا اور بہت سوچ کر ایک ایسا جواب لکھا جو اس وقت اسے تسلی دے سکے۔ یقیناً اس کے نقاب پہ کسی نے کچھ کہہ دیا ہوگا اور وہ دل چھوڑ کر بیٹھی تھی۔ عین ممکن تھا وہ کہنے والے کو ہاتھ میں آئی چیز بھی دے مار چکی ہو یا کم از کم اسے جہنم تک پہنچا چکی ہو۔ پتا نہیں اس کی تسلی ہوئی یا نہیں، مگر اس کا مزید کوئی ٹیکسٹ نہیں آیا۔
صبح وہ بیوک ادا نہیں گیا کیونکہ آج ہفتہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حیا کے حوالے سے کچھ طے کر لے مگر تبھی، کام کے دوران اس کو جواہر مال کے لاکرز کے گارڈ کا پیغام موصول ہوا۔ ایک لڑکی جو سیاہ عبایہ میں تھی، نو نمبر لاکر سے کچھ لے گئی ہے۔
گریٹ۔ وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اسے معلوم تھا اسے کیا کرنا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ سسلی سے واپس سبانجی جاتی، وہ اسے اور پاشا نے دونوں کو اپنے ریسٹورنٹ پہنچنے کا کہہ چکا تھا۔ پاشا بے کا مسکن قریب ہی تھا، سو وہ حیا سے پہلے پہنچ گیا۔
"کیا میرا کام ہو گیا۔" پینٹری میں جا کر اس نے پہلی بات یہی پوچھی تھی۔
"نہیں، اس میں ابھی کچھ وقت ہے، تم تھوڑا صبر نہیں کر سکتے۔" وہ جیسے زچ ہوا تھا۔
"پھر تم کیوں ملنا چاہتے تھے۔"
"ہوٹل گرینڈ کے بارے میں کچھ بات کرنی تھی۔" اس نے پینٹری کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ اپنے پرانے شیف کو وہ سمجھا چکا تھا کہ اسے کس طرح سے حیا کو پچھلی طرف بھیجنا ہے۔ اب پاشا بے کو ہوٹل کے معاملات کے بارے میں بتاتا وہ کنکھیوں سے اس روشن دان کو دیکھ رہا تھا جو اس نے کھول رکھا تھا۔ وہ آئے گی تو اسے سامنے شیلف کے چمکتے شیشے میں روشن دان کا عکس نظر آ جائے گا۔ تب وہ ان کی باتوں سے جان جائے گی کہ دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا چل رہا ہے۔ حسب توقع پاشا بے جلد ہی ہوٹل گرینڈ کی بات ختم کر کے اپنے کام کی طرف آ گیا اور تب ہی وہ اسے روشن دان کے عکس میں نظر آئی۔
وہ جیسے ٹھٹک کر رک گئی تھی۔ وہ بظاہر کیسے اپنے مخصوص انداز میں بات کہے گیا۔ اسے معلوم تھا کہ حیا اندر نہیں آئے گی، اگر اس نے دروازے پہ دستک دی یا گھنٹی بجائی تب وہ فوراً اسے جانے کا کہہ دے گا۔ وہ زبردستی تو اندر نہیں آنا چاہے گی۔ مگر جو ہوا وہ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔
"تمہاری بیوی باہر کھڑی ہے جہان اسے اندر نہیں بلاؤ گے۔" جیسے ہی پاشا بے کی نظر اس پہ پڑی وہ مسکرا کر بولا۔

جہان کو لگا، کسی نے پینٹری کا سارا سامان اس پہ الٹ دیا ہو۔ وہ کیسے جانتا تھا حیا کو۔ یہ ناممکن تھا۔ وہ اسے جہان کی دوست کہتا تو وہ اتنا ششدر نہ ہوتا، مگر جہان کی بیوی۔ اسے کیسا پتا چلا۔ اس بات کا ترکی میں تو کوئی ڈاکومنٹ پروف بھی نہیں تھا، پھر۔

وہ اب اسے حیا کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتا رہا تھا، سبانجی ایکسچینج اسٹوڈنٹ، ڈورم نمبر، وہ سب جانتا تھا۔ ان کی ملاقات بھی ہو چکی تھی۔

حیا نے اثبات میں گردن ہلا کر تصدیق کی، مگر وہ انہی بے یقین نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اگر وہ دونوں مل چکے تھے تو پتا نہیں اس نے حیا کو کیا کیا بتایا ہوگا۔ سب کچھ الٹا ہو گیا تھا۔ اس نے پاشا بے کو واقعی انڈر ایسٹیمیٹ کیا تھا۔

"اس نے بے اختیار پاشا بے کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اگر وہ اس کی بیوی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے کا سوچے بھی تو وہ واقعی اسے جان سے مار دے گا۔ حسب عادت، طیب حبیب پاشا کی مسکراہٹ گمنی۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اسے اس کی بیوی سے غرض نہ تھی، بس کام سے تھی۔ اس کے جاتے ہی وہ حیا کی طرح پلٹا، مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ویمت نے ٹھیک کہا تھا، بعض باتیں سیاق وسباق کے بغیر پیش کی جائیں تو ہیرو کو ولن بنا دیتی ہیں۔ وہ اس کا اعتبار کھو چکا تھا۔ حیا نے اس کی کوئی بات نہیں سنی، وہ فوراً وہ جگہ چھوڑ کر چلی گئی۔

"وہ اسے ترکی سے بھیجنا چاہتا تھا، مگر اس طرح نہیں۔ خود سے بدظن کر کے نہیں، خود کو بے اعتبار کر کے نہیں۔ سب کچھ الٹ گیا تھا۔ بہت دفعہ منصوبے الٹے پڑ جاتے ہیں کوئی بھی انسان ماسٹر پلانر نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی نہیں تھا۔"

دیمت کی بات پوری ہوئی۔ وہ شوہر سے بدظن ہو کر اس سے دور چلی گئی۔ اس نے حیا کو بہت فون کیا، مگر اس نے جہان کی کوئی بات نہیں سنی۔ وہ چلی گئی اور جیسے بوسفورس کا پانی خاموش ہو گیا، سرمئی بگلے اڑنا چھوڑ گئے، ٹیولپس مرجھا گئے اور جیسے سارا استنبول اداس ہو گیا۔

وہ چلی گئی اور اپنا ٹریسر سبانجی کے ڈورم میں ہی چھوڑ گئی۔ ایسا اس نے کبھی نہیں چاہا تھا، مگر ایسا ہو گیا تھا۔ دیمت کی بات پوری ہوئی تھی۔

حیا کے جانے کے بعد ممی اور ابا کی روانگی کے انتظامات بھی مکمل تھے۔ ممی مضبوط عورت تھیں۔ وہ اپنے کام اکیلے دیکھ سکتی تھیں۔ ساری زندگی انہوں نے ایسے ہی گزاری تھی، سو وہ استنبول میں اپنا کام مکمل کر کے جرمنی جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ یہ روپوشی کے دن تھے اور ان دنوں میں وہ سرجری کروا لینا چاہتا تھا۔ وہ تین ہفتے بعد اسے پھر سے ترکی جانا پڑ سکتا تھا، شاید ایک آخری کام کے لیے۔ اس کے بعد ترکی کے باب کو اس کی زندگی سے نکل جانا تھا۔

جرمنی آنے سے قبل وہ طیب حبیب پاشا سے آخری دفعہ ملا تھا۔ اس کی تمام چیزیں اس کے حوالے کرنے سے قبل اس نے صرف ایک بات پوچھی تھی۔ "تم میری بیوی کو کیسے جانتے ہو۔ مجھے صرف سچ سننا ہے۔"

اور طیب حبیب نے سچ بتانے سے انکار نہیں کیا۔ وہ اسے کبھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بقول اس رات جب وہ برگر کنگ کے داخلی دروازے کے ساتھ والی میز پہ چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے بیٹھا تھا، تو اس نے ان دو لڑکیوں کی گفتگو سنی تھی جو وہاں کھڑی تھیں۔ سیاہ اسکارف والی لڑکی دوسری کو اپنی انگوٹھی دکھاتے ہوئے جہان سکندر سے اپنی منگنی اور شادی کا ذکر کر رہی تھی۔ اس لیے وہ ان کے پیچھے گیا، کافی شاپ تک مگر وہ ذرگئیں اور اسٹریٹ میں اس کے آگے بھاگتی واپس برگر کنگ تک آئیں۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اسکوائر تک ضرور آئیں گی، سو وہ وہیں ان کا انتظار کرتا رہا۔ جب رات ڈیڑھ بجے والی بس انہوں نے اسکوائر سے پکڑی تو اس نے ان کا یونیورسٹی کیمپس تک پیچھا کیا اور اگلے روز اس نے ایک جاننے والے سے کہہ کر وہ تمام معلومات نکلوا لیں جو وہ حیا کے متعلق یونیورسٹی سے نکلوا سکتا تھا۔"

اس نے طیب کو اس کے ڈاکومنٹس دے دیے، پھر بیوک ادا جا کر آنے کو بالآخر وہ خبر سنا دی جس کا انتظار کرتے انہیں ایک ڈیڑھ برس بیت چکا تھا۔ ان کا بیٹا مل گیا تھا، وہ ایران میں تھا، اور اس کے کچھ دشمن استنبول اس کی واپسی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اتنے عرصے بعد پہلی دفعہ طیب حبیب نے اپنی ماں کو فون کیا، آنے خوشی وتشکر سے بے حال تھیں۔ جب طیب حبیب نے چاہا کہ وہ تینوں اب اس کے پاس ایران چلی آئیں تو آنے بخوشی راضی ہو گئیں۔ اب عائشے کی باری تھی۔ آنے نے اپنے طور پہ اور جہان نے اپنے طور پہ اس کو ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ وہ صبر شکر والی لڑکی تھی، اور وہ جانتا تھا کہ وہ سمجھ چکی ہے کہ وہ وقت آن پہنچا ہے جب اس مصنوعی رشتے کی ڈور ٹوٹ جائے گی۔ عبدالرحمٰن ان کی زندگیوں سے نکل جائے گا اور وہ ایک دفعہ پھر ایک نارمل فیملی کی طرح رہیں گے۔

عائشے نے صبر کر لیا۔ ساری اذیت دل میں دبا کر وہ روانگی کے لیے پیکنگ کرنے لگی۔

وہ بہارے کو رونے اور عائشے کی چپ سے اندر ہی اندر بہت ڈسٹرب ہوا تھا۔ یہ سب اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کا

"کانٹیکٹ" (طیب حبیب) ادھر نہیں رہ سکتا تھا۔ عائشے اور بہارے کو عبدالرحمٰن کو بھلانے کے لیے ایک عرصہ لگے گا، اس کے بعد وہ ساری زندگی کسی اجنبی پہ اعتبار نہیں کر سکیں گی۔ وہ اپنے اندر کی بہت ساری تلخی ان کی زندگیوں میں چھوڑ کر جا رہا تھا، مگر وہ کیا کرتا یہی اس کی جاب تھی۔

ممی کو ابھی ترکی سے جانے میں چند دن تھے، مگر اس کا کام ختم تھا، سو وہ جرمنی چلا آیا۔ جس روز اس کی سرجری متوقع تھی، اس صبح اس نے حیا کو فون کیا۔ وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ وہ بیمار ہے، اس کی سرجری ہے، وہ اس کے لیے دعا کرے، مگر وہ کسی اور موڈ میں تھی۔ اسے زیادہ فکر فلیش ڈرائیو کے پاس ورڈ کی تھی۔

ایک لمحے کو اس کا جی چاہا، وہ اسے بتا دے کہ پاسورڈ، پاسورڈ ہی ہے۔ دنیا کا آسان ترین پاسورڈ۔ وہ ویڈیو کھولتے ہی اسے کال بیک کرے گی۔ وہ آج ہی، آپریشن ٹیبل پہ جانے سے قبل ہی اس کی آواز سن لے گا، مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اپنی کہہ کر اس نے بہت خشک لہجے میں تمام تعلقات منقطع کرنے کا مژدہ سنایا اور فون رکھ دیا۔

بے حد اضطراری کیفیت میں جہان نے پھر سے اس کا نمبر ڈائل کیا، مگر اب وہ فون اٹھانے سے بھی انکاری تھی۔ وہ جہان سے بھی بدظن تھی اور وہ اپنے نمبر سے کال کر کے کسی لمبی چوڑی صفائی کے موڈ میں نہ تھا، سو بددلی سے اس نے فون ایک طرف ڈال دیا۔

آپریشن سے قبل ڈاکٹر نے آخری دفعہ پوچھا تھا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم آپریٹ کروانا چاہتے ہو؟"

وہ اس وقت آپریشن ٹیبل پہ لیٹا تھا، ہسپتال کے سبز گاؤن میں ملبوس، اس کا چہرہ بھی پژمردہ سا لگ رہا تھا۔ آخری دفعہ اس نے آپریشن تھیٹر کی چھت، لائٹس اور تیار ہوتے ڈاکٹرز اور اسٹاف کو دیکھا اور سر ہلا دیا۔ وہ اپنے رسک پہ سرجری کروا رہا تھا، سارے سود و زیاں اس کے کھاتے میں ہی لکھے جانے تھے۔

جب اینستھیزیا دینے ایک ڈاکٹر اس کے قریب آیا تو اس کا جی چاہا، وہ انہیں روک دے۔ وہ سرجری نہیں چاہتا تھا۔ وہ اندھا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ اپاہج نہیں ہونا چاہتا تھا، مگر الفاظ نے جیسے ساتھ چھوڑ دیا۔ چہرے پہ ماسک لگتے وقت اس کا سارا جسم سن پڑ تا گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ جیسے سیاہ مخمل کا کوئی پردہ ہو۔ جیسے بنا تاروں کے رات کا آسمان ہو۔

کتنے گھنٹے گزرے، کتنے پہر بیتے، وہ نہیں جانتا تھا۔ جب حسیات لوٹیں تو پلکوں سے ڈھیر سارا بوجھ سا اترا۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ وہ ہسپتال کے لباس میں ہی تھا، مگر کمرہ مختلف تھا۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ دھندلا منظر واضح ہوا۔ وہ اب دیکھ سکتا تھا۔

کیا اس کا آپریشن کامیاب ہوا تھا۔

نرس اسے جاگتے دیکھ کر فوراً باہر چلی گئی۔ اس کی واپسی اس کے سرجن کے ساتھ ہوئی۔

"ہو گیا؟" اس نے ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے لبوں کو ذرا سی جنبش دی۔

"نہیں۔ ہم نے آپریٹ نہیں کیا۔" ڈاکٹر اس کے قریب آئے، اور بتانے لگے۔ "تم بے ہوشی کے دوران بار بار کہہ رہے تھے کہ ہم تمہیں جانے دیں، تمہاری ماں کو تمہاری ضرورت ہے۔ اس کے بعد میں یہ آپریشن نہیں کر سکتا تھا۔ رسک فیکٹر تم جانتے ہو۔"

"اوہ!" ایک تھکی ہوئی سانس لبوں سے خارج کر کے اس نے آنکھیں موند لیں۔

"تم کچھ وقت لے لو، خود کو ذہنی طور پہ تیار کر لو، پھر ہم سرجری کریں گے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہسپتال سے چھٹی ملنے پہ وہ اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ ڈاکٹر ٹھیک کہتا تھا۔ اسے یہ خطرہ مول لینے سے قبل خود کو مکمل طور پہ راضی کرنا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے، اس نے اپنا ترکی والا نمبر آن کیا اور ایک ایک کر کے وائس میسج سننے لگا جو نمبر بند ہونے پہ کالرز نے ریکارڈ کروائے تھے، چوتھا میسج ممی کا تھا۔

"جہان! کیا تم شہر میں ہو۔ تمہارے ابا کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ میں انہیں ہسپتال لے کر جا رہی ہوں۔"

وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا، اور جلدی سے اگلا میسج کھولا۔

"جہان! تمہارے ابا کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" اسے لگا، کسی تیز رفتار ٹرک نے اسے کچل دیا ہے۔ وہ بالکل سن سا رہ گیا۔ ممی کے میسجز کے بعد دیگرے فون پہ چل رہے تھے۔

"میں باڈی لے کر پاکستان جا رہی ہوں۔"

"تم جہاں بھی ہو، کوشش کرنا کہ جنازے پہ پہنچ جاؤ۔"

"الفاظ تھے یا چابک۔ اس کی ماں کو اس کی کتنی ضرورت تھی، وہ کتنی اکیلی ہوں گی، وہ کتنی دکھی ہوں گی، سب بے حساب تھا۔ وہ مشکل وقت میں ان کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ وہ مشکل وقت میں کبھی ان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔"

ابا چلے گئے اور وہ ان کا آخری چہرہ بھی نہیں دیکھ سکا۔ زندگی بھی بعض دفعہ ہماری مرضی سے زیادہ قربانیاں مانگ لیتی ہے۔

پاکستان جلد از جلد پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس کی آزادی کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں تھی اجازت، پروٹوکول، احتیاط اور ابا کے جنازے کے تیسرے دن اسلام آباد پہنچ سکا۔ اگر وہ ڈی ایکٹیویٹ نہ ہوتا تو شاید تب بھی نہ پہنچ سکتا۔ جب حیا کی دوست کی ڈیتھ ہوئی تھی، تب حالات فرق تھے۔ اب حالات دوسرے تھے۔

اس رات جب وہ ایئرپورٹ پہ پہنچا تو سب سے پہلے اس نے حیا کو کال کی۔ وہ اس کے گھر کا راستہ جانتا تھا مگر اس کو پہلے قبرستان جانا تھا۔ وہ پچھلی تین چار راتوں سے مسلسل حالت سفر میں تھا اور بمشکل سو پایا تھا۔ سر درد بھی ویسا ہی تھا۔ اسے اپنے باپ اور دادا سے ملے بغیر سکون نہیں مل سکتا تھا۔

حیا خاموش خاموش سی تھی۔ اس کی خفگی، گریز، سنجیدگی، وہ سب سمجھ رہا تھا۔ وہ اسے قبرستان لے گئی۔ اپنے باپ اور دادا کی قبروں کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھے، اس نے بہت سے بیتے لمحوں کو یاد کرنا چاہا۔ تلخ باتیں، کڑوے لمحے۔ ادھوری یادیں، پورے دکھ۔

وہ گھر آئے تو حیا نے اسے اس کا کمرہ دکھایا۔ وہ جوتوں سمیت بستر پہ اس ارادے سے لیٹا کہ ابھی چائے پیئے گا، پھر ممی کے اٹھنے کا انتظار کرے گا۔ وہ فجر پہ اٹھیں گی تو وہ ان سے مل لے گا، مگر تھکن اور سر درد کے باعث اس کی وہیں آنکھ لگ گئی۔

جب وہ جاگا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پہ ابھی تک چائے کی پیالی رکھی تھی۔ حیا اس کے لیے فوراً چائے لے آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا، اس کی خفگی اتنی نہیں تھی کہ وہ اسے دور نہ کر سکے۔

وہ فریش ہو کر نیچے آیا تو فرقان ماموں سمیت سب وہاں تھے۔ حیا گھر پہ نہیں تھی۔ وہ اپنی دوست کے ساتھ شاپنگ پہ گئی تھی۔ حیا اور حیا کے شوق!

فرقان ماموں، اور صائمہ ممانی اسے باتوں باتوں میں کافی سنا گئے۔ ان کے نزدیک اس کا رویہ قابل مذمت تھا۔ بیٹا باپ کے جنازے پہ نہ پہنچے، ایسی بھی کیا مصروفیت۔ وہ خاموش رہا۔

رات کھانے پہ فاطمہ مامی نے اس کا پروگرام پوچھ کر بہت اپنائیت سے کہا تھا۔

"الگ اپارٹمنٹ کی کیا ضرورت ہے۔ یہی گھر ہے سبین کا۔"

وہ کتنے ہی دن بعد پہلی دفعہ مسکرایا۔ وقت کیسے بدلتا ہے، لوگ کیسے بدلتے ہیں، رشتے کیسے بدلتے ہیں۔

فاطمہ مامی کی خواہش بھی بجا تھی، مگر اسے لگتا تھا اس کے نصیب میں پاکستان میں رہنا لکھا ہی نہیں ہے۔ ہاں شاید جب وہ ترکی کے لیے ناکارہ ہو جائے تو کچھ عرصہ یہاں رہ جائے۔ مگر اپنے پلانز وہ ان لوگوں سے ابھی شیئر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حیا اس سے ویسی ہی کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ کبھی شاپنگ کے بہانے، کبھی کسی اور کام کے لیے وہ اس کو ساتھ لے جاتا، اس سے ہلکے پھلکے انداز میں بات کرنے کی کوشش کرتا، لیکن وہ ریزرو ہی رہتی۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے، مگر وہ خاموش تھی۔ ہاں جب بھی وہ اسے دیکھ رہا ہوتا، وہ محسوس کر کے چونکتی اور فوراً اس کی طرف دیکھتی، مگر اس کے چونکنے اور گردن موڑنے تک وہ نگاہوں کا زاویہ بدل چکا ہوتا تھا۔

بالآخر فرقان ماموں کی بیٹی کی منگنی کی رات اس نے حیا سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کافی بنا کر اس کے پاس آیا تو اس نے دیکھا، حیا نے وہی موتیوں والے ایئررنگز پہن رکھے تھے جن کی وجہ سے عائشے بہت ہرٹ ہوئی تھی۔

وہ دونوں چھت پہ جھولے پہ جا بیٹھے تو اس نے طیب حبیب کا ذکر چھیڑا کہ وہ اس کو کیسے جانتی ہے۔

"عبدالرحمن پاشا۔ امت اللہ حبیب پاشا کا بیٹا۔" حیا کی بات پہ وہ چونکا۔

عبدالرحمن۔ اوہ۔ وہ غلط سمجھی تھی۔ اس نے طیب حبیب کی تصویروں کو عبدالرحمن سمجھا تھا وہ تو تصاویر ہی نہیں بنواتا تھا۔ صرف ایک تصویر تھی بہارے کے پاس اس کی ورنہ گھر میں تو ساری تصاویر طیب حبیب کی تھیں۔

جواب میں وہ اسے پوری روداد سنائے گئی۔ وہ بالکل خاموشی سے سنے گیا۔ وہ سب پہلے سے جانتا تھا، سو کیا تبصرہ کرتا۔ صرف ایک بات نئی تھی۔ حیا نے پاشا بے پہ کافی الٹی تھی۔ ویری گڈ پاشا بے نے یہ بات نہیں بتائی تھی، مگر وہ اپنی بیوی کی خداداد صلاحیتوں کو کیسے بھول گیا۔

حیا نے ابھی تک وہ یوایس بی فلیش نہیں کھولی تھی، سو وہ چند آدمی بچی، آدھی فرضی وضاحتوں سے اس کو وقتی طور پہ مطمئن کر کے بات ختم کر گیا۔ اصل بات یہ تھی کہ ان کے درمیان اعتبار کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ حیا نے اپنی طرف کی ساری کہانی سنا ڈالی تھی۔ وہ بھی اپنی کتھا سنا چکا تھا، مگر حیا نے ابھی وہ سنی نہیں تھی۔

سلیمان ماموں کو جانے کس بات پہ روحیل پہ شک پڑ گیا تھا انہوں نے اس سے پوچھا مگر وہ دامن بچا گیا۔ اسے اپنی ڈیل نبھانی تھی۔ مگر ماموں کو علم ہی ہو گیا۔ ان کی روحیل سے اچھی خاصی بحث ہوئی، اور پھر وہ ایک دم ڈھے سے گئے۔

فاطمہ ممانی اور حیا پہ وہ دن بہت بھاری تھے۔ وہ دونوں دکھ سے نڈھال تھیں۔ کیا ہوا جو سلیمان ماموں ان کے برے دنوں میں ان کے ساتھ نہیں تھے اور ممی تو ان کا ساتھ دے سکتے تھے نا۔

وہ جانتا تھا جب باپ ناکارہ ہو جاتا ہے تو رشتے دار بدل جاتے ہیں۔ اس نے حیا کو اپنے رشتے داروں سے ہوشیار رہنے کا کہا اور پھر حالات ایسے بنتے گئے کہ حیا نے اپنے ابا کے آفس جانا شروع کر دیا۔ اس نے جہان سے مدد مانگی مگر وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ اس کو چند دن میں واپس ترکی چلے جانا تھا، اس لیے بہتر تھا وہ خود کو اپنی بیوی کی بیساکھی نہ بنائے۔

آج کل اس نے حیا سے اس کی کار لے رکھی تھی۔ اسے اپنے کاموں کے لیے جانا ہوتا تھا، سو اسے یہ کار ہتھیانی تھی، اور حیا کو اری ٹیٹ کرنا دنیا کا سب سے آسان کام تھا۔ وہ اس کی ڈکٹیشن سے اتنا تنگ پڑی کہ کار کی چابی از خود اس کے حوالے کر دی۔

اس رات جب وہ گھر واپس پہنچا تو دیکھا وہ سیڑھیوں پہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ قریب پہنچنے پہ حیا کی گاڑی میں اس نے دیکھا، وہ رو رہی تھی۔ وہ ایک دم بہت پریشان ہو گیا۔ شاید اس نے ویڈیو کھول لی ہو اور اب اس سے ناراض ہو۔ وہ کچھ بھی بتائے بنا اندر بھاگ گئی۔ اس نے فوراً ممی کو جا لیا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ فرقان ماموں نے وہی کیا تھا جو وہ ہمیشہ کرتے تھے۔ اسے بہت دکھ ہوا۔ سوچا صبح حیا سے بات کرے گا۔ مگر صبح وہ جلدی آفس چلی گئی۔ سو دوپہر میں اس نے حیا کو لنچ پہ بلایا۔ اسے اپنی بیوی کو کچھ خاص بتانا تھا۔ جب وہ بتا چکا تو کھانا آ گیا۔ وہ نقاب کے اندر سے بہت اعتماد اور سکون سے کھا رہی تھی، پھر ایک دم وہ بولی

”تمہیں اچھا لگتا ہے میرا یوں نقاب لینا۔“

وہ بے اختیار چونکا اور پھر اس نے تائید تو کر دی، مگر وہ الجھ گیا تھا۔ کیا وہ نقاب اس کے لیے کرتی تھی۔ وہی پرانی شک کرنے کی عادت۔ وہ واقعتاً قدرے بے یقین ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے سوچا کہ جانے سے قبل حیا سے اس بارے میں بات ضرور کرے گا۔

جس دن اس کے نانا کی برسی تھی، اس شام فاطمہ ممانی نے اسے لاؤنج میں روک لیا۔ وہ ذرا جلدی میں تھا، مگر اتنا بھی نہیں کہ ان کی بات نہ سنتا۔ ابھی اس کی فلائٹ میں وقت تھا۔ ممی کو اس نے صبح ہی بتا دیا تھا، اور حیا کو وہ بتا دے گا اگر ملاقات ہوئی نہیں تو ممی بتا دیں گی۔

”کیا تم حیا کو سمجھا نہیں سکتے۔“ فاطمہ ممانی بہت مان سے اس کو کہہ رہی تھیں کہ وہ حیا کو سمجھائے تا کہ وہ اپنی ضد چھوڑ دے۔ وہ تحمل سے سنتا گیا۔ حیا آ گئی تو ممانی چلی گئیں۔ دونوں کے درمیان ذرا تناؤ تھا۔ ان کے جانے کے بعد کچھ سوچ کر وہ اس کے پاس آیا۔

اس رات باہر بہت زور کی بارش ہو رہی تھی۔ اس برستی بارش کے دوران اس نے حیا سے جاننا چاہا کہ وہ اس کے لیے اپنا نقاب چھوڑ سکتی ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا کہ وہ ایسا چاہتا ہے، بس یہی کہا کہ اگر وہ ایسا کہے۔ مگر چند ہی لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کے لیے یہ سب نہیں کر رہی۔ اسے جہان کی مورل سپورٹ بھی نہیں درکار تھی۔ اس نے خود کو بہت مضبوط کر لیا تھا۔

اب مزید کیا پرکھنا۔ کوئی وضاحت، کوئی امید، کچھ بھی تھمائے بغیر وہ وہاں سے چلا آیا۔ اسے جانا تھا۔ اس کا کام اس کا انتظار کر رہا تھا۔

یہاں سے اسے پہلے استنبول جانا تھا۔ اگر وہاں کچھ کرنے کو نہ رہ گیا تو وہ وہیں چلا جائے گا جہاں کے بارے میں چند روز قبل وہ حیا کو بتا چکا تھا۔ وہ اس پاک اسپائی کی طرح کسی گمنام قبر میں نہیں دفن ہونا چاہتا تھا۔ اگر وہ واپس نہیں آتا تو کم از کم اس کی بیوی کو اتنا تو معلوم ہو کہ اس کی قبر کہاں ڈھونڈنی ہے۔

۞۔۔۔۞۔۔۔۞

باب 13

ایک زوردار ٹکر نے اسے سڑک کے ایک جانب لڑھکا دیا۔
ولید کی گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔
وہ اوندھے منہ نیچے گری تھی۔ دایاں گھٹنا، دایاں پاؤں، بہت زور سے سیڑھیوں سے ٹکرایا تھا۔ وہ شاید سیڑھیوں پہ گر گئی تھی۔ پورا دماغ جیسے لمحے بھر کو شل سا ہو گیا تھا۔
''امی!'' وہ درد سے کراہی۔ ہونٹ اور ٹھوڑی پہ جلن سی ہو رہی تھی۔ بدقت اس نے سیدھے ہونا چاہا۔ ساتھ ہی نقاب کھینچ کر اتارا۔ ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس میں سے خون نکل رہا تھا۔
''حیا باجی.....'' کوئی دور کہیں اسے پکار رہا تھا۔ اپنا دکھتا سر سہلاتے ہوئے وہ بمشکل اٹھ بیٹھی۔ ولید نے اسے گاڑی تلے دے دیا تھا کیا؟ مگر وہ ٹکر کھا کر سڑک کے ایک طرف گر گئی تھی، سوبچ رہی۔ اسے کندھے پہ شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ کسی نے شاید اسے کندھے سے پکڑ کر دائیں جانب دھکا دیا تھا۔
دھیرے دھیرے بیدار ہوتے حواسوں کے ساتھ اس نے گردن موڑی۔ ظفر دور سے بھاگتا آ رہا تھا۔ ولید کی گاڑی کہیں نہیں تھی۔ پارکنگ ایریا میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور تب اس کی نگاہ روش پہ پڑی جہاں سے ابھی ابھی ولید کی گاڑی گزری تھی۔ صرف ایک لمحہ لگا اس کے دماغ کو سامنے نظر آتے منظر کو سمجھنے میں، اور دوسرے ہی پل اس کی ساری توانائی جیسے واپس آ گئی۔ وہ بدحواس سی ہو کر اٹھی۔
''تایا ابا۔'' قدرے لنگڑا کر چلتی وہ ان تک پہنچی۔ وہ زمین پہ گرے ہوئے تھے۔ ان کو چوٹ کس طرح سے لگی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، مگر ان کا سر پھٹ گیا تھا اور پیشانی سے سرخ خون ابل رہا تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے کراہ رہے تھے۔
''تایا ابا..... تایا ابا.....!'' وہ وحشت سے انہیں جھنجھوڑنے لگی۔ ظفر دوڑتے قدموں سے اس تک آیا تھا۔
''بڑے صاحب..... یا اللہ..... وہ آپ کو پکار رہے تھے، آپ سن نہیں رہی تھیں۔'' اس نے پریشانی سے حیا کو دیکھا پھر گڑبڑا کر چہرہ نیچے کر لیا۔
''ان کو گاڑی سے ٹکر لگی ہے ظفر؟ اوہ خدایا! وہ مجھے بچاتے بچاتے۔'' شدت جذبات سے وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ اپنے ہاتھ اس نے تایا ابا کے ماتھے سے ابلتے خون پہ دبا کر رکھے تو لمحوں میں ہاتھ گیلے، سرخ ہو گئے۔ تایا بند ہوتی آنکھوں سے نقاہت سے سانس لے رہے تھے۔
''وہ آپ کو آواز دے رہے تھے۔ آپ آگے سے نہیں ہٹیں تو وہ.....'' ظفر اسے پیش آنے والا واقعہ بتا رہا تھا مگر اس وقت یہ سب غیر ضروری تھا۔ بمشکل اس نے حواس مجتمع کر کے سوچنا چاہا کہ سب سے پہلے اسے کیا کرنا ہے۔
''ان کا..... ان کا خون بہہ رہا ہے۔ فرسٹ ایڈ باکس بھی نہیں ہے۔ کیا کروں۔'' اس نے پریشانی سے کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ ظفر اس سے بھی زیادہ حواس باختہ لگ رہا تھا۔ آفس بلڈنگ بھی بند ہو گئی تھی۔ نہ ہوتی تب بھی یہ جگہ بلڈنگ کی پشت پہ تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا جسے مدد کے لیے بلا پاتی۔
''جاؤ دیکھو، گاڑی میں کوئی کپڑا ہے تو لے آؤ۔ پہلے ان کا خون روکنا ہے، پھر ہسپتال لے چلتے ہیں۔''
''پتا نہیں جی! آپ کی گاڑی ہے، کدھر رکھا ہو گا آپ نے؟'' وہ دیکھ کر واپس آیا اور شدید بدحواسی کے عالم میں بھی اپنے قدموں کو دیکھتے ہوئے بتایا۔
''اوہ خدایا..... میں کیا کروں؟'' اس نے گردن ادھر ادھر گھمائی۔ اس کا سیاہ پرس سیڑھیوں کے قریب گرا پڑا تھا۔
''ظفر!'' اس نے پکارا، مگر وہ نیچے دیکھتا رہا۔
''ظفر، میری بات سنو!'' وہ دبی دبی چلائی۔
''پہلے تسی منہ تے ڈھکو۔'' وہ ہکلا گیا تھا۔

"افوہ! میری بات سنو۔ جاؤ میرا پرس اٹھا کر لاؤ۔" کہنے کے ساتھ ہی ظفر اٹھا اور بھاگ کر اس کا پرس لے آیا۔ پرس میں کچھ بھی ایسا نہ تھا۔ تایا کے سانس کی ہلکی ہوتی آوازیں ویسی ہی سنائی دے رہی تھیں۔ خدایا! وہ کیا کرے۔ زخم شاید بہت بڑا نہ تھا، مگر بڑھاپے کو پہنچتی عمر میں یوں گرنا بہت تشویش ناک تھا۔

"تایا ابا! پلیز آنکھیں کھولیں۔ ہم آپ کو ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ مگر پلیز آنکھیں کھولیں۔"

تایا فرقان نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں اور سر کے اثبات سے بتانا چاہا کہ وہ ٹھیک ہیں، پھر آنکھیں بند کر دیں۔ وہ ان کا ابلتا خون کیسے روکے۔ عبایا کرنے والی لڑکیوں کی اکثریت کی طرح وہ عبایا کے نیچے دوپٹا نہیں لیتی تھی، سو کچھ بھی نہیں تھا کہ تایا کے زخم پہ رکھتی... مگر نہیں۔ اس نے تیزی سے تایا کے ماتھے سے ہاتھ ہٹایا، اپنی اسٹول کی پن کھینچی اور اسے سر سے اتارا۔ کیچر میں جکڑے بالوں کا جوڑا ڈھیلا ہو کر گردن کی پشت پہ آ گرا۔ چہرے کے گرد سے لٹیں نکل کر اطراف میں جھولنے لگیں۔

تایا نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس نے سیاہ کپڑے کو جلدی جلدی گول مول لپیٹ کر ان کے ماتھے کے زخم پہ دبا کر رکھا۔ تایا نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

"ظفر! گاڑی ادھر لے آؤ۔ ان کو جلدی سے ہسپتال لے چلتے ہیں؟" اس نے ایک ہاتھ سے تایا کے زخم کو کپڑے سے دبائے، سر اٹھا کر ظفر کو دیکھا۔ وہ ہکا بکا سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ظفر! گاڑی ادھر لے کر آؤ۔" وہ غصے سے زور سے چلائی۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہوا اور گاڑی کی طرف بھاگا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں تایا کو سہارا دے کر کار میں ڈال رہے تھے۔

"فرخ کہاں ہے۔ کیا وہ گھر پہ تھا؟" کار میں بیٹھتے ہوئے اسے تایا کے دوسرے نمبر کے بیٹے کا خیال آیا جو ہاؤس جاب کر رہا تھا۔

"نہیں جی، فرخ بھائی کی آج کال تھی۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔" ظفر نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بے چینی سے بیک ویو مرر میں اس کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے ہسپتال لے چلو۔ جلدی کرو۔" وہ پچھلی سیٹ پہ تایا کے ساتھ بیٹھی ابھی تک ان کے زخم کو سیاہ کپڑے سے دبائے ہوئے تھی۔

"مگر باجی! آپ ایسے کیسے جائیں گی؟" ظفر کو تایا سے زیادہ اس کی فکر تھی۔

"افوہ، جو کہا ہے وہ کرو...... تیز چلاؤ گاڑی۔"

ظفر چپ ہو گیا مگر وہ بے حد غیر آرام دہ تھا۔ چند ہی منٹ بعد اس نے کار گھر کے گیٹ کے سامنے روکی۔ حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ گھر ہسپتال کے راستے میں ہی تھا مگر انہیں وہاں رکنا نہیں تھا۔

"ایک منٹ باجی، میں آیا۔"

"ظفر! وہ اچنبھے سے آوازیں دیتی رہ گئی وہ مگر گیٹ کے اندر جا چکا تھا۔

پورا منٹ بھی نہیں گزرا جب وہ دوڑتا ہوا واپس آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا، دروازہ بند کیا، ایک دوپٹا اس کی طرف اچھالا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

"اوہ ظفر!" اس نے جیسے تھک کر نفی میں سر ہلایا پھر تہہ شدہ سفید دوپٹا کھولا اور لپیٹ کر سر پہ لے لیا۔ وہ صائمہ تائی کا دوپٹا تھا، وہ پہچانتی تھی۔ تایا نیم وا آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"اتنا وقت دوپٹا لانے میں ضائع کر دیا تم نے۔ خیر تھی ظفر! میں ایسے ہی چلی جاتی۔"

جواب میں ظفر نے ہولے سے سر جھکا۔

"دو خاندانوں میں وخت ڈال کر اب حیا باجی کہتی ہیں کہ میں ایسے ہی چلی جاتی۔" زیر لب وہ خفگی سے بڑبڑایا تھا۔

اسے ایک دم زور سے ہنسی آئی، مگر بمشکل وہ دبا گئی۔ اس بدتمیز ظفر کو تو وہ بعد میں پوچھے گی۔

فرخ ہسپتال میں ہی تھا۔ تایا کو فوری طور پہ داخل کر لیا گیا۔ انہیں کار سے ٹکر نہیں لگی تھی، بس اسے آگے دھکیلتے وہ خود بھی توازن برقرار نہیں رکھ پائے تھے۔ معمر آدمی کے لیے گرنا ہی بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مگر فرخ کا کہنا تھا کہ اتنی تشویش کی کوئی بات نہیں معمولی چوٹیں ہیں ٹھیک

ہو جائیں گی۔

ایک تو پتا نہیں ان ڈاکٹرز کو اتنے بڑے پیمانے پہ چیر پھاڑ کرنے کے بعد بھی اچھے خاصے زخم بھی معمولی کیوں لگتے ہیں۔

"گھر فون مت کرنا ابھی۔ سب خوامخواہ پریشان ہو جائیں گے۔ ویسے بھی ٹانکے لگوا کر ان کو گھر لے جائیں گے اور تمہیں تو چوٹ نہیں آئی؟" فرخ اسے تایا ابا کی حالت کے بارے میں بتانے کے بعد مڑنے لگا تو ایک دم جیسے اسے خیال آیا۔

"نہیں! میں ٹھیک ہوں۔ تھینک یو۔" اس نے نہیں بتایا کہ اس کا دایاں گھٹنا اور پاؤں دکھ رہا ہے۔ وہ جہان سکندر کی بیوی تھی۔ اتنے معمولی زخموں کو لے کر کیوں پریشان ہوتی۔ جہان...... پتا نہیں وہ کب تھا اس نے کب بتایا کہ وہ کدھر جا رہا ہے؟ اس کا ذہن پھر اس نہج پہ بھٹکنے لگا تب ہی فرخ نے کہا۔

"تم ظفر کے ساتھ گھر چلی جاؤ، ابا خیریت سے ہیں۔" اس نے شائستگی سے پیشکش کی تھی۔ ایک زمانے میں وہ، صائمہ تائی کے بقول اس کو پسند کرتا تھا، مگر جب سے وہ ترکی سے آئی تھی اس کے پردے کے باعث یا پھر جہان کی آمد کے باعث وہ محتاط ہو گیا تھا۔

"میں تایا کو یہاں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ میں تم لوگوں کے ساتھ ہی جاؤں گی۔"

فرخ گہری سانس لے کر آگے بڑھ گیا۔ ابا کو اس نے وہیں سے کال کر کے اطلاع دے دی تھی۔ یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی کسی کو مت بتائیں۔ ذیشان انکل ابا کے ساتھ ہی گھر پہ تھے۔ انہوں نے ابا کو بتایا تھا کہ حیا صبح ان کے آفس آئی تھی مگر جلدی واپس چلی گئی۔ اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ کیا وہ آج کا ہی دن تھا؟ یوں لگتا تھا کہ اس بات کو صدیاں بیت گئیں۔

"اوہ ابا! ان سے معذرت کر لیں۔ مجھے کچھ کام یاد آ گیا تھا۔"

پھر اس نے ان دونوں کو ولید کے متعلق بتایا۔ وہ کوئی چھوٹی بات تو نہیں تھی۔ اقدام قتل تھا اور زد میں تایا فرقان اصغر بھی آئے تھے۔ ابا کا غم و غصے سے برا حال تھا۔ اس نے انہیں خود آنے اور گھر میں سے کسی کو بھی بتانے سے منع کر دیا کہ وہ لوگ بس واپس آ ہی رہے تھے۔

رات ابھی زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی جب وہ فرخ اور ظفر کے ساتھ تایا ابا کو لے کر گھر پہنچے۔ تایا چل سکتے تھے، مگر سہارا لے کر۔ ایک طرف سے ان کو فرخ نے سہارا دے رکھا تھا۔ دوسری طرف سے حیا نے ان کا بازو تھام رکھا تھا۔ گھر کے داخلی دروازے پہ وہ بے اختیار رکی۔

ایک دم سے بہت کچھ یاد آیا تھا۔ وہ تو اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔

"چلو حیا! میں زیادہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔" تایا نے نقاہت بھری آواز میں اسے جیسے اکتا کر ڈانٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت سا پانی جمع ہونے لگا۔ بمشکل جی کہہ کر وہ ان کے ہمراہ چوکھٹ کے اندر آئی۔

لاؤنج میں بیٹھے تمام افراد چونک کر کھڑے ہوئے۔

اس نے سیاہ عبایا پہ سفید ستاروں والے دوپٹے سے ترچھا سا نقاب لے رکھا تھا۔ ایک وہ رات تھی جب اسی جگہ سے تایا نے اسے سب کے سامنے بے عزت کر کے نکالا تھا۔ اور ایک آج کی رات تھی جب وہ اس حالت میں اس گھر میں داخل ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ تایا نے پکڑ رکھا تھا، تایا کا بیٹا ان کے ساتھ تھا اور اس نے جس دوپٹے سے نقاب لے رکھا تھا وہ صائمہ تائی کا تھا۔

"کیا ہوا فرخ...... حیا!" صائمہ تائی، سونیا بھابھی، ارم سب پریشانی سے دوڑے چلے آئے۔ فرخ سب کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ وہ بس خاموشی سے تایا کو سہارا دے کر ان کے کمرے تک لانے میں مدد دے رہی تھی۔ تایا ابا نے بیڈ پہ لیٹنے تک اس کا ہاتھ تھامے رکھا تھا۔

سارے گھر والے پریشان اور متاسف سے ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ تایا لیٹ گئے تو اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ علیحدہ کیا اور ان کا تکیہ درست کیا۔ تب انہوں نے پوچھا۔

"کیسے ہوا یہ سب؟" صائمہ تائی پریشانی سے پوچھ رہی تھیں۔

"ولید لغاری نے ہمیں کار سے ٹکر ماری تھی اور وہ بھی جان بوجھ کر۔"

"کون ولید لغاری؟" ارم ذرا حیرت سے چونکی۔

"کمپنی میں ہمارا شیئر ہولڈر ہے، عمیر لغاری کا بیٹا۔" تایا کی گردن تلے تکیے رکھتے وہ سب کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

چونکہ وہ اس کمرے میں تھی، اس لیے فرخ خود ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔

"حیا...... پانی!" سب کو چھوڑ کر انہوں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی۔ کچن میں آ کر پہلے خود پانی پیا پھر ان کے لیے پانی

لے آئی۔

"بیٹا... تمہاری شال!" انہوں نے گلاس لیتے ہوئے نقاہت زدہ لہجہ میں یک لفظی استفسار کیا۔ شال سے مراد اس کی اسٹول تھی۔

اس نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہ میں نے رکھ لی تایا ابا! استعمال کے لیے نئی اسٹول لے لوں گی، مگر اسے اپنے پاس رکھوں گی۔" پھر وہ نم آنکھوں سے مسکرائی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر وہیں ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں اس اسٹول کو کبھی نہیں دھوؤں گی تایا ابا! اس میں بہت کچھ ہے جو میرے لیے بہت قیمتی ہے۔"

تایا ابا نے ہلکے سے مسکرا کر سر کو اثبات میں ذرا سی جنبش دی اور آنکھیں موند لیں۔

صائمہ تائی حق دق ان کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ جو حیا نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ ان کی شاید سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے اور خود حیا شاید ساری زندگی اس لمحے کی، اس قیمتی لمحے کی وضاحت کسی کو نہیں دے سکتی تھی جو خاموشی سے آیا اور تھوڑے سے خون کا خراج لے کر اسے اس کا بہت کچھ لوٹا گیا۔ خون، جو واقعی پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔

تایا سو گئے تھے۔ پھپھو، سلیمان صاحب اور فاطمہ تائی ابھی وہیں بیٹھی تھیں۔ ان سب کو ظفر فوراً بلا لایا تھا۔ صائمہ تائی، داور بھائی، سونیا، بلکہ پورا گھر ہی جاگ رہا تھا۔ سب تایا کے لیے پریشان تھے۔ ابا کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ اب ہر ممکن طور پہ ولید کو گرفتار کروانا چاہتے تھے اور اس کے لیے کوششیں بھی کر رہے تھے۔ وہ اب تھک گئی تھی، سو وہاں سے اٹھ آئی۔ کچن سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا، ظفر چائے کے برتن دھو رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اس نے سر مزید جھکا لیا۔

"سنو ظفر!" وہ باہر جانے سے قبل ایک لمحے کو رکی۔

ظفر نے سر جھکائے ہوئے ہی "جی" کہا۔ جیسے آج وہ اسے دیکھ لینے پہ ابھی تک شرمندہ تھا۔

"ایک چیز ہوتی ہے جسے ایمرجنسی سچوایشن کہتے ہیں اور یقین کرو ہمیں اللہ تعالیٰ کو اپنی کسی بھی سچوایشن کی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے حالات ہم سے زیادہ اچھے طریقے سے سمجھتا ہے۔ اس کی شریعت بھلے کتنی بھی سخت ہے۔ مگر اندھی نہیں ہے۔"

ظفر نے سمجھنے اور نہ سمجھنے کے مابین سر اثبات میں ہلا دیا۔

کمرے میں واپس آتے ہی اس نے دروازہ لاک کیا اور پرس سے فلیش نکالی۔ لیپ ٹاپ آن کر کے گھٹنوں پہ رکھا، وہ ہیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی مدھم تھی، سو اسکرین اس کے چہرے کو بھی چمکا رہی تھی۔

اس نے ویڈیو وہیں سے شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔ ایک، دو، تین، پھر کتنی ہی دفعہ اس نے بار بار وہ فلم دیکھی۔

فجر کی اذان ہوئی تو جیسے وہ اس کے حصار سے نکلی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ بار بار ایک ہی بات کہ وہ اس کا کتنا خیال رکھا کرتا تھا۔ وہ کیوں کبھی یہ نہ جان سکی کہ نرم لہجے والا میجر احمد ہی جہان ہے۔ بس ایک دفعہ...... جب وہ دونوں چاندی کے مجسموں کی طرح جھیل کے کنارے بیٹھے تھے، تب جس طرح جہان نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا، اسے کچھ یاد آیا تھا۔ میجر احمد کا انداز...... آواز بے حد مختلف سہی، مگر اس وقت اسے دونوں کا انداز بالکل ایک سا لگا تھا۔ پھر بھی وہ نہ جان سکی۔ جب وہ اغوا ہوئی تھی، تب ہوش کھونے سے قبل اس نے فون کال کی گھنٹی سنی تھی، وہ جہان تھا جو اسے کال کر رہا تھا تاکہ وہ اندازہ کر سکے کہ وہ کس کمرے میں تھی۔ پھر جب اس نے کسی کو اس روحی کا سر دیوار سے مارتے ہوئے دیکھا تھا، تب وہ غنودگی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ وہ نہیں جان سکی کہ وہ وہیں تھا۔ اس کے پاس ہمیشہ کی طرح ایک فاصلے سے اس پہ نظر رکھے ہوئے۔

اور ہالے نور اس کے ہوٹل میں کام کر چکی تھی، تب ہی وہ عبدالرحمٰن پاشا کے ذکر پہ اتنی چپ ہو جاتی تھی۔ ساری کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔

"جب تک آپ یہ باکس کھولیں گی، وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔"

یہ چنکی نے کہا تھا اور تب اس نے جان بوجھ کر ایسے الفاظ استعمال کیے تھے جن سے وہ سمجھے کہ ڈولی کی زندگی بے یقینی کا شکار ہے۔ وہ اپنے بارے میں ہر وقت ایسی باتیں کیوں کیا کرتا تھا؟ ہر وقت موت کے لیے، دنیا چھوڑنے کے لیے تیار...... جہان سکندر ایسا کیوں تھا؟

"اور اب وہ کہاں تھا؟"

ایک دم وہ چونک کر اٹھی۔ ہاں، بھلا اب وہ کہاں تھا۔ یہ ویڈیو ذرا پرانی تھی، اس میں بہت سی چیزوں کی وضاحت نہیں تھی، مگر وہ سب اس وقت بے معنی تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ اس وقت کہاں تھا۔ اس نے فون نکالا اور اس کا ہر وہ نمبر ٹرائی کیا جو وہ جانتی تھی مگر سب بند تھے۔

"شاید پھپھو کو کچھ علم ہو۔"

وہ ابھی، وضو کر کے پہلے نماز پڑھی، پھر باہر چلی آئی۔ دایاں پاؤں ٹخنے اور ایڑی کے قریب سے بہت درد کر رہا تھا۔ شاید موچ آئی تھی، مگر ابھی پٹی باندھنے کا مطلب اماں یا ابا کو اسے ترکی جانے سے روکنے کا بہانہ دینا تھا۔ پھپھو اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ ان کے قریب کاؤچ پہ بیٹھ کر ان کو دیکھنے گئی۔ وہ چہرہ ہاتھ میں چھپائے دعا مانگ رہی تھیں۔ شاید وہ اپنے بیٹے کی سلامتی مانگ رہی تھیں۔ اس کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا۔

''ارے! تم کب سے یہاں بیٹھی ہو۔ پتا ہی نہیں چلا۔'' چہرے پہ ہاتھ پھیر کر انہوں نے سر اٹھایا تو اسے دیکھ کر جیسے خوش گوار حیرت ہوئی۔

''آپ سے کچھ بات کرنی تھی پھپھو!'' وہ بولی تو اس کی آواز مدھم تھی۔ ''کیا آپ جانتی ہیں جہان کدھر ہے؟''

''وہ مجھے کبھی نہیں بتایا کرتا، مگر......'' وہ ذرا رکیں۔ ''جانے سے پہلے اس نے کہا تھا کہ اس نے تمہیں بتا دیا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔''

''اچھا!'' اس نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔ ''اس نے کسی اور سے بھی یہی بات کہی تھی، مگر مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں کہ......'' کہتے کہتے وہ ایک دم رکی۔ ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ ''لندن'' وہ کتنی ہی دفعہ لندن جانے کی بات کر چکا تھا۔ وہ لندن میں تھا۔ یقیناً وہ وہیں تھا۔

''اوہ! اس نے واقعی مجھے بتایا تھا۔'' اس نے جیسے اپنی کم عقلی پہ افسوس سے سر ہلایا۔ ''مگر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ واپس کب آئے گا۔''

''کہہ رہا تھا ایک آخری کام ہے، پھر وہ ترکی چھوڑ دے گا۔'' پھپھو احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کر رہی تھیں، جیسے انہیں اندازہ نہ تھا کہ وہ کتنا جانتی ہے۔

''مجھے جانا ہے استنبول کلیئرنس کروانے، میں یہ کام کر کے اسے ضرور ڈھونڈوں گی پھپھو! آپ دیکھیے گا۔ میں اسے واپس لے آؤں گی۔''

''حیا! اللہ پر توکل کرو اور آرام سے بیٹھ کر انتظار کرو، وہ آ ہی جائے گا۔''

''نہیں پھپھو!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا توکل نہیں، سستی ہوتی ہے۔ میں اس کو ڈھونڈنے ضرور جاؤں گی۔'' وہ کھڑی ہوئی اور رستے ہوئے چہرے کے ساتھ ذرا سا مسکرائی۔

''ہر دفعہ وہ میرے پیچھے آیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں چلی جاؤں گی تو اس میں برا کیا ہے۔''

جاتے جاتے وہ ایک لمحے کو رکی۔ ''پھپھو! ابا اور تایا لوگوں نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔''

پھپھو کے چہرے پہ حیرت ابھری، پھر جیسے انہوں نے سمجھ کر سر جھٹکا۔

''یہ جہان نے کہا ہو گا تم سے۔ پتا نہیں میرا بیٹا اتنی پرانی باتیں یاد کیوں رکھتا ہے؟ تم اس کی مت سنو، وہ ایسے ہی کہتا رہتا ہے۔''

''اگر اسے پتا چلے کہ آپ نے یہ کہا تو وہ کیا کہے گا؟''

''وہ کہے گا، میری ممی کی مت سنا کرو، وہ ایسے ہی بولتی رہتی ہیں۔'' وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ اسے یقین تھا، جہان پھپھو کے بارے میں کبھی ایسے نہیں کہہ سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

ناشتے کی میز پہ اماں نے سرسری سے انداز میں یہ بات اسے تب بتائی جب پھپھو اور ابا اٹھ چکے تھے۔

''کل دوپہر عابدہ بھابھی آئی تھیں۔''

''پھر؟'' وہ جو کانٹے میں آملیٹ کا ٹکڑا پھنسا رہی تھی، سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

''وہ رضا کے لیے تمہارا رشتہ مانگ رہی تھیں۔''

نوالہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اسے لگا اس نے غلط سنا ہے۔

''میرا رشتہ۔ آر یو سیریس؟'' وہ بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''جب تم اپنی خوامخواہ کی ضد کے پیچھے جہان کو یوں اپنی زندگی سے نکالو گی تو لوگ یہی کہیں گے نا۔''

وہ چکرا کر رہ گئی۔ جہان اس وجہ سے نہیں گیا تھا۔ وہ جانتی تھی مگر باقی سب تو نہیں جانتے تھے۔ ان کے ذہن ارم کی اس بڑھا چڑھا کر کی گئی بات میں اٹکے تھے۔ دل تو چاہا، اگر رضا سامنے ہوتا تو کچھ اٹھا کر اسے دے مارتی اور......

''اف......'' اس نے سر جھٹکا۔ اسے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ چیزیں اٹھا کر دے مارنے کی کتنی شوقین تھی اور وہ کتنی جلدی جان گیا تھا۔

اب مزید اس سے کچھ نہیں کھایا جانا تھا۔ اس نے پلیٹ پرے کر دی۔

"عابدہ چچی سے کہیے گا، آئندہ ایسی بات سوچیں بھی مت۔ لوگوں کو میرا اور جہان کا رشتہ بھلے کمزور لگتا ہو مگر ہمارا رشتہ بہت مضبوط ہے اماں!"

"شیورا!" اماں نے جیسے اکتا کر سر جھٹکا۔ وہ وہاں سے اٹھ آئی۔

ساری رات کی بے خوابی، وہ ویڈیو، تایا کا ایکسیڈنٹ اور پھر عابدہ چچی کا یہ قصہ۔ اس کا سر درد کرنے لگا تھا۔ ارم درست کہہ رہی تھی۔ وہ لوگ جان بوجھ کر اس کے نکاح کو کمزور ثابت کرنے پہ تلے تھے۔

آج اسے آفس نہیں جانا تھا۔ ابا آج خود آفس گئے تھے۔ وہ اب بہت بہتر محسوس کر رہے تھے۔ پتا نہیں ولید کے خلاف ایف آئی آر کا کیا بنا۔ کاش جہان نے اس کے سر پر فرائی پان کی جگہ پورا پریشر ککر دے مارا ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے ابا کے آفس کے دروازے پہ مدھم سی دستک دے کر اسے دھکیلا۔ وہ سامنے اپنی میز کے پیچھے بیٹھے فائلز کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ آہٹ پہ سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ہلکا سا مسکرائے۔ بیماری نے انہیں کافی کمزور اور زرد کر دیا تھا۔

"آؤ بیٹھو" انہوں نے سامنے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ سیدھ میں چلتی ان کے مقابل کرسی تک آئی، پرس میز پہ رکھا اور کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

"مارکیٹنگ فنڈ میں سے کٹوتی کس نے کی ہے؟" انہوں نے سامنے کھلی فائل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس کی کارکردگی دیکھ رہے تھے اور یقیناً انہیں اس میں بہت سی غلطیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ "اور کیا ضرورت تھی شیئر ہولڈرز کو سالانہ dividend دینے کی؟"

"فار رڈیرسٹ! ایک تو میں نے بغیر تنخواہ کے اتنے دن کام کیا اوپر سے ڈانٹ بھی مجھے ہی پڑے گی۔" دو انگلیوں سے نقاب ناک سے ٹھوڑی تک اتارتے ہوئے وہ خفگی سے بولی۔

"ڈاٹرڈیرسٹ! احسان جتانے سے ضائع ہو جایا کرتے ہیں۔" وہ مسکرائے تھے۔

"رہنے دیں ابا! اچھا بتائیں، ولید کی ایف آئی آر کا کیا بنا؟"

"وہ پولیس کو نہیں مل رہا۔ اس کا باپ اس کو گرفتار نہیں ہونے دے گا۔ بہرحال! میں اس کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔" ایک دم وہ سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ "لیکن اس وقت میں نے تمہیں کسی اور بات کے لیے بلایا ہے۔"

"جی کہیے۔" اس کا دل زور سے دھڑکا۔ ابا اپنی بیماری کے باعث بہت سے معاملات سے دور رہے تھے مگر پھر بھی ان کے کانوں تک بہت کچھ پہنچ گیا تھا یقیناً اور بالآخر انہوں نے حیا سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"یہ جہان صاحب واپس کیوں گئے ہیں؟"

"اسے کام تھا کچھ۔ آجائے گا کچھ دن میں واپس۔"

"صائمہ بھابھی کچھ اور کہہ رہی تھیں۔" وہ اسے سوچتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے تھے۔ حیا نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"صائمہ تائی تو ہماری دادی پہ بھی ساری عمر یہی الزام لگاتی رہی تھیں کہ وہ ان پہ جادو کرواتی ہیں۔ اگر صائمہ تائی کا جہان کے بارے میں تجزیہ درست مانا جائے تو دادی والا بھی درست مانا جانا چاہیے؟" وہ بھی حیا تھی۔ اس نے ہار نہ ماننے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

"دیکھو! مجھے تمہارے اس برقعے وغیرہ سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، مگر اس کی وجہ سے تم نے اپنے تایا اور اماں کو بہت ناراض کیا ہے۔ تمہیں چاہیے تھا کہ تم ان کی بات کا احترام کرتیں۔ بڑوں کا حکم ماننا فرض ہوتا ہے۔" وہ چند لمحے سوچتی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی، پھر کہنے لگی۔

"ابا! آپ کو ایک بات بتاؤں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن خطاب نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں۔ ابن عمرؓ نے ایسا نہیں کیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمرؓ سے فرمایا کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ یوں عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد کی بات کا احترام کرتے ہوئے بیوی کو طلاق دے دی۔" وہ لحظے بھر کو رکی۔ سلیمان صاحب سیٹ سے ٹیک لگائے، ایک ہاتھ میں پین گھماتے غور سے اسے سن رہے تھے۔

"پھر ہوا یہ کہ عرصے بعد ایک شخص امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ میرا باپ چاہتا ہے، میں اپنی بیوی کو

طلاق دے دوں۔ امام احمد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسا ہرگز مت کرنا۔ اس شخص نے جواب میں یہ واقعہ بیان کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کے کہنے پر ان کے بیٹے نے تو اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ پھر مجھے کیوں ایسا نہیں کرنا چاہیے؟ ابا......! آپ جانتے ہیں اس پہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے کیا کہا؟"

"کیا۔" وہ بے اختیار بولے۔ حیا ہلکے سے مسکرائی۔

"انہوں نے کہا، کیا تمہارا باپ عمر جیسا ہے؟"

آفس میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ صرف گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔

"ویل......!" ابا نے ہولے سے سر جھٹکا۔ "تم ایل ایل بی اسٹوڈنٹ ہو، میں تم سے بحث میں جیت نہیں سکتا۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے خلع کے بارے میں سوچا ہے؟" اس کا جیسے کسی نے سانس بند کر دیا۔ وہ لمحے بھر کو شل سی رہ گئی۔

"تمہیں یاد ہے میں نے ترکی جانے سے قبل بھی تم سے ایسی ہی بات کی تھی؟"

"جی مجھے یاد ہے۔" چند ثانیے بعد وہ بولی تو اس کا لہجہ بے تاثر ہو گیا تھا۔ "اور تب میں نے آپ سے یہی کہا تھا کہ مجھے ترکی جانے دیں اگر وہاں جا کر مجھے لگا کہ وہ لوگ طلاق چاہتے ہیں تو میں اس رشتے کو وہیں ختم کر دوں گی۔"

"تو پھر؟"

"ابا! ہمارے درمیان یہی ڈیل ہوئی تھی کہ ترکی سے واپسی تک آپ مجھے ٹائم دیں گے۔"

"اور اب عرصہ ہوا...... تم واپس آ چکی ہو۔"

"میں واپس نہیں آئی۔ آفیشلی مجھے ابھی ترکی سے واپسی کی کلیئرنس نہیں ملی۔ پرسوں میں استنبول جا رہی ہوں، واپسی پہ ہم اس بات کو ڈسکس کریں گے۔" وہ بہت اعتماد سے کہہ رہی تھی۔ ابا متفق نہیں تھے، مگر پھر بھی جیسے وقتی طور پہ خاموش ہو گئے۔

"ابا! وہ...... ایک اور بات بھی تھی۔" ہمت کر کے اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں سوچ رہی تھی کہ اگر کلیئرنس کروانے کے بعد میں لندن چلی جاؤں۔ زیادہ نہیں، بس ایک ہفتے کے لیے۔ میں صرف لندن دیکھنا چاہتی ہوں، پھر۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ زیادہ ہی ان ڈیپنڈنٹ ہوتی جا رہی ہیں، مجھے آپ کو ذرا کھینچ کر رکھنا پڑے گا۔" وہ لمحے بھر میں روایتی ابا بن گئے۔

"ابا پلیز!" اس کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کلیئرنس کروا کر سیدھا آپ واپس آئیں گی۔ جتنا گھومنا ہے استنبول میں گھوم لو۔ ترکی کے کسی اور شہر جانا ہو تو بے شک چلی جاؤ، مگر اکیلے نہیں، فرینڈز کے گروپ کے ساتھ جانا۔ لندن وغیرہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن صرف ایک ہفتے......"

"حیا! تم نے سن لیا جو میں نے کہا۔" ان کا لہجہ نرم تھا، مگر ابرو اٹھا کر تنبیہ کرتا انداز سخت تھا۔ وہ خفگی سے "جی" کہہ کر اٹھ گئی۔

☆　☆　☆

وہ آج پھر یونیورسٹی چلی آئی تھی۔ ڈاکٹر ابراہیم سے اس نے آج وقت نہیں لیا تھا مگر پھر بھی وہ اسے اپنے آفس میں مل گئے۔

"آپ نے ٹھیک کہا تھا سر! ہمیں لوگوں کو وقت دینا چاہیے۔" ان کے بالمقابل بیٹھی وہ آج بہت سکون سے کہہ رہی تھی اور وہ اسی توجہ سے اسے سن رہے تھے۔ سامنے اس کے لیے منگوا کر رکھی کافی کی سطح سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ کر فضا میں گم ہو رہے تھے۔ ان کے آفس کا خاموش، پرسکون ماحول اس کے اعصاب کو ریلیکس کر رہا تھا۔

یقین کریں سر! لوگ شروع میں آپ کے حجاب کی جتنی مخالفت کر لیں، ایک وقت آتا ہے کہ وہ اسے قبول کر لیتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ آپ کو اس میں قبول کر لیتے ہیں۔ چاہے انہیں تب بھی حجاب اتنا ہی ناپسند کیوں نہ ہو جتنا پہلے تھا۔ اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ آہستہ آہستہ سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔"

"بالکل۔" انہوں نے مسکرا کر دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔

مگر سر! میں جب اپنے مسئلوں سے گھبرا گئی تو آپ کے پاس آئی اور تب میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ "تواصوبالصبر" انسانوں کو

انسانوں سے ہی چاہیے ہوتا ہے۔ آپ نے میری بات کی تائید کی تھی رائٹ؟"

"جی پھر؟" وہ پوری توجہ سے سن رہے تھے۔

"پھر سر! یہ کہ میری پھپھو کہتی ہیں، انسان کو اپنے مسئلے دوسروں کے سامنے نہیں بیان کرنے چاہئیں۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خود کو بے عزت کرتا ہے۔ کیا ایسا ہی ہے سر! کیا ہمیں اپنے مسئلے کسی سے شیئر نہیں کرنے چاہئیں؟"

وہ اپنی کافی کی سطح پہ آئے جھاگ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی جس میں مختلف اشکال نظر آ رہی تھیں۔

"مگر پھر ہم "تواصو بالصبر" کیسے کریں گے سر؟" جہان کی طرف کی روداد سننے کے بعد یہ سوال اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

"آپ کی پھپھو ٹھیک کہتی ہیں۔ سوال کرنا یعنی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا، بھلے وہ ہمدردی لینے کے لیے ہی ہو، ہر حال میں ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ انسان کو واقعی اپنے مسئلے اپنے تک رکھنے چاہئیں۔ دنیا کو اپنی پرابلم سائیڈ دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اپنے مسئلے کا واقعی اشتہار نہیں لگایا کرتے۔ مگر....." وہ لحظہ بھر کو رکے۔

وہ نامحسوس طریقے سے کرسی پہ آگے کو ہوئی۔ اسے اسی "مگر" کا انتظار تھا۔

"مگر انسان پہ ہر وقت ایک سا فیز نہیں رہتا میرے بچے! وقت بدلتا ہے۔ مسئلے بھی بدلتے ہیں۔ بعض دفعہ انسان ایسی سچوایشن میں گرفتار ہو جاتا ہے جس سے وہ پہلے کبھی نہیں گزرا ہوتا۔ تب اسے چاہیے کہ اپنے مسئلے کا حل کسی سے پوچھ لے۔ انسان کو صرف تب اپنے پرابلمز شیئر کرنے چاہئیں جب اس کو واقعی اپنے پاس سے ان کا حل نہ ملے۔ کوئی ایک دوست، ایک ٹیچر یا پھر کوئی اجنبی، کسی ایک بندے کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکال دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا جو واقعتاً "تواصو بالصبر" کرے۔ ہاں! لیکن ایک بات یاد رکھیں۔ اس شخص کو کبھی اپنی بیساکھی نہ بنائیں۔ آپ کو ہر کچھ دن بعد کسی کے کندھے پہ رونے کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے۔ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔ ہر وقت دوسروں سے تسلی لینے کے بجائے بہتر ہے کہ ہم تسلی دینے والے بنیں "تواصو بالصبر" صبر کی تلقین دینے کا نام ہوتا ہے، ہر وقت لیتے رہنے کا نہیں۔"

اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ اس کی کافی اب ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی، جھاگ کی اشکال چھٹتی جا رہی تھیں۔ اسے خوشی تھی کہ آج وہ سر کے پاس پھر سے نئے مسئلے لے کر نہیں آئی تھی۔

"میں سمجھ گئی اور مجھے کچھ اور بھی بتانا تھا آپ کو۔"

اسے جیسے اسی پل کچھ یاد آیا۔ "آپ نے کہا تھا میں احزاب کی پہیلی میں کچھ مس کر گئی ہوں۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا، پھر مجھے ایک خیال آیا۔"

"اچھا اور وہ کیا۔" وہ دلچسپی سے کہتے ذرا آگے کو ہوئے۔

"سر! جنگ احزاب کے ختم ہونے کے بعد بنو قریظہ اپنے قلعوں میں جا چھپے تھے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان کو جا لیا۔ اگر بنو قریظہ کا فیصلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہ چھوڑا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ سے زیادہ ان کو وہ جگہ چھوڑ دینے کا حکم دے دیتے، مگر ان کا فیصلہ سعد رضی اللہ عنہ پہ چھوڑا گیا جو قبیلہ اوس سے تھے۔ انہوں نے بنو قریظہ کا فیصلہ یہود کی اپنی سزاؤں کے مطابق کیا یعنی کہ تمام مردوں کو غداری کے جرم میں قتل کیا جائے۔ یہ بنی اسرائیل کے ہاں غداری کی سزا تھی۔ کیا میں نے یہی بات مس کر دی کہ آخر میں بنو قریظہ کو ان کے اپنے ہی سزا دیتے ہیں۔"

ڈاکٹر ابراہیم مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے آگے کو ہوئے۔

"یہ آپ کہاں چلی گئیں۔ غزوہ بنو قریظہ جس کا آپ ذکر کر رہی ہیں، یہ غزوۂ احزاب کے بعد ہوئی تھی، یہ غزوۂ احزاب کا حصہ نہیں تھی۔ آیت حجاب قرآن کی جس سورہ میں ہے اس کا نام احزاب ہے، بنو قریظہ نہیں۔ آپ کو احزاب کے دائرہ کار میں رہ کر اس کا جواب تلاش کرنا تھا۔"

"اچھا پھر! آپ مجھے بتا دیں کہ میں کیا مس کر گئی ہوں۔" اس نے خفگی سے پوچھا۔ پتا نہیں سر اس کو کیا دکھانا چاہتے تھے۔

"حیا! میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ سورۂ احزاب اور حجاب میں مماثلت ہے۔ یہ آپ نے کہا تھا۔ آپ نے اسے پہیلی کہہ کر ایک چیلنج کے طور پہ قبول کیا تھا۔ سو آپ کو یہ پزل خود مکمل کرنا ہے۔"

"سر! تھوڑی، بہت چیٹنگ تو جائز ہوتی ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ اچھا کچھ کھائیں گی، آج تو میرے پاس برٹش کینڈیز بھی نہیں ہیں۔"

"نہیں سر! بس یہ کافی بہت ہے، پھر میں چلوں گی۔ اگلی دفعہ میں آپ کے پاس اس پہیلی کا آخری ٹکڑا لے کر ہی آؤں گی۔" وہ ایک عزم سے کہتی اٹھی۔

ڈاکٹر ابراہیم نے مسکرا کر سر کو جنبش دی۔ انہیں جیسے ابھی اس ذہین اسٹوڈنٹ سے اسی بات کی امید تھی۔

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی کے فی میل کیمپس میں ایک دوسری لیکچر سے مل کر وہ انڈلس بلاک سے نکلی تو سامنے ایک طویل روش تھی جس کے اختتام پہ مین گیٹ تھا۔ اس نے گردن جھکا کر ایک نظر اپنے پیروں کو دیکھا جو سیاہ ہیل والی سینڈلز میں مقید تھے۔ ہیل کی اتنی عادت تھی کہ دکھتے پیر کے باوجود اس نے ہیل پہن لی تھی، مگر اب چل چل کر دایاں پاؤں ٹخنے اور ایڑی سے درد کر رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ طویل سڑک عبور کر کے وہ گیٹ سے باہر آئی تو کار سامنے ہی کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے اسے آتے دیکھ کر فوراً پچھلی طرف کا دروازہ کھولا۔ وہ اندر بیٹھی اور دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائیور الٰہی بخش نے فوراً کار اسٹارٹ کر دی۔

ایچ ٹین کا وہ خالی خالی سا علاقہ تھا۔ یونیورسٹی کی حدود سے نکل کر کار اب مین روڈ پہ دوڑ رہی تھی۔ اطراف میں دور دور فیکٹریز، عمارتیں، یا انسٹی ٹیوٹس تھے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اچانک الٰہی بخش نے بریک لگائے۔ وہ جو ٹیک لگائے بیٹھی تھی، جھٹکے سے میکانکی طور پہ ذرا آگے کو ہوئی۔

"کیا ہوا؟"

"یہ گاڑی سامنے آ گئی۔" الفاظ الٰہی بخش کے لبوں پہ ہی تھے کہ حیا نے ونڈ اسکرین کے پار اس منظر کو دیکھا۔ وہ چمکتی ہوئی سیاہ اکارڈ ایک دم سے سامنے آئی تھی۔ یوں کہ ان کا راستہ بلاک ہو گیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سے سیاہ سوٹ میں ملبوس شخص نکل کر تیزی سے ان کی جانب آیا تھا۔ حیا یک ٹک اس سیاہ اکارڈ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس گاڑی کو پہچانتی تھی۔ اس گاڑی نے تایا فرقان کو ٹکر ماری تھی۔

ولید اس کے دروازے سے چند قدم ہی دور تھا۔ غصے کا ایک ابال اس کے اندر اٹھنے لگا۔

"الٰہی بخش! جلدی سے ابا کو فون کرو اور بتاؤ کہ ولید نے ہمارا راستہ روکا ہے۔ میں تب تک اس سے ذرا بات کر لوں۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ ولید اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ چہرے پہ طیش، آنکھوں میں تنفر۔

اس نے کن انکھیوں سے گاڑی میں بیٹھے الٰہی بخش کو نمبر ملاتے دیکھا۔

"میرا خیال تھا آپ ملک سے فرار ہو چکے ہیں۔ مگر نہیں آپ تو یہیں ہیں۔" بہت اطمینان اور سکون سے کہتی وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ "خیر چند دن کا عیش ہے مسٹر لغاری! پھر آپ کو اقدام قتل کے کیس کا سامنا کرنا ہی ہوگا۔"

"میری بات سنو!" ایک ہاتھ کار کی چھت پہ رکھے، دوسرے ہاتھ کی انگلی سے تنبیہ کرتا وہ بہت طیش کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ "تم اس مقدمے میں میرے خلاف ایک لفظ نہیں کہو گی۔ یہ ایک ایکسیڈنٹ تھا، اور تم اپنے بیان میں یہی کہو گی۔"

"میں بیان دے چکی ہوں اور تم نامزد ملزم ٹھہرائے جا چکے ہو۔"

"اپنی بکواس اپنے پاس رکھو۔ جو میں کہہ رہا ہوں، تم وہ ہی کرو گی۔ تم یہ مقدمہ فوراً واپس لے رہی ہو، سنا تم نے؟" وہ بلند آواز سے بولا تھا۔ الٰہی بخش فون کان سے ہٹا کر دوبارہ نمبر ملا رہا تھا۔ شاید رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

"اور اگر میں ایسا نہ کروں تو تم کیا کرو گے؟ مجھے دوبارہ اپنی گاڑی کے نیچے دینے کی کوشش کرو گے؟" اس نے استہزائیہ سر جھٹکا۔

ولید چند لمحے لب بھینچے اسے دیکھتا رہا، پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

"میرے پاس تمہارے لیے اس سے بھی بہتر حل موجود ہے۔"

"اچھا اور وہ کیا ہے؟" وہ اسی کے انداز میں بولی۔ اطراف سے گاڑیاں زن کی آواز کے ساتھ گزر رہی تھیں۔

ولید نے گاڑی کی چھت سے ہاتھ ہٹایا، جیب سے اپنا موبائل نکالا، چند بٹن پریس کیے اور پھر اس کی اسکرین حیا کے سامنے کی۔

"کیا اس منظر کو دیکھ کر کوئی گھنٹی بجی ہے ذہن میں؟" ایک تپا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا تو حیا نے ایک نگاہ اس کے موبائل اسکرین پہ ڈالی، مگر پھر ہٹانا بھول گئی۔ ادھر ہی جم گئی۔ منجمد، شل، ساکت۔

"شریفوں کا مجرا" اس ویڈیو کی جھلک۔ کسی نے کھولتا پتیل اس کے اوپر ڈال دیا تھا۔ اندر باہر آگ میں لپٹے گولے برسنے لگے تھے۔ بے یقینی سی بے یقینی۔

"نکل گئی نا اکڑ۔ اب آئی ہو نا اپنی اوقات پہ۔" ولید نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا۔ نقاب سے جھلکتی اس کی ششدر ساکت آنکھیں ابھی تک وہیں منجمد تھیں۔

"ذرا سوچو میں اس ویڈیو کے ساتھ کیا کیا کر سکتا ہوں۔" وہ اب قدرے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ حیا کا شاک اسے سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ تیر عین نشانے پہ لگا ہے۔

"میں اسے اگر تمہارے خاندان کے سارے مردوں تک پہنچا دوں تو کیا ہو گا حیا بی بی! کبھی سوچا تم نے؟ کیا اب بھی تم میرا نام اس کیس میں لے سکو گی؟"

پھر اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسی غلطی مت کرنا ورنہ میں تمہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ جو آندھی طوفان کی طرح آیا تھا، کسی پُرسکون فاتح کی طرح واپس پلٹ گیا۔ اپنی کار میں بیٹھ کر اس نے دروازہ بند کیا۔ سائیڈ مرر میں دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا، سن گلاسز آنکھوں پہ لگائے اور گاڑی آگے بڑھا کر لے گیا۔

وہ ابھی تک شل سی کار کے ساتھ کھڑی تھی۔ نقاب کے اندر لب ابھی تک ادھ کھلے اور آنکھوں کی پتلیاں ساکن تھیں۔ دل کی دھڑکن ہلکی ہو گئی تھی، جیسے کوئی لٹی پٹی کشتی، سمندر کی گہرائی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہو۔ نیچے...... اور نیچے...... گہرائی...... پاتال۔

"بڑے صاحب فون نہیں اٹھا رہے۔ اب کیا کرنا ہے میم؟"

الٰہی بخش باہر نکل کر پوچھنے لگا۔ اس کا سکتہ جیسے ذرا سا ٹوٹا۔ بے حد خالی خالی نظروں سے الٰہی بخش کو دیکھتے اس نے نفی میں سر ہلایا، پھر بنا کچھ کہے واپس بیٹھ گئی۔ اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ نیلا اور ٹھنڈا۔ جیسے چاندی کے مجسمے کو کسی نے زہر دے دیا ہو۔

وہ گھر کب پہنچی، کیسے نیچے اتری، اسے ہوش نہ تھا۔ بہت چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اندرونی دروازہ کھول کر اس نے لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے کوئی کھڑا نظر آیا۔

بلیو جینز، سیاہ ٹی شرٹ، سنہری سپید رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، وہ ہنستے ہوئے کسی سے بات کر رہا تھا، آہٹ پہ پلٹ کر حیا کو دیکھا جو میکانکی انداز میں نقاب ناک سے اتار کر ٹھوڑی تک لا رہی تھی۔

"یہ ہمارے گھر میں جامعہ حفصہ کہاں سے آ گیا؟" وہ خوشگوار حیرت کے زیر اثر بولا تھا۔

حیا نے دھیرے سے پلکیں جھپکائیں۔ اس کی آنکھوں نے اس شخص کا چہرہ اپنے اندر مقید کیا، پھر بصارت نے یہ پیغام دماغ کو پہنچایا، دماغ نے جیسے سست روی سے اس پیغام کو ڈی کوڈ کیا اور پھر اس شخص کا نام اس کے لبوں تک پہنچایا۔

"رو...... روحیل۔" چند لمحے لگے تھے اسے اپنے شل ہوتے دماغ کے ساتھ اپنے بڑے بھائی کو پہچاننے میں۔

"اتنے شاکڈ تو ابا بھی نہیں ہوئے تھے جتنی تم ہوئی ہو۔" وہ مسکرا کہتا آگے بڑھ کر اسے ملا۔ وہ خوش تھا، ابا اور اس کا معاملہ حل ہو گیا کیا؟ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"حیا! یہ نتاشا ہے، ادھر آ کر ملو۔" اماں نے جانے کہاں سے اسے پکارا تھا۔ اس نے دھیرے سے گردن موڑی۔ اماں کے ساتھ لاؤنج کے صوفے پہ ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا دماغ مزید کام کرنے سے انکاری تھا، اس نے بس سر کے اشارے سے ان انجان لڑکی کو سلام کیا اور پھر روحیل کو دیکھا۔

"میں آتی ہوں۔ سر میں درد ہے۔ سونا ہے مجھے۔" مبہم، ٹوٹے، بے ربط الفاظ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پیچھے سے اماں نے شاید پکارا تھا، مگر اس نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ ذہن اس طرح سے ایک نقطے پہ منجمد ہو گیا تھا کہ وہاں سے آگے پیچھے نہیں جا رہا تھا۔

کسی خود کار روبوٹ کی طرح اس نے عبایا کے بٹن کھولے، پھر سر سے سیاہ اسکارف علیحدہ کیا تو بالوں کا جوڑا کھل گیا۔ سارے بال کمر پہ گرتے گئے۔ اس نے سیاہ لمبی قمیض کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔

اردگرد ہر شے اجنبی سی لگ رہی تھی۔ وہ خالی الذہنی کے عالم میں چلتی باتھ روم کی طرف آئی، دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور باتھ روم کی ساری

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

لائٹیں جلا دیں۔

وہ اسی انداز میں چلتی شاور تک آئی اور اسے پورا کھول دیا۔ پھر باتھ ٹب کی منڈیر کے کنارے پہ بیٹھ گئی۔ اس کی سیاہ لمبی قمیض کا دامن اب پیروں کو چھو رہا تھا۔

شاور سے نکلتی پانی کی تیز دھار بوندیں سیدھی اس کے سر پہ گرنے لگیں۔ وہ جیسے محسوس کیے بنا سامنے سنک کے ساتھ سلیب پہ رکھے پاٹ پوری بھرے شیشے کے پیالے کو دیکھ رہی تھی جس کی خوشبو پورے باتھ روم میں پھیلی تھی۔

انسان سمجھتا ہے، گناہ بھلا دینے سے وہ زندگی سے خارج ہو جاتے ہیں، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ گناہ پیچھا کرتے ہیں۔ وہ عرصے بعد بھی اپنے مالک سے ملنے آ جایا کرتے ہیں۔ گناہ قبر تک انسان کے پیچھے آتے ہیں۔ اس کے گناہ بھی ایک دفعہ پھر اس کے سامنے آ گئے تھے۔ انہوں نے دنیا کے ہجوم میں بھی اپنے مالک کو تلاش کیا تھا۔

موسلادھار پانی اس کے سر سے پھسل کر نیچے گر رہا تھا۔ بال بھیگ کر موٹی لٹوں کی صورت بن گئے تھے۔ اس کا پورا لباس گیلا ہو چکا تھا۔ وہ یک ٹک سامنے ٹائلز سے مزین دیوار کو دیکھ رہی تھی۔

ولید کے پاس وہ ویڈیو کہاں سے آئی، وہ نہیں جانتی تھی، مگر ایک بات طے تھی۔ اللہ نے اسے معاف نہیں کیا تھا۔ اس کے گناہ دھلے نہیں تھے۔ وہ آج بھی اس کے سائے کی طرح اس کا پیچھا کر رہے تھے اور اگر وہ سب کچھ اس کے خاندان والوں کے سامنے آ گیا تو؟

پانی کی بوچھاڑ ابھی تک اسے بھگو رہی تھی۔ اس کے چہرے، بالوں اور سارے وجود پہ موٹی موٹی بوندیں گر رہی تھیں۔ ایسے جیسے بارش کے قطرے ہوتے ہیں۔ جیسے سیپ سے نکلے موتی ہوتے ہیں۔ جیسے ٹوٹے ہوئے آنسو ہوتے ہیں۔

وہ پوری طرح بھیگ چکی تھی۔ مگر ابھی تک یوں ہی شل سی بیٹھی تھی۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ کیا کرے گی اب؟

ولید کے ہاتھ اس کی کمزوری لگ گئی تھی۔ وہ اس کے خلاف گواہی نہ دے، تو کیا ولید بس کر دے گا؟ نہیں، وہ جان چکا ہے کہ اس کے پاس کیا "چیز" ہے۔ وہ اسے بار بار استعمال کرنا چاہے گا۔ کیا وہ اسی طرح اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتی رہے گی؟ اس نے کیوں ولید کو تھپڑ نہیں دے مارا؟ وہ کیوں ڈر گئی؟ وہ کیوں ظاہر نہیں کر سکی کہ اسے اس بات سے فرق نہیں پڑتا؟ مگر وہ یہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ سب کچھ اتنا غیر متوقع ہوا تھا کہ انسان ہونے کے ناتے وہ سنبھل نہیں سکی تھی اور ولید جیت گیا تھا۔

اسے اللہ نے معاف نہیں کیا۔ نیلی مسجد میں بیٹھ کر اس نے کتنی معافی مانگی تھی۔ کتنا نور مانگا تھا۔ اور اب خود کو اس کی پسند کے مطابق ڈھالنے کے بعد جب اسے اپنے گناہ بھولتے جا رہے تھے تو اچانک وہ سب اس کے سامنے لا کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ بری لڑکی نہیں تھی، اس کا کوئی اسکینڈل نہیں رہا تھا۔ دکان دار سے روپے پکڑتے وقت بھی احتیاط کرتی تھی کہ ہاتھ نہ ٹکرائے، مگر خوب صورت دکھنے کی خواہش سے اس سے چند غلطیاں ہوئی تھیں اور وہ اب تک معاف نہیں ہو سکی تھیں۔

جانے کب وہ اٹھی، شاور بند کیا اور بھیگے بالوں اور کپڑوں سمیت اپنے بیڈ کے ساتھ نیچے کارپٹ پہ آ بیٹھی۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اکڑوں بیٹھے، سینے کے گرد بازو لپیٹے سر گھٹنوں میں دیے وہ کب سو گئی، اسے پتا ہی نہیں چلا۔

☆ ☆ ☆

جب وہ اٹھی تو عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ کمرے میں تاریکی پھیلی تھی۔ لباس اور بال ابھی تک نم تھے۔ ذرا حواس بحال ہوئے تو روحیل اور اس کی بیوی کا خیال آیا۔ اس نے تو اسے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا، پتا نہیں اماں نے کیا نام لیا تھا۔

فریش ہو کر، انگوری لمبی قمیص کے ساتھ میرون چوڑی دار پاجاما اور میرون دوپٹا لے کر وہ گیلے بالوں کو ڈرائیر سے سکھا کر باہر آئی تو گھر میں چہل پہل سی تھی۔ سحرش اور ثنا عابدہ چچی کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ ارم، سونیا اور صائمہ تائی بھی لاؤنج میں تھیں۔

روحیل کی بیوی فاطمہ کے ساتھ والے صوفے پہ دوپہر کے انداز میں بیٹھی تھی۔ ٹیک لگا کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے۔ گلابی قمیص کے ساتھ کیپری۔ بال سیاہ گھنگھریالے مگر بھوری سنہری اسٹریکنگ میں ڈائی کروا رکھے تھے۔

نقوش سے وہ نیپالی کم اور ذرا صاف رنگت کی افرو امریکن زیادہ لگتی تھی۔ رنگت گندمی، رخسار کی ہڈیاں اونچی بھنوئیں بے حد باریک اور چہرے کی جلد عام امریکی لڑکیوں کی طرح فیس ویکسنگ کروانے کے باعث جیسے چھلی ہوئی سی لگتی تھی۔ لبوں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ...... حیا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے وہ اچھی لگی تھی یا بری۔

"سوری! صبح میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، صحیح سے مل نہیں سکی۔" انگریزی میں اس سے معذرت کرتے ہوئے اس نے ایک نظر اماں پہ ڈالی۔ اماں اتنی نارمل کیوں تھیں؟ کیا ابا اور اماں نے اس لڑکی کو قبول کر لیا تھا؟ اتنی آسانی سے؟

"اٹس اوکے!" نہ تو انداز میں رکھائی تھی، نہ ہی والہانہ گرمجوشی۔ بس نارمل، سوبر سا انداز۔ حیا ابھی تک کھڑی تھی۔ اس سے بیٹھا ہی نہیں گیا۔ عجب بے چینی تھی۔ سو معذرت کر کے کچن کی طرف چلی آئی۔ کچن اور لاؤنج کے بیچ کی آدھی دیوار کھلی تھی، سو اسے دور سے پھپھو کام کرتی دکھائی دے گئی تھیں۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ ایک ڈش کی ڈریسنگ کرتے ہوئے آہٹ پہ پلٹیں۔ وہی جہان والی آنکھیں، وہی نرم مسکراہٹ۔

"جی، سوری میں دوپہر میں ذرا تھکی ہوئی تھی۔"

"نتاشا سے مل لیں؟" پھپھو نے دور لاؤنج کے صوفوں پہ بیٹھی خواتین کی جانب اشارہ کیا۔ وہ چونکی۔

"اس کا نام نتاشا ہے؟" سرگوشی میں پوچھتے وہ بظاہر چیزیں اٹھا اٹھا کر پھپھو کو دے رہی تھی۔

"ہاں کیوں کیا ہوا؟ اوہ......" پھپھو سمجھ گئیں۔ "اگر روسی اس خوب صورت نام سے کچھ غلط مطلب لیتے ہیں تو اس میں اس نام کا کیا قصور؟ قصور تو روسیوں کا ہے نا۔"

"صحیح مگر روحیل اچانک آ گیا، ابا کا ری ایکشن کیا تھا؟" اب وہ ولید کی باتوں کے اثر سے ذرا نکلی تھی تو ان باتوں کا خیال آیا۔

"وہ اسی لیے بتائے بغیر آیا ہے۔ بس بھائی نے تھوڑا بہت جھڑکا اور پھر روحیل نے معافی مانگ لی اور نتاشا نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے سو بھائی مان گئے۔"

وہ بے یقینی سے انہیں دیکھے گئی۔

"اتنی آسانی سے یہ سب کیسے ہوا؟ یاد ہے اسی شادی کی وجہ سے ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔"

اوون میں ڈش رکھ کر ڈھکن بند کرتے پھپھو نے گہری سانس لی۔

"تو پھر اور کیا کرتے بھائی؟ اب وہ شادی کر ہی چکا ہے اور نتاشا کو مسلمان کر ہی چکا ہے تو بس بات ختم۔ روحیل ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ پہلوٹھی کی اولاد۔"

اوون کا ٹائم سیٹ کر کے وہ اس کی طرف پلٹیں تو ان کے چہرے پہ ایک تھکان زدہ مگر بے شکوہ مسکراہٹ تھی۔

"وہ ان کا بیٹا ہے حیا! اور بیٹوں کے قصور جلدی معاف کر دیے جاتے ہیں۔ صلیب پہ لٹکانے کو صرف بیٹیاں ہوتی ہیں۔"

کچھ تھا جو اس کے اندر ٹوٹ سا گیا۔ پھپھو اب کاؤنٹر کی طرف چلی آئی تھیں۔ اس نے بہت سے آنسو اندر اتارے اور پھر چہرے پہ ظاہری بشاشت لا کر ان کی طرف چلی۔

"آپ یہ سب کیوں کر رہی ہیں؟ اور نور بانو کدھر ہے؟"

"وہ ڈرائنگ روم میں بھائی وغیرہ کو چائے دینے گئی ہے۔ میں نے سوچا، میں کھانے کو آخری دفعہ دیکھ لوں۔ کھانے کا کام عورت کو خود کرنا چاہیے تاکہ اس میں عورت کے ہاتھ کا ذائقہ بھی آئے۔"

"تو نور بانو ہے نا پھپھو!"

"بیٹا! عورت کے ہاتھ کا ذائقہ صرف اس کی فیملی کے لیے ہوتا ہے۔ نور بانو کے بنائے کھانے میں اس کے اپنے بچوں کو ذائقہ آئے گا، مگر اس کے مالکوں کو نہیں۔"

وہ جہان کی ماں تھیں، ان سے کون بحث کرتا؟ وہ واپس لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ ذہن میں ولید کی باتیں ابھی تک گردش کر رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا؟ درمیان میں ایک دفعہ ابا اٹھ کر کسی کام سے آئے تو اسے بلا کر پوچھا۔

"الٰہی بخش کہہ رہا تھا، ولید نے تمہارا راستہ روکا ہے؟" ولید کا نام لیتے ہوئے ان کی آنکھوں میں برہمی در آئی تھی۔ ویسے وہ نارمل لگ رہے تھے، جیسے نتاشا سے کوئی مسئلہ نہ ہو۔

"جی! وہ دھمکی دے رہا تھا کہ اگر...... اگر ہم نے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو ہم پر ذاتی حملے بھی کر سکتا ہے۔" اٹک اٹک کر اس نے چند فقرے جوڑے۔

''میں اس کو دیکھ لوں گا۔اب اکیلے باہر مت جانا۔'' ابا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔اب کیا فائدہ؟ کل تو ویسے ہی اسے استنبول چلے جانا تھا۔

کھانے کے بعد ثنا نے اس سے کہا کہ وہ ترکی کی تصاویر دکھائے سب کو، وہ لیپ ٹاپ لینے کمرے کی طرف جانے لگی تو ارم ساتھ ہی آ گئی۔اس کے سر میں درد تھا اور وہ ذرا لیٹنا چاہتی تھی۔

''تم نے دیکھا، عابدہ چچی اور سحرش کیسے پھپھو کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں؟'' اس کے بیڈ پہ تکیہ درست کر کے لیٹتی ارم بولی تھی۔سحرش واقعی سارا وقت صرف پھپھو سے بات چیت کرتی رہی تھی۔

''جیسے مجھے ان کی پروا ہے۔'' وہ شانے اچکا کر لیپ ٹاپ اٹھائے باہر آ گئی۔

جب وہ لیپ ٹاپ میز پہ رکھے، اپنے ساتھ بیٹھی ثنا کو تصاویر ایک ایک کر کے دکھا رہی تھی تو نتاشا ثنا کے دوسری جانب سنگل صوفے پہ بیٹھی تھی۔وہ زیادہ وقت خاموش ہی رہی تھی، بس کبھی کسی بات کا جواب دے دیتی، کبھی مسکرا دیتی، اور کبھی امریکیوں کے مخصوص انداز میں نخرے سے شانے اچکا دیتی۔

''ایک منٹ پیچھے کرنا۔'' وہ بیوک ادا کی ایلی اور ڈی جے کی تصاویر آگے کرتی جا رہی تھی جب اس نے نتاشا کو سیدھا ہوتے دیکھا۔وہ بے اختیار رکی، مڑ کر نتاشا کو دیکھا پھر تصویر پیچھے کی۔

وہ ڈی جے تھی۔ادا کے بازار کا منظر۔عقب میں جہان کھڑا بگھی بان سے بات کر رہا تھا۔وہ بگھی کی سواری سے چند منٹ قبل کا فوٹو تھا۔وہ تصویریں نہیں بنواتا تھا مگر اتفاق سے اس تصویر میں وہ نظر آ ہی گیا تھا۔

''یہ جہان ہے نا؟'' نتاشا جیسے خوش گوار حیرت سے بولی۔لاؤنج میں بیٹھی تمام خواتین رک کر اسے دیکھنے لگیں۔وہ ذرا آگے ہو کر بیٹھی، مسکراتے ہوئے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

''تم کیسے جانتی ہو؟'' فاطمہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''یہ ہمارے پاس آیا تھا ایک دفعہ، نائٹ لیٹ گیا تھا ہماری طرف۔بہت سوئٹ ہے۔ہے نا؟'' اس نے تائیدی انداز میں حیا کو دیکھا۔حیا نے ایک نظر باقی سب پہ ڈالی اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔وہ کتنا سوئٹ ہے مجھ سے بڑھ کر کون جانتا ہے۔

''ہاں، اس نے بتایا تھا۔مجھے خوشی ہے کہ تمہیں یاد رہا۔'' پھپھو مسکرائی تھیں۔روحیل سے وہ ان چج تھیں مگر نتاشا سے نہیں، سو انہیں اچھا لگا تھا۔

''آف کورس آنٹی! اس نے بالخصوص بتایا تھا کہ وہ روحیل کی بہن کا شوہر ہے تو میں کیسے بھول سکتی تھی؟''

سحرش نے عابدہ چچی کو دیکھا اور عابدہ چچی نے صائمہ تائی کو۔چند متذبذب نگاہوں کے تبادلے ہوئے اور جیسے لمحے بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

پہلی بار اس کو نتاشا بہت اچھی لگی۔ولید کی باتوں سے چھائی کلفت ذرا کم ہو گئی اور وہ انہیں باقی تصاویر دکھانے لگی۔پھر جب لیپ ٹاپ رکھنے کمرے میں آئی تو ارم اس کے بیڈ پہ بیٹھی اس کے موبائل کو کان سے لگائے دبی دبی غصیلی آواز میں کسی سے بات کر رہی تھی۔

''یہ لڑکی بھی نا!'' حیا نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔ارم اسے دیکھ کر تیزی سے الوداعی کلمات کہنے لگی۔

''پلیز کال لاگ کلیئر مت کرنا۔میرے اہم نمبر ضائع ہو جائیں گے۔'' اس نے ابھی کال کاٹی ہی تھی کہ حیا نے فون کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

ارم نے بغیر کسی شرمندگی کے فون اس کو واپس کر دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

حیا نے کال لاگ چیک کیا۔اسی نمبر پہ جو اس نے اپنے موبائل کے اندر ایک میسج میں محفوظ کر رکھا تھا، ارم نے آدھا گھنٹہ بات کی تھی۔تیس منٹ اور پچاس سیکنڈ چونکہ نمبر فون بک میں محفوظ نہیں تھا، سو ارم کو نمبر ملاتے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ نمبر اس فون میں پہلے سے درج ہے۔وہ تاسف بھری گہری سانس لے کر رہ گئی۔یہ لڑکی پتا نہیں کیا کر رہی تھی۔

عائشے گل کہتی تھی۔''اچھی لڑکیاں جیسے دوست نہیں بناتیں۔''

کاش! وہ یہ بات ارم کو سمجھا سکتی۔

وہ واپس لاؤنج میں آئی تو باتوں کا دور ویسے ہی چل رہا تھا۔پھر صائمہ تائی نے ایک دم اسے مخاطب کیا۔

''جہان کی واپسی کا کیا پروگرام ہے حیا؟'' شاید یہ جتانا مقصود تھا کہ اسے جہان کی خبر تک نہیں۔ اس نے بہت ضبط سے گہری سانس لی۔ سبین پھپھو ابھی اٹھ کر کچن تک گئی تھیں۔

''کل میں استنبول جا رہی ہوں نا، تو پھر دیکھتے ہیں کیا پروگرام ڈیسائڈ ہوتا ہے۔''

''تمہاری کب واپسی ہو گی؟'' سحرش نے بہت سادگی سے پوچھا۔ اسے لگا، سب مل کر اس کی تحقیر کر رہے ہیں۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ جہان کے پروگرام پہ منحصر ہے۔'' اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ ''شاید ہفتہ لگ جائے، پھر ہم ساتھ ہی واپس آئیں گے۔''

اس کے لہجے کی مضبوطی پہ سب نے، حتیٰ کہ فاطمہ نے بھی اسے بے اختیار دیکھا تھا۔ وہ نظر انداز کر کے ثنا کی طرف متوجہ ہو گئی، جو پیالی میں پانی بھر لائی تھی اور اپنے پرس سے سرخ، گلابی اور کاسنی نیل پالش کی شیشیاں نکال کر میز پہ رکھ رہی تھی۔ اسے ماربل نیل پالش لگانی تھی اور وہ جانتی تھی کہ حیا سے بہتر یہ کام کوئی نہیں کر سکتا۔

''لگا کر دے رہی ہوں، مگر وضو کرنے سے پہلے دھو لینا۔'' سب ابھی تک اسے دیکھ رہے تھے وہ جیسے بے نیاز سی ہو کر ہر نیل پالش کا ایک ایک قطرہ پانی میں ٹپکانے لگی۔ تینوں رنگ بلبلوں کی صورت پانی کی سطح پہ تیرنے لگے۔ اس کی امیدوں اور دعوؤں جیسے بلبلے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت بڑی بات کہہ گئی ہے۔ جہان ترکی میں نہیں تھا اور وہ اس کے ساتھ واپس نہیں آئے گا، مگر وہ ان کو مزید خود پہ ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

''اب انگوٹھا ڈالو۔'' اس کے کہنے پہ ثنا نے انگوٹھا پانی میں ڈبو کر نکالا، تو ناخن پہ تینوں رنگوں کا ماربل پرنٹ چھپ گیا تھا۔

''واؤ!'' ثنا ستائش سے انگوٹھے کو ہر زاویے سے دیکھنے لگی۔ وہ قدرتی سا ڈیزائن تھا اور بہت خوب صورت تھا۔ قدرت کے ڈیزائن بھی کتنے خوب صورت ہوتے ہیں ناں۔ انسان کی ڈیزائننگ سے بھی زیادہ خوب صورت۔

☆ ☆ ☆

رات دیر سے وہ روحیل کے ساتھ تایا ابا کی طرف گئی تھی تا کہ جانے سے قبل ان سے مل لے اور طبیعت بھی پوچھ لے۔ تایا کی پٹی بندھی تھی اور وہ قدرے بہتر لگ رہے تھے۔

''تم بہن بھائیوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔'' انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔ وہ بیڈ پہ تکیوں سے ٹیک لگا کر نیم دراز تھے۔ پرسوں اگر اسے لگا تھا کہ وہ پہلے جیسے تایا فرقان بن گئے ہیں تو وہ غلط تھی گو کہ سرد مہری کی دیوار گر چکی تھی اور وہ نارمل انداز میں اس سے بات چیت کر رہے تھے، پھر بھی پہلے والی بات نہ تھی۔ اس نے اپنے حجاب سے ان کے زخم کو مرہم دیا تھا، یہ بات جیسے پرانی ہو گئی تھی۔ فطرت کبھی نہیں بدلتی۔

''اور جہان کا کیا پروگرام ہے؟''

''جہان میرے ساتھ ہی واپس آئے گا۔'' تایا کے جواب میں اس نے ذرا اونچی آواز میں کہتے ہوئے قریب بیٹھی صائمہ تائی کو پھر سے سُنایا۔ تائی کو جیسے یہ بات پسند نہیں آئی، انہوں نے رُخ پھیر لیا۔

واپسی پہ دونوں گھروں کا درمیانی دروازہ عبور کرتے ہوئے روحیل نے پوچھا۔ ''صائمہ تائی صبح بتا رہی تھیں کہ جہان تمہیں تمہارے برقعے کی ضد کی وجہ سے چھوڑ کر گیا ہے؟''

حیا نے گہری سانس لیتے ہوئے درمیانی دروازہ لاک کیا اور پھر روحیل کی طرف مڑی۔

''تمہارے ایف ایس سی پری انجینئرنگ میں کتنے مارکس آئے تھے روحیل؟''

''میرے مارکس؟'' وہ ذرا حیران ہوا۔ ''نو سو اکانوے۔ کیوں؟''

''اور جب تمہارے نو سو اکانوے نمبر آئے تھے تو صائمہ تائی نے کہا تھا کہ اس فیڈرل بورڈ والوں سے پیپرز گم ہو گئے تھے، سو انہوں نے Randomly مارکنگ کرتے ہوئے شیرینی کی طرح نمبر بانٹے ہیں اور اس بات کو خاندان والوں سے سن کر تم نے کہا تھا کہ.....ایک منٹ، مجھے تمہارے الفاظ دہرانے دو۔'' وہ اس شام میں پہلی دفعہ مسکرائی۔

''تم نے کہا تھا، صائمہ تائی اس دنیا کی سب سے جھوٹی خاتون ہیں۔''

''اوکے، اوکے، سمجھ گیا۔'' روحیل ہنستے ہوئے سر جھٹک کر اس کے ساتھ پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

چھ ماہ قبل اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ اس واہیات ویڈیو کی سی ڈی اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ ارم لاؤنج میں زمین پہ بیٹھی رد

رہی تھی اور تایا ابا، روحیل سب وہاں موجود تھے۔ تب اس نے سوچا تھا کہ روحیل تو امریکہ میں ہے، پھر ادھر کیسے آیا؟ مگر اب روحیل ادھر آ گیا تھا۔ اس بھیانک منظر کے سارے کردار یہاں موجود تھے۔ جب وہ ترکی سے واپس آئے گی تو کیا اس کا استقبال اس خواب جیسا ہوگا؟ اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

☆　☆　☆

استنبول ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ تاقسم کے مجسمہ آزادی کے پتھروں کا رنگ، ٹیولپس کی مہک، استقلال جدیسی میں چلتے لوگ، سپانجی کی مصنوعی جھیل، ہر شے پہلے جیسی تھی۔ بس ڈی جے نہیں تھی اور جہان نہیں تھا، مگر ان دونوں کا عکس استنبول کے ہر گلی کوچے اور باسفورس کے نیلے جھاگ کے ہر بلبلے میں جھلملا رہا تھا۔ اس شہر نے اس کی زندگی بدل دی تھی اور اب اس بدلی ہوئی پوری زندگی میں وہ اس شہر کو بھول نہیں سکتی تھی۔

بیوک ادا کی بندرگاہ سے چند کوس دور وہ پتھروں کے ساحل پہ ایک بڑے پتھر پہ بیٹھی، ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلی میں پڑے پلاٹینم بینڈ کو گھماتی سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ پرسوں جب وہ استنبول آئی تھی، تب سے اب تک وہ جہان کا ہر نمبر ملا چکی تھی، مگر سب بند تھے۔ وائس میسج اس نے پھر بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کیا کہے؟ الفاظ ہی ختم ہو جاتے تھے۔ کلیئرنس کے تمام معاملات اس کی توقع سے جلدی حل ہو گئے تھے۔ ویزا اس نے بڑھوا لیا تھا۔

پہلے اسے لگا کہ وہ دیر سے واپس آئی ہے مگر فلسطینی لڑکے اور اسرائیلی تالی بھی ابھی گئے نہیں تھے۔ ان کی آج رات کی فلائٹ تھی اور فریڈم فلوٹیلا نے جو دوستی توڑی تھی، وہ اب تک جڑ نہ پائی تھی۔ صبح ادالار آنے سے قبل اس نے معتصم کو پھر سے عبایا کے لیے شکریہ کہا تھا۔ وہ جواباً مسکرا کر رہ گیا تھا۔ بالآخر آج شام ان کا ترکی میں یادگار سمسٹر اختتام پذیر ہو جانا تھا۔ خود اس کا کیا پروگرام تھا، وہ ابھی کچھ فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ جہان لندن میں ہی تھا اور وہ ادھر جا نہیں سکتی تھی اور اس کو لیے بغیر وہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ کیا کرے؟

ایک لہر تیرتی ہوئی اس کے قریب آئی اور پھر واپس پلٹ گئی۔ وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ لہر اس کے قریب ایک چھوٹا سا سیپ ڈال گئی تھی۔

اس نے سیپ چننے عرصہ ہوا ترک کر دیا تھا۔ خالی سیپ کھولنے سے بڑی مایوسی کیا ہوگی بھلا؟ مگر نہ جانے کیوں وہ اٹھی اور ذرا آگے جا کر جھکتے ہوئے وہ سیپ اٹھا لیا۔ دائیں پیر پہ زور پڑنے سے اب بھی تکلیف ہوئی تھی۔

سیپ لے کر وہ واپس بڑے پتھر پہ آ بیٹھی اور دونوں ہاتھوں میں اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ سفید سرمئی سیپ جس پہ بھوری، گلابی لکیریں سی بنی تھیں۔ سیپ گیلا تھا، اور ریت کے ذرات بھی اس پہ لگے تھے۔ اس نے پرس سے ٹشو نکالا، سیپ کو اچھی طرح صاف کیا، یہاں تک کہ ٹھنڈا، سخت خول چمکنے لگا اور پھر وہاں سے اٹھ آئی۔ پکنک کے لیے دور دور تک ٹولیوں میں بیٹھے سیاحوں سے اسے چھری ملنے کی توقع تھی مگر ایک خوانچہ فروش سامنے ہی نظر آ گیا۔ اس کے پاس چاقو تھا۔

حیا نے اس سے چاقو لیا اور وہیں اس کی ریڑھی کے ساتھ کھڑے کھڑے سیپ کو کاٹا۔

اس نے طے کر لیا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری سیپ ہوگا۔ اس میں سے یا تو سفید موتی نکلے گا یا پھر نہیں نکلے گا۔ مگر ان دونوں ممکنات میں سے جو بھی ہو، وہ دوبارہ کبھی سیپ نہیں چنے گی۔

اس نے کٹے ہوئے سیپ کے دونوں باہم ملے ٹکڑوں کو آہستہ سے الگ کرتے ہوئے کھولا۔ دھیرے دھیرے دونوں ٹکڑے جدا ہوتے گئے۔

وہ یک ٹک سی کھلے سیپ کو دیکھ رہی تھی۔

تیسرا امکان بھی ہو سکتا تھا، یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔

☆　☆　☆

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ بہارے گل کے سامنے، حلیمہ آنٹی کے فرشی نشست والے کمرے میں بیٹھی تھی۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں حیا! سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔“ وہ بہت اداسی سے کہہ رہی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے زمین پہ بیٹھی تھیں۔ بہارے نے سبز فراک کے اوپر گھنگھریالے بھورے بالوں کو ہمیشہ کی طرح ہم رنگ پونی میں باندھ رکھا تھا، مگر اس کا چہرہ ہمیشہ جیسا نہ تھا۔

”تو تم نے اپنا پاسپورٹ کیوں جلایا؟“ اس نے جب سے حلیمہ آنٹی سے یہ بات سنی تھی، وہ اچنبھے کا شکار ہو گئی تھی۔

"تاکہ وہ نیا پاسپورٹ دینے کے لیے میرے پاس آ جائے۔" بہارے نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔ حیا نے الجھن سے اسے دیکھا۔ بہارے بہت سمجھدار، بہت ذہین بچی تھی، مگر اس طرح کی بات کی امید اس نے بہارے سے نہیں کی تھی۔

"تمہیں کیوں لگا کہ اس طرح وہ واپس آئے گا؟" وہ اس کے جھکے سر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ بہارے خاموش رہی۔

"بہارے گل! تمہیں کس نے کہا کہ ایسا کرنے سے وہ واپس آ جائے گا؟" اب کے اس نے سر اٹھایا۔ اس کی بھوری سبز آنکھوں میں بے پناہ اداسی تھی۔

"سفیر نے کہا تھا کہ ایسا کرو گی تو وہ آ جائے گا۔"

"اچھا!" وہ اب کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔ "تو سفیر بے کیوں چاہتے ہیں کہ وہ ادھر آ جائے جب کہ ادھر آنا اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے؟" بہارے فکر مندی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ حیا نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ سفیر کوئی گڑبڑ کر رہا ہے۔"

"کیا تمہیں پتا ہے عبدالرحمٰن کدھر ہے اور......" وہ ہچکچائی "کیا تمہیں پتا ہے وہ تمہارا..."

"ہاں مجھے سب پتا ہے اور اب اس بات کا ذکر مت کرو۔" اس نے جلدی سے بہارے کو خاموش کرایا۔ دروازہ کھلا تھا۔ حلیمہ آنٹی کچن تک ہی گئی تھیں۔

"تم نے کہا تھا ہم مل کر اسے ڈھونڈیں گے۔" بہارے نے بے چینی سے کچھ یاد دلایا۔

"وہ ترکی میں نہیں ہے اور ہم اسے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ میرے ابا نے اجازت......" باہر آہٹ ہوئی تو وہ جلدی سے خاموش ہو گئی۔ حلیمہ آنٹی دوائی کی شیشی پکڑے اندر آ رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ڈوپٹہ اوڑھے، مسکراتا حلیم چہرہ۔ ان کو یقیناً خود بھی نہیں پتا تھا کہ ان کا بیٹا کیا کرتا پھر رہا ہے۔ کچھ تو تھا جو غلط تھا۔

"مجھے نہیں کھانی دوائی۔" بہارے نے بُرا سا منہ بنایا تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔

"اس کو کل سے بخار ہے، پلیز اس کو سیرپ پلا دو حیا! میں تب تک کچن دیکھ لوں۔" انہوں نے سیرپ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے فوراً پکڑ لیا۔

"میں پلا دیتی ہوں۔"

"تھینک یو بیٹا۔ میں تب تک کھانا نکالتی ہوں۔ تم کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤ گی۔" مسکرا کر کہتی، وہ باہر نکل گئیں۔ حیا نے گردن ذرا اونچی کر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ جب وہ اوجھل ہو گئیں تو وہ بہارے کی طرف مڑی۔

"کیا تم نے انہیں بتایا کہ یہ سب کرنے کو تمہیں سفیر نے کہا تھا؟" ساتھ ہی اس نے چمچ میں بوتل سے جامنی سیرپ بھرا۔ بہارے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے منہ کھولا۔ اس نے چمچ اس کے منہ میں رکھا۔

"اللہ اللہ! میرا منہ کڑوا ہو گیا۔" سیرپ پینے کے بعد وہ چہرے کے زاویے بگاڑے شکایت کرنے لگی تھی۔

"اللہ تمہیں سمجھے، اللہ تمہیں سمجھے!" وہ جلدی جلدی پانی کا گلاس پیتی بُرا سا منہ بنائے کہہ رہی تھی۔ پانی پی کر بھی اس کی کڑواہٹ ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جیسے اپنی اصل اداسی کا چڑچڑا پن اس سیرپ پہ نکال رہی تھی۔

"اتنا بھی کڑوا نہیں تھا۔ ٹھہرو میرے پاس کینڈی یا چاکلیٹ ہو گی۔" اس نے قالین پہ رکھا اپنا پرس کھولا اور اندر ہاتھ سے ٹٹولا۔ صبح پرس میں چیزیں ڈالتے ہوئے اس نے دیکھا تھا کہ اندر کینڈی رکھی تھی۔ ایک گلابی ریپر والی کینڈی اور ایک خالی ریپر۔ اس نے دونوں چیزیں باہر نکالیں اور کینڈی بہارے کو دی۔

"شکریہ!" بہارے نے جلدی سے کینڈی کھول کر منہ میں رکھ لی۔ حیا نے خالی ریپر کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اسے اس ریپر کے ساتھ ڈاکٹر ابراہیم کی باتیں بھی یاد آئی تھیں۔ احزاب کی پہیلی......

"بہارے! تمہیں یاد ہے، عائشے نے کہا تھا کہ حجاب لینا احزاب کی جنگ جیسا ہوتا ہے۔" ساری کڑواہٹ بھلائے، کینڈی چوستی بہارے نے سر اثبات میں ہلایا۔

"پتا ہے، مجھے کسی نے کہا کہ اس میں کچھ مسنگ ہے۔ کیا عائشے کچھ بتانا بھول گئی تھی؟" بہارے کے ہلتے لب رکے، آنکھوں میں خوشگوار سی حیرت ابھری۔

"ہاں، مجھے پتا ہے۔ عائشے نے آخر میں بتایا ہی نہیں تھا کہ....." وہ کینڈی والے منہ کے ساتھ جوش سے بولتی بولتی ایک دم رکی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی سی اتر آئی تھی۔ "تمہیں بگلوں نے بتایا کیا؟"

"بگلے!" حیا نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"ہاں، ہاں۔" بہارے جوش سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "جب سمندر کنارے عائشے یہ سب بتا رہی تھی تو میں نے دل ہی دل میں بگلوں کو بتائی تھی یہ بات۔

مرمرا کے بگلے اور سلطان احمت مسجد کے کبوتر دل کی بات سن لیتے ہیں..... مگر تم عائشے کو نہ بتانا کہ میں نے یہ کہا ہے، وہ آگے سے کہتی ہے، دل کی بات اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں سُن سکتا۔" حیا بے اختیار ہنس پڑی۔

"وہ ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے یہ بات میرے ٹیچر نے کہی تھی۔ بگلے اور کبوتر کیسے کسی کے دل کی بات سُن سکتے ہیں بہارے!"

بہارے کو جیسے اس کا یوں کہنا بہت بُرا لگا تھا۔

"کیوں؟ کیوں وہ ماہ سن کے دل کی بات تو سنتے تھے نا، اسی لیے وہ کبوتر بن گئی تھی۔ تو میرے دل کی بات کیوں نہیں سُن سکتے۔"

"ماہ سن کون؟" وہ ذرا سا چونکی۔ اسے لگا اس نے یہ بات پہلے بھی کہیں سُنی تھی۔ ماہ سن جو کبوتر بن گئی تھی۔

"کیا تم نے ماہ سن کا واقعہ نہیں سن رکھا؟" بہارے کو اس کی لاعلمی نے حیران کیا۔

"نہیں..... تم سناؤ۔"

"او کے!" بہارے نے کرچ کرچ کی آواز کے ساتھ جلدی جلدی کینڈی چبائی اور کسی ماہر داستان گو کی طرح سُنانے لگی۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کپادوکیہ میں ایک نواب کی بیٹی رہتی تھی، اس کا نام ماہ سن تھا۔ ایک دن ماہ سن نے دیکھا کہ اس کے قلعے کے باہر ایک لڑکا کچھ چیزیں بیچ رہا ہے۔ اس کے پاس کڑھائی کیے ہوئے رومال، قالین اور....."

"ایک منٹ! اتنی لمبی کہانی میں نہیں سُن سکتی۔ صرف ہائی لائٹس بتاؤ!" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بہارے کو روکا۔ وہ جو بہت شوق سے سنا رہی تھی، خفا سی ہو گئی۔

"بس اسے وہ لڑکا پسند آ گیا مگر نواب نے ان دونوں کو علیحدہ کر دیا۔ اس نے ماہ سن کو قلعے میں بند کر دیا۔ وہاں کھڑکی پہ روز کبوتر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ انہوں نے ماہ سن کے دل کی بات سن لی۔ ایک دن وہ بھی کبوتر بن گئی اور صبح وہ کبوتر بن کر اڑ جاتی اور شام میں واپس آ کر پھر سے لڑکی بن جاتی۔ نواب کو پتا چل گیا تو اس نے زہریلے دانے رکھ دیے، ماہ سن نے وہ کھا لیے اور وہ مر گئی اور پھر اس کا باپ بھی پتا نہیں کیسے مر گیا۔"

آخری بات بہارے نے بہت ناراضی کے عالم میں ہاتھ جھلا کر کہی تھی مگر حیا سُن نہیں رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ریپر کو دیکھ رہی تھی۔

جس رات جہان گیا تھا اس سے قبل آخری دفعہ وہ اس سے اٹالین ریسٹورنٹ میں ٹھیک سے بات کر پائی تھی اور جب اس نے جہان سے واپسی کا پوچھا تھا تو اس نے کہا تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے میں ماہ سن کی طرح کبوتر بن کر کسی غار میں چھپ جاؤں۔"

اس نے شکن زدہ ریپر پہ انگلی پھیری۔ اس پہ بنے غار کو دیکھ کر اسے بہت کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔

"کپادوکیہ۔" بہارے الجھ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے کپادوکیہ جانا ہے۔ وہ کپادوکیہ میں ہے۔ مجھے اسے ڈھونڈنا ہے۔" اس نے پرس سے موبائل نکالا اور تیزی سے فلائٹ انکوائری ڈائل کرنے لگی۔

"کیا وہ کپادوکیہ میں ہے؟ کیا تم اب ادھر جاؤ گی؟" بہارے بہت پُرجوش ہو چکی تھی۔ حیا ایک دم ٹھہر سی گئی۔ اسے اپنی ایکسائٹمنٹ میں بہارے کے سامنے کپادوکیہ کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر بہارے نے کسی کو بتا دیا تو..... اف، اسے تو راز رکھنا بھی نہیں آیا تھا۔ اس نے خود کو کوسا اور فون بند کر دیا۔

"کیا میں بھی تمہارے ساتھ کپادوکیہ جا سکتی ہوں؟ بتاؤ!" بہارے نے اس کے گھٹنے کو ہلا کر پوچھا۔

"شش!" اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھی پھر کھلے دروازے کو دیکھا۔ اب وہ یوٹرن نہیں لے سکتی تھی۔ وہ بہارے کو بتانے کی غلطی کر چکی تھی۔

"پلیز مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ پلیز حیا!" بہارے اب دبی آواز میں منت کرنے لگی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنی

آنکھوں میں زمانے بھر کی اداسی و بے بسی سموئی تھی۔ "پلیز میں وعدہ کرتی ہوں میں اچھی لڑکی بن کر رہوں گی۔ تمہیں تنگ بھی نہیں کروں گی۔"

"میں تمہیں کیسے لے جاسکتی ہوں؟" حیا نے بے چینی و تذبذب سے دوبارہ کھلے دروازے کو دیکھا۔ حلیمہ آنٹی کسی بھی وقت آ سکتی تھیں۔

"پلیز حیا...... پلیز!" بہارے کی اداس آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

اس کا دل پسیجنے لگا۔ کیا بہارے کو ساتھ لے جانا اتنا مشکل تھا؟ اور اگر وہ اسے یہیں چھوڑ گئی اور اس نے سفیر یا نسی اور کے سامنے کپادوکیہ کا ذکر کر دیا تو......؟ جو بات جہان نے صرف اسے بتائی تھی، اس کی ہر جگہ تشہیر ہو، اس سے بہتر تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائے۔ کیا وہ درست نہج پہ سوچ رہی تھی؟

"حیا...... بہارے! کھانا کھالو۔"

حلیمہ آنٹی کھانے کے لیے آوازیں دینے لگیں تو بہارے نے جلدی جلدی گیلی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ حیا کچھ کہے بنا اٹھ کھڑی۔

کھانے میں پلاؤ کے ساتھ مچھلی بنی تھی۔ وہ ذرا بے توجہی سے کھاتی بہارے کے بارے میں سوچ جارہی تھی۔ سفیر اس بچی کو اسی گھر میں روکے رکھنا چاہتا تھا، ایسا کر کے کہیں وہ جہان کو بلیک میل تو نہیں کر رہا تھا؟ اگر بہارے کسی مصیبت میں ہوئی تو جہان کو واپس آنا پڑے گا۔ وہ بہارے کے لیے ضرور آئے گا۔ اس کو جیسے جھرجھری سی آئی۔

"عثمان انکل اور سفیر کہاں ہیں آنٹی؟" اس نے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"ہوٹل پہ ہیں دونوں۔ عثمان شاید آنے والے ہوں، مگر سفیر ذرا لیٹ آتا ہے۔" آنٹی نے مسکرا کر بتایا تو حیا نے سر ہلا دیا۔ سفیر اب گھر پہ نہیں تھا، ایسے میں وہ بہارے کو لے کر وہاں سے جاسکتی تھی۔ یہی ٹھیک تھا۔ بھلے کوئی اسے جلدی میں فیصلے کرنے والی کہے، مگر وہ ایسی ہی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بہارے کو ساتھ لے جائے گی۔

"حلیمہ آنٹی! میں چند دن کے لیے ازمیر جا رہی ہوں۔ کیا بہارے میرے ساتھ چل سکتی ہے؟"

بہارے نے تیزی سے گردن اٹھائی۔ اس کے چہرے پہ چمک در آئی تھی۔

"بہارے؟ پتا نہیں، عائشے یا اس کی دادی سے پوچھ لو، اگر ان کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔"

حلیمہ آنٹی نے جیسے راضی برضا انداز میں شانے اچکائے۔ انہیں لگا تھا کہ بہارے اس بات سے خوش ہے، سو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

عائشے کا نمبر بہارے سے لے کر اس سے اجازت لینا رسمی کارروائی تھی۔ حلیمہ آنٹی نے بتایا تھا کہ بہارے کا پاسپورٹ عبدالرحمٰن ایک ہفتے تک بھجوا دے گا۔ وہ کدھر تھا، وہ بھی نہیں جانتی تھیں، سو اس ایک ہفتے تک بہارے اس کے ساتھ اگر رہ لیتی ہے تو کسی کو اس بات سے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

بہارے نے جلدی جلدی اپنا چھوٹا سا بیگ تیار کر لیا اور پھر اپنا گلابی پرس کندھے سے لٹکائے، بالکل تیار ہو کر خوشی خوشی اس کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ چند منٹ پہلے کی لٹکی ہوئی صورت کا اب شائبہ تک نہ تھا۔ چھوٹی سی اداکارہ۔

حلیمہ آنٹی سے رخصت ہو کر وہ پہلی فیری لے کر استنبول واپس آئی تھیں۔ اپنے ڈورم میں آ کر اس نے ایک چھوٹے بیگ میں بہارے کا سامان ڈالا اور پھر اپنے چند کپڑے اور ضروری چیزیں رکھیں۔ کم سے کم سامان بہتر تھا۔

بہارے کا نیکلس وہ گزشتہ روز خرید چکی تھی، مگر اس نے ابھی دینا مناسب نہ سمجھا۔ اسے کسی خاص موقع کے لیے سنبھال کر وہ ابھی صرف اور صرف جہان کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

"حیا! ہم اسے وہاں کیسے ڈھونڈیں گے؟" اوپر اس کے بنک پہ بیٹھی اسے پیکنگ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"میں ذرا کچھ فرینڈز سے مل کر آتی ہوں، وہ آج جا رہے ہیں۔" وہ باہر چلی آئی اور کمرا مقفل کر دیا۔

معتصم، حسین اور مومن گورسل اسٹاپ پہ کھڑے تھے۔ ٹالی بھی ان سے ذرا فاصلے پہ کھڑی تھی۔ سب کے بیگز ان کے پاس تھے۔ لطیف، چیری، سارہ، یہ لوگ کب کے جا چکے تھے۔

"کی حال ہے حیا؟" معتصم نے پکارا۔

"حالی بخیر، کیا تم لوگ ابھی نکل رہے ہو؟" فلسطینیوں کے قریب پہنچ کر اس نے ان کو مخاطب کیا تو آواز میں نامعلوم سی اداسی در آئی۔

"ہوں"۔ حسین نے ڈھیلے ڈھیلے انداز میں سر ہلا دیا۔ زندگی میں ہر چیز کا ایک اختتام ہوتا ہے اور اب جبکہ اس "سفر" کا اختتام پہنچ رہا تھا۔ ایک عجیب سی کسک دل میں اٹھ رہی تھی۔

"کاش! یہ سفر کبھی ختم نہ ہوتا کاش! ہم سب ہمیشہ ادھر رہتے۔"

"اور ایک ساتھ پڑھتے رہتے۔" وہ بہت سی نمی اندر اتارتے ہوئے بولی۔ مغرب کے وقت کی اداسی ہر سو چھائی تھی۔ بس اسٹاپ اور سبانجی کا سبزہ زار ویران سا لگ رہا تھا۔

"اگر ایسا ہوتا تو اس جگہ کا چارم ہی ختم ہو جاتا، اس لیے یہی بہتر ہے کہ زندگی کے اس فیز کا اختتام ہو جائے، تاکہ ہم ساری عمر اسے یاد رکھیں۔" معتصم ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"میں تم لوگوں کو یاد رکھوں گی۔ تم سب بہت اچھے ہو۔"

"تھینکس...... اور ہاں! کیا تمہیں اپنے پزل باکس سے کوئی کارآمد چیز ملی یا وہ سب مذاق تھا؟" معتصم کو اچانک یاد آیا۔

"ہاں! بہت اچھی چیز ملی مجھے اس سے۔ ایسی اچھی چیز جو میں نے پا کر کھو دی، مگر اسے دوبارہ ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی۔ خیر! اپنا خیال رکھنا۔"

اللہ حافظ کہہ کر ان کے پاس سے ہٹ کر وہ ٹالی کی طرف آئی۔ بے چاری ٹالی۔ کتنی بے ضرر سی تھی وہ۔ ذرا سا چھیڑ ہی دیتی تھی اور وہ خوامخواہ اتنی ٹینشن لے لیتی۔ اہل مکہ تو اہل مکہ ہوتے ہیں۔ ان سے کیا شکوہ اصل دکھ تو بنو قریظہ دیتے ہیں۔ ہم سارا وقت ترکی، اٹلی اور فرانس کی حکومتوں کو حجاب پہ پابندی لگانے کے باعث برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ اگر اس سے آدھی توجہ اپنے خاندان کے "بڑوں" کی طرف کر لیں تو کیا ہی اچھا ہو۔

اس کے پکارنے پہ ٹالی، جو رخ پھیرے کھڑی تھی، چونک کر مڑی، پھر اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

"اوہ حیا! آج تمہارے بال کس رنگ کے ہیں؟"

"ہمیشہ کی طرح خوب صورت ہیں۔ رنگ جو بھی ہو۔" وہ بہت خوشگوار اور پر اعتماد انداز میں جواب دیتی اس سے گلے ملی۔

"میں تمہیں مس کروں گی۔"

"میں بھی۔" وہ پھر وہاں اس وقت تک کھڑی رہی جب تک کہ وہ لوگ گورسل میں سوار نہ ہو گئے۔ جب بس کیمپس کی حدود سے دور چلی گئی تو وہ واپس ڈورم میں آئی۔ بہارے منہ بسورے بیٹھی تھی۔

"حیا! ہم عبدالرحمٰن کو کپادوکیہ میں کیسے ڈھونڈیں گے؟"

"میں ذرا فلائٹ بک کروالوں۔" اس نے ان سنی کرتے ہوئے وہیں کمرے میں ٹہلتے ہوئے موبائل پہ نمبر ملایا۔ اتاترک ایئرپورٹ سے ان کو قیصری کے ایئرپورٹ "قیصری ہوالانی" کی صبح کی فلائٹ ملی تھی۔

"ہوالانی...... تم لوگ ایئرپورٹ کو ہوالانی کہتے ہو اور ہم "ہوائی اڈہ" اردو کے الفاظ ترک سے بھی نکلے ہیں اس لیے۔" فون بند کرتے ہوئے وہ جیسے محظوظ ہو کر بولی۔ بہارے بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔

"لیکن اگر ڈی جے ہوتی تو کہتی۔ ترک اردو سے نکلی ہو گی، مگر ہماری اردو اور پنجابی ہے بالکل۔" وہ دھیرے سے ہنسی اور سر جھٹکا۔ وہ "میدان پاکستان" پہ کوئی کمپرومائز نہیں کرتی تھی۔" اس کا لہجہ کہیں کھو سا گیا۔

"ڈی جے...... وہ ہی جو مر گئی تھی نا؟" بہارے نے بہت سمجھداری سے پوچھا۔ وہ اپنا سوال بھول چکی تھی۔

"ہوں! اور اب وہ کبھی واپس نہیں آ سکتی۔ بعض لوگ اتنی دور چلے جاتے ہیں کہ ان سے دوبارہ ملنے کے لیے مرنا ضروری ہوتا ہے۔" اس کے چہرے پہ تاریک سائے آن ٹھہرے۔ وہ کھڑکی کے پاس آئی اور سلائیڈ کھولی۔ باہر تاریکی میں ڈوبے، سبانجی کے وسیع و عریض میدان نظر آ رہے تھے۔

"تمہیں پتا ہے، وہ روز صبح اس جگہ کھڑے ہو کر کیا کہتی تھی؟"

"کیا؟"

"وہ کہتی تھی، گندمار......" الفاظ لبوں پہ دم توڑ گئے۔ جب پچھلی دفعہ وہ پاکستان سے آئی تھی، تب بھی ڈی جے کا مقولہ دہرانے سے قبل الفاظ اسی طرح دم توڑ گئے تھے۔ مگر تب وجہ شدتِ غم تھی اور آج...... آج وجہ سامنے کھڑی تھی۔ بلکہ کھڑا تھا۔

"سفیر! سفیر عثمان!" اس نے جلدی سے سلائیڈ بند کی اور پردہ برابر کیا۔ بہارے اسپرنگ کی طرح اچھل کر بنک سے نیچے اتری۔

"یہ یہاں کیوں آیا ہے؟" حیا بے یقینی سے دہراتی پردے کی درز سے باہر دیکھنے لگی۔ بہارے بھی اس کے ساتھ آ کر ایڑیاں اونچی کر کے کھڑکی سے جھانکنے لگی۔

دور سبزہ زار پہ سفیر کھڑا ایک اسٹوڈنٹ کو روک کر جیسے کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ اسٹوڈنٹ جواباً نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"یہ ہمارے بارے میں پوچھ رہا ہے۔" خطرے کی گھنٹی کہیں بجتی سنائی دے رہی تھی۔ بہارے نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

"کیا وہ مجھے لے جائے گا؟"

"نہیں! تم میرے ساتھ رہو گی۔ میں کچھ کرتی ہوں۔" اس نے موبائل اٹھایا اور جلدی سے ہالے کا نمبر ملایا۔ ہر مشکل وقت پہ ہالے ہی کام آتی تھی۔

"سفیر بُرا نہیں ہے۔ وہ میرا اور عائشے کا بہت خیال رکھا کرتا تھا۔ وہ بالکل ہمارے بھائی جیسا ہے۔"

"بھائی صرف وہی ہوتا ہے، جسے اللہ نے آپ کا بھائی بنایا ہو بہارے اور جسے اللہ آپ کا بھائی نہ بنائے، وہ کبھی بھائی نہیں ہو سکتا۔ بس! تم اور عائشے...... تم لوگ بہت سادہ ہو۔" نمبر ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔

ہالے لائبریری میں تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ فوراً باہر آئی اور سیدھی سفیر کی طرف گئی۔ وہ اسے پہچان گیا تھا۔ ہوٹل گرینڈ پہ وہ اس سے مل چکا تھا۔ سفیر نے اس سے پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ کا پوچھا تو ہالے نے بتایا کہ وہ تو دوپہر کی ٹرین سے ازمیر چلی گئی تھی۔ کس اسٹیشن سے، یہ ہالے نہیں جانتی تھی، مگر سفیر نے اسے اپنا نمبر دے دیا کہ اگر اسے حیا کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے تو اسے ضرور آگاہ کرے۔ ہالے نے اس کی پوری تسلی و تشفی کروا کر فون نمبر رکھ لیا۔

"اور وہ ایک چھوٹی بچی کا بھی پوچھ رہا تھا، جو غالباً یہ ہی ہے۔ ڈونٹ ٹیل می حیا! کہ تم نے اسے اغوا کیا ہے۔" سفیر کے جانے کی تسلی کر لینے کے بعد اب ہالے ان کے ڈورم میں بیٹھی خوش ہوتے ہوئے اپنی کارگزاری بتا رہی تھی۔

"میں اناطولیہ کی بہارے گل ہوں۔ مجھے کوئی اغوا نہیں کر سکتا۔" بہارے باقاعدہ بُرا مان گئی۔

"پھر ہالے! کل صبح تمہارا خوش قسمت دن ہو گا یا بدقسمت دن؟" اس نے بہارے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پیکنگ سمیٹتے ہوئے پوچھا۔ صبح وہ گورسل کی بجائے ہالے کی کار میں ایئرپورٹ جانا چاہتی تھی۔ کوئی خبر نہیں، سفیر صبح پھر واپس آ جائے۔

"خوش قسمت دن۔" ہالے نے ہمیشہ کی طرح پُرخلوص انداز میں بتایا۔ ترک اور ان کی مہمان نوازی۔

وہ واپس جا کر ان سب کو بہت مِس کرے گی، وہ جانتی تھی۔

صبح منہ اندھیرے ہالے انہیں لینے آ گئی۔ اس نے احتیاطاً ہالے کو بتایا تھا کہ وہ انقرہ جا رہے ہیں اور یہ کہ دو لڑکا بہارے کا ہمسایہ ہے اور اسے اس سے کچھ تحفظات ہیں۔ جب ہالے چلی گئی تو اس نے کپادوکیہ کے لیے دو ٹکٹس خرید لیے۔

"حیا!" بہارے نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے عبایا کی آستین ذرا کھینچ کر اسے متوجہ کرنا چاہا۔ "ہم اسے کپادوکیہ میں کیسے ڈھونڈیں گے؟" کل سے وہ کوئی تیسری دفعہ یہ سوال دہرا رہی تھی۔

"تیز چلو بہارے! ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔"

"حیا! ٹیل می ناؤ۔" بہارے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم زور سے چیخی۔ حیا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بہت غصے اور خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اطراف میں لوگ بھی مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

"سوری، سوری!" وہ ہاتھ اٹھا کر ان ٹھٹک کر دیکھتے لوگوں سے معذرت کرتی واپس بہارے کے پاس آئی۔ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھی اور گہرا سانس لے کر اس کو دیکھا۔

"تم نے کبھی سمندر سے مچھلیاں پکڑی ہیں؟"

بہارے کی آنکھوں میں الجھن در آئی، مگر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جب اتنے بڑے سمندر سے مچھلی پکڑنی ہو تو کیا کرتے ہیں بہارے؟ فش راڈ کی کنڈی پہ چھوٹی مچھلی لگاتے ہیں اور راڈ پانی میں ڈال کر کنارے پہ بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔ بڑی مچھلی خود بخود تیر کر ہمارے پاس آجاتی ہے..... ہے نا؟"

"ہم کپادوکیہ مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہیں حیا؟" بہارے کو بے پناہ حیرت ہوئی۔

"نہیں، میری بہن!" اس نے گہری سانس لی۔ کیسے سمجھائے؟ وہیں بیٹھے بیٹھے پرس کھول کر اس نے وہ ڈبی نکالی، جسے وہ سبانجی کے ڈورم میں رکھ کر بھول گئی تھی۔

"اس ڈبی میں ایک ٹریسر ہے جو عبدالرحمٰن کا ہے۔ اس ٹریسر کا ریسیور اس کے پاس ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب میں اس کے قریب ہوتی ہوں چند میل کے فاصلے پہ..... تو اس کو اپنے ریسیور پہ پیغام مل جاتا ہے کہ میں اس شہر میں ہوں۔"

"کیا ہمیں بھی پتا چل جائے گا کہ وہ کدھر ہے؟"

"نہیں بہارے! ہمیں اس کو نہیں ڈھونڈنا۔ اسے ہمیں ڈھونڈنا ہے۔ جیسے ہی اسے پتا چلے گا کہ میں اس کے قریب ہوں، وہ فوراً مجھے کال کرے گا اور میں پہلی دفعہ میجر احمد کی کال کا انتظار کروں گی۔" اس نے آخری فقرہ دل میں کہا تھا اور کھڑی ہو گئی۔

بہارے نے نیم فہمی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ پھر سے پکڑ لیا۔ وہ شاید ٹھیک سے سمجھ نہیں پائی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج سے لاکھوں برس قبل اناطولیہ کے پہاڑوں بشمول حسن داغ اور ادجیئس داغ (داغ ترک میں پہاڑ کو کہتے ہیں) کا لاوا پھٹا تھا اور یوں سیال مادہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے بہتا ارد گرد کے میدانوں میں دور دور تک پھیلتا گیا۔ کئی صدیاں اس لاوے کو سوکھنے میں لگیں اور قریباً تیس لاکھ برس قبل یہ لاوا مکمل طور پہ خشک تو ہو گیا، مگر بارش اور کٹاؤ کے بعد یہ اپنے پیچھے زمین کے چہرے پہ ایک عجیب و غریب علاقہ چھوڑ گیا۔ چاند کی سرزمین سے مشابہت رکھنے والے میدان اور وادیاں، جہاں حیرت انگیز نقش و نگار بنے رہ گئے۔ جیسے ہاتھ سے کسی ماہر مصور نے بنائے ہوں۔

کپادوکیہ..... خوب صورت گھوڑوں کی سرزمین۔

کپادوکیہ کا پہلا نام کس نے رکھا، اس بارے میں کئی روایات ہیں، البتہ اس کا موجودہ نام "کپادوکیہ" کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ یہ فارسی کے "کت پتوک" سے نکلا ہے یعنی..... (خوبصورت گھوڑوں) کی سرزمین۔

اس خشکی اور سبزے کا امتزاج لیے علاقے کی مٹی کی اوپری سطح خاصی نرم ہے، جس کے باعث گئے وقتوں کی عیسائی تہذیبوں نے یہاں پہاڑوں کے اندر غار نما بڑے بڑے گھر اور چرچ بنا لیے تھے۔ ان کی کھڑکیاں یوں ہوتیں کہ دور سے لگتا، جیسے کسی پہاڑی کی بہت سی آنکھیں ہوں۔ زمین کے اندر بنے سینکڑوں زیر زمین شہر آج بھی یہاں موجود تھے۔

صدیوں پرانا غاروں سے بنا ہوا خوب صورت کپادوکیہ۔

ماہ سن کے کبوتروں کی سرزمین۔

☆ ☆ ☆

کپادوکیہ، ترکی کے صوبے "نوشہر" میں واقع تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے شہر تھے۔ جیسے عرگپ، گوریمے وغیرہ۔ جہاں گھر، عبادت گاہیں، ہوٹل، سب غاروں کی صورت بنے تھے۔ عرگپ سے گھنٹہ بھر کی ڈرائیو پہ قیصری کا ایئرپورٹ "قیصری ہوالانی" تھا جہاں ان کا جہاز اس صبح اترا تھا۔

"ہم کہاں رہیں گے حیا؟" بہارے اس کا ہاتھ پکڑے ایئرپورٹ کے لاؤنج میں اس کے ہمراہ چلتی بار بار پوچھ رہی تھی۔

"کسی ہوٹل میں رہیں گے نا، پہلے کچھ کھا لیتے ہیں۔"

"اور اگر عبدالرحمٰن نے فون ہی بند رکھا ہوا ہو؟"

اس نقطے پہ پہنچ کر اس کا اپنا دل ڈوب کر ابھرا۔ یہ وہ آخری بات تھی جو وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

"اس کے سارے نمبر بند ہیں۔ مگر اس نے کوئی دوسرا نمبر آن کر رکھا ہو گا اور یقیناً جی پی ایس ریسیور بھی آن ہو گا۔ وہ ضرور کال کرے گا۔" اس نے بہارے سے زیادہ خود کو تسلی دی۔ ابا اور پھپھو کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ اپنی دوست کے ساتھ کپادوکیہ جا رہی ہے۔ اگر اس نے پھپھو سے رابطہ کیا تو جان لے گا ورنہ..... ورنہ نہیں۔

وہ دونوں ایئرپورٹ کے کیفے ٹیریا میں آئیں اور ایک میز کے قریب اپنا سامان رکھ کر کرسیاں کھینچیں۔ آس پاس کم ہی لوگ تھے۔ کاؤنٹر ساتھ ہی تھا اور..... استقبالیہ پر موجود لڑکے کے ساتھ دو، تین نوجوان لڑکے کھڑے ہنستے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ترکی میں لڑکیوں کا تنہا سفر کرنا بہت عام سی بات تھی مگر لڑکے تو لڑکے ہوتے ہیں۔ چند ہی لمحے گزرے کہ وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مسکراتے ہوئے، مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے۔ اگر اسے جہان کو نہ ڈھونڈنا ہوتا تو وہ کبھی ادھر نہ آتی۔ جب بار بار ان کا گردن موڑنا برداشت نہیں ہوا اور بہارے بھی ناگواری سے ناک سکوڑنے لگی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ آرڈر نہیں کریں گی؟'' کاؤنٹر والے لڑکے نے پہلے ترک اور پھر بہارے کے ''انگلش پلیز'' کہنے پہ انگریزی میں یہی بات دہرائی تا کہ حیا سمجھ سکے۔

''نہیں، ہمیں جانا ہے۔'' وہ کوفت سے کہتی اپنا سامان اٹھانے لگی۔ پتا نہیں اب آگے کیا کرنا تھا۔ ہالے کو بتایا نہیں تھا۔ سو ہوٹلز کے بارے میں نہیں پوچھ سکی تھی۔

''آپ کو ہوٹل چاہیے تو میں مدد کر سکتا ہوں۔'' ایک لڑکے نے دانت نکالتے ہوئے پیش کش کی۔

''شکریہ..... میرے پاس ہوٹل ہے۔'' وہ رکھائی سے کہہ کر بہارے کا ہاتھ پکڑے پلٹنے ہی لگی تھی کہ وہ پھر بولا۔

''کون سا ہوٹل؟'' جتنی تیزی سے اس نے پوچھا تھا، اس سے زیادہ تیزی سے حیا کے لبوں سے نکلا۔ ''یہ اوپر والا۔'' اس نے بے ساختہ جان چھڑانے کے لیے کاؤنٹر پہ رکھے گائیڈ بک لیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں پہلے صفحے پہ تین ہوٹلز کی تصاویر اور معلومات درج تھیں۔ اتنے فاصلے سے اسے ہوٹل کا نام تو پڑھا ہی نہیں گیا مگر وہ سب غیر ارادی طور پہ ہوا تھا۔

چاروں لڑکوں نے بے اختیار گائیڈ بک کے صفحے کو دیکھا۔ اوپر والے ہوٹل کی تصویر پہ نگاہ ڈالی اور پھر بے ساختہ کاؤنٹر والے کے وائٹ اندر ہوئے، ٹیک لگا کر کھڑا لڑکا سیدھا ہوا۔ دوسرے نے فوراً جیسے شانوں سے قمیص کی نادیدہ سلوٹیں ٹھیک کیں۔

''آپ..... آپ مولوت بے کی مہمان ہیں؟ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ پلیز بیٹھیں۔'' کاؤنٹر والا گڑبڑا کر وضاحت کرتا تیزی سے باہر آیا تھا۔ حیا نے رک کر ان کو دیکھا۔ باقی تینوں لڑکے سلام جھاڑ کر فوراً ادھر سے رفوچکر ہو گئے تھے۔

''میں نے مولوت بے کو ابھی آدھا گھنٹہ پہلے بازار میں دیکھا تھا۔ وہ ادھر ہی ہیں، میں انہیں فون کرتا ہوں۔'' وہ جلدی سے اپنا موبائل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ حیا اور بہارے نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر حیا نے کرسی دوبارہ کھینچ لی۔

''مولوت بے آ رہے ہیں آپ کو لینے۔'' فون بند کر کے وہ مستعدی سے مینیو کارڈ لے آیا۔ ''آپ آرڈر کر دیں، میں لے آتا ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد بے چین بیٹھی بہارے گل نے اس کا ہاتھ ہلایا۔

''حیا! یہ مولوت بے کون ہیں اور ہم ان کے ساتھ کیوں جا رہے ہیں؟''

''مجھے نہیں پتا۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔''

''ہم ایسے ہی ان کے ساتھ نہیں چلے جائیں گے۔ عائشے گل کہتی ہے اچھی لڑکیاں ہر جگہ.....''

''تم دو منٹ کے لیے عائشے گل کے لیکچر بھول نہیں سکتیں؟ اب ہمیں کہیں تو رہنا ہے نا۔ اگر نہیں اچھے لگے یہ مولوت بے تو نہیں جائیں گے ان کے ساتھ۔''

بہارے نے خفگی سے منہ میں کچھ بڑبڑا کر رخ پھیر لیا۔

وہ خود بھی ذرا مضطرب تھی۔ پتا نہیں کون تھے وہ صاحب اور کیوں ان کو لینے آ رہے تھے۔ ایسے تو وہ نہیں جائے گی ان کے ساتھ۔ کوئی مرضی کے بغیر تو نہیں لے کر جا سکتا نا۔

''مولوت بے آ گئے۔'' بمشکل پندرہ، بیس منٹ گزرے تھے کہ کاؤنٹر والے لڑکے نے صدا لگائی تو بے اختیار ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

سامنے سے ایک ادھیڑ عمر، گورے سے ترک صاحب چلے آ رہے تھے۔ دراز قد، بے حد اسمارٹ، سر کے بال ماتھے سے ذرا کم، چہرے پہ نرم سی مسکراہٹ، نفیس سے پینٹ شرٹ میں ملبوس۔ مگر وہ شہانہ تھے۔ ایک قدرے پستہ قد آنٹی ان کے ایک طرف تھیں۔ دوسری جانب ایک لمبا، پتلا سا لڑکا، انیس بیس برس کا اور اس کے ساتھ اسی عمر کی لڑکی جس کے بال کندھوں سے کافی نیچے تک آتے، سیاہ اور لہر دار تھے۔ اس نے کیپری کے اوپر ڈھیلی شرٹ پہن رکھی تھی اور ایک موٹی، سفید گھنے بالوں والی ایرانی بلی بازوؤں میں اٹھائے ہوئے تھی۔ لڑکی نے دور سے انہیں ہاتھ ہلایا۔

''کیا یہ تمہاری رشتے دار ہے؟'' بہارے نے اچنبھے سے اسے مخاطب کیا۔

''نہیں...... میں تو اس فیملی کو جانتی بھی نہیں۔'' وہ متذبذب سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''مرحبا...... ہمیں دیر تو نہیں ہوئی؟ اگر پہلے پتا ہوتا تو آپ کو اتنا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ رئیلی سوری۔'' مولوت بے استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ معذرت کر رہے تھے۔ ان کی مسز خوش دلی سے سلام کرتی، ملنے کے لیے آگے ہوئیں۔ ترکوں کے مخصوص انداز میں باری باری دونوں گال ملا کر چوما اور الگ ہو گئیں۔ وہ قد میں حیا سے کافی چھوٹی تھیں۔

''تم پہلے کال کر دیتیں تو ہم جلدی آ جاتے اور کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟'' اس سے الگ ہو کر وہ بہت افسوس سے کہنے لگیں۔ ''میں سونا ہوں، یہ میری بیٹی پنار ہے اور یہ فاتح ہمارے ساتھ کام کرتا ہے۔ میرا بیٹا گوخان آج کل انقرہ گیا ہوا ہے۔ ورنہ اس سے بھی ملاقات ہو جاتی۔''

''میں حیا ہوں۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مزید کیا کہے۔

''میں پنار اور یہ ہماری گارفیلڈ!'' پنار نے بلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزے سے بتایا۔ ''یہ پورے ''آشیانہ'' کی لاڈلی ہے۔ آج کل ذرا بیمار ہے۔ اسے علاج کے لیے لائے تھے ادھر اور اس چھوٹی بلی کا نام کیا ہے؟''

بات کے اختتام پہ پنار نے جھک کر بہارے کا گال چھوا اور چھوٹی بلی کا پہلے تو تحیر سے منہ کھل گیا، پھر بے اختیار شرمائی، یوں کہ رخسار گلابی پڑ گئے اور پلکیں جھکا کر، بہت باریک، نازک سی آواز میں بولی۔

''اناطولیہ کی بہارے گل۔'' حیا نے پوری آنکھیں کھول کر اس چھوٹی اداکارہ کو دیکھا۔ جس کی یہ آواز تو خود اس نے بھی نہیں سن رکھی تھی۔

''آپ استنبول سے آئے ہیں؟'' مولوت بے پوچھ رہے تھے۔

''میں پاکستان سے ہوں اور یہ ترکی میں میری رشتے دار ہیں۔'' ان سب کے والہانہ اور خوش خلق انداز کے آگے اس کا تھینکس کہنے کا ارادہ کمزور پڑنے لگا۔

''باقی باتیں گھر چل کر کر لیں گے۔ فاتح! آپا کا سامان اٹھاؤ۔ دیکھو وہ کتنی تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ آؤ بیٹا، کار باہر ہے۔'' مسز سونا اپنے مہمانوں کو مزید تھکانا نہیں چاہتی تھیں۔ فاتح سامان لینے کے لیے آگے بڑھا تو حیا نے بے اختیار بہارے کو دیکھا۔

''چلو جلدی کرو حیا!'' تازہ تازہ تعریف سے گلنار ہوئی بہارے نے اٹھا کر اس کی آستین کھینچی۔ حیا نے گہری سانس لے کر بیگ فاتح کو تھما دیا۔ کہیں تو رہنا ہی تھا اور فیملی رن ہوٹلز سے زیادہ اچھا ہوٹل کوئی نہیں ہوا کرتا۔

وہ دونوں ان کے ساتھ چلتی باہر آئیں، جہاں ایک چھوٹی سی وین کھڑی تھی۔ اسے بے اختیار اپنا اور ڈی جے کا ترکی میں پہلا دن یاد آیا۔ جب احمت اور چغتائی ایسی ہی وین میں انہیں لینے آئے تھے۔

مولوت بے کا ہوٹل عرگپ میں تھا۔ قریباً گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ کھڑکی کے اس پار کپادوکیہ کا خشک علاقہ نظر آ رہا تھا۔ پراسرار خاموش، دنیا سے الگ تھلگ، غاروں سے بنی خوبصورت گھوڑوں کی سرزمین۔ دور کہیں کوہ حسن کے دونوں پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ جو اپنے اندر کا سارا لاوا صدیوں قبل زمین پہ انڈیل کر اب سکون سے کھڑے تھے۔

''ڈی جے کو بہت حسرت تھی کپادوکیہ دیکھنے کی۔'' کھڑکی کے باہر بھاگتے مناظر دیکھ کر بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر فوراً چپ ہو گئی۔

''ڈی جے کون؟'' پنار جو بلی کو تھپک رہی تھی، بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

''میری...... ایک دوست تھی۔'' اس کے جواب میں بہارے نے آہستہ سے اضافہ کیا۔ ''مر گئی ہے۔''

''اوہ!'' پنار نے تاسف سے اسے دیکھا۔

''جب تمہاری بلی مر جائے گی تو وہ ڈی جے کے پاس چلی جائے گی۔'' چند لمحے بعد بہارے نے بہت سمجھداری سے پنار کی معلومات میں مزید اضافہ کرنا چاہا۔

''بہارے گل! بہت ہو گیا۔'' اس نے ہڑبڑا کر اسے ٹوکا۔ پھر معذرت کرنی چاہی۔ ''سوری! یہ بس ایسے ہی بولتی رہتی ہے۔''

مگر پنار اور مسز سونا ہنس پڑی تھیں۔

''یہ چھوٹی بلی کتنی پیاری ہے نا۔'' پنار نے جھک کر اس کا گال چوما۔ ''آج سے گارفیلڈ بڑی بلی اور تم چھوٹی بلی۔''

بہارے نے شرما کر لب دانت سے دبائے۔ اثبات میں سر ہلایا پھر "دیکھا تم نے" والی فاتحانہ نظروں سے حیا کو دیکھا۔ حیا نے گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔ یہ لڑکی بہت پڑے گی اس کے ہاتھوں۔

"آشیانہ گیو ہاؤس" ایک چھوٹا سا دو منزلہ ہوٹل تھا۔ ننھی سی پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ سامنے سے جیسے کوئی بنگلہ سا لگتا تھا۔ ایک طرف باہر سے جاتی سیڑھیاں، اوپر ٹیرس، سامنے صحن تھا۔ ٹیرس اور گراؤنڈ فلور دونوں کے برآمدے محرابی تھے۔ اندر آدھے کمرے پہاڑ کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ وہ کوئی بہت اونچی پہاڑی نہیں تھی۔ ہوٹل کی چھت سے بھی ذرا کم تھی۔ ہوٹل کی پشت اس پہاڑی میں گویا دھنسی ہوئی تھی۔ چھوٹا سا خوب صورت سا آشیانہ۔

مولوت بلنگچ کا کپادوکیہ میں ایک خاص مقام تھا۔ وہ اس علاقے کے ڈسٹرکٹ چیف تھے۔ لوگ ان سے ڈرتے بھی تھے اور ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ ان کے مہمانوں کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کر سکتا تھا اور آج ہوٹل کے ساتوں کمرے خالی تھے۔ وہ اور بہارے ہی آشیانہ کی مہمان تھیں۔

"یہ ہے تمہارا کمرا، مجھے لگا، تمہیں یہ پسند آئے گا۔ اگر بدلنا ہو تو بتا دو۔" متحرک سی مسز سونا ان کو اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے آئیں۔ وہ خاکی، سرمئی سنگ مرمر سے بنا کمرا بہت خوب صورت تھا۔ کونوں میں زرد بلب لگے تھے۔ سارے جلا دو، تب بھی کمرے میں غار کا نیم مدھم سا اندھیرا برقرار رہتا۔ سرخ سے قالین کا ٹکڑا فرش پہ بچھا تھا۔ اسی سرخ رنگ کا ایک بڑا صوفہ کھڑکی کے آگے رکھا تھا۔ ڈبل بیڈ پہ بھی گہرے سرخ، میرون رنگ کی چادر بچھی تھی۔ بیڈ کی عقبی دیوار پہ ایک جالی دار گلابی پردہ لگا تھا، جو آگے کو ہو کر بیڈ کی پائنتی تک گرتا اور بیڈ پہ سونے والے کو جیسے ڈھک لیتا۔

باہر ٹیرس پہ گول گول میزیں تھیں۔ جن کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ وہاں بیٹھ کر دیکھو تو کھلا آسمان اور سارا کپادوکیہ دکھائی دیتا تھا۔ اتنی خوب صورت جگہ پہ بھی نامعلوم سی اداسی چھائی تھی۔ جہان کے بغیر اسے سب کچھ اداس لگ رہا تھا۔ اگر اس نے واقعی ریسیور آف کر دیا ہو تو......؟

"مجھے یہ کمرا پسند ہے اور میری چھوٹی بلی کو بھی۔" بظاہر بشاشت سے مسکراتے اس نے مسز سونا کو اطمینان دلایا۔

آشیانہ شہر سے ذرا الگ تھلگ تھا۔ سو مولوت بے نے کہہ دیا تھا کہ وہ جہاں جانا چاہیں، وہ انہیں ڈراپ کر دیں گے۔ وہ خالصتاً مہمان نواز ترک خاندان تھا۔ وگرنہ ہوٹل کا مالک جو شہر کا ڈسٹرکٹ چیف بھی ہو، کہاں اپنے مہمانوں کو ڈرائیو کر کے لے جایا کرتا ہے۔ مولوت بے کو پورا کپادوکیہ جانتا تھا۔ ان کے مہمانوں کو کسی بھی قسم کے ٹور پیکج پہ خصوصی ڈسکاؤنٹ مل جاتا تھا۔ ان کا نام "مولوت" اردو لفظ "نو مولود" کا "مولود" ہی تھا۔ ہمارے وہ نام جو "د" پہ ختم ہوتے ہیں۔ ترک انہیں "ت" پہ ختم کرتے تھے۔ وہ احمد کو "احمت" بلند کو بلنت اور مولود کو مولوت پکارتے تھے۔ ایسے ہی ہمارے وہ نام جن کے آخر میں "ب" آتا ہے۔ ترک ان کے آخر میں "پ" لگایا کرتے تھے۔ یوں طیب سے بنا طیپ، ایوب سے ایوپ اور زینب سے زینپ۔

وہ سارا دن کمرے میں ہی رہیں۔ پھر شام کو مسز سونا اور فاتح شہر جا رہے تھے۔ تو ان کے ساتھ چلی گئیں۔ حیا کی ٹریسر والی ڈبی پرس میں ساتھ ہی تھی۔ اگر وہ ادھر ہوا تو جان لے گا کہ وہ اس کے قریب ہے۔ پتا نہیں، دل کے رشتے زیادہ مضبوط تھے یا جی پی ایس کے۔ مگر جب رات اتر آئی اور فون نہیں بجا تو وہ امید کھونے لگی۔

اگلا پورا دن بھی انہوں نے کمرے میں گزارا۔ کھانا بھی وہیں منگوایا۔ مسز سونا کے ہاتھ کے بنے سلاد، جیلی، جام، بالکل گھر جیسا ذائقہ۔ پھر بھی وہ بہت بے زاری محسوس کر رہی تھی۔ بہارے باہر جانا چاہتی تھی۔ مگر اس نے منع کر دیا۔

"کیا عبدالرحمٰن کال نہیں کرے گا؟" اس نے صبح سے کوئی دسویں دفعہ پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا۔ فضول باتیں مت کرو۔" بہارے کی آنکھوں میں ناراضی در آئی۔

"تم نے اگر دوبارہ مجھ سے ایسے بات کی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"میں نے کہا نا فضول باتیں مت کرو!" سختی سے جھڑک کر وہ ڈریسنگ روم کی طرف جانے کے لیے اٹھی۔ بہارے ناک سکوڑ کر منہ میں کچھ بڑبڑائی۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ جاتے جاتے جیسے تپ کر پلٹی۔

"نہیں بتاؤں گی۔" بہارے اتنے ہی غصے سے کہتی ٹیرس کی طرف چلی گئی۔
رات میں مسز سونا انہیں بلانے آ گئیں۔
"تم لوگ صبح سے کمرے سے نہیں نکلے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" حسب توقع وہ فکرمند ہوگئی تھیں۔ ٹورسٹ سیر کے لیے نہ جائے، عجیب سی بات تھی۔
"نہیں! اصل میں ایک دوست نے استنبول سے آنا تھا، اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ آ جائے تو مل کر آپ کا کپادوکیہ گھومیں گے۔" اس نے جلدی سے وضاحت دی۔ پھر ان کے اصرار پہ وہ دونوں ڈنر کے لیے نیچے چلی آئیں۔
نچلی منزل کا ڈائننگ ہال پتھر کی دیواروں سے بنا مدھم سا روشن کمرا تھا۔ دو چار میزیں، کرسیاں رکھی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ فرشی نشست کی طرز کے زمین سے دو بالشت اونچے پتھر کے صوفے بنے تھے۔ جن پہ میرون ترک قالین بچھے تھے۔ اس نے بھی اسی میرون شیڈ کا اجرک کا کرتا اور سیاہ ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اوپر سیاہ حجاب۔
اسے حجاب سے کھاتا دیکھ کر ٹرے اٹھائے ہال میں داخل ہوئی پنار ٹھٹک کر رکی، پھر سامنے کاؤنٹر پہ کھڑے فاتح کو پکارا۔
"فاتح! تم کچن دیکھ لو۔ وہ کمفرٹیبل نہیں ہیں۔" اس نے انگریزی اور ترک دونوں میں کہا، کیونکہ فاتح کی انگریزی کمزور تھی۔ فاتح "جی آپا" کہہ کر تابعداری سے وہاں سے ہٹ گیا۔
"تھینکس!" حیا ہلکے سے مسکرائی۔ دل پہ اتنی کلفت چھائی تھی کہ مسکرانا بھی دشوار لگتا تھا۔
کھانے کے بعد وہ دونوں آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتی اوپر واپس آ گئیں۔ اس کا پاؤں درد کر رہا تھا، سو وہ آتے ہی بستر پہ لیٹ گئی اور پیچھے دیوار سے لٹکتا جالی دار گلابی پردہ اپنی پائنتی تک پھیلا دیا۔ اب چت لیٹے، اسے چھت گلابی جالی کے پار دکھائی دے رہی تھی۔
"حیا! کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟" ساتھ لیٹی بہارے تھوڑی دیر بعد قریب کھسک آئی۔ حیا نے گردن ذرا سی ترچھی کر کے اسے دیکھا۔
"کیوں پوچھ رہی ہو؟"
"کیونکہ عائشے گل کہتی ہے، کسی کو ناراض کر کے نہیں سوتے۔ کیا پتا صبح ہم جاگ ہی نہ سکیں۔"
"نہیں! میں ناراض نہیں ہوں۔" وہ گردن سیدھی کر کے دوبارہ غار کی چھت کو تکنے لگی۔ "میں بس پریشان ہوں۔"
"تم پریشانی میں یوں ہی غصہ کرتی ہو؟"
"ہاں! اور تم کیا کرتی ہو؟"
"میں؟" بہارے ایک دم جوش سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "میں آسمان میں اڑتی ہوں۔ ادالار کے بگلوں اور سلطان احمت مسجد کے کبوتروں کے ساتھ۔ کیا تمہیں یہ کرنا آتا ہے؟"
حیا نے چند لمحے اس کے معصوم، شفاف چہرے کو دیکھنے کے بعد نفی میں سر ہلایا۔ بچپن بھی کتنا پیارا ہوتا ہے۔ کندھے اور دل بہت سارے بوجھ سے خالی ہوتے ہیں۔
"میں تمہیں سکھاتی ہوں۔ آنکھیں بند کرو۔"
حیا نے آنکھیں بند کیں۔ وہی ایک شخص ہر جگہ نظر آنے لگا تھا۔ تکلیف کا احساس جیسے سوا ہو گیا۔
"اب تم آہستہ آہستہ ہوا میں اڑ رہی ہو...... اوپر، بہت اوپر دیکھو! تم اڑ رہی ہو۔" ساتھ ہی وہ دبے قدموں بستر سے اتری۔ حیا نے پلکوں کی جھری سے دیکھا۔ وہ احتیاط سے بلی کی چال چلتی سوئچ بورڈ تک گئی اور پنکھا فل چلا دیا۔ پھر وہ اسی طرح واپس آ گئی۔
"دیکھو! اب تم اوپر ہوا میں اڑ رہی ہو۔ دیکھو! ہوا چل رہی ہے۔ آنکھیں مت کھولنا، ورنہ نیچے گر جاؤ گی۔"
"ہوں!" اس نے بند آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔ اگر زندگی کا وہ فیز کوئی خواب تھا تو واقعی وہ نیچے گرنے کے خوف سے آنکھیں کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر حقیقت تو ہمیشہ نیچے گرا دیا کرتی ہے۔ اس نے ایک دم سے آنکھیں کھول دیں۔
"ہا! یہ کیا کیا؟ دیکھا! نیچے گر گئیں۔" بہارے نے بوکھلا کر احتجاج کیا، پھر پھرتی سے اٹھ کر پنکھا بند کیا۔ ہوا سے گلابی پردہ پھڑ پھڑانے لگا تھا۔
"اللہ تمہیں سمجھے۔" وہ خفگی سے کہتی واپس آ کر لیٹ گئی۔

"کیا تم نے نماز پڑھی؟" وہ نماز کے لیے اٹھنے لگی تو بہارے سے پوچھا۔ بہارے نے جھٹ خود پہ بیڈ کور تان لیا۔

"ہاں! میں ابھی پڑھتی ہوں۔ اوہ! میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ کھل ہی نہیں رہیں۔ اوہ....." اور پھر وہ لمحے بھر میں جیسے ہوش و خرد سے بے گانہ سو چکی تھی۔ حیا سر جھٹک کر رہ گئی۔ پھر وضو کرنے اٹھی تو فون بجنے لگا۔ روحیل کالنگ اس نے کال موصول کی۔

"کب آ رہی ہو تم واپس؟"

"یہ مت کہنا کہ تم مجھے مس کر رہے ہو۔" وہ کھڑکی کے آگے رکھے صوفے پہ بیٹھی مسکرا کر فون کان سے لگائے کہہ رہی تھی۔

"وہ تو خیر نہیں کر رہا، مگر ابا چاہتے ہیں کہ میری شادی اناؤنس کریں۔ ایک ولیمہ ریسیپشن دے کر..... لیکن جب تم اور جہان آؤ گے، تب ہی فنکشن ہو پائے گا۔"

"ہوں! گڈ فار یو۔ بس کچھ دن تک آ جاؤں گی۔" اس نے بہت سے آنسو اندر اتارے۔ کتنے دعوے سے کہہ کر آئی تھی کہ جہان اور وہ ساتھ واپس آئیں گے، مگر وہ تو کہیں بھی نہیں تھا۔

فون بند کر کے اس نے وضو کیا۔ پھر وہیں جائے نماز ڈال کر نماز پڑھی۔ سلام پھیر کر وہ دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو یوں ہی دیکھنے لگی۔

دعا..... کتنا عرصہ ہوا، جب اس نے دعا مانگنی چھوڑ دی تھی۔ جیسے ڈی جے کے لیے مانگی، ویسے پھر کبھی نہ مانگ سکی۔ کچھ تھا جو ڈی جے کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ پھر معافی مانگی، استقامت مانگی، مگر دنیا مانگنا چھوڑ دی۔ لوگ، رشتے، ناتے، یہ سب دنیا ہی تو ہے..... اور یہی سب کو چاہیے ہوتا ہے۔ اسے بھی چاہیے تھا۔ پھر لبوں پہ آ کر ساری دعائیں دم کیوں توڑ جاتی تھیں؟ ایسا کیوں لگتا تھا کہ معافی ابھی تک نہیں ملی؟

وہ گم صم سی اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھنے لگی۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بھی کتنا مبہم سا تھا۔ یہ خواہش تھی کہ میں اسے اچھی لگوں، میں اس کی مانوں، مگر مجھے اس پہ کتنا بھروسا ہے۔ کتنا اعتبار ہے، یہاں آ کر زندگی جیسے خالی جگہ کا سوال بن جاتی تھی۔ پورے فقرے کے درمیان ایک خالی جگہ تھی۔ ادھر کون سا لفظ لکھنا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر وہ لکھنا بھول جاتی تھی۔

کوئی دعا مانگے بنا وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور میز پر رکھے موبائل کی اسکرین کو انگلی سے چھوا۔ وال پیپر جگمگا رہا تھا۔ کتنا زہر لگتا ہے یہ وال پیپر بالخصوص تب، جب کسی خاص ٹیکسٹ کی توقع ہو۔ پھر جائے نماز رکھی۔ دوپٹا اتار کر بالوں کو انگلیوں سے سنوارا اور ڈریسنگ روم کا پردہ ہٹا کر ادھر آ گئی۔ ہیئر برش ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا تھا۔ وہی رات سونے سے قبل سو دفعہ برش کرنے کی عادت۔ اپنے بالوں، جلد اور خوبصورتی کی حفاظت پہ اسے کوئی سمجھوتا نہ تھا۔

برش کے ساتھ نقلی پھولوں کا گلدان رکھا تھا، جس کے اندر شیشے کی ایک ڈبی تھی جو سنہری افشاں سے بھری تھی۔ اس نے یوں ہی وہ ڈبی نکالی اور کھولی۔ سنہری چم چم چمکتی افشاں۔ اس کی پشت سے آتی بلب کی روشنی میں وہ مزید چمک رہی تھی۔

پھر ایک دم سے دمکتی افشاں پہ چھایا سی بن گئی۔ جیسے اس کے اور بلب کے درمیان کوئی آڑ آ گئی تھی۔ کسی خیال کے تحت اس نے سر اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔

اس کے عکس کے پیچھے کوئی کھڑا تھا۔

افشاں کی ڈبی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ایک زوردار، شاکڈ سی چیخ حلق سے نکلنے ہی لگی تھی کہ پیچھے کھڑے شخص نے سختی سے اپنا ہاتھ اس کے لبوں پہ جما دیا۔

"ششش..... چیخنا نہیں..... آواز باہر جائے گی اور پھر یہ ساری فیملی بھاگتی ہوئی آ جائے گی۔" وہ چہرہ اس کے قریب کیے دھیمی سرگوشی میں بولا تھا۔

حیا کی آواز ہی نہیں، سانس بھی جیسے رک گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی، بے یقین نگاہوں سے دم سادھے آئینے کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے لگے اس کے اعصاب کو ڈھیلا پڑنے میں اور پھر اس نے ایک نڈھال سے احساس کے تحت آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

جہان نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹایا۔

سنہری افشاں اس کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی قدموں میں جا گری تھی۔ اس کی انگلیاں، فرش، پیر کا انگوٹھا، ہر جگہ سونے کے ذرات چپکے تھے۔ ایک لمحے کو اس نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے جھاڑ کر افشاں اتارنی چاہی، مگر وہ پورے ہاتھ پہ پھیلتی گئی تو..... وہ دھیرے سے اس کی جانب پلٹی۔ وہ ابھی تک شاکڈ اور شل تھی۔

"تم..... تم ادھر کیا کر رہے ہو؟" خالی خالی نگاہوں سے جہان کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ بدقت کہہ پائی۔

"یہی سوال میں تم سے پوچھنے آیا ہوں۔ "تم" ادھر کیا کر رہی ہو؟" وہ جیسے ڈھیروں غصہ ضبط کر کے سختی سے بولا۔

"تم اندر کیسے آئے؟" حیا کا دماغ ابھی تک سن تھا۔ وہ جواب دیے بنا آگے بڑھا اور ڈریسنگ روم کا پردہ برابر کر دیا۔ بیڈ روم کا منظر چھپ گیا۔ پھر وہ حیا کے مقابل دیوار سے ذرا ٹیک لگا کر جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے منتظر سا کھڑا تھا۔ وہ جیسے علیحدہ جگہ تفصیل سے بات کرنا چاہتا تھا۔

اس کے حواس دھیرے دھیرے بحال ہونے لگے۔ وہ اپنے سنہری ذرات والے ہاتھ اضطرابی انداز میں ایک دوسرے سے ملتی، ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے پہ جا ٹکی، پھر کھلے بال کانوں کے پیچھے اڑسے۔ سنہری ذرات سیاہ بالوں پہ بھی ٹھہر گئے، مگر اسے پتا نہیں چلا۔

"اگر مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ تم میرے پیچھے ادھر آ جاؤ گی تو میں تمہیں کبھی نہ بتاتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔"

"تمہارے پیچھے؟" اس نے جیسے تلملا کر سر اٹھایا۔ بس ایک پل لگا تھا۔ اسے اپنے ازلی انداز میں واپس آنے میں۔ "تم نے مجھے کب بتایا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ تم بھول گئے ہو شاید تم تو بغیر کچھ کہے سنے ہی آ گئے تھے۔"

"اچھا تمہیں نہیں پتا تھا کہ میں کپادوکیہ میں ہوں؟" وہ اسی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟ تمہیں لگتا ہے، میں تمہارے لیے اتنا ٹریول کر کے آؤں گی؟" اس نے جیسے افسوس بھری حیرت سے سر جھٹکا۔ "میں تو خود تمہیں ادھر دیکھ کر حیران ہوں..... اور تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟ بلکہ ایک منٹ۔" وہ جیسے رکی۔ "ڈی جے اور مجھے کپادوکیہ آنا تھا اسپرنگ بریک میں۔ اوہ! تم یہ بات جانتے تھے۔ شاید "تم" میرے پیچھے آئے ہو۔ کیا ایسا ہی ہے؟" اس نے لاء نیچرز سے سن رکھا تھا کہ جب اپنا دفاع کمزور ہو تو مخالف پہ چڑھائی کر دینی چاہیے۔ وہ اپنے دفاع کے چکر میں پڑ کر پسپائی اختیار کر لیتے ہیں۔

"نہیں! میں اتنا فارغ نہیں ہوں کہ تمہارے لیے ادھر آؤں گا۔"

"میں بھی اتنی فارغ نہیں ہوں۔ حد ہے۔" جہان نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔ اس کے بال ویسے ہی ماتھے پہ ذرا بکھرے سے تھے۔ شیو ہلکی سی بڑھی ہوئی تھی۔ اور سفید رف سی پوری آستین کی ٹی شرٹ کہنیوں سے موڑا ہوا تھا۔

"اور اس کو کیوں لائی ہو؟" اس نے ابرو سے پردے کی جانب اشارہ کیا، جس کے پار بیڈ روم تھا۔ حیا نے بظاہر لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"اس کے پاسپورٹ کا مسئلہ تھا کوئی۔ وہ بے کار ادھر رہ رہی تھی، پھر ابا نے کہا تھا میں اکیلی نہ جاؤں اور میں نے سوچا کہ....."

"کہ باڈی گارڈ ساتھ لے جاؤں۔ ہے نا؟"

"کیا ہے جہان! میں کپادوکیہ گھوم پھر بھی نہیں سکتی اپنی دوستوں کے ساتھ؟" وہ تنگ کر کہتی، اپنی انگلی میں پلاٹینم بینڈ گھمانے لگی۔ سنہری افشاں سے انگوٹھی بھر چکی تھی۔ جہان تھوڑی دیر بغور جانچتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"ٹھیک ہے! میں نے مان لیا کہ تم میرے لیے نہیں آئیں اور تمہیں بالکل علم نہیں تھا کہ میں ادھر ہوں۔ بہرحال! کل صبح قیصری سے ایک فلائٹ اتاترک ایئرپورٹ کے لیے نکل رہی ہے..... اور ایک صبیحہ گورچن کے لیے۔ تم کون سی لوگی؟" بہت سنجیدگی سے اس نے استنبول کے دونوں ایئرپورٹس کے نام لیے۔

"کیا مطلب؟ میں واپس نہیں جا رہی۔ میں نے تو ابھی کپادوکیہ دیکھا بھی نہیں۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں رہو۔ تم ادھر یوں اکیلے کیسے رہ سکتی ہو بھلا؟"

"یہ میرا مسئلہ ہے..... اور میں اکیلی نہیں ہوں۔ ہم دو ہیں۔ تم میری فکر مت کرو۔ وہ کرو، جس کے لیے تم ادھر آئے ہو..... اور ویسے مجھے ڈھونڈنے کے علاوہ تم یہاں کس مقصد کے تحت آئے ہو؟"

"مجھے بہت سے کام ہیں زمانے میں....." کہتے کہتے وہ ایک دم رکا۔ حیا کا دل زور سے دھڑکا۔ جہان نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی، پھر نفی میں سر ہلایا۔

"میں زیادہ دیر ادھر نہیں رک سکتا۔ تم کل واپس جا رہی ہو حیا!"

"میں نہیں جا رہی۔ تمہیں کیا پرابلم ہے میرے ادھر رہنے سے؟" اسی پل کمرے میں رکھے اس کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔ وہ بات

روک کر ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے سے اٹھی اور پردہ ہٹا کر میز تک گئی۔ جہان نے گردن موڑ کر اس کے قدموں کو دیکھا۔

"پاؤں کو کیا ہوا ہے؟"

میز سے موبائل اٹھاتے ہوئے اس کا دل لمحے بھر کو تھما۔ اللہ اللہ، اس آدمی کی نظریں؟ اس سے کوئی بات مخفی کیوں نہیں رہتی؟ اس نے تو پاؤں پہ پٹی بھی نہیں باندھی تھی۔ چل بھی بالکل ٹھیک رہی تھی، پھر بھی اف!

"میرے پاؤں کو؟" موبائل لے کر واپس مڑتے اس نے حیرت سے گردن جھکا کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔

"اوہ! یہ افشاں گر گئی تھی۔ وہی لگ گئی ہے۔" ساتھ ہی اس نے انگوٹھا قالین سے رگڑا۔ سرخ قالین کا وہ حصہ فوراً چم چم کرنے لگا، مگر پاؤں سے افشاں نہیں اتری۔

"ٹخنے، ایڑی کو کچھ ہوا ہے۔ موچ آئی ہے یا پاؤں مڑ گیا؟" وہ گردن ترچھی کر کے اس کے پاؤں کو دیکھتا کہہ رہا تھا۔

"نہیں! میرا پاؤں تو بالکل ٹھیک ہے۔ مگر وہ...... اب میں سمجھی۔" موبائل پہ ہالے کا فارورڈ میسج چیک کر کے وہ سر ہلاتی اس کی طرف آئی۔ "تم مجھے واپس بھیجنے کے لیے بہانہ ڈھونڈ رہے ہو۔"

جہان نے نظر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ ایک تو جب بھی وہ یوں دیکھتا، لگتا تھا اندر تک دل کا سارا حال جان لے گا۔

"ٹھیک ہے! تم ادھر میری وجہ سے نہیں آئیں اور تمہارے پاؤں کو بھی کچھ نہیں ہوا۔ مجھے ابھی جانا ہے۔ ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔"

"پھر کب ملو گے؟" وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔ جہان نے رک کر اسے اسی طرح دیکھا۔

"جب تم میرے لیے آئی ہی نہیں ہو تو پھر دوبارہ ملنا؟"

"ابھی خود ہی تو تم نے کہا کہ بعد میں بات کریں گے ورنہ مجھے کیا۔" اس نے خفگی سے شانے اچکائے۔ جہان نے ذرا مسکرا کر سر جھٹکا۔

"کل دوپہر ایک بجے شارپ...... مجھے کنویں پہ ملنا۔"

"کون سا کنواں؟"

"مادام! آپ میرے لیے نہیں، کپادوکیہ کی سیاحت کے لیے آئی ہیں تو آپ کو یہاں کی تمام ٹورسٹ اٹریکشن کا علم تو ہوگا۔ کل ہم کنویں پہ ملیں گے...... اور دھیان رکھنا، کنواں کافی گہرا ہے۔ تمہیں کلاسٹروفوبیا تو نہیں ہے؟" وہ جیسے یاد آنے پہ جاتے جاتے پلٹا۔ حیا نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اوکے۔" اس نے دروازہ کھولا۔ احتیاط سے اطراف میں جھانکا، پھر باہر نکل گیا۔ بہارے اسی طرح سو رہی تھی۔ حیا نے دروازہ بند کیا اور پھر بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھ کر، آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔ ایک دبی دبی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

بہت اسمارٹ بنتا تھا جہان۔ شاید وہ اس سے زیادہ اسمارٹ تھی کہ اس نے اسے ڈھونڈ ہی نکالا تھا۔ ہاں اس کے سامنے یہ نہیں مانے گی کہ وہ اس کے لیے آئی ہے۔ جس بندے نے اسے خوار کیا، اس کو تھوڑا بہت خوار کرنے کا حق تو اسے بھی تھا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے واپس آئی اور ہیئر برش اٹھاتے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ اجرک کے کرتے پہ سامنے، بالوں پہ کانوں کے قریب اور دونوں ہاتھوں پہ افشاں لگی تھی۔ از بیلی اسٹون کے فرش پہ ڈبی ابھی تک الٹی پڑی تھی۔ وہ ڈبی اٹھانے کے لیے نہیں جھکی۔ افشاں کی سب سے پیاری بات یہ تھی کہ اسے جتنا خود سے اتارنے کی کوشش کرو، یہ پھیلتی چلی جاتی ہے اور جس کو چھوتی ہے، اس کو چمک عنایت کر دیتی ہے۔

"دوپہر ایک بجے شارپ۔" اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے عکس کو دیکھتے برش بالوں میں اوپر نیچے چلانا شروع کیا۔ ابھی اسے سو دفعہ برش کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

صبح آشیانہ کے اطراف کے پہاڑوں پہ بہت سہانی اتری تھی۔ کپادوکیہ کو جیسے اس کا حسن واپس مل گیا تھا۔

اس نے بہارے کو تیار ہونے کو کہا، پھر مزید کچھ نہیں بتایا۔ بہارے ابھی بال بنا رہی تھی۔ وہ اسے وہاں چھوڑ کر، اپنے عبایا اور اسکارف کو پن لگاتے ہوئے نیچے چلی آئی۔ آج اس کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔

فاتح استقبالیہ کاؤنٹر پہ تھا۔ وہ لابی بھی چھوٹے سے پتھر یلے کمرے کی مانند بنی تھی۔ غاروں میں غار......

"صبح بخیر آپا......" جلدی سے سب کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"شکریہ فاتح!" وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "ایک بات پوچھنی تھی۔ یہاں آس پاس کوئی کنواں ہے؟"

"کنواں؟" فاتح نے اچنبھے سے دہرایا۔ "پتا نہیں کنویں ہیں بہت سے، مگر آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟"

"کوئی ایسا کنواں جو ٹورسٹ اٹریکشن ہو اور جو کافی گہرا ہو۔" فاتح کو بات سمجھانے کے لیے اسے آہستہ آہستہ الفاظ ادا کرنے پڑ رہے تھے۔ فاتح نے تذبذب سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں! آپا میں ایسے کنویں کو نہیں جانتا۔ ویران کھنڈر کنویں مل جائیں گے، مگر سیاحتی مرکز مشکل ہے۔"

"سوچو فاتح! کوئی بہت گہرا سا کنواں ہوگا ادھر۔ سوچو نا۔" اس کے دل میں بے چینی سی انگڑائی لینے لگی۔ اللہ سمجھے جہان سکندر کو۔ کبھی انسانوں کی زبان میں بات نہیں کرے گا۔ پھر ایک پہیلی؟

"مجھے واقعی کسی گہرے کنویں کے بارے میں نہیں پتا......" وہ ذرا دیر کو رکا۔

"آپ گہرے کنویں کا تو نہیں پوچھ رہیں؟"

"اتنی دیر سے میں اور کیا پوچھ رہی ہوں فاتح؟"

"نہیں نہیں! آپ کسی کنویں کا پوچھ رہی ہیں۔ اصلی کنویں کا جو گہرا ہو...... یا آپ "گہرے کنویں" کا پوچھ رہی ہیں؟"

"دونوں میں کیا فرق ہوا؟" اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔ شاید وہ کسی منزل کے قریب تھی۔

"دیکھیں آپا!" فاتح دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا۔ "ایک ہوتا ہے کنواں جس سے لوگ پانی نکالتے ہیں۔ ان کے بارے میں میں زیادہ نہیں جانتا...... اور ایک ہے "گہرا کنواں" مگر وہ کنواں نہیں ہے۔ وہ...... وہ یلتار شہری ہے۔"

"یلتار شہری...... مطلب؟" اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔ فاتح نے بے بسی سے اسے دیکھا، پھر نفی میں سر ہلایا۔ اسی پل مسز سونا لانڈری باسکٹ اٹھائے وہاں داخل ہوئیں۔ فاتح نے فوراً انہیں پکارا۔

"سونا خانم یلتار شہری کو انگریزی میں کیا کہیں گے؟"

"انڈر گراؤنڈ سٹی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک منٹ مسز سونا! وہ مجھ سے کمرے میں الفشاں گر گئی تھی۔ وہ صاف ہو جائے گی نا؟"

"ہاں! فکر نہ کرو۔ پنار کر لے گی۔" اسے مطمئن کر کے وہ باہر نکل گئیں۔

"انڈر گراؤنڈ سٹی آپا! وہ ایک زیر زمین شہر ہے، جس کا نام 'دیرین کیو' یعنی گہرا کنواں ہے۔ آپ اس کا پوچھ رہی تھیں؟"

حیا پر یقین نہیں تھی۔

"شاید! میں نے کپادوکیہ کے زیر زمین شہروں کا سنا تو ہے، مگر وہ تو بہت سے ہوں گے۔ کیا یہ "دیرین کیو" کوئی مشہور اسپاٹ ہے؟"

"یہ کپادوکیہ سب سے بڑا یلتار شہر ہے آپا! مگر آپ کو کلاسٹروفوبیا تو نہیں ہے؟"

وہ جیسے چونکی...... اور پھر ایک دم اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

"نہیں...... اور ہاں! مجھے یہیں جانا ہے۔ بالکل یہی جگہ ہے۔" وہ جیسے بہت پرجوش ہوگئی تھی۔

"پھر آپ پنار کے ساتھ چلی جائیں، وہ آج تو شہر جا رہی ہے۔ گارفیلڈ کی دوا لینی ہے۔"

"ٹھیک ہے!" وہ ایک دم اتنی خوش ہوئی کہ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ فاتح نے ذرا اچنبھے سے اسے مڑ کر جاتے دیکھا۔ آشیانہ کے کسی مہمان کو اس نے کلاسٹروفوبیا نہ ہونے پہ اتنا پُرجوش ہوتے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

ترکی کے صوبہ "نوشہر" کا وہی معنی تھا، جو پاکستان کے شہر "نوشہرہ" کا ہے۔ "دیرین کیو" یہاں کا سب سے بڑا زیر زمین شہر تھا۔ ایسے سینکڑوں شہر کپادوکیہ میں موجود تھے، جو کم سے کم بھی دو منزلہ تھے۔ جیسے تہہ خانے ہی تہہ خانے ہوں۔ گئے زمانوں میں کپادوکیہ کے باسیوں (عیسائی آبادیوں) نے یہ شہر بنائے تھے تاکہ جنگ کے دنوں میں ان میں پناہ لی جا سکے۔ ان کے پاس شہر کے دہانوں کو مکمل طور پہ بند کرنے کا نظام

بھی موجود تھا۔ پانی، خوراک، روشن دان، نکاسی اور اخراج کا نظام، غرض یہ تمام انتظامات سے آراستہ مکمل شہر تھے۔ بس ان سے آسمان نظر نہیں آتا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عیسائی یہاں سے چلے گئے تھے۔ اب برسوں سے یہ شہر ویران تھے۔ چند سال پہلے ان کو سیاحوں کے لیے کھول دیا گیا تھا۔

"دیرین کیو" کی آٹھ منزلیں سیاحوں کے لیے کھلی تھیں۔ دیرین کا مطلب گہرا اور کیو یعنی کنواں۔ اردو میں گہری دوستی اور دشمنی کے لیے استعمال ہونے والا لفظ "دیرینہ" کا ماخذ بھی یہی "دیرین" تھا۔

مولوت بے، اے، بہارے اور پنار کو ایک لمبی ڈرائیو کے بعد دیرین کیو لے آئے تھے۔ وہ گارفیلڈ کو لے کر خود شہر چلے گئے اور وہ تینوں شہر کی داخلی سُرنگ کی طرف آ گئیں، جہاں سیاحوں کی لمبی قطار لگی تھی۔ دیرین کیو باہر سے یوں لگتا جیسے ایک چھوٹی پہاڑی ہو جس کی دیواروں میں بہت سے سوراخ تھے۔ یوں جیسے کوئی جادوگرنی خاکی چغہ اوڑھ کر جھکی بیٹھی ہو اور اس کے چغے سے بہت سی آنکھیں جھانک رہی ہوں۔ داخلی سُرنگ، غار کے دہانے پہ وہ چھوٹا سا راستہ تھی جس سے اندر جانا تھا۔ باہر دھوپ نکلی تھی، لیکن سرنگ دور سے ہی اندھیری لگ رہی تھی۔

"یہ سوئیٹر رکھ لو۔ شاید ضرورت پڑ جائے۔" پنار نے خود بھی ہلکا سا سوئیٹر پہن لیا تھا اور اب دوسرا اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ حیا نے حیرت سے اسے دیکھا پھر چلچلاتے سورج کو۔

"اتنی گرمی میں؟"

"رکھ لو۔" پنار کے دوبارہ کہنے پہ اس نے سوئیٹر تہہ کر کے بازو پہ ڈال لیا، سیاہ پرس دوسرے کندھے پہ تھا۔ بہارے نے پنار کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ بالوں کو پونی میں باندھے وہ دھوپ کے باعث آنکھیں سکیڑے کھڑی تھی۔

اپنی باری پہ ٹکٹ دکھا کر وہ آگے پیچھے سُرنگ میں داخل ہوئیں۔ باہر دھوپ تھی۔ اندر اندھیرا سا پھیلا تھا۔ کپادوکیہ کے غاروں اور خشک پہاڑوں کی مہیب، پراسرار خوشبو ہر سو پھیلی تھی۔ گائیڈ ان سب سیاحوں کی رہنمائی کرتا جا رہا تھا۔ رش کافی تھا اور راہ داریاں تنگ۔ بعض جگہ تو اتنی تنگ ہوتیں کہ دونوں کندھے اطراف کی دیواروں سے ٹکراتے اور بعض جگہ گردن جھکا کر کمرے میں داخل ہونا پڑتا۔

چند راہ داریاں اور سیڑھیوں سے گزر کر وہ سب سیاح ایک بڑے کمرے میں جمع تھے، جہاں شور سا مچا تھا۔ سیاحوں کے سوال اور اونچی آواز میں بولتا گائیڈ، عجیب مچھلی بازار سا بنا تھا۔ وہ بور ہونے لگی۔ جہان کا کوئی اتا پتا نہیں تھا اور فی الوقت اسے یہ جاننے میں دلچسپی نہیں تھی کہ شہر کا روشن دان یا پانی کا نظام کس طرح کام کرتا تھا، سو وہ پنار کی طرف مڑی۔

"تم بہارے کا خیال رکھنا...... میں بس آ رہی ہوں۔"

"تم کہاں جا رہی ہو؟" بہارے پریشانی سے کہہ اٹھی۔

"میں اپنے طور پہ اندر سے یہ شہر دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم پنار کو تنگ تو نہیں کرو گی؟"

بہارے نے نفی میں سر ہلا دیا، البتہ وہ اس کے جانے پہ خوش نہیں تھی۔

"تم جاؤ! میں چھوٹی بلی کا خیال رکھوں گی۔"

وہ اس کمرے سے آگے کھسک آئی۔ کمرے ہی کمرے، راہ داریاں، محرابی چوکھٹیں، جیسے دی ممی کا سیٹ ہو۔ دیواروں پہ دور دور مشعلوں کی مانند بلب لگے تھے، جو اندھیر گلیوں کو مدھم، زرد روشنی بخش رہے تھے پراسرار، مگر خوبصورت۔

وہ سیاحوں کے جمگھٹے سے ذرا آگے آئی تو ایک دم ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ پنار ٹھیک کہتی تھی۔ اس نے گرے سوئیٹر عبایا کے اوپر پہن لیا اور بٹن سامنے سے کھلے رہنے دیے۔ وہاں آس پاس کوئی نہیں تھا اور ذرا گھٹن والی جگہ تھی تو نقاب ٹھوڑی تک نیچے کر لیا۔

وہ یوں ہی طویل راہ داریوں میں آگے چلتی جا رہی تھی کہ دفعتاً......

"حیا!" کسی نے اس کے کندھے کو ہلکا سا چھوا تو وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے مڑی۔ سانس ایک لمحے کو رکا تھا، مگر پھر بحال ہو گیا۔

"بس! ڈر گئیں؟"

خاکی پینٹ، بھوری آدھے آستین کی ٹی شرٹ، کندھے پہ بھورا دستی بیگ اور سر پہ سیاہ پی کیپ۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحے بھر کو تو کچھ کہہ نہیں پائی۔

"ہائیں! اتنی جلدی ڈر گئیں اور کل مجھے کسی نے کہا تھا کہ وہ اکیلے کپادوکیہ میں رہ سکتی ہے۔"

چونکہ ابھی وہ گذشتہ رات کی طرح نہیں ڈری تھی، سو لمحے بھر میں خود کو سنبھال چکی تھی۔

"کل کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔"

"اوہ! تمہارا باڈی گارڈ تو بھول گیا تھا۔ ابھی کدھر ہے وہ؟" وہ دونوں نیم روشن راہداری کے وسط میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"میں مان ہی نہیں سکتی کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔"

جہان ایک نظر اس پہ ڈال کر دائیں طرف ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔ وہ ایک بڑا سا کمرا تھا۔ زیرِ زمین شہر کا کچن۔ ایک طرف زمین پہ چوکور چولہا بنا تھا (جیسے پاکستان میں گاؤں میں مٹی کے چولہے ہوتے ہیں) اور دوسری طرف دیوار میں کھڑکی کی مانند چوکور بڑا سا خلا تھا۔ اسے اپنا کچن یاد آیا، جہان سے لاؤنج میں جھانکنے کے لیے آدھی دیوار جتنا خلا تھا۔

"کچھ کہا تھا میں نے کل حیا!" وہ اس کھلی بغیر پٹ کی کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگائے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہو گیا۔

"کیا؟" وہ انجان بن گئی۔

"تم واپس جا رہی ہو یا نہیں؟"

دیوار پہ لگے بلب کی روشنی جہان سے ٹکرا کر گزرتی تھی، یوں کہ سامنے والی دیوار پہ اس کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ حیا اس کے بالکل مقابل چولہے کی چوکی پہ آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا سایہ جہان کے سائے کے مقابل گرنے لگا۔ وہ اصل میں کافی فاصلے پہ بیٹھے تھے، مگر ایک ہی دیوار پہ گرتے آمنے سامنے بیٹھے سائے کافی بڑے اور قریب لگ رہے تھے۔

"اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں واپس نہیں جا رہی۔"

"مگر کیوں؟" وہ جیسے اکتا گیا۔

"کیونکہ میں تمہارے لیے نہیں، کپادوکیہ دیکھنے آئی ہوں اور دیکھ کر ہی جاؤں گی۔"

"مگر میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اتنے دن کیسے رہو گی ادھر؟"

"میں نے وہ ویڈیو بھلا دی تھی۔" جہان کے چہرے کے بجائے اس کے سائے کو دیکھتے ہوئے وہ ایک دم بہت رسان سے بولی۔

لمحے بھر کو پورے زیرِ زمین شہر میں سناٹا چھا گیا۔ جہان بالکل چپ ہو گیا۔ اسے لگا، وہ ابھی ہنس دے گا، پھر اسے رکنے کو کہے گا، مگر......

"تو؟ تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہوا کہ میں کیوں تمہیں یہاں سے بھیجنا چاہتا ہوں؟" وہی سنجیدگی بھرا خشک انداز۔ اسے دھچکا سا لگا۔ کوئی اپنائیت، کوئی راز بانٹ دینے والا احساس نہیں۔ وہ تو ویسا ہی تھا۔

"نہیں! مجھے واپس نہیں جانا...... اور میرے یہاں ہونے سے تمہیں کیا مسئلہ ہے؟" اس کی آواز میں دبا دبا غصہ در آیا۔

"مجھے تمہاری فکر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم محفوظ رہو اور یہ محفوظ جگہ نہیں ہے۔"

کھڑے سائے نے اتنے ہی غصے سے سر جھٹکا تھا۔ تب ہی زیرِ زمین شہر کی دیواروں نے بیٹھے سائے کو اٹھتے اور کھڑے سائے کے سامنے آ کر رکتے دیکھا۔

"اور واپس جانے سے میں محفوظ ہو جاؤں گی جہان بے؟"

"ہاں! بالکل۔ مجھے یہاں سے دو چار دنوں میں انقرہ چلے جانا ہے، پھر وہاں سے ایک اور شہر اور ادھر سے شام۔ میں شام سے چند دن میں اسلام آباد واپس آ جاؤں گا۔ میں تم سے وہیں ملوں گا۔ ہو سکتا ہے روحیل کے ولیمہ میں ہم دونوں ساتھ ہوں۔ اس لیے ابھی تم چلی جاؤ۔"

"کیا گارنٹی ہے اس بات کی؟ ہو سکتا ہے واپسی پہ میری فلائٹ کریش کر جائے؟"

چند لمحے کے لیے وہ واقعی کچھ کہہ نہیں سکا، مگر مدھم مشعل کی روشنی میں بھی حیا نے اس کی بے تاثر آنکھوں میں کچھ زخمی ہوتے دیکھا تھا۔

"ایسے مت کہو۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"نہیں جہان بے! مجھے بولنے دو۔ ہاں! پھر کیا گارنٹی ہے کہ میں وہاں محفوظ رہوں گی؟ ہو سکتا ہے کوئی پرانا دشمن مجھے گاڑی تلے کچل دے؟"

"حیا! میں......"

''ہوسکتا ہے یہ ہمارا آخری سفر ہو۔ کیا تب بھی تم اسے میرے ساتھ نہیں کرنا چاہو گے؟'' اس کی آواز دیرین کیو کی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ رہی تھی، مگر اب اس میں آنسو بھی شامل تھے۔

''میں صرف تمہیں محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں حیا۔'' وہ جیسے بے بسی سے بولا تھا۔

''اور تم خود؟''

''میرا کیا ہے۔ میرے لیے رونے والا کوئی نہیں ہوگا۔ مگر مجھے تمہاری فکر ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ.....''

''تم یہ چاہتے ہو، تم وہ چاہتے ہو، تم ہر وقت صرف اپنا کیوں سوچتے ہو جہان! تم ہر چیز پلان کر کے کیوں رہنا چاہتے ہو؟ تم ہر وقت دوسروں کو آزماتے کیوں رہتے ہو؟''

''حیا!'' اسے جیسے دکھ پہنچا تھا۔ وقت پیچھے چلا گیا تھا وہ اس کا جنجر بریڈ ہاؤس توڑ چکا تھا اور وہ اس پہ چلا رہی تھی۔

''نہیں! مجھے بولنے دو۔ آج مجھے بولنے دو۔ جتنا تم نے مجھے آزمایا۔ اس سے آدھا بھی میں تمہیں آزماتی نا تو تم بہت مشکل میں پڑ جاتے۔'' وہ غصے سے بلند آواز میں بول رہی تھی۔ دیوار پہ گرتے سائے اصل سے زیادہ قریب کھڑے تھے۔

''تم یہ سمجھتے ہو کہ ہر دفعہ تم چیزیں پلان کرو گے اور سب تمہاری مرضی کے مطابق ہو جائے گا، پھر بعد میں لوگ تمہاری باتوں کے دوسرے مطلب ڈھونڈتے پھریں اور اس دوران کس کا دل کتنا ٹوٹے، تمہیں کب پروا ہوتی ہے۔ تم دوسروں کا کبھی نہیں سوچتے۔ مگر ہر دفعہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہر دفعہ دوسرے تمہاری طرف کی کہانی نہیں سمجھ لیں گے۔ یہ کرلو تو وہ ہو جائے گا، وہ کرلو تو یہ ہو جائے گا۔ میں مزید تمہارے ان پلانز کے مطابق نہیں چل سکتی۔''

بولتے بولتے اس کا سانس پھولنے لگا۔ جہان نے ہاتھ جیبوں سے نکال کر سینے پہ لپیٹ لیے اور دائیں جوگر سے زمین کو کھرچتا وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ سن رہا تھا۔

''اور بھی جو کچھ اندر بھرا ہے میرے خلاف، وہ بھی کہہ دو۔''

''میرے اندر جو بھی بھرا ہو، تمہیں پروا نہیں ہے۔ تم مجھ سے میرے بر فتے پہ بحث کر کے چپ چاپ چلے آئے۔ اگر تمہیں میرے بر فتے سے مسئلہ نہیں تھا تو پھر تم نے ایک دفعہ بھی کوئی امید، کوئی وضاحت کیوں نہیں دی؟ کیا یہ مناسب تھا کہ تم مجھے یوں چھوڑ کر آتے اور سارے خاندان میں میرا تماشا بنتا؟ تم ہر دفعہ یہ سمجھتے ہو کہ بعد میں تم دوسرے کو منالو گے۔ کیا منا لینے سے دل پہ لگے زخم مٹ جاتے ہیں؟ سخت لکڑی پہ بھی کلہاڑی کی ایک ضرب لگاؤ تو ساری عمر کے لیے نشان رہ جاتا ہے۔ میں تو پھر انسان ہوں۔ کیا تم ساری زندگی یہ ہی کرتے رہو گے؟''

اس کی آواز درد سے پھٹنے لگی۔ جہان کا بے تاثر، سپاٹ ہوتا چہرہ دیکھ کر اسے اور بھی غصہ چڑھنے لگا۔ جب سے وہ غصے سے بولنے لگی تھی، تب سے اس کا چہرہ بے تاثر پڑ گیا تھا۔

''اور اگر مجھے کوئی گاڑی تلے کچل دے تو پھر کس کو وضاحتیں دینے آؤ گے؟ مگر تم نہیں سمجھو گے۔''

وہ بے بسی بھرے دکھ کے ساتھ کہتی پلٹی اور تیز تیز قدموں سے چلتی باہر نکلی۔ پھولا تنفس اور آنکھوں میں جمع آنسو۔ اذیت ہی اذیت تھی۔ وہ بھی کس کو سمجھا رہی تھی؟ وہ پروا ہی کہاں کرتا تھا؟

راہ داری میں سبک قدموں سے چلتی وہ بے آواز روتی آگے بڑھتی جا رہی تھی، پھر ایک کمرے میں بیٹھنے کو ویسی ہی چوکی نظر آئی تو جا کر ادھر بیٹھ گئی اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔ چہرہ اس لیے ڈھانپا تھا کہ گہرے کنوئیں کی قدیم دیواریں اس کے آنسو نہ دیکھ سکیں، سُرنگ اس کی سسکیاں نہ سن سکے اور مصنوعی مشعل کی روشنی میں اس کے ہچکیوں سے لرزتے وجود کا سایہ نہ پڑے، مگر آنسو، سسکیاں اور لرزش ڈھانپ لینے سے بھی نہیں ڈھکتیں۔

وہ بھی کس کو سمجھانا چاہ رہی تھی؟ وہ کہاں اس کی مانتا تھا؟ وہ اس کے ساتھ کپادوکیہ میں رہنا چاہتی تھی، جتنے بھی دن وہ ادھر ہے، مگر وہ اسے اب بھی ہمیشہ کی طرح زبردستی واپس بھیج دے گا۔ بے بسی سی بے بسی تھی۔

اس نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

سُرنگ، محرابی چوکھٹیں بھول بھلیاں، سب سنسان پڑی تھیں۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ دیوار پہ گرتا سایہ اکیلا تھا۔ جہان اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اپنے غصے میں وہ سب بھول جایا کرتی تھی، یہ بھی کہ ایک دفعہ پھر وہ ہمیشہ کی طرح اسے چھوڑ کر آ گئی تھی۔ وہ سب باتیں کہہ کر جو وہ صرف اس کو

ہرٹ کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کا مطلب وہ ہرگز نہیں تھا۔ اس نے دل سے وہ سب نہیں کہا تھا۔

اللہ، اللہ اس نے یہ کیا کر دیا؟ وہ اب کیسے آئے گا اسے منانے؟

"جہان! وہ بدحواسی کے عالم میں اٹھی اور راہ داری کی طرف آئی۔ وہ دائیں سے آئی تھی یا بائیں سے؟ شاید دائیں سے۔ ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑتی وہ اس جانب بھاگی۔

ایک موڑ، دوسرا، دائیں طرف وہ کمرا جہاں ابھی دو سائے ٹکرائے تھے، اب وہ خالی تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔

"جہان!" آنسو پھر سے اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس نے پھر سے اسے کھو دیا تھا۔

مزید اس سے ویرین کیو دیکھا نہیں گیا۔ وہ الٹے قدموں واپس مڑی۔ بمشکل سیڑھیاں ملیں اور باہر جانے کا راستہ سمجھ آیا۔ گائیڈ، سیاح، ابھی تک وہیں تھے۔ بہارے اور پنار بھی ایک طرف کھڑی تھیں۔ اس نے بہارے کا ہاتھ تھاما اور اپنی متورم، سرخ آنکھیں چھپانے کی سعی کیے بغیر بس اتنا بولی۔

"واپس چلتے ہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ہوا؟" پنار حیران اور پھر پریشان ہو گئی، مگر وہ کوئی جواب دیے بنا گہرے کنویں کے داخلی روزن کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں سے سورج کی روشنی جھانک رہی تھی۔

وہ تینوں سُرنگ میں آگے پیچھے چلتی گئیں۔ غار کا اندھیرا چھٹتا گیا اور بالآخر غار کے دہانے پہ سورج سے چمکتا، روشن دن سامنے کھڑا تھا۔

وہ کہیں نہیں تھا۔ کہیں بھی نہیں۔

پنار نے پھر کوئی سوال نہیں پوچھا۔ بہارے جو بے چین ہو رہی تھی، اس کو بھی چپ کروا دیا۔

اس کا دل بار بار بھر رہا تھا۔ وہ کیوں پھر سے اسے چھوڑ گئی۔ آخر کیوں وہ روٹھنے منانے سے آگے نہیں بڑھتے تھے؟

اپنے کمرے میں آ کر وہ سرخ صوفے پہ کھڑکی کے آگے پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دے کر بے آواز روئے جا رہی تھی۔ بہارے پتا نہیں کہاں تھی۔ وہ ہر خیال وفکر سے بے پروا بس آنسو بہا رہی تھی۔ اس کا دل بار بار کسی خوف کے زیرِ اثر سکڑ جاتا تھا۔

بہارے اسے کھانے کے لیے بلانے آئی، مگر وہ نہیں اٹھی۔ دوپہر کی روشنی آہستہ آہستہ بجھنے لگی اور شام کا اندھیرا کپادوکیہ پہ پھیلنے لگا۔ ہر سو پہاڑوں پہ زرد بتیاں جگمگانے لگیں۔ وہ اسی طرح صوفے پہ سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی رہی۔ آنسو بھی پانی سے بنے ہوتے ہیں اور پانی آسمانوں سے اتارا جاتا ہے۔ سو آنسوؤں کے بعد کا مرہم بھی وہیں اوپر سے آتا ہے۔ نیند، پُرسکون نیند۔ اس پہ کب نیند طاری ہوئی، اسے پتا بھی نہیں چلا۔ ذہن میں، دل میں، آنکھوں کے پیچھے، ہر جگہ زیرِ زمین شہر کی سُرنگ کا منظر اُمڈ آ رہا تھا۔ وہ غصے میں اس پہ چلا رہی تھی اور وہ دھیمے لہجے میں اسے پکار رہا تھا۔

"حیا..... بات سنو!"

"مگر وہ اسے سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ اس سے فاصلے پہ کھڑا تھا، پھر بھی پتا نہیں کیسے، وہ اس کا شانہ ہولے سے ہلا رہا تھا۔

"حیا..... اٹھو! میری بات سنو۔" بہت دھیرے سے وہ کہہ رہا تھا۔ چاندی کے مجسمے پھر سے واپس لوٹ آئے تھے۔ گہرے کنویں کا اندھیرا چھٹتا گیا۔ چاندی کی جھیل ہر سو پھیلتی گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں مدھم سی روشنی بکھری تھی۔ اس کے صوفے کے سامنے میز کے کنارے پہ بیٹھا جہان، بہت تکان سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ تھکے تھکے سے انداز میں مسکرایا۔

"دیکھ لو..... تم میرے لیے کپادوکیہ نہیں آئیں، مگر میں ہر دفعہ تمہارے لیے آ جاتا ہوں۔ پھر بھی کہتی ہو مجھے پروا نہیں ہے؟"

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بنا پلک جھپکے وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ پھر اچانک ہی بہت سے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

باب 14

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سانس روکے، بنا پلک جھپکے وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ پھر اچانک بہت سے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

''جہان! آئی ایم سوری۔'' وہ بھیگی آواز میں کہتی، اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ کہیں پلک جھپکنے پہ منظر غائب نہ ہو جائے۔ ''میں نے وہ سب جان بوجھ کر نہیں...... میں بس غصے میں......''

''میری بات سنو!'' اسی دھیمے لہجے میں کہتے ہاتھ اٹھا کر اس نے حیا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ''تمہاری ساری باتیں ٹھیک تھیں۔ تم نے صحیح کہا تھا۔ میں واقعی بہت دفعہ بہت غلط چیزیں کر جاتا ہوں۔''

''نہیں...... میرا وہ مطلب نہیں تھا...... میں تو......'' اس نے احتجاجاً کچھ کہنے کی سعی کی مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

میں جانتا ہوں کہ میں کوئی ہر وقت ہنسنے مسکرانے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں پہلے بھی بہت دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میں ایک پریکٹیکل آدمی ہوں، ایکسپریسو نہیں ہوں، مجھے دوسروں کے دل رکھنے نہیں آتے، میں لوگوں پہ جلدی یقین نہیں کرتا، شک کرتا رہتا ہوں، اور میری جاب نے مجھے ذرا سا بے حس بنا دیا ہے۔ میں اب بہت پرائیویٹ پرسن بن گیا ہوں یا شاید ہمیشہ سے ایسا تھا۔ کیا تم نے دوپہر سے کچھ کھایا؟'' اپنی رو میں کہتے، ایک دم سے اس نے پوچھا۔ اگر وہ توقف کے بعد استفسار کرتا تو وہ کہہ دیتی کہ اس نے کھایا ہے، مگر وہ حملہ اتنا شدید تھا کہ اس کا سر خود بخود نفی میں ہل گیا۔

''نہیں...... ہاں...... بس مجھے بھوک نہیں تھی۔'' اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔ اب وہ آنسو پونچھ چکی تھی، اور یہ اس کے لیے خجالت کا باعث ہوتا اگر وہ جان لیتا کہ حیا نے اس کی وجہ سے تب سے کچھ نہیں کھایا۔ مگر وہ جان چکا تھا۔

''نہیں تم نے کچھ نہیں کھایا۔ اور مجھے پتا ہے کہ لوگوں سے جواب کیسے اگلوائے جاتے ہیں۔'' وہ میز کے کنارے سے اٹھا اور دوسرے کونے میں رکھی انگیٹھی کی طرف گیا۔ وہاں ایک چھوٹی سی میز پہ بہارے کے پاپ کارن کے دو پیکٹ پڑے تھے، اور اوپر دیوار میں ایک بلٹ ان مائیکرو ویو اوون نصب تھا۔

''کیسے اگلوائے جاتے ہیں؟'' اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے وہ وہیں بیٹھے بیٹھے بولی۔ وہ اب مائیکرو ویو اوون کا ڈھکن کھولے کھڑا، پاپ کارن کا ایک پتلا سا پیکٹ اندر رکھ رہا تھا جس میں صرف مکئی کے دانے تھے۔ ٹائم سیٹ کر کے اس نے اوون کا ڈھکن بند کیا، اسے اسٹارٹ کیا اور واپس اس تک آیا۔

''اگر تم کسی سے سچ بلوانا چاہتی ہو، فرض کرو اپنے ابا سے، تو ان سے سوال تب پوچھا کرو جب وہ ڈرائیو کر رہے ہوں۔ ڈرائیو کرتے ہوئے لوگ عموماً سچ بولتے ہیں۔''

''اور مجھے کیسے پتا چلے گا کہ کون سچ بول رہا ہے اور کون جھوٹ؟'' وہ بس بات کو طول دینا چاہتی تھی تاکہ جہان پچھلی بات بھول جائے اور وہ اپنے الفاظ دہرائے جانے کی شرمندگی سے بچ جائے۔

''جھوٹ بولنے والے کے چہرے پہ دس عدد بہت واضح نشانیاں آ جاتی ہیں، اس وقت جب وہ جھوٹ بول رہا ہوتا ہے۔''

اوون ''زوں'' کی آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ مکئی کے دانے چٹخنے کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھی۔

''ایک تو ہو گئی نگاہیں چرانا، باقی نو کون سی ہوتی ہیں؟'' وہ اب صوفے پہ پاؤں نیچے کر کے، دوپٹہ ٹھیک سے شانوں پہ پھیلا کر ذرا تمیز سے بیٹھ چکی تھی۔ کھلے بال چہرے کے دائیں جانب آگے کو ڈال دیے تھے۔ جامنی پلین لمبی قمیض، زیتون رنگ دوپٹے اور چوڑی دار کی ہمراہی میں بھی اس کے چہرے کو بشاشت نہیں دے پا رہی تھی۔ متورم آنکھیں اور زرد پڑتی رنگت، ساری دوپہر کی کہانی واضح تھی۔

''نگاہیں چرانا؟ نہیں، لوگ جھوٹ بولتے ہوئے نگاہیں نہیں چراتے۔ یہ غلط تاثر ہے۔ اِن فیکٹ جھوٹ بولتے ہوئے لوگ آپ کی آنکھوں میں ضرور دیکھتے ہیں، اور وہیں سے وہ پکڑے جاتے ہیں۔''

''تم نے آخری دفعہ سچ کب بولا تھا؟'' کمرے میں اب بھنی ہوئی مکئی کی خستہ سی خوشبو پھیلنے لگی تھی۔

"ابھی ڈیڑھ منٹ پہلے، جب میں نے کہا تھا کہ تمہاری ساری باتیں ٹھیک تھیں۔"
چلو جی۔ وہ پھر وہیں پہنچ گیا تھا۔
"جہان ... آئی ایم سوری ... میں نے وہ دل سے نہیں کہا تھا۔"
"لیکن میں دل سے ہی کہہ رہا ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ شاید یہ واقعی ہمارا آخری سفر ہو۔"
اوون میں زور کا چٹاخہ ہوا۔ شیشے کی ڈش پہ رکھے پیکٹ میں پڑا کوئی دانہ بھن کر پھول گیا تھا شاید۔ اس کے اندر بھی کچھ سلگا تھا۔
"ایسے مت کہو۔" وہ تڑپ کر اسے روکنا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر وہ نہیں چاہتا تو وہ ادھر نہیں رکے گی۔ صبح ہوتے ہی اسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔
"تم نے صحیح کہا تھا۔ ہر وقت کی پلاننگ ٹھیک نہیں ہوتی۔ میرے منصوبے بھی بہت دفعہ مجھ پہ ہی الٹے پڑے ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اپنی ذاتی زندگی میں مجھے اس چیز سے باز آ جانا چاہیے۔ یا کم از کم اس سفر کے لیے ہی سہی۔"
وہ سانس لینے کو رکا۔ "میں تمہیں ہمیشہ سے وہ سب بتانا چاہتا تھا، مگر نہیں بتا سکا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میری بات نہیں سمجھو گی، جیسے کل رات سے نہیں سمجھ رہیں، مگر تم بھی صحیح ہو۔ مجھے ہر وقت اپنی مرضی نہیں ٹھونسنی چاہیے۔"
"جہان!" وہ اسے مزید بولنے سے روکنا چاہتی تھی۔ اس کا اپنا دل بھی اوون کی شیشے کی پلیٹ کی طرح گول گول گھومتا کسی منجدھار میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔
"بہت دفعہ ایسا ہوا کہ میں تمہیں وہ سب بتانا چاہتا تھا جو میں نے اس ویڈیو میں محفوظ کیا تھا، مگر میں یہ نہیں کر سکا۔ میں کچھ پا لینے کے بعد کھونے سے ڈرتا تھا۔ یا شاید مجھے تم پہ اعتبار نہیں تھا، کہ تم مجھے سمجھو گی۔ اب شاید تم سمجھو، مگر اس وقت تم نہ سمجھتیں۔"
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس وقت وہ واقعی نہ سمجھ پاتی۔ مگر اب وہ ایسی باتیں نہ کرے۔ اس کا دل دکھ رہا تھا۔
"جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ میں وہ سب دوبارہ نہیں دہرانا چاہتا۔ اب بھی مجھے تمہارے یہاں رہنے سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں صرف اس لیے فکر مند تھا کہ مجھے کل انقرہ جانا ہے ایک ہفتے کے لیے، پھر واپس کپادوکیہ آ جاؤں گا اور کچھ دن بعد واپس اپنے ملک چلا جاؤں گا۔ مجھے صرف یہی پریشانی تھی کہ تم میرے بغیر ادھر اکیلی نہ رہو۔ ویسے بھی تم کپادوکیہ دیکھنے کے لیے آئی ہو، میرے لیے نہیں۔" یہاں وہ ذرا تھکان سے مسکرایا۔ حیا کا دل چاہا، کہہ دے، نہیں میں تمہارے لیے آئی ہوں مگر انا اور خودداری دیوار بن گئی۔
"میں اکیلی نہیں ہوں۔" کہنے کے ساتھ اس نے ایک نظر بستر پہ گلابی پردے کے پیچھے سوتی بہارے پہ ڈالی۔ "یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں۔" پھر ایک دم وہ چونکی۔ "کہیں تم نے تو انہیں نہیں کہا کہ میرا خیال رکھیں؟"
"اب اتنا فارغ نہیں ہوں میں کہ ہر جگہ تم پہ نظر رکھوں گا۔ مولوت بے اس علاقے کے ڈسٹرکٹ چیف ہیں، اور یہ اپنے ہر گاہک کے ساتھ ایسے ہی پیش آتے ہیں۔ مہمان نواز ترک قوم، یو نو۔ لیکن تم نے اچھا کیا کہ ان کے ہوٹل آ گئی۔ یہ کافی محفوظ اور اچھا ہوٹل ہے۔ ایسے مشکوک نظروں سے مت دیکھو مجھے، میں نے واقعی ان کو کچھ نہیں کہا۔" وہ ذرا خفا ہوا تو حیا نے شانے دھیرے سے اچکائے۔ اوون کب کا بند ہو چکا تھا۔ سارے کمرے میں بھنے مکئی کے دانوں کی خوشبو پھیلی تھی۔
"تو کیا اب میں یہاں رہ سکتی ہوں؟"
"ہاں، جب تک چاہو رہو۔ کل میں چلا جاؤں گا، واپسی تک اگر تم یہیں ہوئی تو ہم دوبارہ مل لیں گے۔"
"انقرہ کیوں جانا ہے؟" اس نے ایک فطری طور پہ ذہن میں آنے والا سوال پوچھا تھا، مگر جہان چند لمحے بہت خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا تھا۔
"ایک کام ہے۔"
"کیسا کام؟" اس کے انداز میں کچھ تھا کہ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔
"ایک کام ادھورا چھوڑ آیا تھا، جب ابا کی ڈیتھ ہوئی تھی، تب میں اسی لیے جرمنی میں تھا۔ اب میرے پاس چند دن ہیں، تو سوچا اس کو مکمل کر لوں۔" بات ختم کر کے وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، جیسے وہ اس کے استفسار کا منتظر تھا۔ جیسے اگر وہ پوچھے تب بھی وہ نہیں بتائے گا، پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ وہ پوچھے۔

حیا نے چند لمحے سوچا، پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔
''اوکے!'' بات ختم۔ اس نے اس موضوع کو نہ کریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔
''مگر اب ایسے مت کہنا کہ یہ ہمارا آخری سفر ہو سکتا ہے۔''
''غلط نہیں کہہ رہا۔ میں ترکی دوبارہ نہیں آسکوں گا، ترکی کے لیے اب ناکارہ ہو چکا ہوں، سو اس ملک میں ہو سکتا ہے یہ آخری......''
''کہہ رہی ہوں نا کہ ایسے مت کہو۔'' وہ صوفے پہ اپنے دونوں اطراف ہتھیلیاں رکھ کر اٹھنے لگی تو جہان نے رکنے کا اشارہ کیا۔
''ایک منٹ۔ میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔''
وہ اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھ گئی۔
''جتنے دن ہم ساتھ ہیں، سب کچھ میری مرضی سے طے ہوگا۔ سارے پروگرام، سارے شیڈول، کہاں ملنا ہے، کہاں جانا ہے، سب میں ڈیسائیڈ کروں گا، اور تم کسی بات سے انکار نہیں کرو گی۔''
حیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا اجازت دینا ہی بہت تھا، اب کیا بحث کرتی۔
''کیا تم پاپ کارن کھاؤ گے؟'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جہان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہولے سے ہاتھ سے کنپٹی کو مسلا۔ شاید اس کے سر میں درد تھا۔
''میں بس چلوں گا۔'' وہ اٹھا، دیوار میں لگے سوئچ بورڈ پہ لائٹ کا ناب گھمایا (جیسے ہمارے ہاں پنکھے کے ناب ہوتے ہیں)۔ کمرے میں جلتا واحد زرد بلب مدھم ہوتا گیا۔ پھر اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر باہر دیکھا۔
حیا نے اوون کا ڈھکن کھولا، اور گرم گرم پھولا ہوا پاپ کارن کا پیکٹ نکالا۔ جہان تب تک کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر دوبارہ سے بتی تیز کر چکا تھا۔ (اگر ڈی جے ہوتی تو کہتی کہ ایسی بتیاں ہماری یونیورسٹی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اگر وہ ہوتی تو پھر مسئلہ ہی کیا تھا؟)
''آشیانہ کے نئے مہمان آگئے ہیں غالباً۔ باہر رش ہے۔ اس کے چھٹنے تک انتظار کرنا ہوگا۔'' وہ صوفے پہ اسی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا جہاں ابھی وہ بیٹھی تھی۔
''تم تھکے ہوئے لگ رہے ہو، چاہو تو لیٹ جاؤ۔ میں آتی ہوں۔''
اسے وہیں چھوڑ کر وہ ڈریسنگ روم میں آئی تاکہ وہاں سنگھار میز پہ رکھا شیشے کا بڑا پیالہ اٹھا لے۔ اس جگہ پہ فرش پہ ابھی تک افشاں کے ذرات دکھائی دیتے تھے، حالانکہ پنار نے صاف بھی کیا تھا۔
پیالہ اٹھاتے ہوئے اس نے آئینے میں خود کو ایک نظر دیکھا تو جھٹکا سا لگا۔ سرخ متورم آنکھیں، زرد پڑتا چہرہ۔ اللہ، اللہ، وہ اتنی دیر سے ایسی لگ رہی تھی؟ وہ بھی کیا کہتا ہوگا کہ وہ اس کے ''غم'' میں رو رہی تھی؟
پیالہ چھوڑ کر وہ باتھ روم میں گئی، سنک کے اوپر جھک کر منہ پہ پانی کے چھینٹے مارے، پھر تولیے سے چہرہ تھپتھپایا، بال برش کیے، اور ذرا خود کو کمپوز کرتی باہر آئی۔
جہان اسی طرح سر ہاتھوں میں دیے بیٹھا تھا۔
''جہان!'' اس نے محتاط انداز میں پکارا۔ جہان نے اسی پل سر جھکائے جھکائے، ہاتھ کی پشت سے ہونٹوں کے اوپر چھوا۔ خون کے قطرے۔ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔
''جہان، تمہارے ناک سے خون آ رہا ہے۔''
وہ بنا کچھ کہے تیزی سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف لپکا۔ حیا متحیر سی پیچھے آئی اور کھلے دروازے سے دیکھا۔ ٹونٹی فل کھولے، وہ سنک پہ جھکا، ناک اور چہرے پہ پانی ڈال رہا تھا۔
وہاں کھڑے ہونا اسے مناسب نہ لگا تو واپس صوفے پہ آ کر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا؟ ایسے اچانک......؟
چند منٹ گزرے کہ وہ تولیے سے گیلا چہرہ خشک کرتا باہر آیا۔
''کیا ہوا تھا؟'' وہ فکرمندی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ جواب دیے بنا اس سے [illegible] فاصلے پہ صوفے پہ بیٹھا اور تولیہ اس کے ہتھ پہ ڈال دیا۔
''نکسیر کیوں پھوٹی؟ اتنی گرمی تو نہیں ہے، کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟''

''کتنے سوال کرتی ہو!'' وہ جیسے اکتا گیا۔

''جتنے بھی کروں، مجھے حق ہے اس کا۔ اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟''

جہان نے نقاہت بھری نظروں سے اسے دیکھا، اور پھر چند لمحے تک یونہی دیکھتا رہا۔ ایسے ہی ابھی وہ انقرہ کے ''کام'' کے متعلق بات کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''اردو میں بات کرتے ہیں حیا، وہ جاگ رہی ہے۔''

حیا نے چونک کر بہارے کی طرف گردن موڑنی چاہی تو وہ جیسے بگڑ کر بولا

''ہاں اب تم اس کو دیکھنے لگ جاؤ تاکہ اسے پتا چل جائے کہ ہم اس کی بات کر رہے ہیں۔''

''سوری!'' اس کی گردن خفیف سی آدھے راستے سے پلٹ آئی۔ ''مگر تمہیں کیسے پتا کہ وہ جاگ رہی ہے؟''

''اس کے پاؤں کا انگوٹھا تناؤ کی پوزیشن میں ہے، پیشانی پہ پڑے بل، اور پلکوں کی لرزش۔ مجھے پتا ہے وہ نہیں سو رہی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سوتی بن گئی تھی، اسے ڈر ہے کہ میں اسے ڈانٹوں گا۔'' یہ آدمی بھی نا، کبھی کسی کو انسانوں کی نظر سے نہیں دیکھے گا۔

''اچھا اب بتاؤ، تمہیں کیا ہوا تھا؟''

نکسیر پھوٹنے کی وجہ کوئی عام سی بھی ہو سکتی تھی مگر اس کا انداز اس بات کا غماز تھا کہ کچھ ہے جو وہ چھپانا بھی چاہتا ہے مگر بتانا بھی چاہتا ہے۔

چند لمحے وہ بالکل خاموش رہا۔ مکئی کے دانوں کی خوشبو ہر گزرتے پل باسی ہوتی گئی، پھر اس نے دھیرے سے کہنا شروع کیا۔

''انقرہ میں میری سرجری ہے۔ انٹرا کرینئل (کھوپڑی کو کھول کر کی جانے والی) سرجری۔'' اس نے رک کر حیا کے تاثرات دیکھے۔ وہ بنا پلک جھپکے، سانس روکے اسے منتظر سی دیکھ رہی تھی۔

''جب میں جیل میں تھا تو مجھے ادھر آنکھ کے قریب ایک زخم آیا تھا۔ یہاں ایک کیل گھس گئی تھی۔ ایک اعشاریہ ایک انچ کی کیل۔ یہ سر درد، اور کچھ عرصے سے نکسیر پھوٹنے کی تکلیف، یہ سب اسی کی وجہ سے ہے۔ اس کو نکالنے کے لیے سرجری کروانی ہو گی۔ نہ کروائی تو یہ مسلسل درد اور اس کے آگے ٹریول کرنے کا خطرہ رہے گا۔ اور اگر سرجری ناکام ہو گئی تو بینائی جا سکتی ہے یا مستقل معذوری۔ جب ابا کی ڈیتھ ہوئی، تب میں اسی لیے جرمنی میں تھا، مگر تب میں ہمت نہیں کر سکا۔''

''اچھا!'' جہان کی توقع کے برعکس حیا نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلایا۔ کوئی شدید تاثر دیے بغیر وہ بولی۔ ''پہلے جرمنی سے کروانے گئے تھے تو اب انقرہ سے کیوں؟''

''ان دنوں میرا ترکی سے باہر رہنا ضروری تھا، جبکہ ابھی مجھے کچھ دن ادھر لگ جائیں گے، میں اس وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔'' وہ بس خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

''کل میری سرجری ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد انقرہ کے لیے نکل جاؤں گا۔ اگر سب ٹھیک ہو گیا تو واپس آ جاؤں گا، تب تک تم.....''

''تب تک میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ ابھی ہماری ڈیل ہوئی ہے کہ میں یہاں تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

''نہیں، ہماری بات کیا دو کیہ کی ہوئی تھی۔'' وہ قطعیت سے کہتا منع کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔

''تم نے کہا تھا ''یہاں'' اور یہاں سے مراد میں نے ترکی لیا تھا۔ ہماری ڈیل ترکی کی ہوئی تھی۔ جب تک تم یہاں، یعنی کہ ترکی میں ہو، میں ادھر رہ سکتی ہوں۔ تم بتاؤ، کون سا ہاسپٹل ہے، اور کب جانا ہے؟'' وہ اتنے اٹل لہجے میں کہہ رہی تھی کہ وہ زیادہ تردد نہ کر پایا۔

''اس کا کیا کرو گی؟'' اس نے ذرا تذبذب سے بنا اشارہ کیے بہارے کا پوچھا۔

''فکر نہ کرو، اسے ہاسپٹل نہیں لاؤں گی، کچھ کر لوں گی۔ تم بس مجھے شیڈول سمجھاؤ۔'' پھر وہ اس کی کہی ہر بات نوٹ کرتی گئی۔ جب ساری باتیں ختم ہو گئیں، اور پاپ کارن کی خوشبو ہوا میں رچ بس کر فنا ہو گئی تو وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ آشیانہ کے صحن کا رش اب چھٹ چکا تھا۔

''تم ایک دفعہ پھر سوچ لو کہ تم میرے ساتھ آنا چاہتی ہو یا نہیں۔

میں تمہیں اپنی وجہ سے مسئلوں سے دوچار نہیں کروانا چاہتا۔'' دروازے پہ پہنچ کر وہ یہ کہنے کے لیے رکا تھا۔

''اب جاؤ، اور میرا وقت ضائع مت کرو، مجھے صبح کے لیے پیکنگ بھی کرنی ہے۔''

اس کے باہر نکلتے ہی اس نے زور سے دروازہ بند کیا، پھر اسے لاک کیا، اور تیزی سے باتھ روم کی طرف آئی۔

دونوں ہاتھ بیسن کے دہانوں پہ رکھے، چہرہ جھکائے، چند گہرے گہرے سانس لے کر اس نے خود کو کمپوز کرنا چاہا۔ اتنی دیر سے جہان کے سامنے جتنے ضبط اور مشکل سے اس نے جو آنسو روک رکھے تھے، وہ تیزی سے ابل پڑے۔ وہ ایک دم دبی دبی سسکیوں سے رونے لگی تھی۔

پانچ سال...... پانچ سال سے وہ اس تکلیف میں مبتلا تھا، اور اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا؟ وہ کیوں ہر شے، ہر دکھ اپنے اندر رکھتا تھا؟ کیوں باقی سب کی طرح غموں کا اشتہار لگا کر ہمدردیاں نہیں سمیٹتا تھا؟ کتنی ہی دفعہ صائمہ تائی، تایا فرقان، حتیٰ کہ ابا نے بھی اسے جتایا تھا کہ وہ اپنے باپ کے جنازے پہ نہیں آیا۔ وہ آگے سے چپ رہا تھا۔ ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اس وقت آپریشن ٹیبل پہ تھا۔ کیوں تھا وہ ایسا کہ وہ محبت لینے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا اور پھر بھی اس سے محبت ہو جاتی تھی؟

اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو سنک کے دہانے سے لڑھک کر جالی دار ممنور تک پھسل رہے تھے۔ وہاں ایک کونے میں خون کا ایک ننھا سا قطرہ ابھی تک لگا ہوا تھا۔ جہان نے سارا سنک صاف کر دیا تھا، مگر یہ پھر بھی رہ گیا۔ اس نے انگلی کے پورے پہ وہ قطرہ اٹھایا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

کیا اس کے ملک کے جوانوں کا خون اتنا ارزاں تھا کہ یونہی بہتا رہے اور کسی کو فرق بھی نہ پڑے؟ زندگی بھی بعض دفعہ ہم سے ہماری بساط سے بڑھ کر قربانی مانگ لیتی ہے۔

کچھ دیر بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو وہ صوفہ جہاں کچھ دیر قبل چاندی کے مجسموں کا بسیرا تھا، اب ادھر اس کی چھوٹی بلی بیٹھی پاپ کارن کے پیالے سے، ایک ایک دانہ اٹھا کر منہ میں ڈال رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر معصومیت سے مسکرائی۔

”کھاؤ گی؟“ ساتھ ہی پیالہ بڑھایا۔

”نو تھینکس۔“ اس کی بھوک مر گئی تھی۔ اور بھی بہت کچھ مر سا گیا تھا۔ وہ اپنا بیگ الماری سے نکالنے لگی۔

”عبدالرحمن سے تم پہلے بھی ملی تھیں نا، اور تم نے مجھے نہیں بتایا۔“ کیا اس نے میرے بارے میں کچھ کہا؟

”بہارے، ہم انقرہ جا رہے ہیں۔“

پاپ کارن ٹونگتا اس کا ہاتھ رک گیا۔ بھوری آنکھوں میں شدید تحیر در آیا۔

”کیوں؟“

”بس، ایک کام ہے مجھے۔ کچھ پیپر ورک کا مسئلہ ہے۔ دو چار دن میں واپس آ جائیں گے۔“ اس کی تسلی و سمجھ کے مطابق جواب دیتی وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ بہارے ابھی ابھی سی بیٹھی رہ گئی۔ پاپ کارن کا پیالہ اس نے بے دلی سے میز پہ رکھ دیا۔ اسے کھانا شاید ان تینوں میں سے کسی کا نصیب نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

انقرہ اتنا ہی خوبصورت، اور صاف ستھرا سا شہر تھا جتنا کہ استنبول مگر اس سے نہ وہ شہر دیکھا گیا، نہ ہی کچھ اور۔ آس پاس کیا ہو رہا ہے، اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اس کا دل، دماغ اور ساری توجہ بس ایک نقطے پہ تھی۔ آج جہان کا آپریشن ہے۔

اس نے جہان کے ہاسپٹل سے دو بلاک چھوڑ کر ایک ہوٹل میں کمرہ لیا تھا۔ بہارے کو البتہ وہ ہاسپٹل کے اندر لے کر نہیں جا سکتی تھی، اور اسے ہوٹل میں تنہا چھوڑنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ وہ اس بچی کو کس کے پاس چھوڑے؟ اور ہر مسئلے کی طرح اس میں بھی اسے ہالے کا خیال آیا تھا۔

”ہالے، میں کیا کروں؟“ فون پہ ہالے کو تھوڑی بہت جمع تفریق کے ساتھ ساری بات بتا کر وہ اب اس سے مدد مانگ رہی تھی۔

”یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میری نانی انقرہ میں رہتی ہیں، جو ایڈریس تم بتا رہی ہو، وہاں سے کافی قریب گھر ہے اُن کا۔ تم صبح بچی کو وہیں چھوڑ دیا کرو۔ پھر شام میں لے جانا۔ چاہو تو تم بھی وہیں رہ لو۔“

اوہ، ہالے کی نانی۔ اسپرنگ بریک میں جب ایکسچینج اسٹوڈنٹس ترکی کی سیر کو گئے تھے تو ان کے ڈورم بلاک سے جو بھی انقرہ گیا، ہالے کی نانی پاس ضرور گیا تھا۔

”مگر تم نے واقعی اس کو اغوا تو نہیں کیا نا؟“ وہ ہنستے ہوئے پوچھنے لگی، پھر اچانک جیسے اسے یاد آیا۔ ”وہ ہوٹل گرینڈ والا لڑکا دو دفعہ آیا تھا۔ میں نے بتایا کہ تم نہیں ہو مگر وہ بھی مُصر تھا اور...... ایک منٹ۔ تم تو ازمیر میں تھیں۔ پھر انقرہ......؟“

”اوہ ہاں، وہ میں آج ہی ادھر آئی ہوں، مگر اسے مت بتانا۔“ اور یہ بات تو ابھی تک اس نے جہان کو بھی نہیں بتائی تھی۔ شاید اس لیے

کہ اس سے بڑے مسائل اس کے سامنے تھے۔
بہارے کی نانی صبیحہ نور آنٹی ہی پُرمشفق، ملنسار اور مہمان نواز خاتون تھیں جتنی کہ ترک عوام ہو سکتی تھی۔ اور ایک وہ لوگ تھے، اسلام آباد میں اس کی یونیورسٹی میں کتنی ہی غیر ملکی اور بالخصوص ترک لڑکیاں پڑھنے آئی ہوئی تھیں، مجال ہے جو وہ کبھی کسی کو اپنا شہر گھمانے لے گئی ہو۔ پتا نہیں کیوں مگر ہم پاکستانی اسٹوڈنٹس کے پاس ایسے کاموں کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔
سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ صبیحہ آنٹی نے بتایا، مسز عبداللہ، مہر اور عروہ کل اُن کے پاس رہنے آ رہی تھیں۔ ڈی جے اور اس کی ہوسٹ فیملی، پہلا کھانا۔ پلاؤ اور مسور کی دال کا چوربہ۔ بعض لوگوں کا نام بھی کسی کتاب کے سرورق کی طرح ہوتا ہے، سنتے ہی یادوں کا ایک بے کراں سمندر ہر سو اُمڈ آتا ہے۔
صبیحہ آنٹی کو اپنا مسئلہ سمجھا کر، کہ ایک دوست کے لیے اسے ہاسپٹل جانا ہے اور بہارے ادھر نہیں رہ سکتی، اس نے بہارے کو علیحدہ لے جا کر چند ایک ہدایات مزید کیں۔
"تم اچھی لڑکی بن کر رہو گی نا؟"
بہارے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ البتہ وہ خوش نہیں لگ رہی تھی۔ "تم مجھے روز چھوڑ کر چلی جایا کرو گی کیا؟ سب مجھے ایسے ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔"
اس کا پہلے سے دکھی دل مزید دکھ گیا۔ ایک دم سے اسے اس پھول سی بچی پہ بے پناہ ترس آیا۔ پاشا بے کے اعمال نے اس کی فیملی کو کسی فٹ بال کی طرح بنا دیا تھا۔ عائشے اپنی بہن کے لیے بہت پریشان تھی، مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔
"میں شام میں آ جاؤں گی، اور تمہیں ایک فون بھی لا دوں گی، اس سے تم جب چاہے مجھ سے اور عائشے سے بات کر لینا۔"
"ٹھیک ہے۔" چھوٹی بلی مسکرا دی۔ اسے یک گونہ طمانیت کا احساس ہوا۔
صبیحہ آنٹی کے گھر سے وہ ہاسپٹل آ گئی۔ یہ ایک پرائیویٹ نیورو سنٹر تھا اور وہ ایڈمٹ ہو چکا تھا۔ اس نے لباس بھی تبدیل کر لیا تھا، اور بس سرجری کا منتظر تھا۔ ابھی اسے اوٹی میں لے کر جانے میں ذرا وقت تھا، سو آپریشن سے قبل وہ آخری دفعہ اسے دیکھنے آئی تھی۔
وہ خاموش تھا۔ چہرہ بے تاثر، مگر زرد۔ اوٹی کے لباس میں تو وہ اور بھی زیادہ پژمردہ لگ رہا تھا۔
"کیسے ہو؟" اس کے سامنے کھڑے، وہ بس اتنا ہی پوچھ سکی۔ جہان نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بیڈ کے کنارے پہ بیٹھا تھا۔
"ٹھیک ہوں۔"
چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے، پھر وہ بولی۔
"تم نے آخری دفعہ سچ کب بولا تھا؟"
"ابھی ایک منٹ قبل جب میں نے کہا میں ٹھیک ہوں۔"
اس کی باتیں بھی اسی کی طرح ہوتی تھیں۔ پہیلی در پہیلی۔
"میرا بیگ رکھ لو۔ اس میں میرا فون بھی ہے۔" اس نے اپنا چمڑے کا دستی بیگ سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر حیا کی طرف بڑھایا جسے حیا نے تھام لیا۔
"اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرا فون کھولنا۔ ویسے وہ فنگر پرنٹ سے کھلتا ہے مگر تمہارے لیے میں نے تمہاری ڈیٹ آف برتھ متبادل پاس ورڈ کے طور پہ لگا دی ہے۔
پورے آٹھ ہندسے، اوکے؟ تم فون بک میں پہلے نمبر کو کال کر کے سب بتا دینا۔" اس کے ہاتھوں میں پکڑا بیگ یکدم بہت بھاری ہو گیا۔
"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"
جہان نے جواب نہیں دیا۔ پھر زیادہ مہلت ملی بھی نہیں۔ وہ اسے لے گئے، اور وہ "عملیات خانے" (آپریشن تھیٹر کا ترک نام) کے باہر ایک کرسی پہ آ بیٹھی۔
وہ کہہ رہا تھا، اگر مجھے کچھ ہو جائے۔ اور وہ سوچ رہی تھی، اگر اسے کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گی؟ زندگی میں بعض "اگر" کتنے خوفناک

ہوتے ہیں نا۔ان کو آدھا سوچ کر بھی دم گھٹنے لگتا ہے۔

وہ بس جہان کا بیگ گود میں رکھے،اسے کسی واحد سہارے کی طرح مضبوطی سے تھامے،کرسی پہ بیٹھی سامنے شیشے کے بند دروازوں کو دیکھے گئی۔

وہ کیسی عجیب سی کیفیت ہوتی ہے کہ جب دعا نہیں مانگی جاتی۔دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو دیکھ کر انہی ہاتھوں سے کیے جانے والے گناہ یاد آ جاتے ہیں۔تب لگتا ہے کہ معافی ابھی تک نہیں ملی۔کیا واقعی سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟ ہمیں کیوں لگتا ہے کہ ہم گناہوں سے توبہ کریں گے اور پھر انہیں بھلا کر سب ٹھیک ہو جائے گا؟ گناہ ایسے نہیں پیچھا چھوڑتے۔ان کے آثار ہمیشہ ان جگہوں پہ موجود رہتے ہیں۔گناہ تو ساری عمر پیچھا کرتے ہیں۔کیا ان سے کوئی رہائی تھی؟ کیا ان کی ملکیت سے کوئی آزادی تھی؟ ایسا کیوں نہ ہو سکا کہ وہ عائشے گل کی طرح ہوتی؟ ہمیشہ سے سچی،ہمیشہ سے باحیا اور نیک۔

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔اور پھر انہیں گرا دیا۔کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا مانگے۔یہ گرہ کہاں لگی تھی؟ دعا کب روٹھی تھی؟ شاید ڈی جے کے وقت۔ہاں تب بھی وہ ایسے ہی ایک ہسپتال کے عملیات خانے کے باہر بیٹھی تھی۔وہ گرہ اب کیسے کھلے گی؟

فون کی گھنٹی بجی تو وہ ذرا چونکی۔پھر موبائل دیکھا۔ابا کالنگ۔

"السلام علیکم ابا۔" اس نے فون کان سے لگایا تو اپنی آواز بے حد پست اور بھاری لگی۔

"وعلیکم السلام۔کیا حال ہے،اور کدھر ہو؟"

پھر وہ رسمی علیک سلیک،حال احوال اور تمہید کے بعد پوچھنے لگے

"تم واپس کب آ رہی ہو؟"

فون کان سے لگائے،اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے بہت سے آنسو اپنے اندر اتارے،پھر آنکھیں کھولیں۔سامنے کا منظر ڈبڈبا گیا تھا۔

"ابا مجھے ایک ہفتہ مزید لگ جائے گا۔"

"حیا!" ابا کو جیسے اکتاہٹ ہوئی۔"اتنے دن ہو چکے ہیں،کیا ابھی تک تمہارا ٹور ختم نہیں ہوا۔"

"آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ......کہ لندن جانے کی بجائے ترکی میں جتنا چاہے وقت گزار لوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے مگر تمہاری اماں روحیل کا ولیمہ کرنا چاہتی ہیں،سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔اور ہاں،جہان کا کیا پروگرام ہے،کیا وہ تمہیں ملا؟" حیا نے ایک نظر آپریشن ایریا کے بند شیشے کے دروازوں کو دیکھا۔

"جی،وہ یہیں ہے۔وہ......وہ بھی ساتھ ہی آئے گا۔" اس کی آواز میں خود بھی اتنی بے یقینی تھی کہ ابا نے جیسے دوسری طرف استہزائیہ سر جھٹک دیا۔

"مجھے پتا ہے وہ تمہیں نہیں ملا ہو گا۔خیر،اس کو چھوڑو،تم جلد آنے کی کوشش کرو۔"

وہ کتنے پُر یقین تھے کہ جہان ان کی بیٹی سے قطع تعلق کرنا چاہتا ہے۔حالانکہ وہ تھے تو سبھی ان دونوں کی منگنی پہ۔مگر نہیں۔لوگ اپنی آنکھوں کی بجائے اپنے کانوں پہ یقین کرنے کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔

"ابا میں جلد نہیں آ سکتی۔ایک......ایک دوست ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے،اس کی انٹرا کرینئل سرجری ہے،میں اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتی ابا۔" آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے لڑھک کر نقاب کے اندر جذب ہونے لگے تھے۔ابا چند لمحے کو بالکل خاموش ہو گئے۔

"اس کا یہاں کوئی نہیں ہے ابا۔اس کی ماں،رشتے دار،فیملی،یہاں اس کا کوئی نہیں ہے ابا۔میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔اس نے ان پانچ ماہ میں استنبول میں میرا بہت خیال رکھا ہے،ہر موقع پہ اس نے میرا ساتھ دیا ہے،اب کیا میں اسے آپریشن تھیٹر میں چھوڑ کر آ جاؤں؟"

"اوہ آئی سی!" وہ ذرا دھیمے پڑے۔"کیا وہ لڑکی......بالے نور......کیا اس کا آپریشن ہے؟"

وہ ذرا چونکی۔"آپ بالے کو کیسے......؟" ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے بھیگی آنکھیں صاف کیں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے،جب تم کچن میں کھڑی ہو کر نور بانو کو ترکی نامہ سنا رہی ہوتی تھی تو سارا گھر برداشت سے سننے کے علاوہ اور کیا کر رہا ہوتا تھا؟"

"اوہ اچھا۔" ہالے کا نام تو وہ بہت لیتی تھی، ابا اس سے واقف تھے۔ پھر بھی اس نے تردید یا تصدیق نہیں کی۔ جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی اور سچ کہنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

"ابا جب تک وہ stable نہ ہو جائے، میں ادھر ہی رہوں گی۔ روحیل کو اتنی جلدی ہے تو کر لے میرے بغیر اپنا ولیمہ۔"

"اچھا ٹھیک ہے، مگر جیسے ہی وہ ٹھیک ہو، تم واپس آ جانا۔"

چند مزید نصیحتیں کر کے انہوں نے فون بند کر دیا۔ حیا چند لمحے فون کو دیکھتی رہی، پھر پھپھو کا نمبر ملایا۔

"ہیلو؟" پھپھو نے تیسری بیل پہ فون اٹھا لیا تھا۔

اس نے کچھ کہنا چاہا، مگر کہہ نہ سکی۔ حلق میں کچھ پھنس سا گیا تھا۔ آنسو بار بار ابل رہے تھے۔

"ہیلو؟ حیا؟" پھپھو اس کا نمبر پہچاننے کے باعث اسے پکار رہی تھیں مگر اس کے سارے الفاظ مر گئے تھے۔ وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ ان کا بیٹا کہاں ہے، کیسا ہے، وہ اس کے لیے دعا کریں، مگر...... کچھ کہا ہی نہیں گیا۔

"ہیلو؟"

اس نے کال کاٹ دی اور پھر فون بند کر دیا۔ جہان نے کسی کو بھی بتانے سے منع کیا تھا، اور وہ اس کا اعتبار نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ عجیب بے بسی سی بے بسی تھی۔

سیکنڈ، منٹ، گھنٹے...... وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس نے ذہن پہ زور دینے کی سعی کی کہ جب کسی کا آپریشن ہو تو کیا پڑھنا چاہیے؟ صائمہ تائی کہتی تھیں کہ پہلے کلمے کو "سوا لاکھ" دفعہ پڑھنا چاہیے۔ جب بھی کوئی بیمار ہوتا یا کسی کزن کا انٹری ٹیسٹ یا ایڈمیشن کا مسئلہ ہوتا، تائی کے لاؤنج میں وہی ایک ماحول سج جاتا۔ چاندنیاں بچھا کر، کھجور کی گٹھلیوں کے ڈھیر لگا دیے۔ اب سوا لاکھ دفعہ یہ یا یہ پڑھنا ہے۔ پھر ساری کزنز کو زبردستی بٹھا دیا جاتا۔ ثناء تو پڑھتی ایک دفعہ اور گٹھلیاں تین گرایا کرتی تھی۔ پھر بھی وہ مرحلہ ختم نہ ہوتا۔ ان کزنز نے تو آپس میں مذاق بھی بنا لیا تھا، کہ جب پڑھی ہوئی گٹھلیوں کو الگ کرنے کا معاملہ ہوتا تو ارم کہتی۔ "یہ ہیں بھئی پڑھی ہوئی گٹھلیاں، اور یہ ہیں ان پڑھ گٹھلیاں۔"

جب تک وہ لوگ اس بابرکت کلام سے بے زار نہ ہو چکے ہوتے، تب تک سوا لاکھ ختم نہ ہوتا۔ تب کی بات بھلے اور تھی، مگر اب بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں ہم اللہ تعالیٰ کو گن گن کر کیوں یاد کرتے ہیں؟ اور اگر جو اس نے بھی گن گن کر دینا شروع کر دیا؟ پتا نہیں ہم اپنی خود ساختہ گنتی سے "ذکر" کو "منتر" کیوں بنا دیتے ہیں؟

ہسپتال کا وہ کاریڈور اب سرد پڑتا جا رہا تھا۔ جولائی کی شام بھی بہت ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچنا چاہا کہ وہ "ذکر" میں کیا پڑھے؟ بغیر حساب رکھے، بغیر گنے، توجہ اور یکسوئی سے کیا مانگے؟ مگر وہ گرہ کھلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ڈی جے کے بعد اس نے دعا مانگنی چھوڑ دی تھی، اور پردے کے بعد شکوہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر ابھی وہ شکوہ کرنا چاہتی تھی۔ جیسے یعقوب علیہ السلام نے کیا تھا۔

اس نے کرسی کی پشت پہ دیوار سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ بس یہی ایک شکوہ تھا جس پہ لب مہر بند نہیں رہے تھے۔

"میں اپنے دکھ اور اپنے ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔"

دھات کی کرسی جیسے مقناطیس بن گئی تھی اور چاندی کے مجسمے کا قطرہ قطرہ اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔

"میں اپنے دکھ اور اپنے ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔"

کرسی نے اس کی ساری چاندی نچوڑ لی تھی۔ لوہے کا ایک خول باقی رہ گیا تھا جسے مقناطیسی نشست نے خود سے جوڑ لیا تھا۔

"میں اپنے دکھ اور اپنے ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔"

اس کے قدموں میں جیسے بیڑیاں ڈل گئی تھیں۔ وہ چاہ کر بھی نہ حرکت کر سکتی تھی، نہ ہی سانس لے سکتی تھی۔ ہر طرف جیسے اندھیرا تھا۔ اس ایک شخص کو کھو دینے کا صرف احساس بھی اس تاریک سرنگ کی طرح تھا جس کا کوئی اختتام نہ تھا۔ اس کی ساری چاندنی اس اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔

"میں اپنے دکھ اور اپنے ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔"

پانچ، ساڑھے پانچ گھنٹے گزر رہے تھے، اور تب ہی شیشے کا وہ دروازہ کھلا۔ اس نے سرجن ڈاکٹر کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ اس کے لوہے کے خول کو کرسی کے مقناطیس نے یوں چپکا رکھا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود بھی اٹھ نہ سکی۔

"کیا ہوا ڈاکٹر؟" اس نے خود کو کہتے سنا۔

"سرجری پیچیدہ تھی، مگر کیل بہت اندر تک نہیں گیا تھا، ہم نے اسے نکال لیا ہے" ڈاکٹر اس کو بتانے لگے تھے۔ اس کی کھوپڑی کا جو حصہ ڈیمج ہوا تھا اسے Titaniom mesh کے ساتھ ری پلیس کر دیا گیا ہے، اور....."

"وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟" اس نے بے قراری سے ان کی بات کاٹی۔ وہ بھی جانے کون سی زبان بولے جا رہے تھے۔

"ہاں، آف کورس وہ ٹھیک ہے۔ سرجری کامیاب رہی ہے۔ جیسے ہی انستھیزیا اترے گا، اور وہ stable ہو جائے گا، تو آپ اس سے مل سکیں گی"۔

زندگی میں بعض خبریں انسان کو کیسے ملتی ہیں؟ شاید جیسے اوپر سے بہتی کوئی آبشار ہو جس کا دھارا اسے بھگو دے۔ یا پھر جیسے آسمان سے سونے کے پتنگے گر رہے ہوں۔ یا جیسے لہلہاتے سبزہ زار کے ساتھ کسی چشمے کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھنا ہو۔

مرہم۔ ٹھنڈک۔ سکون۔

"شکریہ...... بہت شکریہ!" اس کی آنکھیں اور آواز، دونوں بھیگ گئیں۔ نقاب کے اوپر سے اس نے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر جیسے اپنے جذبات کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگ سکون پانے پہ نڈھال سے ہو کر بیٹھ جایا کرتے ہیں، مگر وہ اس کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مقناطیس غائب ہو گیا تھا اور چاندی کا مجسمہ پھر سے چمکنے لگا تھا۔

"اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔" زندگی میں کسی کو اس کے منہ پہ اتنے دل سے اس نے شاید پہلی دفعہ دعا دی تھی۔

وہ ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دے کر آگے بڑھ گئے۔

جس شیشے کے دروازے سے وہ آئے تھے، اس کے پار عملے کے دو افراد ایک اسٹریچر دھکیلتے لے جا رہے تھے۔ وہ دوڑ کر دروازے تک آئی، اور چہرہ شیشے کے دروازے کے قریب لے جا کر دیکھا۔

وہ جہان ہی تھا۔ لیٹے ہوئے اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی تھی، یوں کہ چہرہ حیا کے سامنے تھا۔ بند آنکھیں۔ نیچے گہرے حلقے۔ سر پٹیوں میں جکڑا۔ ایک پٹی آنکھ کے قریب سے گزرتی تھی۔ بے ہوش۔ بے خبر۔ اسٹریچر آگے بڑھ گیا۔ وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

دونوں کے درمیان اس دفعہ بھی شیشے کی دیوار تھی، ایسی ہی جیسی بہت پہلے ان کے درمیان رہی تھی۔ تب وہ دھندلی تھی۔ آر پار کا منظر مبہم تھا، لیکن اب وہ صاف تھی۔ تب واضح تھا۔ مگر دیوار تو دیوار ہوتی ہے، اور ہاتھ زخمی کیے بغیر اس دیوار کو ہٹانا ممکن بھی تو نہ تھا۔

بہت تھکی تھکی سی وہ واپس کرسی پہ آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹھیک سے دعا نہیں کی تھی مگر اب وہ ٹھیک سے شکر تو کر سکتی تھی نا۔

☆ ☆ ☆

سلطنت ترکیہ کے دارالحکومت انقرہ پہ شام کا نیلگوں، سرمئی پن چھا رہا تھا۔ اس کے پرائیویٹ روم تک آنے سے قبل، وہ اپنے ہوٹل کے قریب ایک فلورسٹ سے سفید گلابوں کا ایک بڑا سا بوکے لے آئی تھی، اور اب اس کے کمرے میں کھڑی، ایک کارنر ٹیبل پہ رکھے گلدان میں وہ پھول سیٹ کر رہی تھی۔

سفید گلاب جب کانچ کے گلدان میں جلوہ گر ہو چکے، تو اس نے چہرہ ان کے قریب کر کے، آنکھیں موندے، سانس اندر کو اتاری۔ تازہ، دلفریب مہک سارے وجود میں اندر تک گھل گئی۔

پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سو نہیں رہا تھا، بس گردن سے ذرا نیچے تک شیٹ ڈالے، آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ سر ویسے ہی پٹی میں جکڑا تھا اور اوپر سفید جالی دار سی ٹوپی تھی۔

"کیا تمہیں کچھ چاہیے؟" کہنے کے ساتھ حیا نے گلدستے سے ایک ادھ کھلی کلی علیحدہ کی۔

"اونہوں!" وہ بند آنکھوں سے زیر لب بڑبڑایا۔

"اوکے!" وہ کلی ہاتھ میں لیے اس لمبے سے کاؤچ پہ آ گئی جو بیڈ کی پائنتی کے قریب ہی، دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ عبایا اس نے نہیں اتارا تھا، بس نقاب نیچے کر لیا تھا۔

"ڈاکٹرز کہہ رہے تھے، تم بہت جلدی ریکور کر لو گے۔" چند لمحے گزرے تو اس نے گلاب کی ٹہنی کو انگلیوں سے گھماتے ہوئے بات کرنے کی ایک اور سعی کی۔

"پتا ہے مجھے۔" اس نے آنکھیں نہیں کھولیں، البتہ ماتھے پہ ایک اکتاہٹ بھری شکن کے ساتھ جواب دیا۔
وہ پروا کیے بغیر ہاتھ میں پکڑے سفید گلاب کو اسی طرح گھمائے گئی۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔
"تمہیں یاد ہے جب ہم پہلی دفعہ استنبول میں ملے تھے، تب تم نے پوچھا تھا کہ کون حیا۔" ذرا سا مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے جہان کو دیکھا جس نے اس بات پہ آنکھیں کھول کر ایک اچٹتی نظر اس پہ ڈالی تھی۔ "جیسے کہ تم جانتے ہی نہیں تھے کہ کون ہے حیا۔"
"تو تم نے آگے سے کیا کہا؟ پھپھو کی بھتیجی۔ یعنی پھپھو سے ملنے آئی ہو۔"
"ہاں تو انہی سے ہی ملنے آئی تھی نا۔" اسے ان باتوں کو دہرانے میں مزہ آنے لگا تھا۔
"بالکل، جیسے ابھی کپادو کیہ دیکھنے آئی ہو۔"
"سو تو ہے۔" اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔ "اور کوئی تھا جو تایا کے گھر جوتے اتار کر داخل ہو رہا تھا، اور ایپل ٹی کے علاوہ تو اسے کسی چائے سے واقفیت نہ تھی۔"
جہان نے آنکھیں واپس بند کر لیں۔ کاؤچ کے اس طرف شیشے کا ایک دروازہ تھا جو باہر کھلتا تھا۔ اس کے پار انقرہ کا موسم جیسے بہت کھلا کھلا لگ رہا تھا، یوں جیسے اس دفعہ بہار جولائی میں اتری ہو۔
"اور میرا چولہا ٹھیک کرتے وقت مجھے تم میرے الفاظ لوٹا رہے تھے، مگر مجھے کیا پتا تھا کہ کوئی میری میلز بھی پڑھتا ہے۔"
"اگر تم یہ سب کہہ کر مجھے شرمندہ کرنا چاہتی ہو تو وہ میں نہیں ہوں گا۔ سو بولتی رہو۔"
"اور کوئی کہتا تھا کہ وہ بہت غریب آدمی ہے۔" اس نے اثر لیے بنا اپنا مشغلہ جاری رکھا۔
"سو تو ہوں۔"
"اور جب تمہارے ڈرائیور نے "جہان سکندر" کا نام لیا تو کیا میں اس کے ساتھ نہ آتی؟" وہ اب پھول کو ٹہنی سے پکڑے، اس کی کلی کو اپنی تھوڑی پہ کر رہی تھی۔

"اس نے صرف نام لیا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ اسے جہان سکندر نے بھیجا ہے، تمہیں پوچھنا چاہیے تھا۔"
"اور مجھے نہیں پتا تھا کہ تم تایا فرقان سے اتنا ڈرتے ہو۔" موسم کی شادابی اس کے چہرے پہ بھی نظر آ رہی تھی۔ مسکراہٹ دبائے، وہ ساری باتیں دہرانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔
"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"
"ویسے پھپھو کہتی ہیں کہ جہان کی مت سنا کرو، وہ تو خوامخواہ کہتا رہتا ہے۔"
"ممی کی مت سنا کرو، وہ یونہی بولتی رہتی ہیں۔"
وہ ایک دم چونکی، پھر بے اختیار ہنس دی۔ جہان نے آنکھیں کھول کر، گردن ذرا اٹھا کر اسے تعجب سے دیکھا۔
"ہنسی کیوں؟"
"کچھ نہیں۔" حیا نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔ "اور یاد ہے کس طرح تم نے اور عائشے نے ظاہر کیا تھا کہ تم ایک دوسرے کو نہیں جانتے؟" گلاب کی پتیوں کو اپنے رخسار اور تھوڑی پہ محسوس کرتے ہوئے اس نے اس وقت کا حوالہ دیا جب عائشے اور وہ، جہان کے لیے بندرگاہ تک آئی تھیں۔
"غلط، ہم نے کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔ اگر تم پوچھتی تو ہم بتا دیتے۔"
"وہ بتا دیتی، مگر تم......"
"میرا ایک کام کرو گی؟" اس نے بات کاٹ کر بہت سنجیدگی سے حیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں، کہو۔" وہ بہت توجہ سے سنتی کاؤچ پہ ذرا آگے کو ہوئی۔ پہلے ایک دفعہ جہان نے اس سے چائے بنوائی تھی، وگرنہ وہ کوئی کام نہیں کہتا تھا۔
"مجھے فارمیسی سے تھوڑی سی کاٹن لا دو۔"
"شیور۔" وہ مستعدی سے اٹھی۔ اس کا کام کرنے کی خوشی بہت قیمتی تھی۔ دروازے تک پہنچ کر وہ کسی خیال کے تحت رکی اور پلٹ کر

جہان کو دیکھا، جو ابھی تک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"کس لیے چاہیئے کاٹن؟"

"کان میں ڈالنی ہے۔"

وہ جو پُرجوش سی باہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی، پہلے آنکھوں میں حیرت ابھری، پھر اچنبھا، اور پھر سمجھ آنے پہ ڈھیر ساری خفگی۔ لب خودبخود بھنچ گئے اور بیر پٹختی واپس کاؤچ پہ آ کر بیٹھی۔ پھر بازو سینے پہ لپیٹے، ٹیک لگائے، خاموش مگر ناراض نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"بہت شکریہ۔" اس نے گردن سیدھی کر کے آنکھیں پھر سے موند لیں۔ یہ آدمی بھی نا، ذرا دو چار دن مہذب بنا رہے تو شاید بیمار پڑ جائے، اس لیے اپنے اصل روپ میں بہت جلد واپس آ جاتا تھا۔

وہ اسی طرح خفا خفا سی بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

صبح بہارے کو صبیحہ خانم کے پاس چھوڑنے سے قبل اس نے ایک موبائل فون بمع سم کے خرید کر اسے ایکٹیویٹ کروا دیا تھا۔

"کیا میں تمہارے ساتھ ہاسپٹل نہیں جا سکتی؟" بہارے خفا ہوئی تھی۔ وہ دونوں ٹیکسی میں صبیحہ خانم کے گھر جا رہی تھیں۔

"تم نے کہا تھا تم اچھی لڑکی بنی رہو گی۔ اور میری ساری باتیں مانو گی۔"

"اوکے، میں کیا کہہ رہی ہوں۔" بہارے فوراً دھیمی پڑ گئی۔

"اچھا یہ فون اپنے بیگ میں رکھو، میں تمہیں اس پہ کال کر لوں گی، اور چاہو تو اس سے عائشے کو بھی کال کر لینا۔"

بہارے نے فون اس کے ہاتھ سے تھاما، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر "شکریہ" کہہ کر اپنے گلابی پرس میں ڈال دیا۔ چھوٹا سا پرس تھا مگر اس میں دنیا جہان کی چیزیں وہ لیے گھومتی تھی۔ کنگھی، مانگو، یا قینچی، اس کے پرس میں سے سب نکل آتا تھا۔

بہارے کو صبیحہ خانم کے گھر چھوڑ کر وہ دوبارہ ٹیکسی میں آ بیٹھی (جسے وہ انتظار کرنے کا کہہ گئی تھی)۔ آج مسز عبداللہ وغیرہ نے بھی آ جانا تھا سو بہارے کو کمپنی رہے گی۔

وہ ہاسپٹل کے راستے میں تھی جب فون بجنے لگا۔ وہ جو کھڑکی سے باہر انقرہ کی بھاگتی عمارتیں دیکھ رہی تھی، چونک کر فون کی طرف متوجہ ہوئی۔ اماں کالنگ۔

"حیا..... واپسی کا کیا پروگرام ہے؟" چھوٹتے ہی انہوں نے استفسار کیا تھا۔

ایک تو اس کے گھر والوں کو بھی اس کی واپسی کی بہت فکر تھی۔ سکون سے نہیں رہنے دینا انہوں نے۔

"بس ایک ہفتہ مزید لگے گا۔"

"اب آ بھی جاؤ۔ روحیل کا....."

"اماں یہ وہی نتاشا نہیں ہے، جس کی وجہ سے ہمارے گھر میں طوفان آ گیا تھا؟ اب وہ اتنی امپورٹنٹ کیوں ہو گئی ہے کہ اسے ساری دنیا سے ملوانے کی آپ لوگوں کو بہت جلدی ہو رہی ہے؟" اسے ابھی تک ابا اور اماں کا نتاشہ کو قبول کرنا ہضم نہیں ہوا تھا۔

"اسی لیے تو چاہتے ہیں کہ جو لوگ باتیں بنا رہے ہیں، ان کے منہ اس طرح بند ہو جائیں۔"

وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ پھپھو ٹھیک کہتی تھیں۔ وہ بیٹے ہوتے ہیں جن کے بارے میں باتیں بنانے والوں کے منہ بند کرنے کے لیے جتن کیے جاتے ہیں۔ بیٹیوں کو تو اپنے لیے ساری جنگیں خود ہی لڑنی پڑتی ہیں۔

فون بند کر کے اس نے روحیل کو کال ملائی۔ ٹیکسی ابھی ابھی سگنل پہ رکی تھی۔

"ہیلو جامعہ حفصہ، کیسی ہو؟" وہ دوسری جانب بہت ہی خوشگوار موڈ میں بولا تھا۔

"میری بات سنو اور کان کھول کر سنو۔" وہ جواب میں اتنے غصے سے بولی تھی کہ ادھیڑ عمر ٹیکسی ڈرائیور نے بے اختیار بیک ویو مرر میں اسے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ چونکا۔

"تمہیں اگر اپنے ولیمے کی اتنی جلدی ہو رہی ہے نا تو کر لو میرے بغیر۔ بلکہ میری طرف سے آج ہی کر لو۔ مگر اماں، ابا سے کہو، مجھے بار

بار واپس بلانا چھوڑ دیں۔ اگر تم میرا صبر سے انتظار نہیں کر سکتے تو نہ کرو۔"

"اچھا، اچھا۔ کیا ہو گیا ہے یار! ریلیکس! میں تمہارے آنے تک کچھ نہیں کرنے لگا۔"

"بہت شکریہ۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔" وہ اسے پکارتا رہ گیا، مگر اس نے کال کاٹ دی۔ حد ہے بھئی۔

وہ ہاسپٹل سے ذرا فاصلے پہ اتری تھی۔ پوری اسٹریٹ عبور کر کے آگے ہاسپٹل تھا۔ وہ ارادتاً دکانوں کی شیشے کی دیواروں کو دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی تا کہ اگر کچھ خریدنا ہو تو یاد آ جائے۔ ابھی وہ اسٹریٹ کے درمیان میں ہی تھی کہ ایک دم سے رکی۔

وہ ایک گفٹ شاپ تھی جس کے شیشے کے پار اسے کچھ دکھائی دیا تھا۔ وہ تیزی سے اس شاپ تک آئی، اور گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی اس نے نگاہ اس شے سے نہیں ہٹائی تھی، مبادا کہ وہ اسے کھو نہ دے۔

اندر دروازے کے دائیں جانب ہی وہ چھت پہ نصب ایک ہک سے لٹکا تھا۔ ایک بہت خوبصورت ساؤنڈ چائم۔

وہ گردن پوری اٹھائے، ونڈ چائم کے اطراف میں گھوم کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ایک فٹ لمبا تھا۔ اوپر ایک سلور گول پلیٹ تھی جس سے لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ پانچ لڑیاں تو دراصل لکڑی کی ڈنڈیاں تھیں جن کو سلور پالش کیا گیا تھا۔ باقی کی پانچ لڑیاں کرسٹل کی بنی تھیں۔ جیسے ایک دھاگے میں پنکھڑیاں پرو دی گئی ہوں۔ گلاب کی پنکھڑیاں، چاندی کی سی چمکتی، بے رنگ، کرسٹل کی روز پیٹلز۔ ہر دو پنکھڑیوں کی لڑیوں کے بیچ ایک سلور اسٹک لٹک رہی تھی۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر ہولے سے نازک کانچ کی لڑی کو چھوا۔ وہ اسٹک سے ٹکرائی، اور لکڑی اور کانچ کی کوئی عجیب سی دھن بج اٹھی۔ موسیقی کی کسی بھی قسم سے مختلف، وہ کوئی انوکھی سی آواز تھی۔ اس کے لمس سے لڑیاں جو گول گول دائرے میں گھومنے لگی تھیں، اب آہستہ آہستہ ٹھہرنے کے قریب آ رہی تھیں، اور تبھی اس نے دیکھا۔ اوپر کی سلور پلیٹ پہ انگریزی میں لکھا تھا۔

"Must every house be built upon love? What about loyalty and appreciation?"

(Omer Bin Khitab)

اس نے زیرِ لب اُن الفاظ کو پڑھا۔ اُسے وہ واقعہ یاد تھا۔ ایک شخص اپنی بیوی کو صرف اس وجہ سے چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اس کے جواب میں یہ الفاظ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمائے تھے، کہ "کیا ضروری ہے کہ ہر گھر کی بنیاد محبت پہ ہی ہو؟ تو پھر وفاداری اور قدر دانی کا کیا؟"

(البیان والتابعین 2/101۔ فرائض الکلام صفحہ 113)

"مجھے یہ چاہیئے۔ اس نے ایک دم جذبات سے مخمور ہو کر بہت زور سے سیلز گرل کو مخاطب کیا، پھر احساس ہوا کہ شاپ میں اکیلی ہی تو ہے، سوا تنا اونچا بولنے کی کیا ضرورت ہے۔

"مجھے یہ پیک کر دیں۔" سیلز گرل مسکرا کر اس کی طرف آ رہی تھی، اب کہ اس نے ذرا دھیمے انداز میں اپنی بات دہرائی۔ (ڈی جے ہوتی تو کہتی، ہیں ہم وہی، پاکستان کے پینڈو۔)

پورے دس منٹ بعد جب وہ ہاسپٹل کے اس پرائیویٹ روم میں داخل ہوئی تو ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ میں وہ ونڈ چائم نفاست سے پیک کر کے رکھا تھا۔

"السلام علیکم!" عادتاً اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے سلام کیا، مگر اگلے الفاظ لبوں میں رہ گئے۔

جہان کمرے میں نہیں تھا۔ اس کا بستر خالی تھا۔

اس نے سب سے پہلے باتھ روم کے دروازے کو دیکھا جو ذرا سا کھلا تھا۔

"جہان؟" پرس اور شاپر میز پہ رکھتے اس نے ذرا فکرمندی سے پکارا۔ جواب ندارد۔ اس نے باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا، پھر دھکیلا۔ بتی بجھی تھی۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔

"کدھر چلا گیا؟" وہ متعجب سی کاؤچ پہ آ بیٹھی۔ شاید ڈاکٹرز کسی ضروری چیک اپ یا ٹیسٹ وغیرہ کے لیے لے کر گئے ہوں۔ یہ سوچ کر ذرا تسلی ہوئی۔ کچھ دیر وہ یونہی بیٹھی رہی، پھر ونڈ چائم پیکنگ سے نکالا، اور سنگل دروازے تک آئی جو باہر کھلتا تھا۔ اس کے عین اوپر دیوار پہ ایک

پینٹنگ آویزاں تھی۔ حیا نے وہ پینٹنگ اتاری، میز پہ رکھی، اور ونڈ چائم کی رنگ اس کیل میں ڈال دی۔ ونڈ چائم کی چین دروازے کے سر تک ختم ہوتی تھی، اور وہاں سے سلور پلیٹ اور لڑیاں لٹکتی تھیں۔

اس نے مسکرا کر پیچھے جا کر اپنے تحفے کو دیکھا جسے وہ صرف جہان کے لیے لائی تھی۔ اچھا لگ رہا تھا۔ ارتعاش کے باعث ذرا سا حرکت میں، گول گول گھومتا۔ دروازہ چونکہ سلائیڈنگ والا تھا، سو اس کھلنے کی صورت میں ونڈ چائم سے ٹکرانے کا خدشہ نہ تھا۔

فون کی گھنٹی بجی تو اس نے پرس سے موبائل نکالا۔ اسلام آباد پنڈی کے کوڈ کا لینڈ لائن نمبر تھا اللہ، اللہ، آج تو ردجیل قتل ہو جائے گا اس کے ہاتھوں۔

''ہیلو؟'' اس نے فون کان سے لگایا اور بہت سے سخت جملے تیار کیے ہی تھے کہ......

''جی میڈم ایم ڈی، کیسی ہیں آپ؟'' اس لہجے کو وہ کیسے بھول سکتی تھی؟ اس نے کھڑے کھڑے بے اختیار بیڈ کی پائنتی کے اسٹینڈ کو تھاما۔

''کون بول رہا ہے؟'' بظاہر لہجے کو مضبوط اور بے پرواہ رکھے، اس نے سوال کیا۔ اسے کیسے ملا اس کا ترکی کا نمبر؟ وہ کوئی میجر احمد تو نہیں تھا کہ......

''آپ ہر دفعہ مجھے پہچان جاتی ہیں، اس دفعہ بھی پہچان لیا ہوگا۔ خیر، آپ کی تسلی کے لیے، ولید بات کر رہا ہوں۔''

''آپ ابھی تک گرفتار نہیں ہوئے؟ حیرت ہے!'' وہ نڈھال سی جہان کے بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھی۔ بلیک میلر...... یہ خیال ہی ساری توانائی نچوڑ گیا تھا۔

''حیرت نہ کریں، شکر کریں۔ جب تک میں باہر ہوں آپ عزت سے ہیں۔ جس دن میں نے......''

''عزت دینے اور عزت چھیننے والا اللہ ہوتا ہے، جب تک وہ میرے ساتھ ہے، مجھے آپ کی پرواہ نہیں ہے۔'' دبے دبے غصے سے وہ بولی تھی۔ ''اور آپ کو کیا لگتا ہے، آپ کوئی بھی موویِ اٹھا کر، اس پہ میرا نام لگا کر پیش کر دیں گے تو ساری دنیا یقین کر لے گی؟ ان فیکٹ، آپ جو کرنا چاہتے ہیں، کر لیں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔''

''میں آپ کو آخری موقع دے رہا ہوں، آپ لوگ میرے خلاف کیس واپس لے لیں۔ اور جو پٹیاں آپ نے سلیمان انکل کو میرے بارے میں پڑھائی ہیں نا، جس میں مجھے اور ہیڈ آرکیٹکٹ کو آپ انوالو کر رہی ہیں، اس معاملے کو بھی یہیں ختم کر دیں ورنہ میں بُرا پیش آؤں گا۔''

وہ ایک ایک لفظ چبا کر کہہ رہا تھا۔

(تو ابا نے اس معاملے پہ بھی اس کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا تھا؟)

''مثلاً کیا کر لیں گے آپ؟'' اس نے پھر سے اپنے لہجے کو مضبوط بنانے کی سعی کی مگر دل کی لرزش نے ذرا سا زبان کو چھوا تھا۔ الفاظ لڑکھڑا گئے تھے۔

''میں کیا نہیں کر سکتا اس ویڈیو کے ساتھ؟ میں جانتا ہوں آپ کتنی خوفزدہ ہیں اس سے سو میں اس کی سی ڈی بنوا کر اسے آپ کے گھر کے سارے مردوں میں تقسیم کر سکتا ہوں، وہ شاید آپ کو کچھ بھی نہ کہیں، مگر وہ دل سے آپ کی عزت کبھی نہیں کر سکیں گے، آپ رسوا ہو کر رہ جائیں گی۔''

''جہنم میں جاؤ۔'' اس نے پھٹ پڑنے والے انداز میں کہا، اور فون بند کر دیا۔ تبھی کانچ، اسٹیل اور لکڑی کے باہم ٹکرانے کی آواز آئی۔ فضا میں ایک مدھر سا ارتعاش ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹی۔

جہان بالکونی کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کا سر شاید ونڈ چائم کو چھوا تھا۔ ایک نظر حیا پہ ڈال کر وہ مڑا، گلاس سلائیڈ بند کی، اور پھر پلٹ کر بیڈ تک آیا۔

''تم...... کہاں تھے؟'' اس نے بمشکل خود کو کمپوز کیا۔ کہیں اس نے کچھ سنا تو نہیں؟

''ایک کال کرنے گیا تھا، سوچا ذرا اوپن ایئر میں کر لوں۔'' موبائل بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے اس نے ایک نظر پھر حیا کو دیکھا۔ گہری، اندر تک اترتی نظر، اور پھر خاموشی سے بستر پہ لیٹنے لگا۔

''تمہیں یوں نہیں جانا چاہیے تھا، سسٹر کو پتا چلا تو بُرا منائے گی، ابھی تم ٹھیک نہیں ہو۔''

''تم بتاؤ، تم ٹھیک ہو؟'' وہ اب تکیے کے سہارے لیٹے لیٹے، بہت غور سے حیا کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ بس ایک پل لگا اسے فیصلہ کرنے

میں۔ وہ بیمار تھا، پھر اس کے دوسرے مسائل بھی تو تھے، کیا اب اسے ایک نیا ایشو کھڑا کر کے اس کو مزید بوجھل کرنا چاہیے؟ کیا وہ اتنی خود غرض تھی؟

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ اور یہ تمہارے لیے لائی تھی۔" اس نے زبردستی مسکرانے کی سعی کرتے ہوئے ونڈ چائم کی طرف اشارہ کیا جو جہان سے ٹکرانے کے باعث ابھی تک گول گول گھوم رہا تھا۔

"شکریہ۔" اس نے کرسٹل کے اس خوبصورت تحفے کو دیکھا تک نہیں، بس اس طرح حیا کو کھوجتی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ وہ ابھی تک بیڈ کی پائنتی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اضطراری انداز میں انگلیاں مروڑتی، ذرا بے چین اور مضطرب سی۔

"کیا گھر سے فون تھا؟" اس نے جیسے بہت سوچ سمجھ کر سوال پوچھا۔ حیا کا دل زور سے دھڑکا۔

(اس نے کمرے کے باہر سے کچھ تو لازمی سنا تھا ایڈیٹ نہ ہو تو۔)

"نہیں، ولید لغاری تھا۔" اس نے سچ بول دیا۔

وہ ذرا سا چونکا۔

"وہی؟" ابرو اٹھا کر یک لفظی استفسار کیا۔ حیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم نے کہا تھا کہ آفس جایا کرو، سو میں نے آفس جا کر اس کی کچھ بدعنوانیاں پکڑیں، اور ابا کو بتا دیا۔ وہ اسی پہ مجھے دھمکانے کے لیے بار بار کالز کر رہا ہے۔"

لاپرواہی سے کہتے ہوئے اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

جہان کے چہرے پہ ناگواری ابھری، مگر جیسے ضبط کر گیا۔

"ابھی یہی کہہ رہا تھا؟"

"ہاں مگر میں اس کی زیادہ دیر نہیں سنتی۔ دو چار سنا کر فون رکھ دیتی ہوں۔ ابھی بھی پی ٹی سی ایل سے کیا تھا تو میں نے اٹھا لیا، ورنہ موبائل کے غیر شناسا نمبر تو اب میں اٹھاتی ہی نہیں ہوں۔"

"کیا اس نے تمہیں کبھی موبائل سے فون نہیں کیا؟"

اب کی بار وہ چونکی۔ کچھ تھا جہان کی آواز میں، کچھ ایسا جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔

"اگر تمہیں مجھ پہ شک ہے تو میرا فون چیک کر لو۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے، میں اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ میں نے شاید اس کا موبائل نمبر دیکھا تھا تمہارے فون میں، لیکن اگر مجھے تم پہ شک ہوتا تو اسی وقت کہتا۔"

"اس کا موبائل نمبر؟ کدھر؟" اس نے حیرت سے دہراتے ہوئے اپنا فون اس کی جانب بڑھایا۔ جہان نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے فون تھاما، چند ایک بٹن دبائے، اور پھر اسکرین حیا کے سامنے کی۔ وہاں کال لاگ کھلا پڑا تھا۔ پچھلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی۔

"کیا؟" وہ ناسمجھی سے اسکرین کو دیکھنے لگی۔ وہاں کوئی غیر شناسا سا نمبر تھا جس پہ کال ٹائم آدھے گھنٹے سے ذرا اوپر کا تھا۔

"یہ کس کو......" وہ تعجب سے بڑبڑائی، ایک دم چونکی۔ "یہ تو ارم نے کال کی تھی...... یہ کس کا نمبر ہے؟" اس نے فون ہاتھ میں لے کر قریب سے لاگ کو پڑھا۔

جہان بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"حیا، یہ ولید کا نمبر ہے!"

لمحے بھر کو حیا کا تنفس بالکل تھم سا گیا۔ وہ سانس روکے، حق دق سی جہان کو دیکھنے لگی۔ تو وہ ولید تھا جس کے ساتھ ارم......؟

"ارم اور ولید...... اوہ گاڈ...... مگر تمہیں کیسے...... کیسے پتا کہ یہ ولید کا نمبر ہے؟"

جہان سے ایسے سوال پوچھنا بے کار تھا، پھر بھی وہ پوچھ بیٹھی۔ اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

"جب سلیمان ماموں ہسپتال میں تھے تو ان کے فون پہ اس کی کال آئی تھی، میں نے تب اسکرین پہ آیا نمبر اور نام دیکھا تھا۔ مجھے نمبرز کبھی نہیں بھولتے۔ یہ اسی کا نمبر ہے، اب تم بتاؤ کہ ارم کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟" "ایک دفعہ پہلے بھی وہ تمہارا فون لے کر گئی تھی، مجھے یاد ہے۔"

حیا کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ نیم جاں قدموں سے چلتی کاؤچ پہ آ بیٹھی۔ ارم اس کام کے لیے اپنے گھر کا کوئی فون استعمال نہیں کرتی تھی،

اس لیے نہیں کہ وہ پکڑی نہ جائے، بلکہ اس لیے کہ وہ "ولید" کے ساتھ پکڑی نہ جائے۔ بہت کچھ تھا جو اسے اب سمجھ آ رہا تھا۔

"ارم کا..." وہ پھر بولتی گئی۔ جو بھی معلوم تھا، بتاتی گئی۔ جہان خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ چپ ہوئی تو وہ بس اتنا بولا

"مجھے ارم اور ولید میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، مجھے صرف یہی بات کھٹک رہی ہے کہ اس نے بار بار تمہارا فون کیوں استعمال کیا؟"

"کیا تم مجھ پہ شک کر رہے ہو؟"

"نہیں بھئی۔" وہ جیسے اکتایا۔ "میں ارم کی بات کر رہا ہوں۔ جائے کسی ملازم، کسی دوست کا فون استعمال کرنے کے۔ اس نے تمہارا کیوں کیا؟"

"پتا نہیں، مگر میں ارم سے بات ضرور کروں گی۔" وہ ٹیک لگا کر، بالکل خاموش سی ہو کر بیٹھ گئی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ اس کی نگاہیں ونڈ چائم کی لڑیوں پہ مرکوز تھیں مگر ذہن کہیں اور بھٹکا تھا۔ وہ ویڈیو کس نے دی ولید کو؟ کس نے بتایا ولید کو کہ حیا اس ویڈیو سے اس حد تک خوفزدہ ہو سکتی ہے کہ اس کو دبانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے؟ حیا نے ہر جگہ سے ویڈیو ہٹوا دی تھی، مگر دو جگہیں ایسی تھیں جو رہ گئی تھیں۔ ارم اور حیا کے لیپ ٹاپس۔ جس دن ویڈیو نیٹ پہ ڈالی گئی تھی، اسی دن ان دونوں نے اسے اپنے اپنے کمپیوٹر میں ڈاؤن لوڈ کر لیا تھا۔ ارم نے ہی ولید کو وہ دی ہوگی، مگر اس طرح تو ارم کی اپنی بدنامی بھی ہوگی، پھر؟ پتا نہیں

جہان بیڈ پہ تکیے کے سہارے لیٹا گردن اس کی طرف موڑے، بغور اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ وہ محسوس کیے بغیر گلاس ڈور کے پار دیکھتی، کہیں اور گم تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت اچھے سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ ٹھیک سے چل پھر بھی سکتا تھا۔ اس کا اپنا خیال تھا کہ وہ بغیر رکے دو میل تک بھاگ سکتا ہے۔ مگر ایسا کرنے کی اسے اجازت نہ تھی۔ البتہ وہ بستر پہ لیٹنے سے سخت بے زار ہوتا تھا۔ اس صبح وہ اسے ہسپتال کے لان میں واک کے لیے لے گئی۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ سر پہ وہی سفید ٹوپی، اور نیچے ہسپتال کا ہلکا نیلا ٹراؤزر اور شرٹ۔ عام دنوں کی نسبت وہ ذرا آہستہ چل رہا تھا، مگر اب تو اُسے خود بھی لگنے لگا تھا کہ جہان بالکل ٹھیک ہے۔

"اس روز ہم فون نمبرز کی بات کر رہے تھے۔ تمہیں پتا ہے مجھے نمبرز بھول جاتے ہیں۔ بلکہ یاد ہی نہیں رکھ سکتی۔" وہ دونوں ساتھ واک کر رہے تھے جب اس نے کہا۔

جہان نے جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے قدم اٹھاتا رہا۔

صبح کی ٹھنڈی ہوا گھاس کے تنکوں کے اوپر بہہ رہی تھی۔ پرندوں کے مدھر نغمے، اور درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ سب کچھ بہت پُرسکون تھا۔ اتنا پُرسکون کہ وہ اپنے سارے مسئلے اور پریشانیاں بھلا کر اس ماحول کا حصہ بننا چاہتی تھی۔

"میں نے تمہیں اس رات اس لیے کال نہیں کی تھی، کیونکہ میرے دوسرے فون میں تمہارا نمبر نہیں تھا۔ مجھے نمبرز زبانی یاد نہیں رہتے۔ میرے پاس عثمان شبیر کا کارڈ تھا، سو ان کو فون کیا۔" ساتھ ہی اسے سفیر والی بات کا خیال آیا مگر ابھی وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی، سو اسے بعد کے لیے اٹھا رکھا۔

"اچھا۔" جہان نے ذرا سی سر کو اثبات میں جنبش دی، جیسے اس ساری تفصیل میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔

"اور میں ولید کے ساتھ صرف اس لیے بیٹھی تھی کیونکہ میں اسے رشتہ بھیجنے سے منع کرنا چاہتی تھی، مگر وہ میری غلطی تھی۔"

وہ دونوں اب جنگلے کے ساتھ واک کر رہے تھے۔ جنگلے کے پار سڑک اور درختوں کی قطار تھی۔ جہان جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔

"لیکن اب میں نے زندگی سے یہ سیکھ لیا ہے کہ ہمیں پسند سب کو کرنا چاہیے لیکن اعتبار بہت کم لوگوں پہ کرنا چاہیے۔ کیا دیکھ رہے ہو؟"

اپنی رو میں بولتے اسے احساس ہوا کہ جہان رک کر ذرا سا رخ موڑے، جنگلے کے پار سڑک پہ کچھ دیکھ رہا تھا۔ حیا نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

وہاں درختوں کے ساتھ پولیس ایک جگہ کو فیتہ لگا کر سیل کر رہی تھی۔ لوگوں کا ذرا سا رش فیتے کے اطراف میں جمع ہو رہا تھا، اور وہ گردنیں اونچی کر کے ممنوعہ قطع اراضی کو دیکھ رہے تھے۔ حیا نے بھی ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ وہاں زمین پہ ایک شخص چت گرا پڑا تھا، ہاتھ میں پستول، کنپٹی پہ گولی کا نشان اور ڈھیر سارا خون۔

"اللہ، اللہ!" اس نے بے اختیار ہاتھ لبوں پہ رکھا۔ "اپنی جان خود لے لینا، مایوسی کی انتہا۔ کیوں کرتے ہیں کچھ لوگ ایسا؟"

"نہیں!" جہان نے اسی منظر کو دیکھتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔ "میرا نہیں خیال یہ خودکشی ہے۔ کسی نے اسے قتل کر کے لاش کے ہاتھ میں پستول دے دیا ہے۔"

اللہ، اللہ، یہ شکی مزاج آدمی بھی نا۔

"اور تمہیں کیسے پتا کہ یہ قتل ہے، خودکشی نہیں؟" وہ پوری اس کی طرف گھومی۔ جہان نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"پہلی بات، پستول اس کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہاں تو یہی بات ظاہر کرتی ہے کہ یہ خودکشی ہو سکتی ہے۔"

"ایک تو ایسی عقلمند بیوی اللہ ہر ایک کو دے۔" جہان نے بہت افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھتے نفی میں سر ہلایا۔ حیا کی آنکھوں میں ناراضی ابھری

"مطلب؟"

"نیوٹن کا تھرڈ لاء آف موشن تو پڑھ رکھا ہوگا تم نے؟"

"اب مجھ کم عقل کو کیا پتا کہ نیوٹن کون تھا؟" وہ اسی خفگی سے بولی۔

"ہاں، بالکل، تمہیں تو اتنا بھی نہیں پتا ہوگا۔ بہر حال وہ جو بھی تھا، اس نے ایک قانون دیا تھا کہ....."

"یاد آ گیا، نیوٹن وہی تھا نا جس کا سیبوں کا کاروبار تھا؟" اب کہ اس نے ذرا معصومیت سے پوچھا۔ جہان نے ایک بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پہ روکی۔

"ہاں، بالکل، وہی تھا۔ بہر حال اس کا تیسرا قانون کہتا ہے کہ

ہر ایکشن کا ایک برابر اور مخالف ری ایکشن ہوتا ہے، جب انسان گولی چلاتا ہے، تو گولی آگے، اور گن پیچھے کو جھٹکا کھاتی ہے، خودکشی کرنے والے نے چونکہ خود کو ہرٹ کیا ہوتا ہے، اس لیے بمشکل بیس فیصد خودکشیوں میں پستول ڈیڈ باڈی کے ہاتھ میں رہتا ہے، ورنہ عموماً وہ اس انسان سے تیس سینٹی میٹر کے فاصلے پہ جا گرتا ہے۔"

"اچھا، مگر ہو سکتا ہے کہ یہ ان بیس فیصد کیسیز میں سے ایک ہو؟" وہ بھی ہار نہیں ماننا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

"دوسری بات؟ یہ جو اس کا زخم کا نشان ہے، یہ ذرا فاصلے سے آیا ہوا لگتا ہے، خودکشی میں انسان کنپٹی پہ پستول رکھ کر چلاتا ہے، اور اس کا نشان بالکل مختلف ہوتا ہے۔"

پولیس آفیسرز اب ڈیڈ باڈی کی تصاویر بنا رہے تھے ایک آفیسر جائے وقوعہ کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

"تیسری بات" اگر گولی اس نے خود چلائی ہے تو ہاتھ پہ گن پاؤڈر ضرور گرا ہوگا، اور اگر میں ذرا قریب سے دیکھ پاتا تو تمہیں مزید ثبوت لا کر دیتا مگر تم تب بھی نہ مانتیں۔"

"تم بھی تو نہیں مانتے۔" اس نے شانے ذرا سے اچکائے اور واپس مڑ گئی۔ اس کا موڈ آف ہو چکا تھا جہان سر جھٹک کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

اس نے اتنا کچھ کیا، مگر وہ اب بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ اس کی بیوی "عقلمند" ہے۔ چلو، کبھی کسی دن وہ اس پہ یہ ضرور ثابت کرے گی کہ وہ جہان سے زیادہ سمارٹ ہے۔ کبھی نہ کبھی اسے موقع ضرور ملے گا۔

☆ ☆ ☆

آج وہ شام میں بہارے سے مل کر واپس آ گئی تھی۔ جہان کو ذرا سا بخار تھا، سو وہ اس کے پاس رکنا چاہتی تھی۔ جہان نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ البتہ بہارے نے ذرا سا منہ بنایا تھا۔

"تم مجھے بالکل بھول گئی ہو۔"

"میں اپنی چھوٹی بلی کو کیسے بھول سکتی ہوں۔" جاتے سمے اس کے دونوں گال چومتے ہوئے حیا نے کہا تھا۔

''ہم آشیانہ واپس کب جائیں گے؟''

''کیوں، تمہیں عروہ کے ساتھ مزہ نہیں آ رہا؟'' اس نے مسز عبداللہ کی نواسی کا نام لیا، جو اپنی ماں اور نانی کے ہمراہ صبیحہ نور کے گھر آج کل آئی ہوئی تھی۔

''اونہوں!'' بہارے نے ناک سکیڑی۔ ''وہ اتنی چھوٹی اور بے وقوف ہے، مجھے اس کے ساتھ ذرا بھی مزا نہیں آتا۔''

''ہاں تم تو بہت بڑی ہو جیسے؟'' ہنس کر بہارے کے سر پہ چپت لگاتی وہ پھر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی تھی۔

رات تک جہان کا بخار قدرے اتر گیا تھا، اس نے ایک دو دفعہ کہا بھی کہ وہ چلی جائے مگر وہ اب ہوٹل جا کر کیا کرتی؟ خوامخواہ فکر لگی رہتی، سو وہیں کاؤچ پہ بیٹھی رہی۔

گلاس ڈور کے آگے سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔ باہر سے آتی چاندنی سے دروازے کے اوپر لٹکتا ونڈ چائم چمک رہا تھا۔ یوں جیسے قطرہ قطرہ چاندنی پگھل کر اس کی لڑیوں سے ٹپک رہی ہو۔

جہان کافی دیر سے دوا کے زیرِ اثر پُرسکون سو رہا تھا، وہ وہیں کاؤچ کے سرے پہ ٹکی، اس کو دیکھ رہی تھی، عبایا بھی ساتھ ہی رکھا تھا، اور اس جامنی قمیص کے اوپر اس نے دوپٹہ لے رکھا تھا۔ جہان کا موبائل اس کے سرہانے، سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا، اس کو دیکھتے ہوئے اسے بار بار ارم اور ولید کا خیال آ رہا تھا۔ جہان نے کہا تھا کہ اس نے پھپھو کو حیا کے نمبر سے کال کرنے کے لیے اس کا فون اٹھایا تھا، مگر پھر کال ملا کر بند کر دیا۔ شاید اس نے ویسے ہی اس کا فون چیک کیا ہو۔ شاید اسے ایسے کاموں کی عادت تھی۔ اور اگر وہ اس کا فون چیک کر سکتا تھا تو وہ بھی کر سکتی تھی۔ اسے متبادل پاسورڈ بھی معلوم تھا۔ جاسوس کی جاسوسی بھی دلچسپ کام تھا۔ اور پھر اسے جہان پہ کچھ ثابت بھی تو کرنا تھا نا۔

اس نے بنا کسی آہٹ کے، جھک کر پیر جوتوں سے آزاد کیے، پھر ننگے پاؤں اٹھی، بغیر چاپ کے دبے قدموں چلتی اس کے سرہانے آ کھڑی ہوئی۔ اس کا فون، پانی کے جگ اور گلاس کے ساتھ ہی رکھا تھا۔ جہان سو رہا تھا۔ آنکھیں بند، ہولے ہولے چلتا سانس۔

حیا نے آہستہ سے ہاتھ فون کی طرف بڑھایا۔ ابھی وہ موبائل سے بالشت بھر دور ہی تھا کہ..... ایک جھٹکے سے کسی نے اس کی کلائی پکڑی۔

''امی!'' بوکھلا کر کراہتی، وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

اس کی کلائی پکڑے، جہان کہنی کے بل ذرا سا اٹھا، اور نیند بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''کیا کر رہی تھیں؟'' وہ جیسے حیران ہوا تھا۔ اندھیرے میں بھی حیا کے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

''تم تو سو رہے تھے!'' وہ اتنی شاکڈ تھی کہ پتا نہیں کیا بول گئی۔

''تم کر کیا رہی تھیں؟''

''پانی..... پانی لے رہی تھی۔'' اس کا سانس ابھی تک جیسے رکا ہوا تھا۔ جہان نے ایک نظر پانی کے جگ پہ ڈالی، پھر گردن پھیر کے کاؤچ کی میز کو دیکھا جہاں پانی کی چھوٹی بوتل رکھی تھی۔

''وہ گرم ہو گیا تھا، یہ ٹھنڈا ہے، اس لیے یہ لے رہی تھی۔'' اس کی نگاہوں کا سفر دیکھتے ہوئے اس نے جلدی سے وضاحت دی۔

جہان نے ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی، پھر اس کی کلائی چھوڑ دی۔ اس نے جلدی سے، ذرا لرزتے ہاتھوں سے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا، اور گلاس پکڑے واپس کاؤچ پہ آ بیٹھی۔

''آر یو شیور تمہیں پانی ہی چاہیے تھا؟'' سر واپس تکیے پہ ڈالے، وہ اب اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ہاں، آف کورس!'' اس نے ذرا سا شانے اچکاتے ہوئے گلاس لبوں سے لگایا۔ دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔ یہ آدمی آخر سوتا کب تھا؟

''ویسے اگر ادھر جگ نہ پڑا ہوتا تو تم کیا کہتی؟'' وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ پتا نہیں وہ کیا سمجھ رہا تھا۔

''ادھر جگ نہ ہوتا تو میں ادھر آتی ہی کیوں؟'' وہ پانی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔ آدھا گلاس تھا مگر ختم ہونے کا نام ہی

نہیں لے رہا تھا۔

"بہارے کہاں ہے؟ آج رات"

"وہیں، نانی کے پاس!"

"اس کو ساتھ لانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" وہ پھر سے کسی نئے جھگڑے کے موڈ میں تھا شاید۔

"چھوٹی سی بچی کیا کہہ رہی ہے تمہیں؟"

"اپنی بہن کی جاسوس ہے وہ۔ ایک ایک بات کی رپورٹ دیتی ہوگی اُدھر۔"

"اگر میں اسے نہ لاتی تو زیادہ بُرا ہو سکتا تھا۔ سفیر نے اسے کہا تھا کہ وہ اپنا پاسپورٹ جلا دے، تاکہ تم واپس آ جاؤ۔ اس نے خود مجھے بتایا ہے۔" گلاس میز پہ رکھتے ہوئے اس نے اپنے تئیں ایک بڑی خبر دی تھی۔

"اور تم نے یقین کر لیا؟"

"کیا مطلب؟" حیا کے لب حیرت سے ذرا سے کھل گئے۔

"اس ٹانگ جتنی لڑکی نے تمہیں بے وقوف بنایا اور تم بن گئی۔ ویری سمارٹ حیا!" اس نے پھر سے انہی تاسف بھری نگاہوں سے حیا کو دیکھ کر نفی میں سر ہلایا جیسے جنگلے کے ساتھ کھڑے ہوئے کیا تھا۔

"جہان، اس کو سفیر نے......"

"اس کو سفیر نے واقعی یہ کہا تھا مگر جب وہ اپنا پاسپورٹ جلا چکی تھی، تب! اور وہ بھی غصے سے کیونکہ ایسی صورت میں مجھے واپس آنا پڑتا۔ بہارے نے تم سے جھوٹ نہیں بولا، اس نے صرف تمہیں آدھی بات بتائی ہے، بچے ایسے گول مول بات کر دیتے ہیں، تم تو بڑی تھیں۔ تم ہی عقل کرتیں۔"

پھر وہی عقل کا طعنہ؟

"مگر تم نے کہا تھا کہ وہ لالچی ہے، اور وہ......"

"ہاں لالچی ہے، اس لیے تو وہ نہیں چاہتا کہ عبدالرحمٰن واپس جائے۔ پاشا بے جیسے لوگ جب مشکل میں پھنستے ہیں تو ان کی ساری فیملی خمیازہ بھگتتی ہے۔ سب کچھ بیچ کر، نامحسوس انداز میں ایک، ایک کو باری باری اس ملک سے نکلنا ہوتا ہے۔ ایک ساتھ سب نہیں جا سکتے۔ بہارے نے سب سے کہا تھا کہ وہ آخر میں جائے گی، اور عائشے کے پاس ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر بہارے نے اپنا پاسپورٹ خود ہی جلا دیا۔ نتیجتاً سفیر کی پریشانی بڑھ گئی۔ ہمارے وہاں سے نکلنے کے بعد سب کچھ اسی کا تو ہوگا۔ ہوٹل میں شیئرز، گھر میں، اور کیا نہیں، ہم نے دیا اس کو، وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ میں یا پاشا بے کی فیملی کا کوئی شخص وہاں واپس آئے۔"

"مگر وہ ہمارے پیچھے ڈورم بلاک تک آیا اور......"

"میں اس لڑکی کو اس کی ذمہ داری میں چھوڑ کر گیا تھا، اسے تمہارے پیچھے آنا چاہیے تھا۔ بہارے نے تمہیں ایک طرف کی بات بتائی، اگر تم دوسری طرف کی بات سن لیتی تو اتنا مسئلہ نہ ہوتا۔"

کاؤچ پہ بیٹھی حیا کو لگا، وہ اس دنیا کی سب سے کم عقل اور بے وقوف لڑکی ہے، اسے بہارے پہ بالکل غصہ نہیں آیا۔ اپنی چھوٹی بلی سے وہ خفا ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر اسے خود سفیر سے بات کرنی چاہیے تھی، مگر نہیں...... مسئلہ یہ بھی نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہارے کو کپادوکیہ کے بارے میں بتا چکی تھی، مگر یہ بات وہ اس وقت جہان کو نہیں کہہ سکتی تھی۔ ایک دم اسے ڈھیر سارا رونا آیا تھا۔

"میں نے وہی کیا جو مجھے صحیح لگا۔" بہت مشکل سے یہ الفاظ کہہ کر، اور "جہنم میں جاؤ تم سب" کے الفاظ لبوں تک روک کر وہ اٹھ گئی۔

"تم سو جاؤ، مجھے کام ہے۔" اور تیز تیز قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔ وہی غصے یا دکھ میں جگہ چھوڑ دینے کی عادت۔

باہر کاریڈور میں ذرا آگے جا کر ایک بینچ سا نصب تھا۔ وہ اس بینچ پہ دونوں کہنیاں گھٹنوں پہ رکھے، ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بیٹھ گئی۔ بار بار دل بھر آ رہا تھا۔ شرمندگی کہ وہ جان گیا تھا، وہ اس کا فون چیک کرنے آئی تھی۔ بدتمیز۔ کبھی سوتا بھی تھا یا نہیں؟ اتنی زور کا ہاتھ پکڑا۔ اس نے

چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کلائی کو دیکھا۔ اب کوئی اتنی سرخ بھی نہیں پڑی تھی، مگر پھر بھی اسے رونا آرہا تھا۔

دفعتاً دائیں جانب آہٹ ہوئی۔ حیا نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ کمرے سے نکل کر اس کی طرف آرہا تھا۔ تو یہ طے تھا کہ ہر دفعہ وہ اس کے پیچھے آئے گا۔

''تم کیوں نکل آئے؟ جاؤ جا کر لیٹو۔ ابھی نرس نے دیکھا تو سو باتیں سنائے گی مجھے۔'' وہ پریشانی سے بولی تھی۔ جہان جواب دیے بنا اس کے ساتھ بینچ پہ آ کر بیٹھ گیا۔

''تم باہر کیوں آئی؟'' اس کی طرف چہرہ کیے، وہ ذرا دھیمے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ کاریڈور میں روشنی تھی، سفید روشنی، مگر وہ چاندی کی سی نہیں تھی۔

''کیونکہ تمہیں میں اندر بیٹھی بہت بُری لگ رہی تھی۔''

''ہاں خیر لگ تو رہی تھیں، مگر اتنی بھی نہیں کہ باہر آ جاؤ۔ میں برداشت کر ہی لیتا۔'' وہ بہت سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

اگر اس وقت اس کے ہاتھ میں کوئی بھاری چیز ہوتی تو وہ اس کے پٹی والے سر کا لحاظ بھی نہ کرتی۔

''تم جاؤ، میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' وہ رخ سیدھا کیے، سامنے دیوار کو دیکھنے لگی۔

''اب نیا مسئلہ کیا ہے تمہارا؟''

''میرے مسئلے کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ میری زندگی بھی ایک پہیلی ہے جس کو میں کبھی حل نہیں کر سکتی۔'' پتا نہیں اسے اتنی مایوسی اور بے زاری کس بات پہ تھی، مگر تھی ضرور۔

''تمہارا مسئلہ پتا کیا ہے؟'' وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم ایک بات سمجھ نہیں پا رہی، کہ تم کسی چیز کی کتنی ہی صفائی کیوں نہ کر لو، اس پہ جالے پھر سے بن جائیں گے۔ یہ جو تم بار بار اسٹرگل کرتے کرتے تھکنے اور اداس ہونے لگتی ہو نا، یہ اسی وجہ سے ہے، اور یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس فیز میں یوں بے زار ہو کر بیٹھ نہیں جاتے، بلکہ خود کو منفی ردِعمل سے بچائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صبر اسی چیز کا نام ہے۔ خود کو منفی ردِعمل سے روکنا اور مثبت سوچ پہ جمائے رکھنا۔''

جب اس نے جالے کا لفظ استعمال کیا تھا، وہ تبھی چونکی تھی۔ کچھ یاد آیا تھا۔

''ڈاکٹر ابراہیم نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں مجھ سے۔ مکڑی کے جالوں کی۔'' وہ بولی تو اس کی آواز سے ناراضی مفقود تھی، صرف گہری سوچ پنہاں تھی۔

سرد خاموش کاریڈور میں یکدم ہلکا سا اندھیرا ہو گیا تھا، اور دور کہیں سے پگھلی ہوئی چاندی فرش پہ گرنے لگی تھی۔

''ضرور کہی ہوگی۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے والے اس کی پہیلیوں پہ غور اسی طرح کیا کرتے ہیں۔'' وہ اثبات میں سر ہلا کر کہہ رہا تھا۔ کتنے عرصے بعد اسے لگا تھا، اسے میجر احمد پھر سے مل گیا ہے۔ وہی دھیما ٹھہرا ہوا لہجہ، وہی باتیں۔

''تو پھر میں قرآن کی پہیلیاں کیوں حل نہیں کر سکی؟ سر ابراہیم کا کہنا ہے کہ سورۃ الاحزاب کی پہیلی میں کچھ ہے جو میں مس کر گئی ہوں۔''

دور کاریڈور کے سرے پہ گری چاندی بہہ کر اس طرف آ رہی تھی۔ ساری دیواریں ساتھ میں چاندی کے ورق میں لپٹتی جا رہی تھیں۔

''ہر آدمی ایک آیت کو اپنے طور پہ دیکھتا ہے، اور خود سے ریلیٹ کرتا ہے۔ وہ اسے کسی اور اینگل سے دیکھ رہے ہوں گے، مگر وہ جو بھی چیز ہوگی، وہ اس آیت کا آخری راز کبھی نہیں ہوگا، تمہیں ہر دفعہ وہ آیت یا وہ سورۃ یا صرف وہ ایک لفظ کوئی نیا راز دے گا، اور کوئی بھی راز آخری نہیں ہوگا۔''

چاندی کا پانی سا فرش پہ بہتا اب ان کے بینچ سے ذرا سا ہی دور تھا۔

''کیا تم میرے لیے اس پہیلی کو حل کر سکتے ہو؟''

''حیا، قرآن اور نماز، یہ دو وہ چیزیں ہیں جو ہر انسان کو اپنے لیے خود ہی کرنی ہوتی ہیں۔ یہ کبھی کوئی دوسرا آپ کے لیے نہیں کر سکتا۔''

چاندی کا ورق ان کے قدموں کو چھوتا ان کو بھی خود میں لپیٹنے لگا۔ چاندی کے مجسمے پھر سے لوٹ آئے تھے۔

"لیکن میں تمہیں قرآن کی کچھ پہیلیاں بتا سکتا ہوں، جو بہت سے لوگوں نے حل کی ہیں، جیسے..... جیسے....." چاندی کے مجسمے نے لمحے بھر کو، دانت سے نچلا لب دبائے، کچھ سوچا، پھر کہنے لگا۔

"جیسے تم نے سورۃ الفلق تو پڑھی ہو گی۔"

"او جہان، کس کو الفلق اور الناس زبانی یاد نہیں ہوں گی؟"

"او کے، پھر الفلق کی تیسری آیت یاد کرو ہو من شر غاسق اذا وقب۔ اس آیت کا ترجمہ ہمارے ہاں عموماً یوں کیا جاتا ہے کہ میں (پناہ مانگتا ہوں) رات کے شر سے جب وہ چھا جاتی ہے۔"

"ہوں، ٹھیک!" چاندی کی تہہ پورے کاریڈور پہ چڑھ چکی تھی۔ ہر سو مدھم سی جگمگاہٹ تھی۔

"یعنی کہ "غاسق" کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے یہاں۔ غاسق کا مطلب ہوتا ہے، اندھیرا کرنے والا، یعنی کہ رات۔ لیکن....." وہ لمحے بھر کو ٹھہرا۔ "غاسق کا ایک اور مطلب بھی ہوتا ہے، وہ مطلب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غاسق کے لیے استعمال فرمایا تھا۔ کیا تم وہ مطلب جانتی ہو؟"

"نہیں۔" چاندی کے مجسمے نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ پلک جھپکے بنا پہلے مجسمے کو دیکھ رہی تھی، کہ کہیں وہ ٹرانس ٹوٹ نہ جائے۔

"میں تمہیں اس کا دوسرا مطلب بتاتا، بلکہ دکھاتا ہوں۔ ادھر آؤ۔" وہ اٹھا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی ہوئی۔ وہ اس کے آگے چلتا اپنے کمرے میں واپس آیا اور دروازہ بند کیا۔

کمرے میں نیم اندھیرا تھا، صرف گلاس ڈور سے چاندنی اندر جھانک رہی تھی۔ جہان اس دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا، اور جب وہ اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی تو اس نے انگلی سے باہر، اوپر کی سمت اشارہ کیا۔

"وہ ہے غاسق؟" حیا نے اس کی انگلی کے تعاقب میں دیکھا۔ وہاں سیاہ آسمان پہ چاندی کی ایک ٹکیا جگمگا رہی تھی۔

"چاند؟ غاسق کا دوسرا مطلب چاند ہوتا ہے؟" اس نے بے یقینی سے دہراتے ہوئے جہان کو دیکھا۔ جہان نے ذرا سا مسکرا کر سر کو اثبات میں جنبش دی، اس کا چہرہ آدھا اندھیرے، اور آدھا سلور روشنی میں تھا۔

"چاند کے شر سے پناہ؟ مگر چاند میں کون سا شر ہوتا ہے؟" اسے ابھی تک بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

"ہر چیز میں خیر اور شر دونوں ہوتے ہیں۔ چاند بہت پیارا، بہت خوبصورت ہے۔ لیکن تم نے کبھی دیکھا ہے سمندر کی لہروں کا مدوجزر؟"

حیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہاں، یہ تو وہ جانتی تھی کہ.....

"چاند کھینچتا ہے ان لہروں کو، چاند میں بہت کشش ہوتی ہے۔"

"مگر وہ سمندر کی بات ہے، اس کا انسان سے کیا تعلق؟" کہتے ہوئے حیا نے پھر گردن پھیر کر شیشے کے پار آسمان پہ چمکتے چاند کو دیکھا۔

"حیا..... چاند سمندر کو نہیں، چاند پانی کو کھینچتا ہے۔ چاند 'ہر' پانی کو کھینچتا ہے۔ اور....." اس نے ایک انگلی سے حیا کی کنپٹی کو چھوا "ادھر تمہارے دماغ میں بھی Fluids ہوتے ہیں، پانی ہوتا ہے، چاند اس کو بھی کھینچتا ہے۔ جن لوگوں کا دماغی نظام غیر متوازن ہو جاتا ہے، وہ پاگل کہلاتے ہیں، اور پاگل کو ہم انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟" وہ لمحے بھر کو رکا۔ وہ کسی ٹرانس کے زیر اثر سن رہی تھی۔

"چاند کو ہم Luna کہتے ہیں، اور پاگل کو Lunatic کہتے ہیں۔ چاند اور دماغی امراض کا بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ انسان کے حواس پہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے جو لوگ مرضِ عشق میں مبتلا ہوتے ہیں، یا شاعر وغیرہ، وہ چاند کا ذکر بہت کرتے ہیں۔ چاند بہت خوبصورت ہے، یہ اندھیرے میں ہمیں راستہ دکھاتا ہے۔ اس کی خیر ہمیں سمیٹنی چاہیئے، مگر اس کے شر سے پناہ مانگنی چاہیئے۔ کیا اب تم مانتی ہو کہ قرآن کی پہیلیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں؟"

حیا نے ہولے سے سر اثبات میں ہلایا۔ اس وقت سارے جہاں میں ایسا جادوئی اثر چھایا تھا کہ اسے لگا اس کے کچھ کہنے سے وہ ٹوٹ جائے گا۔

"اور ہاں، میں نے اپنے فون کا متبادل پاسورڈ ہٹا دیا تھا۔" اس نے کہا، اور ایک دم سے وہ سحر ٹوٹا چاندنی چٹخ گئی، اور اس کی پرتیں کہیں ہوا میں تحلیل ہوتی گئیں۔

وہ جیسے کسی خواب سے جاگی، پھر ذرا سے شانے اچکائے اور واپس کاؤچ پہ جا بیٹھی۔

جہان دھیمی مسکراہٹ سے اسے دیکھتا، بیڈ کی طرف چلا گیا۔ حیا نے پھر سے گردن پھیر کر شیشے کے پار دِکھتے چاند کو دیکھا۔ ونڈ چائم کی پنکھڑیاں ابھی تک چاندنی میں نہائی ہوئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

صبح اس نے بہارے کی اچھی کلاس لی تھی۔

"تم نے مجھے یہ تاثر دیا کہ سفیر نے تم سے یہ سب کہا تھا، جبکہ اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ تم نے مجھے مس گائیڈ کیا۔"

"میرا مطلب وہی تھا۔" وہ منمنائی مگر حیا اس کے سامنے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتی سن ہی نہیں رہی تھی۔

"تم نے جھوٹ بولا مجھ سے۔ تم نے جھوٹ بولنا نہیں چھوڑا۔"

"اچھا، سوری، آئندہ نہیں کروں گی۔" وہ بار بار سوری کرتی اس کو منانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر حیا خفا خفا سی سامنے صوفے پہ جا بیٹھی۔ جہان کے سامنے اٹھائی جانے والی شرمندگی کا بدلہ کسی سے تو لینا تھا۔

"کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟" وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

حیا نے ابرو اٹھا کر ایک سخت نگاہ اس پہ ڈالی۔

"نہیں، میں تم سے بہت خوش ہوں اور اگر میں نے یہ سب عائشے کو بتا دیا تو.....؟"

اس بات پہ بہارے نے اپنی سب سے معصوم شکل بنائی، اور بہت ہی ناصحانہ انداز میں بولی۔

"اچھی لڑکیاں شکایت نہیں لگایا کرتیں۔"

"ہاں مگر اچھی لڑکیاں تھپڑ بہت اچھے سے لگا سکتی ہیں، اور میں تمہیں بتا رہی ہوں، کسی دن تم میرے ہاتھوں بہت پٹو گی۔"

بہارے لپک کر اس کے پیچھے سے آئی اور اس کی گردن میں بازو ڈال کر چہرہ اس کے گال سے لگایا۔

"بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے، حیا سلیمان!"

"اچھا، مکھن مت لگاؤ، مجھے ابھی جانا ہے، پھر میں شام میں آؤں گی۔"

بہارے نے بازو ہٹا کر خفگی سے اسے دیکھا۔

"اور میں اس چھوٹی چڑیل کے ساتھ رہوں گی پھر سارا دن؟"

"میں اب تمہاری کسی بات کا یقین نہیں کروں گی۔" اپنی مصنوعی ناراضگی کو جاری رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور چلو، اب کچھ گفٹس لینے ہیں میں نے نانی اور باقی سب کے لیے۔"

"میں اس چھوٹی چڑیل کے لیے کچھ نہیں لوں گی۔" بہارے نے ناک سکوڑتے ہوئے احتجاج کیا، مگر حیا نے رک کر، گھور کر اسے دیکھا تو وہ "سوری" کہتی ہوئی ساتھ چل پڑی۔

کل جہان نے ڈسچارج ہونا تھا، سوان کو واپس کپادوکیہ چلے جانا تھا۔ یقیناً یہ مسز عبداللہ کی فیملی سے اس کی آخری ملاقات تھی، اور ان پانچ ماہ میں ان کی طرف سے دکھائے گئے خلوص اور مہمان نوازی کا بدلہ تو وہ نہیں اتار سکتی تھی، پھر بھی سوچا کچھ تحائف خرید لے۔ ان کے دیے گئے تحائف بھی اس کے پاس تھے، اور تحفہ تو محبت کا وہ نشان ہے، جس کی واپسی ضروری ہوتی ہے۔

نانی، مسز عبداللہ اور مہر نے اپنے تحائف لیتے ہوئے اسے کہا بھی کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی، مگر وہ اس کی محبت پہ مسرور بھی تھیں۔ عروہ کے لیے اس نے کیپٹن پلینٹ کارٹونز کی کچھ ڈی وی ڈیز لی تھیں، اور اس معصوم بچی نے دھیمی آواز میں شکریے کے ساتھ انہیں وصول کیا، پھر اس نے شرمیلی مسکان کے ساتھ بہارے گل کو اپنا گفٹ دکھانے کی کوشش کی مگر ادالار کی شہزادی ناک سکوڑے بیٹھی رہی، جیسے اسے عروہ

میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اور تب حیا کو سمجھ آیا کہ بہارے نے یہ "موڈی انداز" کس سے کاپی کیا ہے۔ جہان۔ وہ بھی ایسا ہی تھا اور بہارے اس کے ہر انداز کو اپنانے کی کوشش کرتی تھی۔

سہ پہر میں وہ جہان کی طرف چلی آئی۔ اس کے پرائیویٹ روم کا دروازہ وہ کھولنے ہی لگی تھی کہ وہ اندر سے کسی نے کھولا۔ وہ رک گئی۔ اندر سے ایک ترک لڑکی باہر آ رہی تھی۔ ساتھ ہی کمرے کا منظر نمایاں ہوا۔ وہ لوگ ایک معمر مریض کو بیڈ پہ لٹا رہے تھے۔ حیا کا سانس جیسے کسی نے روک دیا۔ اس نے دوبارہ سے روم نمبر دیکھا۔

"سسٹر، میرا..... میرا مریض کہاں ہے؟" ایک شناسا نرس دکھائی دی تو وہ دوڑ کر اس تک گئی۔ پریشانی، فکرمندی، خوف، کیا تھا جو اسے اس وقت محسوس نہیں ہوا تھا؟

"وہ صبح ڈسچارج ہو گیا تھا۔"

وہ حق دق سی نرس کو دیکھنے لگی۔

"مگر اسے تو کل جانا تھا۔"

"ہاں مگر وہ ٹھیک تھا۔ اور تین ہفتے بعد تو بالکل پہلے جیسا ہو جائے گا۔"

"لیکن..... وہ گیا کہاں؟" اس بات پہ نرس شانے اچکاتی، ٹرے لیے آگے بڑھ گئی۔ حیا کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے پلٹی اور واپس جانے لگی۔ اب کیا کرے گی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ابھی کاریڈور کے وسط میں تھی کہ ایک دم سے کچھ یاد آیا۔ وہ بھاگ کر اس روم کی چوکھٹ تک واپس آئی۔ دروازہ ابھی تک نیم وا تھا۔ گلاس ڈور سامنے ہی نظر آ رہا تھا، اور اس کے اوپر کیل سے وہی پینٹنگ آویزاں تھی۔

"میرا..... میرا ونڈ چائم تھا ادھر؟" باہر آتی اسی نرس کو اس نے پھر روکا۔

"میں نہیں جانتی۔ وہ اپنی ساری چیزیں لے گیا ہے۔"

اور پتا نہیں وہ ونڈ چائم لے کر گیا بھی تھا یا اسے کہیں پھینک دیا تھا؟ جہان سکندر کا کچھ پتا نہ تھا۔ یہ تو طے تھا کہ ان کو دوبارہ کپادو کیہ ہی جانا تھا، اور انقرہ دیکھنے میں تو اسے ویسے بھی دلچسپی نہ تھی، اس لیے وہ ہاسپٹل سے نکل آئی۔

ہوٹل میں آ کر سب سے پہلا کام اس نے ارم کو فون کرنے کا کیا تھا۔ "ارم وہ ویڈیو ولید کو کس نے دی؟" تمہید کے بعد اس نے تیزی سے پوچھا تھا۔ ارم ایک ثانیے کو خاموش ہوئی۔

"جب سارے شہر میں پھیل سکتی ہے، تو ہو سکتا ہے اُسی ویب سائٹ پہ اس نے بھی دیکھ لی ہو۔"

"یو نو واٹ ارم، میں نے تو یہ کہا ہی نہیں کہ میں کس ویڈیو کی بات کر رہی ہوں۔"

"ہمارے درمیان ایک ہی ویڈیو کا ایشو تھا، اور ظاہر ہے تم اس کی بات....."

"جہنم میں جاؤ تم ارم۔" وہ سنبھل کر بات بنانا چاہ رہی تھی مگر حیا نے ٹھک سے فون بند کر دیا۔ اسے اس کا جواب مل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہمارے درمیان ایک ہی ویڈیو کا ایشو تھا اور ظاہر ہے تم اسی کی بات....." وہ کہنا چاہ رہی تھی مگر دوسری جانب سے حیا نے بہت غصے سے "جہنم میں جاؤ تم ارم!" کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔ ارم نے ایک لمحے کے لیے ریسور کو دیکھا، اور پھر شانے اچکاتے ہوئے اسے واپس کریڈل پہ ڈال دیا اور وہاں رکھا چائے کا کپ پھر سے اٹھا لیا۔

یقیناً حیا کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ویڈیو اس نے ہی ولید کو دی ہے لیکن اسے اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے پاس کھونے کو اب مزید کچھ نہیں رہا تھا۔

اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔ گرم، کڑوا سا سیال مائع جیسے اندر تک اترتا گیا۔

"جہنم میں جاؤں میں؟ نہیں حیا، یہ تم ہو گی جس کو اب اسی طرح بہت کچھ کھونا ہو گا جیسے میں نے کھویا تھا۔ وہ بھی صرف تمہاری وجہ

سے۔اب اپنی دوائی کا مزہ تم بھی چکھو!"

وہ دل ہی دل میں اپنی کزن سے مخاطب ہوئی۔

وہ دونوں چچازاد بہنیں تھیں۔فرسٹ کزنز۔اور بالکل ایسی تھیں جیسی کزنز ہوتی ہیں۔جب ماؤں کے تعلقات خراب ہوئے تو ان کے بھی ہو گئے، مگر جب فضا موافق ہوئی تو دونوں پھر سے ایک ہو گئیں۔دوستی بھی ان کی بہت تھی، اور بڑے سے بڑے فیملی کلیش کے بعد بھی وہ پھر سے ایک ہو جایا کرتی تھیں۔کزنز.....ایک بہت پیارا رشتہ جو بڑوں کی سیاست اور منافقت کی گرد میں بہت میلا ہو جایا کرتا ہے۔

پچھلے دو، تین برسوں میں ان کی ماؤں کے تعلقات خوشگوار رہے تھے، سو ان کی دوستی بھی اپنے عروج پہ رہی۔اور یہ انہی دنوں کی بات ہے جب داور بھائی کی شادی بہت قریب تھی کہ وہ پہلی دفعہ ولید سے ملی۔

اس روز داور بھائی نے اسے یونیورسٹی سے پک کیا تھا، مگر درمیان میں ایک کام آن پڑا تو وہ آفس کی طرف آ گئے۔ابا ان دنوں ویسے بھی آفس نہیں جا رہے تھے۔داور بھائی بلڈنگ میں چلے گئے، اور وہ باہر گاڑی میں بیٹھی رہی۔تبھی کوئی اس کے پاس آ کر رکا تھا۔وہ سمارٹ، گڈ لکنگ سا نوجوان داور بھائی کی کار کو پہچان گیا تھا، اس لیے خیریت پوچھنے رک گیا۔

جلدی جلدی ساری بات بتا کر ارم نے شیشہ اوپر چڑھا دیا۔اگر جو بھائی نے دیکھ لیا کہ وہ لڑکے سے بات کر رہی ہے تو اس کی خیر نہیں تھی۔

وہ نوجوان چلا گیا، مگر اسی دن شام میں اس نے ان کے لینڈ لائن پہ فون کر دیا۔

ارم کی تو جان ہی نکل گئی۔پہلے تو وہ گھبرا گئی، مگر اس نے بہت شائستگی سے بتایا کہ اس کا نام ولید ہے، وہ ان کے بزنس پارٹنر کا بیٹا ہے اور اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔

اسی وقت ابا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔وہ اگر فون رکھتی تو ولید دوبارہ کر لیتا، اور تب ابا اٹھا لیتے کہ وہ اندر آنے ہی والے تھے، سو جلدی میں اس نے یہی کہا کہ وہ بعد میں بات کرے گی، اور اتنی ہی جلدی میں ولید نے اس کا موبائل نمبر پوچھ لیا۔

ارم نے بنا سوچے سمجھے نمبر بتایا اور فون رکھ دیا۔ابا جب تک اندر آئے، وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔مگر ولید نے پھر لینڈ لائن پہ کبھی فون نہیں کیا۔وہ اب اسے موبائل پہ فون کر لیتا تھا۔اس نے بتایا کہ اس کے والد اس کا رشتہ ان کے گھر میں کرنا چاہتے ہیں۔وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ سلیمان صاحب، زاہد صاحب یا فرقان صاحب میں سے کس کی بیٹی کا ذکر کر رہے تھے۔(یا اگر وہ جانتا تھا تب بھی اس نے ظاہر کیا کہ وہ نہیں جانتا لیکن اس کا خیال ہے کہ وہ ارم ہی تھی۔)

شروع میں وہ مکسڈ فیلنگز کا شکار رہی، مگر پھر آہستہ آہستہ اس کا ذہن خوش گمانیاں بننے لگا۔اسے اب ولید سے بات کرتے ہوئے کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔بعض گناہ اس لمبی سڑک کی مانند ہوتے ہیں جن پہ کوئی اسپیڈ بریکر نہیں ہوتا۔ان پہ چلنا شروع کرو تو بس انسان پھر چلتا ہی جاتا ہے، اور جب تک کوئی بڑا ایکسڈنٹ نہ ہو جائے، وہ رک نہیں پاتا۔ارم کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

وہ حیا کے ہمراہ شاپنگ پہ جانے کا پلان کرتی تو حیا کو وہیں کسی شاپ میں چھوڑ کر قریب کسی ریسٹورانٹ میں آ جاتی جہاں ولید کو اس نے بلوا لیا ہوتا تھا۔ایسا موقع گو کہ ہفتے میں ایک بار ہی آتا مگر آ ضرور جاتا۔ولید ایک دو دفعہ ہی آفس گیا تھا، پھر نہیں گیا۔اس کی فرقان صاحب سے کوئی ملاقات نہ تھی، آج کل ذرا فارغ تھا، اور باقاعدہ کام شروع کرنے میں ابھی وقت تھا، سو وہ اس کے لیے ڈھیروں وقت نکال لیا کرتا تھا۔

سب ٹھیک جا رہا تھا، مگر پھر، داور بھائی کی مہندی والے دن اس نے اماں کی زبانی سنا کہ عمیر لغاری اپنے بیٹے ولید لغاری کا رشتہ حیا کے لیے مانگنا چاہ رہے ہیں، اور ارم کو لگا، وہ مٹی کا ڈھیر بن کر ڈھے گئی ہے۔

اس کے بعد زندگی عجیب سی ہو گئی۔وہ اس کی پہلی محبت تھا، اور وہ اسے کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔وہ اس کو حیا سے جتنا برگشتہ کر سکتی تھی، اس نے کیا، اس کے نکاح کے بارے میں بھی بتایا، اور بظاہر تو ولید یہی کہتا کہ وہ حیا میں انٹرسٹڈ نہیں ہے، اور پھر اس کے نکاح کا جب اس کے والد کو علم ہوا تو یہ رشتے والا معاملہ از خود دب گیا، مگر ارم محسوس کرتی تھی کہ وہ حیا کے بارے میں سوالات بہت کرتا تھا۔وہ کیا کر رہی ہے، کدھر ہے، اس کی پسند ناپسند، اس کی کوئی کمزوری۔وہ سب اتنے نامحسوس انداز میں پوچھا کرتا تھا کہ وہ بتا دیتی، مگر پھر بعد میں الجھ بھی جاتی۔وہ ولید سے کہتی رہتی کہ وہ اس کے لیے رشتہ بھیجے، اور وہ "بس چند دن اور" کہہ کر ٹال دیا کرتا۔مگر اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ارم سے زیادہ ارم میں دلچسپی رکھتا

ہے۔ وہ اسی میں خوش تھی۔ سب سے بڑی بات جو ولید سے شادی کرنے میں تھی، وہ یہ تھی کہ اس کو اس اسکارف سے نجات مل جائے گی۔ وہ اپنی مرضی کا پہن اوڑھ سکے گی۔ اسے ابا کا خوف نہیں ہوگا۔ آزادی ایک نعمت تھی جو اس جبری پردے کے باعث اس کی دسترس میں نہیں تھی۔

مگر پھر ایک رات سب کچھ الٹ گیا۔

وہ اپنے کمرے میں کرسی پہ بیٹھی، آدھی رات کے بعد تک، ولید سے فون پہ بات کر رہی تھی۔ کمرہ لاک کرنا وہ بھول گئی تھی، یا پھر اب معمول سے یہ کام کر، کر کے اس کا خوف ختم ہو گیا تھا۔ یہ خوف واپس تب آیا جب اس نے ابا کو چوکھٹ میں کھڑے دیکھا۔

گھبرا کر ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے ارم نے جلدی سے فون بند کیا مگر وہ دیکھ چکے تھے۔ "اس ٹائم کس سے بات کر رہی ہو؟" وہ سخت تیوروں کے ساتھ اس کی طرف آئے اور اس کے ہاتھ سے موبائل قریباً چھینا۔ وہ کپکپاتے دل کے ساتھ بمشکل کھڑی ان کو کال لاگ کھولتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ولید کا نمبر حیا کے نام کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا۔ اس کی وہ تمام کلاس فیلوز جو "چھپے دوست" رکھتی تھیں، وہ اپنے اُن دوستوں کا نام لڑکیوں کے نام سے محفوظ کرتی تھیں۔ سعد کا نام رکھ دیا سعدیہ یا فائز کا رکھ دیا فضا۔ "حیا سے اس وقت کیا کام تھا؟" انہوں نے نمبر دیکھا، پھر کڑی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹائم کا فرق ہے، ان کی اتنی رات نہیں ہوئی۔"

"یہ حیا کا نمبر تو نہیں ہے، یہ پاکستان کا نمبر ہے۔" وہ نمبر چیک کرتے ہوئے بولے تھے۔

"رومنگ پہ ہے اس کا فون، ابا۔ یہ اس کا دوسرا نمبر ہے۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بمشکل کہہ پائی تھی۔ اسی وقت موبائل بجنے لگا۔ حیا سلیمان کالنگ۔ ولید اسے کال بیک کر رہا تھا۔ کبھی ایسی صورت حال پیش جو نہیں آئی تھی سو وہ سمجھ نہ سکا کہ ارم نے کال ایک دم کیوں کاٹی۔

اس لمحے اس نے بہت دعا کی کہ ابا کال نہ اٹھائیں، یا ولید آگے سے کچھ نہ بولے مگر ابا نے کال اٹھائی، مگر کچھ بولے نہیں۔ وہ ابا سے چند فٹ دور کھڑی تھی، مگر اسے ولید کا "ہیلو..... ہیلو؟" سنائی دیا تھا۔

"کون بول رہا ہے؟" وہ درشتی سے بولے۔ دوسری جانب چند لمحے کی خاموشی چھائی رہی، پھر کال کاٹ دی گئی۔ ابا نے شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دوبارہ کال ملائی، مگر اس کا فون بند جا رہا تھا۔

"یہ کوئی لڑکا تھا اور تم کہہ رہی ہو کہ یہ حیا کا نمبر ہے؟" وہ اس پہ غرائے تھے۔

صائمہ بیگم بھی آواز سن کر ادھر آ گئی تھیں۔ ارم منمنا رہی تھی، مگر ابا اس کی نہیں سن رہے تھے۔

"اگر حیا کے ساتھ اس وقت کوئی لڑکا تھا تو اس میں ارم کا کیا قصور ہے؟" اماں نے بات کو نیا رخ دینے کی کوشش کی، جس پہ لمحے بھر کو ابا شبہے میں پڑے۔

"ہو سکتا ہے حیا سبین کے گھر ہو، سبین کے بیٹے نے فون اٹھا لیا ہو۔ لائیں مجھے دیں فون، میں پوچھتی ہوں حیا سے۔"

مگر ابا نے اماں کو فون نہیں دیا۔ انہوں نے خود اپنے فون سے حیا کو کال ملائی۔

کسی سوکھے پتے کی طرح لرزتی ارم نے شدت سے دعا کی کہ حیا فون نہ اٹھائے یا پھر اسے بچا لے۔ پہلے تو اس نے واقعی فون نہیں اٹھایا، مگر دوسری بار ملانے پہ اٹھا لیا۔ ابا اسی طرح غصے میں بھرے کھڑے اس سے پوچھنے لگے، اور حیا نے اس کی عزت نہیں رکھی۔ اس نے صاف صاف انکار کر دیا۔

فون رکھتے ہی ابا نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پہ مارا تھا۔ تھپڑ سے زیادہ تکلیف دہ وہ الفاظ تھے جو انہوں نے اسے، اور اس کی تربیت کو کہے تھے۔ وہ اپنی عزت اور مقام ابا کی نظر سے کھو چکی تھی، اور یہ سب صرف اور صرف حیا کی وجہ سے ہوا تھا۔ کیا تھا اگر وہ جھوٹ بول دیتی، کیا تھا جو اگر وہ اسے بچا لیتی؟ مگر نہیں..... اس نے دوستی، رشتے، کسی چیز کا پاس نہیں کیا۔ اماں تھیں جو ابا کے سامنے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کرتی رہیں، مگر ان کے جاتے ہی وہ بھی پھٹ پڑیں، کہ اپنی اولاد کو سب بہت اچھے سے جانتے ہوتے ہیں۔

زندگی اس کے بعد بہت تنگ ہو گئی تھی۔ اس کا انٹرنیٹ اور موبائل بند ہو گیا، دوستوں کے گھر جانے یا کہیں باہر جانے پہ پابندی لگ گئی۔ اٹھتے بیٹھتے ابا کی ناراضی، بے اعتباری سہنا، سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا۔ اور پھر ولید سے دوری۔

اس نے بس ایک دفعہ لینڈ لائن سے ولید کے لینڈ لائن پر فون کر کے اسے صورت حال بتا دی تھی، پھر دوبارہ بات نہیں ہو سکی۔ ولید نے وہ نمبر ہی بدل لیا تھا۔ اب اس کے پاس صرف اس کا آفیشل نمبر تھا جو ابا کے پاس بھی تھا۔ وہ اب کسی کے موبائل یا لینڈ لائن سے اسے کال نہیں کر سکتی تھی، کہ سب کے موبائلز پوسٹ پیڈ تھے، اور ابا سارے بل ایک دفعہ ضرور دیکھتے تھے۔ البتہ جب حیا اپنی دوست کی ڈیتھ پہ آئی تو کچھ سوچ کر اس نے حیا سے تعلقات بحال کر لیے۔

وہ حیا کے موبائل سے ولید سے بات کرے گی تو حیا پھنسے گی، وہ نہیں۔ مگر جب حیا سب کے سامنے اپنا موبائل واپس لینے آئی اور اس کے جانے کے بعد ابا کی تفتیش اور ڈانٹ کو سہنا..... اس سب نے اسے، مزید ڈھیٹ بنا دیا۔

حیا کے جون میں واپس آ جانے کے بعد اسے جب موقع ملتا وہ حیا کا فون استعمال کر لیتی۔ بہت سی دفعہ تو حیا کو معلوم بھی نہ پڑتا تھا۔ جیسے سکندر انکل کی ڈیتھ اور سلیمان چچا کی بیماری والے دنوں میں حیا اتنی مصروف اور پریشان تھی کہ اسے پتا بھی نہ چلتا اور اس کا فون، وہ استعمال کر کے واپس اسی جگہ پہ رکھ بھی دیا کرتی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی اسے لگتا، ولید اس سے بور ہو گیا ہے۔ شاید وجہ اس کی منگنی تھی۔ زبردستی کی منگنی جو ابا نے فوراً سے کروا دی تھی۔ ان کو کیا لگتا تھا، وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی؟ ہونہہ۔ وہ بھاگنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اگر ولید اس کا ساتھ دیتا تو اس کے لیے وہ ابا اور بھائیوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی، مگر ولید ساتھ دیتا تب نا۔ پھر بھی وہ اس سے بات کرنا ترک نہیں کر سکی تھی۔ اور پتا نہیں وہ کون سا کمزور لمحہ تھا جب اس نے باتوں باتوں میں ولید کو اس ویڈیو کے بارے میں بتا دیا تھا۔ تب تک ویڈیو ہٹ چکی تھی، سو ولید اس کو دیکھ نہ پایا، مگر ہاں، وہ جانتی تھی کہ ویڈیو حیا نے ہٹوائی تھی، اور یہ بھی کہ حیا میجر احمد سے ملنے گئی تھی۔ حیا کا خیال تھا، کسی کو نہیں پتا، مگر اسے پتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے حیا کو اس گراؤنڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا جہاں سے ایک کار نے اسے پک کیا، اور پھر اسی دن ویڈیو ہٹ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ میجر احمد نے حیا سے رپورٹ کرنے کے لیے آنے کا کہا تھا، ساری بات اس کے سامنے ہی تو ہوئی تھی۔ کڑی سے کڑی ملا کر اسے ساری کہانی سمجھ آ گئی تھی۔ کبھی نہ کبھی وہ یہ بات حیا کے خلاف ضرور استعمال کرے گی، اور شاید اسی لیے اس نے ولید کو اس بارے میں بتایا تھا۔

ولید نے بہت دفعہ وہ ویڈیو مانگنا چاہی مگر وہ کیسے وے سکتی تھی؟ مگر وہ دن جب ابا کا ایکسیڈنٹ ہوا، اس سے پچھلے ہی دن اس نے سونیا کے کمرے سے نیٹ استعمال کر کے ولید سے بات کی تھی، اور وہ بضد تھا کہ ارم وہ ویڈیو اسے دے دے تا کہ وہ اسے حیا کے خلاف استعمال کر کے اس زبردستی شادی اور ابا کی نظروں سے گرائے جانے کا بدلہ لے سکے۔ چاہے تو اپنا پارٹ ایڈیٹ کر دے۔

اس خیال پہ وہ ایک دم چونکی تھی۔ ہاں، یہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنا پارٹ edit کر سکتی تھی۔ اس کو یہ کام آتے تھے۔ اپنی تصویر یا ویڈیو وہ ولید کو دینے کا رسک بھی نہیں لے سکتی تھی۔ ریسٹورانٹس اور دیگر جگہوں پہ اس نے اپنے کیمرے سے اپنی اور ولید کی ڈھیروں تصاویر اتاری تھیں، مگر اس کو کبھی اتارنے نہ دی، نہ ہی وہ تصاویر اس کو کبھی بھیجیں۔ وہ تصاویر اس کے لیپ ٹاپ میں ایک پاسورڈ لاکڈ فولڈر میں محفوظ تھیں۔ اب بھی اس نے خود کو نکال لیا۔ ویڈیو صرف حیا کی رہ گئی، ارم اس میں سے غائب ہو گئی، اور وہ ویڈیو ولید کو میل کرنے کے بعد اس نے حیا کے ڈرائیور کے فون سے اسے کال کر کے بتا بھی دیا۔

اس رات ابا کو زخمی حالت میں حیا اور فرخ گھر لائے تھے۔ حیا اس سارے قصے کا الزام ولید کے سر رکھ رہی تھی، مگر اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ولید ایسا کیسے.....؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ بہت مشکل ہے۔ دو روز بعد اسے حیا کا فون استعمال کرنے کا موقع ملا اور اس نے ولید کی ٹھیک ٹھاک کلاس لینی چاہی، مگر وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا، اس کی گاڑی تو ساتھ سے گزری تھی، جب کہ فرقان اصغر کو چوٹ گرنے کے باعث آئی تھی۔ شاید وہ چکرا کر گرے تھے۔ حیا خوامخواہ اسے اس معاملے میں گھسیٹ رہی ہے۔ ارم نے یقین کر لیا۔ اس کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی چوائس نہ تھی۔

اور آج حیا اس کو فون کر کے یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ سب جان گئی ہے۔ اس کی بلا سے۔ اب خود بھگتے سب۔ اس وقت حیا نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا، سو آج ارم بھی۔ اس کے ساتھ کھڑی نہیں ہو گی، یہ طے تھا۔

اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا۔ بھورا مائع ابھی تک کڑوا اور گرم تھا۔ اندر تک جلا دینے والا۔ اور پھر، جلنے سے زیادہ رسوا کن عذاب کون سا ہو سکتا ہے؟

☆ ☆ ☆

کپادوکیہ کا پراسرار حسن ویسا ہی تھا، مگر ایک دفعہ پھر اس میں اداسیاں گھل چکی تھیں۔ "آشیانہ" کے مکینوں نے ان کا استقبال اسی گرمجوشی اور محبت سے کیا جوان کا خاصا تھا، مگر اس کا دل اداس تھا۔ وہ اسے کچھ بھی بتائے بغیر چلا گیا تھا، بار بار واہمے ستا رہے تھے۔ اضطراب، بے چینی اور فکرمندی۔ دنیا بس ان تین جذبوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ دو دن کس کرب میں گزرے، کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا۔ رات میں وہ اسی صوفے پہ، جس کے عقب میں کھڑکی کھلتی تھی بیٹھ کر اسی طرح رونے لگی، مگر کوئی نہیں آیا جو اس کو کہتا کہ وہ پھر سے اس کے لیے آ گیا ہے۔

بہارے نیچے پنار کے ساتھ تھی۔ وہ سامنے ہوتی تو حیا یوں نہ روتی، مگر اکیلے میں اور بات ہوتی ہے۔ بہارے کے آنے کے بعد بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی، اور جب بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو وہیں سو گئی۔ شاید کہ کوئی اسے اٹھائے۔ کوئی اس کے سامنے میز پہ آ بیٹھے، اور ہولے سے اس کا شانہ چھو کر اسے آواز دے۔ مگر خواب ہر دفعہ پورے نہیں ہوتے۔

صبح اس کی آنکھ کسی شناسا سا آواز سے کھلی تھی۔ وہ آواز بہت دیر تک اس کی سماعت میں گونجتی رہی تھی، یہاں تک کہ وہ ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھی۔ یہ آواز..... اتنی مانوس، مگر یہ..... یہ تو......

وہ تیزی سے اٹھ کر صوفے کے پیچھے آئی اور کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹایا۔

کھڑکی کے باہر کسی ہک سے اس کا ونڈ چائم لٹک رہا تھا۔ دور کپادوکیہ کے افق پہ طلوع ہوتے سورج کی کرنوں سے اس کی کرسٹل کی پنکھڑیاں سنہری پڑ رہی تھیں، جیسے سونے کے پتنگے جھول رہے ہوں۔ اسٹیل، کانچ اور لکڑی کے ٹکرانے کی آواز۔ مانوس آواز۔

اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ بے اختیار اس نے لبوں پہ دونوں ہاتھ رکھ کر جذبات کو قابو کرنا چاہا، مگر آنسو پھر سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

وہ آ گیا تھا۔ وہ کپادوکیہ واپس آ گیا تھا اور اس طرح سے اس کو اپنی خیریت بتا رہا تھا۔ وہ اب اس کی زبان سمجھنے لگی تھی۔

دفعتاً اسے محسوس ہوا، ونڈ چائم کی ایک لڑی ساتھ کوئی کاغذ سا بندھا ہے۔ اس نے کھڑکی کا پٹ کھولا، اور ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذ اتارا۔

وہ ایک ٹور گائیڈ کے کسی ٹور کا معلوماتی پرچہ تھا۔ اس پہ جہان نے خود سے کچھ نہیں لکھا تھا، مگر وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے کل صبح اس ٹور کو لینا ہے، کیونکہ وہیں وہ جہان سے مل سکے گی۔

حیا نے ایک نظر پھر اس پرچے پہ بنی تصاویر پہ ڈالی، اور بے اختیار ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

ڈی جے اور اس کا سب سے بڑا خواب۔ سب سے بڑی ایکسائٹمنٹ۔

ہاٹ ایئر بیلون۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح ابھی سورج نہیں نکلا تھا، اور فجر کپادوکیہ کے میدانوں پہ قطرہ قطرہ اتر رہی تھی۔ حیا نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر دیکھا۔ کپادوکیہ کے پہاڑ ابھی تک جامنی اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ وہ خود بھی ابھی ابھی نماز پڑھ کر ہٹی تھی۔ پردہ برابر کر کے اس نے وال کلاک پہ ایک نظر ڈالی۔ صبح کے ساڑھے تین۔

بہارے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی منڈی منڈی آنکھوں سے خود کو آئینے میں دیکھتی، بال برش کر رہی تھی۔ حیا اپنے اجرک والی لمبی قمیص پہ عبایا پہن چکی تھی، اور اب سیاہ اسکارف چہرہ کے گرد لپیٹ رہی تھی۔

"حیا، کیا وہ مجھے ڈانٹے گا؟" برش سنگھار میز پہ رکھتے ہوئے بہارے نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں، میں ہوں نا۔ وہ کچھ نہیں کہے گا۔"

بہارے نے سر ہلا کر اپنے گلابی پرس سے بینڈ نکالا اور بال پونی کی طرح سمیٹے، پھر بینڈ لگانے سے قبل مڑ کر حیا کو دیکھا۔

"اگر میں بال نہ باندھوں تو کیا تم عائشے کو بتاؤ گی؟"

"ہو سکتا ہے بتا دوں۔ ویسے اگر تمہیں بال کھولنے ہی ہیں تو کھول کر ان کے اوپر اسکارف لے لو نا۔"

اس مشورے پہ بہارے نے ناپسندیدگی سے ناک سکوڑی، اور "اس سے تو پونی بہتر ہے" والی نظروں سے حیا کو دیکھتے ہوئے بالوں کو پونی میں جکڑ لیا۔

"آبلہ...... وین آ گئی ہے۔" فاتح نے باہر سے آواز لگائی۔ حالانکہ وہ اس سے بہت بڑی نہیں تھی، پھر بھی وہ اسے آبلہ کہتا تھا۔ (ترک آپا کو آبلہ اور بھائی کو آبی بولتے تھے۔)

"ہم تیار ہیں۔" وہ جلدی جلدی نقاب پن اپ کرتی، بہارے کا ہاتھ تھامے باہر نکل آئی۔

آشیانہ کے باہر ان کو ٹور کمپنی کی وین لینے آئی تھی جس نے انہیں ہاٹ ایئر بیلون کی سائیٹ پہ پہنچانا تھا۔ سارے انتظامات مولوت بے نے کروائے تھے، یوں ان کو ڈسکاؤنٹ بھی مل گیا تھا۔

ہاٹ ایئر بیلون فجر کے وقت اڑا کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی فلائٹ تھی یعنی کپادوکیہ کے اوپر اڑ کر وہ سارا خطہ دیکھ کر، واپس اتر جانا تھا۔

وین نے انہیں بیلون سائٹ پہ جب اتارا تو فجر ابھی تک تازہ تھی۔ وہ ایک ہائی وے تھی، اور اس کے دونوں اطراف کھلا، صاف علاقہ تھا۔ (جیسے پاکستان میں موٹر وے اور اس کے آس پاس کی جگہ ہوتی ہے۔) سڑک پہ ان کی وین کے ساتھ قطار میں بیسیوں وین کھڑی تھیں۔ بہت سے سیاح ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔

وہ بھی بہارے کا ہاتھ تھامے سڑک سے اتر کر بائیں طرف کے کھلے میدان میں آ گئی۔ وہاں ایک قطار میں ہاٹ ایئر بیلون زمین پہ رکھے تھے۔ یوں کہ ان کی ٹوکریاں سیدھی رکھی تھیں، جبکہ ٹوکری سے ننھی غبارہ، بچوں کے پلاسٹک کے ننھے سے، بغیر ہوا کے غبارے کی مانند ایک طرف ڈھلکا ہوا، زمین پہ سجدہ ریز پڑا تھا۔ بڑے بڑے غبارے، اور بڑی بڑی ٹوکریاں۔

"اب ہم نے کیا کرنا ہے حیا؟" بہارے کا سوال نامہ شروع ہو چکا تھا۔

"مجھے کیا پتا۔ میں تو خود پہلی دفعہ ہاٹ ایئر بیلون میں بیٹھنے لگی ہوں۔"

"اوہ...... میں بھی پہلی دفعہ بیٹھوں گی۔" بہارے چہکی۔ حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ بے اختیار اسے اپنی اور ڈی جے کی پہلی فلائٹ یاد آئی تھی۔

فلائٹ کے اڑنے میں وقت کم رہ گیا تھا۔ وہ دونوں گائیڈ کے کہنے کے مطابق اپنی ٹوکری میں جا بیٹھی تھیں۔ یہ پانچ سے سات افراد کی ٹوکری تھی۔ اگر خود ارینج کرتیں تو بیس افراد کی ٹوکری میں جگہ ملتی۔ مگر مولوت بے کی وجہ سے "کھلے کھلے سفر کرنے" کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔

ٹوکری کے اوپر ایک آڑنما چھت تھی، جس کے اوپر آگ جلانے کا انتظام تھا۔ جب آگ جلتی، تو گرم ہوا غبارے میں بھرتی، اور اسے اوپر اٹھا دیتی۔ فی الوقت ان کا نیلا اور زرد غبارہ زمین پہ بے جان سا ڈھلکا پڑا تھا۔

"وہ دیکھو!" تبھی بہارے نے اس کی کہنی ہلائی۔ حیا نے بے اختیار اس طرف دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہی تھی۔

دور، سیاحوں کے درمیان، وہ چلتا آ رہا تھا۔ سر پہ پی کیپ، آنکھوں پہ سیاہ گلاسز، ذرا سی بڑھی شیو۔ سفید پورے آستین کی ٹی شرٹ کو کہنیوں تک موڑے، نیلی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، وہ سر جھکائے قدم اٹھا رہا تھا۔ بیگ کندھے پہ تھا، اور ماتھے پہ پٹی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہفتہ تو ہو گیا تھا اس کے آپریشن کو، اب تک اس کی پٹی کھل ہی جانی چاہیئے تھی۔

وہ ان کے ساتھ آ کر ٹوکری میں بیٹھا، اور حیا کو لگا، خوبصورت گھوڑوں کی سرزمین کو اس کی ساری رعنائی واپس مل گئی ہے۔

"کیسے ہو؟" وہ جہان کی طرح سامنے سیدھی دیکھتی، بہت آہستہ سے بولی تھی۔ بہارے ان کے مقابل ہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ باقی کے دو سیاح ابھی ٹوکری میں چڑھ رہے تھے۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے زیر لب بولا۔

"آخری دفعہ سچ کب بولا تھا؟"

"ابھی دس سیکنڈ پہلے جب میں نے کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔"

حیا نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اسی طرح سامنے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھ کے قریب incision کا نشان گلاسز کے سائیڈ

سے صاف نظر آ رہا تھا۔اس نشان کے سوا پہلے سے وہ بہتر لگ رہا تھا۔

''کیا ہمیں یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ ہم تمہیں نہیں جانتے؟'' وہ دوبارہ چہرہ سیدھا کیے اسی طرح مدھم سا بولی تھی۔

''جب تک بیلون اوپر نہیں چلا جاتا تب تک، ہاں!''

پائلٹ اب بیلون کے اڑنے کا اعلان کر رہا تھا۔ٹوکری اطراف اور چھت سے کھلی تھی سوائے اس بچھے کے جس کے اوپر آگ جلائی جا رہی تھی۔جیسے جیسے شعلے بڑھتے گئے، گرم ہوا اس پھنسے ہوئے غبارے تک پہنچنے لگی۔زمین پہ اوندھے منہ گرا غبارہ ہولے ہولے پھڑپھڑانے لگا۔

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس دن تم بغیر بتائے ہاسپٹل سے کیوں چلے گئے؟''

''نہیں!'' وہ اتنی قطعیت سے بولا کہ وہ بالکل چپ ہوگئی۔

گرم ہوا اب ڈھلکے ہوئے غبارے کو اٹھانے کی سعی کر رہی تھی۔جیسے جیسے ہوا کا زور بڑھتا گیا، غبارہ ذرا پھول کر سیدھا ہونے لگا۔گرم ہوا ٹوکری کے اندر بیٹھے سیاحوں کو نہیں چھو رہی تھی۔ان کے لیے تو فجر کی تازہ ٹھنڈی ہوا ہر سو چل رہی تھی۔

ان گزرے دو دنوں میں، جب وہ اس کے ساتھ نہیں تھی، اسے بہت سی باتوں کا خیال آیا تھا جو وہ ہسپتال میں نہیں پوچھ سکی تھی۔معلوم نہیں یہ سوالات اس وقت کیوں یاد آتے ہیں جب مسئول ہمارے ساتھ نہیں ہوتا۔

''ایک بات پوچھوں؟'' چند لمحے گزرے تو اس نے پھر سے سلسلہ کلام جوڑا۔بہارے اب سر جھکائے اپنے گلابی پرس سے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

''ہوں؟''

غبارہ اب ہوا سے پھول کر، عین ان کے سروں پہ، ٹوکری کے اوپر، بالکل سیدھا، آسمان کی جانب رخ کیے کھڑا ہو چکا تھا۔اعلان کرنے والا اب ان کو سفر کی مزید تفصیلات سمجھا رہا تھا جس میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

''تم نے روحیل سے پیسے کیوں منگوائے تھے؟'' اب تک وہی اسے وضاحتیں دیتی آئی تھی، لیکن آج جہان کی باری تھی۔

''کچھ اکاؤنٹس کا مسئلہ تھا، نکلوا نہیں سکتا تھا، سو روحیل سے لے لیے۔پھر واپس بھی بھجوا دیے تھے۔''

''ایک اور بات بھی بتاؤ۔کیا تمہیں واقعی میرا نقاب کرنا بُرا لگتا ہے؟''

''میں نے کب کہا بُرا لگتا ہے؟'' وہ دونوں دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔غبارہ گرم ہوا سے بھر چکا تھا، اتنا زیادہ کہ وہ زور لگا کر اب ٹوکری کو ہوا میں اٹھانے لگا تھا۔جیسے ہی ٹوکری اوپر اٹھی، اندر بیٹھے سیاحوں میں شور سا مچا۔جوش، خوشی، چہک۔مگر بہارے گل اسی طرح اپنے پرس سے کوئی ایسی شے تلاش کر رہی تھی جو وہ ڈھونڈنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

''میں نے تو یونہی ایک بات پوچھی تھی، اگر مجھے پتا ہوتا کہ ارم سن رہی ہے تو میں ایسا کبھی نہ کرتا۔''

''اور تم نے مجھے برگر کنگ میں اس لیے بلایا تھا تاکہ میں تمہیں پاشا بے کے ساتھ دیکھ لوں؟''

''ہاں مگر میں چاہتا تھا کہ تم میرا مسئلہ سمجھو، نہ کہ مجھے بُرا سمجھو، مگر تم کسی کو جہنم میں بھیجتے ہوئے کہاں کسی کی سنتی ہو؟'' وہ سن گلاسز اتار کر سامنے شرٹ کے گریبان پہ اٹکاتے ہوئے بولا تھا۔حیا نے خفگی سے سر جھٹکا۔بس ایک بات پکڑ لی تھی اس نے، اور اب ساری زندگی اسے دہراتا رہے گا۔

ٹوکری اب ہوا میں چار، پانچ فٹ اوپر اٹھ چکی تھی۔پائلٹ اپنے پروگرام کے مطابق ابھی کم اونچائی پہ فضا میں بیلون کو یا تیرا رہا تھا۔پھر کافی دیر بعد اس نے آہستہ آہستہ بیلون اوپر اٹھانا تھا۔

''بہارے گل!'' وہ اب سرد لہجے میں پکارتا، اس کی طرف متوجہ ہوا۔

بہارے نے سر اٹھایا، پھر تھوک نگلا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے میری بات کیوں نہیں مانی؟''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ منہ بسورے بولی تھی۔

"تم حیا کے ساتھ کیوں آئی ہو؟"

"حیا اور میں کپادوکیہ دیکھنے آئے ہیں۔ ہمیں تو پتا بھی نہیں تھا کہ تم بھی ادھر ہو۔ کیا تم ہمارے لیے ادھر آئے ہو؟" کہہ کر اس نے تائیدی نگاہوں سے حیا کو دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلایا۔ صبح ہی اس نے یہ بیان بہارے کو رٹوایا تھا۔

"تم ہمیشہ میرے لیے مسئلے کھڑے کرتی ہو۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہاری بہن کتنی پریشان ہے؟" برہمی سے اسے جھڑکتا اب وہ جہان نہیں، عبدالرحمٰن لگ رہا تھا۔ یا پھر شاید ترکی میں پہلے دنوں کا جہان۔

"اگر تم نے مجھے ڈانٹا تو میں ٹوکری سے نیچے کود جاؤں گی۔" وہ ناراضی سے ایک دم بولی تو حیا کا گویا سانس رک گیا۔

"بہارے....." اس نے اسے منع کرنا چاہا مگر۔

"یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ شاباش، کود و۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ ٹیک لگا کر بیٹھا، اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

بہارے خفا خفا سی کھڑی ہوئی اور ٹوکری کی منڈیر پہ دونوں ہاتھ رکھ کر نیچے جھانکا، پھر مڑ کر ان دونوں کو دیکھا۔

"جہان..... مت کرو....." اس کا دل کانپ اٹھا تھا۔ وہ اٹھنے لگی مگر جہان نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"تم درمیان میں مت بولو۔ ہاں تو بہارے خانم، میں انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی کود و، میرا وقت نہ ضائع کرو۔"

ان کی طرف دوسرے سیاح قطعاً متوجہ نہ تھے۔ وہ اپنی تصاویر میں مشغول تھے۔ بہارے منڈیر پہ ہاتھ رکھے رکھے جھکی، زمین کو دیکھا جو چھ سات فٹ دور تھی، اور پھر ایک دم دھپ سے آ کر واپس بیٹھ گئی۔

"عائشے گل کہتی ہے، خودکشی حرام ہوتی ہے۔" منہ پھلائے وہ خفا سی بولی تھی۔

حیا کی اٹکی سانس بے اختیار بحال ہوئی۔ یہ چھوٹی بلی بھی نا!

"میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں!" جہان نے سر جھٹکا، اور پھر گردن پھیر کر ٹوکری سے باہر دیکھنے لگا۔ تاحدِ نگاہ کپادوکیہ کی چاندی سرزمین دکھائی دے رہی تھی۔ پہاڑ، خاکی میدان، عجیب و غریب ساخت کے نمونے جن کا بیان الفاظ میں ناممکن ہے۔

غبارہ اب درختوں کی ایک قطار کے ساتھ فضا میں تیر رہا تھا۔ درختوں کے سر اور ٹوکری کی منڈیر برابر سطح پہ تھے۔ وہ خوبانی کے درخت تھے۔ پھلوں کے بوجھ سے لدی شاخیں اور پکی خوبانی کی رسیلی مہک۔ "کیا ہم یہ توڑ سکتے ہیں؟" چھوٹی بلی کو اپنی ساری ناراضی بھول گئی۔

"نہیں!" حیا نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔

"ہاں۔" جہان کہتے ہوئے کھڑا ہوا اور منڈیر پہ جھک کر قریب سے گزرتے درخت کی ایک ٹہنی کو ہاتھ بڑھا کر پکڑا۔ "یہ مہمان نوازی کے درخت ہیں اور ادھر بیلون اس لیے اڑایا جا رہا ہے تاکہ تم ان کو توڑ سکو!" حیران سی حیا کو وضاحت دیتے ہوئے اس نے ایک خوبانی کھینچ کر توڑی۔ پھل شاخ سے الگ ہوا تو شاخ فضا میں جھول کر رہ گئی۔

بیلون آہستہ آہستہ اسی طرح ہوا میں تیرتا رہا۔ دنیا جیسے ٹرانسفارم ہو کر ہیری پوٹر کی کتابوں میں جا پہنچی تھی۔

"کیا تم کھاؤ گی؟" اس نے پوچھا مگر انکار سن کر پھل بہارے کو تھما دیا۔ اس نے اپنے پرس سے پہلے رومال نکالا، اس سے خوبانی اچھے سے رگڑ رگڑ کر صاف کی، پھر کھانے لگی۔ عائشے گل کی بہن!

"تمہیں کس نے بتایا روحیل کے ولیمے کا؟" اسے اچانک یاد آیا، دیرین کیو کے زیرِ زمین شہر میں جہان نے ذکر کیا تھا۔

"جب تم اس سے فون پہ بات کر رہی تھیں تو میں وہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ واپس آ چکا ہے اپنی بیوی کو لے کر؟" کہنے کے ساتھ اس نے ابرو سوالیہ انداز میں اٹھائی۔ حیا نے اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھ کے قریب لگا نشان دیکھ کر ہی تکلیف ہوتی تھی۔

"ہم روحیل کے ولیمے تک واپس پہنچ جائیں گے نا جہان؟"

"ہاں شیور۔ بس دو دن مزید لگیں گے کپادوکیہ میں، پھر مجھے یہاں سے جانا ہے۔"

غبارہ اپنے پنجوں میں ٹوکری کو اٹھائے، اب اوپر اٹھتا جا رہا تھا، دور صبح کی سفیدی آسمان پہ پھیلنے لگی تھی۔ درخت نیچے رہ گئے تھے۔

"پھر کہاں جاؤ گے؟"

''یہاں سے انقرہ، وہاں ایک کام ہے، پھر وہاں سے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ترکی کے بارڈر پہ، ادھر جاتا ہے، پھر ادھر سے شام۔''
''تو انقرہ سے ڈائریکٹ شام چلے جاؤ!''
''انقرہ اور شام کا بارڈر نہیں ملتا حیا۔''
''بارڈر سے کیوں جاؤ گے؟ ایئرپورٹ سے چلے جاؤ۔'' اپنے تئیں اس نے اچھا خاصا مشورہ دیا تھا۔ جہان نے گردن موڑ کر ایک افسوس کرتی نگاہ سے اسے دیکھا۔
''مادام، ایئرپورٹ پہ پاسپورٹ دکھانا ہوتا ہے، اور میں ادھر اِل لیگل ہوں، بارڈر کراس کر کے آیا تھا رات میں، ایسے ہی واپس جاؤں گا۔''
اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔
''تم... تم اِل لیگل (غیر قانونی طریقہ) طریقے سے بارڈر کراس کر کے جاؤ گے؟'' اس نے دبی آواز میں دہرایا۔ وہ دونوں اپنی زبان میں، بہت آہستہ آواز سے باتیں کر رہے تھے۔
''مجھے قانون کی پاسداری پہ کوئی لیکچر مت دینا۔ مجھے اسی طرح واپس جانا ہے۔ ویسے بھی شام کے لیے ترکوں کو ویزہ درکار نہیں ہوتا، مگر پاسپورٹ دکھانا پڑتا ہے۔''
''اچھا ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔ پھر کب جانا ہے؟''
''ابھی نہیں، کل بتاؤں گا۔''
دور، نیچے، زمین بہت چھوٹی نظر آ رہی تھی۔ وہ اب "Fairy Chimneys" کے اوپر اڑ رہے تھے۔ فیری چمنی یا ''پری بجلاری'' Peri Bacalari ایک قدرتی ساخت تھی جو لاوا سوکھنے کے بعد اس سرزمین پہ چھوڑ گیا تھا۔ کافی فاصلے پہ اونچے اونچے ستون سے کھڑے تھے، جن کے سروں پہ ٹوپیاں تھیں، بالکل جیسے مشروم (کھمبیاں) ہوتے ہیں۔ بس ان کھمبیوں کی ڈنڈیاں بہت اونچی تھیں۔

''مطلب بارڈر تک ہم ساتھ جائیں گے؟''
''حیا..... ہم انقرہ تک ساتھ گئے، یہ بہت ہے، تم اب ادھر آ کر کیا کرو گی؟'' وہ جیسے اکتایا تھا۔
''ہماری بات ترکی کی ہوئی تھی۔ ڈیل، ڈیل ہوتی ہے۔ بس ہم بارڈر تک ساتھ ہیں۔''
''ویسے تم تو صرف کپادوکیہ دیکھنے آئی تھیں نہیں؟''
اس کے انداز پہ حیا کا دل چاہا، زور سے کہے، کہ نہیں، ہرگز نہیں مگر..... انا..... انا ہر دفعہ آڑے آ جاتی تھی۔
''ہاں، اور اب تمہاری وجہ سے میں زیادہ دن کپادوکیہ میں رہ بھی نہیں پاؤں گی، اس لیے اس کو میرا احسان گرداننا۔'' وہ بے نیازی سے شانے اچکا کر بولی۔
''ہاں، میں نے یقین کر لیا۔ ویسے اب اس جگہ کو دیکھ کر بتاؤ۔ دنیا کا سب سے خوبصورت شہر کون سا ہے؟''
''اسلام آباد آف کورس!'' وہ مسکرا کر بولی۔
''تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو؟'' بہارے یقیناً ان سے بور ہو کر پنار کو مس کرنے لگی تھی۔ انسان کا ازل سے ابد تک کا مسئلہ۔ اپنی تعریف کرنے والے اسے ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔
''میں آ تا ہوں تمہارے پاس۔'' پھر وہ حیا کی طرف مڑا۔ ''اسے کچھ بھی مت بتانا۔ غلطی سے بھی نہیں۔''
''فکر نہ کرو، مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔''
جہان نے ایک نظر اس کو دیکھتے ہوئے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ ایک نظر بہت اپنی اپنی سی تھی۔ جیسے وہ دونوں شریکِ راز تھے۔ اپنے تھے۔ رازوں کی اپنائیت۔ اسے بہت اچھا لگا۔
''تمہیں لگتا ہے میں بہت کم عقل ہوں۔'' وہ اسی خوشگوار موڈ میں کہنے لگی۔ ''اور تمہیں یہی لگتا ہے کہ میں تمہاری باتیں سمجھ نہیں سکتی، مگر

یونو واٹ جہان، اصل میں تم ماننا ہی نہیں چاہتے کہ تمہاری بیوی تم سے زیادہ اسمارٹ ہو سکتی ہے۔" روانی میں "تمہاری بیوی" کب اس کے لبوں سے نکلا، اسے پتا بھی نہیں چلا۔

جہان اس سارے معاملے میں پہلی دفعہ مسکرایا۔

"میری بیوی جتنی بھی اسمارٹ ہو، مجھ سے دو قدم ہمیشہ پیچھے رہے گی۔ ویسے آپ کا پاؤں کیسا ہے؟"

"میرے پاؤں کو کیا ہوا؟ بالکل ٹھیک تو ہے۔" اس نے شانے اچکا کر کہا، اس کا پاؤں اتنا ہی درد کرتا تھا جتنا پہلے دن کیا تھا، مگر وہ ظاہر ہونے دے، یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

جہان نے مسکرا کر سر جھٹکا اور اٹھ کر بہارے کے ساتھ خالی جگہ پہ جا بیٹھا۔

"جہان، اسے مت ڈانٹنا، میں اسے لے کر آئی ہوں، اور پھر....."

"حیا، تمہیں معلوم ہے تم مجھے کب، بہت اچھی لگتی ہو؟"

وہ جو بولے جا رہی تھی، ایک دم رکی، آنکھیں ذرا سی حیرت سے پھیلیں۔

"کب؟"

"جب تم خاموش رہتی ہو!"

حیا کی بھنوئیں بھنچ گئیں، اور وہ چہرہ پورا موڑ کر خاموشی سے ٹوکری کے پار دیکھنے لگی۔

وہ دونوں اب دھیمی آواز سے اپنی زبان میں بات کر رہے تھے۔ بیلون اب پری چمناری کے عین اوپر ہوا میں کسی کشتی کی طرح تیر رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کا کھانا ان دونوں نے آشیانہ کے قالینوں والے ڈائننگ روم میں کھایا تھا۔ جہان صبح بیلون سائیٹ سے ہی واپس ہو گیا تھا۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ کھانے کے وقت کہیں سے نمودار ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کا دل کسی پینڈولم کی طرح امید اور ناامیدی کے درمیان گھومتا رہا، یہاں تک کہ اس نے خود کو سمجھا لیا کہ وہ سارا دن ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، اسے اپنے بھی کام تھے۔

آشیانہ میں آج دو تین مزید فیملیز آئی ہوئی تھیں، پھر بھی مولوت بے اور مسز سونا ان کا پہلے دن جتنا خیال رکھ رہے تھے۔ رات میں وہ سوئی تو فجر کے لیے اٹھی، پھر نماز پڑھ کر دوبارہ سے سو گئی۔ قریباً دو تین گھنٹے بعد دستک سے آنکھ کھلی۔

"آبلہ، آبلہ۔" فاتح پکار رہا تھا۔

ایک تو یہ آبلہ کا زبردستی کا بھائی بھی نا، آرام نہیں کرنے دے گا۔ وہ جب کلستی ہوئی دروازے تک آئی، وہ جا چکا تھا۔ دروازے کی درز سے البتہ اس نے ایک خط کا لفافہ ڈال دیا تھا۔

اس نے جھک کر لفافہ اٹھایا، اسے کھولا اور اندر رکھا سفید، موٹا کاغذ نکالا۔ اوہ! یہ لکھائی جو وہ ہمیشہ پہچان سکتی تھی۔

I Hope Ladies Are Rejoining At 2:00 Pm

سطر پڑھ کر وہ بے اختیار مسکرا دی۔ یعنی وہ دو بجے مل رہے تھے۔ کدھر؟ جگہ اس نے نہیں لکھی تھی، مگر وہ سمجھ گئی تھی۔ وہ ان کے پاس آئے گا پھر اکٹھے وہ کہیں جائیں گے۔

بعد میں جب اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو سفید گلابوں کا بوکے بھی پڑا تھا، جو فاتح نے لفافے کے ساتھ ہی رکھا ہو گا۔ وہ ان کو بھی اندر لے آئی، اور صوفے کے ساتھ رکھی میز کے گلدان میں سجا دیا۔

گلاب کی تازہ، دلفریب مہک دنیا کی سب سے الگ مہک ہوتی ہے۔ بچپن میں اسے گلاب کی پتیاں کھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ نہ میٹھی ہوتیں نہ نمکین، بس کوئی الگ سا ذائقہ تھا۔ ابھی یہ حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر بہارے اٹھ کر دیکھ لیتی تو کتنی شرمندگی ہوتی؟

بہارے نے ناشتے کے بعد وہ پھول دیکھے تھے۔

"یہ کہاں سے آئے؟"

"عبدالرحمٰن نے بھجوائے ہیں۔" وہ بستر سمیت رہی تھی۔

"کتنے پیارے ہیں.....حیا....." بہارے ذرا رک کر بولی۔ "کیا تم نے کبھی گلاب کی پتیاں کھائی ہیں؟"

وہ جو بیڈ کور تہہ کر رہی تھی، پلٹ کر اسے دیکھا۔

"تمہیں لگتا ہے، مجھ جیسی ڈیسنٹ لڑکی ایسا کر سکتی ہے؟" سچ بولنے کا موڈ نہیں تھا، اور جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی، سو الٹا سوال کر لیا۔

ڈیڑھ بجے وہ تیار ہو کر اپنے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ انتظار اس دنیا کی سب سے تکلیف دہ شے ہے۔ بار بار گھڑی کو دیکھنا۔ جانے کب آئے گا وہ؟

اس نے پھر سے اس کا خط نکال کر پڑھا۔ 2 بجے کا وقت ہی لکھا تھا اس نے۔ وہ کاغذ واپس ڈالنے لگی، پھر ٹھہر گئی۔

یوں تو وہ عام سی سطر تھی، مگر کچھ تھا اس سطر میں جو غلط تھا۔ بہارے اس کے کندھے کے اوپر سے جھانک کر وہ پڑھنے لگی۔

"ہاں، یہ اسی نے لکھا ہے۔ یہ اسی کی لکھائی ہے۔ دیکھو، ہر ورڈ کا پہلا حرف بڑا لکھا ہے۔" جو چیز اسے الجھا رہی تھی، بہارے نے اس کی نشاندہی کر دی۔ وہ ذرا سی چونکی۔

"ہاں، مگر کیوں؟"

"جب اس نے مجھے سیاروں کے نام سکھائے تھے تو ایسے ہی لکھا تھا۔ دکھاؤں تمہیں؟" وہ جھٹ سے اپنا گلابی پرس اٹھا لائی اور اندر سے ایک گلابی ڈائری نکالی، پھر کھول کر ایک صفحہ حیا کے سامنے کیا۔

اس پہ لکھا تھا

"My Very Elegant Mother Just Served Us Nine Pizzas".

"یہ کیا ہے؟" اس نے اچنبھے سے وہ عبارت پڑھی۔ ہر لفظ کا پہلا حرف بڑا تھا۔

"دیکھو، ہر بڑے حرف سے سیارے کا نام بنتا ہے، مائی کے ایم سے مرکری، وری کے وی سے وینس، ای سے ارتھ، اور اس طرح یہ فقرہ یاد کرنے سے مجھے سیاروں کی ترتیب یاد ہو گئی۔ سناؤں؟"

"نہیں، مجھے یہ دیکھنے دو۔" اس نے جلدی سے ایک قلم اٹھایا، اور جہان کے اس فقرے کے ہر بڑے حرف کو علیحدہ نیچے اتارا۔

"اس سے بھی کوئی دوسرا فقرہ بنے گا شاید....." الفاظ اس کے لبوں میں رہ گئے۔ وہ چھے حروف ایک ساتھ لکھے ہوئے اس کے سامنے تھے۔

IHLARA

"اہلارا؟" اس نے بے یقینی سے دہرا کر بہارے کو دیکھا۔

"اہلارا!" بہارے گل چیخی۔

"اللہ اللہ!" قریباً بھاگتے ہوئے اس نے اپنا پرس اور عبایا اٹھایا، پھر گھڑی دیکھی۔ دو بجنے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

وادئ اہلارا کا نام اہلارا گاؤں کے نام پہ تھا جو اس وادی کے قریب واقع تھا۔ یہ وادی یوں تھی کہ دو دیوہیکل چٹانیں چند کلومیٹر کے فاصلے پہ آمنے سامنے کھڑی تھیں، ان کے درمیان سے دریا بہتا تھا، اور جنگل بھی تھا۔ اطراف میں پہاڑ تھے۔ یہ درمیان کی وادی اہلارا وادی تھی۔ سیاح اکثر کپادوکیہ میں "عشق وادی" (لو ویلی) گل شہر (روز ویلی) اور اہلارا ویلی وغیرہ میں ٹریکنگ کے لیے آیا کرتے تھے۔

اہلارا کا ٹریک یہ تھا کہ ایک چٹان سے دوسری چٹان تک، دریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جاتا تھا۔ اصل ٹریک سولہ کلومیٹر لمبا تھا، مگر دو شارٹ کٹ بھی بنے تھے۔ ایک سات کلومیٹر، جبکہ دوسرا ساڑھے تین کلومیٹر لمبا تھا۔

یہ اس کا اندازہ تھا کہ آپریشن کے باعث وہ بہت زیادہ پیدل نہیں چل سکتا ہوگا، اس لیے وہ انہیں سب سے چھوٹے ٹریک کے دہانے پہ مل جائے گا۔ مولوت بے نے انہیں وہیں ڈراپ کر دیا تھا۔ دو کب کے بج چکے تھے، اور ان کو کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ ان سے پہلے کا پہنچ چکا تھا۔

سیاحوں کی چہل پہل میں بھی دور سے حیا نے اسے دیکھ لیا تھا۔

ایک بڑے پتھر پہ بیٹھا، سر پہ پی کیپ، کندھے پہ بیگ اور گلاسز سامنے کرے شرٹ پہ اٹکی ہوئی۔ وہ انہی کو، دھوپ کے باعث آنکھیں سکیڑ کر دیکھ رہا تھا۔

وہ درمیانی رفتار سے چلتی، بہارے کا ہاتھ تھامے، اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے جہان پہ غصہ تھا۔ کیا تھا اگر وہ انسانوں کی زبان میں بتا دیتا کہ اہلا راولی آ جاؤ۔ اگر جو وہ یہ کوڈ نہ جان سکتی، اگر جو وہ نہ مل سکتے تب؟ لیکن تب بھی وہ اسی پہ ملبہ ڈال دیتا۔ آخر وہ اس جیسی اسمارٹ تھوڑی تھی؟

وہ دونوں اس کے قریب آئیں تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری لغت میں دو بجے کا مطلب ایک بج کر پچپن منٹ ہوتا ہے۔"

اور اب ٹائم دیکھو، وہ سنجیدگی سے سرزنش کر رہا تھا۔

کاش اس کی یہ لغت کتابی شکل میں دستیاب ہوتی تو وہ اسے اٹھا کر۔ اف!۔

"اچھا پھر واپس چلی جاتی ہوں۔"

"خیر اب تو میں نے اتنا وقت ضائع کر لیا۔ آؤ، اب چلتے ہیں۔" ہاتھ سے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ اسی جانب چل پڑا۔

"تم نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں کیسی ہوں؟" بہارے نے احتجاجاً اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔

"سوری۔ تم کیسی ہو؟" بجائے جھڑکنے کے، وہ معذرت کرنے لگا۔

بہارے "بہت اچھی" کہہ کر اسے آشیانہ کے بارے میں بتانے لگی، جہاں دنیا کی سب سے اچھی لڑکی پنار رہتی تھی۔

"اچھا..... ہاں..... حیا....." اس کی بات سنتے سنتے اس نے ایک دم حیا کو پکارا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں آئیڈیا نہیں ہوا کہ ہم نے ٹریک پہ جانا ہے؟ میں نے تو صبح ہی بتا دیا تھا۔"

(میری سمجھ میں اب آیا ہے، یو ایڈیٹ!)

"ہاں، تو؟"

"اور تم ان جوتوں کے ساتھ آئی ہو؟" ذرا خفگی سے کہتے ہوئے اس نے حیا کے قدموں کو دیکھا۔ حیا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گردن جھکائی۔ اور ایک کراہ اس کے لبوں سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔

اللہ، اللہ، وہ جلدی میں وہی سرخ ہیل پہن آئی تھی۔

"ہاں، میں ان جوتوں میں بھی دو گھنٹے پیدل چل سکتی ہوں" اور ڈی جے نے ہی تو کہا تھا کہ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ ہار نہ مانے، پھر وہ کیسے ہار مان لیتی؟

"شیور" تمہارا پاؤں....."

"ٹھیک ہے میرا پاؤں۔ چلو اب!" وہ اکتا کر کہتی آگے بڑھ گئی۔ بہارے نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑ دیا۔

وہ گھنے درختوں میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ دریا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دونوں اطراف خشک اونچی چٹانیں تھیں جن میں غار کی صورت چرچ بنے تھے۔ تھوڑی دور جا کر ہی اس کا پاؤں جواب دینے لگا تھا۔ وہ موچ جس کو وہ کب سے نظر انداز کرنے لگی تھی، شاید موچ سے بڑھ کر تھی۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے جب جہان نے کہا کہ ذرا رک جاتے ہیں۔ بائیں جانب چٹان میں سیڑھیاں بنی تھیں جو اوپر ایک غار نما چرچ میں جاتی تھیں۔ وہ ان سیڑھیوں پہ چڑھتے اوپر آ گئے۔ بہارے کو اس نے اپنا کیمرہ دے کر چرچ کی تصاویر بنانے اندر بھیج دیا اور خود وہ سیڑھیوں کے دہانے پہ اوپر نیچے بیٹھ گئے۔

"کیا تم مجھ سے خفا ہو؟" وہ جو نیچے گہری وادی، دریا اور چٹانیں دیکھ رہی تھی، اس کے دوستانہ انداز پہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں ایسا کیوں لگا؟"

"یونہی۔ حالانکہ اب تو میں تمہیں اپنے ساتھ بارڈر تک بھی لے جا رہا ہوں، مگر تم ہمیشہ خفا رہتی ہو۔" کہنے کے ساتھ اس نے کندھے سے اپنا بیگ اتارا اور اندر سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا۔

"نہیں، میں خفا نہیں ہوں اور تمہارا پروگرام.....؟" اس نے اسے نقشہ کھول کر دونوں کے درمیان میں پھیلاتے دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"دیکھو..... یہ کپادوکیہ ہے جہاں ہم ہیں۔" اس نے نقشے پہ ایک جگہ انگلی رکھی، حیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس پل وادئ اہلارا پہ ہر سو چھایا سی تن گئی تھی۔ ٹھنڈا، میٹھا سا موسم، اور نیچے بہتے دریا کا شور۔

"یہ رہا ترکی اور شام کا بارڈر۔" اس نے بارڈر کی موٹی لکیر کو انگلی سے چھو کر بتایا۔ "یہاں ترکی کا چھوٹا سا قصبہ ہے، Kilis نام کا۔ ہم نے کیلیس جانا ہے، وہاں سے یہ بارڈر کراس کر کے میں ادھر شام کے شہر Aleppo چلا جاؤں گا۔ کیلیس سے بارڈر قریباً 3 کلومیٹر دور ہے۔ منگل کی رات ٹھیک ڈھائی بجے مجھے یہ بارڈر کراس کرنا ہے۔ وہاں سے تم واپس چلی جاؤ گی اور پھر میں خود ہی پاکستان آ جاؤں گا۔"

اللہ، اللہ، وہ اتنی خطرناک باتیں کتنے آرام سے کر لیتا تھا۔

"کیا بارڈر کراس کرنا اتنا آسان ہوگا؟" وہ متذبذب تھی۔ دل کو عجیب سے واہمے ستانے لگے تھے۔

"حیا، ترکی اور شام کا بارڈر آسان ترین بارڈر ہے۔ یہ 900 کلومیٹر لمبا ہے۔ اب کیا سارے 900 کلومیٹر پہ پہرہ لگا سکتے ہیں بارڈر فورسز والے؟ نہیں نا۔ سو یہاں صرف خاردار تاریں ہیں جن میں بہت سے سوراخ ہیں۔ ہر رات کتنے ہی لوگ اس بارڈر کو پورے پورے اہل و عیال سمیت کراس کر لیتے ہیں۔" وہ بہت بے نیاز سے انداز میں نقشہ لپیٹتے ہوئے بتا رہا تھا۔ حیا نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"اور بارڈر سیکیورٹی فورسز؟ وہ کیوں نہیں ان لوگوں کو پکڑتیں؟"

"وہ صرف ان کو پکڑتی ہیں جو خود چاہیں۔ اگر ہم نہ پکڑے جانا چاہیں تو فورسز ہمیں نہیں پکڑ سکتیں۔"

"مگر جہان، میں نے تو سنا ہے کہ اس بارڈر پہ بارودی سرنگیں ہوتی ہیں جو پاؤں پڑنے پہ پھٹ سکتی ہیں۔" وہ جتنی پریشان ہو رہی تھی، وہ اتنا ہی پُرسکون تھا۔

"او مجھے پتا ہے کون سی سرنگ کہاں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر مت کرو۔"

وہ کچھ دیر اسی طرح کی باتیں کرتے رہے، پھر اس نے گردن اٹھا کر سورج کو دیکھا۔

"نماز پڑھ لوں میں ذرا۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جہان نے اس کے سرخ جوتوں کو دیکھا۔

"جب تم وضو کرنے کے لیے یہ جوتے اتارو گی تو میں انہیں دریا میں پھینک دوں گا۔" حیا نے مسکرا اسے دیکھا۔

"تو میں انہیں اتاروں گی ہی نہیں۔ میرا دین بہت آسان ہے۔"

وہ نیچے اتری، اور دریا سے وضو کر کے صاف جوتوں کو پھر سے صاف کر کے انہی میں نماز پڑھی، اور جب وہ واپس آئی تو جہان اور بہارے آمنے سامنے چرچ کے داخلی دروازے کے پاس کھڑے تھے۔

"تمہاری عادت نہیں گئی چھپ کر باتیں سننے کی! تم کیوں کر رہی تھیں ایسا؟" وہ غصے سے اسے کہہ رہا تھا۔ سر جھکائے کھڑی بہارے نے منمنانا چاہا۔

"میں نے کچھ نہیں سنا۔ بس تھوڑا سا خود بخود....."

"میں تمہارا خود بخود اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے اس بات کا ذکر کسی سے بھی کیا، تو میں بہت بُرا پیش آؤں گا۔ تمہیں سمجھ آیا جو میں نے کہا؟"

"میں نے کچھ نہیں سنا۔"

تبھی جہان نے حیا کو دیکھا، تو سر جھٹک کر اس تک آیا۔

"کیا وہ ہماری باتیں سن رہی تھی؟" حیا نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، میرا نہیں خیال اس نے کچھ اتنا خاص سنا ہے۔ بہر حال میں اسے خبردار کر دیا تھا۔"

"تم پریشان مت ہو، اگر اس نے کچھ سنا ہو تو بھی سمجھ کہاں آئی ہو گی!"

جہان نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا، اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"وہ اپنی بہن کی جاسوس ہے۔ ایک ایک بات ادھر بتائے گی۔ اس پہ نظر رکھنا، یہ کسی کو فون نہ کرے۔"

"اس کا فون تو آشیانہ میں پڑا تھا چارج پہ لگا تھا۔ تم فکر نہ کرو، واپس جا کر میں فون ہی لے لوں گی۔"

جہان کچھ کہے بنا سیڑھیاں اترنے لگا۔

حیا نے پلٹ کر بہارے کو دیکھا، پھر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے، اپنا گلابی پرس مضبوطی سے پکڑے ان کے پیچھے چلنے لگی۔

اس کا موبائل اس کے گلابی پرس کے اندرونی خانے میں رکھا تھا۔

❁.....❁.....❁

آخری باب

آنے اپنی مخصوص کرسی پہ بیٹھیں، سلائیوں کو مہارت سے چلاتی، سویٹر بُن رہی تھیں۔ اون کا گولا لڑھک کر ان کے قدموں کے قریب گرا پڑا تھا۔
عائشے گل ان سے فاصلے پہ بڑے صوفے کے ایک کونے پہ ٹکی، اون کے گولے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دھاگے پہ جمی تھیں، مگر ذہن کہیں دور بھٹک رہا تھا، زندگی اب اون کے گولے کی سی لگتی تھی۔ کوئی اُسے کب بُن دے، کب ادھیڑ دے۔ سلائیاں اس کے ہاتھ میں تو تھی ہی نہیں۔
''عائشے، تمہارا فون بج رہا ہے۔'' آنے کے پکارنے پہ وہ چونکی، گود میں رکھا موبائل کب سے بج رہا تھا۔
اس نے نمبر دیکھا، اور پھر ایک معصوم سی مسکان نے اس کے لبوں کو چھو لیا۔
''بہارے!'' نمبر پہ لکھا نام بہت محبت سے لے کر اس نے آنے کو بتایا، اور سبز بٹن دبا کر فون کان سے لگایا۔
''سلام علیکم!'' اس نے مسکرا کر سلام کیا تھا۔
''میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ، ترکی والے کیسے ہیں؟'' اس کی مسکراہٹ اور بھی خوبصورت ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں طمانیت کے سارے رنگ اتر آئے تھے۔
''ہاں، بتاؤ، کیا ہوا؟'' اس کے الفاظ سن کر آنے نے بے اختیار سلائیاں چلاتے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔
اسی پل عائشے سیدھی ہو کر بیٹھی۔ اس کی مسکراہٹ ایک دم سمٹی تھی۔
''کون سا بارڈر؟ ترکی اور شام کا؟'' اس نے آہستہ سے دہرایا تھا۔ آنے فاصلے پہ بیٹھی تھیں۔ ان کو سنائی نہیں دیا تھا، مگر انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا ضرور تھا۔ وہ ان کو یوں دیکھتے پا کر زبردستی ذرا سی مسکرائی، پھر معذرت خواہانہ نگاہوں سے گویا اجازت طلب کرتی، اٹھ کر کچن میں آ گئی۔
آنے نے ذرا حیرت سے اسے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ کچن کے کھلے دروازے سے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی، فون پہ بات کرتی نظر آ رہی تھی۔ آنے واپس سلائیوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
''ہاں، کہو پھر، میں سن رہی ہوں۔'' کاؤنٹر پہ کہنی رکھ کر جھکے کھڑے عائشے نے ایک محتاط نظر باہر لاؤنج میں کھڑکی کے پاس بیٹھی آنے پہ ڈالی۔ وہ اب اس کی جانب متوجہ نہیں تھیں۔
''ذرا اونچا بولو، اتنا آہستہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔ کیا کوئی آس پاس ہے؟'' اس نے رک کر سنا، پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، مجھے ساری بات سمجھاؤ اب۔''
اس نے پھر ادھ کھلے دروازے سے جھانکا۔ آنے اپنی بُنائی میں مصروف تھیں۔
''کیا؟ ایک منٹ۔ مجھے سمجھ نہیں آیا۔ کیلیس کے کس طرف ہے وہ بارڈر؟'' وہ تیزی سے فریج کی جانب بڑھی اور اس کے دروازے پہ نصب ہولڈر سے پین نکالا، اور ساتھ ہی آویزاں نوٹ پیڈ کے اوپری صفحے پہ تیزی سے لکھنے لگی۔ ''منگل کی رات، یعنی پیر اور منگل کی درمیانی رات، دو سے تین بجے، وہ الیگل بارڈر کراس کرے گا، اچھا، اور......؟'' روانی سے چند الفاظ گھسیٹے گئی۔
''ہاں، ٹھیک، میں سمجھ گئی۔ اچھا...... او کے......'' اس نے پین واپس ہولڈر میں رکھا، اور نوٹ پیڈ کا صفحہ پھاڑا، پھر تہہ کر کے مٹھی میں دبا لیا۔
''اچھا...... میں...... دیکھتی ہوں۔ کیا ہوا؟ کوئی آ گیا ہے؟ اچھا تم فون رکھو، بعد میں بات کریں گے، مرحبا!'' اس کا ''مرحبا'' ادا ہونے سے قبل ہی فون بند ہو چکا تھا۔ اس نے ایک نظر موبائل کو دیکھا، اور پھر چند گہرے گہرے سانس لے کر اپنے حواس بحال کیے۔ دل ابھی تک

یونہی دھڑک رہا تھا۔

راز بھی ایک بوجھ ہوتے ہیں، جنہیں سہارنے کے لیے بہت مضبوط اعصاب چاہئیے ہوتے ہیں۔ اس نے ہاتھ میں تہہ شدہ کاغذ پہ نگاہ دوڑائی۔ اس معلومات کے ساتھ اُسے کیا کرنا چاہیئے؟

"ترکی کا تم پہ قرض ہے عائشے۔ اپنے دل سے پوچھو کہ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ ایک مجرم، ترکی کا ایک قومی مجرم، غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کر رہا ہے، تو تمہیں کیا کرنا چاہیئے؟"

اس نے اپنے دل سے پوچھنا چاہا۔ عجیب سا ہیجان اور تذبذب ہر جگہ غالب تھا۔

"تمہیں بارڈر سیکورٹی فورس کے کمانڈر کو فون کرنا چاہیئے۔ تمہیں ان کو بتانا چاہیئے سب کچھ تاکہ وہ اسے گرفتار کر سکیں۔ مگر نہیں...... عائشے گل یہ سب کیسے کرے گی؟ عائشے گل تو کبھی کچھ نہیں کر سکتی!"

اس نہج پہ وہ ذرا سی چونکی۔

"عائشے گل کبھی کچھ نہیں کر سکتی!" عبدالرحمٰن ہمیشہ سے کہا کرتا تھا یہ۔ اس کا پسندیدہ فقرہ۔

مگر اس وقت یہ فقرہ کسی تیر کی طرح اسے آ لگا تھا۔ وہ شکستہ قدموں سے چلتی واپس لاؤنج کے بڑے صوفے کے کنارے آ ٹکی۔

آنے نے سلائیوں سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔

"کیا کہہ رہی تھی بہارے؟"

عائشے نے بات ٹھیک سے سنی نہیں تھی، بس نفی میں گردن ہلائی۔ وہ کہیں اور گم تھی۔

کیا اسے عبدالرحمٰن کو دکھا دینا چاہیئے کہ عائشے گل بہت کچھ کر سکتی ہے؟

کیا واقعی؟

☆ ☆ ☆

وہ چلتے چلتے اس جنگل نما علاقے تک آ پہنچے تھے۔

اونچے سرسبز درخت، اور ان کے درمیان سے دریا تنگ جھرنے کی مانند بہہ رہا تھا۔ پانی کے اوپر پُل کی صورت لکڑی کے پھٹے لگے تھے، اور درمیان میں ایک لکڑی کا بڑا سا تخت تھا۔ تخت پہ سرخ قالین بچھا تھا، اور تین طرف منڈیر بنا کر گاؤ تکیے لگے تھے۔ چوتھی طرف منڈیر نہ تھی، تا کہ وہاں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھو تو پیر پانی کو چھوئیں۔

سبز پانی، سبز درخت اور اوپر جھلکتا نیلا آسمان۔ پُل کے اس پار جھونپڑے سے بنے تھے، جن میں سے ایک سے وہ ابھی ابھی نماز پڑھ کر نکلی تھی۔ ظہر سے عصر تک وہ بس چلتے ہی رہے تھے، پھر اس مقام پہ جہان انہیں چھوڑ کر اپنے کسی کام کی غرض سے چلا گیا تھا۔ اس کو گھنٹے تک آنا تھا۔ وہ اس اثنا میں کھانا کھا کر اب نماز سے فارغ ہوئی تھی۔ باہر نکل کر دیکھا تو بہارے پُل کے تخت پہ بیٹھی، پیر کے انگوٹھے سے پانی میں دائرے بنا رہی تھی۔

حیا نے اپنی سرخ ہیلز اتار کر اندر جھونپڑے میں رکھ دیں۔ (جہان کون سا دیکھ رہا تھا) اور پاؤں سے عبایا ذرا سا اٹھائے، ننگے پیر چلتی پُل تک آئی۔ بہارے کے ساتھ بیٹھ کر اس نے پاؤں پانی میں ڈالے تو وہ ٹخنوں تک سبز مائع میں ڈوب گئے۔

جہان سکندر کا ترکی واقعی بہت خوبصورت تھا۔

"عبدالرحمٰن کب آئے گا؟" بہارے گود میں رکھے اپنے گلابی پرس پہ لگے موتی پہ انگلی پھیرتی، پانی کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"آ جائے گا ابھی۔ تم نے اتنی دیر کیا کیا؟" اس نے گردن ذرا سی موڑ کر مسکراتے ہوئے بہارے کو دیکھا۔ وہ کھانے کے بعد جب نماز پڑھنے لگی تھی تو بہارے باہر آ گئی تھی۔

"کچھ بھی نہیں کیا۔" اس نے بجھے بجھے چہرے کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ جہان کی ڈانٹ کا اثر ابھی تک باقی تھا۔

"کیا تم اس لیے اداس ہو کہ اس نے تمہیں ڈانٹا ہے؟"

"وہ ہر وقت ہی ڈانٹتا ہے، مگر میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔"

سامنے سے ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا، پانی کی سطح سے اپنے پنجے ٹکراتے ہوئے ذرا سے قطرے چونچ میں بھرے اور بغیر رکے، پھر پھڑ پھڑاتا اڑتا گیا۔

"کیا تم نے واقعی ہماری باتیں سنی تھیں؟" استفسار کرتے ہوئے بھی وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے سنا ہو، تب بھی وہ سمجھ نہیں پائی ہوگی۔

"نہیں سنا میں نے کچھ۔ سب مجھے کیوں الزام دیتے ہیں؟" وہ خفگی سے کہتی سر اٹھا کر دور جاتے پرندے کو دیکھنے لگی جو اوپر آسمان پہ اڑتا جا رہا تھا۔

شاید اس کے لیے چونچ بھر پانی ہی کافی تھا۔ اس کی وسعت بس اتنی ہی تھی۔

"اچھا، پھر اداس کیوں ہو؟"

"حیا، کیا جب میں پندرہ سال کی ہو جاؤں گی تو شادی کر سکوں گی؟"

اور حیا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"تمہیں ایسی بات کیوں سوجھی بہارے؟"

"غنچہ کی شادی بھی پندرہ سال کی عمر میں ہوئی تھی نا۔"

"غنچہ کون؟"

"ہماری جدیسی میں رہتی تھی، ہم سب گئے تھے اس کی شادی پہ۔ عبدالرحمٰن بھی گیا تھا۔ تصویر بھی ہے میرے پاس۔ دکھاؤں؟"

حیا نے میکانکی انداز میں سر ہلایا۔ بہارے نے اپنا پرس کھولا، اندرونی خانے کی زپ کھولی اور ایک لفافہ نکالا۔ اسے اس کے موبائل کی جھلک نظر آئی تھی۔

"تمہارا فون تمہارے پاس تھا؟" اس کو دھچکا لگا۔ "میں سمجھی تم نہیں لائی۔"

"میں لے آئی تھی، چارجنگ ہو گئی تھی۔"

"کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟" اس نے موبائل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بہارے نے جھٹ سے زپ بند کر کے بیگ پرے کر لیا۔

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تم میرا یقین کیوں نہیں کرتیں؟ میں اچھی لڑکی ہوں۔" حیا نے گہری سانس بھری۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں تمہارا یقین کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ بہارے گل اچھی لڑکی ہے، اور اچھی لڑکیاں کبوتر نہیں بنتیں۔ وہ باتیں ادھر سے ادھر نہیں کرتیں۔" اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔ "جہان تمہیں جو بات آگے بتانے سے منع کر رہا تھا، وہ تم عائشے کو نہیں بتاؤ گی، پرامس؟"

بہارے نے "لیکن" کہنے کے لیے لب کھولے، پھر بند کر دیے۔ پھر سر جھٹک کر لفافے سے ایک فوٹوگراف نکال کر حیا کے سامنے کیا۔

"بس میرے پاس اس کا یہی فوٹو ہے۔" حیا کو دکھاتے ہوئے بھی بہارے نے تصویر کا کنارہ سختی سے پکڑ رکھا تھا، اتنی سختی سے کہ اس کا ناخن پیلا سفید پڑ گیا۔ وہ اب پانی کے قریب کوئی بھی چیز بے احتیاطی سے پکڑنے کا خطرہ نہیں لے سکتی تھی۔ پانی کھوئی ہوئی چیزیں کبھی بھی لوٹایا نہیں کرتا تھا۔

وہ شادی کے فنکشن کی تصویر تھی۔ کورٹ میں نکاح تھا۔ فرنٹ رو کی نشستوں پہ وہ تینوں بیٹھے تھے۔ بلیک سوٹ اور گرے شرٹ میں ملبوس، وہ بس ذرا سا مسکرا رہا تھا۔ ساتھ بیٹھی بہارے اور عائشے بھی مسکرا رہی تھیں۔ مصنوعی فیملی، جواب ٹوٹ گئی تھی۔

"پتہ ہے، ہماری شادیوں میں نکاح کے بعد دلہا دلہن کی کرسی اٹھاتا ہے۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں، تاکہ وہ علامتی طور پہ یہ ثابت کر سکے کہ وہ اپنی بیوی کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔"

"مگر غنچہ اتنی موٹی تھی کہ اس کے دلہے سے کرسی اٹھائی ہی نہیں گئی۔" پھر وہ ذرا رکی۔ "مگر تم عائشے کو مت بتانا کہ میں نے یوں کہا۔"

"اگر تم وہ بات جو جہان نے منع کیا ہے، عائشے کو نہیں بتاؤ گی تو میں بھی اسے نہیں بتاؤں گی۔"

"مگر عائشے کو تو پہلے ہی....." اس نے جیسے زبان دانت تلے دبائی۔

"کیا اسے پہلے ہی پتہ ہے؟" حیا نے بغور اسے دیکھا۔ بہارے نے جھٹ گردن نفی میں ہلائی۔ "میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ پرامس!"

اس نے تصویر احتیاط سے خط کے لفافے میں ڈالی، اور اسے بیگ میں رکھ دیا۔

کچھ تھا جو حیا کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔ کچھ غلط تھا کہیں۔ مگر خیر......

"اور تم یہ شادی کی باتیں مت سوچا کرو۔ اچھا؟" اسے تنبیہہ کرنا یاد آیا تو فوراً کی۔

بہارے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر نفی میں گردن ہلائی۔

"میں تمہیں نہیں بتاؤں گی کہ میں کس سے شادی کروں گی۔"

"وہ کیوں؟"

سامنے دریا کنارے درخت کا ایک پتہ ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ جب ہوا کا بوجھ بڑھا تو وہ ایک دم شاخ سے ٹوٹ کر نیچے گرا۔

"تم برا مانو گی۔ سمجھو میں نے ایسا کہا ہی نہیں۔"

ہوا نے پتے کو اپنے پروں پہ سہارا دیے آہستہ آہستہ نیچے اتارا، یہاں تک کہ پانی نے اسے نرمی سے ہوا کے ہاتھوں سے لیا اور اپنے اوپر لٹا دیا۔

"تمہیں پتہ ہے، عبدالرحمٰن نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ مر جائے۔ تو میں اسے جنازہ ضرور دوں گی۔"

"کیا؟" وہ ششدر رہ گئی۔ سانس رکا، اور دل بھی دھڑکنا بھول گیا۔

اہلارا کے دریا کی سطح پہ درختوں اور آسمان کا عکس جھلملا رہا تھا۔ اس عکس پہ تیرتا پتہ ان کی سمت آ رہا تھا۔

"ہاں، اس نے بہت دفعہ ایسا کہا......"

"چھوڑو ان باتوں کو۔" اس نے خفیف سا سر جھٹکا۔ پتہ نہیں کیوں وہ ہمیشہ آگے کی ساری پلاننگ تیار رکھتا تھا، چاہے وہ مرنے کی ہی کیوں نہ ہو۔

اس نے گردن اٹھا کر سامنے دریا کو دیکھا۔ وہاں سے چٹانیں اور غار دکھائی نہیں دیتے تھے، مگر جب وہ بیلون میں اوپر اڑ رہے تھے، تب وہ نظر آتے تھے۔ بالکل ویسے جیسے ڈاکٹر ابراہیم کی دی گئی کینڈی کے ریپر پہ بنے تھے۔

"بہارے!" اسے ایک دم یاد آیا۔ "یاد ہے عائشے کہا کرتی تھی کہ قرآن میں نشانیاں ہوتی ہیں، ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں؟ اور تم نے کہا تھا کہ تم جانتی ہو وہ اس روز ہمیں کیا بتانا بھول گئی تھی۔"

"ہاں!" بہارے نے اثبات میں سر ہلایا۔

پتا بہتا ہوا ان کے قدموں کے قریب آ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ مزید آگے آیا، بہارے نے اپنے پاؤں سے اس کا راستہ روکنا چاہا۔

حیا کو احساس ہوا کہ وہ دونوں پتے کو دیکھ رہی تھیں، بہارے نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی، مگر اس نے نہیں کی۔

"عائشے نے بتایا ہی نہیں تھا کہ آخر میں جنگ کون جیتا۔"

بہارے نے اپنے پیر سے پتے کو واپس دھکیلا۔ وہ ذرا پیچھے ہوا، پھر اسی رفتار سے واپس آیا۔ اب کے بہارے نے اسے نہیں روکا۔ وہ ان دونوں کے پیروں کے درمیان سے گزرتا تخت کے نیچے بہتا چلا گیا۔

"مسلمان جیتے تھے، یہ تو مجھے پتہ ہے۔" حیا کو حیرت ہوئی۔ یہ تھی وہ بات جس کو جاننے کے لیے اسے بہت تجسس تھا؟

"مگر مجھے نہیں پتہ تھا، سو میں نے اسٹوری بک سے پڑھ لیا تھا بعد میں۔" ساتھ ہی بہارے نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ بچھڑا ہوا پتا اپنے درخت سے بہت دور، پیچھے کو بہتا چلا جا رہا تھا۔

"بس؟ یہی بات تھی؟"

"ہاں!" بہارے نے اثبات میں سر ہلایا۔

حیا کو مایوسی ہوئی تھی۔ یہ تو سامنے کی بات تھی کہ مسلمان ہی جیتے تھے، تو پھر؟ بہارے نے سمجھا عائشے بتانا بھول گئی ہے جبکہ عائشے نے اس لیے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ سب جانتے ہیں، احزاب کی جنگ مسلمانوں نے جیتی تھی۔ یہ کوئی اہم بات تو نہیں تھی۔

شاید ڈاکٹر ابراہیم اسے یہی بتانا چاہ رہے تھے کہ آخر میں یہ جنگ وہ جیت جائے گی۔ پھر بھی، کہیں کچھ مسنگ تھا۔ کچھ تھا جو وہ پھر مس کر گئی تھی۔ اس نے خفیف سا سر جھٹکا۔ پتہ نہیں۔

بہارے ابھی تک گردن موڑے دور جاتے پتے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ پتا جسے اب کبھی اپنے درخت کے پاس واپس نہیں آنا تھا۔

☆ ☆ ☆

جہان آیا تو وہ لوگ اہلارا گاؤں آ گئے۔ اب شام ہو رہی تھی، سو وہ وہیں سے واپس ہو لیا جبکہ انہوں نے کیب لے لی اور واپس آشیانہ آ گئے۔

جہان نے کہا تھا کل یہاں سے روانہ ہونا ہے۔ اسی حساب سے وہ آج پیکنگ کر رہی تھی۔ پنار رات میں چائے دینے آئی تو ان کو سامان سمیٹتا دیکھ کر افسردہ ہو گئی۔

''میری منگنی ہو گی سرما میں، کیا تم لوگ آؤ گے؟ میں تمہیں ضرور انوائیٹ کروں گی۔''

''میں ضرور آؤں گی!'' بہارے نے چہک کر کہا، پھر حیا کو دیکھ کر مسکراہٹ ذرا سمٹی۔ ''میرا مطلب ہے، شاید آؤں!''

''ہوں!'' پنار مسکرا کر اس کا گال تھپتھپاتی باہر نکل گئی۔

''عائشے کہتی ہے، جب میں اس کے پاس آ جاؤں گی تو ہم دونوں دور کسی دوسرے ملک چلے جائیں گے، جہاں پاشا بے نہ ہو، اور جہاں ہم عائشے اور بہارے ہی کر رہیں، منی اور حنہ نہیں۔ اور پھر وہاں ہم بہت سا پڑھیں گے بھی سہی۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے اپنے سفری بیگ کی اندرونی زپ کھولی۔ ایک خانہ ذرا پھولا ہوا تھا۔ وہ، اسے یاد آیا۔ اس نے اس خانے سے وہ سیاہ مخملیں ڈبی نکالی۔

اپنا فراک تہہ کرتی بہارے وہ ڈبی دیکھ کر ٹھٹکی، پھر اس کے پاس چلی آئی۔ حیا نے ڈبی کھولی۔ اندر سیاہ مخمل پہ وہ نازک سا نیکلس جگمگا رہا تھا۔ حیا نے نگاہیں اٹھا کر بہارے کو دیکھا۔

پہلے اس کی آنکھوں میں حیرت اتری، پھر الجھن، اور پھر سمجھ کر اس نے نفی میں سر جھٹکا۔

''یہ وہ نہیں ہے۔ یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ کیا تم نے اسے خریدا ہے؟''

''میں نے اور عبدالرحمٰن نے مل کر اسے خریدا ہے، ادالار کی شہزادی کے لیے۔''

بہارے نے اپنے فراک کو آخری تہہ دی اور پلٹ کر اسے بیگ میں ڈالا۔ جیسے وہ افسردہ ہو گئی تھی۔

''کیا پھر کبھی تمہارا موتی نکلا؟'' حیا نے اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے پھر نہیں ڈھونڈا۔''

''مگر جب کبھی موتی نکلا تو......''

''یہ میرے پاس نہیں رہے گا حیا۔ میں نے اپنا موتی عبدالرحمٰن کو دیا، اس نے مجھے دے دیا مگر وہ باسفورس میں گر گیا۔ عائشے نے بھی اپنے موتی عبدالرحمٰن کو دیے، اس نے وہ تمہیں دے دیے۔ اب یہ بھی مجھ سے گم جائے گا۔ میں یہ نہیں لوں گی۔''

''مگر یہ میں نے تمہارے لیے لیا ہے بہارے!''

بہارے بیگ چھوڑ کر اس تک آئی، مخمل پر سے نیکلس اٹھایا، اس کی ہُک کو الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر اسے حیا کی کلائی کے گرد لپیٹ کر، اس کی ہُک آخری کنڈے کی بجائے، کلائی کے گھیر کے برابر ایک کنڈے میں ڈال دی، یوں کہ نیکلس کلائی کے گرد پورا آ گیا، اور ایک لڑی سی ساتھ لٹکنے لگی، جیسے بریسلٹ کی لٹکتی ہے۔

''یہ اب تمہارا ہو گیا!'' وہ پہلی دفعہ مسکرائی تھی۔

حیانے کلائی کو گھما کر دیکھا۔ زنجیر سے لٹکتے ہیرے، بہت بھلے لگ رہے تھے۔ کلائی کے عین سائیڈ پہ ایک لمبا سا کنڈا خالی تھا۔

"حیا تم نے پھر سیپ ڈھونڈے؟" بہارے نے بھی اسی خالی کنڈے کو دیکھ کر کہا۔

حیانے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"بس ایک دفعہ۔"

"اس میں سے کیا نکلا؟" حیا چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر نفی میں گردن ہلائی۔

"پتہ نہیں، بس وہ کوئی اچھی چیز نہ تھی۔"

"مگر تھا کیا؟"

"جانے دو۔" اس نے پھر سے اپنی کلائی کو دیکھا۔ اوپر ہاتھ کی تیسری انگلی میں پلاٹینم بینڈ تھا۔ وہ دونوں بالواسطہ یا بلاواسطہ جہان کے ہی تحفے تھے۔

"شکریہ بہارے!" وہ ذرا سا مسکرائی۔ تحفہ تو تحفہ ہوتا ہے نا۔

"کیا میں پھر کبھی عبدالرحمٰن سے نہیں مل سکوں گی؟" بہارے اب سرخ صوفے کے کنارے جا ٹکی تھی، اور ہتھیلیوں پہ چہرہ گرائے اداسی سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں، کبھی بھی نہیں۔ تمہیں اب اس بارے میں سوچنا چھوڑنا ہوگا۔" وہ اپنی باقی چیزیں سمیٹنے لگی۔ مسلسل حرکت سے کلائی سے لٹکتی زنجیر ادھر اُدھر جھول رہی تھی۔

"میں کل انقرہ سے ایران چلی جاؤں گی اپنی بہن کے پاس۔ تم لوگ پھر کدھر جاؤ گے؟"

"دیکھو، پتہ نہیں۔" اس نے مصروف سے انداز میں ٹالنا چاہا۔

"کیا تم لوگ کیلیس جاؤ گے؟"

اس کے متحرک ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے سر اٹھا کر بہارے کو دیکھا۔ "تم نے اس وقت کچھ سنا تھا نا، بہارے۔ کیا سنا تھا؟"

"بس اتنا سا!" اس نے انگلی اور انگوٹھے کو ایک انچ کے فاصلے پہ رکھ کر بتایا۔ "مگر جان بوجھ کر نہیں، خود بخود......"

"اور تم نے کیا سنا؟"

"عبدالرحمٰن کیلیس کا نام لے رہا تھا۔ کیا کوئی کیلیس جا رہا ہے؟ واللہ مجھے نہیں پتہ وہ کس کی بات کر رہا تھا۔" اس ساتھ میں قسمیہ انداز میں ہاتھ سے کان کی لو کو چھوتے ہوئے "چچ" کی آواز نکالی۔

"اور تم نے عائشے کو بتائی یہ بات؟"

"نا......نہیں!" بہارے ذرا سی اٹکی تھی۔ جہان نے کہا تھا اس نے اگر سنا ہو تب بھی وہ کچھ نہیں سمجھے گی۔ اس نے اپنی عقل کی بجائے جہان کی عقل پہ بھروسہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا، اور واپس پیکنگ کرنے لگی۔ بہارے سے انہیں کوئی خطرہ نہ تھا۔

بیگ کی ایک زپ میں ڈی جے کی ٹوٹی عینک رکھی تھی۔ اس نے احتیاطاً اسے وہاں سے نکال کر اپنے ہینڈ بیگ کے اندرونی خانے میں رکھ دیا جہاں سفید رومال میں کچھ لپٹا ہوا رکھا تھا۔ اور پھر بیگ کی زپ زوں کی آواز کے ساتھ زور سے بند کی۔

کل انہیں انقرہ جانا تھا۔

☆ ☆ ☆

آشیانہ کی فیملی اور فاتح ان کو سی آف کرنے آشیانہ کے صحن میں کھڑے تھے۔ اتنے دن یوں لگ رہا تھا کہ وہ ہوٹل میں نہیں، بلکہ کسی کے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ اب ایک ایک کو خدا حافظ کرنا، مسز سونا اور پنار کے گلے لگ کر دوبارہ آنے کا بے یقین، کھوکھلا وعدہ کرنا، سب بہت اداس کر دینے والا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ ترکی میں اگر اس نے بہت کچھ کھویا تھا تو بہت کچھ پایا بھی تھا۔ کبھی جب وہ سود و زیاں کا حساب کرنے بیٹھے گی تو پانے والا پلڑہ شاید بھاری نکلے۔

پنار کی ایرانی بلی گارفیلڈ اس کے بازوؤں میں تھی۔ حیا سے مل کر وہ پنجوں کے بل نیچے بیٹھی، اور بہارے سے گلے ملی تو دونوں کے درمیان نرم بلی کسمسائی۔

"جب بھی میری بلی بچے دے گی تو میں ایک تمہارے لیے بھی رکھوں گی چھوٹی بلی!"

بہارے نے کچھ کہا نہیں، بس اداسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

مسز سونا گیٹ تک فکر و اپنائیت سے پوچھتی رہی تھیں۔

"کیمرے، موبائل، چارجرز، سب رکھ لیا تھا؟ راستے کے لیے پانی رکھا ہے؟ کچھ کھانے کو چاہیے؟" ترک بہت ہی پیاری قوم تھی۔

باہر نکل کر بہارے نے پوچھا۔

"کیا پنار کی بلی کی بھی سرما میں منگنی ہو جائے گی؟"

"اوں ہوں۔ وہ تو یونہی کہہ رہی تھی۔" اس نے ہولے سے اس کے سر پہ چپت لگائی۔ پھر پلٹ کر دیکھا۔ وہ سب انہیں ہاتھ ہلا رہے تھے۔

حیا نے بھی مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔

وہ ان لوگوں کی مہمان نوازی کا بدلہ کبھی بھی نہیں چکا سکتی تھی، البتہ وہ اتنا ضرور کر سکتی تھی کہ اب جب بھی وہ اپنے ملک اور اپنی یونیورسٹی میں کسی ترک بلکہ کسی بھی غیر ملکی اسٹوڈنٹ سے ملے گی تو کوشش کرے گی کہ اس کے لیے بھی وہ اتنا ہی وقت نکالے جتنا ان ترکوں نے اس کے لیے نکالا تھا، اور جتنا وہ ہر مہمان کے لیے نکالتے تھے۔

اور کاش وہ یہ کر بھی سکے۔

☆ ☆ ☆

جہان نے بہارے کے سارے کاغذات اسے پہنچا دیے تھے، البتہ انقرہ میں وہ خود انہیں نہیں ملا تھا۔ حیا نے اسے ایئر پورٹ پہ سی آف کرنا تھا اور تہران میں اس کی بہن نے اسے ریسو کر لینا تھا۔

بہارے ایئر پورٹ پہ آخری وقت تک داخلی احاطے کو دیکھتی رہی تھی، شاید وہ آ جائے!

"وہ نہیں آئے گا بہارے، اس نے کہا تھا کہ وہ نہیں آ سکے گا۔"

بہارے کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ پسِ منظر میں اعلان ہونے لگا تھا۔ اب ان دونوں کو الگ ہونا تھا۔

"کیا ہم پھر کبھی نہیں ملیں گے حیا؟"

اس کی بات پہ حیا نے گہری سانس بھری، اور بہارے کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھی، پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

"بہارے گل، زندگی میں انسان کو ہر چیز ویسے نہیں ملتی جیسی اس نے سوچی ہوتی ہے۔ سب ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہو سکتا، اور جو ہم کہتے اور سوچتے ہیں، وہ تو کبھی نہیں ہوتا۔ پہلے ہم نے سوچا تھا کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے، مگر یہ نہیں ہو سکا۔ اور اب ہم سوچ رہے ہیں کہ ہم کبھی دوبارہ مل نہیں پائیں گے، تو ہو سکتا ہے کہ یہ بھی نہ ہو۔"

اس کے ہاتھوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ دیے کھڑی بہارے اس بات پہ چونکی، پھر ایک انوکھی سی چمک اس کے چہرے پہ لوٹ آئی۔

"ہاں بہارے، ہو سکتا ہے، زندگی کے کسی موڑ پہ، کسی شاپنگ مال میں، کسی ریسٹورنٹ میں، کسی فلائٹ کے دوران، ہم کئی سال بعد اچانک سے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔ زندگی میں سب کچھ ممکن ہوتا ہے۔"

"ہاں! واقعی!" مگر پھر اس کا چہرہ ذرا سا بجھا۔ "لیکن میں تمہیں کیسے پہچانوں گی؟ تم تو نقاب کرتی ہو۔"

"اگر قدرت نے ہمیں کسی ناممکن کنڈیشن میں آمنے سامنے کر دیا تو پہچان بھی وہ کروا دے گی۔"

اب کے بہارے کھل کر مسکرائی۔ بہت دیر بعد اس نے بہارے کے معصوم، اُداس چہرے پہ وہ مسکراہٹ دیکھی تھی۔

"حیا سلیمان، بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے!" اس نے باری باری حیا کے دونوں رخسار نقاب کے اوپر سے چومے۔

اور پھر......

بہارے گل چلی گئی۔

زندگی کا ایک باب ٹھک سے بند ہوا۔

جہان کی جاب کا اصول تھا کہ ایک اسائنمنٹ ختم ہو جانے کے بعد اس سے متعلقہ تمام کانٹیکٹس سے تعلقات قطع کر دیے تھے، ہاں اگر جاب کے دوران دوبارہ کسی دوسرے اسائنمنٹ کے لیے ان تعلقات کی ضرورت پڑے تو ان کو پھر سے بحال کیا جا سکتا تھا۔

بس ایک موہوم سی امید تھی وہ بھی، کہ شاید یوں کبھی وہ چاروں پھر اکٹھے ہو سکیں۔ مگر بہت موہوم...... جیسے تیز آندھی میں ٹمٹماتی موم بتی کا شعلہ......

☆ ☆ ☆

کھڑکی سے چھن کر آتی روشنی کتاب کے صفحوں پہ پڑ رہی تھی جو اس نے اپنے سامنے پھیلا رکھی تھی۔ وہ الفاظ پہ نگاہیں مرکوز کیے ہوئے بھی ان کو نہیں پڑھ رہی تھی۔ ذہن کہیں اور تھا۔ دل میں بھی عجب اُداسی چھائی تھی۔ جب تک بہارے نے نہیں آنا تھا، وہ یونہی افسردہ رہتی۔ یہ وہ وجہ تھی جس سے وہ خود کو بہلا لیتی، کہ ہاں، یہ اُداسی صرف بہارے کی وجہ سے ہے۔ مگر وہ جانتی تھی کہ جب وہ آ جائے گی تو بھی یہ افسردگی رہے گی۔ بس تب وجہ ختم ہو جائے گی، بہانہ ختم ہو جائے گا۔

کھڑکی کی جالی سے ہوا کا تیز جھونکا آیا تو کتاب کے صفحے اس کے ہاتھ میں پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ اس کی زندگی کا ایک باب بھی کتاب کے اس صفحے کی مانند تھا جسے کسی نے بے دردی سے پھاڑ دیا ہو، یوں کہ کوئی نشان، جلد سے لگا کاغذ کا کوئی ٹکڑا باقی نہ رہا ہو۔

عائشے گل نے کتاب بند کر کے تپائی پہ ڈال دی۔ اس کا دل کسی شے کے لیے نہیں چاہ رہا تھا۔

زندگی کا وہ باب...... عبدالرحمٰن پاشا...... ایک اجنبی جو ان کی زندگیوں میں آیا، اور پھر ان کی پوری زندگی بن گیا۔ وہ کتنا اچھا، کتنا سلجھا ہوا، ویل مینرز اور نفاست پسند آدمی تھا۔ اس کی ہر چیز پرفیکٹ ہوتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ بھی بہت اچھا تھا۔ اس کی رائے کو اہمیت دیتا، اس کی سمجھداری و ذہانت کی قدر کرتا۔ جب عثمان بے نے اپنے بیٹے کا رشتہ پاکستان میں طے کر دیا اور سفیر اُن سے ناراض ہو گیا تھا، تب عبدالرحمٰن کے کہنے پہ ہی اس نے سفیر سے بار بار اس موضوع پہ بات کی تھی۔ عبدالرحمٰن کو جب بھی کوئی خاص کام ہوتا، وہ اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ جیسے اس رات وہ حیا کو لے کر آیا تھا جب اس کے بالوں پہ ویکس گری تھی۔

اس رات تو وہ اسے عبدالرحمٰن لگا ہی نہیں تھا۔ اتنا ژولیدہ حلیہ، بے چین، مضطرب، بکھرا بکھرا سا۔ مگر جب اس رات کی صبح ہوئی، تو وہ وہی پرانے والا عبدالرحمٰن بن گیا، بلکہ وہ بن گیا جو وہ اس تھپڑ کے بعد بنا تھا۔

اچھی لڑکیاں جلد بازی نہیں کرتیں، مگر اس سے ہو گئی تھی۔ وہ تھپڑ اس کے اور عبدالرحمٰن کے درمیان ایک ایسی سرد دیوار بن گیا جسے وہ کبھی پاٹ نہ سکی۔ اس نے عائشے کو اس تھپڑ کے لیے کبھی معاف نہیں کیا تھا، اور اب تو وہ ان سے بہت دور جا چکا تھا۔

بہارے، آنے اور وہ خود، وہ سب اس کو بھلا دیں گے کیا؟ پاشا بے تو اپنے کاموں میں مصروف سطحی سا آدمی تھا، مگر آنے؟ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔

کمرے کے دوسرے کونے پہ آنے بیٹھی سوئیٹر بُن رہی تھیں۔ پچھلے، اور اس سے پچھلے، دونوں سرما میں انہوں نے عبدالرحمٰن کے لیے سوئیٹر بنے تھے، اس دفعہ بھی وہ اپنی روٹین دُہرا رہی تھیں۔ وہ دیکھتی تھی کہ کس طرح آنے فون کی بیل، دروازے کی دستک، اور ہر آہٹ پہ چونکتیں، پھر عبدالرحمٰن کی خیر خبر نہ پا کر مایوسی سے اپنا کام کرنے لگتیں۔ کیا وہ سب ایک نارمل زندگی گزار پائیں گے؟

شاید ہاں۔ شاید نہیں۔

مگر ابھی اسے کیا کرنا ہے؟

اس نے بلاؤز کی جیب سے وہ تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا، اور اسے کھولا۔ یہ ترکی کی امانت تھا۔ کیا اسے یہ امانت لوٹا دینی چاہیے؟

اس نے گردن پھیر کر کیلنڈر کو دیکھا۔ آج ہفتہ تھا اور یہ معلومات پرسوں، یعنی پیر اور منگل کی درمیانی شب کے بارے میں تھیں۔ اب

صحیح وقت آن پہنچا تھا۔

وہ ایک فیصلے پہ پہنچ کر اٹھی اور اپنا پرس اٹھا لیا۔

قریباً آدھے گھنٹے بعد وہ اپنے گھر سے بہت دور ایک پے فون پہ کھڑی، کارڈ ڈال کر ایک نمبر ملا رہی تھی۔

(دیکھ لو عبدالرحمٰن، عائشے گل کیا کر سکتی ہے!)

ریسور کان سے لگائے، اس نے وہ تہہ کیا ہوا کاغذ سامنے کھول کر رکھ لیا۔ ساتھ ہی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ان کو اس کی کال ٹریس کرنے میں نوے سیکنڈ لگنے تھے۔ وہ اسی ویں سیکنڈ کال کاٹ دے گی۔

کال ملنے کے دسویں سیکنڈ میں اس کا رابطہ موجودہ کمانڈر سے ہو گیا۔

"میرے پاس آپ کے لیے ایک tip ہے۔"

"آپ کون اور کہاں سے بول رہی ہیں؟" بھاری آواز والے مرد نے کال لمبی کرنے کی کوشش کی تھی۔

"جھوٹ بولنا نہیں چاہتی اور ظاہر ہے سچ بتاؤں گی نہیں۔ میرا وقت ضائع مت کریں۔ وہ ٹپ (مخبری) سنیں جو میرے پاس ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔

پچیس سیکنڈ!

دل تھا کہ اندر زور سے دھڑک رہا تھا۔

"جی۔۔۔۔۔۔جی۔۔۔۔۔۔کہیئے۔" دوسری جانب کال ریکارڈ کی جانے لگی تھی۔ ریڈ الرٹ۔

"منگل اور پیر کی درمیانی شب دو بجے کے قریب کیلیس سے تین کلومیٹر دور، ترکی اور شام کی سرحد کو کوئی کراس کرے گا۔ اس کے بہت سے نام ہیں، مگر میں آپ کو وہ نام بتاؤں گی جو آپ جانتے ہیں۔"

چالیس سیکنڈ۔۔۔۔۔۔

"کون سی چوکی کے قریب سے؟" وہ نوٹ کر رہے تھے۔

عائشے جلدی جلدی وہ تمام چیزیں دہرانے لگی جو اس نے کاغذ پہ لکھ رکھی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو اہم تھیں۔

"اطلاع دینے کا شکریہ۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ اپنا پروگرام نہیں بدلے گا؟"

اسی سیکنڈ۔۔۔۔۔۔

"نہیں۔ مرحبا!" اس نے کھٹ سے ریسور رکھا، اور پھر دل پہ ہاتھ رکھ کر چند گہری سانسیں اندر اتاریں۔

اللہ، اللہ! اس نے کر ہی دیا۔ یہ تو ذرا بھی مشکل نہ تھا۔

اب وہ آہستہ آہستہ سانس لیتی اپنے پھولے تنفس کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دل تھا کہ بری طرح دھڑک رہا تھا۔

(عبدالرحمٰن۔۔۔۔۔۔ دیکھو، عائشے گل کیا کچھ کر سکتی ہے!)

وہ پلٹی اور سر جھکائے، تیز تیز چلتی کیب اسٹینڈ کی جانب بڑھ گئی۔ اسے جلد سے جلد گھر پہنچنا تھا تاکہ آنے کو شک نہ پڑے۔

☆ ☆ ☆

چھت سے کھلی، گرے اسپورٹس کار کشادہ ہائی وے پہ دوڑتی جا رہی تھی۔ وہ کہنی دائیں طرف کھلی کھڑکی پہ ٹکائے، بند مٹھی سے گال کو سہارا دیے، آنکھیں موندے کچی پکی نیند میں تھی۔ گرم ہوا سے سیاہ اسکارف پھڑپھڑا رہا تھا۔ دفعتاً کار کو ذرا سا جھٹکا لگا تو اس کا چہرہ آگے کو لڑھکا مگر اگلے ہی پل وہ آنکھیں کھول کر، سنبھل کر پیچھے ہوئی۔

سامنے، لمبی ہائی وے کے افق پہ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ہوا میں گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ سڑک کے دونوں اطراف خشک ویرانہ تھا۔ دور پہاڑ تھے۔

"میں سو گئی تھی؟" اس نے آنکھیں ملتے جیسے خود سے پوچھا۔

''نہیں مادام، آپ کل رات سے ڈرائیو کر رہی ہیں۔ سو تو میں رہا تھا۔''

حیا نے بائیں جانب دیکھا۔ جہان اسٹیئرنگ وہیل پہ دونوں ہاتھ رکھے، ڈرائیو کر رہا تھا۔ نیلی جینز پہ نیلی ڈریس شرٹ کے آستین کہنیوں تک موڑے، آنکھوں پہ سیاہ گلاسز لگائے، جن کے سائیڈ سے آنکھ کے قریب زخم کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔

''کیا ہم کیلیس پہنچ گئے؟'' اس نے گردن ادھر اُدھر پھیری۔ موٹر وے کے اعتراف کا مخصوص ویران علاقہ۔

''نہیں، سو جاؤ۔ جب پہنچیں گے تو تمہیں اٹھا دوں گا۔''

''ہوں!'' حیا نے اثبات میں سر ہلایا اور گردن سیٹ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ جہان نے نگاہ پھیر کر اسے دیکھا اور پھر افسوس سے سر جھٹکا۔

''حیا خانم، فرنٹ سیٹ پہ بیٹھنے کے جو ethics ایتھیکس ہوتے ہیں، ان میں دوسرا نمبر کس چیز کا ہوتا ہے؟''

''میں نے سیٹ بیلٹ پہن رکھی ہے۔'' بند آنکھوں سے کہتے، اس نے ہاتھ سے اپنی سیٹ بیلٹ کو چھو کر یقین دہانی کی۔

''وہ پہلا اصول ہے۔ دوسرا فرنٹ سیٹ پہ سونے کی ممانعت کے حوالے سے ہے۔''

نیند ویسے ہی کھل گئی تھی، اوپر سے اس کے طنز۔ وہ آنکھیں کھول کر پوری طرح جاگ کر سیدھی ہوئی۔

''تمہارے منہ سے ایتھیکس کا ذکر کتنا خوبصورت لگتا ہے نا جہان!''

''کیوں؟ چند ایک باتوں کے علاوہ میں ایک بہت ڈیسنٹ آدمی ہوں!'' وہ بُرا مان گیا۔ حیا نے بہت حیرانی سے اسے دیکھا۔

''تھینک یو ویری مچ جہان سکندر، ورنہ میں انقرہ سے یہاں تک یہی سوچتی آ رہی ہوں کہ یہ کار تمہاری اپنی ہے یا چوری کی؟''

جہان نے ایک خفا نگاہ اس پہ ڈالی، اور ''رینٹ کی ہے۔'' کہہ کر سامنے دیکھنے لگا۔

''ہم کیلیس کب پہنچیں گے؟'' اس نے ذرا اسلمندی سے پوچھا۔

''ڈرائیو میں کر رہا ہوں، تم تو سوتی آئی ہو، پھر؟''

''ایک تو پتہ نہیں ہر ڈرائیو کرنے والا یہ کیوں سمجھتا ہے کہ اس کے علاوہ باقی تمام مسافر تھک نہیں سکتے۔''

''اوہ، تمہارا پاؤں تو نہیں دکھ رہا؟''

''نہیں ٹھیک ہے۔ اور تمہارا سر درد؟'' اس نے پھر سے جارحیت کے پردے میں دفاع کیا۔

''میں ٹھیک ہوں!'' حیا نے اس بات پہ گردن موڑ کر بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

''آخری دفعہ سچ کب بولا تھا؟''

''ابھی دس سیکنڈ پہلے جب میں نے کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔''

وہ جانتی تھی کہ اگر اس کے سر میں درد تھا، تب بھی وہ نہیں بتائے گا۔

چند لمحے خاموشی سے گزرے۔ باہر چلتی گرم ہوا کے تھپیڑوں کے سوا کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔

''ہم کیلیس کب پہنچیں گے؟'' اس نے اب کہ ذرا اکتا کر کوئی تیسری دفعہ پوچھا۔

''دو گھنٹے مزید لگیں گے۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ آؤ، تم خود مصر تھیں۔''

''شکایت تو نہیں کر رہی۔ ٹائم ہی پوچھ رہی ہوں۔''

''کوئی سترہویں دفعہ پوچھ رہی ہو۔'' وہ باقاعدہ بُرا مان گیا تھا۔ ''اور تم تو کپادوکیہ دیکھنے آئی تھیں۔ پھر کیلیس آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میری مرضی!'' اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔ یہ کہہ نہیں سکتی تھی کہ وہ اس کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اسے کھو نہ دے۔

کار اسی طرح سنسان سڑک پہ دوڑ رہی تھی۔ شاذ و نادر آس پاس سے اکا دکا گاڑی گزر جاتی، ورنہ ہر سو نہری سی خاموشی تھی۔

"ہم کیلیس میں کہاں رہیں گے؟" کبھی کبھی بہارے گل بننے میں حرج نہیں ہوتا، سو اس نے پھر سے سوال کیا۔

"ایک سیف ہاؤس ہے۔ رات وہیں رہیں گے۔ آج اتوار ہے۔ کل پیر کا دن بھی وہیں گزاریں گے۔ پھر میں کل رات بارڈر پہ چلا جاؤں گا، اور تم پرسوں صبح استنبول چلی جاؤ گی۔ پھر پرسوں رات تم پاکستان کی فلائٹ لے لوگی۔ اب اگر کہتی ہو تو اکتیسویں دفعہ سارا پلان دہرا دیتا ہوں۔"

"اتنی بُری لگ رہی ہوں تو نہ لاتے مجھے۔ تم نے ایک دفعہ بھی منع نہیں کیا اور فوراً راضی ہو گئے۔ تم اندر سے خود ہی چاہتے تھے کہ میں تمہارے ساتھ آؤں!"

"واہ..... یہ سن کر میری آنکھیں بھر آئیں۔" جہان نے مسکراہٹ دبائے سر جھٹکا۔ وہ یقیناً اس کے سونے سے بور ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ جاگ جائے، اور جلی کٹی ہی سنائے، مگر بولتی رہے، مگر مجال ہے جو یہ آدمی اعتراف کر لے۔

وہ خفگی سے رخ موڑے بائیں طرف باہر دیکھتی رہی۔ پاکستان میں ڈرائیونگ سیٹ دائیں طرف ہوتی تھی، مگر ترکی میں بائیں جانب تھی، سو وہ جہان کے دائیں بیٹھی تھی۔

سورج اب پوری طرح سے نکل آیا تھا۔ کل رات، جب انقرہ میں ہوٹل سے جہان نے اسے پک کیا تھا، تب سے اب تک وہ حالتِ سفر میں تھے۔

"ویسے اب بتاؤ، دنیا کا سب سے خوبصورت شہر کون سا ہے؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

"اسلام آباد!" وہ بے نیازی سے بولی۔

"اچھا!" اسٹیرنگ وہیل گھماتے ہوئے جہان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور ہیلین آف ٹرائے کے 'ٹرائے' کا ذکر تو سنا ہوگا تم نے؟"

"ہاں، اس کا یہاں کیا ذکر؟" وہ دور نظر آتے پہاڑوں کو دیکھ کر بولی۔

"ٹرائے کا تاریخی شہر ترکی میں ہی واقع ہے۔ ہاں، وہ ہیلن آف ٹرائے کی کہانی ترکی کی ہی ہے۔"

"اچھا!" جہان نے اپنے تئیں اسے متاثر کرنے کی کوشش کی مگر حیا نے ذرا اثر نہیں لیا۔ وہ ابھی ڈی جے کی دوست ہونے کا حق ادا کرنا چاہتی تھی۔

جہان کچھ دیر دانت سے لب دبائے کچھ سوچتا رہا، پھر ایک دم اس نے گردن موڑ کر حیا کے اس طرف دور سے دکھائی دیتے پہاڑوں کو دیکھا، اور ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آ گئی۔

"اس پہاڑ کا نام معلوم ہے تمہیں؟"

حیا اسی طرف دیکھ رہی تھی، بس ذرا سے شانے اچکائے۔

"نہیں۔"

"وہ ماؤنٹ نمروت ہے۔" کہہ کر جہان نے اس کے تاثرات دیکھے۔

"اچھا!" وہی بے نیازی۔

"نہیں، تم نہیں سمجھیں۔ یہ ماؤنٹ نمروت ہے۔ نمروت کو تو جانتی ہو گی تم؟"

"کون؟" اس کے لبوں سے پھسلا۔ پھر یاد آیا، ترکوں کے جو نام "ت" پہ ختم ہوتے تھے، وہ ہمارے ہاں "د" پہ ختم ہوتے تھے۔ احمت سے بنا احمد، مولوت سے بنا مولود، اور نمروت سے بنا......

"نمرود؟ بادشاہ نمرود؟" وہ چونکی۔

"ہاں، وہی نمرود۔ اور یہ وہی پہاڑ ہے جہاں نمرود نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں اتارا تھا۔"

"اللہ، اللہ، یہ وہ پہاڑ ہے؟ وہ پہاڑ ترکی میں ہے؟" اس کو حیرت کا جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔ وہ بھورا سا پہاڑ، جو ان سے بہت دور تھا، کافی دیر سے ان کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

یہ تھا وہ پہاڑ؟ وہ پانچ ماہ سے ترکی میں تھی اور اسے بھی یہ نہیں پتہ چلا کہ وہ سارا قصہ، وہ سب آج کے ترکی میں ہوا تھا؟

جہان اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر آسودہ سا مسکراتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا، اور وہ اپنا اسلام آباد بھلائے، بنا پلک جھپکے اس پہاڑ کو دیکھ رہی تھی۔

وہ چار ہزار سال پرانا قصہ، وہ جس کا ذکر قدیم مقدس کتابوں میں ملتا ہے، وہ اس پہاڑ پہ پیش آیا تھا۔ بالکل اسی پہاڑ پہ۔ جب ہم سب کے ابراہیم علیہ السلام کو، ان ابراہیم علیہ اسلام کو جنہیں یہود، عیسائی اور مسلمان سب اپنا پیغمبر مانتے ہیں، ان کو آگ میں ڈالا گیا تھا۔ اس آگ میں جو جلا دیتی ہے۔ جو راکھ کر دیتی ہے۔ مگر وہ آگ ان کے لیے گلزار بن گئی تھی۔ نرم گلابوں کی طرح۔

لیکن پھر ہر کسی کے پاس قلب سلیم تو نہیں ہوتا نا۔ اور جانے اس سلیم دل کو حاصل کرنے کے لیے پہلے انسان کو کتنا جلنا پڑے، یہاں تک کہ آگ اس پہ اثر کرنا چھوڑ دے۔ ہاں، تپش اثر کرنا چھوڑ دیا کرتی ہے جب جل جل کر انسان کندن بن جاتا ہے، اور پھر لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ کو عبایا میں گرمی نہیں لگتی اور حجابی لڑکی حیران ہوئی ہے کہ گرمی؟ کون سی گرمی؟

اس نے بے اختیار اپنے بازو کے اوپری حصے کو چھوا، جہاں داغ گئے تین حروف آج بھی ویسے ہی تھے۔ ?WHO۔ وہ کون تھی؟

ہاں، بہت گناہگار، بہت غلطیاں کرنے والی ہی سہی۔ بہت نافرمان قسم کی مسلمان ہی سہی، مگر سامنے اس پہاڑ پہ نقش تاریخ سے ''ایک امت ہونے'' کا رشتہ تو تھا ہی۔ اور زندگی میں بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جب کسی مسلمان کو خون کے ابلتے جوش، بازو پہ کھڑے ہوتے رونگٹوں اور فرطِ جذبات سے بھیگتی آنکھوں کے ساتھ اپنے مسلمان ہونے پہ بہت فخر محسوس ہوتا ہے۔ اس کے لیے بھی وہ ایک ایسا ہی لمحہ تھا۔

☆ ☆ ☆

کیلیس قریب آیا تو نمروت داغ (کوہِ نمرود) دور ہوتا گیا، مگر اس کا سحر ابھی تک قائم تھا۔ جہان بتا رہا تھا کہ نمروت داغ پہ نمرود کے بڑے بڑے مجسمے بنے ہیں، جن کے سر کاٹ دیے گئے ہیں۔ اب وہ کٹے ہوئے سر پہاڑ کے قدموں میں جا بجا پڑے ہیں، اور سیاح ان پہ اسٹول کی طرح بیٹھ کر تصاویر بنواتے ہیں۔ جو سر جھکتے نہیں، وہ اسی طرح کاٹ دیے جاتے ہیں۔ چلو، وقت انسان سے جو بھی چھینے، کم از کم اس بات کا فیصلہ تو کر ہی دیا کرتا ہے کہ کون تاریخ کے درست طرف تھا اور کون غلط طرف۔

کیلیس سے ذرا دور، وہ ایک گیس اسٹیشن پہ رکے تو جہان نے کہا کہ وہ ادھر موجود اسٹور سے گفٹ لینا چاہتا ہے۔ کس کے لیے؟ اس نے نہیں بتایا۔ یقیناً اپنے میزبانوں کے لیے۔ وہ بھی کار سے نیچے اتر آئی۔

اسٹور میں آ کر وہ پرفیوم والے ریک کی طرف چلا گیا۔ خالص زنانہ پرفیومز۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ کسی لڑکی کے لیے شاپنگ کر رہا ہے۔ عجیب سا لگا۔ خیر۔ وہ میک اپ سیکشن میں کاسمیٹکس الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ پھر یاد آیا کہ کاجل خریدنا تھا، اس کا کب سے ختم ہو چکا تھا۔ اب استعمال بھی ذرا کم کرتی تھی۔ پتہ نہیں یہاں سے کیسا ملے۔

کاجل اسٹکس کی ٹوکری سے جیسے ہی اس نے ایک کاجل اٹھایا، ایک یاد چھم سے آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

ترکی آنے سے قبل وہ چند روز جب اس نے اور ڈی جے نے اکٹھی شاپنگ کی تھی۔ انہی میں سے ایک دن وہ دونوں ایک شاپ کے کاسمیٹکس سیکشن میں کھڑی تھیں۔

''حیا...... سب سے اچھا اور اعلیٰ میک اپ برانڈ کون سا ہے؟'' اس نے لپ گلاس ہونٹوں پہ لگا کر چیک کرتی حیا کو ماہر تصور کر کے پوچھا تھا۔

''Mac میک!'' اس نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔

''آہاں! ڈی جے سیلز گرل کی طرف مڑی۔ ''ایک میک کا کاجل دکھا دیں۔''

سیلز گرل نے فوراً میک کا کاجل نکال کر سامنے کیا۔

خوبصورت ڈبی، جدید انداز۔ ڈی جے کی آنکھوں میں ستائش ابھری۔

''کتنے کا ہے؟'' اس نے الٹ پلٹ کر ڈبی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آٹھ سو روپے کا۔''

ڈی جے کا منہ کھل گیا۔

''یہ ایک آٹھ سو روپے کا؟''

سیلز گرل نے شائستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

ڈی جے نے ہاتھ میں پکڑے کاجل کو دیکھا، اور پھر سیلز گرل کو۔ پھر حیا کی طرف ہو کر سرگوشی کی۔

''Be Pakistani and Buy Pakistani'' ساتھ ہی ٹھک سے کاجل کاؤنٹر پہ رکھ کر قطعیت سے سیلز گرل سے بولی۔

''دکھائیں بھی وہی اپنا پینتیس روپے والا ہاشمی کاجل۔''

منظر نگاہوں کے سامنے سے تحلیل ہو گیا، اور نگاہیں دھندلا گئیں۔ پھر بھی وہ دھیرے سے ہنس دی اور آنکھیں رگڑیں۔ یادیں...... جو کبھی پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

وہ کاجل لیے بغیر (کہ اب پاکستان جا کر ہی لے گی) جہان کی طرف چلی آئی۔ وہ ایک پرفیوم خرید چکا تھا اور اب پے منٹ کر رہا تھا۔

''اتنا چھوٹا سا اسٹور ہے، تمہیں کیسے پتہ کہ اتنا مہنگا پرفیوم جو لے رہے ہو وہ اوریجنل ہے یا نقل؟'' جہان کو ٹوکنا تو قومی فریضہ تھا اس کے لیے۔

جہان نے بقایا پیسے واپس پکڑتے ہوئے مڑ کر سنجیدگی سے اسے دیکھا اور پھر لفافے سے پرفیوم نکال کر، ڈبی سے شیشی باہر نکالی۔ پھر شیشی کی اسپرے نوزل اپنی انگلی کے قریب لے جا کر اسپرے کیا۔

''دیکھو، یہ کتنا فائن اور برابر اسپرے ہوا ہے۔ اگر نقلی ہوتا تو ذرا پچکری کی صورت اسپرے ہوتا۔ اور میں نے کئی بار پریس کر کے دیکھا ہے کیونکہ پہلی دفعہ میں تو اوریجنل پرفیوم پریس کرنے پہ بھی اسپرے اتنا فائن نہیں ہوتا۔'' اس نے ہاتھ پہ لگی خوشبو کو انگلیوں سے مسلا، پھر شیشی کا نوزل حیا کے سامنے کیا۔ ''دیکھو یہ نوزل کتنا پتلا ہے، اوریجنل پرفیوم کا ہمیشہ پتلا ہوتا ہے، جبکہ اسی برانڈ کے نقلی پرفیوم کا نوزل ذرا کھلا ہوگا۔'' پھر وہ شاپر میں پرفیوم ڈالتا پلٹ گیا۔

اس نے بس اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس آدمی کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا تھا!

جب وہ کیلیس کی گلیوں میں سے گزر رہے تھے تو وہ سوچنے لگی کہ کیسے، آخر کیسے اس کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا تھا؟ یہ ساری باتیں کوئی سکھا تو نہیں سکتا۔ یہ خود سیکھی جاتی ہیں۔ تجربے سے۔ مشاہدے سے۔ ہاں، وہ یقیناً کسی مسئلے کی وجہ سے اکتا جاتا ہوگا، مگر پھر عام لوگوں کی طرح اس چیز کو ٹھپ کر کے نہیں بیٹھ جاتا ہوگا، بلکہ اس کا حل ڈھونڈتا ہوگا۔ اور ڈھونڈنے سے تو سب مل جایا کرتا ہے۔ ہاں، وہ اسٹرگل کرنے والوں میں سے تھا۔ وہ اس سے متاثر ہوئی تھی۔ مگر خیر، یہ بات اسے کہے گی تو وہ بھی نہیں۔

کیلیس چھوٹا سا قصبہ تھا۔ تنگ مگر صاف گلیاں، خوانچہ فروش، پھلوں سبزیوں کی ریڑھیاں، پاکستان کے کسی چھوٹے شہر جیسا، مگر زیادہ صاف ستھرا۔ قریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ایک ایسی ہی گلی میں ایک گھر کے دروازے پہ کھڑے تھے۔ دستک دینے کے چند لمحوں میں ہی دروازہ کھل گیا۔

''مرحبا!'' معمر خاتون نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ مسکراہٹ کا پتہ آنکھوں سے چلا، ورنہ انہوں نے کھلے اسکرٹ اور لمبے بلاؤز کے اوپر اسکارف سے نقاب لے رکھا تھا۔

''مرحبا!'' ساتھ ہی جہان نے حیا کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ خاتون راستہ چھوڑ کر کھڑی تھیں۔ حیا نے ذرا جھجک کر جہان کو دیکھا، پھر ان خاتون کو سر کے اثبات سے سلام کا جواب دیتی اندر داخل ہوئی۔

چھوٹا سا صحن۔ آگے کمرے کا دروازہ تھا۔ برآمدہ وغیرہ نہیں تھا۔ وہ تینوں دروازے تک ساتھ آئے۔ چوکھٹ پہ جہان جھک کر بوٹ کے تسمے کھولنے لگا، پھر جھکے جھکے، گردن اٹھا کر آنکھوں سے حیا کو ذرا خفگی سے اشارہ کیا۔

''اوہ!'' وہ جلدی سے آگے بڑھی، اور نقاب اتارتے ہوئے، تعظیماً ان خاتون کا ہاتھ لے کر چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

''یہ میری بیوی ہے، حیا!'' وہ اب جوتے پیروں سے نکال رہا تھا۔ خاتون نے مسکراتے ہوئے اسے دعا دی۔ عمر میں برکت اور نعمتوں کی بقا کی دعا۔

وہ مسکراتے ہوئے دوبارہ نقاب کرنے لگی تو وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہاں اور کوئی نہیں ہے، اتار دو۔'' پھر ان خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ مریم خانم ہیں۔ میرے دوست علی کرامت کی والدہ۔''

حیا کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

اللہ، اللہ، یہ تھیں وہ؟ حد ہے، جہان نے بتایا ہی نہیں۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' وہ واقعی خوشی سے بولی تھی۔ وہ خاتون مسکراتے ہوئے سر ہلا کر پھر انہیں اندر لے گئیں۔

جب وہ ایک فرشی نشست والے کمرے میں آ بیٹھے تو وہ بہت اشتیاق سے کہنے لگی۔

''مجھے جہان نے بہت دفعہ آپ کے بارے میں بتایا تھا، کرامت بے، آپ کے ہزبنڈ کی ورکشاپ تھی نا، استنبول میں۔ اب کہاں ہوتے ہیں وہ؟''

اس سوال پہ مریم خانم کی مسکراتی آنکھیں ذرا مٹیں، انہوں نے جہان کو دیکھا اور جہان نے حیا کو۔

(کیا کچھ غلط پوچھ لیا؟)

''ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے بیٹا۔'' وہ بولیں تو آواز سوگوار تھی۔

''اوہ۔ اللہ مغفرت کرے۔'' اسے پچھتاوا ہوا۔ پھر موضوع بدلنے کی غرض سے بولی۔ ''اور...... آپ کی ایک جیٹھانی بھی تھیں، فریحہ۔ جہان کو بہت پسند تھیں وہ۔ بتایا تھا اس نے مجھے کہ وہ بہت خوبصورت تھیں۔ وہ لوگ استنبول میں ہوتے ہیں کیا؟''

''خانم، ہم کھانا کھائیں گے، مگر کوئی تکلف مت کیجئے گا۔ جو بنا ہے لے آئیں۔'' وہ ذرا اونچی آواز سے بولا۔ حیا خاموش ہو گئی۔ پھر کچھ غلط پوچھ لیا تھا شاید۔

''ہاں تم بیٹھو، میں کھانا لاتی ہوں۔'' اس کی اپنائیت پہ ان کی پھیکی پڑی مسکراہٹ دوبارہ زندہ ہوئی اور وہ باہر چلی گئیں۔

''کتنا بولتی ہو تم۔'' وہ جھنجھلا کر اس کی طرف پلٹا، جو گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ ''جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لو مگر اُن سے نہیں۔''

''تم تو جیسے فوراً بتا دو گے نا؟ اتنے گھنٹے ہو گئے سفر میں، ایک دفعہ ذکر نہیں کیا تم نے کہ ہم علی کرامت کے گھر جا رہے ہیں۔''

''فریحہ نے کئی سال پہلے خودکشی کر لی تھی، اور اس سے پہلے اس نے ان کے شوہر کو قتل کر دیا تھا۔''

وہ جو خفگی سے بولتی جا رہی تھی، اس کی بات پہ دھچکا سا لگا۔

''اللہ، اللہ!'' ششدر سی ہو کر اس نے جہان کو دیکھا۔ ''مگر کیوں؟''

جہان نے شانے اچکائے۔

''زمین جائداد کا مسئلہ تھا شاید۔ یہ لوگ اب یہیں رہتے ہیں۔ ان کے حالات بھی اچھے نہیں ہیں۔ علی کرامت آج کل ادھر نہیں ہوتا۔ لیکن اب یہ ٹاپک ان کے آگے مت چھیڑنا۔''

''او کے، میں چپ ہوں۔'' اس نے کندھے جھٹکے۔ یونہی لگا کہ جہان اصل وجہ جانتا ہے اور چھپا گیا ہے لیکن پوچھنے کا فائدہ نہیں تھا۔

''تم مریم خانم کے لیے لائے ہو پرفیوم؟'' اس نے پھر سوال کیا۔ حالانکہ ابھی اس کے سامنے ہی تو جہان نے ان کو وہ گفٹ بیگ تھمایا تھا۔

''ہاں، ان کو خوشبو پسند ہے، جب میں چلا جاؤں گا تو وہ اسے ضرور استعمال کریں گی اور انہیں اچھی بھی لگے گی۔'' وہ ان کا ذکر بہت محبت اور ادب سے کر رہا تھا۔ اس کی اپنی مرہ جیلہ!

پھر کھانے کے وقت مریم خانم نے ڈش اس کے آگے کرتے ہوئے کہا

"جہان کو بورک بہت پسند ہے اور ایران بھی۔ تمہاری پسند کا نہیں پتہ تھا۔ کیا تم یہ کھا لوگی؟"

"جی بالکل۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ اسے جہان کی پسند ناپسند کا علم نہیں، کھانے کے بارے میں ہی سہی۔

(ایران ترک لسی تھی اور بورک سموسے یا کچوری کی ہی ایک جدید شکل تھی)۔ جہان بہت شوق سے کھا رہا تھا، گو بہت زیادہ نہیں مگر خلوص اور محبت کا بھی اپنا ذائقہ ہوتا ہے۔

"تمہارا کمرا اوپر تیار ہے تم آرام کرلو۔" کھانے کے بعد وہ ہاتھ دھو کر آیا تو مریم خانم نے کہا۔

"جی"۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا، رومال سے ہاتھ صاف کرتا اور حیا کو ایک نظر (جیسے کہہ رہا ہو، میں ذرا آرام کرلوں) دیکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ حیا نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ادھ کھلے دروازے سے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ ان پہ چڑھتا اوپر جا رہا تھا۔ اس گھر سے جیسے وہ بہت مانوس تھا۔

"لائیں میں آپ کی مدد کر دیتی ہوں۔" وہ ان کے ساتھ برتن اٹھانے لگی۔ کچن میں آ کر اس نے دیکھا کہ مریم خانم نے اپنا نقاب اتار دیا تھا۔ وہ واقعی سیاہ فام تھیں لیکن پھر بھی خوبصورت تھیں اور محبت پسندیدگی کو تو نہیں کہتے۔ عربی لغت میں تو محبت کہتے ہی کسی شخص کا کسی دوسرے کے نظر میں خوبصورت لگنے کو ہیں، اتنا خوبصورت کہ وہ دل میں کھب جائے اور واقعی اتنی خوبصورت تو پھر وہ تھیں ہی!۔

ان کا گھر چھوٹا تھا، مگر سلیقے سے سجا ہوا۔ بڑے گھر تو سب سجا لیتے ہیں، اصل آرٹ تو چھوٹا گھر سجانا ہوتا ہے۔ بیٹھک سے نکلو تو ایک طرف سیڑھیاں اور دوسری جانب کچن تھا۔

"تم بھی آرام کرلو، کافی تھک گئی ہوگی۔" جب وہ کچن میں موجود پھیلاوا سمیٹنے لگی تو مریم خانم نے بہت اپنائیت سے کہا۔ حیا نے ایک نظر کھلے دروازے سے دکھتی سیڑھیوں کو دیکھا، اوپر ایک ہی کمرہ ہوگا ظاہر ہے، اور کتنا برا لگے گا اگر وہ ابھی ادھر چلی گئی۔

"نہیں، اصل میں میں تو سوتی آئی تھی، ویسے بھی تھک گئی ہوں بیٹھ بیٹھ کے، اب لیٹنے کا دل نہیں کر رہا۔ وہ آرام کرے گا ابھی۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں گی۔"

"چلو جیسے تمہاری مرضی"۔ وہ مسکرا کر بولی تھیں۔

جب کچن سمیٹ لیا تو پھر وہ دونوں اس فرشی نشست والے کمرے میں آ بیٹھیں۔ چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ حیا کو سمجھ نہیں آیا وہ کیا کہے، نئی جگہ تھی وہ بے تکلف ہونا بھی نہیں چاہ رہی تھی مگر اس گھر میں کچھ انوکھی سی اپنائیت تھی۔

"کیا وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے؟"

"کبھی کبھی آتا ہے۔ وہ بھی پچھلے تین سال سے، جب سے اس کا کاروبار اس جگہ پہ ہو گیا ہے۔"

اس بات پہ حیا نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا مگر یوں لگتا جیسے وہ نہیں جانتیں وہ کونسا کاروبار کر رہا ہے۔

"تمہاری شادی کب ہوئی تھی؟" انہوں نے مسکرا کر محبت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ ذرا گڑبڑا گئی، پتا نہیں جہان نے کیا کہہ رکھا تھا پھر زبردستی ذرا سا مسکرائی۔ "زیادہ عرصہ نہیں ہوا"

(بس بائیس سال ہونے والے ہیں)

"اچھا اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے۔" وہ مسکرا کر سر ہلاتی دعا دے رہی تھیں، عربوں کی مخصوص عادت۔

"جہان کیا اتنے سال آپ سے کانٹیکٹ میں رہا تھا؟"

"ہاں فون کرتا رہتا تھا، دو تین برسوں سے تو آنے جانے بھی لگا ہے۔ بہت سعادت مند لڑکا ہے۔ ہمیں کبھی بھی نہیں بھلایا۔"

"جی وہ بتاتا تھا آپ کے بارے میں اکثر۔ آپ تو ڈاکٹر تھیں نا، میرا مطلب، ہیں نا؟"

"ہاں مگر اب میرے گھٹنوں میں درد رہتا ہے۔ یہاں ہسپتال جاتی ہوں ہر ہفتے اور اتوار لیکن آج تم لوگ آ رہے تھے اس لیے نہیں گئی"

یعنی کہ جہان ان کو آنے سے پہلے مطلع کر چکا تھا لیکن کیا تھا اگر اسے بھی بتا دیتا۔

ان کے ساتھ پہلے وہ تکلف میں بیٹھی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ باتیں کرتی گئیں تو حیا کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ کہنی بھی پیچھے گاؤ تکیے پہ ٹکائے آرام سے بیٹھ گئی۔ کیلیس کی باتیں، یہاں کے لوگوں کی باتیں، پاکستان کی، زیتون کے درختوں کی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے مریم خانم کا گھر بہت اچھا لگنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

رات میں اس نے مریم خانم کے ساتھ مل کر کھانا تیار کروایا تھا۔ انہوں نے آج مانتی بنائے تھے۔ عجیب وغریب سی ڈش تھی مگر مزیدار تھی۔ مریم خانم کے بقول جہان کو بہت پسند تھی۔ جب وہ دستر خوان پہ برتن لگا رہی تھی تب وہ سیڑھیوں سے اترتا ہوا دکھائی دیا۔

''جہان، مجھے مریم آنٹی نے وہ کارڈ بھی دکھایا ہے جو تم نے ان کے لیے لکھا تھا۔ آنٹی آپ تو جہان کو اس سے بھی پہلے سے جانتی ہیں نا؟'' جب وہ اندر قالین پر آ کر بیٹھا تو اس کے سامنے پلیٹ رکھتے ہوئے حیا نے مسکراہٹ دبائے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ مریم آنٹی اس کے پیچھے ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اس کی بات پر مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

''ہاں بیٹا، عرصہ ہو گیا ہے ان کے ساتھ تو۔'' انہوں نے مانتی کی ڈش دستر خوان کے وسط میں رکھتے ہوئے کہا پھر خود بھی وہیں بیٹھ گئیں تمام برتن رکھے جا چکے تھے اور ان کے گرد وہ تینوں تکون کے تین خانوں کی طرح آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

''تو پھر بتائیں نا آنٹی جہان بچپن میں کیسا تھا؟''

وہ اسی طرح مسکراہٹ دبائے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کے بیٹھی مزے سے پوچھنے لگی۔

کھلے بال سمیٹ کر کندھے پہ ایک طرف ڈالے لمبی جامنی قمیص کے اوپر شانوں پہ ٹھیک سے زیتونی دوپٹہ پھیلائے وہ اس گھر کے ساتھ بہت مانوس لگ رہی تھی۔

''جہان کیسا تھا؟ ایسا ہی تھا جیسا اب ہے۔'' آنٹی ڈش اس کے سامنے کرتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگیں۔ وہ اس دوران سر جھکائے خاموشی سے پلیٹ میں کھانا ڈال رہا تھا۔

''تو بتائیں نا، اب اور تب وہ کیسا تھا؟''

اس نے ابرو اٹھا کر سنجیدگی سے حیا کو دیکھا پھر سر جھٹک کے اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''بھئی ایسا ہی تھا، بہت سمجھدار، بہت تمیزدار لڑکا۔ ہماری جد یسی کے لڑکے جب کھیلتے تھے تو گیند اکثر ہمارے گھروں کی چھت پر آ جاتی تھی۔ لڑکے بغیر پوچھے گھروں میں پھلانگ لیتے تھے مگر یہ تو بہت اچھا بچہ تھا۔ کبھی بغیر پوچھے کسی کے گھر میں نہ داخل ہوتا، نہ بغیر پوچھے کسی کی چیز اٹھائی، کبھی کسی کی باتیں نہیں سنیں، کسی کی بات ادھر سے اُدھر نہیں کی، بہت ہی سعادت مند لڑکا تھا۔'' آنٹی بڑی محبت اور اپنائیت سے بتا رہی تھیں اور وہ منہ آدھا کھولے ہکا بکا سی سن رہی تھی جب کہ سعادت مند لڑکے نے اسی سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔

''بس اللہ کا کرم ہے خانم، میری ممی کی تربیت بہت اچھی تھی۔'' ساتھ ہی اس نے مسکراہٹ دبائے حیا کو دیکھا جس کے چہرے کے خفگی بتا رہی تھی اسے یہ ساری باتیں بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔ اگر وہ یہ سمجھتی تھی کہ جہان نے صرف اس کو بیوقوف بنایا ہے تو وہ غلط تھی۔ اس فہرست میں تو بہت سارے لوگ تھے۔ اللہ سمجھے اس کو۔

رات میں آنٹی کے اپنے کمرے میں چلے جانے کے بعد وہ اوپر آئی۔ گیسٹ روم اچھا تھا۔ ڈبل بیڈ نفیس بیڈ شیٹ۔ چھوٹے سے گھر کا چھوٹا سا کمرا، بالکنی میں کھلتا دروازہ (ترکوں کے بالائی منزل کے کمروں میں بالکنی میں کھلتے دروازے ضرور ہوا کرتے تھے۔)

جہان کمرے میں نہیں تھا۔ وہ بیڈ کی پائنتی پہ آ کر بیٹھ گئی۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی اب کیا کرے۔

بالکنی کے دروازے پہ آہٹ ہوئی تو وہ فوراً اٹھنے لگی۔

''بیٹھو بیٹھو!'' وہ ہاتھ اٹھا کر روکتا عجلت میں آگے آیا، کرسی کے سائیڈ سے اپنا بیگ اٹھایا اور اسے کھولنے لگا۔ حیا اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھ گئی۔

''تم سو جاؤ، مجھے ذرا کام ہے۔'' اپنے بیگ سے اپنا لیپ ٹاپ نکالتے ہوئے اس نے حیا کو کہا۔ لیپ ٹاپ کو اپنے سامنے کھول کر وہ اب کچھ سی ڈیز نکال کر الٹ پلٹ کرنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کو دیکھے گئی۔ ایک سی ڈی نکال کر جہان نے لیپ ٹاپ میں ڈالی۔ چند لمحے کے

لیے کچھ دیکھا پھر سی ڈی واپس نکالی، کور میں ڈالی، لیپ ٹاپ کو اٹھا کے بیگ میں رکھا اور پھر ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ابھی تک جہان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے پر ذرا گڑبڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"تم سو جاؤ، میں جا رہا ہوں لیکن ان کو مت بتانا۔" بیگ اٹھا کے زپ بند کرتے ہوئے وہ کھڑا ہوا، اسے کندھے پہ ڈالا اور پھر بالکنی کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ متفکری کھڑی ہوئی "کب آؤ گے؟"

"صبح! اندر سے دروازہ بند کر لو، میرے پاس دوسری چابی ہے۔" اس نے مڑے بغیر کہا اور مڑے بغیر باہر نکل گیا۔ کاش اس وقت مریم خانم سن لیتیں کہ ان کے گھر کی کتنی چابیاں ان کے سعادت مند بیٹے کے پاس ہیں۔

حیا نے دروازہ بند کرتے ہوئے ذرا سی جھری سے باہر دیکھا۔ باہر ایک خستہ حال زینہ تھا جو گھر کی پشت پہ اترتا تھا اور پھر بیک ڈورز کی عادت تو اسے ہمیشہ سے تھی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور اس کی پشت سے ٹیک لگائے کھڑے چند گہری سانسیں اندر اتاریں۔

چوبیس گھنٹے..... پورے چوبیس گھنٹے بعد وہ کیلیس کے بارڈر پہ ہوں گے۔ کل کی رات بلاشبہ ایک یادگار رات ہو گی۔ اس نے سوچا تھا۔

وہ اس کی سوچ سے بھی زیادہ یادگار ہو گی یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح کا سنہری دودھیا پن کیلیس کے کھیتوں اور زیتون کے درختوں کے جھنڈ پہ قطرہ قطرہ اتر رہا تھا۔ وہ کمرے میں رکھی اس واحد کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھی منتظری بالکنی کے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ سامنے میز پہ ناشتے کے برتن خالی پڑے تھے۔ وہ کافی دیر سے اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی۔ اجرک کے لمبے کرتے میں ملبوس بالوں میں ڈھیلا جوڑا بنائے۔ منتظر، مضطرب مگر پُرسکون۔

دفعتاً دروازے کے کی ہول سے کلک کی آواز آئی۔ آہستہ سے دروازہ کھلا۔ پٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑے جہان نے دبے پاؤں اسے یوں دھکیلا کہ اس کی چرچراہٹ کم سے کم سنائی دے۔ ابھی آدھا کھلا تھا کہ اس کی نگاہ سامنے بیٹھی حیا پہ پڑی۔ وہ شاید اس کے آرام کے خیال سے آہستہ کھول رہا تھا، اسے جاگتا دیکھ کر سیدھا ہوا اور اندر آ کے دروازہ بند کیا۔

"صبح بخیر۔ اٹھ گئیں؟"

"ہاں کب کی"

جہان نے اپنا بیگ بیڈ پہ رکھا۔ وہ تھکا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ ٹھیک ہی تھا۔ شاید رات کہیں اور سویا تھا یا شاید نہیں۔ پتہ نہیں کیا کرتا رہا تھا۔

"کیا خانم آئی تھیں؟" وہ الماری کی طرف بڑھا جہاں اس کے کپڑے رکھے تھے۔

"ہاں ناشتہ دے گئی تھیں۔ میں نے تمہارا نہیں بتایا۔"

"اچھا، کیا بنایا ناشتے میں؟" شاید ان کے ہاتھ کا ذائقہ اسے بہت پسند تھا سو ذرا دلچسپی سے پوچھا۔ ساتھ ہی الماری میں رکھے کپڑوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھ رہا تھا۔

"بورک لائی تھیں۔ ایک میرا اور ایک تمہارا۔"

"تم نے اپنا کھا لیا؟"

"ہاں"

"اور میرا؟" اس نے ایک شرٹ اور تولیہ نکال کر کندھے پہ ڈالتے ہوئے باتھ روم کی طرف جاتے جاتے مڑ کر پوچھا۔

"تم تھے نہیں۔ اب واپس کیا کرتی۔ تو میں نے وہ بھی کھا لیا۔"

وہ جو کسی اور جواب کی توقع میں باتھ روم کی طرف جانے ہی لگا تھا، رک کے بے حد تحیر سے اسے دیکھا۔

"تم نے میرا ناشتا بھی کھا لیا؟"

"ہوں!" اس نے آرام سے سر ہلایا۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے، ٹیک لگائے وہ مزے سے بیٹھی تھی۔ جہان نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"دادا کہتے تھے کہ ان کے زمانے میں بیویاں شوہر کے آنے سے پہلے کھانا نہیں کھایا کرتی تھیں۔"

"یہ تمہارے دادا کیا فرعون کے زمانے کے تھے؟" وہ منہ بنا کے بولی۔ "ابھی تو گزرا ہے ان کا زمانہ۔ اب بھی وہی رواج ہیں۔ پتہ نہیں بڑوں کو کیا نوسٹیلجیا ہوتا ہے کہ شاید ان کا زمانہ زیادہ اچھا تھا۔"

اس کی بات پہ جہان نے افسوس سے ذرا سا سر جھٹکا۔

"اچھا سنو! مریم خانم کے کچن کی اوپر والے کیبنٹس میں سے دائیں ہاتھ کی تیسری کیبنٹ کھولو گی تو وہاں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں پڑی ہوں گی۔ کچھ نکال لاؤ میرے لیے۔"

"اللہ اللہ، جہان! کل تو وہ کسی کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ سعادت مند لڑکا کبھی بغیر پوچھے چیز نہیں لیتا۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ بغیر پوچھے لو؟"

"تم نے یہ بھی نہیں کہا کہ پوچھ کے لو۔"

"بورک سے جی نہیں بھرا جو صبح صبح میرا دماغ کھا رہی ہو۔" وہ خفگی سے کہتا باتھ روم میں چلا گیا اور دروازہ زور سے بند کیا۔ اس کے جانے کے بعد حیا کے لبوں پہ مسکراہٹ امڈ آئی۔ وہ شرارت سے نچلا لب دانتوں سے دبائے اٹھی۔ سائڈ ٹیبل کے پردے کے پیچھے سے ایک ڈھکی ہوئی پلیٹ نکالی اور پھر اوپر والی پلیٹ اٹھا کے جہان کا بورک دیکھا، اسے دوبارہ ڈھکا اور پھر سامنے میز پر رکھا۔ چند لمحے کے لیے کھڑی سوچتی رہی پھر اپنا پرس اٹھایا، اندر سے پین اور پوسٹ اٹ نوٹ کا چھوٹا پیڈ نکالا۔ اوپری صفحے پر لکھا "تمہارے دماغ سے بورک کا ذائقہ بہت اچھا ہے" اور اس نوٹ کو پیڈ سے پھاڑا اور پھر اوپری پلیٹ پہ چپکا دیا۔ چند لمحوں بعد وہ کمرے سے باہر تھی۔

کچھ دیر بعد جب جہان نیچے آیا تو وہ دونوں فرشی نشست والے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ ذرا سا مسکرایا۔ وہی اپنائیت بھری مسکراہٹ (غالباً بورک اسے مل گیا تھا۔) وہ بھی جواباً مسکرائی۔ دونوں نے کہا کچھ بھی نہیں۔ پھر وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر کسی کام کا کہہ کر باہر نکل گیا۔

دوپہر میں مریم خانم جب کپڑے دھونے کے لیے صحن میں آئیں تو وہ بھی اپنا عبایا اور اسکارف لے کر ادھر ہی آ گئی۔ عبایا تو وہ عادتاً روز ہی دھوتی تھی، ترکی ہو یا پاکستان۔ حجاب کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ صفائی نہ رکھی جائے بلکہ اس میں صفائی کی زیادہ ضرورت ہوتی تھی۔ وہ کبھی بھی گیلے بالوں پہ اسکارف نہیں اوڑھتی تھی اور بھلے عبایا سے کپڑے نہ نظر آئیں مگر پھر بھی وہ استری شدہ کپڑے پہنتی اور بال ٹھیک سے بنا کر ہی اسکارف لیتی تھی۔

"آنٹی کیا آپ کے پاس عبایا لوشن ہے؟ میرا لوشن ختم ہو گیا ہے۔" اپنا عبایا اور اسکارف پانی سے بھری بالٹی میں ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا۔ وہ عبایا کو سرف سے دھونے کا رسک نہیں لے سکتی تھی اور عبایا لوشن ختم ہو چکا تھا۔ اب کس سے دھوئے۔

"اتفاق سے میرے پاس بھی نہیں پڑا ہوا۔ تم شیمپو ڈال لو، وہ بھی ٹھیک رہے گا۔"

ان کی ہدایت کے مطابق اس نے بالٹی میں تھوڑا سا شیمپو ڈالا اور ہاتھ سے مکس کر دیا۔ مریم خانم مشین میں کپڑے ڈال رہی تھیں۔ وہ ان کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"آنٹی! ایک بات تو بتائیں۔"

"پوچھو۔" انہوں نے دورانِ مصروفیت پوچھا۔

"جہان کہتا ہے کہ قرآن میں پہیلیاں ہوتی ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟"

"دیکھو بیٹا قرآن بذات خود پہیلی نہیں ہے۔ لیکن اس کے اندر بہت ساری نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور یہ تو قرآن خود بھی بار بار کہتا ہے۔ ہاں تم کہہ سکتی ہو کہ قرآن میں بہت ساری پہیلیاں ہیں۔"

"مگر آنٹی قرآن تو آسان بنا کر اتارا گیا ہے نا، تو پھر کیا ضروری ہے کہ ہم اس کی ہر پہیلی ڈھونڈیں؟"

"نہیں قرآن آسان بنا کر نہیں اتارا گیا۔ اس میں غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔" وہ اب مشین کا ٹائمر لگا رہی تھیں۔

"لیکن آنٹی اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس نے قرآن کو آسان بنا کر اتارا ہے؟"

"اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ قرآن کو یسیر بنا کر اتارا ہے لیکن آسان نہیں۔ یسیر کا مطلب آسان نہیں ہوتا۔ یہ تو انگریزی اور دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ آسان کر دیا جاتا ہے ورنہ اس کا مطلب آسان نہیں ہوتا۔ یسیر کہتے ہیں کسی چیز کو تمام ضروری لوازمات سے آراستہ کر کے اسے ready to use بنا دینے کو۔"

"مگر آنٹی آسان بھی تو اسی چیز کو کہتے ہیں" وہ الجھی۔

"نہیں بیٹا، آسان کہتے ہیں پیس آف کیک کو۔ یعنی کسی کو کھانے کے لیے کیک کا ایک ٹکڑا دے دینا۔ اور یسیر کا مطلب ہے کہ کسی کو انڈے، میدہ، گھی، چینی، وغیرہ اور کیک کی ریسیپی دے کر کچن میں بھیج دینا۔ سب اس کے ہاتھ میں ہوگا، مگر کیک اسے خود بنانا ہوگا۔ اب یہ اس پہ منحصر ہے کہ وہ کیک بناتا ہے یا ان اشیاء سے آملیٹ اور میدے کی روٹی بنا کر اصل مقصد سے ہٹ جاتا ہے! انسان کے لیے وہی ہوتا ہے بیٹا جس کی وہ کوشش کرتا ہے!"

مشین زوردار آواز کے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے عبایا کو بھگوئے بھی کافی دیر ہونے کو آئی تھی، سو اس نے بالٹی سے اپنا گیلا عبایا اور اسکارف نکالا اور صحن کے کونے میں لگے سنک پہ لے آئی۔

"آنٹی، کیا سب گناہ معاف ہو جاتی ہیں؟" نل کھول کر دونوں مٹھیوں سے سیاہ حریر کو بھینچتی، وہ اس کی جھاگ نکال رہی تھی۔ پانی غٹا غٹ کی آواز کے ساتھ سنک کے پائپ سے نیچے جا رہا تھا۔

"ہاں! کیوں نہیں!"

"تو پھر وہ پیچھے کیوں آتے ہیں؟" سنک پہ جھکے کھڑی، کپڑا بھینچ بھینچ کر اس کے ہاتھ دکھنے لگے تھے۔ جھاگ اب ذرا کم ہوئی تھی۔

"یعنی.....؟" اس کی آنٹی کی طرف پشت تھی، وہ ان کی صرف آواز سن سکتی تھی۔

"یعنی کہ وہ ہمیں بار بار دکھائی کیوں دیتے ہیں؟" اس نے گیلے عبایا کو گٹھڑی کی صورت بنا کر دونوں ہاتھوں سے نچوڑا۔ پانی کی دھاریں بہتی گئیں۔

"تو اچھا ہے نا۔ ایسے انسان بار بار معافی مانگتا رہتا ہے، پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب اس کے وہ گناہ بدل کر نیکی لکھ دیے جاتے ہیں!"

"لیکن وہ ہمارا تعاقب ختم کیوں نہیں کر دیتے؟" اس کے ہاتھ میں اب ٹھنڈا سا عبایا رہ گیا تھا۔ حریر بھی جب کپڑا تھا۔ اس کو گٹھڑی میں بھی ڈال دو تو ایک شکن نہ پڑتی۔ اس نے کبھی بھی اس کو استری نہیں کیا تھا۔ گول مول کر کے رکھ دو، مجال ہے جو چمک ماند پڑے۔

"سچے دل سے توبہ کرو تو گناہ نہیں آتے پیچھے!"

اس نے تار پہ عبایا پھیلایا، اور پھر ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ اب مشین سے گیلے کپڑے نکال رہی تھیں۔ کنکھیوں سے اسے اپنا عبایا ہوا سے پھڑ پھڑاتا دکھائی دے رہا تھا۔

"مگر وہ کوفت تو دیتے ہیں نا، جیسے یہ عبایا مجھے کوفت دے رہا ہے، لگتا ہے ابھی ہوا کا تیز جھونکا آئے گا، اور یہ اڑ کر میرے سارے منظر پہ چھا کر اس کو تاریک کر دے گا!"

اس بات پہ مریم خانم ذرا سا مسکرائیں، اور ٹوکری میں سے ایک کلپ اٹھا کر عبایا کے اوپر لگا دیا۔ حیا پل بھر کو بالکل ٹھہر گئی۔

"اب نہیں اڑے گا، بھلے کتنا ہی پھڑ پھڑا لے! دعا بھی ایک کلپ کی طرح ہوتی ہے۔ اور یہ گناہ اس لیے یوں پھڑ پھڑاتے ہیں تا کہ تم یہ یاد رکھو کہ اگر تم دوبارہ اس راستے کی طرف گئیں تو یہ کلپ ٹوٹ جائے گا اور کپڑا اڑ کر سب پہ چھا جائے گا۔ زمانہ اسلام میں آنے کے بعد جاہلیت کے سب گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، لیکن ایک دفعہ پھر غلط راستے کی طرف جانے کی صورت میں وہ پچھلے گناہ زندہ ہو جاتے ہیں، اور انسان کو اس پرانے زمانہ جاہلیت کا بھی حساب دینا پڑتا ہے!"

"تو..... تو گناہ اس لیے ہمیں دکھائی جاتے ہیں تا کہ ہم ڈرتے رہیں، اور برائی کی طرف دوبارہ نہ جائیں؟"

"ہاں، اور تا کہ ہم خوف اور امید کے درمیان اللہ تعالیٰ کو پکارتے رہیں۔ اسی کو کہتے ہیں ایمان!"

مشین کا ڈرائیر بزر بجانے لگا تھا، آنٹی اس کی طرف پلٹ گئیں۔ وہ بس ان کی پشت کو دیکھے گئی۔

بہارے، عائشے کی باتیں دہراتی تھی، عائشے جہان کی، اور جہان مریم خانم کی۔ ہر علم والے پہ ایک علم والا ہوتا ہے۔ بس انسان کو سننا شروع کر دینا چاہیے، کیونکہ بعض لوگوں میں اللہ نے بہت خیر رکھی ہوتی ہے۔ اور یہ سننا اس نے ترکی آکر ہی تو شروع کیا تھا۔

ترکی کے خوبصورت لوگوں کی خوبصورت باتیں!

☆ ☆ ☆

کیلیس کا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا تھا۔ آج رات اس پہ چاند نہیں اترا تھا۔ مکئی کے کھیت سنسان پڑے تھے۔ ہر سو زیتون کی رسیلی لہک اور بارش سے پہلے کی مٹی کی خوشبو پھیلی تھی۔

خاموش، تاریک رات۔

جہان نے بریک پہ زور سے پاؤں رکھا تو گاڑی جھٹکے سے رکی۔

حیا نے اسے دیکھا۔ سبز شرٹ، نیلی جینز، اور ماتھے پہ بکھرے بال۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہمیں اس سے آگے پیدل چلنا ہے؟" اس کے سوال پہ جہان کا ارتکاز ٹوٹا، اس نے چونک کر حیا کو دیکھا اور پھر سر ہلایا۔

"ہاں، زیادہ دور نہیں جانا۔ گاڑی یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ تم واپس اس پہ آنا اور اسے خانم کے گھر چھوڑ دینا۔ اس کا مالک اسے وہیں سے لے لے گا۔" اپنی طرف کا لاک کھولتے ہوئے وہ کہتے کہتے رکا۔ "آر یو شیور تم میرے ساتھ وہاں تک آنا چاہتی ہو؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے، میری حسِ مزاح اتنی بری ہے کہ میں ایسی بات مذاق میں کہوں گی؟" وہ خفگی سے کہتی باہر نکل آئی۔ اس نے جہان کی ہدایت کے مطابق عبایا نہیں لیا تھا، تا کہ شامی عورتوں جیسی نہ لگے، اور کیلیس کی مقامی عورتوں کی طرح گھٹنوں سے نیچے کرتا ترک فراک، ٹراؤزرز اور سر پہ مریم خانم کا پھولدار سیاہ سفید اسکارف یوں لے رکھا تھا کہ اسکارف ماتھے پہ لپیٹ کر اس کی دونوں تکونوں کی گرہ گردن کے پیچھے لگائی اور پھر ان کو کندھوں پہ سامنے ڈال دیا، بالکل کشمیری عورتوں کی طرح۔ رات کے اندھیرے میں بھی اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"میں پہلے چلوں گا، جب وہ اس جھاڑی تک پہنچ جاؤں (اشارہ کرتے ہوئے) تب تم چلنا، تا کہ ہمارے درمیان فاصلہ رہے۔"

حیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ خاموشی سے آگے چلا گیا۔

حیا نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ وہاں دور دور کچھ بتیاں دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے واپس آگے دیکھا جہاں وہ جا رہا تھا۔ وہاں ہر طرف اندھیرا تھا۔ پیچھے روشنی، آگے اندھیرا۔ علامتی امتزاج۔

جب وہ نشان زدہ مقام تک پہنچ گیا تو وہ چلنے لگی۔ اس نے پھر وہی، ہاں وہی سرخ ہیل پہن لی تھی۔ جانتی تھی کہ جہان اس سے چڑتا ہے، اسی لیے پہنی تھی۔ پاؤں کا درد ویسا ہی تھا، مگر اپنا سیاہ پرس پکڑے، وہ اس کچی پکی زمین پہ بہر حال ہیل سے ٹھیک چل رہی تھی۔

آسمان پہ بادل وقفے وقفے سے گرجتے تھے۔ آج وہاں چاند نہیں تھا۔ آج وہاں ان کا چاند نہیں تھا۔

چند منٹ وہ یونہی چلتے رہے۔ پیر کا درد پھر سے سوا ہونے لگا۔ اسے پچھتاوا ہوا۔ لیکن جہان کو چڑانا بھی تو تھا۔

وہ کھیت سے نکل کر اب ایک کھلے میدان میں چل رہے تھے۔ گرمی زوروں کی تھی۔ دور، دور زیتون کے چند درخت نظر آتے تھے۔ جہان ایک بڑے سے درخت کے پاس جا کر رکا، اور مڑ کر اسے دیکھا۔ اندھیرے میں اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ وہ سبک رفتاری سے چلتی اس تک آئی۔ سانس ذرا سا پھول گیا تھا۔

"وہ دیکھو!" جہان نے درخت کے اس پار اشارہ کیا۔ وہ تنے کی اوٹ سے بدقت دیکھنے لگی۔

بہت دور، کئی سو میٹر دور، سرحدی باڑ تھی۔ خاردار اونچی تاریں۔ اس کے اندر اضطراب بڑھتا گیا۔ دل کی دھڑکن سوا ہو گئی۔

"دو بجے تک ادھر ہی بیٹھتے ہیں۔" وہ آواز سرگوشی کی مانند کیے تنے سے ٹیک لگا کر زمین پہ بیٹھا۔ (لگتا تھا میجر احمد بول رہا ہے) حیا بھی اسی کے انداز میں تنے سے پشت ٹکا کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ دونوں نے اپنے بیگ ایک دوسرے سے مخالف سمت میں رکھ دیے تھے۔

اوپر بجلی زور سے چمکی۔ چاندی لمحے بھر کو پھیلی اور پھر سارے میں سیاہی اتر آئی۔ حیا نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔

کیا آج اسلام آباد میں بھی بادل ہوں گے، اس نے وقت کا حساب کرنا چاہا۔ یہاں ساڑھے بارہ ہو رہے تھے تو ادھر ساڑھے دس ہوں گے۔ کبھی کبھی ڈنر اسی ٹائم کیا جاتا تھا۔ شاید اب بھی سب کھانا کھا رہے ہوں۔ ڈائننگ ٹیبل پہ سب ہوں۔ تایا ابا کی فیملی بھی، پھپھو بھی۔ وہ پلاسٹک کی بنی نتاشہ بھی۔ اور اگر کوئی ابھی ان کو بتائے کہ جہان اور حیا عین اسی وقت، ترکی اور شام کی سرحدی باڑ سے ذرا دور درخت تلے بیٹھے ہیں تو.....؟ اللہ، اللہ حیا۔ یہ وہ آخری موقع ہے جب ایسی بات تمہیں سوچنی چاہیے۔ اس نے خود کو سرزنش کی۔

جہان تنے سے سر ٹکائے، کلائی چہرے کے سامنے کیے گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

''کچھ وقت ادھر بیٹھنا ہوگا، پھر میں چلا جاؤں گا اور تم واپس!''

''جہان..... کیا یہ آخری طریقہ ہے شام جانے کا؟'' وہ اس کو دیکھتے ہوئے فکرمندی سے بولی۔

''میرے لیے؟ ہاں!''

''مگر پہلے تو تم میرے ساتھ بھی کتنے آرام سے سفر کر لیتے تھے۔ تو اب؟''

''میں نے بتایا تھا نا، میرے ان سے تعلقات خراب ہیں۔ اس دفعہ میں یہی بارڈر کراس کر کے آیا تھا، سو اب اسی طرح جا سکتا ہوں۔'' وہ بہت دھیمی آواز میں سمجھا رہا تھا۔ آج دونوں کا لڑنے کا موڈ نہیں تھا۔

''مگر کیا تم جعلی پیپر ورک کر کے نہیں جا سکتے؟''

''میں اپنی شکل نہیں بدل سکتا حیا۔ میں ایئرپورٹ پہ گرفتار ہو جاؤں گا۔''

''بدل تو سکتے ہو!''

''وہ حیا سلیمان نہیں ہیں جن سے رات کے اندھیرے میں کوئی ڈراؤنی شکل بنا کر ملو تو وہ دن کی روشنی میں نہیں پہچانیں گے۔ وہ پورے ہجوم میں بھی اپنا بندہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ میں اسی شکل پہ کوئی نارمل انسان والی دوسری شکل تو نہیں چڑھا سکتا نا۔''

''ہاں بس جب کسی کو بے وقوف کہنا ہو تو میری مثال کافی ہے۔'' وہ بغیر خفگی کے ہنس کر بولی تھی۔ پہلی دفعہ ایسی بات نے اسے خفا نہیں کیا تھا۔ وہ ذرا مسکرا کر سامنے دیکھنے لگا۔

چند لمحے بیتے۔ خاموشی کے بوجھ نے زیتون کی شاخوں کو مزید بوجھل کر دیا تو وہ بولی۔

''جہان! تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟'' ''یہ کہ میں زندہ رہوں، اور اس لمبی سی عمر میں اپنا کام کرتا رہوں۔''

اندھیرے میں بھی وہ اس کے چہرے پہ وہ چمک دیکھ سکتی تھی جو اب اس کے لیے بہت مانوس تھی۔

''بہت محبت ہے نا تمہیں اپنی جاب سے؟''

''بہت زیادہ!'' اس نے بس دو لفظ کہے۔ جذبات سے بوجھل لفظ۔ مزید کہنا بے کار تھا۔

''اور تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟''

''یہ کہ میں ایک کتاب لکھوں، جس میں قرآن کی آیات کے رموز پہ غور کروں۔ لفظوں میں چھپی پہیلیوں کو سلجھاؤں۔ ان کے نئے نئے مطلب آشکار کروں۔ کہتا ہے نا قرآن کہ اس میں نشانیاں ہیں، مگر ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ میں بھی ان میں سے بننا چاہتی ہوں۔''

وہ محویت سے، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے سن رہا تھا۔

''پھر کب لکھو گی یہ کتاب؟''

''کبھی نہ کبھی ضرور لکھوں گی۔ مگر پتہ ہے، میں ایک بات جانتی ہوں کہ اگر دنیا کے سارے درخت قلمیں بن جائیں، اور تمام سمندر روشنائی بن جائیں، اور میں لکھنے بیٹھوں، اور مجھے اس سے دوگنا قلم اور روشنائی بھی دے دی جائے، تب بھی سارے قلم گھس جائیں گے، ساری روشنائی ختم ہو جائے گی، مگر اللہ تعالیٰ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔''

پھر اس نے سر اٹھا کر درخت کی شاخوں کو دیکھا۔

''یہ زیتون کا درخت ہے نا، مبارک درخت!'' ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی تھی۔ اوپر گردن اٹھانے سے اکارف سے نکل کر

ماتھے پہ جھولتی لٹ کان تک جا گری تھی۔

"یعنی کہ تم واقعی قرآن پڑھتی ہو!" وہ اس کے شجرۂ مبارکہ کا حوالہ دینے پہ سمجھ کر بولا تھا۔

"ابھی تو نہیں" آواز میں ذرا شرمندگی در آئی۔ "بہت پہلے پورا پڑھا تھا۔"

"تم پہلے پڑھتی تھیں قرآن؟"

"میں شریعہ اینڈ لاء کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ قرآن، حدیث، فقہ، شرعی احکام، پانچ برسوں سے یہی تو پڑھ رہے ہیں۔ مگر پہلے کورس کی طرح پڑھا۔ عمل میں اب لائی ہوں۔ وہ وقت گئے جب شریعہ اینڈ لاء میں صرف مذہبی رجحان والی لڑکیاں داخلہ لیا کرتی تھیں۔ اب تو شریعہ کی آدھی لڑکیاں وہی ہی ہوتی ہیں جیسی پہلے میں تھی۔"

"اور اب؟" اس نے اسی روانی سے پوچھا تھا۔

"اب تو میں...... میں بس کل پاکستان جا کر ہی اپنا ٹائم ٹیبل سیٹ کرتی ہوں قرآن پڑھنے کا۔" وہ جیسے خود سے وعدہ کر رہی تھی۔

جہان نے اسے دیکھتے ہوئے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

"حیا قرآن کبھی بھی کل نہیں پڑھا جاتا۔ قرآن آج پڑھا جاتا ہے۔ اسی دن۔ اسی وقت۔ کیونکہ کل کبھی نہیں آیا کرتا۔"

"اوکے! پھر میں آج سے پڑھوں گی!" اس نے فوراً بات مان لی۔ "اور اگر کوئی اور ہوم ورک ہے تو وہ بھی دے دو۔"

"جیسے تم میری بہت مانتی ہو؟"

"کیا نہیں مانا؟"

"میں نے کہا تھا، واپس چلی جاؤ، مگر تم نہیں گئیں۔"

"ہاں تو میں اب بھی کیلیس دیکھنے ہی آئی ہوں، تمہارے لیے تھوڑی ہی آئی ہوں۔" اس نے ناک سکوڑی۔

زیتون کی خوشبو، کچی پکی، رسیلی سی خوشبو پر سو چھا رہی تھی۔ جیسے اس نے کپادوکیہ میں غبارے پہ خوبانی نہیں کھائی تھی، ایسے ہی اس کا دل اب زیتون کھانے کو بھی نہیں چاہا تھا۔ جہان ساتھ ہوتا تو اسے سننے کے علاوہ کہاں کسی دوسرے کام کے لیے جی چاہتا تھا؟

کافی دیر بعد جب وہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی بیٹھی تھک گئی تو ذرا سا پہلو بدلا، اور ایسا کرتے ہوئے پاؤں کی سمت بدلی تو جوتے کی آواز آئی۔ جہان نے چونک کر دیکھا۔

"تم پھر یہی جوتے پہن آئی ہو؟" اس نے اب نوٹ کیا تھا یا پہلے سے جانتا تھا، وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

"ہاں، کیونکہ مجھے پتہ ہے تمہیں یہ کتنے پسند ہیں۔"

"بالکل۔ ذرا ایک منٹ اتارنا۔"

"کیوں؟"

"بس ایک منٹ نا!"

حیا نے ذرا تذبذب سے جھک کر جوتوں کے اسٹریپس کھولے، اور پاؤں ان سے نکالے۔ جہان نے ایک جوتا اٹھا کر الٹ پلٹ کیا۔

"اچھا ہے، مگر اتنا نہیں کہ ساتھ نبھا سکے۔" ساتھ ہی اس نے جوتے کے دونوں کناروں کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ چخ کی آواز کے ساتھ جوتا درمیان سے ٹوٹا۔

"جہان، نہیں!" وہ بمشکل اپنی حواس باختہ چیخ روک پائی۔ جہان نے پرواہ کیے بغیر دوسرے کو بھی فوراً سے اٹھا کر اسی طرح توڑا۔ جوتے کی لکڑی ٹوٹ چکی تھی مگر چمڑے کے باعث دونوں ٹوٹے حصے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔

جہان نے ایک ایک کر کے دونوں کو دور اچھالا۔ وہ اندھیرے میں گم ہو گئے۔

حیا شاکڈ اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں کیا تم نے ایسا؟"

اس نے جواباً بے نیازی سے شانے اچکائے۔

''دل چاہ رہا تھا۔''

''اب میں گھر کیسے جاؤں گی؟ کیا تم مجھے اپنے جوتے دو گے؟''

''میں بالکل بھی اپنے جوتے نہیں دوں گا۔''

''اور جو یہ یہاں اتنے پتھر، اتنے کانٹے اور جھاڑیاں ہیں، میں ان پہ کیسے ننگے پاؤں چل کر جاؤں گی؟'' وہ خفگی سے بولی تھی۔

''یہ جو تم نے اپنے پرس میں نیلے پلاسٹک بیگ میں گلابی رنگ کے کینوس شوز رکھے ہیں نا، تم یہ پہن کر واپس چلی جانا۔''

اور حیا ایک دم جھینپ کر ہنس دی۔

وہ ایک دفعہ پھر پکڑی گئی تھی۔ سوچا تھا اس کو خوب چڑا کر واپسی پہ کینوس شوز پہن لے گی، مگر وہ جہان ہی کیا جو بلا اجازت کسی کا بیگ نہ چیک کرے۔

''میں دیکھنا چاہتی تھی کہ اگر میرا جوتا ٹوٹا تو تم مجھے جوتا دیتے ہو یا نہیں؟''

''اور تمہیں یقین تھا کہ میں نہیں دوں گا، اسی لیے تم دوسرا جوڑا اٹھا لائی۔''

''ہاں، تمہارا کیا بھروسہ۔ اسی لیے پلان بی میں نے تیار رکھا تھا۔ مگر یہ طے ہے کہ میں تمہیں نہیں آزما سکتی، اور تم بھلے مجھے کتنا ہی کیوں نہ آزماؤ'' وہ محظوظ انداز میں بولی تھی۔ ''اور تم نے میرا بیگ چیک کیا، مطلب تمہیں مجھ پہ بھروسہ نہیں ہے۔''

''اونہوں۔ بات بھروسے کی نہیں، پروفیشنلزم کی ہے۔ اصول، اصول ہوتے ہیں۔ اپنے escort کو بغیر چیک کیے میں یہاں تک نہیں لا سکتا۔''

''اور کیا نکلا میرے پرس سے؟'' وہ لطف اندوز ہوتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔

''ایک ٹوٹی ہوئی عینک۔ اور..... اس رومال میں کیا تھا؟''

وہ ذرا چونکی۔ مسکراہٹ سمٹی۔ ''تم نے اسے کھولا؟'' آنکھوں میں بے چینی اتر آئی۔

''نہیں۔''

''آخر دفعہ سچ کب بولا تھا؟''

''ابھی پانچ سیکنڈ پہلے جب میں نے کہا کہ میں نے اس کو نہیں کھولا۔''

حیا خاموشی سے سامنے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔ مبارک درخت کا سایہ اس پل مزید سیاہ ہو گیا تھا۔

''میں نے بس آخری دفعہ سیپ چنا۔ سوچا تھا کہ عائشے کی طرح کا سفید موتی نکلے گا، یا پھر مرے ہوئے جانور کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مگر ان دونوں میں سے کچھ نہیں ہوا۔''

''پھر؟ کیا نکلا؟''

حیا نے ذرا مضطرب انداز سے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ قابلِ فخر نہیں۔''

''دکھاؤ۔''

حیا نے بنا احتجاج کیے پرس کھولا، اندر سے وہ تہہ شدہ رومال اور ٹوٹی ہوئی عینک ایک ساتھ نکالیں، ایک ہاتھ میں عینک پکڑے، دوسرے کی ہتھیلی میں وہ رومال تھاما۔ پھر ہتھیلی جہان کے سامنے کر کے کھولی تو رومال کی کی پوٹلی کھل کر آبشار کی طرح ہاتھ کے اردگرد گر گئی۔ اب ہتھیلی پہ کاغذ کی طرح رکھے سفید رومال کے وسط میں کچھ رکھا نظر آ رہا تھا۔

جہان نے گردن ذرا آگے کر کے دیکھا، اور مسکرایا۔ ''اور تم کہہ رہی تھیں کہ یہ اچھا نہیں ہے؟''

حیا نے رومال کی سمت دیکھا جس کے عین وسط میں ایک موتی چمک رہا تھا۔

سیاہ رنگ کا موتی۔

''عائشے کے موتی سفید نکلتے ہیں۔ سفید ہوتا ہے پاکیزگی، معصومیت، نیکی کی علامت۔ مگر میرا موتی سیاہ رنگ کا نکلا۔ بہت سے سفید موتیوں میں کسی ugly duckling کی طرح۔'' وہ اداسی سے موتی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جہان نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

''واقعی، سیاہ تو برائی کا رنگ ہوتا ہے۔ جادو کی سب سے بُری قسم سیاہ جادو کہلاتی ہے، گناہوں سے بھرا دل سیاہ دل ہوتا ہے، گناہگاروں کے چہرے سیاہ ہوں گے روز قیامت۔''

اس کی بات پہ حیا کا چہرہ مزید بجھ گیا، مگر میجر احمد کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

''اور تم نے اس سے یہ اخذ کیا کہ سیاہ ایک بُرا رنگ ہے؟ اونہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''سیاہ وہ رنگ ہے جو دھنک کے سارے رنگ اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ یہ ایک ڈارک رنگ ہے، اور ڈارک، بُرے کو نہیں، ڈیپ (گہرے) کو کہتے ہیں۔ سارے رنگ اس میں مدفن ہیں اور وہ ان کو کسی راز کی طرح چھپائے رکھتا ہے۔ وہ جو گہرا ہوتا ہے، ہاں وہ سیاہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے، سیاہ رات میں گناہ کیے جاتے ہیں، مگر بے ریا عبادت بھی رات کی سیاہی میں کی جاتی ہے۔ کالا جادو، کالا اسی لیے کہلاتا ہے کہ یہ سفید جادو سے گہرا ہوتا ہے۔ یہ گہرائی کا رنگ ہے۔ دیرپا ہونے کا رنگ۔ اسی لیے کعبہ کا غلاف سیاہ ہوتا ہے، آسمان کا رنگ بھی تو سیاہ ہے، بارش کے قطرے، اپنے اندر سموئے بادل بھی تو کالے ہوتے ہیں، قرآن کے لفظ بھی تو عموماً سیاہ روشنائی میں لکھے جاتے ہیں، اور......'' وہ سانس لینے کو رکا۔ ''اور تمہارا برقع بھی تو سیاہ ہے نا!''

اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ چہرے پہ ایک سکون سا آ ٹھہرا۔

اسے جیسے میجر احمد پھر سے مل گیا تھا۔ اس نے مٹھی بند کر دی، رومال ہاتھ کے کناروں سے جھلکنے لگا تھا۔

''اور کیا سیاہ رات میں کی گئی نیکیاں، سیاہ برائیوں کو دھو ڈالتی ہیں؟''

''تمہیں کیوں لگتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا؟''

''ہوتا ہوگا، مگر...... وہ ویڈیو، اگر وہ کسی کے پاس ہوئی تو......؟ اس کی آواز میں کرب در آیا۔ جہان نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''کیا وہ کسی کے پاس ہے حیا؟''

''نہیں۔ میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔'' وہ کہہ کر پچھتائی۔ اب اسے جلدی سے بات بدلنی تھی۔

''اگر وہ کسی کے پاس ہے تو تم مجھے بتا سکتی ہو، میں......''

''تمہیں مجھ سے محبت کب ہوئی تھی جہان؟ جب میں نے ریسٹورانٹ میں گلدان توڑ کر پھینکا تھا یا جب میں نے تمہارے اوپر جنجر بریڈ کا ٹکڑا پھینکا تھا؟''

تیزی سے بات پلٹنے کی کوشش میں وہ بنا سوچے سمجھے بولی تھی۔ وہ جو روانی سے کچھ کہہ رہا تھا، اس کے لب ٹھہرے، آنکھوں میں ذرا سی بے یقینی اتری مگر پھر وہ اسی روانی سے بولا

''جب تم نے میرے اوپر ٹھنڈا اسلش پھینکا تھا۔''

وہ سانس روکے، انہی ٹھہری ہوئی پتلیوں سے اسے دیکھے گئی۔ چند لمحے سرحدی لکیر کے گرد سب کچھ رک گیا۔ اور پھر، وہ دونوں ہنس دیے۔

''دیکھ لو، مجھے بھی آتا ہے لوگوں سے جواب نکلوانا۔''

''اللہ ان لوگوں پہ رحم کرے!''

وہ گردن پیچھے پھینکے، ہنستی جا رہی تھی۔ سخت گرمی میں جیسے کیلیس پہ بہار اتر آئی تھی۔ جب ہنسی رکی، تو اس نے مسکراہٹ بمشکل دبائے جہان کو دیکھا۔

''کیا تمہیں یاد ہے کہ پہلی دفعہ زندگی میں تم نے کیک کب کھایا تھا؟ یا پہلی دفعہ تم کب روئے تھے؟ نہیں نا؟ کسی کو بھی ایسی باتیں یاد

نہیں ہوتیں۔ مجھے بھی نہیں یاد کہ کب پہلی دفعہ میں نے اپنے نام کے ساتھ تمہارا نام سنا تھا۔" وہ دور پھیلے مکئی کے تاریک کھیتوں کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "یاد ہے تو بس اتنا کہ تمہارا ذکر میرے ساتھ ہمیشہ سے تھا، جیسے میرا سایہ میرے ساتھ ہے، یا جیسے میری روح۔"

"اور تمہیں مجھ سے محبت کب ہوئی تھی؟"

حیا نے محظوظ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"میں نے تو نہیں کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے!"

"او کے۔ میں نے یقین کرلیا!" وہ بھی جہان تھا، مگر اتنی آسانی سے تو وہ نہیں کہنے والی تھی۔

"وہ جو ونڈ چائم میں نے تمہیں گفٹ کیا تھا، ابھی گھر رکھا ہے، تم پاکستان آ ؤ گے تو تمہیں دوں گی، مگر تم نے اس پہ لکھا حضرت عمرؓ کا قول پڑھا؟ وہ شخص جو صرف اس لیے اپنی بیوی کو چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا، مگر گھر بنانے کے لیے محبت ضروری نہیں ہوتی جہان۔ محبت تو بعد میں بھی ہو جاتی ہے۔ وفا اور قدر دانی زیادہ اہم ہوتی ہیں۔"

پھر وہ رکی، اور بے ساختہ امڈ کر آتی مسکراہٹ روک کر بظاہر سنجیدگی سے بولی۔ "تم نے قدر دانی نبھائی وہ ایسے کہ تم میری قدر کرتے ہو، اور جانتے ہو کہ سرچ لائٹ لے کر بھی ڈھونڈ و گے تو میری جیسی بیوی نہیں ملے گی۔ اور میں نے وفا نبھائی، سو تمہیں نہیں چھوڑا۔ کیا ہوا جو تم میرے جتنے گڈ لکنگ نہیں ہو، کیا ہوا جو تم ایک بے مروت، بدلحاظ اور بدتمیز انسان ہو، مگر ہو تو میرے شوہر نا!" ساتھ ہی اس نے شانے اچکائے۔ جہان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"بہت شکریہ حیا!"

چند ساعتیں کیلیس کی سرزمین خاموش رہی۔ درخت اور ان کے پتے ہولے ہولے سانس لیتے رہے۔ پھر وہ بولا۔ "میرا مسئلہ یہ تھا حیا کہ میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ اس رشتے کو اپناؤں یا نہیں، مگر بہت دیر سے میں یہ سمجھا ہوں کہ یہ رشتہ تو ہم بہت پہلے اپنا چکے۔ بات "کرنے" یا نہ کرنے" کی حد سے آگے نکل چکی ہے۔ اب نبھانے کا فیز ہے۔ بس سمجھنے میں دیر ہوئی مگر میں سمجھ گیا ہوں۔"

حیا کے ننگے پیروں پہ کچھ رینگا تھا۔ اس نے جلدی سے پاؤں جھاڑا۔ کوئی کیڑا تھا شاید۔ مگر ماحول کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جہان نے گھڑی دیکھی۔ پونے دو ہونے کو تھے۔

"اب مجھے جانا ہے۔"

اور حیا کو لگا اس کا دل زور سے سمندر میں دھکیل دیا گیا ہے۔ یہ درد اتنا شدید تھا کہ اسے جسمانی لحاظ سے بھی محسوس ہوا تھا۔ وہ درخت کی ٹیک چھوڑ کر اس کی طرف مڑی۔

"جہان پلیز...... مت جاؤ!" آنکھوں میں اضطراب لیے وہ التجا کرنے لگی تھی۔

"نہیں حیا...... ایسے مت کرو!"

"پلیز، میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے تم مت جاؤ۔"

"حیا، یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ اوپر ستارہ جو ہے نا" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا مگر حیا نے اوپر نہیں دیکھا۔ وہ اسی مضطرب انداز میں جہان کو دیکھ رہی تھی۔ "یہ ستارہ اپنے دائیں جانب رکھ کر میں چلتا رہوں گا، اور حلیپو پہنچ جاؤں گا۔ یہ بہت سہل ہے حیا۔"

"جہان، پلیز، نہ جاؤ۔ دیکھو، سیکیورٹی فورسز، کیا پتہ وہ جانتے ہوں، وہ پہلے سے تیار بیٹھے ہوں، پھر؟"

"وہ کیسے جان سکتے ہیں جب میں نے یا تم نے ان کو نہیں بتایا تو؟"

"مگر یہاں بارودی سرنگیں ہیں۔"

"وہ مسئلہ نہیں ہیں۔ مسئلہ صرف کمانڈر ہوتا ہے، اور کمانڈر شیعہ ہے، یعنی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"شیعہ؟" اس نے حیرت سے جہان کو دیکھا۔ یہ فرقہ واریت کہاں سے آ گئی؟

"دیکھو، شام کے صدر بشار الاسد شیعہ ہیں، اور پاپا سنی ہیں۔"

''کس کے پاپا؟ اچھا، طیب اردگان!''

''اللہ ایسی عقلمند بیوی ہر ایک کو دے۔ دیکھو، طیب اردگان سنی ہیں۔ سو جب بارڈر کا کمانڈر سنی ہوتا ہے تو آپ شام سے ترکی میں داخل ہو سکتے ہیں، سیکیورٹی نرم ہوتی ہے، مگر ترکی سے شام جانے میں مسئلہ ہوگا، لیکن جب کمانڈر شیعہ ہوتا ہے تو وہ آپ کو شام جانے دے گا۔''

''مجھے سمجھ نہیں آئی۔''

''مطلب یہ کہ اگر شام سے ترکی جانا ہے تو تب جاؤ جب سنی کمانڈر ہو، اور جب ترکی سے شام جانا ہو تو شیعہ کمانڈر کے وقت جاؤ میں اسی لیے اتنے دن ٹھہرا رہا کیونکہ کمانڈر بدلنا تھا۔ چار روز پہلے نیا کمانڈر آیا ہے۔ دنیا کے ہر بارڈر پہ کمانڈر کی تبدیلی کے گھنٹے بھر میں ہی اس کا نام وغیرہ اسمگلرز اور جاسوسوں میں پھیل جاتا ہے، یہ واحد بارڈر ہے جہاں پہلی بات یہی پھیلتی ہے کہ وہ سنی ہے یا شیعہ۔ یہ فرقہ واریت نہیں ہے، یہ تو بس اسٹریٹجک Strategic سیاست ہے!''

وہ اسی طرح فکرمند اور پریشان سی اسے دیکھتی رہی۔

''میں اگلے ہفتے، منگل کے دن پاکستان آجاؤں گا، میرا یقین کرو!''

حیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس کو روکنا چاہتی تھی، مگر اب یہ اس کے ہاتھ سے باہر تھا۔

''اب یاد کرو، آشیانہ میں میرا وعدہ کہ ہر پلان میں ڈیسائیڈ کروں گا۔ یاد ہے؟''

''ہوں!'' اس نے گردن ہلائی۔ آنسو گلے میں پھندا ڈال رہے تھے۔

''اب مجھ سے کچھ وعدے کرنے ہوں گے تمہیں۔'' وہ بہت غور سے اسے دیکھتا قطعیت سے کہہ رہا تھا۔ ''میرے جانے کے بعد تم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھو گی۔ جو پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں، وہ پتھر کے ہو جاتے ہیں۔''

حیا نے پھر اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''اور میرے جانے کے بعد، پورے پانچ منٹ بعد تم یہاں سے اٹھو گی اور مڑے بغیر واپس گاڑی تک جاؤ گی۔ کلیئر؟''

''ہاں، ٹھیک؟'' اس کی آواز رندھی ہوئی سی نکلی۔

''اور تیسری بات، اس درخت کے اس پار، یعنی سرحد کی طرف تم نہیں جاؤ گی، بلکہ واپس گاڑی کی جانب جاؤ گی۔ حیا کچھ بھی ہو جائے بھلے کچھ بھی ہو جائے، تم اس جگہ سے آگے نہیں جاؤ گی۔''

''جہان.....'' اس نے کہنا چاہا مگر جہان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

''میں کچھ نہیں سنوں گا۔ میں نے کپادوکیہ سے یہاں تک، تمہاری سب باتیں مانیں۔ اب میری یہ تین باتیں تم مانو گی۔ تم یہاں سے آگے نہیں جاؤ گی، بھلے تم کچھ بھی دیکھو یا سنو۔ مجھے کچھ بھی ہو جائے، میں مر بھی جاؤں، گرفتار ہو جاؤں، جو بھی ہو، تم واپس گاڑی تک جاؤ گی۔ بس!''

اس کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔ بمشکل وہ کہہ پائی۔

''ٹھیک۔ مگر ایک بات مانو میری۔''

''کیا؟''

''وہ جو تمہارا..... نقلی دانت..... سائنائڈ۔ وہ تم مجھے دے دو۔ میں اسے یہیں پھینک دوں گی، مگر میں اس خیال کے ساتھ نہیں رہ سکتی کہ تم اپنے منہ میں زہر..... پلیز جہان!''

ساتھ ہی اس نے بند مٹھی کھولی۔ رومال بھی کھلتا چلا گیا۔

''میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتا۔'' جہان نے چہرہ ذرا دوسری سمت کیا، اور انگلی سے دانت سے کچھ نکالا۔ حیا نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے کوئی نوکدار چیز رومال پہ رکھی اور رومال بند کیا۔ حیا نے آنکھیں کھولیں اور پھر مٹھی بھینچ لی۔ گول موتی، نوکدار چیز، وہ محسوس کر سکتی تھی۔

چند لمحے وہ یونہی اسے دیکھتا رہا۔ رات گزرتی رہی۔

''تمہیں پتہ ہے حیا تم ان جنت کے پتوں میں بہت اچھی لگتی ہو۔''
وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔
''تم بھی میجر احمد!''
''میں؟'' اس کے چہرے پہ الجھن ابھری۔
''تم نے کہا تھا کہ جنت کے پتے ہر وہ چیز ہوتے ہیں جو انسان رسوا ہونے کے بعد خود کو ڈھکنے اور دوبارہ عزت حاصل کرنے کے لیے اوڑھتا ہے۔ تو پھر اپنی فیملی پہ لگا داغ دھونے کے لیے جو یونیفارم تم نے پہنا، جو کیپ تم نے لی، وہ سب بھی تو جنت کے پتوں میں ہی آتا ہے نا۔''
وہ ہلکے سے مسکرایا، پھر گھڑی دیکھی اور کھڑا ہو گیا۔ حیا نے اس کے جوتوں کو دیکھا۔ اس کے جوتوں کا رخ...... ان کا رخ......
''منگل کو آؤں گا میں۔ ضرور۔ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔ میں نے کہا تھا قسمت ہرا سکتی ہے مگر میں غلط تھا، قسمت انسان کو مار تو سکتی ہے، مگر ہرا نہیں سکتی۔''
اور پھر وہ درخت کے پیچھے چلا گیا۔ وہ مڑ کر بھی نہ دیکھ سکی۔ اس نے وعدہ کیا تھا۔ سو وہیں چپکی بیٹھی رہی۔ اپنے دل کی دھڑکن، اپنے ہاتھوں کی لرزش، سب محسوس ہو رہا تھا اسے۔ ایک ہاتھ میں پوٹلی کے اندر موتی کی گولائی اور نقلی دانت کی چبھن، اور دوسرے میں......
وہ چونکی۔ اس کا دوسرا ہاتھ خالی تھا۔
اللہ، اللہ! اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ڈی جے کی ٹوٹی عینک...... وہ ابھی اس کے ہاتھ میں تھی، پھر وہ پیر سے کیڑا جھاڑنے لگی تب......؟ وہ کہاں گئی؟
اس نے بدحواسی سے ہاتھ اندھیری زمین پہ ادھر اُدھر مارا۔ نوکیلے چھوٹے پتھر، گھاس کے سوکھے تنکے، مٹی۔ عینک کہیں نہ تھی۔
''نہیں! پلیز نہیں۔'' وہ ڈی جے کی عینک نہیں کھونا چاہتی تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر سے ڈی جے کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔ اس نے اندھوں کی طرح رومال والی بند مٹھی اور دوسرے کھلے ہاتھ سے مٹی کو ٹٹولا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔
رومال پرس میں رکھنے کی غرض سے اس نے پرس کھولا، اور پھر بس ایک نظر دیکھنے کے لیے پوٹلی کھولی۔
اندر سیاہ موتی کے ساتھ ایک ننھی سی چیز پڑی تھی۔
ایک سرمئی رنگ کا چھوٹا سا کنکر۔
''جہان!'' بے یقینی سے اس کے لب کھل گئے۔
پروفیشنلزم...... اصول...... اسے ان پہ کوئی سمجھوتہ نہ تھا۔ اس کا دل رکھنے کے لیے اس نے حیا کو تاثر دیا کہ وہ دانت نکال رہا ہے، مگر اپنے فرار کا واحد راستہ اس نے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔ اس نے نیچے پڑے اس جیسے ہزاروں کنکروں میں سے ایک اٹھا کر رومال پہ رکھ دیا تھا۔
''جہان!'' بہت تکلیف سے اس نے مڑ کر درخت کی اوٹ سے اس پار دیکھا۔
پہلا وعدہ چبھن سے ٹوٹا۔
دور، سرحدی باڑ تاریکی میں ڈوبی تھی۔ اتنی تاریکی کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اسی پل بجلی زور کی چمکی۔ پل بھر کو سب روشن ہوا۔ اور تب اسے دکھائی دیا۔ ایک ہیولہ جو میڑھی چال چلتا سرحد کی طرف بڑھ رہا تھا۔
پانچ منٹ کب کے گزر چکے تھے۔ دوسرا وعدہ بادلوں کی گرج میں تحلیل ہو گیا تھا۔ وہ دم سادھے بجلی چمکنے کا انتظار کرتی، اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھ رہی تھی۔ مگر اب اس نے وہ ہیولہ کھو دیا تھا۔
گزرتے وقت کا احساس کر کے وہ اٹھی، اور واپس جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ ساتھ ہی وہ جھکے ہوئے زمین پہ ہاتھ مار کر عینک ڈھونڈ رہی تھی۔ دفعتاً قریب ہی اس کا ہاتھ کسی سخت شے سے ٹکرایا۔ اسٹریپ، لکڑی،...... اس نے وہ چیز اٹھائی۔ ٹوٹی سرخ جوتی۔
اب عینک اور دوسرا جوتا ڈھونڈنا بے کار تھا۔ وہ سیدھی کھڑی ہوئی، تاکہ واپس جاسکے۔ اب اسے پیچھے نہیں دیکھنا تھا۔ اپنے پرس کو پکڑا ہی تھا کہ دوسرے جوتے نکالے کہ......

ایک دم کہیں سے سورج نکل آیا۔
روشنی۔ آنکھیں چندھیاتی روشنی۔
وہ تیزی سے واپس پلٹی۔ کالی رات روشن ہو گئی تھی۔ جلتی بجھتی روشنی۔ اس نے ہراساں نگاہوں سے پلٹ کر دیکھا۔
سرحد پہ روشنی کے راؤنڈز فائر کیے جا رہے تھے۔ اندھیرے میں ہر طرف روشنی بکھرتی، مدھم ہوتی، پھر بکھرتی۔ سرحدی باڑ پہ ہیولے سے بھاگتے دکھائی دے رہے تھے۔
اس نے زمین پہ پڑے ایک بڑے پتھر کو خالی ہاتھ سے سختی سے تھام لیا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔
روشنی...... فائرنگ...... گولیاں...... اسپیکر پہ آوازیں......
وہ بنا آواز کے لب ہلاتے ہوئے چلائی ''جہان...... واپس آ جاؤ!'' آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔ جسم کپکپا رہا تھا۔
روشنی فواروں کی صورت بار بار پھوٹ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا، وہ بھاگتی ہوئی سرحد پہ چلی جائے، مگر وہ تیسرا وعدہ...... وہ پیر کی زنجیر بن گیا۔ وہ ہر دفعہ اسے چھوڑ کر، جگہ چھوڑ کر چلی آتی تھی۔ پہلی دفعہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر جہان کے وہ الفاظ اسے واپس بھیج رہے تھے۔ ''حیا...... کچھ بھی ہو جائے...... کچھ بھی!''
اور پھر...... ایک دم زور سے دھماکہ ہوا۔
پتھر کو پکڑے، گٹھڑی کی صورت بیٹھی حیا کے بہتے آنسو رک گئے۔ اس نے ساکت نگاہوں سے سرحد کی جانب سے آتے دھوئیں کو دیکھا۔
روشنی...... چیخ و پکار...... سائرن...... بارود کی خوشبو......
اور پھر دھوئیں کے بادل ہر طرف چھاتے گئے۔
سرحد چھپ گئی
اور
دھندلی دیوار ایک دفعہ پھر اُن دونوں کے درمیان چھا گئی۔
کیا ہوا تھا، کیا پھٹا تھا، اسے نہیں معلوم تھا۔ وہ مردہ قدموں سے کھڑی ہوئی۔ ایک ہاتھ سے پرس اور ٹوٹا جوتا لٹک رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ پہلو میں خالی گرا تھا۔ خالی ہاتھ۔ خالی دامن۔ اسے دو وعدے توڑ کر اب تیسرا نبھانا تھا۔ اسے واپس جانا تھا۔
بادل گرج دار آواز کے ساتھ ایک دم برسنے لگے۔ موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں۔ ترکی کی پہلی بارش میں بھی وہ ننگے پیر ٹوٹے جوتے کے ساتھ چل رہی تھی، آخری بارش بھی وہ ننگے پیر تھی۔
''ممی جوہر تک گئی ہیں۔ میں اُن کا بیٹا بول رہا ہوں۔ جہان۔''
وہ ننگے پاؤں کھردری زمین پہ چل رہی تھی۔ کانٹے چبھ کر تلوں کو زخمی کر رہے تھے، مگر وہ سامنے دیکھ رہی تھی، بلکہ وہ تو شاید کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔
''جوتے کو کیا ہوا ہے؟ اتنی سردی میں ننگے پاؤں بیٹھی ہو، لاؤ دکھاؤ جوتا۔''
تڑاتڑ گرتے قطرے اسے بھگو رہے تھے۔ بادلوں نے سارا بوجھ اتار کر زمین اور زمین والوں کو بوجھل کر دیا تھا۔
''میں بکواس کر کے گیا تھا نا مگر میری کون سنتا ہے اس گھر میں؟ دو دن نہ ہوں تو سارا انتظام الٹ جاتا ہے۔''
اس کے پیروں سے خون نکل رہا تھا، جسم میں جان نہ رہی تھی، لگتا تھا ابھی لڑکھڑا کر گر پڑے گی، اور اگر گری تو اٹھ نہ سکے گی۔
''انسان وہی چیز مانگتا ہے جس کی اس کو کمی لگتی ہے، سو میں ہمیشہ زندگی مانگتا ہوں۔''
اس کے ہاتھ میں صرف اپنا ایک جوتا تھا۔ دوسرا وہیں زیتون کے درخت کے آس پاس رہ گیا تھا۔ جب آدھی رات کے بعد حقیقت اپنا نقاب اتار کر پھینکتی ہے تو ہر سنڈریلا کو ایک جوتا اسی مقام پہ چھوڑ کر واپس ہونا ہوتا ہے۔ اسے بھی جانا تھا۔

''ہینڈسم گائیڈ ابھی مصروف ہے، کسی غیر ہینڈسم گائیڈ سے رابطہ کرو۔''

وہ بارش کے قطرے تھے یا آنسو، جو اس کے چہرے کو بھگو چکے تھے۔ دفعتاً اس کا پیر رپٹا۔ وہ اوندھے منہ زمین پہ گری۔ ہتھیلیاں چھلی گئیں، چہرے پہ مٹی لگ گئی۔ برستی بارش، سیاہ رات۔

''بعض دفعہ قسمت ہرا دیا کرتی ہے حیا۔ ڈی جے کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔''

وہ اٹھنا چاہتی تھی، اٹھ نہ سکی۔ وہیں جھکی بیٹھی سسکیوں کے ساتھ روتے گئی۔ کیچڑ، بارش، آنسو۔ سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

''فرقان ماموں کی فیملی سے ڈر لگتا ہے، کیونکہ وہ سرخ مرچ کا استعمال کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں۔''

بمشکل ہتھیلی کے بل زور لگا کر وہ اٹھ پائی۔ پیر لہولہان ہو چکے تھے۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی موسلادھار بارش میں پھر سے چلنے لگی۔

''میں نے کہا تھا نا، زندگی میں کوئی جنت کے پتے لا کر دے تو انہیں تھام لیجئے گا۔ وہ آپ کو رسوا نہیں ہونے دیں گے۔'' کار سامنے تھی، اس کے دروازے کو پکڑے پکڑے سہارا لیے خود کو سنبھالنا چاہا۔

''جب اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میگزین سامنے کرتے ہیں تو اسے الٹا نہیں پکڑتے۔''

اسٹیئرنگ وہیل تھامے اس نے دھندلی آنکھوں سے شیشے کے پار دیکھا۔ ہر سو دھند تھی۔ دھند جو ان کی زندگیوں سے چھٹتی ہی نہیں تھی۔

''اگر جادوگر اپنی ٹرک کے فوراً بعد ہی راز بتا دے تو کیا فائدہ؟''

ہر شے سلوموشن میں ہو رہی تھی۔ ساری آوازیں بند تھیں۔ بس حرکات دکھائی دے رہی تھیں۔

اس نے خود کو مریم خانم کے دروازے پہ دیکھا۔ بارش اسی طرح برس رہی تھی، مگر اس کی سماعت بند ہو چکی تھی۔

''اچھا تم نے پاشا بے کے اوپر کافی الٹ دی تھی؟ گڈ! ویری گڈ!''

خانم اس کو سہارا دیے بستر پہ لٹا رہی تھیں۔ اس کے گرد ساری دنیا گول گول گھوم رہی تھی۔

''اپنی جگہ کبھی نہیں چھوڑتے حیا۔ ہوٹل گرینڈ کی مثال یاد رکھو۔''

وہ بستر پہ لیٹی تھی، آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے۔ پائنتی کے طرف بیٹھی مریم خانم اس کے پیروں پہ دوا لگا رہی تھیں۔ اسے درد نہیں ہو رہا تھا۔ ساری حسیات ختم ہو گئی تھیں۔

''بالکل بھی مدد نہیں کروں گا۔ جو کرنا ہے اکیلے کرو اور خود کرو کیونکہ تم کر سکتی ہو۔''

وہ اپنا ٹرالی بیگ گھسیٹتی ریلوے اسٹیشن پہ چل رہی تھی۔ دونوں پیر پٹیوں میں بندھے تھے۔ قدم اٹھاتی کہیں اور تھی، پڑتا کہیں اور تھا۔

''لگتا ہے سب مجھ سے تنگ آ گئے ہیں جو بار بار جانے کا پوچھتے ہیں۔ دل کرتا ہے ماہ سن کی طرح کبوتر بن کر کسی غار میں چھپ جاؤں۔''

ٹرین تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف بیٹھی، بھیگی، سرخ آنکھوں سے باہر بھاگتے مناظر دیکھ رہی تھی۔ زیتون کے درخت پیچھے رہ گئے تھے۔ شیشے دھندلا گئے تھے یا اس کی آنکھوں میں دھند تھی، اب تو سارے فرق ختم ہو گئے تھے۔

''میرا نام جہان سکندر ہے، میجر جہان سکندر احمد۔''

سبانجی کا سبزہ زار بھی اسی کہر میں ڈوبا تھا۔ ہر سو دھند تھی۔ کوئی آواز، کوئی شور نہیں۔ اس نے خود کو ایک فیکلٹی اپارٹمنٹ کا دروازہ بجاتے دیکھا تھا۔

''شش چیخنا نہیں، ورنہ آواز باہر جائے گی اور یہ ساری فیملی بھاگتی ہوئی آ جائے گی۔''

اندر سے نکلتی فربہ مائل لڑکی اسے دیکھ کر پریشانی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔ وہ کیا کہہ رہی تھی، حیا سن نہیں پا رہی تھی۔ بس اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی سنائی دی ''میرا سامان پیک کروا دیں انجم باجی۔''

''اچھا تمہیں نہیں پتہ تھا میں کپادوکیہ میں ہوں؟''

ہالے اس کے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔ انجم باجی اس کے جوتے رکھ رہی تھیں۔ وہ بس ساکت سی صوفے پہ

بیٹھی، سر جھکائے، بے آواز رو رہی تھی۔

"تھوڑی سی کاٹن لا دو فارمیسی سے۔ کان میں ڈالنی ہے۔"

اپنے ٹرالی بیگ کو ہینڈل سے گھسیٹتی وہ اتاترک ہوالانی (ایئر پورٹ) کے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ بے جان قدم، بے سوچ نگاہیں۔

"پتہ ہے حیا تم کب اچھی لگتی ہو؟ جب تم خاموش رہتی ہو۔"

وہ شناسا سا سالڑکا تیزی سے اس کی طرف آیا تھا۔ وہ اس کو پہچانتی تھی مگر اس کو سمجھ نہ پا رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا کچھ۔ "عبدالرحمٰن بھائی نے کہا تھا کہ آپ سے مل لوں، کہیں آپ کو کچھ مدد کی ضرورت نہ ہو۔ آپ بہارے گل کو لے کر چلی گئیں، میں بہت پریشان تھا، یہ ممی نے بھجوائے ہیں آپ کے لیے۔" وہ کوئی پیکٹ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

"میری لغت میں دو بجے کا مطلب ہوتا ہے ایک بج کر پچپن منٹ۔"

آفیسر اس کو لیپ ٹاپ ہینڈ کیری میں اٹھانے کا کہہ رہی تھی۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتے، لیپ ٹاپ بیگ اٹھا لیا۔ اب کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"مجھے کچھ بھی ہو جائے، مر جاؤں، گرفتار ہو جاؤں، جو بھی ہو، تم واپس گاڑی تک جاؤ گی، بس؟"

جہاز کی کھڑکی سے نیچے، بہت دور باسفورس کا سمندر نظر آ رہا تھا۔ نیلی چادر، سفید جھاگ اور ان سب پہ چھاتی دھند۔ پھر بھی اس نے آنسو نہیں پونچھے۔ وہ ترکی سے ہمیشہ روتے ہوئے جاتی تھی۔ اسے اس دفعہ بھی روتے ہوئے جانا تھا۔

مگر کون جانے،

کہ اس دفعہ کا غم،

سب سے بڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹی تھی۔ دفعتاً دروازے پہ دستک ہوئی۔ اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹایا۔ اسی طرح لیٹی رہی۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر چلتے قدم۔ آنے والے نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ اسے بند آنکھوں سے بھی سورج کی روشنی چھن کر خود پہ پڑتی محسوس ہوئی تھی۔

"حیا، اٹھ جاؤ بیٹا۔ طبیعت کیسی ہے؟" اس نے سبین پھوپھو کی آواز سنی اور پھر بیڈ کی پائینتی کے پاس دباؤ محسوس ہوا، جیسے وہ ادھر بیٹھ گئی تھیں۔

"بخار اترا تمہارا؟" انہوں نے جھک کر اس کے ماتھے کو چھوا۔ حیا نے بازو آنکھوں سے ہٹایا اور خالی خالی نگاہوں سے ان کو دیکھا۔

شانوں پہ دوپٹہ لیے، بال کیچر میں باندھے، وہ ویسی ہی تھیں۔ پرسکون، صابر، ٹھنڈی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ کہنی کے بل ذرا سی اٹھی۔ نقاہت، پژمردگی۔ جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی تھی۔

"اور یہ تمہارے پاؤں کو کیا ہوا ہے۔ نتاشا کہہ رہی تھی کہ ابھی بینڈج لاتی ہے، یہ بینڈج تو بالکل خراب ہو گیا ہے۔" انہوں نے ہولے سے اس کے پیر کے انگوٹھے کو چھو کر کہا، جس پہ لگی پٹی اب پرانی اور خستہ ہو چکی تھی۔ حیا تکیے کے سہارے بیٹھی اسی طرح انہیں دیکھتی رہی۔

"جہان تمہارے ساتھ تھا؟" انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ جب سے وہ آئی تھی، اتنی بیمار ہو گئی تھی کہ پھپھو سے باقاعدہ بات اب ہو پا رہی تھی۔

اس نے گردن کو اثبات میں جنبش دی۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا پڑنے لگا تھا۔

"پھر؟"

اور اس پھر کے آگے سارے جواب ختم ہو جاتے تھے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''میں نہیں جانتی پھوپھو۔ ہم ساتھ تھے۔'' وہ کہنے لگی تو آواز بہت بوجھل تھی۔ ''اس رات آسمان پہ بادل تھے اور چاند نہیں تھا، تارے بھی نہیں تھے۔ وہ آگے جا رہا تھا، میں نے اسے روکنا چاہا، منع بھی کیا مگر اس نے...... اس نے میری نہیں مانی، وہ چلا گیا...... اور پھر......''۔ وہ رکی اور پلک جھپکی تو آنسو رخسار پہ لڑھکنے لگے۔

''پھر پتا نہیں کیا ہوا...... مگر...... مگر وہ واپس نہیں آیا۔''

کمرے میں چند لمحے کے لیے بوجھل سی خاموشی رہی۔ پھوپھو کے چہرے پہ وہ ہی سکون، وہ ہی ٹھہراؤ تھا۔

''کیا اسے اسی وقت واپس آنا تھا؟''

''نہیں اس نے کہا تھا کہ آنے والے منگل کو وہ آجائے گا۔''

''تو ابھی منگل میں کچھ دن ہیں نا، وہ آجائے گا۔ تم فکر کیوں کر رہی ہو؟''

حیا نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہ نہیں آئے گا۔ وہ مشکل میں ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں مگر وہ مشکل میں ہے۔ شاید زخمی ہو، شاید گرفتار ہو اور شاید......'' اس سے آگے فقرہ ٹوٹ گیا، دل بھی ساتھ ہی ٹوٹ گیا۔

''اگر اس نے کہا تھا آئے گا تو وہ ضرور آئے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔'' انہوں نے جیسے دلاسا دیتے ہوئے اس کے ہاتھ کی پشت کو تھپکا۔ وہ ان ہی بھیگی نگاہوں سے ان کا پُرسکون چہرہ دیکھتی رہی۔

''میں سمجھتی تھی کہ آپ میں اور مجھ میں بہت فرق ہے پھوپھو۔ آپ صبر سے انتظار کرنے والی عورت ہیں مگر میں چیزیں اپنے ہاتھ میں لیکر جہان کے ساتھ چلنے والی عورت ہوں۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ تکلیف ہم دونوں کے حصے میں برابر آئے گی۔ آپ ظاہر نہیں کرتیں اور میں چھپا نہیں سکتی۔ بس یہی فرق ہے۔''

''بے یقین نہ ہو بیٹا۔ اللہ سے اچھا گمان رکھو، اچھا ہی ہوگا۔'' انہوں نے نرمی سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ وہ سر بھی نہ ہلا سکی۔ عجیب بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

دروازہ ذرا سی دستک کے ساتھ کھلا۔ پھوپھو اور حیا نے ایک ساتھ اس سمت دیکھا۔ ثنا شا دروازے میں کھڑی تھی۔ حیا بدقت پھیکا سا مسکرائی اور آنسو ہتھیلی کی پشت پر صاف کیے۔

''حیا کیا تم اٹھ گئی ہو؟ میں تمہارے لیے بینڈیج لائی تھی۔ وہ خراب ہو چکا ہے، اسے اتار دیتے ہیں۔'' ثنا شا روانی سے انگریزی میں کہتی ہوئی اندر آئی اور چھوٹا سا بکس بیڈ پہ حیا کے پیروں کے پاس رکھا۔ پھوپھو اس کو جگہ دینے کے لیے اٹھ گئیں تو وہ وہیں پھوپھو کی جگہ پہ بیٹھ گئی۔

''ہوا کیا تھا تمہیں، اتنے زخم کیسے آئے؟'' وہ اب حیا کی ایڑھی سے بینڈیج اتارتے ہوئے بولی تھی۔ لہجہ نہ زیادہ متفکر تھا، نہ زیادہ سرد۔ پتہ نہیں وہ اسے اچھی لگتی تھی یا بُری۔ ویسے تو بے ضرر سی ہی تھی البتہ اس کا لباس۔ اللہ اللہ۔ اس ساری پریشانی میں بھی حیا کے ذہن میں آیا تھا کہ یہ اس طرح سلیولیس ٹاپ اور کیپری میں گھر میں گھومتی ہوگی اور روحیل یا ابا کو کوئی فرق نہیں پڑتا؟

''کیا ہوا تھا حیا پیر پہ؟'' ثنا شا نے دوا لگاتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ حیا چونکی۔

''کانچ، پتھر، زمین پہ بہت کچھ گرا تھا اور میں انہی کے اوپر چلتی رہی۔''

''بہت بد احتیاطی ہے یہ ویسے۔ اوکے، میں اسے بینڈیج کر رہی ہوں۔ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے، زیادہ گہرے نہیں ہیں۔''

وہ اب مصروف انداز میں کہتی اس کی پٹی باندھ رہی تھی۔ دفعتاً آسمانوں پہ اذان کی آواز گونجنے لگی۔ پھوپھو جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اس نے انہیں نہیں روکا۔ اس کے پاس انہیں روکنے کے لیے کوئی جواز نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

لاؤنج سے باتوں کا شور کمرے تک سنائی دے رہا تھا۔ ثنا اور سحرش اپنی امی کے ساتھ آئی تھیں اور حسب معمول ان کی آمد پہ ارم اور سونیا بھی چلی آئی تھیں۔ وہ ابھی تک کمرے میں ہی تھی، ان سے نہیں ملی تھی۔ اماں دروازے پہ دو دفعہ آ کر باہر آنے کا کہہ چکی تھیں۔

"اب تو بخار بھی اتر گیا ہے، باہر آ جاؤ۔ وہ کب سے آئی ہوئیں ہیں، اچھا نہیں لگتا۔" اور پھر بھی وہ کچھ کہے بنا بیٹھی رہی۔ دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کسی سے ملنے کو۔ پھر کافی دیر بعد اٹھی اور اپنا بیگ کھولا تاکہ کوئی جوڑا نکالے۔ ابھی پہنا لباس ملگجا سا ہو رہا تھا۔ گرے شلوار قمیص اور ساتھ میں پتہ نہیں کس جوڑے کا گلابی دوپٹہ پہنے، بہت بکھرے بکھرے سے حلیے میں وہ بیمار سی لگ رہی تھی۔ بیگ کھول کے ڈھکن اٹھایا تو سامنے کپڑوں پر گفٹ پیک میں ملفوف ایک پیکٹ رکھا تھا۔

اس نے پیکٹ اٹھایا۔ کچھ مدہم مدہم سا یاد تھا کہ سفیر نے جاتے ہوئے یہ اس کے حوالے کیا تھا، شاید حلیمہ آنٹی نے دیا تھا۔ اس نے ریپر پھاڑا، اندر بہت خوبصورت سفید ان سلی سلک کا کپڑا تھا۔ ساتھ میں ایک چھوٹا سا کارڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے کارڈ اٹھایا۔

"حیا کے لیے بہت دعاؤں کے ساتھ۔ تم ہمیشہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ تمہارے ساتھ فلائیٹ میں عثمان نے سامنے بیٹھی ترک عورت سے کیا کہا تھا تاکہ وہ تم سے زیادہ فرینک نہ ہو سکے۔ تو میں تمہیں بتائے دیتی ہوں۔ انہوں نے اسے کہا تھا کہ ہم نے ایسی ڈش کا آرڈر دیا ہے جس میں انڈین سٹائل کی تلی ہوئی پیاز بھی شامل ہے۔ اور بات یہ ہے حیا کہ ترک عورتوں کو تلی ہوئی پیاز کی خوشبو سے سخت الرجی ہے لیکن آف کورس وہ صرف اس لیے ایسا کرنا چاہ رہے تھے کہ کہیں کسی اجنبی سے بے تکلفی سے تمہیں نقصان نہ ہو۔ ہم اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتے ہیں!

فقط حلیمہ اور عثمان"۔

اس کے چہرے پہ افسردہ سی مسکراہٹ امڈ آئی۔ کچھ باتیں ادھوری بھی رہ جائیں تب بھی ان کی تشنگی نہیں ہوتی۔ جیسے ڈی جے کو گڈ مارننگ ڈی جے کہنے والا لڑکا اسے نہیں ملا تھا۔ وہ کون تھا، وہ کبھی بھی نہیں جان پائے گی۔ اور کون جانے کہ اس کو خود بھی پتہ تھا یا نہیں کہ ڈی جے اس دنیا سے چلی گئی ہے۔

کون جانے!!!

اس نے بیگ سے کپڑے ادھر اُدھر کیے۔ آگے پیچھے ہر جگہ دیکھا۔ پھر دوسرا بیگ کھولا۔ اس کا ونڈ چائم کہیں نہیں تھا۔ پتہ نہیں وہ اسے کہاں بھول آئی تھی۔ دل اتنا خراب ہوا اس بات سے کہ وہ لباس بدلے بغیر، بال کیچر میں باندھے ہی باہر آ گئی۔

"مطلب حد ہو گئی۔ ایک دم سے ہمیں اتنی سنا دیں رضا بھائی نے۔ ہمارا کیا قصور؟ اور وہ فائزہ وغیرہ، ان کو بھی تو دھیان رکھنا چاہیے تھا نا۔"

ثنا لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھی زور و شور اور خفگی سے کہہ رہی تھی۔ حیا کو آتے دیکھا تو بات روک کر جلدی سے اٹھی۔ "حیا آپا کدھر ہیں آپ، سب کہہ رہے تھے کہ آپ آتے ساتھ ہی بیمار پڑ گئی ہیں۔" وہ بڑے تپاک سے اس کے گلے لگی۔ حیا زبردستی ذرا سی مسکرائی۔ سونیا بھی اچھے سے ملی۔ باقی سحرش اور ارم تو اپنے اپنے موڈ میں تھیں مگر اسے کہاں پرواہ تھی۔ ثنا اپنے مصروف انداز میں بے نیازی صوفے پہ بیٹھی میگزین کے ورق پلٹ رہی تھی۔

"تو پھر کیا تم نے فائزہ سے شکایت کی؟" وہ سب بیٹھ گئیں تو سونیا بھابھی نے ثنا کو تفکر سے دیکھتے ہوئے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ لاؤنج کی وسط میز پہ شیشے کے پیالے میں سٹرابریز بھری تھیں۔ درمیان سے کٹی ہوئی سرخ رسیلی سٹرابریز۔ سحرش بات سنتے سنتے ایک ایک پھل کر کے کھا رہی تھی۔

"ہاں آج جا کر فون کرتی ہوں فائزہ باجی کو۔ حد ہے۔" پھر حیا کو دیکھ کر ثنا وضاحت کرنے لگی۔ "فائزہ باجی نے پتہ ہے کیا کیا؟"

"کیا؟" حیا نے اسی کے انداز میں دوہرایا۔ اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فائزہ ارسل کی بہن تھی اور ارسل وہ تھا جس کے ولیمے کی رات تایا ابا نے اس کی بے عزتی کی تھی۔

"فائزہ باجی نے ارسل بھائی کے ولیمے کی تصویریں فیس بک پہ لگا دیں۔ چلو اپنی لگاتیں، خیر تھی۔ مگر ہماری نبیل کی بھی تین تصویریں البم میں لگا دیں اور پرائیویسی پبلک رکھ دی۔ رضا بھائی نے دیکھا اور پھر ہمیں ہی سنانے لگے۔ اب فائزہ باجی سے پوچھو کہاں کے ایتھکس ہیں یہ کہ کسی اور کی تصویر یوں لگا دو؟"

وہ بس خاموشی سے ثنا کو دیکھتی رہی۔ اس کا ذہن کیلس کی سرحد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

"آپ کی تصویر بھی تھی۔" ثنا نے یاد کر کے بتایا۔ اس پہ وہ ذرا سی چونکی۔

''مگر آپ کی تو خیر ہے، آپ نے تو لپیٹ کر دوپٹہ لیا ہوا تھا نا۔ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کون ہے مگر میری تو اچھی خاصی کلاس لے لی بھائی نے۔'' وہ سخت رنجیدہ تھی، غالباً ان کے گھر آتے ہوئے ہی رضا سے ان کا ٹاکرا ہوا تھا۔

''ہاں حیا کا دوپٹہ نہ ہوا، سلیمانی چغہ ہوا۔'' ارم ذرا سی ہنسی۔ حیا نے نگاہ پھیر کر اسے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی شیشے کی پلیٹ پہ رکھی سٹرابری کو کانٹے میں پھسا رہی تھی۔ پھر کانٹا منہ میں لے جاتے ہوئے اس نے حیا کو دیکھا۔ حیا کی نگاہوں میں کچھ تھا کہ ارم بے اختیار دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''ایک تو پتہ نہیں ہمارے بھائیوں کو اپنے دوستوں کا کیا خوف کیوں ہوتا ہے۔ ایسے ہم سارے زمانے میں بغیر دوپٹے کے گھومتے رہیں تب کچھ نہیں ہوتا لیکن اگر بھائی کی یونیورسٹی کے سامنے کار میں بھی گزر و تو بس۔ ہاتھ اندر کرو، سر پہ دوپٹہ لو، میرا کوئی دوست گزر رہا ہو تو دیکھنا نہیں۔ اف۔'' ثنا، رضا کی نقل کرتے ہوئے بولی تو سحرش ہنس دی۔ ارم فقط مسکرائی پھر اس نے حیا کو دیکھا۔ وہ ابھی تک خاموش مگر گہری نظروں سے ارم کو دیکھ رہی تھی۔ ارم ذرا جزبز ہو کر دوبارہ ثنا کو دیکھنے لگی۔

''جہان نہیں آیا تمہارے ساتھ حیا؟'' سحرش نے بات کا رخ پھیرا تو حیا نے نگاہیں اس کی طرف پھیریں۔ پھر ہلکا سا نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں''۔ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''اچھا تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہ تمہارے ساتھ آئے گا۔'' معصوم سا سوال تھا مگر اسے بہت زور سے چبھا۔ سونیا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے یقیناً سحرش کا لہجہ اچھا نہیں لگا تھا۔

''کہا تھا مگر ایسا ہو نہیں سکا۔'' اس نے فقط یہی کہا۔ کوئی صفائی نہیں، کوئی دلیل نہیں، کوئی منہ توڑ جواب نہیں۔ اب تو کسی بات کا دل نہیں چاہتا تھا۔

''اچھا!'' سحرش نے ذرا سے شانے اچکاتے ہوئے آگے ہو کر ایک اور سٹرابری اٹھائی۔ حیا نے سرخ پھلوں سے بھرے پیالے کو دیکھا۔ سرخ رسیلا پھل۔ سرخ جوتے۔ بیسن کے کنارے پہ لگا خون کا سرخ قطرہ۔

اس کا دل بھر آیا تھا۔ وہ ایک دم اٹھی اور تیزی سے کمرے کی طرف گئی۔

سب نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

نتاشا اسی طرح بے نیازی میگزین کے صفحے پلٹ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

''حیا باجی آپ کا فون ہے۔'' وہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کے سامنے عائشے کو میل لکھ رہی تھی جب نور بانو نے دروازے سے جھانک کر صدا لگائی۔ وہ اچھا کہہ کر سینڈ کا بٹن دبا کر اٹھی اور باہر آئی۔ زندگی میں ناامیدی اتنی بڑھ گئی تھی کہ فون کی گھنٹی پہ بھی چونکنا چھوڑ دیا تھا۔ میجر احمد اسے لینڈ لائن پہ کبھی بھی کال نہیں کیا کرتا تھا سو اسے دلچسپی نہ تھی کہ کس کا فون ہے۔

''ہیلو؟'' اس نے کریڈل کے پاس رکھا الٹا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

''بہت شکریہ میری بات سننے اور سمجھنے کا۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے عقلمندی کا ثبوت دیا''۔ ولید کا مسکراتا لہجہ۔ اسے لگتا تھا کہ سارے احساس مر گئے ہیں مگر ایک ابال سا اندر سے اٹھا تھا۔ ہاں ابھی دل میں کچھ زندہ تھا۔

''جو بھی کہنا ہے صاف کہو'' وہ دبے لہجے میں غرائی۔

''میرے خلاف وہ کیس واپس لے کر آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ ایک عقلمند خاتون ہیں۔'' لمحے بھر کو اس کے اعصاب مفلوج سے ہو گئے۔

کیس واپس؟ اس نے تو نہیں...... پھر کس نے؟

''میں نے تمہارے خلاف کوئی کیس واپس نہیں لیا''

''میں جانتا ہوں کہ آپ کے دباؤ پہ ہی یہ ہوا ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ نے یہ کیوں کیا ہے۔ یہ کال آپ کا شکریہ ادا کرنے کے

لیے کی تھی اور یہ پوچھنے کے لیے کہ ہم پھر کب مل رہے ہیں؟" وہ جیسے بہت مسرور اور مطمئن تھا۔

اس کے اندر جوار بھاٹا پکنے لگا۔ بمشکل اس نے ضبط کیا۔ "میں فون رکھ رہی ہوں"

"کل دوپہر ایک بجے میں جناح سپر والے پزاہٹ پہ آپ کا انتظار کروں گا۔ ضرور آیئے گا، مجھے کچھ اہم باتیں کرنی ہیں، کیونکہ ابھی وہ آرکیٹیکٹ والا مسئلہ حل نہیں ہوا!"

"اچھا اور تمہیں لگتا ہے میں آ جاؤں گی۔ وہ اور ہوتی ہیں کمزور لڑکیاں جو تم جیسوں سے ڈر جاتی ہیں۔ مائی فٹ۔" (اتنا غصہ آیا تھا کہ دل چاہا یہ فون دیوار پہ دے مارے)

"آپ کو آنا ہوگا۔ یاد رکھیں وہ ویڈیو میرے پاس ہے۔ اگر آپ نہیں آئیں تو میں آپ کے گھر آ کر وہ ویڈیو آپ کے ہی ٹی وی پہ چلا کر دکھاؤں گا اور یہ میرا وعدہ ہے۔" اس کے لہجے کی سفاکی..... حیا کا دل لرز کر رہ گیا مگر جب بولی تو آواز مضبوط تھی۔

"تو پھر تم کر گزرو جو تم کرنا چاہتے ہو۔ ایسا سوچنا بھی مت کہ میں تم سے یوں ملنے چلی آؤں گی۔ جہنم میں جاؤ تم۔" کہہ کر اس نے فون زور سے کریڈل پر پٹخا۔ پھر تیزی سے مڑ کر ابا کے کمرے کی طرف گئی۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ٹائی کی ناٹ صحیح کر رہے تھے۔ آفس جانے کے لیے بالکل تیار۔

"ابا کیا آپ نے ولید کے خلاف کیس واپس لے لیا؟" وہ پریشانی سے کہتی بنا اجازت اندر آئی۔ سلیمان صاحب نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر واپس شیشے کے سامنے ہو کر ٹائی کی ناٹ تنگ کرنے لگے۔

"ہاں، واپس لے لیا۔"

"مگر کیوں؟" وہ صدمے سے بولی۔

"پہلی بات یہ کہ وہ بہت ہی کمزور کیس تھا۔ دوسری بات یہ کہ ہمارے پاس کوئی خاص گواہ نہیں ہے۔ اور تیسری بات اس کی گاڑی سے کسی کو نقصان نہیں پہنچا۔ فرقان بھائی کو چوٹ گرنے سے آئی تھی اس لیے اس کیس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔" وہ اب پرفیوم اٹھا کے خود پہ سپرے کر رہے تھے۔ بیماری نے ان کو پہلے سے کافی کمزور کر دیا تھا لیکن اب وہ دن بدن روبصحت تھے۔

"مگر ابا آپ جانتے ہیں کہ اس نے مجھے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔"

"حیا میں اسے اس طرح نہیں چھوڑوں گا۔ آرکیٹیکٹ کے ساتھ مل کر جو اس نے بے ایمانی کی ہے، اس پہ میں اسے آڑے ہاتھوں لوں گا۔ تھوڑا انتظار تو کرو۔" لیکن ابا کی بات کے برعکس ان کا لہجہ غیر سنجیدہ تھا۔ وہ مزید سنے بغیر بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ چند ہی لمحوں بعد وہ تایا فرقان کے گھر تھی۔

تایا ابا اور صائمہ تائی ڈرائنگ روم میں اکیلے ناشتہ کر رہے تھے۔ لڑکے کام پر تھے۔ سونیا اور ارم بھی ساتھ نہ تھیں۔

"تایا ابا"۔ وہ پریشانی سے ان کے پاس آئی۔

"آؤ حیا، طبیعت کیسی ہے؟" وہ ہموار لہجے میں بولے، ساتھ ہی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ پہلے جیسی محبتیں بھی نہیں مگر پچھلے کچھ عرصے والی رکھائی بھی نہیں۔ درمیانہ سا انداز۔

"تایا ابا، آپ لوگوں نے ولید کے خلاف کیس کیوں واپس لے لیا؟" وہ بے چینی سے وہیں کھڑے کھڑے بولی۔ صائمہ تائی اس کے لہجے پہ بے اختیار پلٹ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"میں نے نہیں لیا، تمہارے ابا نے لیا ہے۔ اور وہ اتنے غلط بھی نہیں ہیں۔ کیس کمزور ہے۔ وقت اور پیسے ضائع کرنے کا فائدہ؟"

"مگر اس طرح تو وہ اور بھی شیر ہو جائے گا۔ وہ سمجھے گا کہ ہم ..."

"حیا ہم سب ٹھیک ہیں۔ چوٹ مجھے لگی تھی۔ جب میں سمجھوتہ کرنے پہ مجبور ہوں تو پھر؟" تایا ابا بھی شاید ولید کے خلاف کسی سخت کاروائی کے حق میں نہ تھے۔ کاروباری سیاستیں۔ اف۔

"اور آرکیٹیکٹ والا کیس؟"

"دیکھو ہم اس کو کھلم کھلا تو ڈیل نہیں کر سکتے۔ کمپنی کی ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ مگر تمہارے ابا اس سے ضرور نبٹیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، تم فکر نہ کرو۔"

وہ جانتی تھی کہ اب اس سے کوئی نہیں نبٹے گا۔ وہ اسے صرف اور صرف اس کو آرکیٹیکٹ والے کیس کا ڈراوا دے رہے تھے تاکہ اس کو سیدھا کر کے رکھ سکیں۔ شطرنج۔ بساط۔ سیاست۔

"آپ نہیں سمجھیں گے۔" اس نے تاسف سے نفی میں سر جھٹکا۔

"حیا جہان نہیں آیا؟" صائمہ تائی نے ان کی گفتگو کو اختتام پذیر ہوتے دیکھا تو رہ نہ سکیں۔

اللہ اللہ۔ پھر وہی سوال؟ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"وہ نہیں آ سکا تائی۔" آواز بھی دھیمی پڑ گئی۔

"تو کب آئے گا۔ تمہارے ابا اور اماں تو چاہ رہے تھے کہ تمہارا نکاح بھی روحیل کے ولیمے کے ساتھ اناؤنس کریں۔ مگر....." تائی نے ہنکارہ بھر کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ نامکمل معنی اخذ کیے بغیر پلٹ دی۔ تایا ابا اس وقت اخبار کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

ہر کوئی پوچھتا تھا کہ وہ نہیں آیا، کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا تھا کہ وہ کیوں نہیں آیا۔ سب اپنے مفاد کی بات پوچھتے تھے۔ جہان کی تو کسی کو فکر نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کی میل پہ عائشے کا جواب آ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ شام میں آن لائن ہو گی، تب وہ دونوں بات کریں گی۔ وہ عائشے سے کیا بات کرنا چاہتی تھی، وہ نہیں جانتی تھی، بس وہ اپنا دکھ اور اضطراب کسی سے بانٹنا چاہتی تھی۔ کسی سپاہی کی بیوی ہو کر دنوں، ہفتوں، مہینوں اس کا صبر سے انتظار کرنا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے، وہ اب جان پائی تھی۔

"کیسی ہو؟" اسکرین پہ عائشے کا شفاف، خوبصورت چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے ریوالونگ چیئر پہ بیٹھی تھی، اور بات کرتے ہوئے وہ شیشے کی ننھی پیالی سے ترک چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔

"مجھے نہیں پتہ میں کیسی ہوں؟" وہ اداسی سے بولی تھی۔ ملگجے لباس، اور کیچر سے بندھے بالوں میں حیا بہت کمزور اور افسردہ دکھائی دیتی تھی۔

"کیا ہمارا اناطولیہ اچھا نہیں لگا؟" عائشے نے حیرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ پیالی سائیڈ پہ رکھی۔ (کپادوکیہ، وسطی اناطولیہ میں واقع تھا۔)

"نہیں، بہت اچھا لگا۔" وہ پھیکا سا مسکرائی۔

"بہارے بتا رہی تم لوگ انقرہ بھی گئے تھے، کیا اس کے جانے کے بعد تم نے انقرہ دیکھا یا واپس آ گئی؟"

"میں کیلیس چلی گئی تھی۔" اس کے لبوں سے پھسلا۔

چائے کی پیالی اٹھاتی عائشے ذرا چونکی تھی۔

"اچھا؟ کس دن گئیں تم کیلیس؟"

"اتوار کو گئی تھی، منگل کی دوپہر واپس آ گئی۔" اب چھپانے کا کیا فائدہ تھا۔ عائشے چند لمحے کچھ سوچتی رہی تھی۔ پیالی اس کے ہاتھ میں تھی، مگر وہ اسے لبوں تک لے جانا جیسے بھول گئی تھی۔

"کیا بارڈر وہاں سے بہت قریب پڑتا ہے؟"

"ہاں! بہت قریب!" اس کی نگاہوں کے سامنے پھر سے وہی رات گھوم گئی۔ وہ خوفناک، برستی بارش والی رات۔

"تو کیا بارڈر کی ساری خبریں کیلیس میں لوگوں کو مل جایا کرتی ہیں؟"

"کس قسم کی خبریں عائشے؟" اس نے اچنبھے سے اسکرین کو دیکھا۔

''مطلب جولوگ الیگل بارڈر کراس کرتے ہیں، ان کی گرفتاری کی خبریں۔ کیا منگل کی صبح تم نے کوئی ایسی خبر سنی تھی؟'' وہ بہت سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ اور لمحے بھر کے لیے حیا کو لگا، اس کا سانس رک گیا ہے۔

''وہ اپنی بہن کی جاسوس ہے، ساری باتیں اس کو بتاتی ہوگی۔''

''تمہارا موبائل تمہارے پاس تھا بہارے؟''

''کیا تم لوگ کیلیس جاؤ گے۔ عبدالرحمٰن کیلیس کا نام لے رہا تھا......''

''حیا؟'' عائشے نے اسے پکارا۔ وہ چونکی۔ کڑیاں سے کڑیاں ملائیں تو ایک عجیب سا خیال ذہن میں ابھرا۔ نہیں، یہ نہیں ہوسکتا تھا۔ عائشے کسی کو، پولیس کو کیوں بتائے گی؟ مگر پھر وہ بارڈر کی گرفتاری کے بارے میں سننے میں اتنی دلچسپی کیوں رکھتی تھی؟

''ہاں، پیر اور منگل کی درمیانی رات وہ بارڈر کراس کر رہا تھا عائشے، مگر سیکیورٹی اہلکار اس کے انتظار میں تھے۔ وہ گرفتار ہوا یا مارا گیا، میں نہیں جانتی۔ مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ...... کہ وہ اس کے انتظار میں تھے کیوں کہ کہ تم نے ان کو بتایا تھا۔ ہے نا؟'' پتہ نہیں کیسے یہ سب اس کے منہ سے نکلا تھا۔ لاشعور میں جڑتی کڑیاں مل کر ایک ایسی زنجیر بنا گئی تھیں جس نے اس کے گلے میں پھندا ڈال دیا تھا۔

عائشے لمحے بھر کو خاموش ہوگئی۔ حیا کو لگا، وہ انکار کر دے گی، مگر وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔

''ہاں، میں نے ان کو کال کی تھی۔ یہ میرا فرض تھا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ ایک قومی مجرم قانون توڑنے جا رہا ہے، تو مجھے سیکیورٹی فورسز کو بتانا چاہیے تھا۔''

وہ بے یقینی سے عائشے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کتنے آرام سے یہ سب کہہ رہی تھی۔ کیا اسے نہیں معلوم تھا وہ کیا کہہ رہی تھی؟

''مرحبا، حیا!'' بہارے کہیں پیچھے سے آئی اور بہن کے کندھے سے جھول کر جھک کر اسکرین میں دیکھا۔ حیا نے جواب نہیں دیا، وہ ابھی تک عائشے کو دیکھ رہی تھی۔

''عبدالرحمٰن مجرم نہیں تھا عائشے! وہ مجرم نہیں تھا؟''

چائے کا گھونٹ بھرتے بھرتے عائشے گل ٹھہری۔ اس کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔ ''عبدالرحمٰن کا کیا ذکر؟''

''تم......'' حیا نے لب کھولے، مگر رک گئی۔ اس کے اندر ابلتا غصہ، بے یقینی سب کچھ رک گیا۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

''تم...... تم نے...... عائشے...... ہم عبدالرحمٰن کی بات کر رہے ہیں جسے میں نے کیلیس میں کھو دیا ہے۔'' بے بسی سے اس نے کہنا چاہا۔ بہارے کبھی عائشے کو دیکھتی اور کبھی اسکرین کو۔

چائے کی پیالی بے اختیار ایک طرف رکھتے ہوئے وہ سیدھی ہوئی اس کی آنکھوں میں ابھری حیرت اب بے یقینی میں بدل گئی تھی۔

''عبدالرحمٰن کیلیس میں کیا کر رہا تھا؟''

''تم جانتی ہو وہ کیا کر رہا تھا۔ تم نے سیکیورٹی کو بتایا اس کے بارڈر کراسنگ کا......''

''حیا، وہ کیلیس میں نہیں تھا، اسے انقرہ سے جرمنی جانا تھا، وہ کیلیس کیوں گیا؟''

''تم جانتی ہو وہ کیلیس میں تھا عائشے۔ تمہیں...... بہارے نے بتایا تھا، مجھے معلوم ہے۔'' جذبات کی شدت سے اس کی آواز بلند ہوگئی تھی۔

''بہارے گل، تم جانتی تھیں؟'' عائشے نے بے یقینی سے اپنی بہن کو دیکھا۔ وہ بے ساختہ سہم کر پیچھے ہوئی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ سب مجھے ایسے کیوں دیکھتے ہیں؟'' اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''وہ منگل کی رات بارڈر کراس کرنے جا رہا تھا، کیا یہ تمہیں بہارے نے نہیں بتایا؟''

''وہ بارڈر کراس کرنے جا رہا تھا؟ نہیں حیا...... یہ نہیں ہوسکتا۔'' عائشے ابھی تک بے دم بخود تھی۔ ''میں نے اس کے بارے میں تو کسی کو کچھ نہیں کہا۔ میں نے تو نصوح فخری کے بارے میں بتایا تھا سیکیورٹی کو، اس نے بارڈر کراس کرنا تھا منگل اور پیر کی درمیانی شب!''

''وہ جہان تھا عائشے، جس کے بارے میں تم نے ان کو بتایا...... اور...... اور...... تم نے کال ہی کیوں کی سیکیورٹی کو؟'' وہ دبی دبی

چلائی تھی۔

اس رات کے زخم، بارود کی بو، روشنی کے گولے، سب پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔

"کیونکہ مجھے عبدالرحمٰن نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔" وہ بے بسی سے بولی تھی۔ بہارے نے تائید میں سر ہلایا۔

"میری بہن سچ کہہ رہی ہے، میں نے ان کی باتیں سنی تھیں چرچ میں۔" اور حیا کو لگا، وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔

☆ ☆ ☆

"عائشے، تمہارا فون بج رہا ہے۔" آنے کے پکارنے پہ وہ چونکی، گود میں رکھا موبائل جانے کب سے بج رہا تھا۔

"بہارے!" نمبر پہ لکھا نام بہت محبت سے لے کر اس نے آنے کو بتایا اور سبز بٹن دبا کر فون کان سے لگایا۔

"سلام علیکم!" اس نے مسکرا کر سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟" ایران سے ہزاروں کلومیٹر دور، وہ اطارہ وادی کے چرچ میں کھڑا، بہارے کے فون کو کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چرچ کے کھلے دروازے سے بیرونی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں جو پہاڑ کے نیچے تک جاتی تھیں۔ حیا ابھی نماز پڑھ کر نہیں آئی تھی، اور بہارے کے پرس سے فون پہلے سے نکال کر، اس نے اسے تصویریں کھینچنے چرچ کی اوپری منزل پہ بھیجا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ، ترکی والے کیسے ہیں؟" اس کی مسکراہٹ اور بھی خوبصورت ہو گئی۔ طمانیت کے سارے رنگ آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ بہت دن بعد اس نے عبدالرحمٰن کی آواز سنی تھی۔

"عائشے، یاد ہے تم نے کہا تھا کہ تم مجھے ایک فیور دو گی؟" وہ چرچ کی چوکھٹ میں کھڑا سیڑھیوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔ حیا کے آنے سے پہلے پہلے اسے بات ختم کرنی تھی۔

"ہاں، بتاؤ، کیا ہوا؟"

"تم ترکی کے سب سے بڑے بارڈر کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"کون سا بارڈر؟ ترکی اور شام کا؟" دوسری جانب وہ چونکی تھی۔

"ہاں، اس بارڈر کو ایک قومی مجرم اس منگل کی رات کراس کرے گا، غیر قانونی طور پہ۔ ایسے میں تمہیں کچھ کرنا ہے۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد، (غالباً وہ کسی اور جگہ آ گئی تھی) وہ بولی۔

"ہاں، کہو پھر، میں سن رہی ہوں۔"

"ترکی کا تم پہ قرض ہے عائشے، اپنے دل سے پوچھو کہ اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ ایک مجرم، ترکی کا ایک قومی مجرم غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کر رہا ہے تو تمہیں کیا کرنا چاہیے؟"

عائشے خاموش رہی تھی۔ وہ آواز مزید دھیمی کرتے ہوئے بولا

"تمہیں بارڈر سیکیورٹی فورس کے کمانڈر کو فون کرنا چاہیے، تمہیں ان کو بتانا چاہیے سب کچھ تاکہ وہ اسے گرفتار کر سکیں، مگر نہیں، عائشے گل یہ کیسے کرے گی؟ عائشے گل تو کچھ نہیں کر سکتی۔"

"ذرا اونچا بولو، اتنا آہستہ مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔ کیا کوئی آس پاس ہے؟" وہ بُرا مان کر ذرا خفگی سے بولی، جیسے آخری فقرے کو نظر انداز کرنا چاہ رہی ہے۔

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی سنے۔ تم یہ سب لکھ لو۔ اور کمانڈر کا نمبر بھی۔"

پھر وہ اسے تمام ضروری باتیں بتاتا گیا، اور وہ لکھتی گئی۔

"انہیں تمہاری کال ٹریس کرنے میں نوے سیکنڈ لگیں گے، تم نے اسی ویں سیکنڈ کال کاٹنی ہے۔ تم یہ کرو گی نا؟ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" اور تبھی اس کو اپنی پشت پہ آہٹ کا احساس ہوا، وہ تیزی سے پلٹا۔ اندر چرچ کی سیڑھیوں پہ حرکت سی ہوئی تھی۔

"کوئی آ گیا ہے، بعد میں کال کروں گا۔" اور اس کا مرحبا سننے سے قبل ہی وہ سبک رفتاری سے آگے آیا، اور سیڑھیوں کی اوٹ میں

کھڑی بہارے گل کو کان سے پکڑ کر باہر نکالا۔

"میں ابھی آئی تھی، واللہ، میں نے کچھ نہیں سنا" چھوٹی بلی بوکھلا گئی تھی، مگر وہ لب بھینچے، برہمی سے اسے چرچ سے باہر لایا تھا۔

"تو تم میری باتیں سن رہی تھیں۔ تمہیں تمہاری بہن نے سکھایا نہیں ہے کہ کسی کی باتیں چھپ کر نہیں سنتے؟"

"میری بہن کو کچھ مت کہو۔"

"جو تم نے سنا ہے، اگر وہ تم نے حیا کو بتایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا بہارے۔"

وہ دبے دبے غصے سے کہہ رہا تھا۔ "اور اگر تم نے اپنی بہن کو بتایا کہ میں نے یہ بات حیا کو بتانے سے منع کیا ہے، تو میں واقعی بہت برا پیش آؤں گا۔"

سیڑھیوں پہ ٹک ٹک کی آواز گونجنے لگی۔ وہ اوپر آ رہی تھی۔ جہان نے بہارے کو موبائل واپس کیا جسے اس نے جلدی سے اپنے پرس میں ڈال دیا۔

"اگر تم نے میری بات نہ مانی بہارے......"

"میں نے کچھ نہیں سنا......" وہ روہانسی ہوگئی تھی...... حیا تب تک اوپر پہنچ چکی تھی......

☆ ☆ ☆

"اس نے یہ سب کہا؟" وہ بے یقینی سے اسکرین پہ نظر آتیں عائشے اور بہارے کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، میری بہن سچ کہہ رہی ہے۔ میں نے خود سنا تھا۔"

"تم نے یہ سب سنا تھا؟" اور وہ سمجھتی رہی کہ شاید اس نے اس کی اور جہان کی باتیں سنی تھیں، مگر وہ تو اردو میں بات کر رہے تھے، وہ سن بھی لیتی تو اسے کیا سمجھ آتا؟ اس نے ان کی باتیں سنی ہی نہیں تھیں۔ وہ ایک دفعہ پھر ایک طرف کی کہانی سے نتیجہ اخذ کر گئی تھی۔

"اس نے اپنی مخبری خود کروائی؟ اس نے خود کو خود گرفتار کروایا؟ مگر کیوں؟" اس سارے قصے کا کوئی سینس نہ بنتا تھا۔ وہ حیران تھی۔ پریشان تھی۔

"تمہیں کیسے پتہ کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے؟" عائشے نے بے چینی سے پوچھا۔

"میں نے خود دیکھا تھا، وہ......" حیا کے الفاظ لبوں پہ ٹوٹ گئے۔ اس نے کیا دیکھا تھا؟ ہیولے؟ دھواں؟ روشنی کے گولے؟ ایک طرف کی کہانی؟

"مجھے نہیں پتہ میں نے کیا دیکھا تھا۔ مجھے نہیں پتہ۔" وہ بے بسی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔ پھر ایک دم جھماکے سے اسے یاد آیا۔

جہان کے جوتوں کا رخ...... جب وہ اٹھا تھا تو اس کے جوتوں کا رخ بائیں جانب تھا، حالانکہ وہ سرحد کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔ کیا وہ سرحد کی طرف نہیں جا رہا تھا؟ وہ بائیں جانب جا رہا تھا؟ مگر بائیں طرف کیا تھا؟

"پلیز تمہیں جب بھی کچھ پتہ لگے، مجھے ضرور بتانا۔ اگر اسے میری وجہ سے کچھ ہوا تو میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کروں گی۔"

عائشے بہت فکرمند و بے چین ہو گئی تھی۔ حیا نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ عائشے کو تسلی دینے کے لیے ایک لفظ بھی اس کے پاس نہ تھا۔

سرحد کی وہ رات اور ہر اقلیس کی دائمی آگ سے اٹھتے دھوئیں کے مرغولے، سب پھر سے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے دیوار پہ لگے کیلنڈر کی تاریخوں کو ایک دفعہ پھر دیکھا۔ ابھی ابھی اس نے سرخ پین سے آج کی تاریخ یعنی ہفتے کا دن کاٹا تھا۔ اب مزید دو روز باقی تھے۔ پھر منگل تھا۔ پین رکھ کر وہ ڈریسنگ ٹیبل تک آئی اور آئینے میں خود کو دیکھا۔ ڈوبتی امید کے درمیان اس کا دل بننے سنورنے، تیار ہونے، کسی بھی چیز کو نہیں چاہ رہا تھا۔ سادہ سفید شلوار قمیص اور شانوں پہ پھیلا سفید دوپٹہ اور ڈھیلے جوڑے میں بندھے بال، ویران آنکھیں۔ دل تو وہیں زیتون کے درختوں میں کھو گیا تھا۔

وہ باہر آئی تو روحیل کچن کی آدھ کھلی دیوار کے پیچھے سے نظر آ رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر ذرا سا مسکرایا۔

''پیو گی؟'' وہ کپ میں کانٹے سے کافی پھینٹ رہا تھا۔
''اونہوں!'' وہ ہلکا سا نفی میں سر ہلاتے آگے آئی اور کچن کی سینٹر ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔
''اور کیا ہو رہا ہے؟ جہان نے کب آنا ہے؟'' گھوم پھر کر وہی سوال۔
''اچھا ہے نا وہ نہیں آیا۔ سب خوش ہو گئے۔ اسے اور مجھے ساتھ دیکھ کر خوش تھا ہی کون بھلا۔'' وہ تلخی سے بولی۔
''ارے میں تو خوش تھا بلکہ وہ آتا تو اور بھی خوش ہوتا۔ خیر پھوپھو کہہ رہی تھیں کہ وہ منگل کو آ جائے گا؟'' روحیل پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا وہ سمجھ نہیں سکی۔ پھوپھو کو تو اس نے خود ہی بتایا تھا مگر جب اسے خود ہی یقین نہیں تھا تو روحیل کو کیا دلاتی۔
''نتاشا کہاں ہے؟'' اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے موضوع بدلا۔
''اندر ہوگی۔ ولیمے کے لیے اپنے ڈریس کی ڈیزائننگ کرتی پھر رہی ہے۔''
''اچھا، خوش ہے وہ پاکستان آ کر؟''
''ہوں''۔ روحیل نے کافی پھینٹتے ہوئے ذرا سے شانے اچکائے۔ یہ ہاں تھا یہ ناں، وہ سمجھ نہیں پائی۔
''اور اب تو ابا بھی جہان سے خوش تھے۔''
''تو پہلے کونسا وہ.....'' وہ کہتے کہتے رکی۔ ایک دم سے کچھ یاد آیا تھا۔ بیوک ادا میں جب روحیل سے اس کی بات ہوئی تھی تب اس نے کچھ بتایا تھا۔ ''تم نے بتایا تھا روحیل یاد ہے کہ ابا کسی وجہ سے جہان سے خفا تھے۔''
''چھوڑو حیا۔ رہنے دو، وہ تو بس ایسے ہی۔''
''نہیں مجھے بتاؤ تو سہی، تم نے کہا تھا بعد میں بتاؤں گا۔''
''کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن جب ابا ڈیڑھ سال پہلے استنبول میں سبین پھوپھو سے ملے تھے تو انہوں نے کسی لڑکی کو جہان کو ڈراپ کرتے دیکھا تھا۔ بس اسی بات سے ان کے دل میں گرہ لگ گئی تھی۔ مگر خیر چھوڑو۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔''
اور حیا کو تو یہ بات اچھے سے یاد تھی۔ اس نے ابا اور تایا کی باتیں سنی تھیں۔ ہاں وہ یہی بات کر رہے تھے۔ لیکن جہان نے اسے یہ بات کبھی نہیں بتائی کیونکہ اس نے پوچھی نہیں تھی۔ تو کیا ابھی بھی کچھ ایسی باتیں تھیں جو وہ اسے نہیں بتاتا تھا جیسے عائشے کو وہ سب کہنا۔ اف۔
وہ دونوں ابھی وہیں بیٹھے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ حیا نے آگے ہو کر فون اٹھایا۔ ذہن میں پہلا خیال ولید کا آیا تھا۔
''حیا کیا تم فارغ ہو؟'' صائمہ تائی بہت ہی شیریں لہجے میں بول رہی تھیں۔ یقیناً کوئی کام تھا۔
''جی بتایئے''
''ارم کے ساتھ مارکیٹ تک ہو آؤ۔ کچھ قمیصیں لینی ہیں اسے اور اپنے تایا کا تو تمہیں پتہ ہی ہے، وہ اکیلے جانے کہاں دیتے ہیں''
''او کے میں آ رہی ہوں''
کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ نہ آتی لیکن اسے ارم سے بھی تو بات کرنی تھی۔ سو ایک نہج پہ پہنچ کر وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔

☆ ☆ ☆

اس نے کار پارکنگ ایریا میں روکی اور گیئر کو نیوٹرل پہ کیا۔ چابی گھماتے ہوئے ارم کو دیکھا۔ شلوار قمیص پر سکارف لیے وہ ذرا بے چین بے چین نگاہوں سے شاپنگ پلازہ کو دیکھ رہی تھی۔
''چلیں؟'' اس کی بات پہ ارم چونکی۔
''ہاں چلیں۔ مجھے کچھ قمیصیں لینی ہیں۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ.....'' ارم ذرا تذبذب سے رکی۔ ''مجھے پنک کلر میں لان چاہیے۔ تم یوں کرو، تم شاپ کے اندر چلی جاؤ جو اچھے لگیں، نکلوا لینا۔ تمہارا ٹیسٹ بھی زیادہ اچھا ہے۔ مجھے کچھ جیولری بھی اٹھانی تھی، میں تب تک دوسرے پلازہ سے اٹھا لاؤں۔ تم بیٹھو میں آتی ہوں''
وہ جیسے ساری تمہید تیار کر کے لائی تھی اور اب جلدی جلدی لاک کھولنے لگی۔

"میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔"

"نہیں خیر ہے۔ تمہاری طبیعت نہیں ٹھیک، تمہیں یوں کیوں تھکاؤں۔ بس دس منٹ تو لگیں گے۔"

"ارم اگر تمہیں یوں اکیلے جانا ہے تو پہلے اپنے ابا سے پوچھ لو۔" اس نے کہنے کے ساتھ ہی اپنے موبائل پہ تایا کا نمبر ملایا اور کال کے بٹن پہ ہاتھ رکھے مگر دبائے بغیر سکرین ارم کو دکھائی۔ دروازے کو کھولتا ارم کا ہاتھ ٹھہرا، آنکھوں میں الجھن اور پھر غصہ در آیا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے میں کسی لڑکے سے ملنے جارہی ہوں؟"

"نہیں مجھے لگتا ہے تم ولید سے ملنے جارہی ہو۔"

اس نے بغور ارم کو دیکھتے ہوئے رسان سے کہا۔ ایک لمحے کے لیے ارم کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اس نے تھوک نگلی۔ مگر پھر وہ جی کڑا کر بولی۔

"اور اگر جا بھی رہی ہوں تو کیا کرلو گی تم؟"

"میں اکیلی گھر چلی جاؤں گی اور کسی کو کچھ بھی نہیں کہوں گی۔ پھر جب تم تنہا آؤ گی تو سب کو خود ہی وضاحت دو گی۔ میں تمہارے لیے قربانی کا بکرا کیوں بنوں ہمیشہ؟"

"میں کسی سے نہیں ڈرتی حیا!"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ تم نے جو میری ویڈیو دینے کی حرکت کی ہے اس سے پتہ چل گیا تھا کہ تمہیں اللہ کا خوف بھی نہیں ہے۔"

"کونسی ویڈیو؟" ارم نے ابرو اٹھائی۔ چہرے کا بدلتا رنگ گواہی دے رہا تھا کہ یہ حرکت اسی نے کی تھی۔ فون پہ بھلے وہ جتنی مضبوطی سے بات کرلے، سامنے کی بات اور ہوتی ہے۔

"تمہیں بھی پتہ ہے اور مجھے بھی پتہ ہے کہ میں کس ویڈیو کی بات کر رہی ہوں۔ تم نے اس طرح کرنے سے پہلے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اس میں تمہاری بھی بدنامی ہوگی۔" وہ دکھ سے ارم کو دیکھتے ہوئے بولی۔ گاڑی کے شیشے آدھے کھلے تھے، اس کے باوجود باہر کے شور سے بے نیاز وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ حیا دکھ سے اور ارم تلخی سے۔

"میری زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ میری جتنی بدنامی تم نے کروائی تھی کروالی۔"

"ارم تم ولید سے وہ ویڈیو واپس لے لو۔" اس نے التجا نہیں کی تھی بس قطعیت سے کہا تھا۔

"اچھا، یہ چاہتی ہو تم۔ اور اگر میں نہ لوں تو؟" ارم کے چہرے پہ کڑوی سی مسکراہٹ تھی۔

"تو تم نتائج کی ذمہ دار خود ہوگی۔"

"اور اگر میں اس شرط پہ لوں گی ابا کے سامنے جا کر تم کہو گی کہ میں اس رات تم ہی سے بات کر رہی تھی اور وہ تمہارا ہی کوئی جاننے والا تھا جس نے ابا کے فون کرنے پہ فون اٹھایا تھا تو کیا تم ایسا کرلو گی؟"

حیا چند لمحے بہت دکھ سے اسے دیکھتی رہی۔

"یو نو واٹ، تم اور ولید ایک جیسے ہو۔ جب خود پھنسے ہوئے ہوتے ہو تب بھی تمہیں لگتا ہے کہ دوسروں کو اپنے اشاروں پہ نچا سکتے ہو۔ میں ایسا کبھی بھی نہیں کروں گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ کرنے دو ولید کو اس ویڈیو کے ساتھ جو وہ کرنا چاہتا ہے۔"

چند لمحے دونوں کے درمیان ایک تلخ سی خاموشی حائل رہی۔ حیا سوچتے ہوئے ونڈ سکرین کے پار دیکھتی رہی۔ کسی طرح اسے ارم کو کنونس کرنا تھا کہ وہ ولید سے وہ ویڈیو لے لے، کسی بھی طرح۔

"ارم میری بات سنو۔ اس میں تمہارا پارٹ بھی ہے۔ صرف میں نہیں، تم بھی بدنام ہو جاؤ گی۔"

پہلی دفعہ ارم کے چہرے پہ ایک مطمئن سی مسکراہٹ ابھری۔

"آر یو شیور حیا کہ اس میں میرا پارٹ بھی ہے؟"

اور حیا سن سی رہ گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ ارم نے اپنا پارٹ ایڈٹ کر دیا تھا اور وہ ان کاموں میں بہت اچھی تھی۔ اسے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا کے وہ ایسا بھی کچھ کر سکتی تھی۔

"تو تم نے صرف مجھے بے عزت کرنے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔ ارم تم مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہو؟" وہ جو اتنی دیر سے سپاٹ لہجے میں بات کر رہی تھی اب کہ اس کی آواز میں شدید صدمہ در آیا تھا۔

"ہاں کرتی ہوں اور مجھے تمہارے اس برقعے سے بھی نفرت ہے۔ ہمیشہ تمہاری وجہ سے مجھے ابا سے باتیں سننی پڑتی تھیں۔" ارم ایک دم پھٹ پڑی تھی۔ "جب روحیل بھائی امریکا گئے اور تم یونیورسٹی تو تم ایک دم ماڈرن ہو گئیں۔ ابا تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے سو انہوں نے مجھ پہ روک ٹوک زیادہ کر دی کہ کہیں میں تمہارے جیسی نہ بن جاؤں۔ تمہاری وجہ سے مجھ پہ سختیاں بڑھی ہیں اور اب میں تنگ آ گئی ہوں اس زبردستی کے سکارف سے۔ میرا بس چلے تو میں اس شہر کی ساری سکارف شاپس کو آگ لگا دوں۔ نہیں کرنا مجھے سکارف، کیوں کرتے ہیں ابا اتنی سختی۔" وہ ایک دم رونے لگی تھی۔

"تو پھر کیا کریں وہ۔ سختی نا کریں تو کیا اپنی بیٹیوں کا کھلا چھوڑ دیں کہ جو مرضی کرو؟ ایسا نہیں ہو سکتا ارم۔ ہاں ٹھیک ہے ان کو ذہن سازی بھی کرنی چاہیے۔ انہیں سکارف کے لیے پہلے کنونس کرنا چاہیے۔ مگر ارم ان کی نیت تو ہمیشہ اچھی تھی نا۔" اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ارم کے آنسوؤں سے اس کا دل ذرا پگھلا تھا۔

"تمہیں زیادہ ابا کی وکالت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہیں شاپنگ نہیں کرنی تو ٹھیک ہے چلو گھر۔ مجھے نہیں جانا کہیں۔" وہ آنسو پونچھتی ایک دم بہت تلخی سے کہتی سیدھی ہوئی۔ حیا نے افسوس سے اسے دیکھا۔ دل میں جو نرم گوشہ بننے لگا تھا وہ فوراً مٹ گیا۔ آخر وہ بھول بھی کیسے سکتی تھی کہ ارم نے ولید کو وہ ویڈیو دے دی تھی۔ اتنا بڑا دھوکا اس نے حیا کے ساتھ کیا تھا۔

اس نے افسوس سے سر جھٹکا اور اگنیشن میں چابی گھمائی۔ کار کے انجن میں حرارت پیدا ہوئی۔

ارم بھیگی نگاہوں سے شیشے کے پار دیکھ رہی تھی۔ اسے اب بھی اپنی ہی فکر تھی۔ اپنا سکارف، اپنے ابا کی سختیاں، اپنی مجبوریاں۔ اسے اب بھی حیا کی یا اس ویڈیو کی فکر نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

منگل آیا، صبح ہوئی، دوپہر چڑھی، شام اتری، اور رات چھا گئی۔ وہ نہیں آیا۔ بدھ بھی گزر گیا، اور جمعرات کو زاہد چچا کی بیٹی مہوش پاکستان آ گئی، مگر وہ شدید کرائسز میں تھی۔ زاہد چچا اور عابدہ چچی نے کسی کو نہیں بتایا مگر صائمہ تائی کو اپنے کسی سورس سے پتہ لگ ہی گیا۔ مہوش کا شوہر اس سے اگلی فلائٹ میں آ رہا تھا مگر امیگریشن کے کسی چکر میں پھنس گیا، اور عین وقت پہ گرفتار کر لیا گیا۔ مہوش کی فلائٹ چونکہ ایک روز قبل کی تھی، سو وہ اس وقت تک پاکستان آ چکی تھی، اور پھر خبر ملتے ہی تایا فرقان اور ان کی فیملی سمیت سب ہی عابدہ چچی کی طرف اکٹھے ہو گئے تھے۔

ڈائننگ ہال میں میز کے گرد چھ کرسیوں پہ سونیا اور وہ پانچ کزنز بیٹھی تھیں۔ مہوش خاموش تھی، اور وہ سب بھی۔ حیا تو سربراہی کرسی پہ بیٹھی، دوپٹہ سر پہ ٹھیک سے لیے، دیکھ بھی کہیں دور خلا میں رہی تھی۔

ڈائننگ ہال اور ڈرائنگ روم کے درمیان جالی دار پردہ آدھا گرا تھا، اس کے پار صوفوں پہ سب بڑے بیٹھے تھے۔ لڑکے وغیرہ بھی اکٹھے ہو گئے تھے سو وہ باہر لان میں تھے۔ اب تو حیا کی وجہ سے وہ لڑکیوں والی طرف آنے سے بھی جھجکنے لگے تھے۔ روحیل اور نتاشہ البتہ صوفوں پہ ہی بیٹھے تھے۔

"عفان کے ماں باپ کیا کہتے ہیں؟" تایا ابا پوچھ رہے تھے۔ ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جواب میں عابدہ چچی بُرے دل سے کچھ بتا رہی تھیں۔ ان کو یقیناً یوں سب کا "افسوس" کے لیے آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"آج کل کے لڑکے بھی پتہ نہیں کن چکروں میں ہوتے ہیں۔" صائمہ تائی نے ہمدردی سے کہا تھا۔

مہوش نے دبے دبے غصے سے جالی دار پردے کو دیکھا، اور ایک دم اٹھ کر اندر چلی گئی۔ سونیا نے افسردگی سے اسے جاتے

دیکھا۔ کیا کیا جا سکتا تھا؟

''بس اللہ تعالیٰ خیر سے اسے واپس پہنچا دے۔'' پھپھو نے دھیرے سے کہا تھا۔ انہیں بھی صائمہ تائی کا یوں اصرار سے سب کو ''افسوس'' کے لیے ادھر لے آنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''جہان کی کیا خبر ہے سبین؟ منگل تو گزر گئی، اس کا کوئی اتہ پتہ ہی نہیں؟'' صائمہ تائی کو پھپھو کا ٹوکنا بُرا لگا تو توپوں کا رخ عفان سے جہان کی طرف کر دیا۔ حیا چونک کر آدھے ہٹے پردے کو دیکھنے لگی۔

''آ جائے گا بھابھی۔ کسی مسئلے میں ہوگا تبھی دیر ہوئی ہے۔'' پھپھو کی آواز مزید دھیمی ہوگئی۔

''تم بھی اپنے بیٹے پہ نظر رکھا کرو سبین۔'' تایا ابا نے اسی انداز میں کہا جس میں وہ عفان کی بات کر رہے تھے۔ ''پتہ نہیں وہ بھی کسی ٹھیک کام میں ہے یا..... اپنے باپ کے جنازے پہ بھی تو نہیں آیا تھا۔''

''جہان کا یہاں کیا ذکر بھائی؟'' پھوپھو کے لہجے میں دبا دبا شکوہ تھا۔

حیا نے میز کا کونہ سختی سے پکڑا۔ پیشانی کی رگیں کھنچ گئی تھیں۔ اندر ایک ابال سا اٹھا تھا۔

''عفان کا بھی تو ہمیں معلوم نہیں تھا۔ یہاں شاید کسی کا بھروسہ نہیں ہوتا۔'' تایا ابا نے پھوپھو کی بات سنے بغیر تبصرہ کیا۔ حیا کے اندر کا ابال بس کسی لاوے کی طرح پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔ بمشکل وہ ضبط کر کے لب بھینچے بیٹھی رہی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے بھائی۔ میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔'' حیا نے مڑ کر دیکھا۔ جالی دار پردے کے پاس پھوپھو ذرا خفگی سے کہتی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے صائمہ تائی اور عابدہ چچی کے چہروں کے معنی خیز تاثرات دیکھے اور پھر ابا کو دیکھا جو خاموشی سے پھوپھو کو دیکھ رہے تھے۔

''سچ کہوں تو سبین مجھے تمہارے بیٹے کے کام مشکوک سے لگتے ہیں۔ کبھی کہتا ہے ریسٹورانٹ ہے، کبھی کہتا ہے جاب سے چھٹی نہیں ملی۔ بہتر ہوگا تم اس کو بھی چیک میں رکھا کرو تا کہ کل کو کوئی بڑا نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کام کیا کرتا ہے۔''

اور تایا کی اس بات پہ اسے لگا کہ اس کی برداشت ختم ہوگئی ہے۔ بس بہت ہو گیا، اب مزید وہ نہیں برداشت کر سکتی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اسے راز رکھنے آتے تھے مگر اسے صرف وہ راز رکھنے چاہئیں تھے جن کے رکھنے کا کوئی فائدہ ہو۔ اب مزید نہیں!

وہ تیزی سے اٹھی اور جالی دار پردہ اٹھا کر ڈرائنگ روم کے دہانے پہ آئی۔ اس کے یوں آنے پہ سب نے اسے مڑ کر دیکھا تھا۔

''کیا آپ جانتے ہیں تایا ابا کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ اگر نہیں جانتے وہ کیا میں آپ کو بتاؤں؟'' ہاں یہ ٹھیک ہے کہ وہ بڑے تھے اور اسے ان سے ادب سے بات کرنی چاہیے تھی مگر وہ اپنے لہجے میں پنہاں غصے کو ضبط کیے جب بولی تو اس کی آواز کافی بلند تھی۔ تایا ابا نے قدرے حیرانی، قدرے برہمی سے اسے دیکھا، اور پھر سلیمان صاحب اور فاطمہ کو، جیسے کہہ رہے ہوں کہ ان کی بیٹی کو کیا ہو گیا ہے۔

''شاید آپ نہیں جانتے۔ ٹھہریں میں آپ کو بتاتی ہوں۔'' وہ اسی انداز میں اونچی آواز سے بولی۔ ''جہان ابھی اسی لیے نہیں آ سکا کیوں کہ وہ اپنی آفیشل اسائنمنٹ میں پھنسا ہوا ہے۔ آپ تو یہ بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ وہ ہماری ایجنسی کا ایک ایجنٹ ہے، ایک بہت قابل آرمی آفیسر!''

یہ بات کہہ کر جب وہ فارغ ہوئی تو اس نے باری باری سب کے چہروں کو دیکھا۔ تایا ابا، صائمہ تائی، زاہد چچا، عابدہ چچی۔ سب حیران سی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے جیسے انہیں سمجھ نہیں آیا ہو کہ اس نے کیا کہا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے الفاظ ان کے ذہنوں میں ٹھہرنے لگے اور ان کے معانی ان کے سامنے عیاں ہونے لگے۔

''آرمی آفیسر۔ ایجنٹ۔'' تایا فرقان نے کچھ حیران نگاہوں سے پہلے اسے دیکھا جو اپنی بات کہہ چکنے کے بعد ذرا پُرسکون سی چوکھٹ پہ کھڑی تھی۔ پھر سبین پھوپھو کو دیکھا جو خاموشی سے صوفے پہ بیٹھی تھیں مگر ان کی آنکھوں کا سکون اس بات کا غماز تھا کہ انہیں حیا کی اس بات سے خوشی ہوئی ہے۔ ضروری تو نہیں تھا نا کہ سب کچھ جہان آ کے بتاتا۔ انہیں شاید جہان نے منع کر رکھا تھا سو انہوں نے بیٹے کا مان

کا بھی رکھا لیکن حیا کے اس عمل سے جیسے ان کو ڈھیروں سکون مل گیا تھا۔

''وہ ہماری ایجنسی کے لیے کام کرتا ہے؟'' صائمہ تائی شاکڈ سی بولیں۔ ''کیا وہ آرمی آفیسر ہے، کیا واقعی؟''

''جی تائی یہ سچ ہے۔'' وہ سینے پہ بازو لپیٹے بہت اعتماد سے کہہ رہی تھی۔ ہر دفعہ انسان کو اپنے لیے جنگ نہیں لڑنی ہوتی۔ کئی دفعہ دوسروں کے لیے بھی لڑنی پڑتی ہے اور وہ اس وقت وہی کر رہی تھی۔

''اس نے بہت عرصہ یہ بات اپنی تک رکھی، آپ لوگوں کو نہیں بتائی، اس لیے نہیں کہ وہ آپ کو اپنا نہیں سمجھتا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے اس کی جاب کی نوعیت ایسی تھی کہ اسے اپنی اصل شناخت چھپا کے رکھنی تھی۔ لیکن وہ چاہتا تو بتا سکتا تھا۔ جیسے پھوپھو کو ہمیشہ سے معلوم تھا، جیسے بہت سے دوسرے لوگوں کو معلوم تھا۔ لیکن اس نے آپ لوگوں کو نہیں بتایا شاید اس لیے کہ وہ آپ کا مان نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ وہ مان جس کے ساتھ بہت سال پہلے آپ لوگوں نے.....'' اس نے 'لوگوں' کہتے ہوئے تایا فرقان کو دیکھا۔''...... بہت فخر سے کہا تھا کہ کسی غدار کے بیٹے کو فوج میں کمیشن نہیں مل سکتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تایا ابا۔ کتنے ہی غداروں کے بیٹے، بھتیجے آج بھی فوج میں کام کر رہے ہیں اور بہت دیانتداری اور محب وطنی سے کر رہے ہیں۔ اسی لیے جب اس کو جاب مل گئی تو اس نے آپ کو نہیں بتایا تاکہ آپ کا مان نہ ٹوٹے، تاکہ آپ کے فخر کو ٹھیس نہ پہنچے۔''

وہ جانتی تھی کہ وہ کافی زیادہ بول رہی ہے، بڑوں کے سامنے اتنا نہیں بولنا چاہیے مگر بات کرتے ہوئے بھی وہ تمیز اور تہذیب کی سرحد سے آگے نہیں نکل رہی تھی۔ البتہ اس کی آواز ذرا اونچی تھی۔ بعض دفعہ انسانوں کے خود غرض مجمعے کو اپنی بات منوانے کے لیے تھوڑا سا بدتمیز، تھوڑا سا لاؤڈ ہونا پڑتا ہے۔

ڈرائنگ روم میں اتنا سناٹا تھا کہ سوئی بھی گرتی تو گونج پیدا ہوتی۔ تایا فرقان کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ وہ جیسے سمجھ ہی نہیں پا رہے تھے کہ یہ سب ہوا کیا ہے۔

نتاشا، روحیل سے دھیمی آواز میں کچھ پوچھ رہی تھی اور وہ آہستہ سے جواب میں کچھ بتا رہا تھا۔ نتاشا اس کی بات سن کے ذرا سا مسکرائی اور فاتحانہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہا

''I guessed so۔''

ڈرائنگ روم میں موجود نفوس میں وہ واحد تھی جسے اس خبر نے بہت محظوظ کیا تھا۔

''کیا کرتا ہے وہ آرمی میں، کیا رینک ہے اس کا؟'' زاہد چچا وہ پہلے تھے جنہوں نے سوال کیا۔ شاید ان کے ذہن نے اس بات کو قبول کر لیا تھا۔

''میجر ہے۔'' اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی، جواب کسی اور نے دیا۔ نہ اس نے، نہ پھوپھو نے۔ حیا بے اختیار چونکی۔

سلیمان صاحب!

اب حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔ اس کے لب ذرا سے کھل گئے اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ ابا کو پتہ تھا؟ ابا کو کب سے پتہ تھا؟ اس نے پھوپھو کی طرف دیکھا وہ بھی حیران ہوئی تھیں۔

''کیا تمہیں معلوم تھا؟'' تایا فرقان کو جھٹکا لگا۔

''جی، کافی عرصے سے پتہ تھا۔'' انہوں نے کہتے ہوئے حیا کو دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ تم وہ واحد نہیں ہو جسے یہ بات معلوم تھی۔ ''میں اس شہر میں رہتا ہوں اور میرے اپنے بھی سورسز ہیں۔ مجھے کافی عرصے سے پتہ تھا اور مجھے اس پہ اسی بات کا غصہ تھا کہ کیا تھا اگر وہ ہمیں بتا دیتا۔ ہم اس کے اپنے تھے، دشمن تو نہیں تھے۔''

حیا نے بے اختیار روحیل کی طرف دیکھا۔ روحیل نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو یہی بات تھی جس لیے ابا اس سے برگشتہ رہتے تھے۔ وہ لڑکی والا معاملہ نہیں تھا۔ وہ یہ بات تھی۔ روحیل کو بھی پتہ تھا، ابا کو بھی پتہ تھا، نتاشا کو شک تھا، بس ایک وہی بیوقوف تھی جو تین مہینے اس کے پزل باکس کی پہیلیاں ڈھونڈتی رہ گئی۔ کاش وہ ان سب سے پہلے پوچھ لیتی۔

''حیرت ہے۔'' تایا فرقان بمشکل کہہ پائے۔ وہ ابھی تک بے یقین تھے۔ ''اسے کبھی تو چاہیے تھا کہ ہمیں بتا دے۔ مجھے...... پتہ نہیں......''

''وہ بتانا چاہتا تھا مگر اس کی جاب کی کچھ مجبوریاں تھی کہ وہ نہیں بتا سکا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ایسی جاب میں مشکل ہو جاتی ہے۔ بہر حال اس کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگ لیتی ہوں۔'' سبین پھوپھو نے بہت سکون سے کہا تھا۔ ان کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوتا تھا مگر وہ مطمئن تھیں، بہت مطمئن۔

''تمہیں کس نے بتایا؟'' فاطمہ ابھی تک حیران تھیں۔ کبھی اسے دیکھتیں، کبھی سلیمان صاحب کو۔ جیسے سمجھ نا پا رہی ہوں کہ انہیں اس بات پہ خوش ہونا چاہیے یا نہیں۔

''جہان نے! اسے مجھے ہی بتانا چاہیے تھا نا'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ بس وہ ایک جواب ہر جواب پہ بھاری ہو گیا۔ صائمہ تائی، عابدہ چچی کی معنی خیز نگاہوں، طنز و طعنے کے نشتروں، ہر شے کو اپنا جواب مل گیا۔

وہ واپس پلٹی تو دیکھا ڈائننگ روم میں موجود لڑکیاں اسے انہیں ششدر و حیران نگاہوں سی دیکھ رہی تھی۔ ہاں خبر بڑی تھی مگر جلد ہی وہ اسے قبول کر لیں گے۔ اگر وہ آیا تو پتہ نہیں وہ اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک کریں گے۔ مگر وہ آئے تو سہی۔ کب آئے گا، وہ نہیں جانتی تھی، البتہ وہ یہ جانتی تھی کہ اس جنگ میں جہان اکیلا نہیں ہوگا، وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہوگی۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کے آگے بیٹھی ترکی کی تصویریں دیکھ رہی تھی جب اس کا موبائل بجا۔ سکرین کو دیکھتے ہوئے اس نے فون اٹھایا اور نمبر دیکھتے ہوئے جیسے اندر تک کڑواہٹ گھل گئی۔ ولید۔ جانے یہ کب اس کی جان چھوڑے گا۔

چند لمحے وہ جلتی بجھتی سکرین دیکھتی رہی، اٹھائے یا نہیں۔ مگر اس آدمی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اٹھانا ہی پڑے گا۔ اس نے سبز بٹن دبا کے فون کان سے لگایا۔

''میں تمہارے گھر کے باہر ہوں۔ کیا تم پانچ منٹ میں باہر آ سکتی ہو؟''

اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کے دبا دیا۔

''کیا؟ تم ادھر کیا کرنے آئے ہو؟'' وہ حیران پریشان سی کھڑی ہوئی۔ پھر کمرے سے باہر نکلی۔ وہ بیرونی دروازے کے طرف نہیں بلکہ سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ وہ آرکیٹیکٹ والا مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا اور میں جانتا ہوں تم اسے حل کرواؤ گی۔ میں اس دن پیزا ہٹ میں ویٹ کرتا رہا مگر تم نہیں آئیں! اور اب میرا خیال ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے جب تمہیں میری بات کو سنجیدگی سے سننا چاہیے۔''

''اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں نہیں آؤں گی۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری ان گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جاؤں گی؟ grow up ولید۔'' لہجے میں سختی رکھتے ہوئے وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس نے ٹیرس کا دروازہ کھولا اور تیزی سے باہر آئی۔

''میں نے فون تمہاری یہ سب باتیں سننے کے لیے نہیں کیا۔ تم باہر آؤ، مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ بس پانچ دس منٹ لگیں گے۔ اوکے!'' کال کاٹ دی گئی۔

اس نے شاک زدہ انداز میں بند فون کو دیکھا اور پھر تیزی سے آگے آئی۔ چھت پہ کونے میں پڑے جھولے کے پیچھے سے اس نے منڈیر پر سے جھانکا۔ باہر رات سیاہ تھی۔ کہیں کہیں سٹریٹ پول جل رہے تھے۔ گھر کے گیٹ سے ذرا دور ولید کی سیاہ اکارڈ کھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا، سٹیرنگ ویل پہ ہاتھ رکھے منتظر سا ان کے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حیا کے اندر طوفان سا اٹھنے لگا۔ بے بسی بھی تھی،

غصہ بھی تھا۔ یہ آدمی کسی طرح اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ پتہ نہیں کچھ لوگوں کو اللہ کا خوف بھی نہیں ہوتا۔ کسی کی کمزوری ہاتھ لگنے پہ وہ خود کو خدا کیوں سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر نہیں ایسے خداؤں سے، ایسے بلیک میلرز سے نبٹنا اسے اچھی طرح آتا تھا۔

وہ مڑی اور ٹیرس پہ رکھے ان مصنوعی پودوں کی طرف آئی جو بڑے بڑے گملوں میں رکھے تھے۔ گملے بڑے تھے اس لیے ٹہنیوں کو کھڑا رکھنے کے لیے انہیں مٹی کے بجائے چھوٹے بڑے پتھروں سے بھرا گیا تھا۔ اس نے ایک گملے سے ایک وزنی سا پتھر اٹھایا اور واپس منڈیر تک آئی۔ ولید ابھی تک منتظر نگاہوں سے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس کا خیال تھا کہ اس کی بلیک میلنگ میں آکر وہ ابھی گیٹ سے آتی دکھائی دے گی اور ایک دفعہ پھر اس کی گاڑی میں بیٹھ جائے گی۔ مومن ایک سوراخ سے کبھی دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ وہ اتنی کمزور تو نہیں تھی کہ اس کی بلیک میلنگ کی وجہ سے اس کے ساتھ بیٹھ جاتی۔ وہ اور ہوتی ہوں گی کمزور لڑکیاں جو بلیک میلنگ سے گھبرا جاتی ہوں گی۔ نہیں۔ اگر اس نے جنت کے پتے تھامے تھے تو اللہ اسے رسوا نہیں کرے گا۔ یہ وعدہ اس سے جہان نے کیا تھا مگر جہان تو اس وقت نہیں تھا جو اپنا وعدہ نبھا سکتا۔ اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

اس نے ایک نظر ہاتھ میں پڑے پتھر کو دیکھا اور ایک نظر نیچے کھڑی گاڑی کو۔ لمحے بھر کے لیے ساری باتیں سیلاب کے طرح امڈ کر اس کے ذہن پہ چھاتی گئیں۔ ولید کی بلیک میلنگ، اس کی بدتمیزیاں، اس کی ہر وہ حرکت جس نے اسے ذہنی کوفت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور پھر اس نے کھینچ کر وہ پتھر اس کی گاڑی پہ مارا۔

اندازہ اس نے ونڈ سکرین کا کیا تھا مگر وہ بونٹ پہ لگ کر نیچے گرا۔ ولید نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ اوپر گردن کرتا، حیا پیچھے ہو گئی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اس کے سامنے آنے سے ڈرتی تھی، بس اس نے سکارف نہیں لے رکھا تھا۔

گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور ٹائروں کی رگڑ۔ حیا نے حیرت سے منڈیر کے سوراخ سے نیچے دیکھا۔ ولید کی گاڑی دور جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اتنا بزدل نکلا وہ؟ بس ایک پتھر سے ڈر گیا؟ اس کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔ یا شاید ہر بلیک میلر اتنا ہی بزدل، اتنا ہی کمزور اور اتنا ہی گھٹیا ہوتا ہے۔ ہونہہ۔

تنفس اور حواسوں کو قابو کرتی وہ واپس آئی۔ کمرے میں آکر اس نے لیپ ٹاپ پہ لگی تصویریں بند کر دیں۔ دل اتنا اچاٹ ہو گیا تھا کی سمجھ نہیں آرہی تھی کی کیا کرے۔ وہ بدنیت آدمی پتہ نہیں کب اور کس طرح اس کا پیچھا چھوڑے گا۔ کیا ساری زندگی وہ یہی کرتا رہے گا۔ وہ کب تک اس کو پتھر مار کر، بک جھک کر اپنے سے دور رکھے گی۔ کسی دن اگر وہ واقعی ان کے گھر پہنچ گیا اور وہ سی ڈی ابا یا کسی کو دکھا دی تو پھر نتائج کیا نکلیں گے۔ وہ اپنی عزت کھو دے گی، مقام کھو دے گی۔ ولید کے ہاتھ سے ملنے والی سی ڈی سب خراب کر دے گی۔

ارم اور ولید۔ ان دونوں کو اللہ کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ بے دلی سے بیڈ پہ آ کے بیٹھ گئی۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کیا کرے۔ باہر لاؤنج میں اماں اور پھوپھو کے ساتھ بھی بیٹھنے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ پھوپھو تو ویسے بھی ان دو دنوں میں سب کے سوالوں کے ہی جواب دے رہی تھیں۔ جہان نے کب، کیا اور کیسے جو کچھ کیا، اسے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اپنی طرف سے بم پھوڑ کر فارغ ہو چکی تھی۔ آگے پھوپھو جانیں اور ان کا بیٹا۔

جب دل زیادہ اداس ہوا تو وہ وضو کر کے آئی اور قرآن کھول کے بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ ہاں اس نے جہان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ روز قرآن پڑھے گی مگر ابھی تک نہیں پڑھ سکی تھی۔ اب وہ پڑھا کرے گی۔ مگر کہاں سے شروع کرے۔

بہر حال اس نے سورہ نور نکالی۔ یہ وہ سورت تھی جس نے ہر چیز شروع کی تھی۔ جس نے اسے ایک اور دنیا میں پہنچایا تھا۔ اب اسے ایک دفعہ پھر یہ پڑھنی تھی۔ ہاں عائشے کہتی تھی قرآن میں ہر چیز کا جواب ہوتا ہے۔ ہر دکھ کا مداوا، ہر پریشانی کی تسلی۔ ہر فکر کا حل۔ وہ سورہ نور پڑھنے لگی۔ آہستہ آہستہ دل پہ چھائی تنگی قرآن پہ لکھے سیاہ حروف سے کم ہونے لگی۔ سیاہ حروف، اس کا سیاہ موتی جو رومال میں رکھا تھا اور ساتھ کنکر بھی۔ اس کے دل میں دوسرے خیال آنے لگے۔ اس نے سر جھٹکا اور آیات پر توجہ دی۔

''وہ لوگ جو تم میں سے ایمان والے ہیں،

اور انہوں نے اچھے کام کیے ہیں،

اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے

کہ ان کو وہ ضرور زمین میں جانشین مقرر کرے گا

،جیسا کہ ان سے پہلوں کو مقرر کیا،

اور ان کے لیے جس دین کو پسند کیا ہے،

اسے ضرور مستحکم کرے گا،

اور ان کے خوف ضرور امن میں بدلے گا،

بس شرط یہ ہے کہ وہ میری عبادت کرتے رہیں

اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں!'' (النور ۵۵)

لمحے بھر کو کمرے میں روشنی سی ہوگئی۔ سونے کے چھٹنے سے ہر سو گرنے لگے تھے۔ نور تھا اوپر نور کے۔ وہ الفاظ بہت ہی خوبصورت، بہت ہی پُر امید تھے۔ کیا واقعی ایسا ہو سکے گا۔ کیا واقعی اسے اپنے دین کی ثباتی نصیب ہو سکے گی۔

کبھی کبھی قرآن کی باتیں اتنی پُر امید دکھائی دیتی تھیں کہ اپنی ناامید زندگی سے اسے ریلیٹ کرنا مشکل لگتا تھا۔ مگر مریم خانم نے کہا تھا کہ یقین سے مانگیں تو ضرور ملتا ہے۔ ایک دفعہ ان آیات پہ یقین کر کے تو دیکھے۔ کون جانے...

اس نے قرآن بند کر کے احتیاط سے بک شیلف پہ رکھا اور بیڈ پہ آ کے آنکھوں پہ بازو رکھے لیٹ گئی۔ ابھی وہ صرف سونا چاہتی تھی۔ تھکن بہت زیادہ ہو گئی تھی، بہت زیادہ۔

☆ ☆ ☆

صبح وہ اٹھی تو پہلا خیال ان آیات کا آیا تھا۔ ہاں کمرے میں اب صرف سورج کی روشنی تھی اور صبح کی ٹھنڈی ہوا۔ رات والی روشنی اب ادھر نہیں تھی۔

انسان اسی خیال کے ساتھ اٹھتا ہے جس کے ساتھ وہ سویا تھا۔ شاید اسی لیے انسان جس ایمان کے ساتھ مرے گا، اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ درمیان کا دورانیہ بے معنی تھا۔

وہ بال لپیٹتی باہر آئی۔ سارا گھر ابھی سو رہا تھا۔ لاؤنج اور کچن کے بیچ آدھی کھلی دیوار سے نور بانو کام کرتی نظر آ رہی تھی۔ پس منظر میں کوئی مانوس، غیر مانوس سی آواز آ رہی تھی۔

''نور بانو، ناشتہ!''

''میں نے نتاشا باجی کے لیے مینگو سلش بنایا تھا۔ آپ پئیں گی؟''

وہ سر ہلاتی ہوئی آگے آئی، کاؤنٹر سے گلاس اٹھایا اور سلش والے جگ کو اس میں انڈیلا۔ کوٹی ہوئی برف اور جوس کی دھار اس میں گرنے لگی۔ پھر وہ پاس رکھی کرسی پہ بیٹھی اور گلاس لبوں تک لے جاتے ہوئے یونہی سر اٹھایا۔ ایک لمحے کے لیے ساری دنیا ساکت ہو گئی۔

ہر شے ٹھہر گئی۔ بس ایک چیز تھی جو حرکت کر رہی تھی۔ گول گول دائرے میں گھومتی ہوئی، کانچ اور لکڑی کے ٹکرانے کی مدھم آواز۔ کانچ کی گلاب کی پنکھڑیاں۔ سلور راڈز۔

لبوں تک جاتا گلاس والا ہاتھ تیزی سے نیچے آیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں بے یقینی سے پھیلیں۔

لاؤنج اور کچن کی درمیانی دیوار کے عین اوپر اس کا ونڈ چائم ہوا سے جھول رہا تھا۔

''یہ...... یہ یہاں کیسے آیا؟ یہ کس نے لگایا؟'' اس نے حیرت و شاک سے نور بانو کی طرف دیکھا۔ کام کرتی نور بانو نے مڑ کر ونڈ چائم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اچنبھا ابھرا۔ پھر اس نے ناسمجھی سے نفی میں سر ہلایا۔

''مجھے نہیں پتہ باجی۔ میں نے تو ابھی دیکھا ہے۔''

"یہ تو میرا ہے۔ یہ تو ترکی میں مجھ سے گم گیا تھا۔ یہ یہاں کیسے آیا۔ یہ یہاں کس نے لگایا۔" وہ نور بانو سے کم اور خود سے زیادہ بات کر رہی تھی۔

نور بانو ہراساں سی ہو گئی۔ "میں تو پہلے ہی کہتی تھی باجی کہ ہمارے گھر میں جن ہیں۔"

مگر وہ سنے بغیر تیزی سے کچن سے باہر آئی۔ سیڑھیوں کے اوپر والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ سلش کا گلاس ہاتھ میں پکڑے ننگے پیر تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ پاؤں پہ لگے بینڈج اب کھل چکے تھے مگر زخموں کے نشان وہیں تھے۔

ایک، دو، تین، چار...... قدم جیسے زینوں پہ نہیں، اس کے دل پہ پڑ رہے تھے۔

سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

اسے نہیں پتہ وہ چند سیڑھیاں، چند صدیاں کیوں بن گئی تھیں۔

جیسے یہ فاصلہ کبھی ختم ہی نہیں ہوگا۔

وہ پھولے تنفس کے ساتھ اوپر آئی۔ اور دھڑ کتے دل سے اس آخری کمرے کا دروازہ دھکیلا۔

گیسٹ روم کے بیڈ پہ ایک کھلا ہوا بیگ رکھا تھا جس میں سے شرٹ نکالتے ہوئے وہ بیڈ کے ساتھ ذرا جھکا ہوا کھڑا تھا۔ آہٹ پہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

حیا چوکھٹ پہ سلش کا گلاس اٹھا کر کھڑی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جہان اسے دیکھ کر چند لمحے کچھ کہہ نہیں پایا، پھر دھیرے سے مسکرایا۔ شرٹ بیگ پر رکھی اور قدم قدم چلتا اس تک آیا۔ نیلی جینز اور سبز شرٹ میں وہ بہت فریش لگ رہا تھا۔

"مرحبا!" حیا سے چند قدم دور رک کر اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیتے ہوئے سلام کیا۔ حیا چند لمحے ویسی ہی ساکت نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اور پھر......

پھر اس کے ادھ کھلے لب بھنچ گئے، پیشانی کی رگ تن گئی اور حیرت زدہ آنکھوں میں یکا یک غصہ در آیا۔ ایک دم سے اس نے سلش سے بھرا گلاس جہان پہ پھینکا۔

"تم وہاں مرنے کے لیے مجھے چھوڑ گئے تھے۔ میں وہاں کتنی دفعہ مری ہوں، تمہیں پتہ ہی نہیں اور اب تم آ کر کہتے ہو مرحبا!" وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔

سلش جہان کی شرٹ پہ گرا تھا۔ وہ ایک دم پیچھے ہوا۔ پہلے اس نے اپنی شرٹ کو دیکھا اور پھر حیا کو، جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ حیا نے یہ کیا ہے۔ جیسے اسے یقین نہ آیا ہو کہ ایک دفعہ پھر حیا نے یہ کیا ہے۔

"حیا!" وہ لمحے بھر کے لیے کچھ بول ہی نہیں پایا۔

"کچھ مت کہو تم۔ تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو مجھے۔ بیوقوف ہوں جو میں نہیں سمجھتی کہ تم نے عائشے کو فون کر کے خود اپنی مخبری کروائی، تم نے اپنے آپ کو خود پکڑوانا چاہا۔ یا شاید پتہ نہیں تم وہاں گئے بھی تھے یا نہیں۔ میں نہیں جانتی وہاں کون تھا۔ مگر میں نے وہاں بارودی سرنگیں پھٹتے دیکھیں۔ میں نے وہاں پر گولیاں چلتے سنیں۔ میں نے وہاں پر دھواں دیکھا۔ میں نہیں جانتی وہاں پر کیا ہوا۔ مگر جو بھی ہوا اس کے پیچھے تمہارا ذہن تھا۔ میں جانتی ہوں جہان تم ہمیشہ چیزیں پلان کرتے ہو مگر تم نے کہا تھا کہ اس دفعہ تم کچھ پلان نہیں کرو گے لیکن تم نے کیا! کیا تھا اگر تم مجھے بتا دیتے۔ میں کتنا پریشان رہی، میں کتنی تڑپی۔ میں کتنی بے سکون رہی ہوں ان چند دنوں میں، اندازہ نہیں ہے تمہیں!"

وہ وہیں بیڈ کے کنارے پہ بیٹھی اور پھر ایک دم ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ جہان نے ایک دفعہ پھر گردن جھکا کر اپنی گیلی شرٹ کو دیکھا اور پھر فرش پہ گرے پلاسٹک کے گلاس کو۔ شکر ہے وہ پلاسٹک کا تھا سو ٹوٹا نہیں۔

"تم نے کیا کیا اس وقت، میں نہیں جانتی۔ مگر جو بھی کیا وہ بہت برا تھا۔ اگر وہاں میرے دل کو کچھ ہو جاتا، میں شاک سے ہی مر جاتی تو تم کیا کرتے۔ مگر تمہیں تو کوئی فرق ہی نہیں پڑتا!" وہ روتے روتے کہہ رہی تھی۔

''اگر تمہاری یادداشت ٹھیک سے کام کر رہی ہے تو تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے کہا تھا، فوراً وہاں سے چلی جانا۔ اگر تم نے سب کچھ دیکھا ہے تو اس کا مطلب ہے تم وہیں پر تھیں۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔''

حیا نے ایک دم سے گیلا چہرہ اٹھایا۔

''میں چلی بھی جاتی تو کتنا دور جاتی۔ چند میٹر دور ہی تو کھڑی تھی ہماری جیپ۔ کیا مجھے وہاں تک سرنگیں پھٹنے، دھماکے اور گولیوں کی آواز نہ آتی۔ وہ ایک تاریک خاموش رات تھی اور تم جانتے تھے کہ مجھے آواز آئے گی اسی لیے تم نے مجھے کہا تھا کہ میں سرحد تک نہ جاؤں۔ کیا تم واقعی سرحد کے پار گئے تھے۔ کیا پتہ تم گئے ہی نہ ہو۔ مجھے اب تمہاری کسی بات کا یقین نہیں رہا جہان۔''

کتنے دن وہ مضطرب، بے چین اور دلگیر رہی تھی اور اب کتنے مزے سے وہ آ کر کہہ رہا تھا۔ ''مرحبا!''

''یعنی کہ تم نے میری بات نہیں مانی۔ یعنی کہ تم ہمیشہ اپنی ہی مرضی کرتی ہو۔ اور اگر میں اپنی مرضی کروں تو تم غصہ کرتی ہو اور......'' جہان نے سر جھکا کر اپنی گیلی شرٹ کو دیکھا ''کیا کچھ رہ گیا ہے جو تم نے میرے اوپر نہیں توڑا تو ایک ہی دفعہ توڑ لو تاکہ یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔'' وہ خفگی سے بولا۔ حیا نے اس کی بھیگی شرٹ کو دیکھا۔ اسے ذرا بھی افسوس یا پچھتاوا نہیں تھا۔ فی الحال وہ اسی قابل تھا۔

''میں نے تمہیں کہا تھا کہ ترکی اور شام کا بارڈر سب سے آسان بارڈر ہے۔ میں نے تمہیں یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہمیں نہیں پکڑ سکتے جب تک ہم خود نہ چاہیں۔ آسان بارڈر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپ منہ اٹھا کر سرحدی باڑ سے چلے جائیں گے۔ آسان بارڈر کا مطلب یہ تھا کہ ایسے بارڈر پہ سرحدی فوج کو ڈاج دینا آسان ہوتا ہے۔'' وہ کہتا ہوا باتھ روم کی طرف گیا، چند ہی لمحوں بعد وہ شرٹ کا گریبان تولیے سے صاف کرتے ہوئے واپس آیا تھا۔

''ہم ترکی اور شام کا بارڈر اسی طرح کراس کرتے ہیں۔ کمانڈر شیعہ تھا اس لیے مجھے یہ چاہیے تھا کہ میں اسے ایران سے کال کرواتا اور ایران میں میرے پاس بہترین آپشن عائشے تھی۔ عائشے نے انہیں فون کر کے ایک ایسے کرمنل کا بتایا جسے وہ پکڑنا چاہ رہے تھے۔ حالانکہ وہ آدمی اس سے ہفتہ پہلے ہی ترکی سے شام جا چکا تھا۔ لیکن ان سیکیورٹی فورسز والے گدھوں کو نہیں معلوم تھا۔'' شرٹ صاف کر کے اس نے گردن کے اوپر جوس کے قطرے بھی اس نے تولیے سے پونچھے پھر سر اٹھا کر گلہ آمیز نگاہوں سے حیا کو دیکھا۔

''اور اگر تم کسی پر کچھ گرانے سے پہلے اس کی بات سن لیا کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ میں نے جس کرمنل کے بارے میں انہیں بتایا تھا وہ وہاں پر جا ہی نہیں رہا تھا۔ جو بندہ میری جگہ بارڈر سے اس پوسٹ تک گیا تھا اس کو پیسوں کی ضرورت تھی۔ جب وہ اسے پکڑ لیں گے تو چھ ماہ اسے جیل میں رکھیں گے اور پھر چھوڑ دیں گے اور ان چھ ماہ میں اس کے گھر والوں کا بہت اچھا گزارا ہو جائے گا۔ یہ صرف ایک diversion تھا جو اپنی طرف سے ہم سیکیورٹی فورسز کو دیتے ہیں تاکہ وہ مخبری کی گئی چوکی کی طرف اپنا فوکس رکھیں اور ایسے میں ان کی توجہ کسی قریبی چوکی سے ہٹ جایا کرتی ہے اور ہم ان کی اسی بے دھیانی کا فائدہ اٹھا کر بارڈر کے پار چلے جایا کرتے ہیں۔ ترکی اور شام کا بارڈر سب اسی طرح کراس کرتے ہیں۔ ایک بندہ پکڑواتے ہیں اور پوری کی پوری فیملی قریب ہی کہیں دوسری جگہ سے بارڈر کراس کر لیا کرتی ہے۔ اور جو بارودی سرنگ پھٹی وہ ان لوگوں سے بہت دور تھی۔ صرف افراتفری پھیلانے کے لیے کیا تھا میں نے یہ۔''

تو اسی لیے اس کے جوتوں کا رخ بائیں طرف تھا، وہ بارڈر کی طرف جا ہی نہیں رہا تھا، اس نے جانا ہی بائیں طرف تھا۔ کچھ نہ کچھ تو تھا جو جہان نے اسے سکھایا تھا۔ مگر اس سیکھی ہوئی بات کو وہ پہلے اپلائی کر لیتی تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔

''اگر میں تمہیں بتا دیتا کہ وہاں پر سیکیورٹی فورسز والے تیار ہیں، بارودی سرنگ پھٹے گی، گولیاں چلیں گی، تو کیا تم مجھے وہاں جانے دیتی؟ تم پریشان ہو جاتی۔ تم اتنے دن پریشانی میں گزارتی کہ کہیں میرا diversion ناکام تو نہیں ہو گیا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ سیکیورٹی فورسز والوں کو اندازہ ہو گیا ہو اور انہوں نے آس پاس کی فورس بڑھا دی ہو۔ تم اسی طرح کی باتیں سوچتی رہتی اور پریشان ہوتی۔ اسی لیے میں نے تمہیں نہیں بتایا۔ مگر نہیں، وہ حیا سلیمان ہی کیا جو میری بات مان لے، جو اپنی عقل سے بے عقلی والے کام نہ کیا کرے۔'' گیلے تولیے کو صوفے کی پشت پہ ڈالتے ہوئے وہ برہمی سے کہہ رہا تھا۔

حیا نے بھیگے رخسار ہتھیلی کی پشت سے صاف کیے۔

''اور وہ لڑکی کون تھی جس کے ساتھ ایک دفعہ ابا نے تمہیں دیکھا تھا؟ اب مت ظاہر کرنا کہ تمہیں یاد نہیں ہے!''

''وہ...... ہاں وہ...... عائشے تھی!''

''عائشے تم سے کبھی اتنی بے تکلف ہو ہی نہیں سکتی، سچ بتاؤ!''

''نہیں، ان فیکٹ، مجھے یاد آیا، وہ میری سیکرٹری تھی، دیمت۔'' اور وہ جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اصل بات کبھی نہیں بتائے گا۔ اب بھی کچھ باتیں تھیں جو وہ اسے نہیں بتاتا تھا۔ مگر فی الوقت وہ اسے کچھ بتانا چاہتی تھی۔

''میں وہاں تمہارے لیے گئی تھی جہان، میں ترکی تمہارے لیے گئی تھی۔''

جہان کے خفا چہرے کے تنے ہوئے نقوش ذرا ڈھیلے پڑے اور پھر ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آ گئی۔

''ویری گڈ۔ میں یہی سننا چاہتا تھا!'' وہ بہت محظوظ ہوا تھا۔ ''میں ہمیشہ سے جانتا تھا کی تم وہاں کپادوکیہ دیکھنے کے لیے نہیں آئی۔''

''کپادوکیہ کی بات کون کر رہا ہے جہان۔'' اس نے اکتا کر ٹوکا۔ ''تمہیں اچھی طرح پتہ ہے کہ تم نے مجھے کپادوکیہ خود بلایا تھا ورنہ تم کبھی مجھ سے ماہ سن والی بات نہ کہتے۔ تم چاہتے تھے کہ میں وہاں آؤں۔ لیکن میں کپادوکیہ کی بات کر ہی نہیں رہی۔'' وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی اور جب بولی تو اس کی آواز پہلے سے ہلکی تھی۔

''میں ترکی تمہارے لیے گئی تھی جہان۔ میں نے سبانجی کا سکالرشپ تمہارے لیے لیا تھا۔ میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔ میں تم سے ان سارے گزرے ماہ وسال کا حساب لینا چاہتی تھی جن میں میں نے تمہارا انتظار کیا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناکہ میں نے تمہارا نام کب سنا میں نہیں جانتی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تمہارا نام ہمیشہ میرے نام کے ساتھ رہا تھا۔ اب تم اس کو محبت کہو یا جو بھی کہو مجھے نہیں پتہ۔ میں بس اتنا جانتی ہوں کہ نہ میں تمہارے بغیر رہ سکتی ہوں نہ تم میرے بغیر رہ سکتے ہو میجر احمد!'' آخر میں وہ بھیگی آنکھوں سے مسکرائی۔ جہان نے ایک دم سے اسے دیکھا اور پھر دروازے کو۔

''آہستہ بولو کوئی سن لے گا۔'' حیا کی مسکراہٹ ذرا سی سمٹی۔ بے اختیار اس نے تھوک نگلا۔ اف ایک بات تو رہ ہی گئی......

''سن بھی لے گا تو کیا ہوگا۔'' انجان بنتے ہوئے اس نے شانے جھٹکے۔

''میں نہیں چاہتا ابھی کسی کو پتہ چلے، سمجھا کرو نہ۔'' وہ ذرا سا جھنجھلایا تھا۔

''اس روز جب تایا فرقان وغیرہ تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے اور تمہیں الزام دے رہے تھے تو میں نے......'' وہ ذرا سی کھنکاری۔ ''میں نے ہر چیز بتا دی ان کو۔'' بات کے اختتام پہ اس نے جہان کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے اچنبھا اترا اور پھر......

''تم نے سب کو کیا بتا دیا؟'' وہ بری طرح سے چونکا۔

''وہی جو سچ تھا۔ وہی جو تمہیں بہت پہلے ان کو بتانا چاہیے تھا مگر تم میں ہمت ہی نہیں تھی سو میں نے سوچا تھوڑی سی ہمت میں کر لوں اور میں نے بتا دیا، بس!'' وہ جتنی لاپرواہی سے کہہ رہی تھی اس کے دل کی تیز ہوتی دھڑکن اس کے برعکس تھی۔ جہان کس طرح ری ایکٹ کرے گا اس پہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ تب یقین جو نہیں تھا کہ وہ آ جائے گا۔

''مگر تم نے ایسا...... اف حیا...... اف......'' اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہے۔ وہ متفکر سا نظر آنے لگا تھا۔

''پتہ نہیں اب سب کیسے ری ایکٹ کریں گے۔ ایک دفعہ پھر نیا ایشو۔ میں مزید ایشو افورڈ نہیں کر سکتا۔'' وہ جھنجھلایا تھا۔

''تمہیں کس نے کہا ہے کہ وہ ایشو بنائیں گے۔ وہ کوئی ایشو نہیں بنائیں گے جہان۔ تمہیں شاید ایک بات نہیں پتہ۔'' اس کے دل کی دھڑکن نارمل ہوئی اور جھک کر فرش سے پلاسٹک کا گلاس اٹھایا۔ پھر سیدھی ہو کر مسکراتے ہوئے بولی ''تمہیں دنیا کی ہر تہذیب، ہر ملک، ہر علاقے کا پتہ ہوگا۔ تمہیں بہت سی زبانیں آتی ہوں گی۔ مگر ایک جگہ تم غلطی کر گئے ہو۔ تم پاکستان میں کم رہتے ہو نا، تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ہم پاکستانی بھلے مارشل لاء کے جتنے بھی خلاف ہو جائیں، ہمیں اپنے جرنیلوں، ڈکٹیٹر سے کتنے ہی شکوے کیوں نہ ہوں، ہم ان کی پالیسیز سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ کریں مگر ایک بات ہمیشہ سے طے ہے کہ ہم اپنی فوج سے واقعی محبت کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔''

جہان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کے متفکر چہرے پہ ذرا سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

''اور کیا اس 'ہم' میں تم بھی شامل ہو؟''

''یہ ایک پہیلی ہے اور اس کا جواب تمہیں خود ڈھونڈنا ہوگا۔ اب تم کام کرو اور میں ذرا عائشے کو بتا دوں کہ تم واپس آ گئے ہو۔''

''کون عائشے؟'' وہ جیسے بہت الجھ کر بولا۔ وہ ٹھہر گئی، ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔

''میرا مطلب تھا، پھوپھو کو بتا دوں۔ آف کورس، تمہاری طرح میں بھی کسی عائشے کو نہیں جانتی!''

جہان نے اثبات میں سر ہلایا، یعنی اب اسے ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی ہوگی۔ عائشے، بہارے کا باب بند ہو گیا تھا۔

''کیا اب تمہیں کہیں جانا ہوگا یا تم گھر پہ رہو گے؟''

''کیوں نہیں جانا ہوگا۔ آج تو ویسے بھی میرا یوم قیامت ہے۔ یوم حساب۔ ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا۔ ان تین سال کا حساب دیتے ہوئے بھی ایک عمر نکل جائے گی۔'' وہ واپس بیگ کی طرف مڑنے لگا مگر ایک دفعہ پھر اپنی گیلی شرٹ کو دیکھ کر رکا۔

''اور..... یہ آخری دفعہ ہوا ہے..... ٹھیک!'' اس نے حیا کے ہاتھ میں پکڑے گلاس اور اپنی گیلی شرٹ کو دیکھتے ہوئے تنبیہہ کی۔ حیا نے بڑی مشکل سے مسکراہٹ اپنے لبوں پہ روکی۔

''آئم سوری۔ بس میں غصے میں آ گئی تھی۔''

پھر اپنی مسکراہٹ چھپاتی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ جو پہلی چیز اس نے جہان پہ گرائی تھی وہ بھی سلش ہی تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ آج کا گرایا ہوا سلش وہ آخری چیز ہوگی جو اس نے جہان پہ گرائی ہے یا نہیں، البتہ یہ طے تھا کہ اتنی آسانی سے تو وہ اپنی عادت نہیں چھوڑنے والی۔

☆ ☆ ☆

سارے گھر میں خوشیاں اتر آئی تھیں۔ وہ خوشیاں جن کا اس نے بہت انتظار کیا تھا۔ پچھلے سال دسمبر میں سبانجی کے میل کے بعد ان چھ سات ماہ میں پہلی دفعہ وہ دل سے خوش ہوئی تھی۔ بہت مشکل سے یہ خوشی اس کو ملی تھی اور وہ اس کو پورا پورا جینا چاہتی تھی۔

ابا اور پھوپھو نے فیصلہ کیا تھا کہ جہان اور اس کی 'منگنی' کا فنکشن بھی روحیل اور رنتاشا کے ولیمے کے ساتھ رکھا جائے یعنی اسے بھی دلہن بننا تھا۔ ہاں رخصتی اس کی ڈگری ختم ہونے کے بعد ہی کی جائے گی۔ فنکشن اس سنڈے کو تھا اور جب سے یہ ڈیسائڈ ہوا تھا، سارے گھر میں افراتفری اور رونق سی لگ گئی تھی۔ جہان زیادہ تر گھر سے باہر رہتا لیکن جب بھی آتا اس کا استقبال ہمیشہ احترام اور عزت سے کیا جاتا۔ اس کی توقع کی برعکس تایا ابا، ابا، صائمہ تائی نے اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کوئی گلہ یا کوئی طعنہ نہیں دیا تھا۔ جس نے پوچھنا تھا، پھوپھو سے پوچھ لیا تھا۔ شاید اس سے پوچھنے کی کسی میں ہمت ہی نہیں ہوئی۔ تایا فرقان میں بھی نہیں۔

وقت بھی کیسے بدل جاتا ہے!

ہاں البتہ وہ اس سے اس کی جاب کے بارے میں، اس کی کیریئر کے بارے میں اور اس کے آنے والے کاموں کے بارے میں ضرور پوچھا کرتے تھے اور وہ ان کے سامنے بیٹھا دھیمے لہجے میں مختصر سے جواب دے رہا ہوتا تھا۔ ایک لحاظ سا تھا جو سب نے اپنے اور اس کے درمیان کھڑا کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ اس سب سے خوش بھی تھا یا نہیں۔ مگر وہ بہت خوش تھی۔

اس وقت بھی کچن میں بیٹھے مہمانوں کی لسٹ بناتے ہوئے وہ مسلسل خود ہی سے مسکرا رہی تھی۔ اس کے مقابل چیز کیک کے آمیزے میں چمچ ہلاتی ارم نے وزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''تم نے فنکشن کا جوڑا لے لیا؟'' جب ارم سے اس کی مسکراہٹ سہی نہ گئی تو اس نے پوچھ ہی لیا۔ اسے فاطمہ سے اسپیشل چیز کیک کے لیے بلوایا تھا کیونکہ وہ فیملی میں سب سے اچھا چیز کیک بناتی تھی۔

اس کی بات پہ حیا ذرا سی چونکی، پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''آرڈر تو دے دیا تھا مگر ابھی پک نہیں کیا۔''

''ہاں ویسے کافی لکی ہو تم۔ ہے نا؟'' ارم نے چمچ گول گول ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کتنی آسانی سے بیٹھے بٹھائے اتنا ہینڈسم شو

تمہیں مل گیا۔"

بیٹھے بٹھائے؟ حیا نے تعجب سے سوچا پھر دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے پاؤں پہ زخموں کے نشان ابھی موجود تھے۔ بیٹھے بٹھائے تو کچھ بھی نہیں ملتا۔ ارم نہیں جانتی تھی کہ اس خوشی کو پانے سے پہلے وہ کتنے صحرا ننگے پاؤں آبلہ پا چلی تھی۔ وہ کتنا جلی تھی، کتنا سہا تھا اس نے۔ ارم تو کچھ بھی نہیں جانتی تھی مگر اسے جتانا بے کار تھا۔ اس فنکشن اور اس کی گہما گہمی میں حیا اتنی خوش تھی کہ اس نے ویڈیو والی بات کو دوبارہ نہیں چھیڑا تھا۔ شاید ارم اب جہان کے آنے کے بعد احساس کر کے خود ہی وہ ویڈیو واپس لے لے۔ شاید کچھ نہ کچھ وہ کر لے۔

لاؤنج میں پھوپھو اور اماں ولیمے کے انتظامات ڈسکس کر رہی تھیں۔ حیا کے لبوں پہ پھر سے مسکراہٹ اُمڈ آئی۔

"اماں! سناشا آ گئی شاپنگ سے؟"

"ہاں ابھی ابھی آئی ہے ساڑھی لے کر۔ مجھے دکھا کر اندر رکھنے گئی ہے۔" فاطمہ نے ہلکا سا سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ روحیل کا کمرہ اوپر تھا۔ البتہ فاطمہ کے چہرے پہ ناخوش سا تاثر تھا۔

"حیا جاؤ سناشا کو بلا لاؤ۔ پھوپھو کو بھی دکھا دے ساڑھی۔ تمہاری پھوپھو اندر تھیں جب وہ مجھے دکھا رہی تھی۔" اماں نے یاد آنے پہ اسے پکارا۔ ان کے چہرے پہ البتہ دبی دبی سی کڑھن تھی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔ پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے وہ چین کا غذ وہیں چھوڑ کر اٹھی گئی۔

جہان کا کمرہ سیڑھیوں سے اوپر راہداری میں ایک کونے پہ تھا تو روحیل کا دوسرے کونے پہ۔ وہ آخری زینہ چڑھ کے اوپر آئی تو دیکھا جہان اور سناشا، روحیل کے کمرے کے سامنے کھڑے ہنستے ہوئے کچھ بات کر رہے تھے۔ سناشا کے ہاتھ میں تین چار بڑے بڑے شاپنگ بیگز تھے اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر خالص امریکی انداز میں تیز تیز بولتی کچھ بتا رہی تھی۔ اتنے فاصلے سے آواز تو نہیں آ رہی تھی وہ کیا کہہ رہے تھے مگر خوش مزاجی، شناسائی..... اس کے ابرو تن گئے (اتنے ہنس کر کبھی مجھ سے تو بات نہیں کی۔ ہونہہ!)

"سناشا!" اس نے پکارا۔ دونوں نے بے اختیار اسے مڑ کر دیکھا۔ جہان استقبالیہ انداز میں ذرا سا مسکرایا مگر وہ ایک ناراض نگاہ اس پہ ڈال کر آگے آئی۔

"سناشا! اماں بلا رہی ہیں۔ پھوپھو کو کپڑے دکھا دو۔"

"اوکے"۔ سناشا نے ایک نظر جہان کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا اور نیچے چلی گئی۔ وہ چبھتی ہوئی نگاہوں سے سناشا کو دیکھتی ہوئی جہان کی طرف پلٹی۔

"کیا بات ہو رہی تھی اپنی بچپن کی سہیلی سے؟"

وہ ذرا سا ہنس دیا۔

"نہیں بھئی میں تو تمہاری وجہ سے اتنا خوش اخلاق ہو رہا تھا۔ تمہاری بھابھی ہے نا!"

"میری وجہ سے تم کچھ نہیں کرتے اور اگر کچھ کرنا ہے تو شام میرے ساتھ فنکشن کے کپڑے لینے آ جاؤ۔ اگر تمہیں نہیں پسند ہوئے تو بدل لیں گے۔" سناشا کو بھول کر اسے کپڑوں کی بات یاد آ گئی تھی۔

"ایک تو پتہ نہیں ہماری منگنی کتنی دفعہ ہوگی۔" وہ اس فنکشن کے آئیڈیا سے اکتا جاتا تھا۔

"اب ہو رہی ہے تو ہونے دو نا۔ کیا تم آج شام چلو گے؟"

"نہیں شام میں ذرا بزی ہوں، کل چلوں گا۔ پرامس۔"

وہ نیچے آئی تو پھوپھو اکیلی بیٹھی تھیں۔ اماں وہاں نہیں تھیں نہ ہی سناشا۔

"سناشا صائمہ بھابھی کی طرف گئی ہے انہیں شاپنگ دکھانے۔ تمہاری اماں لان میں ہیں۔" اس کے پوچھنے پہ پھوپھو نے بتایا تھا۔ "اوکے" اس نے سر پہ دوپٹہ لیا اور پورچ کی طرف کھلتے دروازے کی طرف آئی۔ پٹ ذرا سا کھولا تو برآمدے میں فاطمہ اور روحیل روبرو کھڑے نظر آئے۔ فاطمہ غصے اور خفگی سے روحیل سے کچھ بحث کر رہی تھیں اور وہ آگے سے کچھ کہنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

''یہ پہن کر جائے گی وہ ولیمے میں؟ حد ہوتی ہے روحیل۔ وہ گھر میں کیا کیا پہنے نہیں پھرتی، میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اور تمہارے ابا کو بُرا نہیں لگتا۔ مگر اس فنکشن میں ہزاروں لوگ ہوں گے روحیل۔ کچھ احساس ہے تمہیں؟''

''مگر اماں ایسا کیا.....'' مگر اماں اس کی نہیں سن رہی تھیں۔

''شلوار قمیص، لہنگا کچھ لے لیتی۔ بھلے سر پہ دوپٹہ نہ لیتی تب بھی خیر تھی۔ مگر یہ سلیولیس، بیک لیس بیہودہ سی ساڑھی اٹھا کر لے آئی ہے تمہاری بیوی۔ ہمارے خاندان میں کبھی ایسا لباس پہنا ہی کسی نے؟''

''اماں کیا ہو گیا ہے۔ حیا بھی تو سلیولیس پہن لیتی تھی۔'' اور اماں کے تو مانو سر پہ لگی، تلووں پہ بجھی۔

''میری بیٹی کا نام مت لو!''۔ وہ ایک دم غصے میں آ گئی تھیں۔ ''میری بیٹی جب گھر سے نکلتی ہی تو عبایہ پہن کر، چہرہ ڈھانپ کر نکلتی ہے۔ خاندان میں کوئی نہیں ہے جو میری بیٹی کے برابر کا ہو۔''

''مگر اماں پہلے تو حیا بھی.....''

''پہلے کی بات مت کرو روحیل۔ ہم حیا کی بات کر بھی نہیں رہے۔ ہم تمہاری بیوی کی بات کر رہے ہیں۔!''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں بات کروں گا اس سے۔'' وہ جیسے جان چھڑانے والے انداز میں بولا تھا۔ مگر اماں کنونس نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اور بھی کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھیں مگر حیا دبے قدموں واپس پلٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ دل بھر آیا تھا۔

ابھی کل ہی تو جب وہ شاپنگ پہ جانے کے لیے ڈھلے کپڑوں میں سے عبایا ڈھونڈ رہی تھی تو اماں جھنجھلا کر کہہ رہی تھیں کہ ہر وقت اتنا برقع کانشس ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کی غیر موجودگی میں اماں اس کے بارے میں کچھ اور کہہ رہی تھیں۔

دل سے تسلیم کر لینے اور زبان سے اعتراف کر لینے میں فرق ہوتا ہے، اور وہ فرق اماں پاٹ نہیں سک رہی تھیں۔

وہ واپس کچن کی طرف آئی جہاں ارم بیٹھی ابھی تک آمیزے کے ساتھ لگی تھی۔ نتاشہ بھی اسی پل شاپنگ بیگز اٹھائے سیڑھیاں چڑھتی دکھائی دی تھی۔

☆ ☆ ☆

حیا نے کاؤنٹر پہ رکھے ڈبے کے ڈھکن کو بند کرنے سے پہلے ایک دفعہ جوڑے کو دیکھا اور پھر جہان کے چہرے کو۔

''کیسا لگا تمہیں؟؟''۔ اس نے ذرا اشتیاق، ذرا فکرمندی سے پوچھا۔ پتہ نہیں اس کا ٹیسٹ جہان کو اچھا بھی لگتا ہے یا نہیں۔

''ہاں اچھا ہے.....'' وہ شاپ میں شاید اس سے زیادہ تبصرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس ذرا سے شانے اچکائے۔

حیا نے ایک دفعہ پھر اس تہہ شدہ جوڑے کو دیکھا۔ حالانکہ منگنی اور نکاح جیسے موقعوں پہ لڑکیاں لائٹ پنک، پستہ گرین یا ہلکی نیلا پہننا پسند کرتی تھیں۔ پھر بھی اس نے یہ رنگ منتخب کیا تھا۔

وہ لمبا گھیر دار پاؤں تک آتا فراک تھا، ساتھ چوڑی دار پاجامہ۔ سارا لباس ایک ہی رنگ میں تھا۔ گرے کلر۔ اور گرے کا بھی درمیانہ سا شیڈ۔ نہ بہت ہلکا، نہ بہت گہرا۔ پورے فراک پر dimontes اور سفید موتیوں کا کام تھا۔

گرے اور سلور کا کامبینیشن۔

پھوپھو اس کو وائٹ گولڈ اور ڈائمنڈ کا سیٹ دے رہی تھیں اور اس کی مناسبت سے اس کو یہ رنگ سب سے بہترین لگا تھا۔

حیا نے ڈبہ بند کیا اور اسے شاپنگ بیگ میں ڈالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جہان اس کے پیچھے چلتا ہوا باہر آیا۔

''کیا تمہیں واقعی پسند آیا۔ تمہارے چہرے سے تو نہیں لگ رہا تھا؟'' گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ ذرا متفکر سی بولی۔

''نہیں مجھے واقعی پسند آیا۔ بہت اچھا کلر تھا لیکن.....'' اگنیشن میں چابی ڈالتے ہوئے جہان نے ذرا سے شانے اچکائے۔

''لیکن میں صرف یہی سوچ رہا ہوں کہ.....''

''کہ کیا؟'' وہ جانتی تھی کہ وہ بات کو کس طرف لے کے جا رہا ہے پھر بھی اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ تم اس لباس کے ساتھ..... میرا مطلب ہے تم اپنا پردہ کیسے کیری کرو گی دلہن بن کر۔'' وہ شاید کافی دیر سے یہی سوچ

تھا۔ حیا کے لبوں پر ایک ہلکی سی اسرار بھری مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

''کرلوں گی۔'' گاڑی اب سڑک پہ دوڑ رہی تھی اور وہ ذرا سا مسکراتے ہوئی ونڈ سکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔

''کیا تم اس کامدار لباس کے اوپر برقع لوگی یا چادر وغیرہ؟''

''نہیں میں برقع نہیں لوں گی۔''

''تو تم کیا اس کے کام والے ڈوپٹے سے نقاب کروگی؟'' جہان کو کہتے ہوئے بھی یہ بات بہت عجیب سی لگ رہی تھی، بہت ہی آکورڈ۔ نقاب نہیں، کامدار دوپٹے سے نقاب۔ اور اسے شاید لگا تھا کہ حیا آگے سے اس کی بات کی تصدیق کردے گی۔

''نہیں میں دوپٹے سے نقاب تو نہیں کروں گی۔''

''تو پھر تم کیا کروگی؟''

حیا نے آنکھوں میں اسی مسکراہٹ کو سموئے گردن موڑ کر جہان کو دیکھا۔ وہ جیسے اس بات پہ بہت سوچنے کے باوجود بھی کسی نتیجے پہ نہیں پہنچ سکا تھا۔

''جہان، کچھ باتوں میں میں تم سے زیادہ سمارٹ ہوں۔ تم ہی نے تو کہا تھا نا کہ رستہ ہوتا ہے۔ میں نے بھی رستہ نکال لیا ہے!''

''اچھا چلو دیکھتے ہیں تم کیا کرتی ہو!'' وہ اس کی بات پر محظوظ ہو کر ذرا سا مسکرایا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ گاڑی گھر کی بجائے کسی اور جانب جا رہی ہے۔

''کیا ہم گھر نہیں جا رہے؟'' اس نے ذرا تذبذب سے پوچھا۔

''پہلے ہمیں کچھ اٹھانا ہے۔ میں نے ایک بیکری پہ کچھ آرڈر کیا تھا!'' وہ اسٹیرنگ ویل گھماتے ہوئے موڑ کاٹ رہا تھا۔ حیا کو اچھنبا ہوا۔ باہر رات ہو چکی تھی اور ان لوگوں نے ڈنر پر گھر پہنچنا تھا۔

''ایسا کیا آرڈر کیا تھا تم نے؟''

''شاید تمہیں یاد ہو میں نے تمہارا ایک جنجر بریڈ ہاؤس توڑا تھا۔'' اور حیا کا سانس لمحے بھر کے لیے تھما۔

''کیا تم نے میرے لیے جنجر بریڈ ہاؤس بنایا ہے؟'' وہ حیرت زدہ ہی تو رہ گئی تھی۔

''تمہیں لگتا ہے میں اتنا فارغ ہوں؟ میں نے صرف ایک بیکری پر آرڈر دیا ہے اور اب ہم نے اسے پک کرنا ہے۔ کل ہماری منگنی تیسری دفعہ ہو رہی ہے، سو اس سے پہلے مجھے یہ حساب برابر کرنا ہے۔'' مسکراہٹ دباتے ہوئے وہ بولا تھا۔

''لیکن تم نے خود تو نہیں بنایا نا!''

''مگر پیسے تو میں ہی دے رہا ہوں نا۔'' اور یہ بات کرتے ہوئے اس 'غریب آدمی' کے چہرے پہ خفگی سمٹ آئی۔ حیا بے ساختہ گردن موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ جہان اس کی آنکھوں میں آتی مسکراہٹ کو دیکھ پائے۔

اس بیکر نے بہت محنت سے جنجر بریڈ ہاؤس بنایا تھا۔ وہ اتنا ہی پیارا تھا جتنا حیا کا اپنا جنجر بریڈ ہاؤس۔ یا پتہ نہیں کیوں اسے لگا کہ یہ والا ہاؤس زیادہ پیارا تھا۔

کاؤنٹر پہ ٹرے میں رکھا وہ خوبصورت سا ہاؤس جس کے اوپر الا بلا کینڈیز، جیلی اور آئسنگ سے ڈریسنگ کی گئی تھی۔

''نہیں اس کو پیک نہ کریں، یہ ٹوٹ جائے گا۔ بہت نازک ہے۔ میں اس کو یونہی اٹھالوں گی۔'' حیا نے احتیاط سے جنجر بریڈ ہاؤس والی ٹرے اٹھالی۔ کپڑوں والا شاپر تو ویسے ہی گاڑی میں پڑا تھا۔ اب وہ ٹرے کو اسی طرح اٹھائے گھر لے جانا چاہتی تھی۔

''اگر اس دفعہ یہ ٹوٹا تو یہ تمہاری غلطی ہوگی۔'' جہان نے باہر نکل کر اسے تنبیہہ کی تھی۔ وہ جواب دیے بنا سج سج کر چلتی گاڑی تک آئی۔

پھر سارا رستہ وہ ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے رہی تھی۔ ہاتھ دکھنے لگے تھے مگر اس نے ذرا بھی بداحتیاطی نہیں کی تھی۔ یہ جنجر بریڈ

ہاؤس اسے اپنے والے سے زیادہ پیارا تھا۔

گاڑی گھر کے پورچ میں رکی تو جہان جلدی سے باہر نکلا اور اس کی طرف کا دروازہ کھولا۔ یقیناً یہ عنایت اس جنجر بریڈ ہاؤس کے لیے تھی بلکہ اپنے پیسے ضائع نہ ہونے کے لیے۔

وہ ٹرے اٹھائے باہر نکلی۔ جہان نے پچھلے سیٹ پہ پڑا اس کا شاپر اٹھالیا۔

''چلیے مادام! آپ کے کپڑے ڈرائیور لے آئے گا!'' وہ مصنوعی بیچارگی سے کہتا راستہ چھوڑ کر اسے آگے جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ حیا کے لبوں پر مسکراہٹ امڈ آئی۔ ابھی وہ چند قدم ہی چل پائی تھی کہ جہان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''یہ گاڑی کس کی ہے؟ شاید کوئی مہمان آیا ہے۔'' اس بات پہ حیا نے گردن موڑ کے دیکھا۔ پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کے آگے کھڑی گاڑی...... اور پیروں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی تھی۔

اس سیاہ اکارڈ کو وہ ہزاروں گاڑیوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

''پپ...... پتہ نہیں۔'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ ٹرے پہ جمے اس کے ہاتھ مزید سخت ہوئے۔

جہان کچھ کہے بنا شاپنگ بیگ پکڑے اس کے آگے آگے اندر گیا۔ وہ جہان کے پیچھے پیچھے اندر آئی۔ ایک ایک قدم بہت بھاری ہو رہا تھا۔

لاؤنج کے دہانے پہ ہی سارا منظر دکھائی دے دیا تھا۔ اس کے قدم چوکھٹ سے ذرا پیچھے جم گئے۔ وہ تاریک گوشے میں کھڑی تھی، اندر والے لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

وہاں ولید ایک صوفے پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ سامنے ابا، اماں، تایا، صائمہ تائی، روحیل، تناشا، پھوپھو داور بھائی، سونیا...... سب ہی تھے۔ سونیا تو چلو شادی شدہ تھی سو خاندان کی روایت کے مطابق اس کا پردہ نہیں تھا مگر اچنبھے کی بات یہ تھی کہ ارم بھی وہیں کونے میں کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جیسے شاید وہ کچھ سرو کرنے کے بہانے اندر آئی ہو اور پھر وہیں کھڑی ہوگئی ہو۔

جہان آگے آیا، ایک نظر ان سب کو دیکھا اور پھر ''ایک منٹ'' کہہ کر شاپنگ بیگ کی طرف اشارہ کیا جیسے انہیں رکھنا ہے اور سیڑھیاں چڑھتا گیا۔

وہ وہیں اکیلی کھڑی رہ گئی۔ ٹرے کو پکڑے اس کے ہاتھ پسینے میں بھیگ گئے تھے۔

ولید نے جہان کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تو گردن اس طرف موڑی۔ حیا کو دیکھتے ہوئے ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے منہ پہ امڈ آئی۔ وہ کچھ مسرور سا واپس ان سب کی طرف مڑا جو ابھی تک الجھی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''جی سلیمان انکل تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمیں اس معاملے پہ آرام سے بات کرنی چاہیے اور مس حیا۔ سوری مسز حیا تو یہ جانتی ہیں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔'' اس نے بات کر کے پھر سے گردن موڑ کر ایک فاتحانہ نظر حیا پہ ڈالی تھی۔ ابا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں حیا کو دیکھا اور پھر انہیں الجھی نگاہوں سے ولید کو۔

''ولید یہ میرا گھر ہے۔ یہاں اس طرح کے معاملے ڈسکس کرنے کا کیا مطلب ہے؟'' ابا کو جیسے اس کا آنا اور یہ سب کہنا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ روحیل، تایا ابا سب کے ماتھے پہ بل تھے جیسے کسی کو یہ پسند نہیں آرہا۔

''بات گھر کی تھی اسی لیے میں نے سوچا گھر میں کر لی جائے۔ جو چیز میرے پاس ہے اسے دیکھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ آپ لوگ اتنی آسانی سے میرے شیئرز سیل نہیں کر سکتے۔''

''ولید یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔'' داور بھائی ناگواری سے کہتے اٹھنے لگے۔ روحیل بھی برہمی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ارم اسی طرح کونے میں کھڑی تھی۔ شاید اسے کسی نے جانے کے لیے نہیں کہا تھا یا شاید کہا ہو تب بھی وہ کھڑی ہوگئی تھی۔ وہ غالباً سارا تماشا دیکھنا چاہتی تھی۔

اس سارے میں اگر کوئی بڑے مزے سے بیٹھی، کوک کے کین سے گھونٹ گھونٹ بھر رہی تھی تو وہ تناشا تھی۔ ہر فکر سے بے نیاز،

ہر چویشن کو انجوائے کرتی ہوئی۔

''داور تم اسے ضرور دیکھنا چاہو گے۔ آخر اس کا تعلق تمہاری ہی شادی کے فنکشن سے ہی تو ہے۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا اور حیا کی طرف دیکھ کر اپنی جیب سے ایک پلاسٹک ریپر نکالا جس میں رکھی سی ڈی صاف نظر آ رہی تھی۔

''کیا میں اس کو چلا دوں؟'' اس نے سی ڈی حیا کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔

سب لوگ اس بات پر مڑ کر حیا کو دیکھنے لگے تھے۔ وہ جو ساکت سی کھڑی بنا پلک جھپکے اسے دیکھ رہی تھی، اس بات پر بے اختیار اس کے قدم پیچھے ہٹے۔ کمر دیوار سے جا لگی۔ ہاتھ میں پکڑی ٹرے بہت وزنی ہو گئی تھی۔

''جو بات کرنی ہے ابا سے کرو۔'' روحیل برہمی سے بولا تھا۔ اس کی بات کو ولید نے جیسے سنا ہی نہیں۔

اسی لمحے جہان خالی سیڑھیاں اترتا دکھائی دیا۔

''جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔ ہاں بولو، کیا مسئلہ ہے؟'' وہ جیسے اب فارغ ہو کر بہت سنجیدگی سے کہتا، ولید کے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔

حیا نے امید سے جہان کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً سمجھ جائے گا کہ یہ وہی ویڈیو ہے۔ وہ ابھی ولید کو کچھ دے مارے گا، یا سی ڈی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا، اسے پوری امید تھی۔

اس کی بات پہ ولید کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ''یہ شو ٹائم ہے اور تم تو اس شو کو ضرور دیکھنا چاہو گے۔'' بات کے اختتام پہ ولید نے پھر حیا کو دیکھا۔ اس کا بار بار حیا کو دیکھنا سب کو الجھن اور عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر رہا تھا۔

''کیا ہے اس سی ڈی میں؟'' جہان نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا البتہ آنکھوں میں ذرا سی الجھن تھی۔

وہ نہیں سمجھا تھا۔

اللہ اللہ۔ وہ نہیں سمجھا تھا!

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

جہان نہیں سمجھا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی، چلانا چاہتی تھی۔ جہان اس سے مت پوچھو، پلیز جہان، اسے گھر سے نکال دو۔ اسے کچھ دے مارو مگر اسے یہاں سے بھیج دو۔

مگر سارے الفاظ حلق میں دم توڑ گئے۔

''آپ کے گھر کی چیز ہے تو آپ ضرور دیکھنا چاہیں گے اور اس کے بعد آپ فیصلہ کریں گے کہ آپ مجھے اپنی کمپنی میں کس حیثیت سے کام کرنے دیں گے!''

لاؤنج میں خاموشی تھی۔ سب سن رہے تھے، بول بس وہی دونوں بول رہے تھے۔

حیا کا سانس آہستہ آہستہ رکنے لگا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ فضا میں آکسیجن کم ہو گئی تھی۔

''مگر اس میں ہے کیا؟''

''وہ رہا ٹی وی اور وہ اس کے نیچے ڈی وی ڈی رکھا ہے۔ اس کو لگا کر خود دیکھ لو، بہت انجوائے کرو گے۔'' اس نے سی ڈی جہان کی طرف بڑھائی۔ حیا کے نتھنوں سے آکسیجن کا کوئی جھونکا ٹکرایا تھا۔ سانس۔ خوش گمانی۔ امید۔ ایک کرن سی نظر آئی تھی کہ جہان سی ڈی ہاتھ میں لیتے ہی توڑ دے گا اور ولید کو دے مارے گا۔

جہان نے ذرا تذبذب سے سی ڈی کو دیکھا اور پھر اسے تھام لیا۔ مگر اس نے اسے نہیں توڑا۔ اس نے سی ڈی کو کور سے نکالا، الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر سر اٹھا کر ولید کی طرف متوجہ ہوا۔

''آر یو شیور کہ اس میں کچھ ایسا نہیں جو کسی کے توہین کا باعث بنے۔ کیا میں اسے واقعی سب کے سامنے چلا دوں۔''

''اس میں جو ہے وہ سب سچ ہے۔ کوئی فکسنگ نہیں ہے۔ چلاؤ، ضرور چلاؤ۔''

جہان نے سی ڈی پکڑے پکڑے تایا ابا کو دیکھا۔ وہ اسی الجھی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک ہو کیا رہا ہے۔ اس طرح اچانک ولید کا آنا، پھر ان سب سے کہنا کہ وہ ان سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے اور پھر یہ سی ڈی وغیرہ۔

جہان نے مڑ کر ارم کو دیکھا۔ "کیا میں اسے چلا دوں؟" اس نے ارم سے اجازت مانگی تھی۔ وہ اس سے کیوں پوچھ رہا تھا۔ کیا اسے احساس نہیں تھا کہ یہ سی ڈی ارم نے ہی تو ولید کو دی ہوگی۔ اور اسی لیے ارم نے بہت ہی بے نیازی سے شانے اچکائے جیسے کہہ رہی ہو میری بلا سے۔ البتہ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ سی تھی۔ شو ٹائم کی مسکراہٹ کہ اب آئے گا مزہ۔

جہان نے پھر ولید کو دیکھا جیسے خود بھی متذبذب تھا کہ اسے یہ سی ڈی چلانی چاہیے یا نہیں۔

جہان نے ایک سپاٹ سی نگاہ اس پہ ڈالی اور پھر او کے کہتے ہوئے مڑا۔ اس کے قدم دیوار میں لگے ٹی وی کی طرف اٹھ رہے تھے۔

کچن کی کھلی کھڑکی سے ہوا کا جھونکا آیا اور آدھی کھلی دیوار پہ لٹکتے ونڈ چائم کی لڑیاں گول گول گھومنے لگیں۔ اسٹک اور کانچ ٹکرائے۔ خاموشی میں مدھم سا نغمہ بج اٹھا۔

ماتم کا نغمہ۔

سوگ کا نغمہ۔

جہان نے ایک قدم مزید ٹی وی کی طرف بڑھایا، باہر بادل زور کے گرجے، بجلی چمکی، اور حیا کے ہاتھ سے جنجر بریڈ ہاؤس کی ٹرے گر پڑی۔ ہلکے سے ٹھک کی آواز کے ساتھ ٹرے اوندھے منہ زمین بوس ہوئی۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ وہ سب اس سی ڈی کو دیکھ رہے تھے کہ آخر اس میں ایسا کیا ہے جسے دکھانے کے لیے ولید اتنا بے چین ہو رہا تھا۔

جہان آہستہ آہستہ چلتا ٹی وی کی طرف جا رہا تھا۔ حیا کا ٹوٹا ہوا جنجر بریڈ ہاؤس اس کے قدموں میں گرا پڑا تھا۔ لیکن اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ بس سانس روکے لاؤنج میں بیٹھے نفوس کو دیکھ رہی تھی۔

ابا، روحیل، جہان۔ باپ، بھائی، شوہر۔ کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ کوئی اسے اس پرائے مرد، بلیک میلر سے بچا نہیں سکتا تھا، مگر کیا واقعی کوئی نہیں تھا؟

"اللہ تعالیٰ!" اس نے زور سے پکارا تھا۔ اللہ کا نام وہ واحد نام ہوتا ہے جس کو بولنے کے لیے ہونٹ ہلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس نے بھی نقاب تلے آپس بند ہونٹوں پیچھے زبان ہلا کر اسے پکارا تھا۔

"اللہ تعالیٰ، میں بہت اکیلی ہوں، میرے پاس اس وقت کوئی نہیں ہے جسے میں پکار سکوں۔"

جہان اب ٹی وی کے پاس پہنچ چکا تھا۔ حیا کے دل پہ پڑتا بوجھ اب بڑھتا جا رہا تھا۔

"صرف آپ ہیں جو میری مدد کر سکتے ہیں،

آپ دے دیں تو کوئی چھین نہیں سکتا!"

جہان نے ٹی وی کا بٹن آن کیا اور پھر ریموٹ سے ڈی وی ڈی چلایا۔ اب ٹی وی سکرین نیلی آ رہی تھی۔

"آپ چھین لیں تو کوئی دے نہیں سکتا!"

جہان نے جھک کر بٹن دباتے ہوئے ڈی وی ڈی کی پلیٹ باہر نکالی۔ دفعتاً ریموٹ اس کے ہاتھ سے پھسل پڑا۔ ماربل کے فرش پہ ریموٹ گرا تھا۔ چند لمحے مزید گزر گئے۔

"میری مدد کریں۔ مجھے اکیلا مت چھوڑیں!"

جہان ریموٹ اٹھا کر پھر سیدھا ہوا۔ کاش ریموٹ ٹوٹ جاتا مگر وہ نہیں ٹوٹا تھا۔

ہر چیز اس کے خلاف جا رہی تھی۔

جہان نے خالی سانچے میں سی ڈی رکھی اور اسے واپس دھکیلا۔

''مجھے ان لوگوں کے سامنے رسوا نہ کریں!''

سکرین پہ میلو لکھا آ رہا تھا۔ جہان نے ذرا پیچھے ہو کر ریموٹ سے پلے کا بٹن دبایا۔

''مجھے رسوا نہ کرنا! پلیز... ہیلپ می... پلیز!''

حیا نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید سی ڈی نہ لگے، وہ اندر پھنس جائے۔ شاید..... مگر چند ہی لمحوں بعد اسے گانے کی ٹون سنائی دی تھی۔

شیلا کی موسیقی۔

اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی۔ سر سے آسمان ہٹنے لگا۔ اسے لگا وہ ابھی گر جائے گی۔ وہ ابھی مر جائے گی۔

ویڈیو لگ چکی تھی۔ سب دیکھ رہے تھے۔

وہ خواب نہیں تھا۔ وہ حقیقت تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر رسوا ہونے جا رہی تھی۔

ساری رضاعت، ساری اطاعت، سب بیکار گیا تھا۔

رسوائی، گناہ۔ وہ اس کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ وہ قبر تک اس کے پیچھے آئیں گے۔

اس نے اپنی سرخ پڑتی بند آنکھیں کھولیں۔ لاؤنج کا منظر ذرا سا دھندلا رہا تھا۔ اس نے ابا کے چہرے کو دیکھنا چاہا جو بہت شاکڈ سے سکرین کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے اپنے باپ کو سر بازار بے عزت کر دیا تھا۔

اس نے روحیل کا چہرہ دیکھنا چاہا جیسے سمجھ نہ آ رہا ہو کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

اس نے تایا ابا کے چہرے کو دیکھنا چاہا۔ غیض، غضب، غصہ، پیشانی کی تنی نسیں، سرخ پڑتا چہرہ۔ اس نے صائمہ تائی اور اماں کے چہروں کو دیکھا۔ ہکا بکا۔

گانا اسی طرح چل رہا تھا۔

اس نے نتاشا کے چہرے کے دیکھا۔ وہ بڑے ستائشی انداز میں سکرین کو دیکھتی ایکسائٹڈ سی آگے ہو کر بیٹھی تھی۔ کوک کا کین ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس کی نگاہیں نتاشا سے ہوتی ہوئیں سامنے جہان کے چہرے پہ پڑیں۔ جہان وہ واحد شخص تھا جو ٹی وی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ صرف چبھتی ہوئی نگاہوں سے ولید کو دیکھ رہا تھا۔ اور ولید..... تب اس نے دیکھا۔

ولید کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ اتنا سفید جیسے کسی نے پینٹ کر دیا ہو۔ اسی پل اس نے ارم کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی اتنا ہی سفید۔

یہ کیا۔

ایک دم سے حیا نے گردن گھما کر سکرین کو دیکھا۔

نقاب تلے اس کے ہونٹ ذرا سے کھلے۔ آنکھوں کی پتلیاں بے یقینی سے پھیلیں۔

اسے لگا وہ کبھی سانس نہیں لے سکے گی۔

گانا بھی وہی تھا، میوزک بھی وہی تھا، سی ڈی بھی وہی تھی مگر منظر..... نہیں یہ شریفوں کا مجرا نہیں تھا۔ نہیں۔ یہ اس کی ویڈیو نہیں تھی۔ یہ تو۔

ارم اور ولید.....

وہ تصاویر کا ایک سلائیڈ شو تھا۔ ایک ایک کر کے بڑی بڑی تصاویر سکرین پہ ابھرتیں اور چلی جاتیں۔ ارم اور ولید کی تصاویر۔ اکٹھے کسی ریسٹورانٹ میں، کسی شاپنگ ایریا، کسی پارک میں۔ ساری فوٹوز سیلف فوٹوز تھیں۔ جیسے ولید کے ساتھ ہو کر ارم نے بازو بڑھا کر خود ہی موبائل سے کھینچی ہوں۔ اور اس لحاظ سے وہ دونوں بہت قریب قریب کھڑے تھے۔

ہر دو تین تصاویر کے بعد سکین شدہ ای میلز سکرین پہ ابھرتیں۔ ان میں سے کچھ فقرے ہائی لائیٹڈ تھے۔ وہ تصویر اتنی دیر تک سکرین پہ رہتیں کہ وہ سب ان ہائی لائیٹڈ فقروں کو پڑھ لیتے۔ پھر اگلی تصویر آ جاتی۔ ارم اور ولید کی ذاتی ای میلز۔

''یہ..... یہ کیا؟'' ولید ایک دم آگے بڑھنے لگا۔

''ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ان ٹانگوں میں اپنے گھر نہیں جاؤ گے۔ وہیں کھڑے رہو۔'' جہان کا وہ الجھن بھرا چہرہ، وہ تذبذب، سب غائب ہو گیا تھا۔ وہ اتنے سرد اور کٹیلے انداز میں بولا کہ ولید کے بڑھتے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے ششدر سی نگاہوں سے جہان کو دیکھا۔

''یہ شو ٹائم ہے نا ولید لغاری اور تم نے کہا تھا اس شو کو میں بہت انجوائے کروں گا۔ میں تو کر رہا ہوں۔ تم بھی کرو مگر شاید تم کوئی غلط سی ڈی اٹھا لائے ہو۔''

''یہ..... یہ غلط ہے..... یہ سچ نہیں ہے۔'' ولید لغاری ہکلا گیا۔ کبھی وہ صوفوں پہ بیٹھے نفوس کو دیکھتا، کبھی جہان کو۔ حیا کو دیکھنا تو اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔

''ابھی تم نے خود کہا تھا کہ یہ حقیقت ہے، تمہارے کون سے بیان پہ یقین کروں میں؟'' وہ درشتی سے بولا، مگر اسی اثنا، میں داور بھائی غصے سے اٹھے تھے۔

''گھٹیا انسان، میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔''

''پلیز!'' جہان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں اس کے قریب آنے سے روکا۔ ''ہاتھ کا استعمال مجھے بھی آتا ہے، مگر یہاں خواتین بیٹھی ہیں، اس لیے اس آدمی سے میں خود نپٹ لوں گا بعد میں! اور ابھی!'' اس نے انگشت شہادت اٹھا کر قہر آلود نگاہوں سے ولید کو دیکھتے تنبیہہ کی۔ ''ابھی تم یہاں سے اپنی شکل گم کر لو۔ تم سے میں بعد میں ملوں گا، کیونکہ یہ سی ڈی اب میرے پاس ہے اور تم نہیں چاہو گے کہ تمہارا ہونے والا سسر یا اس کی بیٹی یہ سب دیکھے۔ سینیٹر عبدالولی کی بیٹی سے رشتہ ہو رہا ہے نا تمہارا؟''

ولید لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ تایا، ابا، روحیل، سب اپنی جگہوں سے کھڑے ہو چکے تھے۔ بس نہیں چل رہا تھا، اس آدمی کو گولی مار دیں۔

''آؤٹ!'' سلیمان صاحب ضبط سے بہ زور بولے تھے۔ ولید اس اڑی رنگت اور بدحواس قدموں سے پلٹا۔ سامنے دیوار کے ساتھ لگی، حیا کھڑی تھی۔ اس کی نقاب سے جھلکتی سیاہ آنکھوں میں بھی سکتہ طاری تھا۔ ولید ان آنکھوں میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔

باہر اسی طرح بارش کے قطرے گر رہے تھے۔

ٹی وی اسکرین پہ وہ سلائیڈ شو ابھی تک چل رہا تھا۔ ارم سفید چہرے کے ساتھ وہ دیکھ رہی تھی۔ تصویریں تھیں کہ ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔

''یہ سب فوٹو فکسنگ ہو گی۔'' پھپھو رنجیدگی سے بولی تھیں۔ حالانکہ تصاویر بہت کلیئر تھیں، مگر تایا اور داور کے سرخ چہرے..... وہ ارم کو کسی طوفان سے بچانا چاہتی تھیں۔

تیز بارش تھم چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں پہ گرتی ٹپ ٹپ کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

پھپھو کی بات پہ صائمہ تائی کو تقویت ملی تھی۔

''یہ سب جھوٹ ہے، الزام ہے میری بچی پہ۔ یہ سب ارم اور حیا کی تصویریں تھیں، یہ لڑکا کہاں سے آ گیا ان میں؟'' وہ اپنی بات سنوانے کے لیے زور سے بولی تھیں۔ ''اور یہ ساری تصویریں حیا کے پاس تھیں، اسی نے دی ہوں گی اس لڑکے کو، اور نام میری بیٹی کا لگا دیا۔''

''گھر چلو تم لوگ!'' تایا فرقان قہر برساتی نگاہ سے ان کو دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

''میری بات سنیں، یہ حیا کے پاس تھیں تصویریں، اس نے......اسی لیے وہ لڑکا بار بار حیا کا نام لے رہا تھا۔''

''میری بیوی کا نام مت لیں ممانی!'' ابا صائمہ تائی کی بات پہ ناگواری سے احتجاج کرنے ہی لگے تھے کہ وہ جیسے غصے سے کہتا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

''یہ تصویریں شاید آپ کو اپنی بیٹی کے لیپ ٹاپ سے بھی مل جائیں۔ مگر میری بیوی کا نام اگر کسی نے لیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' وہ اتنی سختی سے انگلی اٹھا کر بولا تھا کہ صائمہ ممانی آگے سے کہہ نہ سکیں۔ فاطمہ اور پھپھو نے افسوس سے ایک دوسرے کو دیکھا، جیسے سمجھ نہیں آ رہی ہو کیا کریں۔

''گھر آؤ تم لوگ!'' تایا ابا نے بہت ضبط سے، سرخ پڑتی نگاہوں کے ساتھ بیوی کو اشارہ کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ داور بھائی فوراً باپ کے پیچھے لپکے۔

''ابا...... یہ سب میں نے نہیں...... یہ حیا نے......'' ارم نے ان کو آواز دینا چاہی۔

''ارم!'' جہان نے حیرت اور غصے سے اسے دیکھا۔ ''تم میری بیوی کا نام اس سب میں کیسے لے سکتی ہو؟''

تایا جا چکے تھے۔ ارم نے بے بسی سے جہان کو دیکھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟ تم لڑکیوں کو کیا لگتا ہے، ہاں؟ تم موبائل سے میسج مٹا دو گی، کال ریکارڈ حذف کر دو گی تو وہ ختم ہو جائے گا؟ ایسا نہیں ہوتا ارم۔ ہر ایس ایم ایس ریکارڈ ہوتا ہے، ہر کال ریکارڈ ہوتی ہے۔ ایک دفعہ پھر لو میری بیوی کا نام اور میں تمہیں اپنی ایجنسی سے ولید کے فون پہ کی گئی ہر کال کی آڈیو ریکارڈنگ نکلوا کر دکھاؤں گا۔ میرے لیے یہ بہت آسان ہے۔''

ارم نے خشک لبوں پہ زبان پھیری اور اپنی ماں کو دیکھا مگر وہ پہلے ہی باہر جا رہی تھیں۔ وہ تیزی سے ان کی طرف لپکی۔ چوکھٹ میں کھڑی حیا اور اس کے قدموں میں گرے ملبے کو اس نے دیکھا بھی نہیں۔

لاؤنج میں پھر سے خاموشی چھا گئی تھی۔ سب جیسے ایک دوسرے سے شرمندہ تھے، سوائے نتاشہ کے۔ وہ بڑے مزے سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھی، کین سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور روحیل کو مخاطب کیا۔

"Honestly Rohail, you have a very interesting family."

روحیل نے ''اونہوں!'' کہتے ہوئے اسے گھورا، پھر معذرت خواہانہ انداز میں باقیوں کو دیکھا۔ نتاشہ جہان کے سائیڈ سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔

شو ٹائم ختم ہو چکا تھا۔

البتہ جانے سے قبل نتاشہ نے جہان کی طرف جو مسکراہٹ اچھالی تھی، کونے میں کھڑی حیا کے ذہن میں وہ اٹک کر رہ گئی۔

یہ سب کیسے ہوا؟ وہ ابھی تک دم بخود تھی، مگر نتاشہ کی مسکراہٹ۔ اوہ ڈیئر نتاشہ! اس کا اور جہان کا باتیں کرنا، پھر اس کا اتنے بڑے شاپنگ بیگ اٹھا کر صائمہ تائی کی طرف جانا، اور پھر اوپر واپس جانا...... وہ صائمہ تائی کو شاپنگ دکھانے نہیں، ارم کا لیپ ٹاپ اڑانے گئی تھی، ورنہ اسے کب سے تائی سے اتنی محبت ہو گئی؟ ورنہ جہان کو کیسے پتہ کہ یہ تصاویر ارم کے لیپ ٹاپ میں تھیں؟ وہ بھی اوپر کمرے میں حیا کے کپڑے رکھنے نہیں، وہی سی ڈی لینے گیا تھا، ریموٹ گراتے ہوئے جھک کر اس نے سی ڈیز swap کی تھیں۔ اوہ جہان......! وہ swapping کا ماہر تھا!

ایک ایک کر کے سب لاؤنج سے چلے گئے تھے۔ پھپھو نے البتہ جاتے ہوئے افسردہ نگاہوں سے جہان کو دیکھا تھا۔

''یہ سب کیا تھا جہان؟''

''وہ شاید کوئی غلط سی ڈی اٹھا لیا تھا۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''جیسے میں تمہیں جانتی ہی نہیں۔ تمہارا ہاتھ ہے اس میں، پتہ ہے مجھے۔'' وہ جھڑک کر کہتی، خفگی سے باہر نکل گئیں۔

اس سارے میں وہ پہلی بار حیا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اسی طرح دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ جہان کو اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے

نقاب کھینچ کر اتارا۔ اس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ رہا تھا۔ اور تب ہی جہان نے دیکھا.....

''اللہ، اللہ، یہ تم نے کیا کیا؟''

''یہ تم نے کیسے کیا جہان؟'' ایک دم آنسو ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ وہ پریشانی سے جنجر بریڈ کے ملبے کو دیکھتا اس تک آیا۔

''میرے سارے پیسے برباد کر دیے تم نے۔ یہ کیوں توڑا؟''

''جہان!'' حیا نے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر خود کو رونے سے روکا، مگر آنسو بہتے جا رہے تھے۔ ''میں بہت ڈر گئی تھی۔ تم جانتے تھے نا..... کہ وہ ویڈیو ولید کے پاس ہے۔''

ملبے سے نگاہ ہٹا کر جہان نے گہری سانس لیتے ہوئے حیا کو دیکھا۔

''دیرین کیو میں تم نے دو دفعہ کہا تھا کہ اگر کوئی تمہیں گاڑی تلے کچل دے تو؟ دو دفعہ کہی گئی بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہی معلوم کر لیا تھا سب، تم نے مجھ پہ بھروسہ نہیں کیا سو میں نے بھی تمہیں نہیں بتایا۔''

''میں تمہیں پریشان نہیں.....'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

''حیا، آپ کے اپنے اور کس لیے ہوتے ہیں؟ اور مجھے کب تم نے پریشان نہیں کیا؟ ایک دفعہ مزید کرنے میں حرج ہی کیا تھا؟ اگلی دفعہ مجھ پہ بھروسہ کر کے دیکھنا۔''

''مگر..... ارم..... اس کی تو بہت.....''

جہان کے جبڑے کی رگیں تن گئیں۔

''اس کا ذکر مت کرو۔ جب انسان کچھ غلط کرتا ہے تو اس کا نتیجہ اس کو بھگتنا پڑتا ہے۔ آج کسی ایک نے تو رسوا ہونا تھا، مگر میں نے ایک لڑکی سے وعدہ کیا تھا کہ جنت کے پتے تھامنے والوں کو اللہ رسوا نہیں کرتا۔ مجھے اپنا وعدہ نبھانا تھا۔'' پھر اس نے ٹوٹے ہوئے جنجر بریڈ ہاؤس کو دیکھا۔ ''کب تم جذبات میں آ کر چیزیں پھینکنا چھوڑو گی، لڑکی!'' ساتھ ہی وہ نور بانو کو آواز دینے لگا تا کہ وہ جگہ صاف کی جا سکے۔

''آئی لو یو جہان! آئی ریئلی لو یو۔'' وہ رندھی ہوئی آواز، اور فرطِ مسرت، رونے اور مسکرانے کے درمیان بولی تھی۔ جہان نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر دائیں بائیں۔

''میری بچپن کی سہیلی ٹھیک کہتی ہے۔ اس گھر میں سب بہت انٹرسٹنگ ہیں۔'' وہ جھرجھری لے کر آگے بڑھ گیا۔ نور بانو اسی طرف آ رہی تھی۔

حیا یونہی عبایا میں ملبوس لاؤنج کے صوفے کے ہتھ پہ بیٹھی، اور موبائل نکال کر ایک نمبر ملایا۔ ہتھیلی سے آنسو پونچھتے اس نے فون کان سے لگایا۔

''ڈاکٹر ابراہیم..... میں نے وہ پہیلی حل کر لی۔'' وہ مڑ کر، چوکھٹ پہ پنجوں کے بل جھکے بیٹھے جہان کو دیکھتے ہوئے بولی جو نور بانو کے ساتھ جنجر بریڈ کے ٹکڑے اٹھا رہا تھا۔

''اچھا، کیا ملا آپ کو پھر؟'' دوسری جانب جیسے وہ مسکرائے تھے۔

''آیتِ حجاب سورۃ احزاب میں نازل ہوئی ہے، میں بتاتی ہوں آپ کو حجاب اور جنگِ احزاب کی مماثلت۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''میں بتاتی ہوں آپ کو کہ جنگِ احزاب میں کیا کیا ہے! جنگ احزاب میں گروہ بھی ہیں، بنو قریظہ بھی، خندق بھی، سردی اور بھوک کی تنگی بھی، تین طرف خندق تو ایک طرف گھنے درختوں کا سایہ اور مضبوط چٹان بھی جو خاموشی سے آپ کو سپورٹ کرتے ہیں۔'' اس نے جہان کی پشت کو دیکھتے ہوئے کہا، وہ افسوس سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ٹکڑے پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔ اس کی جینز کی جیب میں ایک سی ڈی جھلک رہی تھی۔

''لیکن اگر جنگِ احزاب میں کچھ نہیں ہے تو وہ ''جنگ'' نہیں ہے۔ یہ وہ جنگ ہے جس میں جنگ ہوتی ہی نہیں۔ اکا دکا انفرادی لڑائیوں کو چھوڑ کر، اصل جنگ، ہتھیاروں سے لڑی جانے والی جنگ سے قبل ہی ایک رات طوفان آتا ہے، اور دشمنوں کے اپنے خیموں کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔ ان کی ہانڈیاں ان ہی پہ الٹ جاتی ہیں، اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ مجھے میری ایک چھوٹی دوست نے یہی بات کہی تھی کہ یہ جنگ جیتا کون تھا؟ تب نہیں سمجھی میں۔ اب سمجھی ہوں۔ ''جنگ'' نہیں، وہ لڑائی کی بات کر رہی تھی، لڑائی جو اس جنگ میں ہوتی بھی نہیں ہے۔ آپ کو صبر اور انتظار کرنا ہوتا ہے، کسی کو ایک دن، کسی کو ایک ماہ اور کسی کو کئی سال اور پھر ایک دن، آپ بغیر کچھ کھوئے، بغیر کسی محاذ پہ لڑے، بغیر کسی نقصان کے اچانک سے وہ جنگ جیت جاتے ہیں۔ یہی بات تھی نا سر!''

''میرے ذہین بچے، مجھے آپ پہ فخر ہے!'' وہ بہت خوش ہوئے تھے۔

حیا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس غریب آدمی کو دیکھا جو ابھی تک اپنے پیسے ضائع ہونے پہ افسوس کر رہا تھا۔ چیزیں وقتی ہوتی ہیں، ٹوٹ جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں، ان کا کیا افسوس کرنا؟

اب ان دونوں کو جنجر بریڈ کے گھروں کو بھول کر رشتوں اور اعتماد سے بنا گھر قائم کرنا تھا۔

صبح قریب تھی۔

اُن کی صبح۔

☆ ☆ ☆

وہ پارلر کے ڈریسنگ مرر کے سامنے کرسی پہ بیٹھی تھی، اور بیوٹیشن لڑکی مہارت سے اس کا آئی شیڈو لگا رہی تھی۔ اس نے اپنا گرے اور سلور فراک پہن رکھا تھا، بال وغیرہ ابھی بنانے تھے۔

''اونچا جوڑا بنائیں گی کیا؟'' بیوٹیشن نے آئی شیڈو کو آخری ٹچ دیتے ہوئے پوچھا تھا۔ حیا نے آئینے میں چہرہ دائیں بائیں کر کے آنکھیں دیکھیں۔ اچھی لگ رہی تھیں۔

''اونہوں۔ فرنچ ناٹ بنا دو۔ اونچے جوڑے میں تو نماز نہیں ہوگی اور دو تین نمازیں تو فنکشن کے دوران آ جائیں گی۔''

''آج نہ پڑھیں تو خیر ہے۔'' لڑکی اکتائی تھی۔

''اپنی خوشی میں اللہ کو ناراض کر دوں؟ اونہوں!'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا نیل پالش لگانی ہے یا نقلی نیلز؟''

''کچھ بھی نہیں، بار بار وضو کے لیے اتاروں گی کیسے؟'' اس نے سادگی سے الٹا سوال کیا۔

''اوہ ہو...... اچھا نقلی پلکیں تو لگا دوں نا؟''

''اللہ تعالیٰ کو بُرا لگے گا۔''

''آپ نے آئی بروز بھی نہیں بنائیں تھوڑا سا سیٹ ہی کر دوں!''

''اللہ تعالیٰ کو اور بھی بُرا لگے گا۔''

لڑکی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ گھوم کر اس کے سامنے آئی۔

''آپ کہیں الہدیٰ کی تو نہیں ہیں؟''

حیا ہنس دی۔

''نہیں، میں بس ایک مسلمان لڑکی ہوں، اور یہ سوچ رہی ہوں کہ جب میں تمہیں اپنا دوپٹہ سیٹ کرنے کو کہوں گی، تو تمہاری کیا حالت ہوگی؟'' وہ جیسے سوچ کر ہی محظوظ ہوئی۔ لڑکی نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''کیوں؟''

''پہلے میک اوور مکمل کرو، پھر بتاتی ہوں۔'' مزے سے کہتی اس نے دوبارہ سر کرسی کی پشت پہ ٹکا دیا۔ بیوٹیشن لڑکی جز بز سی ہو کر

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

آئی شیڈو کٹ اٹھائے پھر سے اس کے سر پہ آ کھڑی ہوئی۔

اور جب حیا نے اسے دوپٹہ اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کرنے کو کہا تو اس کا منہ کھل گیا۔

''گھونگھٹ؟ کون نکالتا ہے گھونگھٹ؟ آپ کیا بات کر رہی ہیں؟''

''میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ بہت نیچے تک نکالو، بس تھوڑی تک آئے۔ نیچے ویسے ہی بند گلا ہے۔'' اس نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے لاپرواہی سے کہا تھا۔

''مگر آپ کا چہرہ تو نظر ہی نہیں آئے گا۔ اور.....'' لڑکی پریشان ہو گئی تھی۔

''تم نکال رہی ہو یا میں خود نکال لوں؟''

اور بیوٹیشن کے پاس اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس سے کوئی بعید نہیں تھی، وہ جلدی سے دوپٹہ سیٹ کرنے لگی۔

اس نے ابا سے بہت کہا تھا کہ مکسڈ گیدرنگ نہ رکھیں، فوٹوگرافر نہ ہوں، مگر ابا اور اماں نے ایک نہ سنی۔

''حیا، میں تمہارے پردے کا پھر کوئی ایشو نہیں سننا چاہتی۔'' اماں تو باقاعدہ بے زار ہو گئی تھیں۔ حیا جانتی تھی کہ اس کے سامنے وہ کبھی اعتراف نہیں کریں گی کہ وہ اس کے پردے سے دل سے راضی تھیں، مگر کیا فرق پڑتا تھا؟

اس نے اپنی کلاس فیلوز سے پوچھا، حجابی لڑکیاں دلہن بنتے ہوئے کیا کرتی ہیں کہ کوئی ناراض بھی نہ ہو اور وہ حجاب بھی کیری کر لیں؟ جتنے آپشن نظر آئے، ان میں سب سے بہترین یہی تھا۔

گھونگھٹ۔

اور پھر نیچے سے دوپٹہ اتنا پھیلا کر لیا ہو کہ ستر پوشی کا فرض ادا کرے۔ اب کوئی اس کی تصویریں کھینچے، یا نہیں، اسے پرواہ نہیں تھی۔

میرج ہال میں جب اسے برائیڈل روم سے لا کر اسٹیج پہ بٹھایا گیا تو ثنا، اس کے ایک طرف آ بیٹھی تھی۔ آج کے لیے ثنا اس کی اسسٹنٹ تھی۔ اپنی طرف سے تصاویر کھینچنے والوں کو وہ مسلسل منع کر رہی تھی۔

''حیا آپا پردہ کرتی ہیں، پلیز فوٹو زمت کھینچیں۔'' یا اگر کوئی اس کے گھونگھٹ پہ کچھ بولتا تو وہ جواب بھی دے رہی تھی۔

''آپا کلاسیکل دلہن بنی ہیں، اور وہ گھونگھٹ نہیں اٹھائیں گی۔'' کوئی چاچی، مامی، خالہ ساتھ آ کر بیٹھتی، پھر ذرا سا گھونگھٹ اٹھا کر چہرہ دیکھتی، سلامی دیتی، تعریف کرتی یا جو بھی، سب ایسے تھا جیسے عموماً مہندی کی دلہن کا ہوتا ہے۔

اس کا گہرے فراک پیروں تک آتا تھا۔ گھیرے پہ کافی کام تھا۔ گھونگھٹ تھوڑی تک گرتا تھا، نیچے دوپٹہ ''یو'' کی شکل میں پھیلا کر سامنے ڈلا تھا۔ آستین پورے تھے۔ اور وہ سر جھکا کر نہیں بیٹھی تھی، وہ گردن اٹھا کر پورے اعتماد کے ساتھ بیٹھی، ہر پاس آ کر بیٹھنے والی آنٹی سے بڑے آرام سے باتیں کر رہی تھی۔ لوگ بُرا تب مانتے ہیں جب دلہن اکڑ کر بیٹھے۔ اگر وہ خوش مزاجی سے بات کر رہی ہو، پورے اعتماد کے ساتھ، تو لوگ بھی نرم پڑ جاتے ہیں۔ البتہ کہنے والے تو کہہ رہے تھے۔ یہ کیا کیا؟ میک اپ تو چھپ گیا۔ خراب ہو گیا ہو گا تبھی یہ کیا۔ ناٹک، ڈرامے۔ مگر وہ اب اس مقام پہ تھی جہاں یہ سب باتیں ثانوی محسوس ہوتی تھیں۔ مشکلیں بہت پڑ کر بھی آسان ہو جاتی ہیں۔

جہان اس کے ساتھ آ کر بیٹھا تو بہت دھیرے سے بولا تھا۔ ''ثابت ہوا کہ تم کچھ چیزوں میں واقعی بہت اسمارٹ ہو۔'' بس یہی ایک فقرہ کا اس نے۔ پھر وہ جلدی ہی اٹھ گیا۔ اسے یوں مرکز نگاہ بن کر بیٹھنا قبول نہیں تھا۔ بدتمیز نہ ہو تو۔

وہ پھر خود بھی زیادہ دیر اسٹیج پہ نہیں بیٹھی اور واپس برائیڈل روم واپس آ گئی۔ یہ نتاشہ کا دن تھا، اب نتاشہ کو پوری توجہ ملنی چاہیے تھی۔ خیر، وہ پوری توجہ لے بھی رہی تھی۔ ساڑھی کی پشت پہ زبردستی اس نے پلو ڈالا ہوا تھا، مگر وہ روحیل کا بازو تھامے مہمانوں کے درمیان ہنستی بولتی گھوم رہی تھی۔ (اور فاطمہ کو ہول اٹھ رہے تھے۔)

''جہان بھائی کہہ رہے ہیں، وہ ادھر آ جائیں؟'' ثنا نے اس کو آواز دی۔ وہ جو برائیڈل روم میں بیٹھی، گھونگھٹ پیچھے گرائے، لپ اسٹک ٹھیک کر رہی تھی، چونک کر پلٹی۔ کیا وہ آ رہا تھا؟ اس سے ملنے؟ اس کا دل زور سے دھڑکا۔

''ہاں، بلالو۔'' وہ اور ثناء اکیلے ہی تو تھے۔ اچھا ہے، ثناء باہر چلی جائے گی اور وہ دونوں کم از کم بات تو کر سکیں گے۔ دو دن سے تو وہ نظر ہی نہیں آیا تھا۔

ذرا سی دستک کے بعد دروازہ کھول کر جہان اندر داخل ہوا۔ سیاہ ڈنر سوٹ، بال پیچھے کیے، بالکل جیسے وہ میٹرو میں لگا تھا پہلی بار۔ اب بھی ہینڈسم لگ رہا تھا..... بلکہ نہیں، ہینڈسم ایڈیٹ لگ رہا تھا کیونکہ.....

وہ جو منتظر سی کھڑی تھی، لبوں پہ ذرا سی مسکراہٹ لیے، اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

جہان کے ساتھ وہ سوبر اور سادہ، لمبی سی ثانیہ بھی تھی۔

''حیا، مائی وائف اور حیا، یہ میری بہت اچھی دوست ہیں، کولیگ بھی ہیں، ثانیہ۔'' بہت تہذیب اور شائستگی سے وہ دونوں کا تعارف کرا رہا تھا۔

''بہت خوشی ہوئی۔'' ثانیہ اسی سوبر سی مسکراہٹ کے ساتھ آگے آئی اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حیا نے بے مروت مسکراتے ہوئے ہاتھ تھاما اور ملا کر چھوڑ دیا۔ پھر ایک شاکی نظر جہان پہ ڈالی۔ وہ بس اس لیے اس کے پاس آیا تھا؟ بدتمیز!

''بس تمہیں ملوانا چاہ رہا تھا ثانیہ سے۔ ان کے ہزبنڈ دوست ہیں میرے۔''

''جی، ان سے تو بہت دفعہ مل چکی ہوں۔'' وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ جہان نے بے ساختہ ماتھے کو چھوا۔

''اچھا؟ حماد نے نہیں ذکر کیا؟'' ثانیہ نے جہان کو دیکھا، وہ جو اُف کے انداز میں ماتھے کو چھو رہا تھا، فوراً سے پیشانی مسل کر ہاتھ نیچے لے گیا۔

''ہاں، وہ ہم ڈنر کر رہے تھے تو وہ مل گیا تھا۔ خیر ہم چلتے ہیں، سی یو۔'' وہ حیا کو گھور کر ثانیہ کو راستہ دیتے ہوئے سامنے سے ہٹا۔

وہ ناقدانہ نگاہوں سے انہیں جاتے دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے پاس صابر کا نمبر ہے، میں اسے کال کرنا چاہ رہا تھا تو.....''

''ہاں، ٹھہرو تمہیں سینڈ کرتی ہوں۔'' وہ دونوں اپنے اپنے سیل فونز سامنے کیے باتیں کرتے باہر نکل گئے۔

''ہونہہ!'' وہ پیر پٹخ کر واپس کرسی پہ بیٹھی۔

اس آدمی کے ساتھ زندگی کبھی بھی فینٹسی نہیں ہوگی، پہلے سے وہ جانتی تھی، مگر اب اس بات پہ یقین بھی آ رہا تھا۔ سب کچھ بہت مشکل تھا، اور مشکل ہوگا بھی، مگر خیر، وہ ساتھ تو تھے نا۔ آہستہ آہستہ وہ اس سب کی عادی ہو جائے گی۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ اور پھر دروازے کی طرف دیکھا۔

ذرا سی جھری کھلی تھی، وہاں سے میرج ہال کی روشنیاں، لوگوں کا رش، ہنستے بولتے مہمان، رنگ، خوشبو، سب نظر آ رہا تھا۔

اس کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔ اس نے کلائی گھما کر دیکھی۔ بہارے کا نیکلیس بریسلیٹ کی صورت اس میں پہنا تھا، اور اس کی سائیڈ پہ خالی کنڈے میں اب ایک موتی جھول رہا تھا۔

سیاہ موتی۔

وہ سفید موتی نہیں بن سکی تو کیا ہوا۔ سیاہ موتی بننے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ کہ پھر.....

موتی تو وہ ہوتا ہے،

جس کی کالک بھی چمکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

صبح کا دودھیا پن اسلام آباد کی پہاڑیوں پہ چھایا ہوا تھا۔ گذشتہ رات کی بارش کے باعث سرمئی سڑکیں ابھی تک گیلی تھیں۔

اس نے کچن کی کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ جالی سے روشنی اور ہوا اندر جھانکنے لگی۔ تازگی کا احساس۔ تبھی دیوار میں نصب اوون کھانا پکنے کی گھنٹی بجانے لگا۔ وہ آگے آئی، اور اوون کا دروازہ کھولا، پھر دستانے والے ہاتھ سے ٹرے باہر نکالی۔

پگھلے ہوئے پنیر سے سجا گرم گرم پیزا تیار تھا۔ اس نے چہرہ ذرا جھکا کر سانس اندر اتاری۔ خستہ، اشتہا انگیز خوشبو۔ جہان کو پسند آئے گا۔ تعریف نہیں کرے گا البتہ تھوڑا کھائے گا، اور اس پہ بھی کئی دن ایکسرسائز کا دورانیہ بڑھا کر ان کیلوریز کو برن کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اپنی فٹنیس اور صحت کے بارے میں وہ آج بھی اتنا ہی کانشس تھا جتنا چار سال قبل ان کی شادی کے وقت تھا۔

اس نے ٹرے اندر دھکیلی، اور اوون کا ڈھکن بند کیا۔ اب جہان آفس سے آ جائے گا، تب ہی وہ اسے نکالے گی۔ ساتھ ہی اس نے پلٹ کر گھڑی دیکھی۔ ابھی اس کے آنے میں کافی وقت تھا۔ آج ویسے ہی حیا کے سارے کام جلدی ختم ہو گئے تھے، اب کیا کرے؟ سبین پھپھو کی کسی پرانی دوست کے بیٹے کی شادی تھی سو وہ کراچی گئی ہوئی تھیں۔ ویسے یہاں ان کے اپارٹمنٹ سے ابا اور تایا کے گھر زیادہ دور بھی نہیں تھے، سو پہلے اس نے اماں کی طرف جانے کا سوچا، پھر ارادہ ترک کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔

جہان اور اس کا بیڈ روم بہت نفاست مگر سادگی سے سجا تھا۔ وہ تو اتنی آرگنائزڈ نہیں تھی، مگر جہان...... وہ خراب، بے ترتیب چیزیں کبھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر وہ بھی بہت کچھ سیکھ گئی تھی۔

خدیجہ کا کمرہ گو کہ ساتھ والا تھا، مگر وہ ابھی اتنی چھوٹی تھی، بس تین سال کی، کہ یہ کمرہ اس کا بھی تھا۔ اس وقت بھی وہ کارپٹ پہ بیٹھی بلاکس کو توڑ کر پھر سے جوڑنے میں لگی تھی۔ ٹوٹے بلاکس ایک طرف تھے، جڑے ہوئے ایک طرف۔ بے ترتیبی میں بھی ترتیب تھی۔ باپ کی طرح وہ بھی Clutter نہیں پھیلاتی تھی۔

''خدیجہ گل کیا بنا رہی ہے؟'' وہ الماری کی طرف بڑھتے ہوئے اسے مخاطب کر کے بولی تھی۔ پٹ کھول کر اس نے لیپ ٹاپ کا بیگ نکالا، اور پلٹ کر اپنی بیٹی کو دیکھا، جو اس کے سوال پہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

وہ سلیولیس سرخ فراک میں ملبوس تھی، مگر نیچے سے اس نے کہنی تک آتی پنک شرٹ پہن رکھی تھی۔ جرابیں بھی پنک۔ نرم گھرے بھورے بال پونی میں بندھے تھے۔ (جہان اس کے بال کٹوانے نہیں دیتا تھا۔ اسے لمبے بال پسند تھے۔ مگر صرف خدیجہ کے۔ خدیجہ کی ماں کے بالوں کے بارے میں وہ رائے نہیں دیا کرتا تھا۔) گوری، گلابی رنگت، اٹھی ہوئی ناک، اور جہان جیسی آنکھیں۔ وہ جہان کی ہی بیٹی تھی۔ اور جہان کو لوگوں کا خدیجہ کو اس سے ملانا بہت پسند تھا۔ اس نے حیا سے صرف اچھا قد لیا تھا، مگر......

''میں تم سے زیادہ لمبا ہوں، اس کا قد بھی مجھ پہ گیا ہے۔'' وہ شانے اچکا کر بے نیازی سے کہتا تھا۔

''تھنگ!'' خدیجہ گل نے ذرا سے شانے اچکا کر نفی میں سر ہلایا اور واپس کام میں مگن ہو گئی۔ حیا نے جب اس کا نام خدیجہ گل رکھا تھا تو جہان نے اعتراض نہیں کیا تھا۔

''تم اپنی پسند کا نام رکھ لو، میں تو جو نام بھی بتاؤں گا، آگے سے کہو گی، اب اس نام کی اپنی پرانی دوست کا حلیہ بھی بتاؤ جس کی یاد میں یہ رکھنا چاہتے ہو؟'' (ویسے اتنا غلط بھی نہیں تھا وہ۔) سو اس نے اپنی بیٹی کا نام خدیجہ گل رکھا تھا۔

''میری تین بہترین دوستوں کی یاد میں!''

خدیجہ ایک پری میچور بچی تھی، مگر صد شکر کہ وہ ہمیشہ صحت مند رہی تھی۔ سو ان کے لیے وہ واقعی 'خدیجہ گل' تھی، (یعنی وقت سے پہلے پیدا ہو جانے والا گلاب۔)

اپنے گلاب کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے وہ الماری کا پٹ بند کرنے لگی، پھر یکایک ٹھہر گئی۔ جس خانے سے لیپ ٹاپ بیگ نکالا تھا، اس کے پیچھے لکڑی کی دیوار کا رنگ باقی الماری سے ذرا ہلکا لگ رہا تھا۔ اس نے اچنبھے سے اسے دیکھتے بیگ نیچے رکھا، اور ہاتھ بڑھا کر پیچھے لکڑی کو چھوا۔ کارڈ بورڈ تھا وہ۔ اُف۔ اس نے دبے دبے غصے سے کارڈ بورڈ کے ٹکڑے کو دائیں بائیں کرنے کی کوشش کی، اور ذرا سی محنت سے وہ ایک طرف سلائیڈ کر گیا۔

پیچھے ایک لاکر تھا۔ چند لمحے وہ خفگی سے اس بند تجوری کو دیکھتی رہی جس میں پتہ نہیں کیا تھا، اور پھر کارڈ بورڈ کی سلائیڈ واپس جگہ پہ کر کے الماری بند کر دی۔

اس گھر میں پچھلے چار سالوں میں کوئی چار سو خفیہ خانے تو وہ ڈھونڈ چکی تھی، پتہ نہیں اب کتنے تلاشنا باقی تھے۔ جہان سے پوچھنا

بے کار تھا۔ وہ بہت حیران ہو کر آگے سے کہتا" اچھا؟ ویری اسٹرینج۔ پتہ نہیں مالک مکان نے اتنے لاکرز کیوں رکھے ہیں۔ کبھی بات کروں گا ان سے۔"

ہاں جیسے وہ تو اپنے شوہر کو جانتی ہی نہیں تھی نا۔

خدیجہ اسی محویت کے ساتھ بلاکس اوپر رکھ نیچے جوڑ رکھی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ کھولے بیڈ پہ آ بیٹھی اور ای میلز چیک کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ خدیجہ پہ گاہے بگاہے نظر بھی ڈال لیتی تھی۔

ابھی یہی فراک، پنک شرٹ کے ساتھ پہنا کر پہلے ہی ہفتے وہ اماں کی طرف گئی تو اماں حسب عادت خفا ہونے لگی تھیں۔" اتنی سی بچی پہ تو پردہ نہیں لگتا نا۔ تم سلیولیس پہنا دو گی تو کیا ہو جائے گا حیا؟"

" آف کورس اماں، اس پہ پردہ لاگو نہیں ہوتا، مگر میں اسے کوئی زبردستی کا اسکارف تو نہیں اوڑھا رہی نا، صرف آستین پورے پہناتی ہوں۔ اماں میں نہیں چاہتی کہ اس کی حیا مر جائے، اور وہ ان چیزوں کی عادی ہو جائے جو......" اور اس سے آگے اماں نہیں سنا کرتی تھیں۔ وہ آج بھی حیا کے پردے کی سب سے بڑی مخالف تھیں۔ لیکن وہ کہاں پرواہ کرتی تھی۔ ہاں کسی کا دل چیر کر تو ہم نے نہیں دیکھا ہوتا، مگر وقت اور تجربہ یہ اندازہ کرنا تو سکھا دیتا ہے کہ کون دل سے کچھ کہہ رہا ہے، اور کون صرف زبان سے۔

لیپ ٹاپ کی چمکتی اسکرین اس کے چہرے کو بھی چمکا رہی تھی۔ وہ بہت توجہ سے اپنی ای میلز دیکھ رہی تھی۔ لمبے بال آدھے کیچر میں بندھے، آدھے پیچھے کھلے کمر پہ پڑے تھے، چہرہ ویسا ہی تھا، ملائی جیسا، اور اسے لگتا تھا وہ ان چار سالوں میں پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے، مگر......

" خوبصورت کی بجائے تین چار اور الفاظ ہیں میری لغت میں مگر میں کہوں گا تو تمہیں برا لگے گا۔" ڈائننگ ٹیبل پہ ہی ایک رات اس کے پوچھنے پہ کھانا کھاتے ہوئے جہان نے بے نیازی سے کہا تھا۔ وہ سلگ کر رہ گئی۔

" اگر تمہاری یہ لغت کتابی شکل میں دستیاب ہوتی تو میں اسے واقعی تمہیں دے مارتی جہان!" وہ بہت خفگی سے بولی تھی، مگر اس بات پہ اس کے ساتھ کرسی پہ بیٹھی خدیجہ نے ابرو تن کر ناراضی سے بولی

" نو، حیا!" وہ اس کے آئیڈیل باپ کو کچھ دے مارنے کی بات کر رہی تھی، وہ کیسے برداشت کرتی۔ اور بس، اس کی یہ عادت خود بخود دم توڑ گئی۔

ایک کلک کے بعد اگلا صفحہ کھلا تو وہ ٹھہر سی گئی۔ آنکھوں میں پہلے حیرت ابھری اور پھر الجھن۔

وہ مصر کی ایک یونیورسٹی کا پراسپکٹس تھا جو اس کی درخواست پہ اسے بھیجا گیا تھا۔ مگر...... یہ درخواست تو اس نے دی ہی نہیں تھی۔ کیا جہان نے اس کی طرف سے اپلائی کیا تھا؟

وہ الجھن بھری نگاہوں سے اس پراسپکٹس کو پڑھنے لگی۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ اب وہ ایل ایل ایم کرے گی، جہان ایسی باتوں پہ دھیان نہیں دیتا تھا کہ اپنی مرضی ہے، جو کرو۔ تو کیا اس نے ......؟ پتہ نہیں۔

میلز چیک کر کے اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ جہان کے آنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ رسٹ واچ کے ساتھ اس کی کلائی میں وہ بریسلٹ بھی بندھا تھا، اور اس میں پرویا سیاہ موتی جو آج بھی چمکدار تھا۔

سچا موتی۔

" بس کرو خدیجہ، اب کچھ کھا لو!" وہ لیپ ٹاپ بند کر کے اٹھی اور بیٹی کے سامنے سے بلاکس سمیٹنے لگی۔ خدیجہ کھانے کے معاملے میں ذرا چور تھی، بعض دفعہ زبردستی کرنی پڑتی تھی۔ ایسی ہی ایک دفعہ خدیجہ بہت بیمار تھی، اور حیا اسے کچھ کھلانا چاہ رہی تھی، مگر خدیجہ نے ہاتھ مار کر پیالہ گرا دیا تو اس نے بہت غصے سے کہا تھا۔

" اللہ، اللہ، بات کیوں نہیں مانتی ہو؟ میں کدھر جاؤں؟"

اور خدیجہ نے سرخ چہرے اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ غصے سے کہا تھا" جہنم میں جاؤ!"

اور وہ بالکل شل رہ گئی۔ بس وہ آخری دن تھا، پھر اس نے اپنا تکیہ کلام ترک کر دیا تھا۔ بس، اب اور نہیں۔ بری عادتیں ہمیں خود بدلنی پڑتی ہیں۔ اپنے لیے نہیں تو اپنے بچوں کے لیے ہی سہی!

خدیجہ کو کچن کاؤنٹر پہ بٹھا کر اس نے فریج کا دروازہ کھولا تا کہ اندر سے کھیر نکالے..... مگر.....

دروازے کے اندرونی طرف، انڈوں کے خانے میں ایک ''پوسٹ اٹ نوٹ'' چپکا تھا۔ اس نے نوٹ اتارا اور سیدھے ہوتے ہوئے پڑھا۔

''لنچ ٹائم پہ کبوتروں کو یاد کرنے میں کوئی حرج تو نہیں؟''

لنچ ٹائم؟ اس نے بے ساختہ گھڑی دیکھی۔ لنچ ٹائم تو ہونے والا تھا۔ اللہ، یہ آدمی بھی نا۔

''چلو خدیجہ، بابا کے پاس جانا ہے۔'' اس نے جلدی سے بچی کو کاؤنٹر ٹاپ سے اتارا۔ بابا سن کر اس کے چہرے پہ سارے جہان کی خوشی امڈ آئی۔ وہ فوراً اندر کی طرف دوڑی۔ جب تک حیا دروازے، کھڑکیاں بند کر کے آئی، وہ حیا کا بڑا سا پرس کندھے پہ لٹکائے، اس کا عبایا گھسیٹتی (فرش پہ جھاڑو دیتی) لا رہی تھی۔

''تھینکس۔ اپنے جوتے پہنو اب۔'' اس نے جلدی سے عبایا اور پرس اس سے لے لیا۔

ماہ سن کے کبوتروں کا ذکر پہلی دفعہ جہان نے ایک اطالوی ریسٹورنٹ میں کیا تھا۔ اس کے بعد سے اس ریسٹورنٹ کو وہ ''کبوتروں'' کے کوڈ نیم کے ساتھ یاد کرتے تھے۔ لیکن کیا تھا اگر وہ صبح ناشتے پہ کہہ جاتا کہ لنچ باہر کریں گے، مگر نہیں، وہ انسانوں کی زبان میں بات ہی کب کرتا تھا؟ صبح سے اتنی دفعہ فریج کھولا، پتہ نہیں کیوں نظر نہیں پڑی۔ اف!

آدھے گھنٹے بعد، وہ اپنے حریر کے سیاہ عبایا میں ملبوس، خدیجہ کی انگلی تھامے، ریسٹورنٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اوپر آ کر دیکھا، کونے والا میز خالی تھا۔ وہ وہیں کہیں ہوگا، مگر جب تک وہ بیٹھ نہیں جائے گی، وہ نہیں آئے گا۔ ویسے وہ اس طرح باہر کم ہی بلاتا تھا، یقیناً اب کوئی ایسی بات تھی جو وہ گھر میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

خدیجہ کو مخصوص کرسی پہ بٹھا کر، وہ جیسے ہی بیٹھی، اسے وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ گرے کوٹ بازو پہ ڈالے، کف موڑے، ٹائی ڈھیلی، سنجیدہ چہرہ اور ہمیشہ کی طرح ہینڈسم۔ اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہی وہ بولا تھا۔

''مرحبا۔ کیا حال ہے؟'' پھر موبائل، والٹ میز پہ رکھتے ہوئے اس نے جھک کر خدیجہ کے دونوں گال باری باری چومے۔ اپنی بہت سی ترک عادات کو وہ ترک نہیں کر سکے تھے۔

''بابا، یو نو واٹ؟'' خدیجہ چہک کر جلدی جلدی اسے کچھ بتانے لگی تھی اور وہ توجہ سے مسکراتے ہوئے سن رہا تھا۔ آدھی تو یقیناً ''حیا'' کی شکایات تھیں۔ نہیں، وہ ماما کہنے کا تکلف نہیں کیا کرتی تھی۔ وہ وہی کہتی تھی جو اس کا باپ کہتا تھا۔

جب آرڈر سرو ہو چکا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور..... سب ٹھیک ہے؟''

''تمہید کو شارٹ کرو جہان، اور اب بتا بھی چکو کہ کیا بات ہے۔''

''نہیں، اتنا کچھ خاص نہیں ہے، بس ایسے ہی.....'' وہ چھری کانٹے کی مدد سے اسٹیک کا ٹکڑا توڑتے ہوئے لاپرواہی سے بولا تھا۔

(بہت خاص بات ہے، اور گھر پہ نہیں ہو سکتی تھی)۔ یہ فقرہ اس نے کہا نہیں تھا، مگر حیا توجہ سے سر ہلاتی، اس کو سنتے ہوئے خود ہی ذہن میں اس کے الفاظ ڈی کوڈ کر رہی تھی۔

''اصل میں، میں کچھ آگے کا سوچ رہا تھا.....''

(مجھے آگے کا اسائنمنٹ مل گیا ہے۔ اور اوپر سے حکم آیا ہے)

''کہ کچھ دن کے لیے، تھوڑا سا گھومنے پھرنے، باہر چلا جاؤں۔''

(یعنی کہ ایک دو سال تو کہیں نہیں گئے)

''ہوں؟'' حیا نے سمجھ کر سر ہلا کر اسے مزید بولنے دیا۔

''زیادہ دور نہیں، بس قریب ہی۔ میل چیک کی تم نے آج؟'' حیا نے بس ہاں میں گردن ہلائی۔ بولی کچھ نہیں۔

(قریب یعنی کہ مصر..... وہیں سے میل آئی ہے ناتمہیں۔)

''تو..... تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ سنجیدگی سے اس کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

(ہم رہ لو گی اتنا عرصہ؟)

حیا نے شانے ذرا سے اچکائے۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔'' دل البتہ بہت اداس ہو گیا تھا۔ تو بالآخر وہ لمحہ آن پہنچا تھا جب اسے ایک فوجی کی بیوی کا کردار کرنا ہوگا۔ گھر رہ کر برسوں انتظار کرنے والی بیوی کا۔ خدیجہ بڑی ہو جائے گی، اور پھر پتہ نہیں وہ کب اپنے باپ کو دوبارہ دیکھ پائے گی۔ زندگی بھی بہت غیر یقینی چیز تھی۔

''خدیجہ تو میرے بغیر رہ لے گی، ممی کے ساتھ اس کی بہت بنتی ہے۔'' وہ بھی حیا کی طرح شاید اس کی سوچ کو ڈی کوڈ کر کے بولا تھا۔ ''مگر، تمہارے لیے مشکل ہوگا، جانتا ہوں تم مجھے مس کرو گی۔'' وہ ذرا سا مسکرایا۔

(میں تمہیں مس کروں گا مگر قیامت تک اس بات کا اقرار نہیں کروں گا۔)

''اچھا، تو پھر؟''

''پھر یہ کہ.....'' اس نے پلیٹ پرے کرتے ہوئے حیا کو دیکھا۔

''میں ایک ایسا کور بنانا چاہ رہا ہوں جس میں مجھے شاید کسی یونیورسٹی میں کچھ عرصے کے لیے پڑھانا پڑھے۔ تمہیں بھی آگے پڑھنے کا شوق ہے، تو کیوں نہ ہم یوں کریں کہ خدیجہ کو ممی کے پاس چھوڑ دیں، اور تم میری اسٹوڈنٹ بن کر میری کلاس میں ان رول ہو جاؤ۔'' یہاں پہ آ کر اس نے مسکراہٹ دبائی۔ ''ہاں لیکن میں اس بات کی یقین دہانی کروں گا کہ تم میری سے زیادہ ڈانٹ کھانے والی اسٹوڈنٹ ہو گی۔''

''اچھا اور تمہیں لگتا ہے کہ مان جاؤں گی؟'' وہ ذرا توقف کے بعد بولی تھی۔ ''ترکی کے ان پانچ ماہ کی طرح ایک دفعہ پھر تم ڈرائیونگ سیٹ میں ہو گے، اور ہر چیز کنٹرول کرو گے؟''

''ہاں، تو؟''

''تو میرا خیال ہے کہ یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے، مگر تھوڑی سی تبدیلی کی گنجائش ہے۔'' اس سارے میں وہ پہلی دفعہ مسکرائی تھی۔ ہتھیلی تھوڑی تلے رکھے، وہ بہت مطمئن سی اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''ہم اپنی جگہیں swap کر لیتے ہیں۔''

''مطلب؟'' وہ الجھا۔

''مطلب کہ میں ٹیچر ہوں گی، اور تم میرے اسٹوڈنٹ ہو گے۔ اور ہاں، میں اس بات کی یقین دہانی کروں گی کہ تم میرے سب سے زیادہ ڈانٹ کھانے والے اسٹوڈنٹ ہو گے۔''

''اور تمہیں لگتا ہے کہ مان جاؤں گا؟''

''ہاں، کیونکہ اس دفعہ میں ڈرائیونگ سیٹ میں ہونا چاہتی ہوں۔ اور تمہارے پاس فیصلہ کرنے کے لیے دس سیکنڈ ہیں۔'' اس نے ساتھ ہی گھڑی دیکھی۔

''حیا!'' وہ جھنجلایا تھا۔ خدیجہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، اور پھر حیا کو، اور پھر سے جہان کی پلیٹ سے اسٹیک کے ٹکڑے اٹھانے لگی (وہ ہمیشہ اس کی پلیٹ سے کھاتی تھی۔)

''ڈیل؟'' حیا نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔ اور دوبارہ گھڑی دیکھی۔ وہ ذرا ناخوش سا لگ رہا تھا، چند لمحے کے لیے کچھ سوچا، اور پھر شاید اسے کوئی اپنا فائدہ نظر آیا تھا، تبھی بولا۔

''او کے، ڈیل۔ مگر.....'' اس نے نیپکن سے ہونٹ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''یہ یاد رکھنا، کہ تم ہمیشہ مجھ سے دو قدم پیچھے رہو گی۔''

ایل ایل بی آنرز کی اسٹوڈنٹ حیا سلیمان کی زندگی میں دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب اسے پانچ ماہ کا ایک سمیسٹر پڑھنے کے لیے ترکی کی ایک یونیورسٹی کا اسکالرشپ ملا، لیکن حالات اس وقت گھمبیر ہو گئے جب ایک فنکشن پہ بنائی گئی اُس کی ذاتی ویڈیو کو کسی نے انٹرنیٹ پہ ڈال دیا۔ اپنے روائتی قسم کے خاندان والوں کی نظر سے اس ویڈیو کو دُور رکھنے اور کسی بھی پیچیدگی سے بچنے کے لیے اس کو سائبر کرائم سیل کے ایک ایسے آفیسر سے رابطہ کرنا پڑا جو اس کی ویڈیو کو ہٹوا سکتا تھا۔ مگر جلد ہی یہ احساس اسے پریشان کر گیا کہ وہ بے چہرہ آفیسر اس کے بارے میں بہت پہلے سے سب کچھ جانتا ہے۔

کیا حیا وہ ویڈیو انٹرنیٹ سے ہٹوا پائے گی؟ کیا وہ ترکی جا پائے گی؟ اور سب سے بڑھ کر کیا اُسے ترکی میں 'وہ' مل سکے گا جس کو اُس نے کبھی دیکھا نہیں تھا مگر جس کو وہ کئی برس سے ڈھونڈ رہی تھی؟

استنبول کی گلیوں سے بوسفورس کے سمندر تک، کپادوکیہ کی غاروں سے بھارتی جیلوں کے ٹارچر سیلز تک 'جنت کے پتے' کسی ایسے رولر کوسٹر کی مانند ہے جس میں آپ کے اوپر نیچے ہوتے اکثر اندازے غلط ثابت ہوں گے اور رازوں سے بھری یہ کہانی اپنی آخری سطر تک اپنے راز محفوظ رکھے گی، کیونکہ راز رکھنا بھی ایک فن ہے اور یہ ہر ایک کو نہیں آتا۔

عِلم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اُردو بازار، لاہور۔

فون: 37232336'37352332 فیکس: 37223584
www.ilmoirfanpublishers.com
E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com